00112145

سلسلۂ مطبوعات جامعۂ عثمانیہ

نشان.........

معاشیات ہند

نظر ثانی شدہ بار پنجم ۱۹۳۹ء

جلد دوم

مصنفہ

جی، بی، جتھار
ایم، اے (انڈین ایجوکیشنل سروس)

و

یس، جی، بیری
ایم، اے (بمبئی ایجوکیشنل سروس)

مترجمہ

مولوی رشید احمد صاحب
بی، اے (علیگ) ایف آر ای ایس (لندن)

سابق رکن سررشتہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ

۱۳۶۴ھ سنہ ۱۳۵۴ف سنہ ۱۹۴۵ء

مطبوعہ

دارالطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

معاشیات ہند جلد دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

ع ۱

۱۔ تامین صنعتی ترقی کی معاون ہے

اہل ہند اپنی قوم کو نئے راستے پر چلانے کے لیے حکومت ہی کو ہمیشہ سے رہبر سمجھتے رہے ہیں۔ ہندوستان میں انتہائی قسم کے فلسفۂ انفرادیت کے پیرووں کی تعداد کسی زمانے میں بھی زیادہ نہ تھی۔ اس کے برخلاف انگلستان میں یہ فلسفہ اس درجہ عوام کے دل و دماغ پر چھا گیا تھا کہ ہر قسم کی سرکاری مداخلت محض فضول اور پریشان کن خیال کی جاتی تھی۔ لیکن موجودہ زمانے میں یہ فلسفہ جبکہ خود انگلستان ہی میں نظروں سے بڑی حد تک گر چکا ہے ہندوستان میں اس کے ماننے والوں کی تعداد کے بڑھنے کا امکان اور بھی کم ہو گیا ہے۔ یہاں حکومت ہی سے یہ درخواست کی جائے گی کہ وہ ملک کو صنعتی بنانے میں دلچسپی لے اور صنعتی ترقی کی تدابیر اختیار اور نافذ کرنے میں پیش قدمی کرے۔ چنانچہ عام طور پر ان تدابیر میں سب سے مقدم "تامینی محصول" سمجھا جاتا ہے۔

۲۔ ہندوستان میں تامین کے حق میں سب سے بڑی دلیل۔

ہندوستان کے لیے تامینی پالیسی کی تائید میں سب سے زیادہ زور عام طور پر "نوخیز صنعت" کی دلیل پر دیا جاتا ہے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تامین کے تحت صنعتوں کی بڑی تعداد رونما ہوگی۔ اگر ان کی نشو و نما کے ابتدائی زمانے میں معقول نفع کا یقین دلایا جائے تو ان کی قوت اور کارکردگی تیزی سے ترقی کرے گی یہاں تک کہ وہ آخر کار ہر قسم کی مصنوعی امداد سے بے نیاز ہو جائیں گی

اور اس طرح ان کی نشو و نما کی ابتدائی منزلوں میں عائد ہونے والے نقصان کی تلافی آخر میں قومی فائدے سے ہو جائے گی۔ چنانچہ مالی کمیشن[1] پروفیسر اے۔ سی پیگو کے مندرجۂ ذیل الفاظ سے اتفاق کرتے ہوئے ان کو نقل کرتا ہے اور بتلاتا ہے کہ ان کا اطلاق ہندوستان پر ہو سکتا ہے۔ پروفیسر پیگو کے الفاظ یہ ہیں:۔ "پیداآور قوت کو بڑھانے کے لیے تامین کی دلیل ایسے زرعی ملک کے حق میں بہت قوت رکھتی ہے جو بظاہر مصنوعات تیار کرنے کی قدرتی سہولتیں رکھتا ہو۔ ایسے ملک کو بدیسی مصنوعات کے مبادلے میں ملکی خام پیداوار کی نکاسی کے رک جانے سے فوری نقصان تو ہوگا۔ لیکن اس کی کافی سے زیادہ تلافی اس فایدے سے بخوبی ہو جائے گی جو خود اس کی صنعتی ترقی کی رفتار تیز ہونے سے رونما ہوگا۔ کو بیر تامینی محصولوں کے متعلق لکھتا ہے کہ وہ نئی صنعتوں کو اپنے پیروں چلنا سکھانے والا سہارا ہیں۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ صنعتیں کسی سہارے بغیر اپنے پیروں چلنا جتنی مدت میں سیکھ سکتی ہیں اس سے بہت جلد تامینی محصول کے سہارے سیکھ جاتی ہیں بلکہ اتنی کم مدت میں کہ ان سہاروں کا خرچ بھی کافی سے زیادہ وصول ہو جاتا ہے"۔

۳۔ صنعت کی تامین اور تنویع

مختلف النوع صنعتوں کی نشو و نما بجائے خود ایک اچھا مقصد ہے، اس لیے کہ ان میں مختلف درجوں کی مہارت سے کام لینے کا موقع ملتا ہے اور قومی خصائل اور خصوصیات پر بھی ان کا اچھا اثر پڑتا ہے۔ تامین ایسی نشو و نما کی رہنمائی میں جو حصہ لیتی ہے گویا یہ خود اس کی تائید میں ایک اور دلیل ہے۔ بظاہر یہ ضروری نہیں ہے کہ محض صنعتوں کی کافی تنویع کی خاطر ہندوستان کوئی خاص قربانی کرے۔ اگر صرف انھی صنعتوں کو تامین دی جائے جو بعد میں اس سے بے نیاز ہو سکتی ہوں تو ہمارا مقصود خود بخود پورا ہو جاتا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو مالی کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۴۷۔

۴۔ تامین اور قومی خود کفالت۔

بعض اوقات تامین پر اس لیے زور دیا جاتا ہے کہ وہ ملک کو معاشی حیثیت سے خود کفیل بنانے کے لیے استعمال کی جاسکتی ہے۔ یہاں یہ بتلا دینا مناسب ہوگا کہ جو لوگ تامین کے حامی ہیں ساتھ ہی ساتھ برآمد کو بھی ہر ممکنہ طریقے سے بڑھانا چاہتے ہیں۔ لیکن برآمد بڑھانا قومی خود کفالت کے مقصد کے صریحاً خلاف ہے۔ اس لیے کہ برآمد کے ساتھ درآمد میں بھی لازمی طور پر مساوی رفتار سے اضافہ ہوگا۔ اس سے قطع نظر یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ جب انفرادی خود کفالت کوئی اچھا نصب العین نہیں ہے تو کیا قومی خود کفالت اس سے زیادہ مستحسن ہوسکتی ہے؟ جیسا کہ ایڈون کینن کا قول ہے "انتہائی تامین کا حامی ایک ایسا تارک دنیا بن باسی ہے جو اپنے ہمسایوں سے کوئی شے خریدنے سے انکار کرتا ہے[1]"۔ اس اعتبار سے 'دنیا سے الگ تھلگ رہنے والی قوم' اس تارک دنیا بن باسی سے ہرگز زیادہ لایق تعریف نہیں ہے۔ جو قوم دوسری قوموں سے کوئی شے خریدنے سے انکار کرے اس کو یا تو اپنی ضرورت کی سب اشیا خود ہی تیار کرنی پڑتی ہیں یا بعض اشیا سے جو اس کی فلاح و بہبود کا سامان کرتی ہیں محروم ہونا پڑتا ہے۔ بہرصورت اس کو خوشحالی کے اعتبار سے نقصان ہوگا۔ عام نظر سے دیکھا جائے تو قومی خود کفالت کے مقصد کو اصول مصارف متقابلہ کے تابع رہنا چاہئے اور تامین کا خیال صرف ان صنعتوں کے بارے میں کرنا چاہئے جن میں ملک کو قدرتی طور پر غیر مشتبہ سہولتیں حاصل ہوں۔

خود کفالت کے اصول کی حمایت عام طور پر قومی تحفظ کے خیال سے کی جاتی ہے۔ یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ قومی تحفظ کا یہی تقاضا ہے کہ ہر ملک معاشی آزادی کو اپنا مقصد قرار دے، خواہ اس کی وجہ سے قوم مستقل طور پر ہی زیر بار کیوں نہ ہوجائے۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشی قربانی کرنا اور قومی تحفظ کی خاطر بعض صنعتوں کو فروغ دینا نہ صرف ممکن بلکہ مناسب عمل ہے۔ لیکن زمانہ امن کے لیے

---

[1] دیکھو اکنامک جرنل بابت مارچ ۱۹۱۹ء صفحہ ۷۰۔

جو معیاری صنعتی نظام درکار ہے اس کو بحیثیت مجموعی جنگی بنیاد پر قائم کرنے کی کوشش بڑی حماقت ہوگی۔ ہندوستان ایک بڑا ملک اور گوناگوں ذرائع کا مالک ہونے کے اعتبار سے برطانیہ جیسے ملک کے مقابلے میں بہت زیادہ کامیاب طریق پر خودکفیل بن سکتا ہے اور ہندوستان کو اپنی ضرورت کی غذائی اشیا حاصل کرنے کے لیے دوسرے ملکوں کا محتاج بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہ بات نہ تو ممکن ہے اور نہ مناسب کہ ہندوستان اپنی سب ضرورتوں کو خود ہی پورا کرلے اور دوسرے ملکوں سے بے نیاز بن جائے۔ فوجی ضرورت کی اشیا سب کی سب ملک کے اندر تیار نہیں کی جاسکتیں اور بعض کی تیاری بہت بھاری قربانی کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ پس یہ دلیل
عام حیثیت سے تو کافی معقول ہے کہ کسی صنعت کو اس لیے تامین دینا چاہیے ص۳
کہ وہ قومی تحفظ کے اغراض کے لیے لابد ہے۔ لیکن بہرحال یہ ضروری ہوگا کہ صنعت کی فوجی قدر و اہمیت اور صنعت کی حفاظت و حمایت کی معاشی قربانی کا ایک دوسرے سے مقابلہ و موازنہ کیا جائے اور آخری فیصلے کو حسنِ تناسب پہ لازمی طور پر منحصر رکھا جائے۔"[1]

مسٹر آلڈس ہکسلے کی کتاب موسوم بہ "نتائج و مقاصد" (Ends and Means)[2] کے مندرجہ ذیل اقتباسات اس لحاظ سے دلچسپ ہیں کہ وہ قومی خودکفالت کے موضوع کے بارے میں ایک نئے نقطۂ نظر کی تشریح کرتے ہیں "اکثر حکومتیں ناموری کی خاطر اور جنگ کے زمانے میں پیش آنے والے واقعات کے خوف سے آج کل اس بات کی آرزومند معلوم ہوتی ہیں کہ ان اشیاء میں سے حتی الامکان زیادہ سے زیادہ اشیا اپنے علاقوں کے اندر تیار کریں جو دوسرے ملکوں میں نسبتاً سہولت کے ساتھ تیار ہوتی ہیں خواہ ایسا کرنے میں انھیں کتنے ہی مصارف اور فطری مشکلات کیوں نہ اٹھانی پڑیں۔ علاوہ ازیں

سلہ دیکھو مالی کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۱۰۷۔

سلہ دیکھو صفحہ ۴۲ تا ۴۳۔

صناعیات کی ترقی نے حکومتوں کی اس آرزو کی تکمیل کو کم از کم عملاً تو بڑی حد تک ممکن بنا دیا ہے۔ آج کل قوم پرستی کا اثر اس قدر زبردست ہو گیا ہے کہ قوموں کے باہمی ربط و تعلق سے نااتفاقی کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک قوم کا دوسری سے جس قدر کم تعلق اور سروکار ہو اتنا ہی اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ امن برقرار رہے گا۔

۵۔ کلیدی صنعتوں کا مسئلہ یہ بات مان لی گئی ہے کہ اساسی یا کلیدی صنعتیں خاص لحاظ اور توجہ کی اس لیے مستحق ہیں کہ ان کی پیداوار خام مال کے طور پر استعمال کی جاتی ہے جس کی رسد کے یقینی ہونے پر کئی دوسری اہم صنعتوں کی کامیابی اور سرسبزی کا دارومدار ہوتا ہے۔ پس تامین کے لیے کلیدی صنعتوں کے انتخاب میں خاص احتیاط اور ہوشیاری کی ضرورت ہے، اس لیے کہ قریب قریب ہر صنعت کسی نہ کسی اعتبار سے کلیدی صنعت ہونے کا عذر پیش کرکے تامین کا تقاضا کرے گی اور اس طرح اس کا امکان ہے کہ خریداروں کے اغراض کو ناحق اور بے دھڑک قربان کر دیا جائے۔

۶۔ تامین اور حکومت کی مدنی تامین سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ صنعتی ترقی کی رفتار تیز ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ دوسرے فوائد بھی بتلائے جاتے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ تامین، مالیے پر اچھا اثر ڈالے گی۔ لیکن اس کی بابت کم سے کم یہ کہہ دینا مناسب ہوگا کہ یہ انتہائی طور پر مشتبہ امر ہے۔ چنانچہ اگر تامینی محصول عاید کرنے سے پیشتر بعض اشیا بلا محصول درآمد کی جا رہی ہوں اور اب ان پر کروڑگیری لی جائے تو ظاہر ہے کہ اس حد تک کروڑگیری سے سرکاری آمدنی بڑھ جائے گی۔ لیکن دوسری طرف اشیا کی قیمتوں میں ناگزیر اضافہ بھی ہوگا جو صارفوں کی محصول ادا کرنے کی قابلیت کو گھٹا دے گا[1]۔ اسی طرح ایک اور صورت لیجیے۔ اگر کسی درآمدی شے پر

[1] قیمتوں کا اضافہ صرف محصول زدہ اشیا تک محدود نہ رہے گا۔ بلکہ دوسری اشیا بھی اس سے متاثر

پہلے سے محصول موجود ہو اور تامین کی خاطر اس میں کچھ اضافہ کر دیا جائے تو اس کا مالیہ پر کیا اثر پڑے گا۔ اس کا دارو مدار اس بات پر ہوگا کہ محصول کے اضافے کے باوجود یہ شئے کتنی مقدار میں درآمد ہوتی رہے گی۔ اگر محصول واقعی کارگر ہو تو اشیا کی درآمد فوراً کم ہو جانی چاہئیے اور اس کے بالمقابل حکومت کی آمدنی بھی کم ہو جائیگی۔ یہ بات تصور میں آسکتی ہے کہ درآمدی محصول بہت اعلیٰ شرح سے لگایا جائے تو وہ درآمد کو بڑی حد تک کم کر دینے کے باوجود مالیے کے نقطۂ نظر سے نہایت اطمینان بخش ثابت ہوگا۔ لیکن اس نتیجے پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بہرحال ضروری ہے کہ خریداروں کی محصول ادا کرنے کی قابلیت کے کم ہو جانے سے سرکاری آمدنی میں کچھ نہ کچھ کمی آئے۔ یہ بات بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ چونکہ مراعات یافتہ صنعتوں میں کام کرنے والے چند اشخاص کو تامین کی بدولت زیادہ آمدنی وصول ہوگی، اس لیے ان پر انکم ٹکس جیسے محصولوں کو براہ راست عاید کرنا حکومت کے لیے نفع آور ثابت ہوگا۔ گو کہ ایک خاص حد سے نیچے کی آمدنی محصول آمدنی سے معمولاً مستثنیٰ ہوتی ہے لیکن اس سے اوپر کی آمدنی پر محصول تدریجی طور پر بڑھتا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اعلیٰ آمدنیوں کے محصول کا حاصل چھوٹی آمدنیوں کے براہ راست یا بالواسطہ محصولوں کے حاصل سے مقدار میں زائد ہوگا۔ بہرحال یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے کہ تامین مالیے پر قطعی طور پر کیا اثر ڈالے گی۔ اس میں کئی عاملوں کا لحاظ ضروری ہے اور اسی لیے یقین کے ساتھ ابتداءً یہ بتا دینا محال ہے کہ صنعتوں کی تامین سے سرکاری آمدنی میں کمی ہوگی یا بیشی۔

ان امور کا اطلاق قلیل مدت کے نتائج پر ہوتا ہے۔ لیکن اگر کافی طویل مدت لی جائے جس میں تامینی محصولوں کے نتائج و اثرات پوری طرح

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ ہوں گی۔ چنانچہ درآمدی اشیا کے بدل کے طور پر جو اشیا ملک میں تیار کی جائیں گی وہ اس اضافے کا اثر سب سے پہلے قبول کریں گی۔ (دیکھو مالی کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۷۹)۔

رونما ہو سکیں اور یہ فرض کیا جائے کہ محصول دانشمندی کے ساتھ عائد کیے گئے ہیں تو آخر کار ملک کے تمول اور اہل ملک کی محصول ادا کرنے کی قابلیت کے بڑھ جانے سے سرکاری آمدنی میں یقیناً اضافہ ہو جانا چاہیے۔ لیکن قلیل مدت اور طویل مدت کے نتائج کو الگ الگ رکھنا ضروری ہے اور جو ملک تامینی طریق اختیار کرلے اس کو اپنا میزانیہ متوازن رکھنے کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے[1]۔

۷۔ ہندوستان میں تامین کا قومی جذبہ

آزاد تجارت کی پالیسی جس پر حکومت کچھ سال ادھر تک کاربند تھی، اس عام بدگمانی کے باعث خاص طور پر غیر مقبول تھی کہ انگلستان، ہندوستان میں "کھلے دروازے" کے اصول کی تائید ہندوستان کے مفاد کے لیے اس قدر نہیں کر رہا تھا جس قدر کہ اپنے ذاتی اغراض کی خاطر۔ اس بدگمانی کو اس لحاظ سے اور بھی تقویت پہنچی کہ لنکا شائر کو ہندوستان کی مالی و صنعتی پالیسی میں وقتاً فوقتاً مداخلت کا موقع دیا گیا۔ علاوہ ازیں محب وطن ہندوستانیوں کا اپنے ملک کی گری ہوئی حالت اور موجودہ حقیر صنعتی حیثیت کو دیکھ کر رنج کرنا ایک فطری امر تھا اور ان کا یہ رنج و افسوس گذشتہ زمانے کو یاد کر کے جبکہ ہندوستان اپنی مصنوعات کے لیے شہرۂ آفاق تھا، اور بھی گہرا ہو گیا۔ ان کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ریاست ہائے متحدۂ امریکا، جرمنی، اور سب سے بڑھ کر، جاپان، تامین ہی کے تحت اور اسی کی بدولت انتہائی طور پر خوش حال ہوئے۔ رہے یہ دلایل کہ ان ملکوں کی خوش حالی کے اسباب بالکل دوسرے تھے اور تامین صنعتی ترقی کے حق میں محرک نہیں بلکہ مزاحم تھی، خواہ وہ بظاہر کتنے ہی معقول کیوں نہ ہوں، ان کو مطمئن کرنے میں ناکام رہے

[1] چنانچہ جب یہ معلوم ہوا کہ شکر، کپڑوں اور دیا سلائی کی تامین سے مالیہ میں گھاٹا آرہا ہے تو ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء کے میزانیہ میں شکر اور دیا سلائی پر محصول چنگی عاید کرنے کی پالیسی اختیار کرنی پڑی۔

اور انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ خود انگلستان نے تاین کی پالیسی کو صرف اس وقت ترک کیا جبکہ اس کا صنعتی تفوق محفوظ و مستحکم طور پر قایم ہو گیا، اور یہ کہ بہر طور انگلستان میں آزاد تجارت کی پالیسی کے شروعات کا مقصد زراعت سے تاین اٹھا کر صنعت کی مدد کرنا تھا۔ آخر میں یہ کہ ۱۹۱۵ء سے خود انگلستان کا تدریجی اور مستقل میلان تاینی پالیسی کی جانب رہا ہے، ایسی حالت میں انگلستان اب کس منھ سے ہندوستان کو آزاد تجارت کا درس دے سکتا ہے۔

یوں تو جنگ عظیم کے بعد سے غیر معمولی مصارف عامہ نے درآمدی اشیا کے محصول میں اضافہ کرنے پر حکومت کو بہت بڑی حد تک مجبور کر ہی دیا تھا لیکن اس کارروائی نے اکثر مصنوعات کے حق میں غیر ارادی طور پر تاین کا اثر پیدا کر دیا۔ چونکہ یہ تاین بالکل اتفاقی اور بے اصول تھی اس لیے اس سے بعض ناگوار نتائج کا پیدا ہونا یقینی تھا۔ چنانچہ بعض صنعتیں تو اس کی پناہ میں آگئیں، لیکن نہ تو مستقل پالیسی کا یقین دلایا گیا اور نہ ان صنعتوں کو لازمی طور پر پناہ دی گئی جو اس کی مستحق تھیں۔ کروڑگیری کی اعلیٰ شرح جس کی اصل غرض حصول آمدنی ہو اور جو اتفاقی طور پر تاینی اثر رکھتی ہو، ہندوستان کی صنعتی نشو و نما کی رفتار کو تیز کرنے کے بجائے اس کے حق میں در اصل بہت بڑا سنگ راہ بن سکتی ہے؛ مثلاً خام مال اور نیم مصنوعہ اشیا پر اعلیٰ محصول لگانے سے صنعتی ترقی میں سنگین رکاوٹیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ان حالات کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے تاین کو ملک میں دانستہ اور ارادی طور پر رائج کرنے میں سہولتیں پیدا کیں۔ تاہم تاین اختیار نہیں کی گئی اور اگر آخری چارۂ کار کے طور پر اختیار کی جاتی تو غلطی ہوتی۔ تاین اس لیے شروع کی گئی کہ اس سے قطعی فوائد کی توقع کی جاتی تھی نہ کہ اس لیے کہ حصول آمدنی کی غرض سے عائد کیے ہوئے محصول کے طریقے سے جو غیر ارادی طور پر تاینی بھی تھا بچا اور گریز کیا جائے۔

۸۔ تاین کا بار	تاین کے عقیدے میں ایک خاص ترغیب اور زور بیان ہے اور

عام آدمی جو معاشی تجزیے کا خوگر نہ ہو اسے قبول کرنے پر فوراً آمادہ ہو جاتا ہے۔ لیکن تامین کو زیادہ سے زیادہ کار آمد بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں جو مختلف قسم کی قربانیاں مضمر ہیں ان کو صاف طور پر ذہن نشین کر لیا جائے اور ہوشیاری کے ساتھ ان قربانیوں کو تاحد امکان کم کرنے کی کوشش کی جائے۔ سب سے اول یہ کہ تامین، مصارف زندگی کو لازمی طور پر بڑھادے گی۔ اخراجات کی زیادتی کی وجہ سے نہ صرف خریدار بلکہ غیر تامین یافتہ صنعتیں بھی خسارے میں رہیں گی۔ یہ امر عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ غیر تامین یافتہ صنعتوں پر کس درجہ بار پڑے گا؛ چنانچہ غیر تعلیم یافتہ عوام کو تامین کا سرگرم حامی بنانے والے اسباب میں سے ایک یہ بھی ہے[1]۔

ممکن ہے کہ مصارف زندگی کی زیادتی کے ساتھ اجرتوں میں بھی اضافہ ہو، لیکن اجرت قیمتوں کی طرح تیزی کے ساتھ نہیں بڑھتی۔ گو تامین سے خاص کر تامین یافتہ صنعت میں کام کرنے والے ماہر مزدور فائدے میں رہیں گے لیکن بے مہارت مزدور بوجہ کثرت تعداد غالباً گھاٹے میں رہیں گے۔ ممکن ہے کہ زرعی مزدور کی اجرت بھی خاص کر صنعتی مرکزوں کے گردو نواح میں بڑھ جائے؛ لیکن یہ مشتبہ ہے کہ اضافۂ اجرت بڑھے ہوئے مصارف زندگی کے برابر آجائیگا۔ رہا ملکی کاشتکار تو اس کے مصارف اس لیے بڑھ جائیں گے کہ اگر وہ باہر کے کسی مزدور سے کام لے تو اسے زیادہ اجرت دینی ہوگی اور اس کے آلات کی قیمتیں بڑھی ہوئی ہونگی لیکن دوسری طرف اس کو اپنی پیداوار کی فروخت سے زیادہ قیمت وصول ہوگی[2]۔ لیکن اس کے پاس فاضل پیداوار فروخت کے لیے نہ ہو تو تامین

---

[1] ہر مثبت کے مقابلے میں ایک منفی کا ہونا ضروری ہے لیکن عوام شاید محض اس وجہ سے تامین کی حمایت کرتے ہیں کہ کئی منفیوں کے مقابلے میں ایک مثبت کو دیکھنا عام طور پر زیادہ آسان ہوتا ہے۔" دیکھو اولڈہم کا مضمون موسوم بہ "آزاد تجارت کے تحت صنعتی آئرستان" اکنامک جرنل شایع شدہ جون ۱۹۱۰ئہ میں۔

[2] لیکن یہ ممکن ہے کہ تامین درآمدی اشیا کی مقدار میں کمی کردے جس کے نتیجے کے طور پر اشیا کی برآمد میں بھی

سے فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔ متوسط طبقے تاہینی طریق کے تحت، یقیناً نقصان میں رہیں گے، اس لیے کہ ان کی آمدنی قیمتوں کے اضافے کے شکل یا تناسب سے نہیں بڑھے گی۔ اس کے باوجود متوسط طبقے ہی ہندوستان میں تاہین رائج کرنے کے لیے سب سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی وجہ کسی حد تک یہ ہے کہ ان کی تعلیم اور روشن خیالی انھیں اس قابل بناتی ہے کہ وہ تاہین کو وسیع قومی نقطۂ نظر سے دیکھیں۔ وہ تاہین کا خیر مقدم صنعتی ترقی کی خاطر کرتے ہیں اور جماعت کی حیثیت سے زیادہ پرمشقت زندگی کا ہنسی خوشی کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔ لیکن تاہین کے بارے میں ان کے جوش وخروش کا سبب زیادہ تر ان کی ناواقفیت ہے کہ وہ اس سے پیدا ہونے والی مشکلات اور دشواریوں کا صاف اور صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ اگر تاہینی طریق پر کچھ عرصے تک واقعی عملدرآمد ہوتا رہے۔ اور توقع کے مطابق یہ نتیجہ رونما ہو کہ قیمتیں بڑھ جائیں تو اس سے متاثر ہونے کے باوجود تاہین کے بارے میں متوسط طبقے کے جوش وخروش میں نمایاں کمی نہ ہونا حیرت انگیز ہوگا۔

۹۔ امتیازی تاہین امتیازی تاہین کی پالسی کا مقصد جیسا کہ اس کو ہندوستان میں اختیار کیا گیا یہ ہے کہ قوم پر کم سے کم بار ڈالتے ہوئے صنعتی ترقی کے حق میں ضروری محرک مہیا کیا جائے۔ اس لیے صرف ان صنعتوں کو تاہین دی جائے جو حقیقت میں موزوں ہوں اور تاہین سے فائدہ حاصل کرنے کا موقع صرف انہی صنعتوں کو دینا چاہیے جو اور شرایط کے منجملہ اپنے کاروباری طریقوں کی اصلاح کے لیے تیار ہوں۔ خود صنعتوں کے بہترین اغراض کے لیے یہ ضروری ہے کہ امتیاز بہت ہوشیاری سے کیا جائے۔ اگر درآمدی اشیا پر غیر امتیازی طور پر اعلیٰ محصول لگایا جائے تو اندیشہ ہے کہ بہت سے ناکارہ اور گھٹیا کارخانے وجود میں آجائیں۔ ان کی ناگزیر تباہی، سرمایے کے اعتماد کو جو صنعت کی تدریجی ترقی کے لیے ضروری

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: کمی ہو جائے اور اس کی وجہ سے زرعی پیداوار کی قیمتیں گر جائیں۔

ہے متزلزل کر دے گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس قسم کا اعلیٰ محصول، مزدوروں کے انتشار کا باعث ہو۔ اس لیے کہ غیر امتیازی تامین کی پیدا شدہ خطرناک گرم بازاری کے دور میں مزدوروں کو مستحکم صنعتوں سے ہٹ کر غیر مستحکم صنعتوں میں جانے کی ترغیب و کشش ہوگی، اور وہ ایسے بھنور میں گھر جائیں گے جس میں جلد یا بدیر ان کی تباہی یقینی ہے۔

امتیازی تامین کی بابتہ مالی کمیشن کے پیش کئے ہوئے مندرجہ ذیل عام اصول کو مجلس کروڑگیری (Tariff Board.) کی رہنمائی کی غرض سے اختیار کرایا گیا ہے۔ مجلس کروڑگیری ۱۹۲۴ء میں اس غرض سے قایم کی گئی کہ مختلف صنعتوں کی طرف سے تامین کے جو دعوے وقتاً فوقتاً پیش ہوں ان کی تحقیقات کرے[1]۔

ا۔ صنعت ایسی ہونی چاہئے جو فطری سہولتیں رکھتی ہو، مثلاً اشیاء خام کی وافر رسد، ارزاں قوت، مزدوروں کی کافی رسد اور ایک بڑا داخلی بازار۔ کوئی صنعت جو کسی قسم کی تقابلی سہولتیں نہ رکھتی ہو دنیا کی کامیاب صنعتوں سے برابر کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔ اس لحاظ سے ان فطری سہولتوں کا احتیاط کے ساتھ تجزیہ کرنا چاہئے جو کسی ہندوستانی صنعت کو حاصل ہوں تاکہ بحد ممکنہ یہ اطمینان ہو جائے کہ کسی ایسی صنعت کو تامین نہ دی جائے گی جو قوم پر مستقل بار ہونے والی ہو۔

۲۔ صنعت ایسی ہونی چاہیے جس کی نشوونما یا تو تامین کے سہارے بغیر قطعی ناممکن ہو یا اتنی تیز رفتار سے ممکن نہ ہو جو ملک کے اغراض کے لیے مناسب ہو۔

۳۔ صنعت ایسی ہونی چاہئے جو آخر میں چلکر، تامین کے بغیر، عالمی مسابقت کا سامنا کر سکے[2]۔

---

[1] یہ امر قابل ذکر ہے کہ امتیازی تامین یوں تو غالباً نئی اصطلاح ہے لیکن اس کے اختیار کیئے ہوئے اصول نئے نہیں ہیں۔

[2] بعض نقاد یہ خیال کرتے رہیں کہ ”امتیازی تامین“ کی ایسی پالیسی اختیار کرنے کا عملی نتیجہ یہ رونما ہوا کہ

دوسرے ضمنی مشورے بھی دئے جاتے ہیں؛ مثلاً یہ کہ قانون بحیثیت حاصل کی تابع صنعتوں کو جن سے ملک کی کل ضرورتیں جلد پوری ہونے کی توقع ہو، تامین دینا مناسب ہوگا۔ دوسری طرف عام قاعدہ یہ ہونا چاہئے کہ ایسی صنعت کو تامین نہ دی جائے جو آیندہ بھی ملک کی طلب کے ایک حقیر جزو سے زیادہ کو پورا نہ کرسکے۔ ممکن ہے ایک صنعت کو تامین دینے سے دوسری کو نقصان پہنچے لیکن محض اسی بنیاد پر کسی صنعت کو تامین دینے سے لازمی طور پر انکار نہ کرنا چاہئے اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ بحیثیت مجموعی خالص فایدہ زیادہ ہو۔ اگر ملک کے عام مفاد کی خاطر مرتب کی ہوئی پالیسی متقاضی ہو تو صارفوں کی طرح کبھی کبھی دولت پیدا کرنے والوں کو بھی اپنا مفاد قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہئے۔

بعض اوقات ممکن ہے کہ غیر ملکی اشیا کی بھرمار روکنے کے لیے تامینی مسلک اختیار کرنا یا تامینی محصول بڑھانا پڑے۔ اگر یہ بات اچھی طرح ثابت ہوجائے کہ اشیا کی بھرمار ہو رہی ہے اور اس کی وجہ سے کسی ایسی صنعت کو نقصان پہنچ رہا ہے جس کی خوش حالی پر قومی خوش حالی کا انحصار ہے تو بھرمار کو روکنے کے لیے ایک خاص محصول ضروری ہوسکتا ہے۔ علیٰ ہذا اسی قسم کی کارروائی کسی ایسے ملک کی اشیا کے خلاف بھی حق بجانب ہوسکتی ہے جس کے زر کی قدر بری طرح گری ہوئی ہو اور جو اس کی بنا پر اپنی اشیا کو کسی غیر ملک کے نسبتاً مستحکم زر کے مبادلے میں ادنیٰ قیمتوں پر فروخت کرے۔ آخر میں سرکاری مالی امداد سے پرورش پائی ہوئی غیر ملکی اشیا کے ایک میں داخل ہونے سے مخصوص تامینی تدابیر کا اختیار کرنا

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ، حکومت نے تامین دینے سے غیر امتیازی طور پر انکار کر دیا۔ بہرحال اگر یہ سچ ہے کہ حکومت نے غیر ضروری احتیاط سے کام کیا تو اس کا الزام "امتیازی تامین" کے اصول پر نہیں دھرا جاسکتا اس لیے کہ "امتیازی تامین" کے اصول ضرورت سے زیادہ تامین اور ضرورت سے کم تامین دونوں سے تضاد رکھتے ہیں۔

ضروری ہو سکتا ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہمارے ملک کے قانون میں بھی گنجایش موجود ہے۔ چنانچہ ایکٹ ۱۴ بابتہ ۱۸۹۹ء کی رو سے یہ قرار دیا گیا ہے کہ "جب کوئی ملک اپنی اشیا کی برآمد کے لیے براہ راست یا بالواسطہ مالی امداد دیے رہا ہو تو گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل اس امر کے مجاز ہیں کہ جریدۂ اعلامیہ ہند (گزٹ آف انڈیا) میں اعلان کے ذریعے ہندوستان میں ان اشیا کی درآمد پر اتنا محصول عاید کریں جو اس مالی امداد کی خالص مقدار کے مساوی ہو"

مالی کمیشن یہ خیال کرتا ہے کہ عام طور پر نوخیز صنعتیں ہی تامین کی مستحق قرار پائیں گی۔ لیکن کمیشن نے اس امر کو بھی تسلیم کیا کہ کبھی کبھی ایسی صورتیں رونما ہو سکتی ہیں جبکہ ایک طاقت ور اور مستحکم صنعت کی تامین بھی حق بجانب ثابت کی جا سکتی ہے۔ اس تامین میں غرض صرف یہ ہوگی کہ صنعت کو اس قابل بنا یا جائے کہ وہ اس عارضی کساد بازاری کے دور سے جو اس کے قابو سے باہر اسباب کے باعث رونما ہو صحیح سلامت نکل آئے۔ اس لحاظ سے اس بارے میں کوئی عام اور قطعی قاعدہ مقرر نہیں کیا جا سکتا کہ تامین نشو و نما کی کس منزل پر حق بجانب ہے۔

رہا قطعی نئی صنعتوں کا معاملہ تو ان کے بارے میں کمیشن کے ارکان یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ حقیقی واقعات کو نظر انداز کرنا اور نئے کاروبار کے بانیوں کی محض توقعات پر تامین دینا حد سے زیادہ خطرہ مول لینا ہے۔ لیکن سچ پوچھو تو پہلے سے موجودہ صنعتوں کے بارے میں بھی جھنجھٹوں اور غیر یقینی امور سے پوری طرح بچنا ناممکن ہوگا۔ چنانچہ مجلس کردڑگیری (ٹیرف بورڈ) سے بھی یہی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ تامین کی درخواست کرنے والوں کی اسی امید اور قیاس پر اپنا فیصلہ صادر کرے گی کہ تامین کی بدولت ان کی صنعت ترقی کرے گی اور آخر کار اپنے بل بوتے پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائے گی۔ اس میں کلام نہیں کہ صنعت پہلے سے قایم ہونے کی وجہ سے اس کے متعلق کچھ ٹھوس مواد ملے گا اور اس حد تک اس کے مستقبل کے پیش اندازے میں

قیاس کو کم دخل ہوگا۔ البتہ قیاس کا عنصر اس وقت زیادہ ہوگا جبکہ تامین کسی صنعت کو اس غرض سے دینا مقصود ہو کہ وہ اپنے یہاں کسی جدید شعبے کو ترقی دے سکے۔ چنانچہ کمشن کے اراکین کسی صنعت کو اس بنیاد پر تامین دینے کے مخالف نہیں ہیں[1]۔ اس طرح ظاہر ہے کہ تامین کے ہر معاملے میں قیاس اور عدم تیقن کا عنصر کم و بیش ہمیشہ موجود رہے گا۔ کسی بالکل نئی صنعت کے بارے میں بھی یہ ہو سکتا ہے کہ دوسرے ملکوں سے جہاں یہ صنعت مستحکم طور پر قایم ہو معتبر مواد ایسی نوعیت کا مل جائے جس سے ہمارے یہاں اس صنعت کی کامیابی کی بابت زیادہ شبہے کی گنجایش باقی نہ رہے۔ مالی کمیشن یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ عام طور پر نئی صنعتوں کو تامین دینا نہ صرف قابل اعتراض بلکہ غیر ضروری بھی ہوگا؛ اس لیے کہ مالی ضرورتیں حکومت کو مجبور کریں گی کہ آمدنی کی خاطر خاصے بھاری محصول کی عام سطح برقرار رکھے، اور یہی محصول صنعت کے ابتدائی زمانے میں تامین کا پوری طرح کام دے گا۔ لیکن اس خیال میں صنعت کی داغ بیل ڈالنے کی مشکلات کا اندازہ کسی قدر گھٹا کر کیا گیا ہے؛ اور اس واقعے کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ بعض صورتوں میں ممکن ہے کہ کسی ہونہار صنعت کی ابتدائی منزلوں میں مابعد منزلوں کے مقابلے میں بہت زیادہ مشکلات پیش آئیں۔ اور اس طرح صنعت کی داغ بیل ڈالنے سے پیشتر ہی اس کی ضرورت ہو کہ اس کو حکومت کی طرف سے معقول امداد کا یقین دلایا جائے۔ یہ اصول کہ حکومت کسی نئے کاروبار کی سرپرستی کی خاطر قرضہ دینے والے بنک کے لیے مطلوبہ ضمانتیں فراہم کرے (دیکھو جلد اول باب ۱۳) جس کو اکثر حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے، اس اصول سے دراصل مختلف نہیں ہے کہ ایسے کاروبار کا تامین کے مد نظر لحاظ کیا جائے۔ چنانچہ دونوں صورتوں میں یہی نکتہ قابل غور رہے گا کہ آیا صنعت مذکورۂ بالا عام شرایط کو پورا کرتی ہے یا نہیں۔ بہرحال

[1] دیکھو مالی کمیشن کی رپورٹ فقرہ (۱۰۰)۔

مالی کمیشن کا یہ مشورہ کہ نئی صنعتوں کو محصول کے ذریعے تامین دینے کی بجائے عام طور پر مالی امداد دی جائے۔ درست اور معقول معلوم ہوتا ہے؛ اس لیے کہ جب تک کوئی صنعت ملک کی جملہ ضرورتوں کے بڑے حصے کو پورا نہ کر رہی ہو اس کی تامین کے خیال سے محصول عائد کرنا گویا صارف کو حد سے زیادہ زیر بار کر دینا ہے۔

اس امر کا فیصلہ کر لینے کے بعد کہ کسی صنعت کو تامین دیدی جائے۔ دوسرا اہم تصفیہ طلب مسئلہ شرح تامین کا تعین ہے۔ اگر بہت بھاری محصول لگایا جائے تو وہ سراسر مضر ہوگا۔ صنعت کو اتنی کامل تامین نہ دینی چاہیئے کہ وہ آیندہ جد وجہد ترک کر دے۔ اس کو دراصل محرک کی ضرورت ہے نہ کہ مسکن کی۔ محصول کی شرح کو افراط و تفریط سے بچا کر حد اعتدال پر رکھنا بہت مشکل کام ہے اور اس سلسلے میں مصارف کے مسئلے پر نہایت احتیاط کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس امر کا اطمینان کر لینا ہوگا کہ ہندوستان میں مصارف پیدائش کے نسبتہً زیادہ ہونے کا تمامتر باعث کہیں خراب کارکردگی یا دوسرے ایسے اسباب تو نہیں ہیں جن کو بآسانی دور کیا جا سکتا ہو۔ علاوہ ازیں ہندوستان اور غیر ممالک کے مصارف پیدائش کا مقابلہ کرنے کے لیے متوسط درجے کے کارخانوں کو لینا ہوگا اور ایسے کارخانوں کو چھوڑ دینا ہوگا جن کی کارکردگی معمولی طور پر عمدہ کارگزاری والے کارخانوں سے بڑھیا یا گھٹیا معیار کی ہو۔ تامینی محصول کی شرح کے تقرر میں صارف کی سہولت کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ممکن ہے کہ

لہ قاری کو مصارف پیدائش کے تجزیے کی پیچیدگی کا تصور قایم کرنے کی غرض سے حسب ذیل کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے مثلاً سرجے۔ سی۔ کویاجی کی تصنیف موسوم بہ "ہندوستانی مالی مسئلہ" صفحہ ۲۹ تا صفحہ ۴۳، بی۔ جی۔ کالے کی کتاب موسوم بہ "ہندی معاشیات تامین" اور (۳) سی۔ این۔ ونکیل اور ایم۔ سی منشی کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان کی صنعتی پالیسی کروڑگیری کے خاص تعلق سے" صفحہ ۲۱ تا صفحہ ۵۸، نیز مجلس کروڑگیری (ٹیرف بورڈ) کی مختلف رپورٹیں۔

اعلیٰ شرح مقرر کرنے میں یہ فائدہ ہو کہ صنعت کی ترقی کی رفتار تیز ہو جائے۔ لیکن اس کے باوجود قیمتوں کے ناواجب اضافے کو روکنے کی خاطر شرح کو کم رکھنا ہی زیادہ مناسب ہوگا، اور اس طرح مقابلۃً سُست رفتار ترقی قبول کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔[1]

۱۰۔ تامین کے خطرات

مالی کمیشن، لالہ ہرکشن لال کے اس مقولے کو کہ "شیر خوار کو پالو پوسو، بچے کو سہارا دو اور بالغ کو آزادیٔ عمل دو" بہ نظر پسندیدگی نقل کرتا ہے، بایں خیال کہ وہ صحیح اصول تامین کا لب لباب ہے۔ اس مقولے کا آخری جزو یعنی "بالغ کو آزادیٔ عمل دو" تامین کے نہایت پیچیدہ اور مشکل مسایل میں سے ایک ہے۔ اس لیے کہ اگر بالغ کو آزادیٔ عمل دینے اور ان تامینی بندشوں کو ہٹانے کی کوشش کی جائے گی جن کو وہ بحیثیت مجموعی بہت آرام دہ پاتا ہے تو ممکن ہے کہ اس کو ناگوار ہو اور وہ مزاحمت کرے۔ جب کوئی صنعت تامین کے تحت آجائے تو وہ فطری طور پر یہی کوشش کرے گی کہ اس سہولت کو تا حد امکان

[1] اس سلسلے میں اس ہندوستانی برطانوی معاہدے کی دفعہ (۳) کی جانب توجہ منعطف کرانا مناسب ہوگا جو ملک معظم کی حکومت اور حکومت ہند کے درمیان ۱۹۳۵ء کے اوائل میں طے پایا تھا۔ (یہ معاہدہ ۱۹۳۲ء کے معاہدۂ اوٹاوا کے نفاذ کے دوران میں نافذ رہنے والا تھا) حکومت ہند نے اس دفعہ کی رو سے اس امر کی ذمہ داری لی کہ کسی صنعت کو صرف اسی حد تک تامین دی جائے گی جس کی بنا پر درآمدی اشیا کی قیمتیں اسی قسم کی ہندوستانی اشیا کی قیمت فروخت کے مساوی ہو جائیں اور تامینی محصول کی شرح اس سے زیادہ نہ بڑھائی جائے گی۔ چنانچہ اسی مقصد کے مدنظر ایک ہدایت اس مخصوص مجلس کروڑگیری کے موضوع تحقیق میں شامل کی گئی جو حکومت ہند کی جانب سے ۱۰؍ستمبر ۱۹۳۵ء کو اس غرض سے مقرر کی گئی تھی کہ سلطنت متحدہ کے سوتی پارچوں کی درآمد کے مقابلے میں ہندوستانی سوتی صنعت پارچہ بافی کی تامین کے بارے میں تحقیق کرے اور رپورٹ پیش کرے۔ مجلس کو اس سے قبل کے زمانے میں یہ اختیار دیا گیا تھا کہ کسی صنعت کو کافی و شافی تامین دینے کے بارے میں اپنی صوابدید کے مطابق عمل کرے۔

اپنے لیے برقرار رکھے، اور اس غرض سے ممکن ہے کہ وہ مختلف طریقوں کے منجملہ ایک طریقہ یہ اختیار کرلے کہ اپنی خوش حالی کو چھپائے اور خود کو بے سہارا اور بے وسیلہ ثابت کرے۔ لیکن اس میں یہ خطرہ ہے کہ اس کے قول کے مطابق بناوٹی حالت اصلی سمجھ لی جاسکتی ہے اور تامین اس بنا پر ہٹالی جاسکتی ہے کہ صنعت کو اس سے فایدہ نہیں ہوا۔ دوسرا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ تامینی محصول کو کم کرنے یا ہٹالینے والی مقتدر جماعت پر سیاسی ڈباو ڈالا جائے۔ تامین دیتے وقت ہی تامین کی کوئی قطعی میعاد مقرر کرنا اس لیے ناقابل عمل ہے کہ صنعت کو متاثر کرنے والے حالات کے بدستور قایم رہنے کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اگر حالات یکسر بدل جائیں تو صورت حال پر مکرر غور کرنا اور غالباً تامین کی میعاد میں توسیع کرنا ضروری ہوگا۔

مالی کمیشن یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ معقول نگرانی کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ٹیرف بورڈ تامین یافتہ صنعت کی وقتاً فوقتاً جانچ پڑتال کیا کرے اور مدلل سفارشیں پیش کرے کہ آیا محصول جاری رکھا جائے یا ہٹالیا جائے، اور اگر جاری رکھا جائے تو آیا شرح میں ترمیم کی جائے یا نہیں۔

اس کام کو کارگر طریقے پر بے رو و رعایت اور غیر جانب داری کے ساتھ انجام دینے کے لیے معاشی نظریے اور واقعات کی مکمل معلومات کے علاوہ نادر عقلی و اخلاقی اوصاف کی بھی ضرورت ہے۔ پس مجلس کروڑگیری کے ارکان کا انتخاب تاحد امکان انتہائی احتیاط سے کرنا چاہیے۔ تامین کی کامیابی کا انحصار اس بورڈ کے طریقۂ کار پر ہے، اس لیے کہ مجلس کروڑگیری کو بروقت غیبی تائید کرنے والا وسیلہ بنادیا گیا ہے جس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ہر مشکل کو جو تامینی پالسی کو بروے عمل لانے میں رونما ہو آسان اور حل کردے گا۔[۱]

---

[۱] مسٹر این ایس سبا راؤ نے انڈین اکنامک کانفرنس کے اجلاس منعقدہ الہ آباد ۱۹۲۹ء کے صدارتی خطبے میں یہ مشورہ دیا کہ ریاست ہاے متحدہ امریکا کے ٹیرف کمیشن اور وفاقی تجارتی کمیشن جیسی مستقل

بورڈ کی راہ میں اصلی دشواری اس وقت رونما ہوگی جب تامینی محصول کی آڑ میں اغراض قائمہ رونما ہوں گے جو خود غرضانہ رنگ میں اور ملک کے عام مفاد کے خلاف محصول میں الٹ پھیر کی کوشش کرینگے۔ ہمارے ملک اور دوسرے ملکوں کا تجربہ یہ بتلاتا ہے کہ ایک کارگزار اور دیانت دار عدلیہ وجود میں آسکتا ہے بشرطیکہ اس معاملے پر سنجیدہ طور پر توجہ کی جائے۔ پس جب ہائی کورٹ اور بے میل عدلیہ قایم کیا جا سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک کارداں اور بے لاگ ٹیرف بورڈ کے قایم ہونے میں ناکامی ہو۔ لیکن اس سے زیادہ مشکل معاملہ ایک ایسی مجلس قانون ساز اور حکومت کا قایم کرنا ہے جو ملک میں تامین کی پالیسی مرتب کرنے میں مخصوص اغراض کو مفادات سے متاثر نہ ہو۔ اکثر ملکوں میں جہاں تامین اختیار کی گئی، محصول کے آئین و قوانین غرض مند جماعتوں کی باہمی کشمکش کا نتیجہ ہیں، اور شاذ ہی ایسا ہوا ہے کہ وضع قوانین کے وقت ملک کے عام مفاد کی خاطر کوئی باضابطہ نظام العمل پیش نظر رہا ہو۔ لیکن مالی کمیشن یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ چونکہ ہندوستانی مجلس قانون ساز میں مختلف مفادات کی نمائندگی ہوگی اور زراعت اور جائداد کے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:- جماعتوں کے نمونے پر جو ایک وسیع اور جامع نظام العمل ترتیب دیکر تحقیق کا کام کرتی ہیں، ہندوستانی ٹیرف بورڈ کو بھی ایک قومی مجلس معاشیات (National Economic Board) میں مبدل کر دیا جائے۔ ٹیرف بورڈ کو مناسب طریقے پر وسیع کیا جا سکتا ہے اور اس بات کا مجاز گردانا جا سکتا ہے کہ ذیلی کمیٹیوں اور منفرد ماہر محققوں کا تقرر کرے۔ بورڈ کو یہ اختیار حاصل ہونا چاہئے کہ اپنے طور پر جانچ اور تحقیق کرکے حکومت کے سامنے وقتاً فوقتاً سفارشیں پیش کرے۔ یہ طریقہ موجودہ سرسری و سطحی طریق تحقیق کی جگہ لے گا، منظم معاشی نشوونما کی جانب رہنمائی کرے گا اور ملک کے صنعتی نظام میں ضروری تغیر و ترمیم کرنے کی سہولتیں بہم پہنچائے گا۔ سر ایچ پی مودی نے مارچ ۱۹۳۶ء میں مجلس قانون ساز میں یہ تحریک پیش کی کہ ٹیرف بورڈ کے طریق کار کی نظر ثانی و اصلاح کی جائے تاکہ وہ "برطانوی مشاورتی مجلس درآمدی محصولات" کی طرح جلد اور موثر کارروائی کرسکے۔

مفادات کو ان مجلسوں میں مستقل طور پر اہم حیثیت حاصل رہے گی' اس لیے ہندوستان میں سیاسی بدمعاملگی کا اس قدر خطرہ نہیں ہے جتنا کہ بعض دوسرے ملکوں میں۔ یہ تخیل' صورت حال کے بارے میں غالباً بیجا رجائیت پر مبنی ہے اور سیاسی بدمعاملگی کے خطروں کا اندازہ گھٹا کر کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تامین کے تحت تقویت پانے والے مفادات کو اپنے مخالف مفادات کے مقابلے میں زیادہ وسیع ذرایع اور بہتر تنظیم پر دست رس حاصل ہوگی اور موخر الذکر اس درجہ مختلف النوع ہوں گے کہ کوئی کارگر اتحاد قایم نہ کر سکیں گے۔ بہر نوع جب کہ جو کھم کا کام کیا گیا ہے تو ان سب خطروں کا مقابلہ کرنا ہی ہوگا' البتہ خصوصی مراعات چاہنے والی صنعتوں کے حالات کی جب ٹیرف بورڈ تحقیق کرے تو اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونی چاہئے۔ اس سے بدمعاملگی کا خطرہ کم ہو جائے گا بشرطیکہ عوام کافی تربیت یافتہ اور خبردار ہوں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہونا چاہیے کہ صارف طاقت ور اتحادات میں منظم ہونے کی کوشش کریں اور اس طرح تامین کو جائز حدود کے اندر رکھنے میں مدد دیں۔

سیاسی بدمعاملگی کے علاوہ ایک اور نقص بھی ہے جس سے بچاؤ کی تدبیر کرنا ضروری ہے' اور وہ تامین کے تحت صناعوں کے اتحادات کی ترقی ہے اس صورت میں بھی ٹیرف بورڈ کے سر پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس امر کا اطمینان کرے کہ اتحاد جو رونما ہوا ہے وہ دراصل ملک کے حق میں نقصان رساں ہے یا نہیں' اور اگر یہ اطمینان ہو جائے کہ نقصان رساں ہے تو تامینی محصول کو کم کرنے یا ہٹا لینے کی سفارش پیش کرے۔

١١۔ تامینی برآمدی محصول　صنعت میں استعمال ہونے والی خام اشیاء کی آزادانہ برآمد پر بندشیں عائد کرنے کے معاشی اثرات کے متعلق کسی اور سلسلے میں کچھ بحث ہو چکی ہے اور یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ برآمدی محصول سے صناعوں کو کوئی قابل لحاظ فائدہ نہیں پہنچتا اور خام اشیاء تیار کرنے والے کو غیر متناسب نقصان پہنچ جاتا ہے۔ چونکہ اشیاء کی قیمت مصنوعہ شئے کے کل مصارف کا بہت ہی حقیر جزو ہوتی ہے اس لیے ملکی صناع کے فایدے کی خاطر

مصنوعہ شے کے مصارف میں مقابلتہً خفیف فرق پیدا کرنے کے لیے بھی برآمدی محصول کو بہت ہی اعلیٰ رکھنا ہوگا اور خام اشیاء تیار کرنے والوں کی مشکلات اس قدر بڑھ جائیں گی کہ تامینی طریق اس نہج پر اختیار کرنے کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں اگر کسی خاص صنعت کے لیے تامین ضروری ہو تو اس کا بار تا حد امکان پوری قوم پر ڈالنا چاہیئے۔ یہ غلط اصول ہے کہ تامین یافتہ صنعت کے فائدے کی خاطر صرف کسی ایک خاص جماعت کو زیر بار کیا جائے۔ چنانچہ جیسا کہ ہم پہلے مشورہ دے چکے ہیں برآمدی محصول پر سرکاری رقمی امداد اور تامینی محصول درآمد کو ترجیح دینی چاہیئے۔ برآمدی محصول اس وجہ سے بھی قابل اعتراض ہے کہ اس کی وجہ سے غیر ملکی بازاروں سے سراسر محروم ہو جانے کا اندیشہ ہے جیسا کہ شورے کی بابتہ ہمیں تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔

۱۲۔ تامین کے علاوہ دوسرے لوازم ہندوستان نے تامینی طریق کو اس لیے اختیار کیا ہے کہ یہ صنعتوں کی نشوونما کی رفتار کو بڑھانے میں لازمی طور پر مدد دے گا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ محض آئین و قوانین وضع کر کے کسی قوم کو دولتمند اور خوش حال بنایا جا سکتا ہے اور نہ تامین ہی کوئی جادو کی چھڑی ہے کہ کسی ملک کے دقیانوسی نظام کو جدید ترین ترقی یافتہ نظام میں مبدل کر دے[1]۔ اگر کسی ملک میں جدید طرز کی معاشی زندگی کے ناگزیر لوازم مثلاً بنک کاری کا موثر نظام، نقل و حمل کا مناسب طور پر ترقی یافتہ انتظام، ریل اور جہاز کے کرایوں کے بارے میں ہمدردانہ پالیسی، فروخت کا کارگر انتظام، تجارتی و صنعتی معلومات کی فراہمی کا معقول انتظام وغیرہ خاصے ترقی یافتہ نہ ہوں، تو ایسا ملک تامین کے باوجود معاشی حیثیت سے ہمیشہ پس ماندہ حالت میں رہے گا۔

۱۳۔ تعلیم سب سے زیادہ اس چیز کی ضرورت ہے کہ تمام

[1] دیکھو کویاجی کی کتاب محولہ بالا صفحہ ۴۳ تا صفحہ ۴۴۔

طبقوں کے ہندوستانی اپنا مطمح نظر بدل ڈالیں[1]۔ ہندوستانی زمانۂ دراز سے ان فاسد خیالات کے زیر اثر رہے ہیں کہ افلاس ناگزیر ہے اور یہ کہ سر برآوردہ

[1] ڈاکٹر الفریڈ مارشل سے ان کے ایک قدیم شاگرد نے پوچھا کہ ہندوستان کے لیے تامین اختیار کرنے کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے تو ڈاکٹر موصوف نے جواب میں لکھا کہ "مجھے نوخیز ہندوستانی صنعتوں کی تامین پر اصولی لحاظ سے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے محصول کروڑگیری ایک بیش خرچ طریقہ ہے، اور موجودہ حالات کے تحت وہ ہندوستانی اصل داروں کے بجاے یورپی اصل داروں کو مالا مال کر دے گا۔ پس میں یہ خیال کرتا ہوں کہ دوسرے طریقوں کی آزمائش ہونے تک اس کو بر دئے عمل نہ لانا چاہئے۔ یعنی جب تک وہ صنعتیں جو مصارف نقل و حمل (اور بعض صورتوں میں دہرے مصارف نقل و حمل) کی بنا پر بہت ہی اعلیٰ تامین پا رہی ہیں ہندوستانی کاروباری اولوالعزمی و حوصلہ مندی کو ابھارنے میں کامیاب نہ ہوں، اس وقت تک کروڑگیری یا تامینی محصول عائد نہ کرنا چاہئے۔ جن مثالوں سے میری خاص طور پر مراد ہے وہ چرم کا غذ اور روغن دار تخم کی صنعتیں ہیں۔ اگر ہندوستان کو مسٹر ٹاٹا جیسے دس بیس آدمی نصیب ہوتے اور چند ہزار اشخاص ایسے بھی ہوتے جو جاپانیوں کی طرح حقائق سے دلچسپی رکھتے، میدان سیاسیات اور عدالتوں میں نری تقریربازیوں سے سخت نفرت کرتے، اور دماغ کو "خیالات" سے پر رکھ کر عملی کام کرنے کو برا نہ جانتے تو ہندوستان بہت جلد ایک بڑی قوم بن جاتا۔ پھر اس کو کوئی روک نہیں سکتا کوئی محصول اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہو سکتا، وہ اپنا ترکہ پا کر رہے گا لیکن جب تک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوستانی اپنا وقت شائستہ راحت و آرام میں گزارے گا اور مقدمہ بازیوں سے کسب معاش کرے گا جو ملک کے حق میں ایسی ہی غیر مفید ہیں۔ جیسے کہ سمندر کے ساحل کی ریت۔ اس وقت تک ہندوستان کے لیے کوئی تدبیر کارگر اور مفید نہیں ہو سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ بمبئی کے سوتی کپڑے کی گرنیوں سے قطع نظر جو در اصل پارسیوں کی بنائی ہوئی ہیں۔ اور چند کارخانوں کو مستثنیٰ کر کے جو ٹاٹا کی نگرانی میں چل رہے ہیں، جملہ کاروبار اب بھی یوروپین ہاتھوں ہی میں ہیں، حالانکہ یوروپی باشندوں کے نوخیز بچوں کے لیے ہندوستان کی آب و ہوا کا ناموافق اور غیر صحت بخش ہونا یورپی کاروبار کے مقابلے میں ہندوستانی کاروبار کے حق میں پچاس تا سو فی صدی تامینی محصول کا اثر رکھتا ہے۔ کیمبرج میں ۲۰ سال سے

یورپی قوموں نے دولت اور صنعتی عظمت جس درجے تک حاصل کی ہے وہاں تک ہندوستان کی رسائی محال ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج کل ہندوستانیوں میں خود اعتمادی اور بلند حوصلگی کا خاص طور پر فقدان ہے اور یہ سب خرابیاں زیادہ تر موجودہ ناقص تعلیمی نظام سے منسوب کی جا سکتی ہیں۔ ہندوستان میں ایک زمانہ دراز سے تعلیمی مباحث کا پامال موضوع یہ بنا ہوا ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام از سرتاپا ادبی اور نظری ہے اور یہ کہ اس میں زیادہ عملی رجحان پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ ہر قسم کی تعلیم دستی محنت سے کراہت پیدا کرتی ہے، اس لیے کہ اس کے برخلاف ایک معقول نظام تعلیم میں اس بات کا خاص لحاظ رہے گا کہ محنت کی حرمت کے اصول پر کافی زور دیا جائے۔ صحیح تعلیمی اسکیم کے بنیادی اصول میں سے ایک یہ ہوگا کہ طالب علم کو اپنے ہاتھوں اور اپنی آنکھوں سے حتی الامکان زیادہ کام لینے کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ نقشہ کشی اور دستی تربیت جیسے صـ۱۴۱

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:- ہندوستانیوں پر یہ زور دے رہا ہوں کہ وہ اپنے وطنی بھائیوں سے پوچھیں کہ مغرب کو جاننے والوں میں کتنے کم لوگ ایسے ہیں جو اپنی انفرادی تربیت و شایستگی کے سوا کسی دوسرے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوں!! کیا ایک جاپانی اپنی ذات سے ہمیشہ یہ سوال نہیں کرتا کہ وہاں سے لوٹنے پر وہ اپنے ملک کی مفید خدمت انجام دینے کے لیے اپنی قابلیت کو کس طرح بڑھا اور ترقی دے سکتا ہے؟ کیا وہ حقیقی تعلیم حاصل نہیں کرتا؟ کیا وہ مغربی ملکوں کی قوت کی بنیادوں پر غور و فکر نہیں کرتا؟ کیا جاپان کی تیز ترقی کا یہی اصلی سبب نہیں ہے؟ کیا ہم جاپان کی تقلید نہیں کر سکتے؟ کیا جاپانیوں کی طرح ہم میں بھی صرف ایک تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے کہ پہلے اپنے ملک کا خیال کریں اور اس کے بہت بعد اپنا' (دیکھو اے سی پیگو کی کتاب موسوم بہ سوانح الفریڈ مارشل صـ۲۷۴ (Memoirs of Alfred Marshall)۔ خواہ اچھا ہو یا برا (ہماری رائے میں تو بحیثیت مجموعی اچھا ہی ہے کہ) ہندوستان نے تامین اختیار کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے تاہم ڈاکٹر مارشل کے الفاظ غور و فکر کے مستحق ہیں اس لیے کہ تامین ہو یا نہ ہو کوئی قابل لحاظ معاشی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ ڈاکٹر مارشل کے بیان کے مطابق قومی خصایل و عادات کی خرابیاں دور نہ ہوں۔

مضامین جو اس نقطۂ نظر سے بہت قابل قدر ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے نصاب میں داخل کرنے چاہئیں۔ کسی قسم کی تعلیم نہ پانے یا نامناسب قسم کی تعلیم سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے ایک تو مزدور کی کارکردگی خراب ہوتی ہے اور اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، دوسرے یہ کہ مزدور میں اصلاح و ترقی کی خواہش مردہ ہو جاتی ہے۔ تعلیم، مزدور کی احتیاجات کو ترقی دے گی، ان کی تکمیل کے لیئے زیادہ اور بہتر کام کرنے کی ترغیب و تحریص دلائے گی اور اس کے معیار زندگی کو از سرتا پا بلند کر دے گی۔ ہندوستانی صنعتیں جن مشکلات کے تحت کام کر رہی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ بامہارت مزدوروں، سپروائزروں اور نائکوں (فورمن) کو عام طور پر باہر سے بلانا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح طلب کئے ہوئے مزدور مہنگے پڑتے ہیں کیونکہ ان کو اجرت بڑھی ہوئی شرح سے دینی پڑتی ہے اور اس کے علاوہ انھیں وطن لوٹ آنے کے لیے بھی مصارف برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ مالی کمیشن نے یہ سفارش پیش کی تھی کہ حکومت غیر ملکی کارخانوں کو بڑی فرمائش بھیجے تو ان کی تکمیل کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ بھی قرار دے کہ وہ ہندوستانی کارآموزوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کریں۔ بامہارت مزدوروں، سپروائزروں، اور نائکوں (فورمین) کے علاوہ منتظموں کا بھی ہندوستانی ہونا ضروری ہے ہندوستانیوں کو فنی تربیت کے لیے سرکاری وظائف دے کر باہر بھیجنے سے ملک کی ضرورتیں تمام و کمال پوری نہیں ہو سکتیں۔ اس دشواری کا واحد حقیقی حل یہ ہے کہ ملک ہی میں ہر درجے کی فنی درسگاہیں قایم کی جائیں، تا کہ ہندوستانی صنعتوں کے لیے ہر قسم کے غیر ملکی مزدوروں سے بے نیاز بننا ممکن ہو۔ صنعتی مسائل کی تحقیق اہم ترین کام ہے، اور اس مقصد کے لیے ضروری ادارے، خانگی یا سرکاری خرچ سے قایم کرنے چاہئیں۔ صنعتی ترقی کے لیے نری فنی معلومات ہی کافی نہیں ہیں بلکہ اس سے زیادہ کچھ اور بھی درکار ہے۔ صنعتی دوڑ میں ملک کی رہنمائی کرنے اور اس کو دوسری قوموں کے قدم بقدم چلانے کے لیے صاحب بصیرت، باہمت اور انتظامی قابلیت

رکھنے والے اشخاص کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے کہ تجارتی کالجوں کی تعداد بڑھانے سے اس قسم کے اشخاص کو خود شناسی کا موقع ملے۔ اس خصوص میں موجودہ کمی کا باعث کم از کم ایک حد تک یہ واقعہ ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام نے ان اوصاف کو ابھارنے اور اجاگر کرنے کی طرف کوئی خاص توجہ ہی نہیں کی ہے جو کاروباری شخص کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری ہیں۔ تعلیم کی انتہائی ادبی نوعیت جس کا مقصد ابتداءً محض حکومت کی انتظامی ضرورتوں کو پورا کرنا تھا اس اعتبار سے کسی حد تک گھٹ گئی ہے کہ ہمارے مدرسوں اور جامعوں میں جدید سائنس کی تعلیم کو روزافزوں اہمیت دی جارہی ہے۔ چنانچہ تجربہ خانوں میں قدرتی طور پر حقایق سے دوچار ہونے اور دلائل کی عملی طور پر تصدیق کرنے کے مواقع ملتے ہیں، جن سے انسان کے خیالات اور افعال پر صریح اثر پڑتا ہے، اور وہ ان سے مفید عملی میدانوں میں کام لے سکتے ہیں
تجارتی وفنی مدرسوں اور کالجوں کے ذریعے سے بھی یہی مفید نتیجہ پیدا ہونا چاہئے۔ ۱۵
کشاکش حیات کی روزافزوں شدت، تعلیم یافتہ طبقوں کو رفتہ رفتہ اس بات پر مجبور کر رہی ہے کہ وہ سرکاری ملازمت کی جستجو کے بجائے کاروبار کو اپنا مشغلۂ زندگی بنائیں اس لیے کہ طیلسانین کی غیر محدود تعداد کو سرکاری ملازمت ملنا ممکن نہیں ہے۔ صنعتوں کی نشوونما کی بدولت متعدد راستوں کے کھل جانے کی وجہ سے سرکاری ملازمت اور طب، وقانون جیسے پر، پیشوں کی کشش کم ہوجائے گی۔ ان سب تبدیلیوں کا آغاز تو ہوچکا ہے لیکن برائے نام ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اب جس رفتار کے ساتھ یہ تبدیلیاں ہو رہی ہیں اس سے زیادہ سرعت کے ساتھ عمل میں لائی جائیں۔ اس کے لیے زوردار کوششیں درکار ہیں، تاکہ تعلیمی وصنعتی سہولتوں کی اصلاح وتوسیع ہوسکے۔

۱۴۔ ہندوستان میں صنعتی تعلیم کا موقف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کی ضرورت واہمیت کو حکومت ہند نے ابتداءً ۱۸۸۸ء میں محسوس کیا تھا جبکہ اس معاملے کے متعلق ایک قرارداد جاری کی گئی تھی

اور صوبہ وار حکومتوں سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ اس معاملے میں مناسب کارروائی کریں۔ لیکن اس کا عملی نتیجہ تقریباً صفر رہا۔ اور سارے ملک میں وکٹوریا جوبلی ٹکنکل انسٹیٹیوٹ ہی ایک ایسا ادارہ تھا جو زمانۂ دراز تک اکیلا کام کرتا رہا۔ یہ ادارہ ۱۸۸۷ء میں بمبی میں زیادہ تر خانگی کوششوں سے اس لیے قایم کیا گیا تھا کہ گرنی کی ترقی پذیر مقامی صنعت کی ضرورتوں کے مطابق تعلیمی نصاب مہیا کرے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں ہندوستانی تعلیمی نظام کے نقائص کی تحقیق کی غرض سے لارڈ کرزن نے ماہران تعلیم کی ایک کانفرنس شملے میں منعقد کی جس میں فنی تعلیم کا سوال مکرر اٹھایا گیا لیکن اس کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ جامعات میں سائنس کی تعلیم کے انتظامات میں کچھ اصلاح و ترقی ہوئی اور ہندوستانیوں کو امریکا اور انگلستان بھیجنے کے لیے حکومت ہند کی جانب سے چند فنی وظائف مقرر کیے گیے لیکن یہ طریقہ بھی کچھ کامیاب ثابت نہیں ہوا جس کے کئی اسباب تھے مثلاً ایک تو غیر موزوں امیدواروں کا انتخاب دوسرے صنعتوں کے طریقہ کار اور نظم کے متعلق حقیقی عملی معلومات حاصل کرنے میں ہندوستانی طلبا کی مشکلات اور تیسرے ان کی واپسی پر ان کو مناسب ملازمت مہیا کرنے کی دشواری حال ہی میں ان وظائف کے متعلق قواعد پر نظر ثانی کی گئی ہے تاکہ اس قسم کی چند خرابیوں کو دور کیا جائے۔

کچھ سال ادھر فنی اور عام تعلیم کے مسئلے کو قومی مباحث میں نمایاں جگہ حاصل رہی۔ چنانچہ صنعتی کمیشن (سنہ ۱۹۱۶ء۔ سنہ ۱۹۱۸ء) کلکتہ یونیورسٹی سیاڈلر کمیشن (سنہ ۱۹۱۷ تا ۱۹۱۹ء) اور حکومت بمبی کی مقرر کی ہوئی کمیٹی (سنہ ۱۹۲۱ء) نے اس مسئلے کی تفصیلات پر اپنی پوری توجہ صرف کی۔ صنعتی کمیشن نے کئی سفارشیں پیش کیں مثلاً (۱) مقامی حکومتیں اور ذی اقتدار حکام، دست کار اور مزدور پیشہ آبادی کے لیے ابتدائی تعلیم کا ایک ایسا مناسب نظام مرتب کریں جس میں صنعتی رنگ غالب ہو۔ اگر ان آجروں کو مالی امداد دی جائے صـ۱۹ جو اپنے مزدوروں کے فائدہ کے لیے تعلیمی سہولتیں مہیا کریں۔ (۲) محکمۂ

صنعت و حرفت کی زیر نگرانی گھریلو صنعتوں کے لیے صنعتی یا حرفتی مدرسے کھولے جائیں اور (۳) منظم صنعتوں کے لیے مزدوروں کی تربیت کا انتظام کیا جائے۔ منظم صنعتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک تو دستی و رزی صنعتیں (Manipulative Industries) مثلاً میکانکی، انجنیری، اور دوسرے غیر دستی و ذہنی یا عاملی صنعتیں (Non-manipulative Industries or Operative Industries) مثلاً کیمیائی اشیا کی صنعت۔ یہ مشورہ بھی دیا گیا ہے کہ فورمین کو عملی تعلیم کارخانوں ہی میں دی جائے اور انہی سے نظری تعلیم کی جماعتیں وابستہ کی جائیں؛ اگرچہ پارچہ بافی جیسی صنعت کے لیے ان کو ایسے فنی مدارس میں تعلیم دینا مناسب ہوگا جن سے کارخانے ملحق ہوں۔ عاملی صنعتوں کے لیے صناعیاتی (فنی) مدرسے کھولے جائیں اور عملی تجربہ فیکٹری میں حاصل کرنے کا انتظام کیا جائے۔ صنعتی کمیشن نے یہ بھی سفارش کی کہ موجودہ صوبہ واری اداروں کے علاوہ دو مرکزی کالج قایم کیے جائیں جن میں سے ایک تو انجنیری کی بہت ہی اعلیٰ تعلیم کے لیے ہو اور دوسرا فلزیات اور معدنی صناعیات کے لیے[1]۔

سنہ ۱۹۱۹ء کی "اصلاحات" کے تحت تعلیم کا محکمہ صوبہ واری حکومتوں کو منتقل کر دیا گیا اور صوبہ واری محکمہ جات صنعت و حرفت، صنعتی و فنی تعلیم کی ترقی و توسیع کی نگرانی کرنے لگے۔ لیکن مالی مشکلات کے باعث اب تک کوئی قابل لحاظ نتائج حاصل نہیں ہوئے ہیں۔ ابتدائی تعلیم بھی بہت دھیمی ترقی کر رہی ہے حالانکہ مختلف صوبوں میں اختیاری اور جبری ابتدائی تعلیم کے قوانین منظور کیے جا چکے ہیں اور سنہ ۱۹۲۲ء کے فیکٹری ایکٹ کی رو سے فیکٹریوں میں کام کرنے والے بچوں کی عمر کا معیار بڑھا دیا گیا ہے۔ فنی تعلیم اور صنعتی تربیت کو زیادہ وسیع بنانے کی ضرورت کو

---

[1] "ہندوستانی مدرسۂ معادن" (Indian School of mines) دھنباد میں سنہ ۱۹۲۶ء کے آخر میں اس غرض سے کھولا گیا کہ معدنی انجنیروں اور ماہران ارضیات کی تربیت گاہ کا کام دے سکے۔

تسلیم کرتے ہوئے حکومت بمبی نے فنی وصنعتی تعلیم کے بارے میں فروری ۱۹۲۱ء میں ایک کمیٹی مقرر کی اس کمیٹی نے دو رپورٹیں پیش کیں جن میں سے ایک تو یورپی اکثریت کی تھی اور دوسری ہندوستانی اقلیت کی کمیٹی کے صدر سر ام وسویسوریا اقلیت کی تائید میں تھے۔ ان دونوں جماعتوں میں اصل اختلاف اداروں کی نوعیت، تربیت پانے والے طلبا کی تعداد، مصارف کے اندازے اور اس تجویز کو بروئے کار لانے کے انتظام اور وسایل کے بارے میں تھا۔ اکثریت نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "نوجوانوں کو عملی تعلیم دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ کارآموزی کے مدرسے کھولے جائیں جو بڑے کارخانوں اور فیکٹریوں سے ملحق رہیں" اور ان مدرسوں میں تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد اندازاً ۶۰۰ مقرر کی[1]۔ اقلیت نے یہ اعتراض کیا کہ اس وقت جو چند فیکٹریاں اور کارخانے موجود ہیں ان سے جز وقتی مدرسے ملحق کرنا گو مفید ضرور ہوگا لیکن ان مدرسوں میں طلبا کی جو تعداد تعلیم حاصل کرے گی وہ بالکل ناکافی ہوگی چنانچہ اقلیت نے یہ تجویز پیش کی کہ موجودہ طریقے کی توسیع اور اصلاح کی جائے وہ اس طرح کہ ان میں کام کرنے والے ہمہ وقتی صنعتی مدرسے کھولے جائیں جن سے کارخانے اور تجربہ خانے ملحق ہوں اور جہاں کم و بیش ۳۱۰۰ طالب علم تعلیم حاصل کر سکیں۔

اکثریت کی رپورٹ میں جو محدود پیمانے پر تجویز پیش کی گئی تھی اس کو بھی عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا اگرچہ محکمہ صنعت و حرفت کے قائم کیے ہوئے پارچہ بافی کے مدرسے دستی پارچہ بافی کی صنعت کو برابر مدد دے رہے ہیں۔

[1] اکثریت نے یہ بھی سفارش کی کہ فیکٹریوں میں کام کرنے والے بچوں یا نصف وقت کام کرنے والوں کو معمولی لکھنے پڑھنے کی تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے جس میں صنعتی رنگ غالب ہو گو حکومت پر واجب ہے کہ آجروں کے اس کام کو آغاز کرنے میں ان کی ہمت افزائی کرے۔ لیکن ایسی تعلیم دینے کا کام حکومت اپنے ذمے لے اور اگر ممکن ہو تو اس قسم کی تعلیم کو مفت اور جبری کر دے۔

اس طرح عام فنی اور تجارتی تعلیم کی حالت غیر اطمینان بخش ہے اور حکومت کی طرف سے یا نجی کوششوں سے جو کچھ بھی انتظامات کیئے گئے ہیں وہ ملک کی وسعت اور کثیر ضرورتوں کے لحاظ سے بالکل ناکافی ہیں۔ چنانچہ ہارٹوگ کمیٹی کا بھی یہی خیال ہے کہ "فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے جو کچھ بھی کوششیں کی گئی ہیں وہ تعلیمی نظام سے بہت کم ربط رکھتی ہیں اور اس لحاظ سے بڑی حد تک لاحاصل ہیں[1]"

۱۵۔ اشیاء کی خریداری کی پالیسی۔ ہندوستان کے مختلف سرکاری محکموں اور ریلوں کے لیے ہمہ اقسام کی اشیاء کثیر مقدار میں خریدی جاتی ہیں، اور کچھ سال ادھر تک ان اشیاء کا بڑا حصہ غیر ممالک سے اور وہ بھی زیادہ تر انگلستان سے دفتر ہند واقع لندن کے محکمۂ خرید اشیاء کی وساطت سے درآمد کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس طریق پر حکومت نے سنہ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۵ء میں ۷ کروڑ روپیے، سنہ ۱۹۲۱ء میں ۲۵ء۱۶ کروڑ روپیے اور ۱۹۲۸ء تا سنہ ۱۹۲۹ء میں ۰۹ء۱۰ کروڑ روپیے کی اشیاء درآمد کیں۔ لیکن حالیہ سالوں میں جو اشیاء درآمد کی گئیں ان کی مجموعی قیمت بہت ہی کم رہی مثلاً سنہ ۱۹۳۱ء تا سنہ ۱۹۳۲ء میں ۲۷ء۴ کروڑ روپیے سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء میں ۹۵ء۱ کروڑ روپیہ اور سنہ ۱۹۳۶ء تا سنہ ۱۹۳۷ء میں ۴۸ء۲ کروڑ روپیہ ملکی صنعتوں کی ہمت افزائی کا ایک طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس قسم کی اشیاء امکانی حد تک ملک کے اندر خریدی جائیں۔ لیکن اس اصول کو دوسرے بہت سے عمدہ اصولوں کی طرح بہت زمانہ پہلے مان تو لیا گیا تھا لیکن

[1] پیشہ ورانہ اور فنی تعلیم کے متعلق اعداد و شمار کے لیے دیکھو ہارٹوگ کمیٹی کی رپورٹ یا جیسا کہ اس کا مفصل نام ہے
Review of the Growth of Education in British India by the Auxiliary Committee appointed by the Statutory (Simon) Commission Appendix IV.

نیز ملاحظہ ہو انڈین ایر بک بابتہ ۱۹۳۷ء صفحہ ۲۷۱ تا صفحہ ۲۷۲۔

عمل میں نہیں لایا گیا۔ حکومت نے قریب قریب ۵۰ سال پیشتر یہ پالیسی قرار دی تھی کہ سرکاری اغراض کے لیے بدیسی ساخت کی اشیاء یا مصنوعات کی بجائے دیسی اشیاء اور مصنوعات خریدی جائیں۔ اشیاء کی خریداری کے متعلق قواعد بنائے گئے اور ان کی وقتاً فوقتاً نظر ثانی بھی کی گئی۔ چنانچہ ان کی رو سے یہ لازم تھا کہ بعض شرایط مثلاً عام خوبی وغیرہ کے تابع ان اشیاء کو ترجیح دی جائے جو سراسر یا جزوی طور پر ہندوستان میں تیار کی گئی ہوں۔ جب ہندوستان ہی میں اشیاء دستیاب ہوں اور وہ اتنی ہی عمدہ اور ارزاں ہوں جتنی کہ بدیسی اشیاء تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں دیسی اشیاء کو ترجیح دینی چاہئے۔ بعض لوگ اس سے بھی ایک قدم آگے جاتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ دیسی مصنوعات ہی کو ترجیح دی جائے خواہ ان کی قیمت بدیسی اشیاء سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو، لیکن ایسی پالیسی ٹیکس ادا کرنے والوں پر زائد بار عائد کردے گی بلکہ سچ پوچھو تو تامین دینے کے مساوی ہوگی۔ لہٰذا قبل اس کے کہ اس مسلک کے تحت کسی خاص صنعت کے حق میں کارروائی کی جائے جس سے حکومت کے مصارف میں کثیر اضافہ کا احتمال ہو مناسب یہ ہے کہ ٹیرف بورڈ کو اس بارے میں اظہار رائے کا موقع دیا جائے۔ بہرحال اس مسئلے پر تامین کے مذکورہ بالا اصول کی روشنی میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ بات واضح نہیں ہے کہ مذکورہ بالا قواعد کا کہاں تک یہ منشاء ہے کہ ہندوستانی اشیاء کی خریداری کو ترجیح دینی چاہئے، خواہ ان کی قیمت نسبتہً بہت زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔[1]

---

[1] اس مسئلے کے متعلق ۱۹۲۳ء میں ایک سرکاری قرارداد جاری کی گئی جس میں حسب ذیل ہدایتیں تھیں:- "حکومت ہند کے محکمہ یا ان محکموں کے خاص طور پر مجاز عہدے دار یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ اس قسم کی تدبیریں حق بجانب ہیں ہندوستانی اشیاء یا مصنوعات کو قیمت کے اعتبار سے محدود دائرے میں ترجیح دے سکتے ہیں۔ چنانچہ مذکورۂ بالا امور کے تابع خریداری کرنے میں حسب ذیل اشیاء کو ترجیح دی جائے گی:- (۱) ہندوستانی خام اشیاء کو یا ہندوستانی خام مال سے تیار کی ہوئی ہندوستانی

منشاء خواہ کچھ ہی ہو صنعتی کمیشن کی تحقیق سے یہ بات معلوم ہوئی کہ عملی طور پر برطانوی اشیاء ہی کو ترجیح دی جاتی تھی، حالانکہ ہندوستانی صناع بھی ان کی سربراہی، قیمت اور خوبی کے لحاظ سے، مساوی عمدگی کے ساتھ کرسکتے تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی صناعوں کو سرکاری محکموں کے فرمائشات پورا کرنے کے لیے دفتر ہند کے محکمۂ خرید اشیا واقع لندن کے وصول کردہ ٹنڈروں سے مسابقت کرتے وقت اور بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ حکومت اشیاء کی خریداری کے قواعد کو کام میں لانے سے قاصر رہی اور ملک میں مصنوعات تیار کرنے کی جو قابلیت تھی اس سے پوری طرح استفادہ نہیں کیا۔ حکومت نے اس کوتاہی کو حق بجانب تو نہیں ٹھیرایا لیکن یہ کہہ کر اپنی براءت کی کوشش ضروری کی کہ ہندوستان کے افسر فرمائشات کو مشورہ اور ہدایت دینے کے لیے کوئی نگراں محکمہ یا ایجنسی موجود نہ تھی؛ اور اس لیے یہ افسر تمام جھگڑوں اور ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے دفتر ہند واقع لندن کے محکمۂ خرید اشیاء کو فرمائش روانہ کردیتا تھا۔ اس تاویل سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ماہرانہ مشورہ حاصل کرنے کے لیے کیوں ضروری تدابیر اختیار نہیں کی گئیں؟ اس کے علاوہ یہ تاویل ان معترضین کو مطمئن نہیں کرسکتی جو یہ الزام لگاتے ہیں کہ حکومت لاپروا ہے اور اس کا طرز عمل قومیت کے منافی ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ مصنوعات کو غیر ممالک سے درآمد کئے ہوئے خام مال سے کلاً یا جزواً تیار کی ہوئی ہندوستانی مصنوعات یا غیر ملکی مصنوعات کے مقابلے میں بشرطیکہ متعلقہ کام کے لیے وہ (اول الذکر) کافی اچھی ہوں۔ (۲) درآمدہ خام اشیاء سے کلاً یا جزواً تیار کی ہوئی ہندوستانی مصنوعات کو غیر ملکی مصنوعات پر بشرطیکہ وہ متعلقہ کام کے لیے کافی اچھی ہوں۔ (۳) غیر ملکی مصنوعات کے موجودہ ذخیرے کو ان ملکی مصنوعات پر جن کا خاص طور پر درآمد کرنا ضروری ہو بشرطیکہ وہ مناسب قسم کی ہوں اور مطلوبہ خوبی رکھتی ہوں۔ (۴) غیر ملکی مصنوعات کو جن کا کسی خاص وجہ سے درآمد کرنا ضروری ہو"۔ ریلوے بورڈ بھی ریلوں کی طرف سے اشیاء کی خریدی میں اسی قسم کی پالیسی پر عمل کرتا ہے۔

ہندوستانی صنعتی کمیشن نے اس خیال پر زور دیا کہ اشیار کی خریداری کی پالیسی کو اس طرح منضبط کرنا چاہیے کہ وہ ہندوستانی صنعتوں کے حق میں محرک ثابت ہو۔ اگر "بے رو و رعایت" پالیسی بھی اختیار کی جائے اور ہندوستانی مصنوعات کو کوئی تامینی ترجیح نہ دی جائے تو بھی ملکی صنعتوں کو حکومت سے بڑی مقدار میں فرمائشوں کا ملنا ایک ایسی سہولت ہے جو بجائے خود صنعتوں کے حق میں اہم اور قابل قدر محرک ثابت ہوگی۔ علاوہ ازیں، جیسا کہ صنعتی کمیشن نے بتلایا ہے اگر فرمائش بھیجنے کے طریق کی اصلاح کے متعلق بعض مشورے مان لیے جائیں تو، صرف موجودہ صنعتیں ہی فائدہ نہ اٹھائیں گی بلکہ نئی صنعتیں بھی قایم کی جا سکیں گی۔ چنانچہ اگر ایک ہی مقررہ قسم کی اشیار کی فرمائشوں میں غیر ضروری تنوع کو روا رکھنے کی بجائے معیاری نمونے اختیار کیے جائیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معیاری نمونے کی اشیار بڑی مقدار میں طلب کی جائیں گی جس کو پورا کرنے کے لیے ہندوستان ہی میں کوئی خاص کارخانہ یا پلانٹ نفع کے ساتھ قایم کیا جا سکتا ہے۔

جوں جوں صنعتی نشو و نما کی رفتار بڑھتی جا رہی ہے حکومت کے لیے یہ زیادہ سے زیادہ ممکن ہوتا جا رہا ہے کہ اپنی ضرورتوں کو مقامی صنعتوں کے ذریعے پورا کرے، خاص کر اس لیے بھی کہ ہندوستانی رسد کے ذرائع اور ان کی بازاری قیمتوں کے متعلق معلومات نہ ملنے کی دشواری اور نگران محکمہ کی عدم موجودگی کی دقت کو رفع کرنے کے لیے اب انتظامات کر دیے گئے ہیں۔ صنعتی کمیشن کی سفارش کے مطابق ایک مجلس خرید اشیار قایم ہوگئی ہے اور اس نے کمیشن مذکور کے اس مشورے کی تائید کی کہ ساری اشیار کی جانچ کی غرض سے ماہروں کی ایک مرکزی ایجنسی قایم کی جائے۔ چنانچہ ایک محکمہ بنام "ہندوستانی محکمۂ خرید اشیا" قایم ہوگیا ہے۔ اگرچہ یہ محکمہ حکومت ہند کے تحت ہے لیکن صوبوں کی حکومتیں، بلدیے، بندرگاہوں کے محکمے، کمپنیوں کے زیر نگرانی ریلیں اور دوسرے سرکاری اور نیم سرکاری ادارے اور دیسی ریاستیں بھی اس کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ موجودہ

انتظام کے تحت محکمۂ خرید اشیا کے بڑے عہدہ داروں میں صدر مہتمم خرید اشیاء، ناظم تنقیح، ناظم خرید و معلومات اور نائب ناظم خرید (پارچہ جات) شامل ہیں۔ یہ محکمہ مشیرانہ حیثیت سے خریداری اور نگرانی کا کام کرتا ہے فرمایشوں کو اس غرض سے جانچتا ہے کہ ملکی ساخت کی اشیا کی خریداری قیمت و خوبی کے شرائط کے لحاظ سے ممکن ہو تو غیر ملکوں کو فرمایشوں کی روانگی روک دے۔ بعض خاص قسم کی ہندوستانی اشیاء کو خریدتا اور ان کا معائنہ کرتا ہے، اشیاء کی خریداری اور قیمتوں کے متعلق جملہ معاملات کے بارے میں مرکزی محکمۂ معلومات کے طور پر کام کرتا ہے، اور دوسرے ایسے اہم فرائض انجام دیتا ہے جن سے ہندوستانی صنعتوں کی ہمت افزائی ہو۔ محکمۂ خرید اشیاء کی مقامی شاخیں کلکتہ اور بمبئی میں اور معائنہ کی ایجنسیاں مدراس، بمبئی، کراچی، کانپور اور دہلی میں قایم کی گئی ہیں۔ محکمۂ خرید اشیاء نے بیرونی کارخانوں سے مسابقت کرنے والے ہندوستانی کارخانوں کی ہمت افزائی اور سہولت کی خاطر ہندوستان میں مال لاکر پہنچانے کے لیے روپے کی شکل میں ٹنڈر طلب کرنے کی پالیسی اختیار کی ہے اور اس کو بتدریج ترقی دے رہا ہے۔ روپیہ کے ٹنڈر کے طریقے کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے حکومت ہند کے ہائی کمشنر مقیم لندن کے مشاورتی انجنیروں کو ماہرانہ مشورہ دینے کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ چنانچہ اسی غرض سے ان کے دفتر کی ایک شاخ کلکتے میں کھول دی گئی ہے۔ محکمۂ خرید اشیاء کے کام کا ایک اہم جزو یہ ہے کہ وہ ملکی اشیاء کی رسد کے امکانات کی مسلسل تحقیقات کرتا رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں منظورہ ٹھیکہ داروں کی فہرست میں مستقل اضافہ ہو رہا ہے۔

محکمۂ خرید اشیاء نے حکومت کی پالیسی کی اتباع میں جس کا اعلان سنہ ۱۹۲۰ء میں کیا گیا تھا کامل یا جزوی ہندوستانی ساخت کی اشیاء جن کی قیمت ۵۶ء۱۵ کروڑ روپے تھی سنہ ۱۹۲۸ء تا سنہ ۱۹۳۶ء کے آٹھ سالوں میں سرکاری اغراض کے لیے خریدیں[1]۔

[1] دیکھو ایک رپورٹ موسومہ بہ "حکومت کا عمل صنعتوں کے بارے میں" سنہ ۱۹۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء صفحہ ۲۷۔

۱۶۔ محکمۂ تحقیقات صنعت

انڈین انڈسٹریز کانفرنس نے جو جولائی ۱۹۳۴ء میں منعقد ہوئی اپنے پانچویں اجلاس میں ایک مرکزی محکمۂ صنعتی معلومات و تحقیقات قایم کرنے کی تجویز پر غور کیا تاکہ تحقیقات کو منظم کیا جائے۔ یہ محکمہ جواب "محکمۂ صنعتی تحقیقات" کے نام سے موسوم ہے اپریل ۱۹۳۵ء میں قایم ہوا اور تحقیقات کے لیے اس کی ایک شاخ علی پور میں کھولی گئی۔ اس محکمے کو ہندوستانی محکمۂ خرید اشیاء سے ملحق کر دیا گیا ہے اور اس کے مصارف تین سال کے لیے پانچ لاکھ روپے منظور کئے گئے ہیں[1]۔ صنعتی معلومات کی فراہمی اور اشاعت، صنعتی تحقیق میں متعلقہ صنعت سے تعاون کرنا، صنعتوں میں معیاریت پیدا کرنا اور صنعتی نمایشوں کے انتظام میں مشورہ اور مدد دینے کی غرض سے موزوں اطلاعی پرچے اور اعلامیے شایع کرنا، یہ سب اس سررشتے کے فرایض میں داخل ہیں۔ ایسے مرکزی ادارے کی ضرورت اور صنعتی تحقیق کی اہمیت کو جس قدر بڑھا کر بیان کیا جائے کم ہے۔

۱۷۔ صوبہ واری محکمہ جات صنعت و حرفت کا کام۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ صنعتی کمیشن کی سفارش کے مطابق صوبہ واری محکمہ جات صنعت و حرفت قایم ہوئے[2]۔ ان محکموں کا اہم کام تین حصوں میں منقسم ہے۔ (۱) فنی و صنعتی تعلیم کو فروغ و ترقی دینا، (۲) صنعتی معلومات بہم پہنچانا اور (۳) نہ صرف صنعتوں کو بلکہ صنعتی بھنڈاروں اور نمایشوں کو مالی امداد دینا[3]۔ لیکن ان محکموں کی جد و جہد بڑے پیمانے کی صنعت کی بجائے

---

[1] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "حکومت کا عمل صنعتوں کے بارے میں" ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۵ء صفحہ ۴۷۔

[2] دیکھو جلد اول باب ۱۲ فصل ۴۔

[3] مختلف صوبوں میں جو کام ہوا اس کی تفصیل کے لیے دیکھو اے۔ جی۔ کلو کی کتاب موسوم "حکومت اور صنعت"۔ نیز ایک رپورٹ موسوم بہ "حکومت کا عمل صنعتوں کے بارے میں" ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۵ء۔

زیادہ تر گھریلو اور دیہی صنعتوں کے لیے وقف ہے[1]۔ صنعتی محکموں نے اس طریقے اور پیمانے پر ترقی نہیں کی جس کی صنعتی کمیشن کو توقع تھی جس کی وجہ یہ ہوئی کہ روپے کی قلت رہی اور کمیشن مذکور کے قائم ہونے کے بعد سے صنعتی حالات میں بھی بہت بڑا تغیر ہوا۔ ۱۹۱۹ئہ کے دستوری تغیرات نے صنعت کو نشو ونما دینے کی ذمہ داری زیادہ تر صوبوں پر عائد کردی۔ اس کی وجہ سے بھی ایک باقاعدہ اور جامع صنعتی پالسی اختیار کرنے میں رکاوٹیں پیدا ہوگئیں۔ لیکن کل ہند صنعتی کانفرنس کے سالانہ جلسوں کی وجہ سے جن میں صوبوں کے صنعتی محکموں کے وزیروں اور ناظموں کے علاوہ بعض دیسی ریاستوں کے نمایندے بھی شریک ہوتے ہیں ایک حد تک مفید اتحاد عمل اور ربط پیدا ہوگیا ہے۔ دوسرے صوبوں کے مقابلے میں صوبۂ بنگال کے محکمۂ صنعت و حرفت کی جد و جہد زیادہ کامیاب رہی ہے۔ اس کے مکمل عملے اور کلکتے میں تحقیق کے لیے ایک تجربے خانے کے افتتاح پر نظر کرتے ہوئے خیال کیا جاسکتا ہے کہ یہ محکمہ اس پالسی کو عملی جامہ پہنا سکے گا۔ جس کی سفارش صنعتی کمیشن نے کی ہے۔ بنگال کے صنعتی ماہر کیمیا نے اس صوبے کی خام اشیا کے بہتر استفادے کے متعلق بہت سی تحقیقاتیں کی ہیں۔ بنگال کی درس گاہ دباغت، مقامی چرم اور دباغی کے متعلق تحقیقاتی کام کر رہی ہے۔ بنگال، صوبۂ متحدہ اور مدراس کی صنعتی تحقیق بھی قابل ذکر ہے۔ بعض صوبوں میں مظاہرے کی غرض سے نمونے کے کارخانے کھولے گئے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ان میں سے چند ہی کامیاب ثابت ہوئے ہیں؛ مثلاً مدراس میں روشنائی کی صنعت؛ باقی کارخانے مثلاً لاہور کا سرکاری دباغت خانہ اور صوبۂ متحدہ کا پھرکی کا کارخانہ، ناکام رہے۔

ہم ان قوانین کا ذکر کر چکے ہیں جو بعض صوبہ واری مجالس قانون ساز نے

---

[1] اس جد و جہد پر آیندہ باب میں تبصرہ کیا گیا ہے۔

نے صنعتوں کی مالی امداد کے لیے منظور کئے ہیں۔ اسی طرح کے قوانین مدراس پنجاب، بہار اور اڑیسہ میں ۱۹۲۳ء سے نافذ ہیں۔ بنگال اور صوبۂ متوسط میں قوانین علی الترتیب ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۳ء میں منظور ہوئے۔ ان قوانین کے تحت خانگی افراد کو اس غرض سے قرضے دیے جاسکتے ہیں کہ وہ بعض شرائط کے تابع نئی صنعتیں جاری کریں۔ یہ قوانین اپنے عمل درآمد میں بڑے پیمانے کی صنعتوں کے بجائے دراصل چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے حق میں زیادہ مفید ثابت ہوئے ہیں[1]۔ کرناٹک پیپر ملز (مدراس) اور انڈین اسٹیل وائر پروڈکٹس لمیٹڈ[2] (بہار و اڑیسہ) جیسے بڑے کارخانوں کو جو چند بڑے قرضے دیئے گئے وہ ناکام ثابت ہوئے۔ البتہ اس ناکامی نے یہ واضح کردیا کہ بڑی صنعتوں کو قرضہ دینے کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے خاص تدبیریں درکار ہیں۔

محکمۂ صنعت و حرفت مدراس کی شایع کردہ مارچ ۱۹۳۵ء کو ختم ہونے والے سال کی رپورٹ میں اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ گو صنعتوں کی سرکاری امداد کا قانون بارہ سال تک نافذ رہا لیکن یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اس قانون نے اس مدت میں صنعتی ترقی کے محرک کے طور پر کوئی قابل لحاظ کامیابی حاصل کی۔ اس رپورٹ میں یہ مشورہ بھی دیا گیا ہے کہ صوبۂ متحدہ کی تقلید میں ایک مخصوص کمیٹی قائم کرنی چاہیے جو صنعتوں کو مالی امداد دینے کے بارے میں ایک نئی تجویز مرتب کرے۔ صوبۂ متحدہ کی کمیٹی جو "صنعتوں کی مالی کمیٹی" کے نام سے موسوم ہے ۱۹۳۴ء میں سر ایس، این، پوچ کھانے والا، کی صدارت میں قائم کی گئی تھی۔ اس کمیٹی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ صنعتوں کو براہ راست مالی امداد دینا مناسب

[1] دیکھو ڈی۔ آر۔ گاڈگل کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان کا صنعتی ارتقا" (تیسرا اڈیشن) صفحہ ۲۱۳۔ نیز پانچویں صنعتی کانفرنس ۱۹۳۳ء کی روئداد۔

[2] Indian Steel Wire Products Limited

نہ تھا۔ کمیٹی نے یہ سفارش پیش کی کہ ایک مشترک سرمایہ بنک موسوم بہ "انڈسٹریل کریڈٹ بنک صوبہ متحدہ محدود" کھولا جائے جس کا سرمایہ ۳۵ لاکھ روپے ہو اور جس کے حصص پر حکومت ۲۰ سال کی انتہائی مدت کے لیے بہ معافی محصول چار فی صد مقسوم کی ضمانت دے تاکہ بڑی اور چھوٹی صنعتوں کو طویل المدت اور قلیل المدت قرضے دیے جا سکیں۔ کمیٹی نے یہ مشورہ بھی دیا کہ فروخت کا ایک جدید نظام قائم کیا جائے جو "صوبہ متحدہ کی مالی امداد اور فروخت کے انتظام کی محدود کمپنی" کے نام سے موسوم ہو جو مشترک سرمایے کے اصول پر پانچ لاکھ روپے کے سرمایے سے کام شروع کرے اور جس کے غیر فروخت شدہ حصے خریدنے کا ذمہ دار "انڈسٹریل بنک" کو قرار دیا جائے[1]۔ صوبہ متحدہ کی مجلس قانون ساز نے جون ۱۹۳۶ء میں حکومت کی تجویز کو جو عام طور پر کمیٹی کی سفارشوں کے مطابق تیار کی گئی تھی منظور کر لیا[2]۔ بنگال کی مجلس قانون ساز نے بھی دسمبر ۱۹۳۶ء میں اس بات کو منظور کر لیا کہ ایک انجمن قرضہ بنام "انڈسٹریل کریڈٹ کارپوریشن" قائم کی جائے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ رہا شدہ قیدی یا کوئی بنگالی شہری جو قابل عمل تجاویز پیش کر سکتا ہو چھوٹے پیمانے کی صنعت قائم کرے تو اس کو قرضہ دیا جائے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ صنعتی قرضوں کے متعلق یہ نئے تجربے پیش نظر مقصد کو کس حد تک پورا کرتے ہیں۔

مذکورۂ بالا تبصرے سے یہ بات واضح ہو گی کہ جنگ عظیم کے بعد سے ہندوستان نے صنعتی نشو و نما کے ایک نئے دور میں قدم رکھا ہے۔ مرکزی اور صوبہ واری حکومتوں نے صنعتی ترقی کو منظم اور

---

[1] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "صنعتوں کے بارے میں سرکاری عمل" ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۵ء صفحہ ۴۴۔

[2] اس اسکیم کی مزید تفصیلات باب (۱۰) میں صنعتی مالی امداد کے متعلق فصلوں کی بیان کی گئی ہیں۔

اس کی رفتار کو تیز کرنے کی غرض سے قدیم اصول ”عدم مداخلت“ کی بجائے ”سرگرم مداخلت“ کی پالسی کو اختیار کر لیا ہے۔

دوسرا باب

ہندوستانی صنعتیں: قدیم وجدید

۱- اس باب کا موضوع

ہندوستانی صنعتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) وہ صنعتیں جن میں کام کرنے والا اپنے ہی گھر پر کام کرتا ہے۔ چنانچہ ان کو گھریلو صنعتیں کہنا مناسب ہوگا۔ ان کے کاروبار کا پیمانہ چھوٹا اور انتظام مختصر اور محدود ہوتا ہے۔ اور سامان ابھی زیادہ تر مقامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ ایسی صنعتوں کے بارے میں اس باب کے آخر میں بحث کی جائیگی۔ (۲) منظم صنعتیں، جن کا کاروبار مختلف پیمانے کے کارخانوں یا فیکٹریوں میں ہوتا ہے۔ ان میں ایک طرف سیدھے سادے دیہی کارخانے شامل ہیں جن میں صرف جزوی صنعتی کاروبار ہوتا ہے۔ تو دوسری طرف کپڑا بننے کی بڑی گرنیاں اور انجینیری کے ایسے کارخانے ہیں جن میں ہزاروں مزدور کام کرتے ہیں اور مصنوعات کی تیاری اور ان کی فروخت کے لیے باضابطہ تنظیم ہے۔ زراعت کے سلسلے میں متعلقہ منظم صنعتوں مثلاً چائے، قہوہ، نیل اور شکر کا ذکر ہو چکا ہے۔ سردست ہندوستان کی جدید وضع کی منظم صنعتوں کا حال بیان کیا جائے گا تاکہ اس وقت تک جو صنعتی ترقی ہوئی ہے اس کا اندازہ ہو جائے اور ضمناً یہ واضح ہو جائے کہ ٹیرف بورڈ کی رہنمائی میں نئے تاجی نظام سے

کس طریقے پر کام لیا جا رہا ہے۔

۴۔ صنعتی ترقی کے اعداد و شمار

ہندوستان نے صنعتی ترقی کس حد تک کی ہے اس کا اندازہ اعداد و شمار کے مندرجہ ذیل ماخذوں کا بیجا مطالعہ کرنے سے بخوبی ہو سکتا ہے :۔

(۱) ہندوستان کے صنعتی اعداد و شمار جو ۱۹۲۱ء میں فراہم کیے گئے۔
(۲) ایک رپورٹ موسوم بہ "ہندوستان کے بڑے صنعتی کارخانے"
(۳) انڈین فیکٹریز ایکٹ کے تحت ۱۹۳۵ء میں ہندوستانی فیکٹریوں کے اعداد و شمار جو ۱۹۳۳ء ۶۴۳ ہندوستان میں چل رہی تھیں خواہ ان کی رجسٹری ہندوستان میں ہوئی ہو یا بیرون ہندوستان۔

(۱) ہندوستان میں ۱۹۲۱ء میں فراہم کئے ہوئے صنعتی اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ دس سے زیادہ مزدور لگانے والے ۱۵۶۰۶ کارخانے تھے جن میں ۲۶۸۱۱۲۵ مزدور کام کرتے تھے اور ان میں مردوں اور عورتوں کا تناسب ۱۰۰ اور ۳۶ تھا[1]۔ ان صنعتی اعداد و شمار سے زراعت خارج ہے، لیکن قہوہ، چائے، ربر اور نیل کی کاشت نیز کان کنی اور سنگ براری ان میں شامل ہیں۔

جملہ ۸۰۱۵ کارخانے ایک نہ ایک قسم کی قوت محرکہ استعمال کرتے تھے جن کے منجملہ ۵۲۹۲ بھاپ، ۱۳۴۵ تیل، ۱۱۳۷ برقی، ۱۲۵ گیس اور ۸۵ پانی سے کام لیتے تھے۔ برقی قوت کا استعمال بڑھ رہا ہے جیسا کہ گیس اور برقی سے کام لینے والے کارخانوں کی تعداد کے اضافے سے ظاہر ہوتا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں اس قسم کی ۴۲ فیکٹریاں تھیں جن میں ۴۶۸۰ مزدور تھے۔ لیکن ۱۹۲۱ء میں ایسے کارخانوں کی تعداد ۱۸۱ اور ان میں مزدوروں کی تعداد ۱۵۲۰۲ ہو گئی۔

[1] مختلف اقسام کے کارخانوں کے مفصل بیان کے لیے قاری کو ایک کتاب موسوم بہ "اعدادی خلاصہ برائے برطانوی ہند" ۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۹ء جدول نشان ۳۱۵ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

(۲) ہندوستان میں بڑے صنعتی کارخانے ۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار ایک رپورٹ موسوم بہ "۱۹۳۵ء میں ہندوستان کے بڑے صنعتی کارخانے" شائع شدہ ۱۹۳۷ء سے لیے گئے ہیں ۔

۱۹۳۵ء کے بڑے ہندوستانی صنعتی کارخانے

کارخانے کی قسم	کارخانوں کی تعداد	مزدوروں کی تعداد
(۱) پارچہ بافی :-	۷۵۳	۸۲۷۴۴۱
روئی (کاتنے، بننے اور دوسرے کاموں کے کارخانے)	۳۹۸	۵۱۵۸۱۳
سن کی گرنیاں	۱۰۴	۲۸۰۹۶۸
ریشم کی گرنیاں	۴۹	۷۰۵۰
اون کی گرنیاں	۱۵	۶۳۴۶
(۲) انجینیری :-	۸۸۸	۲۲۰۵۸۷
جہاز کی گودیاں اور کارخانے	۱۲	۴۵۳۰
برقی انجینیری کے کارخانے	۶۴	۷۷۲۳
عام انجینیری کے کارخانے	۳۰۵	۴۵۱۱۶
ریلوں کے کارخانے	۱۶۱	۱۱۳۶۱۰
جہاز سازی اور انجینیری کے کارخانے	۱۷	۱۶۵۳۲
(۳) معدنیات اور فلزیات :-	۱۴۴	۵۶،۱۵۹
فلز ڈھالنے کے کارخانے	۷۰	۴،۳۷۱
لوہے اور فولاد کی گرنیاں	۸	۴۶،۶۵۳
پٹرولیم صاف کرنے کے کارخانے	۱۲	۱۱۰۵۰
(۴) ماکولات، مشروبات اور تمباکو :-	۲۹۵۷	۲۵۷،۵۸۴
آٹے کی گرنیاں	۷۲	۵،۹۵۲

کارخانے کی قسم	کارخانوں کی تعداد	مزدوروں کی تعداد
چاول کی گرنیاں	۱۳۸۰	۷۸۹۰۰
شکر کے کارخانے	۱۷۴	۷۲،۹۳۵
چاء کی فیکٹریاں	۹۹۴	۶۶،۳۷۶
تمباکو کی فیکٹریاں	۳۰	۱۱،۹۳۶
(۵) کیمیاوی اشیا، رنگ وغیرہ:-	۵۱۴	۶۴۵۳۹
سوت کی رنگائی اور دھلائی کے کارخانے	۵۳	۷،۳۶۲
کیمیاوی اشیاء	۲۳	۴۱۸۳
دیاسلائی	۶۱	۲۱۴۴۰
روغن نکالنے کی گرنیاں	۲۴۵	۱۴،۹۳۴
(۶) کاغذ وطباعت:-	۴۵۴	۴۸۶۲۲
کاغذ سازی	۹	۶،۶۹۸
طباعت، جلد بندی وغیرہ	۴۲۷	۴۰۲۸۴
کاغذ کا گودا	۱	۶۶۵
(۷) لکڑی، پتھر اور شیشے کے کام:-	۵۳۲	۸۷۰۶۶
ٹائیل اور اینٹوں کی فیکٹریاں	۱۳۸	۱۵۳۱۷
آراکشی کی گرنیاں	۱۴۹	۱۴،۳۳۶
شیشہ سازی کے کارخانے	۵۹	۶۹۵۳
(۸) چرم اور کھال کا کام:-	۶۸	۱۰۲۷۶
چمڑا اور جوتے	۱۱	۴۲۵۰ ص۲۵
دباغت کے کارخانے	۳۰	۴۰۸۹
(۹) بنولہ اوٹنے اور روئی دبانے کے کارخانے:-	۲۷۲۹	۲۱۶۲۳۳
روئی اوٹنے اور گانٹھ بنانے کے کارخانے	۲۵۴۷	۱۸۰۱۵۳
سن دبانے کے کارخانے	۱۰۴	۳۱۸۸۷

کارخانے کی قسم	کارخانوں کی تعداد	مزدوروں کی تعداد
(۱۰) متفرق :-	۲۲۲	۵۲۲۸۵
میزان	۹۲۶۱	۱۸۴۰۷۹۲

ان بڑے صنعتی کارخانوں میں وہ سب فیکٹریاں شامل ہیں جن پر سنہ ۱۹۳۴ء کے ہندوستانی قانون کارخانہ جات کا اطلاق ہوتا ہے ان سے وہ کارخانے خارج ہیں جن میں روزمرہ کام کرنے والے اشخاص کی اوسط تعداد بیس سے کم ہے، البتہ دیسی ریاستوں کے وہ سب کارخانے شامل ہیں جن کے متعلق یہ معلومات فراہم ہوسکے کہ وہ صنعتی حیثیت سے کافی اہم ہیں۔ مندرجہ بالا جدول میں اتا ۱۰ اہم قسم کے کارخانوں کی میزانیں ان کے محاذی درج کی گئی ہیں اور ان کے تحت بڑی بڑی ذیلی قسموں کی تفصیل دی گئی ہے۔ ۹۲۶۱ بڑے صنعتی کارخانوں کے منجملہ ۴۰۰۲ موسمی تھے جن میں ۳۶۳۷۰۳ آدمی کام کر رہے تھے؛ اور ۵۱۷۹ دوامی تھے جن میں ۱۴۷۷۰۸۹ آدمی کام کر رہے تھے۔

(۳) ہندوستانی کارخانے جو ہندوستانی قانون کارخانہ جات کے تحت ہیں ان کے سنہ ۱۹۳۹ء کے اعداد کے مطابق مزدوروں کی مجموعی روزانہ اوسط تعداد ۱۶۱۰۹۳۲ تھی، اور چالو فیکٹریوں کی مجموعی تعداد ۸۸۳۱ تھی، جن کی تقسیم حسب ذیل تھی :-

مدراس ۱۴۹۱؛ بمبئی ۱۷۴۶، بنگال ۱۵۹۵؛ صوبہ متحدہ ۴۹۶؛ پنجاب ۶۶۹؛ برما ۹۶۵؛ بہار و اڑیسہ ۳۱۹؛ صوبہ متوسط و برار ۴۹۶؛ آسام ۷۰۶؛ شمال مغربی سرحدی صوبہ ۲۸؛ بلوچستان ۱۶، اجمیر مارواڑ ۳۸۱، دہلی ۵۵؛ بنگلور اور کرگ ۲۱ - ۸۸۳۱ فیکٹریوں کے منجملہ ۱۶۶۵ فیکٹریاں سال بھر کام کرتی رہیں۔

اور ۱۹۵۴ موسمی تھیں [1]۔

(۴) مشترک سرمایہ کمپنیوں کے اعداد و شمار۔ ہندوستان میں خاص کر جنگ عظیم کے چھڑنے کے بعد سے، صنعت کی توسیع و ترقی کی رفتار کا اندازہ مندرجۂ ذیل اعداد سے ہوسکتا ہے جو ان مشترک سرمایہ کمپنیوں سے متعلق ہیں جن کی رجسٹری برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں میں علی الترتیب ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۵ء اور ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں ہوئی تھی [2]۔

---

[1] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "فیکٹریوں کے اعداد و شمار برائے سال مختتم بہ ۳۱ دسمبر ۱۹۳۵ء" صفحہ ۱، صفحہ ۲۱۔

[2] ہندوستانی ریاستوں کی حد تک صرف فیکٹریوں کی مجموعی تعداد اور ان کے ادا کردہ اصل کی مجموعی تعداد دی گئی ہے۔ لیکن ہر قسم کی کمپنیوں کی ذیلی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں۔ ہندوستان میں جو غیر ملکی اصل مصروف ہے اس کی بحث کرتے وقت ہم ان مشترک سرمایہ کمپنیوں کے اعداد و شمار بھی پیش کرچکے ہیں جو ہندوستان سے باہر رجسٹر ہوئیں لیکن ہندوستان میں کام کر رہی ہیں۔ علاوہ ازیں ہم حسب ذیل امور پر بھی بحث کرچکے ہیں:۔

(۱) جنگ عظیم کے بعد کی صنعتی گرما گرمی؛

(۲) ہندوستان میں اس کے بعد کے زمانے کی تجارتی کساد بازاری اور

(۳) گزشتہ چند سالوں میں بحالی۔ دیکھو جلد اول باب ۱۳ فصل ۵، ۶ اور ۱۴۔

کمپنیوں کی قسم	۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۵ء		۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء	
	تعداد	اداشدہ اصل	تعداد	اداشدہ اصل
		لاکھ روپیہ		لاکھ روپیہ
بنک کاری اور قرضہ	۴۳۶	۷۸۰	۱۷۹۶	۲۹۱۵
بیمہ	۱۸۴	۵۰	۵۹۱	۳۰۳
جہاز رانی	۲۴	۱۲۸	۳۸	۲۷۴
ریلیں اور ٹریم	۴۴	۸۳۰	۴۷	۱۵۱۰
دوسری قسم کے وسایل بار برداری و نقل و حمل	۰	۰	۲۸۱	۳۹۸
تجارت اور مصنوعات کی تیاری	۷۵۴	۱۱۳۲	۳۳۸۸	۹۴۲۱
چائے	۲۰۸	۴۳۱	۴۸۵	۱۳۷۴
دوسری کاشت کی کمپنیاں	۲۹	۴۱	۹۴	۱۸۵
کوئلے کی کان کنی	۱۴۰	۲۰۹	۲۷۵	۷۴۶
سونے کی کان کنی	۸	۳۴	۱	۰
کان کنی اور سنگ براری کی دوسری کمپنیاں۔	۵۷	۵۷۶	۹۸	۲۹۳۴
سوتی کپڑے کی گرنیاں	۳۴	۷۶۱	۶۹	۱۸۷۵
سن کی گرنیاں	۳۴	۷۶۱	۶۹	۱۸۷۵
اون، ریشم اور سن وغیرہ کی گرنیاں	۱۳	۱۲۲	۲۱	۲۴۰
روئی اوٹنے، دبانے اور گانٹھ بنانے کی گرنیاں۔	۰	۰	۱۰۹	۲۳۹
سن دبانے کی کلیں	۱۳۹	۲۷۰	۳۴	۲۰۳
آٹے کی گرنیاں	۳۰	۸۰	۳۰	۱۳۴
چاندا وغیر منقولہ، زمین اور عمارت	۳۲	۲۱۷	۱۵۹	۱۰۷۰

کمپنیوں کی قسم	۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۵ء		۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء	
	تعداد	ادا شدہ اصل	تعداد	ادا شدہ اصل
شکر (بہ شمول گڑ)	۲۲	۸۰	۱۵۳	۴۲۲
دوسری کمپنیاں	۱۲۳	۲۰۵	۵۶۹	۱۰۶۹
میزان (برطانوی ہند)	۲۴۸	۸۰۲۴	۸۵۴۰	۲۸۸۲۵
میزان (ریاستہائے ہند)	۶۵	۹۴	۸۹۴	۱۲۵۶
صدر میزان	۲۵۴۵	۸۰۶۸	۹۴۳۴	۳۰۰۸۱

مذکورۂ بالا اعداد و شمار سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی صنعتیں روز افزوں ترقی کر رہی ہیں اور بڑے پیمانے کی صنعتوں میں بھی خاصی ترقی و توسیع ہوئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان صنعتی حیثیت سے ابھی اس رتبے پر نہیں پہنچا ہے جو مغرب کی ترقی یافتہ قوموں مثلاً جرمنی، ریاستہائے متحدۂ امریکہ اور انگلستان کو حاصل ہو چکا ہے۔ ”ہماری قومی معیشت میں منظم صنعتیں اب بھی کوئی نمایاں حیثیت نہیں رکھتیں اور صنعت پیشہ آبادی کا بہت بڑا حصہ محض سادہ، موسمی، متفرق یا مرمت کی صنعتوں میں کام کرتا ہے۔ جدید وضع کی صنعتوں میں ہندوستان کی جتنی آبادی لگی ہوئی ہے اس میں سے بھی بہت بڑی تعداد ہونے سے روئی اوٹنے اور دبانے کی گرنیوں، سن دبانے کے کارخانوں، چاول اور چوب پیننے کی گرنیوں، انجینیری اور دھات کے کارخانوں میں کام کرتی ہے[1]۔ اس طرح بہ حیثیت مجموعی جدید صنعت میں

[1] ملاحظہ ہو گاڈگل کی تصنیف محولہ بالا، صفحہ ۲۸۲۔

کام کرنے والی آبادی کا تناسب ملک کی کل آبادی کے ۲ فی صد سے بھی کم ہے۔

۳۔ سوت اور سوتی کپڑے کے کارخانے

اب ہم ہندوستان کی ان چند صنعتوں کا حال مختصر طور پر بیان کریں گے جو بڑے پیمانے پر کام کرتی ہیں۔ ہندوستان میں سوتی کپڑے کا پہلا کارخانہ ۱۸۱۸ء میں کلکتے میں کھولا گیا۔ لیکن سوتی کپڑے کے کارخانوں کا مرکز بننا بمبئی کے مقدر میں لکھا تھا جس کا پہلا کارخانہ پارسی جد و جہد کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۵ء سے اس کارخانے میں کام شروع ہوا۔

جزیرۂ بمبئی کا اس صنعت میں مرکزی حیثیت حاصل کرنا قدرتی اور مستقل اسباب سے کہیں زیادہ دوسری سہولتوں کا نتیجہ تھا۔ مثلاً وافر سرمایہ اور اعتبار کی سہولتیں، ارزاں اور تیز رفتار وسائل نقل و حمل کی موجودگی اور کچھ روز کے لیے چین سے سوت کی بڑھتی ہوئی مانگ جس کو بمبئی اپنے محل وقوع کے اعتبار سے خاص سہولت کے ساتھ پورا کرسکتا تھا۔ ۱۸۷۷ء سے اس صنعت کی ترقی کا رخ بدل گیا اور وہ دوسرے مقاموں کو منتقل ہوگئی۔ چنانچہ ملک کے اندرونی مرکزوں مثلاً ناگپور، احمد آباد، شولاپور وغیرہ میں جو روئی پیدا کرنے والے علاقوں کے بیچوں بیچ واقع ہیں کپڑا بننے کی کرنیاں تیزی سے کھلنے لگیں۔ صنعت کے اس طرح منتقل ہونے کے زیادہ قدرتی اسباب تھے مثلاً خام پیداوار کی قربت مزدوروں کی افراط اور بڑی بڑی تجارتی منڈیوں کی موجودگی، اس معاملے میں ریلوں کی توسیع سے اور بھی سہولت ہوگئی۔ موجودہ صدی کے آغاز سے چین کی سوت کی تجارت میں کمی ہوگئی۔ اس سے بھی بمبئی کی نمایاں فوقیت کو صدمہ پہنچا۔ علاوہ ازیں سودیشی کی تحریک سے پارچہ بافی کو احاطۂ بمبئی کے باہر ترقی ہوئی۔ چونکہ حال میں برطانوی ہند میں کارخانوں کے قوانین میں ترقی ہوئی ہے۔ اس لیے یہ صنعت بعض دیسی ریاستوں کو منتقل ہوتی جارہی ہے کیونکہ یہاں کارخانوں کے قوانین نسبتاً نرم ہیں۔

کچھ دنوں سے ہندوستانی گرنیاں اعلیٰ درجے کا مہین سوت زیادہ مقدار میں تیار کرنے کی طرف مایل ہیں۔ چنانچہ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور دوسرے مقامات سے لانبے ریشے کی کپاس اسی لیے درآمد کی جاتی ہے۔ لیکن غیر ملکی کپاس کی گرانی اور نئی کلیں لگانے کے مصارف، مہین سوت کی کتائی میں حایل ہیں۔ لہذا اگر ملک ہی میں عمدہ روئی پیدا کرنے کا انتظام کیا جائے تو یہ دقت دور ہو جائے گی۔

جنگ عظیم نے کچھ ایسے حالات پیدا کر دیے جن سے سوتی کپڑے کی صنعت کو کافی تقویت پہنچی۔ ایک طرف تو حکومت نے جنگ کے مشرقی میدانوں میں سوتی سامان کی حد تک اپنی فوجی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے گرنیوں کی جی کھول کر سرپرستی کی۔ دوسری طرف لنکاشائر کی گرنیاں جنگی ضرورتوں کو پورا کرنے میں مصروف تھیں جس کی وجہ سے ان کے کپڑوں کی درآمد ہندوستان میں بہت کم ہو گئی۔ تیسرے یہ کہ بار برداری کے جہازوں کی قلت کی وجہ سے غیر ملکی کپڑا کافی مہنگا ہو گیا۔ غرض ان سب اسباب سے دیسی پیداوار خاصی بڑھ گئی۔ لیکن اس زمانے میں مشنری درآمد کرنا بہت مشکل تھا۔ اگر یہ رکاوٹ نہ ہوتی تو ترقی کی رفتار اور زیادہ تیز ہوتی بایں ہمہ دیسی سوتی کپڑے کی پیداوار ۱۹۱۳ئہ تا ۱۹۱۴ئہ کے ۱۱۶۴ ملین گز سے ۱۹۱۷ئہ تا ۱۹۱۸ئہ میں ۱۶۱۴ ملین گز تک بڑھ گئی۔ مہین سوت کے بنے ہوئے بڑھیا کپڑے جو جنگ عظیم سے قبل زیادہ تر درآمد کیے جاتے تھے ان کی مقدار میں خاص طور پر اضافہ ہوا۔ ۱۹۳۶ئہ تا ۱۹۳۷ئہ میں ملک کے جملہ کارخانوں میں ۴۳۳۶ ملین گز کپڑا بنا گیا۔

۴۔ سوتی کپڑے کی صنعت کی ترقی

مندرجہ ذیل جدولوں سے ایک طرف کل ہندوستان کے سوتی کپڑوں کے کارخانوں کی ترقی اور دوسری طرف

بلسبی سوتی کپڑوں کی درآمد کی کمی کا حال معلوم ہوتا ہے:۔

جدول (ا)[1]

سال مختتم بہ ۳۰ جون	گرنیوں کی تعداد	تکلوں کی تعداد	کرگھوں کی تعداد	کام کرنے والے مزدوروں کی اوسط تعداد
۱۸۷۷	۵۱	۱۲۴۴۲۰۶	۱۰۳۸۵	×
۱۹۰۰	۱۹۳	۴۹۴۵۷۸۳	۴۰۱۲۴	۱۶۱۱۸۹
۱۹۱۴[2]	۲۷۱	۶۷۷۸۸۹۵	۱۰۴۱۷۹	۲۶۰۲۷۶
۱۹۱۸[2]	۲۶۲	۶۶۵۳۸۷۱	۱۱۶۸۴	۲۸۲۲۲۷
۱۹۲۲[2]	۲۹۸	۷۳۳۱۲۱۹	۱۳۴۶۲۰	۲۴۳۷۲۳
۱۹۲۳[2]	۳۳۳	۷۹۲۷۹۳۸	۱۴۴۷۹۴	۳۴۷۳۲۳
۱۹۲۷[2]	۳۳۶	۸۷۰۲۷۶۰	۱۶۱۹۵۲	۳۸۴۶۲۳
۱۹۳۰[2]	۳۴۸	۹۱۲۴۷۶۸	۱۷۹۲۵۰	۳۸۴۰۲۲
۱۹۳۲[2]	۳۳۹	۹۵۰۶۰۸۳	۱۸۶۳۴۱	۴۰۳۲۲۶
۱۹۳۳[2]	۳۴۴	۹۵۸۰۶۶۸	۱۸۹۰۴۰	۴۰۰۰۰۵
۹۳۴[2]	۳۵۳	۹۶۱۳۱۷۴	۱۴۹۸۸	۳۸۴۹۳۸
۱۹۳۶[2]	۳۷۹	۹۸۵۶۶۵۸	۲۰۰۰۶۲	۴۱۷۸۰۳

[1] دیکھو ایک کتاب موسوم بہ انڈین ایر بک Indian Year Book سنہ ۱۹۳۷ تا سنہ ۱۹۳۸ صفحہ ۶۹۸۔

[2] برائے سال مختتم بہ ۳۱ اگست۔

جدول (۲)[1]

	۱۹۰۴ تا ۱۹۰۸	۱۹۱۳ تا ۱۹۱۴	۱۹۱۹ تا ۱۹۲۰	۱۹۲۴ تا ۱۹۲۵	۱۹۳۰ تا ۱۹۳۱	۱۹۳۴ تا ۱۹۳۵	۱۹۳۶ تا ۱۹۳۷
ہندوستانی گرنیوں کی پیداوار	۶۷۸	۱۱۶۴	۱۶۴۰	۱۹۷۰	۲۵۶۱	۳۳۹۷	۳۵۷۲
درآمدۂ اشیا	۲۲۸۸	۳۱۵۹	۱۰۶۴	۱۸۰۱	۸۸۲	۹۴۴	۷۶۴
میزان	۲۹۶۶	۴۳۲۳	۲۷۰۴	۳۷۷۱	۳۴۴۳	۴۳۴۱	۴۳۳۶

سنہ ۱۹۰۴ء سے سنہ ۱۹۰۵ء تک سوت کی برآمدی تجارت جو مسلسل بڑھتی رہی اس کی وجہ یہ تھی کہ بمبئی کو اپنے محل وقوع کے لحاظ سے چین کی منڈیوں سے تجارت کرنے میں سہولت تھی۔ چنانچہ جزیرۂ بمبئی کے کارخانے کل تجارت برآمد کے ۹۰ فی صد پر حاوی تھے اور مجموعی برآمد کا ۹۰ فی صد چین میں کھپ جاتا تھا۔ سنہ ۱۸۹۰ء تک جاپان بھی ایک دوسرا بڑا گاہک رہا۔ اسٹریٹس سٹلمنٹز اور عرب میں بھی نئے بازار کھل گئے تھے سنہ ۱۹۰۵ء کے بعد تجارت کو اتنی ہی جلدی زوال آیا جتنی جلد اس نے پہلے ترقی کی تھی۔ ہندوستانی ٹکسالوں میں آزاد سکہ سازی کی موقوفی کی وجہ سے صد ۲۹۰

[1] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "تبصرہ بر تجارت ہند" (برائے سنہ ۱۹۳۶ء تا سنہ ۱۹۳۷ء) صفحہ ۴۲۔ ان اعداد سے کپڑوں کے چھوٹے تھان خارج ہیں۔

روپیہ اور چینی سکّے کی شرح میں خلل واقع ہونا، چین میں سوت کی کتائی کی صنعت کا شروع ہونا، جنگ عظیم کے باعث جہازوں سے سامان بھیجنے میں ہندوستانی تاجروں کو دشواری پیش آنا اور اس کی وجہ سے جاپان کو اس موقع کا ہاتھ آنا جس کی وہ تاک میں تھا، خود ہندوستان میں پارچہ بافی کا ترقی کرنا، اور اندرون ملک منافعہ ملنے کی وجہ سے ہندوستانی صناعوں کا غیر ملکی بازاروں سے بے پروائی کرنا۔ یہ سب زوال کے اہم اسباب تھے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ جاپان نے جنگ عظیم کے چھڑنے تک سوت کے چینی بازار میں ہندوستان کے حریف کی حیثیت حاصل نہیں کی تھی، البتہ اس کے بعد سے وہ نہ صرف ہندوستان کو چینی بازار سے بے دخل کرنے میں کامیاب ہوا بلکہ خود ہندوستان ہی میں جاپانی سوت کی درآمد خوفناک تیزی سے بڑھ گئی جس کی وجہ سے ہماری کتائی کی صنعت بری طرح متاثر ہوئی۔ سوت اور دھاگے کی برآمد جو ۱۸۹۹ء سنہ ۱۹۰۰ء میں ۲۴۴ ملین پاونڈ تھی گھٹ کر قبل جنگ کے پانچ سالوں میں اوسطاً ۱۹۳ ملین پونڈ رہ گئی۔ پھر زمانۂ جنگ کا پنجسالہ اوسط ۱۳۰ ملین پونڈ رہا۔ اسی طرح جنگ کے بعد کا پنجسالہ اوسط صرف ۸۲ ملین پونڈ تھا۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۹۳۶-۱۹۳۷ء میں اس برآمد کی مقدار ۱۰۱۲ ملین پونڈ رہ گئی گو اسی سال ہندوستانی گرنیوں کی سوت کی پیداوار ۱۰۵۴ ملین پونڈ تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان آج کل اپنی سوتی پیداوار کا بہت ہی تھوڑا حصّہ برآمد کرتا ہے۔ کیونکہ سب کا سب ملک ہی میں کھپ جاتا ہے۔

جنگ عظیم سے تعلق رکھنے والے اسباب کی بناء پر ۱۹۱۷ء میں گرم بازاری شروع ہوئی۔ سنہ ۱۹۱۷-۱۹۱۸ء تا سنہ ۱۹۲۱-۱۹۲۲ء میں ملک میں اصل مشغول کی مقدار ۲۰۱۸۴ کروڑ روپیہ سے بڑھ کر ۴۰۱۹۸ کروڑ روپیہ ہو گئی۔ چڑھتی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے گرنیاں انتہائی زور و شور سے کام کر رہی تھیں۔ چنانچہ بمبئی کے سوتی کپڑوں کے کارخانوں نے بہت ہی اعلیٰ مقسوم

ادا کیے؛ یعنی ادا شدہ اصل پر سنہ ۱۹۱۹ء میں ۱۰۸؛ سنہ ۱۹۲۰ء میں ۳۵۱۲ فی صد؛ اور سنہ ۱۹۲۱ء میں ۳۰ فی صد منافع تقسیم کیا گیا۔[۱]

گرم بازاری چھ سال تک جاری رہی جس کے اختتام پر ایک دم سرد بازاری واقع ہوئی۔ اس اثنا میں جاپان نے نہ صرف چینی بازاروں میں اہم پوزیشن حاصل کرلی۔ بلکہ خود ہندوستان میں اپنی ارزاں اشیا کی بھرمار شروع کردی جس سے ہندوستانی گرنیوں کی پیداوار کی قیمتیں گر گئیں۔ ہندوستان نے جس طرح بین قومی گرم بازاری میں حصہ لیا تھا اسی طرح عام کساد بازاری میں بھی اس کی شرکت ضروری تھی۔ ہندوستان میں گرم بازاری و سرد بازاری کا ہونا "تجارتی دور" پر موقوف ہے۔

دوسرے عالمی اسباب یہ تھے کہ سنہ ۱۹۲۰ء سے زرعی پیداوار اور عام اشیا کی قیمتوں کی باہمی نسبت بدل گئی اور سنہ ۱۹۱۱ء سے روئی کی قیمتوں میں سخت تغیرات ہوئے۔ تمام دنیا میں ایک وقت صنعتی سرد بازاری کی وجہ یہ ہوئی کہ زرعی طبقوں کی قوت خرید میں کمی ہوگئی اور قوت خرید کے کم ہوجانے کی وجہ یہ تھی کہ سنہ ۱۹۲۰ء سے تمام دنیا میں زرعی پیداوار کی قیمتیں گر گئیں۔ گرم بازاری کے زمانے میں کاروبار بڑھانے اور پھیلانے کی جو تجویزیں مرتب کی گئی تھیں وہ سنہ ۱۹۲۲ء سے قبل مکمل نہ ہو سکیں۔ نئے کارخانوں کو حقیقت میں گرم بازاری کے زمانے کی گراں قیمتوں کے لحاظ سے زیادہ مصارف برداشت کرنے پڑے اور اکثر صورتوں میں اصل کے ان بڑھے ہوئے مصارف میں شرح مبادلہ کے ان تغیرات کی وجہ سے جو سنہ ۱۹۲۰ء میں ہوئے اور بھی اضافہ ہوگیا۔[۲] ہندوستان میں سوتی صنعت کی مشکلات میں اضافہ کا ایک اہم سبب یہ قرار دیا جاسکتا ہے کہ سنہ ۱۹۱۷ء

[۱] ملاحظہ ہو ٹیرف بورڈ (صنعت پارچہ بافی) کی رپورٹ شائع شدہ سنہ ۱۹۲۷ء ضمیمہ (۵)؛ اور برج نارائن کی تصنیف موسومہ (Life in India) صفحہ ۴۵۸۔

[۲] ملاحظہ ہو کاڈگل کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۲۴۲۔

کے بعد سے امریکی کپاس کی گھٹتی بڑھتی رسد اور قیمتوں کے اثر سے ہندوستانی کپاس کی قیمتوں میں بھی سخت تغیرات ہوئے۔ گو کساد بازاری کے شروع میں کپاس کی قیمتیں بڑھ رہی تھیں اور کپڑے کی قیمتیں ایک ہی سطح پر قایم تھیں لیکن ۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۶ء کپاس اور کپڑے اور دونوں کی قیمتیں بہت گر گئیں ۱۹۲۳ء اس صنعت کے لیے غالباً بدترین سال تھا۔ چنانچہ کساد بازاری کی شدت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ گو ہندوستان میں مسلسل تین سال تک موسم بارش اچھا رہا اور جاپان میں زلزلے کی تباہ کاریوں کی وجہ سے اس ملک سے مسابقت کا اندیشہ بھی کم ہوگیا تھا مگر پھر بھی صورت حال بہتر نہ ہوسکی۔

سوت کی چینی تجارت کی کامل موقوفی ہندوستانی پارچہ بافی کے حق میں محرک بن گئی۔ چنانچہ موجودہ صدی کے آغاز سے اس میں نمایاں ترقی و توسیع ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہم غیر ملکی کپڑے کے اس درجہ محتاج نہیں ہیں جیسا کہ پہلے تھے۔

۵ ہندوستان میں سوتی کپڑوں کا فی کس صرف

مندرجہ ذیل جدول میں سوتی کپڑوں کے فی کس صرف کے متعلق دلچسپ اعداد دئے گئے ہیں[1] اور ان میں ہندوستانی دستی راچھ کی پیداوار بھی شامل ہے:۔

سال	خالص درآمد[2]		گرنی کی خالص موجودہ پیداوار[3]		دستی راچھ کی پیداوار		خالص موجودہ مقدار برائے صرف	
	حقیقی	فی کس	حقیقی	فی کس	تخمینی	فی کس	میزان	فی کس
	کروڑ گز	گز	کروڑ گز	گز	کروڑ گز	گز	کروڑ گز	گز
۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۶ء	۲۳۹	۷٫۹۷	۶۱	۲٫۰۳	۱۰۸	۳٫۶۶	۴۰۸	۱۳٫۶۶

[1] ملاحظہ ہو ایک رپورٹ موسوم بہ "تبصرہ بر تجارت ہندوستان" برائے ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء۔ ان اعداد میں کپڑوں کے چھوٹے تھان بھی شامل ہیں۔

[2] غیر ملکی اشیاء کی درآمد میں سے غیر ملکی اشیاء کی مکرر برآمد کو منہا کرنے سے یہ خالص درآمد حاصل ہوتی ہے۔

[3] گرنی کی پیداوار میں سے ہندوستانی کپڑے کی برآمد کو منہا کرنے کے بعد گرنی کی خالص پیداوار رہ جاتی ہے۔

سال	خالص درآمد		گرنی کی خالص موجودہ پیداوار		دستی راچھ کی پیداوار		خالص موجودہ مقدار برائے صرف	
	حقیقی	فی کس	حقیقی	فی کس	تخمینی	فی کس	میزان	فی کس
	کروڑ گز	گز	کروڑ گز	گز	کروڑ گز	گز	کروڑ گز	گز
سنہ ۱۹۰۹ء تا سنہ ۱۹۱۰ء	۲۱۴	۶٫۹	۸۷	۲٫۸۱	۹۰	۲٫۹	۳۹۱	۱۳٫۶۱
سنہ ۱۹۱۳ء تا سنہ ۱۹۱۴ء	۳۱۳	۹٫۷۸	۱۰۸	۳٫۳۸	۱۰۷	۳٫۳۴	۵۲۸	۱۶٫۵
سنہ ۱۹۱۸ء تا سنہ ۱۹۱۹ء	۱۰۱	۳٫۱۶	۱۳۰	۴٫۰۶	۱۰۵	۳٫۲۸	۳۳۶	۱۰٫۵
سنہ ۱۹۱۹ء تا سنہ ۱۹۲۰ء	۹۹	۳٫۰۹	۱۴۴	۴٫۵	۵۶	۱٫۷۵	۲۹۹	۹٫۳۴
سنہ ۱۹۲۳ء تا سنہ ۱۹۲۴ء	۱۴۲	۴٫۳	۱۵۴	۴٫۶۷	۱۰۱	۳٫۰۶	۳۹۷	۱۲٫۰۳
سنہ ۱۹۲۶ء تا سنہ ۱۹۲۷ء	۱۷۶	۵٫۱۸	۲۰۶	۶٫۰۶	۱۳۳	۳٫۹۱	۵۱۵	۱۵٫۱۵
سنہ ۱۹۲۷ء تا سنہ ۱۹۲۸ء	۱۹۴	۵٫۷۱	۲۱۹	۶٫۴۴	۱۳۱	۳٫۸۵	۵۴۴	۱۶
سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۱ء	۸۷	۲٫۴۹	۲۴۶	۷٫۰۳	۱۳۹	۳٫۹۷	۴۷۲	۱۳٫۴۹
سنہ ۱۹۳۲ء تا سنہ ۱۹۳۳ء	۱۲۰	۳٫۳۴	۳۱۱	۸٫۶۴	۱۷۰	۴٫۷۲	۶۰۱	۱۶٫۷
سنہ ۱۸۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء	۹۷	۲٫۶۲	۳۳۴	۹٫۰۳	۱۴۶	۳٫۹۵	۵۷۷	۱۵٫۶
سنہ ۱۹۳۶ء تا سنہ ۱۹۳۷ء	۷۹	۲٫۱۳	۳۴۷	۹٫۳۸	۱۴۹	۴٫۰۳	۵۷۵	۱۵٫۵۴

یہ اندازہ لگانے کے لیے فی کس کتنا کپڑا صرف میں آتا ہے آبادی کے سال بہ سال تغیرات کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ لیکن بری راستوں سے جو برآمد ہوتی ہے اور سامان جو سال بہ سال بچ رہتا ہے ان کا حساب نہ ہو سکا۔ دستی راچھ کی پیداوار کے اعداد محض اندازے سے پیش کیے گئے ہیں، اور یہ اندازہ ہر سال صرف میں آنے والے سوت کی مقدار پر مبنی ہے۔

مندرجہ بالا جدول سے بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اولاً اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی کارخانوں میں اتنی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے کہ وہ اپنی پیداوار سے ہندوستان کی کپڑوں کی مجموعی طلب

کے بہت بڑے حصے کو پورا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ غیر ملکی سامان کی درآمد میں بہت بڑی کمی ہو گئی ہے۔ موجودہ صدی کے آغاز پر صورتِ حال اس اعتبار سے معکوس تھی۔ اس جدول سے دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جلاہے کے دستی راچھ کی پیداوار کا تناسب ہندوستان میں صرف ہونیوالے کپڑوں کی مجموعی تعداد کے مقابلے میں اب بھی خاصا ہے یعنی صرف کی مجموعی مقدار کا ۲۵ فی صد ہے اور ہندوستانی گرنیوں کی پیداوار کا ۴۰ تا ۵۰ فی صد ہے۔ تیسری بات جدول سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ جنگ عظیم کے زمانے میں کپڑے کے صرف فی کس میں کمی واقع ہوئی چنانچہ ۱۹۱۳-۱۹۱۴ء میں فی کس صرف کا اوسط ۱۶.۵ گز تھا لیکن ۲۰-۱۹۱۹ء میں ۹.۳۴ تک گھٹ گیا۔ اس کے بعد سے فی کس صرف میں پھر اضافہ شروع ہوا گو حالیہ سالوں میں اس اضافے کی رفتار میں کچھ کمی ہو گئی ہے۔ کیونکہ کساد بازاری کی وجہ سے عوام کی قوتِ خرید بہت کم ہو گئی ہے۔ ۱۹۳۲-۱۹۳۳ء کے اعداد کسی قدر غلط فہمی میں ڈال دیتے ہیں۔ اس لیے کہ اس زمانے میں ملکی پیداوار اور درآمد دونوں بڑھے ہوئے تھے۔ جدول سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی کپڑے کی گرنیوں کی پیداوار ۱۹۳۶-۱۹۳۷ء میں پچھلے سالوں پر سبقت لے گئی۔

۶۔ سوتی کپڑے کے کارخانوں کی بعض مشکلات

بعض اعتباروں سے سوتی کپڑے کی تجارت سوت کی تجارت کے مقابلے میں زیادہ محفوظ ہے۔ سوت کی تجارت کی خامی یہ تھی کہ اس کا انحصار زیادہ تر ایک ہی بازار یعنی چین کی منڈیوں پر تھا۔ اس کے برخلاف سوتی کپڑے کی برآمد کے لیے بہت سے بازار کھلے ہوئے ہیں اور آیندہ ان میں ہندوستانی سامان کی کھپت کی زیادہ گنجایش معلوم ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں اس کا امکان نہیں ہے کہ کسی ایک گاہک کی خریداری میں کمی تجارت کی مجموعی مقدار کو زیادہ متاثر کرے۔ لیکن یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہندوستانی صنعتی کارخانوں کے مالکوں نے غیر ملکی منڈیوں سے تجارت بڑھانے میں

اب تک کوئی خاص کوشش نہیں کی ہے اور ان کی یہ فروگذاشت صنعت کی موجودہ صورت حال کے مدنظر اور بھی زیادہ سنگین ہوجاتی ہے ۱۹۳۰ء۔۱۹۳۱ء کے قبل کپڑے کی درآمد بہت بڑھی۔ جاپان اس لحاظ سے ایک زبردست حریف ہے کیونکہ اس کی اشیا لنکاشائر کی اشیا کے برعکس ہندوستانی مصنوعات سے براہ راست مسابقت کرتی ہیں۔ جاپان اپنا مال ہندوستانی سامان سے ارزاں فروخت کرسکتا ہے کیونکہ اس کو چند خاص سہولتیں حاصل ہیں۔ مثلاً اس کی اعلیٰ درجہ کی آب و ہوا مزدور کی کارکردگی کو بڑھاتی ہے۔ اور جاپان کے سماجی حالات میں مزدور عورتوں سے کم اجرت پر بہت زیادہ کام لیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کپاس کے قطع نظر جو چین سے ہر وقت حاصل ہوسکتی ہے جاپان ریاستہائے متحدہ اور ہندوستان سے بھی کپاس بڑے پیمانے پر اور نہایت منظم طریقے پر خریدتا ہے جس کی وجہ سے جاپان کو ہندوستان پر خاصی برتری حاصل ہوگئی ہے۔ البتہ چھوٹے ریشے کی کپاس کی حد تک ہندوستان نسبتاً فایدے میں ہے۔ مخلوط امریکی اور ہندوستانی کپاس کا بنا ہوا سفید جاپانی کپڑا ہندوستانی کپڑوں سے زیادہ جاذب نظر ہوتا ہے۔ یہاں تک تو جاپان کا رویہ بیجا فایدہ اٹھانے کی تعریف میں یقیناً داخل نہیں ہے لیکن جب اس نے کام کے گھنٹوں اور عورتوں اور بچوں سے رات کے وقت کام نہ لینے کے متعلق واشنگٹن کانفرنس کے بنائے ہوئے قواعد مزدوران کو ماننے سے انکار کردیا تو یہ حرکت ضرور بیجا فایدے کی تعریف میں آتی ہے[۱]۔ یہ حالات ہندوستان کے مقابلے میں جاپان میں بہت زیادہ خراب ہیں

[۱] "جاپانی کارخانوں میں دو بدلی طریق پر کام ہونے کی وجہ سے سوت کاتنے اور کپڑا بننے کے حقیقی مصارف میں ۲۰ فی صد کمی رہتی ہے۔ یہ بچت اور بھی زیادہ ہوجاتی ہے اگر مصارف پیدائش میں سرمایے کا کچھ منافعہ بھی شامل کرلیا جائے۔"
ملاحظہ ہو ٹیرف بورڈ کی رپورٹ پارچہ بافی کے متعلق شائع شدہ ۱۹۲۷ء۔ فقرہ (۳۲)

اور جون ۱۹۲۶ء میں جاپانی قانون کارخانہ جات منظورہ ۱۹۱۱ء نافذ ہونے تک ویسے ہی رہے بلکہ اس وقت بھی کام کے گھنٹوں کی حد تک جاپان کو زیادہ سہولتیں رہیں۔[1]

۱۹۲۳ء کے بعد سے زر کی پالیسی میں بار بار تغیرات ہونے کے وجہ سے سوتی کپڑے کی صنعت کی دشواریوں میں اضافہ ہو گیا اور شرح مبادلہ ۱ شلنگ ۴ پنس کی بجائے ۱ شلنگ ۶ پنس مقرر کی جانے کی وجہ سے صنعت پر ایسے زمانے میں بلا شبہ بہت کاری ضرب لگی۔ جبکہ کساد بازاری اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ جاپان کی شرح مبادلہ گر جانے سے ہندوستان کے مقابلے میں جاپان کی قوت مسابقت پر جو اثر پڑا اس کے بارے میں ٹیرف بورڈ نے یہ رائے ظاہر کی کہ دسمبر ۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۵ء جبکہ شرح مبادلہ گری رہی جاپانی برآمد کو ہندوستان میں یقیناً تقویت پہنچی۔ علاوہ ازیں گزشتہ چند سال سے روپے کے مقابلے میں این (جاپانی سکہ) کی قدر سونے میں نسبتاً زیادہ گر جانے سے جاپان کو ہندوستان کے مقابلے میں سہولت حاصل ہو گئی ہے۔

سوتی کپڑے کی صنعت میں جو کساد بازاری رونما ہوئی اس کو کسی حد تک تنظیم کے بعض نقائص سے منسوب کیا جا سکتا ہے، مثلاً: زائد از ضرورت تاصیل، مجالس نظماء میں فنی ماہروں کی عدم موجودگی جس کی وجہ سے نقصان رساں غلطیاں وقوع پذیر ہوئیں؛ کلوں سے بے احتیاطی کے ساتھ اور نامناسب طریقے پر کام لینا اور پرانی کلوں کو وقتاً فوقتاً نہ بدلتے رہنا؛ محنت بچانے والی جدید ترین ترکیبوں کی عدم موجودگی؛ روئی، کوئلہ، فضلہ اور اشیا کا غیر کفایت شعارانہ طریق پر استعمال؛

---

[1] محنت کے موجودہ حالات و شرائط کے تبصرے اور مزید تفصیلی اعداد کے لیے دیکھو مس سی۔ ماتھیسن کی کتاب موسوم بہ "ہندوستانی صنعت" باب ۴۔

نکاسی کم ہونے کی صورت میں مزدوروں سے کم گھنٹے کام لینے کا باقاعدہ
انتظام نہ ہونا وغیرہ۔ ہمیں فروخت پیداوار میں ایجنسی کے طریق کے صـ۴۳
نقائص اور اعتباری سہولتوں کی غیر اطمینان بخش حالت[1] کا بھی ذکر کرنا ضروری ہے جس کی وجہ سے کرگہیوں اور سوداگروں دونوں کے لیے سخت دشواریاں پیدا ہوئیں۔

۷۔ انتظامی نظارت کا طریقہ۔ انتظامی نظارت (مینیجنگ ایجنسی) کے طریقے پر نہایت سخت اعتراض کیے جاتے ہیں اس لیے اس کے متعلق کچھ کہنا مناسب ہوگا۔ انتظامی نظارت تین یا چار ارکان کی جو بالعموم آپس میں رشتہ دار ہوتے ہیں ایک نجی شراکت ہوتی ہے۔ نظارت کی حقیت اکثر صورتوں میں توریثی اصول کے تابع ہوتی ہے جس کی وجہ سے انتظام بسا اوقات نا اہل ہاتھوں میں آجاتا ہے۔ انتظامی ناظر کارخانے کے حصوں کی کافی تعداد کے مالک ہوتے ہیں اور کارخانے کی مالی ضرورتوں کی سربراہی، تنظیم، خام مال کی خریداری اور پیداوار کی فروخت کی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں۔ ناظروں کو محنتانہ ادا کرنے کے بعض طریقے ایسے ہیں جن کی وجہ سے ناظر ایسا عمل اختیار کرنے کی طرف مائل ہو جاتے ہیں جو ان کے نجی منافعہ کو تو بڑھا دیتا ہے مگر کارخانے کے اغراض کے منافی ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر ناظروں کو پیداوار کی مجموعی مقدار کے لحاظ سے محنتانہ دیا جائے تو ان کا اسی میں زیادہ فائدہ ہے کہ پیداوار

---

[1] "ایک اور عام خرابی یہ ہے کہ کاروباری سرمایہ کے لیے اکثر کرگہیوں کا انحصار زیادہ تر قلیل مدت کی امانتوں، نقد اعتبار اور دوسرے قرضوں پر ہوتا ہے جن کے پر آشوب زمانے میں سختی کے ساتھ محدود کر دیے جانے کا امکان ہوتا ہے۔" دیکھو ویرا آنسٹے کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان کی معاشی نشوونما" صفحہ ۲۷۵۔

[2] ہندوستان میں انتظامی نظارت کے طریقے کی ابتدا، اس کے فوائد اور نقصانات کے مختصر اور جامع بیان کے لیے ملاحظہ ہو آنسٹے کی تصنیف محولۂ بالا صـ۱۱۲ تا صـ۱۱۵ اور صـ۲۵۳؛ نیز ٹیرف بورڈ

ممکنہ طور پر زیادہ تیار کی جائے خواہ اس پالسی کا اثر کارخانے کے منافعے پر کچھ ہی پڑے۔ انتظامی ناظروں پر یہ بھی الزام لگایا گیا ہے کہ وہ کمپنی کی طرف سے خرید و فروخت کرنے میں خفیہ طور پر کمیشن لیتے ہیں۔ اس طریقے میں دوسری خرابیاں یہ ہیں کہ وہ نظماء کو جن کے سر پر حقیقی ذمہ داری بہت ہی کم ہوتی ہے کارخانے کے معاملات سے بے پروائی کرنے اور بے خبر رہنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس طریقے کی وجہ سے حصہ دار بھی بے بس، کمزور اور غیر ذمے دار بنجاتے ہیں اور اس لیے کمپنی کی خاطر قربانی کرنے یا کاروبار میں زیادہ سرمایہ لگانے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ علاوہ ازیں یہ طریقہ انتہائی قدامت پسند اور پست ہمت بناتا ہے۔ آخر میں یہ کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں ہندوستان کی معاشی ترقی صنعتی میدان کی بجائے تجارتی میدان میں ہونے کی حقیقی وجہ ایک حد تک انتظامی نظارت کا طریقہ قرار دی جاسکتی ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اگر انتظامی ناظر مالی امداد کی ذمے داری اپنے سر نہ لیتے (اور اکثر صورتوں میں انھوں نے صنعتی و تجارتی کاروبار کے لیے ذرائع آمدنی خود ہی مہیا کیے) تو، ہندوستان کی معاشی ترقی کی رفتار اس سے بھی زیادہ سست رہتی جتنی کہ اب تک رہی ہے۔

ہندوستان میں اصل کا حجاب ضرب المثل ہے اور اس بارے میں جو امید افزا تبدیلی ہوئی ہے کہ عوام شغل اصل میں دلچسپی لے رہے ہیں بالکل حال کی چیز ہے۔ آج کل بھی کوئی بنک اس وقت تک قرضہ نہیں دیتا جب تک کہ قرضے کی درخواست پر انتظامی ناظروں کے دستخط نہ ہوں، جو شخصی حیثیت سے ذمے دار قرار دیے جاتے ہیں۔ صنعتوں کے لیے اصل دائر اور اصل قایم کی اعتباری سہولتیں مہیا کرنے کے علاوہ انتظامی نظارت نئے نئے کاروبار کے اجراء اور صنعتی تحقیق میں معاون ہے۔ یہ بھی تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ موجودہ شدید کساد بازاری کے زمانے میں انتظامی ناظر

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ (سوتی کپڑے کی صنعت) کی رپورٹ شائع شدہ ۱۹۳۲ء فقرہ ۶۵ تا ۸۳۔

ان نقصانات میں برابر کے شریک رہے جو صنعتوں کو برداشت کرنے پڑے اور نہ صرف اپنے کمیشن سے دست بردار ہو گئے، بلکہ شدید ضرورت کے وقت سرمایہ بھی مہیا کیا۔ باوجود اس کے یہ بات عام طور سے تسلیم کی جاتی ہے کہ اب انتظام نظارت کے طریقے کی کامل طور پر اصلاح ہونی چاہیے[1]۔ ٹیرف بورڈ نے ۱۹۳۲ء میں یہ سفارش پیش کی کہ انتظامی نظارت کے طریقے کو بہتر نگرانی کے تحت لانے کی خاطر قانون وضع کرنے کے لیے جلد تحقیقات عمل میں لائی جائے۔ چنانچہ ہندوستانی کمپنیوں کے قانون میں ۱۹۳۶ء میں ترمیم ہوئی اور اس کے ذریعے سے انتظامی نظارت کی اکثر خرابیوں کو دور کرنے کی حسب ذیل تدابیر اختیار کی گئیں:۔ (۱) انتظامی ناظر کے عہدے پر بہ یک وقت زیادہ سے زیادہ ۲۰ سال مدت کے لیے تقرر؛ (۲) انتظامی ناظر پر اپنا عہدہ اور محنتانہ دوسرے کو منتقل کرنے کے بارے میں بندشیں؛ (۳) فریب اور خیانت مجرمانہ کی پاداش میں برطرفی؛ (۴) انتظامی ناظر کے محنتانے کے لیے یکساں طریقے (خالص سالانہ منافع) کا تعین؛ (۵) ایک ہی انتظامی ناظر کے تحت کام کرنے والی مختلف کمپنیوں کے درمیان قرضے کے

[1] ممکن ہے کہ یہ امر بالکل صحیح ہو کہ متعدد بلکہ اکثر و بیشتر انتظامی ناظروں نے اپنے فرائض خوبی اور دیانت داری کے ساتھ انجام دیے۔ لیکن اس کی بنا پر ایک ایسا نظام جو لوٹ کھسوٹ اور خیانت کے خاص مواقع بہم پہنچاتا ہے، اعتراض سے بری نہیں ہو جاتا۔ بہر حال یہ بات عام طور سے تسلیم کی جاتی ہے کہ یہ طریق اس غیر مشتبہ واقعے کا بڑی حد تک ذمہ دار ہے کہ ہندوستان میں صنعتی و تجارتی مہم پسندی کا زیادہ تر انحصار، یورپین و ہندوستانی افراد کی قلیل جماعت پر ہے۔ چنانچہ مشہور فرم اندریو یول اینڈ کمپنی کی (Andrew Yule & Company) مثال لیجیے جو کئی صنعتی کارخانوں اور تجارتی کاروبار کے انتظامی ناظر کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔ اس کاروبار میں کم از کم دس سن کی گرنیاں، پندرہ کوئلہ کی کمپنیاں، دو برقابی کی کمپنیاں، دو روغن نکالنے کی گرنیاں، ایک آٹے کی گرنی، اور جہاز رانی، ربر، شکر سازی، خشت و ظروف سازی اور ہمہ اقسام کے متفرق کاروبار شامل ہیں۔ (ملاحظہ ہو رسالہ "کیپٹل" مورخہ ۴ مارچ ۱۹۳۶ء)

لین دین یا ڈبنچر کی فروخت پر بند شیں۔

۸۔ بمبئی میں کساد بازاری

بمبئی میں کساد بازاری خاص شدت سے رونما ہوئی چنانچہ اس کے اسباب پہلے بیان کیے جا چکے ہیں۔ مثلاً جاپانی مسابقت اور چین میں سوتی صنعت کی ترقی و توسیع کی وجہ سے چین سے سوت کی تجارت موقوف ہوگئی اور یہ اتنا بڑا نقصان تھا کہ اس کی کامل تلافی سوتی کپڑے کی برآمد کے بڑھ جانے سے بھی نہ ہوئی۔ دوسرے یہ کہ جنگ عظیم کے زمانے میں اور اس کے بعد باربرداری کی مشکلات بڑھ گئیں۔ تیسرے یہ کہ بمبئی کو نہ صرف ان کارخانوں کی روز افزوں شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جو اندرون ملک قائم ہوگئے تھے اور جن کی تعداد حال میں بہت بڑھ گئی ہے بلکہ ان کارخانوں کا بھی جو دیسی ریاستوں میں کھل گئے ہیں جہاں مزدوروں کے قواعد پر نرمی سے عمل کیا جاتا ہے اور برطانوی ہند کے کارخانوں کی پیداوار پر بالعموم خصوصی محصول لگائے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا الزام ایک حد تک بمبئی کی گرنیوں ہی پر عاید ہوتا ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے سوتی کپڑے خصوصاً مہین کپڑے وضع وضع کا بنانے، بازاروں سے براہ راست تعلق قائم کرنے اور ہوشیار کمیشن ایجنٹ مقرر کرنے پر بہت کم توجہ کی۔ لیکن بمبئی چند ایسی مشکلات اور مجبوریوں میں بھی مبتلا ہے جن کے لیے اس پر کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا مثلاً مزدوروں کو زیادہ اجرت دینی پڑتی ہے، ایندھن اور آبی قوت گراں ہے۔ مقامی محصول بڑھے ہوئے ہیں اور بمبئی مفصلات کے بازاروں اور خام مال کے مرکزوں سے دور واقع ہے۔ بمبئی کپڑا بننے کی صنعت میں اپنی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں لازمی طور پر بہت زیادہ آمدنی وصول ہوتی ہوگی بعض اوقات مختلف اغراض میں مطابقت پیدا کرنا یقیناً مشکل ہوتا ہوگا اور کسی ایک فرم کیلئے اتنے وسیع اور مختلف النوع کاروبار کی نگرانی اور ان کا اجتماعی طور پر انتظام اور بھی زیادہ دقت طلب ہوگا، دیکھو انسٹے کی تصنیف محولہ بالا ص۵ تا ص۵۰۲

اس ممتاز حیثیت کو اب کھو رہا ہے جو اس کو بارہ سال پیشتر حاصل تھی۔ چنانچہ اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ بمبئی میں کام کرنے والی گرنیوں کی تعداد ۱۹۲۶ء میں ۸۰ تھی لیکن گھٹتے گھٹتے ۱۹۳۶ء میں ۶۶ ہو گئی۔ لیکن اس کے باوجود بمبئی ایک ساتھ سوت کاتنے اور کپڑا بننے کے بڑے کارخانوں کا مرکز ہے۔

۹۔ کپڑے کی صنعت کی تامین۔ ۱۹۲۶ء سے اس وقت تک کپڑے کی صنعت کی تامین کا مسئلہ تین مرتبہ ٹیرف بورڈ کے زیر غور رہا ہے۔ پہلی تحقیق ۱۹۲۶ء میں ہوئی جبکہ یہ معلوم ہوا کہ صنعت کی حالت خاص کر بمبئی میں غیر اطمینان بخش تھی۔ بورڈ نے ۱۹۲۷ء میں اپنی رپورٹ میں لکھا کہ زوال کے خاص اسباب یہ تھے کہ اندرونی حالات ناموافق تھے، جاپان بیجا اور معاشی اصولوں کے خلاف مسابقت کر رہا تھا اور ہر طرف کساد بازاری کا دور دورہ تھا[1]۔ کساد بازاری کو دور کرنے کے لیے جو بمبئی میں خاص طور پر شدید تھی بورڈ نے حسب ذیل تدابیر پر عمل کرنے کا مشورہ دیا:- (۱) اشیائے خام کے خریدنے کے انتظام کو بہتر بنایا جائے مثلاً تھوک خرید کے اصول پر عمل کیا جائے (۲) محنت کو بڑھانے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کی جائیں مثلاً کام کی مقدار کے حساب سے اجرت دی جائے، مزدوروں کی بھرتی زیادہ احتیاط سے کی جائے اور مزدوروں کی رہائش اور تعلیم کا معقول انتظام کیا جائے۔ (۳) مالکان گرنی اپنے مشترکہ اغراض کو ترقی دینے کے لیے زیادہ تعاون باہمی سے کام کریں۔ (۴) پیداوار کو زیادہ متنوع بنایا جائے اور زیادہ مہارت اور تخصیص سے کام لے کر مہین تاروں کے کپڑے بنائے جائیں۔ اور اس طرح ان سہولتوں سے جو بمبئی کو اپنی مرطوب آب و ہوا کی وجہ سے اور محل وقوع کے اعتبار سے حاصل ہیں لانبے ریشے کی امریکی و افریقی روئی

---

[1] ملاحظہ ہو ایک رپورٹ موسوم بہ "صنعتوں کے بارے میں حکومت کی کارروائی" ۱۹۲۳ء تا ۱۹۳۱ء صفحہ ۹۲

درآمد کرکے پورا پورا فایدہ اٹھایا جائے (۵) پیدائش کے نئے شعبوں کو ترقی دی جائے مثلاً سوتی کپڑے چھاپنے کی صنعت قایم کی جائے۔ (۶) ایران و عراق جیسی منڈیوں کی نشو و نما پر زیادہ توجہ صرف کی جائے اور (۷) ہندوستان کے اندر اور باہر بازاروں سے زیادہ گہرے تعلقات قایم کئے جائیں وغیرہ۔

تاپین کے بارے میں، بورڈ کی اصل سفارش یہ تھی کہ درآمدی محصول ۱۱ فی صد سے ۱۵ فی صد تک بڑھا دیا جائے، مہین سوت کی کتائی کو فروغ دینے کے لیے مالی امداد دی جائے، سوتی کپڑا بننے کی کلوں پر اور گرنی میں کام آنے والی اشیا پر محصول درآمد معاف کیا جائے۔ حکومت ہند نے صرف آخری سفارش کو منظور کرنے کا فیصلہ کیا۔ گرنی کے مالکوں نے اس فیصلے کے خلاف سخت احتجاج کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی سوت پر تاپینی محصول بہ لحاظ قیمت ۵ فی صد یا ۱½ آنہ فی پونڈ (دونوں میں سے جو بھی زیادہ ہو) ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۳۲ء تک کے لیے عاید کیا گیا۔ جو محصول درآمد مشنری اور گرنی میں استعمال ہونے والے دوسرے سامان پر عاید تھا اس کو معاف کیا گیا۔

مصنوعی ریشمی سوت کی درآمد پر جو محصول تھا اس کو بھی ۱۵ فیصد سے گھٹا کر ۷½ فی صد کر دیا گیا تاکہ دستی پارچہ کی صنعت پر سے وہ بار اٹھا لیا جائے جو اس پر سستے ہوئے سوت کے ترمیم شدہ درآمدی محصول سے پڑ رہا تھا اور ہندوستانی گرنیوں کی پیداوار کو متنوع بنانے میں

---

[1] بورڈ نے یہ بھی سفارش کی کہ اگر انجمن مالکان گرنی بمبئی اطمینان بخش تجویز پیش کرے تو حکومت کو چاہیے کہ رنگنے، کاشت، رنگ ریزی اور چھپائی کے متحدہ کارخانے کو مالی مدد دے، اور یہ کہ ناظم تجارت مقرر کئے جائیں جن میں سے ایک بصرے میں اور دوسرا ممباسہ میں مقیم رہے اور ایک چھوٹا سا تجارتی وفد جس میں انجمن مالکان گرنی کا ایک نمایندہ بھی شامل ہو دوسرے بازاروں کی امکانی قوتوں کے بارے میں جلد تحقیقات کرے۔ دیکھو ٹیرف بورڈ کی کپڑے کی صنعت کی تحقیقاتی

سہولت بہم پہنچائی جائے۔ یہ بیان کر دینا مناسب ہوگا کہ ہندوستان کے دستی راچھ اور کپڑا بننے کے کارخانے اس قسم کے سوت کا استعمال روز افزوں کر رہے ہیں۔ حکومت ہند نے ٹیرف بورڈ کی سفارش کے مطابق ایک تجارتی وفد بھی مقرر کیا۔[1] لیکن ان تمام کارروائیوں سے ہندوستان کی سوتی صنعت کو اطمینان ہوا اور نہ عوام کو صنعت میں کساد بازاری بدستور جاری رہی اور عام طور پر یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ اس کی اور زیادہ امداد کی ضرورت تھی۔

۱۰۔ مسٹر جی، ایس، ہارڈی کی تحقیق

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے جولائی ۱۹۲۹ء میں مسٹر جی، ایس، ہارڈی محکمۂ کروڑ گیری کلکتہ کے کلکٹر کو مقرر کیا تاکہ وہ غیر ملکی مسابقت کی وسعت اور شدت کے بارے میں تحقیقات کریں۔ مسٹر ہارڈی کی رپورٹ نے جاپانی مسابقت کے متعلق کرگیوں کے مالکوں کے اِدعا کی پوری طرح تصدیق کر دی۔[2] مسٹر ہارڈی نے یہ بتلایا کہ گزشتہ آٹھ سال میں ہندوستانی درآمدی تجارت کی سب سے اہم خصوصیت یہ رہی کہ جاپانی کپڑے کی درآمد بتدریج بہت بڑھ گئی اور یہ کہ ٹیرف بورڈ کے رپورٹ پیش کرنے کے بعد سے جاپانی تجارت نے بہت تیز اور رفتار کاووٹ کے ترقی کی۔ ہارڈی کی تحقیقات سے یہ بخوبی واضح ہوگیا کہ کپڑے کی کرگیوں کو معقول امداد دینے کی ضرورت تھی اور حکومت کو توجہ دلائی گئی کہ وہ اپنی ۱۹۲۷ء کی اس غلطی کی اصلاح کرے جو اس نے اس معمولی امداد سے دریغ کرنے میں کی تھی جس کی ٹیرف بورڈ نے سفارش کی تھی۔ حکومت نے اس کے جواب میں اپریل ۱۹۳۰ء میں سوتی کپڑے کی صنعت کی تامین کے متعلق ایک قانون منظور کیا جس کا

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ رپورٹ بابت ۱۹۲۷ء فقرہ (۹۹ تا ۱۰۱)۔

[1] دیکھو باب ۶۔

[2] ملاحظہ ہو مسٹر جی، ایس، ہارڈی کی رپورٹ "سوتی کپڑوں کی غیر ملکی مسابقت" فقرہ ۱۱۔

مقصد یہ تھا کہ ۳۱ مارچ ۱۹۳۳ء تک جاپان کے مقابلے میں کافی تامین حاصل رہے۔ اس ایکٹ کے بموجب عام "محصول بہ لحاظ قیمت" ۵ا فیصد تک بڑھا دیا گیا۔ علاوہ ازیں سادے سفید کپڑے پر جو بقول سرجارج رینی بمبئی کی صنعت کی روزی کا ذریعہ ہے ایک اقل محصول ۳½ آنے فی پونڈ کے حساب سے لگایا گیا تاکہ بمبئی اپنی صنعت کی مالی اور فنی تنظیم کر سکے۔[1]

اس کے علاوہ ۵ فی صد کا ایک خاص تامینی محصول عاید کیا گیا۔ لیکن اس محصول کو صرف غیر برطانوی کپڑوں تک محدود رکھا گیا حکومت کا استدلال یہ تھا کہ اگر محصول کی اس طرح تحدید نہ کی جاتی تو کئی قسم کی اشیا جن سے اس وقت بمبئی کو کوئی خاص فایدہ نہ تھا متاثر ہوتیں، اور صارفوں کو غیر ضروری نقصان پہنچتا؛ یہ کہ برطانوی کپڑے کو محصول سے مستثنیٰ کرنے کا منشا یہ تھا کہ صرف اس قسم کے کپڑے مستثنیٰ کئے جائیں جو بمبئی سے براہ راست مسابقت نہیں کر رہے تھے؛ یہ کہ لنکا شائر کے حق میں جو امتیاز کیا گیا تھا وہ محض اتفاقی تھا؛ اور یہ کہ اگر انگلستان ان اشیا کے بارے میں مسابقت کی کوشش کرے جن کی بھرمار جاپان، ہندوستان میں کر رہا تھا تو تین سال کے بعد کل صورت حال کی نظر ثانی کر کے انگلستان کے خلاف بھی ہندوستان کو تامین دی جا سکتی تھی۔ لیکن حکومت کے اس بیان کے باوجود کہ برطانوی اشیا کو بالکل ضمنی اور اتفاقی طور پر ترجیح حاصل ہو گئی تھی۔ ہندوستان کے اکثر لوگوں کے دلوں میں یہ بدگمانی باقی ہے کہ یہ پالیسی دانستہ اختیار کی گئی تھی۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح کے سازشی طریقوں سے شاہی ترجیح کا مقصد ہرگز پورا نہیں ہو سکتا۔ حکومت کے لیے بھی

---

[1] چونکہ حکومت نے اپنے ابتدائی مسودہ قانون کے متعلق مسٹر (اب سر) شان مکم چیٹی کی ترمیم منظور کر لیا تھا اس لیے ۳½ آنے فی پونڈ کا محصول نہ صرف سفید غیر برطانوی کپڑے پر بلکہ برطانوی کپڑے پر بھی لگانے کا انتظام کر دیا گیا۔

مناسب تھا کہ یکساں محصول عاید کرنے کا فیصلہ کرتی اور اس سے صارفین پر جو زیادہ بار عاید ہوتا اس کو دوسری خرابی کے مقابلے میں کم نقصان رساں تصور کرتی۔

۱۱۔ محصولوں میں مزید تبدیلیاں

سوتی کپڑے کی گرنی کی صنعت کو زاید تامین اولاً قانون مالیہ[ل] ہند بابتہ مارچ ۱۹۳۱ء کے تحت حاصل ہوئی۔ جس کی رو سے سوتی کپڑوں کی درآمد پر ۵ فی صد زاید محصول بلحاظ قیمت عاید کیا گیا؛ اور اس کے بعد ذیلی قانون مالیہ[ل] بابتہ نومبر ۱۹۳۱ء کے تحت جس کی رو سے اس وقت کے جملہ درآمدی محصولوں پر ۲۵ فی صد فوقی محصول عاید کیا گیا' اور اس طرح برطانوی صنعت کے سادہ کپڑوں پر درآمدی محصول ۲۵ فی صد بلحاظ قیمت یا $\frac{3}{8}$ ۴ آنے فی پونڈ (ان میں سے جو بھی زائد ہو) اور غیر برطانوی سادہ سفید کپڑوں پر $\frac{1}{4}$ ۳۱ فی صد بہ لحاظ قیمت یا $\frac{3}{8}$ ۴ آنے فی پونڈ (ان میں سے جو بھی زاید ہو) مقرر ہوا۔ دوسری اشیا کے بارے میں برطانوی سامان پر ۲۵ فی صد اور غیر برطانوی سامان پر $\frac{1}{4}$ ۳۱ فی صد محصول تھا۔ مصنوعی ریشمی کپڑے پر جو ۴۰ فی صد زاید محصول لگایا گیا اس سے بھی یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ ہندوستان کے سوتی کپڑے کی صنعت کو مدد دے گا۔ دوسری طرف اسی زمانے میں جو نئے محصول کلوں کی درآمد پر (۱۰ فی صد) اور دوسری اشیا پر عاید کیے گئے ان کا اثر یہ ہوا کہ کپڑے کی تیاری کے مصارف ایسے زمانے میں بڑھ گئے جبکہ لوگوں کی قوت خرید، معاشی کساد بازاری اور قیمتوں کے گر جانے کی وجہ سے گھٹ گئی تھی۔ علاوہ ازیں خام کپاس پر $\frac{1}{2}$ آنہ فی پونڈ کا جو محصول درآمد نومبر ۱۹۳۱ء میں عاید کیا گیا تھا اس کے بعد یہ اندیشہ تھا کہ وہ اعلیٰ درجے کے کپڑے کی تیاری میں مزاحم

ل Indian Finance Act.

ل Supplementary Finance Act.

ہوگا جس کو ترقی دینے کی گرنیاں کوشش کر رہی تھیں۔

۱۲۔ ٹیرف بورڈ کی دوسری تحقیقات (۱۹۳۲ء)

چونکہ ان تامینی محصولوں کی مدت جو ۱۹۳۰ء کے ایکٹ کے بموجب عاید کیے گئے تھے ۳۱ مارچ ۱۹۳۳ء کو ختم ہونے والی تھی، اس لیے ٹیرف بورڈ کو اپریل ۱۹۳۲ء میں ہدایت کی گئی کہ وہ آیندہ کے لیے ہندوستان کی سوتی کپڑے کی صنعت کی تامین کے مسئلے کی تحقیقات کرے۔ لیکن قبل اس کے کہ بورڈ کی تحقیقات ختم ہوتی جاپان کی شرح مبادلہ (ین کی قیمت) بہت کم ہوگئی اور جاپان سے درآمد ہونے والے سوتی کپڑے کی قیمتیں گر گئیں۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شرح مبادلہ اور قیمتوں کا یہ اتار اس تامین کو بے اثر کر دے گا جو ۱۹۳۰ء کے محصولوں کے ذریعے سے ہندوستانی کپڑے کی صنعت کو دینا مقصود تھا۔ اس لیے جولائی ۱۹۳۲ء میں بورڈ کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ فوراً تحقیقات کرے۔ چنانچہ اس تحقیق کی بنا پر یہ طے پایا کہ ۳۰ اگست ۱۹۳۲ء سے غیر برطانوی کپڑے پر محصول درآمد بحساب ۳۱ ۱/۴ فی صد سے بڑھا کر ۵۰ فی صد کر دیا جائے اور غیر سرکاری سادے سفید کپڑے پر محصول بحساب پیمانہ ۳ ۳/۴ آنے فی پونڈ سے بڑھا کر ۵ ۱/۴ آنے فی پونڈ مقرر کیا جائے۔ ۸ جون ۱۹۳۳ء سے یہ شرحیں بڑھا کر علی الترتیب ۷۵ فی صد (بلحاظ قیمت) اور ۶ ۳/۴ آنے فی پونڈ کر دی گئیں، تاکہ جاپانی اشیا کی بھرمار کی پوری طرح روک تھام کی جائے۔ اسی اثنا میں ان تامینی محصولوں کی مدت میں جو ۱۹۳۰ء میں عاید کیے گئے تھے ۳۱ اکتوبر ۱۹۳۳ء تک کے لیے توسیع کی گئی تاکہ حکومت ہند کو کپڑے کی صنعت کے بارے میں ٹیرف بورڈ کی رپورٹ پر غور کرنے کا موقع ملے۔ اس مدت میں مزید توسیع ۳۰ اپریل ۱۹۳۴ء تک کر دی گئی اس لیے کہ ہندوستان اور جاپان کے درمیان جدید تجارتی راضی نامہ کا مسئلہ ابھی تک زیر غور تھا۔ یہ جدید معاہدہ ۱۹۰۴ء کے قدیم معاہدے کی جگہ لینے والا تھا جس کو حکومت ہند نے اپریل ۱۹۳۳ء میں اس لیے

منسوخ کر دیا تھا کہ اس کے تحت حکومت خاص طور پر جاپانی مال پر تامینی محصول عاید نہیں کرسکتی تھی۔ آخر کار ہندوستانی مجلس قانون ساز نے ایک قانون بنام "ہندوستان کے محصول تامین پارچہ بافی کی ترمیم کا قانون بابتہ ۱۹۳۴ء" ۲۶ر اپریل ۱۹۳۴ء کو منظور کیا جو یکم مئی سے نافذ ہوا۔ اس قانون نے ٹیرف بورڈ کی سفارشوں کو جو پارچہ بافی کی صنعت کو کافی تامین دینے سے متعلق تھیں عملی جامہ پہنایا۔ البتہ جاپان سے ۱۹۳۴ء میں جو تجارتی معاہدہ ہوا تھا اور انگلستان اور ہندوستان کے پارچہ بافی کی صنعت کے نمایندوں کے درمیان جو غیر سرکاری معاہدہ ہوا تھا (اور جو موڈی لینر معاہدے کے نام سے موسوم ہے) ان کا لحاظ رکھا گیا۔[1]

اس ایکٹ کی رو سے غیر برطانی کپڑے پر درآمدی محصول کی شرح ۵۰ فی صد اور سادے سفید کپڑوں کی حد تک ۵ ۱/۴ آنے فی پونڈ کی اقل شرح مقرر کی گئی۔[2] اسی قانون کے تحت ریشم کے کپڑے بانے کی صنعت کو بھی تامین دی گئی (دیکھو فصل ۳۸)۔ یہ قانون ۳۱ر مارچ ۱۹۳۹ء تک کے لیے نافذ کیا گیا۔

۱۴۔ پارچہ بافی کے لیے ایک خصوصی مجلس کروڑ گیری ۱۹۳۵ء

مسودہ ترمیم قانون پارچہ بافی پر بحث کے دوران میں سر جوزف بھورے وزیر تجارت نے یہ وعدہ کیا تھا کہ بمبئی لنکاشائر پارچہ بافی کے معاہدے کی دو سالہ مدت ختم ہونے پر برطانوی اشیا کے محصول کی شرحوں پر نظر ثانی کی جائے گی چنانچہ اس وعدے کے مطابق حکومت ہند نے ۱۰ر ستمبر ۱۹۳۵ء کو ایک خصوصی ٹیرف بورڈ مقرر کیا جس کے صدر نشین سر الگزینڈر مرے تھے

---

[1] دیکھو باب (۱۳)۔

[2] غیر برطانوی اشیا کے بارے میں درآمدی محصول کی یہ شرح ۸ر جنوری ۱۹۳۴ء سے نافذ تھی جب کہ ہندوستانی جاپانی گفت وشنید کے نتیجے کے طور پر محصول کو ۷۵ فی صد سے گھٹا کر ۵۰ فی صد کر دیا گیا تھا۔

اور بورڈ کو ہدایت کی گئی کہ وہ سلطنت متحدہ سے درآمد ہونے والی اشیا کے مقابلے میں ہندوستانی کپڑے کی صنعت کی تامین کے مسئلے کی تحقیقات کرکے رپورٹ پیش کرے۔ اسی خصوصی بورڈ سے یہ بھی کہا گیا کہ وہ ایسے محصولوں کی سفارش کرے جن کو عائد کرنے کے بعد سلطنت متحدہ سے درآمدہ اشیا کی قیمتیں اور ہندوستانی اشیا کی واجبی فروخت کی قیمتیں دونوں مساوی ہو جائیں۔ تاکہ اس طرح ہندوستانی کپڑے کی صنعت کی کافی تامین ہو سکے۔ لنکاشائر کے کارخانہ داروں نے اپنا ایک خاص وفد ہندوستان روانہ کیا تاکہ وہ ان کا مقدمہ بمبئی میں خصوصی مجلس کروڑگیری کے سامنے پیش کرے۔

بورڈ نے اپنی تحقیقات ڈسمبر ۱۹۳۵ء میں ختم کردی اور اس کی رپورٹ جون ۱۹۳۶ء میں شایع کردی گئی۔ اس کے بعد ہی حکومت ہند نے ہندوستان کے قانون کروڑگیری کی دفعہ ۴ (الف) کے بموجب یہ اعلان کیا کہ ٹیرف بورڈ کی متفقہ سفارش کے مطابق لنکاشائر کے کپڑے کے محصول کی شرحوں میں ۲۵ جون ۱۹۳۶ء سے فوراً کمی کردی جائے۔ ٹیرف بورڈ کی سفارشیں حسب ذیل تھیں[1]۔

(۱) سادہ سفید کپڑوں پر ۲۵ فی صد بلحاظ قیمت یا ۴$\frac{3}{8}$ آنے فی پونڈ (ان میں سے جو بھی زاید ہو) کا جو محصول تھا اس کو گھٹا کر ۲۰ فی صد بلحاظ قیمت یا ۳$\frac{1}{2}$ آنے فی پونڈ (دونوں میں سے جو بھی زاید ہو) کردیا جائے۔

(۲) حاشیہ دار سفید کپڑوں پر اور چھینٹوں کے علاوہ دوسرے رنگین اور سفید کپڑوں پر محصول کو بلحاظ قیمت ۲۵ فی صد سے گھٹا کر ۲۰ فی صد بلحاظ قیمت کردیا جائے۔ اس کمی کی سفارش اس بنا پر کی گئی کہ اس قسم کے ہندوستانی ساخت کے کپڑوں کی تامین کے لیے پہلے کے محصول ضرورت سے زیادہ تھے۔

[1] دیکھو ہندوستانی سوتی کپڑے کی صنعت کو تامین دینے کے بارے میں خصوصی ٹیرف بورڈ کی رپورٹ (۱۹۳۶ء)

(۳) سوت کا محصول بدستور قایم رہے۔ ٹیرف بورڈ نے چھینٹوں کے بارے میں اس لیے کوئی سفارش پیش نہیں کی کہ ہندوستان میں چھینٹ کی صنعت بالکل ابتدائی حالت میں تھی۔ اس کے علاوہ مصنوعی ریشم کے بارے میں پھر کوئی تجویز پیش نہ کی جاسکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بورڈ کو جو معلومات دستیاب ہوئے وہ ناکافی تھے۔

لنکاشائر نے ان سفارشوں پر مایوسی کا اظہار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ محصول میں حقیقت میں اتنی کمی نہیں کی گئی جتنا کہ حالات کا تقاضا تھا۔ [1] اور یہ کہ چھاپے دار کپڑے اور سوت کو نئے محصول کی فہرست سے خارج کردیا گیا۔ دوسری طرف ہندوستان کے سربرآوردہ کاروباری اشخاص نے یہ اعتراض کیا کہ محصول میں تخفیف ہندوستانی کارخانوں کے مفاد کے خلاف تھی، کیونکہ ہندوستانی صنعت کے اپنے طور پر پھلنے پھولنے کی بہت کم گنجایش تھی۔ حکومت کی اس کارروائی پر بھی سخت لعنت ملامت کی گئی کہ اس نے ہندوستانی مجلس قانون سازسے مشورہ کیے بغیر محصول کی شرحوں میں فوری کمی کا اعلان کردیا۔ "راضی نامہ اوٹاوا" کی تنسیخ سے بین سلطنتی تجارتی تعلقات کا کل مسئلہ پھر ڈوب چکا تھا، اس لیے یہ استدلال کیا گیا کہ حکومت کو ایک اہم برطانوی درآمد کے بارے میں ایسی عاجلانہ کارروائی اس وقت تک نہ کرنی چاہیے تھی جب تک کہ ہندوستان کو اپنی آیندہ تجارتی پالسی کو زیادہ واضح طور پر معین کرنے کا موقع نہ مل جاتا۔ علاوہ ازیں بظاہر اس کی بھی کوئی کوشش نہیں کی گئی کہ محصول کی کمی کے معاوضے میں لنکاشائر سے کوئی خاص مراعات حاصل کی جائیں۔ چونکہ "مودی لیز معاہدہ" جس کی رو سے لنکاشائر نے انگلستان کے کارخانوں میں ہندوستانی کپاس کا استعمال کرنے کی ذمے داری لی تھی ڈسمبر ۱۹۳۵ء میں ختم ہوگیا۔ اس لیے

---

[1] لنکاشائر کا استدلال یہ تھا کہ ہندوستانی صنعت ترقی کی ابتدائی حالت سے بڑھ چکی تھی، یہ کہ ہندوستان کا حریف دراصل جاپان تھا اور یہ کہ لنکاشائر کے کارخانے ہندوستانی کپاس کا استعمال روز افزوں کررہے تھے۔

یہ بھی واضح نہیں ہے کہ یہ ذمے داری اب کہاں تک باقی ہے۔

حکومت نے اپنی کارروائی کی حمایت میں یہ استدلال کیا کہ طریقۂ محصول کی حالت غیر یقینی ہونے سے کپڑے پر محصول درآمد کی آمدنی اپریل اور مئی ۱۹۳۶ء سے کم ہونا شروع ہوگئی تھی؛ یہ کہ حکومت کو ہندوستانی قانون کروڑگیری بابتہ ۱۸۹۴ء کے تحت جو اختیار دیا گیا تھا اس کو وہ محصول گھٹانے کے لیے بھی اسی طرح استعمال کر سکتی تھی جس طرح بڑھانے کے لیے؛ اور یہ کہ حکومت ہند اس اختیار سے دو مرتبہ پہلے کام لے چکی تھی؛ ایک تو اگست ۱۹۳۲ء میں جب کہ غیر برطانی (یا جاپانی) کپڑے کا محصول ۵۰ فی صد تک بڑھا دیا گیا تھا اور دوسرے جون ۱۹۳۳ء میں جبکہ اس کو ۷۵ فیصد تک بڑھا دیا گیا تھا۔ اس لیے حکومت نے جو کارروائی اختیار کی اس کی نظیر موجود تھی۔

"موڈی لینر راضی نامے" کی اس شرط کے متعلق کہ اس محصول کے ساتھ دوسرے زائد محصولوں میں بھی کمی کر دی جائے گی، حکومت ہند نے یہ بتلایا کہ راضی نامہ طے پانے کے بعد ایک ترمیمی قانون (۱۹۳۴ء) کے ذریعے سے اس محصول کو ۲۵ فی صد محصول (بلحاظ قیمت) کر دیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے وہ "زائد محصول" کی تعریف میں نہیں آتا تھا۔

۱۴۔ جوٹ کی صنعت بنگال میں سن کاتنے کی پہلی گرنی ۱۸۵۵ء میں بمقام رش را سیرام پور کے قریب کھولی گئی۔ اور میکانیکی قوت سے چلنے والا پہلا راچھ ۱۸۵۹ء میں قایم ہوا۔ ابتدائی تیس سالوں میں صنعت کی ترقی کی رفتار سست رہی، اس لیے کہ سن کی مصنوعات کی برآمد کی نوبت شاذ ہی آتی تھی۔ لیکن اس ابتدائی سست ترقی کے دور میں بھی وقتاً فوقتاً خاصی گرم بازاری رہی۔ چنانچہ ۱۸۶۸ء تا ۱۸۷۳ء گرنیوں نے بلا مبالغہ روپیہ رولا اور ۱۵ تا ۲۵ فی صد مقسوم ادا کیا گیا۔ اس کی وجہ سے نئی گرنیاں بہت بڑی تعداد میں کھلیں یہاں تک کہ پیداوار کی افراط ہوگئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منافع میں بہ سرعت کمی ہوگئی۔

صنعت پر نازک وقت آگیا اور بہت سی گرنیوں کو بند ہونا پڑا لیکن سن کی صنعت کا دائرہ کافی وسیع ہو چکا تھا۔ چنانچہ ۱۸۸۱ء میں صرف بنگال میں قوت سے چلنے والے ۵۰۰۰ راچھ کام کر رہے تھے۔ ۱۸۸۵ء سے ٹاٹ کے تھیلوں کے مقابلے میں سن کے کپڑے کی تیاری کی طرف زیادہ میلان رہا۔ چنانچہ ۱۸۷۷ء اور ۱۹۱۵ء کے درمیان جہاں بوروں کے راچھوں میں ۲۹۵۰ سے ۵۰۷۷ تک اضافہ عمل میں آیا۔ سن کے کپڑے کے راچھ ۹۱۰ سے بڑھ کر ۲۲۰۳۰ ہو گئے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ بوروں کے راچھوں کے ۳۰۴ فی صد کے مقابلے میں کپڑے کے راچھوں میں ۲۴۰۰ فی صد اضافہ ہوا۔ جنگ عظیم کی وجہ سے سن کی صنعت کو کافی فروغ ہوا اس لیے کہ اس زمانے میں اس صنعت کو جنگ کے مختلف میدانوں میں خندقوں کے لیے ریت کے تھیلوں اور جنگی اغراض کے لئے کنوس کے کپڑے مثلاً خیمے کے پارچے، موم جامہ اور واگنوں کے سرپوشوں وغیرہ کی مانگ پورا کرنے کا موقع ملا۔ اس جدید ترقی میں اس وجہ سے اور اضافہ ہوا کہ ۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۶ء میں جرمنی کے روس کو پامال کر دینے سے روس کے سن کی رسد تقریباً بند ہو گئی تھی اور اس کے بجائے ہندوستانی جوٹ کی مانگ تھی۔

معمولی تغیرات سے قطع نظر سن کی صنعت کی سرگزشت سے بحیثیت مجموعی، مستقل و مسلسل ترقی ظاہر ہوتی ہے۔ بنگال میں ۱۸۹۱ء میں قوت سے چلنے والے ۸۰۰۰ راچھ؛ ۱۹۰۱ء میں ۱۶۰۰۰ راچھ؛ ۱۹۱۱ء میں ۳۳۰۰۰ راچھ؛ ۱۹۲۱ء میں ۴۳۰۰۰ راچھ؛ ۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۷ء میں ۵۱۰۶۱ راچھ اور ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء میں ۶۱۸۰۰ راچھ کام کر رہے تھے۔ مندرجۂ ذیل اعداد و شمار سے بھی نمایاں ترقی ظاہر ہوتی ہے جو خاص کر جنگ عظیم اور اس کے بعد کے زمانے میں ہوئی۔ سن کی صنعت پر دنیا کی کساد بازاری کے جو اثرات پڑے ان کو بعد کی فصل میں بیان

کیا گیا ہے۔

	کام کرنے والی کمپنیوں کی تعداد	مجموعہ اصل (لاکھ روپیہ)	تعداد (ہزار میں)		
			کام کرنے والے آدمی	راچھ	تکلے
اوسط سنہ ۱۸۷۹-۸۰ء تا سنہ ۱۸۸۳-۸۴ء	۲۱	۲۷۰٫۷	۳۸٫۸	۵٫۵	۸۸
سنہ ۱۸۹۹-۱۹۰۰ء تا سنہ ۱۹۰۳-۰۴ء	۳۶	۶۸۰	۱۱۴٫۲	۱۶٫۲	۳۳۴٫۶
سنہ ۱۹۰۹-۱۹۱۰ء تا سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء	۶۰	۱۲۰۹	۲۰۸٫۴	۳۳٫۵	۶۹۱٫۸
سنہ ۱۹۱۴-۱۵ء تا سنہ ۱۹۱۸-۱۹ء	۷۳	۱۴۰۳٫۶	۲۵۹٫۳	۳۹٫۷	۸۲۱٫۲
سنہ ۱۹۲۵-۲۶ء	۹۰	۲۱۳۴٫۷	۳۳۱٫۳	۵۰٫۵	۱۰۶۳٫۷
سنہ ۱۹۲۶-۲۷ء	۹۳	۲۱۱۹٫۸	۳۳٫۶	۵۱	۱۰۸۳٫۸
سنہ ۱۹۲۸-۲۹ء	۹۵	۲۳۳۶٫۷	۳۴۳٫۹	۵۲	۱۱۰۸٫۱
سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء	۹۸	۲۱۸۶٫۶	۳۴۳٫۲	۵۳٫۹	۱۱۴۰٫۴
سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء	۱۰۰	۲۳۶۰٫۶	۲۷۶٫۸	۶۱٫۴	۱۲۲۰٫۵
سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء	۱۰۳	۳۳۶۰٫۶	۲۷۶٫۸	۶۱٫۴	۱۲۲۰٫۵
سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء	۹۹	۲۳۷۰٫۶	۲۵۷٫۱	۵۹٫۵	۱۱۹۴٫۴

برسوں تک برطانیہ عظمیٰ ہی تنہا وہ ملک تھا جو سن کی مصنوعات تیار کرتا تھا اور ڈنڈی اس صنعت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اب کلکتے نے ڈنڈی کی سابقہ تجارت کا بہت بڑا حصہ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ ہندوستانی گرنیوں میں سن کا صرف ڈنڈی کے مقابلے میں تقریباً ۵ گنا ہے۔ سنہ ۱۹۲۸ء تا سنہ ۱۹۲۹ء میں بحری راستے سے برآمد کردہ سن کی مصنوعات کی قیمت ۵۶،۹ کروڑ روپے ہوئی؛ اس کے برخلاف سنہ ۱۸۹۰-۹۱ء تا سنہ ۱۹۰۳-۰۴ء کے زمانے میں برآمد کی اوسط قیمت صرف ۲،۱۱ کروڑ روپے تھی۔ سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء میں تجارتی کساد بازاری کے باعث، ان برآمد کردہ مصنوعات کی قیمت گھٹ کر ۲۱،۴۸ کروڑ روپے رہ گئی۔ سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء سے حالت کچھ بہتر معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء میں مصنوعات کی برآمد کی قیمت ۲۷،۹۴ کروڑ روپے وصول ہوئی۔ بنگال کی گرنیوں میں جنگ عظیم سے پیشتر خام سن کی پیداوار کا نصف سے بھی کم حصہ صرف ہوتا تھا، اس کے مقابلے میں آج کل تقریباً ۲/۳ حصہ صرف ہوتا ہے۔ اس طرح بنگال، باقی کل دنیا کے مقابلے میں سن کی مصنوعات جو زیادہ تر ٹاٹ کے تھیلوں، ٹاٹ کے کپڑوں اور سن کی ڈوری اور رسی کی شکل میں ہوتے ہیں تقریباً دوگنی مقدار میں تیار کرتا ہے[1]۔ سن کی اشیا کی طلب کا انحصار دنیا کی زرعی پیداوار کی مقدار پر ہے؛ اس لیے کہ داخلی اور بین قومی تجارت میں زرعی پیداوار کو ایک مقام سے دوسرے مقام کو منتقل کرنے کے لیے سن کی مصنوعات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس سال ہندوستان میں فصلیں اچھی ہوتی ہیں سن کی مصنوعات کی برآمد کم ہو جاتی ہے اس لیے کہ کثیر زرعی پیداوار کی منتقلی کے لیے خود ملک میں کافی تھیلے درکار ہوتے ہیں۔ اسی طرح غیر ملکی طلب کی کمی بھی، جیسی کہ حالیہ معاشی کساد بازاری کے زمانے میں رونما ہوئی سن کی مصنوعات کی برآمد پر

[1] دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا چودھواں ایڈیشن زیر عنوان "ہندوستان"

مخالف اثرات ڈالتی ہے۔ سن کے بدل کی تلاش میں اب تک کوئی زیادہ کامیابی نہیں ہوئی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سن کے اور زیادہ مصرف دریافت ہوئے ہیں۔ ہندوستانی مرکزی سن کمیٹی حال (۱۹۳۶ء) میں قایم ہوئی ہے اور اس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ سن اور سن کی پیداوار کے بارے میں تحقیقاتی کام کرے گی تاکہ بازار ہاتھ سے نکل جانے کے امکانات کی روک تھام کی جائے۔

۱۵۔ سن اور کپاس کی صنعتوں کا مقابلہ۔

ہندوستان میں سن اور کپاس کی مصنوعات بڑے پیمانے کی جدید صنعتوں کی ترقی کی نمایاں مثال ہیں۔ بین الاقوامی تجارت میں سن کی صنعت روئی کی صنعت کے مقابلے میں بدرجہا مستحکم ہے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کو سن کا اجارہ حاصل ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، ہندوستان کی دو اہم ترین منظم صنعتوں کے درمیان ایک نمایاں تضاد یہ ہے کہ جہاں سوتی کپڑے کی گرنی کی صنعت تقریباً سب کی سب ہندوستانی ہاتھوں میں ہے اور ہندوستانی اصل سے چل رہی ہے۔ سن کی صنعت کی ابتدا اور ترقی یورپی خصوصاً اسکاچستانی اصل اور جدوجہد سے ہوئی ہے۔ ایک اور فرق یہ ہے کہ کپاس کی صنعت میں لامرکزیت پائی جاتی ہے اور سن کی صنعت میں انتہائی مرکزیت اور تحصیر ہے؛ چنانچہ ۴۰ میل کے دائرے کے اندر تقریباً ۹۰ سن کی گرنیاں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں ایک متوسط کپاس کی گرنی کے مقابلے میں ایک متوسط سن کی گرنی بدرجہا بڑی ہوتی ہے جیسا کہ ڈاکٹر پلے نے کہا ہے حسن انتظام میں سن کی صنعت ہندوستان میں اپنی آپ نظیر ہے[1]۔ اس اعلیٰ انتظام میں صنعت کی مرکزیت

۱؎ دیکھو پی پی پلے کی کتاب موسومہ "ہندوستان کے معاشی حالات" (Economic Conditions In India.) صفحہ ۱۷۵

معاون ہے۔ ہندوستانی سن کی گرنیوں کی انجمن[1] ۱۸۸۴ء میں قایم ہوئی۔ دوسرے اغراض کے منجملہ اس انجمن کی ایک غرض یہ تھی افراط پیدایش وغیرہ کو روکنے کی خاطر گرنیوں کے کام کے گھنٹوں میں کمی کے لیے متحدہ کارروائی کی جائے۔ جنگ عظیم کے زمانے میں کثیر منافعہ اس صنعت میں افراط پیدایش کا باعث ہوا اور جنگ ختم ہوجانے کے بعد صنعت کو برے دن دیکھنے پڑے۔ مانگ میں تو کمی ہوگئی، لیکن مصارف پیدایش بڑھ گئے جس کا سبب یہ تھا کہ سن کی قیمت اور اجرتوں میں اضافہ ہوگیا تھا[2]۔ ۱۹۲۱ء میں انجمن نے ایک امریکی کاروباری ماہر کو اس لیے مدعو کیا کہ وہ یہ مشورہ دے کہ کہاں تک ایک ایسا جوٹ ٹرسٹ قائم کرنا ممکن ہے جو جوٹ کی پیدایش اور اس کی قیمتوں کو قابو میں رکھ سکے۔ لیکن کساد بازاری کے ختم ہوجانے کی وجہ سے یہ تجویز سردست ترک کردی گئی ہے۔ کلکتے کی جوٹ کے تاجروں کی انجمن[3] اپنے ارکان کے مشترکہ اغراض کی نگرانی کرتی ہے[4]۔

۱۶۔ کساد بازاری کے زمانے میں سن کی صنعت

موجودہ کساد بازاری تقریباً ہر صنعت پر کم و بیش اثر انداز ہوئی، چنانچہ اس کے اثرات سے جوٹ کی گرنی کی صنعت بھی محفوظ نہ رہ سکی۔ قیمتوں کی کمی، صرف کے بڑے مرکزوں پر ذخائر کی بڑی مقدار کی موجودگی اور آئے دن کے مزدوروں کے فسادات وغیرہ کے باعث جوٹ کی صنعت کو کافی نقصان ہوا اور ہو رہا ہے۔ لیکن اس نے زمانۂ بعد از جنگ کی مشکلات کا مقابلہ بمبئی کی سوتی کپڑے کی گرنی کی صنعت کی نسبت اچھی طرح

---

[1] Indian Jute mills Association

[2] سن کی صنعت کے حالیہ تبصرے کے لیے دیکھو میتھسن کی کتاب محولۂ سابق باب ۵۔

[3] Calcutta Jute Dealers Association

[4] دیکھو "انڈین ایر بک" برائے ۱۹۳۴ء و ۱۹۳۵ء صفحہ ۳۰۰۔

کیا حقیقت میں یہ نتیجہ ہے اس احتیاط کا کہ اس نے اپنے مد محفوظ کو مستحکم رکھا اور حسب ضرورت کام کے گھنٹوں میں باقاعدہ کمی کی۔ اُن دس سالوں میں جو مارچ ۱۹۳۶ء کو ختم ہوئے پیداوار کم تیار کرنے کی پالسی پر مسلسل عمل ہوتا رہا۔ جو گرنیاں انجمن کی رکن تھیں انھوں نے ۴۸ گھنٹے فی ہفتہ کے حساب سے کام کیا، اور اپنے کچھ راچھ بھی بند کر دیے جن کا تناسب ۱۹۳۱ء میں ۵ فی صد اور ۱۹۳۵ء میں ۱۰ فی صد رہا۔ بند راچھوں کا تناسب جو بعد میں کم ہو گیا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ گرنیاں جو پیداوار کم کرنے کی تجویز میں شریک نہیں ہوئی تھیں مسابقت کر رہی تھیں۔ اس کے علاوہ تجارتی حالات بھی بہتر ہوتے معلوم ہو رہے تھے۔ نیز دوسرے مقامات کے کارخانوں سے مسابقت کا اندیشہ تھا۔ جو گرنیاں انجمن کی رکن نہیں بنی ہیں ان سے اب تک کوئی معاہدہ نہیں ہوا ہے۔ ۱۹۳۷ء کا پورا سال سن کی صنعت کے لیے بہت نازک زمانہ تھا، اس لیے کہ اس سال پیداوار بے روک تیار ہوئی اور مزدوروں کے ہنگامے ہوتے رہے۔ چنانچہ جیسے جیسے سال گزرتا گیا قیمتوں میں کمی ہوتی گئی۔

۱۷۔ آہن و فولاد کی صنعت۔ کوئی دوسری صنعت آہن و فولاد کی صنعت سے زیادہ بنیادی یا "کلیدی" صنعت کہلانے کی مستحق نہیں ہے اور اس کی قومی اہمیت کے بارے میں جو بھی مبالغہ کیا جائے وہ کم ہے۔ ہندوستان اور انگلستان کے صنعتی انقلاب کے درمیان ایک نمایاں تضاد یہ ہے کہ ہندوستان میں انقلاب کا آغاز صنعت پارچہ بافی میں بھاپ کے استعمال سے ہوا۔ اس کے برخلاف انگلستان میں آہن و فولاد جیسی صنعتوں کی نشو و نما کے ساتھ انقلاب شروع ہوا۔ انگلستان کا جدید صنعتی نظام آہن و فولاد کی صنعت اور میکانیکل انجینری کی ذیلی صنعتوں کی مستحکم بنیادوں پر قائم ہوا تھا۔ لیکن ہندوستان میں جو انقلاب آیا اس کے

دوران میں اس قسم کی کوئی صورت نہیں پیدا ہوئی۔ حال حال تک ہندوستانی صنعتوں کا انحصار درآمدہ، کلوں، آلات اور عام آہنی سامان پر تھا۔ آہن و فولاد کی صنعت کی جو کچھ بھی قومی اہمیت ہے اس سے اب حکومت اور عوام دونوں واقف ہو چکے ہیں۔ چنانچہ، بعض اہم تدابیر جن کو عنقریب بیان کیا جائے گا، اس صنعت کی سریع ترقی کو یقینی بنانے کے لیئے اختیار کی گئی ہیں۔

سنہ۱۸۳۰ء ہی میں جنوبی ارکاٹ کے علاقے میں بیڑ اور فولاد بنانے کے جدید طریقوں کو رائج کرنے کی انتہائی کوششیں کی گئیں۔ مگر یہ سب کوششیں ناکام ہوئیں، یہاں تک کہ سنہ۱۸۷۵ء میں جھریا کی کوئلے کی کانوں کے قریب براکر ایئرن ورکس نے کام شروع کیا بعد میں اس کارخانے کو بنگال اسٹیل اینڈ ایرن کمپنی نے سنہ۱۸۸۹ء میں حاصل کر لیا لیکن کمپنی کو منافعہ سنہ۱۸۹۹ء ہی سے ملنا شروع ہوا۔ موجودہ صدی کے آغاز پر اس کمپنی کی سالانہ پیداوار تقریباً ۳۵۰۰۰ ٹن تھی۔ فولاد سازی کی کوششیں بھی کی گئیں مگر اس میں بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ جس کے اسباب یہ تھے کہ درآمدہ فولاد کی قیمت کم تھی، مختلف فولادی سامان جو تیار کیا گیا اس کی مانگ کم رہی۔ اس وقت جو بیڑ تیار ہوتا تھا وہ فولاد سازی کے لائق نہ تھا اور آتشی خشت اور فیرومینگنیز[1] کی رسد درآمد کے ذریعے سے حاصل کرنی پڑتی تھی لیکن سنہ۱۹۱۰ء میں بنگال کمپنی کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا، جبکہ سنگ بھوم اور مان بھوم کے علاقوں میں خام لوہے کا ایک نیا معدن دریافت ہوا اور اس سے [ایک] خام دھات نکالی جانے لگی۔

اس صنعت کی تاریخ کا دوسرا اہم دور اس وقت شروع ہوا جبکہ ٹاٹا کمپنی قائم ہوئی۔ جے، ین، ٹاٹا آنجہانی نے سنہ۱۹۰۷ء میں سنگ بھوم کے

---

[1] دیکھو ایک کتاب موسوم بہ Industrial Hand book of Munitions Board. صفحہ ۱۳۸ تا ۱۳۹۔

علاقے ہیں بمقام سکچی یہ کمپنی قائم کی، اور ۱۹۰۸ء میں کارخانے کی تعمیر شروع ہوئی۔ بیڑ پہلی مرتبہ دسمبر ۱۹۱۱ء میں اور فولاد موجودہ زمانے میں پہلی مرتبہ ۱۹۱۳ء میں تیار کیا گیا یہاں تک کہ ۱۹۱۶ء میں جنگی ضرورت کے زیر اثر کل کارخانہ پوری قوت کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ اس طرح وہ فکر و پریشانی کا دور جو اس نوعیت کے نئے کاروبار میں خاص کر بے روک غیر ملکی سابقت کی موجودگی میں ہونا ضروری تھا ختم ہوگیا اور کارخانہ مستحکم بنیادوں پر قائم ہوگیا، چنانچہ عراق، فلسطین، مشرقی افریقہ اور سالونیکا میں فوجی ریلوں کی تعمیر کی غرض سے آہنی پٹریاں اور تختے کثیر مقدار میں مہیا کرکے جنگ کو جاری رکھنے میں اس کمپنی کی امداد بیش بہا ثابت ہوئی۔ ۱۹۱۷ء میں اس کی توسیع و ترقی کی ایک بڑی اسکیم مرتب ہوئی جو ۱۹۲۴ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچ سکی۔ اس تاخیر کا باعث زمانۂ جنگ اور زمانۂ بعد از جنگ کی مشکلات تھیں جو خاص کر مطلوبہ کلوں کی درآمد کے سلسلے میں رونما ہوئی تھیں۔ پرانی مشینیں، فولادی سامان مثلاً ریلیں بھاری تعمیری سامان (مثلاً شہتیر، آہنی زاویے اور نالیاں)، سلاخیں ہلکا تعمیری سامان، ہلکی پٹریاں اور جوڑ تختیاں تیار کرتی تھیں۔ جدید مشینیں ۱۹۲۶ء سے چالو ہیں اور وہ تختیاں، چادریں، (سیاہ اور جستی)، چادری سلاخیں اور چادری سلیپر وغیرہ زائد سامان تیار کر رہی ہیں[1]۔ ٹاٹا کے کارخانوں کی کامیابی کی بدولت بعض نئی کمپنیاں وجود میں آگئی ہیں، مثلاً آسن سول کے قریب ہیرا پور میں ۱۹۱۸ء میں مسرز برن اینڈ کو کلکتہ نے یونائیٹڈ اسٹیل کارپوریشن آف ایشیا قائم کی؛ اور ۱۹۲۳ء میں بمقام بھدراوتی میسور اسٹیٹ ائرن ورکس اور ایسٹرن ایرن ورکس قائم ہوئے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ آخر الذکر کارخانے کی جھکڑ بھٹیوں میں لکڑی کا کوئلہ جلایا جاتا ہے۔

---

[1] دیکھو ٹیرف بورڈ کی رپورٹ فولادی صنعت پر (۱۹۲۶ء) فقرہ ۱۴ تا ۱۵۔

صنعت میں جو توسیع و ترقی ہوئی اس کا اندازہ اس کی پیداوار اور درآمدہ سامان کے اعداد سے ہوسکتا ہے۔ موجودہ صدی کے آغاز میں پِگ کی پیداوار ۳۵ر۰۰۰ ٹن تھی جو بڑھ کر ۱۹۱۴ء میں ۲۳۶ر۲۸۲ ٹن؛ ۱۹۱۹ء میں ۳۲۲ر۲۶۸ ٹن؛ اور ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء میں ۱۳۷۶ر۰۰۰ ٹن ہوگئی۔ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء میں برآمد کم ہو جانے سے پگ کی پیداوار ۱۱۴۱ر۰۰۰ ٹن تک گھٹ گئی۔ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں ۱۵۷۵ر۰۰۰ ٹن پگ تیار ہوا جس میں سے ۴۷۵ر۰۰۰ ٹن جس کی قیمت ۱۲۹ لاکھ روپیہ تھی برآمد کیا گیا اور جاپان نے اس کا بیشتر حصہ خریدا۔ جاپان کے بعد سلطنت متحدہ اور ریاستہائے متحدۂ امریکا ہندوستانی پگ کے اہم خریدار ہیں۔ ہندوستانی پگ بلحاظ قسم بر اعظمی پیداوار سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ چنانچہ پگ کی درآمد اب بالکل برائے نام رہ گئی ہے؛ مثلاً ۱۹۳۶-۱۹۳۷ء میں اس کی درآمد ۱۵۰۰ ٹن تھی اور یہ کل مقدار سلطنت متحدہ سے آئی۔ ۱۹۱۶-۱۹۱۷ء میں فولاد کی پیداوار ۱۳۹ر۴۳۳ ٹن تھی، جو ۱۹۲۷-۲۸ء میں بڑھ کر ۵۹۹ر۵۶۵ ٹن ہوگئی، اور اسی مدت میں فولادی تیار سامان کی مقدار ۸۰۵ر۲۶۷ ٹن سے بڑھ کر ۴۲۸ر۶۵۴ ٹن ہوگئی۔ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں فولادی کندوں کی پیداوار ۸۶۱ر۰۰۰ ٹن اور فولادی سامان کی پیداوار ۶۹۲ر۰۰۰ ٹن تھی۔ آج کل کی جنگی تیاریوں کی عالمگیر تحریک آہن و فولاد کی صنعت کے حق میں محرک ثابت ہوئی۔ ہندوستان بھی اپنی صنعت کو مستحکم کرنے میں دنیا کی اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔

ہندوستان اپنی روز افزوں پیداوار کے باوجود اب بھی بڑی حد تک بیرونی لوہے اور فولاد کا محتاج ہے۔ زمانۂ قبل از جنگ میں ہندوستان میں لوہے اور فولاد کی درآمد کا اوسط ۸۰۰ر۰۰۰ ٹن تھا جس کی قیمت تقریباً ۱۲ء۴ کرو[ڑ]

سلہ دیکھو ایک رپورٹ موسومہ بہ ریویو آف دی ٹریڈ آف انڈیا (تبصرہ بر تجارت ہندوستان) برائے ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء صفحہ ۵۰۔

روپے ہوتی تھی۔ جنگ عظیم کے پانچ سالوں میں درآمد کا اوسط گھٹ کر ۲۲۲۰۰۰ ٹن رہ گیا۔ جس کی قیمت تقریباً ۱۱ء۱۰ کروڑ روپے تھی۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ ٹاٹا کمپنی نے اپنی پیداوار بڑھائی اور حکومت کو جنگی ساز و سامان مہیّا کیا۔ جنگ کے بعد کے زمانے میں درآمد بتدریج بڑھتی گئی۔ زمانۂ بعد از جنگ کا پنج سالہ اوسط ۶۶۱۰۰۰ ٹن قیمتی ۸ء۳۲ کروڑ روپے تھا۔ اس میں سنہ ۱۹۲۹ء-۳۰ء میں درآمد بڑھ کر ۹۶۸۰۰۰ ٹن ہوگئی جس کی قیمت ۱۷ء۱۶ کروڑ روپے تھی۔ ملک میں پیداوار کی زیادتی کے باوجود درآمد میں اضافہ ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ ریلوں اور دوسرے کارہائے عامّہ نیز تجارت تعمیر میں بیرونی اشیاء کی کھپت روزافزوں تھی۔ جنگ کے بعد کے زمانے میں درآمد بڑھ گئی جس سے اس صنعت کی تائین کے لیے ایک اور دلیل مل گئی۔ عالمگیر معاشی کساد بازاری اور ملکی پیداوار کی زیادتی کے باعث حالیہ سالوں میں درآمد پھر کم ہوگئی ہے چنانچہ سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء میں درآمد کی مقدار ۳۲۹۰۰۰ ٹن تھی جس کی قیمت ۲۲ء۷ کروڑ روپے تھی۔ سنہ ۱۹۳۶ء تا سنہ ۱۹۳۷ء میں مقدار پھر گھٹ کر ۳۶۳۰۰۰ ٹن ہوگئی جس کی قیمت ۹۴ء۵ کروڑ روپے تھی۔

تائین کا مسئلہ چھیڑنے سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ ان ترقیوں کا ذکر کر دیا جائے جو ضمنی صنعتوں کے قائم ہونے سے رونما ہوئیں۔ یہ ضمنی صنعتیں مع ان صنعتوں کے جو ذیلی پیداوار سے کام لیتی تھیں ساکچی[1] کے نواح میں قائم ہوئیں۔ توسیع کی تجویز کے تحت جو مختلف مصنوعات تیار کی جاتی ہیں ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں:- فولادی نلیاں، قلعی، تختی، مینا کاری کا سامان، تار، کیلیں، ریلوں کے واگن، چائے اور سن کی گرہوں کی کلیں، آلات کشاورزی، جستی سامان، فولاد کا ڈھلا ہوا سامان، بھاری کیمیاوی مرکبات، گندھک کا ترشہ،

[1] جنگ عظیم کے بعد ساکچی کا نام بدل کر جمشید پور رکھا گیا۔

نائٹرک ترشہ، کھاد، چونا، اموینیم سلفیٹ وغیرہ۔ اس غرض سے کئی صنعتی کمپنیاں قائم کی جا چکی ہیں۔ اس طرح جمشید پور اور اس کا نواحی علاقہ ترقی کر کے جدید صنعتوں کا مرکز بن گیا ہے۔

۱۸۔ فولاد و آہن کی صنعت کو تامین۔ ۱۹۲۳ء کے ابتدائی حصے میں مجلس قانون ساز نے امتیازی تامین کی جو پالیسی اختیار کی تھی اس کو ہندوستان میں پہلی دفعہ صنعت آہن و فولاد کے بارے میں عملی جامہ پہنایا گیا۔ چنانچہ ایک ٹیرف بورڈ قائم کیا گیا اور پہلا کام جو اس ٹیرف بورڈ کے سپرد ہوا یہ تھا کہ فولاد کی صنعت کو تامین دینے کے بارے میں ٹاٹا اسٹیل اینڈ آئرن کمپنی کے مطالبے کی تحقیق کرے۔ کمپنی نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ موجودہ ۱۰ فی صد محصول درآمد بلحاظ قیمت کو بڑھا کر ۳۳½ فی صد کر دیا جائے تا کہ غیر ملکی فولاد و آہن کی بھرمار کے مقابلے میں صنعت کی کافی تامین ہو سکے۔ بھرمار کے مواقع اس وجہ سے پیدا ہو گئے تھے کہ عالمی کساد بازاری کا دور تھا اور یورپی ممالک کے مبادلات کی شرح گر چکی تھی۔ اس کے علاوہ غیر ممالک میں یہ صنعت بہت پہلے سے قائم تھی۔ اس لیے ہندوستانی نوخیز صنعت کے مقابلے میں وہاں اس کی حالت کافی مستحکم ہو چکی تھی۔ کمپنی نے مالی کمیشن کی اس رائے کی طرف بھی توجہ دلائی کہ ایسی اہم کلیدی صنعت کی خوشحالی، قومی تحفظ و ترقی کے لحاظ سے ضروری تھی، اور وہ عظیم الشان خدمات یاد دلائیں جو اس صنعت نے گزشتہ جنگ عظیم کے زمانے میں حکومت کے لیے انجام دی تھیں۔

ٹیرف بورڈ غور و تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ تامین کے استدلال بے بنیاد نہ تھے، اور یہ کہ اسی زمانے میں جبکہ ٹاٹا کمپنی نے توسیع و ترقی کی عظیم الشان تجویز کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا تھا شدید غیر ملکی مسابقت کی وجہ سے ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی۔ بورڈ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ صنعت ان

تمام حالات و شرائط کو پورا کر رہی تھی جو مالی کمیشن نے پیش کیے تھے ہندوستان کو فولاد کی تیاری میں بہت سہولتیں ہیں۔ کیونکہ سنگھبوم اور اڑیسہ کی لوہے کی کانوں میں لوہے کی بہتات ہے۔ اور یہ دونوں مقام کوئلے کی کانوں سے بھی کچھ زیادہ دور واقع نہیں ہیں۔ کوکی کوئلے (Coking Coal) کی جتنی مقدار دستیاب ہو سکتی ہے وہ ملک کی ضرورتوں کے لیے کافی ہے علیٰ ہذا چونے کا پتھر اور ڈولومائٹ اکثر اغراض کے لیے عمدہ اور کافی مقدار میں دستیاب ہوتا ہے۔ دوسری قسموں کی اکثر مطلوبہ خام اشیا مثلاً مینگنیز اور دشوار گداز اینٹیں بنانے کا سامان کافی مقداروں میں موجود ہے۔ آہن و فولاد کی صنعت کے لیے ایک اور سہولت یہ ہے کہ ملک ہی میں ایک بڑا اور وسعت پذیر بازار موجود ہے۔ لیکن مزدوروں کے بارے میں ہندوستان کو ابھی کچھ دقتیں ہیں جو ایسے ملک میں ہونا ضروری ہیں جو زیادہ تر زراعتی ہو اور جہاں صنعتی تجربہ اور تربیت ابھی حاصل کرنا باقی ہو۔ چنانچہ سردست ماہر نگرانکاروں کو یورپ اور امریکا سے طلب کرنا ضروری ہوگیا ہے۔ لیکن یہ ایک عارضی دقت ہے جو آخرکار رفع ہوجائے گی۔ بورڈ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر تامین نہ دی گئی تو آیندہ کئی سال تک صنعت کے ترقی کرنے کی توقع نہ ہوگی۔ بلکہ اس کا قوی اندیشہ تھا کہ وہ بالکل تباہ ہوجائے۔ یہ بھی خیال کیا گیا کہ غالباً آیندہ دو یا تین سالوں میں فولاد کے مصارف پیدائش میں بڑی حد تک کمی ہوجائے گی اور قریبی زمانے میں صنعت تامین کے سہارے بغیر اپنے پیروں پر کھڑی ہونے کے قابل ہوجائے گی۔ بورڈ نے اس امر سے اتفاق کیا کہ یہ صنعت، فوجی اغراض کے لیے بھی نہایت اہم اور ضروری ہے اور اس لحاظ سے تامین کی خاص طور سے مستحق ہے۔ یہ توقع کی گئی تھی کہ مصارف پر جو بار پڑے گا وہ عارضی ہوگا اور زیادہ لوگوں پر تقسیم ہوجائے گا۔

مسودۂ قانون تامین فولاد، جس میں بورڈ کی سفارشیں شامل تھیں،

ہندوستان کی مرکزی مجلس قانون ساز کے ایک خاص اجلاس منعقدۂ مئی اور جون ۱۹۲۴ء میں غور و بحث کے بعد منظور ہو گیا۔ اس کی رو سے فولاد کی تیار کی ہوئی بعض مصنوعات کے محصول میں اضافہ کر دیا گیا، اور ہندوستان کی بنی ہوئی بھاری فولادی پٹریوں، جوڑ تختیوں اور ریل کی واگنوں کے لیے مالی امداد منظور کی گئی۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۵ء میں مالی امداد کی کل مقدار تقریباً ۲۴۲ لاکھ روپے ہوئی فولادی سلاخوں پر ۴۰ روپے فی ٹن اور فولادی چادروں پر ۳۰ روپے فی ٹن کے حساب سے محصول درآمد مقرر کیا گیا۔ یہ طے کیا گیا کہ اس مدت کے اختتام پر مالی امداد اور محصول، دونوں کی نظر ثانی کی جائے۔

فولاد سے خام مال کے طور پر کام لینے والی صنعتوں کے مفاد کے تحفظ کے لیے ذیلی تامینی تدابیر اختیار کرنی پڑیں۔ اس امر کا قرینہ تھا کہ تامین کے باعث فولاد کی قیمت کا اضافہ، ایسے زمانے میں انجینیری کی صنعت کے اکثر شعبوں کے منافی ہو جبکہ وہ غیر ملکی مسابقت کے تحت اپنی سنبھال بہ مشکل کر سکتی تھی۔ ٹیرف بورڈ نے فولاد کی تامین کے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے چند سفارشیں پیش کیں جن کو حکومت اور مجلس قانون ساز نے منظور کر لیا۔ درآمدہ فولادی مصنوعات پر چند مستثنیات کے ساتھ اعلیٰ محصول درآمد عائد کر کے انجینیری کی صنعت کو تامین دی گئی۔

لیکن برِاعظم یورپ کے فولاد کی قیمت کی کمی اور شرح مبادلہ کے کم و بیش اشلنگ ۶ پنس پر برقرار ہو جانے کے باعث بہت جلد صنعت فولاد کو دی ہوئی تامین کا اثر بڑی حد تک زائل ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں مالی امداد کو بڑھا کر مزید تامین دی گئی۔

۱۹۔ صنعت فولاد کی دستوری تحقیق ۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۷ء

جیسا کہ قانون تامین فولاد بابت ۱۹۲۴ء میں جس کی مدت ۳۱ مارچ ۱۹۲۷ء کو ختم ہونے والی تھی طے کیا گیا، ٹیرف بورڈ نے ۱۹۲۶ء میں صنعت کی

حالت کا بغور مطالعہ کیا، اور سفارش کی کہ مزید سات سال کی مدت کے لیے
بعض شرائط کے تابع تامین میں توسیع کی جائے اور وہ اس طرح کہ پیدائش ص ۴۹
پر مالی امداد کے طریقے کے بجائے زائد محصول درآمد کی شکل میں صنعت
کو تامین دی جائے، کیونکہ اول الذکر طریق کا سات سال تک برقرار
رکھنا بہت زیادہ مصارف کا باعث تھا۔ یہ بھی سفارش کی گئی کہ
اس مدت کے اختتام پر مکرر تحقیق کی جائے کہ آیندہ کس قدر اور کس قسم
کی تامین درکار ہوگی[1]۔ چنانچہ ایک مسودۂ قانون مجلس قانون ساز کے
اجلاس منعقدہ دہلی ۱۹۲۷ء میں پیش ہوا اور یکم اپریل ۱۹۲۷ء کو نافذ
ہوا۔ اس کی رو سے یہ قرار پایا کہ بعض آہنی و فولادی اشیا پر مختلف شرحوں
سے محصول عائد کیا جائے جس کا طریقہ یہ ہو کہ برطانوی آہنی مصنوعات پر
ایک معیاری شرح محصول اور غیر برطانوی سامان پر اس کے سوا زائد شرح
محصول مقرر کی جائے۔ مجلس قانون ساز میں معیاری اور غیر معیاری فولاد
کی تفریق کے مسئلے پر بہت ہرگرم مباحثہ ہوا، حقیقت میں اس سے
برطانوی اور دوسرے یورپی فولاد میں تفریق پیدا کرنا مقصود تھا۔ حکومت
نے بورڈ سے اتفاق کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ تفریق اس لیے ضروری
تھی کہ صارفوں کی مختلف جماعتوں پر محصول کا بار کم و بیش مساوی طور پر
تقسیم کیا جا سکے اور تامین کی بنیاد مستحکم ہو جائے۔ مخالف جماعت کو
یہ شبہہ ہوا کہ مسودۂ قانون میں برطانوی فولاد کی ترجیح کا اصول مضمر ہے
جس سے ان کو اختلاف تھا۔

ٹیرف بورڈ نے صنعت فولاد کی دستوری تحقیق ختم کرنے کے بعد
اپنی دوسری رپورٹ جون ۱۹۲۷ء میں پیش کی۔ مارچ ۱۹۲۷ء میں
حکومت نے مجلس قانون ساز میں مسودۂ قانون تامین فولاد پیش کیا،

---

[1] دیکھو ٹیرف بورڈ کی رپورٹ صنعت فولاد کی تامین کی توسیع کی بابت شائع شدہ ۱۹۲۷ء، فقرہ ۱۶۷۔

تاکہ بورڈ کی رپورٹ کے متعلق اپنے فیصلوں کو عملی جامہ پہنائے۔ چنانچہ یہ مسودہ "قانون تامین صنعت فولاد بابت ۱۹۲۷ء" کی صورت میں منظور ہو گیا۔

۲۰۔ صنعت فولاد و آہن کے متعلق حال کے بعض تامینی آئین۔ انڈین اسٹیل وائر پروڈکٹس لمیٹڈ واقع ٹاٹانگر کی درخواست پر "۱۹۳۲ء سے تار اور تار کی کیلوں کے تامینی قانون بابت ۱۹۳۲ء" کی رو سے جو ٹیرف بورڈ کی سفارش پر ۵ مارچ ۱۹۳۲ء کو منظور ہوا، تامین کو بحال کیا گیا۔ تار اور تار کی کیلوں پر ۴۵ روپے فی ٹن تامینی محصول صرف ۳۱ مارچ ۱۹۳۴ء تک اس لیے عائد کیا گیا کہ اس کی توقع تھی کہ کارخانہ جلد اپنے لیے خام مال کی رسد فراہم کرلے گا۔ ہندوستانی محصول کا ترمیمی قانون بابت ۱۹۳۲ء یعنی اوٹاوا کا معاہدہ یکم جنوری ۱۹۳۳ء کو نافذ ہوا۔ اس کے بموجب وہ تمام تبدیلیاں عمل میں آئیں جو حکومت ہند اور حکومت برطانیہ کے باہمی تجارتی معاہدے کی وجہ سے ضروری ہو گئی تھیں۔ یہ معاہدہ اوٹاوا کانفرنس میں ہوا تھا جو جولائی اور اگست ۱۹۳۲ء میں منعقد ہوئی۔ اس کے علاوہ ترمیم کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ ستمبر ۱۹۳۲ء میں لوہے اور فولاد کے متعلق بھی ایک ذیلی معاہدہ ہوا تھا۔ آہنی و فولادی سامان میں ترجیح صرف ان اشیا کو دی گئی جو تامینی محصولوں کے تابع نہ تھیں، اور کلوں میں صرف ان اشیا کو ترجیح دی گئی جن پر محض محاصل کی خاطر ۲۵ فی صد محصول بلحاظ قیمت ادا کیا جاتا تھا اور ان اشیا کو ترجیح نہیں دی گئی جن پر زراعت اور صنعتوں کے مفاد کی خاطر محصول معاف رکھا گیا تھا جو صرف ۱۰ فی صد عارضی محصول بلحاظ قیمت کے تابع تھیں۔ ذیلی معاہدے کی رو سے جستی چادروں کے ہندوستانی محصول درآمد میں حسب ذیل ترمیم کی گئی،

ہندوستانی چادری سلاخ سے سلطنت متحدہ میں تیار کردہ چادر پر بحساب ۳۰ روپے فی ٹن؛ دوسرے ملک کی چادری سلاخ سے سلطنت متحدہ میں تیار کردہ چادر پر بحساب ۳۵ روپے فی ٹن؛ ۴۲ روپے فی ٹن ایسی چادر پر جو سلطنت متحدہ میں تیار کی گئی ہو۔ ۱۹۲۷ء کے ایکٹ اور ۱۹۳۲ء کے دو ایکٹوں کی رو سے عائد کردہ تامینی محصولوں کے عمل درآمد کی مدت میں ۳۱ اکتوبر ۱۹۳۴ء تک توسیع کی گئی۔ اس اثنا میں ۱۹۲۷ء کے قانون تامین صنعت فولاد کے مطابق تامین کی تجدید کرنے کے کل مسئلے کو ٹیرف بورڈ نے جانچا۔ بورڈ نے جن تامینی تدابیر کی سفارش کی ان کو قانون محاصل آہن و فولاد بابت ۱۹۳۴ء کے تحت یکم نومبر ۱۹۳۴ء سے عملی جامہ پہنایا گیا۔ چونکہ بورڈ کی سفارشوں کے مطابق بعض اہم چیزوں کے محصول درآمد کی شرح میں معتدبہ کمی واقع ہوتی اور نتیجے کے طور پر کرورگیری کی آمدنی گھٹ جاتی لہذا آمدنی بڑھانے کی غرض سے برطانوی ہند میں فولادی کندوں کی تیاری پر ۴ روپے فی ٹن چنگی اور اس کے جواب میں فولادی کندوں کی درآمد پر مساوی کرورگیری عائد کرنا ضروری ہوگیا۔ جن اشیا کے لیے بورڈ نے تامین کی سفارش نہیں کی تھی اور جو باغراض آمدنی محصول بہ حساب قیمت کے تابع تھیں ان کی حد تک یہ جوابی محصول بدل کے طور پر عائد کیا جا سکتا تھا۔

ہم اس عام پالیسی کو بحیثیت مجموعی بہ نظر پسندیدگی دیکھ سکتے ہیں جو ۱۹۲۴ء سے صنعت آہن و فولاد کے بارے میں اختیار کی گئی۔ گو یہ صحیح ہے کہ حکومت کی بروقت مداخلت کے بغیر صنعت، اس مسابقت کی زد سے جانبر نہ ہو سکتی تھی جو زمانۂ بعد از جنگ میں اس پر پڑی۔ تاہم ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۷ء کے مابین دی ہوئی تامین پوری طرح کافی نہ تھی چنانچہ ٹاٹا اسٹیل کمپنی اپنے اخراجات بمشکل نکال سکتی تھی لیکن بعض ناموافق حالات کے باوجود، صنعت نے قابل لحاظ ترقی کی، جیسا کہ حسب ذیل امور سے ظاہر ہوتا ہے:۔ ''پیداوار بڑھ گئی، مزدوروں

کی کارکردگی میں ترقی ہوئی، بیرونی مزدوروں کی تعداد میں تخفیف ہوگئی، کارخانوں کے مصارف بڑی حد تک گھٹ گئے، اور مزدوروں کے حالات میں، خاص کر اجرتوں رہنے کے مکانوں اور زندگی کی دوسری آسائشوں میں قابل لحاظ اصلاح اور ترقی ہوگئی[1]۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں جو تامینی تدابیر اختیار کی گئی تھیں ان کی تجدید کرکے تامین کا سلسلہ ۱۹۴۱ء تک قائم رکھنے کا فیصلہ ان حالات میں کافی حق بجانب تھا۔

۲۱۔ دباغت اور چرمی صنعتیں[2]۔ ہندوستان میں کھالوں اور چمڑوں کی بہت بڑی رسد موجود ہے۔ گائے کا چرسا جس کو "ایسٹ انڈیا کپس"[3] کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے بکری کی کھال، بھینس کا چرسا، اور بھیڑ کی کھال، وغیرہ کو ہندوستانی زراعت کی ذیلی پیداوار خیال کیا جا سکتا ہے۔ جنگ عظیم سے پیشتر، ہندوستان، کھالیں خاص کر آسٹریلیا اور جرمنی کو کثیر مقدار میں برآمد کرتا تھا؛ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں ان کی قیمت کا اندازہ ۱۷ء۷ کروڑ روپے کیا گیا تھا۔ اس سال خام کھالیں جن کی قیمت ۴ء۴ کروڑ روپے تھی زیادہ تر ریاستہائے متحدہ امریکہ کو برآمد کی گئیں۔ غرض غیر ممالک میں یہاں کے چمڑے کی بکثرت

---

[1] دیکھو ایچ۔ ایل۔ ڈے، کا مضمون موسوم بہ "صنعت فولاد کی تامین از ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۷ء" "انڈین جرنل آف اکنامکس" بابت جولائی ۱۹۲۸ء میں۔

[2] ابواب چرم کی تحقیقاتی کمیٹی ہندوستان کے لیے اس صنعت کی مالیت اور قدر و قیمت کا اندازہ بحیثیت مجموعی (جس میں خام چرم، تجارت چرم، دباغت چرم اور ملحقہ اور متعلقہ صنائع شامل ہیں) تقریباً ۴۰ تا ۵۰ کروڑ روپے کرتی ہے۔ یہ صنعت کئی لاکھ آدمیوں کے لیے روزگار مہیا کرتی ہے اور ہندوستان کے پست طبقے کے لاکھوں نفوس کی معاشی خوشحالی اس پر منحصر ہے۔ دیکھو ابواب چرم کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ شائع شدہ ۱۹۳۰ء، فقرہ (۱۵)۔

[3] East India Kips.

مانگ تھی اور اعلیٰ قیمتیں ادا کی جاتی تھیں۔ جنگ عظیم کی وجہ سے ہندوستان کی دباغت کی صنعت اور کھالوں اور چمڑوں کی برآمدی تجارت میں اہم تغیرات ہوئے کیونکہ غنیم ممالک کے بازاروں سے تجارت کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا اور دوسری طرف حکومت نے اس صنعت کو اپنی نگرانی میں لے لیا تھا۔

ملک میں مدت دراز سے دیسی دباغت کی بہت بڑی صنعت موجود ہے جس میں مقامی طور پر دستیاب ہونے والا دباغتی مسالہ چمڑے کو سکھانے اور دباغت کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جو چمڑا تیار ہوتا ہے اس سے گھٹیا قسم کے چرم کی مقامی طلب کو پورا کیا جاتا ہے۔ لیکن یورپ میں دباغت کے طریقے بالکل بدل گئے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں ان طریقوں کو ابتداءً فوجی حکام نے رائج کیا۔ غرض یہ تھی کہ گھوڑوں کے ساز اور دوسرے فوجی ضروریات کے لیے اعلیٰ درجے کا چمڑا تیار کیا جائے۔ چنانچہ اسلحہ خانوں کے ساتھ ساتھ عام طور پر دباغت کے کارخانے بھی قائم ہوئے۔ ۱۸۶۷ء میں اس صنعت کی ترقی کے سلسلے میں ایک اور قدم بڑھایا گیا جبکہ کانپور میں ایک کارخانہ بنام گورنمنٹ ہارنیس اینڈ سیڈلری فیکٹری کھولا گیا۔ اس کی تھوڑی ہی مدت بعد مسرز کوپر ایلن اینڈ کو نے فوجی بوٹ اور ساز وسامان کا کارخانہ قائم کیا، جس کو ابتدا میں معتد بہ مالی امداد حکومت سے ملتی رہی۔ "کانپور میں تجارت چرم کو ترقی دینے کی ساعی کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی؛ اور جنگ عظیم کے شروع ہونے تک جتنی فیکٹریاں وجود میں آئیں، اگرچہ ان کا انحصار فرمائشوں کے لیے فوج پر تھا لیکن وہ محکمۂ فوج کے لازمے میں داخل نہ تھیں"[1] آدم جی پیر بھائی نے دی ویسٹرن انڈیا آرمی اینڈ ایکوپمنٹ فیکٹری بمبئی میں بمقام سیان

[1] دیکھو صنعتی کمیشن کی رپورٹ، ضمیمہ جات صفحہ ۷۰۔

قائم کی۔ مختلف مقامات پر چند اور فیکٹریاں کھولی گئیں جہاں چمڑے کا سامان تیار کرنے کی کوشش کی گئی۔ اگرچہ یورپ کے دباغت خانوں اور چرم سازی کی فیکٹریوں میں کلوں کا استعمال بہت زیادہ ہے لیکن حال حال تک ہندوستانی دباغت کے کارخانوں میں ان کا استعمال بالکل نہ تھا۔ البتہ کانپور اور سیان کے کارخانے اور مدراس کا دباغت خانہ اس سے مستثنیٰ تھے۔ انھی کارخانوں میں وہ تمام نیم پختہ چمڑا اور کھالیں تیار کی جاتی تھیں جن کو ملک کی برآمدی تجارت میں خاصی اہمیت حاصل ہے۔ جنگ عظیم سے پیشتر دباغت کردہ کھالوں اور چمڑوں کی برآمدی تجارت کا بیشتر حصہ جنوبی ہند تک محدود تھا، کیونکہ یہاں ایک پودا موسوم بہ (Cassia auriculata) جسے بمبئی میں "تروڑ" اور مدراس میں "اوارم" کہتے ہیں، دستیاب ہوتا ہے اور اس کی چھال دباغت میں کام آتی ہے۔ مدراس میں دوسرے صوبوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ دباغت کے کارخانے موجود ہیں۔[1]

۲۲۔ جنگ عظیم کے اثرات دباغت اور چرم کی صنعت پر۔ جنگ عظیم کے زمانے میں دباغت اور چرم کی صنعت میں بہت بڑا انقلاب واقع ہوا۔ ہندوستانی مجلس اسلحہ نے اپنی کوششیں چرم کی ان قسموں کی پیداوار بڑھانے اور منظم کرنے میں صرف کیں جو جنگی سامان کی حیثیت سے خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اہم ترین ترقی نیم دباغت یافتہ گائے کے چمڑے کے متعلق تھی جو مدراس اور بمبئی کے دباغت خانوں میں تیار ہوتے تھے اور ایسٹ انڈیا کپس[2] کہلاتے تھے۔ اس چمڑے کی اہمیت فوجی بوٹ کی ابریاں (Uppers) تیار کرنے کے لیے جنگ کے زمانے میں محسوس کی گئی،

[1] دیکھو میتھےسن کی کتاب محولۂ سابق باب (۶)۔

[2] East India Kips.-

چنانچہ حکومت نے اس کی تجارت کو کاملاً اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ہندوستان کی کل پیداوار برطانوی محکمۂ جنگ کو براہ راست برآمد کرنے کی غرض سے خریدنے لگی۔ سنہ۱۹۱۴ء میں دباغت کردہ چرم ۳ ۶ ۲ ۷ ۴ ۴ ۱ ۹ ہنڈرڈویٹ بہ قیمت ۵ء۱۱ کروڑ روپے اور سنہ۱۹۱۷ء-۱۹۱۸ء میں ۴ ۷ ۱ ۶ ۱ ۶ ۳ ہنڈرڈویٹ بہ قیمت ۴ء۸۶ کروڑ روپے برآمد کیا گیا۔ جنگ عظیم کے زمانے میں ہندوستانی دباغت کے کارخانوں نے "ایسٹ انڈیا کپس" کی برآمد کے علاوہ نہ صرف اس فوج کے لیے جو ہندوستان میں تھی بلکہ مہماتی فوج کے لیے ہر قسم کا چرمی سازوسامان اور جوتوں کی کثیر تعداد تیار کی۔ اس طرح حکومت نے مجلس اسلحہ کے زیر نگرانی صنعت دباغی کو بہت ترقی دی۔ چنانچہ جنگ عظیم سے پہلے کے مقابلے میں جنگ عظیم کے اختتام پر سالانہ تیار کردہ بوٹ شوز کی تعداد ۲۰ گنا زیادہ تھی۔ صداقتنامۂ تقدم[1] کے طریق کے تحت مجلس اسلحہ نے بعض قسم کی چرمی اشیا کو جو سابق میں باہر سے درآمد کی جاتی تھیں، ہندوستان ہی میں تیار کرانے کی کوشش کی؛ مثلاً بیلن کی چرمی پٹیاں، پٹے اور تسمے جن کی کپڑے کی گرنیوں میں ضرورت ہوتی تھی۔[2]

دباغت میں کرومی طریقہ اختیار کرنے سے اعلیٰ درجے کا چرم تیار ہو سکتا ہے، لیکن ہندوستان میں اس کی ترقی کی رفتار بہت سست رہی ہے، حالانکہ امریکا میں سنہ۱۸۹۰ء تک یہ طریقہ بخوبی ترقی پا چکا تھا۔ ابتداءً حکومت مدراس نے کرومی دباغت کا سنہ۱۹۰۳ء تا سنہ۱۹۱۱ء تجربہ کیا اور اس طرح یہ ثابت کر دیا کہ یہ طریقہ ہندوستان میں بھی کامیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ امر قابل افسوس ہے کہ حکومت کو شمالی ہند اور مدراس کے ایوان ہائے تجارت کے احتجاج کی وجہ سے

۱؎ Priority Certificates.

۲؎ دیکھو انڈسٹریل ہینڈ بک (Industrial Hand book.) صفحہ ۱۲۰ تا ۱۲۸۔

اس فیکٹری کو فروخت کر دینا پڑا۔ ان کی شکایت یہ تھی کہ خانگی تجارت میں حکومت مداخلت کر رہی تھی۔ جنگ عظیم کے چھڑ جانے پر ترقی کی رفتار بہت تیز ہوگئی؛ اور ہندوستانی کروی چرم کو برطانیۂ عظمیٰ میں نفع بخش بازار مل گیا۔ ہندوستان میں کروی دباغت کی ترقی کے سلسلے میں بہت سی دقتیں ہیں مثلاً اعلیٰ درجے کے فنی طریقوں کے اختیار کرنے کی ضرورت ہے جن کے لیے کیمیائی معلومات اور بیش خرچ میکانی ساز و سامان درکار ہے۔ ہندوستان کی گائے اور بکری کے چمڑوں کا بہت بڑا حصہ اس قسم کے کام کے لیے نہایت موزوں ہے، اور ماہر دباغ کی رہنمائی اور نگرانی کے تحت بہت کچھ اصلاح و ترقی کی توقع کی جا سکتی ہے؛ چنانچہ حکومت نے صنعت دباغی کی ترقی کے لیے ایک ماہر دباغ کی خدمات حاصل کرلی ہیں۔

۳۴۔ صنعت دباغی کی تامین۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں قانون محصول ہند بابت سنہ ۱۸۹۴ء میں ترمیم کر دی گئی؛ چنانچہ چمڑوں اور کھالوں کی برآمد پر ۱۵ فیصد محصول عائد کیا گیا، اور سلطنت برطانیہ کے دوسرے علاقوں میں دباغت کے لیے برآمد ہونے والے چمڑوں پر دس فی صد محصول معاف کیا گیا، یہ محصول، ہندوستانی صنعت دباغی کی تامین کی غرض سے عائد کیا گیا تھا جس کو جنگ عظیم کے زمانے میں سرکاری سرپرستی کی وجہ سے خاص فروغ ہوگیا تھا لیکن یہ ترقی زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ جنگی ساز و سامان کی پہلے کی سی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ ایسی صورت میں امداد کا کوئی دوسرا طریقہ ضروری تھا۔ چونکہ ہندوستان کے دباغت کے کارخانے ملک کے چرموں اور کھالوں کی مجموعی رسد کے صرف بہت ہی قلیل جزو کو کام میں لا سکتے تھے اس لیے سلطنت برطانیہ کے اندر ہی دباغی کو فروغ دینے کی غرض سے تخفیف محصول کی حمایت کی گئی تاکہ ہندوستانی کھالوں کی جرمنی میں دباغت کو روک کر سلطنت برطانیہ کی طرف اس کا رخ پھیر دیا جائے۔

لیکن یہ تجربہ ان دونوں مقاصد میں سے کسی ایک کو بھی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ ہندوستانی صنعت دباغی کو ویسی کامیابی نہیں ہوئی جیسی کہ توقع تھی۔ ہندوستان سے چرموں کی برآمد جنگ سے پہلے کے مقابلے میں نصف رہ گئی اور تجارت کا بیشتر حصہ پھر جرمنی منتقل ہو گیا۔ مالی کمیشن نے محصول کو اس بنیاد پر اصولاً غلط قرار دیا کہ اگر تائین کی واقعی ضرورت تھی تو اس کو محصول برآمد کی بجائے محصول درآمد کے ذریعے سے دینا چاہیئے تھا۔ حکومت ہند نے محصول کی خرابیوں سے متاثر ہو کر شرح کو ۵ فی صد تک گھٹا دیا' اور دس فی صد کی رعایت کو بھی ۱۹۲۳ء میں منسوخ کر دیا۔ پانچ فی صد محصول باقی رکھنے کو آمدنی کی ضرورت کی بنیاد پر حق بجانب قرار دیا گیا لیکن محصول کی تحقیقاتی کمیٹی نے بہ کثرت آرا مالی کمیشن سے اتفاق کرتے ہوئے اس قلیل محصول کو بھی جلد منسوخ کرنے کا مشورہ دیا۔ ڈاکٹر آر-پی-پارنجپئے اور سردار جوگیندر سنگھ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ گزشتہ چند سالوں کا تجربہ جنگ عظیم کے غیر معمولی حالات کے باعث بھروسے کے قابل نہ تھا اور ہندوستانی صنعت دباغی کو مستقل طور پر تائین دینے اور محصول برآمد کو باقی رکھنے کی سفارش کی۔ لیکن محصول کی تحقیقاتی کمیٹی نے صرف چمڑے پر محصول کو قائم رکھنے کی سفارش کی اس لیے کہ عالمی بازار میں اس کو اچھی خاصی شہرت حاصل تھی اور اس پر محصول کا نقصان رساں اثر نہ پڑتا تھا۔ اس بنا پر رکن مالیہ نے مسودۂ قانون مالیہ بابت ۱۹۲۷ء میں خام چمڑے پر پانچ فی صد محصول برآمد کو منسوخ کرنے کی تجویز پیش کی۔ لیکن مجلس قانون ساز نے اس تجویز کو نامنظور کیا جس سے برآمد کرنے والوں کو سخت مایوسی ہوئی۔ مجلس نے یہ رائے ظاہر کی کہ اس تجویز کو منظور کرنے سے ہندوستانی صنعت دباغی کے اغراض متاثر ہوں گے۔

حکومت ہند نے ستمبر ۱۹۲۹ء میں دو چرسے کے ابواب کی

تحقیقاتی کمیٹی" مقرر کی تاکہ وہ اس امر کی تحقیقات کر کے رپورٹ پیش کرے کہ چرم اور خام کھالوں کی برآمد پر ابواب عائد کرنا کس حد تک مناسب تھا اور ہندوستانی مرکزی کپاس کمیٹی کے نمونے پر ایک کمیٹی بنائے جو بحیثیت مجموعی صنعت کے مفاد کے لیے ان ابواب کا انتظام کرے۔ اگرچہ حکومت کی قرارداد میں تحقیقاتی کمیٹی کے تقرر کا اعلان کرتے وقت یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ مشکلات کا اطمینان بخش حل یہی ہو سکتا ہے کہ محصول برآمد کی بجائے ابواب برآمد عائد کیے جائیں پھر بھی کمیٹی نے یہ خیال ظاہر کیا (جس سے صرف ایک رکن مسٹر ای۔ ال۔ پرائس کو اختلاف تھا) کہ محصول برآمد کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے اس کو خاص طور سے ہدایت نہیں کی گئی تھی اور یہ کہ اس کے بارے میں ارکان کے خیالات مختلف تھے۔ کمیٹی نے یہ سفارش پیش کی کہ چرسے اور خام کھال کی برآمد پر ایک فی صد ابواب بلحاظ قیمت عائد کیا جائے اور اس کی آمدنی کو خام مال، دباغی اور متعلقہ صنعتوں کی اصلاح و ترقی پر صرف کیا جائے۔ ابواب فنڈ کا انتظام ایک کمیٹی بنام "ابواب کمیٹی" کے سپرد کیا جانے والا تھا جس میں چرم فراہم کرنے والوں، سوداگروں، خام مال بھیجنے والوں صنعت دباغی، انجمن ہائے امداد باہمی اور دیسی ریاستوں کے نمایندے اور چند سرکاری عہدہ دار شامل ہوں۔ یہ تجویز پیش کی گئی کہ محصول برآمد کے جداگانہ مسئلے پر فیصلہ ہونے تک خام مال کے کل محصول کو حسب حال برقرار رکھا جائے[1]۔

چرسے کے ۵ فی صد محصول برآمد کو ۱۹۳۴ء کے قانون مالیہ (Finance Act) کے بموجب اس وجہ سے منسوخ کر دیا گیا کہ جرمنی سے چرسے کی جو برآمدی تجارت ہو رہی تھی اس میں کمی ہو گئی تھی تو

[1] دیکھو چرسے کے ابواب کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ (۱۹۳۰ء) فقرہ ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۷، ۱۲۲، ۱۲۶، ۱۲۷۔

دوسری طرف خام چمڑے کے محصول برآمد کو ۱۹۳۵ء کے قانون مالیہ کی رو سے اس غرض سے منسوخ کیا گیا کہ ہندوستان کی تجارت برآمد کو پھر ترقی دینے میں مدد دی جائے (اس سلسلے میں دیکھئے باب ۱۱)۔

کلیدی صنعت ہونے کی حیثیت سے ہندوستانی صنعت دباغی و چرم سازی کی تامین کے مطالبات اس بات کے مستحق ہیں کہ ان پر بااحتیاط غور وخوض کیا جائے۔ لیکن تامین کے ساتھ ساتھ داخلی اصلاح و ترقی کی بھی ابھی بہت کچھ گنجایش موجود ہے اس لیے کہ اصل وقت جس کا صنعت کو مقابلہ کرنا ہے انتظام اور مہارت کی کمی ہے لیکن کچھ سال ادھر سے دو چیزوں نے ہندوستان میں صنعت دباغی کو ترقی دینے میں اہم حصہ لیا۔ ایک تو یہ کہ چرم کا صرف خاص کر کفش سازی پانی کی مشک اور گھوڑے کے ساز وغیرہ کے لیے نمایاں طور پر بڑھ گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ مرکزی یورپ میں گوشت کی مانگ بڑھ جانے کی وجہ سے ملک کے اندر چمڑے کی بہت بڑی رسد اتنی کم قیمتوں پر دستیاب ہو رہی ہے کہ ہندوستانی چمڑے کی برآمد کی بہت کم ترغیب ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں ہندوستانی دباغوں کو موقع ہے کہ نہ صرف اپنے کام کے لیے عمدہ چمڑوں کا انتخاب کرلیں بلکہ یورپ کی قیمتوں کے مقابلے میں زیادہ قیمت بھی ادا کرسکیں۔

۴۲ کیمیائی اشیا کی صنعتیں۔

"کسی جدید سلطنت میں کیمیائی اشیا کی صنعتوں کو ایسے پیمانے پر ترقی دینے کے لیے کہ وہ ملک کی معاشی زندگی میں ایک اہم عنصر بن جائیں (جیسا کہ وہ انگلستان جرمنی اور امریکا میں ہیں) اس بات کی ضرورت ہے کہ بعض لوازم کافی ارزاں مہیا کیے جائیں۔ سب سے اہم لوازم کیمیائی اشیا خاص کر گندھک کا ترشہ، ہائیڈروکلورک ترشہ، چونا، کاسٹک، سوڈا، سوڈیم کاربونیٹ، نائٹرک ترشہ وغیرہ ہیں۔ اس کو نہ صرف ملکی خام مال سے دوسری کیمیائی اشیا کی تیاری میں

استعمال کیا جاتا ہے بلکہ مختلف قسم کی قدرتی پیداوار یا اس کی ذیلی پیداوار کے صاف کرنے کے لیے بھی۔ چنانچہ منجمد اور معدنی روغنوں کو صاف کرنے کے لیے گندھک کے ترشے اور الکلی کی ضرورت کثیر مقدار میں ہوتی ہے۔ دوسرے دو لوازم یہ ہیں:-
(۱) ایندھن، قوت پیدا کرنے، دھاتوں کو پگھلانے اور دوسرے کاموں کے لیے: اور (۲) کیمیائی مشنری[1]۔

گو جنگ عظیم نے اکثر کیمیائی صنعتوں کو کافی حد تک ترقی دی لیکن ہندوستان کا انحصار اب بھی بڑی حد تک غیر ملکی کیمیائی اشیا ہی پر ہے۔ چنانچہ یہاں ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۵ء میں ۲ کرور ۹۲ لاکھ روپے کی مالیت کی کیمیائی اشیا درآمد کی گئیں جس کے مقابلے میں جنگ سے پہلے کا اوسط صرف ۹۰ لاکھ روپے تھا۔ لیکن چونکہ ہندوستان میں یہ اشیا بہت سی قسموں کی اور ہر قسم مقابلۃً قلیل مقدار میں استعمال ہوتی ہے اس لیے مقامی صناعوں نے امن کی حالت کے تحت اپنی توجہ چند بھاری کیمیائی اشیا مثلاً گندھک کا ترشہ اور ہیڈروکلورک ترشے اور نائٹرک ترشوں کی تیاری تک محدود رکھی جن کی مانگ بہت زیادہ ہے اور جن کے حق میں بحری نقل و حمل کے بھاری کرائے نے تا مین کا کام کیا۔ لیکن چونکہ گندھک کے ترشے سے اخذ کردہ نمکوں کی حد تک یہ تامین موجود نہیں ہے اس لیے ان کی بڑے پیمانے پر تیاری میں رکاوٹ پیدا ہوگئی ہے۔ معمولی عرقیات اور ادویات بھی چھوٹے پیمانے پر تیار کئے جاتے ہیں۔ جنگ عظیم کے اختتام کے بعد سے کیمیائی صنعتوں میں معقول ترقی رونما ہوئی ہے۔

ہندوستان کے ذرائع بھاری کیمیائی اشیا کے خام مال کی حد تک کم نہیں ہیں بشرطیکہ مختلف قسم کی معدنی کچ دھاتوں سے مناسب طریقے پید

[1] دیکھو کتاب موسوم بہ "(Industrial Hand book)" صفحہ ۵۸۔

کام لیا جائے۔ ہندوستان کی مختلف النوع معدنی دولت مثلاً سلفائیڈ اورس، شورہ، پھٹکری، زاجی نمکوں، چونے کے کنکر میگنیشیم وغیرہ کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ گندھک کے ترشے کی تیاری میں نمایاں کامیابی حاصل ہو چکی ہے۔ یہ ترشہ کل کیمیائی صنعتوں کے لیے اہم ترین کلیدی صنعت ہے، حتیٰ کہ اس کی تیاری کو کسی ملک کے تمول کے جانچنے کا معیار قرار دیا جاتا ہے۔ گندھک کے ترشے کی مانگ خاص کر جنگ عظیم کے زمانے میں دھاکو اشیا کے لیے بہت زیادہ تھی۔ یہ صنعت ہندوستان میں قائم ہو چکی ہے لیکن جست تیار کرنے کی غرض سے بمقام سنگ بھوم برما کے جستی مرتکزات (Cocentrates) کو پگھلا کر صاف کرنے کی تجویز سے جو توقع تھی وہ پوری نہیں ہوئی ہے۔ ایسٹرن کیمیکل کمپنی لمیٹڈ بمبئی نے ۱۹۲۸ء میں ٹیرف بورڈ کے سامنے ایک درخواست پیش کی کہ گندھک کے ترشے کی تیاری کے لیے معقول مالی امداد دی جائے۔ موجودہ زمانے میں اس صنعت کو طاقتور یورپی تجارتی اتحادوں کی مسابقت کا سامنا ہے۔ چنانچہ جرمنی اور سلطنت متحدہ سب سے مخدوش حریف ہیں[1]۔ نائٹرک ترشے کی حد تک ملکی پیدائش کو ابھی کافی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ٹیرف بورڈ کے سامنے کیمیائی صنعتوں کے نمایندوں نے یہ بیان کیا کہ ہز مجسٹی کی ٹکسال واقع بمبئی میں دھات صاف کرنے کا نیا کارخانہ قائم کرنے کے لیے سالانہ تقریباً دو سو ٹن نائٹرک ترشے کی ضرورت ہے اور یہ مقدار موجودہ ملکی پیداوار کی دوگنی کے برابر ہے۔ اس صنعت میں بھی سلطنت متحدہ اور جرمنی ہندوستان کے زبردست حریف ہیں۔ پتھر کا کوئلہ جلا کر تارپین اور امونیا جیسی ذیلی پیداوار حاصل کرنے کی غرض سے ایک کارخانہ قائم کیا جا چکا ہے۔

کیمیائی صنعتوں کے لیے دوسرے لوازم ایندھن اور شنیری ہیں۔

---

[1] دیکھو ٹیرف بورڈ کی رپورٹ بھاری کیمیائی صنعت کے بارے میں فقرہ ۷۲۔

ایندھن کی صورت حال پر نظر ڈالی جا چکی ہے اور یہ بتایا جا چکا ہے کہ کس طرح ہندوستانی کوئلہ کی کانوں کی تقسیم غیر مساوی یا نہ ہے۔ مثلاً بنگال میں ایندھن کے لیے کوئلہ ارزاں ملتا ہے؛ اسی لیے بنگال بعض کیمیائی صنعتوں کے واسطے مناسب مرکز ہے۔ لیکن جنوبی ہند کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہندوستان کی برقابی اسکیمیں یورپ اور امریکا کے مانند ترقی یافتہ نہیں ہیں۔ برقی فلزیات اور برقی کیمیائی صنعتوں کو ترقی دینے کی غرض سے ارزاں برقی قوت مہیا کرنے کی مزید کوششیں ضروری ہیں۔ کیمیائی صنعتوں کے لیے جو خاص قسم کی مشنری مطلوب تھی وہ جنگ سے پہلے درآمد کی جاتی تھی؛ لیکن معمولی مشینیں زیادہ تر ملک ہی میں تیار کی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں کام کا آغاز کیا جا چکا ہے۔

۲۵۔ بھاری کیمیائی صنعت کی تامین۔ جولائی ۱۹۲۸ء میں یہ مسئلہ ٹیرف بورڈ کے سامنے پیش کیا گیا۔ بورڈ اس نتیجے پر پہنچا کہ تامین کے لیے کیمیائی صنعت کے مطالبات اس اصول پر مبنی تھے کہ اس کو عظیم الشان قومی اہمیت حاصل ہے۔ یہ ایک کلیدی صنعت تھی جس کی پیداوار تقریباً تمام صنعتوں میں استعمال کی جاتی تھی، قومی مدافعت کے لیے ناگزیر تھی، اور صنعتوں اور زراعت میں کیمیائی تحقیق کی اساس تھی۔ اس صنعت نے مالی کمیشن کے مقرر کردہ شرائط کو، کما حقہ پورا کر کے خود کو تامین کا مستحق ثابت کیا تھا۔ اس لیے یہ طے کیا گیا کہ تامین عام طور پر خاص محصولوں کی تشکل میں دی جائے۔ ایسپم سالٹ اور زنک کلورائڈ کے لیے جو خاص محصول تجویز کیے گئے تھے وہ بلحاظ قیمت علی الترتیب ۴۴ فی صد اور ۴۳ فی صد تھے۔ دوسری کیمیائی اشیا کے محصول آمدنی کی موجودہ سطح کے برابر تھے۔ نیز یہ قرار پایا کہ سات سال کے بعد جبکہ تامین کی مدت ختم ہو از سر نو تحقیقات کی جائے جیسا کہ صنعت فولاد کے بارے میں

ص۵۵

کیا گیا تھا۔ اسی طرح فاسفیٹ جو مصنوعی کھاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اس کی تیاری پر مالی امداد منظور کی جائے۔ بورڈ نے بڑے پیمانے پر کیمیائی صنعت کو ہندوستان میں قائم کرنے کے مدنظر ریلوں کے کرایوں میں کمی کی سفارش کی۔ چونکہ یورپ میں افراط پیدائش تھی اور طاقتور یورپی تجارتی اتحادوں کو قیمتوں پر قابو حاصل تھا اس لیے گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو یہ اختیار دینا تجویز ہوا کہ اگر انھیں یہ یقین ہو جائے کہ ہندوستان میں کیمیائی اشیا ایسی قیمتوں پر داخل ہو رہی ہیں جن کی وجہ سے تامین کا اثر زائل ہو رہا ہے تو وہ زائد محصول عاید کریں[۱]۔ بھاری کیمیائی اشیا کی صنعت کی تامین کا قانون بابت ۱۹۳۱ء بہت تاخیر کے ساتھ یکم اکتوبر ۱۹۳۱ء کو منظور ہوا اور اس کی رو سے ٹیرف بورڈ کی بعض سفارشوں کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ اس قانون نے میگنیشیم کلورائیڈ کو معافی کی فہرست سے خارج کر دیا اور اس پر اور بعض دوسری بھاری کیمیائی اشیا پر مختلف شرحوں سے تامینی محصول عائد کیے گئے۔ یہ محصول بجز میگنیشیم کلورائیڈ کے تمام کیمیائی اشیا پر ۳۱ مارچ ۱۹۳۳ء تک قائم رکھا گیا اور اس میں حسب ضرورت اضافہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ میگنیشیم کلورائیڈ کی تامین کا سلسلہ جاری رکھنے کے مسئلے کو حال ہی میں (دسمبر ۱۹۳۷ء) ٹیرف بورڈ کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔

۲۶۔ روغن نکالنے کی صنعت

یہاں روغن نکالنے کی صنعت کا بھی کچھ تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ گو ہندوستان میں مختلف قسم کے روغن دار تخم پیدا ہوتے ہیں لیکن ان کی بہت بڑی مقدار برآمد کر دی جاتی ہے۔ اور صاف شدہ تیلوں اور روغن دار

---

[۱] دیکھو ٹیرف بورڈ کی رپورٹ بھاری کیمیائی اشیا کی صنعت کے بارے میں فقرہ ۱۴۷ اور ۱۳۷۔

تخم کی کھلی کی صنعت کو خاطر خواہ فروغ نہیں ہوا ہے۔ یورپ اور امریکا میں عمدہ اور جدید وضع کی مشینوں اور طریقوں سے کام لیا جا رہا ہے لیکن ہندوستان میں ابھی تک زیادہ تر بیل اور گھانی کے دقیانوسی طریقے سے تیل نکالا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کھلی میں روغن کا بڑا حصہ باقی رہ جاتا ہے اور مویشی کی خوراک یا کھاد کے طور پر کھلی کو فائدہ مند طریقے پر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ روغن بالعموم بہت میلا اور غیر صاف شدہ ہوتا ہے اور اس کی قیمت بھی اچھی وصول نہیں ہوتی۔

بھاپ یا دوسری میکانی قوت سے چلنے والی تیل کی گرنیوں کی تعداد خاص کر سرسوں ارنڈی اور مونگ پھلی کے تیلوں کی حد تک کچھ سال ادھر سے بہت بڑھ گئی ہے۔ ہندوستان میں روغن نکالنے کی صنعت کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اکثر ملکوں میں روغن دار تخموں کی درآمد پر کوئی محصول نہیں لگایا جاتا۔ اس کے برخلاف ان سے تیار کی ہوئی مصنوعات پر محصول لگایا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ روغن یا کھلی کے مقابلے میں تخموں کے لیے ریل کا کرایہ بہت کم ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی کسان مشین سے تیار کی ہوئی کھلی کو مویشی کی غذا یا زرعی کھاد کے طور پر استعمال کرنا پسند نہیں کرتا۔ آخر میں یہ کہ موجودہ زمانے میں ہندوستان میں اس تمام کھلی یا چونی کی کھپت نہیں ہو سکتی جو پودوں کی کھاد اور جانوروں کی غذا کے لیے تیار کی جاتی ہے حالانکہ اس کے اغراض کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ان چیزوں کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرے۔ چنانچہ ہندوستان کے لیے یہ اصول نامناسب ہی نہیں بلکہ غیر معاشی ہے کہ خود روغن اور روغنی کھلی تیار کرنے کی بجائے اپنے روغن دار تخموں کو برآمد کرے۔ تخموں کی برآمد کی وجہ سے ہندوستانی صناع نفع سے اور زراعت مویشی کی بیش بہا غذا اور کھاد سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ

نباتی تیل کئی اہم کاموں میں استعمال کئے جاتے ہیں اور کسی مہذب قوم کی معاشی زندگی میں بہت بڑا حصہ لیتے ہیں۔ نباتی تیل اور چربی صابن اور گلیسرین کی تیاری کے لیے اور سخت مرہم اور تدہین کے کاموں وغیرہ کے لئے ضروری ہیں۔ جنگ عظیم کے بعد سے ہندوستانی روغن براری کی صنعت کی بڑے پیمانے پر ترقی کو ممکن بنانے کے لیے بہت کچھ توجہ دی گئی ہے۔ اگر استقلال کے ساتھ صنعت کو مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش کی جائے تو کامیابی یقینی ہے۔

۲۷۔ کاغذ سازی۔ موجودہ زمانے میں کل کے ذریعے سے کاغذ بنانے کا آغاز ہندوستان میں بظاہر سنہ ۱۸۷۰ء سے ہوتا ہے جبکہ دریائے ہگلی پر "بالی ملز" قائم ہوئی۔ ہگلی کا نواح اب بھی اس صنعت کا بڑا مرکز ہے۔ ٹیٹا گھر پیپر ملز سنہ ۱۸۸۲ء میں کھولی گئیں اور سنہ ۱۹۰۳ء میں ان میں امپیریل پیپر ل جو سنہ ۱۸۹۲ء تا سنہ ۱۸۹۴ء میں بمقام کن کنارا قائم تھی، ضم کرلی گئی۔ بالی ملز نے چند سال تک بظاہر امید افزا طریقے پر کام کرنے کے بعد سنہ ۱۹۰۵ء میں اپنا کاروبار بند کردیا۔ سنہ ۱۸۹۲ء سے ۳۰ سال تک کوئی نئی کاغذ کی گرنی ہگلی پر قائم نہیں ہوئی لیکن سنہ ۱۹۲۲ء میں انڈین پیپر پلپ کمپنی نے جو سنہ ۱۹۱۸ء میں بانس سے گودا اور کاغذ تیار کرنے کی غرض سے قائم ہوئی تھی نے ہٹی مل[لہ] میں کاغذ سازی شروع کی۔ شمالی ہند کی کاغذ کی گرنیوں میں قدیم ترین گرنی اپر انڈیا کوپر مل تھی جو لکھنؤ میں سنہ ۱۸۷۹ء میں قائم ہوئی تھی۔ سنہ ۱۸۸۵ء میں دکن پیپر مل پونے میں قائم ہوئی اور وہیں اس نے سنہ ۱۸۸۷ء میں کام شروع کردیا۔ موجودہ زمانے میں شمالی ہند کی کاغذ سازی کی گرنی رانی گنج میں واقع ہے۔ یہ کمپنی بنگال پیپر مل کمپنی کے نام سے سنہ ۱۸۸۹ء میں

لہ (Naihati Mills)

قائم ہوئی تھی اور اس میں ۱۸۹۱ء سے کام شروع ہوا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں چھوٹے پیمانے کی تین گرنیاں یعنی دو بمبئی میں اور ایک بمقام پونا اور ریاست ٹراونکور میں ہیں۔ ۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۸ء میں کرناٹک پیپر ملز نے بمقام راجمندری چاول بھوسہ اور بانس سے کاغذ بنانے کا کام شروع کیا۔ پنجاب پیپر ملز کمپنی نے سہارنپور کے قریب اپنے کارخانے کے لیے، پنجاب میں بھبتر گھاس کے بارے میں بڑی مراعات حاصل کیں۔ ان دو نئی گرنیوں کو چھوڑ کر ٹیرف بورڈ نے یہ اندازہ لگایا کہ قدیم نو گرنیاں ۳۳,۰۰۰ ٹن سالانہ پیداوار تیار کر سکتی تھیں جو نئی گرنیوں کو شامل کرنے کی صورت میں بڑھ کر ۴۳,۰۰۰ ٹن ہو سکتی تھی آسام میں ایک نئی کمپنی قائم ہوئی ہے اور بمقام چٹاگانگ ایک نیا کارخانہ بانس سے کاغذی گودا تیار کرنے کے لیے کھولا گیا ہے۔ کاغذ کی ہندوستانی پیداوار ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء کے ۸۰۴۰۰ ہنڈریڈویٹ کے مقابلے میں ۱۹۳۶-۳۷ء میں ۹۱۷۰۰ ہنڈریڈویٹ ہوئی اس سال ہندوستان میں جملہ گیارہ کاغذ کی گرنیاں تھیں یعنی ۴ بنگال میں، ۴ بمبئی میں اور ایک ایک صوبۂ متحدہ، مدراس اور ٹراونکور میں۔ ٹیرف بورڈ کے اندازے کے بموجب ہندوستان میں کاغذ کے سالانہ صرف کی مجموعی مقدار ۱۰۰,۰۰۰ ٹن ہوتی ہے جس کے منجملہ موجودہ رفتار سے دیسی کاغذ کی کھپت بازار میں تقریباً ۵۰ ہزار ٹن تک ہوتی ہے۔ اس طرح جب موجودہ گرنیاں پوری قوت کے ساتھ کاغذ تیار کرنے لگیں گی تو وہ کل طلب کا ۵/۲ حصہ مہیا کرنے لگیں گی؛ دوسرے الفاظ میں ہندوستانی گرنیوں کی پیداوار کی طلب ابھی اتنی زیادہ نہیں ہوئی ہے کہ اس کی وجہ سے صنعت میں کوئی بڑی ترقی ممکن ہو۔ تاوقتیکہ ہندوستان میں اعلیٰ درجے کے اور زیادہ قیمتی کاغذ کی طلب میں کافی اضافہ نہ ہو، کوئی ہندوستانی گرنی یورپی گرنیوں سے مسابقت کرنے کے قابل نہ ہوگی جو اعلیٰ درجے کے کاغذ تیار کرنے میں خاص مہارت رکھتی ہیں۔

ہندوستانی کاغذ ساز کا اساسی خام مسالہ اب تک گھاس رہا ہے جو شمالی ہند میں بافراط پیدا ہوتی ہے اور یورپ کی اسپارٹو (Esparto) گھاس کے مثل ہے۔ ہندوستانی جنگلی درختوں کو کاغذ سازی کے لیے ابھی استعمال نہیں کیا گیا ہے اور گودا یورپ سے درآمد کیا جاتا ہے۔ ارزاں قسم کے کاغذ کے لیے، دھجیاں، سن، جوٹ کا فضلہ اور ردی کاغذ استعمال کیا جاتا ہے۔ انڈین پیپر پلپ کمپنی ہی ایک معروف استثنا ہے جو بانس کے گودے سے کاغذ تیار کرتی ہے۔ سبائی گھاس منتشر گچھوں کی شکل میں اگتی ہے، دوسری قسم کی نباتات سے ملی ہوئی ہوتی ہے اور ناموافق موسموں سے متاثر ہوتی ہے۔ بانس کی پیداوار فی ایکڑ مختلف قسموں کی گھاس کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے اور اس کے مصارف پیدائش بھی کم ہوتے ہیں۔ بانس برما، بنگال اور جنوب مغربی ہندوستان میں بآسانی دستیاب ہوتا ہے۔ ہندوستان میں استعمال ہونے والے کاغذ کے بڑے حصے کے لیے بانس کا ریشہ کافی اچھا ہے۔ البتہ کاغذ سازی کے خام مسالے کی حیثیت سے بانس، سبائی گھاس کے مقابلے میں مضبوط اور دیرپا ہونے کے لحاظ سے گھٹیا درجے کا ہے۔ لیکن جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ہندوستان میں اعلیٰ درجے کے کاغذ کی طلب کم ہے۔ ۱۸۷۵ء سے اس نقطۂ نظر سے بانس بہت کچھ توجہ کا مرکز رہا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں برما کے امکانات کی تحقیق ایک خصوصی ماہر نے کی، اور اس کے فوراً بعد ہی ادارۂ تحقیقات صحرا میں گودے کا ماہر مقرر کیا گیا۔ یہاں جو تحقیقات ہوئی ہے اس کے نتیجے کے طور پر بانس کے کاغذی گودے کی صنعت کے مستقبل کے بارے میں بڑی توقعات پیدا ہو گئی ہیں اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر کاغذ کے گودے کے لیے ہندوستانی بانس اور گھاس سے کامیابی کے ساتھ استفادہ کیا جا سکے تو کاغذ کی عالمی قلت کے بارے میں اضطراب بڑی حد تک دور ہو سکتا ہے۔ گو خام مال کے بارے میں مستقبل امید افزا ہے پھر بھی صنعت

بعض مشکلات سے دوچار رہے ہے مثلاً کیمیائی اشیا کی گرانی، کوئلہ کی نقل وحمل کے مصارف کی زیادتی اور اس کانڈ نیویا، جرمنی، سلطنت متحدہ، آسٹریا، جاپان اور ریاست ہائے متحدہ کی شدید مسابقت کچھ سال ادھر سے کاغذ کی درآمد بڑھتی جارہی ہے۔ چنانچہ کاغذ اور مقوے کی مجموعی درآمد ۳۷-۱۹۳۶ء میں ۲۷ لاکھ ۱۸ ہزار ہنڈریڈ ویٹ ہوئی جس کی قیمت ۲ کروڑ ۶۴ لاکھ روپے ادا کی گئی۔ ص۹۰

۲۸۔ کاغذ کی تامین۔ کاغذ سازی اور کاغذ کے گودے کی صنعت نے اپریل ۱۹۲۴ء میں تامین کا مطالبہ پیش کیا اور ٹیرف بورڈ سے اس پر غور کرنے کی استدعا کی۔ بورڈ کی تحقیق نے اس توقع کو حق بجانب قرار دیا کہ بانس سے کاغذی گودے کی تیاری اور کاغذ سازی کو کامیابی کے ساتھ ترقی دی جاسکتی ہے۔ بورڈ نے سفارش کی کہ بعض قسموں کے لکھائی اور چھپائی کے کاغذ پر جو ہندوستانی کاغذ سے مسابقت کر رہا تھا ایک آنہ فی پونڈ کا تامینی محصول ۵ سال کے لیے عائد کیا جائے اور انڈین پیپر پلپ کمپنی واقع نیہٹی کو دس لاکھ روپے قرض دیا جائے یا اصل اور سود کے بارے میں ضمانت دی جائے تاکہ وہ زیادہ تعداد میں مشینیں خرید سکے اور تجارتی بنیاد پر سلفائیٹ کے طریقے کی آزمائش کرسکے۔ اسی طرح ہر اس صنعت کو جو سوڈے کے طریقے کی آزمائش کرنے کے لیے تیار ہو اسی قسم کی مدد دی جائے۔

۱۹۲۵ء میں بانس کی کاغذی صنعت کی تامین کا قانون منظور ہوا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ بورڈ کی تجویز کے مطابق سات سال یعنی ۳۱ مارچ ۱۹۳۲ء تک ایک آنہ فی پونڈ کا تامینی محصول عائد کیا جائے تاکہ صنعت کی بنیاد مستحکم کی جائے۔ ۱۹۳۲ء کے بانس کی کاغذ سازی کے تامین کے قانون نے ٹیرف بورڈ کی سفارش کے مطابق تامینی محصول کی ۳۱ مارچ ۱۹۳۹ء تک تجدید کردی۔ یہ سفارش بورڈ نے اس لیے کی تھی کہ

بانس سے کاغذ بنانے میں مدد دینے سے بہت کچھ ترقی ہوئی تھی، خام مال کی رسد ۱۹۲۵ء کے مقابلے میں اب ارزاں اور افراط کے ساتھ دستیاب ہو سکتی تھی اور تامین کے زمانے میں ہندوستانی گرنیوں میں مصارف پیدائش بہت بڑی حد تک گھٹ گئے تھے۔ اسی قانون کی رو سے ایک نیا تامینی محصول ۴۵ روپے فی ٹن کے حساب سے چوبی گودے کی درآمد پر عائد کیا گیا تاکہ بانس کے گودے کی تیاری اور استعمال کے لیے قطعی محرک مہیا کیا جائے۔ اس صنعت کی ترقی کی رفتار نئی گرنیاں قائم ہونے کی حد تک کچھ زیادہ تیز نہیں رہی ہے۔ لیکن یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک گرنی بنگلور میں اور دوسری حیدرآباد میں کھلنے والی ہے۔ صنعت کاغذ سازی کی تامین کا سلسلہ جاری رکھنے کے مسئلے کو حال ہی میں دسمبر ۱۹۳۷ء میں ٹیرف بورڈ کے تفویض کردیا گیا ہے۔ چونکہ صنعت شکر سازی کی ترقی کی بدولت گنّے وغیرہ کے کھوجر کی شکل میں خام مال آج کل بہت کافی مقدار میں دستیاب ہو سکتا ہے اس لیے ٹیرف بورڈ کو چاہئے کہ دفتی اور پٹھے کو تامین دینے کے مسئلے کی بھی تحقیقات کرے۔

۲۶۔ شیشہ سازی۔ شیشہ سازی ایک بہت ہی قدیم صنعت ہے؛ چنانچہ پلینی بھی اس کا تذکرہ کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ اعلیٰ درجے کا ہندوستانی شیشہ بلوری قلموں سے بنایا جاتا ہے۔ پھر بھی آج کل قدیم صنعت کے کوئی آثار باقی نہیں ہیں۔ صرف اس قدر پتا چلتا ہے کہ وہ سولھویں صدی میں ایک باقاعدہ صنعت کی حیثیت سے موجود تھی، لیکن بہت ہی ادنیٰ اور گھٹیا مال تیار کرنے کی حالت سے آگے نہ بڑھی تھی جو چوڑیاں بنانے اور خفیف حد تک چھوٹی بوتلیں اور قرابے تیار کرنے کے کام میں لایا جاتا تھا۔ اس زمانے میں موجودہ زمانے کے مثل ملک میں چوڑیوں کی طلب زیادہ تھی

بعد میں چل کر ۱۸۹۲ء اور ۱۸۹۳ء کے درمیان جدید وضع کی شیشہ سازی کے پانچ کارخانے قائم ہوئے۔ لیکن جلد یا دیر سے سب کے سب بند بھی ہو گئے۔ یوروپی انتظام کے تحت جو کارخانے قائم ہوئے وہ سخت کشمکش کرتے رہے۔ اور زیادہ مدت تک چالو رہے لیکن ان میں کا آخری کارخانہ ۱۹۰۰ء میں دوالیہ ہو گیا۔ کارخانہ قائم کرنے کی ایک اور یوروپی کوشش ۱۹۰۹ء میں مدراس میں کی گئی، لیکن یہ بھی ناکام رہی۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیشہ سازی کی صنعت ہندوستانیوں کے لیے جاذبیت رکھتی ہے، کیونکہ سابقہ ناکامیوں کے باوجود سودیشی تحریک کے زمانے (۱۹۰۶ء - ۱۹۱۳ء) میں چھوٹے پیمانے پر تقریباً ۱۶ کارخانے قائم ہوئے، اور یہ خالص ہندوستانی جد و جہد کا نتیجہ تھے۔ ان کارخانوں میں بعض صورتوں میں یورپ میں شیشہ سازی کی تعلیم پائے ہوئے کاریگر اور بعض صورتوں میں جاپانی کاریگر ایسے ہندوستانیوں کی نگرانی کے تحت کام کرتے تھے جو جاپان میں جدید طریقوں کی تعلیم حاصل کر کے آئے تھے۔ لیکن جنگ عظیم کے شروع میں صرف ۳ کارخانے چالو تھے اور ان میں سے کسی کو بھی تجارتی نفع نہیں ہو رہا تھا، البتہ پونے کی تالے گاؤں والی فیکٹری پیسہ فنڈ کی امداد سے کسی قدر انوکھے اور غیر تجارتی اسلوب پر چل رہی تھی اور اپنے مصارف نکال لیتی تھی۔

صنعت کی موجودہ حالت میں اس کی دو قطعی قسمیں قرار دی جا سکتی ہیں (۱) دیسی گھریلو صنعت (چوڑی سازی) اور (۲) جدید فیکٹری کی صنعت۔ یوں تو دیسی صنعت کل ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن زیادہ تر ضلع فیروزآباد (یوپی) اور ضلع بلگام (جنوبی ہند) اس کا مرکز ہیں۔ فیروزآباد میں چوڑی بنانے والوں کی ایک بڑی نو آبادی اور تقریباً ساٹھ چوڑی کے کارخانے ہیں۔ فیروزآباد کی صنعت زیادہ تر بڑے

کارخانوں میں بنے ہوئے شیشہ کیک یا شیشہ کندوں سے ارزاں چوڑیاں تیار کرتی ہے۔ یہاں کی پیداوار مجموعی طلب کے تقریباً ایک تہائی حصے کو پورا کرتی ہے، اور جنگ عظیم کے زمانے میں سرسبز حالت میں رہی لیکن جاپان سے جو "ریشمی چوڑیاں" درآمد کی جاتی ہیں وہ دیسی مال کی بہت ہی طاقتور رقیب ہیں۔

فیکٹری کی صنعت ابھی ترقی کی ابتدائی منزل میں ہے، اور اس کی پیداوار زیادہ تر لیمپ کے سامان اور خفیف حد تک بوتلوں اور قرابوں کی تیاری تک محدود ہے۔ جنگ عظیم کے زمانے میں مجلس اسلحہ کی وساطت سے جو مخصوص قسم کے شیشے کی فرمایش ہوئی اس نے بڑے محرک کا کام کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیکٹریاں کسی حد تک کامیابی کے ساتھ شیشے کی نلیاں، تنگ گردن کی بوتلیں، بادیہ، پیالے، تشتریاں، اور کٹھالیاں تیار کرنے لگیں؛ اور انڈین میڈیکل سروس کی زیر نگرانی سائنس کے تجربے خانوں کے مطالبات کو پورا کرنے کے لیے چند کارخانے کھولے گئے ہیں۔ لیکن ہندوستانی کارخانے، شیشے کی چادر اور تختی تجربہ خانہ یا میز کا شیشہ یا نقشی شیشہ آلات نہیں تیار کر سکتے، البتہ ریاست آندھ واقع بمبئی کے گلاس ورکس نے حال میں مختلف نمونوں کے گلدان تیار کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

۳۰ - شیشہ کی درآمد:- جنگ عظیم سے پہلے ہندوستان ایک کروڑ ۹۰ لاکھ روپے قیمت کے شیشے اور شیشہ آلات درآمد کرتا تھا اور اہم درآمدہ اشیا میں چوڑیاں، منکے، جھوٹے موتی، شیشے کی چادر اور تختی، چراغ کا سامان، چھوٹی بڑی بوتلیں، سوڈے کی بوتل، میز کا سامان وغیرہ تھے۔ آسٹریا اور جرمنی، تجارت میں بہت غالب حیثیت رکھتے تھے۔ چنانچہ مجموعی درآمد اشیا میں

ان کا حصہ ۷۵ فی صد تھا۔ جنگ عظیم کے زمانے میں چوڑیوں اور لیمپ کے سامان کی درآمد گھٹ گئی اور ان کی جگہ ہندوستانی سامان نے لے لی۔ ہندوستان میں تیار کئے ہوئے شیشہ آلات کی مجموعی قیمت کا اندازہ ۱۸-۱۹۱۷ء کے لیے ۴۰ لاکھ روپے کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں ٹیرف بورڈ نے اس کا اندازہ ایک کروڑ ۴۰ لاکھ روپے لگایا۔ درآمدہ سامان میں جاپان کا حصہ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ ۱۹۲۹ء-۳۰ء میں درآمدہ اشیا کا اندازہ ۲ کروڑ ۵۲ لاکھ روپے کیا گیا اور یہ زیادہ تر جاپان، سلطنت متحدہ، جرمنی، بلجیم، اور چیکوسلواکیا سے آئیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی صنعت ابھی اپنے ایام طفلی میں ہے۔ درآمدہ اشیا کی قیمت ۱۹۳۰ء-۳۱ء میں ایک کروڑ ۶۵ لاکھ روپے، ۱۹۳۱ء-۱۹۳۲ء میں اور دوبارہ ۱۹۳۳ء-۳۴ء میں گھٹ کر ایک کروڑ ۲۲ لاکھ ہو گئی۔ ۱۹۳۶-۳۵ء یہ بڑھ کر ایک کروڑ ۳۹ لاکھ ہو گئی لیکن ۱۹۳۶ء-۳۷ء میں گھٹ کر ایک کروڑ ۲۸ لاکھ تک آ گئی۔ جاپان نے پھر بھی اپنی غالب حیثیت برقرار رکھی، چنانچہ اس کا متناسب حصہ ۴۹ فی صد رہا۔

غیر ملکی مسابقت کے علاوہ، دوسری مشکلات، ناتجربے کارانہ نگرانی، تربیت یافتہ ماہروں کی کمی، اور کوئلہ، سوڈے کی راکھ، ریت اور چونہ جیسی ضروری اشیا کی ناکافی رسد اور غیر مکتفی مالیہ وغیرہ تھیں۔ ٹیرف بورڈ کے شائع کردہ اعداد کے مطابق ۱۹۳۲ء میں ۵۹ شیشے کی فیکٹریاں تھیں، جن کے اہم مرکز بمبئی، جبلپور، الہ آباد، نینی، بہجوی، انبالہ، لاہور، اور کلکتہ تھے۔ ہندوستان میں شیشے کی صنعت کی جغرافی تقسیم وسیع ہے اور اس کی پیداوار کی نوعیت اور اس کی تیاری کے طریقوں میں (اس کے محل وقوع کے اعتبار سے) نمایاں فرق اور اختلافات ہیں۔ لیکن صنعت کے تمام شعبوں کی مشترکہ احتیاج وہی اشیائے خام ہیں[1] شیشہ کے کارخانوں کے محل وقوع کا انتخاب

---

[1] دیکھو ٹیرف بورڈ کی رپورٹ (شیشے کی صنعت) فقرہ ۴۔

خاص کر جنگ عظیم کے زمانے میں جبکہ اعلیٰ قیمتوں کے باعث اس عامل کو نظر انداز کر دیا گیا تھا ہمیشہ بالکل اچھا نہیں رہا؛ اور خام اشیا اور بازاروں کی قربت سے حاصل ہونے والی سہولت کے مقابلے میں شخصی امور کا عام طور پر حد سے بہت زیادہ لحاظ کیا گیا۔ بمبئی جیسے دوسرے مرکزوں کے مقابلے میں صوبۂ متحدہ میں الہ آباد اور نینی اس لحاظ سے بہت زیادہ سہولتیں رکھتے ہیں کہ ان کا محل وقوع خام اشیا اور ایندھن کے مرکزوں سے بہت قریب ہے۔[1]

برقی شیشے بھٹی کو چلانے کے لیے ارزان برقی مہیا کر کے ایندھن کی مشکل کو رفع کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ اتنا آسان معاملہ نہیں ہے جتنا کہ کسی زمانے میں ناواقفیت کی بنا پر سمجھا جاتا تھا۔ مزدور حاصل کرنے کی مشکلات بلاشبہ بہت زیادہ ہیں کیونکہ شیشے کی صنعت اپنی سادہ شکل میں بھی نہایت مہارت طلب ہے، اور صرف سائنٹیفک طریقے پر تربیت یافتہ منتظم اور ماہر مزدور ہی اسے عمدگی کے ساتھ چلا سکتے ہیں۔ شیشہ وَموں کی تعلیم و تربیت کرنے میں پیسہ فنڈ گلاس ورکس واقع تالے گاؤں نے بہت ہی مفید کام انجام دیا ہے، اور جنگ عظیم کے حالات کے تحت صنعت میں جو توسیع و ترقی ہوئی اس کا زیادہ تر باعث مزدوروں کی رسد تھی جو اسی مقام سے دستیاب ہوئی، اگرچہ یہاں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ بہت کچھ اصلاح کی محتاج ہے۔ سرالفرڈ چیٹرٹن یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ایک سرکاری گلاس فیکٹری ایک اعلیٰ درجے کے صناعیاتی تجربے خانہ اور ماہروں اور تجربہ کار کاریگروں کے قابل عملہ

---

[1] دیکھو فاکس کی رپورٹ موسوم بہ (Notes on glass manufacture)

(ہندوستانی صنعتوں اور مزدوروں کے متعلق رسالہ نمبر ۲۹ شائع شدہ ۱۹۲۲ء)۔

کے ساتھ قائم کی جائے۔ ریلوے کی سہولتیں مہیا کرنا بھی ضروری ہے۔

۱۳۱ - شیشہ کی صنعت کی تامین:- ہندوستانی شیشہ سازوں کی درخواست کے جواب میں حکومت ہند نے شیشے کی صنعت کی تامین کے مطالبے کو اکتوبر ۱۹۳۱ء میں ٹیرف بورڈ کے پاس بغرض اظہار رائے بھیجا۔ بورڈ نے اپنی رپورٹ ۱۹۳۲ء میں پیش کی اور یہ سفارش کی کہ دس سال کے لیے تامین دی جائے؛ نیز شیشے کی چادر اور تختی، چوڑیوں، منکوں بھوٹے موتیوں شیشہ اور شیشہ آلات پر تامینی محصول عائد کرنے کی تجاویز پیش کیں۔ حکومت ہند نے تاخیر کے ساتھ جون ۱۹۳۵ء میں اپنے فیصلے کا اعلان کیا۔ جو ٹیرف بورڈ کی تحقیقات اور سفارش کے خلاف تھا۔ حکومت نے تامین کے استدلال کو اس بنیاد پر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ خام مال (یعنی سوڈے کی راکھ) کی رسد کی عدم موجودگی صنعت کے حق میں نقصان رساں تھی جس کی تلافی کسی ایسے فائدے یا سہولت سے نہیں کی جاسکتی جو دوسری حیثیتوں سے اس کو حاصل ہے۔ پھر بھی حکومت نے اپنے آخری فیصلے کو اس وقت تک ملتوی کر دیا ہے۔ جب تک سوڈے کی راکھ کی رسد کے نئے ذرائع حاصل کرنے کے امکانات کی پوری طرح تفتیش نہ ہو جائے۔ اس اثنا میں حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ صنعت شیشہ سازی کو درآمدہ سوڈے کی راکھ کے محصول کی منہائی کی شکل میں کسی قدر مدد دے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ برطانوی اور نو آبادیاتی سوڈے کی راکھ پر منہا کردہ رقم سب کی سب اور دوسرے ممالک کی راکھ پر کچھ حصہ (جو ۱۰ فی صد سے زائد ہو) بصورت نقد واپس کیا جائے۔ یہ رعایت تین سال تک جاری رہے گی، اور اگر اس مدت کے اختتام پر یہ معلوم ہو کہ تامین

ا ؎ دیکھو (Industrial Hand book) صفحہ ۲۶۹ -

کی ضرورت بادی النظر میں باقی ہے تو ٹیرف بورڈ سے مزید مشورہ کیا جائے گا۔ حکومت ہند کے اس فیصلے سے شیشہ سازوں کو بڑی حد تک مایوسی ہوئی، اور وہ عام طور پر مخالفانہ نکتہ چینی کا موضوع بنا رہا۔ ٹیرف بورڈ نے گو یہ تسلیم کیا کہ سوڈے کی راکھ کے اطمینان بخش ذرائع ہندوستان میں ابھی تک موجود نہ تھے، لیکن یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ واقعہ فی نفسہ، صنعت شیشہ سازی کی تائین کے مطالبے کو ناقابل پذیرائی نہیں قرار دیتا۔

۳۲۔ سمنٹ کی صنعت:۔ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ ہندوستان میں بڑے داخلی بازار کی موجودگی، سمنٹ سازی کے موافق حالات اور اس صنعت کی قومی اہمیت کے باوجود جنگ عظیم سے پہلے سمنٹ سازی کی صنعت کی حیثیت بہت ہی حقیر تھی، اور وہ برطانوی معیار کے مطابق سمنٹ تیار کرنے کے قابل نہ تھی۔ جنگ عظیم سے پہلے بھی ہندوستان میں سمنٹ کثیر مقدار میں استعمال کی جاتی تھی۔ چنانچہ تقریباً ۸۰۰۰۰ ٹن سمنٹ سالانہ درآمد کی جاتی تھی۔ جنگ عظیم کے بعد سمنٹ کی مانگ بہت تیزی کے ساتھ بڑھی، اور اس کی مقدار اب کم و بیش دس لاکھ ٹن سالانہ ہے۔ فیرو کنکریٹ (لوہا کنکریٹ) کا استعمال، پلوں اور ہر قسم کے بھاری تعمیر کے کاموں میں بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے؛ حتیٰ کہ یہ کہا جانے لگا ہے کہ "فولادی عہد" اب "سمنٹ، لوہے اور کنکریٹ" کے دور سے بدل رہا ہے۔

یوں تو پورٹ لینڈ سمنٹ کی تیاری مدراس میں ۱۹۰۴ء ہی میں شروع ہوگئی تھی۔ لیکن جنگ عظیم سے صرف کچھ زمانہ پیشتر ۱۹۱۲ء۔۱۳ء میں قائم شدہ تین کمپنیوں نے ہندوستان میں بڑے پیمانے پر سمنٹ سازی کا ارادہ کیا۔ چنانچہ سب سے اول پوربندر کی کاٹھیاواڑ سمنٹ کمپنی نے کاروبار کا آغاز کیا۔ اس کے بعد کٹنی سمنٹ اینڈ انڈسٹریل

کمپنی (صوبۂ متوسط) اور بنڈی پورٹ لینڈ سمنٹ کمپنی (راجپوتانہ) نے کام شروع کیا۔ حال میں صنعت نے خاص کر حکومت کی سرپرستی میں ترقی کی ہے؛ چنانچہ حکومت نے جنگ عظیم کے آخری زمانے میں پیداوار کا بیشتر حصہ خریدا۔ جنگ عظیم کے بعد کی گرم بازاری کے دور میں عظیم منافعہ کی ترغیب کے تحت جو اس وقت صنعت سے حاصل ہو رہا تھا، کئی کمپنیاں کھولی گئیں۔ تین قدیم کمپنیوں نے اپنی پیداوار دگنی کرلی؛ اور سات نئی کمپنیاں کھولنے کی تجویز مرتب ہوئی، چنانچہ ان میں سے چھ کمپنیوں نے ۱۹۲۳ء تک کاروبار شروع کردیا۔ اس طرح ترقی کی رفتار بہت تیز رہی، اور مجموعی پیداوار ۱۹۱۴ء کے ۹۴۵ ٹن سے بڑھ کر ۱۹۲۴ء میں ۴۶،۲۳۶ ٹن ہوگئی، اور اسی مدت میں درآمد ۱۶۵،۳۴۳ ٹن سے ۱۲۴،۱۸۶ ٹن تک گھٹ گئی ۱۹۳۰-۳۱ء میں درآمد میں مزید کمی ہوئی اور اس کی مقدار صرف ۱۱۲،۰۰۰ ٹن رہی، جس کے منجملہ ۶۳،۲۰۰ ٹن سلطنتِ متحدہ نے مہیا کئے، اور دوسرے اہم ذرائع جاپان، جرمنی، اٹلی اور بلجیم تھے۔ ۱۹۳۱-۳۲ء میں سمنٹ کی درآمد میں مزید کمی ظاہر ہوئی، چنانچہ اس کی مقدار صرف ۵۱،۰۰۰ ٹن اور قیمت ۱۹ لاکھ روپے تھی۔ اس درآمد میں احاطۂ مدراس اور برما کا حصہ سب سے زیادہ تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ یہ صوبے ہندوستانی سمنٹ کے کارخانوں سے دور واقع تھے۔ اسی سال ہندوستان میں پورٹ لینڈ سمنٹ ۹۹۷،۰۰۰ ٹن تیار ہوئی؛ اس کے مقابلے میں ۱۹۳۳ء، ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۲-۳۳ء میں پیداوار کے اعداد علی الترتیب ۶۴۳،۰۰۰ ٹن اور ۵۹۳،۰۰۰ ٹن تھے۔ بحیثیت مجموعی ہندوستانی سمنٹ سازی کی صنعت کی ترقی میں سمنٹ مارکیٹنگ کمپنی آف انڈیا کے قیام نے بہت سہولت پیدا کی؛ یہ کمپنی تمام سمنٹ ساز کمپنیوں کی نمایندہ تھی۔ ہندوستانی سمنٹ بلحاظ خوبی برطانوی پیداوار سے گھٹیا نہیں ہے، اور براعظم کی ارزاں سمنٹ کے مقابلے میں بہت

مضبوطی کے ساتھ جمی ہوئی ہے اور کامیابی حاصل کر رہی ہے۔ سَراف اِی، ڈنشاہ آنجہانی کی کوششوں کی بدولت ہندوستان کی سمنٹ کی صنعت نے ترقی کا بہت بڑا قدم آگے بڑھایا اور ایک نیا موثر اتحاد جو ''اسوسیٹیڈ سمنٹ کمپنیز آف انڈیا لمیٹیڈ'' (Associated Cement Companies of India Ltd.) کے نام سے موسوم ہے قائم کر لیا۔ توقع کی جاتی ہے کہ دس بڑی کمپنیوں کے اس جاذب توجہ اتحاد کی وجہ سے کاروبار میں بہت بڑی کفایت عمل میں آئے گی[1]۔

ٹیرف بورڈ نے دیکھا کہ صنعت فطری سہولتیں رکھتی ہے مثلاً چونے کا پتھر اعلیٰ درجے کا اور بڑی مقدار میں ملک کے اکثر حصوں میں ریلوے لائینوں سے متصل دستیاب ہوتا ہے؛ عمدہ چکنی مٹی بھی ریلوے لائینوں سے متصل ملتی ہے؛ اور کھریا مٹی بھی موجود ہے اگرچہ اس کی نقل و حمل کے لیے طویل فاصلے طے کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن ایندھن کے بارے میں صنعت کو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کیونکہ اکثر کارخانے کوئلے کی کانوں سے دور واقع ہیں۔ منڈیوں کے بارے میں بورڈ یہ بتلاتا ہے کہ اندرون ملک کی منڈی ہندوستانی سمنٹ کے کارخانوں کے لیے فطری طور پر محفوظ منڈی ہے؛ اور بجز کاٹھیاوار کی فیکٹریوں کے سب ہندوستانی کارخانے کسی بندرگاہ سے ۳۰۰ میل سے زیادہ دور واقع ہیں۔ دوسرے مقامات میں ہندوستانی سمنٹ کو بیرونی مال کی مسابقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن چونکہ ہندوستان میں سمنٹ کا اہم بازار اندرونی علاقہ نہیں ہے، بلکہ بمبئی اور کلکتے کی بندرگاہیں ہیں، لہٰذا اکثر ہندوستانی فیکٹریاں اس لیے نقصان اٹھاتی ہیں کہ وہ بندرگاہوں سے دور ہیں[2]۔

---

[1] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ ''تبصرہ بر تجارت ہند'' بابت ۳۷-۱۹۳۶ع، صفحہ ۸۲۔

[2] دیکھو ٹیرف بورڈ (صنعت سمنٹ سازی کی صنعت) کی رپورٹ، فقرہ ۸ تا ۱۲۔

اپریل ۱۹۲۴ء میں سمنٹ سازی کی صنعت کی تامین کا مسئلہ ٹیرف بورڈ کے غور وخوض کے لیے پیش ہوا، لیکن بورڈ نے صنعت کے لیے تامین کی سفارش کرنے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ وہ ضرورت سے زیادہ پیداوار تیار کر رہی تھی، اور قیمتوں کا تعین اندرون ملک ہندوستانی صناعوں کی مسابقت کی بنا پر ہو رہا تھا نہ کہ اشیائے درآمد کی بنا پر۔ بورڈ نے اندازہ لگایا کہ ہندوستانی کارخانے ۶۰۰,۰۰۰ ٹن کی انتہائی پیداوار تیار کرنے کے قابل ہو چکے تھے، اس کے برخلاف سالانہ صرف کی مقدار ۳۹۰,۰۰۰ ٹن تھی[1]۔ لیکن بورڈ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ حالات میں بہت جلد ثبات پیدا ہو جائے گا۔ اور سمنٹ سازی کے اکثر کارخانے کوئلے کی کانوں یا بندرگاہوں سے دور واقع ہونے کی وجہ سے ان کی ترقی میں جو رکاوٹیں پیش آ رہی تھیں ان کو دور کرنے کے خیال سے بورڈ نے یہ سفارش کی کہ ایسے قوانین وضع وجاری کیے جائیں جن کی رو سے حکومت کو اختیار دیا جائے کہ وہ ہندوستانی فیکٹریوں سے بعض بندرگاہوں یا ریلوے اسٹیشنوں کو (جو ان بندرگاہوں سے ایک مقررہ فاصلے پر ہوں) بھیجی ہوئی سمنٹ پر رقمی امداد دے بشرطیکہ امداد دینے کی وجہ سے درآمدہ سمنٹ کی قیمت کے مقابلے میں دیسی سمنٹ کی قیمت میں کمی نہ ہو۔ حکومت ہند نے اس قسم کا مشروط قانون وضع کرنے کے اصول کو تسلیم نہیں کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ رپورٹ کے بارے میں کوئی کارروائی نہ کی جائے۔

---

[1] ٹیرف بورڈ کی رپورٹ پیش ہونے کے بعد سے صرف میں مزید اضافہ ہو گیا ہے، جیسا کہ اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ ۳۷-۱۹۳۶ء کی ۹۹۷,۰۰۰ ٹن کی بڑھی ہوئی داخلی پیداوار کے علاوہ اسی سال ۵۱,۰۰۰ ٹن سمنٹ درآمد کی گئی چنانچہ اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔

۳۳۔ ٹیرف بورڈ کی طرف سے دوسری صنعتوں کے بارے میں تحقیق

(۱) کوئلے کی صنعت ــــ غیر ملکی کوئلہ اور خاص کر جنوبی آفریقہ کے کوئلے کی مسابقت کی طرف نیز ہندوستانی کوئلے کی صنعت کی تامین کے مطالبے کا پہلے تذکرہ کیا جا چکا ہے۔[1] ٹیرف بورڈ نے اپنی تحقیقات ۱۹۲۶ء میں ختم کی، اور یہ رپورٹ پیش کی کہ عام تامین کے لیے کوئی قوی بنیاد نہ تھی، لیکن یہ کہ ایک روپیہ آٹھ آنے فی ٹن کی شرح سے محصول حق بجانب ہوگا۔ اکثریت کی رپورٹ میں یہ بتلایا گیا کہ سب درآمد کیے ہوئے کوئلے پر تامینی محصول عائد کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صنعت کو بہت سی فطری سہولتیں حاصل ہیں، لیکن تامین کی وجہ سے کوئی معقول ترقی رونما نہ ہوگی۔ صنعت کی کساد بازاری کا باعث زیادہ تر یہ تھا کہ اعلیٰ قیمتوں کے دور میں صنعت نے انتہا سے زیادہ سریع ترقی کی تھی۔ اس کے علاوہ اصولی لحاظ سے ایندھن کی قیمت کو بڑھانے والی تدابیر عام طور پر اس وقت تک اختیار نہ کرنی چاہئیں جب تک کہ ایسا کرنے کے اسباب معقول اور اطمینان بخش نہ ہوں۔ ٹیرف بورڈ نے کوئلے کی کانوں کے مالکوں کو یہ مشورہ دیا کہ بنگالی کوئلے کے بارے میں مغربی ہندوستان کے مخالفانہ میلان کو رفع کرنے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں کوئلے کی درجہ بندی کی مجلس (مجلس درجہ بندی زغال) کے جاری کردہ صداقت نامے بہت مفید ثابت ہوں گے۔[2] مسٹر (اس وقت سر) پادم جی جن والا نے اپنی علیحدہ رپورٹ میں یہ بتلایا کہ انگریزی کوئلے پر تامینی محصول حق بجانب نہ تھا، کیونکہ وہ بلحاظ خوبی و

[1] دیکھو معاشیات ہند جلد اول، باب ۱ فصل (۲۹)۔

[2] دیکھو ٹیرف بورڈ کی اکثریت کی رپورٹ (کوئلے کی صنعت) فقرہ ۵۲۔

قسم ہندوستانی کوئلے سے مختلف اور بڑھیا تھا، اور یہ توقع کرنا غلط تھا کہ ہندوستانی کوئلہ انگریزی کوئلے سے مسابقت کر سکے گا۔ آسٹریلیا اور جاپان سے جو کوئلہ درآمد ہو رہا تھا اس کی مقدار بہت تھوڑی تھی۔ اسی وجہ سے بجز جنوبی افریقہ کے کوئلے کے تمام درآمد شدہ کوئلے پر محصول عائد کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی[1]۔

مسٹر جن والا نے اپنے رفقائے کار سے اختلاف کرتے ہوئے یہ سفارش کی کہ جنوبی آفریقہ کے کوئلے پر آٹھ آنے فی ٹن کے موجودہ محصول کے علاوہ ڈیڑھ روپیہ فی ٹن کا محصول متوازن بھی عائد کیا جائے۔ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان اور مشرقی بازاروں میں جنوبی آفریقہ کے کوئلے کی مسابقت سے ہندوستانی کوئلے کی صنعت کو سخت نقصان پہنچا تھا؛ یہ کہ جنوبی افریقہ کی ریلوں کی جانب سے برآمد کے کوئلے کو اور جہازی کوئلے کے لیے کرایے کی مراعات کی شکل میں دی ہوئی مالی امداد اس نقصان کا اصل سبب تھی؛ اور یہ کہ امتیازی تاءین کی پالیسی کے لحاظ سے محصول متوازن کا عائد کرنا حق بجانب تھا۔ حکومت ہند نے بورڈ کی متفقہ تحقیقات سے اتفاق کیا کہ سب درآمدہ کوئلے پر تاءینی محصول عائد کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں بتائی گئی تھی اور اکثریت کے اس خیال کی تائید کی کہ موجودہ حالات میں کسی محصول کا عائد کرنا مناسب نہ تھا۔ بیرونی کوئلے پر دس آنے فی ٹن کے موجودہ محصول کے علاوہ جنوبی آفریقہ کے کوئلے کی درآمد پر ایک روپیہ آٹھ آنے فی ٹن کے محصول متوازن عائد کرنے کے مسئلے کو اسوسئیٹیڈ چیمبرس آف کامرس (متحدہ ایوانہائے تجارت) نے دوبارہ اٹھایا؛ چنانچہ ان ایوانوں نے اپنی سالانہ کانفرنس منعقدہ ۱۹۲۵ء میں اس قسم کا محصول عائد کرنے کے لیے

[1] ٹیرف بورڈ کی اقلیت کی رپورٹ (کوئلے کی صنعت) فقرہ ۲۔

پُر زور استدلال پیش کیا۔ تاکہ جنوبی افریقہ کے کوئلے کی درآمد کے مقابلے میں ہندوستانی کوئلے کو تامین دی جا سکے۔ کیونکہ کوئلے کی مقامی پیداوار کے مقابلے میں جو محدود طلب تھی اس کو بھی جنوبی افریقہ کا کوئلہ پورا کر رہا تھا۔[1]

(۲) دیا سلائی کی صنعت:۔ گجرات اسلام میاچ فیکٹری کے قطع نظر جو ۱۸۹۵ء میں احمد آباد میں قائم ہوئی تھی ۱۹۲۱ء سے پہلے ہندوستان میں تجارتی اصول پر دیا سلائی کا کوئی کامیاب کارخانہ نہیں کھلا۔ وقتاً فوقتاً چھوٹے پیمانے پر فیکٹریاں کھلیں، لیکن نامناسب محل وقوع، ناکافی اصل یا غیر تشفی بخش انتظام کے باعث فوراً بند بھی ہو گئیں۔ ۱۹۲۲ء میں محاصل کے اغراض کے لیے ایک روپیہ آٹھ آنے فی گروس یا بلحاظ قیمت زائد از ۱۰۰ فی صد محصول درآمد عائد کرنے کی وجہ سے کچھ سال ادھر سے دیا سلائی کی صنعت میں بہت کچھ توسیع و ترقی ہوئی ہے۔ صنعت کو ایک وسیع داخلی بازار پر دسترس حاصل ہے اور صرف کا اندازہ ۱۷ ملین گروس سالانہ کیا گیا ہے۔ مزدور ادنیٰ شرح اجرت پر ملجاتے ہیں اور سادہ مشنری کو اچھی طرح چلا سکتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں کم و بیش ۲۷ فیکٹریاں ہیں جو روزانہ ۵۰۰ گروس یا اس سے زائد مقدار تیار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ حال میں ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ محصول درآمد سے بچنے کے خیال سے عظیم الشان سویڈش اتحاد نے جو دنیا کی مجموعی طلب کے تقریباً ۶۰ فی صد حصے کو پورا کرتا ہے ہندوستان میں دیا سلائی کے کارخانے کھولدیے اور اس زبردست غیر ملکی کمپنی کی مسابقت سے دیسی صنعت پر جو نقصان رساں اثرات پڑ رہے تھے ان کے مدنظر ایوان ہائے تجارت کی جانب سے سخت احتجاج کیا گیا۔ تامین کے

---

[1] دیکھو جلد اول عبارت منقولۂ بالا۔

مطالبے کے بارے میں بورڈ نے ۱۹۲۸ء میں جو رپورٹ پیش کی اس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ ہندوستانی دیاسلائیوں کی قیمتوں کا تعین اندرونی مسابقت کی بنا پر ہوتا تھا۔ صارف ان کو حتی الامکان ارزاں حاصل کرتا تھا، اور سرکاری امداد کے بغیر صنعت عالمی مسابقت کی مقاومت کر سکتی تھی۔ پھر بھی بورڈ نے یہ سفارش کی کہ محاصل کی غرض سے ایک روپیہ آٹھ آنے فی گروس[1] کا جو محصول درآمد اب تک عائد تھا اس کو غیر معین مدت تک تامینی محصول میں تبدیل کر دیا جائے، تاکہ صنعت کو یہ یقین حاصل ہو کہ وہ اب تک جس تامین سے متمتع ہو رہی تھی اس سے فوراً محروم نہیں ہوگی۔ لیکن بورڈ نے سردست ایسی تدابیر کی کوئی سفارش نہیں کی جو ہندوستان میں سویڈش میاچ کمپنی کے مقابلے میں ہندوستانی اغراض کا تحفظ کرتیں۔ بورڈ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ کمپنی ہندوستان میں صنعت کی توسیع و ترقی کے لیے مفید کام کر رہی تھی، اور ہندوستانی صنعت کی تامین کے ساتھ ساتھ، خام مال کی رسد کے ہندوستانی ذرائع کو ترقی دینے، خوبی کے معیار کو عام طور سے بلند کرنے اور جدید طریقوں کو رائج کرنے میں بھی یہ کمپنی بہت کچھ مدد دے گی لیکن بورڈ نے سویڈش میاچ کمپنی کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا سرمایہ روپے کی تشکیل میں از سر نو قائم کرے اور ہندوستانیوں کو اپنی مجلس نظما میں داخل کر کے خود کو ہندوستانی قومی و سیاسی احساس کے مطابق بنائے۔ ساتھ ہی بورڈ نے کمپنی پر نگرانی رکھنے کی ضرورت کو بھی تسلیم کیا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ اپنے وسیع ذرائع کو ہندوستان میں اجارہ قائم کرنے کے لیے تو نہیں لگا رہی ہے۔[2]

---

[1] Gross = ۱۲ درجن۔

[2] بورڈ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ فیکٹریوں کی بڑے پیمانے کی پیداوار کی مسابقت کے مدنظر ہندوستان

ستمبر ۱۹۲۸ء میں ٹیرف بورڈ کی سفارش کے مطابق مجلس قانون ساز نے دیا سلائی کی صنعت کی تامین کا مسودۂ قانون منظور کر لیا، اور اس کی رو سے ایک گروس بکسوں پر جن میں سے ہر ایک میں ۱۰۰ دیا سلائیاں ہوتی تھیں ایک روپیہ آٹھ آنے محصول عائد کیا گیا۔ دیا سلائی بنانے کی سادہ سلائیوں کے ہر پاونڈ پر ۴½ آنے اور بکس بنانے کے تختوں پر فی پونڈ چھ آنے محصول عائد کیا گیا۔ ملک کی رائے عامہ کا بہت بڑا حصہ اور ہندوستانی ایوان ہائے تجارت، ٹیرف بورڈ اور حکومت کی اس پالیسی کے سخت مخالف تھے جو انھوں نے ہندوستانی اغراض کے تحفظ کے لیے معمولی قانونی تدابیر اختیار کئے بغیر سویڈش میاچ کمپنی جیسی بیرونی کمپنی کو تامین کا فائدہ حاصل کرنے کا موقع دینے کے بارے میں اختیار کی تھی۔ لیکن حکومت نے مجلس قانون ساز کو یقین دلایا کہ وہ اس بات کا اطمینان کرنے کے لیے کہ سویڈش اتحاد اجارہ کی شکل میں ترقی کرکے دیسی صنعت کے لیے خطرہ نہ ثابت ہو خاص احتیاطی تدابیر اختیار کرے گی۔[1] حکومت نے یہ بھی اعلان کیا کہ وہ تامینی محصول کو اس کی موجودہ اونچی سطح پر زیادہ مدت تک رکھنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ اس طرح ہندوستانی دیا سلائی کی صنعت، اعلیٰ محصول کی پناہ میں رہ کر، ہندوستان کی گھریلو ضرورتوں کو پورا کرنے کے قابل ہے۔ اور غیر ملکی دیا سلائیوں کی درآمد کی مقدار اس وقت بہت تھوڑی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:- میں دیا سلائی کی گھریلو صنعت قائم کرنا قطعاً ناممکن تھا۔ دیکھیے ٹیرف بورڈ کی رپورٹ (دیا سلائی کی صنعت) شائع شدہ ۱۹۲۸ء فقرہ ۱۳۱ تا ۱۳۲)۔

[1] ۱۹۳۱ء میں اپنے سالانہ جلسے میں ہندوستانی ایوانہائے تجارت کے وفاق نے حکومت پر زور دیا کہ وہ ایسی تدابیر اختیار کرے جن کے تحت سویڈش میاچ کمپنی کا ٹیرف بورڈ کی ان سفارشوں پر عمل کرنا یقینی ہو جائے جو کمپنی کی ناروا جدوجہد مثلاً دیسی صنعتوں سے قیمتوں کی جنگ کے مدنظر بورڈ نے پیش کی تھیں۔

ہے۔ چنانچہ ۲۲-۱۹۲۱ء کے ½۱۳ ملین گروس قیمتی ۲۰۴ لاکھ روپے کے مقابلے میں ۳۱-۱۹۳۰ء میں صرف ۳۷۹,۰۰۰ گروس بکس قیمتی ۴ لاکھ روپے درآمد کیے گئے ۳۷-۱۹۳۶ء میں درآمد کی مقدار گھٹ کر ۵۴۲,۰۰۰ گروس ہوگئی جسکی قیمت ۶۲,۰۰۰ روپیہ تھی[۱]

(۳) سنہری ڈورے کی صنعت:- یہ امر اطمینان بخش ہے کہ سنہری ڈورے کی صنعت کی تامین کا قانون جو فروری ۱۹۳۱ء میں منظور ہوا۔ اس میں اس ہندوستانی صنعت کو تامین دینے کے بارے میں ٹیرف بورڈ کی سفارشوں کو عملی جامہ پہنایا گیا ہے۔ اس قانون کی رو سے نقروی ڈورے اور تار اور سنہری ڈورے اور تار، نیز نقروی ورق اور ریتر، فلزاتی ستارہ اور اسی قسم کی اشیاء پر دس سال کی مدت کے لیے بلحاظ قیمت ۵۰ فی صد تامینی محصول عائد کیا گیا ہے۔ نیز چاندی کی تختی اور ظروف اور نقروی مصنوعات پر جن کی اب تک صراحت نہیں کی گئی تھی بلحاظ قیمت ۳۰ فی صد محصول بحال کر دیا گیا جو پہلے عائد تھا اور پھر معاف کر دیا گیا تھا۔

گھریلو صنعتیں

۴۳۔ چھوٹے پیمانے پر پیدائش کے برقرار رہنے کے اسباب

موجودہ زمانے میں صنعتی ترقی عام طور پر بڑے پیمانے کی پیدائش سے منسوب کی جاتی ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کی وجہ سے چھوٹے پیمانے کی پیدائش لازمی طور پر بالکل مفقود نہیں ہو جاتی۔ جدید وضع کے کارخانوں میں بھی پیدائش کے پیمانے کی ایک حد ہوتی ہے۔ جس سے تجاوز کرنے سے فائدہ نہیں ہوتا

[۱] ۱۹۳۲ء میں دیا سلائی پر جنگی کا جو محصول عائد کیا گیا اور اس کی وجہ سے درآمد کے محصول میں جو تبدیلیاں کی گئیں ان کے متعلق باب ۱۱ میں بحث کی گئی ہے۔

پیدائش کا سب سے موثر پیمانہ کیا ہے، ایک ایسا معاملہ ہے جس کا انحصار ایک حد تک استعمال شدہ قوت محرکہ پر ہے۔ مثلاً بھاپ کی بجائے برقی کا روز افزوں استعمال، اہم خارجی و داخلی کفایات کو نقصان پہنچائے بغیر موجودہ زمانے کی متوسط درجے کی فیکٹری کے مقابلے میں پیدائش کی اکائی کو چھوٹا کر دے گا۔ اسی طرح ہر ترقی پذیر معاشرے میں متعدد اشیا مثلاً فن کاری کے نمونے اور تعیش کی اکثر چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو معیاری طریقے پر تیار نہیں کی جا سکتیں۔ اس کے علاوہ تہذیب و تمدن کے مادی لوازم کی نت نئی ترقیوں کے باعث اور ان کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے بہت سے چھوٹے کارخانے وجود میں آتے ہیں۔ اس کی ایک مثال جو فوراً ذہن میں آتی ہے یہ ہے کہ موٹری نقل و حمل کی نشو و نما کی وجہ سے مشینوں کی مرمت اور درستی کے بیشمار کارخانے کھل جاتے ہیں۔ آخر میں یہ کہ نئی صنعتیں جس وقت تک تجربے کی حالت میں ہوں ابتداً چھوٹے پیمانے پر چلائی جاتی ہیں، اور صرف ان کے کامیاب ثابت ہونے کی صورت میں ان کو بڑے پیمانے پر منتظم کیا جاتا ہے[1]۔ چنانچہ مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی بڑے پیمانے کی صنعتوں کی دوش بدوش چھوٹے پیمانے کی صنعتیں کثیر تعداد میں اور آسودہ اور سرسبز حالت میں ہیں۔ مثلاً فرانس کے صنعتی کارخانوں میں ۹۰ فی صد سے زیادہ حصہ ایسا ہے جس میں ہر کارخانے میں ۱۰۰ مزدوروں سے کم تعداد سے کام لیا جاتا ہے، اور ان میں سے اکثر کارخانے ایسے ہیں جہاں فی کارخانہ ۵۰ مزدوروں سے بھی کم تعداد کام کرتی ہے۔ یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ انگلستان میں بھی جو

---

[1] دیکھو رادھا کمل مکرجی کی کتاب موسوم بہ: (Foundations of Indian Economics) ص ۳۶۰۔

بڑے پیمانے کی صنعت کا مرکز ہے، ۱۸۹۶ء میں کم و بیش ۳۶ ہزار کارخانوں میں ایک سا تھ ۵ مزدور فی کارخانے سے زیادہ تعداد کام پر نہیں رہی بلکہ کچھ سال ادھر تک یعنی ۱۹۱۳ء میں اکثر صنعتوں میں مزدوروں کی تعداد فی کارخانہ ۲۰ سے بھی کم تھی۔[1]

۳۵ - صنعتی ترقی اور ہندوستان کی گھریلو صنعتیں

ہندوستان میں، خاص کر موجودہ حالات کے تحت مستقبل قریب میں اس کا قرینہ ہے کہ صنعتی توسیع یہ شکل اختیار کرے کہ ملک کے طول و عرض میں چھوٹے پیمانے کے کارخانے بکثرت قایم ہو جائیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہندوستان کی صنعتی ترقی، پرانی وضع کی تمام صنعتوں کو کمزور کئے بغیر بدستور برقرار رہے گی۔ بعض پرانی بے جان صنعتیں، جدید صنعتوں کے دوش بدوش تقریباً ہمیشہ موجود رہیں گی، اور ہمیں یہ توقع رکھنی چاہیئے کہ صنعتی ترقی کی رفتار کو بہت تیز کرنا موجودہ زمانے کی بعض دست کاری کے پیشوں کے لیے مضر ہوگا۔ بعض صورتوں میں پرانی صنعتوں کی تباہی ناگزیر ہو گی، اور اس کو صنعتی ترقی کی قیمت تسلیم کرنا ضروری ہوگا۔ لیکن عبوری دور میں جو تکلیف اور خرابی رونما ہو اس کو دور کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کرنی چاہیے اور جو تبدیلی ضروری ہو اس کو آسانی سے عمل میں لانے کے لیے یہ احتیاط کرنی چاہیئے کہ کوئی تبدیلی اچانک عمل میں نہ لائی جائے اور اس سے جن لوگوں پر برا اثر پڑے دوسرے ذرائع سے اور روزگار کے مواقع مہیا کر کے ان کی مدد کرنی چاہیئے۔ اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان میں معاشی عبوری دور نے مختلف دیسی صنعتوں کو کس طریقے سے متاثر کیا۔[2] اور یہ بتلا دیا گیا ہے کہ دست کاروں کو

---

[1] دیکھو اکنامک جرنل بابت دسمبر ۱۹۲۲ء، صفحہ ۴۸۹ تا صفحہ ۴۹۰۔

[2] چنانچہ دیکھو جلد اول باب ۵، فصل ۲۰، ۲۱ اور ۲۵؛ نیز دیکھو ایک رپورٹ

آزاد چھوڑ دیا گیا تھا کہ اپنے ذاتی وسائل کو کام میں لائیں اور حکومت کی کسی قسم کی نگرانی یا امداد کے بغیر انھیں نئی صورت حال کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ یہ غلط طریقۂ کار تھا، اور آیندہ احتیاط کرنی چاہئے کہ اس کا اعادہ نہ ہونے پائے۔ (۱) دستی کتائی جیسی بعض پرانی صنعتیں تباہ ہو چکی ہیں۔ گو ہم یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ زراعت کے ذیلی پیشے کی حیثیت سے یہ صنعت کچھ خفیف امکانات رکھتی ہے، پھر بھی ہم یہ نہیں خیال کرتے کہ مصنوعی طریق پر اس میں نئی جان ڈالنے کی کوششوں سے ملک کوئی فائدہ حاصل کر سکیگا۔

(۲) دوسری گھریلو صنعتیں ایسی ہیں جن کی پیداوار، مشینوں سے بنے ہوئے سامان سے براہ راست مسابقت کر رہی ہے، اور جن کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نیم مردہ ہو چکی ہیں۔ ان صنعتوں سے لوگوں کے چمٹے رہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ یا تو آبائی پیشے کو چھوڑنا نہیں چاہتے، یا موجودہ تنظیم کے لحاظ سے کارخانوں کے سخت شرائط ان کو اپنا پیشہ چھوڑنے سے باز رکھتے ہیں، یا ممکن ہے کہ چھوٹے ہندوستانی دست کار کے "سرپرست اور حوا" یعنی ساہوکار نے ان کو ان کے روایتی پیشے میں رہنے پر مجبور کیا ہو، کیونکہ "تاجر ساہوکار" کی غرض اس میں وابستہ ہے کہ وہ دست کار کو اس کے پیشے میں غیر معین مدت تک رکھے تاکہ اپنا روپیہ اس سے واپس لے سکے اور اس کو لوٹتا رہے۔ ان صورتوں میں سے ہر صورت کا مناسب علاج موجود ہے۔ پروپگنڈے اور تعلیم کے ذریعے سے قدامت پرستی پر غلبہ حاصل کرنا چاہئے تاکہ دست کار متبدلہ حالات کے مطابق خود کو بنانا جلد سیکھ جائے۔ کارخانے کے کام کے متعلق جو خوف و دہشت پھیلی ہوئی ہے اس کو دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ فیکٹری کے مزدور کی حیثیت و حالت کی اصلاح و درستی کی جائے اور شہروں

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:- موسوم بہ RePort on the Survey of cottage Industries in Madras Presidancy شائع شدہ ۱۹۲۹ء۔

میں کام کے حالات و شرائط کو موجودہ زمانے کے مقابلے میں زیادہ ترغیب دہ بنانا چاہیئے۔ قرض داری سے نجات دلانے کے لیے قرض با مداد باہمی کا طریق اور دوسرے طریقے جن پر بحث کی جا چکی ہے اختیار کرنے چاہئیں۔

(۳) گھریلو صنعتوں کی تیسری قسم وہ ہے جو مذکورۂ بالا پہلی دو قسموں کی طرح کہنہ اور ناقابل اصلاح کمزوری میں مبتلا نہیں ہیں اور جدید حالات کے تحت بھی قائم رہنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ مثلاً ان صنعتوں کو جو زراعت سے قریبی تعلق رکھتی ہیں اور جن میں سادہ آلات کی ضرورت ہے عام طور سے فیکٹری کی مصنوعات کے مقابلے میں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسی صورتیں بھی ہیں جن میں دستکاروں نے خود کو کامیابی کے ساتھ نئے حالات کے مطابق بنا لیا ہے، اور اعلیٰ درجے کا خام مال اور بہتر آلات استعمال کرنا سیکھ گئے ہیں چنانچہ اپنی ضرورتوں کے لحاظ سے جولاہا کرنی کا سوت، رنگ ریز، مصنوعی رنگ، پیتل اور تانبے کا کام کرنے والا چادری دھات اور آہنگر مختلف شکلوں میں ڈھلا ہوا لوہا استعمال کرنے لگا ہے، اور ہر صورت میں مصارف پیدائش کی کمی سے فائدہ اٹھا رہا ہے، جس کی وجہ سے اس کے تیار کیے ہوئے سامان کی فروخت بہت وسیع ہو گئی ہے۔ جنوبی بنگال کے بعض علاقوں میں جلاہے جدید وضع کی ڈھرکی عام طور پر استعمال کرتے ہیں اور مدراس پریسیڈنسی کے ساحلی علاقوں میں جلاہوں کی بہت بڑی تعداد نے ڈھرکی کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ اور دوسرے مقامات میں بھی اس کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ خیاط، عام طور سے سلائی کی مشینوں پر کام کرتے ہیں، اور شہری دست کار یورپی یا امریکی ساخت کے جدید آلات کے استعمال کی طرف مائل نظر آتے ہیں[1]۔ اس کے علاوہ بعض دست کاروں کی

---

[1] دیکھو صنعتی کمیشن کی رپورٹ، فقرہ ۲۵۵۔

معاشی حالت اس وجہ سے مستحکم ہے کہ وہ جو اشیا تیار کرتے ہیں ایسی نوعیت کی ہیں کہ ان کو مشینوں سے یا بڑے پیمانے پر تیار نہیں کیا جاسکتا اور دستی محنت کی بجائے مشینوں سے تیار کرنے کی صورت میں وہ زیادہ ارزاں یا بہتر نہیں ہو سکتیں۔ ممکن ہے کہ عوام کے مذاق میں اس درجہ اختلافات ہوں کہ ایک ہی چیز مختلف وضع قطع کی درکار ہو۔ ایسی صورت میں ان کو بڑے پیمانے پر جدید مشینوں سے تیار کرنے میں کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ بازاروں کی قربت اور صارفوں کی ضروریات سے تفصیلی واقفیت گھریلو صنعتوں کے حق میں اور بھی زیادہ سود مند ثابت ہو[1]۔ اس کے علاوہ اگرچہ گاؤں کی خود کفالت کامل طور پر باقی نہیں رہی، پھر بھی آج کل اس کے اثرات خاص کر ان مقامات میں جہاں ریلوے نہیں ہے باقی ہیں۔ اسی وجہ سے گاؤں کی اجتماعی زندگی میں بعض دست کاروں کی اب بھی وہی حیثیت ہے جو سابق سے چلی آرہی ہے۔ اس کے علاوہ وہ گاؤں والوں کی سیدھی سادی ضروریات کی تکمیل اسی طرح کرتے ہیں جس طرح کہ پرانے زمانے میں کرتے تھے اور اپنی محنت کا صلہ اسی طریقے پر پاتے ہیں جس کو پہلے بیان کیا جاچکا ہے[2]۔ پھر بھی گاؤں کی خود کفالت روز بروز کمزور ہوتی جارہی ہے اور جب وہ ختم ہو جائے گی تو ان دست کاروں کی حیثیت

[1] چنانچہ بعض قسم کی پگڑیوں دھوتیوں اور ساڑیوں کو جو جلاہے دستی راچھ پر تیار کرتے ہیں جدید کارخانوں نے رواج سے نہیں ہٹایا۔ ڈھاکہ، مرشد آباد، مدورا اور بنارس کے جلاہے لکھنؤ اور دہلی کے کارچوب کے کاریگر اور سورت کے لیس تیار کرنے والے جو سامان تیار کرتے ہیں ان کی طلب مشینوں کے بنے ہوئے اسی قسم کے سامان کی مسابقت سے کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوئی ہے۔ فلز کار کفش ساز، سنار، درزی، حلوائی اور دوسرے دست کار اسی ذیل میں آتے ہیں اور اسی طرح محفوظ ہیں۔ دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "ہندوستان ۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۷ء میں" (India in 1926 - 27) صفحہ ۲۳۰۔

[2] دیکھو جلد اول باب ۵ فصل ۱۲۔

اور جدید حالات سے مطابقت پیدا کرنا ضروری ہوگا۔

جدید صنعت نے ہمارے ملک میں ابھی معمولی سی ترقی کی ہے۔ اس کے علاوہ ارزاں غیر ملکی مصنوعات کی آزاد درآمد کا طریقہ جو حال حال تک جاری رہا تمام ملکی صنعتوں کی کامل طور پر بیخ کنی نہ کرسکا۔ چنانچہ اس وقت بھی تقریباً ہر قصبے اور ہر قریئے کی آبادی میں مختلف گھریلو صنعتوں کے مزدوروں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے؛ بلکہ ان کی تعداد، منظم صنعتوں میں کام کرنے والے کاریگروں کے مقابلے میں بھی بدرجہا زیادہ ہے[1]۔ ان حالات میں ایک طرف سریع صنعتی توسیع و ترقی کے لیے کوشش کرنی چاہیئے، تو دوسری طرف اس بات پر نظر رکھنی چاہیئے کہ اس کے اثرات ہمارے ملک کے بے شمار غریب دست کاروں پر کیا ہوں گے۔

یہاں اس بات کا اعادہ کرنا مناسب ہوگا کہ ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ حکومت بے سوچے سمجھے جملہ قدیم صنعتوں کو قائم رکھنے کی کوشش کرے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ مستقبل قریب میں صنعتی ترقی کے جو امکانات ہیں ان کے بپیش نظر ہر گھریلو صنعت کے بارے میں مکمل تحقیق کی جائے۔ جہاں کسی قدیم صنعت کے متعلق یہ معلوم ہو کہ اس کا فنا ہونا یقینی ہے اس کو ترقی دینے کی ضرورت نہیں۔ ایسی صورت میں بہتر یہی ہوگا کہ اس کا خاتمہ بالخیر ہونے دیا جائے۔ لیکن جہاں کسی قدیم طرز کی صنعت میں فطری طور پر زندہ رہنے کے عناصر پائے جائیں وہاں اس کی بقا کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر صنعتی ترقی کے لیے یہ ضروری ہو کہ بڑے پیمانے پر اس کی تنظیم کی جائے تو ہمیں اسے بلا پس وپیش تسلیم کرلینا چاہیے، البتہ اس میں جو خرابیاں اور خطرات ہوں ان سے بچنے کی کوشش ضروری ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جہاں پرانی قسم کی تنظیم معاشی لحاظ سے رکاوٹ یا کمزوری کا باعث نہ ہو وہاں ہمارا مقصد

[1] دیکھو صنعتی کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۲۵۵۔

یہ ہونا چاہئے کہ اس کو ترقی دینے کا سلسلہ جاری رکھیں۔ گھریلو صنعت میں دست کار زیادہ آرام و چین کی زندگی بسر کر سکتا ہے اور اپنے ہی گھر میں اپنے اہل و عیال سے قریب رہ کر مقابلۃً زیادہ خوش گوار اور صحت بخش حالات کے تحت کام کرتا ہے۔ چونکہ وہ اپنی بنائی ہوئی اشیا کی تیاری اور ان کے استعمال کے درمیانی تعلقات کے کل سلسلے کو بخوبی سمجھتا ہے، اس لیے اپنے کام میں بدرجہا دلچسپی لے سکتا ہے۔ اور اپنی صناعی کی جدت سے مسرت حاصل کر سکتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ گھریلو صنعت میں مزدور اپنا کام آزادانہ طریقے پر انجام دیتا ہے، اور آجر و اجیر کی باہمی مخاصمت کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہوتی جس کا جدید صنعت میں ہمیشہ اندیشہ ہوتا ہے۔

مذکورۂ بالا حالات کی روشنی میں اب ہم ہندوستان کی چند گھریلو صنعتوں کی موجودہ حیثیت و حالت کو مختصر طور سے جانچیں گے، اور اس غرض کے لیے پارچہ بافی کی صنعتوں کا انتخاب کریں گے جو ہندوستان میں اہم ترین ہیں اور ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔

۳۶ سوتی صنعت دستی راچھ۔ سوت کی کتائی موجودہ زمانے میں تقریباً بالکل موقوف ہو چکی ہے، چنانچہ اس پر ہمیں غور و بحث کی ضرورت نہیں ہے[۱]۔ دستی راچھ کی صنعت اور اہمیت کا صحیح اندازہ عام طور پر نہیں لگایا جاتا۔ سوتی پارچہ بافی کی مجلس کروڑ گیری نے اپنی رپورٹ شائع شدہ ۱۹۳۲ء میں یہ تخمینہ کیا کہ (۱۹۸۴۹۵۰) راچھوں پر کام ہو رہا تھا اور ۱۹۳۱ء کے فراہم کردہ اعداد و شمار سے معلوم ہوا کہ (۲۵۷۵۰۰۰) مزدور ریشمی پارچہ بافی اور کتائی میں کام کر رہے تھے[۲]۔ اگرچہ یہ کہنا اب صحیح نہیں رہا

[۱] ہم چرخے کے احیا کے امکان پر جلد اول باب ۸ فصل ۱۹ میں بحث کر چکے ہیں۔

[۲] مختلف صوبوں میں موجودہ زمانے کی دستی سوتی راچھ کی صنعت کی صورت حال کی ایک

کہ "راس امید سے لے کر چین تک ہر مرد اور عورت سر سے پاؤں تک ہندوستانی راچھ کی پیداوار میں ملبوس ہے"[1]۔ اور اگرچہ صنعت کی موجودہ حیثیت وحالت بہت غیر اطمینان بخش ہے؛ پھر بھی اس کا مستقبل نہایت شاندار ہے، صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کو مناسب طریقے پر منظم کرنے کے لیے موزوں تدابیر اختیار کی جائیں۔

اس واقعے سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ گرنی کے بنے ہوئے پارچے کی مسابقت کے باعث دستی راچھ کی پارچہ بافی نے نقصان اور بعض صورتوں میں بہت سخت نقصان اٹھایا، جب جلاہے کا مقابلہ بڑے پیمانے کے کاروبار سے ہوا جو جلاہے کی تیار کی ہوئی اشیا جیسی اشیا بدرجہا ارزاں مصارف سے تیار کرتا تھا تو اس کے لیے کامیابی کا موقع باقی نہیں رہا۔ ان حالات میں جلاہے کو اپنا پیشہ ترک کرنا اور اس کی بجائے زراعت کو اختیار کرنا پڑا۔ وہ بالعموم بے زمین مزدوروں کے زمرے میں شامل ہوتا گیا اور بہت ہی پرخطر زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا۔ اب اس کی حالت یہ ہے کہ معمولی کسان کے مقابلے میں بھی قحط وخشک سالی کی مقاومت کرنے کی کم سکت رکھتا ہے۔ لیکن اس کی حیثیت ایسی اشیا کی تیاری میں بہتر ہے جو یا تو بہت بھدی ہیں یا بہت اعلیٰ درجے کی اور نفیس ہیں اور جن کی حد تک دستی راچھ کلوں کا بخوبی مقابلہ کر سکتا ہے۔ غریب طبقے، خاص کر دہقانی دستی راچھ کے بنے ہوئے کپڑے کو ترجیح دیتے ہیں، اس لیے کہ وہ گرنیوں کے تیار کردہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ؛ مختصر کیفیت کے لیے دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۲۹۹۔ دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "صنعتوں کے بارے میں حکومت کا عمل" از ۱۹۲۷ء تا ۱۹۳۷ء باب ۳۔

[1] ماخوذ از پائی راؤ۔

اسی قسم کے کپڑے کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ مضبوط اور پائدار خیال کیا جاتا ہے۔ گرنیاں، طرح طرح کے مخصوص وضع کے ایسے کپڑے تیار نہیں کرسکتیں جن کا استعمال ہندوستانی رسم و رواج کے تحت ضروری ہے، اس لیے کہ ان کی طلب بحیثیت مجموعی بڑی ہونے کے باوجود ہر منفرد وضع کی طلب اس قدر قلیل ہے کہ فیکٹری میں اس کو تیار کرنا معاشی حیثیت سے فائدہ بخش نہیں ہوتا۔ یہی حالت ان اعلیٰ درجے کے نفیس کپڑوں کی ہے جن کی تیاری کے لیے انفرادی مہارت درکار ہے۔ اس طرح دستکار کے لیے ایک معینہ میدان موجود ہے جس پر وہ حاوی رہ سکتا ہے اور جس کو فیکٹری اس سے چھین نہیں سکتی۔ صفحہ ۳۰ پر مندرجہ جدول سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۰۵-۱۹۰۴ء اور ۳۷-۱۹۳۶ء کے درمیان ہندوستانی دستی راچھ کی پیداوار میں ۱۰۸ کروڑ گز سے ۱۴۹ کروڑ گز تک اضافہ ہوا۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ دستی راچھ، ہندوستان میں کپڑے کی کل طلب کے تقریباً ۲۵ فی صد حصے کو پورا کرتا ہے۔ جنگ عظیم کے زمانے میں درآمدہ کپڑے کی کمی کو بخوبی پورا کرنے سے ہندوستانی گرنیوں کا قاصر رہنا اور التوائے جنگ کے بعد گرانی کے بنے ہوئے کپڑے کی نہایت اعلیٰ قیمتیں، ان دو اسباب نے جلاہے کی بڑی حد تک مدد کی۔ لیکن ۱۹۲۲ء کے بعد سے جلاہے نے بیرونی (خاص کر جاپانی) مسابقت اور ہندوستانی گرنیوں کے روز افزوں مقابلے سے بہت نقصان اٹھایا ہے؛ اگرچہ بعض ہوشیار اور اولوالعزم کاریگروں نے ریشم بافی اور ریلیس کے کام کو اختیار کرلیا ہے۔ فی الجملہ، دستی راچھ کی پارچہ بافی کی صنعت نے حالات کے مطابق اپنے آپ کو بنا لینے کی صلاحیت اور قوت حیات کا حیرت انگیز طریقے پر ثبوت دیا ہے۔

جلاہا، اپنے ذاتی گھر میں فیکٹری کے مزدور کے مقابلے میں زیادہ گھنٹے کام کرتا ہے، اور اس کو یہ بھی سہولت حاصل ہے کہ اس کے خاندان کی عورتیں خانہ داری کے کاموں سے فراغت پاکر بلا اجرت اس کی مدد

کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں وہ بہت ہی قلیل شرح منافعہ پر قانع ہوتا ہے اس لیے کہ اس کا معیار رہائش پست ہوتا ہے۔ گو یہ حالات اس کی قوت مسابقت کو بڑھا دیتے ہیں، پھر بھی اس کا وجود کوئی خوش آیند معاملہ نہیں ہے۔ اصلاح کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ دستی مزدور کی کارکردگی کو اس طرح ترقی دی جائے کہ وہ اعلیٰ تر معیار زندگی کو اختیار کرنے اور برقرار رکھنے کے قابل ہو جائے۔ گو یہ توقع کرنے کے قوی معاشی اسباب ہیں کہ اگر وہ اپنے معینہ دائرۂ عمل کے لیے جہاں فیکٹری اس کے تسلط میں مداخلت نہیں کر سکتی، خود کو وقف کر دے تو، وہ خوش حال رہے گا؛ پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی موجودہ حالت انتہائی افلاس اور مصیبت کی ہے۔ اس صورت حال کے اسباب اور علاج کے متعلق ایک عام بحث کی جا سکتی ہے جس کا اطلاق کل گھریلو صنعتوں پر ہو سکتا ہے۔ اس بحث کو اس باب کے آخر میں جگہ دی گئی ہے اور دستی راچھ کی صنعت کی امداد کے بارے میں حکومت ہند کی اختیار کردہ حالیہ تدابیر بھی بیان کی گئی ہیں۔

۳۷ - اونی صنعت:- ملک کے تمام حصوں میں اونی سامان کسی نہ کسی شکل میں تیار کیا جاتا ہے، اس کی وجہ محض یہی ہے کہ بھیڑیں ہر مقام پر پائی جاتی ہیں۔ یوں تو مختلف مقامات کی اون خوبی کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے، لیکن میدانوں کے مقابلے میں پہاڑی علاقوں کی بھیڑوں سے عام طور پر اعلیٰ درجے کی اون نکلتی ہے۔

مغلیہ دور میں اونی قالینوں کی صنعت عروج پر تھی۔ اونی قالینوں کی مانگ زیادہ تر شاہی درباروں اور طبقۂ امرا میں تھی اس لحاظ سے بڑے بڑے شہر جو حکومت کے مرکز و مستقر ہوتے تھے قدرتی طور پر اس صنعت کا مسکن بن گئے؛ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد یہ صنعت

دوسرے مرکزوں کو منتقل ہوگئی۔ سلطنت کی شکست نے قالینوں کی مقامی مانگ کو تقریباً موقوف کردیا، لیکن برطانوی حکومت قائم ہونے کے بعد اس کی جگہ بیرونی مانگ نے رفتہ رفتہ لے لی۔ گو اس غیر ملکی طلب نے دست کاروں کی معاشی تباہی کو روکنے میں مدد دی لیکن یہی سبب خراب اور گھٹیا قسم کی اشیا کی تیاری کا باعث ہوا۔ چنانچہ اس کی بنا پر ایسی ارزاں اشیا کی تیاری کی ہمت افزائی ہوئی جو باہر سے ہندوستان بھیجے ہوئے نمونوں کے مطابق بنائی جاتی تھیں۔ انیلین رنگوں کا روز افزوں استعمال، اشیا کی خوبی کو خرابی سے مبدل کرنے کا ایک اور سبب تھا۔ غیر ملکی بازاروں کے کھل جانے کی وجہ سے درمیانی اشخاص کی کثیر تعداد رونما ہوئی، جو موجودہ زمانے میں ہندوستان کی تجارت اور خاص کر برآمدی تجارت کی ایک خصوصیت ہوگئی ہے؛ موجودہ زمانے میں ہندوستان میں قالین بافی کا انحصار کم وبیش کامل طور پر غیر ملکی طلب پر ہے، اس طلب کو پورا کرنے میں مجموعی پیداوار کا تقریباً ۹۰ فی صد حصہ کام میں آجاتا ہے۔

قالین باف زیادہ تر مسلمان تھے؛ اور انھوں نے ایسے جتھے بنا کر خود کو منتظم کر رکھا تھا، جو نہ صرف مزدوروں کی اجرتوں اور اشیا کی قیمتوں کو، بلکہ تیار کردہ اشیا کی خوبی کو بھی متعین کرتے تھے۔ بظاہر ان جتھوں نے موثر طریقے پر کام کیا اور صنعت پر مفید اثر ڈالا۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، جتھوں کی تنظیم میں رخنے پڑتے گئے۔ علاوہ ازیں یہ حرفت مسلمانوں کا اجارہ نہ رہی اور قلیل تعداد ہندوؤں کی بھی اس میں حصہ لینے لگی، جو اپنے پیشۂ زراعت کے ساتھ ساتھ اس کو بھی چلاتے ہیں۔ آج سے تقریباً پچاس سال پیشتر قالین بافی کو محبسوں میں رائج کیا گیا، اور ان میں تربیت پائے ہوئے قیدیوں کو بالعموم ان فیکٹریوں میں کام ملجاتا تھا جو مختلف مقامات میں برآمد کرنے والی فرموں کی جانب سے کھولی گئی تھیں۔

جلاہے کے افلاس اور جہالت، نیز انتظام کی عدم موجودگی کے باعث قالین بافی کی حالت، گھریلو صنعت کی حیثیت سے نہایت نازک ہے۔ جلاہا عادتاً سوداگر سے پیشگی رقم لے لیتا ہے۔ پیشگیوں کا یہ طریقہ، آزاد دستکار کو سوداگر کا زر خرید غلام بنا دیتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے جلاہے کو کام میں ذاتی دلچسپی اور اصلاح و ترقی کی ترغیب نہیں ہوتی۔ وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اپنی محنت یا اشیا کو بہترین بازار میں فروخت کرے، اور سوداگر کے حکم کے مطابق کام کرنا اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے۔

برطانوی دور حکومت سے پیشتر کے زمانے میں، ہندوستان، خاص کر کشمیر میں شال کی صنعت نے بہت شہرت حاصل کر لی تھی، اور مغل شہنشاہ اس کی نشو و نما میں خاص طور پر دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ شہنشاہ اکبر کی سرپرستی اور مساعی ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ صنعت، کشمیر کے سوا دوسرے مرکزوں، مثلاً امرتسر، لاہور، لدھیانہ وغیرہ، میں قائم ہو گئی۔ کشمیر کی شالیں اعلیٰ درجے کی ساخت اور ملائمت کے لحاظ سے بے نظیر تھیں، اور سرحد پار کے ملکوں اور روس میں ان کی مانگ بہت زیادہ تھی۔ سنہ ۱۸۳۰ء کے قحط نے اس صنعت کو کاری ضرب لگائی، جس سے اس کا سنبھلنا دشوار ہو گیا، اور اس کی مشکلات میں ریاست کشمیر کے عائد کردہ کئی محصولوں نے اور بھی اضافہ کر دیا۔ یورپ کو تجارت برآمد کی ترقی انیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہوئی اور صنعت کے زوال کو روکنے میں اس سے مدد ملی، چنانچہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں یہ تجارت ۱۵ ہزار سے زائد مزدوروں کے لیے روزگار مہیا کرتی تھی۔ لیکن سنہ ۱۸۷۰ء کی جرمن و فرانسیسی جنگ نے یورپی طلب میں اچانک کمی کر دی۔ طلب کی یہ کمی بلحاظ نوعیت عارضی نہ تھی، اس لیے کہ یورپ میں شالوں کا فیشن تیزی کے ساتھ غائب ہو گیا، اور جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد بھی اس کی تجارت اپنی سابقہ حالت پر

نہ ہوتی۔ طلب میں کمی ہونے کا ایک اور سبب یہ تھا کہ انگلستان میں بمقام پیزلی شال بنانے کے کارخانے کھلے۔ چنانچہ ایک زمانے میں مشہور پیزلی شالوں کی فروخت سے ایک ملین پونڈ اسٹرلنگ سے زائد رقم وصول ہوئی، اور ان شالوں نے یورپی بازاروں سے ہندوستانی مال کا کامیابی کے ساتھ اخراج کر دیا۔

ایک اور ادنی صنعت بھی ملک میں بکثرت پھیلی ہوئی ہے اور وہ کھردرے موٹے کمبل کی صنعت ہے۔ دیہات کے غریب باشندے اسے مختلف طریقوں سے استعمال کرتے ہیں، "وہ اس سے بستر، بقچہ اور کوٹ یا چھتری کے کام لیتے ہیں"۔ کمبلوں کی صنعت عام طور پر ذیلی پیشہ ہے جس میں زیادہ تر ہندو چرواہے یا کسان حصہ لیتے ہیں۔ ان اشیا کی تجارت برآمد بالکل نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود یہ صنعت اس لیے اہم ہے کہ اس میں کام کرنے والوں کی تعداد کثیر ہے۔ یہ کل سے بنی ہوئی اشیا کی سابقت سے اس بنا پر محفوظ ہے کہ موخرالذکر ہاتھ کے بنے ہوئے کمبل کی طرح مضبوط اور دیرپا نہیں ہوتے۔ ملک کے ہر حصے میں خام اشیا کے دستیاب ہونے کی سہولت اور داخلی بازار کی وسعت کا لحاظ کرتے ہوئے کمبل بافی کا مستقبل گھریلو صنعت کی حیثیت سے بظاہر بہت امید افزا معلوم ہوتا ہے، چنانچہ اس کے امکانات کی باقاعدہ طور سے تفتیش کرنی چاہیئے۔ دستی راچھ کی اونی صنعت، تقریباً ۴ لاکھ اشخاص کے لیے جز وقتی روزگار رہتا کرتی ہے۔

۴۸۔ کرم پروری اور ریشمی مصنوعات

خام ریشم کی تیاری کا پہلا لازمہ یہ ہے کہ شہتوت کے درخت کافی تعداد میں موجود ہوں، تاکہ کرموں کو جبکہ وہ چھوٹے ہوں کافی غذا میسر آسکے۔ زمین جس میں شہتوت اگتا ہے، اور درختوں کی عمر اور حالت، کا لحاظ رکھنا کامیاب کرم پروری کے لیے نہایت ضروری ہے۔ مزدوروں کی وافر اور ارزان

رسد ایک اور ناگزیر عامل ہے - ہندوستان کے جن حصوں میں کرم پروری نے تھوڑی بہت کامیابی حاصل کی ہے وہ بنگال، کشمیر، اور میسور ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حصوں میں یہ کل شرائط و حالات موجود ہیں۔

کم و بیش سترھویں صدی کے ابتدائی تین چوتھائی حصے میں ایسٹ انڈیا کمپنی، خام ریشم کی تجارت میں خاص طور سے دلچسپی رکھتی تھی۔ بعد میں چل کر کمپنی نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستانی ریشمی مصنوعات انگلستان کو برآمد کرکے زیادہ منافع حاصل کیا جا سکتا ہے، چنانچہ اس نے اس پالیسی کو اتنی سرگرمی اور کامیابی کے ساتھ عملی جامہ پہنایا کہ انگلستان کے جلاہے بھی گھبرا گئے۔ انگریز جلاہوں کی مخالفت کے باعث نیز دوسرے اسباب کی بنا پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے دوبارہ خام ریشم کی تجارت کی جانب اپنا رخ پلٹا، اور سخت نقصان اٹھایا، جس کی بنا پر وہ سنہ ۱۸۳۵ء کے بعد تجارت میں سرگرم عملی حصہ لینے سے دست کش ہونے پر مجبور ہو گئی۔ اس اثنا میں خام ریشم کی تیاری کے موافق اور ریشمی مصنوعات کی تیاری کے مخالف پالیسی کا دیسی پارچہ بافی کی صنعت پر برا اثر پڑا[1]۔ اس کی حالت اور بھی زیادہ خراب اس قسم کے اسباب کی بنا پر ہوئی جن کو قالین اور شال کی اعلیٰ مصنوعات کے زوال کی توجیہ کے سلسلے میں بیان کیا جا چکا ہے، یعنی یورپی طلب کی نوعیت کی تبدیلی اور یورپ میں ریشم بافی کی ترقی جہاں یہ صنعت ہندوستانی صنعت پر فنی حیثیت سے سبقت لے گئی[2]۔ ان اسباب کی فہرست میں ایک اور سبب کا

[1] ریشمی صنعت کے زوال کا حال، برآمدی تجارت کے اعداد و شمار سے نمایاں طریقے پر معلوم ہوتا ہے۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں ریشمی مصنوعات کی برآمد کی مالیت ۰۰۰ر۹۶ر۲۳ روپے تھی؛ سنہ ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۳ء میں اس کی مقدار ۰۰۰ر۸۳ر۲ روپے تھی۔

[2] سنہ ۱۸۲۰ء تک ہندوستان، بافتہ ریشم کی درآمد کے مقابلے میں برآمد زیادہ کرتا تھا، لیکن

اضافہ کرنا ضروری ہے، اور وہ یہ کہ یورپی بازاروں میں جاپان، چین اور ریاستہائے متحدہ ہندوستان کے حریفوں کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ اور خود ہندوستان میں، دستی راچھ پر تیار کی ہوئی اشیا کی طلب، تعلیم یافتہ اور خوش حال جماعتوں میں گھٹ رہی تھی۔ قدیم طبقۂ امرا اور شاہی درباروں کے مٹ جانے سے جو کمی پیدا ہو گئی تھی اس کو پورا کرنے کی توقع انھی جماعتوں سے کی جا سکتی تھی، لیکن اس کو انھوں نے پورا نہیں کیا۔

خلاصہ یہ کہ کرم پروری اور پارچہ بافی، دونوں، آج کل ہندوستان میں زوال پذیر ہیں۔ ہندوستان کی خام اشیا کی برآمد نہ صرف مقدار میں گھٹ گئی ہے، بلکہ شکل میں بھی بدل گئی ہے۔ موجودہ زمانے میں ریشم صرف ردی یا کوئے کی شکل میں برآمد کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں اٹیرن اس قدر خراب کیا جاتا ہے کہ بیرونی ممالک اس ملک سے کویا حاصل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں اور اٹیرن کا کام خود ہی کر لیتے ہیں۔ یہی سبب ہندوستان میں درآمدہ ریشم کی روز افزوں مقبولیت کی توجیہ کرتا ہے۔ ہندوستانی پارچہ باف خود دیسی پیداوار کے مقابلے میں جو گرہوں اور کھلے ہوئے سروں سے بھری ہوئی اور غیر مساوی مضبوطی کی ہوتی ہے، زیادہ ہموار اٹیرے ہوئے چینی یا جاپانی تاروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہندوستانی ریشم کی خوبی کی اصلاح و ترقی کے لیے خاص کر بنگال میں کوششیں کی جا رہی ہیں۔ چنانچہ اس صوبے کا محکمۂ زراعت کرم پروری کے دو مدرسے چلا رہا ہے۔ اور کرمی تخم کے کئی فارم بھی قائم کیے گئے ہیں، جن کا انتظام محکمے کی نگرانی کے تحت ان مدرسوں کے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: تقریباً ۱۸۲۰ء کے بعد سے اس کی ریشمی اشیا کا داخلی و بیرونی بازاروں سے اخراج عمل میں آیا، اور زمانۂ قبل از جنگ سے اس کی ریشمی مصنوعات کی برآمد میں خفیف سی کمی ہو گئی۔

فارغ التحصیل طلبہ کرتے ہیں۔ ان مدرسوں میں تربیت پائے ہوئے طلبہ کو ۲۵۰ روپے فی کس بطور عطیہ دیے جاتے ہیں اور ان کو پرورش گاہیں تیار کرنے کے لیے سرکاری گھروں سے تخمی کرم فراہم کیے جاتے ہیں۔ اس کو منتخب پرورش کرنے والوں کا طریقہ Selected Rearir's gystem کہا جاتا ہے، اور اس سے اچھے نتائج پیدا ہو رہے ہیں۔ آسام اور کشمیر اور میسور جیسی دیسی ریاستوں میں بھی کرم پروری کی ہمت افزائی کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں حکومت ہند نے کرم پروری کی ایک شاہی کمیٹی قائم کی، اس کمیٹی کی سفارش کے مطابق ۹۴۰۰۰ روپے کا عطیہ مختلف صوبوں کو دیا گیا، تاکہ اس کی مدد سے بنگال، آسام، مدراس، بہار، اوڑیسہ، اور برما میں کرم پروری کو ترقی دینے کے متعلق تجاویز عمل میں لائی جائیں[1]۔ ان تجاویز کا مقصد امراض سے محفوظ تخموں کی پیداوار میں اضافہ کرنا اور ریشم کے کیڑے کے مرض کے متعلق تحقیق میں مدد دینا ہے۔ حکومت ہند نے یکم اپریل ۱۹۳۵ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۴۰ء تک ۵ سال کے لیے ایک لاکھ روپے سالانہ کا عطیہ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ بیرونی ریشم کی درآمد پر ۱۵ فی صد کا اعلیٰ محصول (جو بغرض آمدنی عائد کیا گیا تھا) ریشم کی پیداوار کو بڑھانے میں مدد دے رہا تھا، لیکن ۱۹۲۲ء میں مصنوعی ریشم کی درآمد کے محصول کو $\frac{1}{2}$ ۷ فی صد تک گھٹا دینے سے یہ امداد کم ہو گئی، اگرچہ ۱۹۳۱ء میں محصول کے تغیرات کے باعث اس محصول کو دوبارہ اسی کی سابقہ سطح ۱۵ فی صد پر بحال کر دیا گیا۔ مصنوعی ریشمی سوت کی درآمد چند سال سے بہت تیزی سے بڑھتی جاتی ہے۔ چنانچہ ۲۳-۱۹۲۲ء اور ۲۹-۱۹۲۸ء کے مابین ۲۲۵۰۰۰ پونڈ سے ۷۷۰۰۰۰۰ پونڈ تک اضافہ ہوا۔ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں درآمد ۱۷۶۰۰۰۰۰ پونڈ کی انتہائی مقدار تک پہنچ گئی، اور اس کی قیمت ۹۹ لاکھ روپے

[1] دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "ہندوستان ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں" صفحہ ۲۵۔

ادا کی گئی۔ قیمتوں کی کمی اور مال کی خوبی نے مصنوعی ریشم کی مقبولیت کو بڑھانے میں مدد دی۔ مصنوعی ریشم کی درآمد زیادہ تر جاپان اور اٹلی سے ہوتی ہے۔ جہاں تک ریشم بافی کا تعلق ہے، یہ دیسی صنعت، عمدہ انتظام کی عدم موجودگی، متوسط چلا آ رہے ہے کہ ایسے کن محدود ذرائع اور پیدائش کے دقیانوسی طریقوں کی وجہ سے بیرونی مصنوعات کے لیے بتدریج جگہ خالی کر رہی ہے۔ ریشمی پارچوں کی صنعت کے لیے گھریلو صنعت کی حیثیت سے ہندوستان کے موجودہ حالات میں بعض غیر معمولی سہولتیں ہیں۔ ریشمی مصنوعات کا جدید میکانی آلات کی مدد سے بڑے پیمانے پر پیداوار تیار کرنا سوتی مصنوعات کے مقابلے میں زیادہ دشوار ہے، اور ابھی اس ملک میں اس کا آغاز بھی بمشکل ہوا ہے۔ علاوہ ازیں ریشمی مصنوعات، ہندوستان میں زیادہ تر سامان تعیش کی نوعیت رکھتی ہیں اس لحاظ سے ان میں صنعت کاری کی حد تک بہت زیادہ تنوع کی گنجایش ہے۔ اس لیے ان میں ہمیشہ ایسا کام کافی موجود رہے گا جس کو صرف دستی پارچہ ہی سے انجام دیا جا سکتا ہے۔ رہا مکمل اشیا کی درآمد کا مسئلہ تو ملکی صنعت اس بنا پر بڑی حد تک محفوظ ہے کہ بیرونی مصنوعات پر محصول درآمد عائد ہے۔ چنانچہ خام مال کے مقابلے میں مصنوعات پر دگنا محصول وصول کیا جاتا ہے۔ آخر میں یہ کہ چند سال سے ہندوستانیوں میں حب وطن کی خاطر یہ رجحان نمایاں طور پر بڑھ چلا ہے کہ بیرونی اشیا کے مقابلے میں دیسی اشیا کو ترجیح دی جائے۔ اس طرح ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریشم کی گھریلو صنعت کے احیاء کے لیے حالات خاص طور پر موافق ہیں۔

یہاں یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ ہندوستانی محصول (پارچہ بافی کی تامین) کے قانون بابتہ ۱۹۳۴ء نے بھی ان فیصلوں کو عملی جامہ پہنایا جو صنعت کرم پروری کی تامین کے مطالبات کی تحقیقات کرنے کی غرض سے مقرر کردہ ٹیرف بورڈ کی سفارشوں کی بنا پر حکومت ہند نے کیے تھے۔ ص ۷۹

اس قانون کی رو سے خام ریشم، ریشمی سوت، ریشمی تھانوں، ملونی پارچوں، مصنوعی ریشم کے مختلف کپڑوں پر تامینی محصول عائد کیے گئے؛ علاوہ ازیں مصنوعی ریشمی سوت پر جو ریشمی سوت سے مسابقت کرتا ہے، محصول بلحاظ قیمت ۲۵ فی صد تک بڑھا دیا گیا، اور ایک متبادل اقل ترین مخصوص محصول ۳ آنے فی پونڈ مقرر کیا گیا۔

۳۹۔ دوسری گھریلو صنعتیں:۔ مختلف گھریلو صنعتوں کی موجودہ حیثیت جلد اول باب پنجم میں زیر عنوان "ہندوستان میں معاشی تغیر" بیان کردی گئی ہے، اور روغن برآری، دباغت، شیشہ سازی اور دیا سلائی کی گھریلو صنعتوں پر "صنائع" کے باب میں بحث کی جاچکی ہے۔ ذیلی زرعی صنعتوں کی موجودہ حالت اور مستقبل میں ترقی کے امکانات کا ذکر بھی زرعی تنظیم کے تحت جلد اول باب ہشتم میں کیا جاچکا ہے۔ ان کے علاوہ دوسری کئی گھریلو صنعتیں ہیں، مثلاً زردوزی، فرنیچر، فلز، چھری چاقو اور سونے اور چاندی کے تاروں اور دھاگوں کی صنعتیں، ظروف سازی، صابون سازی، کلاہ سازی، منکہ سازی، گڈھے اور چھوٹے مجسمے بنانا وغیرہ[1]۔ جگہ کی قلت کے باعث ہم کل گھریلو صنعتوں پر یہاں تفصیلی بحث نہیں کرسکتے[2]۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ہماری قومی معیشت میں ان کو جو دائمی اہم حیثیت حاصل رہے گی، اس کے مدنظر ہم جس طرح زراعت کو نظر انداز نہیں کرسکتے اسی طرح ان کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتے، خواہ جدید وضع کی صنعتوں کی سریع ترقی کے لیے ہماری فکر و سعی کتنی ہی زیادہ

---

[1] مدراس کی مختلف گھریلو صنعتوں کے دلچسپ بیان کے لیے دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "احاطہ مدراس کی گھریلو صنعتوں کا تبصرہ"۔ نیز گاڈگل کی کتاب محولۂ بالا صد ۲۹۹ تا صد ۳۰۲۔

[2] ان صنعتوں میں سے بعض کی اُجرتوں کی تفصیلات کے متعلق دیکھو شیعین کی کتاب محولۂ بالا باب ۶ ضمیمہ (۴)۔

کیوں نہ ہو۔

۴۰۔ گھریلو صنعتوں کو امداد دینے کے طریقے: [1]

چھوٹے دستکار کی جہالت اور افلاس اور اس کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کسی موثر انتظام کی عدم موجودگی، اس امر کو ضروری بنا دیتی ہے کہ اس کی امداد کے لیے ایک مکمل اور جامع پالیسی مرتب کی جائے اور اس کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ پہلا بدیہی قدم یقیناً یہ ہوگا کہ عام تعلیم بہتر طریقے پر دی جائے اور اسی کے توسط سے صنعتی پیشوں میں دستی تربیت دینے کی کچھ کوشش کی جائے۔ علاوہ ازیں یہ ضروری ہے کہ دستکار کی تعلیم کا معقول انتظام خصوصی صنعتی مدارس میں کیا جائے جن کا ناظم صنعت و حرفت کی نگرانی میں ہونا بہتر ہوگا۔ بمبئی میں محکمۂ صنعت و حرفت نے دستی راچھ پر کام کرنے والے جلاہوں کے فائدے کے لیے پارچہ بافی کے چھ مدارس قائم کر رکھے ہیں۔ صنعتی کمیشن نے بھی یہ سفارش کی تھی کہ زیادہ ذہین دستکاروں کی تربیت کے لیے، سرکاری امداد و سرپرستی میں دستی راچھ کے مظاہرے کی فیکٹریاں کھولنی چاہئیں، اور پارچہ بافی کے مدرسوں سے ایک تجارتی شعبہ ملحق کرنا چاہئے۔ تاکہ اس طرح کے تربیت یافتہ دستکار جو زیادہ حوصلہ مند ہوں اپنے طور پر دستی راچھ کی چھوٹی فیکٹریاں کھولنے کے قابل ہو سکیں۔ قید خانوں اور اصلاحی مدرسوں کے یتیموں کو مختلف حرفتی پیشے، مثلاً نجاری، بید بافی اور بانس کا کام وغیرہ سکھانے کا خاص انتظام کیا گیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ قیدی محبس سے چھوٹنے کے بعد اہل حرفہ کے طور پر زندگی شروع کر سکیں۔ لیکن قیدیوں کی رہائی کے بعد ان کے دھندے کی، باقاعدہ نگرانی کافی طویل مدت تک نہیں کی جاتی؛ اور

---

[1] دیکھو اے۔ جی کلو کی کتاب محولۂ بالا (The state Industry) باب ۲؛ اور بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۳۰۰۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ قیدیوں کو دست کاری کی تعلیم دینے کی یہ کوشش، گھریلو صنعتوں کو برقرار رکھنے میں کس حد تک مدد دے رہی ہے۔ گھریلو صنعتوں کو جو مشکلات عام طور سے پیش آتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ عمدہ قسم کا ارزاں خام مال آسانی سے نہیں ملتا۔ چنانچہ دیسی سوت اور ریشم کی خوبی کی اصلاح و ترقی کی ضرورت ہے۔ ایک اور ضروری اصلاح یہ ہونی چاہئے کہ زیادہ مفید اور کارگر آلات اور اوزار ایجاد اور رائج کئے جائیں۔ بہار اور اڑیسہ' میں صوبے کو دس حلقوں میں تقسیم کیا گیا ہے؛ اور ان میں سے ہر ایک میں ایک مظاہرہ کرنے والا متعین ہے، جو اصلاح و ترقی یافتہ آلات کا مظاہرہ کرنے کے لیے دورہ کرتا ہے۔ یہ مظاہرے کا نتیجہ انڈسٹریز انسٹی ٹیوٹ کے تجربوں پر مبنی ہیں جو اپنے مختلف شعبوں میں تجربے عمل میں لاتا ہے، کرگھوں رنگوں اور دوسرے لوازم وغیرہ کی رسد کا انتظام کرتا ہے' اور پارچہ بافوں میں نئے کپڑے اور نئی وضعیں رائج کرتا ہے۔ ریشمی صنعت کے لیے اسی قسم کی خدمات بھاگل پور سلک انسٹی ٹیوٹ انجام دیتا ہے' اور گیا کی آزمائشی کمبل ساز فیکٹری، جنوبی پٹنہ ڈویژن میں قدیم کمبل کی صنعت کے لیے یہی کام کر رہی ہے۔ صوبۂ متوسط میں، محکمۂ صنعت وحرفت نے جلاہوں میں ترقی یافتہ ڈھرکی کو رائج کرنے کے لیے باضابطہ کوشش شروع کر دی ہے۔ فنی تربیت کی سہولتیں اور فنی مشورہ مہیا کر کے اور دست کاروں کو نئے نمونے اور نئی وضعیں بتلا کر بھی بیش بہا مدد دی جا سکتی ہے۔ بعض صورتوں میں پیدائش کی بہتر تنظیم بھی مفید ہو سکتی ہے۔ مثلاً یہ ہو سکتا ہے کہ سادہ گھریلو صنعتوں میں بھی تقسیم عمل کی زیادہ گنجائش نکل آئے۔ مزدوروں کو ایک چھت کے نیچے جمع کرنے سے ایک طرح کا فیکٹری کا طریقہ قائم ہو جائے گا، اگرچہ یہ فیکٹری، گنجان شہری علاقے میں واقع نہ ہو اور میکانی قوت کا استعمال نہ کرے۔ اس قسم کا انتظام اس لیے ناکام رہا کہ گھریلو صنعت میں کام کرنے والے آزاد مزدور کو فیکٹری کے ضبط کی بآسانی

تربیت نہیں دی جاسکتی۔ تنظیم کی ایک اور صورت یہ ہوسکتی ہے کہ مزدور اپنے ذاتی گھروں میں فیکٹری کے منتظموں کے زیر نگرانی کام کریں اور منتظم، پیدائش کے لیے مالی امداد مہیا کرنے اور تیار شدہ اشیا فروخت کرنے کی ذمے داری لیں لیکن اس طریقے میں خرابی یہ ہے کہ کارخانہ داروں کو کاریگروں کی عرق ریزمحنت سے معمولی کارخانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل ہوجائے گا۔

دست کار کو ضروری اصل مہیا کرنے کے سلسلے میں صنعتی کمیشن نے یہ مشورہ دیا ہے کہ بعض صورتوں میں ناظم صنعت وحرفت کی جانب سے قلیل مقدار قرضے دیے جانے چاہئیں، یا آلات اور کلیں، قسط واری خرید کے طریقے پر فراہم کرنی چاہئیں، تاکہ وہ بالآخر دست کاروں کی ملک بن جائیں۔ لیکن اس مسئلے کا سب سے زیادہ امید افزا حل قرضۂ امداد باہمی میں ملتا ہے۔ امداد باہمی کا اصول، چھوٹے دست کار کی حالت کی اصلاح کے لیے نہایت نفع بخش معلوم ہوتا ہے[1] خواہ معتدل شرح سود پر قرضہ مہیا کرنے کا اصول اختیار کیا جائے یا خام اشیا اور آلات کی خریداری یا مکمل اشیا کی فروخت میں مدد دینے کا۔ اگر صنعتی بنک کھولے جائیں تو ان کے لیے نہ صرف بڑے پیمانے کی صنعت بلکہ چھوٹے پیمانے کے کاروبار کی مالی مدد کرنا بھی ممکن ہوگا، چنانچہ بنک اپنی متعدد شاخیں قائم کرکے ان سے اتصال قائم رکھ سکتے ہیں[2] موجودہ نظام کی ایک اور کمزوری یہ ہے کہ فروخت کا کوئی کارگر اور معقول انتظام نہیں ہے۔ چنانچہ دست کار اپنی اشیا کی بہترین قیمت حاصل کرنے میں اس لیے ناکام رہتا ہے کہ وہ اپنی اشیا کی مناسب تشہیر نہیں کرسکتا۔ لکھنؤ اور لاہور میں صنعت وحرفت کی فروخت گاہیں قائم کرنے کا مقصد کسی حد تک

---

[1] دیکھو جلد اول باب (۱۰) فصل (۱۱)۔
[2] دیکھو بمبئی کی صوبہ داری بنک کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ ۱۷۷۔

اسی وقت کا رفع کرنا ہے، لیکن خاطر خواہ نتائج پیدا کرنے کے لیے ایسی متعدد فروخت گاہیں درکار ہیں۔ دوسرے ملکوں میں فروخت کے انتظام پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ جرمنی کے کھلونے بنانے کی صنعت اور جاپان کی گھریلو صنعتیں، اپنی کامیابی کے لیے اس کاروباری تنظیم کی رہین منت ہیں جو ان کی پیداوار حاصل کر لیتی ہے اور اس کو ملک کے اندر و باہر فروخت کرتی ہے۔ موجودہ زمانے میں بیرونی بازاروں کو ہندوستان میں نظر انداز کیا جاتا ہے اور داخلی بازار کی طرف بھی مناسب توجہ نہیں کی جاتی۔ بمبئی کے سودیشی ذخائر' دیسی پیداوار کی اندرونی تقسیم کا ایک سرگرم اور کامیاب ذریعہ ہونے کی حیثیت سے ایک عمدہ مثال اور ایک قابل تقلید نمونہ ہیں۔ محکمۂ صنعت و حرفت کو اس قسم کے کاروباری اداروں سے اس غرض سے تعاون کرنا چاہیے کہ ہندوستانی دست کاروں کی پیداوار ملک کے طول و عرض میں اور بیرون ملک صارفون کے ہاتھ میں پہنچائی جائے۔ اس قسم کا انتظام کرنے اور انجمن ہائے امداد باہمی قائم کرنے کے علاوہ ایک مرکزی تجارتی نظام ضروری ہے، نہ صرف گھریلو صنعتوں کی پیداوار کے لیے وسیع ترین ممکنہ بازار حاصل کرنے کے لیے بلکہ علیحدہ اور بے تعلق گھریلو صنعتوں میں انضمام اور اتحاد پیدا کرنے کے لیے بھی۔ بنک کاری کی صوبہ داری تحقیقاتی کمیٹی نے گھریلو صنعتوں کی پیداوار کو اکٹھا اور فروخت کرنے کی غرض سے اجازت یافتہ ذخائر اور امداد باہمی کے اصول پر تھوک فروش فروخت گاہیں قائم کرنے کی موافقت میں جو سفارش پیش کی تھی اس کی
تائید بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی نے بھی کی۔ مرکزی کمیٹی نے یہ صہ ۸۲
توقع ظاہر کی کہ ان کی مدد سے اور کمیٹی کی مجوزہ صوبہ واری فروخت کی مجلسوں کی نگرانی کے تحت' فروخت کے انتظام کی مشکلات کل نہیں تو بڑی حد تک ضرور رفع ہو جائیں گی۔[1]

[1] دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ (۳۹)۔

دستی راچھ کی پیداوار کی فروخت کے انتظام کے مسئلے پر چھٹی صنعتی کانفرنس ۱۹۳۴ء میں غور کیا گیا اور اس کے بعد سے، مدراس، بمبئی، بنگال، صوبۂ متوسط و برار، پنجاب، بہار، اڑیسہ، اور برما کی صوبہ واری حکومتوں نے مفید تجاویز اختیار کیں جو امداد باہمی کے اصول پر مبنی ہیں۔ بمبئی میں اہم مقامات پر امداد باہمی کی پانچ علاقہ واری صنعتی انجمنیں قائم کی گئی ہیں۔ ہر انجمن کی اپنی ایک دوکان ہوگی جو دستی راچھ پر کام کرنے والے جلاہوں کی پیداوار کچھ رقم پیشگی ادا کرکے حاصل کرے گی اور کمیشن کے اصول پر فروخت کرے گی۔ فروخت کے انتظام کے متعلق ایک افسر بھی مقرر کیا گیا ہے[1]۔

یہ شکایت عام طور پر سنی جاتی ہے کہ اس ملک کے لوگوں میں جن میں تعلیم یافتہ طبقہ بھی شامل ہے فنی اور صنعت کاری کا ذوق کم ہوگیا ہے۔ ملکی صنعت کاری کی پیداوار کی وسیع پیمانے پر تشہیر نہ صرف دست کاری کو فائدہ پہنچائے گی، بلکہ لوگوں میں مناسب جمالیاتی ذوق پیدا کرنے میں بھی مدد دے گی۔

حکومت ایک اور طریقے سے بھی امداد کر سکتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ گھریلو صنعتوں تک اپنی سرپرستی کو وسیع کرے۔ چنانچہ صوبۂ متحدہ کے محکمۂ خرید اشیا نے بظاہر اس پالیسی کو تسلیم کر لیا ہے، اور جب کبھی ممکن ہو مقامی صناعوں ہی سے اشیا خریدتا ہے۔

گھریلو صنعتوں کے احیاء میں روز افزوں سرکاری دلچسپی کی ایک اور خوش آیند علامت کو بیان کیا جاچکا ہے، یعنی یہ کہ مختلف صوبوں نے

---

[1] فروخت کے انتظام کی مختلف تجاویز کے لیے دیکھو ایک رپورٹ موسوم، بہ (stat action in respect of Indristries) برائے ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء صفحہ ۲۶ تا صفحہ ۲۹ اور سالانہ رپورٹ انجمن ہائے امداد باہمی (بمبئی) برائے ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء فقرہ ۱۰۱۔

صنعتوں کی سرکاری امداد کے قوانین منظور کئے ہیں۔ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی اس سفارش سے ہمیں اتفاق ہے کہ صوبہ واری حکومتوں کو چاہئے کہ اپنی سرگرم توجہ کو دیہی اور گھریلو صنعتوں کی طرف اس واقعے کے مدنظر مبذول کریں کہ ان میں سے بعض صنعتیں زرعی آبادی کی بڑی اکثریت کے لیے ذیلی پیشے مہیا کرتی ہیں؛ اور بعض صنعتوں کے بارے میں اس کا قرینہ ہے کہ وہ ان لوگوں کے لیے جو اس وقت زراعت میں مصروف ہیں بدل کے طور پر پیشہ مہیا کریں[1]۔

۱۴۔ گھریلو صنعتوں کی سرکاری امداد کی حالیہ تدابیر:۔ حکومت ہند چند سال سے، ہندوستانی گھریلو صنعتوں، خاص کر دستی راچھ کی سوتی صنعت اور کرم پروری کی صنعت کی ترقی میں گہری دلچسپی لے رہی ہے۔ جولائی سنہ ۱۹۳۴ء میں چھٹی بین صوبہ جاتی صنعتی کانفرنس منعقد ہوئی اور اس میں ان تجاویز پر بحث کی گئی جو مختلف صوبہ جاتی حکومتوں نے ملک کی سب سے بڑی صنعت، یعنی دستی پارچہ بافی کی ترقی کے لیے پیش کی تھیں۔ حکومت ہند نے کانفرنس میں یہ اعلان کیا کہ اس نے دستی راچھ کی صنعت کی ترقی کے لیے سالانہ ۵ لاکھ روپے خرچ کرنے کا فیصلہ کیا ہے[2]۔ اس طرح مختلف صوبوں میں جن تجاویز پر روپیہ خرچ کیا گیا کئی طرح کی ہیں۔ چنانچہ جلاہوں کو مختلف ترقی یافتہ طریقہ ہائے پیدائش میں تربیت دینا فروخت گاہوں اور دستی راچھ کی پیداوار

[1] دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ (۳۰۹)۔

[2] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ (stat action in respect of Indristries) بابتہ سنہ ۱۹۲۸ء تا سنہ ۱۹۳۵ء صفحہ ۲۰۔

کی فروخت کے لیے جلاہوں کی انجمن ہائے امداد باہمی کا قائم کرنا' اور نئے نمونوں اور نئی وضعوں اور جدید آلات کا رائج کرنا' ان تجاویز میں شامل ہیں۔ مختلف صوبوں کو صوبہ واری مصارف اور سوت کے صرف کی بنیاد پر رقمیں عطا کی گئیں۔ چھوٹی صنعتی کانفرنس نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ دستی راچھ کی کلوں اور کپڑوں کی نمائش کی جائے[1]۔ ہم پہلے ہی ان تدابیر پر تبصرہ کرچکے ہیں جو حکومت ہند نے صنعت کرم پروری کی ہمت افزائی اور تامین کے لیے اختیار کی تھیں۔ ۱۹۳۶ء کے اوائل میں حکومت ہند نے اونی صنعت کی تامین کے لیے ٹیرف بورڈ کی سفارش کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے اپنے اس ارادے کا اعلان کیا کہ وہ گھریلو صنعت کے فائدے کے لیے مجلس قانون ساز سے پانچ سال کے لیے ۵ لاکھ روپے کے عطیے کی منظوری کی درخواست کرنا چاہتی ہے۔

۱۹۳۷ء میں کانگریسی وزارتوں کے برسرعہدہ آنے کے بعد سے مختلف صوبہ واری حکومتیں ملک کی گھریلو صنعتوں کو ازسرنو زندہ کرنے اور ترقی دینے میں جو دلچسپی لے رہی ہیں اس پر نظر کرتے ہوئے یہ توقع کی جاتی ہے کہ اس سمت میں ترقی کی رفتار تیز ہوجائے[2] گی۔

---

[1] دیکھو صنعتی کانفرنس کے ساتویں اجلاس منعقدہ دہلی (اکتوبر ۱۹۳۵ء) کی روداد۔

[2] ۱۹۳۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی سرپرستی میں ایک "انجمن ترقی صنائع ہند" قائم ہوئی تھی۔ اس انجمن نے دیہات کی گھریلو صنعتوں میں نئی جان ڈالنے اور ان کی ہمت افزائی کرنے کے بارے میں جو تدابیر اختیار کیں ان کی تفصیلات کے لیے دیکھو انجمن مذکور کی "سالانہ رپورٹیں"۔

تیسرا باب

صنعتی مزدور

۱۔ ہندوستان میں مزدوروں کے مسائل کی روز افزوں اہمیت

بڑے پیمانے کی صنعت کی تدریجی ترقی اور کارخانے کے شہروں کی نشوونما کے ساتھ ساتھ، مزدوروں کے جدید مسائل جن سے مغرب کو سابقہ پڑ رہا ہے، ہندوستان میں بتدریج نمایاں حیثیت حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ ہمارے ملک کی صنعتی ترقی کی رفتار سست ہونے کے باعث یہاں کے مزدوروں کے مسائل ابھی ویسے پیچیدہ نہیں ہیں جیسے کہ مغرب میں ہیں۔ لیکن وہ وقت دور نہیں جبکہ یہاں بھی وہ اسی طرح کی وسعت و اہمیت حاصل کرلیں گے۔ جنگ عظیم نے عوام میں بیداری پیدا کردی ہے! اور مزدوروں کو اپنی اہمیت، حقوق اور مرتبے کا زیادہ احساس ہوتا جارہا ہے۔ جنگ عظیم کے زمانے میں اور اس کے بعد قیمتوں کے اضافے نے نہ صرف مصارف زندگی میں بڑی حد تک اضافہ کردیا جس کی وجہ سے مزدوروں میں بے چینی پیدا ہوگئی، بلکہ مزدوروں کو اپنے اغراض کی حفاظت کی غرض سے اپنی تنظیم کرنے پر مجبور کردیا۔ ہندوستان کی تحریک مزدوران اب بین قومی مزدوروں کی تحریک سے ملادی گئی

ہے ؛ اور ہندوستانی مزدوروں کے نمائندے سالانہ منعقد ہونے والی بین قومی مزدور کانفرنس میں شریک ہوتے ہیں۔ مجلس اقوام نے ہندوستان کو صنعتی اہمیت رکھنے والے چوٹی کے آٹھ ملکوں میں سے ایک تسلیم کرلیا ہے۔ آخر میں یہ کہ حکومت اور عوام اس بات کو زیادہ سے زیادہ محسوس کرتے جارہے ہیں کہ صنعتوں کو کارگزار اور قانع مزدوروں کی کافی رسد ملنے کو یقینی بنانے کی قومی اہمیت کیا ہے چنانچہ مئی ۱۹۲۹ء میں مزدوروں کے مسائل پر غور کرنے کے لیے رائٹ آنریبل جے۔ ایچ وھٹلے کی صدارت میں ایک شاہی کمیشن کا تقرر اسی احساس کا ثبوت تھا۔ کمیشن کی سفارشوں کو حکومت کی مزدوروں کے متعلق پالیسی کی بنیاد تسلیم کرلیا گیا ہے' اور ان سفارشوں نے مزدوروں کے متعلق حالیہ قانون سازی کو بہت بڑی حد تک متاثر کیا ہے[1]۔ ایک اور عامل جس کے متعلق وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ حکومت کو مزدوروں کے متعلق پالیسی پر قطعی اثر ڈالے گا یہ ہے کہ ۱۹۳۷ء کے وسط سے برطانوی ہند کے بیشتر صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوگئی ہیں۔ اس سلسلے میں ہم اس اخباری اعلان کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں جو حکومت بمبئی نے اگست ۱۹۳۷ء میں جاری کیا تھا اور جس میں صنعتی مزدور کی نسبت اپنی پالیسی کی توضیح کی تھی: "حکومت کا مقصد یہ ہے کہ معاشری و معاشی نظم کو ایسے طریقے سے مرتب کرنے کی کوشش کرے کہ اس کی بنا پر مزدور کو یہ اطمینان ہوجائے کہ وہ کم از کم اپنی اقل انسانی ضرورتیں پوری کرسکیگا"

---

[1] وھٹلے کمیشن کی رپورٹ جون ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی' اور اس باب میں اس کا ذکر ہر جگہ "مزدور کمیشن کی رپورٹ" کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس نام کے ساتھ جو اعداد درج ہیں وہ رپورٹ کے صفحوں کو ظاہر کرتے ہیں چنانچہ "مزدور کمیشن کی رپورٹ ۴" کا مطلب "مزدور کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۴" ہے۔

صفحہ ۸۵ کام کی ضمانت مل جائے گی، بیروزگاری کے زمانے میں بدل کے طور پر دوسرے پیشوں میں کام کی سربراہی کی جائے گی اور معذوری اور کام نہ کر سکنے کے زمانے میں اس کی مالی امداد کی جائے گی[1]۔ بمبئی کے پیش نامے کو مزدوروں کے متعلق کل ہند پالیسی کی اساس کے طور پر قبول کر لیا گیا ہے۔

۲۔ فیکٹری کے مزدوروں کی ترقی۔

سنہ ۱۸۷۹ء تا سنہ ۱۸۸۰ء میں ۸۵۵ ،۴۷ اشخاص ملک کی سوتی گرنیوں میں کام پر لگے ہوئے پائے گئے۔ سنہ ۱۸۸۹ء میں ۲۲۲ ،۵۹ مزدور سن کی گرنیوں میں کام کر رہے تھے[2]۔ سنہ ۱۸۹۲ء اور سنہ ۱۹۲۹ء کے درمیان ہندوستانی فیکٹریوں کے قانون کے تابع فیکٹریوں کی تعداد ۶۵۰ سے بڑھ کر ۱۲۹ ،۸ تک ہو گئی، اور اسی زمانے میں ان میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد کم و بیش ۰۰۰ ،۳۴۴ سے بڑھ کر ۱۶۹ ،۵۳ ،۱۵ تک ہو گئی۔ عمالی کمیشن کے تخمینے کے مطابق مدامی کارخانوں کے[3] مزدوروں کی تعداد تقریباً ۰۰۰ ،۵۰ ،۲۵ تھی۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں دفتر ہند نے مجلس اقوام میں جو یادداشت پیش کی اس میں ہندوستان کے مزدوروں کی مجموعی تعداد کے بارے میں حسب ذیل اعداد ملتے ہیں جو قابل لحاظ

---

[1] دیکھو "لیبر گزٹ" بابتہ اگست سنہ ۱۹۴۷ء صفحہ ۹۱۰ اور صفحہ ۹۲۲ تا صفحہ ۹۲۴۔

[2] دیکھو آر، کے، داس کی کتاب موسومہ بہ "ہندوستانی کارخانوں کے مزدور" صفحہ ۱۵ تا صفحہ ۱۶۔

[3] "مدامی کارخانوں" کے مفہوم سے حسب ذیل کارخانے خارج ہیں:

(۱) وہ کارخانے جو زیادہ تر زرعی پیداوار پر اس کی خام حالت میں کام کرتے ہیں؛

(۲) وہ کارخانے جو صرف سال کے ایک حصے میں کام کرتے ہیں اور

(۳) وہ کارخانے جو یا تو کوئی میکانی قوت استعمال نہیں کرتے یا قوت کو استعمال کر کے

ہیں:-

(۱) زرعی مزدور (۷۷ر۶۶۴ر۸۸۶ ملکی کاشتکاروں کو خارج کرکے) جو بین قومی عمالی دفتر کے کام کے حدود میں آتے ہیں۔ ۲۷ر۱۰ر۱۴۰

(۲) بحری مزدور خلاصی وغیرہ ——— ۱۴۱ر۰۰۰

(۳) صنعتوں میں کام کرنے والے مزدور بشمول گھریلو صنعتوں، کانوں اور نقل و حمل کے مزدوروں کے } ۲۰ر۲۱۹ر۰۰۰

جیسا کہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری سے ظاہر ہوتا ہے، زرعی مزدوروں کی تعداد بڑھ کر تقریباً ۳۱ر۵۰۰ر۰۰۰ ہوگئی ہے۔ صنعت، تجارت، نقل و حمل اور معدنوں میں کام کرکے کمانے والوں اور متعلقین کی تعداد ۲۶ر۰۰۰ر۰۰۰ تھی۔ فیکٹریوں کی کل ہند رپورٹ (بابت ۱۹۳۵ء) کے مطابق ہندوستان میں فیکٹریوں کی مجموعی تعداد ۸۸۳۱ تھی اور ان میں روزمرہ کام کرنے والے مزدوروں کی اوسط تعداد ۱ر۶۱۰ر۹۲۱ تھی۔ اُسی سال ہندوستانی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد ۲۵۳ر۹۰۷ تھی۔ اگر محض مزدوروں کی مجموعی تعداد کو معیار آزمائش قرار دیا جائے تو ہندوستان بآسانی دنیا کا پہلا ملک ہے۔ کل یورپ کے مرد مزدوروں کے مقابلے میں ہندوستان کے مرد مزدوروں کی تعداد ایک کروڑ سے زیادہ ہے؛ چنانچہ وہ اس اعتبار سے اٹلی (۱۱ر۲۷۵ر۰۰۰) جاپان (۱ر۸۰۰ر۰۰۰) بلجیم (۲ر۶۰۰ر۰۰۰) اور سوئیزرلینڈ (۱ر۷۷۷ر۰۰۰) پر سبقت لے جاتا ہے۔

۳- صنعتی مزدوروں کی رسد اور اسکی نقل پذیر نوعیت

ہندوستانی فیکٹریوں کے مزدور مغربی ممالک کی طرح صحیح طور پر اجرت کمانے والی جماعت نہیں ہیں۔ ان ممالک میں مزدور صنعتی کام کرنے والوں کی ایک

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ- بھی ۲۰ مزدوروں سے کم سے کام لیتے ہیں۔

مستقل جماعت ہیں جو زمین سے قطعاً بے تعلق ہے۔

ان میں سے اکثروں نے شہروں میں پرورش پائی، اور بعض دیہات کو مستقل طور پر چھوڑ کر شہروں میں جا بسے ہیں۔ مغرب کے صنعتی مزدور کی اعلیٰ استعداد کا سبب بڑی حد تک یہ ہے کہ اسکی پرورش ابتداہی سے فیکٹری کے رقبے میں ہوئی ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستانی فیکٹری کا مزدور عام طور پر نقل پذیر ہوتا ہے اور اپنے گاؤں سے شاذ ہی اپنا تعلق منقطع کرتا ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ٹھیٹ ہندوستانی فیکٹری کا مزدور اساسی طور سے کاشت کار ہے جس نے اپنا زرعی کام صرف عارضی طور پر اس غرض سے ترک کر دیا ہے کہ شہر میں کچھ مدت تک صنعتی کام کر کے اپنی آمدنی میں اضافہ کرے۔ زراعت سے قلیل مدت کے لیے ' رنگروٹوں کی بھرتی کا تخیل اس واقعے کی بنا پر تازہ رہتا ہے کہ بعض نئے رنگروٹ دیہات کو جلد لوٹ جاتے ہیں اور عام طور پر مزدور ایک ہی فیکٹری میں زیادہ مدت تک نہیں ٹکتے۔ یہ واقعہ ہے کہ صنعتی مرکزوں میں ہندوستانی مزدوروں کی بڑی تعداد دراصل دہقانی ہوتی ہے، یعنی ان کی پرورش گاؤں میں گاؤں کے روایات کے تحت ہوتی ہے، اور ان میں سے اکثر اپنے گاؤں کو لوٹنا چاہتے ہیں اور لوٹنے میں کامیابی بھی حاصل کرتے ہیں۔ حال میں قائم شدہ صنعتی آبادی کے بڑے حصے کی رسد کاشتکاروں سے پوری ہوتی ہے، اگرچہ کچھ حصے کی رسد مختلف دیہی پیشوں سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ فیکٹری کے مزدور جو زراعت سے کچھ مالی منفعت حاصل کرتے ہیں تعداد میں اتنے زیادہ نہیں ہیں جتنے کہ عام طور سے خیال کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر زراعت میں صرف بالواسطہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ مثلاً ممکن ہے کہ وہ ایک ایسے مشترکہ خاندان کے رکن ہوں جس کے پاس زرعی زمین ہو یا ایسے قریبی رشتے دار رکھتے ہوں جو زراعت میں سرگرمی کے ساتھ مصروف ہوں۔ اکثر صنعتی مزدور دیہات میں پیدا

ہوتے ہیں اور یہیں ان کا بچپن کا زمانہ گزرتا ہے؛ اس میلان کو اس بنا پر تقویت حاصل ہوتی ہے کہ صنعتی کارخانوں میں کام کرنے کی بیشترین عمر بڑھادی گئی ہے۔ اکثر مزدور اپنے اہل وعیال کو اپنے پیچھے دیہات میں چھوڑ جاتے ہیں، اور اس صورت میں بھی جبکہ بیوی اپنے شوہر کے ساتھ شہر جاتی ہے زچگی کے لیے گاؤں کو واپس بھیجدی جاتی ہے۔ ہندوستانی صنعت کی تدریجی ترقی و توسیع کے ساتھ ساتھ دیہی علاقوں سے حاصل ہونے والے مزدوروں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ مالی حالات جتنی دفعہ اجازت دیں اتنی دفعہ مزدور اپنے گاؤں کو جاتا ہے۔ لیکن جب وہ گاؤں کو لوٹتا ہے تو لازمی طور پر اس غرض سے نہیں کہ زرعی کاروبار میں مدد کرے۔ ممکن ہے کہ وہ بیکار رہنے کو ترجیح دے اور جس وقت تک ممکن ہو چھٹی منائے۔ وہ شہر میں جب تک رہتا ہے گاؤں سے اس حد تک تعلق برقرار رکھتا ہے جس حد تک اسے اپنے خاندان یا رشتہ داروں یا ساہوکار کو ترسیل رقم کرنی ہے۔ (دیکھو مزدور کمیشن کی رپورٹ، (۱۱تا۱۴)۔

دیہات سے قصبات کی طرف مزدوروں کی نقل کے اسباب کو یہاں مختصراً جانچنا مناسب ہوگا۔ بے زمین دیہی مزدوروں کی بڑھتی ہوئی جماعت، زرعی مصیبت کو سب سے پہلے محسوس کرتی ہے اور ترقی یافتہ وسائل آمد ورفت ان کو اس قابل بناتے ہیں کہ فیکٹریوں، کارخانوں، گودیوں، کانوں، جدید وضع کے کھیتوں، اور ریلوے اور آب پاشی جیسے بڑے کارہائے عامہ میں کام اور اعلی اجرت کی تلاش میں دیہات کو چھوڑیں۔ بعض صوبوں، مثلاً صوبجات متحدہ، بہار، اڑیسہ میں اور بمبئی پریسیڈنسی کے بعض علاقوں مثلاً رتنا گیری میں آبادی کی گنجائش اور زمین پر دباؤ اس قدر زیادہ ہے، اور غیر معاشی کھیتوں کی خرابی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ چھوٹے زمیندار ذریعۂ معاش پیدا کرنے کے لیے ہر سال قصبوں اور شہروں کو منتقل ہونے پر مجبور ہیں۔ مشترکہ خاندان کا طریق بھی، ایسی

نقل میں اس وجہ سے سہولتیں بہم پہنچاتا ہے کہ خاندان کے بعض ارکان اپنا گھر برخاست کئے بغیر یا اپنی زمین چھوڑے بغیر گاؤں سے ہٹ سکتے ہیں، اس لیے کہ گھر اور زمین کو ان دوسرے ارکان کی نگرانی میں رکھا جاسکتا ہے جو گاؤں میں ٹھیرے رہتے ہیں۔ بعض اوقات ممکن ہے کہ کاشت کار، دیہی مہاجن سے اپنا پیچھا چھڑانے یا مویشی یا زمین خریدنے کی خاطر زیادہ کمانے کے خیال سے شہروں میں کام تلاش کرے۔ اس کے علاوہ بعض اوقات نیچ ذات کے دیہی خدمت گار اپنے مستقبل کو سدھارنے کی غرض سے گاؤں چھوڑ کر شہروں کو چلے جاتے ہیں۔ دہقان کو شہر میں منتقل ہونے کی ترغیب دینے والے اسباب خواہ کچھ ہی ہوں ایک بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے یہ ہے کہ وہ گاؤں سے اپنا تعلق برقرار رکھتا ہے۔ مزدور کمیشن کے بقول اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ " اس نقل وحرکت کا محرک بالکل یکطرفہ ہوتا ہے یعنی گاؤں کے حالات اس کو ترک وطن پر مجبور کرتے ہیں۔ شہر کی کشش یا کوئی بڑی اُمنگ اس کو صنعتی مزدور کی حیثیت سے شہر کی طرف نہیں لیجاتی اسی لیے شہر میں اس کی دلبستگی نہیں ہوتی اور جب وہ گاؤں چھوڑتا ہے تو ضروریات زندگی کی فراہمی کے سوا کوئی اور آرزو اس کے دل میں نہیں ہوتی۔ اگر ان صنعتی مزدوروں کو گاؤں ہی میں کافی غذا اور لباس میسر آسکتا تو بہت کم تعداد صنعت میں کام کرتی۔ غرض شہر ان کو اپنی طرف نہیں کھینچتا، بلکہ گاؤں ان کو شہروں کی طرف دھکیلتے ہیں۔" (مزدور کمیشن کی رپورٹ ، ۴)۔

۴۔ نقل وطن کے نتائج واثرات۔

نقل وطن کی وجہ سے فیکٹری کے مزدوروں کے اکثر طبقے خود کو رسم ورواج اور روایات کے بالکل غیر مانوس ماحول میں پاتے ہیں۔ بلکہ ان کو مختلف زبان سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ قدیم رسم ورواج کمزور پڑ جاتے اور ان کی قوت

ٹوٹ جاتی ہے۔" دیہی زندگی کو اس کی اجتماعی اور مربوط نوعیت دینے والے بندھن ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، نئے بندھن آسانی سے قائم نہیں ہوتے، اور زندگی زیادہ انفرادی بن جاتی ہے۔" اس کے علاوہ آب وہوا کے اساسی اختلاف، ناقص غذا، انتہائی گنجانی، حفظ صحت کے ناکافی انتظام اور اپنے خاندان سے جبری جدائی کے ترغیبات کے باعث مزدور کی صحت وتندرستی پر بہت سخت دباؤ پڑ سکتا ہے۔ بعض خرابیوں کی وجہ سے جو دیہات میں بڑی حد تک موجود نہیں ہوتیں مثلاً شراب نوشی اور جوا بازی، مزدور کے اخلاق پر بھی برا اثر پڑتا ہے کام کے حالات وشرائط کی حد تک مزدور یہ محسوس کرتا ہے کہ اس پر غیر معمولی دماغی وجسمانی دباؤ پڑ رہا ہے، جس کا باعث یہ ہے کہ فرصت کے طویل وقفوں کے ساتھ بے قاعدہ کام کرنے کے بجائے جس کا وہ خوگر تھا اس کو باضابطہ اور مقررہ گھنٹوں میں مسلسل محنت کرنی پڑتی ہے۔ یہ مشکلات کئی نئے رنگروٹوں کی برداشت اور تحمل سے زیادہ ہوتی ہیں اور ان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ اپنے دیہات کو لوٹ جائیں۔ چونکہ مزدور اس بات کا خواہاں ہوتا ہے کہ آخر میں اپنے وطن یعنی گاؤں ہی کو لوٹے، اس لیے وہ اپنے شہر کے کام میں مستقل طور پر دلچسپی لینے کے قابل نہیں رہتا، اور یہ ان اسباب کے منجملہ غالباً ایک سبب ہے جو اس کو فنی کارکردگی واستعداد کا اعلیٰ معیار حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے۔ اس کے اپنے گاؤں کے متواتر چکروں یا دوسرے اسباب کے باعث اس کا اپنے کام سے جلد جلد غائب ہوجانا، آجروں اور اجیروں میں ربط قائم کرنے کو مشکل بنا دیتا ہے، اور خود مزدوروں میں موثر اتحاد کی ہر شکل کے منافی ہے۔ جو مزدور غیر حاضر رہ کر ایک مدت کے بعد لوٹتا ہے اس کو واپسی پر مکرر کام ملنے کا کوئی یقین نہیں ہوتا، اور اس کی دوبارہ کھیت کی مشکلات، اس کو بالعموم مہاجن، جابر، یا محنت کی رسد مہیا کرنے والے، نورمین اور شراب فروش

کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی ہیں۔[1]

لیکن دیہات سے تعلق کا برقرار رہنا فوائد سے خالی نہیں ہوتا۔ اگر صنعتی مزدور صحت بخش دیہی ماحول میں پرورش پائیں تو ان کی جسمانی صحت اس سے بدرجہا بہتر ہوسکتی ہے جتنی کے شہروں میں پرورش پانے کی صورت میں ہوسکتی ہے۔ گاؤں کو وقتاً فوقتاً آتے رہنے سے بھی جسمانی و دماغی توانائی اور صحت اچھی رہتی ہے۔ دیہی مکان مزدور اور اس کے خاندان کے لیے بے روزگاری، بیماری وغیرہ کی صورت میں نہایت موزوں و آرام دہ پناہ گاہ ہے۔ گاؤں بے روزگاری سے بچاؤ کا کسی حد تک اسی طرح یقین دلاتا ہے جس طرح شہر، دیہات کے معاشی دباؤ کو کم کرتے ہیں مدد دیتے ہیں۔ شہری و دیہی زندگی کا اتحاد نہ صرف شہر بلکہ گاؤں کے لیے بھی مفید ہے۔ یہ اتحاد نہ صرف دیہات میں بیرونی دنیا کی وسیع تر معلومات پھیلانے میں مدد دیتا ہے۔ بلکہ رسم و رواج اور تعصب کے بندھنوں سے خود کو چھڑانے میں دہقان کی اعانت کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اتحاد شہری کو بھی اس قابل بناتا ہے کہ ہندوستانی زندگی کے حقائق کے متعلق بیش بہا گہری معلومات حاصل کرے۔ ان حالات میں مزدور کمیشن غور و خوض کے بعد یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ موجودہ حالت میں گاؤں سے تعلق باقی رہنے کو ایک بین فائدہ خیال کرنا چاہیئے؛ اور مقصد یہ ہونا چاہئے کہ اس تعلق کو توڑنے کی کوشش نہ کی جائے، بلکہ اس کو فروغ دیا جائے اور اس میں باقاعدگی پیدا کی جائے۔[2]

---

[1] دیکھو بی۔ ہرسٹ کی کتاب موسوم بہ "Labour and Housing in Bombay"

پیش لفظ از سر اسٹینلی ریڈ صفحہ (۵، ۶)۔

[2] دیکھو مزدور کمیشن کی رپورٹ (۱۷ - ۱۲)۔

۵۔ بعض اہم صنعتی مرکزوں میں محنت کی رسد کے ذرائع

اب محنت کی رسد کا تجزیہ کرکے جس پر بعض زیادہ اہم صنعتی مرکزوں کا انحصار ہے، صنعتی مرکزوں کی نقل پذیر نوعیت کی تشریح و توضیح کرنا مناسب ہوگا۔

(۱) بمبئی۔ بمبئی کی سب سے بڑی صنعت سوتی کپڑوں کی گرنی کی صنعت ہے۔ دوسری صنعتیں، ریلوے اور انجنیری کے کارخانوں، گودیوں، روغن برآری اور آٹا پیسنے کی گرنیوں، دباغت خانوں، لوہا اور پیتل ڈھالنے کے کارخانوں، کیمیائی فیکٹریوں، کارہائے برقی، طباعت کی کلوں وغیرہ کے متعلق ہیں۔ بمبئی کا انحصار بہت بڑی حد تک درآمدہ محنت پر ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہر بمبئی کے ۸۴ فی صد باشندے شہر سے باہر پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں یہ فی صد گھٹ کر ۷۵٫۴ ہوگیا۔ لیکن اس بارے میں صد ۸۹
کسی حد تک شبہ ہے کہ آیا اس اعتبار سے اعداد و شمار صحیح تھے یا نہیں۔ بمبئی کی محنت کی رسد کے اہم ذرائع، دکن اور کون کن اور خاص کر رتناگیری کا علاقہ ہیں۔ دوسرے ذرائع کاٹھیاوار، اور کچھ، بلکہ صوبہ جات متحدہ، مدراس اور پنجاب، فرانسیسی و پرتگالی مقبوضات جیسے دور افتادہ علاقے بھی ہیں۔

(۲) احمد آباد اور شولاپور۔ شہر بمبئی کے مقابلے میں بمبئی پریذیڈنسی کے دوسرے مرکزوں میں مزدوروں کی جماعت زیادہ قیام پذیر اور کمتر تعداد باہر کے مخلوط عناصر پر مشتمل ہے۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ احمد آباد میں مزدور پیشہ آبادی کے منجملہ قیام پذیر عنصر ۲۰ فی صد ہے (مزدور کمیشن کی رپورٹ، ۱۴)۔ بقیہ حصے کی تکمیل بمبئی کی ریاستوں اور ایجنسیوں اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے ہوتی ہے۔ شولاپور میں مستقل آبادی کا تناسب اور بھی اعلیٰ ہے، اور بیرونی مزدور زیادہ تر ہمسایہ مملکت حیدرآباد سے آتے ہیں۔

(۳) کلکتہ۔ کلکتے کا انحصار اس کے مضافات کو شامل کرکے

جہاں جوٹ کی گرنیوں جیسی صنعتیں مرتکز ہیں، بمبئی کی طرح نہ صرف درآمدہ محنت پر ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم درجے میں کسی دوسرے مرکز کے مقابلے میں بہت زیادہ صوبہ جات متحدہ، بہار، اوڑیسہ، مدراس، اور صوبۂ متوسط جیسے علاقوں کی محنت پر ہے۔ محنت کی رسد میں بنگالیوں کا جو کمتر اور مائل بہ کمی حصہ ہے اس کو اس بات کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ یہاں کی زمین بہت زرخیز ہے اور فیکٹری کے کام سے بنگالیوں کو تنفر ہے۔

(۴) کانپور۔ کانپور ایک اور اہم صنعتی مرکز ہے، اور صوبۂ متحدہ کا سب سے بڑا صنعتی شہر ہے۔ گو یہاں پارچہ بافی کی صنعت ہی سب سے اہم صنعت ہے، تاہم دوسری صنعتیں مثلاً دباغت اور چرم کے کارخانے انجینیری کے کارخانے، روغن براری، آٹا پسائی، اور چاول کی گرنیاں، کیمیائی کارخانے، شکر کی فیکٹریاں وغیرہ بھی موجود ہیں، محنت مقابلۃً وافر مقدار میں موجود ہے، اور کانپور کے اطراف واکناف کے گنجان آباد دیہی علاقوں سے بہ سہولت و آزادی حاصل ہوتی ہے۔ چونکہ یہاں سکونت کے حالات مقابلۃً زیادہ اطمینان بخش ہیں۔ اس لئے دوسرے مقامات کے مقابلے میں یہاں فیکٹری کی آبادی زیادہ اطمینان کے ساتھ رہتی سہتی ہے۔

(۵) مدراس۔ مدراس کی صنعتی ترقی کی راہ میں کوئلے کی عدم موجودگی مزاحم ہے۔ یہاں سوتی کپڑے کی بڑی گرنیاں دباغت کے کارخانے اور چرمی فیکٹریاں چند ہی ہیں۔ مدراس کا انحصار بمبئی کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ اپنی ہی مقامی محنت پر ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ صوبۂ مدراس بحیثیت مجموعی اشخاص کی زیادہ تعداد برما، بمبئی، بنگال، میسور، سیلون وغیرہ کو بھیجتا ہے۔ شہر مدراس کے باشندوں کے منجملہ کم از کم ۹۵ فی صد
صفحہ ۹۰ ایسے ہیں جو اسی صوبے میں پیدا ہوئے اور ان ۹۵ فی صد میں سے دو ثلث خاص شہر مدراس میں پیدا ہوئے۔ باقی آبادی کا بڑا حصہ چنگل پیٹ اور

شمالی و جنوبی ارکاٹ جیسے متصلہ علاقوں سے آیا ہوا ہے۔" علاوہ ازیں عورتوں اور مردوں کا تناسب کم و بیش مساوی ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق عورتوں اور مردوں کا تناسب بمبئی کے ۵۵۴ : ۱۰۰۰ کے مقابلے میں ۹۷۸ : ۱۰۰۰ ہے جس سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ بمبئی کے مقابلے میں مدراس کی مزدوروں کی جماعت زیادہ قیام پذیر اور مستقل بود و باش رکھنے والی ہے۔ چونکہ یہاں ایسی صنعتیں بہت کم ہیں جو مزدوروں کے لیے مسابقت کرتی ہیں اس لیے مزدور کو اپنے پائے ہوئے کام پر جمے رہنے کی فکر ہوتی ہے؛ کیونکہ بمبئی کے مقابلے میں یہاں بدل کا کام پانے کے مواقع نسبتاً کم ہیں[1]۔

۶۔ کان کنی کے مرکزوں میں محنت کی رسد۔

کان کنی، خاص کر کوئلے کی کانیں، بنگال کی ایک اہم منظم صنعت ہے، اور بہار و اڑیسہ کی اساسی صنعت ہے؛ بنگال کے کوئلے کی کانوں کے مزدوروں کی رسد سنتھال اور باوری کی پسماندہ کاشت کار جماعتوں سے حاصل ہوتی ہے جو بہار اور اڑیسہ کی سرحدوں پر رہتی ہے۔ بہار اور اڑیسہ میں زیادہ تر مقامی مزدور کوئلے کی کندیدگی کرتے ہیں، اگرچہ ان کی رسد صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ اور صوبۂ متوسط سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ معدنی مرکزوں میں مزدوروں کی رسد ناکافی اور بہت دیر سے دستیاب ہوتی ہے جس کا باعث زیادہ تر یہ ہے کہ ادنیٰ اجرت دی جاتی ہے۔ مزدوروں کی صرف قلیل تعداد کانوں کے قریب مستقل سکونت اختیار کرتی ہے۔ باقی حصہ عام طور پر چھوٹے کاشت کاروں یا زرعی مزدوروں پر مشتمل ہے جو تخم بوتے یا فصل کاٹنے کے زمانے میں اپنے دیہات کو لوٹ جاتے ہیں۔

---

[1] دیکھو جی ام براؤٹن کی کتاب موسوم بہ Labour in Indian Industries صہ ۱۴۱۔

۷۔ آسام کے چائے کے باغات کی محنت کی رسد[1]

ہندوستان میں چائے کی کاشت کا سب سے بڑا رقبہ آسام میں ہے، اور یہاں کے چائے کے باغات مزدوروں سے کام لینے والی ایجنسیاں ہیں جو خاص قواعد و ضوابط کے تحت کام کرتی ہیں جس کی وجہ سے وہ عام زراعت یا زرعی کام کے مقابلے میں صنعتی کاروبار سے زیادہ گہرا اور قریبی تعلق رکھتی ہیں" سنہ ۱۹۰۱ئ کے قانون مزدوراں و توطن خارجی کا مقصد یہ تھا کہ میثاقی مزدوروں کے طریق کو جو انیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں رائج کیا گیا تھا منظم کیا جائے۔ اس کی رو سے باغات میں کام کرنے والے قلیوں کی محنت کی نگرانی کے متعلق قواعد بنائے گئے، اور بجز اجازت یافتہ ٹھیکہ داروں کے توسط کے، مزدوروں کی بھرتی کی ممانعت کر دی گئی لیکن ٹھیکہ داروں کے خلاف رجحانات پیدا ہو جانے کے باعث اور قانون نقض معاہدہ (Breach of Contract Act.) بابت ۱۸۵۹ئ کے تعزیری دفعات کی بنا پر بھرتی میں مشکلات پیش آتی رہیں؛ چنانچہ انھی کی بنا پر ۱۹۱۵ئ میں ایک قانون منظور ہوا جس کی رو سے ٹھیکہ داروں کے توسط سے بھرتی کے طریقے کو منسوخ کر دیا گیا۔ بھرتی اب صرف سرکاری "مجلس مزدوراں" کے گماشتوں کی وساطت سے ممکن تھی۔ یہ مجلس باغات کی بھی نگرانی کرتی تھی اور قواعد نافذ کرتی تھی جن کی رو سے نہ صرف معاہدے کی مدت ۴ سال تک محدود رکھی جاتی تھی، اجرت اور کام کے گھنٹوں کا تعین کیا جاتا تھا، اور میثاق کی مدت ختم ہو جانے کے بعد قلیوں کو (بجز آزاد مزدور کی حیثیت کے) از سر نو کام پر رکھنے کی ممانعت کی جاتی تھی؛ بلکہ حفظ صحت و صفائی، انتظام سکونت اور مفت طبی امداد کے

---

[1] باغات اور کھیتوں پر محنت مزدوری کرنے کے حالات و شرائط کے مفصل بیان کے لیے دیکھو مزدور کمیشن کی رپورٹ باب ۲۰ و باب ۱

بارے میں بھی تفصیلی ہدایات جاری کرتی تھیں ۔ ۱۹۲۰ء میں ایک سال سے زیادہ مدت کے معاہدے قانوناً ناجایز قرار دئے گئے ؛ اور یہی وہ شرط تھی جس کو پہلے عام طور پر نظر انداز کیا جاتا تھا اور ۱۹۲۰ء کے قانون کی رو سے جو ۱۹۲۶ء میں نافذ ہوا، معاہدوں کی تعزیری منظوری منسوخ کر دی گئی اس وقت نقض معاہدہ، دیوانی جرم تھا نہ کہ فوجداری۔ مزدوروں کی رسد زیادہ تر بہار، اڑیسہ اور صوبۂ متحدہ سے حاصل کی جاتی ہے۔

بھرتی کا انتظام بہت بیش خرچ ہے۔ اجرت بہ شکل زر کے علاوہ مزدوروں کو ایک خطۂ زمین، اور بلا معاوضہ چراگاہ وغیرہ بھی دی جاتی ہے ؛ اور مجموعی حیثیت سے ان سے اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔

۸۔ چائے کی کاشت کے علاقوں میں مزدوروں کے توطن کا قانون ۱۹۳۲ء

یہ قانون، جو مزدور کمیشن کی سفارشوں پر مبنی تھا اور ۱۹۳۲ء میں منظور ہوا تھا سارے برطانوی ہند پر بہ شمول علاقۂ سنتھال کے حاوی ہے ؛ اور اس نے ۱۹۰۱ء کے آسام کے محنت و توطن کے قانون اور متعاقب ترمیمی قوانین منسوخ کر دئے۔ اس قانون کا پہلا مقصد ایک طرف یہ ہے کہ بھرتی کے بارے میں اور آسام کے چائے کے باغات میں امدادی توطن پذیر مزدوروں کی روانگی کی پوری پوری نگرانی کو ممکن بنائے جو توطن اختیار کرنے والوں اور امکانی توطن اختیار کرنے والوں کے اغراض و مفادات کی بنیاد پر ضروری اور حق بجانب ہو۔ اس کے علاوہ دوسری طرف یہ یقین دلایا جائے کہ کوئی ایسی بندش عائد نہ کی جائے گی جو حق بجانب نہ ہو۔ حکومت ہند کی نگرانی کے تحت مقامی حکومتوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ امدادی توطن پذیر مزدوروں کی روانگی پر یا بھرتی اور روانگی، دونوں پر حسب موقع نگرانی رکھیں۔ آجروں کو، بجز مصدقہ باغاتی سرداروں یا اجازت یافتہ بھرتی کرنے والوں کی وساطت کے، بھرتی کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے

سولہ سال سے کم عمر کے اشخاص کو توطن اختیار کرنے میں مدد دینا ناجائز قرار دیا گیا ہے، تاوقتیکہ ان کے ساتھ ان کے والدین یا مربی نہ ہوں وطن کو واپسی کے مسئلے کے بارے میں ہر پردیسی مزدور آسام میں داخل ہونے کی تاریخ سے تین سال کی مدت گزرنے پر اپنے آجر کے مقابلے میں جس کے تحت وہ کام کر رہا ہو اختتام مدت پر حق واپسئ وطن سے استفادہ کر سکے گا؛ اور کسی پردیسی مزدور کو آسام میں اس کے داخلے کے تین سال گزرنے سے پیشتر اس کا آجر ارادی اور سنگین بد چلنی کے علاوہ کسی اور سبب سے برطرف کردے تو بھی، مزدور اپنے حق واپسئ وطن سے استفادہ کر سکے گا۔ اگر پردیسی مزدور کی صحت خراب ہوجائے، اس کو موزوں قسم کا کام نہ دیا جائے یا اس کی اجرت ناواجب طور سے روک لی جائے تو وہ اس بنا پر یا کسی اور معقول سبب کی بنا پر تین سال کے اندر بھی حق واپسی کا مطالبہ کر سکے گا۔ علاوہ ازیں عدالت فوجداری ایسی صورت میں کسی وقت بھی مزدور کی واپسی کا حکم صادر کر سکتی ہے جبکہ اس پر آجر یا اس کے گماشتے نے حملہ کیا ہو۔ جہاں آجر اپنے تحت کام کرنے والے مزدور کی واپسی کے جملہ ضروری انتظامات پردیسی مزدور کے حق واپسی رونما ہونے کی تاریخ سے پندرہ دن کے اندر کرنے سے قاصر ہو، نگران کار آجر متعلقہ کو ہدایت کر سکتا ہے کہ ایسے مزدور اور اس کے خاندان کو اس کے وطن بھیجدے۔ یا اس کو نگران کار کی مقررہ مدت کے اندر اور معین کردہ مقدار کے مطابق معاوضہ ادا کردے۔

پردیسی مزدوروں کے نگران کار کے تقرر کا انتظام کیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ اس طریقے کی عام نگرانی کے لیے جو قانون قائم کرنا چاہتا ہے، کچھ عملہ اور غالباً ایک یا زیادہ نگراں کار کے تقرر کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔ رہے مصارف تو ان کو سالانہ ابواب سے جنھیں "پردیسیانہ" کے نام سے موسوم کیا جائے گا، پورا کیا جائے گا۔

پردیسیانہ ایسی شرح سے عائد کیا جائے گا جس کا تعین گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل گزٹ آف انڈیا میں اعلان کے ذریعے سے ہر سال کریں گے، لیکن یہ شرح ۹ روپیہ فی مزدور سے زائد نہ ہوگی۔

قانون کے شرائط کا اطلاق ابتداءً آسام کے آٹھ مشخصہ اضلاع پر صرف چائے کے باغات میں کام کرنے والے پردیسیوں پر کرنا مقصود تھا، لیکن ضرورت کے لحاظ سے قانون کے اطلاق کو آسام کی دوسری صنعتوں اور دوسرے علاقوں تک وسیع کرنے کا اقتدار بھی محفوظ رکھا گیا ہے۔

۹۔ صنعتی مزدوروں کی قلت۔ ہم مزدوروں کی بیشتر قلت و گرانی کا پہلے ذکر کر چکے ہیں۔[1] اگر کسی جگہ مزدوروں کی قلت ہو تو اس کی حقیقی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ بمبئی جیسے شہروں میں سکونت کے انتظامات نہایت ناقابل اطمینان ہیں۔ اجرت اور مصارف زندگی کے درمیان کوئی مطابقت نہیں ہے۔ اور مزدوروں کی بھرتی کرنے والا کوئی موزوں ادارہ موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ آئے دن شہروں میں قحط، طاعون اور انفلوئینزا جیسے متعدی امراض کے پھوٹ پڑنے سے جو کثیر اموات ہوتی ہیں اس کی وجہ سے ایسے مزدوروں کی تعداد میں اچانک کمی واقع ہو جاتی ہے جو شہری زندگی کے تکالیف کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ صنعتی مزدوروں کے ہمیشہ نقل مقام کرتے رہنے کی وجہ سے بھی ان کی قلت محسوس ہوتی ہے۔ ماہر مزدور کا حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اور اس کا باعث یقیناً یہ ہے کہ جدید صنعت کے لیے مزدور کی تربیت کی بہت ہی کم سہولتیں موجود ہیں، فنی اور کاروباری تجربہ رکھنے والے مستری یا فورمین جماعت کے اشخاص کی قلت اس امر کی جانب بھی منسوب کی گئی ہے کہ ”متوسط درجے کا تعلیم یافتہ ہندوستانی ہر قسم کے دستی کام سے تنفر رکھتا ہے۔“

[1] دیکھو جلد اول ”باب ۳“، فصل ۲۷۔

مزدور کمیشن کا کہنا یہ ہے کہ گو ہندوستان میں منظم صنعت، اپنی تاریخ کے بیشتر حصے میں، مزدوروں کی قلت سے متاثر رہی ہے؛ پھر بھی تقریباً ۱۹۲۵ء سے صورت حال بہتری کی جانب مائل رہی ہے۔ چنانچہ وسائل آمد و رفت میں بتدریج اصلاح و ترقی ہوئی ہے، یہاں تک کہ محنت کی رسد پہلے کے مقابلے میں اب وسیع تر رقم سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ شہروں اور فیکٹریوں کے حالات اگرچہ بہترین نہیں ہیں، پھر بھی ان میں عام طور پر اصلاح و ترقی ہو رہی ہے۔ گو زمین پر دباؤ کے کم ہونے کی کوئی علامت نہیں ہے پھر بھی دیہی آبادی نقل و حرکت کے لیے زیادہ آمادگی ظاہر کر رہی ہے۔ اس لحاظ سے ہندوستانی فیکٹریوں کے متعلق یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ مزدوروں کی وافر رسد حاصل کرنے کے دور میں عنقریب قدم رکھنے والی ہیں؛ مزدوروں میں کام حاصل کرنے کے لیے مسابقت روزافزوں تیز ہوتی جا رہی ہے؛ جس کی بنا پر محنت کے لیے یہ بات اور بھی زیادہ اہم ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی تنظیم کرے اور آجروں کی دست برد سے خود کو بچائے (مزدور کمیشن کی رپورٹ، ۲۱، ۲۲)۔

۱۰۔ ہندوستان میں فیکٹری کی زندگی کے حالات[۱]

دیہات اور شہروں میں زندگی اور محنت کے حالات کے درمیان جو تضاد پایا جاتا ہے اس کے متعلق جتنے بھی مبالغے سے کام لیا جائے کم ہے۔ زرعی مزدور اپنے اہل و عیال اور دوسرے گاؤں والوں کے ساتھ کھلی ہوا میں کام کرنے کا عادی ہوتا ہے، لیکن بمبئی جیسے صنعتی مرکز میں اس کو کلیۃً مختلف حالات سے سابقہ پڑتا ہے۔ فیکٹری اس کے لیے پنجرے یا کال کوٹھری سے کم نہیں ہوتی۔ اس کو یہاں کلوں کی گڑگڑاہٹ اور شور میں اور دوسرے مزدوروں کے ساتھ مل کر جن میں سے اکثروں سے

---

[۱] اس مسئلے کی بحث کے لیے دیکھو میتھیسن کی کتاب بحوالۂ بالا۔

وہ بالکل نا مانوس ہوتا ہے، کام کرنا پڑتا ہے۔ جب وہ کارخانے سے اپنے خراب و خستہ مکان کو لوٹتا ہے، جو ایک بے ڈھنگے اور گنجان آباد مزدور واڑے میں واقع ہوتا ہے جہاں آرام دہ گھر کی زندگی کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا، تو اس کو اور بھی زیادہ تکلیف و مصیبت اٹھانی پڑتی ہے۔ مزدور متعدد مشکلات کے باعث اپنے اہل و عیال کو گاؤں میں چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور سب سے زیادہ شدید مشکل یہ ہے کہ وہ شہر میں گھریلو زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے نہایت معمولی پیمانے پر بھی مکان حاصل نہیں کرسکتا۔[۱] اگر اس کی قسمت نے یاوری کی تو بعض اوقات اس کو کسی دوست کی مہربانی اور مدد سے کام فوراً مل جاتا ہے لیکن بالعموم اس کو انتظار کرنا پڑتا ہے؛ اور اس کے بعد بھی جب کام ملتا ہے تو کسی مستقل مزدور کی عارضی غیر حاضری میں بدل کے طور پر!

۱۱۔ بھرتی کے طریقے۔ اس سلسلے میں بھرتی کے طریقوں کے بارے میں کچھ کہنا مناسب ہوگا۔ گرنی کے منتظم جتنے مزدور درکار ہوں ان سب کی براہ راست بھرتی نہیں کرتے۔ ممکن ہے کہ ٹھیکہ داروں کا ملک میں گھوم کر شخصی طور پر بھرتی کرنا غیر معمولی صورتوں میں ضروری ہو، جیسا کہ آسام کے چائے کے باغوں میں ہوتا ہے؛ لیکن عام طور سے ایسا نہیں ہوتا۔ پھر بھی عام طور سے فورمین یا جابر کے توسط سے مزدور حاصل کئے جاتے ہیں چنانچہ وہ آجر و اجیر کے درمیان بیچ والوں کی حیثیت سے کام کرتے ہیں جابر یا فورمین کے بعض کام مغربی مزدور سبھاؤں کے عہدہ داروں کے کام کے مثل ہوتے ہیں، اور گاہ گاہ

[۱] عورتوں اور بچوں سے کام لینے کے بارے میں کئی بندشیں بھی مزدور کے لیے اپنے اہل و عیال کو اپنے ساتھ لانے کو مشکل بنا دیتی ہیں۔

وہ ہڑتالی قائد کے طور پر بھی کام کرتا ہے[۱]۔ جابر خود کو مزدوروں کے لیے مختلف طریقوں سے ناگزیر بنا لیتا ہے۔ وہ ان کو قرضہ دیتا ہے، خاندانی معاملات میں مشورہ دیتا ہے اور جھگڑوں میں ثالثی کا کام انجام دیتا ہے۔ چونکہ سب مزدور اس کی وساطت سے بھرتی کئے جاتے ہیں اس لیے نوواردوں کے لیے عارضی یا مستقل کام حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ جابر کو رشوت دے۔ چنانچہ کلکتے کی سن کی گرنیوں میں رشوت کا رواج جس کو "دستوری" (غیر مسلمہ کمیشن) کہا جاتا ہے، بہت عام ہے؛ اور چھوٹی چھوٹی رقمیں جو حاصل کی جاتی ہیں وہ "سردار" کی ماہواری آمدنی میں چار گونہ یا پانچ گونہ اضافہ کر دیتی ہیں۔ اجرت ادا کرنے والے محرروں کے متعلق بھی یہ مشہور ہے کہ ان کو بھی اس قسم کی آمدنی وصول ہوتی ہے۔ نگرانکاروں کے عائد کردہ بار کو مردوں کے ساتھ عورتیں بھی برداشت کرتی ہیں، لیکن اگر عورتیں بیوہ ہوں تو ان پر زیادتی کئے جانے کا خاص طور پر امکان ہوتا ہے[۲]۔ بمبئی کی سوتی کپڑے کی گرنیوں کے ان شعبوں میں جہاں عورتیں کام کرتی ہیں، مثلاً سوت بٹنے اور لپیٹنے کے شعبوں میں بالعموم عورتیں ہی نگرانکار مقرر کی جاتی ہیں اور ان کو نائک عورتیں یا "فوروی مین" کہا جاتا ہے[۳]۔ یہ مجموعی حیثیت سے ادنیٰ اور گرے ہوئے اخلاق کی خیال کی جاتی ہیں، اور اپنے تحت کام کرنے والی نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کے بارے میں اپنے اقتدار کو عام طور پر ناجائز طریقے پر استعمال کرتی ہیں۔ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جابروں کے طریقے کا عام رواج بہت بڑی خرابی ہے۔ اس کا واحد علاج یہ ہے کہ گرنی کے عہدہ داروں کی طرف سے زیادہ سختی کے ساتھ جانچ کی جائے، اور

---

[۱] جابر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے مشہور ہے، مثلاً سردار، مقدم، یا مستری۔

[۲] دیکھو جے۔ ایچ کیل من کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان کے مزدور" صفحہ ۱۰۰ تا صفحہ ۱۰۱۔

[۳] Naikins of forewomen

بھرتی، تقررات اور برطرفیوں پر براہ راست نگرانی رکھی جائے۔ موجودہ زمانے میں رشوت اور مزدوروں کی الٹ پلٹ میں گہرا تعلق ہے۔ جہاں جابر تمام تازہ تقررات کے بارے میں رشوت لینے کا خوگر ہو، وہاں اس کی یہ خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ نئے تقررات حتی الامکان زیادہ سے زیادہ ہوں، اور ایک فیکٹری سے دوسری فیکٹری میں مزدور کی نقل کی ہمت افزائی کرے۔ لہذا جابروں کو مزدور کے تقرر یا برطرفی سے الگ رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ مزدور کمیشن کی سفارش کے مطابق، ای، ڈی سیسون اینڈ کمپنی اور برماشل کمپنی جیسی بڑی کمپنیوں نے مزدور کی خوش حالی کی غرض سے خاص عہدہ دار مقرر کئے ہیں تا کہ ان کے ذریعے سے مزدوروں کی بھرتی اور ان کی فلاح و بہبود کی نگرانی کی جاسکے۔ اس طریق کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ جہاں کہیں رائج ہوا پوری طرح کامیاب ثابت ہوا[1]۔ جابروں کی وساطت سے بھرتی کرنے کی بجائے اس طریق کو عام طور سے اختیار کرنا تجارتی کساد بازاری کے باعث ممکن نہیں ہوا ہے؛ لیکن اس کے باوجود بھرتی کے موجودہ طریقوں کی اصلاح و ترقی کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ مزدور کے چھٹی سے لوٹنے پر اگر گرنیاں اس کو از سر نو کام پر رکھنے کے لیے زیادہ آمادگی ظاہر کریں اور اس طرح گرنی سے وفادار رہنے میں اس کی مدد کریں تو مناسب ہوگا۔ رخصت اور تعطیل کے زمانے میں باقاعدہ الونس جاری کرنے چاہئیں، اس لیے کہ اس کی وجہ سے جابر کا زور ٹوٹ جائے گا اور ایک قانع اور کارگزار مزدوروں کی جماعت پیدا ہو جائے گی[2]۔

یہ مسئلہ حکومت بمبئی کے زیر غور ہے کہ آیا بیماری کے زمانے میں سالم تنخواہ کے ساتھ رخصت دینے کے متعلق قوانین وضع کرنا

---

[1] دیکھو انڈین ایر بک برائے ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۸ء صفحہ ۵۰۴۔

[2] مزدور کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۲۳ تا صفحہ ۲۷۔

قابل عمل ہے یا نہیں[1]۔

۱۲۔ اجرت ادا کرنے کی مدت۔ بمبئی کی اکثر گرنیوں میں اجرت مہینے میں ایک دفعہ یعنی جس مہینے میں اجرت پر کام کیا جاتا ہے اس کے بعد کے مہینے کی بالعموم پندرھویں تاریخ کو دی جاتی ہے اس طرح نئے رنگروٹ کو اپنی اجرت پانے سے پیشتر صہ ۹۵ چھ ہفتے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہ نہایت تکلیف دہ چیز ہے، اور فیکٹری کی آبادی کی قرضداری کی بہت بڑی حد تک توجیہ کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرضداری دیہی زندگی کی طرح شہری زندگی کی بھی خصوصیت ہے۔ گرنی کا مالک اجرت کو بقایا میں رکھنے کا یہ عذر پیش کرتا ہے کہ مزدوروں کی جماعت کو اس کے پاس سے بلا اطلاع چلے جانے کو روکنے کا یہی واحد طریقہ ہے۔ اجرت کی ماہوار تقسیم کی ضروری شرط یہ ہوتی ہے کہ اگر مزدور ہٹنا چاہے تو اس کی اطلاع کم از کم ایک مہینہ پہلے دے دے۔ اکثر نئے مزدور اس سے ناواقف ہونے کی وجہ سے بلا اطلاع کام ترک کردیتے اور اس طرح ایک مہینے کی تنخواہ کھو بیٹھتے ہیں۔ عام طور سے دیکھا جائے تو، اجرت دینے کی مدت جتنی طویل ہوگی اتنی ہی اجرت کی ادائی میں تعویق ہوگی۔ کلکتے کی سن کی گرنیوں میں اجرت ہفتہ وار دی جاتی ہے، اور صرف ایک ہفتے کی اجرت روک لی جاتی ہے۔ احمد آباد میں اجرت دو ہفتے یا ۱۴ تا ۱۶ یوم کے وقفے سے دی جاتی ہے۔

ستمبر سنہ ۱۹۲۴ء میں مقامی حکومتوں سے اجرت کی ادائی کی مدت کے بارے میں معلومات جمع کرنے کی خواہش کی گئی۔ اس طرح فراہم شدہ مواد سے پتا چلا کہ مختلف صنعتوں اور مقامات میں مختلف

[1] دیکھو "لیبر گزٹ" بمبئی برائے اگست سنہ ۱۹۲۳ء صہ ۹۲۳۔

طریقوں پر عمل ہو رہا تھا ان میں قطعاً یکسانی نہ تھی حتیٰ کہ ایک ہی کارخانے کے اندر مختلف طریقے موجود تھے[1] "قانون ادائی اجرت" اپریل ۱۹۳۶ئہ میں منظور ہوا اور مارچ ۱۹۳۷ئہ میں نافذ ہوا۔ اس قانون کی رو سے یہ لازم ہے کہ (۱) اجرت ادا کرنے کی مدت ایک ماہ سے متجاوز نہ ہو (۲) اجرت سکے یا کرنسی نوٹ کی شکل میں ادا کی جائے؛ اور (۳) (۲) کسی ریلوے فیکٹری یا صنعتی کارخانے میں جہاں ایک ہزار سے زائد مزدور کام کر رہے ہوں ہر مزدور کی اجرت ساتواں روز گزرنے سے پیشتر ادا کی جائےگی (ب) کسی دوسری ریلوے فیکٹری یا صنعتی کارخانے میں جس زمانے کی اجرت واجب الادا ہو اس کی میعاد کے آخری دن کے بعد سے دسواں دن گزرنے سے پیشتر کسی شخص کو اجرت دے دینی چاہیے۔

۱۴۳۔ اجرت کی منہائیاں۔ سودۂ قانون ادائی اجرت میں جس کو پچھلی فصل میں بیان کیا جا چکا ہے، اجرت کی منہائیوں کو منظم و محدود کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ صرف چند منہائیوں کو روا رکھا گیا ہے۔

کسی مزدور کی اجرت سے منہائیاں صرف مندرجۂ ذیل قسموں کی ہو سکتی ہیں:-

(۱) جرمانے اور (۲) خدمت سے غیر حاضری کی منہائیاں (۳) اجیر کے زیر تفویض و نگرانی سامان کے اتلاف یا نقصان کے سلسلے میں منہائیاں یا اس

[1] یہ معلومات ہندوستانی صنعتوں اور مزدوروں کے متعلق ایک رسالہ نمبر ۴۳ موسوم بہ Period of Wages Payment میں ۱۹۲۸ئہ میں شائع کی جا چکی ہے۔

[2] سودۂ قانون ادائگی اجرت کے متعلق عامالی ارکان نے اجرت کی ادائگی کی مدت ایک یا دو ہفتے تک گھٹا دینے کے بارے میں جو ترمیمیں پیش کیں وہ زیادہ تر ماہوار اجرت وصول کرنے والے مزدوروں کی مخالفت کی بنا پر ناکام ہوگئیں۔

زر کے تلف ہو جانے کے سلسلے میں منہائیاں جس کا حساب اس کو پیش کرنا ہے، خاص کر ایسی صورت میں جبکہ ایسا اتلاف یا نقصان براہ راست اس کی بے پروائی کا نتیجہ ہو؛ (۴) آجر کے مہیا کردہ مکان کے سلسلے میں منہائی؛ (۵) پیشگیوں کی بازیافت یا زاید اجرت کی واپسی کے سلسلے میں منہائیاں؛ (۶) کسی پیش احتیاطی ذخیرے کے چندے یا اس فنڈ سے پیشگی ادا کرنے کے سلسلے میں منہائیاں وغیرہ۔

جرمانے کسی اجیر پر کوئی جرمانہ عائد نہیں کیا جا سکتا بجز ان اعمال اور فروگزاشتوں کی صورت کے جن کے بارے میں کارخانے کے حدود کے اندر مقررہ نمونے پر اعلان کر دیا گیا ہو۔ کسی مزدور پر اجرت کی ادائی کی کسی مدت میں جو جرمانہ عائد کیا جا سکتا ہے اس کی مجموعی مقدار اس مدت کے لیے ادا کی ہوئی اجرت کے فی روپیہ ½ آنے کی شرح سے زائد نہ ہوگی۔ کسی مزدور پر جس کی عمر ۱۵ سال سے کم ہو کوئی جرمانہ عائد نہیں کیا جائے گا۔

اس طرح قانون ادائی اجرت کے متعلق یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہندوستان کے لیے معاشری آئین سازی کی ایک دقیق اور ترقی یافتہ شکل ہے۔

۱۴۔ کام کے گھنٹے اور وقت بے کار گنوانے کی عادت

ہم مختلف قوانین کارخانہ جات کے تحت کام کے گھنٹوں کی قانونی نگرانی کی بحث اس فصل میں کریں گے جس میں مزدوروں کے بارے میں قانون سازی کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ ہندوستان کے تمام کارخانوں میں موجودہ کام کے گھنٹوں کا مختصر حال بیان کرنے سے قبل یہ مناسب ہوگا کہ ہم ہندوستانی کارخانے کے مزدور کی ایک بحث طلب خصوصیت یعنی اس کی بے کار وقت گنوانے کی مبینہ عادت کا بھی ذکر کر دیں۔ گو سنہ ۱۹۱۱ء کے قانون کارخانہ کی رو سے

پارچہ بافی کی فیکٹریوں میں بالغ مردوں کے لیے کام کے گھنٹے ۱۱ ساعت فی یوم مقرر کئے گئے، بمبئی کی گرنیوں کے مالکوں نے یہ استدلال کیا کہ کام مسلسل طریقے پر اور سختی کے ساتھ انجام نہ دیے جانے کی وجہ سے کام در اصل تقریباً ۸ گھنٹے کیا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی آجروں کی شکایتوں میں سے ایک ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ ہندوستانی گرنی کا مزدور استقلال کے ساتھ اور مسلسل طریقے پر کام انجام دینے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ وہ مختلف بہانوں سے وقت ضائع کرنے اور بے کار گنوانے کا عادی ہے؛ مزدور اپنی کلوں اور کام پر بالعموم غیر حاضر رہتے ہیں اور ان کاہلوں کی کلوں کو چلانے کے لیے زائد آدمی رکھنے پڑتے ہیں۔ ہندوستانی فیکٹری کمیشن (۱۹۰۸ء) نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "گو فیکٹری کا مزدور مقابلۃً قلیل مدت کے لیے سخت محنت کر سکتا ہے تاہم اس کا فطری میلان یہ ہوتا ہے کہ اپنے ذمے کے کام کو طویل مدت میں پھیلا کر اور اپنے آرام کو ملحوظ رکھ کر انجام دے اور جب کبھی طبیعت کام سے اکتا جائے تو ستانے کے لیے بیٹھ جائے۔" یوں تو بے کار وقت گنوانے کی عادت کے کئی اسباب بیان کئے جاتے ہیں لیکن اوقات کار کی انتہائی طوالت خاص کر ۱۹۱۱ء اور ۱۹۲۲ء کے قوانین کارخانہ جات منظور ہونے سے پہلے تک ۱۲ سے ۱۴ گھنٹے تک کام کرنے کی پابندی اساسی سبب خیال کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر ٹی، ایم، نائر فیکٹری کمیشن کی رپورٹ سے اختلاف کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ "یہ مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت کا مظاہرہ ہے، جو سب انسانوں میں کم و بیش پائی جاتی ہے، اور محنت کی شدت کو کم کرنے کی ایک تدبیر ہے، جو مزدور اپنی جسمانی بہبود کے تحفظ کے لیے اختیار کرتا ہے۔" اس کے علاوہ آب و ہوا کے حالات، مزدور کی کمزور جسمانی ساخت اور اس کے زرعی تعلقات دوسرے اسباب خیال کئے جاتے ہیں۔ اگر کام کے گھنٹوں کو کم کر دیا جائے حفظ صحت

کے حالات کو بہتر بنایا جائے، فیکٹری میں ہوا اور روشنی کا معقول انتظام کیا جائے، اور اجازت کا طریقہ نافذ کرکے بہتر نگرانی کی جائے، تو اس کی وجہ سے وقت بیکار گنوانے کی عادت بڑی حد تک دور ہو جائے گی اور مزدور کی کارکردگی بڑھ جائے گی۔ چنانچہ کلکتے کی سن کی گرنیوں میں جہاں مزدور کمتر وقت کے لیے بدلیوں میں کام کرتے ہیں، اور انجینیری کے کارخانوں میں جہاں کارگزاری کا دن ۸ گھنٹوں سے متجاوز نہیں ہوتا، وقت کم گنوایا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں مندرجۂ ذیل جدول دلچسپ ثابت ہوگی جس میں ان جملہ ہندوستانی کارخانوں کے کام کے گھنٹوں کو مختصر طور پر بیان کر دیا گیا ہے جو ۱۹۳۵ء میں موجود تھے۔[۱]

کارخانوں کی قسمیں جنسی تقسیم کے ساتھ	ان کارخانوں کا فی صد جن میں معمولی ہفتہ وار گھنٹے حسب ذیل ہیں:-		
	کم از کم ۴۲	۴۲ اور ۴۸ کے درمیان	۴۸ سے زائد
دوامی کارخانے			
مردوں کے لیے	۷	۲۳	۷۰
عورتوں کے لیے	۱۵	۸	۶۷
موسمی کارخانے			
مردوں کے لیے	۲۷	۱۳	۶۰
عورتوں کے لیے	۳۵	۱۱	۵۴

۱؎ دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ Statistics of Factories for the Year-ending 31 - December 1935. صفحہ ۳؛ نیز انڈین ایر بک برائے ۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۶ء ص ۵۰۷۔

سنہ۱۹۳۴ئہ کے قانون کارخانہ جات کی بموجب کسی بچے سے کسی ایک ہفتے میں تیس گھنٹوں سے زائد کام نہیں لیا جا سکتا سنہ۱۹۳۳ئہ میں صورت حال یہ تھی کہ بچوں سے کام لینے والے ۹۱۹ کارخانوں کے منجملہ ۳۶۷ کارخانوں میں بچوں کے کام کے گھنٹے ۳۰ سے کم اور ۵۵۲ کارخانوں میں ۳۰ سے زیادہ تھے۔ بچوں کے کام کے گھنٹوں میں کمی کر دیے جانے سے ان کی کارکردگی میں اس قدر اصلاح و ترقی ہوئی ہے کہ اس کی وجہ سے ان کی اجرت کم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔

۱۵۔ عورتوں اور بچوں سے کام لینے کے برے نتائج۔ کارخانوں میں عورتوں اور بچوں کی ملازمت جدید صنعتی نظام کی بعض نہایت سنگین خرابیوں کی ذمہ دار ہے اور ہندوستان کے حالات کے لحاظ سے خاص طور پر تکلیف دہ اور نقصان رساں ثابت ہوئی ہے۔ فیکٹری میں کام کرنے والی شادی شدہ عورت کی زندگی بہت کٹھن ہوتی ہے کیونکہ اس کو مزدوری کے ساتھ ساتھ گھر کا تمام کام کاج بھی کرنا پڑتا ہے اور کام کی کثرت اس کے رگ پٹھوں اور بافتوں کو کمزور اور جسم کو مضمحل کر دیتی ہے۔ چھوٹے بچے نگرانی کے بغیر یوں ہی پڑے رہتے ہیں کیونکہ بہت کم فیکٹریوں میں بالک گھروں کا انتظام ہے۔ زچگی کے زمانے کی امداد و مراعات کی عدم موجودگی اور انتہائی محنت جو اس کو زچگی تک اور زچگی کے تقریباً فوراً ہی

لہ۔ صنعتی شہروں میں مکانوں کے انتظام کی مشکلات اکثر مزدوروں کو مجرد اور تنہا رہنے پر مجبور کرتی ہیں، اور اسی وجہ سے ہندوستانی فیکٹریوں میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں اور بچوں کی تعداد کم ہے۔ چنانچہ سنہ۱۹۳۵ئہ میں برطانوی ہند میں فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی مجموعی تعداد سولہ لاکھ دس ہزار نو سو اکیس کے منجملہ عورتیں (۲۲۹۰۷۱) بالغ ۲۳۰۰۲ (جن میں عورتیں ۲۲۹۰۵ تھیں) اور بچے ۱۹۷۶۲ تھے۔

بعد انجام دینی پڑتی ہے، مزدور عورت کی صحت کو اور بھی زیادہ تباہ و برباد کر دیتی ہے (دیکھو فصل ۴۷-) ایک اور بدنصیبی یہ ہے کہ مناسب طبی سہولتیں موجود نہیں ہیں۔

بچوں سے کام لینے میں اور بھی زیادہ بیجا فائدہ اٹھانے کا امکان ہوتا ہے۔ ۱۹۲۲ء کے قانون کارخانہ جات کی منظوری سے پہلے تک جن بچوں کی عمر نو سال ہونے کا صداقت نامہ پیش کیا جاتا تھا ان سے روزانہ ۷ گھنٹے کام لیا جا سکتا تھا۔ صحیح عمر معلوم کرنے کی مشکل اور صداقت نامۂ عمر کے طریقے کے نامناسب استعمال کے باعث عمر کی حد اور بھی کم ہو جاتی تھی۔ قانون کی زد سے بچنے کی کوشش یوں بھی کی جاتی تھی کہ بچے دو کرنیوں میں کام کرتے تھے۔ کارخانوں کے ناظروں کو ان خرابیوں کی روک تھام میں بہت دشواری پیش آتی تھی۔ اسی وجہ سے ۱۹۲۲ء کے قانون کارخانہ جات نے ان خرابیوں کو دور کرنے کے مدنظر جو قانون کی زد سے بچنے کی خاطر عمر کی جھوٹی شہادت پیش کرنے کی وجہ سے پیدا ہو رہی تھیں سابقہ طریق کی بجائے نیم فوقی طلبا کی عمر کی حد بڑھا کر بارہ اور پندرہ سال کر دی اور کام کی مدت گھٹا کر ۶ گھنٹے مقرر کی۔ بمبئی میں ایک اور اہم اصلاح یہ کی گئی کہ ہمہ وقتی سرجنوں کا تقرر کیا گیا۔ آج کل تمام صوبوں میں بچوں کے صداقتناموں کے انتظامات روز بروز بہتر ہو رہے ہیں۔ ۱۹۲۶ء کے مرمہ قانون کارخانہ جات نے دو صداقت نامے پیش کر کے بچوں کو دو جگہ کام پر لگانے کے لیے ان کے والدین اور سرپرستوں کو جواب دہ گردانا۔ ۱۹۳۴ء کے قانون کارخانہ جات کی بموجب ۱۵ اور ۱۷ سال کی درمیانی عمر والے بالغوں کی ایک نئی گروہ بندی کی گئی کہ اگر وہ بڑوں کی طرح کام کرنے کے قابل نہ ہوں تو ان کو بچوں میں شمار کیا جائے (دیکھو فصل ۴۳)۔ اس طرح فیکٹریوں میں کام کرنے والے بچوں کی تعداد ۱۹۲۳ء میں ۷۴,۶۲۰ تھی جو بتدریج گھٹ کر ۱۹۳۵ء میں ۱۵,۴۵۷ ہو گئی۔ شہر

بمبئی کے کپڑے کی گرنیوں میں ایک بچہ بھی نہیں ہے۔ یہاں یہ کہدینا غالباً ضروری ہے کہ عمر کے معیار کے اضافے سے فائدہ اٹھا کر بچوں کو تعلیم دینے کا مناسب انتظام کرنا چاہئے۔

۱۶۔ گرنیوں میں مزدوروں کے گردوپیش کے خراب حالات

مزدوروں کی صحت و کارکردگی کو برقرار رکھنے کے لیے بہت سے امور توجہ طلب ہیں مثلاً کارخانوں میں صاف ہوا اور روشنی کا انتظام، کارخانوں میں ہوا کو معتدل طور پر مرطوب رکھنے کا انتظام کھانے کے کمرے، غسل خانے اور بیت الخلا کا انتظام، ان سب اعتبارات سے حالات بتدریج روبہ اصلاح ہیں۔ لیکن مزید اصلاح و ترقی کی ابھی بہت گنجائش باقی ہے۔ روشنی اور ہوا کی آزادانہ آمد و رفت کا مسئلہ روئی کی گرنیوں میں خاص مشکلات پیش کرتا ہے، کیونکہ بمبئی جیسے شہر میں ایسی گرنیاں متعدد منزلہ عمارتوں کی شکل میں بنائی جاتی ہیں، جہاں بجز سب سے اوپر کی منزل کے تمام منزلوں میں چھت کے اوپر سے ہوا اور روشنی نہیں آسکتی۔ تجربوں سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ گرمی کے موسم میں پارچہ بافی کے ایسے پنڈال میں جہاں ہوا اور روشنی کا اچھی طرح گزر نہیں ہوتا، کارکردگی میں ۲۰ فی صد کمی ہو جاتی ہے۔" ہوا کو مرطوب بنانے کا طریقہ ایک اور مشکل سوال پیش کرتا ہے۔ ہندوستان فطری طور سے مرطوب موسم کی سہولت سے محروم ہے، جو سوت کاتنے
ص۹۹ اور کپڑا بننے کے لیے ضروری ہے۔ دھاگے کے ٹوٹ جانے اور خام مال کے نقصان کو روکنے کے لیے کارخانوں کو مصنوعی طور پر مرطوب بنانا ضروری ہے۔ ہوا کو مرطوب بنانے کا مصنوعی طریقہ خاص کر بھاپ اندر پہنچانا اور میلا پانی استعمال کرنا مزدوروں کی صحت کے لیے نقصان رساں ہوتا ہے۔ حکومت ہند نے بہترین ممکنہ طریقے اختیار کئے جانے کو یقینی بنانے کے لیے ترطیب کے ایک خصوصی ماہر کا تقرر کر کے مناسب سمت

میں قدم اٹھایا ہے۔

ہندوستان کی اکثر گرنیوں اور کارخانوں میں مزدوروں کے کھانے پینے کے لیے کوئی مناسب و معقول انتظام نہیں ہے۔ کھانا صبح میں جلدی سے تیار کیا جاتا ہے۔ جس کو یا تو مزدور خود ساتھ لے جاتا ہے یا بعد میں دوسرا آدمی اس کے یہاں پہنچا دیتا ہے۔ اگر موسم اجازت دے تو مزدور کارخانے کے کھلے صحن میں ورنہ ان ہی پنڈالوں کے نیچے بیٹھکر کھاتا ہے جہاں کلیں نصب ہوتی ہیں۔ مدراس کی بکنگھم اینڈ کرناٹک ملز جیسی گرنیاں بہت کم ہیں جنھوں نے اپنے مزدوروں کے لیے جو مختلف ذات پات کے ہیں کھانے کے سائبان مہیا کئے ہیں۔ ایسی مناسب طعام گاہوں کی فوری ضرورت ہے جن کی سرپرستی دونوں جنسوں کے مزدور کرسکیں۔ اس کی وجہ سے مزدور عورت کا بار بھی کم ہوجائے گا، اور دوپہر کا وقفہ اس کے لیے حقیقت میں آرام کا گھنٹہ ہوجائے گا۔ کارخانہ داروں کو ابھی تک اس بات کا کافی احساس نہیں ہوا ہے کہ فیکٹریوں کے ماحول سے متعلق چند اور چیزیں بھی قابل توجہ ہیں جن سے مزدور کے لیے زیادہ سہولتیں مہیا ہوسکتی ہیں اور اس کی کارکردگی میں اضافہ ہوسکتا ہے، مثلاً پینے کے لیے صاف پانی کی بہم رسانی نہانے کا انتظام جو گرم ملک کے لیے نہایت ضروری ہے، اور حفظ صحت کے اصول پر بیت الخلاؤں کی تعمیر وغیرہ۔ حکومت بمبئی نے اپنی عمالی پالسی سے متعلق ایک حالیہ پریس نوٹ کے ذریعے یہ اعلان کیا ہے کہ وہ موزوں طعام خانوں اور رکانی طبی سہولتوں کی فراہمی کے بارے میں کارخانہ داروں پر قانونی پابندی عاید کرنا چاہتی ہے۔

۱۷۔ ہندوستانی کارخانوں میں مزدوروں کی غایب باشی۔ ہندوستانی مزدوروں کی کثرت سے غیر حاضری یا غائب باشی کارخانے کو بے روک چلانے میں غیر معمولی مشکلات پیدا کرتی ہے۔ گرنیوں کے مالک یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اجرت کے اضافے یا اجرت و انعام کی

ادائی کے بعد غیر حاضری میں اضافہ ہو جاتا ہے، اور جب مزدور برے بھلے گزر کرنے کے لیے کافی کما لیتا ہے تو مطمئن ہو بیٹھتا ہے۔ غیر حاضری کا تناسب (جس کا اوسط بمبئی میں ۸ تا ۱۲ فی صدی ہے) موسموں کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے۔ چنانچہ بارش کے موسم اور تہواروں اور شادی کے زمانے میں بہت زیادہ ہو جاتا ہے، مثلاً مارچ سے جون تک بہت بڑھا ہوا رہتا ہے اور دسمبر و جنوری میں کمترین رہتا ہے۔ کلکتے میں موسم گرما میں ہر سال مزدور کثیر تعداد میں اس لیے باہر چلے جاتے ہیں کہ سن کی صنعت کا کاروبار سرما کے بعد مندا پڑ جاتا ہے، اور گرما کے اوائل میں موسم خاص طور پر تکلیف دہ بن جاتا ہے۔

اس پیمانے پر مزدوروں کی اتنی کثرت سے غائب باشی کی وجہ سے نہ صرف حاضری کے بہت بڑے رجسٹر کا انتظام ضروری ہو جاتا ہے بلکہ کبھی کبھی گھٹیا مزدور بھرتی کر کے ہنگامی طور پر کام میں لگانے پڑتے ہیں لیکن ان خرابیوں کو دور کرنے کے تجاویز پیش کرنا آسان نہیں ہے۔ حاضری کا الونس دینے کے طریقے کی آزمائش کی گئی تو کسی حد تک کامیاب ثابت ہوئی۔ مجلس کرورگیری پارچہ بافی یہ مشورہ دیتی ہے کہ مزدوروں کی ایک مد محفوظ قائم کی جائے تاکہ ہنگامی بدلی والے کی ضرورت باقی نہ رہے اور رخصت منظور کرنے میں بھی سہولت ہو (دیکھو رپورٹ فقرہ ۱۰)۔

مزدوروں کا ایک کارخانہ سے دوسرے کارخانے میں جلد جلد منتقل ہونا ایک اور خرابی ہے، اور اس کا غیر حاضری و غائب باشی سے گہرا تعلق ہے[1]۔ بمبئی، مدراس اور ناگپور جیسے صنعتی مرکزوں کی

---

[1] کام کے گھنٹوں یا اجرت سے بے اطمینانی کی بنا پر ایک گرنی سے دوسری گرنی میں منتقل ہونے کا موقع ملتا ہے، اور اجرتوں کی عدم معیاریت، منتقلی کی تحریک کو اور زیادہ تقویت دیتی ہے (دیکھو داس کی کتاب محولۂ سابق صـ۲۲ تا صـ۶۹۔) مزدوروں کی تلاش میں مختلف گرنیوں میں جابروں کی دوڑ دھوپ بھی اس خرابی کی ایک حد تک ذمہ دار خیال

گرنیوں میں تقریباً ڈیڑھ سال میں مزدور قریب قریب سبھی بدل جاتے ہیں۔ اس طرح مصارف پیدائش میں غیر ضروری اضافہ ہوجاتا ہے اور مزدوروں کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔

۱۸۔ **صنعتی مزدور کی کارکردگی۔** جہاں تک ہندوستانی مزدور کی کارکردگی سے خرابی منسوب کی جاتی ہے حقیقی صورت حال کو واضح کردینا ضروری ہے۔ ہندوستانی مزدور کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی کارکردگی یورپین مزدور کے مقابلے میں نسبتاً کم ہوتی ہے۔ اگر اس کے یہ معنی لیے جائیں کہ ایک مقررہ وقت میں یورپین مزدور، ہندوستانی مزدور کے مقابلے میں زیادہ کام انجام دیسکتا ہے۔ تو اس بیان کی تردید کرنا مشکل ہے۔ سر الگزنڈر رنگ روبرٹ نے صنعتی کمیشن کے سامنے گواہی دیتے ہوئے یہ بیان کیا کہ انگریز مزدور کی کارکردگی ہندوستانی مزدور کے مقابلے میں ۳، ۵ یا چار گونہ زیادہ تھی۔ سر کلینٹ سمپسن نے یہ اندازہ پیش کیا کہ روئی کاتنے اور کپڑا بننے والی ہندوستانی گرنی کے ۶۷، ۲ مزدور، لنکا شائر مل کے ایک مزدور کے برابر ہیں۔ لیکن ڈاکٹر گلبرٹ سلیٹر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہندوستانی مزدور کی کمتری کو مبالغے کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ہندوستان اور انگلستان میں ایک راچھ پر کام کرنے والے جلاہوں کی تعداد کا اختلاف ہندوستانی اور انگریز مزدور کی کارکردگی کے فرق کا صحیح معیار نہیں ہوسکتا ہندوستان میں مزدوروں کی کثیر تعداد سے اس لیے کام لیا جاتا ہے کہ زائد پیداوار کی قیمت اجرت کی برآورد کے اضافے سے زیادہ ہوتی ہے۔ انگلستان میں اجرت نسبتاً اعلیٰ ہونے کی وجہ سے مزدوروں کی نسبتاً

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ کی جاتی ہے ایک ”سرکاری محکمہ مزدوران“ قائم کرکے اس خرابی کو کسی حد تک رفع کیا جاسکتا ہے۔

کم تعداد کام میں لگانی پڑتی ہے۔ لیکن سلیٹر یہ تسلیم کرتے ہیں کہ گو ہندوستانی مزدوروں کی کمتری کو عام طور پر مبالغے سے بیان کیا جاتا ہے، پھر بھی اس میں کافی صداقت ہے؛ اور حقیقت میں یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں اگر ہم انگریز مزدور کی اعلیٰ جسمانی صحت، طاقت، ذہانت، ضبط پذیری اور استقلال و تسلسل کے ساتھ کام کرنے کی صلاحیت کو ذہن میں رکھیں۔ لیکن مذکورۂ بالا ریاضی نما بیانات احتیاط کے ساتھ قبول کرنا ضروری ہے۔ انگریز و ہندوستانی مزدور کی کارکردگی کے مسئلے کو "فرق و اختلاف کے طریقے" سے حاصل نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ کام کے حالات و شرائط بالکل غیر مشابہ ہیں۔ ہندوستانی گرنی کی کمتر پیداوار کا باعث کلیۃً ہندوستانی مزدور کی کمتر کارکردگی ہی کو نہیں قرار دیا جا سکتا، کیونکہ ممکن ہے کہ اس کی کمتر کارکردگی نسبتۂ خراب انتظام کا نتیجہ ہو۔ علاوہ ازیں جیسا کہ بمبئی کے پارچہ بافوں نے گورنر جنرل کے پاس اپنے پیش کئے ہوئے محضر میں ۱۸۸۹ء میں بتلایا، ہندوستانی مزدور کی راہ میں ایک مزاحمت یہ ہے کہ ہندوستانی گرنیوں میں خام اشیا خراب قسم کی استعمال ہوتی ہیں۔ روئی خراب قسم کی ہونے کی وجہ سے دھاگے بار بار ٹوٹ جاتے ہیں، اور اس طرح زیادہ آدمیوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ یہ بھی شکایت کی جاتی ہے کہ لنکا شائر کے مالکان گرنی کے برعکس، ہندوستانی گرنیوں کے مالک، جدید ترین محنت بچاؤ تدابیر اور کلیں استعمال نہیں کرتے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہاں سب کلوں کو باہر سے درآمد کرنا پڑتا ہے، جس کی بنا پر وہ انگلستان کے مقابلے میں یہاں زیادہ بیش خرچ ثابت ہوتی ہیں، اور چونکہ ہندوستان میں اجرت ادنیٰ ہے۔ لہٰذا جدید ترین کلوں اور محنت بچاؤ نت نئی ترکیبوں اور آلات میں زر مشغول کرنے کے بجائے مزدوروں کو زیادہ تعداد میں رکھنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ سچ پوچھو تو آجروں پر اس کا الزام نہیں لگایا جا سکتا، لیکن اس کی وجہ سے انگریز مزدور کے مقابلے میں ہندوستانی مزدور یقیناً کمتر درجے کا معلوم ہوتا ہے۔

لیکن اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ دوسری چیزیں مثلاً زیر استعمال کلوں کی نوعیت وغیرہ مقررہ ہونے کی صورت میں بھی ہندوستانی مزدور تقریباً یقینی طور سے اس مفہوم میں گھٹیا پایا جائے گا کہ اس کی محنت کی پیداوار قلیل تر ہوگی تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہندوستانی مزدور دوسرے مفہوم میں یعنی کام اور اجرت کے لحاظ سے بھی کم کارگزار ہے یا نہیں۔ صنعتی کمیشن نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندوستانی مزدور کی اجرت کم ہونے کے باوجود اس کی پیداوار کی لاگت مغربی مزدور کے مقابلے میں کم نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر نائر نے ۱۹۰۸ء میں یہ استدلال پیش کیا کہ "اگر لنکا شائر کا ایک مزدور ۶۷ء۲ مدراسی مزدوروں کے مساوی ہو تو چونکہ لنکا شائری مزدور کی اوسط ماہانہ اجرت تقریباً ۶۰ روپے یا ۴ پونڈ اور مدراسی مزدور کی اجرت ماہانہ اوسطاً ۱۵ روپے (ایک پونڈ) ہوتی ہے۔ لہذا یہ ظاہر ہے کہ ایک ہی مقررہ زر کے معاوضے میں ہندوستانی کرنی کا مالک انگریزی کرنی کے مالک کے مقابلے میں تقریباً دوگنا کام لیتا ہے"[1] لیکن اس کے یہ معنی نکلتے ہیں کہ کارکردگی کے دوسرے مفہوم کے لحاظ سے ہندوستانی مزدور، انگریز مزدور سے حقیقت میں بہتر کارگزار ہے؛ حالانکہ یہ تقریباً یقینی طور سے حقیقت سے بعید ہے۔ علاوہ ازیں ہندوستانی مزدور کے دوستوں کو یہ ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ یہ استدلال ان کے نقطۂ نظر سے ثبوت پیش کرنے کی حد سے تجاوز کر جاتا ہے؛ اس لیے کہ اگر ہندوستانی مزدور انگریز مزدور سے دوگنا کارگزار ہو (حالانکہ غالباً امریکی مزدور کو مستثنیٰ کر کے انگریزی مزدور ہی دنیا کا بہترین کارگزار مزدور عام طور سے خیال کیا جاتا ہے) تو اجرت بڑھا کر اور اس کے نتیجے کے طور پر اس کے معیار زندگی کو بلند تر کر کے ہندوستانی مزدور کی کارکردگی میں اضافہ کرنے کی زحمت ہی کیوں گوارا کی جائے؟ ہندوستانی مزدور

---

[1] دیکھو پلے کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۲۴۴۔

کی ایسی بے شعور تائید وحمایت اضافۂ اجرت کے استدلال کو واضح طور سے کمزور کردیتی ہے۔ لیکن حکمت وفراست کے ملحوظات سے قطع نظر ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ وسیع نظر سے دیکھا جائے تو یہ پایا جائے گا کہ موجودہ زمانے میں اعلیٰ اجرت کی کفایت کے اصول کا اطلاق ہندوستانی مزدور پر ہوتا ہے' اس طرح اس کا قرینہ ہے کہ اضافۂ اجرت سے کارکردگی میں تناسب سے زیادہ اضافہ ہو اور یہ کہ ہم خواہ کسی طریقے سے معاملے پر غور کریں موجودہ صورت یہ ہے کہ مغربی مزدور ہندوستانی مزدور کے مقابلے میں بہتر کارگزار ہوتا ہے[1]۔ اگرچہ ہندوستانی مزدوروں میں بتدریج اور دھیرے دھیرے اصلاح ہو رہی ہے۔

۱۹۔ ہندوستانی مزدور کی خراب کارکردگی کے اسباب۔

خراب کارکردگی کے اسباب گوناگوں ہیں۔ ان میں سے بعض مستقل ہیں اور بعض عارضی اور قابل علاج۔ اول الذکر قسم کے تحت ہندوستان کے موسمی حالات آتے ہیں جو اعلیٰ کارکردگی کے لیے عام طور سے مضر ہیں۔ سوتی کپڑا بننے کی صنعت پر غور کرنے سے ہمیں معلوم ہو سکتا ہے کہ لنکاشائر کو سرد اور فرحت بخش موسم کی بہت بڑی سہولت حاصل ہے جس سے ہندوستان کے اکثر علاقے جہاں پر یہ صنعت قائم ہے

[1] سر (جو اس وقت تک مسٹر تھے) ایچ۔ پی۔ مودی انجمن مالکان گرنی بمبئی کے صدر نے مالی کمیشن کے سامنے زبانی شہادت دیتے ہوئے مزدوروں کی اضافی کارگردگی کے متعلق حسب ذیل اعداد پیش کئے۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ 'جاپانیوں میں ایک جلاہا ۴ کرگھے یا راچھ چلاتا ہے اور اس کی کارکردگی ۹۵ فی صد ہے۔ چین میں ایک جلاہا ۴ راچھ چلاتا ہے اور اس کی کارکردگی ۸۰ فی صد ہے۔ بمبئی میں ایک جلاہے کی نگرانی میں دو راچھ ہوتے ہیں اور اس کی کارکردگی ۸۰ فی صد ہے۔ جاپان اور چین کی بنیاد پر اگر تخمینہ کیا جائے تو بمبئی کے جلاہے کو چین یا جاپان کے جلاہے کے مقابلے میں اجرت ۲۰۰ فی صد تا ۳۰۰ فی صد زیادہ دی جاتی ہے'۔

محروم ہیں۔ علاوہ ازیں مصنوعی ترطیب جس کی ہندوستان میں ضرورت ہوتی ہے۔ لنکاشائر کے فطری طور سے مرطوب موسم کا بہت ہی ادنیٰ بدل ہے اور اس کا امکان ہے کہ تاوقتیکہ مصنوعی ترطیب کا مناسب طریقے پر انتظام نہ کیا جائے وہ مزدوروں کی صحت کو بری طرح متاثر کرے۔ قابل اصلاح اسباب مثلاً ہوا، روشنی اور صفائی وغیرہ کے انتہائی غیر اطمینان بخش حالات پہلے بیان کئے جا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ استدلال پیش کیا جا سکتا ہے کہ کام کے گھنٹے گو حال میں آئین سازی کے ذریعے سے کم کر دیے گئے ہیں پھر بھی حد سے زیادہ طویل ہیں خاص کر ایسے ملک کے لیے جس کی آب و ہوا گرم ہو۔ چنانچہ اس خیال میں غالباً بہت کچھ صداقت ہے کہ ہندوستانی مزدور کا تساہل اور بے پروائی ایک قسم کی حفاظتی تدبیر ہے جو وہ غیر ارادی طور سے اس غرض سے اختیار کرتا ہے کہ کہیں جسمانی صحت جواب نہ دے اس لیے کہ طویل گھنٹوں تک سخت محنت کرنے کا ناگزیر نتیجہ یہی ہوگا۔

بلاشبہ یہ ایک واقعہ ہے کہ متوسط ہندوستانی مزدور جسمانی ساخت میں متوسط انگریز مزدور سے مقابلتہً گھٹیا ہوتا ہے۔ اس کے دو اسباب ہیں یعنی (۱) مرض کی تباہ کاریاں اور (۲) گھٹیا اور کم غذا۔ گو جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں دیہی علاقے ملیریا، طاعون، ہیضہ، انفلوئنزا، کالاآزار خناقیہ وغیرہ جیسے بڑے امراض سے محفوظ نہیں ہیں پھر بھی گنجان صنعتی علاقوں میں وہ بہت زیادہ شدت کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ ہولناک گندے محلے جہاں مزدوروں کو رہنا پڑتا ہے متعدی امراض کی درجۂ اول کی پرورش گاہیں ہیں اور ان کو تیزی کے ساتھ پھیلانے کے لیے بہترین مواقع بہم پہنچاتے ہیں۔

صحت عامہ کی اصلاح و ترقی کا طریقہ جس میں صاف پانی اور خالص غذا کی بہم رسانی اور بدررو کا مناسب انتظام شامل ہو اور اسی کے ساتھ صنعتی مزدوروں کے لیے بہتر طبی سہولتیں اور بیماری کے

بیمے کا طریقہ قطعی طور پر ضروری ہے۔
رہا خراب اور کم غذا کے اثرات کا معاملہ تو اس کا تعلق کل ہندوستانی آبادی سے ہے۔ اس لحاظ سے اس پر باب (۴) میں بحث کی جائے گی۔

۲۰۔ انتظام سکونت کے حالات۔

ہندوستان کے اکثر صنعتی شہروں میں آبادی کی ناقابل یقین گنجانی اور حفظ صحت کے بھیانک حالات شہروں میں مزدوروں کے مستقل طور پر نہ رہنے اور ان کی گھٹیا کارکردگی کے بڑی حد تک ذمے دار ہیں۔ بعض صنعتی علاقوں میں جہاں کارخانے شہر سے کسی قدر فاصلے پر قائم کئے گئے ہیں انتظام رہائش اور حفظ صحت کا مسئلہ مقابلۃً سادہ ہوتا ہے۔ مزدوروں کو عام طور پر متصلہ دیہات میں یا یکمنزلہ مکانات میں رکھا جاتا ہے جو قطاروں کی شکل میں آجروں کی طرف سے بنائے جاتے ہیں اور آجر مطلوبہ زمین کسی دقت کے بغیر حاصل کر سکتا ہے۔ گنجانی کی حالت کی مثال مدراس، کانپور، ناگپور اور احمد آباد جیسے شہروں اور کلکتے کے اطراف کے اکثر صنعتی علاقے میں ملتی ہے۔ ان علاقوں میں خاص بمبئی اور کلکتے کے مقابلے میں زمین بہت ارزان ہے۔ یہاں سکونت کا انتظام یکمنزلہ جھونپڑوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کو بستیاں کہتے ہیں اور جن کو مالکان گرنی نہیں بلکہ دوسرے اشخاص تعمیر کراتے ہیں اور جو مزدوروں کو مناسب شرح کرایہ پر دیے جاتے ہیں بعض مقامات مثلاً کانپور، کلکتہ اور احمد آباد میں زیادہ روشن خیال کارخانہ داروں نے مزدوروں کے لیے مکانوں کی بہم رسانی کو اس بنا پر مناسب بلکہ ضروری پایا ہے کہ منتخب مزدوروں کے بازار پر دسترس حاصل ہوگی خاص کر مزدوروں کی نقل پذیر جماعت کی حد تک جس پر پارچہ بافی کے کارخانوں کا دارومدار ہوتا ہے۔ یوں تو احمد آباد کے حالات اس لحاظ سے بہتر ہونے چاہئے تھے کہ دوسرے شہروں کے مقابلے میں یہاں زمین ارزاں تر

ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ احمد آباد کے انتظام رہائش کی حالت ہندوستان کے کسی دوسرے صنعتی مرکز کے مقابلے میں زیادہ خراب معلوم ہوتی ہے۔ پھر بھی بلدیہ نے مزدوروں کے لیے معیاری مکان تعمیر کرنے کا حال ہی میں فیصلہ کیا ہے اور اس مسئلے کو امداد باہمی کے طریقوں پر بھی حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تقریباً ہر صنعتی مرکز میں گنجانی کی خرابی کو بڑھنے کا موقع دیا گیا ہے اور کارخانوں کے قیام کے وقت جگہ کے انتخاب پر کوئی نگرانی نہیں رکھی گئی ہے۔

اس کی وجہ سے حالات نے نازک صورت اختیار کر لی ہے۔ مزدور پیشہ طبقے کا بڑا حصہ مزدور بستیوں (Chawls) میں سکونت پذیر ہوتا ہے جو بالعموم ایک کوٹھری اور بعض اوقات دو کوٹھری والی قیام گاہوں (Calles) پر مشتمل ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں دو کوٹھریوں سے زائد گنجائش نہیں ہوتی۔ اس انتظام کا مقصد یہ ہے کہ مزدور پیشہ طبقے کی بہت بڑی تعداد کو حتی الامکان ارزاں طریقے پر مکان (جن کو گودام کہنا مناسب ہوگا) مہیا کئے جائیں[1]۔

بمبئی میں مزدوروں کے خاندانوں کی بہت بڑی تعداد (یعنی ۷۰ ٪ سے زائد) ایک کوٹھری والی قیام گاہ میں رہتی ہے۔ مزدور بستیوں کی حد تک اشخاص کی اوسط تعداد فی کمرہ ۴.۰۳ ہے۔ یہ اعداد لندن کے مقابلے میں نمایاں تضاد رکھتے ہیں؛ چنانچہ لندن میں آبادی کا صرف ۶ ٪ حصہ ایک کوٹھری کے مکانوں میں رہتا ہے اور اشخاص کا اوسط فی کمرہ ۱.۹۲ ہے۔ یہ امر بھی ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ ذیلی کرایہ پر دینے کا طریقہ بمبئی کے صنعتی مزدوروں میں عام ہے۔ اس کی وجہ سے گنجانی اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے گو مزدور بستی بمبئی کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے۔ لیکن گنجانی کی شکایت دوسرے مرکزوں میں بھی ہے۔ چنانچہ ہوڑا کے بعض حصوں کی گنجانی

---

[1] دیکھو ہرسٹ کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۲ نیز دیکھو صنعتی کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۲۴۱۔

ہندوستان کے کسی دوسرے صنعتی مرکز میں اپنی نظیر غالباً نہیں رکھتی۔ چھوٹے صنعتی شہروں میں بھی غالباً یہی میلان ہے۔

۲۱۔ ناقص انتظام سکونت وحفظ صحت کے مضر اثرات ونتائج۔

عمدہ مکانوں کے معنی یہ ہیں کہ خوشگوار گھریلو زندگی، مسرت وصحت نصیب ہو۔ خراب مکان، نجاست شراب نوشی، بیماری، بد اخلاقی اور جرم کا مسکن ہوتے ہیں اور آخر کار ہسپتالوں، قید خانوں اور پاگل خانوں کو ضروری بنا دیتے ہیں جس میں ہم معاشرے کے ان لاوارث افراد کو چھپائے رکھتے ہیں جو زیادہ تر خود معاشرے ہی کی غفلت کا نتیجہ ہیں۔" ناکافی اور خراب انتظام سکونت بھی ان عاملین سے ایک ہے جو صنعتی بے اطمینانی اور بے چینی کے ذمہ دار ہیں۔ چنانچہ بمبئی میں یہ سب خرابیاں مختلف مدارج میں موجود ہیں۔ بمبئی کے گندہ محلوں میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ بچوں میں اموات زیادہ واقع ہوتی ہیں۔ مقام سکونت کے کمروں کی تعداد کے لحاظ سے شرح اموات میں معکوس تغیر ہوتا ہے۔ یوں تو عام آبادی میں اوسط شرح اموات فی ہزار رجسٹر شدہ ولادتوں میں ۲۰۰ تا ۲۵۰ ہے لیکن بدترین محلوں میں اعلیٰ ترین شرح ۲۹۸ ہے[1]۔ مزدور بستیوں کی زندگی کے ہولناک حالات اور تخلیہ و تنہائی کا فقدان بھی ان لوگوں کی راہ میں مزاحمت پیدا کرتا ہے جو اپنے خاندانوں کو اپنے ساتھ شہر میں لانا چاہتے ہیں۔ اور اس طرح مزدور کی کارکردگی اور قیام پذیری پر بہت مضر اثر پڑتا ہے۔

۲۲۔ انتظام سکونت کی اصلاح کی کوشش

بمبئی میں آب رسانی، حفظ صحت، اور بدرروں کے انتظام کی اصلاح تو کی گئی لیکن آبادی کی گنجانی کو دور کرنے اور گندہ محلوں کو ڈھانے کی طرف زمانۂ دراز تک

[1] دیکھو مزدور کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۱۲۱۔

کوئی توجہ ہی نہیں کی گئی حتیٰ کہ حالت ہر سال بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں بڑے طاعون کے باعث بمبئی میں کثیر اموات واقع ہوئیں اور عام بھگدڑ مچ گئی اس کے نتیجے کے طور پر تجارت اور صنعت مفلوج ہو کر رہ گئی۔ ان سب چیزوں نے صورت حال کو بہت نازک بنا دیا تھا۔ سنہ ۱۸۹۸ء میں ایک محکمۂ آرائش اس غرض سے قائم کیا گیا کہ نئی سڑکیں بنائے، گنجان علاقوں کو کشادہ کرے، توسیع کی گنجائش نکالنے کے لیے سمندر کے حصے کو خشکی میں مبدل کرے اور غریبوں اور پولس کے سپاہیوں کے لیے حفظ صحت کے اصول پر مکان تعمیر کرے۔ محکمۂ آرائش کے محدود اختیارات اور قلیل سرمایہ، محکمۂ آرائش اور بلدیہ کا باہمی عدم تعاون، اور خانگی املاک کے جبری حصول اور عمارتوں کے انہدام کی وجہ سے محکمے کی ناگزیر غیر مقبولیت یہ ایسے اسباب تھے جن کی وجہ سے کچھ زیادہ کام نہ ہوسکا البتہ گندہ بستیوں کی تھوڑی بہت اصلاح کی گئی۔ پھر بھی محکمۂ آرائش نے جو تھوڑا بہت کام کیا وہ نہایت مفید تھا۔

بلدیہ نے سنہ ۱۹۲۰ء تک اپنے عملے کے لیے بھی ۲۹۰۰ مکان تیار کر لیے اور مزید ۲۲۰۰ مکانوں کی تعمیر کی منظوری بھی دیدی۔ محکمۂ بندرگاہ نے اپنے تقریباً ۵۰۰۰ مزدوروں کے لیے مکان فراہم کیے۔ اس اثنا میں شہر کی آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی تھی، اور مالکان گرنی نے اپنے مزدوروں کی حد تک انتظام سکونت کے معاملے میں کچھ بھی نہیں کیا۔ صنعتی کمیشن نے مزید گنجانی کو روکنے اور بہتر انتظام سکونت کرنے کی غرض سے یہ سفارش کی کہ چند مستثنیات کے ساتھ شہر میں جدید صنعتی کارخانوں کے قائم کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا جائے[1]، صنعتی ترقی کے لیے ایک علیحدہ رقبہ مخصوص کر دیا جائے، موجودہ ریلوے ورکشاپوں کو شہر سے معقول فاصلے پر منتقل کر دیا جائے، ریلیں حکومتی محکمہ جات اور

---

[1] اس مشورے کو قبول کر لیا گیا ہے اور خاص بمبئی شہر میں کسی قسم کی نئی گرنی کھولنے کی اجازت نہیں ہے۔

سرکاری ادارے اپنے ملازموں کے لیے سکونتی مکان مہیا کریں؛ صنعتی مضافات قائم کرنے کی غرض سے وسایل آمد و رفت کی اصلاح و ترقی کی جائے؛ شہر کے صنعتی مکانوں کی وسعت و مکانیت کا ایک معین معیار رکھا جائے۔ مقامی حکومت تعمیرات کا پروگرام مرتب کرے اور اس کے مطابق کام کرے۔

جنگ عظیم کے اختتام پر اس مسئلے کو حل کرنے کی غرض سے حکومت بمبئی کی جانب سے نظامت ترقیات عامہ قائم کرنے کی ایک مکمل تجویز پیش کی گئی۔ ترقیات کے لیے ۹ کروڑ روپے قرضے سے اور بمبئی میں درآمد ہونے والی روئی کی ہر گانٹھ پر ایک روپیہ "شہری محصول" عائد کرکے سرمایہ فراہم کیا گیا۔ لیکن تعمیر کردہ مکانات کی کثیر تعداد خاص کر ورلی کے مزدور واڑے خالی پڑے ہوئے ہیں۔ فن تعمیر کے نقطۂ نظر سے یہ مکان عام طور سے نہایت بھدے اور بدنما خیال کئے جاتے ہیں؛ اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کے غیر مقبول ہونے کے اسباب میں ان کو حاصل کرنے کی مشکلات، بازار کی سہولتوں کی عدم موجودگی، سمنٹ کی تعمیر (جس کی وجہ سے مکان گرما میں تکلیف دہ طریقے پر گرم اور سرما میں تکلیف دہ طریقے پر سرد رہتے ہیں)، کرائے کی زیادتی، روشنی اور پولیس کے انتظام کی عدم موجودگی داخل ہیں۔ اب یہ کوشش کی جارہی ہے کہ ان نقائص کو دور کیا جائے۔ بلدیہ اور محکمۂ آرائش بھی اصلاح و ترقی کے متعلق اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنا رہے ہیں اور محکمۂ بندرگاہ نے بمقام سیوری کپاس کے لیے ایک گودام تیار کیا ہے۔

جہاں تک مالکان گرنی کا تعلق ہے، بعض گرنیوں، مثلاً سیسون ملز نے اپنے مزدوروں کے لیے سکونتی مکان مہیا کئے ہیں۔ کارخانوں کے قرب وجوار میں مناسب شرائط پر زمین حاصل کرنے کی دقت، کسی ضمانت کی عدم موجودگی کہ گرنی کے بنائے ہوئے مکانوں میں رہنے والے مزدور دوسری گرنیوں میں کام قبول نہ کریں گے، اور خود مزدوروں کا ان انتظامات سے فائدہ اٹھانے میں پس و پیش، ان چیزوں نے ترقی کی رفتار کو ناگزیر

طور سے سست کر دیا ہے۔ مزدوروں کو یہ ڈر ہے کہ ان سے آزادیٔ عمل چھن جائے گی اور ہڑتال کرنے کی صورت میں ان کو مکانوں سے نکال دیا جائے گا؛ اور وہ حفظ صحت کے قواعد اور ضبط کے مخالف ہیں جن کی قدر و قیمت سے وہ ناواقف ہیں اس اعتبار سے کانپور، ناگپور، احمد آباد اور مدراس میں زیادہ موافق حالات موجود ہیں، چنانچہ یہاں کے کارخانہ داروں نے اپنے مزدوروں کے لیے سکونتی مکانوں کا انتظام کرنے میں زیادہ دلچسپی لی ہے، جس سے فریقین کو بہت بڑا فائدہ ہو رہا ہے۔ صنعتی مکانات کی اس عمدہ تجویز کا خاص طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے جس پر مسرز ٹاٹا سنس لمیٹڈ کی نگرانی میں امپریس ملز نے بمقام ناگپور اور ٹاٹا آئیرن اینڈ اسٹیل کمپنی لمیٹڈ نے اپنے عملے اور مزدوروں کے لیے جمشید پور میں عمل شروع کیا ہے۔

مزدور کمیشن نے متعدد مشورے دئے؛ اور یہ سفارش کی کہ (۱) قانون تحصیل اراضی میں اس طرح ترمیم کرنی چاہئے کہ صنعتی کارخانوں کے مالکوں کو مزدوروں کے لیے سکونتی مکان تعمیر کرنے کی غرض سے زمین حاصل کرنے میں سہولت ہو چنانچہ حکومت ہند کی تحریک پر اس قانون میں ۱۹۳۳ء میں ترمیم کر دی گئی؛ (۲) صوبہ دار حکومتوں کو چاہئے کہ شہری و صنعتی علاقوں کا معائنہ اس غرض سے کریں کہ مکانوں کی حد تک ان مقامات کی ضرورتوں کا علم ہو اور اس بارے میں جملہ متعلقہ جماعتوں کے باہمی مشورے سے عملی تدابیر اختیار کرائی جائیں (۳) حکومت کو چاہئے کہ مکعب رقبے، ہوا اور روشنی کے انتظام، آب رسانی، موریوں وغیرہ کے بارے میں اقل ترین معیار مقرر کرے؛ (۴) شہری تشکیل کے مناسب قوانین جہاں کہیں ضروری ہوں منظور کرنے چاہئیں؛ (۵) ہر محکمۂ آرائش کے لیے مزدوروں کے واسطے مکانوں کا انتظام دستوری طریقے پر لازمی قرار دیا جائے؛ (۶) انجمن تعمیر امداد باہمی کی ہمت افزائی کی جائے؛ (۷) بلدیوں کی طرف سے صحت، انتظام سکونت اور حفظ صحت کے متعلق ذیلی قواعد کی نظر ثانی

ترمیم اور سختی کے ساتھ نفاذ کا اہتمام ہونا چاہیئے (مزدور کمیشن کی رپورٹ، باب ۱۵)۔ صنعتی مکانوں کی تعمیر کی راہ میں مالیہ، انتظام، نقشے وغیرہ کے متعلق کئی مشکلات حائل ہیں؛ چنانچہ ان کے منجملہ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ صاف ستھرے اور صحت بخش سکونتی مکانوں کی ضرورت واہمیت سے خود مزدور بالکل غافل اور بے پروا ہیں۔ حفظ صحت کے ابتدائی اصولوں کے بارے میں مزدوروں کی مناسب تربیت اور دیہایت میں پائے جانے والے حالات سے صنعتی مکانوں کی حتی الامکان مطابقت یہ ایسی چیزیں ہیں جو صاف ستھری جائے رہائش کے مسئلے کو حل کرنے میں معاون ہوں گی اور ساتھ ہی صنعتی مزدوروں میں ثبات پذیری پیدا ہوسکے گی۔

۲۳۔ اجرت کی شرحیں۔ حکومت بمبئی کے دفتر عمال نے احاطۂ بمبئی کی کپڑے کی گرنیوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی اجرت کے بارے میں سنہ ۱۹۲۱ء، سنہ ۱۹۲۳ء اور سنہ ۱۹۳۴ء میں علی الترتیب چار مرتبہ تحقیقات کی۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں حکومت بمبئی نے ایک عام اجرت شماری شروع کی، تاکہ بمبئی پریسیڈنسی کے ہر قسم کے صنعتی کارخانوں سے متعلق اجرتوں کے بارے میں تفصیلی معلومات دستیاب ہوجائے۔ حکومت نے دفتر عمال کو ہدایت دی کہ پہلے کارخانوں کے کام کے حالات اور اجرت کے متعلق دو حصوں میں یعنی ایک میں تمام دوامی کارخانوں کے متعلق اور دوسرے میں تمام موسمی کارخانوں کے متعلق تحقیق کرے۔ اس وقت تک تین رپورٹیں شائع ہوچکی ہیں۔ پہلی رپورٹ میں انجینیری کے کارخانوں اور پیشوں سے، دوسری میں چھپائی کی صنعت سے اور تیسری میں بمبئی پریسیڈنسی کی پارچہ بافی کی صنعتوں سے بحث کی گئی ہے۔[2]

---

[1] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "بمبئی کے کپڑے کی صنعت میں بے روزگاری اور اجرت" شائع شدہ سنہ ۱۹۳۴ء۔

[2] دیکھو Labour Gazette بمبئی بابتہ جولائی سنہ ۱۹۳۷ء صفحہ ۸۱۶

بمبئی پریسیڈنسی میں اس وقت جو اجرت شماری ہو رہی ہے اس کے بموجب ۱۹۳۴ء میں بمبئی پریسیڈنسی کے سوتی کپڑوں کے کارخانوں میں جملہ پیشوں اور ہنروں میں کام کرنے والے بالغ مزدوروں کی اوسط روزمرہ اجرت حسب ذیل تھی:- شہر بمبئی میں ایک روپیہ ایک آنہ ۱۰ پائی[1]؛ مضافات بمبئی، تھانہ، قلابہ، اور رتناگیری کے علاقوں میں ایک روپیہ تین پائی؛ شہر احمد آباد میں ایک روپیہ پانچ آنے ۷ پائی؛ احمد آباد، کیرا اور پنچ محل میں ایک روپیہ تین پائی؛ بروچ اور سورت میں ۱۴ آنے مشرقی و مغربی خاندیس میں ۱۲ آنے؛ پونا، ناسک اور احمد نگر میں ۱۵ آنے ۷ پائی؛ شولاپور شہر میں ۱۱ آنے ۸ پائی؛ شولاپور اور ستارا میں ۷ آنے ۹ پائی اور بلگام، بیجاپور، دھاڑواڑ اور کنارا میں ۸ آنے ۷ پائی۔

کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی اوسط ماہانہ اجرت تمام انجینیری کے اور دوسرے عام پیشوں میں بمبئی کی اجرت شماری کے مطابق حسب ذیل تھی:- اس میں فیکٹریوں کے غیر ماہر مزدور شامل نہیں ہیں۔

بمبئی شہر میں ۴۱ روپے ۸ آنے ۵ پائی[2]؛ مضافات بمبئی، تھانہ، قلابہ اور رتناگیری میں ۴۳ روپے ۲ آنے ۱۱ پائی۔ شہر احمد آباد میں ۳۳ روپے ۷ آنے ۴ پائی؛ احمد آباد کیرا اور پنچ محل میں ۵۲ روپے ۱۲ آنے ۷ پائی؛ بروچ اور سورت میں ۳۲ روپے ایک آنہ ۱۰ پائی؛ مشرقی و مغربی خاندیس میں ۲۹ روپے ۷ آنے ۹ پائی؛ پونا، ناسک اور احمد نگر میں ۲۹ روپے ایک آنہ ۷ پائی۔ شولاپور شہر میں ۲۲ روپے ایک آنہ ۴ پائی؛

---

[1] جولائی ۱۹۲۶ء کے مقابلے میں اکتوبر ۱۹۳۳ء تک بمبئی کی گرنیوں میں اجرت ۱۶ فی صد کم تھی۔

[2] ان علاقوں میں حاضری کا اوسط فی صد زیادہ تھا، چنانچہ بمبئی شہر کے ۷۶ء۸ فی صد کے مقابلے میں یہاں ۹۰ فی صد تھا۔ دیکھو رپورٹ عام اجرت شماری (بمبئی) انجینیری کی صنعت حصہ اول ص۵۸

Report on General Wages Census (Bombay), Engineering Industry.

شولاپور اور ستارا میں ۴۲ روپے ۲ آنے ۱ پائی ؛ بلگام، دھاڑ واڑ، بیجاپور اور کنارا میں ۴۲ روپے ۱۳ آنے، پائی۔ بمبئی، پریسیڈنسی کا اوسط ۴۰ روپے ۴ آنے ۳ پائی تھا۔

بنگال کی سن کی صنعت میں مختلف قسم کے مزدوروں کی اوسط ماہوار اجرت، ۴۰ روپے سے جو دھات کے خرادیے پاتے ہیں ۱۱ روپے تک ہے جو پھر کی صاف کرنے والے کو ملتی ہے۔ ہم نے اس اندازے سے چینی نجاروں کو خارج کر دیا ہے جو قریب قریب ۹۳ روپے مہینہ کماتے ہیں۔ کئی ٹولیوں کے طریقے کے مقابلے میں ایک ٹولی کے طریق پر کام کرنے والوں کی اجرت خاصی زیادہ ہے۔

برطانوی ہند کی زیادہ اہم کوئلے کی کانوں میں زمین کے اندر کام کرنے والے مزدوروں کی روزمرہ کی اجرت مختلف مقامات کے لحاظ سے فورمین سردار وغیرہ کے لیے ایک روپیہ ۷ آنے سے تقریباً ۱۳ آنے تک، کان کنوں کے لیے ۱۴ آنے سے ۸ آنے تک اور لادنے والوں کے لیے ۱۲ آنے سے ۶ آنے تک ہے۔ زمین کے اندر کام کرنے والے دوسرے مزدوروں کی حد تک، اجرت کی شرح کا انحصار اس بات پر ہے کہ آیا وہ ماہر ہیں یا غیر ماہر۔ زمین کے اندر کام کرنے والی عورتیں تقریباً ۶ آنے یومیہ سے زیادہ نہیں کماتیں۔

"کھلی کانوں" میں کام کرنے والے مزدوروں کی اجرت کا عام پیمانہ کمتر اور بالائی سطح زمین پر کام کرنے والوں کا کمترین ہے۔ آسام کے چائے کے باغات میں ایک خاندان کو کام کرنے والی، اکائی کے طور پر لینا پڑتا ہے، اور اوسط خاندان کی ماہوار نقد اجرت مختلف علاقوں کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے۔ چنانچہ ضلع ڈبروگڑھ میں اعلیٰ ترین (تقریباً ۳۲ روپے) اور "کچار" صدر اور ہیلاکنڈی کے اضلاع میں کمترین (تقریباً ۱۵ روپے) ہے۔

۲۴ - ادنیٰ معیار زندگی۔ ہندوستانی مزدور کا ادنیٰ معیار زندگی بھی اس کی ادنیٰ کارکردگی کا ایک سبب خیال کیا جا سکتا ہے۔ یہ ادنیٰ اجرت کا سبب بھی ہے اور نتیجہ بھی۔ غالباً اس بدیہی تعمیم کے مطابق جو (Engis' Law) کے نام سے معروف ہے، ہم یہ پاتے ہیں کہ ہندوستانی مزدور کی اوسط آمدنی چونکہ بہت ہی قلیل ہوتی ہے، اس لیے اس آمدنی کا بہت بڑا جزو غذا میں صرف کیا جاتا ہے، اور اس صرف کا تناسب آمدنی کی مقدار کی زیادتی کے ساتھ ساتھ گھٹتا جاتا ہے۔ چنانچہ بمبئی میں مزدور پیشہ طبقے کے میزانیوں کی ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۲ء کی تحقیقی رپورٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غذا کے مصارف میں ۳۰ روپے ماہانہ سے کم آمدنی پانے والے کے ۶۰ء۵ فی صد سے لے کر ۸۰ تا ۹۰ روپے فی ماہ آمدنی پانے والے کے ۵۲ء۶ فی صد تک تغیر ہے۔ ان ملکوں میں جہاں معیار زندگی اعلیٰ ہے، مثلاً انگلستان اور ریاستہائے متحدہ میں مزدور کی آمدنی کا نسبتاً بہت قلیل جزو غذا اور دوسری ضروریات حیات میں صرف ہوتا ہے، اور رسمی ضروریات اور تعیشات کے لیے بہت زیادہ باقی رہتا ہے[1]۔ ہندوستانی مزدور کا معیار زندگی اس سے کم ہے جتنا کہ پوری کارکردگی کے لیے مطلوب ہے، اور اس کے اہل و عیال کی کفالت کے لیے بہ مشکل کفایت کرتا ہے۔

شہر بمبئی کے مزدور طبقے کے میزانیوں کی جدید ترین تحقیق ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں محکمۂ عمال کی طرف سے کی گئی، اس کی رپورٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک خاندان کے اوسط ماہوار مصارف ۴۵ روپے صفحہ ۱۰۹

---

[1] دیکھو جی فنڈلے شراس کی کتاب موسوم به "بمبئی کے مزدور طبقے کے میزانیے" Working Class Budgets in Bombay شایع کردہ محکمۂ عمال بمبئی ۱۹۲۳ء۔

۱۵ آنے ۹ پائی ہیں۔ بجز ان آمدنیوں کے جو ۳۰ روپے اور ۳۰ تا ۴۰ روپے ماہانہ سے کم ہیں، سب میں آمدنی، مصارف سے زائد ہے؛ اور ۹۰ روپے اور اس سے زائد آمدنی پانے والوں میں ختم ماہ پر، ماہوار آمدنی کا تقریباً ۲۲٫۵ حصہ بچ رہتا ہے۔ یہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ یہ صورتِ حال تحقیق کے زمانے میں تھی، اور اس زمانے کے بعد سے اجرت میں جو تخفیف ہوئی ہے۔ خاص کر سوتی گرنی کی صنعت میں، اس نے ممکن ہے کہ یا تو ماہانہ پس اندازیوں کو متاثر کیا ہو یا معیارِ زندگی کو گھٹا دیا ہو۔ مندرجۂ ذیل جدول میں کئی شہروں کو لے کر یہ بتلایا گیا ہے کہ ایک خاندان کے میزانئے میں جو مختلف قسم کی اشیا اور خدمات شامل ہیں ان کے بارے میں مصارف کی تقسیم کا حقیقی فی صد کیا ہے؛ اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف مرکزوں میں مزدور پیشہ طبقے کی زندگی کی کیا حالت ہے۔[1]

---

[1] شہر بمبئی کے مزدور طبقے کے خاندان کے میزانیوں کی تحقیق کی رپورٹ شائع شدہ ۱۹۳۵ء، صفحہ ۱۹، اور انڈین ایر بک برائے ۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۸ء صفحہ ۵۲۔ یہ اعداد اس وجہ سے حقیقی طور پر قابل موازنہ نہیں ہیں کہ مختلف گروہ بندیوں میں جو مدیں شامل ہیں ان میں اختلافات ہیں۔ تاہم وہ اس لحاظ سے مفید ہیں کہ ان سے اس بات کا عام اندازہ ہوتا ہے کہ مصارف کی تقسیم میں کیا تغیرات ہوتے ہیں۔

مصارف کی تقسیم کا فیصد

مختلف مدات	بمبئی ۱۹۳۲ تا ۱۹۳۳ء	احمد آباد ۱۹۲۶ء	شولاپور ۱۹۲۵ء	ناگپور ۱۹۲۷ء	جبل پور ۱۹۲۷ء	رنگون ۱۹۲۸ء
غذا	۴۶٫۶۰	۵۷٫۹۰	۴۹٫۲۵	۶۴٫۱۰	۶۶٫۰۰	۶۲٫۵۷
ایندھن اور روشنی	۷٫۱۱	۷٫۰۴	۹٫۶۰	۹٫۶۲	۷٫۹۵	۵٫۲
لباس جوتے وغیرہ	۷٫۷۵	۹٫۴۵	۱۱٫۸۶	۱۰٫۷۰	۱۰٫۸۶	۱۰٫۶
مکان کا کرایہ	۱۲٫۸۱	۱۱٫۷۴	۶٫۲۷	۱٫۹۲	۱٫۴۴	۱۳٫۹
متفرق[1]	۲۵٫۷۳	۱۳٫۸۷	۲۳٫۰۲	۱۳٫۶۲	۱۳٫۷۵	۱۷٫۶
	۱۰۰٫۰۰	۱۰۰٫۰۰	۱۰۰٫۰۰	۱۰۰٫۰۰	۱۰۰٫۰۰	۱۰۰٫۰۰

بمبئی کے مزدوروں کے ایک خاندان کی اوسط ماہانہ آمدنی ۵۰ روپے ۱ آنہ ۱ پائی، احمد آباد میں ۴۴ روپے ۷ آنے ۲ پائی، شولاپور میں ۳۹ روپے ۱۴ آنے ۱۰ پائی اور رنگون میں ۸۵ روپے ۸ آنے ۳ پائی ہے۔ اس طرح کی آمدنیوں سے ظاہر ہے کہ کوئی اطمینان بخش معیار زندگی برقرار رکھنا ناممکن ہے۔ مزدور صحت بخش غذا کافی مقدار میں مہیا نہیں کرسکتا؛ خواہ یہ بھی کیوں نہ فرض کرلیا جائے کہ وہ اپنی آمدنی نہایت کامل دانشمندی سے خرچ کر رہا ہے۔ مکان کے متعلق اس کی افسوسناک حالت کو پہلے ہی بیان کرچکے ہیں اس کا لباس اتنا مختصر ہوتا ہے کہ گرم موسم کے لیے بھی کافی تصور نہیں ہوسکتا تعلیم پر

[1] یہ امر قابل ذکر ہے کہ "متفرق مصارف" کی مد میں قرضوں کا سود، شراب اور گاؤں کی آمد و رفت وغیرہ کا خرچ شامل ہیں۔

وہ تقریباً کچھ بھی خرچ نہیں کرتا۔ رہا فرنیچر جس کی وہ سربراہی کرسکتا ہے تو وہ چند بھدّے صنوبر کے صندوق، آہنی تختی کے ٹرنک، بانس کی لکڑیاں موٹا کمبل، پھٹی پرانی چٹائی، چند معمولی نمائشی چیزیں اور ارزاں روغنی تصویریں ہیں جن میں قدیم قصّے کہانیوں کے متعلق مناظر ہوتے ہیں[1]۔ اکثر مزدوروں کو اپنی آمدنی کا بیشتر حصّہ دیہات کی آمدورفت میں صرف کرنا پڑتا ہے۔ دوسرا بڑا حصہ اس قرضے کے سود کی ادائی میں صرف ہوتا ہے جو مزدور کم و بیش ہمیشہ لیا کرتا ہے[2] شرح سود ۱ آنہ فی روپیہ ماہانہ یا ۷۵ فی صد سالانہ ہوتی ہے، اور سود باقاعدہ ادا نہ کئے جانے کی صورت میں سود در سود وصول کیا جاتا ہے۔ قرضے کے سود کے متعلق یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ کل اوسط ماہانہ خرچ کا تقریباً ۳ فی صدی ہوتا ہے[3]۔

۲۵۔ شراب نوشی کا خرچ کارخانے کے مزدوروں میں شراب نوشی بہت خطرناک طریقے سے پھیل رہی ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے، جیسا کہ خاندان کے بجٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ مزدور طبقے کے کل اخراجات کا کم از کم ۴ فی صد شراب نوشی پر خرچ ہوتا ہے اور بھنگیوں جیسے ادنیٰ ترین طبقے میں یہ تناسب کم از کم ۱۰ فی صد تک بڑھ جاتا ہے۔ مرد مزدور (عورتیں شاذ ہی پیتی ہیں) مشرقی آفتاب کی تیز اور مرطوب گرمی میں دن بھر سخت محنت کرکے اکثر شراب نوشی کے ذریعے سے آرام و سکون حاصل کرنے کی کوشش

---

[1] دیکھو ہرسٹ کی کتاب محولۂ سابق، صفحہ ۹۳۔

[2] بمبئی میں ۱۹۲۱ء میں مزدور طبقے کے بجٹوں کے بارے میں محکمۂ مزدوران کی طرف سے جو تحقیق کی گئی اس کے مطابق، ۴۷ فی صد خاندان مقروض تھے، اور قرضے کی مقدار ڈھائی مہینے کی کمائی کے مساوی تھی (ایک ماہ کی اوسط کمائی فی خاندان ۵۲ روپے ۴ آنے ۷ پائی تھی)

[3] دیکھو، فصل (۲۸)۔

کرتا ہے" (ہرسٹ)۔ ایک طرف شراب نوشی کی طلب اور دوسری طرف افلاس کے باعث کام کے مضرِ صحت حالات اور ناقص غذا کے درمیان کچھ نہ کچھ عضویاتی تعلق ضرور موجود ہے۔ اس معاملے میں جس بات پر غصہ آتا ہے یہ ہے کہ اگر یہی روپیہ جو شراب نوشی پر خرچ ہوتا ہے زیادہ اور بہتر غذا خریدنے میں صرف کیا جاتا تو غذا کے نقص میں یقیناً کمی ہو جاتی۔ مزدور صرف غایت درجہ تنگ دست اور نادار ہی نہیں ہے بلکہ اپنے مصارف کا بہترین طریق پر انتظام کرنے کے بھی ناقابل ہے۔ شراب نوشی کے مصارف اس کی تنگدستی کو بڑھاتے ہیں اور تنگ دستی اس کو اور زیادہ شرابی بناتی ہے۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لیے یہ تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں کہ شراب خانوں کے بدل کے طور پر چائے خانے سینما گھر، کلب اور دوسری قسم کی تفریح گاہیں کھولی جا رہی ہیں؛ سیندھی شراب کی دوکانوں کی تعداد کم کی جا رہی ہے، ان کے کھلے رہنے کے اوقات کو محدود کیا جا رہا ہے اور گرنیوں کے حدود کے اندر جو شراب فروخت ہو سکتی ہے اس کی مقدار کو بھی گھٹایا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں امتناع شراب کی پالسی کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے جس کا اعلان حال ہی میں (۱۹۳۷ء) بمبئی، مدراس اور دوسرے صوبوں کی کانگریسی وزارتوں نے کیا ہے۔ حکومت بمبئی اس پالسی کو جلد عملی جامہ پہنانے کے لیے اہم صنعتی شہروں کے انتخاب پر غور کر رہی ہے۔

۲۶۔ اعلیٰ اجرتوں کا مسئلہ۔ ہندوستان میں اجرت کی مروجہ شرحوں کی حد تک یہ خیال پیش کرنے کی جرأت کی جا سکتی ہے کہ مزدور کی حالت کو بہ لحاظ کارکردگی بہتر بنانے کی پہلی تدبیر یہ ہو سکتی ہے کہ اس کی اجرت میں اضافہ کیا جائے۔ دوسرے ملکوں کے مثل ہندوستان میں بسا اوقات یہ پایا گیا ہے کہ آجر اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ اجرتوں کا اضافہ مزدور کے

معیار زندگی کو بڑھانے کی بجائے یا تو شراب خواری میں ضائع کر دیا جاتا ہے یا مزدور کو زیادہ کاہل اور تن آسان بنا دیتا ہے جس کے نتیجے کے طور پر مزدور کی کارکردگی میں کوئی اصلاح و ترقی نہیں ہوتی۔ اعلیٰ اجرت دینے کے بارے میں اس قسم کا جو اعتراض کیا جاتا ہے اس کا موثر جواب پروفیسر پیگو حسب ذیل دیتے ہیں:-

"یہ صحیح ہے کہ کسی مقررہ وقت میں ایسے اشخاص کا ذوق اور ان کی طبیعت کی افتاد جو بہت زمانے سے نادار رہوں، ان کے ماحول کے کم و بیش مطابق بن جاتی ہے۔ چنانچہ اگر آمدنی میں کوئی اچانک اور بڑا اضافہ ہو جائے تو ممکن ہے وہ اس کو احمقانہ طور پر خرچ کر بیٹھیں جس سے ان کی خوشحالی میں بالکل اضافہ نہ ہوگا یا بہت کم ہوگا۔ لیکن اگر اعلیٰ آمدنی کسی دراز مدت کے لیے برقرار رہے تو یہ شکل باقی نہ رہیگی۔ دوسری طرف اگر اضافہ تدریجی طور پر ہو تو ممکن ہے کہ ایسی احمقانہ فضول خرچی کی نوبت ہی نہ آئے۔ بہر حال یہ استدلال کرنا کہ نادار اشخاص اتنے زیادہ احمق ہوتے ہیں کہ آمدنی کے اضافے سے ان کی خوشحالی میں کچھ بھی ترقی نہیں ہو سکتی اس قول متناقض کو کھینچ تان کر اس نقطے سے آگے لیجانا ہے جہاں تک کہ معقولیت سے بحث کی جا سکتی ہے"[1] ایک اور اصولی اعتراض اجرتوں کو بڑھانے کے بارے میں یہ کیا جاتا ہے کہ ممکن ہے کہ اس کے اثر کو آبادی کا اضافہ بہت جلد زائل کر دے۔ اس معاملے پر پہلے بحث کی جا چکی ہے (دیکھو جلد اول باب ۳) اور ہم نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اگرچہ دولت کا اضافہ ایک حد تک اضافۂ آبادی کی شکل میں ظاہر ہو سکتا ہے، لیکن یہ توقع بھی کی جا سکتی ہے کہ اضافۂ دولت کے

---

[1] اے، سی، پیگو کی کتاب موسوم بہ "معاشیات خوشحالی"، ص ۵۳ تا ص ۵۴

Economies of Welfare

نتیجے کے طور پر معیارِ زندگی بھی ایک حد تک بڑھے گا۔ اس بارے میں زیادہ اختلافِ رائے کی گنجائش نہیں ہے کہ صنعتی مزدور کا معیارِ زندگی گزشتہ چند سالوں میں قابلِ لحاظ حد تک بڑھ گیا ہے۔

بین الاقوامی مسابقت کے متعلق بھی یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اجرت کی سطح کو بلند کرنے میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ چنانچہ سوتی کپڑے کے کارخانوں کی مشکلات کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں جن کا باعث بلاشبہ ایک حد تک جاپانی مسابقت ہے۔ اس بات کو ایک واقعے کے طور پر تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ ایک ملک اپنے مزدوروں سے نیم بیگار کے طور پر کام لے کر کم از کم عارضی طور پر دوسرے ملک کے مقابلے میں اپنے لیے بہت اچھا موقع پیدا کر سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ دوسرے ملکوں کو بھی مدافعانہ طور پر اسی قسم کے نیم بیگاری کے طریقے اختیار کرنے چاہییں۔ یہ حجت کی جاسکتی ہے کہ نیم بیگار پیشے آخر میں چل کر فائدہ بخش ثابت نہیں ہوتے، اس لیے کہ وہ کارکردگی کو گھٹاتے ہیں۔ بہرحال کوئی مہذب قوم خودداری کے ساتھ اس بات کو بھول نہیں سکتی کہ پیدائشِ دولت کو ترقی دینے کا معاشی نصب العین جتنا اہم ہے اسی قدر اہم انسانی زندگی کو بہتر اور خوشتر بنانے کا اخلاقی نصب العین بھی ہے۔ مسابقت کے حالات و شرائط کو مساوی بنانے کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ ہر قوم کو اس بات پر راضی کیا جائے کہ وہ کام کے متعلق بعض اقل معیار مقرر کریں۔ اگر کوئی خاص ملک سرتابی کرے تو مزدوروں کے لیے خطرناک طور پر ادنیٰ اور گھٹیا معیارِ زندگی کو چپ چاپ مان لینے یا عائد کرنے کی بجائے اس ملک کی زد سے بچنے کے لیے دوسری تدابیر اختیار کرنی چاہییں۔

حکومت بمبئی نے حال ہی میں (ستمبر ۱۹۳۴ء) بمبئی کے سوتی کپڑے کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے متعلق ایک

تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی تا کہ دوسرے معاملات کے منجملہ اس امر کی جانچ کی جائے کہ اس صوبے کے مختلف مرکزوں میں سوتی کپڑے کے کارخانوں میں کام کے اوقات، شرائط و آلات اور کارکردگی کے اعتبار سے مزدوروں کی اجرتیں کیا ہیں؛ اور یہ دریافت کیا جائے کہ آیا اجرت جو ملتی ہے کفافی اجرت کے معیار کے لحاظ سے کافی ہے یا ناکافی۔ کمیٹی نے اپنی ایک درمیانی رپورٹ میں جو فروری ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی یہ سفارش پیش کی کہ اس واقعے کے مدنظر کہ سوتی کپڑے کی صنعت میں ۱۹۳۷ء سے مسلمہ طور پر اصلاح و ترقی رونما ہوئی ہے احاطۂ بمبئی کے کارخانوں کے مزدوروں کی اجرت میں اضافہ کیا جائے۔

۲۷۔ کم سے کم اجرت کی قانونی حد۔ گیارھویں بین قومی مزدور کانفرنس میں جو ۱۹۲۸ء میں بمقام جنیوا منعقد ہوئی ایک قرارداد منظور کی گئی جس کی رو سے یہ طے پایا کہ بعض پیشوں خاص کر گھریلو صنعتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے لیے کم سے کم اجرت کی شرحیں مقرر کرنے کا انتظام کیا جائے، اس لیے کہ ان پیشوں میں اجرتوں کی موثر تنظیم کا کوئی انتظام موجود نہ تھا اور اجرتوں کی شرحیں غیر معمولی طور پر ادنیٰ تھیں۔ مزدور کمیشن نے یہ مشورہ دیا کہ کم سے کم اجرت مقرر کرنے کا انتظام کرنے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ ایسی صنعتوں کا انتخاب کیا جائے جن کے متعلق یہ گمان قوی ہو کہ ان کے حالات کی تفصیلی تحقیقات کی معقول وجہ پائی جاتی ہے، اور ہر صنعت کی جانچ کی جائے تا کہ اس کی بنیاد کے طور پر یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ کہاں تک کم سے کم اجرت کی شرحیں مقرر کرنا قابل عمل اور مناسب ہے۔ جب کسی صنعت کے بارے میں یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ انتظامی تدبیروں کی ضرورت ہے تو ان تدبیروں کے نفاذ کے مصارف پر خاص توجہ دینی چاہئے، اس لیے کہ یہ ممکن ہے کہ مصارف اس بنا پر

زیادہ ثابت ہوں کہ آجروں میں صنعتی قانون کی تعمیل کا رجحان کم ہے، مزدور ناخواندہ اور جاہل ہیں اور رلی بھگت کا امکان پایا جاتا ہے۔ اگر مطلوبہ مقصد آسانی سے حاصل کرنا منظور ہو تو تدریجی کارروائی کی پالیسی کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ بمبئی کی کانگریسی وزارت نے اگست ۱۹۳۷ء میں ایک یادداشت "صنعتی مزدور کی خوش حالی" کے بارے میں مرتب کی جس میں یہ بیان کیا گیا کہ وہ اجرت کی کم سے کم شرح مقرر کرنے کے بارے میں تدابیر اختیار کرنے کے امکان پر غور کر رہی ہے تاکہ ان سے خاص ضرورتیں پوری کی جائیں، اور وزارت کا یہ مقصد ہے کہ صنعتی مزدور کی کم از کم اقل انسانی احتیاجوں کو پورا کیا جائے۔ اسی سلسلے میں بمبئی کے سوتی کپڑے کے کارخانوں کے مزدوروں کی تحقیقاتی کمیٹی کو دوسرے معاملات کے منجملہ یہ بھی ہدایت کی گئی ہے کہ اجرت کی اقل شرح مقرر کرنے کے متعلق اور ایسے طریقے اختیار کرنے کے بارے میں کہ اجرتوں میں از خود تنظیم اور مطابقت پیدا ہو سفارشیں پیش کرے۔ اسی طرح احاطۂ بمبئی کی حد تک اجرتوں کے جامع اعداد و شمار فراہم کرنے کے متعلق حکومت بمبئی نے ۱۹۳۴ء میں جو طریقہ اختیار کیا اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ اجرت کی اقل شرح مقرر کرنے کے انتظام کے سوال پر مزید روشنی ڈالی جائے۔

۲۸۔ قرضداری اکثر صنعتی مزدور اپنی کاروباری زندگی کے بڑے حصے میں مقروض رہتے ہیں۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ اکثر صنعتی مرکزوں میں کم از کم دو تہائی مزدور پیشہ آبادی قرضے میں مبتلا ہے۔ اور ہر مزدور کے ذمے قرضے کی مقدار عام طور پر اس کی تین مہینے کی اجرت سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ مزدوروں کی بہت بڑی تعداد غلہ فروشوں کی مقروض ہوتی ہے۔ قرضہ ادا کرنے میں عام طور پر کوتاہی کی جاتی ہے جس کا باعث یہ ہے کہ مزدور نادار اور ناعاقبت اندیش ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قرضہ دہندہ اس کوتاہی اور عہد شکنی کا موقع دیتا ہے۔ اور

اس طرح ایک چھوٹا سا ابتدائی قرضہ بڑھتے بڑھتے ایک مستقل اور ناقابل برداشت بوجھ بن جاتا ہے۔ مقروضیت کا اہم ترین واحد سبب تقاریب خاص کر شادی بیاہ کا خرچ ہے۔ قرض لینے کی حد تک صنعتی مزدور کی حیثیت کسان کی حیثیت سے بہت کچھ مختلف ہے۔ صنعتی مزدور کے ایک گرنی سے دوسری گرنی میں، ایک مرکز سے دوسرے مرکز میں اور قصبے سے گاؤں میں آتے جاتے اور گھومتے رہنے کی وجہ سے قرض لینے کے حالات و شرائط فطرتی طور پر بہت زیادہ سخت ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں کسان کے قرض کا کم از کم تھوڑا سا جزو تو ضرور نفع آور ہوتا ہے، کم از کم وہ حصہ جو قلیل مدت کے لیے لیا جاتا ہے اور جس کو زمین پر لگانے کے بعد زراعت کے منافع سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برخلاف صنعتی مزدور جو قرض لیتے ہیں وہ عام طور پر غیر پیدآور ہوتا ہے۔ آخر میں یہ کہ کسان کے برعکس صنعتی مزدور شاذ ہی کافی ضمانت پیش کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ سمجھنا آسان ہے کہ اس کے لیے سود کی شرحیں کیوں غیر معمولی طور پر بڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ کسان کی حد تک تو امداد باہمی پر بہت زور دیا جاتا ہے لیکن کارخانے کے مزدور کے لیے اس کی دائمی نقل پذیری کے باعث اس طریق کو اختیار کرنا مشکل ہے۔ علاوہ ازیں مزدور کے لیے اس کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ اس کے اعتبار یا قرضہ لینے کی صلاحیت میں اضافہ کیا جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر مزدور کی جاذبیت شغل اصل کا میدان مہیا کرنے کی حیثیت سے کم ہو جائے اور اگر مزدوروں کو ان کی ادائی کی قابلیت سے زیادہ مقداروں میں قرضے دینا قرض دہندوں کے لیے غیر نفع بخش بنا دیا جائے تو مزدور فائدے میں رہیں گے۔ مزدور کمیشن نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بعض تجاویز پیش کی ہیں۔ چنانچہ اس نے یہ تحریک پیش کی ہے کہ ان تمام مزدوروں کی تنخواہوں اور اجرت کو

جو تین سو روپیہ ماہانہ سے کم پارہے ہیں قرقی سے مستثنیٰ کردینا چاہئے اسی طرح مزدور جو رقم پراویڈنٹ فنڈ میں ادا کریں اس کو بھی ضبطی سے مستثنیٰ قرار دینا چاہئے۔ حکومت ہند نے اس تحریک کے مطابق ضابطۂ دیوانی میں ترمیم کردی ہے۔ چنانچہ اس کی رو سے ایک معین حد کے نیچے کی تنخواہیں قرقی سے مستثنیٰ کردی گئی ہیں۔ یہ بھی مشورہ دیا گیا ہے کہ معمولی صنعتی مزدور کو حراست میں رکھنے اور قید کرنے کا طریقہ موقوف کردینا چاہئے۔ تاوقتیکہ یہ ثابت نہ ہوجائے کہ وہ قرضہ ادا کرنے کی قابلیت کے باوجود ادائی میں پس و پیش کررہا ہے[1]۔ اور یہ کہ مزدوروں کے غیر کفالتی قرضوں کی بے باقی کے لیے کوئی سرسری کارروائی ہونی چاہئے اور عدالتوں کو یہ اختیار دینا چاہئے کہ ڈگری کی رقم اتنی مقرر کی جائے کہ مزدور بلا تکلیف ادا کرسکے۔

ہندوستان میں مزدوروں کیلیے قانون سازی

۲۹۔ ہندوستان میں مزدوروں کے لیے قانون سازی کے امکانات روز افزوں ہیں

ہندوستان میں مزدوروں کے لیے قانون سازی ویسی اہم حیثیت نہیں رکھتی جیسی کہ انگلستان اور ریاستہائے متحدہ جیسے ملکوں میں جو صنعتی حیثیت سے ترقی یافتہ ہیں۔ اس کا باعث یہ ہے کہ یہاں میکانی قوت کا استعمال بہت آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے اور اس سے ابھی ملک کا بہت کم حصہ متاثر ہوا ہے۔ بیشتر کام کھلے مقامات میں یا بے دیوار سائبانوں کے نیچے انجام دیا جاتا ہے۔ اس لیے تنگ مقام میں مزدوروں کی بھیڑ بھاڑ، ہوا اور دھوپ کے

---

[1] حکومت ہند نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تجربی طریق پر قوانین وضع کیے جائیں اور پہلے ان کو صرف دہلی کے علاقے میں نافذ کیا جائے۔ دیکھو انڈین ایر بک (۱۹۲۷ء تا ۱۹۳۰ء) ص ۵۲۱۔

آنے کا خراب انتظام اور عورتوں اور مردوں کا نامناسب طور پر ملنا جلنا جیسے مسائل کو بھی اتنے بڑے پیمانے پر حل کرنا نہیں پڑتا۔ جوں جوں ملک صنعتی ترقی میں قدم آگے بڑھاتا جارہا ہے، مزدوروں کے بارے میں حکومت کو اپنے فرائض کا زیادہ احساس ہوتا جارہا ہے، اور جب سے مزدور طبقے میں اپنے حقوق کے بارے میں کچھ سال ادھر سے بیداری پیدا ہوئی ہے، اور ہندوستان نے انجمن اقوام کے بین قومی مزدور نظام کے تحت اپنی اخلاقی ذمہ داری کو تسلیم کرلیا ہے، مزدوروں کے لیے قانون سازی بھی زیادہ سے زیادہ اہمیت حاصل کرتی جارہی ہے[1]۔ صنعتی نظام کی عام خرابیوں کو کم کرنے کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ حکومت ثابت قدمی کے ساتھ کوئی کارروائی اختیار کرے۔ خواہ ایسا کرنے کی وجہ سے صنعتی ترقی کی رفتار سست ہی کیوں نہ پڑجائے۔ واقعہ یہ ہے کہ اب تک ہم یورپ کے ملکوں کے تجربے سے فائدہ اٹھانے سے بحیثیت مجموعی قاصر رہے۔ علم رکھتے ہوئے ہم نے اپنے ملک میں بعض ایسی خرابیوں کو پیدا ہونے دیا جن سے سب واقف ہیں، مثلاً گندہ شہروں کا قیام، بچوں سے کام لینا، مردوں اور عورتوں کے طویل اوقات کار، ہوا اور دھوپ آنے کا خراب انتظام اور حفاظتی تدابیر کی عدم موجودگی۔ اور اب ہم انھی سب خرابیوں کی اصلاح کے لیے جان توڑ کوشش کر رہے ہیں۔

۳۰۔ ہندوستان میں فیکٹریوں کے لئے قانون سازی کا آغاز

ہندوستان میں فیکٹریوں کے لیے قانون سازی کا مسئلہ سب سے اول میجر مور کی رپورٹ میں اٹھایا گیا جو ۱۸۷۳ء میں شائع کیا۔ اس بمبئی کے صدر مہتمم تھے۔ بمبئی میں سوتی کپڑے کی صنعت نے جو ترقی کی تھی اس کو دیکھ کر لنکاشائر کے صناعوں کے سینوں میں حسد کی

[1] دیکھو فصل (۱)۔

آگ بھڑک اٹھی۔ چنانچہ ۱۸۷۴ء میں ایک وفد ایوان تجارت مانچسٹر کی طرف سے وزیر ہند کے پاس اس بات پر زور دینے کے لیے بھیجا گیا کہ ہندوستان پر بھی برطانوی قانون کارخانہ جات کا اطلاق کیا جائے۔ اس کے نتیجے کے طور پر حکومت بمبئی نے ۱۸۷۵ء میں ایک "فیکٹری کمیشن" مقرر کیا۔ چنانچہ اس کی سفارش کی بنا پر پہلا قانون کارخانہ ۱۸۸۱ء میں منظور ہوا۔ اس قانون کی اہم شرائط حسب ذیل تھیں:-

سات برس سے کم عمر کے بچوں سے کام لینے کی ممانعت کی گئی۔ ۷ تا ۱۲ سال کے عمر کے بچوں کے لیے روزانہ ۹ گھنٹے سے زیادہ کام کرنے کی اجازت نہ تھی۔ بچوں کے لیے روزانہ ایک گھنٹہ آرام کے لیے اور مہینے میں چار دن تعطیل کے مقرر کیے گئے۔ لیکن عورتوں اور بالغ مردوں کو آرام کا کوئی وقت نہیں دیا گیا۔ ایکٹ کا اطلاق ان فیکٹریوں پر ہوتا تھا جن میں کم از کم ایک سو اشخاص کام کر رہے ہوں اور جو قوت استعمال کر رہی ہوں۔ فیکٹریوں کے انسپکٹر مقرر کرنے کا اختیار مقامی حکومتوں کو دیا گیا۔

پہلا قانون کارخانہ منظور ہونے کے فوراً ہی بعد اس میں ترمیم کرنے کے لیے ہلچل شروع ہو گئی۔ ۱۸۸۱ء کا قانون "قدامت پسندوں کی کامیابی تھی اور انھی لوگوں نے اس کی دفعات کو اتنا سخت نہ ہونے دیا جتنا کہ حکومت ہند اور حکومت بمبئی ان کو بنانا چاہتی تھیں۔ لنکاشائر کی طرف سے دوبارہ دباؤ پڑنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزیر ہند نے یہ تحریک کی کہ زیادہ سخت قوانین بنائے اور اختیار کیے جائیں۔ چنانچہ ۱۸۹۱ء میں دوسرا "قانون کارخانہ" منظور ہوا۔ اس قانون کی دفعات کا اطلاق ان تمام کارخانوں پر ہوتا تھا جن میں قوت استعمال کی جاتی تھی اور کم از کم ۵۰ اشخاص سے کام لیا جاتا تھا۔ لیکن مقامی حکومتوں کو یہ اختیار حاصل تھا کہ اس قانون کا اطلاق دوسرے ایسے کارخانوں کے بارے میں بھی کریں جن میں کم از کم ۲۰ اشخاص کام کر سکتے ہوں۔ کارخانے میں کام کرنے کے قابل

بچوں کی عمر کی کم از کم حد ۹ سال اور زیادہ سے زیادہ حد ۱۴ سال مقرر کی گئی۔ ان کے کام کے گھنٹے ایک دن میں ۷ مقرر کیے گئے۔ اور یہ ضروری تھا کہ یہ کام صرف صبح ۵ بجے سے شام کے ۸ بجے کے درمیان کسی وقت لیا جائے عورتوں سے کام لینے کے بارے میں بھی بندشیں عائد کی گئیں۔ چنانچہ وہ کارخانوں میں صبح ۵ بجے سے بیشتر اور ۸ بجے کے بعد کام نہیں کرسکتی تھیں، بجز ان مقامات کے جہاں بدلی کا مناسب انتظام موجود ہو، ان کے کام کے گھنٹے دن میں ۱۱ مقرر کئے گئے، اور ان کو درمیان میں ڈیڑھ گھنٹہ آرام لینے کا مستحق کیا گیا۔ مردوں کو روزانہ ۱۲ بجے اور ۲ بجے کے درمیان آدھ گھنٹے کا وقفہ اور ہفتے میں ایک دن آرام کے لیے دیا گیا۔ بعض دفعات کی رو سے صفائی، اور ہوا اور دھوپ کے آنے کے انتظام کی بھی ضمانت کی گئی اور فیکٹریوں میں مزدوروں کی بھیڑ بھاڑ کو روکا گیا۔

۳۱۔ قانون کارخانہ بابت ۱۹۱۱ء۔

بمبئی کی گرنیوں میں نیز کلکتے کی بعض سن کی گرنیوں میں برقی روشنی کے روزافزوں استعمال کی بدولت اوقات کار میں اضافہ ہوگیا تھا۔ لنکا شائر کے صناع حسب معمول شاکی تھے، ہندوستانی اخبارات شور مچا رہے تھے، اور بعض آجر بھی دلچسپی لے رہے تھے۔ ان سب واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک فیکٹری کمیشن مقرر ہوا جس نے ۱۹۰۸ء میں رپورٹ پیش کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۱۱ء میں ایک قانون کارخانہ منظور ہوا جس کے دائرے میں وہ سب موسمی کارخانے بھی آتے تھے جو سال میں ۴ مہینے سے بھی کم کام کرتے تھے۔ اس قانون کی رو سے صداقتنامۂ عمر پیش کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ پارچہ بافی کے کارخانوں میں بچوں کیلیے کام کے گھنٹے گھٹا کر فی یوم ۶ کردیئے گئے۔ عورتوں سے رات کے وقت کام لینے پر بھی قانون نے بندشیں عائد کیں۔ صرف روئی اوٹنے اور دبانے کے کارخانوں میں ان کو رات میں کام کرنے کی اجازت تھی۔ اس قانون کی رو سے پہلی دفعہ بالغ مرد مزدوروں کے

کام کے گھنٹوں پر بندش عائد کی گئی۔ چنانچہ ڈاکٹر نائر کی سفارش کی بنا پر صرف پارچہ بافی کے کارخانوں میں ان کے کام کے گھنٹے ۱۲ فی یوم کردیے گئے۔ ڈاکٹر نائر ۱۹۰۸ء کے فیکٹری کمیشن کے تنہا رکن تھے جنھوں نے بالغ مردوں کے کام کے گھنٹوں کی تحدید کی حمایت کی تھی۔ علاوہ ازیں تمام پارچہ بافی کے کارخانوں میں بجز ان کارخانوں کے جو "بدلی" کے منظورہ طریق کے مطابق کام کر رہے تھے۔ کسی شخص کو ۵ بجے صبح سے پیشتر یا ۷ بجے شام کے بعد کام کرنے کی اجازت نہ تھی۔ یہ جدید حدود وہی تھے جو عورتوں اور بچوں کے لیے قائم کئے جا چکے تھے۔ اس کے علاوہ صحت وسلامتی کے متعلق زیادہ وسیع انتظامات ضروری قرار دیے گئے اور فیکٹریوں کے معائنے کو زیادہ موثر کردیا گیا۔

۳۲۔ قانون کارخانہ جات بابت ۱۹۲۲ء

جنگ عظیم کے جو اثرات فیکٹری کے نظم ونسق پر اور آخر کار قانون کارخانہ پر پڑے وہ نہایت اہم تھے۔ ہندوستان کی صنعتی جدوجہد میں خاصی وسعت پیدا ہوگئی۔ اور ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۹ء کے درمیان فیکٹریوں اور ان میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد ۲۵ فی صد بڑھ گئی۔ قانون کارخانہ کی اکثر دفعات سے کارخانوں کو مستثنیٰ کرنا پڑا اور معائنوں کی اوسط تعداد میں بھی کمی ہوگئی۔ لیکن اہم ترین اثر خود مزدوروں پر پڑا۔ مزدوروں کی طلب کے بڑھ جانے کی وجہ سے ان کی حیثیت اور زیادہ مستحکم ہوگئی۔ دوسری طرف قیمتوں اور منافع میں اضافہ ہوا اور جنگ کے نتیجے کے طور پر عام بے چینی رونما ہوئی تو مزدوروں میں اپنی قوت کا احساس اور بھی بڑھ گیا اور ناخوش گوار حالات کو قبول کرنے کے خلاف میلان رونما ہوا۔ اس طرح اصلاح وترقی یافتہ حالات پیدا کرنے اور زیادہ سخت قوانین وضع کرانے میں ہندوستانی مزدوروں کی خواہش پہلی دفعہ ایک زبردست قوت کے طور پر ظاہر ہوئی۔

۱۹۱۹ء میں جو بین الاقوامی مزدور کانفرنس واشنگٹن میں منعقد ہوئی تھی

اس سے ہندوستان بھی متعلق تھا اور چونکہ اس کانفرنس کے نتیجے کے طور پر ہندوستان نے مزدوروں سے متعلق چند ذمہ داریاں قبول کرلی تھیں اس فیکٹریوں کے قوانین میں مزید تغیرات ضروری ہوگئے۔ قانون کارخانہ جات بابت ۱۹۳۶ئہ کی رو سے قوت استعمال کرنے والے سب کارخانے جن میں کم از کم بیس اشخاص کام کر رہے ہوں کارخانوں کے قانون کے تحت آگئے۔ مقامی حکومتوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ ان قوانین کو ایسے کارخانوں تک بھی وسیع کریں جن میں کم از کم دس اشخاص کام کریں خواہ قوت کا استعمال کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ بچوں سے کام لینے کی کم از کم حد بڑھا کر ۱۲ سال اور زیادہ سے زیادہ حد ۱۵ سال مقرر کی گئی۔ ان عمروں کے درمیان والے بچوں کے کسی کارخانے میں ۶ گھنٹے فی یوم سے زیادہ کام لینے کی ممانعت کی گئی۔ کسی کارخانے میں عورتوں اور بچوں سے ½۵ بجے سے پیشتر اور ۷ بجے کے بعد کام نہیں لیا جاسکتا تھا۔ بالغ مزدوروں کے کام کے گھنٹے ہفتے میں ۶۰ اور ایک دن میں ۱۱ مقرر کیے گئے۔ ایک ہفتے میں کارگزاری کے دن ۶ سے زیادہ نہ ہوسکتے تھے۔ تمام طبقوں کے مزدوروں کے لیے آرام کا وقفہ کشادہ دلی سے مقرر کیا گیا۔ اس ایکٹ کی رو سے یہ طے پایا کہ ہر چھ گھنٹے کے کام کے بعد ایک گھنٹہ آرام کے لیے دیا جائے، اگرچہ مزدوروں کی درخواست پر اس ایک گھنٹے کو نصف نصف گھنٹوں کے دو وقفوں میں تقسیم کیا جاسکتا تھا، بشرطیکہ مسلسل پانچ گھنٹوں سے زیادہ کام نہ کیا جائے۔ معائنے کے طریقے میں بھی مزید اصلاح اس طرح کی گئی کہ اہم صنعتی مرکزوں میں اچھی قابلیت کے ہمہ وقتی ناظر زیادہ تعداد میں مقرر کیے گئے۔ آخر میں یہ کہ صحت و سلامتی کے متعلق شرائط میں بھی اضافہ اور توسیع کی گئی اور مقامی حکومتوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ ہوا اور دھوپ کے آنے اور مصنوعی طریقے پر نمی پیدا کرنے کے انتظامات کے معیار مقرر کریں۔

۴۳۔ قانون کارخانہ جات بابت ۱۹۳۴ء

قانون کارخانہ جات بابت ۱۹۳۲ء کی ترمیم ۱۹۲۳ء و ۱۹۲۶ء اور ۱۹۳۱ء میں کی گئی۔ اس طرح بعض انتظامی مشکلات دور کر دی گئیں۔ اور کچھ معمولی سی اصلاح و ترقی عمل میں لائی گئی۔ ۱۹۳۴ء میں مزدور کمیشن کی سفارشوں کی بنا پر ایک نیا انضمامی قانون منظور ہوا اور یکم جنوری ۱۹۳۵ء سے نافذ کیا گیا۔ اس قانون کی رو سے حسب ذیل شرائط طے پائیں:۔

(۱) موسمی یا موقتی کارخانوں اور سال تمام مدامی کارخانوں کے درمیان امتیاز قائم کیا گیا ہے۔

(۲) بچوں اور بالغوں کی دو جماعتوں کے علاوہ ایک تیسری جماعت "نوجوانوں" کی قرار دی گئی ہے جن کی عمر ۱۵ سال سے زائد اور ۱۷ سال سے کم ہو۔ تاکہ اگر انھیں بالغوں کی حیثیت سے کام کرنے کا صداقت نامہ نہ ملے تو ان کو بچوں کی جماعت میں شمار کیا جائے۔

(۳) کام کے گھنٹوں کے موجودہ حدود یعنی ۱۱ فی یوم اور ۶۰ فی ہفتے کا اطلاق موسمی یا موقتی کارخانوں کے بارے میں بدستور قائم رکھا گیا ہے، البتہ مدامی کارخانوں کے بارے میں ان کو چند شرائط کے تابع گھٹا کر علی الترتیب ۱۰ اور ۵۴ کر دیا گیا ہے۔ بچوں کے کام کے گھنٹے ہر جگہ انتہائی طور پر ۵ فی یوم رکھے گئے ہیں۔

(۴) کام کی "خوش تقسیمی" Spreadover کے اصول کو پہلی دفعہ جاری کیا گیا ہے، یعنی مسلسل کام کے گھنٹوں کو بڑوں کے لیے ۱۳ تک اور بچوں کے لیے ۷½ تک محدود کیا گیا ہے۔

(۵) ہوا کو نم بنانے کے طریق کی نگرانی کے متعلق موجودہ شرائط میں اضافہ کیا گیا۔ اس قانون کی رو سے مقامی حکومتوں کو بھی یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ انسپکٹر کو اس بات کا مجاز کریں کہ وہ کارخانوں کے منتظموں سے اس امر کا مطالبہ کریں کہ جہاں کہیں ضروری ہو ہوا کی

ٹھنڈک پہنچانے کی قوت کو بڑھانے کے لیے خاص تدابیر اختیار کریں۔

(۶) آرام و آسائش کی بعض سہولتیں بہم پہنچا دی گئی ہیں، مثلاً کارخانوں میں مزدوروں کے آرام لینے کی جگہوں کا قیام، کام کرنے والی عورتوں کے بچوں کے استعمال کے لیے محفوظ کمرے۔ امداد اولین کا سامان وغیرہ۔

(۷) مقامی حکومتوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ مزدوروں کے کام کرنے کی موزونیت اور قابلیت کے متعلق قواعد بنائے جائیں اور جو بچے کام کرنے کے ناقابل قرار دیے جائیں ان سے کام نہ لیا جائے۔

(۸) انسپکٹروں کو مجاز کیا گیا ہے کہ اگر کسی کارخانے کی عمارت ناکافی ہو یا اس کی تعمیر میں کوئی نقص ہو جس سے مزدوروں کے لیے خطرے کا احتمال ہو تو اس کمی یا نقص کو دور کرنے کی غرض سے منتظم کارخانہ کو مجبور کرے۔

(۹) مزدور سے زائد گھنٹے کام لینے کے حدود مقرر کیے گئے ہیں اور زائد از وقت کام لینے کے معاوضے کا تعین کیا گیا ہے۔

۴۳۔ کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کیلئے قانون سازی۔ مزدوروں کی تنظیم صنعت پارچہ بافی کے مقابلے میں کان کنی میں بہت دیر سے شروع کی گئی۔ سلنڈ۱۹۰۱ء میں پہلا قانون معادن ہند منظور ہوا اور انسپکٹر مقرر کیے گئے۔ واشنگٹن کانفرنس کی سفارشوں اور روز افزوں ترقی کرنے والے کان کنی کے کاروبار میں مزدوروں کی تعداد بڑھ جانے کی وجہ سے ایک قانون نظر ثانی کے بعد سنہ ۱۹۲۳ء میں منظور ہوا۔ اس کی رو سے "کان" کی تعریف وسیع کی گئی، زمین کے اوپر کام کرنے والے مزدوروں کے کام کے گھنٹے ہفتے میں ۶۰ اور زمین کے اندر کام کرنے والے مزدوروں کے کام کے گھنٹے ہفتے میں ۵۴ مقرر کیے گئے ایک ہفتے میں ۶ دن سے زیادہ کام نہیں لیا جا سکتا تھا۔ کسی بچے سے زمین کے اندر کام لینے کی اجازت نہ تھی اور بچے کی تعریف میں

ایسا لڑکا داخل کیا گیا جس کی عمر ۱۳ سال سے کم ہو۔ عورتوں سے زمین کے اندر کام لینے پر کوئی بندش عائد نہیں کی گئی حالانکہ مسٹر-ین۔ ایم جوشی نے عورتوں سے اس طرح کام لینے کی ممانعت کرنے کی سفارش کی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ زمین کے اندر کام کرنے والے مزدوروں میں ۴۵ فی صد عورتیں تھیں، اگر ان سے کام لینے کی اچانک اور قطعی ممانعت کردی جاتی تو اس کی وجہ سے ملک کی ایک کلیدی صنعت کی نظم و ترتیب میں سخت خلل پڑجاتا۔ دوسری طرف اصلاح کی ضرورت بھی کافی محسوس ہورہی تھی۔ حکومت ہند نے ان اختیارات سے کام لے کر جو اس کو ۱۹۰۱ء کے ایکٹ کی روسے حاصل تھے۔ اور جن کی تجدید ۱۹۲۳ء کے ایکٹ کی روسے ہوئی تھی ۱۹۲۹ء میں قواعد بنائے جن کا مقصد یہ تھا کہ عورتوں کو زیر زمین کام کرنے سے فوراً روک دیا جائے، اور صرف چند کانوں مثلاً بنگال، بہار اڑیسہ اور صوبۂ متوسط کی کوئلے کی کانوں اور پنجاب کی نمک کی کانوں کو مستثنیٰ کیا جائے بلکہ ان مستثنیٰ کانوں میں بھی ان کو بتدریج روکا جائے، یہاں تک کہ یکم جولائی ۱۹۳۹ء کے بعد سے عورتیں زیر زمین کام ہی نہ کرسکیں[1]۔

قانون معادن ہند بابتہ ۱۹۲۳ء کی روسے کام کے روزانہ گھنٹوں کے بارے میں کوئی دستوری قیود عائد نہیں کی گئی تھیں۔ اس لیے مارچ ۱۹۲۸ء میں مجلس قانون ساز نے ایک ترمیمی ایکٹ منظور کیا جس کی روسے کسی کان میں ایک ہی مزدور سے چوبیس گھنٹے میں صرف ۱۲ گھنٹے کام لیا جاسکتا تھا اور اس سے زیادہ کی اجازت نہیں تھی۔ اگر کام کو

---

[1] ۱۹۳۵ء میں ان سب کانوں کی مجموعی تعداد جو قانون معادن ہند کے تحت آتی تھیں ۱۸۱۳ تھی۔ ان میں کام کرنے والوں کی تعداد (۲,۵۳,۹۷۰) تھی، جن کے منجملہ (۱,۹۲,۲۶۳) زیر زمین اور (۶۱,۷۰۷) زمین کے اوپر کام کرتے تھے۔ اسی سال زیر زمین کام کرنے والی عورتوں کی تعداد (۹,۰۵۱) تھی جس کے مقابلے میں ۱۹۲۹ء میں (۲۶,۰۸۹) اور ۱۹۲۶ء میں (۳۱,۸۹۱) تھی۔

۲۴ گھنٹوں کے لیے مسلسل جاری رکھنے کی ضرورت ہو تو بدلی کے طریق پر بارہ بارہ گھنٹے کام کرنے کے لیے مزدور لیے جا سکتے تھے۔ کانوں کے مالکوں پر یہ لازم کیا گیا کہ وہ اپنے دفتر کے باہر اعلان چسپاں کریں جس میں مزدوروں کی بدلی اور ان کے کام کے گھنٹوں کی تفصیل بیان کریں۔ ۱۹۳۵ء کا ترمیمی ایکٹ شاہی مزدور کمیشن کی سفارشوں پر مبنی ہے جس میں ”بین قومی مزدور کانفرنس“ کے پندرھویں اجلاس کے منظورہ قول و قرار کا اثر نمایاں ہے اس ایکٹ کی رو سے چند حسب ذیل تبدیلیاں کی گئی ہیں۔

کسی شخص کو ایک کان میں ہفتے میں ۶ دن سے زیادہ کام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کسی شخص کو جو ایک کان میں بالائے زمین کام کر رہا ہو اس کی اجازت نہیں ہے کہ ایک ہفتے میں ۵۴ گھنٹے سے زیادہ یا ایک دن میں ۱۰ گھنٹے سے زیادہ کام کرے۔ مزدوروں کے کام کے گھنٹوں کا اس طرح انتظام کیا گیا ہے کہ آرام کے وقفے کے ساتھ ان کو ایک دن میں ۱۲ گھنٹے سے زیادہ کام نہیں کرنا پڑتا اور آرام کے وقفے سے پیشتر جو کم از کم ایک گھنٹے کا ہونا ضروری ہے ۶ گھنٹے سے زیادہ کام نہیں لیا جا سکتا۔ کان میں زیر زمین کام کرنے والے کسی شخص کو ایک دن میں ۹ گھنٹے سے زیادہ کام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کسی کان میں زیر زمین ایک قسم کا کام ایک دن میں ۹ گھنٹے سے زیادہ بجز بدل چوکی کے طریق کے نہیں لیا جا سکتا اور یہ انتظام کرنا بھی ضروری ہے کہ ہر بدل چوکی کے کام کی مدت ۹ گھنٹے سے متجاوز نہ ہو۔ کسی کان میں ۱۵ سال سے کم عمر کے بچوں سے کام لینے کی ممانعت ہے۔

قوانین معادن کے علاوہ، کانوں میں کام کرنے کے حالات و شرائط کو بھی ”مجالس حفظ صحت معادن“ مقرر کر کے منظم کیا گیا ہے اور یہ مجالس مزدوروں کی جماعت کی صحت کی نگرانی کرتی رہیں۔ چنانچہ اس قسم کی ایک مجلس بہار و اڑیسہ کی کوئلے کی کانوں کے لیے ۱۹۱۹ء میں

قائم کی گئی اور اس کے مصارف کو پورا کرنے کے لیے کوئلے کی کانوں کی رائلٹی سے رقم حاصل کی گئی۔ مجلس کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کانوں کے مالکوں کو اس بات پر مجبور کرے کہ کانوں کی متعلقہ بستی کے حدود کے اندر، مکانوں، آبرسانی، حفظ صحت کی سہولتوں اور طبی امداد کا انتظام کرے۔

۳۵- ریلوں کے مزدوروں کے لیے قانون سازی -

جملہ ریلوں کے کارخانے، قانون کارخانجات بابت ۱۹۲۲ء کے انتظام کے تحت آتے ہیں۔ ہندوستانی ریلیں ڈھائی لاکھ مزدوروں سے دوسرے شعبوں میں بھی کام لیتی ہیں جن کی حد تک حال حال تک کام کے گھنٹوں وغیرہ کی نگرانی کے بارے میں کسی قسم کے قواعد نہیں بنائے گئے تھے، حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ حکومت ہند" بمقام واشنگٹن ۱۹۱۹ء میں اور بمقام جینوا ۱۹۲۱ء میں طے پائے ہوئے شرائط کی توثیق برطانوی ہند کی ریلوں کی حد تک کر چکی تھی۔ اس مسئلے میں بہت سے الجھاؤ تھے جن کو ہندوستانی ریلوں کے ترمیمی قانون بابت ۱۹۳۰ء نے دور کر دیا، چنانچہ اس قانون کی رو سے وہ دستوری واجبات پورے ہو گئے جو بین قومی عمالی معاہدوں کے تحت حکومت پر عاید ہوتے تھے۔ یہ طے پایا کہ کسی ریلوے ملازم سے کسی مہینے میں ہفتے میں اوسطاً ۶۰ گھنٹے سے زیادہ کام نہیں لیا جائے گا۔ کسی ریلوے ملازم سے جو لازمی طور پر تھوڑے تھوڑے وقفے سے کام انجام دے کسی ہفتے میں ۸۴ گھنٹے سے زیادہ کام نہیں لیا جائے گا۔ ریلوے ملازمین کو مذکورۂ بالا شرائط سے حسب ذیل صورتوں میں عارضی طور پر مستثنیٰ کیا جائے گا:- (۱) مفاجی حالات میں جن میں ریلوں کے معمولی کاروبار میں بری طرح رخنہ پڑے اور (۲) کام کی غیر معمولی کثرت کی صورتوں میں، اور زاید وقت کام کرنے کے لیے صرف موخرالذکر صورتوں میں زاید کام کا معاوضہ دیا جائے گا۔ ہفتے میں ایک دفعہ پورے ۲۴ گھنٹے آرام کے لیے تجویز کیے گئے ہیں اور یہ مذکورۂ بالا عارضی استثناء کے تابع ہوں گے۔ اگر کوئی مزدور کسی آرام کے وقفے سے فائدہ اٹھانے سے

باز رہے تو اس کے معاوضے میں اس کو آرام کا وقفہ دینا ضروری ہے۔ گورنر جنرل باجلاس کونسل ریلوں کے معائنے کی غرض سے ریلوے مزدوروں کے ناظروں کا تقرر کرسکتے ہیں، تاکہ یہ معلوم کیا جائے کہ آیا قانون کی شرائط کی پوری پابندی کی جارہی ہے یا نہیں۔

۳۶۔ قانون تلافی مزدوراں بابت ۱۹۲۳ء (ترمیم یافتہ تا ۱۹۳۳ء)

اکثر مغربی ملکوں میں مزدور کا یہ حق قانونی طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے کہ اس کا بیمہ کارخانے کے مصارف سے ان تمام حادثات کے لیے کرنا چاہیئے جو مزدور کے باقاعدہ کام کرنے کے زمانے میں اور اس کام کے خطرات برداشت کرنے کے نتیجے کے طور پر رونما ہوں۔ ہندوستان میں حادثات کی تلافی کرنے کے خیال کی رفتار بہت ہی سست رہی ہے۔ کئی سال پیشتر ۱۸۸۴ء میں بمبئی کے مزدوروں نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ تلافی کا طریق رائج کیا جائے۔ اگرچہ بعض روشن خیال آجروں نے اپنے مزدوروں کے نقصان کی تلافی کا طریقہ جاری کیا، لیکن اس کو عام طور پر اختیار نہیں کیا گیا۔ ۱۹۲۳ء کے ایکٹ سے پیشتر یہ رواج تھا کہ حادثے سے موت واقع ہونے کی صورت میں قانون حادثات مہلک بابت ۱۸۵۵ء کے تحت آجر کے خلاف نالش کی جاسکتی تھی لیکن بہت ہی شاذ موقعوں پر اس قانون سے کام لینے کی نوبت آئی۔ علاوہ ازیں آجروں کی ذمہ داری کے عام مسئلے کی حد تک ہندوستان میں صورتِ حال مبہم سی تھی۔

۱۹۲۳ء کے قانون کا اصول یہ تھا کہ معاوضہ معمولی طور پر ان مزدوروں کو دیا جائے جن کو کام کرنے کی حالت میں حادثات سے گزند پہنچے یا چوٹ آئی ہو اور بعض حالت میں بیماریوں کے لیے بھی معاوضہ دیا جاتا تھا۔ اگرچہ اس قانون میں جہاں تک اصول کا تعلق ہے دوسرے مقامات میں نافذہ قوانین کی پیروی کی گئی تھی، لیکن بعض صورتوں میں اس قانون کو امتیازی حیثیت بھی حاصل تھی اور

اس کو ہندوستان کی صنعتی زندگی کی خصوصیات کے مطابق بنا لیا گیا تھا۔ اس قانون کا دائرۂ عمل ابتداءً محدود تھا۔ لیکن ۱۹۲۶ء، ۱۹۲۹ء، ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۳ء میں ترمیمی قوانین منظور کرکے اس کو بہت وسیع کر دیا گیا۔ اس کی ضرورت ایک حد تک تو اس وجہ سے ہوئی کہ حکومت ہند نے اس معاہدے کی توثیق کر دی تھی جو بین قومی کانفرنس نے ۱۹۲۵ء میں مزدوروں کے برسرِ کار رہ کر عارضوں میں مبتلا ہو جانے اور متضرر ہو جانے کے معاوضے کی بابت منظور کیا تھا اور کسی حد تک ان سفارشوں کی بنا پر ضرورت پیش آئی جو شاہی عمالی کمیشن نے ۱۹۳۱ء میں پیش کی تھیں۔ ۱۹۲۳ء کا قانون ایک آزمائشی آئین تھا۔ جس کی جگہ اب ۱۹۳۳ء کے ترمیمی قانون نے لے لی ہے۔

۱۹۳۳ء کا قانون حسب ذیل شعبوں کے مزدوروں پر حاوی ہے:۔ ریلوے، ٹریم وے، فیکٹریاں، معادن، گودیاں، تعمیرات بشمول انہدام یا مرمت مکانات، کشتی رانی، جہاز رانی، پہاڑی سرنگ بحری تعمیری کام، ٹیلی گراف، ٹیلی فون، اور بجلی کی لائنیں، بارود سے اڑانے یا کھدائی کے کام، روشنی مینار، چائے، کافی، ربر یا سنکونا کے کھیت اور باغات، برقی یا گیس تیار کرنے کے اسٹیشن، تنخواہ یاب موٹر ڈرائیور اور زمین دوز گندہ نالیوں میں کام کرنے والے مزدور۔ لیکن تمام صورتوں میں ان سب اشخاص کو خارج کر دیا گیا ہے۔ جو انتظامی یا اہلکارانہ حیثیت سے کام کرتے ہیں اور جن کی ماہانہ آمدنی ۳۰۰ روپے سے زائد ہے۔ اس طرح ملک کے ۷ ملین سے زائد مزدور اس ایکٹ کے تحت آتے ہیں۔

قابل ادائی معاوضے کی مقدار کا انحصار مجروح یا متوفی مزدور کی اوسط ماہانہ آمدنی پر ہوتا ہے۔ اگر مجروح مزدور کی ماہانہ اجرت ۱۰ روپے سے زائد نہ ہو تو اس کو قابل ادائی معاوضے کی مقدار موت واقع ہونے کی صورت میں ۵۰۰ روپے ہے۔ مستقل معذوری کی حالت

میں ۷۰۰ روپے یکشت اور عارضی معذوری کی صورت میں ماہانہ اجرت کا نصف معاوضہ دیا جاتا ہے۔ ایسے مزدور کی حد تک جس کی ماہانہ اجرت ۵۰ روپے اور ۶۰ روپے ماہانہ کے درمیان ہو معاوضے کی رقم علی الترتیب ۱۸۰۰ روپے، ۲۵۲۰ روپے، اور ۱۵ روپے ہے۔ ۲۰۰ روپے ماہانہ سے زاید کمانے والے مزدوروں کے معاوضے کی انتہائی مقدار مذکورہ ترتیب کے لحاظ سے ۴۰۰۰ روپے، ۵۶۰۰ روپے اور ۳۰ روپے ہے۔ بچوں کی حد تک موت اور دوامی معذوری کے لیے معاوضوں کی مقدار یکساں شرح سے ۲۰۰ روپے اور ۱۲۰۰ روپے علی الترتیب رکھی گئی ہے۔ اور عارضی معذوری کے لیے اس کی ماہانہ اجرت کا نصف۔ لیکن ۷ دن کے اس انتظاری وقفے کے لیے جو ضرر پہنچنے کے دوسرے دن سے شروع ہوتا ہے کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا جاتا۔ جن متعلقین کو معاوضے کی رقم واجب الادا ہوتی ہے ان میں سب سے اول وہ لوگ ہیں جو حقیقت میں متوسل ہیں مثلاً بیوی یا نابالغ بچہ، اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو متوسل ہوں یا نہ ہوں مثلاً شوہر اور (بیوہ ماں کو مستثنیٰ کر کے) سرپرست وغیرہ۔ اسباب کا انتظام کیا گیا ہے کہ مہلک حادثات کی حد تک متعلقین کے اغراض کی بہتر طریق پر حفاظت کی جائے اور ایسے حادثات کو ایکٹ کی رو سے صوبہ وار حکومتوں کے مقرر کردہ کمشنروں کے علم میں یقینی طور پر لایا جائے۔

اس قانون کے عام انصرام اور نزاعوں کے تصفیے کو انھی کمشنروں کے سپرد کیا گیا ہے اور انھیں اس بارے میں وسیع اختیارات دیے گئے ہیں۔ طریق کار بہت سادہ اور اپیلوں کے مواقع پر قید و بند عاید کی گئی ہے۔ اس قسم کے آئین کی کامیابی کے لیے یہ ضروری ہے کہ مزدوروں کو جو گزند پہنچے اس کی عاجلانہ تحقیقات قابل طبیبوں کے

انڈین ایر بک ۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۸ء صفحہ ۴۳۲ ـ

ذریعے سے کرائی جائے جو ضرر کا اندازہ کر سکیں اور اسی کے ساتھ حکومت کو چاہیے کہ بے لاگ اور غیر جانب دار جج مقرر کرے تا کہ مزدور وہ امداد پا سکے جس کا وہ مستحق ہے۔ ہندوستان میں صنعتی مزدور نقل مقام کا خوگر ہے، اور اس بات سے ناواقف ہے کہ اس ایکٹ کی رو سے اس کو مالی امداد مل سکتی ہے، نیز ایسے قابل اشخاص کا بھی یہاں کال ہے جو مزدوروں کے معاوضے کے مقدمے کو مناسب طور پر پیش کر سکیں۔ غرض انھی چند اسباب کی بنا پر ہندوستان میں اس قسم کے آئین کے عملدرآمد میں مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔

۳۷۔ عمرانی بیمہ۔ بیماری، بیکاری، اور پیرانہ سالی سے صنعتی مزدور کو جو تکلیف اور مصیبت اٹھانی پڑتی ہے اس کے مقابلے میں مزدور کا تحفظ کرنے کے لیے مدت ہوئی کہ ریاستہائے متحدۂ امریکا اور جرمنی جیسے صنعتی ملکوں میں عمرانی بیمے کے اصول کو تسلیم کیا جا چکا ہے۔ بین قومی عمالی انجمنوں نے بھی ان سب معاملات کی نسبت وقتاً فوقتاً میثاق طے کر کے عمرانی بیمے کے بارے میں اپنی تائید کا میلان ظاہر کیا ہے۔ ان میں سے بعض مسایل حکومت ہند اور دوسری متعلقہ جماعتوں کی توجہ حاصل کرتے رہے ہیں، خاص کر جب سے کہ دسویں بین قومی مزدور کانفرنس (۱۹۲۷ء) نے صنعتی مزدوروں اور گھریلو ملازموں کی بیماری کے بیمے کے بارے میں میثاق طے کیا ہے۔ اگست ۱۹۳۷ء میں بمبئی کی کانگریسی وزارت نے صنعتی مزدور کی خوش حالی کے بارے میں اپنا پروگرام شایع کیا، چنانچہ اس زمانے سے ان مسایل پر ہندوستان میں بہت خاص توجہ دی جا رہی ہے۔ وزارت نے عمرانی بیمے کی ایک جامع اسکیم کو جاری کرنے کے متعلق ایک خاکا تیار کیا ہے، یہ مسئلہ بھی اس کے زیر غور ہے کہ آیا بیماری کے زمانے میں تنخواہ کے ساتھ رخصت دینے کے متعلق قانون وضع کرنا قابل عمل ہوگا یا نہیں، اور اس نے یہ امید

بھی ظاہر کی ہے کہ یہ اسکیم بیماری کے بیمے کے لیے راستہ تیار کرے گی۔

ہندوستان میں عمرانی بیمے کو رائج اور نافذ کرنے کے راستے میں بہت سی انتظامی، مالی اور دوسری قسم کی مشکلات حایل ہیں۔ موجودہ زمانے میں عمرانی بیمے کی مختلف شکلوں کے لیے ضروری اعدادی اور حسابی مواد سراسر مفقود ہے۔ زرعی مزدوروں کی حد تک دقت یہ ہے کہ ان کی حیثیت مستقل مزدوروں کی نہیں ہے۔ اور پھر یہ کہ دیہات میں قابل طبیبوں کا کال ہے۔ بمبئی پریسیڈنسی کے صنعتی مزدوروں کی حد تک حکومت بمبئی محکمۂ عمال کے انتظامی عملے سے فراہمی مواد کا کام لے رہی ہے اور حکومت ایک معقول مدت کے اندر اس قابل ہو جائے گی کہ ہندوستانی حالات کے مطابق صحیح اور قابل عمل تجاویز کی تیاری کے بارے میں مناسب کارروائی اختیار کرے۔ گو یہ بہت ہی مستحسن اقدام ہے، لیکن دو امور ذہن میں رکھنا ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس امر کا کماحقہ، لحاظ کرنا چاہئے کہ صنعت پر جو زاید بار پڑے گا اس کو وہ اس نازک موقع پر برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے یا نہیں، اور دوسرے یہ کہ عمرانی بیمے کی تجاویز کی بنیاد مثل دوسرے ملکوں کے امدادی طریق پر رکھنی چاہئے، یعنی آجروں، مزدوروں اور حکومت، سبھوں کو چاہیے کہ حتی المقدور اس بوجھ کو اٹھائیں۔ یہ بھی مناسب ہے کہ ان معاملات میں جو بھی کارروائی اختیار کی جائے وہ کل ہند اساس پر کی جائے تاکہ ایسا نہ ہو کہ چند صوبوں کی صنعتوں پر بار ڈالا جائے اور دوسرے صوبوں یا دیسی ریاستوں کی صنعتیں بچی رہ جائیں۔

۳۸۔ ہندوستان میں صنعتی نزاعوں کی تاریخ۔

ہندوستان میں گزشتہ صدی کے آٹھویں عشرے میں چند ہڑتالیں ہوئیں۔ لیکن ۱۹۱۷ء سے قبل تک اس قسم کے واقعات بحیثیت مجموعی بہت ہی شاذ رونما ہوئے۔ سچ پوچھو تو مزدوروں نے ہڑتال کی

قدر و قیمت ایک حربے کی حیثیت سے عام طور پر موجودہ صدی کے ابتدائی سالوں میں پہچانی - چنانچہ بمبئی میں برقی کے رواج اور طویل گھنٹوں تک کام لینے کے باعث ۱۹۰۵ء میں کئی ہڑتالیں ہوئیں۔ لیکن جنگ عظیم کے زمانے میں ہڑتال کو صنعتی جنگ و جدل کا ایک معمولی ہتیار خیال کیا جانے لگا - جنگ عظیم نے معاشی انقلاب اور بے اطمینانی کا عام احساس پیدا کر دیا تھا - قیمتوں کے اضافے کے باعث مصارف زندگی بڑھ گئے تھے اور جماعتی خودداری کی پیدا ہو گئی تھی - ان سب چیزوں کے نتیجے کے طور پر ۱۹۱۷ء سے کئی ہڑتالیں ہوئیں - ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۰ء میں صورت حال خاص طور پر نازک ہو گئی - چنانچہ بمبئی میں ایک بہت بڑی ہڑتال ہوئی جس سے گرنیوں کے ڈیڑھ لاکھ مزدور متاثر ہوئے - ان ہڑتالوں کے معاون اسباب میں سے حسب ذیل قابل ذکر ہیں - کام کے طویل گھنٹے، خراب انتظام رہائش، جسمانی ضرر کا معاوضہ دینے کی تدابیر کا حال حال تک فقدان، فور مینوں کا مزدوروں کے ساتھ برا سلوک، ہڑتالیوں کی ایک جماعت کی دوسری جماعت کے ساتھ ہمدردی وغیرہ - ہم بعد کی کسی فصل میں یہ بتلائیں گے کہ اس زمانے میں مزدور سبھا کی تحریک نے کس طرح جنم لیا۔

۳۹ - صنعتی نزاعوں کا کثرت سے رونما ہونا۔ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۲ء کے دوران میں صنعتی نزاعوں کی تعداد ہر سال گھٹتی بڑھتی رہی - چنانچہ ۱۹۲۱ء میں ۳۹۶ ہڑتالیں ہوئیں تو ۱۹۳۲ء میں ۱۱۸ - سب سے زیادہ نزاعیں سوتی اور اونی کپڑے کی گرنیوں میں ہوئیں اور وہ بھی سب کی سب بمبئی پریسیڈنسی میں - کچھ سال ادھر تک خاص شہر بمبئی میں اشتمالی خیالات کا اثر مزدوروں کی بے اطمینانی کو بڑھانے والا ایک طاقت ور عامل رہا ہے۔

جنگ عظیم نے نہ صرف قیمتوں میں بلکہ معاشی تکالیف اور

مصیبت میں بھی اضافہ کردیا تھا جس کے باعث ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۱ء کی ہڑتال نے نہایت نازک صورت اختیار کرلی تھی۔ جب حالات رفتہ رفتہ اپنی معمولی رفتار پر لوٹ آئے اور مصارفِ زندگی میں کمی ہوگئی تو ایسا معلوم ہوا کہ ہڑتال کا جوش تھوڑی مدت کے لیے ٹھنڈا پڑ گیا۔ جنگِ عظیم کے زمانے میں اجرت کی جو اعلیٰ شرحیں دی گئی تھیں وہ جنگ ختم ہوجانے کے بعد بھی اسی سطح پر کچھ زمانے تک برقرار رہیں، اگرچہ قیمتیں گر گئی تھیں۔ اس طرح مزدور کی اجرت صحیحہ میں کچھ اضافہ ہوا۔ لیکن بعد میں چل کر جو تجارتی کساد بازاری رونما ہوئی اس کی بناء پر آجروں میں یہ تحریک پیدا ہوئی کہ جنگ کے زمانے میں جو بڑھوتری دی جارہی تھی اس کو موقوف کردیا جائے یا اجرت کو گھٹا دیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بمبئی اور احمدآباد جیسے صنعتی مرکزوں میں ہڑتالوں کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا۔ ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء کے دوسال ایک حد تک امن و سکون سے گزرے۔ لیکن ۱۹۲۸ء میں پھر بے اطمینانی رونما ہوئی اور تمام ملک میں کئی بڑی ہڑتالیں ہوئیں۔ چنانچہ مالکان گرنی کی طرف سے کام کی عقلی تنظیم (Rational ization) اور کام کے نئے طریقے رائج کرنے کی کوشش کے نتیجے کے طور پر اکتوبر ۱۹۲۸ء میں بمبئی کی سوتی پارچہ بافی کی گرنیوں میں بہت بڑی ہڑتال ہوئی۔ اس قسم کی ہڑتالوں کے بہت شدت کے ساتھ اور ان میں سے بعض کے غیر معمولی طور پر طویل مدت تک جاری رہنے کو اوس کے اشتمالی اثرات اور وہاں کی پوشیدہ مالی امداد کی طرف منسوب کیا گیا۔ ستمبر ۱۹۲۸ء میں مجلس قانون ساز نے مسودۂ قانون حفاظت عامہ کو مسترد کردیا اور بعد میں صدرنشین نے اس کو دوبارہ پیش کرنے کی اجازت نہیں دی لیکن حکومت نے اس مسودۂ قانون کو حق بجانب ٹھیرایا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ ان مخرب اخلاق اثرات کی اپج کو روکنے کے لیے یہ ایک ضروری آئینی تدبیر تھی۔ مالکان گرنی اور ہڑتال کمیٹی کے درمیان جو

راضی نامہ ہوا اس کی رو سے یہ طے پایا کہ باہمی اختلافات کو ایک تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے پیش کیا جائے جو حکومت بمبئی کے تین نامزدہ ارکان پر مشتمل ہو۔ اس کمیٹی نے جو فاسیٹ کمیٹی کے نام سے موسوم ہے مارچ ۱۹۲۹ء میں اپنی رپورٹ پیش کی، لیکن اس کی کوششوں کو صنعت پارچہ بافی میں امن قائم کرنے میں بظاہر کامیابی نہیں ہوئی۔ چنانچہ جمشید پور کے کارخانۂ آہن و فولاد کی طویل ہڑتال اور کئی ریلوں کی شدید ہڑتالیں یا ہڑتال کی دھمکیاں ۱۹۲۸ء کے سال کی نمایاں خصوصیت تھی۔ اسی زمانے میں ای آئی اور ایس آئی ریلوں کی ہڑتالوں میں تشدد کا عنصر بھی شریک رہا۔

۱۹۲۹ء کے دوران میں سب سے اہم صنعتی جھگڑا بمبئی کی سوتی کپڑوں کی گرنیوں میں اس وجہ سے ہوا کہ واڈیا کی گرنیوں سے ۶ ہزار مزدور خارج کر دیے گئے تھے۔ قانون نزاعات تجارتی کی رو سے جو اس سال کے اوائل میں منظور ہوا تھا ایک عدالت تحقیقات کلکتہ ہائی کورٹ کے جج مسٹر پیرسن کی صدارت میں ۳ جولائی ۱۹۲۹ء کو مقرر کی گئی۔ تحقیقات کے بعد رپورٹ میں سارا الزام گرنی کامگار سبھا پر لگایا گیا کہ جھگڑے کو طول دینے کا باعث یہ تھا کہ سبھا نے فاسیٹ کمیٹی کی سفارشوں کے بارے میں غیر مصالحانہ روش اختیار کی تھی۔ عدالت نے نہ صرف فاسیٹ کمیٹی کے حسب سفارش "مصالحت کے قواعد" کے نفاذ کی پر زور سفارش کی جن کی بموجب صنعتی نزاعات پر ان کی ابتدائی حالت میں غور کر کے تصفیہ کرنے کی غرض سے فریقین کے نمایندوں پر مشتمل ایک مصالحتی کمیٹی تجویز کی گئی تھی[1] بلکہ یہ بھی سفارش کی کہ ثالثی کی ایک مشترکہ پنچایت قائم کی جائے جس کے پاس ہڑتال کی صورت میں جھگڑے بغرض تصفیہ پیش کئے جاسکیں "کارکردگی کی تجویز کے ردّ عمل

[1] دیکھو فاسیٹ کمیٹی کی رپورٹ ضمیمہ (۱۱)۔

لانے سے جو صورت حال رونما ہوئی تھی اس سے نمٹ لینے کی غرض سے "بے کاری کے بیمے" کا طریقہ جاری کرنے کی سفارش کی گئی۔ عدالت تحقیقات نے بتلایا کہ قانون صنعتی نزاعات ۱۹۲۹ء کی روسے جو مجلس مصالحت قائم ہو سکتی تھی اس کو اس وقت تک کامیابی نہیں ہو سکتی جب تک کہ متعلقہ فریقین نیک نیتی کے ساتھ اس سے تعاون نہ کریں (رپورٹ فقرہ ۸۷) کساد بازاری نے خاص کر صنعت پارچہ بافی کی حد تک بدترین صورت ۱۹۳۳ء میں اختیار کی۔ کرنیوں نے یہ کوشش کی کہ کفایت کی ایک ضروری تدبیر کے طور پر اجرتوں میں کمی کی جائے۔ اس کی وجہ سے چند ہڑتالیں ہوئیں لیکن مزدوران کا سلسلہ ایک مختصر مدت سے زیادہ کے لیے جاری نہ رکھ سکے۔ ۱۹۳۴ء میں ایک مزدور کمیٹی کل ہند اساس پر بنائی گئی تاکہ تمام ملک میں سوتی کپڑے کی کرنیوں میں عام ہڑتال کرائی جائے۔ کمیٹی کو تین مہینے سے زائد تک شولاپور کی سوتی کپڑے کی کل کرنیوں میں اور دو مہینے سے زائد تک بمبئی کی کرنیوں میں ہڑتال کرانے میں کامیابی ہوئی۔ حکومت بمبئی نے بمبئی پریسیڈنسی میں اجرتوں کی تخفیف کے مسئلے کی محکمہ واری تحقیقات کا انتظام کیا۔ اس تحقیقات کی رپورٹ جون ۱۹۳۷ء میں شایع ہوئی اور تقریباً اسی زمانے میں بمبئی کی کرنیوں کی ہڑتال موقوف کر دی گئی۔ اس تحقیقات کا اہم ترین نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت بمبئی نے قانون مصالحت نزاعات تجارتی منظور کیا جس پر آیندہ فصل (۱۴) میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس قانون کے منظور ہونے کے بعد تقریباً تین سال تک شہر بمبئی کی سوتی کپڑے کی کرنیوں میں کسی قسم کا جھگڑا نہیں ہوا۔ لیکن کچھ مہینے ادھر سے بمبئی، احمد آباد، کانپور، مدراس اور ہندوستان کے دوسرے صنعتی مرکزوں میں مزدوروں کے ہنگامے پھر رونما ہوئے ہیں جس کا باعث ایک حد تک تو یہ ہے کہ مزدور اعلیٰ اجرت کا اور تخفیف شدہ اجرت کی بحالی کا مطالبہ اس بنیاد پر کر رہے ہیں کہ صنعت و کاروبار میں بحالی رونما ہو چکی ہے اور کسی حد تک

یہ بھی وجہ ہے کہ عمالی حلقوں میں اشتمالی ریشہ دوانی اپنا کام کر رہی ہے۔ آج کی تاریخ (اپریل ۱۹۳۰ء تک) میں عمالی تحقیقاتی کمیٹیاں بمبئی، ناگپور اور کانپور میں کام کر رہی ہیں۔

۴۰۔ صنعتی نزاعات کی روک تھام۔ یہ بحث کرنے سے بیشتر کہ جھگڑوں کے رونما ہونے کے بعد ان کے تصفیے کا کیا انتظام کرنا چاہیئے، ان کی قبل از قبل روک تھام کے طریقوں کے متعلق چند الفاظ کہدینا مناسب ہوگا۔ سب سے اول تو یہ ضروری ہے کہ آجروں اور اجیروں دونوں کی باقاعدہ تنظیم ہونی چاہیئے ہندوستان میں آجر بہت کافی حد تک منظم ہیں لیکن مزدوروں کی حالت اس کے برعکس ہے۔ باقاعدہ مزدور سبھاؤں کا قائم کرنا، ان تدریجی تدابیر میں پہلا قدم ہے جو ہڑتالوں اور دربندیوں کی روک تھام اور موقوفی کے لیے ضروری ہیں۔ اگر دونوں فریق باضابطہ تنظیم کرلیں اور اپنے اپنے طبقوں کی ترجمانی پوری قوت و قابلیت کے ساتھ کریں تو اس کی بدولت اچانک ہڑتالوں اور دربندی پر روک قائم ہوجائے گی اور ہڑتال کے اعلان سے قبل ہی شکوہ شکایت پیش کی جاسکے گی نہ کہ بعد۔ چنانچہ ہندوستان کی صورتِ حال اس وقت یہی ہے کہ ہڑتال کے بعد شکوہ شکایت کی جاتی ہے۔ احمد آباد میں صنعت پارچہ بافی کے جھگڑے چکانے کے لیے ایک مستقل "مجلس ثالثی" قائم کی گئی ہے جس کے ممتاز ارکان میں سے ایک گاندھی جی بھی ہیں۔ بمبئی کی صنعتی جھگڑوں کی کمیٹی ۱۹۲۲ء نے یہ سفارش کی تھی کہ انگلستان کے وھٹ لے کمیٹیوں کے نمونے پر یہاں "کارخانے کی کمیٹیاں" قایم کرنی چاہییں۔ ان کمیٹیوں میں آجر و مزدور دونوں طبقوں کے نمایندے موجود ہوں گے جو کام کے شرائط مقرر کرنے اور ان کی پابندی کرانے کے ذمہ دار ہوں گے۔ ایسی کمیٹیوں سے یہ فائدہ بھی ہے کہ وہ آجروں اور اجیروں کے درمیان ذاتی تعلقات کے فقدان کے اثر کو زائل کر دیتی ہیں اور اس کے علاوہ خود مزدوروں کے لیے

سبق آموز ہوتی ہیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ٹاٹا جیسے بعض روشن خیال آجروں نے اور حکومت نے بھی آجر کی حیثیت سے اس قسم کی کمیٹیاں قائم کردی ہیں۔ مزدور کمیشن بھی یہ سفارش کرتا ہے کہ کارخانے کی کمیٹیاں قائم کرنی چاہییں، اس لیے کہ وہ ہندوستان کے صنعتی نظام میں مفید کام انجام دے سکتی ہیں (دیکھو مزدور کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۳۴۲ تا ۳۴۳)۔

اب جھگڑوں کو چکانے کے لیے ثالثی اور مصالحت کے طریقوں کی بحث شروع کی جا سکتی ہے۔ زمانہ بعد از جنگ میں جو بیشمار جھگڑے ہوئے ان سے یہ بات صاف طور پر ثابت ہو گئی کہ ان کی تحقیقات اور تصفیے کے لیے کوئی مناسب انتظام ضروری تھا۔ حکومت مدراس پہلی صوبہ وار حکومت ہے جس نے اس سمت میں تدابیر اختیار کیں۔ چنانچہ اگر کوئی جھگڑا پیدا ہو تو اس سے نمٹنے کے لیے تحقیقاتی عدالتیں قایم کی گئیں۔ حکومت بنگال نے ۱۹۲۱ء میں اور حکومت بمبئی نے ۱۹۲۲ء میں جو کمیٹیاں قایم کیں انھوں نے نہایت مفید ابتدائی کام کیا اور جھگڑوں کے روکنے اور تصفیہ کرنے کے انتظام کے متعلق کئی تفصیلی سفارشیں پیش کیں۔ حکومت ہند نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اس مسئلے پر کل ہند اساس پر قانون وضع کرنا چاہیے۔ لیکن قانون وضع کرنا قبل از وقت تھا، اس لیے کہ پہلے مزدور سبھا کا قانون منظور ہونا ضروری تھا۔ مزدور سبھا کے متعلق مسودۂ قانون ۱۹۲۶ء میں قانون بنا اور اس کے بعد کے سال میں نافذ ہوا۔ صنعتی نزاعات کا قانون ۱۲ اپریل ۱۹۲۹ء کو منظور ہوا اور ۸ مئی ۱۹۲۹ء سے نافذ ہوا۔ یہ ابتداءً صرف پانچ سال تک نافذ رہنے والا تھا لیکن ایک ترمیمی قانون کے ذریعے سے اس کو ۱۹۳۴ء میں دوامی حیثیت دیدی گئی۔

اہم صنعتی جھگڑوں کے متعلق قانون سازی۔

۱۔ صنعتی جھگڑوں کا قانون بابت ۱۹۲۹ء۔ یہ قانون انگلستان کے وضع کردہ قانون کی تقلید میں بنایا گیا ہے اور اس میں جبری ثالثی کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا ہے۔

انگلستان کے مثل یہاں بھی رائے عامہ ہی کو جھگڑے چکانے میں فیصلہ کن اور قطعی عامل خیال کیا جاتا ہے اور اس کی تہ میں جو خیال مضمر ہے وہ یہ ہے کہ ایک غیر طرف دار عدالت کو تصفیہ طلب امور کی واضح طور پر ترتیب اور بحث میں مدد دی جائے تاکہ رائے عامہ پوری واقفیت حاصل کرے اس قانون کی رو سے تحقیقاتی عدالتوں اور مجالس مصالحت کے قایم کرنے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔

(ا) تحقیقات کی نوعیت:۔ صوبہ وار حکومت یا گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو اس صورت میں جبکہ آجر گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے ماتحت کسی محکمے کا یا ریلوے کمپنی کا صدر ہو' اس بات کا مجاز گردانا گیا ہے کہ جب جھگڑا کرنے والے دونوں فریق انفرادی یا مشترکہ طور پر درخواست کریں بشرطیکہ درخواست دینے والے ہر فریق کی اکثریت کے نمایندے ہوں تو جھگڑے کو روکنے یا اس کا تصفیہ کرنے کے لیے ایک عدالت تحقیقات یا مجلس مصالحت حسب ضرورت قائم کی جائے[1]۔

(ب) عدالت تحقیقات کی ترکیب:۔ عدالت تحقیقات کا صدر نشین ایک غیر طرف دار شخص ہوگا اور اس میں دوسرے ایسے غیر طرفدار اشخاص کو شامل کیا جائے گا جن کو تقرر کرنے والی مقتدر جماعت مناسب خیال کرے یا صرف ایک ہی غیر طرف دار بے لاگ شخص کو مقرر کیا جائے گا۔

(ج) مجلس مصالحت:۔ مجلس مصالحت ایک جداگانہ طریقے پر بنائی جائے گی۔ چنانچہ اس میں ایک صدر نشین اور دو یا چار دوسرے ارکان ہوں گے۔ جن کو مامور کرنے والی با اقتدار جماعت مناسب خیال کرے

[1] مزدور کمیشن یہ سفارش کرتا ہے کہ ایکٹ کے تحت خصوصی عدالتوں کا تقرر کرنے کے بجائے اس امر کو جانچنا چاہیے کہ آیا دوامی عدالتوں کا قایم کرنا ممکن و مناسب ہے یا نہیں۔ (دیکھو

یا صرف ایک ہی غیر طرف دار شخص کو مقرر کیا جائے گا۔ صدر نشین ایک غیر طرف دار شخص ہوگا اور دوسرے ارکان یا تو غیر طرف دار ہوں گے یا ایسے اشخاص ہوں گے جو جھگڑا کرنے والی جماعتوں کی نمایندگی کریں گے اور متعلقہ جماعتوں کی سفارش پر مساوی تعداد میں مقرر کیے جائیں گے۔

(د) طریق کار۔ اس مجلس کا کام یہ ہوگا کہ جھگڑے کی حقیقت کا پتا چلانے کے بعد اس کو چکانے کی کوشش کرے۔ فریقین کو معقول اور دوستانہ تصفیے کی ترغیب دینے کے لیے جو طریقے مناسب ہوں اختیار کرے اور ان کو اس کے لیے مناسب وقت و مہلت دے۔ جھگڑا چکانے میں ناکامی ہو تو مجلس یہ طریقہ اختیار کرے گی کہ مقرر کرنے والی با اقتدار جماعت کے پاس مکمل رپورٹ پیش کرے گی جس میں ان تمام کارروائیوں اور تدابیر کا ذکر کیا جائے گا جو بورڈ کو جھگڑا چکانے کے لیے اختیار کرنی پڑیں اور اسی کے ساتھ نتیجۂ تحقیقات اور سفارشیں بھی روانہ کرے گی۔ مجلس کا تقرر کرنے والی مقتدر جماعت آخری یا درمیانی رپورٹ کے وصول ہونے کے بعد اس کو حتی الامکان جلد شایع کرے گی۔

(ھ) افادۂ عامہ کے محکموں میں ہڑتالیں۔ قانون کے دوسرے حصے میں جو شرایط افادۂ عامہ کی خدمات کے متعلق ہیں وہ کل قانون کے اہم ترین شرایط میں سے ہیں۔ افادۂ عامہ کی خدمت کے مفہوم میں حسب ذیل خدمات شامل ہیں:-

(۱) ریلوے سروس جس کے متعلق گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل قانون کے اغراض کے لیے اس قسم کا اعلان کریں؛

(۲) ڈاک، ٹیلی گراف یا ٹیلیفون سروس؛

(۳) عوام کو روشنی یا پانی کی بہم رسانی کرنے والا کوئی کاروبار اور

(۴) صحت عامہ وصفائی کی نگرانی کا کوئی نظام۔ ان خدمات

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ مزدور کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۳۳۶)۔

میں ماہانہ اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں کے لیے جو معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہڑتال کریں اور آجر کو اس کی اطلاع ایک مہینے قبل یا کم از کم ۱۴ دن پہلے نہ دیں، خاص سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔ اگر آجر جو اس قسم کے افادۂ عامہ کی خدمت انجام دے رہے ہوں اپنے تحت کے مزدوروں کو اسی قسم کا نوٹس دیئے بغیر ان کی دربندی کریں تو ان کو بھی سزا دی جاسکتی ہے بلکہ ان پر زیادہ بھاری جرمانہ کیا جاسکتا ہے مذکورۂ بالا جرم کی اعانت کرنے والوں کے ساتھ مرمہ قانون جرایم کے تحت کارروائی کی جائے گی۔

(۹) خلاف قانون ہڑتال۔ خلاف قانون ہڑتالوں کے بارے میں برطانوی صنعتی نزاعات کے قانون (۱۹۲۷ء) کے نمونے پر خاص قواعد بنائے گئے ہیں۔ ایسی ہڑتال یا دربندی خلاف قانون خیال کی جاسکتی ہے جس کا مقصد (۱) ایسی صنعت یا تجارت جس میں کہ جھگڑا کرنیوالے فریق کام کر رہے ہوں جھگڑا بڑھانے کے سوا کچھ اور ہو (۲) قوم پر سخت عام اور طویل تکلیف و مصیبت عائد کرنا اور اس طرح حکومت کو مجبور کرنا ہو کہ وہ کوئی خاص کارروائی کرے یا خاص کارروائی کرنے سے باز رہے۔ اگر اس قسم کی ہڑتالوں کی براہ راست تائید میں رقمیں جمع یا صرف کی جائیں تو وہ خلاف قانون ہیں۔ کسی صنعت کے تجارتی جھگڑے کی تعریف "اس صنعت کے آجروں اور اجیروں کے درمیان تنہا اس صنعت کے کام کے متعلق جھگڑا" کی گئی ہے۔ اور اس جھگڑے کی ہمدردی میں دوسری صنعت میں ہڑتال ہو تو اس کو خلاف قانون قرار دیا گیا ہے۔ اگر مزدور سبھا کے رکن مزدور اس قسم کی خلاف قانون ہڑتالوں میں شریک ہونے سے انکار کریں تو ایسی صورت میں ان کی رکنیت کے حقوق کو محفوظ کیا گیا ہے۔

اس ایکٹ میں پہلے سے یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ آجروں اور اجیروں کے ادارے موجود ہیں؛ اور جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے ایکٹ کا مقصد

ان اداروں کو مدد و فروغ دینا ہے تاکہ وہ مزدوروں کی اچانک ہڑتال اور آجروں کی من مانی دربندی کو روکیں اور ہڑتال کا اعلان ہونے سے قبل ہی نہ کہ بعد میں شکوہ شکایت کو پیش کرنے میں مدد دیں۔ اس قانون میں ایک اہم فرد گزاشت یہ ہے کہ تخویف یا دھمکی کی روک تھام کے لیے کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ ہڑتال کے زمانے میں لوگوں کو کام سے روکنے یا پکٹنگ کا قانون میں کہیں ذکر اس لیے نہیں ہے کہ ہر قسم کی پکٹنگ قابل اعتراض نہیں ہے اور جب وہ تخویف کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو معمولی قانون کے تحت قابل سزا ہوتی ہے۔ ایکٹ کی رو سے ہمدردانہ ہڑتالیں ضمنی طور پر خلاف قانون ہیں۔ عمالی قائدوں نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کی بدولت حکومت کو یہ اقتدار حاصل ہوتا ہے کہ کسی بڑی ہڑتال کو خلاف قانون قرار دیدے۔ لیکن یہ بھی اندیشہ ہوسکتا ہے کہ کوئی عام ہڑتال قوم کے لیے ایک حقیقی دھمکی بن جائے جس طرح کہ انگلستان کی تہری (Triple) ہڑتال نے صورت اختیار کی تھی۔ اس لحاظ سے قانون کے دوسرے قاعدوں کی طرح اس خاص قاعدے پر محض اس بنا پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ اس کا لازمی طور پر غلط استعمال کیا جائے گا۔ اس سے زیادہ صحیح اعتراض یہ ہوگا کہ یہ بتلایا جائے کہ اب تک ہندوستان میں جتنی ہڑتالیں ہوئی ہیں چونکہ وہ بر طانیۂ عظمیٰ کی عام ہڑتال کے مشابہ نہیں ہیں، اس لیے موجودہ حالات میں اس قسم کا قاعدہ بنانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ اس بات پر بھی بہت زور سے توجہ دلائی گئی ہے کہ خلاف قانون ہڑتالوں کے متعلق دفعات، مزدوروں کے اساسی انسانی حقوق میں مداخلت کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ دفعات ہندوستان میں مزدور سبھائی تحریک کا گلا گھونٹ دیں گی جو ابھی تک زمانہ طفولیت میں ہے اور مزدوروں کے دل میں بدگمانی پیدا کریں گی۔ بعض نکتہ چیں یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اس ایکٹ کے وہ اجزا غیر ضروری ہیں جن کا تعلق افادۂ عامہ کی خدمات اور خلاف قانون

ہڑتالوں سے ہے۔ اگر آب رسانی، روشنی اور صحت وصفائی جیسی عمرانی تحفظ کی خدمات میں اچانک ہڑتال کی جائے تو وہ یوں بھی ضابطۂ تعزیرات کے تحت قابل سزا ہے۔ اگر معمولی افادۂ عامّہ کی خدمات (جو حفاظت عامّہ کی خدمات سے الگ اور ممیز ہیں) مثلاً ڈاک، ٹیلی گراف یا ٹیلیفون یا ریلوے سروس میں ہڑتال کی جائے تو اس میں سختی برتنے کی ضرورت نہیں ہے۔[1]

(۲) مزدور کمیشن نے یہ سفارش کی کہ ہر صوبائی حکومت کو چاہیئے کہ مصالحت کرانے کی غرض سے ایک یا کئی افسر مقرر کرے۔ چنانچہ ناظم مزدوران مدراس، ناظم صنعت وحرفت پنجاب، ناظم اعداد وشمار وناظم مزدوران برما اور ناظم ونائبان ناظم صوبہ متوسط کو افسران مصالحت کی حیثیت سے اختیارات دیدیے گئے ہیں بمبئی میں قانون تصفیۂ نزاعات صنعتی" ۱۹۳۴ء میں منظور ہوا جس کی رو سے ناظم مزدوران کو بحیثیت عہدہ صدر افسر مصالحت مقرر کیا گیا اور ایک افسر مزدوران، افسران مصالحت و مددگاران افسر مصالحت کا بھی تقرر کیا گیا۔ افسران مصالحت کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ افسر مزدوران کی طرف سے یا بمبئی کی صنعت پارچہ بافی میں جھگڑا کرنے والے فریقین میں سے کسی فریق کی طرف سے رپورٹ یا درخواست وصول ہونے پر یا اپنی معلومات اور ذاتی واقفیت کی بنا پر فریقین کو اپنے روبرو طلب

[1] قانون صنعتی نزاعات بابت ۱۹۲۹ء میں توسیع و ترمیم کرنے کی غرض سے حال ہی میں یعنی اپریل ۱۹۳۸ء میں ایک مسودۂ قانون کو مرکزی مجلس قانون ساز نے منظور کر لیا ہے۔ اس نئے قانون میں خلاف قانون ہڑتال کی تعریف بدل دی گئی ہے؛ افادۂ عامّہ کی خدمات کی فہرست میں (اندرون ملک کی کوئی دخانی کشتی اور ٹریموے کی ہر وہ سروس جس کے متعلق حکومت کا اعلان ہو، ہر وہ کاروبار جو عوام کو قوت کی بہم رسانی کرے شامل کی گئی ہے" اور یہ انتظام کیا گیا ہے کہ وہ صوبائی حکومتیں جو افسران مصالحت مقرر کرنا چاہیں کچھ اختیارات کے ساتھ افسروں کا تقرر کر سکتی ہیں۔

کریں اور ان میں مصالحت کرائیں۔ ستمبر ۱۹۳۴ء میں مزدوروں کے حقوق کی حفاظت کی غرض سے ایک افسر مزدوران کا تقرر کیا گیا۔ انجمن مالکان گرنی نے بھی اپنے طور پر ایک افسر مزدوران مقرر کیا ہے تاکہ وہ سرکاری افسر مزدوران اور صدر افسر مصالحت سے گفت و شنید کے دوران میں گرنی کے منتظموں کی نمایندگی کرے۔ اس ایکٹ کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا کہ وہ بمبئی شہر کی پارچہ بافی کی گرنیوں میں صنعتی جھگڑوں کو مٹانے میں عملاً کامیاب رہا۔ لیکن کم و بیش تین سال کے صنعتی امن کے بعد جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ۱۹۳۷ء کے وسط سے بمبئی اور پارچہ بافی کے دوسرے مرکزوں میں، مزدوروں کے جھگڑے از سر نو شدت کے ساتھ رونما ہوئے۔ حکومت بمبئی نے حال ہی میں یعنی مارچ ۱۹۳۸ء میں ایک مسودۂ قانون گشت کرایا جس کا مقصد یہ تھا کہ ہڑتالوں اور دربندیوں کو روکا جائے اور فیکٹریوں اور دوسرے صنعتی کارخانوں میں جھگڑوں کو باہمی سمجھوتے سے طے کرایا جائے۔ یہ مسودۂ قانون جبری مصالحت کے اصول پر مبنی ہے، اس کے برخلاف مرکزی حکومت کا ایکٹ مصالحت کو اختیاری رکھتا ہے۔

۲۴۔ ہندوستان میں مزدور سبھا کی تحریک

مدراس میں مسٹر بی، پی، واڈیا کی قیادت میں مزدور سبھائیں ۱۹۱۸ء ہی میں منظم ہو چکی تھیں۔ مزدور سبھا کی تحریک مدراس میں شروع ہونے کے بعد بمبئی میں بھی جا پہنچی۔ ۱۹۱۹ء میں صنعتی بے چینی کا آغاز ہوا اور اس کے نتیجے کے طور پر کئی عمالی انجمنیں وجود میں آئیں۔ لیکن یہ نوعیت کے لحاظ سے عارضی تھیں۔ چنانچہ ادھر ان کا فوری مقصد مثلاً اجرت کا اضافہ وغیرہ پورا ہوا اور ادھر وہ ٹوٹ گئیں۔ یہ انجمنیں دراصل ہڑتالی کمیٹیوں سے کچھ زیادہ نہ تھیں، جو چند عہدہ داروں اور غالباً چند چندہ دینے والے ارکان پر مشتمل تھیں[۱]، لیکن اس صورت حال میں بتدریج

[۱] دیکھو ہرسٹ کی کتاب محولہ بالا ص ۱۰۱۔

اصلاح و ترقی ہوتی گئی۔ اور مزدور سبھاؤں کی نمایاں ترقی خاص کر ۱۹۲۱ء میں یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس تحریک نے مستقل حیثیت اختیار کر لی ہے۔ لیکن ۱۹۲۳ء میں مزدوروں کی معاشی حالت کی اصلاح و ترقی کی بدولت اور اس کے نتیجے کے طور پر ہڑتالوں کی تعداد کم ہو جانے کے باعث یہ تحریک کچھ کم ہو گئی۔ تحریک کی ابتدائی حالتوں میں مزدوروں میں عملاً اتحاد پیدا کرنے والا تنہا رشتہ حقیقی معاشی تکلیف و مصیبت تھی۔ چنانچہ جب حالات زیادہ موافق ہو گئے تو یہ رشتہ کمزور ہو گیا۔ کچھ سال ادھر سے تحریک میں بحالی کے نمایاں آثار نمودار ہوئے ہیں اور امید ہے کہ مزدور سبھا ایکٹ بابت ۱۹۲۶ء کی بدولت وہ مزید تقویت حاصل کرے گی۔ علاوہ ازیں ہندوستان میں مزدور سبھا کی تحریک کو ابتدا ہی سے آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس[1] جیسے ایک کل ہند نظام سے مدد ملتی رہی جو ۱۹۲۰ء سے اپنے سالانہ اجلاس منعقد کر رہی ہے[2]۔ جب بین قومی دفتر مزدوران وجود میں آیا تو ہندوستان میں بھی فوراً ایک مرکزی مزدور سبھا کا نظام قائم ہو گیا۔ چنانچہ جنیوا کی سالانہ مزدور کانفرنسوں میں اس کے نمایندوں کی شرکت سے ہندوستانی تحریک کا براہ راست اتصال مغربی دنیا کی تحریک سے قائم ہو گیا ہے۔

---

[1] All India Trade Union Congress

[2] ۱۹۲۹ء میں ٹریڈ یونین کانگریس کی صفوں میں سخت پھوٹ واقع ہوئی۔ اور تین نمایاں گروہ وجود میں آئے یعنی ایک اشتمالی، دوسرے احراری اور تیسرے باقی لوگ۔ ۱۹۳۵ء میں دو بڑے نظامات یعنی آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس اور نیشنل ٹریڈس یونین فیڈریشن (۱۹۳۳ء) کی ایک مشترکہ کمیٹی اس غرض سے بنائی گئی کہ اتحاد کو فروغ دیا جائے اور مطمح نظر و طریق کار کے بارے میں اساسی باہمی اختلافات کو دور کیا جائے۔ یہ اتحاد بعد میں چلکر پیدا ہو گیا۔ چنانچہ ہندوستانی مزدوروں کے لیے یہ ایک فال نیک ہے کہ ہندوستانی مزدور سبھا تحریک ایک متحدہ اساس پر اپریل ۱۹۳۷ء میں قائم ہو گئی جبکہ ان دونوں نظامات کا مشترکہ اجلاس ہوا۔ دوسری کئی اور کل ہند انجمنیں بھی ہیں

کل ہند مزدور سبھا کانگریس All India Irade Unions Congress نے دسمبر ۱۹۲۹ء میں یہ دعویٰ کیا کہ وہ ۱۰۹ر۴۳۶ منظم مزدوروں کی نمایندہ تھی۔[۱] ٹریڈ یونین ایکٹ بابت ۱۹۲۶ء کے تحت[۲] رجسٹری شدہ مزدور سبھاؤں کی کل تعداد ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ۲۱۳ تھی۔ اس سال سبھاؤں نے اعداد و شمار کی جو رپورٹ پیش کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۰۳ سبھاؤں میں ارکان کی تعداد (۲۸۴٬۹۱۸) اور مجموعی آمدنی ۲۹ء۵ لاکھ روپے تھی۔ مزدور عورتوں کا فیصد تناسب بہت ہی ادنیٰ یعنی کل ارکان کے مقابلے میں ۲ فی صد سے بھی کم تھا۔ لیکن یہ سب سبھائیں استحکام اور قوت میں مساوی نہیں ہیں۔ ان میں سے قریب قریب نصف ایسی ہیں جن کا تعلق سرکاری ملازموں سے ہے یا ایسے اشخاص سے ہے جو سرکاری ملازمت سے متعلق ہیں مزدور سبھاؤں کا طریق ریلوے اور ڈاک خانے کے مزدوروں میں مقابلتہً زیادہ کامیاب رہا اور پارچہ بافی اور کان کنی کی بڑی اور منظم صنعتوں میں بحیثیت مجموعی کمزور رہے۔ لیکن ہندوستان میں سب سے بڑی اور سب سے زیادہ منظم مزدور سبھا احمد آباد کے پارچہ باف مزدوروں کی سبھا ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ :۔ مثلاً آل انڈیا پوسٹل اینڈ آر' ایم' ایس ایسوسی ایشن نیشنل فیڈریشن آف ٹکسٹائل لیبران انڈیا وغیرہ۔

[۱] مسز بربل اور ہاس ورتھ برطانوی مزدور سبھا کی طرف سے ہندوستان کو بھیجے ہوئے دو مندوبوں نے یہ اندازہ قایم کیا کہ ہندوستان کی مختلف صنعتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی منظم جماعتوں میں کل ۱۰۹ر۶۶۲ر۲۵ اشخاص تھے' جن میں ۱۰۷ر۶۲ر۶ و ۲۱ زرعی مزدور شامل تھے لیکن گھریلو ملازم' ڈاک خانے کے اور دوسرے سرکاری ملازم خارج تھے۔ دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "ہندوستان میں مزدوروں کے حالات" Report on Labour Coaditions in India (British Trade Union Delegation 1928)

[۲] دیکھو فصل ۴۴۔

۳۴۔ ہندوستان میں اس تحریک کی ترقی کی راہ میں مشکلات

مزدور سبھا کی تحریک کے راستے میں پہلی بڑی مشکل یہ ہے کہ مزدور پیشہ آبادی اپنے پیشے پر قائم نہیں رہتی بلکہ نقل پذیر رہتی ہے (دیکھو فصل ۱۳)۔ دوسرے یہ کہ بمبئی اور کلکتے جیسے صنعتی مرکزوں کے مزدوروں کی جماعت مختلف خصلت اور وضع کے اشخاص کا مجموعہ ہوتی ہے جو ایک دوسرے سے مختلف زبانیں بولتے ہیں اور اس لحاظ سے ان میں آپس میں کوئی گہرا میل ملاپ نہیں ہوتا۔ جہاں باہر سے آنے والے مزدوروں کا تناسب کم ہوتا ہے جیسا کہ احمد آباد میں ہے تو مزدور سبھائیں دوسرے مقاموں کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہوتی ہیں۔ تیسرے یہ کہ اکثر مزدور باقاعدہ طور پر چندہ دینے اور سبھا کے نظم و ضبط کی پابندی کو ناپسند کرتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ کارخانے کے مزدوروں کی بہت ہی قلیل تعداد رکنیت قبول کرتی ہے۔ چونکہ عموماً مزدور بہت ہی مفلس ہوتے ہیں اس لیے تھوڑا سا چندہ بھی ان کے لیے بارگراں ہوتا ہے۔ چوتھے یہ کہ اکثر مزدور بے لکھے پڑھے ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنی جماعت میں سے اپنے نئے قائد تلاش کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہندوستان کی مزدور سبھا کی تحریک کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی قیادت زیادہ تر ایسے اشخاص کرتے ہیں جو متوسط طبقے، وکالت کے پیشے اور دوسری جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی لیے یہ لوگ سیاسی اور معاشی امور کے درمیان بعض اوقات فرق و امتیاز قائم نہ کر سکے علاوہ ازیں ان اشخاص کی توجہ کئی سبھاؤں میں منقسم ہوتی ہے اور فنی باریکیوں کے متعلق ان کی معلومات بہت ہی کم ہوتی ہیں۔ ایک اور دقت یہ ہے کہ حقیقی جمہوری نصب العین مفقود ہے جس کی موجودگی مزدور سبھا کے نظام کو موثر بنانے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ یہ سب چیزیں انگلستان کی مزدور سبھاؤں کی صورت حال سے نمایاں تضاد رکھتی ہیں جہاں سبھاؤں کے عہدہ دار بلا استثنا مزدوروں ہی میں سے ہوتے ہیں۔ گو ہندوستان کی عمالی تحریک میں سیاست دانوں

اور وکیلوں کی مداخلت کی برائی کرنا آسان ہے، لیکن اس سلسلے میں متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ قائدوں نے جو ابتدائی کام کیا ہے اس کی قدر و قیمت تسلیم کرنا ضروری ہے[1]۔ آخر میں یہ کہ مزدور سبھا کے طریق کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ موجودہ معاشری نظام کو کم از کم عارضی طور پر تسلیم کر لیا جائے تاکہ مزدوروں کے لیے زیادہ سے زیادہ رعایتیں حاصل کی جا سکیں[2]۔ اگر مزدوروں کے قائد اور رہنما معاشرے کے موجودہ اصلداری نظام کا شیرازہ بکھیرنے کی کوشش کریں تو ان کا اثر لازمی طور پر مزدور سبھا تحریک کو کمزور کر دے گا۔ اکثر اہل الرائے مبصرین کا خیال ہے کہ یہی چیز بمبئی میں تحریک کی کمزوری کے اہم اسباب میں سے ایک ہے۔ اس کے برعکس احمد آباد جیسے مرکز میں تحریک نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ قانون حکومت ہند بابت ۱۹۳۵ء کی رو سے صوبہ داری مجالس قانون ساز میں خصوصی حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعے سے جو رجسٹری شدہ سبھاؤں پر مشتمل ہیں مزدوروں کو نمائندگی دی گئی ہے۔ امید ہے کہ اس کی وجہ سے نہ صرف نئی سبھاؤں کی رجسٹری کو فروغ ہوگا بلکہ حساب کے کھاتوں اور ارکان کے رجسٹروں کا رکھنا یقینی ہو جائے گا۔

---

[1] "جس طرح برطانوی مزدور سبھا کے نظام کو اپنے ابتدائی دور میں رابرٹ اوین، فرانسیس پلیس اور بعد میں کنگسلے، لڈلو اور فریڈرک ہیریسن جیسے اشخاص پر انحصار کرنا پڑا، اسی طرح ہندوستانی تحریک کو بھی اپنے ابتدائی دور میں اپنی انجمن کے صدر نشینوں اور معتمدوں کی حد تک وکیلوں کے طبقے پر قریب قریب بالکل انحصار کرنا پڑ رہا ہے۔" دیکھو برطانوی مزدور سبھا کانگریس کے وفد کی رپورٹ ہندوستان میں مزدوروں کے حالات کے بارے میں شائع شدہ ۱۹۲۸ء۔ اس موضوع پر بعض دلچسپ تنقیدات کے لیے دیکھو مزدور کمیشن کی رپورٹ ۳۲۴ تا ۳۲۵ و ۳۲۸ تا ۳۲۹۔

[2] دیکھو احمد مختار کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان کی مزدور سبھاؤں کا طریق اور

۴۴۔ مزدور سبھا قانون بابت ۱۹۲۶ء۔

۱۹۲۰ء کے اختتام پر مدراس ہائیکورٹ نے ایک فیصلہ صادر کیا جس کی رو سے یہ حکم دیا گیا تھا کہ مزدور سبھاؤں کے عہدہ دار یا منتظم، مزدوروں کو اپنے معاہدے اُجروں سے توڑنے اور اجرت بڑھانے کی غرض سے ہڑتال کرنے کے لیے ابھارنے سے باز رہیں۔ چنانچہ اس فیصلے کی بنا پر ہندوستانی مزدور سبھاؤں کی رجسٹری اور حفاظت کے لیے آئین و قوانین وضع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مسٹر جوشی عمالی رکن پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس مسئلے کو مجلس قانون ساز میں مارچ ۱۹۲۱ء میں پیش کیا، اور اس سلسلے میں انھوں نے جو لگاتار کوششیں کیں ان کا پھل، آخر کار اس وقت ملا جبکہ مزدور سبھا ایکٹ جو ۱۹۲۶ء میں منظور ہوا تھا ۱ار جون ۱۹۲۷ء کو نافذ ہوا۔ اس ایکٹ میں ہندوستانی مزدور سبھاؤں کی قانونی حیثیت کی تعریف قطعی اور واضح الفاظ میں کردی گئی ہے۔ مزدور سبھاؤں کی رجسٹری اختیاری ہے، لیکن ایکٹ کی رو سے بعض کارآمد خصوصی حقوق رجسٹر شدہ سبھاؤں کو دیے گئے ہیں جن سے سبھائیں محروم رہتی ہیں جو رجسٹری کرنا نہیں چاہتیں رجسٹری شدہ مزدور سبھا کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ اپنے نام اور اس مقصد کی صراحت کرے جس کے لیے وہ قایم کی گئی ہے۔ یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ارکان کی ایک فہرست تیار کرے، اپنے سرمایے کی باضابطہ سالانہ تنقیح کا انتظام کرے، اور اس سرمایے کو صرف ان اغراض کے لیے خرچ کرے جو ارکان کے مفاد کے لیے ضروری ہوں۔ یہ بھی لازمی کیا گیا ہے کہ رجسٹری شدہ سبھا کے کم از کم نصف عہدہ دار متعلقہ صنعت میں کام کرنے والوں میں سے ہوں۔ ان بندشوں کے مقابلے میں ایکٹ مزدور سبھاؤں کے ان سب عہدہ داروں کو تعذیری بازپرس سے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ مزدوروں کے جھگڑے Trade Union and Labour Disputes in India

محفوظ کر دیتا ہے جو سبھا کے تمام جائز مقاصد کو ترقی دینے کے لیے کام کر رہے ہوں۔ ان پر سازش کے الزام میں مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا۔ ایکٹ میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ (۱) کسی دیوانی عدالت میں رجسٹری شدہ سبھا کے کسی عہدہ دار یا رکن کے خلاف کسی ایسے فعل کے بارے میں جو اس کی طرف سے پیشے کے جھگڑے کو بڑھانے یا جھگڑا پیدا کرنے کی غرض سے کیا گیا ہو، محض اس بنا پر مقدمہ دائر نہیں کیا جا سکتا کہ اس قسم کے فعل کی بنا پر بعض دوسرے اشخاص کو کام کا معاہدہ توڑنے کی ترغیب ہو یا اس کا یہ فعل کسی دوسرے شخص کے پیشے یا کاروبار یا ملازمت میں یا اس کے اپنے اصل یا اپنی محنت کو اپنے حسب مرضی لگانے کے حق میں خلل انداز ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا اس ایکٹ میں یہ بھی قرار دیا گیا ہے کہ کسی رجسٹری شدہ مزدور سبھا کے خلاف کسی دیوانی عدالت میں کوئی مقدمہ محض اس بنا پر دائر نہیں کیا جا سکتا کہ کسی شخص نے سبھا کی طرف سے پیشے کے جھگڑے کو بڑھانے کے لیے یا اس کی نیت سے کوئی فعل کیا، تاوقتیکہ یہ ثابت نہ کیا جائے کہ ایسے شخص نے مزدور سبھا کی عاملہ کے علم کے بغیر یا عاملہ کی صریح ہدایتوں کے خلاف ایسا کیا۔ رجسٹری شدہ مزدور سبھا اپنے ارکان کے سول اور سیاسی اغراض کو ترقی دینے کے لیے سرمایہ قایم کر سکتی ہے لیکن اس کے لیے جو چندے لیے جائیں ان کے بارے میں اس کا سختی کے ساتھ خیال رکھا جائے کہ وہ خوشی اور رضامندی سے دیے جا رہے ہیں۔

صنعتی رفاہ[1]

۵۴۔ رفاہی کام کی نوعیت فلاح اور بہبود کے کام کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ ایک تعریف میں اس کو آجروں کی اس خود اختیاری

[1] اس موضوع کے بارے میں دیکھو مزدور کمیشن کی رپورٹ باب ۱۴۔

جدوجہد تک محدود رکھا گیا ہے جو وہ اپنے کارخانوں میں مزدوروں سے کام لینے کے بہترین حالات مہیا کرنے کے سلسلے میں کریں۔ دوسری تعریف میں جو عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے، بہبود و رفاہ کے حدود میں "ان تمام مساعی کو شامل کر لیا گیا ہے جن کا مقصد مزدور کی صحت و سلامتی، عام خوش حالی اور صنعتی کارکردگی کی اصلاح و ترقی ہے[۵۷]"

اس قسم کی کوششیں آجروں یا حکومت کی طرف سے یا خود مزدوروں یا سماجی ایجنسیوں کی طرف سے کی جاسکتی ہیں۔ ایک نقطۂ نظر سے ان کوششوں کو رفاہی تصور کیا جاسکتا ہے جن کا مقصد صنعتی آبادی کی خوشحالی کو بڑھانا ہے۔ اس سے تنگ تر اور خالص افادی نقطۂ نظر سے نام نہاد "رفاہی کام" کو "کارکردگی بڑھانے کا کام" خیال کیا جاسکتا ہے جس کا اچھا اثر براہ راست مزدوروں کی مادی آسودہ حالی اور کارکردگی پر ہوتا ہے اور اس طرح وہ ہندوستانی مزدور کی نقل پذیری کے رجحان کو زائل کرنے میں مدد دیتا ہے۔ رفاہی کام کے متعلق یہ بھی خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہ بے لکھے پڑھے مزدوروں کی جماعت میں ذمہ داری اور وقار کے احساس کو ترقی دینے کا بھی ذریعہ ہے تاکہ وہ اچھے شہری بنیں۔

۶۴۔ رفاہی کام کی تقسیم۔ رفاہی کام دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ ایک تو فیکٹری کے اندر رفاہی کام اور دوسرے فیکٹری کے باہر فلاح و بہبود کا کام فیکٹری کے اندر کام کے حالات کی اصلاح و ترقی کے رفاہی کام کی حد تک حکومت نے بڑی حد تک اور آجروں نے معمولی حد تک جو کچھ کیا ہے اس کا حال اس باب کے اوائل میں بیان ہوچکا ہے۔

گزشتہ زمانے میں رفاہی کام، خاص کر فرصت کے اوقات کے بہتر مصرف کی طرف آجروں نے بہت ہی کم توجہ کی، اور جو کچھ بھی کوششیں

۵۷۔ دیکھو صدارتی خطبہ "کل ہند صنعتی فلاح کانفرنس" منعقدہ ۱۹۲۲ء۔

کی گئیں ان کا تعلق زیادہ تر طبی امداد اور بچوں کی ابتدائی تعلیم کی سہولتیں مہیا کرنے اور رہائش کے انتظام سے تھا۔ لیکن موجودہ زمانے میں شدید صنعتی بے چینی کے باعث اس کام کی طرف روز افزوں توجہ کی جارہی ہے۔

"سوشل سروس لیگ" بمبئی نے ۱۹۱۸ء میں دو روشن خیال مل ایجنٹوں یعنی کریم بھائی ابراہیم اینڈ سنز اور ٹاٹا اینڈ سنز کو اس بات پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوئی کہ وہ ان کی کمپنیوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے لیے دو رفاہی اداروں کا انتظام لیگ کے سپرد کریں۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں ایک کل ہند صنعتی بہبود کانفرنس بمبئی میں منعقد ہوئی۔ اس میں کئی دلچسپ مسائل پر بحث ہوئی جو فلاح اور رفاہ کے کاموں سے متعلق تھے اور کانفرنس اس قابل ہوئی کہ مختلف ایجنسیوں کے کام میں جو مختلف مرکزوں میں قائم تھیں ربط پیدا کرے۔ کل ہند مزدور سبھا کانگریس (آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس) کچھ زمانے سے مزدوروں کی بہبود کے کام کی طرف توجہ کر رہی ہے۔ مئی سنہ ۱۹۲۶ء میں حکومت ہند نے تمام صوبہ دار حکومتوں کو ہدایت کی کہ وہ اس امر کی بابت مکمل معلومات فراہم کریں کہ اس زمانے کے لیے جبکہ مزدور حقیقت میں کام نہیں کرتے ان کے رہنے سہنے کے حالات کی اصلاح و درستی کے لیے کیا مساعی اور تدابیر اختیار کی گئیں۔ یہ تحقیق اس سفارش کے جواب میں شروع کی گئی جو بین قومی عمالی کانفرنس کے ساتویں اجلاس میں منظور ہوئی تھی۔ اور جس میں مختلف متعلقہ حکومتوں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ بین قومی عمالی کانفرنس کے دفتر میں اس امر کی بابت جدید ترین اطلاعیں روانہ کریں کہ مزدور اپنے فرصت کے اوقات کو کس طرح صرف کرتے ہیں۔

بمبئی کے بعض روشن خیال آجروں نے جو دلچسپی ظاہر کی ہے[۱۵]۔ اس کے

۱۵۔ بمبئی پریسیڈنسی میں کپڑے کے کارخانوں کے آجروں نے جو رفاہی کام کیا ہے اس کی تفصیلات کے لیے دیکھو "بمبئی پریسیڈنسی کے کپڑے کے کارخانوں میں اجرت، کام کے گھنٹوں اور شرائط کے

علاوہ دوسرے صنعتی مرکزوں کے چند آجروں نے بھی اپنے مزدوروں کی فلاح وبہبود کے لیے مدراس، ناگ پور، جمشید پور اور کانپور میں رفاہی تجویزوں کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ چنانچہ مدراس میں بکنگ ہم اینڈ کرناٹک ملز گزشتہ کئی سال سے جو رفاہی کام انجام دے رہی ہے اس کا سب کو اچھی طرح علم ہے۔ ناگپور میں ایمپرس ملز نے اپنے مزدوروں کی خوشحالی کی نگرانی کا کام وائی، ایم سی، اے کو تفویض کر دیا ہے۔ ٹاٹا اسٹیل اینڈ آئرن کمپنی واقع جمشید پور کی مجلس نظما یہ دعویٰ کرتی ہے کہ ''مزدوروں کے بارے میں کمپنی کی جو روش ابتدائی زمانے سے رہی ہے اور اس نے ہندوستان میں مزدوروں کے لیے رہائش، تعلیم، فلاح، آبرسانی، بدررو، شفاخانوں اور دوسری خدمات عامہ کا انتظام جس بے نظیر طریقے اور پیمانے پر کیا ہے اس کو ہر خیال کے قومی کارکنوں نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے''۔ کانپور میں برٹش انڈیا کارپوریشن نے اپنے مزدوروں کے رہنے سہنے کے لیے بستیاں بسائی ہیں اور ان کی نگرانی کے لیے ایک مہتمم مقرر کیا ہے۔ اسی طرح بعض بلدیوں مثلاً بلدیہ بمبئی نے اور محکمۂ بندرگاہ اور افادۂ عامہ کے محکموں خاص کر ریلوں نے اپنے مزدوروں کی خوش حالی کو ترقی دینے کے لیے بعض تدابیر اختیار کی ہیں۔ آخر میں یہ کہ بعض خدمت خلق کے ادارے مثلاً بمبئی میں سوشل سروس لیگ جس کو سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی نے قائم کیا، نیز مدراس اور بنگال میں اسی قسم کی لیگیں، ان کے علاوہ سیوا سادن سوسائٹی، بمبئی پریسیڈنسی کی نسوانی کونسل، انجمن بہبود اطفال و زچگان، وائی، ایم، سی، اے، نیچ طبقوں کی تبلیغی انجمن، دوسری تبلیغی انجمنیں، یہ سب بہبود کے کام کی تنظیم میں نہ صرف آجروں کو مدد دے کر بلکہ اپنی آزادانہ کوششوں کے ذریعے سے بھی مفید خدمت کر رہی ہیں۔

لہ بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ :۔ متعلق رپورٹ جو عام اجرت شماری کے سلسلے میں ۱۹۲۳ء میں شائع کی گئی۔

۴۷۔ رفاہی کام کی مدیں۔

(۱) تعلیم۔ صنعتی مزدوروں کی تعلیم کی حد تک جیسی کچھ غیر اطمینان بخش حالت پائی جاتی ہے اس کا حال پہلے بیان ہو چکا ہے[1]۔ ٹاٹا جیسے بعض روشن خیال آجروں نے بچوں اور بڑے مزدوروں کی تعلیم کا انتظام دن اور رات کے مدرسوں میں کیا ہے۔ بمبئی کی سوشل سروس لیگ اور وائی، ایم، سی، اے نے بھی کارخانوں کے مزدوروں کے لیے نہ صرف مدرسے کھول کر بلکہ دار المطالعے اور کتب خانے قائم کرکے بہت کچھ کیا ہے۔

(۲) طبی امداد۔ ہندوستان کے بڑے اور اہم کارخانوں میں طبی سہولتیں عام طور پر مہیا کی گئی ہیں، اگرچہ عورت مزدوروں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے شاذ ہی خاص طور پر لیڈی ڈاکٹر مقرر کی گئی ہیں۔

(۳) زچگی کے لیے امداد۔ مغربی ممالک نے کارخانے میں کام کرنیوالی عورتوں اور ان کے بچوں کے لیے امداد بغرض زچگی کا طریقہ رائج کیا ہے، اور ولادت سے کچھ مدت قبل اور کچھ مدت بعد حاملہ عورتوں سے کام لینے کی ممانعت کردی گئی ہے۔ یہ واقعہ کہ ہندوستان میں کارخانے کی ملازم عورتیں گھر کے کام کاج میں بھی مصروف رہتی ہیں، یورپ کی طرح یہاں بھی انتظامات کرنے کو اور بھی زیادہ اہم اور ضروری بنا دیتا ہے۔ واشنگٹن کی بین قومی عمالی کانفرنس (۱۹۱۹ء) نے بچے کی ولادت سے قبل اور بعد عورت سے کام لینے کے متعلق ایک قاعدہ منظور کیا۔ اگرچہ یہ توقع نہیں کی گئی تھی کہ ہندوستان اس قاعدے کی توثیق فوراً ہی کرے گا، پھر بھی حکومت ہند سے درخواست کی گئی کہ وہ اس مسئلے پر جس میں امداد بغرض زچگی شامل تھی غور و تحقیق کرے اور آیندہ کانفرنس میں اس کی ایک رپورٹ پیش کرے۔ پیش کردہ رپورٹ کے سلسلے میں جو تحقیقات کی گئی اس سے یہ ظاہر ہوا کہ اس قسم کی تجاویز کو آجروں کی بہت ہی تھوڑی تعداد نے

[1] دیکھو باب فصل (۱۳) و (۱۴)۔

عملی جامہ پہنایا تھا۔ لیکن صوبہ واری حکومتوں نے رپورٹ پیش کرتے ہوئے اپنی آمادگی اس بات پر ظاہر کی کہ اس قسم کی مزید رضاکارانہ تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ ہمت افزائی کریں گی۔ مجلس قانون ساز کے مشورے کی بنا پر حکومت ہند نے جون ۱۹۲۴ء میں جو مزید تحقیقات کی اس سے یہ معلوم ہوا کہ بنگال کی تین بڑی منظم صنعتوں یعنی سن، چائے اور کوئلے کی حد تک امداد بغرض زچگی کی گئی تجاویز پر عمل کیا جا رہا تھا۔ آسام کے چائے کے باغات، آسام ریلویز اینڈ ٹریڈنگ کمپنی بہار اور اڑیسہ کی کانوں اور بمبئی، مدراس اور صوبۂ متوسط کے کارخانوں میں اس قسم کی کئی اسکیموں پر عمل کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ ان اسکیموں کی رو سے کئی رعایتیں دی گئی ہیں، مثلاً حمل کے زمانے میں مختلف میعاد کی چھٹی، دودھ اور دودھ پلانے کی بوتلوں کی مفت بہم رسانی وغیرہ۔ ان سب رعایتوں کے علاوہ بمبئی میں زچگی خانوں کی تعداد روز افزوں ہے۔ حکومت بمبئی نے مزدور عورتوں کو زچگی کی امداد دینے کے سلسلے میں ایک لیڈی ڈاکٹر ڈاکٹر بارنس کا تقرر کیا تھا۔

ڈاکٹر بارنس اپنی آخری رپورٹ میں زچگی کی اس امداد کی دلچسپ تفصیلات بیان کرتی ہیں جو ٹاٹا کی گرنیوں میں دی جا رہی ہیں۔ مثلاً ایک ایسی مزدور عورت کو جس کی ملازمت کی مدت کم از کم گیارہ مہینے رہی ہو زچگی سے پیشتر ایک ماہ اور زچگی کے بعد ایک ماہ گویا کل دو ماہ کی اجرت مفت بطور الاؤنس دی جاتی ہے۔ لیکن شرط یہ لگائی گئی ہے کہ ایسی عورت کسی لیڈی ڈاکٹر سے ۸ ماہ کے حمل کی تکمیل کا صداقت نامہ حاصل کر کے پیش کرے اور اس بات کا وعدہ کرے کہ کسی دوسری جگہ اجرت پر کام نہ کرے گی۔

۱۹۲۴ء میں مسٹر جوشی نے مجلس قانون ساز میں ستمبر کی میقات میں ایک مسودۂ قانون پیش کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ فیکٹریوں، کانوں اور ایسے علاقوں میں جن پر قانون مزدوران وتوطن خارجی بابت ۱۹۰۱ء کا اطلاق ہوتا تھا، حاملہ عورتوں کی زچگی سے کچھ مدت پیشتر اور کچھ مدت بعد

مزدور عورتوں کے کام سے متعلق ضابطہ مقرر کیا جائے اور زچگی کے لیے امداد دینے کا انتظام کیا جائے۔ اس مسودۂ قانون میں یہ تحریک کی گئی کہ مقامی حکومتیں زچگی سے پیشتر اور بعد چھ ہفتے کی چھٹی مع الاونس دلائیں۔ اور زچگی کی امداد کے لیے اجروں کے چندے سے سرمایہ قائم کیا جائے۔ مجلس قانون ساز نے اس مسودۂ قانون کو اس بنیاد پر مسترد کر دیا کہ وہ ہندوستان کی رائے عامہ سے بہت زیادہ آگے بڑھا ہوا تھا لیکن بمبئی کے لیے اس سے ملتا جلتا قانون "قانون امداد برائے زچگی بابت ۱۹۲۹ء" کے نام سے منظور ہوا۔ اس کا اطلاق اولاً بمبئی پریسیڈنسی کے منتخب شہروں پر ہوا ہے، لیکن حکومت چاہے تو اس کو دوسرے مقاموں پر بھی نافذ کر سکتی ہے۔ ۱۹۳۴ء میں اس قانون کی ترمیم ہوئی اور اس کی رو سے ولادت کے دن کے بعد سے چار ہفتے تک عورت سے کام لینے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ نیز اس دوران میں کسی کارخانے میں اس کا کام کرنا خلاف قانون قرار دیا گیا ہے۔ حاملہ عورت زچگی سے چار ہفتے پیشتر اور زچگی کے فوراً بعد چار ہفتے کی غیر حاضری کی حقیقی مدت کے لیے ۸ آنے یومیہ کے حساب سے امداد بغرض زچگی کا مطالبہ اپنے اجر سے کر سکتی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ جس تاریخ عورت یہ اطلاع دے کہ آیندہ ایک ماہ میں اس کی زچگی ہونے والی ہے اور وہ کام پر نہ آسکے گی اس کے کم از کم ۹ ماہ پیشتر سے وہ کام کرتی رہی ہو۔ اگر یہ حاملہ عورت منظورہ رخصت کے زمانے میں کسی کارخانے میں کام کرے تو اس کا زچگی کی امداد حاصل کرنے کا حق سوخت ہو جائے گا۔ صوبۂ متوسط میں بھی امداد بغرض زچگی کا ایک قانون جس کا اطلاق محدود طریقے پر کیا گیا تھا سنہ ۱۹۳۰ء میں منظور ہوا۔ مدراس کے "قانون امداد برائے زچگی بابت ۱۹۳۵ء" میں بمبئی کے ایکٹ کی پوری تقلید کی گئی ہے۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اس قسم کا قانون کل ہند اساس پر وضع کیا جائے تاکہ تمام صوبوں کے اجر یکساں طور پر اس قانون کی عائد کردہ ذمہ داریوں کے پابند ہو سکیں۔

(۴) تفریح۔ تفریح کی قدر و قیمت پر خاص زور دینے کی بہ مشکل ضرورت ہے۔ ہر اس چیز کا خیر مقدم کرنا چاہیئے جو مزدور کی زندگی کو خوشگوار بنائے۔ اس لیے کہ مزدور کی زندگی زیادہ تر خشک ہوتی ہے۔ یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ مزدور کو اس امر کی ترغیب دی جائے کہ اپنے فرصت کے گھنٹوں کو کام میں لائے تاکہ شراب خانے اور سٹا گھر سے دور رہے۔ شہروں میں صنعتی کام کی دلچسپیوں میں عام طور پر اضافہ کیا جائے تاکہ مزدوروں کو صنعتی مرکزوں میں مستقل طور پر سکونت اختیار کرنے کی ترغیب ہو۔ اس سلسلے میں سوشل سروس لیگ بمبئی کا کام جس نے پریل میں ایک "ادارہ مزدوران" قائم کیا ہے اور ٹاٹا اور مدراس کی بکنگھم اینڈ کرناٹک ملز جیسے بعض روشن خیال آجروں کی کوششیں خاص توجہ کی مستحق ہیں جنھوں نے گھر کے اندر اور باہر کھیلوں، تماشوں اور تفریح کا انتظام کیا ہے مثلاً سینما کے تماشے، فانوسی پکچر، رقص و سرود کی محفلیں، ناٹک کے کھیل، کشتی کے مقابلے وغیرہ۔

(۵) انتظام رہائش۔ اس مسئلے پر باب کے ابتدائی حصے میں مفصل بحث کی جاچکی ہے۔

(۶) امداد باہمی کی انجمنیں۔ صنعتی مزدوروں کے لیے انجمن ہائے امداد باہمی نے جو کام کیا ہے اس کا ذکر امداد باہمی کی تحریک کے متعلق باب میں کیا جاچکا ہے[1]۔

(۷) غلے اور کپڑے کی دکانیں۔ بعض کرنیوں میں دکانیں کھولی جاتی ہیں جہاں ارزاں غلہ اور کپڑا مزدوروں کے ہاتھ فروخت کیا جاتا ہے۔ اس طرح ان کو بنیوں کی لوٹ کھسوٹ سے بچایا جاتا ہے اگرچہ بنیوں کے ادھار فروخت کرنے کی وجہ سے مزدوروں کو ان ہی سے مال خریدنے کی زیادہ ترغیب ہوتی ہے۔ اس میلان کے رونما ہونے کی وجہ

[1] دیکھو جلد اول باب ۱۰۔

یہ ہے کہ بعض گرنی کی دکانیں بگڑ کر "بیہودہ دکانیں[1]" بن گئی ہیں۔ اس مسئلے کا واحد اطمینان بخش حل یہ ہے کہ امداد باہمی کے ذخائر قایم کئے جائیں۔

(۸) چائے خانے اور کھانے پینے کی دکانیں۔ چائے خانوں اور کھانے پینے کی دکانوں کا بہت ہی کم تعداد میں انتظام کیا گیا ہے' اور اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ عمدہ صحت بخش چائے اور پکا ہوا کھانا حاصل کرنے کے لیے مناسب سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ انگستان میں جنگ عظیم کے زمانے کی پیدائش کے دباؤ کے تحت جس قسم اور وضع کی کھانے کی دکانوں نے معقول ترقی کی دیسی دکانیں بہت ہی کم تعداد میں کھولی گئی ہیں۔ ذات پات کی مشکلات اور عورتوں کی قدامت پرستی بہت بڑی رکاوٹیں ہیں۔ لیکن ان مشکلات کو دور کرنے کے لیے ہر ممکنہ کوشش کرنی چاہئے تاکہ مزدور کی صحت و تندرستی کی اصلاح ہو اور وہ سیندھی شراب کے استعمال سے پرہیز کریں۔

قوانین کارخانہ جات کی سب سے حالیہ ترمیم میں جس کا ذکر فصل ۲۳ میں آچکا ہے' مزدور کی بہبود کے متعلق کئی شرائط ہیں' مثلاً آرام لینے کے لیے سائبانوں کا کافی انتظام' پچاس عورتوں سے زائد تعداد سے کام لینے والے کارخانوں میں ان عورتوں کے بچوں کے استعمال کے لیے خاص کمروں کا مختص کردینا' اور امداد اولین کے سازو سامان کی بہم رسانی وغیرہ۔ ہندوستان میں صرف اسی بات کی ضرورت نہیں ہے کہ مزدوروں کے لیے بہبود کا جو کام ہو رہا ہے اس کو بہت وسیع کیا جائے بلکہ خود مزدور ایسے کام کی تنظیم اور نگرانی زیادہ سے زیادہ کریں۔ موجودہ زمانے میں یہ کام زیادہ تر آجروں کی نگرانی میں ہو رہا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مزدور سبھاؤں اور ان کی جدوجہد سے متصادم ہو رہا ہے۔ ممتاز مزدوروں کا انتخاب اس غرض

[1] Truck Shops

سے کرنا کہ وہ رفاہی کمیٹیوں میں شریک ہو کر کام کریں، یہ کسی طرح ایسا انتظام نہیں ہے جس کو اطمینان بخش کہا جا سکے، اس لیے کہ اس کی وجہ سے یہ مزدور مزدوروں کی عام جماعت سے الگ ہو جاتے ہیں[۱]۔

---

[۱] دیکھو برطانوی مزدور سبھا کانگریس کے وفد (سنہ ۱۹۲۸ء) کی رپورٹ "ہندوستان میں مزدوروں کے حالات" ص ۱۲۔

چوتھا باب

قومی مقسوم

۱۔ ہندوستان میں قومی آمدنی کے متعلق اندازے دادابھائی نوروجی کا اندازہ

ہندوستان کی قومی آمدنی کے متعلق مختلف اوقات میں مختلف اندازے کیئے گئے ہیں۔ اور اگرچہ ان میں عظیم اختلافات ہیں، پھر بھی ان میں جو سب سے رجائی ہیں ان میں بھی اس واقعے پر زور دیا گیا ہے کہ اس ملک کے باشندوں کا افلاس اس درجے بڑھا ہوا ہے کہ اس کی کوئی نظیر موجودہ زمانے میں مغربی یورپ کے ملکوں میں نہیں ملتی۔

اب ہم ہندوستان کی قومی آمدنی کے متعلق مختلف مصنفوں نے اب تک جو اندازے قائم کیئے ہیں ان کے نتائج کو مختصر طور پر بیان کریں گے۔ چنانچہ مسٹر دادابھائی نوروجی نے اس سمت میں پہلی سنجیدہ کوشش اپنی مشہور کتاب Povertyand Un-British Rule in India میں کی۔ دادابھائی نوروجی نے ۱۸۶۷ء کے اعداد و شمار کی بنیاد پر اپنا اندازہ قائم کیا۔ انھوں نے جس اصول پر اندازہ لگایا ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے:۔

"میں نے اندازہ لگانے میں جو اصول اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ

ہر صوبے کی سب سے اہم ایک یا دو قسم کی پیداوار لی گئی ہے اور اس کو اس صوبے کی کل پیداوار کا نمایندہ قرار دیا گیا ہے۔ میں نے ہر ضلع کا مزروعہ رقبہ، اس کی فی ایکڑ پیداوار اور پیداوار کی قیمت کو لیا ہے اور سیدھی سادی جمع تفریق کے ذریعے سے پیداوار کی مجموعی مقدار اور قیمت کا اندازہ کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ کو اس طریقے سے فی ایکڑ اوسط پیداوار کی مقدار اور کل پیداوار کی قیمت کا صحیح حال معلوم ہو سکتا ہے اس لیے کہ اس طریقے میں جملہ ضروری عناصر کا لحاظ کرنے کا موقع ملتا ہے" غرض اس نہج پر حساب لگا کر وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مجموعی خام زرعی پیداوار کی قیمت ۲۷ کرور ۷۰ لاکھ پونڈ ہوتی ہے۔ اس میں سے وہ چھ فی صد تخم کے لیے منہا کرتے ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ باقی بچتا ہے اس کی مقدار ۲۶ کرور پونڈ ہوتی ہے جو عمدہ موسم میں کی ہوئی کاشت کی پیداوار کی نمایندگی کرتی ہے اور باشندوں کو ایک ایک سال کے استعمال کے لیے کافی ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایک کرور ۷۰ لاکھ پونڈ کی رقم نمک، افیون اور کوئلے کی قیمت اور تجارت کے نفع کے طور پر قرار دی گئی ہے۔ مصنوعات کی قیمت ایک کرور ۵۰ لاکھ پونڈ رکھی گئی ہے۔ اس کے مساوی رقم مویشی، مچھلی، دودھ، گوشت وغیرہ کی سالانہ پیداوار کے لیے اور ۳ کرور پونڈ اتفاقی مدوں کے لیے رکھے گئے ہیں۔ ان سب کو جوڑنے سے مجموعی مقدار ۳۴ کرور پونڈ ہوتی ہے۔ اگر مان لیا جائے کہ برطانوی ہند کی آبادی ۱۷ کرور ہے تو برطانوی ہند کی آمدنی فی کس ۴۰ شلنگ یا ۲۰ روپے ہوتی ہے۔ اس کے بعد مسٹر نوروجی جیل خانوں کی مقررہ غذا اور تارک وطن قلیوں کے راشن وغیرہ کی بنیاد پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جب معمولی گزر بسر کے لیے کم از کم ۳۴ روپے کفایت نہیں کر سکتے تو یہ آمدنی (یعنی ۲۰ روپیے) جو اس سے کم ہے کس طرح کافی ہو سکتی ہے" اور وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "معمولی عیش و آرام کے سامان معاشری و مذہبی احتیاجوں، خوشی و غمی کی تقریبوں کے مصارف اور برے موسم کے لیے پیشگی سربراہی تو درکنار ایک

اچھے موسم میں بھی ایسی غذا اور لباس کے لیے جو قیدیوں کو دیے جاتے ہیں پیدائش کافی مقدار میں نہیں ہوتی۔ ہندوستان کے کروڑوں باشندوں کی یہ حالت ہے کہ عام طور پر انہیں اتنا بھی میسر نہیں آتا جس سے زندگی کی معمولی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے"۔ چونکہ ہندوستان کے باشندوں کو ہر سال جو آمدنی وصول ہوتی تھی وہ ان کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ناکافی تھی اس لیے ملک کے اصل میں سے خرچ کیا جانے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک زیادہ سے زیادہ مفلس اور پیدائش کی صلاحیتوں کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ کمزور ہوتا گیا۔ مسٹر نوروجی نے ملازمتوں کو اپنے اندازے میں شمار نہ کرنے کی یہ وجہ بتلائی کہ ملازموں کو تنخواہیں آخر کار مادی پیداوار سے دی جاتی ہیں اور مادی پیداوار کا تخمینہ کیا جا چکا ہے۔ لہذا ملازمتوں کے مزید شمار کے معنی یہ ہوں گے کہ ایک ہی چیز کا مکرر حساب کیا جائے۔ اس کے بعد وہ وسیع تر تعمیم یہ قائم کرتے ہیں کہ ملک کی سالانہ مادی پیداوار ہی آمدنی کا واحد سرچشمہ ہے اور یہ کہ اس پیداوار کے علاوہ کوئی دوسرے ذرائع ہی نہیں ہیں جن سے کوئی فرد قومی آمدنی سے اپنا حصہ حاصل کر سکتا ہو۔ اس دلیل کو مسٹر کے ٹی شاہ اور کے جے کھمباٹا نے اپنی تصنیف موسوم بہ "ہندوستان کی دولت اور ادائے محصول کی قابلیت"

Wealth and Taxable Capacity of India میں

اساسی طور پر دہرایا ہے۔

۲ - قومی آمدنی ۱۸۶۸ء اور ۱۹۱۱ء کے درمیان

مسٹر نوروجی کی تحقیق کے بعد کی تحقیق جو قابل غور ہے وہ ۱۸۸۲ء میں ارل کرومر نے جو اس وقت تک صرف میجر ایولین بیرنگ تھے اور سر ڈیوڈ باربر نے جو اس وقت مسٹر باربر تھے، کی؛ اور ان کے

لہ دیکھو ان کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۳۱۔

نتائج حسب ذیل تھے[1] :-

	روپے
زرعی آمدنی	۳۵۰،۰۰،۰۰،۰۰۰
غیر زرعی آمدنی	۱۷۵،۰۰،۰۰،۰۰۰
مجموعی آمدنی	۵۲۵،۰۰،۰۰،۰۰۰

اگر اس عدد کو ۱۹۴،۵۳۹،۰۰۰ اشخاص پر تقسیم کیا جائے جو اس وقت کی برطانوی ہند کی آبادی تھی تو اوسط آمدنی فی کس ۲۷ روپے ہوتی ہے۔

اس کے بعد ہم ڈگبی کے اندازے پر غور کرسکتے ہیں جو اس مفروضے پر مبنی تھا کہ حکومت کی مالگزاری، پیداوار سے قطعی تناسب رکھتی ہے۔ مجموعی پیداوار اور مالگزاری کا جو تناسب رومیش چندر دت نے نکالا ہے اور اپنی کتاب موسوم بہ "کھلی چٹھی بنام لارڈ کرزن" میں پیش کیا ہے اس میں اس کی اتباع کی گئی ہے اور وہ مختلف صوبوں کے لیے مختلف ہے۔

بنگال.............. ۵ تا ۶ فی صد
صوبۂ سرحدی.......... ۸ فی صد
پنجاب.............. ۱۰ " "
مدراس.............. ۱۲ تا ۳۱ فیصد یا اوسطاً ۲۰ فیصد
بمبئی.............. ۲۰ تا ۳۳ " یا " ۲۵ "

شاہ اور کھمباٹا اس طریق کی اس بنا پر مخالفت کرتے ہیں کہ وہ صرف ناقابل اعتبار ہی نہیں ہے بلکہ اس میں مقدمے کو نتیجے پر منحصر رکھا گیا ہے،

[1] دیکھو ڈبلیو ڈگبی کی کتاب موسوم بہ Prosperous India (خوشحال ہندوستان)۔ صفحہ ۳۶۷۔

اس لیے کہ "اس میں خام پیداوار کو جس مضروب فیہ سے معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ خود صرف خام پیداوار سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نتیجے کا انحصار اس مضروب فیہ پر ہوگا جس کا انتخاب کیا جائے گا" ہم اس استدلال کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مضروب فیہ چند نمونے کی مثالوں کی تحقیقات کے نتیجے کے طور پر معلوم کیا جاتا ہے اور سب مثالوں کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا، اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس طریق میں استدلال دوری پایا جاتا ہے۔

ڈگبی کے حساب سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوئے۔

سنہ ۱۸۹۸ء تا سنہ ۱۸۹۹ء کی زرعی آمدنی ۲۸۵,۰۰,۰۰,۰۰۰ روپیہ یا ۱۹۰,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ

غیر زرعی آمدنی ، مذکورہ آمدنی کا نصف ۱۴۲,۵۰,۰۰,۰۰۰ روپیہ یا ۹۵,۰۰۰,۰۰۰ ،،

میزان ۴۲۷,۵۰,۰۰,۰۰۰ روپیہ یا ۲۸۵,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ

حکومت ہند کے اندازے کے مطابق ہندوستان کی آبادی غالباً ۲۴,۵۵,۰۰,۰۰۰ تھی۔ اگر مذکورہ آمدنی کو اس آبادی پر تقسیم کیا جائے تو اوسط آمدنی فی کس سترہ روپے آٹھ آنے پانچ پائی ہوتی ہے لیکن سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری سے یہ معلوم ہوا کہ مجموعی آبادی صرف ۲۳,۱۰,۰۰,۰۰۰ تھی۔ اس بنیاد پر فی کس آمدنی اچھے سال میں ۱۸ روپے ۸ آنے ۱۱ پائی ہوگی۔ سنہ ۱۸۹۹ء تا سنہ ۱۹۰۰ء کی محط سالی میں ڈگبی نے اندازہ لگایا کہ آمدنی گھٹ کر ۱۲ روپے ۶ آنے رہ گئی تھی۔

لارڈ کرزن نے اس گوشوارے اور دوسرے اس کے مشابہ گوشواروں کے جواب میں ان اعداد کی بنیاد پر اپنا ایک تخمینہ تیار کیا جو سنہ ۱۸۹۸ء کے

[1] دیکھو شاہ اور کھمباٹا کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان کی دولت اور ادائی محصول کی قابلیت"

The Wealth and Texable Capacity of India

قحط کمیشن کے لیے جمع کیے گئے تھے اور جن میں ہندوستان کی قریب ترین زمانے کی زرعی آمدنی بتلائی گئی تھی۔ چنانچہ اس آمدنی کی مقدار ۵۰۰۰۰۰... تھی۔ ۱۸۹۸ء کے تخمینوں سے یہ معلوم ہوا تھا کہ اوسط زرعی آمدنی ۱۸ روپے فی کس تھی اور اسی مقررہ رقبے کے لیے سب سے حال کی مردم شماری کے اعداد لینے پر جیسا کہ ابتدائی تخمینے میں کیا گیا تھا، معلوم ہوا کہ زرعی آمدنی ۲۰ روپے فی کس تک بڑھ گئی تھی۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ غیر زرعی آمدنی بھی اسی تناسب سے بڑھی تھی تو اوسط آمدنی ۱۸۸۲ء کے ۲۷ روپے فی کس کے مقابلے میں ۱۹۰۱ء میں ۳۰ روپے فی کس ہوتی۔ لارڈ کرزن نے یہ تسلیم کیا کہ مفروضہ اعداد ناقابل تردید اور مسلم نہیں تھے، لیکن انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ۱۸۸۰ء کے اعداد بھی کسی حد تک قیاسی تھے، اور یہ کہ اگر ایک قسم کے اعداد استدلال میں استعمال کئے جا سکتے تھے تو دوسری قسم کے اعداد بھی مساوی طور پر استعمال کئے جا سکتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ معاشی صورت حال کی جو ترقی حسابات سے ظاہر ہوئی ہو وہ بجائے خود بہت درخشاں اور اطمینان بخش نہ تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ ان حسابات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معاشی حالت کا رخ ترقی کی طرف تھا نہ کہ تنزل کی طرف۔

ڈگبی نے اس طرف دوبارہ توجہ کی اور اس مسئلے کو مکرر جانچا تاکہ یہ ثابت کرے کہ لارڈ کرزن نے جو رجائی خیال قائم کیا تھا وہ غلطی پر مبنی تھا۔ زرعی آمدنی کے متعلق ڈگبی نے وہی پرانا طریقہ اختیار کیا یعنی مالگزاری سے زرعی آمدنی کا استخراج کیا۔ لیکن غیر زرعی آمدنی کے بارے میں یہ فرض کرنے کی بجائے کہ وہ زرعی آمدنی کا نصف ہے، انھوں نے کئی مدوں کو جانچا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ملک کی مجموعی آمدنی ۹۰۰۰۰۰۰... پونڈ تھی جس کو ۲۲۶۰۰۰۰۰۰ کی مجموعی آبادی پر تقسیم کرنے سے فی کس اوسط آمدنی ۱۷ روپے ۴ آنے حاصل ہوئی۔

سرجے، ڈی، ایس اپنی کتاب موسوم بہ "اصل ہندوستان"

The Real India میں الیف' جے' اٹکن سن کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ۱۸۷۵ء اور ۱۸۹۵ء کے درمیان فی کس آمدنی ۱۵ روپے سے ۴۴ روپے تک بڑھ گئی تھی۔ فروری ۱۹۲۱ء میں آنریبل ای' ام کک نے کونسل آف اسٹیٹ میں یہ اعلان کیا کہ ۱۸۸۲ء اور ۱۹۰۱ء میں حساب کا جو طریقہ اختیار کیا گیا تھا اسی کو اختیار کرنے سے معلوم ہوا کہ ۱۹۱۱ء میں فی کس آمدنی ۵۰ روپے تک بڑھ گئی تھی۔ انھوں نے یہ بھی بتلایا کہ اگر حساب کا زیادہ دقیق اور کم ناقص طریقہ اختیار کیا جائے تو فی کس آمدنی ۸۰ روپے تک ثابت ہوگی۔

۴۔ واڈیا اور جوشی کا تخمینہ۔ پی' اے' واڈیا اور جی' این' جوشی نے ۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۴ء کے متعلق ہندوستان کی قومی آمدنی کا ایک تخمینہ مرتب کیا ہے[1]۔ یہاں ان کی تحقیق کے نتائج کو مختصر طور پر بیان کرنا مناسب ہوگا۔ زرعی پیداوار کی قیمت ۲۸۲ر۳۹ر۹۹ر۴۲ر۰۷ر۱۰ روپے لگائی گئی ہے اور اس میں سے ۲۰ فی صد مشغولہ رقم کی بابت یا تخم کھاد وغیرہ کی بابت منہا کی گئی ہے جس کے بعد خالص رقم ۶۲۶ر۴۶ر۹۹ر۳۹ر۰۸ر۸ روپے باقی بچتی ہے۔ معدنی پیداوار کی خام قیمت کا اندازہ ۰۰۰ر۵۹ر۴۰ر۱۴ر۱ روپے کیا گیا ہے اور اس میں سے بھی ۲۰ فی صد رقم فرسودگی اور اجرت کی شکل میں کاروباری مصارف کی بابت منہا کی گئی ہے۔ واضح ہو کہ معدنی پیداوار کو آگے چل کر مصنوعات کی قیمت میں محسوب کیا گیا ہے۔ غرض اس منہائی کے بعد خالص رقم ۰۰۰ر۶۷ر۲۲ر۵ر۱۱ روپے حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد مختلف قسموں کی پیداوار مثلاً کھالوں اور چمڑوں' کھاد' اون' ریشم اور مرغبانی کی پیداوار کی قیمت کا اندازہ اس مفروضے پر لگایا گیا ہے کہ اس تمام پیداوار کی برآمد مجموعی پیداوار کا ۸۰ فی صد ہے۔ اس میں ماہی گیری کی پیداوار کی قیمت ماہی گیری کے

[1] دیکھو Wealth of India ص ۹۷ تا ص ۱۱۲

پیشے میں کام کرنے والے ۰۰۰،۶۵،۸ اشخاص کے لیے ۲۷۵ دن کے واسطے ۴ آنے فی کس کے حساب سے جوڑی گئی ہے۔ آخری مد جو جمع کی گئی ہے وہ اولاً اس پیداوار کی قیمت سے متعلق ہے جس کو دستکار تیار کرتے ہیں اور دوسرے ان مزدوروں کی کمائی سے متعلق ہے جو تجارت اور نقل وحمل میں کام کرتے ہیں اور اس کمائی کا اندازہ ۴ آنے فی کس فی یوم کے حساب سے ۳۱۰ دن کے لیے ۰۰۰،۰۰،۱۸ اشخاص کے لیے کیا گیا ہے۔ ان سب مدوں کی میزان ۷۵۰،۵۸،۲۹،۴۲،۱۵ روپے ہوتی ہے۔ اس کے بعد کی مد مویشیوں اور جانوروں کی پیداوار سے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں جو اعداد لیے گئے ہیں وہ ۱۹۱۷ء تا ۱۹۱۸ء کے سال کے بارے میں ہیں، اور یہ فرض کیا گیا ہے کہ اس سال جتنے جانور تھے ان کی تعداد اور ۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۴ء کی تعداد کا درمیانی فرق زیادہ بڑا نہ تھا۔ کل مویشیوں کی سالانہ مجموعی آمدنی کا اندازہ ۵۱۸،۱۱،۵۰،۹۴،۳ روپے کیا گیا ہے۔ اس میں سے ان مویشیوں کی خدمات کی آمدنی منہا کر دی گئی ہے جن سے زرعی اغراض میں کام لیا گیا، تاکہ ان کا مکرر حساب عمل میں نہ آئے، اس لیے کہ ان خدمات کو زرعی پیدائش کی آمدنی میں شامل کیا جا چکا ہے جیسا کہ اوپر درج ہو چکا ہے۔ رہی مصنوعات کی زائد آمدنی تو اس کا اندازہ خام اشیاء کی مجموعی مقدار یعنی ۰۰۰،۶۵،۶۷،۴۲،۲۰ روپے کا $\frac{1}{5}$ یا ۲۰ فی صد یعنی ۰۰۰،۳۳،۹۵،۴۰ روپے کیا گیا ہے۔ مصنف مجموعی خام آمدنی سے اس طریق پر مختلف منہائیاں کرتے ہیں جس کو اوپر بیان کیا جا چکا ہے، اور مندرجۂ ذیل گوشوارہ پیش کرتے ہیں جس سے ان رقوم کا حال معلوم ہوتا ہے جو ۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۴ء کی قومی آمدنی کی مجموعی مقدار سے منہائی کے قابل ہیں:-

۱۔ مطالبات وطن	۰۰۰،۰۰۰،۲۰ پونڈ

۲۔ حکومت کی طرف سے غیر ملکی سرمایے کا شغل	۸,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ
۳۔ ہندوستان میں مشغول غیر ملکی سرمایہ کا نفع	۳۹,۰۰۰,۰۰۰
۴۔ ہندوستان میں نئے غیر ملکی سرمایے کا شغل	۵,۰۰۰,۰۰۰ [1]
۵۔ زر کی ترسیلات جو ہندوستان سے خانگی طور پر سرکاری عہدہ داروں کی طرف سے یا بنکوں اور شترک سرمایے کی کمپنیوں وغیرہ کے یوروپین ملازموں کی طرف سے کی جاتی ہیں۔	۱۰,۰۰۰,۰۰۰
میزان	۸۲,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ یا ۱,۲۳۰,۰۰۰,۰۰۰ روپے

اس طرح مندرجہ ذیل جدول میں واڈیا اور جوشی کے تخمینے کے نتائج مختصر طور پر دیئے گئے ہیں :۔

[1] بولے رد برٹ سن رپورٹ کے مصنف یہ بتلاتے ہیں کہ اس مد کی آمدنی کو ایک مرتبہ کی بجائے دو مرتبہ منہا کیا گیا ہے۔

برطانوی ہند کی سالانہ آمدنی یا قومی مقسوم

کی مجموعی مقدار برائے سنہ ۱۹۱۳ء تا سنہ ۱۹۱۴ء

مدات	مجموعی آمدنی بحساب روپیہ
۱۔ زرعی پیدائش	۸۵۸،۳۹،۹۴،۶۲۶
۲۔ معدنی پیدائش	۱۱،۵۲،۷۶،۰۰۰
۳۔ متفرق پیداوار اور دستکاروں کی آمدنی وغیرہ	۱۵۴،۲۹،۵۸،۷۵۰
۴۔ مویشیوں کی پیداوار	۱۳۵،۱۰،۳۴،۶۳۴
۵۔ مصنوعات	۴۰،۹۵،۳۳،۰۰۰
خام مجموعی آمدنی	۱،۲۱۰،۲۷،۹۷،۰۱۰
مطالبات وطن کی تہائی وغیرہ	۱۲۳،۰۰،۰۰،۰۰۰
خالص سالانہ آمدنی	۱،۰۸۷،۲۷،۹۷،۰۱۰

اگر اس خالص آمدنی کو برطانوی ہند کی مجموعی آبادی یعنی ۲۴۵،۸۹،۷۱۶ پر تقسیم کیا جائے تو فی کس سالانہ ۴۴ روپے ۵ آنے ۶ پائی یا ۲ پونڈ ۱۹ شلنگ ۴ پنس حاصل ہوتی ہے۔

سنہ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے لحاظ سے برطانوی ہند کی آبادی ۲۴۴،۱۸۹،۷۱۶ تھی۔ اس میں دس لاکھ کا اضافہ اس لیے کیا گیا ہے کہ تین سال میں آبادی میں تقریباً اسی قدر اضافہ ہوا ہوگا۔

۴۔ شاہ اور کھمباٹا کا تخمینہ شاہ اور کھمباٹا کا تخمینہ ذیل کی جدول میں مختصر طور پر درج کیا گیا ہے۔[1]

مدات	زمانۂ قبل از جنگ سنہ ۱۹۰۰ تا سنہ ۱۹۱۴	زمانۂ بعد از جنگ سنہ ۱۹۱۴ تا سنہ ۱۹۲۲	کل زمانہ سنہ ۱۹۰۰ تا سنہ ۱۹۲۲	۱۹۲۱ تا سنہ ۱۹۲۲ء
		کرور	روپیہ	
زرعی پیداوار	۱۰۱۴٫۸	۱۶۸۶٫۵	۱۲۵۷٫۱	۲۱۵۵٫۸
منہائی برائے تخم	۲۰	۳۵	۲۵	۵۸
خالص زرعی پیداوار	۹۹۴٫۸	۱۶۵۱٫۵	۱۲۳۲٫۱	۲۰۹۷٫۸
جنگلات کی پیداوار	۱۰	۲۰	۱۴	۲۸
ماہی گیری کی پیداوار	۱٫۲	۲٫۵	۱٫۹	۳٫۲
مصنوعات	۸۰	۱۵۰	۱۰۶	۱۸۶
معدنی دولت	۱۰	۲۱٫۶	۱۴	۲۸٫۷
عمارات وغیرہ	۱۰	۱۶٫۴	۱۲	۲۰٫۳
میزان	۱۱۰۶	۱۸۶۲	۱۳۸۰	۲۳۶۴

اس طرح مختلف سالوں کے لیے فی کس خام آمدنی حسب ذیل ہوتی ہے:۔

سنہ ۱۹۰۰ء تا سنہ ۱۹۱۴ء .... ۳۶ روپے

سنہ ۱۹۱۴ء تا سنہ ۱۹۲۲ء .... ۵۸½ ″

سنہ ۱۹۰۰ء تا سنہ ۱۹۲۲ء .... ۴۴½ ″

سنہ ۱۹۲۱ء تا سنہ ۱۹۲۲ء .... ۷۴ ″

[1] دیکھو شاہ اور کھمباٹا کی تصنیف محولۂ بالا ۱۹۹ تا ۲۰۰۔

قیمتوں کی سطح میں جو تبدیلی ہوئی تھی اس کے اعتبار سے کمی بیشی کی جائے تو زمانۂ قبل از جنگ کے لیے فی کس آمدنی ۳۶ روپے اور زمانۂ جنگ و بعد از جنگ کے لیے ۳۸ روپے ۲ آنے ہوتی ہے۔ مصنف خام آمدنی سے مطالبات وطن وغیرہ کے سلسلے میں کئی منہائیاں کرتے ہیں۔ اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس "نکاسی" کے باعث ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۲ء کے لیے فی کس آمدنی میں ۱۰ روپے کی کمی ہو جاتی ہے اور خام آمدنی ۶۷ روپے تک گھٹ جاتی ہے۔

ڈ۔ فنڈلے شِراس کا تخمینہ

جی فنڈلے شراس نے ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۲ء کے لیے جو تخمینہ قائم کیا ہے[1] اس میں وہ زرعی آمدنی کا اندازہ اول الذکر سال کے لیے ۱۰۴۹۴ لاکھ روپے اور موخر الذکر سال کے لیے ۱۹۰۳۴ لاکھ روپے اور غیر زرعی آمدنی کا اندازہ ۸۲ کروڑ روپے کرتے ہیں۔ اس بنیاد پر فی کس آمدنی ۱۹۲۱ء کے لیے ۱۰۷ روپے اور ۱۹۲۲ء کے لیے ۱۱۶ روپے ہوتی ہے۔ شراس یہ بتلاتا ہے کہ

[1] ۱۹۲۲ء میں محکمۂ زراعت مدراس کے شعبۂ اعداد و شمار نے ایک اندازہ شائع کیا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ احاطۂ مدراس کی زرعی آمدنی کی مجموعی مقدار ۲۰۹,۷ کروڑ روپے تھی۔ احاطۂ مدراس کی زرعی آبادی مجموعی آبادی کا تقریباً ۷۱/۱۰۰ حصہ ہے۔ اور اگر یہ فرض کیا جائے کہ زرعی آبادی کی آمدنی، غیر زرعی آبادی کی آمدنی کے مقابلے میں اتنی ہی ہے جتنی کہ ان دونوں آبادیوں کا تناسب تو غیر زرعی آمدنی کی مجموعی مقدار زرعی آمدنی کا ۲۹/۷۱ ہوگی۔ اس عمل سے مجموعی آمدنی ۴۴۴ کروڑ روپے ہو جاتی ہے ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے مطابق احاطۂ مدراس کی آبادی ۴۲,۳۱۲ ملین تھی۔ اس طرح اوسط آمدنی فی کس تقریباً ۱۰۰ روپے نکلتی ہے ۱۸۹۹ء اور ۱۹۲۰ء کے درمیان قیمتوں میں جو اضافہ ہوا اگر اس کا لحاظ کیا جائے تو ۱۸۹۹ء میں یہ اضافہ ۴۰ روپے کے برابر ہوگا۔ اس طرح آمدنی میں فی کس کا حقیقی اضافہ ظاہر ہوا۔ دیکھو پلے کی کتاب موسوم بہ "

Economic Conditions in India

صفحہ ۹۶۔

سال ۱۸۹۱ء اور سال ۱۹۱۱ء کے درمیان جتنی تحقیقاتیں کی گئیں ان میں یہ فرض کیا گیا تھا کہ کاشتکاروں اور غیر کاشتکاروں کی خام آمدنی ان دونوں جماعتوں کے درمیان ان کی تعداد کے تناسب سے تقسیم تھی۔ یہ حساب اسوقت تک کافی طور پر ٹھیک بیٹھا جب تک کہ ملک نے صنعتی حیثیت سے ادنی ترقی کی تھی۔ لیکن گزشتہ چند سالوں میں کافی تغیرات واقع ہوئے۔ اس لیے کچھ رعایت کرنی ضروری تھی تاکہ غیر زرعی آمدنی کی مجموعی مقدار کا اندازہ لگایا جاتا۔ چنانچہ ۷۵ کرور روپے کے اضافے سے یہ کمی بظاہر پوری ہوگئی اور مجموعی مقدار ۸۸۲ کرور روپے ہوگئی۔ شراس کے تخمینے کے بارے میں جو بدیہی اعتراض کئے جاتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ معمولی طریقے کے برخلاف انھوں نے زرعی آمدنی کا حساب لگانے میں تخم کی بابت کوئی منہائی نہیں کی۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ شراس کے تخمینے کے لحاظ سے غیر زرعی آمدنی، زرعی آمدنی کا تقریباً ۴۰ فی صد ہے۔ برخلاف اس کے شاہ اور کھمباٹا نے جو اندازہ لگایا ہے اس کی رو سے یہ تناسب صرف ۱۰ فی صد اور واڈیا وجوشی کے تخمینے کے لحاظ سے تقریباً ۳۰ فی صد ہے۔ اس فرق و تفاوت کا باعث دوسری چیزوں کے منجملہ یہ ہے کہ "خدمات" کے افادوں کا حساب لگانے کے طریق میں فرق ہے۔ شاہ اور کھمباٹا اپنے حساب سے "خدمات" کو خارج کردیتے ہیں برخلاف اس کے شراس ان کو شامل کرتا ہے۔

اب ان مختلف ذرائع کی تحقیقات کے نتائج کو جن کا اوپر

لہ دیکھو فنڈلے شراس کی کتاب موسوم بہ "مالیات" The Science of Public Finance صفحہ ۱۳۹ تا صفحہ ۱۴۰۔

ذکر کیا گیا گوشوارے کی شکل میں پیش کرنا مناسب ہوگا:۔

نمبر شمار	نام اندازہ قائم کرنے والوں کا	متعلق سال	فی کس آمدنی
			روپیہ آنہ پائی
۱	دادا بھائی نوروجی	سنہ ۱۸۷۰ء	۲۰ - × - ×
۲	بیرنگ باربر	سنہ ۱۸۸۲ء	۲۷ - × - ×
۳	ڈگبی	سنہ ۱۸۹۸ء تا سنہ ۱۸۹۹ء	۱۸ - ۹ - ×
۴	لارڈ کرزن	سنہ ۱۹۰۰ء	۳۰ - × - ×
۵	ڈگبی	سنہ ۱۹۰۰ء	۱۷ - ۴ - ۸
۶	اٹ کن سن	سنہ ۱۸۷۵ء سنہ ۱۸۹۵ء	۲۵ - × - × ۳۴ - × - ×
-	—	سنہ ۱۹۱۱ء	۵۰ - × - × ۸۰ - × - ×
۷	واڈیا و جوشی	سنہ ۱۹۱۳ء تا سنہ ۱۹۱۴ء	۴۴ - ۵ - ۶
۸	شاہ و کمباٹا	سنہ ۱۹۲۱ء تا سنہ ۱۹۲۲ء	۶۷ - × - ×
۹	فنڈلے شراس	سنہ ۱۹۲۱ء سنہ ۱۹۲۲ء	۱۰۷ - × - × ۱۱۶ - × - ×

سنہ ۱۹۲۳ء تا سنہ ۱۹۳۲ء کے دس سالوں کے تخمینے کے اعداد الگ الگ حسب ذیل ہیں[1]:-

سال	فی کس آمدنی بحساب روپیہ
سنہ ۱۹۲۳ء تا سنہ ۱۹۲۴ء	۱۱۷
سنہ ۱۹۲۴ء تا سنہ ۱۹۲۵ء	۱۲۶
سنہ ۱۹۲۵ء تا سنہ ۱۹۲۶ء	۱۱۴
سنہ ۱۹۲۶ء تا سنہ ۱۹۲۷ء	۱۰۸
سنہ ۱۹۲۷ء تا سنہ ۱۹۲۸ء	۱۰۸
سنہ ۱۹۲۸ء تا سنہ ۱۹۲۹ء	۱۰۶
سنہ ۱۹۲۹ء تا سنہ ۱۹۳۰ء	۱۰۹
سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۱ء	۸۴
سنہ ۱۹۳۱ء تا سنہ ۱۹۳۲ء	۶۳
سنہ ۱۹۳۲ء تا سنہ ۱۹۳۳ء	۵۸

[1] جی فنڈلے شیراس کی کتاب موسومہ بہ The Science of Public Finance تیسرا ایڈیشن صفحہ

سر ایم، وس ویسو ریا اپنی کتاب موسوم بہ (Planned Economy for India صفحہ ۲۲ میں یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ برطانوی ہند کے لیے اوسط آمدنی معمولی سال میں ۲۸ روپے فی کس مانی جا سکتی ہے۔ حالیہ کساد بازاری کے زمانے میں اوسط آمدنی کو معمولی اوسط کا $\frac{1}{2}$ یا ۵۸ روپے فی کس ماننا مناسب ہوگا۔

۶۔ **تشریح اور موازنے کی مشکلات** ان نتائج کا موازنہ کرنے میں قاری کو بہت سی باتوں میں احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیئے۔ پہلی بات یہ کہ ان نتائج کا تعلق مختلف تاریخوں سے ہے۔ چنانچہ دو مختلف تاریخوں میں لوگوں کی معاشی حالت کی تقابلی تحلیل کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ ان دو تاریخوں میں قیمتوں کا فرق و اختلاف معلوم کیا جائے۔ مثلاً اگر قیمتوں کا اضافہ ۸۰ فی صد فرض کیا جائے تو ۱۹۱۳ء کے ۴۵ روپے ۲۲-۱۹۲۱ء کے ۸۱ روپے کے برابر ہوں گے۔ ایک اور واقعہ یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ حساب کرنے میں جس رقبے کا لحاظ کیا گیا ہے وہ بہر صورت مقررہ نہیں ہے۔ مثلاً شاہ اور کھمباٹا اپنے حساب میں برطانوی ہند ہی کو نہیں بلکہ دیسی ریاستوں کو بھی شامل کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر ان کے تخمینے کا موازنہ کسی دوسرے کے اندازے سے کرنا ہو جو صرف برطانوی ہند کے متعلق ہو تو ہمیں یہ فرض کرتے ہوئے کہ برطانوی ہند بحیثیت مجموعی دیسی ریاستوں کے مقابلے میں کسی قدر زیادہ دولتمند اور معاشی حیثیت سے زیادہ ترقی یافتہ ہے، شاہ اور کھمباٹا کے نکالے ہوئے فی کس عدد میں کسی قدر اضافہ کرنا پڑے گا۔ علاوہ ازیں ہمیں ان طریقوں کے اختلاف کا بھی لحاظ کرنا ضروری ہے جو تحقیقات میں استعمال کئے گئے۔ چنانچہ ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ شراس کسی قسم کی منہائیاں نہیں کرتا، برخلاف اس کے دوسرے تخمینوں میں کم و بیش منہائیاں کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ قومی مقسوم کے عناصر ترکیبی کے بارے میں

اختلاف رائے ہونے کی وجہ سے قومی آمدنی کے اندازوں میں فرق ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے، شراس کے مرتبہ تخمینے میں پیشہ ور جماعتوں کی آمدنیاں شامل ہیں[1]، برخلاف اس کے بعض دوسرے تخمینوں میں ان کو ارادتاً خارج کردیا گیا ہے۔ دو مختلف زمانوں کے متعلق جو تحقیقات کی گئی ہو ان کے نتائج کا صحیح طریقے پر موازنہ کرنے کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ حقیقی اعداد جس طرح دیے گئے ہیں اسی طرح نہ لیے جائیں بلکہ اختیار کردہ طریقے یکساں ہونے کی صورت میں اعداد جس طرح ہوتے اس طرح لیے جائیں۔ ایک اور قابل ذکر امر یہ ہے کہ بعد کے زمانے کے تخمینے بہت زیادہ باقاعدہ اور احتیاط کے ساتھ مرتب کیے گئے ہیں؛ اور جیسا کہ شراس نے بتلایا ہے خود اسی کے زیادہ دقیق طریقے کے مقابلے میں قدیم طریقوں کو استعمال کیا جاتا تو اس کے مرتبہ تخمینوں میں زرعی پیداوار کی آمدنی اور غیر زرعی آمدنی کافی کم ہوجاتی۔

"فی کس آمدنی" سے معاشی بہبود اور خوش حالی کے بارے میں نتائج اخذ کرنے میں بھی احتیاط درکار ہے۔ یہاں نہ صرف فی کس اوسط آمدنی کا بلکہ قومی آمدنی کی ترکیب کا لحاظ بھی اہم و ضروری ہے۔ مثلاً ہندوستان کی حد تک یہ تحقیق کرنا خاص طور پر ضروری ہوگا کہ اس کی قومی آمدنی کا کتنا حصہ قابل خورونوش اشیا کی شکل میں ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ معلوم ہو کہ ایسی اشیا کی رسد جو زندگی کے لیے قطعی طور پر ضروری ہیں ناکافی ہے تو قومی آمدنی کی دوسری شکلوں کے اضافے کے بارے میں یہ نہیں خیال کیا جاسکتا کہ وہ قابل خورونوش اشیا کے برابر اہمیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں اگر حساب میں "خدمات" کو شامل کرلیا گیا تو اس نیم سیاسی سوال کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ

[1] فنڈلے شراس اپنے اصل تخمینے میں "خدمات" کو واضح طور پر شامل نہیں کرتا، لیکن غیر زرعی آمدنی کے متعلق اپنے اعداد کی تنقیح ایک ایسے گوشوارے سے کرتا ہے جس میں خدمات کی آمدنی شامل ہے

آیا ہندوستان میں بعض خدمات کے معاوضے ضرورت سے زیادہ ہیں یا نہیں۔

آخر میں ایک عام انتباہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ کسی خاص تحقیق کے نتیجے کا لحاظ کرنے میں ہمیں اس کی غرض و غایت کا بھی لحاظ کرنا چاہئے۔ جن تحقیقاتوں کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے ان میں سے اکثر سیاسی اختلافات کے جذبے سے متاثر ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے کہ اس نوع کے عامیانہ اعتراضات کسی تحقیق کے راستے میں حایل ہوجاتے ہیں کہ فلاں مخصوص اندازہ قصداً کم کرکے دکھایا گیا ہے یا زیادہ کرکے دکھایا گیا ہے (جیسی صورت ہو۔ اگر ان اعتراضات کو صحیح اور حقیقی سمجھ کر مان لیا گیا ہو تو انھی کی روشنی میں آخری نتایج کی تشریح کرنی چاہئے یعنی اگر کوئی خاص تخمینہ مرتب کرنے والا یہ اعلان کرے کہ اس کا تخمینہ صیح حساب سے زیادہ ہے تو ہمیں عدد کو گھٹانا چاہئے؛ اور اگر برخلاف اس کے ہمیں یہ اطمینان دلایا جائے کہ قصداً کمی کے ساتھ مرتب کئے ہوئے تخمینے سے بحث کی جارہی ہے تو ہم کو چاہئے کہ اس عدد میں مناسب اضافہ کرلیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ایسے اندازے جن کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ حقیقت سے کم ہیں دراصل ان اندازوں سے زیادہ ثابت ہوتے ہیں جن کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ حقیقت سے زیادہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معترضین کو خاموش کرنے کی خاطر جہاں اعداد میں کچھ کمی کردی جاتی ہے تو دوسری طرف بعض امور میں اتنا مبالغہ کردیا جاتا ہے کہ نتیجۃً اندازے کے اعداد میں کافی بیشی ہوجاتی ہے۔

مختلف محققوں نے جو نتایج حاصل کیے ان میں اختلاف ہونے کے باوجود ایک واقعہ صاف طور پر ثابت ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہندوستان انتہائی مفلس ملک ہے۔ حیات کے لیے جو شے سب سے زیادہ ضروری ہے یعنی غذا اس کی حد تک بھی اس ملک کے

لوگوں کی بہت بڑی تعداد یہ استطاعت نہیں رکھتی کہ اس کی اتنی مقدار خرید سکے جو جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے درکار ہے۔ اس بیان کی صحت پر اس غیر قطعی شہادت کا کوئی اثر نہیں پڑتا جس کی طرف ہم نے اس مسئلے کی بحث کے سلسلے میں اشارہ کیا تھا کہ آیا ملک کی غذا کی رسد میں آبادی کے اضافے کے تناسب سے اضافہ ہو رہا ہے یا نہیں[1]۔ خواہ غذا کی مجموعی رسد کافی ہو یا نہ ہو یا ناکافی ہونے کی صورت میں خواہ یہ قلت بڑھ رہی ہو یا گھٹ رہی ہو، یہ ایک ناقابل تردید اور تکلیف دہ حقیقت ہے کہ باشندوں کی بہت بڑی تعداد نیم فاقے کی حالت میں گزر کر رہی ہے[2]۔

لیکن انتہائی افلاس کی تصویر کھینچنے میں وہ لوگ مبالغے سے کام لیتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ فی کس آمدنی گویا متوسط خاندان کی آمدنی ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم یہ ذہن نشین نہ رکھیں کہ قومی آمدنی کی تقسیم بہت ہی غیر مساوی ہے تو یہ غلطی ہو سکتی ہے کہ عوام کی حالت حقیقت میں جیسی ہے اس سے بہتر تصور کرنے لگیں۔ بعض لوگوں کو اوسط آمدنی سے زیادہ اور بعض کو کم ملتا ہے۔ مثلاً علمی پیشوں اور بڑے زمینداروں کو کسانوں یا صنعتی مزدوروں کے مقابلے میں زیادہ آمدنی ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے تاجروں اور دکانداروں کی آمدنی اوسط درجے کی ہوتی ہے۔ شاہ اور کھمباٹا حسب ذیل اعداد یہ ثابت کرنے کے لیے پیش کرتے ہیں کہ ہندوستان کی قومی آمدنی کی تقسیم غیر مساوی ہے[3]۔

---

[1] دیکھو جلد اول باب ۳ فصل ۱۳۔

[2] سی۔ این۔ وکیل اور ایس کے مورنجن اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ یہی نہیں کہ غذا کی رسد ناکافی ہے بلکہ قلت روز افزوں ہے۔ دیکھو ان کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں کرنسی اور قیمتیں" صفحہ ۲۶۴۔

[3] دیکھو ان کی تصنیف محولہ بالا ص ۳۰۱۔

"(۱) ۶ ہزار افراد جن کی اوسط آمدنی فی کس ایک لاکھ روپے سالانہ ہے، ۶۰ کروڑ روپے ہضم کر جاتے ہیں اور ۳۰ ہزار اشخاص کی کفالت کرتے ہیں۔

(۲) انکم ٹیکس ادا کرنے والے دو لاکھ ۳۰ ہزار اشخاص جن کی اوسط آمدنی (؟) روپے ہے، ۱۱ لاکھ ۵۰ ہزار اشخاص کی کفالت کرتے ہیں۔

(۳) دو لاکھ ۷۰ ہزار اشخاص انکم ٹیکس سے بچے ہوئے یا مستثنیٰ ہیں، لیکن ان کی آمدنی اتنی ہے جس پر ٹیکس عائد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ فی کس اوسط آمدنی ۵ ہزار سالانہ اور مجموعی آمدنی ایک ارب ۳۵ کروڑ روپے ہے، اور یہ ۱۳ لاکھ ۵۰ ہزار اشخاص کے کفیل ہیں۔

(۴) ۲۵ لاکھ اشخاص کی اوسط آمدنی ایک ہزار روپے سالانہ اور مجموعی آمدنی ۲ ارب ۵۰ کروڑ روپے ہے، اور یہ ۱ کروڑ ۲۵ لاکھ اشخاص کے کفیل ہیں۔

(۵) ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ اشخاص کی اوسط آمدنی ۲۰۰ روپے سالانہ اور مجموعی آمدنی ۷۰ کروڑ روپے ہے اور ان کی زیر کفالت ۱۰ کروڑ افراد ہیں۔

باقی اشخاص کی اوسط آمدنی ۵۰ روپے فی کس سالانہ اور مجموعی آمدنی ۱۰ ارب ۲۵ کروڑ روپے ہے۔"

اس حساب کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک کی دولت سے زائد از یک ثلث حصے سے آبادی کا ۱ فی صد جزو فائدہ اٹھاتا ہے یا اگر متعلقین کو شامل کر لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ ۵ فی صد جزو متمتع ہوتا ہے، ایک تہائی آبادی ملک میں پیدا شدہ سالانہ دولت کے ایک ثلث سے کچھ زائد کو صرف کرتی ہے؛ اور برطانوی ہند کی ۹۰ فی صد آبادی ملک میں پیدا شدہ مجموعی دولت کے تقریباً ۴۰ فی صد سے استفادہ کرتی ہے۔

یہ امر بھی ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ فی کس آمدنی کی مقدار مختلف صوبوں میں مختلف ہے[1]۔ ان صوبوں میں جہاں تجارتی پیداوار بوئی جاتی ہے اور جن میں صنعتی جدوجہد مقابلۃً زیادہ ہے مثلاً بمبئی، سندھ، پنجاب، آسام صوبۂ متوسط و برار وہاں فی کس آمدنی یقیناً زیادہ ہوگی۔ اس کے برخلاف بہار، اڑیسہ، صوبۂ متحدہ، اور مدراس میں دولت اور آمدنی کم ہے۔

۷۔ دنیا کے ملکوں کا باہمی مقابلہ وموازنہ

محض فی کس آمدنی کی بنا پر بین قومی مقابلہ وموازنہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ سر رابرٹ گفن نے اس امر کی طرف متوجہ کرایا کہ ضروری مستثنیات و شرائط کے بغیر اس قسم کا موازنہ کرنا اور یہ فرض کرنا کہ وہ مختلف ملکوں میں جو اعداد ایک ہی نام سے موسوم ہیں وہ یکساں قدر وقیمت رکھتے ہیں،، غلطی ہے۔ ایک ملک کے باشندوں کے مقابلے میں دوسرے ملک کے باشندوں کی معاشی خوش حالی کا حال فی کس آمدنی کے اعداد سے صحیح طور پر اس وقت تک نہیں معلوم ہوسکتا جب تک کہ معیار زندگی، عادات اور رسم ورواج کے اختلافات جیسے عاملین کا لحاظ نہ کیا جائے۔ جیسا کہ سر جوشیا اسٹامپ بتلاتے ہیں، وہ جن ملکوں کا مقابلہ وموازنہ کرنا ہو ان میں یکساں اشیا پر یکساں طریق پر نظر ڈالنا ضروری ہے اور ان کی اضافی قدر وقیمت کو جانچنے کا پیمانہ یکساں ہونا چاہئے۔ اس اعتبار سے ملکوں میں جس حد تک اختلاف ہوگا اس حد تک موازنہ غیر صحیح ہوگا[2]،، مثلاً ہندوستان اور انگلستان جیسے

[1] دیکھو وکیل ومورنجن کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۳۵۶ تا صفحہ ۳۵۷۔

[2] یہ بہت ہی مشتبہ امر ہے کہ آیا دو ملکوں کے اعداد کا موازنہ کرنا قابل اعتماد ہوسکتا ہے یا نہیں۔ مکان، لباس، اور غذا کا موازنہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ آمدنی کے اس جزو کی اہمیت جو اجرت نہ ہو ہر ملک میں مختلف ہوتی ہے، اور ایک ملک میں ایسی اکثر اشیا کا خریدنا ضروری

دو ملکوں میں جو ایک دوسرے سے دور واقع ہیں فی کس آمدنی کے اعداد یکساں ہوں تو بھی ان کی اہمیت و وقعت بدیہی طور پر بالکل مختلف ہوگی، اس لیے کہ ان کی قدر و قیمت کے موازنہ کرنے کا پیمانہ مختلف ہے، نہ صرف اس اعتبار سے کہ مذاق مختلف ہیں، بلکہ اس وجہ سے بھی کہ طبعی حالات ضرورتوں کے مختلف معیار عائد کرتے ہیں۔ اگر وسیع نظر ڈالی جائے تو ہندوستان کی آب و ہوا گرم ہونے کے باعث یہاں غذا، لباس، ایندھن اور مکان پر انگلستان کے مقابلے میں کمتر مصارف عائد ہوتے ہیں۔ ان عاملین کے لیے ہر قسم کی رعایت ملحوظ رکھنے کے باوجود مندرجۂ ذیل اعداد سے[1] کافی شہادت ملتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اور بعض دوسرے ملکوں کے درمیان معاشی خوش حالی کی حد تک کس قدر فرق ہے[2]۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ :- ہوتا ہے جو دوسرے ملک میں غیر ضروری ہوتی ہیں یا دوسرے ملک کے اندر تیار ہوتی، پیدا کی جاتی یا مفت دستیاب ہوتی ہیں۔ ہمیں مختلف ملکوں کے صنعتی طبقوں مثلاً ان مزدوروں کا موازنہ نہ کرنا چاہیے جو تعمیر، انجینیری اور طباعت میں کام کر رہے ہوں اس لیے کہ کام کے طریقے اور حالات و شرائط مختلف ہوتے ہیں۔ اگر موازنہ کرنا ہو تو اس قسم کے اختلافات کے ممکنہ نتائج کے بارے میں بہت وسیع رعایت ملحوظ رکھنی چاہیے۔

[1] دیکھو نندلے شر، اس کی کتاب موسوم بہ

(Poverty and Kindred Problems in India Economic)

تیسرا ایڈیشن صفحہ ۴۴ تا صفحہ ۴۵۔

[2] سائمن کمیشن یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ اگر انتہائی رعایت سے کام لے کر شراس کے تخمینے کے مطابق ہندوستان کی حد تک سنہ ۱۹۲۰ء تا سنہ ۱۹۲۱ء کے لیے ۱۰۰ روپے فی کس اور سنہ ۱۹۲۱ء تا سنہ ۱۹۲۲ء کے لیے ۱۱۶ روپے فی کس آمدنی مان لی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سنہ ۱۹۲۲ء کے لیے ہندوستان کی اوسط آمدنی فی کس اس وقت کے مروجہ شرح مبادلہ کے حساب سے ۸ پونڈ سے بھی کم ہوگی، اس کے مقابلے میں انگلستان کے لیے یہ عدد ۹۵ ہوگا۔ "تکمیل طلب ضرورتوں کی

ملک	سال	فی کس آمدنی بحساب پونڈ	ملک	سال	فی کس آمدنی بحساب پونڈ
برطانوی ہند	۱۹۳۱	۵	جرمنی	۱۹۲۵	۳۹
سلطنت متحدہ	۱۹۳۱	۷۶	اٹلی	۱۹۲۷	۲۴
آسٹریلیا	۱۹۲۴	۹۸	مصر	۱۹۲۸	۲۱
ریاستہائے متحدۂ امریکا	۱۹۳۲	۸۹	جاپان	۱۹۲۵	۱۴
فرانس	۱۹۲۸	۴۱	بلغاریہ	۱۹۳۲	۹
چیکوسلواکیا	۱۹۲۵	۳۵	روس	۱۹۲۵	۱۰
ڈنمارک	۱۹۲۷	۵۵	×	×	×

بقیہ حاشیہ گزشتہ :- وسعت کے اختلاف کا لحاظ کرنے کے بعد بھی یہ تضاد عجیب و غریب معلوم ہوگا۔" دیکھو سائمن کمیشن رپورٹ جلد اول فقرہ ۴۲- بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی یہ بتلاتی ہے کہ اگر زراعتی آبادی کی آمدنی کا تخمینہ الگ کیا جائے تو بہت کم ہوگا۔ صوبہ واری کمیٹیوں کی رپورٹوں اور دوسری قسم کی شایع شدہ اعدادی معلومات سے پتا چلتا ہے کہ سنہ ۱۹۲۸ء کی قیمتوں کی سطحوں کی بنیاد پر سالانہ زرعی پیداوار کی مجموعی خام مالیت تقریباً ۱۲ ارب روپے ہے اس بنیاد پر نیز بعض ذیلی پیشوں کی ممکنہ آمدنی کا لحاظ کرنے کے بعد کا اندازہ زرعی آمدنی کا ۲۰ فی صد کیا گیا ہے۔ اور سنہ ۱۹۲۹ء کے بعد کے دہے میں آبادی کے گھٹاؤ اور قیمتوں کے بڑھاؤ کو نظر انداز کر کے برطانوی ہند میں کسان کی اوسط آمدنی ۴۲ روپے یا تقریباً ۳ پونڈ سالانہ سے زائد نہیں ہوتی۔" دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۴۰۔

ظاہر ہے کہ مذکورۂ بالا اکثر ملکوں کی حالت ہندوستان سے بدرجہا بہتر ہے' اگر ہم زیادہ ترقی یافتہ ملکوں کو چھوڑ دیں اور بلغاریہ جیسے مشرقی یورپ کے پسماندہ ملکوں سے یا سوویٹ روس سے موازنہ کریں یا جو انقلاب کے تکلیف دہ دور میں سے گزر رہا ہے تب بھی وہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

۸۔ مفصل تحقیقات

فی کس قومی آمدنی کے حسابات کے علاوہ مختلف دیہات اور علاقوں کی مفصل تحقیقات مختلف محققین مثلاً ڈاکٹر مان نے بمبئی میں اور ڈاکٹر سلیٹر نے مدراس میں کی۔ ڈاکٹر مان نے ۱۹۱۷ئہ میں پمپلا سوداگر نامی موضع کے بارے میں یہ اندازہ قائم کیا کہ ایک متوسط درجے کے اچھے سال میں فی خاندان ۲۱۸ روپے اور فی کس ۴۳ روپے ۳ آنے آمدنی ہوئی۔ ایک خاندان کے مصارف جو ۵ اشخاص پہ مشتمل ہو بلوطہ دار وں اور قرضوں کے سود کے مطالبات کی ادائی کے بعد ۲۰۰ روپے ۸ آنے ہوئے۔ ڈاکٹر مان نے اس عدد میں ۱۱ روپے کا اضافہ اس خیال سے کیا ہے کہ معیاری خاندان کے مقابلے میں جس کے لیے حساب نکالا گیا تھا اس موضع میں بالغوں کا تناسب زیادہ تھا۔ اس طرح ۱۰۳ خاندانوں کے لیے جن کا باضابطہ اندراج موجود تھا ۴۲ روپے ۱۴ آنے فی کس کا اوسط نکلتا ہے۔ اگر بلوطے کو شامل کرلیا جائے تو کسانوں کے خاندانوں میں (۱۰۳ میں سے ۱۷ میں) مجموعی مصارف فی کس ۴۴ روپے ہوں گے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ معمولی سال ہے اور قرضوں کی مد کی ادائی کو نظر انداز کردیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسانوں کے خاندان ۴۴ روپے فی کس آمدنی سے اپنا خرچ چلالیتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرض کی موجودگی' صورت حال کو بدل دیتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر مان اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ " ۱۰۳ خاندانوں کے منجملہ جن کی تحقیقات کی گئی صرف ۳۶ خاندان یا کچھ کم ۳۵ فی صد ایسے ہیں

جو اپنا خرچ اس معیار کے لحاظ سے چلا لیتے ہیں جس کو وہ خود مقرر کرتے ہیں۔ باقی خاندان اس معیار سے نیچے زندگی بسر کرتے ہیں؛ اور یہ نتیجہ جو بہت واضح ہے، نہایت ہی خراب صورت حال کو ظاہر کرتا ہے۔" ڈاکٹر مان نے ایک اور دکنی موضع جاتے گاؤں بدرک نامی کے بارے میں تحقیق کی اور اسی طرح کے نتیجے پر پہنچے۔ میجر جیاک نے بنگال کے ضلع فرید پور کے معاشی حالات کی جو تحقیق سنہ ۱۹۱۰ء تا سنہ ۱۹۱۴ء میں کی اس سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوئے:۔

زندگی کا معیار	اشخاص	آمدنی فی کس (بحساب روپیہ)
راحت و آرام کے ساتھ	۹۵۱/۲۰۵	۶۵
کم راحت و آرام کے ساتھ	۵۲۴۸۰۳	۴۳
تنگدستی سے کچھ بہتر حالت میں	۳۱۹۳۱۵	۳۲
” کی حالت میں	۶۵۸۶۰	۲۶
میزان	۱۸۶۱۱۸۳	(اوسط آمدنی) ۵۲

حال میں کئی اور مفصل تحقیقاتیں کی گئی ہیں۔ چنانچہ مجلس معاشی تحقیق (Board of Economic Enquiry) پنجاب کی دیہی و شہری شاخوں نے کئی تحقیقاتیں کیں۔ ہندوستانی مرکزی کپاس کمیٹی نے کپاس کی کاشت اور فروخت اور کسانوں کی مالی امداد کے بارے میں جو آٹھ تفصیلی تحقیقاتیں ہندوستانی معاشی تحقیقاتی کمیٹی کی تجویز کردہ تحقیقاتوں کی طرح کیں وہ نہایت اہم معلومات بہم پہنچاتی ہیں[1]۔ یہ سب تحقیقاتیں عام طور پر ان

[1] دیکھو ایک عام رپورٹ موسوم بہ

نتائج کی توثیق کرتی ہیں جو لوگوں کی معاشی حالت کے بارے میں اوپر بیان ہو چکے ہیں۔

۹۔ کیا ہندوستانیوں کا افلاس دور ہو رہا ہے؟

اس بات کو ایک حقیقت مانتے ہوئے کہ ہندوستان میں افلاس بہت ہی خطرناک صورت میں موجود ہے، اس سوال کے جواب کہ آیا افلاس بڑھ رہا ہے یا گھٹ رہا ہے یا ایک حالت پر قائم ہے مختلف دیے گئے ہیں۔ واڈیا اور جوشی یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ۱۸۹۵ء تا ۱۹۱۴ء کی بیس سالہ مدت میں باشندوں کی حالت میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ عام خیال یہ ہے کہ لوگوں کی حالت میں در اصل اصلاح و ترقی ہوئی گو کہ اس کی رفتار بہت ہی سست رہی، اور یہ ترقی بحیثیت مجموعی برقرار رہی۔ یہ سچ ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ غیر مطمئن ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن جیسا کہ یورپ کے تجربے سے معلوم ہوتا ہے، یہ عوام کی معاشی حیثیت و حالت کی اصلاح و ترقی کی عین علامت ہے۔ دولت بڑھتے ہی عام طور پر افلاس کا احساس بھی بڑھ جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انتہائی افلاس اس قدر بہیمیت پیدا کر دے کہ افلاس کا احساس ہی باقی نہ رکھے۔ لیکن ادھر افلاس سے کچھ نجات ملی کہ اس سے اور زیادہ چھٹکارا حاصل کرنے کی سوجھتی ہے۔ جدید معاشی ترقیوں کی بدولت انسانی احتیاجوں اور ان کو پورا کرنے کے وسائل میں گوناگوں اضافہ ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ افلاس سے اب مراد "چند ابتدائی ضرورتوں کو پورا

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ (General Report on Eight Investi) (gations iuto Finance and Marketing of Cultivators' Cotton,)

شائع شدہ ۱۹۲۸ء۔

کرنے کی عدم قابلیت" نہیں ہے بلکہ اس سے مطلب "ہر دور کی نئی معلومہ اشیا سے استفادہ کرنے کی عدم قابلیت" ہے۔ گو مغربی ممالک میں عوام کو پچاس سال قبل کے مقابلے میں بہتر لباس، بہتر غذا اور بہتر مکان میسر ہیں، پھر بھی وہ آج کل پہلے سے زیادہ غیر مطمئن اور غیر قانع ہیں۔ بعض مبصرین کا خیال ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کے تخیل میں بھی اسی قسم کی تبدیلی رونما ہوئی ہے، اور یہ اسبات کا نتیجہ ہے کہ ان کی معاشی حالت میں قطعی طور پر اصلاح و ترقی ہوئی ہے۔ لوگ پہلے کے مقابلے میں موجودہ زمانے میں قحطوں کا مقابلہ کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ قومی آمدنی کے بارے میں ہم نے جو مختلف اندازے اوپر پیش کئے وہ اپنے نقائص کے باوجود بحیثیت مجموعی کامیابی کے ساتھ یہ بات ذہن نشین کر دیتے ہیں کہ معاشی حالت میں تدریجی اصلاح و ترقی ہوئی ہے۔ اس خیال کو زرعی و صنعتی مزدوروں کے روز افزوں جذبۂ آزادی جیسے میلانات سے تقویت پہنچتی ہے۔ علاوہ ازیں بحیثیت مجموعی یہ نتیجہ اخذ کرنے کے معقول وجوہ ہیں کہ کپڑے اور غذا کا فی کس صرف بتدریج بڑھ رہا ہے۔ حکومت کا یہ خیال ہے کہ اصلاح و ترقی یقینی ہوئی ہے، اور جو دلائل اس کی تائید میں عام طور پر پیش کئے جاتے ہیں ان کی ایک اچھی مثال ذیل کے اقتباس سے ملتی ہے:۔ "جس حد تک معمولی معیاروں کا اطلاق کیا جا سکتا ہے اس حد تک اوسط ہندوستانی زمیندار، تاجر، رعیت یا دستکار کی حالت پچاس سال قبل کے مقابلے میں اب بدرجہا بہتر ہے۔ وہ نمک، شکر، تمباکو اور درآمدہ اشیائے تعیش و آرام ایک نسل پیشتر کے مقابلے میں اب زیادہ مقداروں میں استعمال کرنے لگا ہے۔ گھر گھر تحقیقات کرنے سے پایا گیا کہ اوسط درجے کا دہقان اپنے باپ کے مقابلے میں زیادہ غذا کھاتا ہے اور بہتر مکان میں رہتا ہے۔ گھروں میں پچھلے زمانے کے بھدے مٹی کے برتنوں کی جگہ اب بڑی حد تک پیتل اور دوسری

دھاتوں کے ظروف سے لی ہے اور اس کے خاندان کو پہلے کے مقابلے میں اب زیادہ کپڑے میسر ہیں[1]۔" اس خاکے کی سچائی کو بعض غیر سرکاری مبصرین معرض بحث میں لائے ہیں" اور اس کی بعض تفصیلات کو خاص طور پر شبہے کی نظروں سے دیکھا گیا ہے۔ مثلاً اس بیان کو عام طور پر تسلیم ہی نہیں کیا جاتا کہ اوسط درجے کا دہقان زیادہ غذا کھاتا ہے۔ متوسط درجے کا کسان اپنی خفیف سی زیادہ آمدنی کو پہلے کے مقابلے میں زیادہ اشیا خریدنے پر صرف کرتا ہے، لیکن وہ اس قابل نہیں ہوا ہے کہ اپنی غذا کے معیار کو بلند کرے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ خیال کرنے کے معقول وجوہ ہیں کہ دیہات میں خاص کر ان دیہات میں جو شہروں کے نواح میں ہیں متوسط درجے کے دہقان کی غذا گھٹیا ہوگئی ہے اور پہلے کے مقابلے میں اس کو خراب اور کم غذا ملتی ہے۔ دودھ کی ذیلی پیداواروں کا اوسط صرف جو زیادہ تر ساگ پات کھانے والوں کی غذا میں اہم حیثیت رکھتا ہے، نمایاں طور پر گھٹ گیا ہے۔ اس کے بدل کے طور پر بظاہر کسی ایسی شے کا اضافہ بھی نہیں ہوا ہے جس کے متعلق یہ خیال کیا جاسکے کہ وہ غذا کی حیثیت سے مساوی اہمیت رکھتی ہے، اگرچہ اس بات کو مان لیا جاسکتا ہے کہ لوگوں کی غذا میں نقل و حمل اور وسائل آمد و رفت کی اصلاح و ترقی کی بدولت بہت تنوع پیدا ہوگیا ہے۔ جو شہادت دستیاب ہوتی ہے اس کی نوعیت غیر اطمینان بخش ہونے کی وجہ سے ممکن ہے کہ اکثر لوگ اس مسئلے کے بارے میں کہ آیا قومی آمدنی بڑھ رہی ہے یا نہیں نیز اس سے بالکل ہی مختلف مسئلے کے بارے میں کہ آیا

[1] دیکھو (Results of Indian Administration in the Past Fifty Years.

شائع شدہ ۱۹۰۹ء صفحہ ۲۱۔ جس کی عبارت کو ایل، سی، اے، نالس نے اپنی کتاب موسوم بہ "برطانوی سلطنت ماوراالبحر کی معاشی ترقی" از ۱۷۶۳ء تا ۱۹۱۴ء جلد اول صفحہ ۲۷۵ پر نقل کیا ہے۔

دولت سے قطع نظر کرتے ہوئے خوشحالی میں اضافہ ہو رہا ہے یا نہیں اپنا فیصلہ ملتوی رکھنے کی تکلیف برداشت کرنے کو ترجیح دیں۔ لیکن یہ مان لینے کے باوجود کہ ملک کی دولت میں کچھ اضافہ ہوا ہے اس کا مقابلہ اس حیرت انگیز ترقی سے نہیں کیا جاسکتا جو انگلستان جیسے مغربی ممالک نے کچھ سال ادھر کی ہے۔ چنانچہ اس ترقی کی جھلک ناداروں کی کمی، شرح اموات کی کمی، مفلسوں کے امراض کی کمی، اجرت کی زیادتی، کام کے گھنٹوں کی کمی، تعلیم کی اشاعت اور اصلاح و ترقی، تفریح و تفنن کے وسائل کی کثرت، اور بہتر انتظام سکونت و حفظ صحت وغیرہ میں نظر آتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مغرب میں دولت کی تقسیم میں عظیم عدم مساوات ہے، لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ معاشی خوشحالی میں عام طور پر اضافہ ہوا ہے۔ زندگی کی ضروریوں اور آرام کی اشیا کی کثرت و ارزانی اور اس کے ساتھ آمدنیوں کے عام اضافے کی بدولت عوام کو ایسی اکثر اشیا اور آسائش کے ذرائع پر دسترس حاصل ہو گئی ہے۔ جن پر پہلے بہت ہی مالدار طبقے کو قابو حاصل تھا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے جیسا کہ وائی کونت دی آوینل (Vicounte D' Avenel) نے کہا ہے کہ "لطف اندوزیوں کی سطح بلند ہو گئی ہے"[1]

۱۰۔ بہتر اعداد و شمار کی ضرورت موجودہ حالات میں ہندوستان کے باشندوں کی معاشی حالت کے بارے میں مختلف مسائل پر کوئی قطعی رائے ظاہر کرنے میں توقف اور غیر یقینی طرز عمل کے سوا کوئی اور چیز ممکن ہی نہیں ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ صحیح اعدادی معلومات مفقود ہیں۔ انتہائی افلاس کے بدیہی واقعے کے علاوہ دوسرے امور کے

---

[1] دیکھو (Georges D' Auennel) کی کتاب موسوم بہ (Decouvertes d' Histoire Sociale) صفحہ ۱۹۵ تا ۳۱۰۔

بارے میں بھی ہمیں کوئی معلومات حاصل نہیں ہیں۔ معتبر اعدادی مواد کے جمع کرنے سے ہماری معلومات زیادہ صحیح ہوجائیں گی اور بیشمار قیاسات اور مفروضات جو اس وقت ہر تحقیق میں ناگزیر ہیں قائم کرنے کی ضرورت کم ہوگی۔ نیز اس کی بدولت ان بیشمار معاشی و معاشری خرابیوں کا صحیح علاج بھی معلوم ہو جائے گا جن میں ملک مبتلا ہے اور روزمرہ کے نظم و نسق کے مسائل کو حل کرنے میں مدد ملے گی۔ ہندوستانی معاشی تحقیق کی کمیٹی (۱۹۲۵ء) نے اس سلسلے میں لندن ٹائمز کے مندرجۂ ذیل برجستہ ریمارک کو نقل کیا ہے۔

سلطنت برطانیہ کی اعداد کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے جس کا اجلاس جنوری و فروری ۱۹۲۰ء میں ہوا، کمیٹی نے کہا کہ جنگ عظیم سے پیشتر جرمنی کا محکمۂ اعداد و شمار ہر اس معاملے کے بارے میں اعداد مہیا کرنے میں لگاتار مصروف تھا جس سے جرمن قوم کے مستقبل کے روشن بننے کی توقع تھی اور اس ممتاز دور میں جس کا اب آغاز ہوا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ وہ قوم جو واقعات کی رفتار کا اعداد کی تحلیل کے ذریعے سے مطالعہ کررہی ہو کسی دوسری قوم کے مقابلے میں جو غالباً محض تجربی طریقوں پر بھروسا کرتی ہو، قطعی طور پر ساز و سامان سے بہتر طور پر آراستہ اور تیار ہوگی۔“ موجودہ زمانے میں جو اعداد و شمار فراہم کیے جاتے ہیں وہ عام طور پر غیر مربوط ہوتے ہیں، ان کی ماہرانہ نگرانی نہیں کی جاتی اور وہ عام طور پر انتظام حکومت کی ذیلی پیداوار ہوتے ہیں جن کا مقصد اہم معاشی و معاشری جد و جہد کے بارے میں عوام کو معلومات فراہم کرنے سے زیادہ سرکاری محکموں کو مستفید کرنا ہوتا ہے۔

یہ بالکل سچ ہے کہ ہندوستان میں اعداد و شمار کی فراہمی کی راہ میں غیر معمولی مشکلات حائل ہیں۔ چنانچہ اولاً ملک کی عظیم وسعت کے

لہ دیکھو معاشی تحقیق کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۴۔

باعث اس کام کو انجام دینا بیش خرچ اور مشکل ہے۔ دوسرے یہ کہ آبادی دیہات میں پھیلی اور بکھری ہوئی ہے اور شہروں اور قصبوں میں مرتکز نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ جہالت اور ناخواندگی کی بنا پر اعداد و شمار فراہم کرنے کے کام میں عوام کا تعاون حاصل کرنا عملاً غیر ممکن ہے۔ برطانیۂ عظمیٰ اور برطانوی نو آبادیات میں پیدائش دولت، اجرت اور قیمتوں کے متعلق اعداد و شمار فراہم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ خانگی افراد میں جن سے مواد حاصل کرنا مقصود ہو۔ جدولوں اور گوشواروں کے فارم تقسیم کر دیے جاتے ہیں تاکہ خانہ پری کے بعد مقررہ مدت کے اندر واپس کر دیے جائیں۔ یہ طریقہ، تنخواہ یاب خصوصی عملے سے کام لینے کے طریق کے مقابلے میں زیادہ درست اور کم خرچ ہے۔ نجی خانگی انجمنوں سے بھی مدد لی جاتی ہے۔ لیکن ہندوستان میں ایسی انجمنیں تقریباً بالکل مفقود ہیں۔ یہاں منظم تدابیر کی عدم موجودگی اور بیشمار چھوٹے پیمانے کی غیر منظم مساعی کی بنا پر اعداد و شمار کی فراہمی غیر معمولی طور پر مشکل ہو جاتی ہے۔

گو یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ہم مستقبل قریب میں اس معیار کو حاصل کر لیں گے جو مغربی ممالک میں معمولاً موجود ہے، تاہم اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان میں بحالت موجودہ بہت کچھ اصلاح و ترقی کی گنجائش ہے۔ معاشی تحقیق کی کمیٹی کی رپورٹ اور پروفیسر برنٹ ہرسٹ کے اختلافی نوٹ میں اس بارے میں کئی مفید اشارے موجود ہیں کہ اس کام کو کس طرح کیا جا سکتا ہے۔

۱۱۔ بولے اور رابرٹسن کی تحقیق۔ نومبر ۱۹۳۳ء میں حکومت ہند نے لندن اسکول آف اکنامکس کے پروفیسر اے، ایل، بولے اور کیمبرج کے

۱۔ دیکھو پروفیسر برنٹ ہرسٹ کا اختلافی نوٹ "معاشی تحقیق کی کمیٹی کی رپورٹ" میں صفحہ ۹۳ تا صفحہ ۹۶۔

پکار معاشیات ڈی' بیچ' رابرٹ سن کی خدمات اس غرض سے حاصل کیں کہ زیادہ صحیح اور مفصل اعداد و شمار حاصل کرنے اور پیدائش دولت کے اعداد حاصل کرنے کے امکانات پر حکومت کو مشورہ دیا جائے۔ تین ہندوستانی معاشیین بھی ان دو خصوصی ماہروں کے شریک کار تھے اور ان سب حضرات کی کوششوں کا نتیجہ ایک رپورٹ کی شکل میں ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ اس رپورٹ کا نام "ہندوستان کے معاشی اعداد و شمار کی فراہمی کی تجویز" A scheme for an Economic Census of India تھا' اور ذیل میں اس کا مختصر خلاصہ درج کیا جاتا ہے:-

۲۱-(۱) اعداد و شمار کی تنظیم۔ ماہران معاشیات کا ایک دوامی عملہ قائم کرنا چاہئے اور اس کا تعلق گورنر جنرل کی مجلس عاملہ کی معاشی کمیٹی سے براہ راست رکھنا چاہئے۔ یہ عملہ چار ارکان پر مشتمل ہونا چاہئے جس کا سینیر رکن مجلس عاملہ کی معاشی کمیٹی کے معتمد کی حیثیت سے کام کرے اور معاشی معلومات کے کل کام کی تنظیم کا ذمہ دار رہے اس طرح اس کا کام یہ ہوگا کہ وقتاً فوقتاً جو ضروری اور فوری توجہ کے لائق مسائل رونما ہوں ان کے بارے میں رپورٹیں تیار کرے' اور اسی غرض سے اس کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ اندرون و بیرون ملک کے معاشی و کاروباری واقعات کے متعلق تازہ معلومات کی بہم رسانی کا انتظام کرے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کا یہ بھی فرض ہوگا کہ مستقبل کے بارے میں پہلے سے غور و فکر کرتا رہے اور زیادہ وسیع اور زیادہ بنیادی قسم کی تحقیقاتوں کے خاکے مرتب کرنے میں پیش قدمی کرے۔

عملے کے باقی دو رکن تربیت یافتہ معاشیات دان ہوں گے' اور تیسرا رکن ناظم اعداد و شمار ہوگا۔ عملہ تاحدامکان انفرادی حیثیت کی بجائے اجتماعی حیثیت سے کام کرے گا۔ لیکن چونکہ معاشیات کا میدان اس قدر وسیع ہے کہ کوئی ایک شخص اس کی مساحت نہیں کرسکتا' لہٰذا اس کام کو سینیر رکن اور دو افسران معاشی معلومات اپنے میلان طبع اور

اپنی صلاحیتوں کے مطابق آپس میں تقسیم کرلیں۔ مثلاً ان میں سے ایک کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ ہندوستان کی تجارت خارجہ کی توسیع یا پالیسی کے اقتضا کے مطابق تجارت کی منظم تحدید کے وسائل کی تحقیق اور محصولوں اور تجارتی معاہدوں کے عملدرآمد کے مطالعے کو اپنے لیے مختص کرلے۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ ہر دو افسران معاشی معلومات اسی آزادی کے ساتھ کام کرسکیں جو سیول سروس کی رکنیت کے شایان ہو۔ اس کل عملے کو حکومت کے دوسرے عہدہ داروں سے نہایت ہی قریبی ربط قائم رکھنا پڑے گا۔ ان عہدہ داروں میں سے بعض تو وہ ہوں گے جن کے فرائض زیادہ تر انتظامی ہیں اور بعض وہ ہوں گے جن کا اصلی کام فنی اور مشیرانہ نوعیت رکھتا ہے۔ اس عملے کو اس امر کا اختیار ہوگا کہ مجلس عاملہ کی معاشی کمیٹی کے پاس غیر ملکی خصوصی ماہروں کی خدمات اس غرض سے حاصل کرنے کی سفارش کرے کہ وہ پیدائش دولت کے خصوصی رقبوں یا خصوصی شعبوں یا طریقوں کے معاشی امکانات کے بارے میں رپورٹ پیش کریں۔

ناظم اعداد وشمار عملے کا رکن رہے گا اور دوامی معاشی عملے کو معلومات بہم پہنچانے کا اہم وسیلہ رہے گا۔ اس کے علاوہ اس کے خصوصی فرائض بھی ہوں گے جن کی انجام دہی میں اس کو خاصی وسیع آزادی حاصل ہوگی۔ ان فرائض میں حسب ذیل کام شامل ہیں:-

(۱) مردم شماری کا انتظام؛
(۲) پیدائش دولت کے متعلق اعداد وشمار کی فراہمی۔
(۳) مرکزی اعداد وشمار کی تدوین؛ اور
(۴) صوبہ واری اعداد وشمار کی تدوین۔ اس کو ان کاموں میں مدد دینے کے لیے محکمۂ تجارتی معلومات واعداد وشمار کی موجودہ شاخ ”اعداد وشمار“ اس کی نگرانی میں دیدی جائے گی اور اس کے مستقل کارکنوں میں کچھ اضافہ کرنے کی ضرورت ہوگی۔ محکمۂ مذکور کی

شاخ ''تجارتی معلومات'' جو زیادہ تر تجارتی دنیا کی تحقیقات سے متعلق ہوتی ہے، محکمۂ صنعت و حرفت کی ایک شاخ بن جائے گی۔

پیدائش دولت کے اعداد و شمار پنجسالہ مرتب کرنے چاہئیں اور گو عام مردم شماری ہر دس سال کے بعد عمل میں آتی رہے گی۔ پھر بھی ہر پانچ سال کے بعد ایک زائد مردم شماری کرنی چاہئے اور مختصر جدولوں یا گوشواروں میں زیادہ تر آبادی، عمر، جنس اور پیشے کے متعلق تحقیقات کا اندراج ہونا چاہئے۔ مردم شماری اور پیدائش دولت کے اعداد و شمار ترتیب جدول کی ضرورتوں کے مطابق حتی الامکان ہم زماں ہونے چاہیں۔ ان اعداد و شمار کی تیاری اور ان کے نتائج کی تحلیل، اعداد و شمار کے مستقل عملے کی خصوصی شاخ کے لیے تقریباً مسلسل طور پر کام فراہم کرے گی، اور دہ سالہ مردم شماری کے موقع پر اس عملے کا کام زیادہ وسیع انتظامات کی شکل اختیار کرے گا۔

ناظم اعداد و شمار کو اس امر کا اختیار ہونا چاہئے کہ تمام محکموں میں اعداد و شمار کی تیاری کے جو لوگ ذمہ دار ہیں ان سے اس غرض سے مشورہ کرے کہ تبویب میں یکسانی پیدا کی جا سکے اور وہ سب اعداد و شمار فراہم کئے جا سکیں جو عام اغراض کے لیے مطلوب ہوں۔ لیکن ساتھ ہی اسبات کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ محکموں کے فائدے کے لیے جو دوسرا مواد ضروری ہو ان کی فراہمی بے جا طور پر متاثر نہ ہو۔ ناظم مذکور کو اعدادی خلاصے کی اشاعت کا بھی ذمہ دار ہونا چاہئے۔

یہ ضروری ہے کہ ہر بڑے صوبے میں ایک ہمہ وقتی ماہر اعداد و شمار کا تقرر کیا جائے اور جہاں تک انتظامی ضرورتیں اجازت دیں محکمہ واری نگرانی سے اس کو آزاد رکھا جائے۔ لیکن اس کی خدمات کو سب محکموں کے لیے قابل حصول بنانا چاہئے، سب محکموں کے اعداد و شمار اس کی نظر سے گزرنے چاہئیں، اس کے ذریعے سے مرکزی ناظم اعداد و شمار کی نگرانی میں مردم شماری ہونی چاہئے اور اس خصوصی ماہر کو

اول الذکر کے ساتھ ہر ممکن طریق پر ملکر کام کرنا چاہیئے۔ اس قسم کے افسر ہر جگہ مقرر ہونے تک ناظم کا یہ کام ہوگا کہ ہر صوبے میں ہر ایسے شخص سے ربط قائم کرے جس سے اس کی ضرورت کی تکمیل ہو، تا کہ صوبہ واری اعداد و شمار میں یکسانی قائم کی جاسکے اور اس طرح ان کو کل ہند میزانوں میں جوڑنے میں سہولت ہو۔

۱۳۔ (۲) قومی آمدنی کا اندازہ مذکورہ رپورٹ کے مصنف یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں ہندوستان کی قومی آمدنی اور دولت کا اندازہ کرنے کے لیے جو مواد دستیاب ہوسکتا ہے وہ بہت ہی ناقص ہے، اس وقت تک جو بھی اندازے کیے گئے ہیں وہ بہت پرانے ہوچکے ہیں اور وقت اور حالات کا یہ اقتضا ہے کہ اس مسئلے کو از سر نو ہاتھ میں لیا جائے۔

قومی آمدنی کیا ہے؟ اس سے ان اشیا اور خدمات کی مجموعی مقدار زر کی شکل میں معلوم ہوتی ہے جو کسی ملک کے باشندوں کو ایک سال کے دوران میں حاصل ہوں۔ اگر انفرادی یا مجموعی دولت میں کوئی خالص اضافہ ہو تو اس کو قومی آمدنی میں شامل کرنا اور خالص کمی ہو تو اس کو خارج کرنا ضروری ہے۔ لیکن اگر زلزلے یا مویشیوں کے شدید طاعون جیسی کسی ناگہانی آفت و تباہی سے دولت کا نقصان ہو تو غالباً بہترین طریق کار یہ ہے کہ اس کو نظر انداز کردیا جائے۔

جیسا کہ سب کو بخوبی علم ہے، حساب کرنے کے دو طریقے ہیں پہلا طریقہ یہ ہے کہ جملہ اشیا اور خدمات کی مالیت کا اندازہ کیا جائے اور دوسرا یہ کہ انفرادی آمدنیوں کی مجموعی مقدار معلوم کی جائے۔ یہ دونوں طریقے ایک دوسرے کی راہ میں رکاوٹ نہیں پیدا کرتے مثلاً کابینے کے وزرا کی خدمات کے متعلق یہ خیال کرنا چاہیئے کہ وہ ان کی تنخواہوں کے مساوی مالیت رکھتی ہیں، اس لیے کہ ان خدمات کی قیمت کا

اندازہ لگانے کا کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔ ہندوستان کی حد تک یہ غیر ممکن معلوم ہوتا ہے کہ " پیدائش دولت کے اعداد و شمار مہیا کرنے " یعنی پہلے طریقہ کا اطلاق کل صنعتی میدان پر یکساں طور پر ہوسکے گا۔ اس لیے ممکن ہے کہ دونوں طریقوں کے نتائج کو نہایت احتیاط کے ساتھ یکجا کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

پہلے طریقے یعنی پیدائش شماری میں حسب ذیل کام ضروری ہیں۔

(۱) پیدآور کاروبار، زراعت، کان کنی، اور صنعت وغیرہ کے مختلف شعبوں کی خاص پیداوار کی مالیت کا اندازہ پیدائش کے مقام پر کرنا۔ لیکن یہ احتیاط کرنی چاہئے کہ ایک ہی شئے کا دو مرتبہ شمار نہ ہونے پائے گیہوں کی پیداوار کو شمار کرنا اور اسی کے ساتھ ان مویشیوں کی محنت کو شمار کرنا جو اس گیہوں کے پیدا کرنے میں لگے

(۲) ملک میں تیار کی ہوئی اور درآمدہ اشیاء کی قیمتوں میں نقل و حمل کی وجہ سے جو اضافہ ہو اس کو جوڑنا۔

(۳) ملک میں تیار کی ہوئی اشیا پر جو محصول چنگی ہے اس کو جوڑنا۔

(۴) اشیائے برآمد بشمول طلا و نقرے کی قیمت جو جہاز پر لدائی کے وقت تک ہوتی ہے اس کو تفریق کرنا۔

(۵) درآمدہ اشیا بشمول طلا و نقرے کی جو قیمت جہاز سے اتارتے وقت تک ہوتی ہے اس کو جوڑنا۔

(۶) درآمدہ اشیا پر محصول کروڑگیری کا اضافہ کرنا۔

(۷) ملک میں تیار کی ہوئی یا درآمدہ اشیا کی قیمت کو تفریق کرنا جو اصل قائم کو برقرار رکھنے میں استعمال کی گئی ہو۔ یا ایسی خام و مکمل اشیا کے ذخائر کی قیمت کو تفریق کرنا جن کو ہاتھ نہ لگا یا گیا ہو۔

(۸) ہر قسم کی ذاتی خدمات کی آمدنی کو جوڑنا۔

(۹) مکانوں کے کرائے کی سالانہ آمدنی کو جوڑنا، خواہ وہ کرائے پر اٹھائے جائیں یا مالکوں کے قبضے میں رہیں۔

(۱۰) ملکی باشندوں کے فاضلات اور تمسکات غیر ممالک میں ہوں تو ان کی آمدنی کو جوڑنا، یا ایسے فاضلات یا تمسکات میں کوئی گھاٹا آئے تو اس کو منہا کرنا، اور غیر ملک کے باشندوں کے تمسکات و فاضلات اس ملک میں ہوں تو ان کی آمدنی کو منہا کرنا، یا ایسے تمسکات و فاضلات میں گھاٹا آئے تو اس کو جوڑنا۔

ان طریقوں میں سے بعض مزید تشریح کے طالب ہیں۔

(۱) زراعت وغیرہ کی پیداوار کے اس جز کی (جس کی مقدار ہندوستان میں بہت بڑی ہے) مالیت کا اندازہ جو پیدا کرنے والا خود ہی صرف کرے یا جس کا مبادلہ مقامی طور پر خدمات کے لیے کیا جائے اس کی اور پیداوار کی طرح مقام پیدائش کی قیمت کے حساب سے لگانا چاہیئے نہ کہ خردہ فروش کی قیمت پر جو دور کے بازاروں میں صارف ادا کرتے ہیں اور جن میں اٹھانے اور ڈھونے وغیرہ کے مصارف شامل ہوتے ہیں۔ مصارف مقامی طور پر صرف ہونے والی اشیا پر عاید نہیں ہوتے۔ (۳) و (۶) یہ اس لیے ضروری ہے کہ جس میزان کو ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ صارف کے لیے قدر مبادلہ کی مجموعی مقدار ہے۔

(۴) (۵) و (۱۰) یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ اگر حکومت ہند ریلوے کی تعمیر کے لیے لندن میں قرضہ حاصل کرے تو درآمدہ تمسکات انگریز مشغل اصل کرنے والوں کی حقیقی آمدنی کا اسی طریقے سے جزو بنجاتے ہیں جس طریقے سے کہ ہندوستانی چائے کی درآمدہ اسی حقیقت کا معکوس پہلو یہ ہے کہ ہندوستان کے اصل کا اضافہ جو پیدا شدہ دولت یا درآمدہ اشیا کے اندازے میں شامل رہتا ہے اس سرمائے سے متوازن ہو جاتا ہے جو غیر ممالک کے باشندوں کو واجب الادا ہو اور اس کا منہا کرنا خالص آمدنی معلوم کرنے کے لیے ضروری ہے۔

اسی قسم کے ملحوظات کا اطلاق بنکوں کے فاضلات کی ملکیت کے ردّ و بدل پر بھی ہوتا ہے خواہ یہ ردّ و بدل ملک میں ہو یا ملک سے باہر، اور ہندوستان کی حد تک جو چیز بہت ہی اہم ہے وہ یہ ہے کہ ان ملحوظات کا اطلاق قیمتی فلزات کے ذخیرے کی کمی اور بیشی پر بھی ہوتا ہے جو اس غرض کے لیے غیر ملکی تمسکات تصور کیے جاسکتے ہیں۔

(۸) (ا) سچ پوچھو تو یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ صرف ان سرکاری ملازموں کی خدمات کو شامل کرنا چاہئے جو زندگی کی امان اور حفاظت وغیرہ جیسے افادے براہ راست مہیا کرتی ہیں۔ اور جو ان خدمات سے نمایاں طور پر الگ اور ممتاز ہوتی ہیں جو پیدائش دولت کو بڑھانے میں مدد دیتی ہیں۔ چنانچہ موخر الذکر کی آمدنی کو دوسرے تمام مصارف پیدائش کے مثل پیداوار کی قیمت فروخت میں ضمن (۱) کے تحت شامل کیا جاچکا ہے۔ اس پیچ دار تفریق و تقسیم سے جو الجھاؤ پیدا ہوتا ہے اس کو یہاں سلجھانے کی کوشش کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ آگے چلکر سہولت کی خاطر یہ فرض کیا جائے گا کہ جملہ سرکاری ملازموں کی خدمات براہ راست افادہ مہیا کرتی ہیں اور حقیقی قومی آمدنی کا جزو ہیں۔ جو لوگ چاہیں وہ اپنے مذاق کے مطابق ان میں سے منہائیاں کرسکتے ہیں۔ ان خدمات کی آمدنی کے اندازے میں وہ حقوق وظیفہ بھی شامل ہونے چاہئیں جو سال بہ سال ان خدمات کے انجام دینے والوں کو حاصل ہوں۔

(ب) ہندوستان میں خیراتی عطیوں (جو آمدنی کا جزو نہیں ہوتے) اور رسمی یا مذہبی نوعیت کی خدمات کے معاوضوں میں جو فرق و امتیاز کیا جاتا ہے وہ نمایاں طور پر غیر قطعی ہے اور ان کے درمیان جو امتیازی خط کھینچا گیا ہے وہ یقیناً بے ضابطہ ہے۔

قومی آمدنی کا اندازہ لگانے کے جو دو طریقے ہیں ان میں پیدائش شماری کا جو طریقہ اوپر بیان ہوا زیادہ بنیادی ہے۔ دوسرے طریقے یعنی

"آمدنی شماری" کے نتائج کو اول الذکر طریقے کے نتائج کے مطابق بنانے کی غرض سے بعض احتیاطی تدابیر کا اختیار کرنا ضروری ہے۔

(۱) فرد واحد کی آمدنی میں وہ سب پیداوار جو وہ صرف کرے اور سب وصولات بشکل جنس کو شامل کرنا چاہیئے اور ان کا اندازہ پیدائش کے مقام پر قیمت فروخت کے حساب سے کرنا چاہیئے۔ اسی طرح ان مکانوں کے سالانہ کرایوں کو بھی شامل کرنا چاہیئے جن میں مالک خود رہیں۔

(۲) فرد واحد کی آمدنی کو شامل کرنے سے پیشتر جملہ سود کی رقم، خواہ وہ ایسے قرضوں کا سود ہی کیوں نہ ہو جو صرف کے اغراض کے لیے لئے جائیں، منہا کرنی چاہیئے۔

(۳) اس سے قطع نظر کرتے ہوئے ملک کے جملہ افراد کی آمدنیاں جن میں سرکاری قرضوں کا سود اور سابق ملازموں کے وظائف شامل ہوں خام آمدنی کی شکل میں یعنی محصولات بلا واسطہ (بشمول مالگزاری)
۱۵۹ ادا کرنے سے پیشتر جو خام آمدنی قرار پاتی ہو شریک کرنی چاہئیں۔ سرکاری ملازموں کی آمدنیوں کو بشمول ان حقوق وظایف کے جو سال کے دوران میں وصول ہوں شامل کرنا چاہیئے۔

اس طرح جو مجموعی مقدار حاصل ہو اس میں سرکاری کاروبار کے خالص منافع اور کمپنیوں کے غیر منقسمہ منافع کا اضافہ کرنا چاہیئے۔ اس مجموعی مقدار میں سے وہ رقم منہا کرنی چاہیئے جو پیداآور کاروبار کے سوا دوسرے اغراض کے واسطے لیے ہوئے سرکاری قرضوں پر سود اور سابق سرکاری ملازموں کے وظائف ادا کرنے کے لیے ضروری ہو، خواہ یہ وظائف ملک کے اندر دیئے جائیں یا باہر۔

(۴) اگرچہ یہ کسی قدر انوکھا سا معلوم ہوتا ہے لیکن اس طرح جو مجموعی مقدار حاصل ہو اس میں وہ سب محصول جوڑنے چاہئیں جو کاروباری مصارف کی نوعیت رکھتے ہوں، مثلاً کروڑگیری اور چنگی، اسٹامپ کے محصول اور مقامی محصولوں کے ماحصل؛ اس لیے کہ

موخر الذکر مبادلے کی ان قدروں کا مجموعہ ہے جو دولت پیدا کرنے والوں کو حاصل ہوتا ہے، اس کے برخلاف حقیقی قومی آمدنی جس کا حساب پیدائش شماری کے طریق پر کیا جائے مبادلے کی ان قدروں کا مجموعہ ہے جو صارفوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ پس تا وقتیکہ ان محصولوں کو چھوڑا نہ جائے اندازہ غلط ہوگا۔

ذیل میں جو تجاویز پیش کی گئی ہیں ان کا تعلق قومی آمدنی کے وسیع شعبوں کے اندازے سے ہے، اور جس جمع و خرج کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کو آخری حساب میں ملحوظ رکھنا ہوگا۔

رپورٹ کے مصنف موجودہ زمانے میں ہندوستان کی حد تک اس امر کی سفارش نہیں کرتے کہ قومی دولت کا بحیثیت مجموعی اندازہ لگایا جائے۔ اس کا اندازہ لگانے کے دو طریقے ہیں جن کو دوسرے ملکوں میں اختیار کیا جاتا ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ہندوستان کے لیے موزوں نہیں ہے۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ تمام آمدنی خیز جائداد کی مع کاروباری شہرت کے سربستہ مالیت اس طرح معلوم کی جاتی ہے کہ زمینوں اور مکانوں کے لگان، منافع اور سود وغیرہ کی سالانہ آمدنی کے لحاظ سے چند سالوں کی مجموعی آمدنی بطور مالیت معین کی جاتی ہے اور بعض اوقات ان املاک کی مالیت کے اندازے بھی اس میں داخل کر لیے جاتے ہیں جو ملکیت عامہ ہوتے ہیں، جیسے جہاز سازی کے کارخانے ریلیں اور سرکاری عمارت وغیرہ۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس جائداد کے اعداد و شمار سے کام لیا جائے جو موت واقع ہونے کی صورت میں منتقل ہوتی ہے، یہ اعداد و شمار وصیت ناموں کی سرکاری تصدیق سے حاصل کیے جائیں، اور زندہ لوگوں کی جائداد کے گوشواروں سے جائداد کی کل مالیت کا اندازہ کیا جائے۔ یہ طریقہ ہندوستان میں ناقابل عمل ہے؛ اس لیے کہ یہاں دراصل وراثت پر کوئی محصول نہیں لگایا جاتا
پہلے طریقے کی حد تک انفرادی جائداد کی اکثر اہم قسموں کی مالیت کے

اندازے کے لیے یقیناً کافی معلومات نہیں ہیں؛ اور اگرچہ ریلوں کی مالیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، لیکن کارہائے آب پاشی اور سرکاری مصارف کی دوسری اکثر اہم مدوں کا اندازہ ناممکن ہے۔

گو مصنفوں کو یہ توقع نہیں ہے کہ دولت کی مجموعی مقدار کا اندازہ ویسی صحت کے ساتھ جو ان کی سعی کو حق بجانب قرار دے کیا جاسکتا ہے، پھر بھی یہ ممکن ہے کہ دولت جو شکلیں اختیار کرے ان کی کچھ سلسلہ وار کیفیت بیان کی جائے مثلاً دوامی کاموں پر مصارف عامہ نئے کاروبار میں شغل اصل اور دوسرے مصارف اصل جو شغل اصل سے متعلق ہوں۔

قومی دولت کا اندازہ کرنے کی غرض سے جو تحقیقات تجویز کی گئی ہے وہ پیدائش دولت پر مبنی ہے۔ لیکن جیسا کہ تمام ملکوں میں اس قسم کے اندازے قائم کرنے میں ہوتا ہے یہاں بھی تحقیقات کے کچھ حصے کا انحصار انفرادی آمدنیوں پر ہے۔ ہندوستان میں انفرادی آمدنیوں کا تناسب شہروں میں غالباً زیادہ ہے، لیکن مجموعی مقدار کی حد تک مغربی ممالک کے مقابلے میں بدرجہا کم ہے۔ دیہی آمدنی شہری آمدنی سے الگ بتلائی گئی ہے۔ اس لیے کہ شہر اور دیہات کی پیداوار کی نوعیت میں اختلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر دو مقامات کے لیے تحقیقات کے مختلف طریقے درکار ہوتے ہیں۔

دیہی آمدنی کے بارے میں مصنف اس امر پر زور دیتے ہیں کہ زمین سے حاصل ہونے والی ہر قسم کی پیداوار کی مقدار اور آمدنی اور گاؤں میں انجام دی ہوئی خدمات کی آمدنی کا اندازہ کرنے کے لیے نمونہ دیہات میں تفصیلی تحقیقات کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

شہری آمدنی کی حد تک وہ یہ سفارش کرتے ہیں کہ بڑے شہروں کی تحقیقات اسی طریق پر کی جائے جس کو دوسرے ملکوں میں اختیار کیا گیا ہے۔ اس طریقے کی رو سے خاندانوں کے افراد اور پیشوں کی جانچ

اور تحقیقات کی جاتی ہے' اور کسی حد تک ان خاندانوں کے شخصی بیانات کے ذریعے سے اور کسی حد تک شہروں میں مروجہ اجرت اور تنخواہوں کی تحقیقات کے ذریعہ سے اندازہ کیا جاتا ہے۔ ایک ہزار روپیے یا کم از کم دو ہزار روپیے کی آمدنی سے اوپر کی آمدنیوں کے لیے انکم ٹکس کے اعداد و شمار بہت ہی کار آمد ثابت ہوسکتے ہیں۔

رپورٹ مرتب کرنے والوں نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ شہری آبادی کی حد تک ایک درمیانی مردم شماری بھی ہونی چاہیئے۔ ان تینوں تحقیقاتوں کے علاوہ ایک اور تحقیق یعنی پیدائش شماری کا بھی اضافہ کرنا ہوگا جو قوت استعمال کرنے والے کارخانوں کانوں اور بعض دوسری صنعتوں کے متعلق ہوگی۔ اول الذکر تحقیق شہری تحقیق سے بڑی حد تک اور دیہی تحقیق سے خفیف حد تک متصادم ہوجائے گی لیکن وہ بجائے خود بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے اور یہ خیال کیا گیا ہے کہ کم از کم جملہ کیفیت کے ایک جزو کی حد تک وہ دوسری تحقیقوں کے مقابلے میں زیادہ صحیح حال پیش کرے گی۔ یہ خیال کیا گیا ہے کہ جب سب مواد جمع ہو جائے گا تو دو مرتبہ کسی چیز کو شمار نہ کرنے کے متعلق تدابیر معلوم کی جائیں گی اور وہ اس طرح کہ شہری یا دیہی تحقیقاتوں اور پیدائش شماری دونوں میں جو آمدنی شامل کی گئی ہو اس کو علیحدہ معلوم کیا جائے یا دوسرے طریقوں سے اس مقصد کو پورا کیا جائے۔

اس کے بعد آبادی اور اصل تحقیقاتوں کے نتائج کے لحاظ سے چھوٹے شہروں کی آمدنی معلوم کرنا باقی رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چائے کے باغات اور دوسرے خصوصی علاقوں کی حد تک جو دیہی تحقیقاتوں میں شامل نہ کئے گئے ہوں۔ مزید تخمینے مرتب کرنے ہوں گے۔

تمام تحقیقاتوں کو دیسی ریاستوں سے اس حد تک متعلق کرنا چاہیئے جس حد تک کہ ریاستیں اس کے لیے تیار اور تعامل کے قابل ہوں ان سب رقبوں کے لیے جو اس طرح محسوب نہ کئے گیے ہوں

زرعی اعداد و شمار سے کام لیکر اندازے کرنا ضروری ہو گا۔

ان تجاویز پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہندوستان کی آبادی کے اکثر طبقوں کی آمدنی اور ملک کے بیشتر علاقوں کی پیداوار کا خاصا صحیح اندازہ ہو جائے گا۔ اس طرح اندازہ کر لیا جائے تو قیاس آرائی کو کم کرنے اور قطعی و یقینی واقعات کو محسوب کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

۴ ۱۔ ۳ پیدائش دولت کے اعداد و شمار۔ پیدائش دولت کے اعداد و شمار کی ترتیب کا کام برطانیہ عظمی کے مثل مرکزی مجلس قانون ساز کے ایک خصوصی ایکٹ کی رو سے شروع کیا جائے اور مطلوبہ واقعات کی اطلاع دینا جبری قرار دیا جائے۔ اس کام کو ناظم اعداد و شمار انجام دے۔ اور انتظامی امور محکمۂ صنعت و مزدوران کے ذریعے طے پائیں۔

اگر انگلستان اور امریکا کے طریقے اختیار کرنا ہے تو اس کام کی وسعت کو بڑے کارخانوں تک محدود رکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے، اور بڑے کارخانوں میں فطری طور پر وہی کارخانے شمار ہوں گے جن کی طرف قانون کارخانہ جات میں اشارہ کیا جا چکا ہے؛ یعنی میکانی قوت استعمال کرنے والے ایسے کارخانے جن میں بیس یا بیس سے زاید اشخاص ملکر کام کریں۔ ان چھوٹے کارخانوں پر اس طریقے کا اطلاق کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا جن کے بارے میں صوبائی حکومتوں نے خاص اسباب کی بنا پر جو کوئی بڑی اعدادی اہمیت نہیں رکھتے، قانون کارخانہ جات کو وسعت دینے کے اختیارات سے کام لیا ہو۔ لیکن ممکن ہے کہ چھوٹے کارخانوں کی بعض ایسی قسمیں ہوں جن کے متعلق تخمینہ کرنا فائدہ مند ہو۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ بعض بڑے کارخانے غیر میکانی قسم کے ہوں، مثلاً عمارت سازی، خشت سازی اور قالین بافی کے کارخانے جن کا تخمینہ کرنا ضروری ہے۔ اس طرح ریلوے لائینوں اور ان سب کارخانوں کو بھی محسوب کرنا چاہیے جو قانون معادن کے

تحت آتے ہوں۔

برما کو خارج کرکے برطانوی ہند میں کارخانے کے مزدوروں کی اوسط تعداد ۱۹۳۲ء میں ۱۴ لاکھ ۳۰ ہزار تھی۔ اگرچہ یہ تعداد صنعت میں کام کرنے والے جملہ اشخاص کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے، پھر بھی اس جماعت کو برآمد کے معاملے میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ اسی سبب اور دوسرے اسباب کی بنا پر اس جماعت کے مسائل پر بجا طور پر خاص توجہ دی گئی ہے اور آیندہ بھی دی جانی چاہئے۔ لیکن یہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ کارخانے کی صنعت کو گھریلو صنعت کے نقصان سے ترقی ہو رہی ہے اس لحاظ سے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ ان کا باہمی تعلق اعداد و شمار کے ذریعے سے ظاہر کیا جائے۔ سردست صحیح اندازہ کرنے کا کوئی امکان نہیں معلوم ہوتا۔ مجوزہ دیہی و شہری تحقیقاتوں کو روبہ عمل لانے سے کچھ مواد ملے گا۔ کپاس، نیشکر اور دوسری زرعی پیداوار کی فصلوں کا صحیح اندازہ جن کی مصنوعات گھر وغیرہ اور فیکٹریوں میں تیار کی جاتی ہیں زیادہ مکمل معلومات بہم پہنچا سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پیشوں کے متعلق اعداد و شمار کے مواد کی گوشوارہ بندی اس طرح کی جائے جس سے ان پیشوں میں کام کرنے والوں کی کل تعداد معلوم ہو جائے اور اس طرح جب اس کو فیکٹری کے اعداد و شمار سے ملا کر دیکھا جائے تو صنعت کے ہر دو نظامات کی تقابلی اہمیت واضح ہو سکے۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری سے درحقیقت یہ معلوم ہوتا ہے جیسا کہ توقع کی جا سکتی ہے کہ برطانوی ہند میں بحیثیت مجموعی کام کرنے والے مزدوروں کی کل تعداد اس تعداد سے بدرجہا زیادہ بڑھی ہوئی ہے جو فیکٹری کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتی ہے۔ گو کارخانوں کے مزدوروں کی تعداد اور پیداوار کا مقابلہ اسی قسم کی گھریلو صنعتوں کے مزدوروں اور پیداوار سے کرنا فوراً ممکن نہیں ہے، تاہم جب اس وقت کی مجوزہ کل تحقیقات مکمل ہو جائے تو

ص ۱۶۲

کچھ نہ کچھ سالانہ مواد حاصل کرنا ممکن ہو جائے گا جس سے ان کی تقابلی ترقی یا ان کے تقابلی تنزل کا پتا چل سکے گا۔

دیہی تحقیق

کل ہندوستان کی آمدنی اور مالی ذرائع کی تحقیق کے جزو کے طور پر یہ معلومات بھی حاصل کرنا ضروری خیال کیا گیا ہے کہ زمین سے نقد یا جنس کی شکل میں یا دوسرے دیہی مدات سے جو آمدنی وصول ہوتی ہے اور زمین کے مالکوں، قابضوں اور مزدوروں وغیرہ میں تقسیم ہوتی ہے اس کے اعداد و شمار کیا ہیں۔

لیکن برطانوی ہند کے ۵ لاکھ دیہات میں سے ہر ایک کے حالات کی براہ راست تحقیق اخراجات کا انتظام کر لینے یا تحقیقات کرنے والوں کو کافی تعداد میں مہیا کر لینے کے باوجود جلد ممکن نہیں ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ چند دیہات کو بطور نمونہ لے کر تحقیق کی جائے[1]۔

گو موجودہ مالی حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ان تمام سفارشوں کو عملی جامہ پہنایا جائے جن کے مصارف کا اندازہ تیس لاکھ روپے کیا گیا ہے، تاہم یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ مستقبل قریب میں پیدائش دولت کے اعداد و شمار کی فراہمی ممکن ہوگی جو صحیح معاشی پالیسی مرتب کرنے کے لیے ضروری ہے۔ حال ہی میں (۱۹۳۸ء) ڈاکٹر ٹی، ای گریگوری پروفیسر لندن اسکول آف اکنامکس کا تقرر حکومت ہند کے مشیر معاشیات کے عہدے پر ہوا ہے جس سے ہماری توقع کو تقویت پہنچتی ہے۔

۱۵۔ ہندوستان کے افلاس کے اسباب۔

ہندوستان کے افلاس کا مسئلہ نہایت ہی پیچیدہ ہے جس کے مختلف اور بے شمار اسباب ہیں۔ ہم اس خیال پر بحث کر چکے ہیں کہ کہاں تک لوگوں

[1] دیکھیو بولے اور روبرٹ سن کی رپورٹ محولۂ بالا۔

کے افلاس کا باعث یہ ہے کہ ان کا مطمح نظر زندگی کے متعلق بگڑا ہوا ہے جو ایک ایسے مذہب کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جو تمام مذاہب سے زیادہ غیر دنیاوی ہے[1]۔ یہ استدلال کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے باشندے روحانیت میں اس قدر غرق ہیں کہ وہ دولت کی پیدائش اور فراہمی کا کافی خیال ہی نہیں کر سکتے۔ ان کو قناعت کی تلاش ہوتی ہے۔ ان کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ معیار زندگی کو بلند کیا جائے اور اس معیار کو بلند کرنے کے لیے جد و جہد کی جائے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ تمام خواہشوں کو سختی کے ساتھ روکا اور دبایا جائے۔ وہ چولھے میں زیادہ ایندھن جھونکنے کی بجائے اس میں سے زیادہ سے زیادہ آگ نکال لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے اسباب یہ بیان کئے گئے تھے کہ ہندوستانی دستی محنت سے نفرت کرتے ہیں؛ آوارہ گرد فقیروں اور بیراگیوں جیسے ہزاروں طفیلی اشخاص جو قوم پر بار بنے ہوئے ہیں ان کی ہمت افزائی اور ان کے وجود سے چشم پوشی کی جاتی ہے؛ مختلف مذہبی تعصبات اور کئی غیر معاشی رسم و رواج اور روایات کی موجودگی کی وجہ سے عورتوں کی بہت بڑی تعداد تمام معاشی جد و جہد سے الگ اور ہٹی ہوئی ہے؛ آبادی میں بے روک اضافہ ہو رہا ہے؛ بچپن کی شادی کے مثل کئی رواج نسل انسانی کی جسمانی طاقت سلب کر لیتے اور اس طرح معاشی کارکردگی کو گھٹا دیتے ہیں؛ ملیریا اور خطافیہ جیسے امراض کی اشاعت بھی اسی طرح جسمانی انحطاط کا موجب ہوتی ہے؛ مقدمہ بازی کا شوق ہندوستانیوں کی خصوصیت خاصہ ہے اور مقدمہ جیتنے کی خوشی انھیں عدالتوں کی طرف کشاں کشاں لیے جاتی ہے؛ وغیرہ۔ نظم و نسق پر بھی یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ ملک کے افلاس اور اس کی پسماندگی کا بڑی حد تک

[1] دیکھو جلد اول باب ۴ کتاب ہذا۔

ذمہ دار ہے۔ حکومت پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس نے ملک کے معاشی ذرائع کو ترقی دینے کے لیے اتنی کوشش نہیں کی جتنی کہ اس کو کرنی چاہیے تھی۔ خاص الزام یہ ہے کہ وہ صنعتی ترقی کو آگے بڑھانے کے لیے ضروری تدابیر اختیار کرنے سے قاصر رہی۔ اکثر لوگوں کے نزدیک ”اخراج دولت“ Drain کا نظریہ ہندوستان کے افلاس کی توجیہ کے لیے کافی ہے۔ مذکورۂ بالا اسباب میں سے چند پر مناسب موقعوں پر بحث کی جا چکی ہے؛ اور دوسرے اسی قسم کے مسائل پر آیندہ بابوں میں بحث کی جائے گی۔

۱۹۔ صرف دولت کی چند غلطیاں ہندوستان کے افلاس کو بڑھانے والے اسباب کی حیثیت سے

ہر وہ شئے جو لوگوں کی پیدا آوری کو گھٹائے گی لازمی طور پر افلاس کا سبب خیال کی جائے گی۔ لیکن اصلی پیدا آوری کے علاوہ غیر دانشمندانہ صرف بھی معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر سکتا ہے۔ دانشمندانہ صرف یا ”افادوں کا معقول استعمال، غور و فکر، قوت تخیلہ اور فراست کا طالب ہے[1]“ دولت کی زیادتی عام طور پر بڑی بڑی احتیاجیں پیدا کر دیتی ہے جن میں سے اکثر نقصان رساں اور مخرب اخلاق ہوتی ہیں؛ اور نافرمان بچوں کی طرح اس دولت کو تباہ کر دیتی ہیں جن سے وہ پیدا ہوئیں اور آخر کار افلاس تک پہنچاتی ہیں۔ لیکن دولت کے بڑے ذخیرے کے مالکوں پر بیجا اسراف سے جو معاشی تباہی آتی ہے اس سے قطع نظر کرتے ہوئے ایسے تعیشات پر

---

[1] دیکھو نکلسن کی کتاب موسوم بہ ”اصول معاشیات“ جلد سوم صفحہ ۴۳۶ ”زر کو اچھی طرح خرچ کرنا، زر اچھی طرح کمانے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ زر کمانے میں کام عام طور پر پہلے سے معین ہوتا ہے؛ لیکن خرچ کرنے کے لیے خرچ کرنے والے کو اختراعی قوت سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس میں خاموش اطاعت سے کام نہیں چلتا بلکہ نیک منشی کی ضرورت ہے۔“

بے عقلی کے ساتھ دولت خرچ کرنا جو زندگی کی لطافتوں اور آسائشوں میں کوئی اضافہ نہ کرے۔ قوم کے لیے بھی نقصان رساں ہے۔ اس لیے کہ یہ خرچ سرمایہ اور محنت کی ایک بہت بڑی مقدار کو ضروریات کی سربراہی سے ہٹا دیتا ہے۔ تنہا دولت مند ہی نقصان رساں اسراف کے مجرم نہیں ہوتے۔ بلکہ اکثر ملکوں میں سب سے غریب طبقہ محض اپنے افلاس کے باعث انتہائی بے احتیاط اور مسرف پایا جاتا ہے۔ اس کا برعکس نقص یعنی کنجوسی جو کفایت شعاری کا بھیس بدلے ہوئے ہوتی ہے بعض لوگوں، خاص کر متوسط طبقے کے ارکان اور مارواڑی جیسی قوموں کی امتیازی خصوصیت ہوتی ہے جو خست سے کام لیتے ہیں اور آزادی سے خرچ کرنے کی جگہ اندوختہ کرتے ہیں۔ زندگی کے متعلق قدیم نقطۂ نظر یہ تھا کہ دولت آہستہ آہستہ پس انداز کی جائے، تاکہ اولاد سرمائے کی مدد سے بہتر طور پر زندگی شروع کرے لیکن اب اس خیال میں یہ تبدیلی ہوگئی ہے کہ کمانے والا اپنے موجودہ ذاتی آرام و آسایش کا زیادہ خیال رکھتا ہے اور اپنی اولاد کو بشرطیکہ اس کی تعلیم و تربیت اچھی طرح ہوئی ہو۔ اور وہ شخصی اصل سے مالا مال ہو، اپنے بہبود کی فکر آپ کر لینے کے لیے چھوڑ دیتا ہے[1]۔" اس روش اور طرز عمل کا سبب ایک حد تک یہ ہے کہ لوگوں کی نفسیات میں حقیقی طور پر تبدیلی ہوگئی ہے جو گزشتہ جنگ عظیم کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ لیکن اس طرز عمل کا باعث کسی حد تک غالباً قیمتوں کا وہ عظیم اضافہ بھی ہے جو جنگ عظیم کے بعد رونما ہوا۔ متوسط طبقوں کی آمدنیوں میں قیمتوں کی زیادتی کے تناسب سے اضافہ نہیں ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پہلے کفایت اور نفس کشی سے جتنی پس اندازی کرنے کے قابل تھے

---

[1] دیکھو۔ ڈبلیو ایچ کوٹس کا تبصرہ "قومی قرضہ اور محصول کی کمیٹی کے رپورٹ" کے بارے میں "جرنل آف رائل اسٹاٹسٹی کل سوسائٹی" بابت ۱۹۲۷ء جلد ۱۴۔ حصۂ دوم صہ ۲۵۶ پر۔

زر کی قوتِ خرید کم ہو جانے سے اس کی ترغیب باقی نہیں رہی۔ اس بات کی کئی علامتیں پائی جاتی ہیں کہ ہندوستان کے متوسط طبقوں کے طرز عمل میں بھی ایک حد تک اسی قسم کی تبدیلی واقع ہو رہی ہے، کیونکہ کچھ زمانہ ادھر سے ان کا معیار زندگی نمایاں طور پر بڑھ گیا ہے۔ یہ تبدیلی ایک حد تک اچھی خیال کی جا سکتی ہے، اس لیے کہ حقیقی کفایت شعاری عام طور پر زر کو آیندہ کے لیے پس انداز کرنے پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ موجودہ زمانے میں خوشحالی کی ترقی پر خرچ کرنے پر منحصر ہوتی ہے جس سے آیندہ خوشحالی بڑھنے میں مدد ملے۔ وہ لوگ جو ضرورت سے زیادہ کنجوس ہیں اور وہ جو بے احتیاطی کے ساتھ اسراف کرتے ہیں، دونوں مساوی طور پر قابل ملامت ہیں، اس لیے کہ ان کا طرز عمل قوم کو معاشی حیثیت سے کمزور کر دیتا ہے۔ ہندوستان کے صرف دولت کے مسئلے کے تمام پہلوؤں پر تفصیل کے ساتھ بحث کرنا یہاں ناممکن ہے۔ لیکن اس استدلال کی عام صداقت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہندوستان میں افلاس کی جو خرابی پائی جاتی ہے اس کا باعث گو بڑی حد تک ادنیٰ پیداآوری ہے۔ غیر منظم صرف بھی اس کا معاون سبب ہے۔ چنانچہ یہاں ہم غیر دانشمندانہ صرف کی ایک شکل پر خاص طور پر زور دینا چاہتے ہیں جو حال میں جاذبِ توجہ بن گئی ہے۔ یہ بتلانے کی بہ مشکل ضرورت ہے کہ جسمانی کارکردگی اور غذا میں بہت ہی گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ جرمن کہاوت Man Ist was Erisst سے ظاہر ہوتا ہے "آدمی کا سارا دارومدار خوراک پر ہے"۔ ہندوستان کے اکثر صوبوں میں لوگوں کی جو غذا ہے اس کا تعین اب تک مقامی حالات سے ہوتا آیا ہے اور اس کا انحصار غذائی اشیا کی اس قسم پر رہا ہے جو اس مقام پر پیدا ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض صوبوں میں لوگوں کی خاص غذا اہم قوت بخش اجزا سے معرا ہوتی

ہے۔ سکھ، گورکھے، مرہٹے، کنڑے، بنگالی اور مدراسی جیسی ہندوستانی قوموں کی جسمانی کارکردگی کے اختلافات کا باعث زیادہ تر ان کی غذا کے اختلافات کو قرار دیا جا سکتا ہے۔" یہ لوگ جو غذا ئیں ضرورت، عادت یا مذہبی میلان کی بنا پر استعمال کرنے پر مجبور ہیں ان کی حیاتیاتی قدر و قیمت سے ان لوگوں کی کارکردگی کے باہمی اختلافات کا تعلق قطعی طور پر واضح ہو چکا ہے۔ لفٹننٹ کرنل آر میک کیریسن اور دوسرے اشخاص نے ناقص غذا کو جسمانی عدم کارکردگی اور بیماری کا سبب قرار دیتے ہوئے جو تحقیقات کی ہے وہ بہت ہی سبق آموز ہے۔ اس تحقیق سے یہ پتا چلتا ہے کہ بلحاظ غذائیت ہندوستانی غذاؤں کی کیا حیثیت ہے۔ اس تحقیقات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چاول جو خاص کر بنگال اور مدراس میں اکثر ہندوستانیوں کی غذا ہے بہت ہی کم قوت غذا ہے جس میں اہم نامیاتی نمکوں کی کمی ہوتی ہے اور جو غذا کے وہ غیر مشخص اجزا مہیا نہیں کرتی جس کو "حیاتین" Vitamins کہا جاتا ہے اور جن کی اہمیت جدید تحقیقات سے آشکارا ہو چکی ہے۔ گیہوں اور گوشت کھانے والی قوموں مثلاً سکھوں، پٹھانوں اور گورکھوں کی جسمانی ساخت چاول کھانے والے بنگالیوں اور مدراسیوں سے بدرجہا بہتر ہوتی ہے۔ گیہوں، دودھ، مکھن، گوشت وغیرہ کا اضافہ چاول کھانے والے کی غذا میں بہت کچھ اصلاح کر دیتا ہے۔ چنانچہ مرہٹوں کی حد تک ایسا ہی ہے جو زیادہ تر جوار اور باجرا اور بعض اوقات گیہوں اور دودھ بھی استعمال کرتے ہیں۔ غیر موزوں غذا کے روزمرہ استعمال سے جسم کی ساخت اور صحت رفتہ رفتہ خراب ہو جاتی ہے۔ اس مسئلے کو جتنی اہمیت دینی چاہئے نہیں دی جاتی۔ ناقص غذا کا مسئلہ افلاس کے مسئلے سے الگ اور مختلف ہے، اس لیے کہ غذا کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کی کافی مقدار میسر آئے، بلکہ یہ کہ صحت و توانائی

کو برقرار رکھنے کے لیے مختلف اجزا متوازن مقدار میں دستیاب ہوں۔ جیسا کہ زرعی کمیشن نے بتلایا ہے، غذائیت کی کمی اور فاقہ ایک ہی نہیں ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کو اپنے جسم کی مناسبت سے زیادہ غذا کھانے کے باوجود کافی غذائیت میسر نہ آتی ہو اور غذا کی مقدار اس سے زیادہ ہو جو وہ غذا مناسب اجزا پر مشتمل ہونے کی صورت میں استعمال کرتا۔ غذا میں بعض ضروری اجزا کی عدم موجودگی سے کمزوری کے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے ایسے امراض کا رونما ہونا افلاس[1] اور اس کے نتیجے کے طور پر غذا کی قلت کی علامت نہیں ہے۔ جو غذا ناقص تغذیے کا باعث ہو وہ متوازن غذا کے مقابلے میں جو صحت بخش ہوتی ہے، بیش خرچ اور نقصان رساں ہوتی ہے[2]۔

مستند تحقیقات کی بنا پر عام پروپیگنڈا کیا جائے تو وہ لوگوں کو یہ بتلانے میں ضرور کامیاب ہوگا کہ مناسب غذا کا انتخاب کیا جائے تو زائد خرچ عائد کیے بغیر جسمانی خوشحالی کے اعتبار سے زیادہ فوائد حاصل ہوسکتے ہیں۔ مشرق کی غفلت و بے پروائی مشہور رہی ہے، چنانچہ یہی ہندوستانی مزدور کی امتیازی خصوصیت ہے اور عام طور پر اس کا سبب زیادہ تر

[1] ڈاکٹر سیلٹر نے اس واقعے کی طرف متوجہ کرایا ہے کہ "بعض صورتوں میں معیار زندگی کے بڑھ جانے سے طبعی نقصانات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً چاول کی گرنیوں کی تعداد میں اضافہ ہوجانے کی وجہ سے گھروالیوں کی تکلیف اور مشقت میں تو بچت ہوگئی لیکن چاول کوٹ کر بھوسا صاف کرنے کی صحت بخش محنت بھی غالباً کم ہوگئی اور اسی کے ساتھ چاول اپنی قوت بخش خاصیت سے بھی اس لیے محروم ہوگیا کہ چاول کا بھوسا کلوں کے ذریعہ سے صاف کرنے میں ان کی سب سے اوپر کی کنی کے ساتھ حیاتین بھی خارج ہوجاتے ہیں۔" دیکھو سلیٹر کی تصنیف محولہ بالا کی تمہید صہ ۱۹۔

[2] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۴۹۴ تا صفحہ ۴۹۵۔

اس کی غذا ہے جو نہ صرف ناکافی بلکہ غیر متوازن بھی ہے۔ ہمارا سروکار سردست موخر الذکر ہی سے ہے۔

کرنل میاک کیرسن نے تقریباً ۲۵ سال پیشتر بنگال کے قید خانوں کی غذا کی تحقیقات کی تھی جس سے یہ معلوم ہوا کہ غذا ایک ایسا اہم عامل ہے جو لوگوں کی جسمانی نشوونما اور عام خوشحالی کو متاثر کرتا ہے۔[1] انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ بنگالی کی خراب جسمانی ساخت اور کمزوری کا باعث غالباً زیادہ تر یہ تھا کہ اس کی غذا میں پروٹین کی کمی تھی۔" اس کے برخلاف بہار و اڑیسہ اور صوبۂ متحدہ سے پنجاب کی طرف شمال میں آگے بڑھئے تو گیہوں کا تناسب غذا میں بتدریج زیادہ سے زیادہ ہوتا جاتا ہے اور اس کی بنا پر آبادی کی جسمانی حالت میں نمایاں تبدیلی پائی جاتی ہے۔ کسی خاص صوبے میں غذائی اشیا کی کمی وسائل آمد و رفت اور ذرائع نقل و حمل کی اصلاح و ترقی سے پوری کی جاسکتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ مطلوبہ اشیا دوسرے صوبوں سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ ہیں کہ متعلقہ لوگ غذائی اشیا کی طلب کی نوعیت میں تبدیلی پیدا کریں۔ اس غرض کے لیے غذائی معاملات کے بارے میں تعلیم اور معلومات کی ضرورت ہے۔ کرنل میاک کیرسن نے کونور میں جو تحقیقات کی اس کی بنا پر اور شاہی زرعی کمیشن کے ذریعے سے اس کی اطلاع عام ہونے کی بنا پر ملک میں اس مسئلے کے بارے میں بہت بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے کہ ایسی باقاعدہ اور سائنٹیفک غذا مقرر کی جائے جو ملک کی آب و ہوا کے اختلافات اور لوگوں کے مختلف پیشوں اور دھندوں کے لحاظ سے موزوں ہو۔ زرعی کمیشن نے لوگوں کی عام صحت کی اصلاح و ترقی کی غرض سے جو تدابیر بطور مشورہ پیش کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ملک کی مچھلی کے

---

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ ص ۴۹۳۔

ذرایع کو محفوظ کیا جائے اور ان کو ترقی دی جائے۔ اس کام میں عملی حصہ لینے کے لیے وہ حکومت، مقامی مجلسوں اور دیہی برادری کو عام طور پر دعوت دیتا ہے، اس لیے کہ مچھلی کا اضافہ زیادہ تر چاول کھانے والوں کی غذا کی قوت بڑھانے کی بہترین صورت ہوسکتی ہے[1]۔ ہندوستان کے باشندوں کے بڑے حصے کو مچھلی کے استعمال کے بارے میں مذہبی یا دوسرے قسم کے اعتراضات نہیں ہیں اس لیے اس واقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

حال میں چائے نوشی کی عادت کے بڑھ جانے سے غذا کی اصلاح کرنے والوں میں کچھ بے چینی پیدا ہوگئی ہے۔ احاطۂ بمبئی میں چائے نوشی کا رواج خاص طور پر زیادہ ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جبکہ انگلستان میں بھی مصنفوں اور مصلحوں میں چائے نوشی کی برائی کرنے کا فیشن ہوگیا تھا اور چائے پینے والوں کو طرح طرح کی صلواتیں سنائی جاتی تھیں اور ان پر نام رکھے جاتے تھے[2] لیکن وہاں کے مزدور پیشہ طبقے ہر قسم کی مخالفت کے باوجود چائے کے استعمال پر جمے رہے یہاں تک کہ چائے ان کی ضروریات زندگی میں ایک اہم مد بن گئی ہے۔

---

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ صلاہی تا ص۱۴۹ کمیشن یہ بھی مشورہ دیتا ہے کہ ایک مرکزی ادارہ تغذیۂ انسانی Central Institute of Human Nutritien قائم کیا جائے اور اسی کے ساتھ تحقیقات کا بھی انتظام کیا جائے۔ یہ دونوں کام حکومت کی طرف سے انجام دئے جائیں۔ کمیشن یہ مزید سفارش کرتا ہے کہ حیوانی تغذیہ اور انسانی تغذیہ کی تحقیقات کے درمیان زیادہ قریبی ربط قائم کیا جائے اور ان سب ہندوستانی تحقیقاتوں اور سلطنت برطانیہ کے دوسرے علاقوں کی مماثل تحقیقاتوں کے درمیان بھی ربط قائم کیا جائے یہ مسائل اس قدر وسیع ہیں کہ ان کو حل کرنے کے لیے جس قدر عملہ اور مواد دستیاب ہوسکتا ہو وہ سب مدد کے لیے حاصل کیا جائے۔

[2] دیکھو Helen Bosanguet کی کتاب موسوم بہ "معیار زندگی" ص۳۰۔

چائے نوشی کے بارے میں رائے عامہ میں بھی انقلاب واقع ہوا ہے، چنانچہ چائے نوشی کو ایک برائی خیال کرنے کے بجائے آج کل "گھریلو پن اور شراب خواری سے پرہیز" کی علامت خیال کیا جانے لگا ہے۔ چائے نوشی کی حمایت عام طور پر شراب خواری کے بدل اور علاج کے طور پر کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر سلیٹر کی کتاب موسوم بہ "جنوبی ہند کے بعض دیہات" میں صفحہ ۲۳۲ پر چائے کی حمایت ایک عجیب طریقے پر کی گئی ہے۔ مصنف نے اس میں یہ لکھا ہے کہ ہندوستانی کسان اس معاملے میں بہت پیچھے ہیں کہ ان میں عمدہ مشروبات کا رواج بہت کم ہے۔ ہندوستان کے باشندوں کی بہت بڑی تعداد گندہ پانی پیتی ہے، جو یا تو دریاؤں اور آب پاشی کی نہروں سے حاصل کیا جاتا ہے اور ہر قسم کی گندگی سے بھرا ہوتا یا ٹھیرے ہوئے پانی کے تالابوں سے لیا جاتا ہے جن کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ڈاکٹر سلیٹر یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ "موجودہ زمانے میں ہندوستان کو جو سب سے بڑے فوائد پہنچائے جا سکتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ چائے کا رواج عام کیا جائے جو جوش دی ہوئی پینے کی چیزوں میں سب سے سستی ہے" وہ ان مساعی کی ستائش کرتے ہیں جو بکنگھم اینڈ کرناٹک ملز کے منتظموں نے مدراس میں چائے کو مدرسوں میں نیم دہقی طالب علموں اور مزدوروں کے بچوں میں مقبول بنانے کے لیے کی ہیں۔ لیکن گندہ پانی پینے کے خطرات سے بچاؤ کی حد تک چائے کے فوائد گو مشتبہ خیال کیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ چائے نوشی کی خرابیوں سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ خطرات اس وقت تک دور نہیں ہوتے جب تک کہ پانی کی کم از کم تھوڑی مقدار بھی پینے کے لیے استعمال ہوتی رہے۔ اس خطرے سے بچنے کا زیادہ موثر طریقہ یہ ہوگا کہ خالص پانی کی رسد کو یقینی بنا دیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ الکحل کے بدل کے طور پر چائے خانوں

کو بلاشبہہ ایک نعمت خیال کرنا چاہئے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس میں کوئی شبہہ نہیں ہوسکتا کہ حد سے زیادہ چائے نوشی گرم موسم میں جسمانی نظام کے لیے نقصان رساں ہوتی ہے، خاص کر جبکہ گھٹیا درجے کی چائے استعمال کی جائے جیسا کہ ہندستان کے اکثر چائے خانوں میں کی جاتی ہے۔ ان چائے خانوں میں عام طور پر جیسا گھٹیا قسم کا جوشاندہ ملتا ہے اس کی بجائے معقول طور پر عمدہ چائے کی فروخت کو یقینی بنانے کے لیے بعض تدابیر ضروری معلوم ہوتی ہیں، گو آخر میں سب سے کارگر تدبیر یہی ہوگی کہ خود لوگوں ہی کے ذوق میں اصلاح و تبدیلی کی جائے۔ ہم یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ چائے خانے، شراب نوشی کی روز افزوں خرابی کو روکنے میں نمایاں کام کرسکتے ہیں، اور اسی کے ساتھ وہ ایسی کیف آور شے مہیا کرتے ہیں جو مقابلۃً کم نقصان رساں ہے اور جس کی ضرورت ان لوگوں کی حد تک جنھیں کٹھن اور تھکا دینے والی جسمانی محنت کرنی پڑتی ہو نظر انداز نہیں کی جاسکتی[1]۔

---

[1] جنوبی ہند میں کافی نوشی کا عام رواج ہے، اور اس کی حد تک بھی اسی قسم کے خیالات رونما ہوتے ہیں۔ الکحلی شرابوں کا خرچ اور اس کے بارے میں جو پالیسی اختیار کرنی چاہئے ان کا ذکر بعد میں کیا جائے گا (دیکھو باب ۱۱)۔ معاشیات ہند کے طالب علم کو غیر منظم اور بیجا صرف کی دوسری مشہور مثالیں بآسانی مل جائیں گی، مثلاً شادی اور موت کے بیجا طور پر بھاری اخراجات اور سونے اور چاندی کے زیورات (دیکھو باب ۱، فصل ۶۴)۔

پانچواں باب

نقل وحمل

۱۔ نقل وحمل کی اہمیت

معاشی، فوجی، انتظامی، تہذیبی اور معاشرتی نقطۂ ہائے نظر سے نقل وحمل اسقدر اہمیت رکھتی ہے کہ اس پر مزید زور دینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ہندوستان کی تمام تاریخ میں آمد و رفت کی مشکلات سیاسی و معاشی نشو و نما کا تعین کرنے میں بہت ہی غالب عنصر رہی ہیں۔ موجودہ زمانے میں ان مشکلات کو ریل، تار، موٹر اور نقل وحمل کی دوسری شکلوں نے کسی حد تک دور کر دیا ہے۔ لیکن یہ مشکلات جدید صنعت کی ترقی میں اب بھی بڑی رکاوٹ پیدا کر رہی ہیں۔ ملک کو اس کی ضرورتوں کے مطابق نقل وحمل کے جدید نظام سے آراستہ کرنے کے لیے کثیر اخراجات لاحق ہوں گے۔ ہندوستان ایک چھوٹا سا براعظم ہے، ملک کے اندر دور دور کے مقاموں کو طے کرنا پڑتا ہے، اور ایک علاقے سے دوسرے میں جانے کے لیے بڑی بڑی طبعی رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ ایک اور دقت یہ ہے کہ ایک محدود رقبے میں بھی اندرونی وسائل

آمد و رفت بارش کے موسم میں عام طور پر بالکل منقطع ہو جاتے ہیں علاوہ ازیں قابل جہاز رانی دریاؤں کی حد تک ہندوستان، انگلستان جیسے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں کم خوش قسمت ہے۔ چنانچہ اکثر ملکوں میں تجارت کے لیے سہولتیں پیدا کرنے میں خاص کر ریلوں کی ایجاد سے بیشتر ان دریائی راستوں کا بہت ہی اہم حصہ تھا۔

ہندوستان میں انیسویں صدی کے وسط تک ذرایع آمد و رفت ایک حد تک بہت ہی ناقص تھے جس سے اٹھارویں صدی کے وسط کے انگلستان کی یاد تازہ ہوتی تھی اگرچہ آب و ہوا کے زیادہ موافق حالات کے باعث سڑکیں انگلستان کے مقابلے میں ہندوستان میں بہتر تھیں۔ ریلوں کی ابتدا نہیں ہوی تھی۔ ہندوستان کے حکمرانوں خاص کر مغل شاہنشاہوں نے شمالی ہند میں جو چند بڑی شاہراہیں بنالی تھیں وہ اس زمانے کی بہت ہی معمولی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بھی کافی نہیں تھیں[1]۔ اکثر نام نہاد سڑکیں محض پگ ڈنڈی کی شکل رکھتی تھیں اور ملک میں ہر جگہ بیل گاڑیوں کی آمد و رفت سے نشان پڑ جانے کی وجہ سے یہ راستے بن گئے تھے۔ بارش کے موسم میں بیل گاڑیوں کی آمد و رفت بھی ان راستوں سے بڑی حد تک ناممکن ہو جاتی تھی۔ ملک کے اندرونی حصے تک رسائی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ لدو جانوروں کے کاروان تھے۔ علاوہ ازیں سڑکیں غیر محفوظ تھیں اور ان پر ٹھگ اور پنڈاری جیسے ڈاکوؤں کی عملداری تھی۔ جہاز رانی کے لایق کوئی قابل ذکر نہریں بھی نہ تھیں، اگرچہ گنگا اور سندھ کے ساحلی خطے جیسے چند علاقے جو اس زمانے میں تجارت کے لیے فطری طور پر بڑی شاہراہیں تھیں اور سمندر کے کنارے کے علاقے دوسرے

[1] دیکھو ڈبلیو ایچ مورلینڈ کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان شہنشاہ اکبر کی وفات کے زمانے میں" صفحہ ۱۶۶ تا صفحہ ۱۶۷۔

مقاموں کے مقابلے میں زیادہ موافق محل وقوع رکھتے تھے۔ شمالی ہند کے وسیع میدان گرما کے موسم میں اس لیے آسانی کے ساتھ عبور و مرور کے قابل تھے کہ وہاں کے دریا جہاز رانی کے قابل تھے اور چند سڑکیں بھی بنا دی گئی تھیں۔ چنانچہ بحیثیت مجموعی شمالی ہند کی حالت جزیرہ نما کے مقابلے میں جو ایک ناہموار اور کوہستانی علاقہ ہے اور دریائی نقل و حمل کی سہولتیں بھی بجز دونوں ساحلوں کے بہت کم رکھتا ہے بدرجہا اطمینان بخش تھی۔

ناقص ذرائع آمد و رفت کے معاشی و معاشرتی اثرات پر ہم پہلے بحث کر چکے ہیں اور یہ بیان کر چکے ہیں کہ گاؤں باقی دنیا سے الگ تھلگ خود مکتفی زندگی بسر کر رہا تھا اور مقامی معیشت کا دور دورہ تھا، جس سے بازاروں کی وسعت اور تقسیم عمل کے بارے میں کئی مشکلات رونما ہو رہی تھیں؛ مزدور غیر نقل پذیر اور لوگ قدامت پسند تھے۔ معاشی زندگی معمولاً خوش گوار اور پرسکون تھی مگر قحط و خشک سالی کے زمانے میں پریشانی کا سامنا ہوتا تھا[1]۔ لارڈ ڈلہوزی کے عہد حکومت میں ذرائع نقل و حمل اور وسائل آمد و رفت میں جدید اصلاح و ترقی کی بدولت حقیقی معاشی و معاشرتی انقلاب رونما ہوا۔ لارڈ ڈلہوزی نے نہایت شد و مد کے ساتھ تعمیرات عامہ کی پالیسی پر عمل شروع کیا۔ اس سلسلے میں جو مختلف کام کئے گئے ان کا ذکر ہم مختصر طور پر اس باب میں کریں گے۔

سہولت بحث کی خاطر ہم اس موضوع کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کریں گے:-

(۱) ریلیں، جو موجودہ زمانے میں ہندوستان کے وسائل آمد و رفت میں حد درجہ اہمیت رکھتی ہیں؛

---

[1] دیکھو جلد اول باب (۵)۔

(۲) سڑکیں، اور
(۳) دریائی راستے[۱]

ریلیں

۲۔ حکومت اور ریلوے لائینوں کے باہمی تعلقات کا اختلاف[۲]

ہندوستانی ریلوں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ملکیت اور انتظام کے بارے میں حکومت اور ریلوں کے باہمی تعلقات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان اہم لائینوں میں سے جو برطانوی ہند میں ہیں یا جن میں حکومت ہند کو دلچسپی ہے۔ چار لائنیں حکومت کی ملک اور نگرانی میں کام کر رہی ہیں۔ یعنی نارتھ ویسٹرن ریلوے (این، ڈبلیو، آر)؛ ایسٹرن بنگال ریلوے (ای، بی، آر) ایسٹ انڈین ریلوے (ای، آئی، آر) جس کے ساتھ اودھ اینڈ روہیل کھنڈ ریلوے (او، آر، آر) یکم جولائی ۱۹۲۹ء سے ضم کر دی گئی ہے؛ اور گریٹ انڈین پننسولا ریلوے (جی، آئی، پی)[۳]۔ پانچ لائینوں کی مالک حکومت ہے لیکن ان کا انتظام حکومت کی طرف سے کمپنیاں کرتی ہیں جن کے مفاد کی ضمانت حکومت کی طرف سے کر دی گئی ہے؛ مثلاً

---

[۱] کچھ سال ادھر سے ہوائی نقل وحمل نے بھی نئی اہمیت حاصل کر لی ہے اور اس کا قرینہ پایا جاتا ہے کہ ملک کے وسائل نقل وحمل میں مزید انقلاب رونما ہو۔

[۲] دیکھو ایک رپورٹ موسومہ بہ Report on Indian Railways بابتہ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء جلد اول ضمیمہ (ب)۔

[۳] یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے برما، برطانوی ہند سے الگ ہو گیا تو برما کی ریلیں ہندوستانی سرکاری ریلوں سے الگ کر دی گئیں۔

بی، بی اینڈ سی، آئی ریلوے؛ مدراس اینڈ سدھرن مرہٹہ ریلوے؛ آسام بنگال ریلوے؛ بنگال ناگپور ریلوے اور ساوتھ انڈین ریلوے۔ دو اہم لائنیں یعنی بنگال اینڈ نارتھ ویسٹرن ریلوے اور روہیل کھنڈ اینڈ کمایون ریلوے اور کئی دوسری کم اہمیت رکھنے والی لائنیں۔ خانگی کمپنیوں کی ملک ہیں جن میں سے چند تو مالک کمپنیوں کے زیر انتظام ہیں اور بعض حکومت کی نگرانی میں یا ان کمپنیوں کی نگرانی میں کام کرتی ہیں جو سرکاری ملکیت کی ریلوں کو چلاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی چھوٹی لائنیں ہیں جو ڈسٹرکٹ بورڈوں کی ملک ہیں یا ان بورڈوں کی طرف سے عطا کردہ ضمانت سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔ بعض ہندوستانی ریاستوں کی بھی اپنی الگ ریلیں ہیں، مثلاً ہز اگزالٹیڈ ہائی نس دی نظام اسٹیٹ ریلوے (ین، یس، آر) جو سنہ ۱۹۳۰ء سے قبل تک کمپنی کی ملک تھی اور نظامس گارنٹیڈ اسٹیٹ ریلوے (ین، جی، یس، آر) کے نام سے موسوم تھی۔ ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۳۷ء تک ہندوستانی ریلوے لائینوں کا مجموعی طول ۴۳٫۱۲۸ میل تھا، جس کے منجملہ سرکاری ملکیت کی ریلوں کا طول ۳۱٫۷۲۹ میل یا مجموعی طول کا تقریباً ۷۴ فی صد تھا، اور حکومت کے براہ راست زیر انتظام ریلوں کا طول ۱۹٫۱۴۲ میل یا تقریباً ۴۴ فی صد تھا۔

۳۔ ریلوں کی تاریخ کے اہم دور۔

ریلوں کا انتظام جس ایجنسی کے ذریعے سے کیا جاتا ہے اس کے مختلف و پیچیدہ حالات و شرائط کو سمجھنے اور مختلف قسموں کی کمپنیوں سے حکومت کے تعلقات معلوم کرنے کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ ہندوستانی ریلوں کی تاریخ پر اور حکومت کی ریلوے پالیسی کے متعدد تغیرات پر جو اس دوران میں رونما ہوئے ایک نظر ڈالی جائے۔

ہندوستانی ریلوں کی تاریخ کو کم و بیش چھ جدا دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) سنہ ۱۸۴۴ء تا سنہ ۱۸۶۹ء قدیم ضمانتی طریق؛ (۲) سنہ ۱۸۶۹ء تا سنہ ۱۸۷۹ء حکومت کا ریلیں بنانا اور انتظام کرنا؛ (۳) سنہ ۱۸۷۹ء تا سنہ ۱۹۰۰ء جدید ضمانتی طریق؛ (۴) سنہ ۱۹۰۰ء تا سنہ ۱۹۱۴ء

عاجلانہ توسیع اور اصلاح و ترقی، اور ریلوے سے نفع ملنا شروع ہونا؛ (۵) ۱۹۱۴ء تا ۱۹۲۱ء جنگ عظیم کے حالات کے زیر اثر ریلوے نظام کا خراب ہونا؛ اور (۶) ۱۹۲۱ء کے بعد کا زمانہ اکورتھ کمیٹی کا تقرر، اور حکومت کی راست نگرانی اور اس کے راست انتظام کی بنیاد پر ریلوے پالیسی کی از سر نو تشکیل۔

۴۔ قدیم ضمانتی طریق ۱۸۴۴ء تا ۱۸۶۹ء

ریلوں کا جال بچھانے کی اولین تجاویز ۱۸۴۴ء میں پیش کی گئیں جن کی رو سے یہ طے پایا کہ انگلستان میں قائم شدہ ریلوے کمپنیاں جن کو ایسٹ انڈیا کمپنی ایک مقررہ منافع کی ضمانت دے ریلوے لائن بنائیں۔ چنانچہ ایسٹ انڈین ریلوے کمپنی اور گریٹ انڈین پنن سولا ریلوے کمپنی سے علی الترتیب کلکتہ اور بمبئی کے قریب دو چھوٹی ریلوے لائنیں بنانے کا معاہدہ کیا گیا۔ لیکن ہندوستانی ریلوں کی تعمیر اور ان کا انتظام ضمانتی کمپنیوں کو سپرد کرنے کی تدبیر پر ۱۸۵۴ء تک عمل نہیں کیا گیا۔ چنانچہ لارڈ ڈلہوزی نے ۱۸۵۳ء میں اس مسئلے کے بارے میں جو مشہور یادداشت پیش کی اس نے حکومت کی پالیسی کا رخ اس سمت میں قطعی طور پر پھیر دیا لارڈ ڈلہوزی نے اپنی یادداشت میں اس امر پر زور دیا کہ ٹرنک لائنوں کا ایک نظام قائم کیا جائے اور ہر پریسیڈنسی کے اندرونی علاقے کو اس کی بڑی بندرگاہ سے اور ہر پریسیڈنسی کو ایک دوسرے سے ملحق کیا جائے۔ انگلستان اور ہندوستان دونوں کو ریلوں سے فوائد حاصل ہونے کی انھیں جو توقع تھی اس کو انھوں نے حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا۔

یہاں ایسے بڑے بڑے علاقے موجود ہیں جن میں پیداوار بکثرت ہوتی ہے۔ لیکن وہ اس پیداوار کی نکاسی نہیں کر سکتے۔ بعض علاقوں میں پیداوار تو اتنی زیادہ نہیں ہے لیکن اسی کو صرف طلب کے مقام تک لیجانے کا انتظام ہوجائے تو وہ بہت زیادہ مقدار تیار کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں جو تھوڑی بہت کپاس ہوتی ہے وہ انگلستان کو

شہادت کے ساتھ مطلوب ہے۔ اگر آیندہ دور دور کے میدانوں سے ایسی بندرگاہوں تک کپاس کی ڈھلوائی کا مناسب انتظام ہو جائے جو اس کو جہازیں لاد کر بھجوانے کے لیے موزوں ہوں تو ملک میں کپاس کی عمدہ قسم اور زیادہ مقدار تیار ہونے لگے گی۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے ہندوستان کے اندرونی بازاروں میں یورپی اشیا کی مانگ، تجارتی سہولتوں کے اضافے کی وجہ سے روز افزوں ہے۔ ہماری بندرگاہوں میں دنیا کے ہر حصے کے جہاز پیداوار کی تلاش میں جوق جوق آتے ہیں۔ یہ پیداوار ملک کے اندرونی علاقے میں موجود ہے یا وہاں سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں اس کو جہازوں تک پہنچانے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ کرۂ ارض کے اس گوشے میں نئے نئے بازار ایسے حالات کے تحت کھل رہے ہیں جن کی اہمیت اور قدر و قیمت کے بارے میں کوئی عقلمند سے عقلمند شخص بھی پیش اندازہ یا ان کی آیندہ توسیع و ترقی کا تخمینہ نہیں کر سکتا۔"

انھوں نے ریلوں کو حکومت کی براہ راست نگرانی میں بنانے پر حکومت کے زیر ہدایت کمپنیوں کے ذریعے سے بنوانے کو ترجیح دیتے ہوئے اپنے خاص اسباب پیش کیے۔ ان کو سرکاری انجینیروں کی قابلیت کے بارے میں کسی قسم کا شبہہ نہ تھا، لیکن وہ یہ خیال کرتے تھے کہ تجارتی معاملات اور کاروبار کو خاص کر ہندوستان میں حکومت کے فرایض میں داخل کرنا نامناسب تھا؛ اس لیے کہ یہاں عوام کو حکومت پر ہر چیز کے لیے انحصار کرنے کی جو عادت پڑی ہوئی تھی اس کی حوصلہ شکنی ضروری تھی۔ لارڈ ڈلہوزی کو یہ اطمینان تھا کہ برطانوی کمپنیوں کے ذریعے سے ریلیں بہ عجلت تعمیر کروانے کا ایک نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان کی تجارت اور صنعت میں انگلستان کے سرمائے اور مہم کی وسیع پیمانے پر کھپت ہوگی۔

لارڈ ڈلہوزی کی تجویز کے مطابق ہندوستان کے مختلف حصوں میں

ریلوے لائن بنانے اور ریلیں چلانے کے لیے ۱۸۴۹ء اور ۱۸۶۰ء کے درمیان آٹھ کمپنیوں سے معاہدے کئے گیے۔ غدر کے زمانے میں نقل وحمل کے ناقص انتظام کے باعث فوج، سامان اور اشیا کی نقل وحرکت میں سنگین رکاوٹیں پیش آئیں۔ اس تلخ تجربے نے ریلوں کی تعمیر کے حق میں تازہ محرک کا کام کیا۔ ابتدائی ضمانتی کمپنیوں سے جو معاہدے کیے گئے تھے ان کی بڑی خصوصیات حسب ذیل تھیں:-

(۱) زمین مفت دی گئی؛

(۲) ۴½ تا ۵ فی صد شرح سود کی ضمانت دی گئی اور یہ سود ۲۲ پنس فی روپے کے حساب سے قابل ادائی تھا؛

(۳) کمپنیوں کو جو خالص نفع ملے اس کا نصف حصہ حکومت کو دیا جائے تاکہ وہ اس نقصان کی تلافی کرسکے جو اس کو سود کی ضمانت کو پورا کرنے میں لاحق ہوا ہو، اور باقی نفع حصہ داروں میں تقسیم کردیا جائے۔

(۴) حکومت نے بجز عملے کے انتخاب کے تقریباً سب اہم معاملات میں نگرانی اور تنقیح کے اختیارات اپنے لیے محفوظ رکھے؛

(۵) حکومت کو یہ اختیار تھا کہ ۲۵ سال یا ۵۰ سال گزرنے پر کمپنیوں کو پورا معاوضہ دے کر ریلیں خرید لے۔

یہ طریقہ حکومت کے مالی ذرائع کے حق میں جونک ثابت ہوا اور ہندوستان کے محصول ادا کرنے والے کے لیے بار ہوگیا۔ اس لیے کہ کمپنیاں ۵ فی صد نفع حاصل نہ کرسکیں اور اس کمی کو پورا کرنے کا مطالبہ حکومت سے کرتی تھیں۔ چنانچہ ۱۸۶۹ء تک ریلوے کے موازنے میں جو گھاٹا آیا اس کی تعداد ایک کروڑ ۶۶ لاکھ ۵۰ ہزار روپے تھی۔ کئی نقادوں نے اس گھاٹے کو کمپنیوں کے اخراجات میں بے احتیاطی کی طرف منسوب کیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ ضمانتی طریق کے تحت کفایت شعاری سے کام لینے کا کوئی محرک ہی نہیں پیدا ہوسکتا۔ ان

نقادوں میں لارڈ لارنس بھی تھے جنھوں نے ۱۸۶۷ء میں اپنی ایک یادداشت میں ضمانتی طریقے کی سخت مذمت کی تھی[1]۔ لیکن اکورتھ کمیٹی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ انگریزی کمپنیاں قائم کرنا ہی درست تھا، اس لیے کہ ہندوستان میں ایک طرف ریلوں کی شدید ضرورت تھی تو دوسری طرف ہندوستانی اصل شرمیلا تھا۔ ان حالات میں برطانوی اصل لانے کے لیے کوئی خاص کشش مہیا کرنا ضروری تھا۔ لیکن دوسروں نے اس پالیسی کی دانائی پر شبہہ کیا اور اس بات کو ماننے سے انکار کردیا کہ صرف منافع کی مقررہ شرح کی ضمانت کی ترغیب دیکر ہی انگلستان کے اصل کو یہاں کھینچا جاسکتا ہے۔ مثلاً ولیم تھارنٹن نے یہ شہادت پیش کی کہ اگر ضمانت نہ دی جاتی تب بھی انگلستان کا سرمایہ ریلیں بنانے کے لیے ہندوستان جاتا، اس لیے کہ انگلستان میں سرمایہ کثیر مقدار میں موجود تھا جس کو وطن میں نفع بخش طور پر مشغول کرنے کا کوئی میدان نہ تھا اور جو اسی وجہ سے جنوبی امریکا اور دوسرے ملکوں میں نکلنے کے لیے راستہ ڈھونڈھ رہا تھا۔ پس یہ خیال غلط تھا کہ وہ ہندوستان آنے سے پے درپے گریز کرتا[2]۔ یہ مفروضہ بھی غیر ثابت رہ جاتا ہے کہ جس شرح سود کی حقیقت میں ضمانت دی گئی تھی وہ دراصل ضروری تھی۔ اس بات کو مان لینے کے معقول اسباب ہیں کہ شرح سود میں معتدبہ کمی کرنے کے باوجود برطانوی اصل اور مہم کو یہاں آنے کی ترغیب ہوسکتی تھی۔ اس لیے

[1] دیکھو آر۔ دت کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان کی معاشی تاریخ عہد وکٹوریہ میں" ۱۵۵
صفحہ ۳۵۶۔

[2] دیکھو آر۔ دت کی کتاب Economic History of India in the Victorian age
"عہد وکٹوریہ میں ہندوستان کی معاشی تاریخ" صفحہ ۳۹۔

کہ اس زمانے میں انگلستان کے زر کے بازار میں قرضہ آسان شرائط کے ساتھ مل سکتا تھا۔ اس استدلال کو حکومت کے متعاقب تجربے سے تقویت پہنچی جب کہ حکومت کسی زیادہ وقت کے بغیر نظر ثانی کردہ ضمانتی طریق کے تحت ایسے شرائط پر معاہدے کرنے کے قابل ہوئی جو کمپنی کے حق میں ضمانتی شرح سود اور دوسرے مراعات کے بارے میں کمتر موافق تھیں۔ کمپنیوں کی حد تک غیر ضروری طور پر فیاضانہ شرائط منظور کرنے کے باعث ملک کو جو نقصان ہو رہا تھا اس سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ بھی بتلایا جا سکتا ہے کہ جہاں حکومت نے ریلوں کو ترقی دینے میں اپنی عملی دلچسپی کا ثبوت دیا وہاں اس نے ان صنعتوں میں سے کسی کو فروغ دینے کی کوشش ہی نہیں کی جو ریلوں کے مطلوبہ سامان کی فراہمی کے لیے ضروری تھیں، اور اس کی وجہ سے ریلیں اور بھی زیادہ بیش خرچ بن گئیں۔

۵۔ حکومت کا ریلیں بنانا اور چلانا ۱۸۶۹ء تا ۱۸۷۹ء

قدیم ضمانتی طریق کے مالی نتائج سے بے اطمینانی محسوس کر کے حکومت نے ۱۸۶۲ء تا ۱۸۶۶ء میں ہندوستان میں ریلیں ایسی شرایط پر بنانے کی ایک ناکام کوشش کی جو قدیم کمپنیوں کے ساتھ کئے ہوئے معاہدوں کے مقابلے میں حکومت کے لیے زیادہ موافق تھیں چنانچہ انڈین برانچ لائن کمپنی جیسی چند کمپنیوں کو جس نے بعد میں اپنا نام بدل کر اودھ اینڈ روہیل کھنڈ کمپنی رکھا، ضمانت کے بجائے فی میل لائن کے حساب سے کچھ مقررہ شرح پر سالانہ امداد منظور کی گئی حکومت ہند قدیم ضمانتی طریق جاری رکھنے کے لیے تیار نہ تھی، اور اس کے اعتراضات یہ تھے کہ کمپنیاں اخراجات میں بے احتیاطی سے کام لیتی تھیں، حکومت کمپنیوں کی موثر طریق پر نگرانی نہیں کر سکتی تھی، کمپنیوں کے سرمایے پر ایک مقررہ شرح سود کی ضمانت دینے سے حکومت کو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور حکومت کو ریلوں کے بچے ہوئے نفع سے

اپنا حصہ حاصل کرنے کی توقع بعید از امکان معلوم ہوتی تھی۔ لہٰذا دو اہم تبدیلیاں کی گئیں۔ جی، آئی، پی ریلوے جیسی بڑی اور اہم ریلوے کمپنیوں میں سے بعض کی حد تک زائد منافع کی تقسیم کے بارے میں جو انتظامات تھے اس طرح ان میں تبدیلی کردی گئی جس کی بنا پر حکومت ہر ششماہی پر زائد منافع کے نصف حصے کا مطالبہ غیر مشروط طور پر کرسکتی تھی۔ اس کے معاوضے میں حکومت معاہدوں کی ابتدائی تاریخوں سے پہلے ۲۵ سال کے ختم پر لائنوں کو خریدنے کے متعلق اپنے حق سے دست بردار ہوگئی۔ پالیسی کی اس سے بھی زیادہ اہم تبدیلی جو انیسویں صدی کے چھٹے دہے میں جبکہ اصول غیر مداخلت کے خیالات کا دور دورہ تھا بہت نمایاں تھی اس وقت رونما ہوئی جبکہ وزیر ہند نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان میں نئی لائنوں کے لیے مطلوبہ سرمایے کی حد تک حکومت کو چاہئے کہ اپنے ذاتی اعتبار سے اور ارزاں طریق تعمیر سے جس کو استعمال کرنے کی وہ توقع کررہی تھی پورا پورا فائدہ اٹھائے۔ چنانچہ ۱۸۶۹ء کے بعد کئی سال تک حکومت زیادہ تر براہ راست سرمایہ لگاتی رہی۔ اور ضمانتی کمپنیوں سے کسی قسم کے تازہ معاہدے نہیں کیے گئے۔ طے پایا کہ سرکاری انتظام کے تحت چلنے والی ریلوں کے بنانے کے لیے سالانہ ۲ ملین پونڈ تک قرضہ حاصل کیا جائے اور ایک نئی اور ارزاں پٹری کو جسے میٹر گیج کہا جاتا تھا اختیار کیا گیا۔ اس کے بعد پر زور طریقے پر ریلوں کی تعمیر کی گئی اور جہاں تک مصارف کا تعلق تھا۔ بہتر نتائج برآمد ہوئے۔ لیکن سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ سرمایے کو مسلسل اور کافی مقدار میں فراہم کرنا دشوار تھا۔ سب سے اول سندھ اور پنجاب کی لائنوں کو جو بعد میں نارتھ ویسٹرن ریلوے کے نام سے موسوم ہوئیں فوجی حکمت عملی کے اسباب کی بنا پر میٹر گیج سے براڈ گیج میں تبدیل کرنا پڑا۔ دوسرے یہ کہ روپے کی گرتی ہوئی شرح تبادلہ اور ۱۸۷۴ء اور ۱۸۷۹ء کے درمیان قحطوں نے خزانوں پر جو بار ڈالا اس کے باعث حکومت کی مالی مشکلات

بڑھ گئیں۔ ان مشکلات میں سرحدی جنگ سے جو افغانستان سے لڑی گئی مزید اضافہ ہو گیا۔ علاوہ ازیں سنہ ۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن نے ۵۰۰۰ میل کی زاید ریلوے لائن کی شدید ضرورت بتائی تھی اور یہ کہ ملک کو قحطوں سے اس وقت تک محفوظ نہیں خیال کیا جا سکتا جب تک کہ ہندوستانی ریلوے لائنوں کا طول بڑھا کر ۲۰ ہزار میل نہ کر دیا جائے۔ اس طرح حکومت یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہو گئی کہ قحط کمیشن نے جس قدر جلد کام کرنے کی سفارش کی تھی اس کے مطابق ریلیں بنانے کے لیے تنہا حکومت ہی کافی سرمایہ فراہم نہیں کر سکتی' اور دوبارہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ مستعار سرمایے سے جو خانگی کمپنیاں مہیا کریں مدد لی جائے' خاص کر اس وجہ سے کہ اس وقت یہ خیال کیا گیا تھا کہ حکومت سالانہ جتنی مقدار میں قرضہ حاصل کر رہی تھی اس کو معین کرنا ضروری تھا۔

۴۔ نیا ضمانتی طریق سنہ ۱۸۷۹ء تا سنہ ۱۹۰۰ء۔

اس طرح ریلوں کے سرکاری انتظام کی تائید میں خیالات کی جو رو تھی اس کا زور انیسویں صدی کے آٹھویں دہے تک بڑی حد تک ٹوٹ گیا' اور ریلوے کی تاریخ میں نئے دور کا آغاز اس وقت ہوا جبکہ حکومت نے قحط کمیشن کی سفارش کے مطابق قدیم شرائط میں کچھ تبدیلیاں کر کے ضمانتی کمپنیوں کے ذریعے سے کام لینے کا دوبارہ فیصلہ کیا۔ چنانچہ بنگال' ناگپور ریلوے کمپنی اور سدرن مرہٹہ ریلوے کمپنی جیسی نئی ضمانتی کمپنیوں سے معاہدے کیے گئے۔ اس طرح نئے ضمانتی طریق کی اہم امتیازی خصوصیات حسب ذیل تھیں :-

(۱) کمپنیاں جو لائنیں بنائیں گی وہ وزیر ہند کی ملک متصور ہوا کریں گی' جن کو یہ حق حاصل ہوگا کہ معاہدے کی ابتدا سے تقریباً ۲۵ سال گزرنے پر یا اس کے بعد ہر دس سال کی مدت کے ختم پر کمپنیوں کے لگائے ہوئے سرمایے کو مساوات پر ادا کر کے معاہدے کو کالعدم قرار دیں۔

(۲) کمپنیوں کے فراہم کردہ سرمایے پر نسبتاً کم شرح سود کی ضمانت

دی گئی۔ چنانچہ شرح عام طور پر ۳½ فی صد رکھی گئی۔

(۳) حکومت نے اپنے لیے فاضل منافع کا نسبتہً زیادہ حصہ مقرر کیا جو بالعموم ۳/۴ طے پایا۔

اس طرح جدید طریقے کے تحت جو لائنیں بنائی گئیں وہ شروع ہی سے حکومت کی ملک رہیں اگرچہ کمپنیوں کو ان کے فراہم کیے ہوئے سرمایے کے ایک جزو پر کسی حد تک شرح سود کی ضمانت دی گئی اور کمپنیوں کو اس کی اجازت دی گئی کہ لائنوں کی تکمیل پر ان کا انتظام کریں۔

اس طرح جب قدیم ضمانتی کمپنیوں کے معاہدے کی مدت ختم ہوگئی تو حکومت نے معاہدے کو ختم کر دینے کے لیے اپنے حق و اختیار سے کام لیا، اگرچہ اس حق سے مختلف صورتوں میں مختلف طریقے سے کام لیا گیا۔ بعض صورتوں میں مثلاً ایسٹرن بنگال، اودھ روہیل کھنڈ اور سندھ پنجاب ریلوں کے بارے میں لائنیں خرید کر سرکاری انتظام کے تحت لے لی گئیں۔ لیکن دوسری صورتوں یعنی ای، آئی آر اور جی، آئی، پی کی حد تک لائنیں خرید تو لی گئیں لیکن ان ہی کمپنیوں کو نظر ثانی کردہ معاہدوں کے تحت انتظام کے لیے دوبارہ دیدی گئیں۔ علیٰ ہذا جب نئی ضمانتی کمپنیوں کے معاہدے کی مدت ختم ہوئی تو یہ انتظام کیا گیا کہ یہی کمپنیاں نگرانی کا سلسلہ جاری رکھیں، مگر حکومت نے مختلف طریقوں سے اپنے لیے زیادہ موافق شرائط حاصل کیے۔ مثلاً سرمایے میں کمپنی کے حصے کو اور ضمانت دادہ شرح سود کو کم کر دیا گیا اور زائد منافع کی تقسیم کے متعلق فقروں میں مزید ترمیم و تبدیل کر دیا گیا۔

۷۔ موجودہ صورت حال

حکومت اور ضمانتی کمپنیوں کے موجودہ باہمی تعلقات کو اس موقع پر مختصر طور پر بیان کر دینا مناسب ہوگا۔ حکومت آج کل ٹرنک لائنوں کے بڑے حصے کی مالک بنی ہوئی ہے۔ سرمایے کا بیشتر حصہ اس کی ملک بن گیا ہے جس کو اس نے یا تو ابتدا میں خود ہی فراہم کیا تھا یا بعد میں کمپنیوں سے

قدیم معاہدوں کے ختم ہونے پر حاصل کر لیا۔ اس طرح شروع میں کمپنیوں نے جو سرمایہ لگایا وہ موجودہ ریلوے لائنوں کی مجموعی لاگت کا بہت ہی قلیل جزو ہے۔ مزید سرمایے کی ضرورت ہونے کی صورت میں حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اس کو یا تو خود فراہم کرے یا کمپنیوں کے ذریعے سے فراہم کرائے۔ ریلوں کا انتظام بجز چند صورتوں کے[1] کمپنیوں کے ہاتھ میں چھوڑا گیا ہے۔ پھر بھی عام نگرانی حکومت ہی کی رہتی ہے۔ چنانچہ اس غرض سے ایک ریلوے بورڈ ۱۹۰۵ء سے قائم کر دیا گیا ہے جو ریلوں کے پہیہ دار سامان اور مرمت کے معیاروں کی نگہداشت کرتا ہے، تحفظ عامہ کا ذمہ دار ہوتا ہے، ریلوے کے نظاموں میں ربط پیدا کرتا ہے اور ٹرین سرویس، مسافروں اور حمل ونقل کے کرایوں وغیرہ کی نگرانی کرتا ہے۔ حکومت کو یہ بھی اختیار حاصل ہے کہ کمپنیوں کی مجالس نظما میں حکومت کا ایک نمایندہ مقرر کرے۔ یہ سب معاہدے بجز اس معاہدے کے جو ۲۵ سال کی مدت کے لیے کیا گیا ہو وزیر ہند کی مرضی سے مقررہ تاریخوں پر کمپنیوں کا پورا سرمایہ ادا کر کے ختم کئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ان معاہدوں میں سے آخری معاہدہ جس کی مدت ختم ہونے والی ہے۔ بنگال، ناگپور ریلوے سے کیا گیا تھا اور وہ ۱۹۵۰ء میں اختتام کو پہنچیگا۔

۸۔ ریلوے شاخوں کی کمپنیاں

اس زمانے میں دوسری قسم کی ریلوے کمپنیاں بھی وجود میں آئیں۔ ہندوستانی ریاستوں کو اپنے علاقے کے اندر ریلیں بنانے کا مشورہ دیا گیا۔ چنانچہ سلطنت حیدرآباد نے اس سمت میں سب سے پہلے قدم اٹھایا اور سرکار کی جانب سے ریلوے کمپنی کو ضمانت دی گئی۔ اس طرح

---

[1] حال میں ریلوں کے انتظام کا حکومت کے ہاتھوں میں منتقل ہو جانا نئی پالیسی کے آغاز کی نشان دہی کرتا ہے جس کو بعد میں بیان کیا جائے گا۔

دیسی ریاستوں نے قریب ۵ ہزار میل ریلوے لائین بنائی جس کے بڑے حصے کی وہ خود ہی مالک ہیں۔ اس بات کی ہمت افزائی کی گئی کہ برانچ لائن کمپنیاں معاون لائنیں بنائیں۔ سنہ ۱۸۹۳ء میں برانچ لائنوں کو ایک پیشکش دیا گیا کہ انھیں میں لائنوں سے ٹرافک کا تبادلہ کرنے سے جو خام آمدنی ہو اس پر کچھ کٹوتی دی جائے گی تاکہ مقسوم ۳ فی صد تک بڑھ سکے۔ کٹوتی کے یہ شرائط غیر ترغیب دہ ہونے کی وجہ سے ان کی وقتاً فوقتاً نظر ثانی کی گئی تاکہ ایک قطعی ضمانت مہیا کی جائے اور زائد منافع میں حصہ دیا جائے یا زیادہ موافق کٹوتی دی جائے تاکہ بازار کے حالات سے مطابقت پیدا کی جاسکے۔ ان شرائط کے تحت کئی برانچ لائن کی کمپنیاں قائم کی گئیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی اس طریقے پر مالی حیثیت سے کام اچھی طرح نہیں ہوا۔ چنانچہ اکورتھ کمیٹی نے اس پر سخت نکتہ چینی کی اور اس کو گاڑی کے پانچویں پہیے سے تعبیر کیا۔ گو کمیٹی نے یہ تسلیم کیا کہ اس کی بدولت جتنی لائنیں بنائی جاسکتی تھیں وہ دوسری صورت میں ممکن نہ تھیں پھر بھی یہ سفارش کی کہ حکومت کو چاہئے کہ قدیم پالیسی ترک کردے یعنی موجودہ برانچ لائن کمپنیوں کو ختم کرکے ان کی تعداد گھٹادے اور ایسی لائنیں خود ہی بنائے بجز اس صورت کے جبکہ کسی وجہ سے وہ کافی سرمایہ مہیا نہ کرسکتی ہو یا نہ کرنا چاہتی ہو۔ لیکن ایسی کوئی وجہ پیدا ہونے کا بظاہر کوئی اندیشہ نہ تھا۔ ان سفارشوں کے مطابق حکومت نے سنہ ۱۹۲۵ء میں یہ فیصلہ کیا کہ شاخوں اور معاون لائنوں کے بنانے کے لیے خود ہی ضروری سرمایہ مہیا کرے۔ حکومت نے ایسی لائنیں خاص مقامی یا انتظامی سہولت کی خاطر بنانے پر بھی آمادگی ظاہر کی بشرطیکہ متعلقہ مقامی حکومت ریلوے بورڈ کو یہ اطمینان دلائے کہ نقصان کو وہ برداشت کرے گی۔

۹۔ ریلوں کی توسیع و ترقی اور منافع ملنے کا آغاز (سنہ ۱۹۰۰ء تا سنہ ۱۹۱۴ء)۔

اس دور کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ قومی نشو و نما کی ایک نئی اور پر زور پالیسی اختیار کی گئی جس سے معاشی زندگی کا تقریباً ہر شعبہ

متاثر ہوا، اور اسی کے جزو کے طور پر ریلوں میں بھی سریع توسیع و ترقی ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں ریلوں نے نئی شان اس طرح حاصل کی کہ ان کا ایک الگ محکمہ قائم ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس سال محکمۂ تعمیرات عامہ کا ریلوے سے متعلق شعبہ برخاست کر دیا گیا اور محکمہ صنعت و تجارت کے تحت ریلوں کی نگرانی کے لیے ایک ریلوے بورڈ قایم کیا گیا جس کا ایک صدر اور دو ارکان تھے۔ ایک تازہ محرک اس وقت ملا جبکہ ریلوے مالیے کی "میک کے" کمیٹی نے ۱۹۰۸ء میں ریلوں پر سرمایے کے سالانہ مصارف کے لیے آیندہ ۱ کرور ۲۵ لاکھ پونڈ کا معیار تجویز کیا جو میعادی طور پر نظر ثانی کے تابع تھا۔ حکومت اس قابل تو نہ تھی کہ میک کے کمیٹی کے سفارش کردہ معیار پہ قائم رہتی اور نہ اس کو مسلسل کئی سال تک کسی یکساں شرح پر جمے رہنے کا موقع ملا، پھر بھی اس نے سابقہ سالوں کے مقابلے میں زیادہ رقم صرف کی۔ چنانچہ ریل کی پٹریوں کا طول جو ۱۹۰۱ء میں ۲۵۷۴۲ میل تھا ۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۴ء میں ۳۴۶۵۶ میل تک بڑھ گیا۔ اور سرمایے کے مصارف ۳۲۹٫۵۳ کرور روپے سے ۴۹۵٫۰۹ کرور روپے تک بڑھ گئے۔

اس دور کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت یہ تھی کہ ۱۹۰۰ء میں ریلوں سے منافع ملنے کا آغاز ہوا۔ کم و بیش اس تاریخ تک ریلیں غیر نفع بخش تھیں جس کا باعث یہ تھا کہ قدیم ضمانتی کمپنیاں ریلوں کو غیر کفایت شعارانہ طریق پر بناتی اور چلاتی رہیں، قحط کی امداد کی غرض سے یا فوجی حکمت عملی کے نقطۂ نظر سے نارتھ ویسٹرن ریلوے جیسی ریلیں بنادی گئی تھیں جن سے کوئی آمدنی نہ ہوتی تھی، ریلوے جیسے نئے ذریعۂ نقل و حمل کو کامیاب بنانے کے لیے جو ملک کے موجودہ معاشی نظام کے فوراً مطابق نہ ہو سکا مسافروں یا مال کی کافی آمد و رفت نہ تھی۔ چنانچہ ریلوں کی آمد کے ابتدائی چالیس سال کے زمانے میں حکومت کو ۵۰ کرور روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اس کے بعد

ضمانتی کمپنیوں سے معاہدوں کی تجدید ایسے شرائط پر کئے جانے کی وجہ سے جو حکومت کے حق میں زیادہ مفید تھیں اور عام طور پر ملک کی معاشی نشوونما کے باعث اور خاص طور پر پنجاب اور سندھ کی معاشی ترقی کی بدولت جو ان صوبوں نے اپنے کارہائے آب پاشی کے تحت کی تھی، حکومت کو ریلوں سے سرمایے کے مصارف پر منافع ملنا شروع ہوا۔ چنانچہ فرانٹیر ریلوے بھی جو ایک زمانے تک ہندوستانی ریلوں میں سب سے کم نفع آور خیال کی جا رہی تھی اس ترقی کی بدولت اپنا خرچ نکالنے کے قابل بن گئی۔ سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد ابتدائی دس سال تک حکومت کو جو نفع ملا اس کی مقدار کم رہی، لیکن سنہ ۱۹۲۴ء تک نفع کی مجموعی مقدار ۱۰۳ کروڑ روپے ہو گئی۔ ریلوں کے منافع کی مقداریں ہر سال اس لیے تغیر ہوتا رہتا ہے کہ اس کا انحصار ملک کی زراعت کی حالت اور داخلی و خارجی تجارت کی رفتار پر ہے۔ اکورتھ کمیٹی کی سفارشوں کے اختیار کرنے اور انچ کیپ کمیٹی (سنہ ۱۹۲۲ء تا سنہ ۱۹۲۳ء) کے مشورے کے مطابق مصارف میں کمی کرنے کے باعث ہندوستانی ریلوں کی مالی حالت و حیثیت پہلے سے زیادہ مستحکم ہو گئی ہے۔ حکومت کے فراہم کیے ہوئے سرمایے پر مجموعی خام منافع میں (جو مجموعی خام آمدنی میں سے کاروباری مصارف کو منہا کرنے کے بعد بچا) حال کے سالوں میں حسب ذیل تغیرات ہوئے:-

فی صد منافع سنہ ۱۹۱۳ء تا سنہ ۱۹۳۰ء

سال	فی صد	سال	فی صد
سنہ ۱۹۱۳ء تا سنہ ۱۹۱۴ء	۵،۰۱	سنہ ۱۹۲۸ء تا سنہ ۱۹۲۹ء	۶،۵۳
سنہ ۱۹۱۶ء تا سنہ ۱۹۱۷ء	۶،۴۶	سنہ ۱۹۲۹ء تا سنہ ۱۹۳۰ء	۴،۶۵

سال	فیصد	سال	فیصد
سنہ ۱۹۱۸ء تا سنہ ۱۹۱۹ء	۷٫۵۳	سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۱ء	۳٫۴۶[ا]
سنہ ۱۹۲۱ء تا سنہ ۱۹۲۲ء	۲٫۶۴	سنہ ۱۹۳۱ء تا سنہ ۱۹۳۲ء	۳٫۰
سنہ ۱۹۲۲ء تا سنہ ۱۹۲۳ء	۴٫۳۸	سنہ ۱۹۳۲ء تا سنہ ۱۹۳۳ء	۲٫۹
سنہ ۱۹۲۳ء تا سنہ ۱۹۲۴ء	۵٫۲۴	سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء	۳٫۱
سنہ ۱۹۲۴ء تا سنہ ۱۹۲۵ء	۵٫۸۵	سنہ ۱۹۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء	۳٫۴
سنہ ۱۹۲۵ء تا سنہ ۱۹۲۶ء	۵٫۳۱	سنہ ۱۹۳۵ء تا سنہ ۱۹۳۶ء	۳٫۵
سنہ ۱۹۲۶ء تا سنہ ۱۹۲۷ء	۴٫۹۵	سنہ ۱۹۳۶ء تا سنہ ۱۹۳۷ء	۴٫۱
سنہ ۱۹۲۷ء تا سنہ ۱۹۲۸ء	۵٫۳		

تخفیف مصارف کی کمیٹی نے یہ مشورہ دیا کہ ریلوں کا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ سرمایے کے مصارف پر ۵½ فی صد آمدنی حاصل کریں۔ حکومت نے ریلوں کے منافع کے بارے میں جو اعلان کیا اس کے متعلق

[ا] سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء تا سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء میں زیادہ تر تجارتی کساد بازاری کے مضر اثرات کے باعث ریلوں کو مطالبات سود کے ادا کرنے کے بعد بھاری نقصان برداشت کرنا پڑا۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھو اس باب کی فصل ۱۵۔

مسٹر چندریکا پرشاد یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ "ریلوں کے زائد منافع کا اعلان کرنے میں خاص کر کچھ سال ادھر سرمایے کی فرسودگی کا لحاظ کرنے کے تجارتی اصول سے کام نہیں لیا گیا۔" وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ معلنہ منافعے میں سے اس مد کی بابت بہت کچھ کمی کرنی چاہیئے۔ اکورتھ کمیٹی نے اس استدلال کی تائید کی اور اس بات کی پر زور سفارش کی کہ ہر ریلوے کو چاہیئے کہ اپنے مستقل راستے اور ریل گاڑیوں اور انجنوں کی مرمت درستی اور بحالی کے لیے سالانہ معقول رقم مہیا کرے۔ ریلوں کے کاروبار کے مالی نتائج کے مسئلے پر مزید بحث اس باب کی فصل ۱۴ تا ۱۷ میں کی گئی ہے۔

۱۰۔ ریلوں کے نظام کا بیٹھ جانا (۱۹۱۴ء تا ۱۹۲۱ء)۔

اس دور کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ ریلوں کا نظام بالکل درہم برہم ہوگیا اور وہ سرعت کے ساتھ زوال پذیر ہوگئیں۔ اس کی وجہ کسی حد تک یہ تھی کہ ایک ایسے زمانے میں جبکہ عراق اور جنگ کے دوسرے میدانوں میں فوجی ریلیں بنانے اور چلانے کے لیے یہاں سے ریل گاڑیوں اور انجنوں کا ذخیرہ اور عملہ طلب کیا جارہا تھا یہاں کی ریلوں کو فوجوں کی بہت بڑی تعداد کی نقل وحرکت اور سازوسامان کی باربرداری کا ضروری انتظام کرنے پر مجبور کیا گیا جس سے ریلوں پر بہت بار پڑا؛ اور کسی حد تک یہ بھی وجہ تھی کہ حکومت کو عام طور پر مالی مشکلات کا سامنا تھا اور وہ ریلوں پر سرمایے کے سالانہ مصارف گھٹانے پر مجبور ہوگئی تھی۔ ان سب پر طرہ یہ کہ اس زمانے میں انگلستان سے ریل کا کوئی سامان حاصل کرنا نہایت مشکل تھا۔ صرف یہی نہیں کہ ریلوں کی جدید توسیع کو روکنا پڑا بلکہ موجودہ لائنیں بھی عمدہ حالت میں قایم نہیں رکھی جاسکتی تھیں۔ اکورتھ کمیٹی نے جنگ عظیم کے حالات کے تحت ریلوں کے نظام کے درہم برہم ہوجانے کا نقشہ حسب ذیل الفاظ میں کھینچا ہے:-

"ایسے بیسیوں پل ہیں جن کے شہتیروں یا گرڈروں میں جدید ضرورتوں کے لحاظ سے ٹرین کے وزن کو سنبھالنے کی قابلیت نہیں ہے! میلوں پٹریاں، صدہا انجن اور ہزاروں واگن ایسے ہیں جن کی پابجائی اور تجدید مدتوں قبل ہونی چاہیئے تھی مگر اب تک وہ فرسودہ حالت میں پڑے ہوئے ہیں"۔ ان حالات میں یہ امر کچھ تعجب خیز نہیں کہ عوام اور تاجروں کے طبقے نے مسافروں اور مال کی نقل وحمل کی دشواریوں کے بارے میں خوب شکایتیں کیں۔ رائے عامہ بھی روز افزوں اس بات کی مخالفت کر رہی تھی کہ انگلستان میں قائم شدہ کمپنیاں سرکاری ریلوں کے بڑے حصے کا انتظام کریں۔ چنانچہ یہ مطالبہ کیا گیا کہ حکومت کو جہاں کہیں ممکن ہو انتظام اپنے ہاتھ میں لینا چاہیئے۔

۱۱۔ اکورتھ کمیٹی اور اس کے بعد یہ بات بھی روز افزوں محسوس کی جارہی تھی کہ ریلوے بورڈ اپنی موجودہ ترکیب کے لحاظ سے اس قابل نہ تھا کہ ریلوے کی پالیسی کا تعین کرنے میں اقدام کرتا" اور یہ کہ وہ خاص کر مسافروں اور مال کے کرائے کے بارے میں ریلوں کے نظم ونسق کی موثر نگرانی کرنے سے قاصر رہا جس کے اسباب یہ تھے کہ وہ معمولی کام کے بوجھ سے حد سے زیادہ لدا ہوا تھا، غیر ضروری بندشوں اور قیود میں جکڑا ہوا تھا، مقامی حالات کی ناواقفیت ایک سنگ راہ تھی اور خصوصی ماہر اور نگران کار انتظامی عملہ ناکافی تھا۔ اسی طرح ریلوں کے مالیے کی آیندہ پالیسی کے بارے میں بھی تازہ رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ غرض ان سب مسائل کو ایک خصوصی کمیٹی کے سامنے رکھا گیا جس کا تقرر نومبر ۱۹۲۰ء میں ہوا اور جس کے صدر نشین انگلستان کی ریلوں کے ایک خصوصی ماہر سر ولیم اکورتھ (آنجہانی) مقرر کیے گئے۔ لیکن کمیٹی کے تقرر کا فوری سبب یہ مسئلہ تھا کہ ای، آئی، آر کے بارے میں جس کی مالک حکومت تھی اور جس کا انتظام ایسٹ انڈین ریلوے کمپنی کے ہاتھ میں تھا، حکومت کا معاہدہ کمپنی سے نومبر ۱۹۲۰ء میں ختم ہونے کی صورت میں

کیا کارروائی کی جائے۔ عارضی تدبیر کے طور پر قدیم معاہدے کی توسیع ختم سال ۱۹۲۴ء تک کی گئی، اور انتظام کے مختلف ممکنہ طریقوں کی متعلقہ خوبیوں اور خرابیوں کی بحث سے پیدا ہونے والے عام مسائل اکورتھ کمیٹی کے سامنے بھیجدیے گئے۔ کمیٹی نے ایک جامع اور مفصل تحقیق کے بعد دوسرے ہی سال اپنی رپورٹ شائع کی۔ اس رپورٹ میں کئی اہم مسائل کی تحقیقات شامل ہے۔ چنانچہ ہم اب ان ہی پر تبصرہ کریں گے۔ لیکن اس سے قبل یہ ضروری ہے کہ حکومتی انتظام بمقابلہ انتظام کمپنی کی بحث پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

۱۲۔ ہندوستان میں ریلوں کے حکومتی انتظام کے حق میں دلائل

ریلوں کے سرکاری انتظام کے خلاف جو دلیل ہے اس کو نظری اسباب کی بنا پر ضرور پرزور مانا جا سکتا ہے[1] لیکن جب ہم کسی خاص ملک کے حوالے سے اس امر پر غور کرتے ہیں کہ آیا سرکار کو ریلوں کا انتظام کرنا چاہئے یا کمپنی کو تو محض نظری اسباب کی بحث بے سود ہو جاتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نظری ملحوظات کی بجائے تاریخی اسباب نے اس امر کا تعین کیا ہے کہ کس خاص طریق پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ مختلف ملکوں کو کم و بیش مختلف طریقوں کے تحت ترقی و خوش حالی میسر ہوئی ہے۔ ہندوستان میں قیاس اس اصول کی حمایت میں ہے جو براعظم یورپ میں رائج ہے، کہ حکومت کو چاہئے کہ جو کچھ کر سکتی ہو اس سے دریغ نہ کرے۔ برخلاف اس کے انگلوسیکسن اصول یہ ہے کہ حکومت کے توسط کے بغیر جو کچھ کیا جا سکتا ہے اسے عوام کو پورا کرنا چاہئے۔ حکومت ریلوں کا کاروبار مختلف اسباب کی بنا پر کرتی ہے۔ چنانچہ وہ یا تو سیاسی اغراض کے تحت یا خانگی مہم کی عدم موجودگی یا کمی کو پورا

---

[1] اس مسئلے کے متعلق مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہو ڈبلیو، ایم، اکورتھ کی کتاب موسوم بہ State Railway ownership

کرنے کے لیے، یا عوام کی نقل وحرکت کا انتظام ارزاں شرح کرایے پر کرنے، مختلف مفادات واغراض کے ساتھ رواداری برتنے، اور بہتر سہولتیں مہیا کرنے کی خاطر یہ کاروبار کرتی ہے۔ ہندوستان میں یہ سب اسباب کم وبیش سرکاری انتظام کی دلیل کی حمایت قوت کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں سچ پوچھو تو یہاں کمپنی کے ذریعے سے انتظام ناقابل عمل ہے؛ اور اس لحاظ سے، جیسا کہ اکورتھ کمیٹی کی اکثریت کی رپورٹ میں بتلایا گیا ہے، غیر ممالک کی نظیر پیش کرنا اور یہ بتلانا کہ دوسرے ملکوں میں کمپنی کا انتظام زیادہ کامیاب رہا، بے موقع اور خارج از بحث ہے۔ ہمارے ملک میں سرکاری ملکیت کا وجود اکثر صورتوں میں اور راست سرکاری انتظام بھی کسی حد تک پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مثال کے طور پر نارتھ ویسٹرن ریلوے اور ایسٹرن بنگال ریلوے کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ حال ہی میں اس فہرست میں دوسری ریلوے لائنوں مثلاً ای، آئی، آر کا ۱۹۲۴ء میں، جی، آئی، پی کا ۱۹۲۵ء میں اور برما ریلویز کا ۱۹۲۹ء میں اضافہ ہوا ہے۔ کچھ سال ادھر تک اکثر سرکاری ریلوں کا انتظام لندن میں قائم شدہ کمپنیاں کرتی تھیں، بلکہ موجودہ زمانے میں بھی سرکاری ریلوں میں سے تقریباً ۵۰ فی صد کا انتظام کمپنیوں ہی کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ خیال کہ حکومت کو چاہئے کہ ریلوں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے بتدریج قوت اور اہمیت حاصل کرتا جارہا ہے۔ چنانچہ اکورتھ کمیٹی کی اکثریت اور غیر سرکاری ہندوستانی رائے عامہ عام طور پر اسی خیال کی حامی ہے۔ بہرحال آرا کا اتفاق عام طور پر اس بات پر ہے کہ کمپنیوں کے ذریعے سے انتظام کم از کم اپنی موجودہ شکل میں باقی نہ رہنا چاہئے، یعنی انتظام لندن میں قائم شدہ کمپنیوں کے سپرد نہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ اکورتھ کمیٹی میں رایوں کا اختلاف اس بات پر ہوا کہ آیا انتظام حکومت کو کرنا چاہئے یا ہندوستان میں قائم شدہ کمپنیوں کو۔

اکثریت نے کمیٹی کے صدر نشین سر ولیم اکورتھ کی قیادت میں اول الذکر طریق کی حمایت میں قطعی طور پر رائے دی۔ ہندوستان میں سرکاری انتظام کے حق میں جو دلیل پیش کی جاتی ہے اس کو حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے[1]
گو ایسی کمپنی جو اپنا ذاتی سرمایہ مشغول کرتی ہو اپنی جائداد کا خود ہی انتظام کرتی ہو اور اپنے عہدہ داروں کے متعلق رائے اس اعتبار سے قایم کرتی ہو کہ وہ مقسوم کی شکل میں نتائج پیدا کرنے میں کس درجہ کامیاب ہیں، کاروبار کو اس سے زیادہ ہمت و مستعدی کفایت اور لچکداری کے ساتھ انجام دیتی ہے جتنی کہ حکومت کی راست نگرانی کی صورت میں کاروبار میں عام طور پر ممکن ہے؛ پھر بھی مدت ہوئی کہ ہندوستان میں حکومت کی ریلوں کا انتظام کرنے والی انگریزی کمپنیاں اس مفہوم میں کمپنیاں نہیں رہی ہیں۔ جو جائداد انتظام کی غرض سے ان کے تفویض کی گئی ہے وہ ان کی ملک نہیں ہے اور اس میں ان کے سرمایے کی بہت ہی کم مقدار لگی ہوئی ہے[2]۔ اس طریق پر نہ تو گزشتہ زمانے میں اطمینان بخش کام ہوا اور نہ آیندہ ہو سکتا ہے۔ انتظام صرف برائے نام کمپنیوں کے سپرد کیا جاتا ہے اور حکومت نے خود کو اصلی مالک خیال کرکے کمپنیوں کو اپنے طور پر کچھ کرنے کا کوئی حقیقی اختیار نہیں دیا سرکاری

---

[1] ملاحظہ ہو اکورتھ کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۲۱۰ تا ۲۳۹۔

[2] اس سلسلے میں مندرجۂ ذیل اعداد دلچسپ پائے جائیں گے۔ تمام ریلوں پر بشمول زیر تیاری ریلوں کے جو سرمایہ خرچ ہوا اس کی مجموعی مقدار ختم مارچ ۱۹۳۷ء تک ۸۰۰٫۱۳ کرور روپے تھی۔ اس کے منجملہ ۸۹۰٫۰۳ کرور روپے سرکاری ریلوں پر لگایا گیا اس میں وہ بڑھوتری بھی شامل ہے جو کمپنیوں کو ان کی لاگتوں کی خریداری میں ادا کی گئی باقی یعنی ۱۰٫۱۹ کرور روپے وہ سرمایہ ہے جو ہندوستانی ریاستوں کمپنیوں اور مجالس ضلع نے فراہم کیا۔ اس کل رقم کا بیشتر حصہ یعنی ۶۳٫۵۱۰۷ کرور روپے حکومت کا سرمایہ ہے اور صرف ۱/۱۴ حصہ یعنی ۳۹٫۲۷ کرور روپیہ کمپنیوں نے فراہم کیا۔ ان اعداد میں ۸۰٫۳۴۳ کرور روپے اس سرمایے کے خرچ کی مد کے بھی ہیں جو ختم مارچ ۱۹۳۷ء تک

ڈائرکٹر انگلستان کی مجلس نظما میں بیٹھا ہوا اپنے رفقائے کار کے فیصلوں کو نامنظور کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ یہ لازمی قرار دیا گیا ہے کہ ریلوں کی آمدنی کل کی کل سرکاری خزانے میں جمع کردی جائے اور مصارف کے لیے جو زر درکار ہو وہ صرف حکومت کی مقرر کردہ بندشوں کے تابع حاصل کیا جا سکتا ہے اور اس بارے میں کمپنی کی خواہش کی تکمیل ہونا لازمی نہیں ہے۔ جائدادوں کا قیام اور تقررات وغیرہ جیسے اہم معاملات کی نگرانی زیادہ تر حکومت ہی کرتی ہے۔ اس طرح کمپنیاں کاروبار کا انتظام نہ تو بحالت موجودہ کرتی ہیں اور نہ کبھی کر سکتی ہیں اور نہ بجز حکومت کی منظوری کے کسی جانب کوئی نیا قدم اٹھا سکتی ہیں۔ حکومت اس بات کو اپنی ذمہ داری میں داخل نہیں سمجھتی کہ خود کوئی پیش قدمی کرے۔ اگر کمپنیاں سستی سے کام کریں تو وہ ان کو حرکت میں نہیں لا سکتی۔ مختصر یہ کہ یہ ایسا طریق ہے جس کے تحت مصارف کی جزویات کا حد سے زیادہ خیال رکھنے والی حکومت کی نگرانی کے باعث ایک ترقی پذیر کمپنی کی راہ میں سنگین رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ دوسری طرف کمپنی کے بورڈ کی غیر دانشمندانہ اور غیر ترقی پذیر پالیسی سے جو نقصانات حکومت کی آمدنی اور ملک کی معاشی نشو و نما کو پہنچ سکتے ہیں ان کو حکومت کی انتہائی دانشمندی بھی روکنے کے قابل نہیں ہے۔ اکورتھ کمیٹی کی اقلیتی جماعت نے جو تجویز پیش کی کہ انتظام انگریزی کمپنیوں سے لے کر ہندوستانی کمپنیوں کے ہاتھ میں منتقل کرنا چاہئے' اس کے بارے میں پہلا اعتراض یہ ہے کہ اس کام میں ہندوستانی کمپنیوں کا حصہ بہت ہی چھوٹا ہوگا۔ حکومت ہی بڑی اور غالب حصہ دار رہیگی' نظما کی نصف تعداد اور صدر نشین کا

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ فوجی اہمیت کی لائنوں پر لگا۔ ملاحظہ ہو ایک رپورٹ موسوم بہ ہندوستانی ریلیں Report on Indian Railways بابت ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۶ء جلد اول فقرہ ۳۵۔

تقرر کرے گی اور کاروبار کی نگرانی اپنے ہاتھ میں رکھے گی۔ حکومت اور مجلس نظما کے درمیان ذمہ داری کی تقسیم برقرار رہے گی، اور انتظامی عہدہ داروں کو ایک طرف مجلس نظما کی اطاعت کرنی پڑے گی اس لیے کہ وہی ان کو مقرر کرے گی اور تنخواہ دے گی، اور دوسری طرف حکومت کا بھی وفادار رہنا پڑے گا جو مجلس نظما کی آڑ میں بیٹھی ہوئی ہوگی۔ اس طرح عہدہ دار کام کرنے کی بہترین صلاحیت رکھنے کے باوجود کام نہ کر سکیں گے۔ لایق کاروباری اشخاص مجلس نظما میں شریک ہونے سے انکار کر دیں گے اگر انھیں یہ معلوم ہو کہ ان کے اختیارات حکومت کی نگرانی اور سرکاری ضوابط کی بنا پر محدود ہیں، چنانچہ اس تجویز کی رو سے جس کی حمایت اقلیتی جماعت نے کی ہے یہ چیز ناگزیر معلوم ہوتی ہے۔ چونکہ اس بات کی تجویز پیش نہیں کی گئی ہے کہ خانگی کمپنیاں ریلوں کو حکومت سے پوری طرح خرید لیں جس کے لیے انھیں کروڑوں روپے کا سرمایہ فراہم کرنا ہوگا، اس لیے ریلوں کے سرمایے میں اس قسم کی کمپنیوں کا حصہ جن کی اقلیتی جماعت نے تجویز کی ہے لازمی طور پر قلیل ہوگا۔ پس محض اس بنا پر معاملات میں اصلاح و ترقی نہ ہوگی کہ کمپنی انگلستان میں قایم ہوئی یا ہندوستان میں، اس لیے کہ ہندوستان میں ایسی کمپنیاں قایم ہی نہیں کی جا سکتیں جو حکومت سے بڑی حد تک بے تعلق اور آزاد ہوں، اور ایسی آزادی کے بغیر خانگی کام کے فوائد ہی حاصل نہیں ہو سکتے۔ علاوہ ازیں ہندوستان میں قایم شدہ کمپنیاں ریلیں بنانے کے لیے ضروری سرمایہ فراہم کرنے میں زیادہ کارآمد ثابت نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ اس کام کا بڑا حصہ حکومت کو بطور خود کرنا پڑے گا جو کمپنی کے انتظام کے مقابلے میں سرکاری انتظام کے تحت زیادہ سہولت کے ساتھ انجام پا سکتا ہے۔ کمپنی کا انتظام، خواہ کمپنی کہیں قایم ہو۔ ہندوستان میں مقبولیت حاصل نہیں کر سکتا۔ مالی، معاشی اور سیاسی نقطۂ نظر سے یہی مناسب ہوگا کہ ہندوستانی ریلوں کے لیے جو زر مطلوب ہو وہ آیندہ سے حتی الامکان ہندوستان ہی

میں فراہم کیا جائے اور اگر حکومت ریلوں کا انتظام اپنے ہی ہاتھوں میں لے لے تو عوام دل کھول کر اور زیادہ مستعدی کے ساتھ سرمایہ فراہم کردیں گے۔ علاوہ ازیں اگر ملک کے باہر سے قرضہ حاصل کرنا ضروری ہو تو حکومت ہند اور وزیر ہند کی ساکھ ملک کے سب سے بڑے بنکروں کی حیثیت سے ایک انمول اثاثہ ہے۔ ہندوستان میں سرکاری انتظام کے حق میں جو اہم ترین دلائل ہیں ان میں سے ایک عام طور پر مانا ہوا خیال یہ ہے کہ کمپنی کے انتظام نے یہ ثابت کردیا ہے کہ کمپنی قومی اغراض سے دیدہ ودانستہ بے پروائی کرتی ہے، یعنی یا تو یوروپین اغراض کو فائدہ پہنچانے کی خاطر راستوں اور کرایے کی شرحوں میں جوڑ توڑ کیا جاتا ہے جس سے ہندوستانی صناعوں اور ہندوستانی تجارت کو نقصان پہنچتا ہے یا ریلوے کی خدمات خاص کر اعلیٰ عہدوں پر قابل ہندوستانیوں کو بے لاگ اور مساوی طور پر مقرر کرنے سے انکار کیا جاتا ہے۔ اگر انتظام حکومت کے ہاتھ میں آجائے تو ان سب خرابیوں کو دور کرنے کا زیادہ موقع ملے گا۔ سرکاری انتظام سے ایک اور فائدے کی توقع کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ ریلوں کے چلانے کے مصارف میں کفایت ہوگی۔ موجودہ زمانے میں حکومت کو صرف کمپنی کے لگائے ہوئے سرمایے پر سود ہی ادا کرنا نہیں پڑتا بلکہ منافع کا ایک حصہ بھی دینا پڑتا ہے۔ سرکاری انتظام کے تحت یہ رقم لندن کی بورڈ کمپنی کو یا فرض کرتے ہوئے کہ ہندوستانی کمپنیاں قایم ہوں ہندوستانی کمپنی کو ملنے کی بجائے ہندوستان کے سرکاری خزانے میں جائے گی۔ یہ خوف کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ موجودہ حالات کے تحت ہندوستان میں جو کمپنیوں کا تصور کیا جاسکتا ہے ان کے انتظام کے مقابلے میں سرکاری انتظام خوبی کار کے اعتبار سے خراب اور گھٹیا درجے کا اور اس لیے کم نفع آور ہوگا۔ ہندوستان میں سرکاری انتظام کے متعلق حقیقی تجربہ اگر کوئی دلیل ہوسکتی ہے تو اس نے یہ ثابت کردیا ہے کہ سرکاری انتظام کمپنی کے انتظام کے مقابلے میں برا نہیں رہا۔

اس استدلال میں بھی کوئی صداقت نہیں معلوم ہوتی کہ ہندوستان میں سرکاری انتظام نے جتنی کہ کامیابی حاصل کی اس کا باعث یہ ہے کہ یہاں سرکاری انتظام کے پہلو بہ پہلو کمپنیاں بھی ریلیں چلا رہی ہیں اور ان کی مسابقت کا مفید اثر پڑا۔ موجودہ طریق کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ریلوں کے حقوق قائمہ ملک کے مختلف حصوں میں نہ صرف مال اور مسافروں کی نقل وحمل پر پورا اختیار رکھتے ہیں بلکہ نئی ٹرنک یا معاون لائنوں کی تیاری اور دو یا دو سے زیادہ مختلف لائنوں کے میل پر بھی کامل تسلط رکھتے ہیں۔ اس طرح کئی حلقہ ہائے اثر قائم ہو گئے ہیں جن سے ریلوں کی مناسب اصلاح و ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ سرکاری انتظام کے تحت یہ خرابی دور ہو جائے گی، اور ملک کے حقیقی اغراض کے مطابق لائنیں بنائی جائیں گی۔ علاوہ ازیں سرکاری انتظام کے تحت تاجروں اور مسافروں کی سہولت کا موجودہ حالت کے مقابلے میں زیادہ خیال رکھا جائے گا۔[1] کمپنیوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ منافع سمیٹنا ان کا واحد مقصد ہوتا ہے اور اس بات سے ہندوستان میں بہت ناراضی پھیلی ہوئی ہے کہ کمپنیاں جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے، تاجروں اور مسافروں خاص کر تیسرے درجے کے مسافروں کے اغراض سے تغافل برتتی ہیں۔ سرکاری انتظام کے تحت عوام کی شکایتوں کو جلد اور موثر طور پر دور کرنے کا بہت زیادہ موقع ملے گا۔ ریلوے کمپنیوں کی مجالس نظما کا صدر مقام چونکہ لندن ہوتا ہے اس لیے ہندوستانی مفادات کی جانب سے بیانات اور نمایندگیوں کی اول تو وہاں تک پہنچ مشکل سے ہوتی ہے۔ اگر پہنچ ہوئی بھی تو ان کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا برخلاف اس کے یوروپی تاجر بدرجہا بہتر طریق پر منظم ہیں اور انگلستان

[1] مسٹر این، بی، مہتا یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ریلوے لائنوں کی باہمی مسابقت اور ریداولتہ علامت کے فقدان نے ہندوستان میں سرکاری انتظام کو ایک اخلاقی فرض بنا دیا ہے۔

میں ان کی نمایندگی بدرجہا بہتر کی جاتی ہے۔ اس لیے ان کی چیخ پکار آسانی سے سنی جاتی ہے۔ یہ صورت حال ہماری تجارت اور صنعت کی سریع اصلاح و ترقی کے لیے مفید خیال نہیں کی جاسکتی۔ نسلی تعصبات سے قطع نظر کرتے ہوئے چھ ہزار میل کے فاصلے سے نگرانی کرنا لازمی طور پر دشوار ہوگا۔ اس لیے کہ ایسی نگرانی ریلوے کے مقامی انتظامی کارکنوں کو بےجا قیود میں جکڑ دیتی ہے۔

سرکاری انتظام اور کمپنی کے انتظام کا مباحثہ اس وقت اہم نقطے پر پہنچا جبکہ جی، آئی، پی اور ای، آئی، آر کے معاہدے ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۵ء میں ختم ہونے والے تھے۔ فروری ۱۹۲۳ء میں یہ معاملہ مجلس قانون ساز میں پیش ہوا۔ ہندوستانی غیر سرکاری ارکان نے بالکل سرکاری انتظام کے حق میں خیالات ظاہر کئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں ریلوں کو سرکاری انتظام کے تحت لے لینے کی سادہ تحریک منظور ہوگئی۔ چنانچہ حکومت نے دونوں ریلوں کو براہ راست اپنی نگرانی میں لے لیا۔ برما ریلویز بھی جنوری ۱۹۲۹ء سے سرکاری نگرانی میں آگئیں۔ یہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ حکومت نے ۱۹۳۰ء میں سدرن پنجاب ریلوے کو خرید لیا۔ اس کا انتظام این، ڈبلیو، آر کرتی ہے جس کی مالک و منتظم حکومت ہے۔ اس امر کے مدنظر کہ رائے عامہ بہت قوی ہے اور وہ یقینی طور پر سرکاری انتظام کو ترجیح دیتی ہے، اس بات کا امکان ہے کہ رفتار زمانہ کے ساتھ ریلیں سب کی سب حکومت کی نگرانی اور انتظام میں آجائیں[1]۔

[1] لیکن یہ بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ حکومت نے مدراس اینڈ سدرن مرہٹہ ریلوے بنگال اینڈ نارتھ ویسٹرن ریلوے اور روہیل کھنڈ اینڈ کمایون ریلویز سے ان کے معاہدے ۳۱ دسمبر ۱۹۳۲ء کو ختم ہوتے وقت اپنے اختیارات سے کام نہیں لیا۔

۱۴۔ عام مالیے سے ریلوں کے مالیے کی علیحدگی

حال کی ان اہم تبدیلیوں میں سے جو ریلوں کی کارکردگی پر خاص طور سے اثر انداز ہوتی ہیں ایک تبدیلی عام مالیہ سے ریلوں کے مالیہ کی علیحدگی ہے۔ اکورتھ کمیٹی نے مختلف اسباب کی بنا پر اس تدبیر کو اختیار کرنے پر زور دیا۔

اس تدبیر کے اختیار کرنے کا ایک نتیجہ یہ بتایا جاتا ہے کہ سالانہ بجٹ میں عدم تیقن کا عنصر جو ریلوں کے منافع کو شامل کرنے کے باعث پیدا ہوتا ہے باقی نہ رہے گا۔ منافع میں موسم اور تجارتی حالات کی نوعیت کے لحاظ سے تغیر ہوتا رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اندازے سے کئی کروڑ کم یا زیادہ آمدنی ہوتی ہے۔

ریلوے کے نقطۂ نظر سے علیحدگی کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ قابل لحاظ سمجھا گیا۔ ریلوے کے کاروبار کا انحصار عام میزانیے کی ناگہانی ضرورتوں اور ملک کی مالی حالت پر رہنے کی وجہ سے ریلوں کو تجارتی بنیاد پر چلانے میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

جس انتظام کی رو سے یہ فرض کیا گیا تھا کہ ریلوے کا کاروبار ہر سال ۳۱ مارچ کو ختم ہو جاتا ہے ریلوں کے لیے بدیہی طور پر نقصان دہ تھا۔ دونوں میزانیوں کی علیحدگی کا مقصد صرف یہی نہ تھا کہ ریلیں اپنا انتظام کاروباری طریق پر کر سکیں بلکہ حکومت کو بھی قدیم طریقے کی مشکلات سے نجات دلائی جائے۔ اس مسئلے کی اہمیت کے مدنظر ستمبر ۱۹۲۱ء میں مجلس قانون ساز کے سامنے ایک تجویز پیش کی گئی اور اس مسئلے کی تحقیقات کی غرض سے دونوں ایوانوں کی ایک مشترکہ کمیٹی بنائی گئی۔ اس کمیٹی نے فوری علیحدگی کو ناقابل عمل قرار دیا۔ لیکن کمیٹی پر اس بات نے گہرا اثر ڈالا کہ موجودہ ریلوے لائنوں کی از سر نو درستی ضروری تھی جو جنگ عظیم کے زمانے میں بالکل نظر انداز کر دی گئی تھی۔ چنانچہ اس نے یہ سفارش کی کہ ۱۵۰ کروڑ روپیہ

کے ایک پروگرام کی ضمانت دی جائے تاکہ اس روپے کو پانچ سال کی مدت پر پھیلا کر موجودہ لائنوں کی اصلاح و درستی اور تکمیل پر نیز تیسرے درجے کے مسافروں کے آرام و آسایش کا بہتر سامان کرنے پر خرچ کیا جائے۔

مجلس قانون ساز نے نہ صرف اس سفارش کی تائید کی بلکہ ریلوے کے مایے کو عام مایے سے علیحدہ کرنے کی تجویز کو اس شرط پر قبول کرنے کو تیار ہوگئی کہ عام مایے کو ریلوں کی سالانہ آمدنی سے ایک معینہ حصہ ملتا رہے اور اس رقم کی ادائی ریلوں کی خالص آمدنی پر اولین مطالبہ تصور کیا جائے۔ اس حصے کے متعلق یہ طے پایا کہ وہ سرمایے کے ایک فی صد پر مبنی ہوگا جو تجارتی لائنوں پر ماقبل آخر مالی سال کے ختم تک لگا ہوا ہوگا۔ اس سے وہ سرمایہ خارج کر دیا گیا جو کمپنیوں اور دیسی ریاستوں کی طرف سے مہیا کیا جائے۔ اس کے علاوہ عام مایے کو اس سال کے زائد منافع کا ۱/۵ جزو بھی دیا جائے گا اور فوجی اہمیت کی لائنوں پر لگے ہوئے سرمایے کا سود اور وہ گھاٹا جو ان پر ریلیں چلانے سے آئے منہا کر دیا جائیگا۔ مجلس قانون ساز نے یہ طے کیا کہ اگر اس طرح مقرر کیے ہوئے حصے کی ادائی کے بعد ریلوے کے سرمایۂ محفوظ میں منتقل کی جانے والی رقم ۳ کروڑ روپے سے متجاوز ہو تو اس زاید رقم کا ۱/۳ حصہ عام سرکاری آمدنی میں جمع کر دیا جائے۔ یہ قرار پایا کہ ریلوے کے سرمایۂ محفوظ کو حسب ذیل کاموں کے لیے استعمال کیا جائے یعنی سالانہ حصے کی ادائی کو یقینی بنانے، اگر ضرورت ہو تو فرسودگی کے بقایا اور سرمایۂ مشغول کی قدر متعارف گھٹانے اور ریلوں کی مالی حالت کو عام طور پر مستحکم کرنے۔ یہ توقع کی گئی تھی کہ اس انتظام سے ہندوستانی محصول ادا کرنے والوں پر آیندہ محصولات کے بارے میں کمی ممکن ہوسکے گی۔ دوسری طرف مسلسل مالی پالیسی کو برقرار رکھنے اور حسابات کی عارضی اور دوامی توفیر یا گھاٹے کے درمیان فرق اور امتیاز کرنے میں بہت سہولت ہوجائے گی۔ چنانچہ اس تجویز کے تحت پہلا ریلوے بجٹ مجلس قانون ساز میں مارچ ۱۹۲۵ء میں

پیش کیا گیا۔ علیحدگی کے اس طریقے کے مالی نتائج پر فصل ۱۵ میں تبصرہ کیا گیا ہے۔

۴۱۔ ریلوے بجٹ۔ مندرجۂ ذیل جدول میں ریلوے بجٹ کی آمدنی اور خرچ کی بڑی مدات پیش کی گئی ہیں۔

ریلوے بجٹ برائے ۳۸-۱۹۳۷ء[1]

آمدنی کی مدیں	کرور روپے	خرچ کی مدیں	کرور روپے
(۱) سرکاری ریلیں:۔ (۱) تجارتی لائنیں:۔ مجموعی خام آمدنی	۹۴٫۶۵[2]	(۱) سرکاری ریلیں:۔ (۱) تجارتی لائنیں:۔ سرکاری سرمایۂ مصروفہ کا سود	۲۶٫۸۵
سرکاری ریلوں کے کاروباری مصارف منہا شدنی.........	۶۱٫۸۹[3]	ہندوستانی ریاستوں اور کمپنیوں کے فراہم کیے ہوئے سرمایے کا سود.........	۱٫۱۸
زائد منافع جو ہندوستانی ریاستوں اور ریلوے کمپنیوں کو ادا کیا گیا	٫۳۹	تجارتی لائنوں کے سرمایے کا مجموعی سود	۲۸٫۰۳
کام کرنے والی ریلوں کو ادائی.........	۲٫۸۸	(۲) فوجی اہمیت کی لائنیں:۔ مشغولہ اصل کا سود.......	۱٫۳۳
خالص آمدنی	۲۹٫۴۹	سود کی مجموعی مقدار	۲۹٫۳۶

[1] دیکھو مرکزی حکومت کا میزانیہ برائے ۳۸-۱۹۳۷ء صفحہ ۲۲ تا صفحہ ۳۵۔

[2] اس میں سرکار کے زیر انتظام لائنوں کی ۵٫۳۵ کرور روپے کی آمدنی شامل ہے۔

[3] اس میں سرکار کے زیر انتظام لائنوں کے کاروباری مصارف یعنی ۲٫۱۶ لاکھ روپے شامل ہیں۔

(۲) فوجی اہمیت کی لائنیں:-	
مجموعی خام آمدنی....	۱،۴۵
کاروباری مصارف...	۲،۰۶
خالص آمدنی	--۰،۶۱
مجموعی آمدنی تجارتی اور فوجی لائنوں سے	۲۸،۸۸
(ب) سرکاری امداد پانیوالی ریلوے کمپنیاں:-	
حکومت کا حصہ زائد منافع میں	۰،۱۴
(ج) متفرق ریلوں کی آمدنیاں:-	
سرمایۂ محفوظ فرسودگی کے فاضلات کا سود	۰،۷۲
ریلوں کی شاخوں میں مشغولات اصل کا مقسوم اور دوسری متفرق مدوں کی آمدنی........	۰،۳۱
سرمایۂ محفوظ برائے فرسودگی کے فاضلات کا سود	۰،۰۹
مجموعی آمدنی	۳۰،۱۴
(د) ریلوے کے سرمایۂ محفوظ برائے فرسودگی میں جمع کردہ رقم کی واپسی	-
میزان	۳۰،۱۴

(ب) سرکاری امداد پانے والی کمپنیاں:-	
زمین اور سرکاری مالی امداد....	۰،۰۷
(ج) ریلوں کے متفرق اخراجات.	۰،۵۶
(د) عام سرکاری آمدنی میں ادا کردہ حصہ[1]	۰،۱۵
ریلوں کے محفوظ سرمایۂ فرسودگی سے لیے ہوئے قرضے کی ادائی	-
ریلوے کے سرمایۂ محفوظ کو منتقل کردہ ریلوں کی زائد آمدنی	-
میزان	۳۰،۱۴

[1] ذیل میں اس حصے کے متعلق اعداد و شمار درج ہیں جو ریلوں کی آمدنی سے عام سرکاری آمدنی میں ۳۶-۱۹۳۵ء میں واجب الادا تھے اور جو ۳۶-۱۹۳۵ء کے متداول اعداد پر مبنی ہیں:-

(۱) تجارتی لائنوں پر لگائے ہوئے ۷، لاکھ ۴ ہزار ۲ سو پانچ روپے کے سرمایے کا ا فیصد = (بحساب ہزار روپے ۷،۱۹،۰۴)

(۲) مجموعی آمدنی سے کاروباری مصارف، سود کی ادائی، زمین اور ملی امداد وغیرہ جیسے مصارف اور لگائے ہوئے سرمایے پر ا فی صد حصے کی ادائی کو منہا کرنے کے بعد جو خالص آمدنی بچے اس کا ۱/۵ حصہ = —

۱۵۔ ریلوں کے مالی نتائج

حکومت ہند کا جن ریلوں سے براہ راست تعلق ہے ان کے کام کے مالی نتائج ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۶ء تک صفحہ ۸۷ا پر مندرجہ جدول میں دیے گئے ہیں اور ان سے اس مالی عملدرآمد کی تشریح ہوتی ہے جو ۱۹۲۴ء کے بعد سے علیحدگی کا طریقہ اختیار کرنے سے وجود میں آیا۔ اس دور کی ابتدائی ۱۲ سالہ مدت ۱۹۲۴ء تا ۱۹۳۶ء کو لیجیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ شروع کے چھ سال خوشحالی کے تھے اور آخری چھ سال دشواری کے تھے۔ اس کل مدت کو بحیثیت مجموعی لیجیئے تو ابتدائی چھ سالوں میں جو مجموعی زاید آمدنی ہوئی اس کی مقدار ۲۵ کروڑ ۶۴ لاکھ روپے تھی، اس کے برخلاف دوسرے چھ سالوں میں گھاٹے کی مقدار ۴۱ کروڑ ۶۳ لاکھ روپے تھی۔ تغیر پذیر منافع کے اس طویل دور میں خالص توفیر ۱۱ کروڑ ایک لاکھ روپے رہی۔ کاروباری مصارف کو منہا کرکے، فرسودگی کے مطالبات کی گنجایش رکھ کر اور اصل مستعار کا پورا سود ادا کرنے کے بعد سالانہ منافع کچھ کم ایک کروڑ روپے رہ جاتا ہے[1]۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ ریلوں کی آمدنی سے مجموعی حصہ .... ۷،۱۴،۰۳

(۳) منہا شدنی:۔ فوجی اہمیت کی لائنوں پر گھاٹا جس کا بار ریلوں کی آمدنی پر پڑا:۔ (۱) سرمایے کا سود = ۵۲،۷،۳۴،۱۱ روپے + (۲) کاروباری نقصان = ۲۷،۵۶۵ روپے + (۳) کاروباری نقصان کو پورا کرنے کی غرض سے محفوظ ذخیرۂ فرسودگی سے جو رقم ادا کی گئی اس کا سود = ۳۹۴۴ روپے ... ۱،۷،۴۷،۱۱

ریلوں کی آمدنی سے عام آمدنی کو منتقل کیا جانے والا واجب الادا حصہ ... ۳۲،۳۸،۴۲

دیکھو ریلوے بجٹ برائے ۱۹۳۷ء۔۳۸ صفحہ ۳۷۔

[1] مرکزی حکومت کے بیزانیے بابت ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء کے بارے میں رکن ریلوے کی تقریر فقرہ (۱۷)۔

۱۹۲۴ء تا ۱۹۳۰ء کے عام خوش حالی کے دور میں حکومت کو جو حصہ ادا کیا گیا اس کی مجموعی مقدار ۴۲ کروڑ روپے تھی گویا مالیے کی علٰحدگی کے بعد سے کل مدت کے لیے سالانہ اوسط ۳ کروڑ روپے رہا۔ اسی مدت میں محفوظ ذخیرۂ فرسودگی میں ½ ۴۱ کروڑ روپے جمع ہوئے ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء کے بعد ریلوں کی حالت میں بنیادی تغیر رونما ہوا اور منافع میں کمی شروع ہو گئی۔ بلکہ اس سال سے گھاٹے کے دور کا آغاز ہوتا ہے جو زیادہ تر حسب ذیل مضر اثرات کا نتیجہ تھا:۔ عالمی کساد بازاری اشیا کی قیمتوں کا اتار گیہوں کی برآمد کی کمی، حالیہ سالوں میں ہندوستان کے پر آشوب حالات، سیلابوں اور زلزلوں کے نقصانات، ریلوں اور بسوں کی مسابقت[1]، دریائی اور بحری راستوں سے شدید مسابقت اور کاروباری مصارف کی زیادتی۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے قریب قریب تمام ملکوں کی محصول کی پالیسی نے جن میں سے اکثر گزشتہ زمانے میں ہندوستان کے بہترین گاہک تھے، ریلوں کی آمدنی پر نقصان رساں اثر ڈالا۔

ریلوں میں ان لگاتار گھاٹوں کے باعث ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء کے بعد ریلیں حکومت کی عام آمدنی میں کوئی حصہ ادا کرنے سے قاصر رہیں۔ ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء کے سال سے ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء کے سال تک مالیے کی علٰحدگی کے قاعدے کے تحت ادا شدنی حصے کی بقایا کی مجموعی مقدار ۴۷، ۴۰ کروڑ روپے تھی۔ اس زمانے میں صرف یہی نہیں ہوا کہ ریلوں کے عام محفوظ ذخائر خالی ہو گئے بلکہ ریلوں نے محفوظ

---

[1] دیکھو تحقیقاتی کمیٹی (۱۹۳۷ء) نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ موٹر بسوں کی مسابقت سے ریلوں کی آمدنی میں جو گھاٹا آیا اس کی مقدار کم و بیش ½ ۴ کروڑ روپے سالانہ ہے۔ دیکھو ہندوستانی ریلوں کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۱۶۹۔

مالی نتائج پر تبصرہ از ۱۹۲۴ء۔۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۶ء۔۱۹۳۷ء

(تجارتی اور فوجی اہمیت کی لائنوں کو ملا کر)

نقشہ ل

اعداد لاکھ روپوں میں دیے گئے ہیں

		۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۵ء	۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۶ء	۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۷ء	۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۸ء	۱۹۲۸ء تا ۱۹۲۹ء	۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء	۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء	۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء	۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء	۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء	۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء	۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء	۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء نظر ثانی شدہ اندازہ	۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۸ء بجٹ تخمینہ
میل	سرکاری مملوکہ لائن	۲۷۰۰۲	۲۷۰۹۰	۲۷۶۶۲	۲۸۰۸۶	۲۹۱۱۱	۳۰۸۶۸	۳۱۱۹۷	۳۱۶۴۲	۳۱۶۲۲	۳۱۶۱۹	۳۱۶۷۹	۳۱۷۳۴	۳۱۸۳۲	۳۹۷۲۲
	کمپنیوں کے زیر انتظام لائن	۵۸۴۷	۵۹۷۷	۵۸۱۵	۵۸۱۲	۵۸۴۳	۴۷۳۳	۴۸۷۳	۴۸۶۶	۴۹۱۳	۴۶۳۲	۴۹۳۲	۴۵۷۸	۴۳۹۷	۴۰۸۴
مجموعی خام آمدنی	سرکاری مملوکہ لائن	لاکھ روپے ۱۰۰۱۳	لاکھ روپے ۹۰۹۴۰	لاکھ روپے ۹۸۴۲	لاکھ روپے ۱۰۳۴۳	لاکھ روپے ۱۰۳۷۳	لاکھ روپے ۱۰۲۷۰	لاکھ روپے ۹۵۱۰	لاکھ روپے ۸۶۶۳	لاکھ روپے ۸۴۴۳	لاکھ روپے ۸۶۶۳	لاکھ روپے ۹۰۳۰	لاکھ روپے ۹۰۶۵	لاکھ روپے ۹۵۰۰	لاکھ روپے ۹۰۷۵
	کمپنی کے زیر انتظام لائن	۷۳۴	۷۱۲	۶۷۷	۸۱۸	۷۲۷	۶۴۷	۴۹۹	۵۰۷	۴۸۶	۵۱۳	۵۲۸	۵۳۷	۵۴۵	۵۳۵
ریلیں چلانے کے مصارف	سرکاری مملوکہ لائن	۵۱۶۵	۵۲۹۹	۵۲۸۹	۵۳۰۶	۵۴۲۲	۵۵۵۹	۵۴۳۹	۴۹۳۱	۹۰۸	۴۹۵۰	۵۰۲۷	۵۰۸۷	۵۰۷۵	۴۸۷۵
	کمپنی کے زیر انتظام لائن	۳۷۰	۳۵۷	۲۳۳	۳۵۳	۳۶۳	۳۳۰	۲۶۶	۳۶۳	۲۴۹	۲۶۰	۲۶۶	۲۹۸	۲۶۴	۲۶۱
محفوظ ذخیرۂ فرسودگی		۱۰۳۵	۱۰۶۷	۱۰۸۹	۱۱۵۸	۱۲۰۰	۱۲۵۹	۱۳۰۷	۱۳۴۶	۱۳۷۷	۱۳۹۵	۱۳۷۲	۱۳۲۵	۱۳۱۵	۱۳۵۹
کمپنیوں کے زیر انتظام لائنوں کو ادائی		۳۶۳	۳۵۵	۳۴۴	۳۶۵	۳۶۴	۳۱۷	۳۳۳	۳۴۴	۲۳۷	۲۵۳	۲۶۲	۲۶۹	۲۸۱	۴۷۴
سرکاری مملوکہ لائنوں کی خالص آمدنی		۳۸۱۳	۳۵۲۸	۳۴۶۴	۳۸۹۹	۳۷۵۱	۳۲۵۲	۲۷۶۴	۲۳۸۶	۲۱۵۸	۲۳۵۷	۲۶۳۱	۲۶۵۳	۳۱۱۰	۲۹۴۱
خالص متفرق آمدنی متفرق مطالبات کو منہا کرنے نیز کمپنیوں کو قابل ادائی زائد منافع ادا کرنے کے بعد		-۱۰۷	-۱۱۹	-۱۲۷	-۸۷	-۳۷	-۲	-۱۱	۱	۱۱۰	۱۰۵	۵۳	۸۷	-۱۲	۱۰
خالص آمدنی		۳۷۰۶	۳۴۰۹	۳۳۳۷	۳۸۱۲	۳۷۱۴	۳۲۵۰	۲۷۵۳	۲۳۸۷	۲۲۶۸	۲۴۶۲	۲۶۸۴	۲۷۴۰	۳۰۹۸	۲۹۵۱
مطالبات سود		۳۳۹۰	۲۴۸۱	۲۵۸۷	۲۷۲۷	۲۹۳۳	۳۰۴۶	۳۲۶۷	۳۳۰۷	۳۲۹۱	۳۲۵۸	۳۱۸۰	۳۱۳۹	۳۰۸۳	۲۹۳۶
بچت		۱۳۱۶	۹۲۸	۲۷۵۰	۱۰۸۵	۷۸۱۰	۲۰۴	-۵۱۴	-۹۲۰	-۱۰۲۳	-۷۹۶	-۵۰۶	۳۹۹	۱۵	۱۵
عام آمدنی میں جمع شدہ حصہ		۱۶۷۸	۵۴۹	۶۰۱	۶۲۸	۵۲۳	۴۱۲	۵۷۴	—	—	—	—	—	—	۱۵
ریلوے کے سرمایۂ محفوظ کو منتقل شدہ		۶۳۸	۳۷۹	۱۴۹	۲۵۷	۲۵۸	-۲۰۸	-۱۰۹۳	۲۹۵	—	—	—	—	—	—

ﮯ۔ مرکزی حکومت کا بجٹ برائے ۱۹۳۷ء۔۱۹۳۸ء۔ ﮯ۔ برما کی ریلوں کو خارج کر دیا گیا ہے۔

یاد داشت (۱):۔ ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۵ء کے نقصان اور اس کے بعد کے سالوں کے مجموعی نقصان کو محفوظ ذخیرۂ فرسودگی سے پورا کر دیا گیا ہے یا پورا کر دیا جائے گا۔

یاد داشت (۲):۔ آمدنی میں جن کاموں اور کارخانوں کو محسوب نہیں کیا گیا ان کے سامان کے لیے ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۲ء کے سال تک قرضے لیے گئے جن کا مقصد کاروباری مصارف کو کم کرنا تھا۔ ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۵ء کے سال سے ان مصارف کی کمی کے لیے قرضے لیے گئے جو محفوظ ذخیرۂ فرسودگی سے پورے کیے گئے۔ اس طرح جو رقمیں لی گئیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔ ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں ۱۱۹ لاکھ روپے، ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء ۱۱۹ لاکھ روپے، ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء ۹۰ لاکھ روپے، ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء ۱۱۰ لاکھ روپے۔

یاد داشت (۳):۔ سابقہ حسابات میں ترتیب و مطابقت پیدا کرنے کی خاطر ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۲ء میں محفوظ ذخیرۂ فرسودگی سے قرضے لے کر کاروباری مصارف کو ۳۰۷ لاکھ روپے تک گھٹا دیا گیا اور سابقہ سالوں کے مصارف کی غیر معمولی بازگشت کے ذریعے سے ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۸ء میں کاروباری مصارف کو ۱۰۹ لاکھ روپے تک گھٹا دیا گیا۔

ذخیرۂ فرسودگی سے اپنے ذمے کے مطالبات سود ادا کرنے کی غرض سے ۳۱ ، ۳۴ کروڑ روپیہ بھی قرض حاصل کیا۔ اس طرح واجب الادا رقم کی مجموعی مقدار تقریباً ۶۲ کروڑ روپے تھی۔ اور اتنی بڑی رقم کو آیندہ کی توفیر سے چند سال کی مدت میں ادا کرنا قطعی ناممکن تھا۔ چنانچہ اس بنا پر مرکزی مجلس قانون ساز میں فروری ۱۹۳۷ء میں میزانیے کے مباحث کے دوران میں ایک سرکاری تحریک پیش کی گئی کہ اس کل رقم کو منسوخ کیا جائے اور آیندہ مالی سال اس رقم کی معافی سے شروع کیا جائے۔ بیک وقت اتنے بڑے قرضے کی تنسیخ نے مجلس قانون ساز میں نیز اس کے باہر پرانے خیال کے مالی حلقوں میں ایک ہلچل مچادی۔ اس اثنا میں دستور جدید کے تحت صوبہ دار خود مختاری کے آغاز کے ساتھ ہی مالی ذرائع کو بڑھانے کے برابر تقاضے کیے جارہے تھے۔ لیکن چونکہ مالیے کی علٰحدگی کے موجودہ قاعدے کے تحت آیندہ کے منافع میں مطالبے کی پہلی مد محفوظ ذخیرۂ فرسودگی سے حاصل کیا ہوا قرضہ تھا اور اس کے بعد عام آمدنی کو ادا کیا جانے والا غیر ادا شدہ حصہ باقی کیا جاتا، اس لیے عام آمدنی کو ریلوں کی آمدنی سے مستحقہ حصہ پانے کے لیے بہت انتظار کرنا پڑتا۔ اس دہری مشکل کا حل یوں دریافت کیا گیا کہ ایک اور تجویز رکن مالیہ نے مجلس قانون ساز میں اس کے شملے کے اجلاس ۱۹۳۷ء میں پیش کی جس میں یہ تحریک کی گئی کہ واجب الادا رقوم کی ادائی کے لیے تین سال کی مہلت دی جائے۔ اس طرح جہاں قدیم خیال کے لوگوں کو کم از کم اصولی لحاظ سے اس فیصلے کی بنا پر مطمئن کیا گیا کہ ریلویز کے ذمے کی واجب الادا رقوم کو منسوخ نہ کیا جائے، وہاں مہلت کی تجویز نے اس بات کو ممکن بنادیا کہ ریلوے کی خالص آمدنی میں سے

ل۔ دیکھو، رسالۂ کیپٹل (ہندوستانی صنعتوں، تجارت۔ اور نقل وحمل کا ضمیمہ) بابت دسمبر ۱۹۳۷ء صہ ۲۶۔

جو ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء سے رونما ہوئی ہے مطالبات سود ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچے اس کو ۲۰ کروڑ روپے کے بقایا کی بڑی مقدار ادا کیے بغیر حکومت کی آمدنی میں حصہ ادا کرنے کے لیے فوراً کام میں لایا جائے۔ اس طریق عمل نے مرکزی حکومت کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ نیمیر فیصلے کے بموجب ۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۸ء کے سال میں صوبوں کو محصول آمدنی سے محدود مقدار میں مالی امداد دے (دیکھو باب ۱۱)۔ اسی کے ساتھ یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا ریلیں اپنے ذمے کی یہ واجب الادا رقوم کو ایک نسل کے دوران میں بھی ادا کرنے کے قابل ہونگی یا نہیں۔

بہر حال یہ امر حقیقی طور پر اطمینان بخش ہے کہ سرکاری ریلیں چھ سال تک تشویش پیدا کرنے والا قاصر موازنہ پیش کرنے کے بعد قرض لیے بغیر اپنا خرچ نکالنے کے قابل ہو گئیں اور سود اور ذخیرۂ فرسودگی کے مطالبات ادا کرنے کے بعد ان کی آمدنی میں بچت ہونے لگی۔ ریلوں کی مالی حالت میں یہ خوش آیند اصلاح و ترقی ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں رونما ہوئی جس کا باعث تجارت اور قیمتوں کی بحالی اور کسی حد تک مصارف کی کمی تھا۔ لیکن اس بحالی میں ناپائداری کا عنصر موجود ہے کیونکہ جزوی طور پر اس بحالی کا سبب دنیا کی جدید اسلحہ بندی کا پروگرام ہے۔ حقیقت میں گزشتہ چند مہینوں سے معاشی حالات میں ابتری اور خرابی قطعی طور پر نمایاں ہو چکی ہے۔[1] غرض جزوی معاشی بحالی کے تحت ریلیں نازک صورت حال سے بچ کر نکل آئی ہیں۔ اور ان کے مالی نتائج ابتدائی گھاٹوں کے تاریک دور کے مقابلے میں اب ایک خوش آیند تضاد پیش کرتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء کے بجٹ میں نظر ثانی کردہ اندازہ یہ لگایا گیا تھا کہ ۱۵ لاکھ روپے کی قلیل رقم کی بچت ہوگی۔ لیکن یہ اندازہ حقیقی بچت سے کم نکلا۔ چنانچہ آخری نتیجے کے طور پر

---

[1] یہ حصہ ۱۹۳۸ء میں لکھا گیا تھا۔

اکروڑ ۲۱ لاکھ روپے کی بچت ہوئی جو اس وقت کے مروجہ قاعدے کے مطابق محفوظ ذخیرۂ فرسودگی سے لیے ہوئے قرضے کے ایک جزو کو ادا کرنے کے کام میں لائی گئی۔ اسی طرح ۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۸ء کے میزانیہ میں جہاں ۱۵ لاکھ روپے کی بچت کا پیش اندازہ کیا گیا تھا وہاں نظر ثانی کردہ اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ مطالبات سود اور ذخیرۂ فرسودگی میں حصہ ادا کرنے کے بعد ۲ کروڑ ۳۸ لاکھ روپے کی بچت ہو سکتی ہے حکومت کے رکن نقل وحمل نے ۱۹۳۸ء تا ۱۹۳۹ء کے سال کے لیے میزانیہ میں ۲ کروڑ ۵۶ لاکھ روپے کی بچت کا اندازہ لگایا ہے۔

۱۶- ویجوڈ ریلوے تحقیقاتی کمیٹی۔ حالیہ جزوی بحالی سے قبل ریلوں کی مالی حالت میں جو ابتری پیدا ہوگئی تھی اس نے ریلوے پالیسی اور نظم ونسق کے بارے میں تمام ملک میں تنقید کا ایک طوفان برپا کردیا اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ ریلوں کے معاملات کی گہری تحقیقات کی جائے۔ سر آٹو نیمیر خصوصی ماہر مالیات جنوری ۱۹۳۶ء میں انگلستان سے ہندوستان آئے اور انھوں نے مرکزی حکومت اور صوبوں کے باہمی مالی تصفیے کے متعلق اپنی رپورٹ میں اس بات کی پرزور حمایت کی کہ جدید دستور (۱۹۳۵ء) کے تحت ریلوں کے مصارف کی کامل اور از سر نو تنظیم کی جائے اور نقل وحمل کے مختلف ذرایع کے درمیان موثر ربط قایم کیا جائے۔ انھوں نے اپنی رپورٹ[1] میں یہ سفارش کی کہ مرکزی حکومت محصول آمدنی کا نصف حصہ اس شرط پر صوبوں کے حوالے کرے کہ ریلیں اپنا خرچ نکالنے اور عام آمدنی میں حصہ ادا کرنے کے قابل بن جائیں۔ اس رپورٹ نے ریلوں کی مالی تنظیم کے مسئلے کو ایک نئی اہمیت دیدی مجلس قانون ساز کی حسابات عامہ

---

[1] Indian Financial Report

فقرہ ۳۱، شائع شدہ اپریل ۱۹۳۶ء دیکھو باب ۱۱)۔

کی کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں جو دہلی سے ستمبر ۱۹۳۶ء میں شایع ہوئی:
سر آٹو نیمیر کے مشورے کی پر زور حمایت کرتے ہوئے یہ سفارش کی کہ
ریلوے کے جملہ مالیے کی تحقیق کے واسطے جلد ایک خصوصی ماہر کا تقرر
کیا جائے۔ آخر میں چلکر ایک خصوصی ماہر کے بجائے یہ مناسب
خیال کیا گیا کہ تین ماہروں کی ایک کمیٹی مقرر کی جائے۔ چنانچہ اکتوبر
۱۹۳۶ء میں ہندوستانی ریلوں کی ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی گئی جس کے
صدر نشین سر، رالف، ویجوڈ چیف جنرل مینجر لندن اینڈ نارتھ ایسٹرن
ریلوے تھے۔

۱۷- ویجوڈ کمیٹی کی سفارشیں۔ ویجوڈ کمیٹی کی رپورٹ جون ۱۹۳۷ء میں شایع ہوئی
اور اس میں ریلوں کے کاروبار کے تقریباً ہر پہلو کے
متعلق کئی مفید مشورے دیے گئے ہیں جن سے کارکردگی
میں اضافہ اور مصارف میں کفایت کی جاسکتی ہے۔ بعض بڑے مسائل
کی حد تک ویجوڈ کمیٹی کی رپورٹ کی سخت مخالفت کی گئی۔ اولاً کمیٹی
کی اس تجویز کے بارے میں کہ حکومت کے محاصل میں ریلوں کی آمدنی
سے حصے کی ادائی ترک کردی جائے تاکہ ریلوں کی مالی حالت مستحکم
بنیاد پر قایم کی جائے۔ اور خسارے کے سالوں میں[1] ریلوں کے ممکنہ
گھاٹے کو پورا کیا جاسکے، مرکزی مجلس قانون ساز اور صوبوں میں
احتجاج کا ایک طوفان برپا ہوا کہ یہ تجویز نیمیر کے مقرر کردہ قاعدے کی
خلاف ورزی کرتی ہے جس میں صوبائی حکومتوں کو مالی امداد دینے کا
انحصار اس بات پر رکھا گیا تھا کہ ریلیں از سر نو حکومت کے محاصل میں

---

[1] اس سلسلے میں یہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ ویجوڈ کمیٹی اس بات پر زور دیتی ہے کہ
محفوظ ذخیرۂ فرسودگی کا کافی مقدار میں رکھنا ضروری ہے۔ اور یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ ذخیرے کی حقیقی
مقدار اس وقت ۱۴ کروڑ روپیے تھی جس کو ۳۰ کروڑ روپے تک بھی معمولاً بڑھادینا زیادہ نہ ہوگا۔
اس کے علاوہ ریلوں کو چاہیے کہ ایک عام ذخیرۂ محفوظ قایم کریں جو مطالبات سود کی ادائی اور

حصہ ادا کریں۔ سر سلطان احمد رکن ریلوے نے مخالفین کی بدگمانی یہ کہہ کر دور کر دی کہ حکومت ان وعدوں کا احترام سختی کے ساتھ کرے گی جو نیمیر فیصلے کے تحت کیے گئے تھے اور مرکزی مجلس قانون ساز کو دوبارہ یہ اطمینان دلایا کہ ریلوں کی آمدنی کی بچت سے صوبوں کو مالی امداد دیجائے گی دوسرے یہ کہ ریلوں کے کارخانوں میں یوروپین سپروائزروں اور تجارتی محکموں میں یوروپی افسروں کو بھرتی کرنے کی ضرورت کے بارے میں ویجوڈ کمیٹی نے جو خیال ظاہر کیا تھا اس کے خلاف انتہائی سیاسی غم وغصے کا اظہار کیا گیا۔ لیکن یہ غم وغصہ حکومت کی اس یقین آفرینی سے کم ہو گیا کہ ریلوے خدمات کو بتدریج ہندیانے کی پالیسی سے انحراف نہیں کیا جائے گا۔ تیسرے یہ کہ کمیٹی نے ریلوں کی وفاقی دستوری ذی اقتدار جماعت کے بارے میں جو خیالات ظاہر کیے تھے (دیکھو فصل ۲۲) وہ موضوع تحقیق کے حدود سے باہر خیال کیے جا رہے تھے اور ان کے بارے میں ہندوستان میں شدید اختلاف آرا رہا[1]۔ ویجوڈ کمیٹی نے مسافروں اور مال کی باربرداری کے کرایوں کی نظر ثانی اور ریل اور بس کے الحاق کے بارے میں جو سفارشیں پیش کیں ان پر اگلی فصلوں میں بحث کی گئی ہے۔

کمیٹی نے بجا طور پر اس بات پر زور دیا ہے کہ ریلیں اپنی ہردلعزیزی کو بڑھائیں اور عوام سے اپنے تعلقات بہتر بنائیں۔ چنانچہ وہ اس مقصد کے تحت یہ سفارش کرتی ہے کہ ریلوے کا محکمہ ایک افسر رابطۂ صحافت اور ایک دفتر معلومات عامّہ مقرر کرکے صحافت سے گہرا ربط قایم کرے۔ عام طور پر ریلوں کے وسیع انضمام سے کمیٹی متفق نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنے سے انتظامات کے بے قابو ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: سرمایے کی بے باقی کے لیے محفوظ ذخیرۂ تسویہ کا کام دے (دیکھو فقرہ ۲۰۲ و ۲۱۰ تا ۲۱۱)۔

[1] ملاحظہ ہو رسالہ کیپٹل (ضمیمہ دسمبر ۱۹۳۶ء) صفحہ ۲۶۔

۱۸۔ ریلوں کی شرح کرایے کی پالیسی۔

ہندوستان کی یہ شکایت بہت دیرینہ ہے کہ اس ملک کی ریلوں کی شرحیں محض ریلوں کے مالی فائدے کے مدنظر معین کی جاتی ہیں۔ اور اس سے بھی بدتر یہ کہ یورپی تاجروں کو مدد دینے اور ہندوستانی صنعتوں اور کاروبار کی نشو و نما کو روکنے کے خیال سے ان شرحوں میں جوڑ توڑ کیا گیا ہے۔ یہی شکایت سر ابراہیم رحمت اللہ نے مرکزی مجلس قانون ساز میں ۱۹۱۵ئ میں اور کئی گواہوں نے صنعتی کمیشن، مالی کمیشن اور اکورتھ کمیٹی کے سامنے پیش کی[1]۔

اس سلسلے میں جو خاص قسم کے الزامات لگائے جاتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ کرایے کی شرحیں اس طور پر مرتب کی جاتی ہیں کہ بندرگاہوں تک مسافروں اور مال کی آمد و رفت کی ہمت افزائی ہو اور اندرون ملک مسافروں اور مال کی آمد و رفت کی حوصلہ شکنی ہو۔ اس طرح خام اشیا کی برآمد اور غیر ملکی مصنوعات کی درآمد کی ہمت افزائی کی جاتی ہے[2]۔ ہندوستانی کاروباری اشخاص اور کارخانوں کے مالکوں نے یہ شکایت کی کہ ان کو ہندوستان کے مختلف علاقوں سے خام اشیا طلب کرنے یا مصنوعات دوسرے بازاروں میں بھیجنے کی

---

[1] ملاحظہ ہو "ہندوستانی ریلوں کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ"

Indian Railways Enquiry Report

باب ۱۲ و باب ۱۳۔

[2] دیکھو مالی کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۱۲۷۔ ریلویز کی طرف سے اس بات پر زور دیا گیا کہ وہ خارجی تجارت کی پاسداری اس وجہ سے کر رہی تھیں کہ ان کے نقطۂ نظر سے خارجی تجارت داخلی تجارت کے مقابلے میں زیادہ اہم تھی۔ اس کے علاوہ موافق شرحوں کا خارجی تجارت پر خاطر خواہ اثر ہوتا تھا۔ چنانچہ اسی لیے بندرگاہوں سے مال کی آمد و رفت کے واسطے زیادہ سہولتیں مہیا کی گئی تھیں۔ حال میں داخلی تجارت میں تیزی کے ساتھ ترقی ہوئی ہے۔ اور اس کا اس

صورت میں ایسی شرح سے کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے جس کو وہ بےجا اور غیر منصفانہ خیال کرتے ہیں۔ مزاحمتی شرحوں کے طریق[1] نے بھی بہت بے اطمینانی پھیلادی، اس لیے کہ اس کی وجہ سے مال کی آمد و رفت کا رخ پلٹ جاتا ہے جس کی بنا پر صنعت و تجارت کی راہ میں مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ کرایے کی پالیسی کا اثر گزشتہ زمانے میں یہ ہوا کہ جو شہر بندرگاہ تھے ان میں صنعتیں مرتکز ہو گئیں۔ چنانچہ صنعتوں اور کارخانوں کا یہی ارتکاز ان شہروں کی اکثر موجودہ پریشانیوں کا ذمہ دار ہے۔ مزدوروں کی حد تک جو سخت دشواریاں محسوس ہوتی ہیں ان کا باعث بڑی حد تک یہ ہے کہ ایسے مرکزوں میں صنعتیں مرتکز ہیں جو اندرون ملک سے دور واقع ہیں۔ ریلوں کے کرایوں کی پالیسی کا جو مضر اثر ہندوستان میں دریائی نقل و حمل پر پڑ رہا ہے اس کا ذکر بعد کی فصل میں کیا گیا ہے۔

جیسا کہ مالی کمیشن نے تسلیم کیا ہے، ہندوستانی صنعتوں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کیے جانے کے متعلق جو شکایتیں پیش کی گئیں وہ بے بنیاد نہیں تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ریلیں، ریلوے بورڈ کے منظورہ حدود کے اندر شرحوں میں جوڑ توڑ کرنے اور خاص اشیا کو خاص قسم کے تحت شمار کرنے کی حد تک بالکل آزاد رہیں[2]۔ صنعتی کمیشن نے اس مسئلے کی گہری تحقیقات

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ مطالبے سے کہ اس کا خاص لحاظ کیا جائے زیادہ دیر تک انکار نہیں کیا سکتا۔

[1] Block Rates System

(Block Rates) کے معنی یہ ہیں کہ ایک ایسے اسٹیشن سے جو دوسری ریلوں کے جنگشن کے قریب ہو جنگشن تک آنے جانے کا کرایہ چھوٹے فاصلے کے لیے بحساب فی میل زیادہ شرح سے مقرر کیا جاتا ہے تاکہ مال کو اس دوسری لائن پر دور تک لیجانا مقصود ہو تو اس کی نقل و حمل کو اسی لائن پر روکا جائے جہاں سے وہ چلا تھا اور حریف لائن پر جانے سے باز رکھا جائے یا اس کے لیے مزاحمت پیدا کی جائے۔

[2] پروفیسر کے، ٹی، شاہ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "چونکہ ریلوں کا بنانا ابتداءً بہت بیش خرچ ہوتا ہے اور ان کو چلانا اس سے بھی زیادہ بیش خرچ ہوتا ہے، اور چونکہ ریلیں ہندوستان کی معاشی حالت

کرنے کے بعد یہ سفارش کی کہ اندرونی نقل وحمل کے کرایے کی شرح ممکنہ حد تک اسی شرح کے مساوی رکھی جائے جو بندرگاہوں سے یا بندرگاہوں تک ایک ہی قسم کے سامان اور مساوی فاصلے کے لیے مقرر کی جاتی ہو تاکہ خام اشیا کو برآمد سے قبل ممکنہ حد تک مصنوعات کی شکل دینے کی ہمت افزائی ہو۔ کمیشن نے یہ بھی سفارش کی کہ ایک سے زیادہ لائنوں پر جانے والے مال کا کرایہ کل فاصلے کے حساب سے ایک ہی رقم میں لیا جائے۔ مالی کمیشن نے ان سفارشوں کی تائید کی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ سابقہ کمیشنوں کے تجویز کردہ شرائط کے اندر نئی صنعتوں کے لیے چند سالوں تک خصوصی شرحیں منظور کی جائیں اور دوسری صنعتوں کے حق میں بھی یہی کیا جائے بشرطیکہ وہ خود کو خاص رعایت کا مستحق ثابت کر سکیں۔ زرعی کمیشن جس نے ریلوں کے کرایے کی پالیسی کو اس نقطۂ نظر سے جانچا کہ زرعی نشو ونما پر اس کا کیا اثر پڑتا تھا، یہ خیال ظاہر کیا کہ محکمہ جات زراعت اور ریلوں کے درمیان گہرا ربط قایم کیا جائے اور یہ سفارش کی کہ کھاد، ایندھن، چارہ اور دودھ دینے والے مویشیوں وغیرہ کی نقل وحمل کے لیے رعایتی شرح کرایہ منظور کی جائے۔ اس کمیشن نے یہ بھی مشورہ دیا کہ آلات کشاورزی زرعی کلوں اور ان کے متعلقہ خام مال کی نقل وحمل کے کرایے کی شرحوں کو از سر نو جانچا جائے۔ حکومت ہند نے ان سفارشوں میں سے بعض کو اپریل ۱۹۳۳ئہ میں منظور کیا۔ چنانچہ بے قاعدگیوں کو دور کرنے کے لیے آلات کشاورزی کی قسمیں از سر نو

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ :- کا لحاظ کئے بغیر بنائی اور چلائی جاتی ہیں، اس لیے ریلوں کی شرحیں بھی نقل وحمل کی نوعیت اور اس امر کا لحاظ کیے بغیر مقرر کی گئی ہیں کہ ہندوستانی تجارت اور صنعت پر ان کے کیا اثرات پڑتے ہیں۔" ملاحظہ ہو ان کی تصنیف موسوم بہ "ہندوستان کی تجارت، کروڑگیری اور نقل وحمل" صفحہ ۲۹۷۔

ھ زرعی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۳۷۷ تا صفحہ ۳۷۹۔

قایم کی گئی ہیں، مویشیوں کی نقل کی شرحیں جانچی گئی ہیں اور ان میں کمی کی گئی ہے۔ ویجوڈ کمیٹی نے یہ اعتراض کیا کہ ہندوستانی ریلوں کی شرحوں کا طریقہ بے ڈھنگا اور بے اصولی ہے اور اس کو بالکل آسان کر دینے کی ضرورت ہے۔ سادگی پیدا کرنے کی خاطر ویجوڈ کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ ریلوے بورڈ کو چاہئیے کہ مندرجہ فہرست شرحوں کے لحاظ سے کرایہ وصول کرنے کے طریق کی تحقیق کرے[1]۔

اکورتھ کمیٹی کی سفارش کے مطابق شرحوں کے متعلق ایک مشاورتی کمیٹی سنہ ۱۹۲۶ء میں مقرر کی گئی جو ایک صدر نشین، تجارتی اغراض کی نمایندگی کرنے والے ایک رکن اور ریلوں کی نمایندگی کرنے والے ایک رکن پر مشتمل تھی، تاکہ حسب ذیل مسائل کی تحقیق کرے اور ان کے بارے میں حکومت سے سفارشیں کرے :-

(۱) بے جا ترجیح کی شکایتیں،

(۲) یہ شکایتیں کہ شرحیں خود بے حد گراں ہیں،

(۳) ریل کے آخری اسٹیشن Terminus کے بارے میں شکایتیں یا جھگڑے اور یہ شکایتیں کہ ریلوے کمپنیاں تجارت کے لیے معقول سہولتیں مہیا کرنے کی حد تک اپنے فرائض پورے نہیں کرتیں،

(۴) ایسی اشیا کے پارسلوں کے شرائط معقول ہیں یا نہیں جن کو نقصان پہنچنے کا یا جن سے دوسروں کو نقصان پہنچنے کا امکان ہو،

(۵) کس شرح کے مطابق مال کی گٹھری بنا کر بھیجنے کے متعلق شکایتیں ہیں۔ کمیٹی کی دستوری حیثیت محض ایک مشاورتی جماعت کی ہے، حکومت اس کی تحقیقات کو منظور کرے یا نہ کرے۔ ویجوڈ تحقیقاتی کمیٹی نے یہ سفارش کی ہے کہ مذکورۂ بالا کمیٹی کو اپنی کارروائی زیادہ مستعدی کے ساتھ

[1] انڈین ریلوے کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۱۲۷۔

اور زیادہ علانیہ طور پر کرنی چاہیئے اور حکومت کو معمولاً یہ ذمہ داری قبول کرنی چاہیئے کہ اگر اس کے پاس کوئی قابل لحاظ درخواست آئے تو اس کو کمیٹی کے پاس بھیجدے۔ (نقرہ ۱۴۳) موجودہ مشاورتی کمیٹی کے بجائے یہ مناسب ہے کہ ایسی جماعت بنائی جائے جس کو برطانیہ کی ریلوں کی شرحوں کی مجلس[1] یا ریاستہائے متحدۂ امریکا کے بین ریاستی تجارتی کمیشن کی طرح ابتدائی اختیارات حاصل ہوں۔

۱۹۔ ریلوے بورڈ کی تنظیم جدید

اکورتھ کمیٹی نے یہ مشورہ دیا کہ ریلوے بورڈ کی تنظیم جدید اس طرح کی جائے کہ وہ ایک اطمینان بخش وسیلہ بن جائے جس کی وساطت سے حکومت ہند ملک کے کل ریلوے نظام کی موثر نگرانی کر سکے۔

جدید تنظیم کے تحت ریلوے بورڈ ایک چیف کمشنر، ایک مالی کمشنر اور تین ارکان پر مشتمل ہے[2]۔ اکورتھ کمیٹی کی سفارش یہ تھی کہ کل کام تین علاقوں یا حلقوں پر تقسیم کر دیا جائے اور ان میں سے ہر علاقہ ایک کمشنر کے زیر نگرانی رہے، لیکن اس کے بجائے یہ تدبیر اختیار کی گئی کہ کام کو مسائل کی بنیاد پر تقسیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک رکن فنی مسائل سے نبٹتا ہے،

---

[1] Railway Rates Tribunal.

[2] عمالی مسائل کی روز افزوں اہمیت کی بنا پر ۱۹۲۹ء میں ایک تیسرے رکن کا تقرر کیا گیا جس کے اہم کاموں میں عمالی مسائل کو اطمینان بخش طور پر حل کرنا، عام طور پر عملے کی خدمت کے شرائط اور خاص کر ادنیٰ اجرت پانے والے مزدوروں کی خدمت کے شرایط کی اصلاح و ترمیم کرنا داخل ہے۔ مالی دباؤ کے باعث بعض اعلیٰ عہدوں کے تقررات ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء سے روک دیئے گئے ہیں۔ ریلوے بورڈ کا موجودہ اعلیٰ عملہ چیف کمشنر، مالی کمشنر، ایک رکن، چار نظمار، پانچ نائبان ناظم، ایک معتمد، اور ایک مددگار معتمد پر مشتمل ہے۔ دیکھو ہندوستانی ریلوں کی رپورٹ (۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء) جلد اول، صفحہ ۹۵ تا صفحہ ۹۶۔ ریلوں کے موجودہ نظم و نسق کے متعلق بعض تنقیدوں اور مشوروں کے لیے ملاحظہ ہو ہندوستانی ریلوں کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ

دوسرا رکن عام نظم و نسق عملے اور مسافروں اور مال کی نقل و حمل کے مسائل کا ذمہ دار ہے اور مالی کمشنر جو ریلوے بورڈ میں محکمۂ مالیہ کی نمایندگی کرتا ہے عملے مالی مسائل کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ بورڈ کی مدد کے لیے پانچ ڈائرکٹر بھی ہیں جو سیول انجینیری، میکانیکل انجینیری، مسافروں اور مال کی نقل و حمل اور آمد و رفت، مالیہ اور کارخانوں کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ان نظماء نے حیثیت کمشنر اور ارکان کا بہت سا کام ہلکا کر دیا ہے اور ان کو موقع دیا ہے کہ اپنی توجہ ریلوے پالیسی کے بڑے مصارف پر صرف کریں، مختلف ریلوے لائنوں پر دورہ کریں اور مقامی حکومتوں سے جہاں تک ممکن ہو سابق کے مقابلے میں زیادہ شخصی ربط قایم کریں۔

۲۰۔ ریلوے کی مشاورتی کمیٹیاں۔ اکورتھ کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ مرکزی اور مشاورتی مجلسیں قایم کی جائیں تاکہ ہندوستان کے طبقۂ عوام کو ریلوں کے انتظامی معاملات میں مشورہ دینے کا موقع ملے۔ چنانچہ اس وقت حکومت کی مملوکہ تمام ریلوں کے لیے مشاورتی کمیٹیاں موجود ہیں۔ مرکزی مجلس قانون سازی کی بھی ایک کمیٹی ہے جو اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے نمایندوں پر مشتمل ہے۔

۲۱۔ خدمات کو ہندیانے کا عمل۔ اکورتھ کمیٹی اور لی کمیشن (۱۹۲۳ء) دونوں نے اس امر کی سفارش کی کہ ہندوستانیوں کو ریلوے کی اعلیٰ خدمات کے لیے تربیت دینے کی سہولتوں کو وسیع کیا جائے۔ چنانچہ لی کمیشن نے ایسے عہدوں کے لیے ۷۵ فی صد کا تناسب تجویز کیا۔ حکومت نے اس سفارش کو قبول کر لیا اور اس کے متعلق ریلوے بورڈ تربیت کے متعلق سہولتوں کو وسیع کرنے کے بارے میں تدابیر اختیار کر چکا ہے جو ریلوے کی خدمات کو ہندیانے کی جانب

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ ۱۹۳۷ء فقرہ ۸۷ تا ۹۰۔

پہلا ضروری اقدام ہے چنانچہ ریلوے کی نقل وحمل کا ایک مدرسہ چندوسی میں کھولا جاچکا ہے جس میں تحتانی افسروں کو تربیت دی جاتی ہے اور بعض علاقہ واری مدارس ریلوے کے عملے کی تربیت کے لیے بھی کھولے گئے ہیں۔ یہ بدقسمتی ہے کہ مالی مشکلات کے باعث ریلوے اسٹاف کالج کو جو دہرہ دون میں ریلوے افسروں کی تعلیم و تربیت کے لیے کھولا گیا تھا ۱۹۳۲ء کے اوائل میں بند کردینا پڑا۔ حکومت ہند نے حال ہی (۱۹۳۷ء) میں ویجوڈ کمیٹی کی رپورٹ پر بحث کے دوران میں ریلوے خدمات کو ہندیانے کی پالیسی کی ازسرنو توثیق کی (دیکھو فصل ۱۷)۔

اکورتھ کمیٹی نے عوام کے بعض شکایات کو رفع کرنے کے بارے میں بھی سفارشیں پیش کیں۔ چنانچہ حکومت نے ان شکایتوں کو دور کرنے کی غرض سے چند تدابیر اختیار کیں۔ مثلاً ریل گاڑیوں، ڈبوں اور انجنوں کی تعداد میں اضافہ کیا، پلیٹ فارم اور ویٹنگ روم کی گنجایش کو وسیع کیا، نئے اسٹیشن بنائے، آب رسانی کا بہتر انتظام کیا۔ مسافروں کی نگرانی کرنے والے مہتموں کا تقرر کیا وغیرہ۔ مسافروں کی آمد ورفت سے ریلوں کو جو آمدنی وصول ہوتی ہے اس میں سب سے بڑا حصہ تیسرے درجے کے لوگ دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے دوسرے امور سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ چیز کاروباری نقطۂ نظر سے بہت ہی مفید ہوگی کہ تیسرے درجے کے مسافروں کے لیے سفر کی دلکشی میں اضافہ کیا جائے۔

۲۲۔ ریلیں وفاقی حکومت کے تحت۔

قانون حکومت ہند بابت ۱۹۳۵ء کی رو سے یہ قرار دیا گیا ہے کہ جہاں وفاقی حکومت اور وفاقی مجلس قانون ساز ریلوے کی پالیسی کی عام نگرانی کرے، وہاں سرکاری ریلوں اور کمپنیوں کے زیر انتظام ریلوں کے حقیقی نظم ونسق کو ریلوے کی ایک ذی اقتدار دستوری جماعت کے تحت رکھا جائے جس کو وفاق کے تحت ریلوں کو بنانے چلانے، ان کا انتظام و نگرانی کرنے کے بارے میں عاملی اقتدار حاصل ہو۔ ریلوں کی ذی اقتدار جماعت

کو کاروباری اصول پر کام کرنا چاہئیے۔ اور زراعت، صنعت، تجارت اور عوام کے اغراض کا مناسب لحاظ رکھنا چاہئیے۔ جہاں تک کہ پالیسی کا تعلق ہے اس ذی اقتدار جماعت کو وفاقی حکومت کی دی ہوئی ہدایتوں کی رہنمائی میں اپنے کام انجام دینے چاہییں۔

اس ذی اقتدار جماعت کے ارکان میں سے کم از کم ۳/۷ حصہ ایسے اشخاص پر مشتمل ہونا چاہئیے جن کو گورنر جنرل اپنے صوابدید کے لحاظ سے مقرر کرے، اور گورنر جنرل ہی ان ارکان میں سے ایک کا تقرر بحیثیت صدر نشین کریں گے۔

یہ ذی اقتدار جماعت ایک فنڈ جس کو "ریلوے فنڈ" سے موسوم کیا جائے گا قایم کرے گی اور اس کا انتظام و نگرانی کرے گی۔ اس جماعت کو جو رقم آمدنی یا سرمایے کی مد میں اپنے کاموں کی انجام دہی میں وصول ہو اور اس جماعت کو اپنے فرائض بجا لانے کے قابل بنانے کے لیے جو رقم مرکزی وفاقی حکومت کی آمدنی سے مہیا کی جائے وہ سب اسی فنڈ میں جمع ہوگی اور اس کے تمام اخراجات اسی فنڈ سے پورے کیے جائیں گے۔

گورنر جنرل وقتاً فوقتاً ریل کی شرحوں کی کمیٹی مقرر کرسکتے ہیں تاکہ ریل استعمال کرنے والے اشخاص اور اس ذی اقتدار جماعت کے درمیان کرایے اور آمد و رفت کی سہولتوں کی بابت کوئی نزاع ہو جس کے بارے میں گورنر جنرل ذی اقتدار جماعت کے لیے لازمی گردانیں کہ وہ اس مسئلے کو کمیٹی کے سامنے پیش کرے تو کمیٹی ذی اقتدار جماعت کو مشورہ دے سکے۔

ریلوں میں مسافروں یا مال کا جو کرایہ لیا جائے اس کی تنظیم کی غرض سے کوئی مسودۂ قانون بنایا جائے یا قانون میں کوئی ترمیم کی جائے تو اس کو بجز گورنر جنرل کی سفارش کے وفاقی مقننہ کے کسی ایوان میں بھی نہ تو پیش کیا جاسکتا ہے نہ اس کے لیے

تحریک کی جاسکتی ہے۔
گورنر جنرل کو یہ اختیار حاصل ہے کہ ایسے قواعد بنائیں جن کی رو سے ریلوے کی ذی اقتدار جماعت یا کسی شریک وفاق ریاست کے لیے یہ لازمی ہو کہ وہ ایسی صورتوں میں جن کی تصریح قواعد میں کردی گئی ہو ریل بنانے یا ریل کے راستے کا خاکہ یا ریل کی پٹری کی چوڑائی بدلنے کے بارے میں کسی تجویز کے متعلق قبل از قبل اطلاع دیجائے اور خاکے اور نقشے پیش کیے جائیں۔
اگر ذی اقتدار جماعت یا شریک وفاق ریاست کوئی اعتراض کرے کہ اس تجویز پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وفاقی ریلوے یا ریاستی ریلوے سے ناواجب یا غیر معاشی مسابقت کرنی پڑے گی تو گورنر جنرل اس اعتراض کو ریلوے کی ایک خصوصی عدالت (ٹریبونل) میں بھجوا سکتے ہیں جو حسب ذیل اشخاص پر مشتمل ہوگی۔ ایک صدر نشین ہوگا جس کا تقرر وفاقی عدالتوں کے ججوں میں سے ہندوستان کے چیف جسٹس سے مشورہ کرنے کے بعد وایسرائے کریں گے، اور اس کے رکن دوسرے دو اشخاص ہوں گے جن کا انتخاب ریلوے، نظم ونسق یا کاروبار کا تجربہ رکھنے والے آٹھ اشخاص کی ایک فہرست میں سے ہر صورت میں وائسرائے کریں گے۔
ریلوے کی خصوصی عدالت کے کسی فیصلے کے خلاف اپیل قانونی مسئلے کے بارے میں وفاقی عدالت میں کی جائے گی[1]۔
ریلوے کی وفاقی ذی اقتدار جماعت کے بارے میں قانون حکومت ہند (بابت ۱۹۳۵ء) کی دفعات عوام کو مطمئن کرنے میں ناکام رہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی شدید مخالفت اس بنا پر کی گئی کہ یہ شرائط ریلوے پالیسی اور نظم ونسق پر آئینی نگرانی اور عوام کی

[1] قانون حکومت ہند (۱۹۳۵ء) فصل ۱۸۱ تا ۱۹۹۔

نگرانی کو بڑی حد تک کم کر دیتی ہیں۔ اسی بنا پر دیجوڈ کمیٹی کی حالیہ (۱۹۳۷ء میں) سفارشوں کی مخالفت کی گئی تھی۔ یہ سفارشیں اس خیال سے کی گئی تھیں کہ ریلوں کی وفاقی ذی اقتدار جماعت کے معاملات میں سیاسی و انتظامی مداخلت کو روکا جائے۔[1]

۲۲۔ ریلوں کے معاشی اثرات و نتائج[2]

ریلوں اور فاصلہ کم کرنے والے دوسرے ذرائع کے فوائد قومی، معاشری اور تہذیبی نقطۂ نظر سے ظاہر ہیں اور ان کو یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ عمدہ نظم و نسق اور داخلی و خارجی فوجی مدافعت کے لیے بھی ریل کے وسائل آمد و رفت کا مناسب طور پر ترقی یافتہ ہونا ضروری ہے۔ ریلوں کے معاشی اثرات اہم ترین ہیں۔ ہندوستان جیسے ملک میں قحط کی امداد کا انحصار ریلوں کے عمدہ انتظام پر ہے تاکہ متاثرہ رقبوں میں غذائی اشیا جلد سے جلد پہنچائی جا سکیں۔ علاوہ ازیں ریلیں ملک کی عام معاشی ترقی کے حق میں زبردست محرک کا کام کرتی ہیں وہ نہ صرف ملک کے طول و عرض میں قیمتوں میں مساوات پیدا کرتی ہیں بلکہ ان قیمتوں کو دنیا کی قیمتوں کے مطابق رکھتی ہیں، بے روزگاروں کے لیے کام اور روزگار مہیا کرتی ہیں اور آبادی کی زیادہ مساویانہ تقسیم کو ممکن بناتی ہیں۔ ریلیں ملک کی داخلی و خارجی تجارت میں ضروری ربط و تعلق پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ یہ ثابت کرنا آسان ہے کہ ریلوں کی توسیع کی بدولت مسافروں اور مال کی آمد و رفت میں کافی ترقی ہوئی۔

ریلوں نے ہندوستان میں زرعی پیداوار کے بازاروں میں وسعت پیدا کر کے کاشتکاروں کی ہمتیں بڑھا دیں۔ ملک کی صنعتی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ریلوں کو

---

[1] ہندوستانی ریلوں کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ نقرہ ۲۱۵ تا ۲۲۱۔

[2] ملاحظہ ہو اس باب کی فصل (۱)۔

اطمینان بخش طور پر توسیع و ترقی دی جائے، تاکہ کوئلے اور خام اشیا کی نقل وحمل اور تیار مال کی تقسیم میں سہولتیں پیدا ہوں۔ ریلیں، انجینیری کی صنعتوں کے حق میں بھی محرک کا کام کرتی ہیں اور تلغراف اور ڈاک کے انتظام کی ترقی سے ان کا گہرا تعلق ہے۔ جنگلات پر بھی ریلوں کا اثر بحیثیت مجموعی مفید پڑا۔ ریلوں کی نقل وحمل کی سہولتوں اور ریلوں کی پٹریوں کے سلیپروں کی مانگ نے جنگل میں درخت اگانے کی بہت ہمت افزائی کی۔ شہروں کی ترقی اور بندرگاہوں کی نشو و نما کو بھی ریلیں ہی ممکن بناتی ہیں۔ صحت وصفائی کے انتظام کی اصلاح و ترقی کے متعلق اشتہار و اشاعت کی مختلف مہموں کی رہنمائی کرنے اور زراعت کے طریق کی اصلاح کرنے میں ریلیں جو بیش بہا مدد دے سکتی ہیں ان کو پہلے بیان کیا جا چکا ہے[1]۔ آخر میں یہ کہ ریلوں سے حکومت کی آمدنی میں براہ راست اور بالواسطہ دونوں طریقوں پر اضافہ ہوتا ہے۔ براہ راست اس لحاظ سے کہ حکومت ریلوں کے منافع سے حصہ پاتی ہے، اور بالواسطہ اس لیے کہ ریلیں ملک کی مجموعی دولت میں اضافہ کرتی ہیں اور اس کے نتیجے کے طور پر عوام کی ٹیکس ادا کرنے کی صلاحیت کو بڑھا دیتی ہیں۔

لیکن ہندوستان کے حق میں ریلیں خالص نعمت ثابت نہیں ہوئیں چنانچہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ریلوں کا جال بچھانے کا عمل دیسی صنعتوں کی تباہی کی رفتار کو تیز کرنے میں کس قدر اہم حصہ رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ ریلیں بنانے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ ملک کی معاشی ترقی یک طرفہ ہوئی، جس کے تحت ملک کی برآمد کم و بیش بالکل خام اشیا پر اور اس کی درآمد مصنوعات پر مشتمل ہوتی ہے۔ قحط کی موثر امداد کو منظم کرنے کے معاملے میں ریلوں سے جو مدد ملتی ہے اس کی حد تک ہمیں اس واقعے کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ اس تصویر کا تاریک رخ بھی ہے۔ ریلوں نے

[1] ملاحظہ ہو جلد اول باب (۸) فصل (۲)۔

دیسی صنعتوں کے زوال میں حصہ لیکر ملک کو اور بھی زیادہ زراعتی بنا دیا اور اس کی وجہ سے یہاں کے باشندوں کی بہت بڑی تعداد خاص کر پارچہ باف جیسے دست کار پہلے سے زیادہ قحط کی زد میں آگئے۔ اس طرح جہاں ریلوں نے قحط کے امدادی کام میں سہولتیں بہم پہنچائیں وہیں دوسری طرف یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اس کام کی مقدار اور وسعت کو بڑھا دیا۔ ریلوں کی نشو و نما کے ابتدائی دور میں ریلوں کی ایندھن کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جنگلات بے احتیاطی کیساتھ تباہ کئے گئے، یہاں تک کہ حکومت نے اس طریق کو روکنے کے لیے ضروری تدابیر اختیار کیں۔ اس ملک میں ریلوں کی نشو و نما کے معنی یہ بھی رہے کہ غیر ملکی سرمایہ درآمد ہوتا رہا اور غیر ملکی شغل اصل کو فروغ ہوا۔ چنانچہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، اسی وجہ سے چند فوائد کے ساتھ ساتھ بعض خرابیاں بھی پیدا ہوئیں۔

۲۴۔ ریلوں کو مزید توسیع و ترقی دینے کی ضرورت۔

لیکن ان نقصان دہ اثرات و نتائج کو ریلیں بنانے کی طرف منسوب کرنا اسقدر مناسب نہیں جسقدر کہ ریلیں بنانے کے طریق اور ریل بنانے میں بے جا عجلت سے کام لینے کی طرف منسوب کرنا۔ اس لحاظ سے ہمیں ان بعض افسوس ناک نتائج کی بنا پر جو ہندوستان میں ریلیں بنانے سے حقیقی طور پر رونما ہوئے۔ یہ خیال نہ کر لینا چاہئیے کہ ریلوں کی مزید توسیع و ترقی کو روکنا ملک کے اغراض کے لیے مفید ہوگا۔ برخلاف اس کے یہ بات نہایت ہی اہم ہے کہ مناسب تحفظات کے تابع ریلوں کی نشو و نما کو ممکنہ طور پر جلد سے جلد آگے بڑھایا جائے تاکہ ملک کی صنعتی و تجارتی ترقی کی رفتار تیز ہو۔ یہ امر کہ ہندوستان میں ریلوں کی تعداد کم اور ناکافی ہے اس واقعہ سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ جہاں روس کو الگ کر کے یورپ اپنے ۱۶،۶۰،۰۰۰ مربع میل رقبے میں ۹۰،۰۰۰ میل طویل ریلوے لائن رکھتا

ہے وہاں ہندوستان ۱۸۰۳۰۰۰ مربع میل کا رقبہ رکھتے ہوئے (سنہ ۱۹۲۸ء) میں صرف ۳۹۷۱۲ میل طویل ریلوے لائن رکھتا ہے[1]۔
خاص کر جب آبادی کے معیار سے جانچا جاتا ہے تو دوسرے اکثر ملکوں کے مقابلے میں ہندوستان میں ریلوں کی سہولتیں بہت ہی ناقص اور ناکافی ہیں۔ یہ یقیناً مہمل بات ہوگی کہ ہندوستان جیسے زرعی ملک کا مقابلہ جو دور دور پھیلے ہوئے پہاڑی سلسلے، بڑے دریاؤں کے دہانے وسیع ریگستان، صحرا اور بنجر علاقے رکھتا ہے، انگلستان جیسے صنعتی حیثیت سے اعلیٰ درجے کے ترقی یافتہ ملک اور گھنے بسے ہوئے ملک سے کیا جائے جس کے ہر مربع میل سے قومی آمدنی میں کچھ نہ کچھ حصہ وصول ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ ہندوستان میں وسائل آمدورفت کی ضرورت کو نہایت موثر اور ارزاں طریق پر اکثر صورتوں میں ریلوں کے مقابلے میں سڑکوں پر میکانی باربرداری اور دریائی نقل وحمل کے انتظام کے ذریعے سے بہتر طریق پر پورا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان سب باتوں کا لحاظ کرنے کے بعد بھی بہت سا کام ریلوں کی توسیع کے سلسلے میں کرنا باقی ہے۔
یہ بھی ضروری ہے کہ مطلوبہ سرمایہ ہندوستان ہی میں مہیا کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی جائے، تاکہ ملک میں غیر ملکی سرمایے کی مزید ترقی حدود کے اندر رکی رہے۔ آخر میں یہ ضروری ہے کہ ایک طرف ریلیں بنائی جائیں تو دوسری طرف اس کام کے ساتھ ساتھ ریلوں کی صنعتوں کو فروغ دیا جائے اور ان کی پرورش کی جائے۔ اس معاملے کو اب تک بالکل نظر انداز کیا گیا۔ ریلوں کا سامان باہر سے حاصل کرنے اور معمولی مرمت ودرستی کرانے کی حد تک بھی غیر ممالک پر ہندوستان کے انحصار کا خطرہ گزشتہ جنگ عظیم میں پوری طرح نمودار ہوا۔ اسی لیے اس بات پر

---

[1] دیکھو انڈین ریلوے کانفرنس (سنہ ۱۹۲۸ء) کے صدر نشین کی تقریر۔

زور دیا جاتا ہے کہ اس انحصار کو ختم کرنے کے لیے تدابیر اختیار کرنی چاہئیں اس کے علاوہ صنعتی ترقی کے عام اغراض کے تحت بھی ریلوں سے متعلقہ دیسی صنعتوں کا فروغ مناسب ہے۔

سڑک پر بار برداری

۲۵۔ سڑکوں کی حالیہ سرگزشت

ہندوستان میں گزشتہ صدی کے وسط میں سڑک کی بار برداری کی جو غیر اطمینان بخش حالت تھی اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ چونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی زیادہ تر ایک تجارتی جماعت تھی۔ اس لیے اس نے مہذب حکومت کے ایک اہم کام کو نظر انداز کیا اور وہ یہ کہ سڑک بنانے میں بہت کم دلچسپی لی۔ جو کچھ محدود ترقی ہوئی اس کا باعث لارڈ ولیم بنٹنک جیسے ارباب نظم ونسق کی انفرادی کوشش تھی۔ چنانچہ لارڈ صاحب موصوف ہی نے شمالی ہندوستان کو بنگال سے ملانے کے لیے ایک شاہراہ بنانے کی تجویز کو زندہ کیا اور اس کے نتیجے کے طور پر گرانڈ ٹرنک روڈ بنائی گئی جو پشاور کو دہلی اور کلکتے سے ملاتی ہے۔ کمپنی سیول آبادی کی سڑک کی ضرورتوں کو جو کم اہمیت دیتی تھی اس کا ثبوت اس واقعے سے ملتا ہے کہ اس زمانے میں سڑکوں کو ایک خاص محکمۂ تعمیرات کے بجائے صوبائی مجالس فوجی کے تفویض کیا گیا تھا۔

لیکن لارڈ ڈلہوزی کے عہد حکومت میں ہندوستان نے سڑک بنانے کے ایک نئے دور میں قدم رکھا۔ لارڈ ڈلہوزی نے صرف ریلوں کو ترقی دینے ہی میں عملی دلچسپی نہیں لی بلکہ سڑکوں کے بارے میں بھی

ایک زیادہ پر زور پالیسی رائج کی اور اس غرض سے ایک مرکزی محکمہ تعمیرات عامہ کھولنے کے علاوہ تمام صوبوں میں مجالس فوجی کے بجائے ۱۸۵۵ء میں اسی قسم کے محکمے قایم کئے گئے۔ ایک اور سبب جس نے گزشتہ ۵۰ سال کے دوران میں سڑکوں کی نشوونما کو ترقی دی وہ ریلوں کا اثر تھا۔ چنانچہ جوں جوں ریلیں بتدریج بنتی گئیں یہ روزافزوں ضروری ہوتا گیا کہ سڑکیں بنائی جائیں تاکہ وہ ریلوں سے مسابقت کرنے کے بجائے ان کی معاون رہیں۔ اس کی وجہ سے "کنکر کی پکی اور پل والی سڑکوں کی جو ریلوں سے مل کر زاویۂ قائمہ بناتی ہیں اور سال کے تمام موسموں میں ریلوں تک رسائی کا ذریعہ مہیا کرتی ہیں ایسی طلب پیدا ہوگئی جو آج تک تمام وکمال پوری نہیں ہوئی ہے"[1] لیکن یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ ریلوں کی توسیع اور ان کو نفع بخش طور پر چلانے میں حکومت گہری مالی دلچسپی لے رہی تھی، اس لیے اس نے سڑکوں اور خاص کر ایسی شاہراہوں سے جہاں وہ ریلوے لائنوں کے متوازی واقع تھیں کسی حد تک بے توجہی کی[2]۔ مقامی خود اختیاری حکومت کی حد تک لارڈ میو اور لارڈ رپن کی ترقی پذیر پالیسی نے جہاں مقامی معاملات میں مقامی نگرانی قایم کی وہاں سڑکوں کی نشوونما کے حق میں کسی حد تک محرک کا کام کیا۔ ان سب عاملین کا مجموعی نتیجہ گزشتہ ۵۰ سال کے دوران میں سڑکوں کی زوردار تیاری کی صورت میں ظاہر ہوا۔ چنانچہ شمالی شاہراہ میں وادی گنگا سے پشاور تک توسیع کی گئی، ہندوستان کے ہر گوشہ میں کنکر کی عمدہ اور پختہ شاہراہیں اور علاقہ واری سڑکیں میدانوں اور پہاڑیوں میں تیار کی گئیں، اور ہزاروں میل کی کچی بے کنکر کی کارآمد سڑکیں اور آدمی اور گھوڑا چلنے کی بہت عمدہ پگڈنڈیاں بنائی گئیں

---

[1] زرعی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۳۷۰۔

[2] سڑکوں کی نشوونما کی کمیٹی کی رپورٹ، فقرہ ۱۷۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان کے ہر حصے میں گزشتہ دو یا تین دہوں میں وسائل نقل وحمل میں بہت اضافہ اور ترقی ہوئی ہے، اور یہ توسیع و ترقی ہی اس بات کا معیار ہے کہ ہندوستان کی سڑکوں کے نظام کو کس حد تک فروغ ہوا ہے اور اس ملک کے باشندوں کے لئے سڑکیں کیا معاشی قدر و قیمت رکھتی ہیں[1]۔

۲۶۔ ہندوستان کی سڑکوں کے نظام کی اہم خصوصیات

موجودہ زمانے میں چار بڑی شاہراہیں ملک میں موجود ہیں اور ان ہی سے اہم ذیلی سڑکیں ملحق ہیں۔ سب سے مشہور شاہراہ وہ قدیم فوجی راستہ ہے جو "گرینڈ ٹرنک روڈ" کے نام سے موسوم ہے اور جو شمالی ہند کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک خیبر سے کلکتے تک چلی گئی ہے اور باقی تین شاہراہیں کلکتے سے مدراس کو، مدراس سے بمبئی کو اور بمبئی سے دہلی کو ملاتی ہیں۔ برطانوی ہند میں ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں کنکر کی پختہ سڑکوں کا طول ۸۰۲۲۸۴ میل تھا جس کے منجملہ ان چار شاہراہوں کا طول ۵۰۰۰ میل ہے۔ جنوبی ہند اس اعتبار سے سب سے زیادہ سہولتیں رکھتا ہے کہ یہاں ذیلی سڑکوں کی صرف تعداد ہی زیادہ نہیں ہے بلکہ ان سڑکوں کی حالت اطمینان بخش ہے۔ راجپوتانہ، سندھ، پنجاب کے بعض حصے، اڑیسہ اور بنگال ایسے علاقے ہیں جہاں سڑکیں سب سے کم اور خراب حالت میں ہیں۔ سڑکوں کی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:۔ زمین کا ریتیلا ہونا، آبادی کی کمی، بے پل کے اور ناقابل پل سازی دریا، سطح زمین کی ناہمواری اور سڑک بنانے کے لیے موزوں مسالے کی کمی۔ پکی سڑکوں کے علاوہ بے کنکر کی کچی سڑکیں بھی برطانوی ہند میں بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں ان کا طول ۲۲۴۳۳ میل تھا، اور ان میں سے

[1] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "ہندوستان ۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۷ء میں" صفحہ ۲۶۱۔

بعض خشک موسم میں موٹروں کے عبور و مرور کے لیے نہایت عمدہ ہیں۔

یوں تو ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء[1] میں سڑکوں کا مجموعی طول ۳۰۰،۹۱،۷۱،۱ میل تھا جس کے منجملہ کنکر کی پکّی سڑکیں ۸۲۲۸۴ میل اور بے کنکر کی کچی سڑکیں ۲،۴۲،۴۴۳ میل طویل تھیں لیکن بحیثیت مجموعی ملک کے عظیم رقبے کا لحاظ کرتے ہوئے یہ تناسب بہت ہی ادنیٰ تھا۔ یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ موٹری نقل وحمل کے رواج سے قبل بھی ہندوستان کی سڑکیں اس کی ضرورتوں کے اعتبار سے بالکل ناکافی تھیں۔

سڑکوں کی قلت[2] دیہی علاقوں میں شدت سے محسوس کی جاتی ہے دیہات میں ایسی سڑکیں بہت ہی کم ہیں جو شاہراہوں یا ریلوے لائنوں سے جا کر ملتی ہوں۔ اکثر دیہات تک تو رسائی بھی مشکل ہے اور وہ وسایل آمد و رفت کی سہولتوں سے بالکل محروم ہیں۔

اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ ملک میں سڑکوں کی تعداد ناکافی ہے اور بہرحال کچھ سال ادھر تک سڑکوں کی تیاری کے پروگرام میں باقاعدگی اور تسلسل نہیں تھا، ایک اور غیر اطمینان بخش خصوصیت یہ واقعہ ہے کہ حالیہ سالوں میں سڑکوں کو خراب ہونے دیا گیا۔ یہ خرابی اور ابتری ان سڑکوں کے بارے میں سب سے زیادہ نمایاں رہی جو

[1] برطانوی ہند میں سڑکوں کا مجموعی طول ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں ۱،۷۱،۹۰،۳ میل تھا، جس کے منجملہ ۱۲۹،۱۴ میل طویل سڑکیں محکمۂ تعمیرات عامہ کے زیر نگرانی، ۲۰،۶۴۲ میل کی سڑکیں بلدیوں کے زیر انتظام اور ۲۶،۴۹۹ و ۲۳۴ میل کی سڑکیں مجالس ضلع اور مقامی مجالس کے تحت تھیں۔ دیکھو "برطانوی ہند کا اعدادی خلاصہ" برائے ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء، جدول ۲۳۲۔

[2] زرعی کمیشن یہ بتلاتا ہے کہ جہاں ریاستہائے متحدہ کے فی ۱۰۰ مربع میل رقبے میں ۱۰۰ میل کی سڑکیں ہیں، وہاں ہندوستان میں فی ۱۰۰ مربع میل صرف ۲۰ میل کی سڑکیں پائی جاتی ہیں (دیکھو رپورٹ فقرہ ۲۹۹)۔

مقامی حکومتوں کے زیر انتظام تھیں۔ مقامی حکومتوں کے ذرائع آمدنی کا محدود ہونا ہی اس صورت حال کا زیادہ تر ذمہ دار ہے۔ لیکن ہمیں اس صورتِ حال میں ایک نئے عامل کا بھی لحاظ کرنا چاہئے اور وہ یہ کہ کچھ سال ادھر سے تمام ہندوستان میں خانگی موٹر کاروں اور خاص کر سرکاری موٹر بسوں کی تعداد حیرت انگیز تیزی کے ساتھ بڑھ گئی ہے اور اس طرح سڑکوں کی تیاری اور نگرانی کے مسائل کا ایک نیا سلسلہ رونما ہوا ہے۔ یہ سچ ہے کہ بڑے فاصلوں کے لیے بھی زرعی پیداوار اور مصنوعات کے ڈھونے میں بیل گاڑی کے استعمال کو موٹر لاری نے بمشکل متاثر کیا ہے؛ چنانچہ دوسرے اسباب کے منجملہ اس کا باعث یہ مشکلات ہیں کہ اکثر سڑکوں کی حالت مایوس کن ہے اور بڑی سڑکوں پر دریاؤں کے پل بنے ہوئے نہیں ہیں اور ریلوں سے مسابقت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن جب یہ مشکلات رفع ہو جائینگی تو ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ خاص کر اس اصلاح و ترقی کے مدنظر جو مال کی ڈھلوائی کی لاریوں کی ساخت میں عمل میں آ رہی ہے بار برداری بڑی حد تک میکانی وسائل نقل و حمل کے ذریعے انجام پانے لگے گی۔ ۵ اس قسم کی ترقی پہاڑی علاقوں میں خاص طور پر ممکن ہے جہاں ریلیں بنانا کفایت کے خلاف ہے اور صرف موٹروں کے عبور و مرور کے قابل سڑکیں بنائی جا سکتی ہیں۔ علاوہ ازیں بڑے شہروں کے نواح میں بھی موٹروں کو زوال پذیر اشیا کی ڈھلوائی کا موقع حاصل ہے۔

۲۷۔ سڑکوں کی تعداد بڑھانے کی ضرورت

ہندوستان جیسے ملک میں جو براعظم کی حیثیت اور غالب زرعی اغراض رکھتا ہے اور جس کی صنعتیں ترقی کی کشاکش میں مبتلا ہیں، نقل و حمل کے قابل عمدہ سڑکوں کی ضرورت پر زور دینے کی بہ مشکل ضرورت ہے۔ جیسا کہ زرعی کمیشن نے خیال ظاہر کیا ہے۔ "نقل و حمل

پیداوار کی فروخت کے انتظام کا اہم جزو ہے، اور تجارت کی جدید نشوونما عمدہ سڑکوں کی قدر و قیمت اور اہمیت کو بڑھا دیتی ہے۔ ہندوستان کی داخلی و خارجی تجارت خاصی وسیع ہے اور اس میں آیندہ مزید توسیع کی گنجایش ہے۔ اس کے ماسوا زرعی پیدایش کو ترقی دینے اور دیہات میں معیار زندگی کو بلند کرنے کا یقینی اور بہترین طریقہ یہ ہے کہ اچھے ذرایع آمد و رفت مہیا کئے جائیں۔ اس کا ضمنی فایدہ یہ ہوگا کہ بار برداری کے جانوروں کی صحت و توانائی پر جو مسلسل بار پڑ رہا ہے وہ کم ہو جائے گا اور ان کی کارکردگی بڑھ جائے گی۔ علاوہ ازیں سڑکیں ان صنعتوں کی ترقی میں خاص طور پر مدد دیں گی جن کا تعلق زرعی پیداوار کو برآمد اور اندرون ملک صرف کی غرض سے تیار کرنے سے ہے۔ سڑکیں، صنعتوں کے ایک جگہ جمع ہونے کو روکنے میں بھی مدد دیں گی۔ چنانچہ موجودہ زمانے میں ان کا بے جا ارتکاز، ان کی راہ میں خاص کر مزدوروں کی رسد اور انتظام سکونت کے بارے میں کئی مشکلات پیدا کر رہا ہے۔ سڑکوں کی بدولت یہ بھی ممکن ہو جائے گا کہ "دیہات میں کارخانے" قایم کئے جائیں اور اس طرح صنعتی ترقی وہی شکل اختیار کرلے گی جو ہندوستانی مزدور کی ضرورتوں کے لحاظ سے نہایت موزوں ہے، اس لیے کہ ہندوستانی مزدور دیہی ماحول ہی میں بہت خوش رہتا ہے۔ غیر ملکوں کی مثال کو ہمت افزائی اور انتباہ کے طور پر کام میں لانا چاہئے۔ ریاستہائے متحدۂ امریکہ اور ڈنمارک کی خوش حالی کا باعث بڑی حد تک یہ ہے کہ ان کے وسائل آمد و رفت اور نقل و حمل کے میکانی ذرایع نہایت عمدہ ہیں۔ برخلاف اس کے ناقص وسائل نقل و حمل کے نقصان رساں اثر کی مثال روس میں ملتی ہے جو بہت بڑے زرعی ذرایع رکھنے کے باوجود بعض اوقات اپنے شہروں اور صنعتی رقبوں کی آبادی کی غذا مہیا کرنے سے قاصر رہتا ہے، حالانکہ اس کے

زرخیز جنوبی علاقے میں گیہوں سڑتا پڑا رہتا ہے۔ آخر میں یہ کہ ہندوستانی جنگلات کی وافر دولت سے صرف اس صورت میں موثر طور سے فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے جبکہ نقل و حمل کے قابل عمدہ سڑکیں موجود ہوں۔

۲۸۔ سڑک بمقابلہ ریل

گو مستقبل قریب میں ریلوں کو توسیع و ترقی دینے کے بارے میں تجویزیں تیار کی گئی ہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے وسیع ملک میں اس کی ضرورتوں پر نظر کرتے ہوئے اور ان معیاروں کے لحاظ سے جانچتے ہوئے جن پر دوسرے ملک پہنچے ہیں ریلوں کی کافی تعداد کا مہیا ہونا ناممکن ہے۔ ملک کے اندرونی حصے کو کھولنے اور بڑے صنعتی مرکزوں اور بندرگاہوں سے اس کو ملانے کے لیے سڑکوں ہی پر بڑی حد تک انحصار کرنا پڑے گا۔ اس وقت اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ بڑی سڑکوں اور معاون سڑکوں کا جال بچھا دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ سڑکوں کے بنانے میں ابتداءً بھاری اخراجات برداشت کرنے پڑیں گے اور اس کے علاوہ ان کے انتظام مرمت و درستی کے سالانہ اخراجات بھی عائد ہوں گے۔ لیکن اندرون ملک آمد و رفت کے لیے ریلیں بنائی جائیں تو ان کے مصارف بہرحال سڑکوں سے زیادہ ہوں گے۔ بمقابلۃً ہلکی آمد و رفت اور باربرداری اور چھوٹے فاصلوں کے لیے سڑک غالباً زیادہ موزوں ہوگی، اس لیے کہ وہ ریل کے مقابلے میں تقریباً ہر جگہ اور بدرجہا کم مصارف سے تیار کی جا سکتی ہے[1]۔ اسی کے ساتھ یہ ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ ہندوستان میں موسمی حالات یکساں نہیں رہتے بلکہ سال میں کئی مہینے انتہائی خشک رہتے

[1] آیندہ کے لیے ہزاروں میل دور مقاموں کے درمیان ہلکی اور قیمتی اشیا کی عاجلانہ نقل و حمل کے لیے ہوائی جہاز کا کوئی رقیب و حریف نہیں بن سکتا۔

ہیں تو ایک چھوٹی سی مدت میں بھاری اور لگاتار بارش ہوتی ہے جس کی وجہ سے بھاری موٹروں کی آمد و رفت کے قابل سڑکوں کا انتظام بیش خرچ ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں یہاں اسی میں زیادہ فایدہ ہے کہ ریلیں بنائی جائیں لیکن عام طور پر دیکھا جائے تو سڑکوں پر نقل وحمل کرنا ریلوں کے ذریعے سے نقل وحمل کرنے سے زیادہ ارزاں ہوگا، اس لیے کہ سڑکوں پر اسٹیشن، سائبان، سگنل بتلیاں وغیرہ بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ سڑکوں پر آخری اسٹیشن ہوتے ہیں جہاں خصوصی کرایہ وصول کیا جانے اور وقت ضایع جانے کا امکان ہو جس طرح ریلوں میں ہوتا ہے اس طرح سڑکوں کی حد تک نیم خالی واگنوں کو لے جانے یا بڑی تعداد میں ریل کے ڈبوں اور انجنوں کو بے کار رکھنے کے مسائل سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ بہرحال یہ بتلایا گیا ہے کہ سڑکوں پر نقل وحمل کے ارزاں ہونے کا باعث کسی حد تک یہ واقعہ ہے کہ میکانی وسایل بار برداری کے لیے موزوں سڑکوں کے انتظام کا بھاری خرچ موجودہ زمانے میں زیادہ تر عام محصول ادا کرنے والے کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ برخلاف اس کے ریلوں کے مستقل راستے کی نگہداشت اور دوسری مدوں کا کل خرچ خود ریلوں ہی کو اٹھانا پڑتا ہے۔ لیکن اگر آمد و رفت کرنے والی موٹروں پر سڑکوں کی نگہداشت کے مصارف کا بڑا حصہ عاید کیا جائے تو بھی سڑکوں کی یہ سہولت باقی رہے گی کہ ان پر نقل وحمل کرنا زیادہ ارزاں ہوگا۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، اس کا اطلاق ہلکی نقل وحمل اور چھوٹے سفر پر ہوتا ہے۔ دوسری طرف ریلیں بھی اپنی حیثیت کو برقرار رکھیں گی اور وزنی اشیا اور طویل فاصلوں کے لیے نقل وحمل کی ایک کم خرچ اور زیادہ سہولت بخش شکل ہونگی، جس کا باعث دوسرے امور کے منجملہ یہ ہوگا کہ ان کو چلانے کے مصارف

بدرجہا کم ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ریلیں اور سڑکیں کسی حد تک تو ایک دوسرے کا بدل ہیں اور ایک دوسرے سے مسابقت کرتی ہیں، لیکن کافی حد تک وہ ایک دوسرے کی معاون و مددگار ہیں۔ اس خیال کو حسب ذیل الفاظ میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ:۔

"سڑکیں کسان کے کھیت کو مقامی بازاروں اور قریبی ریلوے اسٹیشن سے ملاتی ہیں۔ اس کے برخلاف ریلیں ایک طرف پیدائش کے رقبے اور دور کے صارفوں کو باہم ملانے والی ایک کڑی کا کام دیتی ہیں تو دوسری طرف شہر کے صناعوں اور کسان کو جو اپنی ضرورت کی چیزیں، ہل، کھاد اور کپڑے خریدتا ہے، ایک دوسرے سے قریب کرتی ہیں۔ عمدہ اور کافی سڑکوں کے بغیر ریلیں نہ تو نقل وحمل کے لیے کافی پیداوار حاصل کرسکتی ہیں اور نہ ان کو چلانا ممکن ہے۔ دوسری جانب ریلوں کے بغیر بہترین سڑکیں بھی کسان کی پیداوار کو خریدار کے پاس نہیں پہنچا سکتیں[1]"، اس لیے یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ریلوں میں جو قومی سرمایہ ۸۰۰ کروڑ روپے کا مشغول ہے وہ سڑکوں کی توسیع و ترقی سے معرض خطر میں پڑ جائے گا۔ واقعہ یہ ہے، جیسا کہ سڑکوں کی نشو ونما کی کمیٹی کے روبرو پیش کی ہوئی ریلوے بورڈ کی یادداشت میں بتلایا گیا ہے کہ ہندوستانی ریلوں کو اس بات کا ہمیشہ سے شدید احساس رہا ہے کہ ان کے معاون کے طور پر سڑکوں کی تعداد کم رہی ہے[2]۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ریلوں اور سڑکوں کے درمیان کسی حد تک مسابقت ناگزیر ہے اور ہندوستانی ریلیں اس مسابقت کے دباؤ کو محسوس کر رہی ہیں، نہ صرف بڑے شہروں اور مضافات میں بلکہ

---

[1] زرعی کمیشن کی رپورٹ نقرہ ۳۱۲۔

[2] "یہ یقینی طور پر کسی قدر بے جوڑ بات ہے کہ ہندوستان میں تقریباً ۴۰ ہزار میل طویل ریلیں ہوں اور اس کے برخلاف مسطح سڑکوں کا طول برطانوی ہند میں صرف ۵۹ ہزار میل ہو" دیکھو سڑکوں کی

ملک کے دوسرے حصوں میں بھی جہاں موٹر سروس ریلوں کے متوازی چل رہی ہے یا جہاں ریلوے لائن چکر سے جاتی ہے، جیسے کہ احمد نگر اور پونہ کے درمیان ریلوے کے نظم ونسق نے عوام کے لیے سڑکوں کی نقل وحمل کے مقابلے میں بہتر یا مساوی خدمت مہیا کرنے کی عام پالیسی اختیار کی ہے اور دوسری طرف اس زائد کاروبار سے پورا فائدہ اٹھایا جو ریلوں تک معاون یا تقسیم کنندہ سڑکیں پہنچاتی ہیں۔ موٹر سرویسوں کا آغاز عام طور پر اسی لیے ہوا کہ ریلیں عوام کے مطالبے کو پورا کرنے سے کسی نہ کسی طرح قاصر رہیں۔ اس طرح ان کی مسابقت بعض اوقات عوام کے نقطۂ نظر سے اس حد تک مفید رہی کہ موٹر سرویس نے ریلوں کو اس بات پر مجبور کردیا کہ وہ عوام کی ضرورتوں کی بہتر طریق پر تکمیل کریں۔

۲۹۔ سڑکوں کی مسابقت کے اثر کو زائل کرنے کی تدابیر۔ سڑکوں کی مسابقت کو کمزور کرنے کے طریقوں میں سے ایک یہ ہے کہ ریلوے بس سرویس جاری کی جائے جیسی کہ ای، آئی، آر چلا رہی ہے، چوکیداری سرویسوں اور آدھا گاڑیوں جیسی خود چلنے والی کوچیں چلائی جائیں؛ ریل کے وقت ناموں میں ترمیم و تبدیلی کی جائے؛ ارزاں واپسی کے ٹکٹ جاری کیے جائیں؛ شادی کی براتوں کے لیے کرایے میں خاص طور پر کمی کی جائے؛ خصوصی ٹرینیں رعایتی شرح پر دوڑائی جائیں؛ ریلوے سرویس کا زیادہ اشتہار دیا جائے عام سہولتیں مہیا کی جائیں اور کرایوں میں کمی کی جائے[1]۔

ویجوڈ کمیٹی نے سڑکوں کی مسابقت کے مخالف اثر کو زائل

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:- نشوونما کی کمیٹی کی رپورٹ (۱۹۲۸ء) فقرہ ۳۶۔

[1] ہندوستانی ریلوں کے بارے میں ریلوے بورڈ کی رپورٹ (بابت ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء) فقرہ ۵۱۔

کرنے کے لیے چند تدابیر کی سفارش کی ہے۔ مسافروں کی آمد و رفت کی حد تک کمیٹی نے یہ مشورہ دیا ہے کہ پاسنجر ٹرینیں زیادہ تیز چلائی جائیں، مختلف لائنوں کی ٹرینوں کے ملنے کا بہتر انتظام کیا جائے ٹرینیں زیادہ تعداد میں چلائی جائیں اور تیسرے درجے کے مسافروں کی سہولت کا بہتر انتظام کیا جائے۔ کمیٹی اس بات کی مخالفت کرتی ہے کہ سڑکوں کی مسابقت سے نپٹنے کے لیے کرایوں میں عام کمی کی جائے۔ آمد و رفت کے انحراف کیے جانے یا انحراف کی دھمکی دی جانے کی خاص صورتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کرایوں میں مقامی طور پر کمی کرنی چاہیے۔ ہندوستانی ریلوں کو چاہیئے کہ مسافروں اور مال کی آمد و رفت کو ٹکٹ فروش ایجنسیوں کے ذریعے سے زیادہ سے زیادہ ترقی دیں۔ مال کی نقل وحمل کی حد تک کمیٹی یہ سفارش کرتی ہے کہ مال گاڑیاں تیز رفتار اور جلد جلد چلائی جائیں، اشیا کی ترسیل کے معاملے کو مستعدی سے نمٹایا جائے، محردوں کی ضابطے کی پابندیوں اور پیچیدہ کارروائیوں کی وجہ سے جو مشکلات پیدا ہوتی ہیں ان کو کم کیا جائے، مال اکھٹا کرنے اور منزل مقصود پر پہنچانے کی سروسوں کو ترقی دی جائے، ریل کے ڈبوں میں اشیا کو سرد اور محفوظ رکھنے کے انتظامات کئے جائیں وغیرہ۔ چونکہ جدید حالات کا اقتضا یہ ہے کہ مال ادھر سے ادھر جلد منتقل کیا جائے، اس لیے ریلوں کے لیے مناسب یہ ہوگا کہ بہتر خدمت مہیا کرنے کی خاطر پوری واگنوں کی لدائی یا ٹنوں کی لدائی قربان کردی جائے۔ سڑکوں کی نقل وحمل کی مسابقت سے رو در رو ہونے کی غرض سے کرایوں میں عام کمی کرنے سے ریلوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اس لیے ریلوں کو چاہیے کہ انفرادی کرایوں میں سوچ سمجھ کر کمی کرنے کے متعلق اپنی سابقہ پالیسی کو جاری رکھیں [1]۔

صفحہ ۲۰

---

[1] ہندوستانی ریلوں کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۱۶۹ تا ۱۸۹، نیز فصل (۳۱)۔

۳۰- نقل و حمل میں ربط پیدا کرنے کی پالیسی

گو اس طرح نقل و حمل کی دونوں شکلوں کے درمیان ربط قایم کرنے کی پالیسی مرتب کرنا مشکل ہے، لیکن یہ ممکن ہے کہ سڑک اور ریل کی توسیع کے نئے پروگرام اس طرح تیار کئے جائیں کہ سڑکیں ریلوں کی حریف بننے کے بجائے ان کے معاون کے طور پر کام کریں خاص کر ایسی آمد و رفت کے لیے جس کا انتظام ریلیں زیادہ خوبی اور کفایت کے ساتھ کرنے کی قابلیت رکھتی ہیں اور ریل اور موٹر کی آمد و رفت کے درمیان یورپ کے اکثر ملکوں میں آج کل جیسی نقصان رساں اور غیر دانشمندانہ مسابقت ہو رہی ہے ویسی ہندوستان میں رونما نہ ہو۔ بڑے کاموں کی تعمیر کے سرمایے میں سے نقل و حمل کے لیے جو رقوم دستیاب ہوں ان کو زیادہ تر سڑکوں کی تیاری میں ایسے طریقے سے لگانا چاہیئے کہ اس کی بنا پر نقل و حمل کی موجودہ سہولتیں دہری نہ ہوں بلکہ ان علاقوں میں غیر مسابقتی سڑکوں کی تیاری و ترقی کو ترجیح دینی چاہیئے جہاں نقل و حمل کی سہولتیں مفقود یا کم ہوں۔ اس امر کو یقینی بنانے کے لیے کہ نقل و حمل کی ہر مختلف شکل کو وہی کام سپرد کیا جائے جس کے لیے وہ سب سے زیادہ موزوں ہو۔ احتیاط کے ساتھ ربط دہی ضروری ہے مچل کرک نس رپورٹ میں اسی مقصد سے یہ سفارش کی گئی ہے کہ صوبوں میں وسائل آمد و رفت کی ایک مرکزی مشاورتی مجلس اور کمشنروں کے علاقوں میں علاقہ وار کمیٹیاں قایم کی جائیں۔ یہ رپورٹ اس تحقیقات کا نتیجہ تھی جس کو دو عہدہ داروں کی ایک چھوٹی کمیٹی نے ریلوں اور سڑکوں کی موجودہ مسابقت کے بارے میں سنہ ۱۹۳۲ء میں انجام دیا۔ ان میں سے ایک عہدہ دار مسٹر کے، جی مچل حکومت ہند کے سڑکوں کے انجینیر اور دوسرے عہدہ دار ایل، ایچ، کرک نس ریلوے بورڈ کو خصوصی کام کے لیے مستعار دیے ہوئے افسر تھے۔ ان کی رپورٹ میں اس مسابقت کو معقول بنانے کے لیے جو طریقے بتلائے گئے ہیں

ان میں سے ایک یہ ہے کہ موٹری نقل وحمل پر زیادہ اچھی طرح نگرانی رکھی جائے۔ اس میں یہ مزید سفارش کی گئی ہے کہ (۱) متوازی مسابقتی راستوں پر کم و بیش ۵۰ میل کے دائرے کے اندر اندر موٹری نقل وحمل کے منطقے مقرر کردیے جائیں؛ (۲) بعض ریلوں کو اس کی اجازت دی جائے کہ جو سڑکیں ریلوے لائن کے متوازی ہوں ان پر وہ موٹروں کے ذریعے نقل وحمل کا انتظام کریں؛ (۳) موٹری نقل وحمل پر ٹکس لگانے کے طریق کی نظر ثانی کی جائے؛ اور (۴) ریلیں چلانے کی ان تجاویز پر جو رکی ہوئی ہیں ان ترقیوں کی روشنی میں مکرر غور کیا جائے جو موٹری نقل وحمل میں حال ہی میں رونما ہوئی ہیں[1]۔ مچل کرک نس کمیٹی کی سفارشوں کے مطابق جو سڑک و ریل کانفرنس بمقام شملہ اپریل ۱۹۳۳ء میں منعقد ہوئی اس میں نقل وحمل کی مختلف شکلوں کی نگرانی و ترقی کے ذمہ دار مختلف محکموں کے باہمی تعامل کے بارے میں تحریکات منظور کی گئیں، تاکہ ان کے درمیان جو غیر معاشی مسابقت جاری تھی اس کو کم کیا جائے کانفرنس نے دوسرے طریقوں کے منجملہ اس بات پر بھی زور دیا کہ بعض ریلوں کی حد تک وہ دستوری ممانعت ہٹالی جائے جو ان پر بس سرویس چلانے کے بارے میں عائد کی گئی تھی، دیہی سرویسوں کو ترقی دینے کی غرض سے شارعی نقل وحمل کے اجارے منظور کئے جائیں، نیز مرکزی حکومت کے زیر نگرانی اور صوبوں میں ایسے محکمے قایم کئے جائیں جو مجوزہ ربط و تعامل کو مزید ترقی دیں۔ چنانچہ اس کے مطابق ستمبر ۱۹۳۳ء میں ریلوے ایکٹ میں ترمیم کردی گئی اور ریلوں کو مجاز گردانا گیا کہ ریل کی نقل وحمل کے ساتھ ساتھ موٹر سرویس بھی چلائیں۔ ۱۹۳۵ء میں نقل وحمل کی ایک مشاورتی مجلس قایم کی گئی جو مختلف صوبوں کے ایسے وزیروں یا ان کے نمایندوں پر مشتمل

[1] ملاحظہ ہو مچل کرک نس کی رپورٹ صفحہ ۴۔

ہے جن کا تعلق سڑکوں سے ہے اور اس میں ایک یا دو مشیر بھی ہیں - اس مجلس کا کام یہ ہے کہ سڑکوں کی پالیسی کے متعلق غور کر کے ایک بیان جاری کرے جس پر مختلف صوبے سڑکوں، ریلوں اور نقل و حمل کی دوسری شکلوں کے تعامل کو ترقی دینے کی غرض سے عام طور پر عمل پیرا ہو سکیں، کیونکہ یہ کام ملک کی معاشی ترقی کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے[1]۔

۴۱ - ریلوں اور سڑکوں کے تعاون باہمی کے بارے میں ویجوڈ کمیٹی

ویجوڈ کمیٹی نے ریل اور سڑکوں کی نقل و حمل کے تعامل کے مسئلے کو ۱۹۳۷ء میں جانچا تو معلوم ہوا کہ صوبائی حکومتوں کی طرف سے سڑکوں کی نقل و حمل کی تنظیم و نگرانی ناکافی تھی اور حالات بہت ہی ابتر تھے۔ صوبائی حکومتوں نے اب تک جس پالیسی پر عمل کیا ہے اس کے باعث سڑکوں پر ایک غیر منظم اور خراب قسم کی نقل و حمل کی ہمت افزائی ہوتی ہے - چنانچہ اس کی مسابقت سڑکوں پر کوئی معتبر سرویس مہیا کئے بغیر ریلوں کو نقصان پہنچائے گی۔ دوسری طرف سڑکوں کے فنڈ سے (دیکھو فصل ۳۴ تا ۳۶) سڑکوں پر جو رقم خرچ کی جاتی ہے اس پر مرکزی حکومت کی نگرانی کو صرف اس صورت میں موثر بنایا جا سکتا ہے جبکہ سڑکوں کی کافی تعداد کی بہم رسانی کی روک تھام یا ان کے بنانے میں تاخیر کی جائے - لیکن ریلوں کا قطعی طور پر کوئی لحاظ کئے بغیر سڑکیں بنانا ایک شدید قومی ضرورت ہے - اس طرح موجودہ پالیسی پر قایم رہنے سے ہندوستان کو دونوں اعتباروں سے نقصان پہنچے گا - یعنی اس کی ریلیں پست حالت میں رہیں گی اور سڑکوں

[1] تعامل کے مسئلے کی ایک سبق آموز بحث کے لیے دیکھئے ایس، کے، گھا کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں وسائل نقل و حمل کے تعامل کے مسائل"۔

کی تعداد ناکافی رہے گی۔[۱] موثر تعاون صرف اس صورت میں عمل میں لایا جاسکتا ہے جبکہ ریل اور ٹرک دونوں کی نقل وحمل کا انتظام خدمات عامہ کے طور پر کیا جائے۔ کمیٹی اس خیال سے اتفاق نہیں کرتی جو ریلوے کے بعض نقادوں نے ظاہر کیا ہے کہ سڑکوں کی نقل وحمل کی نگرانی کی حمایت محض ریلوں کو محفوظ رکھنے کی خاطر کی جاتی ہے۔ سڑکوں کی نقل وحمل کی مناسب نگرانی صرف امن وامان کے اغراض ہی کے لیے نہیں بلکہ صحیح اور معاشی اصول پر خود اسی کو ترقی دینے کی خاطر بھی ضروری ہے۔ یہ بھی مناسب اور پسندیدہ ہے کہ ریلوں کو کسی نئے حریف کے بے جا اور غیر معاشی حملوں سے محفوظ رکھا جائے۔ صوبائی حکومتوں کو چاہئیے کہ مرکزی حکومت کے نافذ کئے ہوئے یکساں قواعد کے مطابق سڑکوں پر نگرانی رکھیں۔ لیکن سڑکوں کی نقل وحمل پر کوئی ایسی بندش عائد نہ کرنی چاہیے جس کی بنا پر اس کی ترقی میں بیجا رکاوٹ پیدا ہو۔ عوام کے تحفظ کی غرض سے بسوں اور لاریوں کی نگرانی کے قواعد یکساں ہونے چاہییں۔ چنانچہ دونوں کو حسب ذیل شرائط کی پابندی کرنی چاہئیے :-

گاڑیوں کو ٹھیک اور اچھی حالت میں رکھنا چاہئیے، مال اور مسافروں کی غیر ضروری بھرمار نہ ہونی چاہئیے، رفتار کی حد بندی ہونی چاہئیے، کام کے گھنٹے مقرر کرنے چاہییں، ڈرائیور موزوں ہونا چاہئیے۔ عوام کی ضرورتوں کے مطابق اجازت نامے جاری کرنے چاہییں تاکہ بسوں اور لاریوں کی تعداد میں غیر ضروری اضافہ اور سڑکوں پر نقل وحمل کی سہولتوں کی غیر مساوی تقسیم نہ ہو۔ مسافروں کی سرویس کا انتظام ایک مقررہ راستے کا اجازت نامہ دے کر اور وقت نامہ اور کرایہ مقرر کر کے کرنا چاہئیے۔ کمیٹی یہ سفارش کرتی ہے کہ مال لے جانے والی گاڑیوں کے لیے علاقہ واری

[۱] ویجوڈ کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۱۳۸

اجازت ناموں کا طریقہ جاری کیا جائے اور قانون میں یہ گنجائش رکھی جائے کہ آیندہ کسی موقع پر مال کی ڈھلوائی کے کرایوں کو معین کیا جاسکے ۔ سرکاری اور خانگی لاریوں کے بارے میں یکساں قواعد جاری کرنے چاہییں۔ ایک انتدائی قانون کے ذریعے سے ان سفارشوں کو آئینی شکل دینی چاہیئے، اور یہ ناممکن ہونے کی صورت میں موٹر گاڑیوں کا ایک مرممہ مسودۂ قانون جلد سے جلد منظور کرنا چاہیئے۔ صوبائی قواعد نافذ کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ پولیس کی نگرانی کو قوی کیا جائے اور صوبائی حکومتوں کو چاہیئے کہ موٹر گاڑیوں پر ٹکس عائد کرنے میں یکسانی کو ملحوظ رکھیں۔

ویجوڈ کمیٹی نے اس امر کی پر زور سفارش کی کہ ریلیں سڑکوں کی نقل وحمل سے مسابقت کریں۔ اور اس غرض کے لیے کمیٹی نے یہ تحریک کی کہ ریلوں کو بس سرویس چلانے، سڑکوں کی نقل وحمل کے کاروبار میں سرمایہ مشغول کرنے یا ایسا کاروبار کرنے والوں سے معاہدے کرنے اور ٹھیکہ داروں کی وساطت سے سڑکوں کی نقل وحمل کا انتظام کرنے کے بارے میں کامل اختیارات حاصل ہونے چاہییں۔ ریلویز کو چاہیئے کہ مسافروں کی آمد ورفت اور سڑکوں کی خدمات کے امکان کو فوراً جانچیں اور مسابقتی اور معاون خدمات کے بارے میں اپنی تجاویز صوبائی حکومتوں کے سامنے پیش کریں۔ آخر میں کمیٹی اس بات پر زور دیتی ہے کہ ریلوں اور سڑکوں کی نقل وحمل کے دوسرے اہم عناصر کے درمیان تعامل ضروری ہے[1]۔

۲۳۔ موٹر بسوں کی آمد ورفت کی تنظیم۔ موٹر لاریوں کے بیمے کی کمیٹی کی حالیہ رپورٹ ویجوڈ کمیٹی کی رپورٹ مختلف صوبائی حکومتوں اور نقل وحمل کی تیسری مشاورتی مجلس کے مشوروں کی روشنی میں ایک جامع مسودۂ قانون مرتب کیا گیا اور مارچ ۱۹۳۸ء میں

[1] دیکھو ہندوستانی ریلوں کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۱۳۵ تا ۱۶۷۔

مرکزی مجلس قانون ساز کی منتخبہ کمیٹی کے تفویض کیا گیا۔

موٹر لاریوں کے متعلق مسودۂ قانون کے دو پہلو ہیں، یعنی (۱) تنظیمی اور (۲) تعاملی۔ اس مسودۂ قانون کی عام تجویز یہ ہے کہ مسافروں یا مال کی نقل و حمل کرایہ پر یا کسی دوسرے طریقے سے کرنے والی گاڑیوں کی نگرانی نقل و حمل کا انتظام کرنے والی جماعتوں کے ہاتھوں میں ہونی چاہئے جو صوبے کے اندر خاص رقبوں کے لیے بنائی جائیں؛ اور تعامل، مرافعے کی سماعت وغیرہ کی غرض سے پورے صوبے کے لیے نقل و حمل کی ایک انتظامی جماعت ہونی چاہئے۔ یہ ضروری ہے کہ تمام موٹر لاریاں اجازت نامہ حاصل کریں جو کسی علاقے کی نقل و حمل کی انتظامی جماعت جاری کرے گی اور اجازت نامہ حاصل کرنے والے کے لیے اس بات کو لازمی گردانا چاہیئے کہ وہ بعض مسلمہ شرائط کی تعمیل کرے؛ مثلاً گاڑی کو اطمینان بخش حالت میں رکھے، رفتار کے مقررہ حدود کی پابندی کرے، گاڑی میں مال یا مسافروں کی بھرمار کرنے یا ڈرائیور سے اس کے مقررہ وقت سے زیادہ کام لینے سے باز رہے؛ صوبہ واری انتظامی جماعت کے اختیارات اجازتی نوعیت کے ہوں گے چنانچہ انتظامات میں ربط پیدا کرنے یا علاقہ وار انتظامی جماعتوں کے باہمی اختلافات کا تصفیہ کرنے یا ایک مقام سے دوسرے مقام تک سیدھے جانے والے راستوں پر نگرانی بڑھانے کے لیے ان اختیارات سے کام لیا جا سکتا ہے۔

موٹر بسوں اور ٹیکسیوں کو اجازت نامے دینے کی حد تک نقل و حمل کا انتظام کرنے والی جماعتوں کو بطور رہنمائی چند اصولوں کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً عوام کی ضرورت اور سہولت، غیر معاشی مسابقت کی روک تھام، اور جن وسائل نقل و حمل کے لیے اجازت نامے طلب کئے جائیں ان کو چلانے کے لیے سڑکوں کا عمدہ حالت میں رکھنا۔ عوام کے مال کی نقل و حمل کی حد تک

یہ اصول اختیار کیا گیا ہے کہ ٹرنس پر مال کو اتار کر منتقل کرنے میں جو تاخیر اور نقصان ہوتا ہے اس سے بچنے کی غرض سے زوال پذیر اشیا کی چھوٹے فاصلوں کے لیے سڑک کے ذریعے سے نقل و حمل کرنے میں دست اندازی نہ کی جائے؛ اور اسی کے ساتھ بڑے فاصلوں کی نقل و حمل لازمی طور پر ریلوں کے لیے چھوڑ دی جائے۔ یہ قرار دیا گیا ہے کہ کسی خاص معینہ راستے کا اجازت نامہ رکھنے والا اس تحفظ کے معاوضے میں جو اس کو غیر معقول مسابقت کے مقابل دی جائے باقاعدگی کے ساتھ خدمت انجام دے گا یعنی افادۂ عامہ کی کمپنی کی ذمہ داری اپنے سر پر لیگا۔ انتظامی جماعتوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ سڑکوں پر نقل و حمل کے کرایوں کی بیش ترین اور کمترین شرحوں کا تعین کریں۔

اس مسودۂ قانون کی ایک قابل ذکر خصوصیت جس نے شدید بحث اور مناقشہ پیدا کر دیا، وہ شرط ہے جو پانچ سال کے بعد تیسرے فریق کے خطرات کے بارے میں موٹر گاڑیوں کے جبری بیمے کے متعلق ہے۔ ملک میں سڑکوں پر موٹر کے جو بے شمار حادثے ہوتے ہیں ان کے مدنظر اس شرط کو خوش آیند کہا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ عوام کی باربرداری کرنے والوں پر سماجی ذمہ داری عائد کرنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔

یہ قرار دیا گیا ہے کہ موٹر کے اجازت نامے تمام برطانوی ہند میں چلنے چاہئیں اور اس کی وجہ سے کسی صوبے کا یہ حق متاثر نہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنے طور پر موٹر کا ٹیکس مقرر کرے۔ نئے اجازت ناموں کے لیے درخواست دینے والوں پر یہ لازم ہوگا کہ وہ ایک خصوصی مقررہ آزمائش میں کامیاب ہوں۔

گو اس نئے مسودۂ قانون کی بعض خصوصیات بحث مباحثے کا مرکز بنیں، پھر بھی یہ مسودۂ قانون اصولی لحاظ سے غیر نزاعی ہے اور

اس کو بجا طور پر "مجموعۂ قوانین شاہراہ" کہا گیا ہے۔ یہ نہایت خوش آیند علامت ہے کہ اس بات کو روز افزوں تسلیم کیا جا رہا ہے کہ حالات میں جو ابتری اور افراتفری پائی جاتی ہے اس کو دور کر کے نظم و ترتیب پیدا کرنا اور نقل و حمل کے ایک منظم اور مربوط نظام کے لیے تدابیر نکالنا ضروری ہے۔

۳۳۔ ہندوستانی سڑکوں کی ترقی کی کمیٹی۔ ہندوستان میں کچھ سال اد هر[1] سے موٹروں کی آمد و رفت میں تیزی کے ساتھ ترقی اور اضافہ ہو جانے کی وجہ سے مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں یہ احساس روز افزوں ہے کہ سڑکوں کے بارے میں ایک جامع نظام العمل بنانا ضروری ہے تاکہ مقامی نظاموں میں ربط قایم کیا جائے اور ایک مشترک پالیسی اختیار کی جائے۔ چنانچہ بمبئی، برما، مدراس، پنجاب، اور صوبۂ متحدہ میں شارعی مجلسیں قایم کی جا چکی ہیں۔ ان مجالس کی حیثیت زیادہ تر مشاورتی ہے بجز پنجاب اور برما کے جہاں ان مجالس کے تفویض یہ کام بھی ہے کہ صوبائی فنڈ سے جو رقمی منظور یاں دی جائیں ان کو تقسیم کریں۔ نومبر ۱۹۲۷ء میں حکومت ہند نے ایک کمیٹی بنام "سڑکوں کی ترقی کی کمیٹی" بنائی جو مرکزی مقننہ کے ۱۴ ارکان پر مشتمل تھی اور جس کے صدر نشین مسٹر ایم، آر، جیکار تھے۔ کمیٹی سے حسب ذیل امور کے بارے میں سفارشیں کرنے کے لیے کہا گیا:-

---

[1] ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں ہندوستان میں درآمدہ موٹروں کی تعداد ۱۲۹۳۹ تھی جس میں ۹۱۶۰ موٹر بس اور بند موٹریں شامل تھیں۔ ۱۹۲۸ء تا ۱۹۲۹ء میں موٹروں کی درآمد کی تعداد سب سے زیادہ رہی۔ یعنی مجموعی تعداد ۱۹۶۵۷ تھی جس میں ۱۲۷۰۹ بسیں وغیرہ شامل تھیں۔ مارچ ۱۹۳۷ء کے ختم تک برطانوی ہند میں ہر قسم کی موٹر گاڑیوں کی مجموعی تعداد ۱۴۵۶۳ تھی جس میں ۴۱۹۰۴ لاریاں، بسیں وغیرہ شامل تھیں۔ ملاحظہ ہو ایک رپورٹ موسوم بہ "تبصرہ بر تجارت ہند" (برائے ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء) صفحہ ۶۰ تا صفحہ ۶۲۔

(۱) آیا ہندوستان میں سڑکوں کے نظام کو ترقی دینا مناسب ہے یا نہیں؛۔

(۲) اس ترقی کی اسکیم کو مالی مدد دینے کا سب سے موزوں طریقہ کیا ہے؛ اور

(۳) مرکزی اور صوبائی کاموں کی تقسیم کا مناسب لحاظ کرنے کے بعد ایک مرکزی شارعی مجلس قایم کر کے سڑکوں کی ترقی کو مربوط کیا جائے' سڑکوں کے بارے میں تحقیقات کی جائے اور سڑکیں تیار کی جائیں۔

۴۳۔ سڑکوں کی مالیات۔ جیسا کہ ہندوستانی سڑکوں کی ترقی کی کمیٹی نے کہا ہے' "ہندوستان میں سڑکوں کی ترقی کا معاملہ مقامی حکومتوں اور مقامی جماعتوں کی مالی حیثیت سے تجاوز کرتا جا رہا ہے اور قومی اہمیت حاصل کر رہا ہے جس کے مصارف کو مرکزی حکومت کی آمدنی ہی سے پورا کرنا کسی حد تک مناسب ہوگا"۔ مرکزی حکومت کی آمدنی میں سڑکوں کو ترقی دینے سے اضافہ ہوتا ہے' صرف اسی لحاظ سے نہیں کہ ریلوں سے زیادہ آمدنی وصول ہوتی ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ موٹروں اور موٹر کے تیلوں کا استعمال تیزی سے بڑھ رہا ہے اور ان سے محصول اور چنگی کی آمدنی وصول ہوتی ہے[1]۔ موٹروں کے ٹیکس کی ایک متوازن تجویز میں موٹروں کے تیل کا محصول' موٹروں کا محصول' اور کرایے کی موٹروں کے اجازت نامے کی فیس شامل ہونی چاہیے اور

[1] اندازہ کیا گیا ہے کہ حکومت کو موٹروں کی نقل و حمل سے ٹیکس کی شکل میں ۸ کروڑ ۳۰ لاکھ روپیہ وصول ہوتا ہے جس کے منجملہ ایک کروڑ ۸۰ روپیہ سڑکوں کی ترقی کی مد میں پٹرول پر لگائے ہوئے ٹیکس سے جمع ہوتا ہے' ۴ کروڑ ۳۰ لاکھ روپیہ مرکزی حکومت کو بطور آمدنی وصول ہوتا ہے اور تین کروڑ روپیہ صوبائی' ریاستی اور مقامی حکومتوں کو آمدنی کے طور پر ملتا ہے۔

ان کے ماحصل کو سڑکوں کی ترقی پر صرف کرنا چاہیئے۔ یہ مشورہ دیا گیا ہے
کہ سڑکوں کی از سرنو درجہ بندی کرنی چاہیئے تاکہ بعض مقامی سڑکوں کو
شاہراہوں میں تبدیل کیا جا سکے اور اس طرح مقامی جماعتوں پر جو بار
پڑ رہا ہے اس کو کم کیا جائے اور ان کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ
معاون سڑکوں پر اور خالص مقامی اہمیت کی سڑکوں پر زیادہ توجہ
دے سکیں۔ جیسا کہ سڑک کمیٹی نے بتلایا ہے، یہ امر تمام دنیا میں
۲۰۹ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ شاہراہوں کی اصلاح و ترقی کے مصارف
کا بار حکومت کی چھوٹی اکائیوں پر ڈالنا سخت ناانصافی ہے۔ مقامی
جماعتیں اس بات کی بھی طالب ہیں کہ انھیں صوبائی فنڈ سے مالی
امداد زیادہ کشادہ دلی کے ساتھ دی جائے۔ سڑک کمیٹی نے جو
مذکورۂ بالا سفارشیں کی ہیں ان کو اختیار کرنے سے دیہی سڑکوں کو
بالواسطہ فائدہ پہنچے گا اور وہ صوبائی آمدنی اور مقامی فنڈ واگذاشت
ہو جائے گا جس کو اس وقت موٹری نقل وحمل کی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے
شاہراہوں پر خرچ کیا جا رہا ہے۔ سڑک کمیٹی اس خیال پر بھی زور دیتی
ہے کہ ریلوے نظم و نسق کو چاہیئے کہ معاون سڑکوں کی تیاری اور نگہداشت
کے مصارف میں کچھ حصہ لے۔ کمیٹی اس بات کی مخالف ہے کہ کسی
سواری پر بجز پلوں کے جہاں ناو کے ذریعے یا پیادہ پا ندی کو عبور
کرنے کی زحمت سے بچانے کے لیے ایک قطعی خدمت مہیا کی جاتی
ہے، تہ بازاری یا محصول سڑک عائد کیا جائے؛ اس لیے کہ اس
قسم کا محصول سڑکوں کے تیز رفتار وسائل نقل وحمل کے راستے میں
رکاوٹ پیدا کرے گا اور ہر قسم کی آمد و رفت کے حق میں باعث
زحمت بن جائے گا۔ جہاں ضرورت ہو وہاں ان محصولوں کے
بجائے کم تکلیف دہ محصول لگانا چاہیئے۔ زرعی کمیشن نے یہ سفارش
کی ہے کہ دیہی برادری کی اجتماعی محنت کے قدیم طریق کی تجدید کی جائے
اور اس کو حکومت کی طرف سے مالی امداد مل سکتی ہے بہ شرطیکہ وہ

اپنے ذمے کا کام کرنے کے لیے تیار ہو۔

اب یہ غور کرنا باقی رہ جاتا ہے کہ سڑکوں کو ترقی دینے کے لیے قرضوں کے ذریعے سے کام چلانا کس حد تک مناسب ہوگا۔ زرعی کمیشن یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ سڑکوں کے پروگراموں کے مصارف کے لیے محض حکومت کی چالو آمدنی پر انحصار کرنے کے بجائے قرضے حاصل کئے جائیں تو سڑکوں کو ترقی دینے کی پالیسی پر بہت بہتر طریق پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ کمیشن یہ خیال کرتا ہے کہ سڑکوں اور ان کے متعلقہ کاموں کی نیم دوامی نوعیت کے مد نظر اس غرض سے حاصل کئے ہوئے صوبائی قرضوں کی بے باقی کے لیے جو رقم سالانہ مطلوب ہوگی وہ صوبے کے ذرایع پر مقامی دیہی سڑکوں کی نگہداشت کے لیے بھاری مطالبہ ثابت نہ ہوگی[1]۔ سڑک کمیٹی یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ اس امر کا فیصلہ کہ آیا ایسے قرضے حاصل کرنا مناسب ہے یا نہیں ہر مقامی حکومت کو اپنے حالات کے لحاظ سے اپنے طور پر کرنا چاہیئے۔ کمیٹی اس بات کی مخالف ہے کہ سڑکوں کی توسیع کی بڑی تجاویز کی مالی امداد قرضوں کے ذریعے سے کی جائے، اس لیے کہ ان قرضوں کی بے باقی کے لیے صوبائی آمدنی کو طویل مدت کے لیے وقف کردینا پڑے گا اور دوسری طرف ممکن ہے کہ حکومت کے دوسرے شعبے جو اس معاملے کے مساوی اہم ہوں امداد سے محروم رہ جائیں۔ کمیٹی یہ سفارش کرتی ہے کہ قرضوں سے صرف سڑکوں کی تیاری اور مکرر تیاری کے لیے مالی امداد لینی چاہیئے اور یہ قرضے چھوٹی مدت کے لیے لینے چاہییں؛ ایک آمدنی واضح طور پر پیش نظر ہونی چاہیے تاکہ نہ صرف سود اور استغراقی فنڈ کے مطالبات کو بلکہ سڑک تیار کرنے کے بعد اس کی نگہداشت کے مصارف کو بھی

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۳۰۶۔

پورا کیا جاسکے؛ اور یہ قرضے لے کر جو سڑکیں تیار کی جائیں وہ صرف پورے پروجیکٹ کے زیادہ مستقل اجزا مثلاً پلوں تک محدود ہونے چاہییں، اس لیے کہ اول تو ان کی عمر کا اندازہ استغراقی فنڈ کے حساب کے لیے اچھی خاصی صحت کے ساتھ کیا جاسکتا ہے اور دوسری طرف ان کی نگہداشت کے مصارف کم ہوتے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۴ء کی سڑک و ریل
ص ۲۱۰ کانفرنس نے یہ سفارش کی کہ ایک جامع خاکہ مرتب کیا جائے تاکہ قرضے کے فنڈ سے ان مالی ذرائع کے حدود کے اندر جو مرمت کے لیے دستیاب ہوسکیں، شاہراہوں اور ذیلی سڑکوں کی ترقی کے امکان کو جانچا جاسکے (دیکھو فصل ۳۷)۔

۳۵۔ سڑکوں کے بارے میں جدید پالیسی۔ سڑک کمیٹی کی اہم سفارش کے مطابق قانون مالیۂ ہند بابت مارچ سنہ ۱۹۲۹ء کی رو سے موٹر کے تیلوں پر محصول درآمد اور چنگی ۴ آنہ فی گیلن سے ۶ آنہ فی گیلن تک بڑھا دی گئی۔ چنانچہ اس مد سے سنہ ۱۹۲۹ء تا سنہ ۱۹۳۳ء میں ۹۴ لاکھ روپے کی زائد آمدنی وصول ہوئی۔ سڑک کانفرنس کے مباحث کے فقرہ (۷۰) تا فقرہ (۷۹) میں جو سفارشیں درج ہیں ان کے مطابق سر بی۔ ایل۔ مترنے مجلس قانون ساز میں ۱۱ ستمبر سنہ ۱۹۲۹ء کو ایک تحریک پیش کی۔ اس تحریک میں جو قاعدہ تجویز کیا گیا اس کی اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں:-

(۱) سڑکوں کے لائحۂ عمل میں تسلسل کو یقینی بنانے کے لیے موٹر کے تیل پر جتنا محصول بڑھایا گیا تھا اس کو ابتداءً ۵ سال تک برقرار رکھا جائے۔

(۲) اس مدت میں زائد محصول کا ماحصل سڑکوں کی ترقی پر خرچ کرنے کے لیے یکمشت منظور کیا جائے، اس ماحصل کو سڑکوں کی ترقی کی ایک جداگانہ مد میں جمع کیا جائے اور اس میں سے جو رقم خرچ ہونے سے بچ رہے اس کے استعمال کا حق مالی سال کے ختم پر

سوختہ نہ کیا جائے۔

(۳) سالانہ منظورہ رقم کو حسب ذیل طریق پر تقسیم کیا جائے:-

(۱) حکومت ہند اس کا ۱۰ فی صد ۳۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو ختم ہونے والے دو سال کے لیے بطور سرمایہ محفوظ اپنے پاس رکھے گی اور اس کے بعد صورت حال کی مکرر تحقیقات کی جائے گی۔ اس سرمائیہ محفوظ سے ایسی صورتوں میں خاص رقمی منظوریاں دی جاسکیں گی جن میں کسی سبب سے خاص امداد کی ضرورت ہو، مثلاً ایسی تجاویز کے لیے جو مقامی حکومتوں کے ذرایع سے باہر ہوں یا ایسی تجاویز کے لیے جو ایک ریاست یا ایک صوبے سے زیادہ کے متعلق ہوں یا کسی صوبے یا ریاست کی سرحد پر دریا کا پل بنانے کے لیے۔

(ب) جو کچھ باقی بچے اس میں سے ایک حصہ تمام صوبوں میں اس تناسب سے تقسیم کیا جائے گا جو سابقہ تقویمی سال میں ہر صوبے کے پٹرول کے صرف اور ہندوستان کے پٹرول کے مجموعی صرف کے درمیان ہوگا؛ اور دوسرے چھوٹے صوبوں، برطانوی نظم ونسق کے علاقوں، اور ہندوستانی ریاستوں میں جو پٹرول صرف ہوگا اس کے تناسب رقم یکمشت حکومت ہند کو دی جائے گی۔

(۴) بجز بریں ہر صوبے کو ایسی تجویزوں پر خرچ کرنے کے لیے منظورہ رقمیں دی جائیں گی جن کو گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل سڑکوں کی مجلس قائمہ کے مشورے سے منظور کریں۔

(۵) ہر سال سڑکوں کے لیے ایک مجلس قائمہ بنائی جائیگی اور وہ ہندوستانی مقننہ کے دونوں ایوانوں کے بعض منتخبہ اور نامزد کردہ ارکان پر مشتمل ہوگی۔ اس مجلس کا صدر نشیں گورنر جنرل کی مجلس انتظامی کا وہ رکن ہوگا جس کے تفویض محکمۂ سڑکوں کا محکمہ ہوگا۔ یہ مجلس گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو ان تمام امور میں مشورہ دے گی جو سڑکوں کے متعلق معاملات، سڑکوں کی مرکزی تحقیقات اور میعادی سڑک کانفرسوں کی

کارروائیوں کے بارے میں حکومت ہند کی طرف سے اختیار کیے جانے والے طریق عمل کے متعلق ہوں گے۔

صدا۲۱ (ج) وہ تمام تجاویز جو سالانہ منظورہ رقم یا اس کی جمع شدہ فاضلات سے صرف کرنے کے بارے میں ہوں گی منظوری کے لیے مالیہ کی ذیلی کمیٹی میں پیش کی جائیں گی جو سڑکوں کی مجلس قائمہ کے صدر نشین اور اس کے ان ارکان پر مشتمل ہوگی جو مجلس قانون ساز کے بھی رکن ہوں گے۔

اس قاعدے کو مجلس قانون ساز نے اپنے دہلی کے اجلاس (فروری تا مارچ ۱۹۳۰ئ) میں پانچ سال کے لیے منظور کر لیا۔

سڑک کمیٹی اس سفارش کی مخالفت کرتی ہے کہ ایک مرکزی سڑک بورڈ قایم کیا جائے جس کو ایک علحدہ سڑک فنڈ کا انتظام کرنے کی غرض سے عاملانہ اختیارات دئے جائیں۔ یہ کمیٹی اس امر کے بھی خلاف ہے کہ ایک علحدہ مرکزی محکمۂ سڑک قائم کیا جائے۔ اس لیے کہ اس کا وجود غیر ضروری ہوگا اور وہ مقامی حکومتوں کے معاملات میں بے جا دست اندازی کرے گا۔ ضروری تعاون کو موثر بنانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ حکومت ہند اور مقامی حکومتوں کے نمایندوں کی ایک میعادی سڑک کانفرنس طلب کی جائے جو مشترکہ دلچسپی کے معاملات پر تبادلۂ خیالات کرنے کی غرض سے وقتاً فوقتاً اپنے اجلاس منعقد کرے۔ کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ حکومت ہند کے تحت ایک انجینیر سڑک مقرر کیا جائے اور یہی عہدہ دار سڑک کانفرنس کے معتمد کی حیثیت سے بھی کام کرے۔ حکومت ہند سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ اکورتھ ریلوے کمیٹی اور انچ کیپ تخفیف مصارف کمیٹی کی اس سفارش پر مکرر غور کیا جائے جو سڑکوں اور ریلوں کی ترقی کے بارے میں ایک ہی قسم کی پالیسی کو یقینی بنانے کے لیے ایک مرکزی محکمہ رسل و رسائل قایم کرنے کے حق میں پیش کی گئی

ہے[1]۔ اس سفارش کو عملی جامہ نومبر ۱۹۳۷ئہ میں پہنایا گیا جب کہ حکومت ہند کے محکمہ جات کی ترتیب میں رد و بدل ہوا۔ چنانچہ ایک جدید محکمۂ رسل و رسائل ایک جدید رکن رسل و رسائل کے تفویض کیا گیا ہے اور اس میں ریلیں، ڈاک اور تار، سیول طیارہ رانی، لاسلکی نشر، موسمیات، سڑک، بندرگاہ اور اندرونی جہاز رانی کے محکمے شامل ہیں۔

۳۶۔ سڑکوں کے مالیے کی صورت حال

سڑکوں کی ترقی کی مد میں ابتدائی پانچ سال کے لیے جو مجموعی آمدنی وصول ہوئی اس کی مقدار ۵ کروڑ ۸۱ لاکھ روپے تھی۔ اس مد میں ۳۰ ستمبر ۱۹۳۳ئہ تک جو حقیقی آمدنی سال ختم ہونے سے پیشتر جمع کی گئی اس کی مقدار کم و بیش ۴ کروڑ ۷۰ لاکھ روپے تھی۔ اس میں سے سرمایۂ محفوظ کے طور پر ۱۰ فی صد مہیا کرنے کے بعد جو فاضلات تقسیم کے لیے بچے ان کی مقدار ۴ کروڑ ۱۴ لاکھ روپے تھی۔ اس رقم کے منجملہ ۳ کروڑ ۴۴ لاکھ روپے دس گورنروں کے صوبوں میں تقسیم کئے گئے۔ لیکن مختلف صوبوں کو انفرادی طور پر مختلف رقمیں ملیں، مثلاً بمبئی کو ۵۷ لاکھ روپے تو مدراس اور بنگال کو ۶۰-۶۰ لاکھ روپے، اور آسام کو ۹ لاکھ روپے تو شمال مغربی صوبۂ سرحد کو ۸ لاکھ روپے۔ برما کو خارج کرکے نو صوبوں کے کل مصارف کی مقدار قریب قریب ۱ کروڑ ۹۲ لاکھ روپے رہی۔ علاوہ ازیں اس وقت کی مالی حالت کی وجہ سے پانچ صوبوں کی حکومتوں کو اس بات کی اجازت دی گئی کہ اپنے حصے کی مد میں سے تقریباً ۵۵ لاکھ روپے بطور قرض حاصل کریں۔ جو رقم صرف نہیں ہوئی اور بچ رہی یعنی ۹۷ لاکھ روپے اس کو بطور پیشں آورد رکھا گیا۔ سرمایۂ محفوظ میں سے ۵ لاکھ روپے سڑکوں کے صد۱۲

[1] ملاحظہ ہو سڑکوں کی ترقی کی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۷، ۸ تا ۹۰۔

تجربوں اور تحقیق پر صرف کرنے کے لیے الگ رکھ دیا گیا۔ سڑک فنڈ کے لیے جو رقمیں مختص کی گئیں ان کی مقدار سنہ ۱۹۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء میں ۱ کروڑ ۵۹ لاکھ روپے، سنہ ۱۹۳۵ء تا سنہ ۱۹۳۶ء میں ایک کروڑ ۲۹ لاکھ روپے سنہ ۱۹۳۶ء تا سنہ ۱۹۳۷ء میں بعد نظر ثانی ۱ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے اور سنہ ۱۹۳۷ء تا سنہ ۱۹۳۸ء کے بجٹ میں ۱ کروڑ ۴۱ لاکھ روپے تھی۔

۳۷۔ سڑکوں کے بارے میں نئی تجاویز۔

(۱) سڑکوں کی آمد و خرچ کا حساب کتاب کرنے کے لیے ۵ سال کی جو آزمائشی مدت پہلی دفع منظور کی گئی تھی وہ سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء میں ختم ہو گئی۔ صوبائی حکومتوں سے مشورہ کرنے کے بعد سڑک و ریل کانفرنس نے جو سفارش کی تھی اس کے مطابق ایک نئی تحریک سڑکوں کے حساب و کتاب کی تنظیم کے متعلق مرکزی مقننہ میں اپریل سنہ ۱۹۳۴ء میں منظور ہوئی[۱] اور اس کی رو سے سڑکوں کی آمد و خرچ کا حساب کم و بیش مستقل بنیاد پر قایم ہو گیا۔ اس کی وجہ سے وہ سرمایۂ محفوظ جو حکومت ہند کی نگرانی میں رہتا تھا ۱۰ فی صد سے بڑھ کر ۱۵ فی صد ہو گیا، اور حکومت اس قابل ہو گئی کہ کم ترقی یافتہ صوبوں کے ساتھ زیادہ فیاضانہ سلوک کرے۔ اس تحریک کی رو سے سڑکوں کی ترقی کے لیے اور خاص صورتوں میں سرمایۂ محفوظ سے یا قرضوں سے بنائی ہوئی سڑکوں کی نگہداشت و نگرانی کے مصارف کے لیے قرضوں کے حاصل کرنے کا مجاز کیا گیا اور ایسے قرضے فرد حساب کی ایک جائز مد بن گئے

(۲) نقل و حمل کی مشاورتی مجلس کی سفارش کی بنا پر سڑک فنڈ سے صوبوں کو رقمی منظوری دینے کے متعلق ایک جدید تحریک مرکزی مجلس قانون ساز میں فروری سنہ ۱۹۳۷ء میں منظور ہوئی۔ اس کی رو سے حسب ذیل اہم تبدیلیاں ہوئیں:-

[۱] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "ہندوستان سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء میں" صفحہ ۱۱۱۔

(الف) گورنروں کے صوبوں میں خرچ کرنے کے لیے جو حصے دئے گئے تھے وہ آیندہ سے گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی تحویل میں دیدئے گئے تا آنکہ ان کی حقیقت میں ضرورت پیش آئے اور اس طرح صوبوں میں اس روپے کا بروقت خرچ یقینی ہو گیا جو ان کے تفویض کیا جائے۔

(ب) مرکزی حکومت کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس رقم کے کل یا جزو پر جو اس کے پاس کسی صوبے میں خرچ کرنے کے لیے موجود ہو اس صورت میں دوبارہ قبضہ کر سکتی تھی جبکہ یہ صوبہ کسی معقول سبب کے بغیر سڑک فنڈ کے اپنے حصے کو سڑکوں کی ترقی کیلئے خرچ کرنے میں تساہل کرے۔

(ج) لیکن اہم ترین تبدیلی اس فقرے سے پیدا ہوتی ہے جس کی رو سے گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو مجاز کیا گیا ہے کہ وہ متعلقہ صوبے کے حصے پر اس صورت میں قبضہ کر لے جبکہ یہ صوبہ ان تدابیر پر عمل پیرا ہونے سے قاصر رہے جن کی سفارش گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل اس صوبے کے اندر موٹر گاڑیوں کی نگرانی اور تنظیم کی غرض سے کریں۔ اس آخری شرط نے شدید قیل وقال پیدا کر دی، اور اس کے خلاف تمام صوبے غم وغصہ کا اظہار اس بنا پر کر رہے ہیں کہ یہ مرکزی حکومت کی طرف سے ان کی سڑکوں کی پالیسی میں ناجائز مداخلت ہے جو ریلوں کی مالی حالت کو محفوظ بنانے کے لیے کی جارہی ہے۔ سر فرانک نائس نے مرکزی حکومت کی تائید میں جواب دیتے ہوئے یہ استدلال کیا کہ سڑک فنڈ سے منظوریاں دیتے وقت شرائط عائد کرنا اور صوبوں کو من مانے طور پر رقم خرچ کرنے سے روکنا غیر منصفانہ نہ تھا۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ رسل ورسائل کے نظام میں توازن پیدا کیا جائے۔[1] صلا ۲

[1] جیسا کہ سر جیمس گرگ نے بتلایا، حکومت کے لیے یہ بات بالکل ناممکن تھی کہ ریلوں پر ۔۔۔ کروڑ

(۵) ابتدائی تحریک کی وہ شرط جس کی رو سے سڑکوں کے واسطے حاصل کئے ہوئے قرضوں اور ان کے مصارف کو پورا کرنے کے لیے سڑک فنڈ کو استعمال کرنے کی اجازت دی گئی تھی، موجودہ پابندیوں کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر اس امر کے مدنظر اب ترک کر دی گئی کہ صوبہ وار خود مختاری کا آغاز قریب الوقوع ہے۔

گو سڑک فنڈ کے بارے میں اس آخری شرط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت اور صوبوں کے درمیان تصادم کا امکان ہے، لیکن کوئی بڑا اختلاف لازمی طور پر رونما نہ ہوگا، اس لیے کہ سراٹونیمیر کی خوش سلیقگی سے مرتب کی ہوئی مالی تجویز کے تحت صوبوں کو اس امر سے دلچسپی ہے کہ ریلوں کی مالی حالت اچھی رہے اور وہ ایسی تدابیر اختیار کرنے کی طرف مائل ہیں کہ موٹری نقل وحمل ریلوں کی آمدنی کو شدید نقصان نہ پہنچانے پائے۔ (دیکھو باب ۱۱)۔

دریائی نقل وحمل

۳۸۔ ملک کے اندر جہاز رانی کے قابل دریا

ہندوستان کی حد تک دریائی نقل وحمل کے موضوع کی بحث کو آسانی کے ساتھ دو علیحدہ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:-

(۱) اندرونی دریائی راستے۔

(۲) بحری نقل وحمل۔

قدرت نے ہندوستان کو دریاؤں کے بارے میں اس درجہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: روپے کا سرمایہ مصروف رکھتے ہوئے حریف وسائل نقل وحمل کو غیر مشروط طور پر مالی امداد دیتی۔

سہولتیں عطا نہیں کی ہیں جیسی کہ انگلستان کو حاصل ہیں۔ انگلستان میں دریا جہاز رانی کے قدرتی راستے ہیں۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ شمالی ہند اور جزیرہ نمائے ہند کے دریاؤں کے درمیان اس اعتبار سے تضاد پایا جاتا ہے[1]۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شمالی ہندوستان کے بڑے دریاؤں میں ۲۶۰۰ میل طویل جہاز رانی کے قابل آبی راستے ہیں۔ دریائے سندھ گنگا، برہم پتر اور راوی سال بھر یا سال کے بڑے حصے میں جہاز رانی کے قابل رہتے ہیں۔ چنانچہ ان دریاؤں کے دہانوں کے اوپر یا ان کے ڈیلٹاؤں سے نکلی ہوئی نہروں پر ہزاروں میل تک کشتیاں اور جہاز چل سکتے ہیں۔ مثلاً دریائے سندھ ڈیرہ اسماعیل خاں تک جو شمال مغربی سرحدی صوبے میں دہانے سے ۸۰۰ میل دور واقع ہے، سال کے بارہ مہینے جہاز رانی کے قابل ہے۔ دریائے سندھ کی شاخیں، چناب اور ستلج، تمام سال چھوٹی کشتیوں کے لیے کھلی رہتی ہیں۔ قلیلی اور مشرقی نارا کی نہروں کو دریائے سندھ کی قابل جہاز رانی شاخیں خیال کیا جا سکتا ہے۔ گنگا میں اس کے دہانے سے کانپور تک جہاز چل سکتے ہیں اور اسٹیمر گھاگرا میں داخل ہو کر فیض آباد تک جاتے ہیں۔ لیکن ریلوں کی آمد و رفت کی ترقی کی وجہ سے دریائے سندھ اور گنگا کے بالائی حصے میں دخانی جہازوں کا سفر بہت کم ہو گیا ہے۔ برہم پتر میں ڈبرو گڑھ تک دخانی جہاز جا سکتے ہیں اور اس کے معاون سورما میں سلہٹ اور کچھار تک دخانی جہازوں کی آمد و رفت ہے۔ ہوگلی تمام سال ندیا تک اور اس سے اوپر کے حصے میں جولائی سے اکتوبر تک جہاز رانی کے قابل ہے۔

صفحہ ۲۱۴ لیکن جزیرہ نمائے ہند کے دریا جہاز رانی کے قابل نہیں ہیں۔ موسموں کے اعتبار سے یہ دریا یا تو تیز دھارے کے ساتھ بہتے ہیں یا

---

[1] ملاحظہ ہو جلد اول باب ۲ فصل ۱۰۔

پانی کم ہو جانے سے اُجاڑ ریت اور عمیق پہاڑیوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے چشموں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے کشتیوں اور جہازوں کی آمد ورفت ناقابل عمل ہو جاتی ہے۔ نربدا اور تاپتی جیسے بعض دریاؤں کی چٹانی تہ اور ان کے تیز رو سیلاب، جہاز رانی کے لیے انتہائی رکاوٹ ہیں۔ مہاندی، گوداوری اور کرشنا اپنے مخرج کے قریب بیشک قابل جہاز رانی ہیں، لیکن جہازوں کی آمد ورفت بہت زیادہ نہیں ہے۔

ملک میں دریائی آمد ورفت کی ان محدود سہولتوں کے علاوہ، اطراف میں تمام ساحل پر بیشمار چھوٹی ندیاں، درے اور رکھاڑیاں موجود ہیں جو آبی نقل وحمل کی سہولتیں مہیا کرتی ہیں۔ چنانچہ ملک کے باشندے چھوٹی کشتیوں اور ناؤ کے ذریعے سے ان سے پوری طرح فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ ان سہولتوں سے قطع نظر اندرونی جہاز رانی صرف ان بڑے دریاؤں کی وادیوں اور ڈلٹاؤں تک محدود ہے جو ملک کی قدرتی دریائی شاہراہیں ہیں۔

قدیم زمانے میں اندرونی جہاز رانی سے بڑی حد تک کام لیا جاتا تھا۔ چنانچہ موریہ راجاؤں اور مغل شہنشاہوں کے زمانے میں دریائی آمد ورفت بہت کافی تھی۔ مثلاً گنگا تجارت کی بہت بڑی قدرتی شاہراہ تھی اور اس کے کنارے کئی شہر آباد تھے، جیسے کہ مرزاپور جو وسطی ہندوستان اور بنگال کے درمیان ایک بڑا تجارتی مرکز تھا۔ لیکن ریلوں کی آمد اندرونی جہاز رانی کے حق میں ایک رکاوٹ بن گئی جیسا کہ صنعتی کمیشن نے بتلایا ہے، "موجودہ دریائی راستوں کے کسی نمایندے کی عدم موجودگی میں جو ان کے اغراض کی رکھوالی کرتا، ریلوں کے حقوق قائمہ نے ہندوستان کے دریائی راستوں پر ویسی توجہ مبذول نہ ہونے دی جیسی کہ دوسرے ملکوں میں اطمینان بخش نتائج کے ساتھ مبذول

کی جارہی ہے[1]۔ اکورتھ کمیٹی بھی اس خیال کا اعادہ کرتی ہے کہ دریائی راستوں کو ریلوں کی غیر منصفانہ مسابقت سے نقصان پہنچا - چنانچہ کمیٹی اپنے استدلال کی تائید میں بمبئی کے دریائی بندرگاہ برنچ اور مدراس کی نہر بکنگھم کی مثال پیش کرتی ہے - ایک زمانے میں قابل جہاز رانی نہروں کی موافقت میں کافی آواز بلند کی گئی[2]۔ سر آرتھر کاٹن نے جو "عظیم الشان کارہائے کاویری و گوداوری کے معمار" تھے قابل جہاز رانی نہروں کی ایک حوصلہ مندانہ تجویز تیار کی؛ اور یہ تجویز ۱۸۷۲ء میں ایک پارلیمانی کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی۔ سر آرتھر نے یہ دلیل پیش کی کہ ہندوستان کے لیے آبی نقل وحمل کی سہولتوں کا مہیا کرنا ریلوں کے مقابلے میں زیادہ موزوں اور کم خرچ ہے - کیونکہ اس زمانے میں ریلیں بری طرح ناکام ثابت ہوتی معلوم ہو رہی تھیں۔ سر آرتھر نے نہروں کا ایک مزید فائدہ یہ بتلایا کہ ان سے بعض اوقات آب پاشی کا کام بھی لیا جاسکتا تھا۔ سر آرتھر نے جہاز رانی کی جن اہم لائینوں کی سفارش کی وہ حسب ذیل تھیں:-

"(۱) کلکتہ تا کراچی گنگا کے بالائی حصے اور دریائے سندھ کے زیریں حصے تک۔ صفحہ ۲۱۵

(۲) کوکناڈا تا سورت گوداوری کے بالائی حصے اور تاپتی کے زیریں حصے تک۔

(۳) ایک لائین تنگبھدرا کے بالائی حصے تک جو کردار تک بحر عرب میں چلی جائے۔

(۴) ایک لائین پال گھاٹ اور کوئمبتور سے ہوتے ہوئے پونا نگ تک"۔ سر آرتھر نے اندازہ لگایا تھا کہ ان سب ضروری قابل

---

[1] ہندوستانی صنعتی کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۲۷۹۔

[2] دیکھو دت کی کتاب محولۂ بالا ص ۳۶۰ تا ص ۳۷۷۔

جہاز رانی نہروں کی تیاری کی لاگت ۳ کروڑ پونڈ کے سرمایے سے زائد نہ ہوگی۔ لیکن یہ گوارا کر لیا گیا کہ یہ تجویز ختم کر دی جائے، اس لیے کہ یہ بھاری خرچ عائد کرتی تھی، اور اس سے بڑھ کر اس لیے کہ انگریزوں کے لیے اس بات کا سمجھنا دشوار تھا کہ ہندوستان کے لیے نہریں کتنی اہمیت رکھتی تھیں اور انگلستان کے تجربے کے لحاظ سے اس صورت حال کے بارے میں فیصلہ ریلوں ہی کے حق میں ہو سکتا تھا۔ ہندوستان میں ریلوں کی جانب سے جو مخالفت کی گئی وہ بھی ایک قابل لحاظ عنصر تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ نقل وحمل اور آب پاشی کے دوہرے مقصد کو ایک ساتھ پورا کرنے یا محض نقل وحمل کی غرض سے قابل جہاز رانی نہروں کو تیار کرنا ایک زمانے میں خاص طور پر جبکہ ریلوں میں گھاٹا آرہا تھا دلکش معلوم ہوا۔ لیکن حالات کے پلٹا کھاتے ہی جبکہ موجودہ صدی کی ابتدا میں ریلوں سے منافعہ ملنے لگا نہروں کے حق میں یہ جوش وخروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ آج کل جہاز رانی کے قابل نہریں صرف چند ہی ہیں، مثلاً ہردوار سے کانپور تک نہر گنگا اور مدراس میں شرقی ساحل کے متوازی نہر بکنگھم۔ آب پاشی کی کئی نہریں جن کا ذکر کیا جا چکا ہے نقل وحمل کے لیے بڑی حد تک غیر موزوں ہیں۔ ان دونوں قسموں کی نہروں کو بخوبی یکجا نہیں کیا جا سکتا۔ عام طور پر دیکھا جائے تو جہاز رانی کو پانی کی رسد کی کمی کے زمانے میں آب پاشی کو نقصان پہنچائے بغیر برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ علاوہ ازیں آب پاشی کی نہریں عام طور پر کم گہری اور چکردار ہوتی ہیں اور کم آبادی کے دیہی علاقوں میں سے زراعت کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بہتی ہیں۔ اس کے برخلاف جہاز رانی کا صنعتی وتجارتی مرکزوں میں سے گزرنا ضروری ہے تاکہ کاروبار کافی مقدار میں ان کی طرف کھنچ کر آئے۔ لیکن بنگال، اڑیسہ، سندھ اور مدراس کے ڈلٹائی علاقوں میں حالات زیادہ موافق ہیں۔ خاص کر مشرقی بنگال میں اس بات کی خاصی بڑی گنجائش ہے کہ نہروں

کو ایک دوسرے سے ملایا جائے تاکہ اس حصۂ ملک کے عظیم الشان دریائی نظام کو جہاز رانی کی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے اصلاح و ترقی دی جاسکے۔

ہندوستان میں اندرونی جہاز رانی کی قدرتی حد بندیوں اور رکاوٹوں کے باوجود "موجودہ" دریائی راستوں میں اب بھی اصلاح و ترقی کی کچھ گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ صنعتی کمیشن یہ سفارش کرتا ہے کہ حکومت ہند کو چاہیے کہ اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لے اور اس کا انتظام کرے کہ ریلوں اور دریائی راستوں کے نظم ونسق ملک کے ان علاقوں میں ہم آہنگی کے ساتھ کام کریں جن کی یہ دونوں مل کر خدمت انجام دیتے ہیں اور یہ کہ دریائی راستوں کا محکمہ قائم کرنے کی تجویز پر احتیاط کے ساتھ توجہ دی جائے[۵۱]۔ اگر اندرونی دریائی راستوں کو مناسب ترقی دی جائے تو اس کی وجہ سے ریلوں پر یورش کم ہو جائے گی اور ملک میں چھوٹے پیمانے کی نقل وحمل کی ضرورتیں پوری ہوں گی۔ یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ آب پاشی کی کم از کم بعض نہروں کو جہاز رانی کی ضرورتوں کے مطابق بنا لیا جائے[۵۲]۔ صد ۲۱۶

۳۹۔ (۲) بحری نقل وحمل۔ خارجی آبی نقل وحمل کی حد تک گو ہندوستان کو انگلستان کی طرح آسانیاں حاصل نہیں ہیں مثلاً انگلستان کا ساحل دندانہ دار ہے اور وہاں قدرتی بندرگاہیں پھر بھی ہندوستان کو ایک بڑا بحری ساحل رکھنے کی حیثیت سے

۵۱؎ صنعتی کمیشن کی رپورٹ، فقرہ ۲۷۹۔

۵۲؎ مجلس قانون ساز میں مسٹر نیوگی نے جنوری ۱۹۱۷ء میں یہ تحریک پیش کی کہ اندرون ملک کے دخانی جہازوں کے قانون میں ترمیم کرنے کی غرض سے ایک مسودۂ قانون پر غور کیا جائے۔ مرحمہ قانون کی رو سے جس کو مجلس قانون ساز نے منظور کیا اور حکومت نے مان لیا، یہ کوشش کی گئی کہ بیش ترین اور کم ترین شرحیں مقرر کرکے ہندوستان کے اندرونی حصے میں دریائی نقل وحمل کو ترقی دی جائے۔

بہت اہمیت حاصل ہے۔ جیسا کہ 'یس' ان' حاجی نے خیال ظاہر کیا ہے' جو ملک' قدیم دنیا کے وسیع براعظموں میں ایک آویزہ کی طرح لگا ہوا ہو جس کے ساحلی خط کا طول . . . ۲۰۰۰ میل ہو اور جو بہت ہی مفید قسم کی بیشمار اشیا پیدا کرتا ہو جیسی کہ دوسری جگہ عمدگی اور مقدار کے اعتبار سے نہیں پیدا ہوتیں' وہ قدرتی طور پر جہاز رانی کرنے والا ملک ہوگا۔ ہندوستان میں بندرگاہ بلحاظ تعداد اور وسعت کافی ہیں جن سے اس ملک کی پیداوار کی بہت سی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں[1]۔

اس عبارت میں واقعے کو غالباً حد سے زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے اور اس بات پر کافی زور نہیں دیا گیا ہے کہ ہندوستان میں قدرتی بندرگاہوں کی کمی ہے۔ اس کے علاوہ' جیسا کہ پہلے بتلایا جا چکا ہے' چونکہ ہندوستان کا ساحل بہت بڑا ہے اور اس ملک کا محل وقوع باقی دنیا کے مقابلے میں بہت ہی موافق ہے' اس لیے وہ دنیا کے تجارت کرنے والے بڑے ملکوں میں سے ایک بن سکتا ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل تک ہندوستان کو بحری جہاز رانی کرنے والا ایک بڑا ملک کہا جا سکتا تھا۔ "ہندوستان میں جہاز سازی کی حالت ایسی اچھی تھی کہ جو جہاز بنائے جا سکتے اور بنائے جاتے تھے وہ برطانوی ساخت کے جہازوں اور برطانوی جنگی جہازوں کے ساتھ دریائے ٹیمز تک سفر کرتے تھے۔ ۱۸۰۰ء میں گورنر جنرل نے لیڈن ہال اسٹریٹ واقع لندن میں اپنے بالادست حکام کو لکھا تھا کہ کلکتے کی بندرگاہ میں تقریباً ۱۰ ہزار ٹن وزن کے باربردار جہاز موجود ہیں جو ہندوستان ہی میں بنائے گئے ہیں اور اپنی ساخت کے لحاظ سے اس قابل ہیں کہ تجارتی مال کی نقل و حمل انگلستان تک کر سکتے ہیں۔ بمبئی کے بنے ہوئے ساگوانی جہاز قدیم انگلستان کے شاہ بلوط کے

---

[1] "جہاز کی لدائی کی معاشیات" صفحہ ۳۶۵ تا صفحہ ۳۶۶۔

جہازوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔[1]

شہنشاہ اکبر کی وفات کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے، مورلینڈ نے یہ بتلایا ہے کہ بحر ہند میں تجارتی مال کی بڑی مقدار کی نقل و حمل ہندوستان میں بنے ہوئے جہاز کرتے تھے، اور یہ کہ ہندوستان کے پاس اتنے بڑے سفری جہاز موجود تھے کہ اس زمانے کا کوئی یوروپین ملک بجز پرتگال کے ان کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔

لیکن آہنی ساخت کے جہازوں نے ہندوستان کو اس تفرقی سہولت سے محروم کردیا جو اس کو اعلیٰ درجے کی لکڑی کی وافر رسد کی بناء پر حاصل تھی۔ غرض بحری جہازوں کی تعمیر کی تیزی کے ساتھ اصلاح و ترقی، سمندروں میں میکانی وسائل باربرداری کا رواج، صفحہ ۲۱ برطانوی جہاز رانی کے اغراض کا رشک و حسد، اور انگریزوں کے زیر تسلط ہندوستان پر برطانوی قوانین جہاز رانی کا اطلاق وغیرہ، یہی وہ بڑے اور اہم اسباب خیال کئے جاسکتے ہیں جو ہندوستانی جہاز رانی کے زوال کا باعث تھے۔

۴۔ جہاز رانی میں ہندوستانی حوصلہ مندی کی راہ میں مشکلات

اب ہم اس حیثیت کو بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔ جو ہندوستانیوں کو ہندوستان کی ساحلی اور سمندر پار کی تجارت میں حاصل تھی۔ ہندوستان کی ساحلی تجارت کی مجموعی مالیت جو ۲۹-۱۹۲۸ء میں ۲۰۹٫۲۹ کروڑ روپے تھی، ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں ۱۶۱٫۸۵ کروڑ روپے ہوگئی تھی۔ موٹا اندازہ یہ ہے کہ ہندوستان کی ساحلی تجارت میں کام کرنے والے جہاز قریب ۵۰ لاکھ ٹن سالانہ وزنی مال کی ڈھلوائی کرتے ہیں۔ اگر بندرگاہوں کی اصلاح و ترقی کرکے ان میں زیادہ سہولتیں مہیا کی جائیں اور ریلوں کے تعامل و تعاون کا یقین حاصل کرلیا جائے تو

[1] ملاحظہ ہو ڈگبی کی کتاب موسوم بہ "خوش حال ہندوستان" صفحہ ۸۵ تا ۸۶۔

ممکن ہے کہ اس مقدار میں مزید اضافہ ہو جائے۔ اگر ہندوستان کے تجارتی جہازوں کے بیڑے کو ترقی دی جائے، یہ بیڑہ ہندوستانیوں کی غالب تعداد کی نگرانی میں رکھا جائے اور حکومت مثل وزاگاپٹم اور کوچین کی بندرگاہوں کی ترقی کی تجاویز کے بندرگاہوں کی سہولتوں کی توسیع کے بارے میں اپنی موجودہ پالیسی پر قائم رہے تو اس کی بدولت ساحلی تجارت کو بہت فروغ ہوگا۔

۲۹-۱۹۲۸ء کے لیے سامان اور زر و جواہر کی حد تک ہندوستان کی بحری تجارت کی مجموعی مالیت کا اندازہ ۶۴۶،۱۹ کروڑ روپے کیا گیا تھا۔ حالیہ سالوں میں، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، معاشی کساد بازاری کی وجہ سے اس تجارت میں بہت کمی ہو گئی ہے چنانچہ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں اس کی مجموعی مالیت صرف ۳۷۵،۹۲ کروڑ روپے تھی۔ ہندوستان کے پانچ بڑے بندرگاہوں یعنی کراچی، بمبئی، رنگون (یکم اپریل ۱۹۳۷ء میں برما کی علیحدگی سے پیشتر)، مدراس اور کلکتے میں کل ہندوستان کی بحری تجارت کا ۹/۱۰ حصہ مرتکز ہے اور تقریباً ایک کروڑ ۲۰ لاکھ ٹن سالانہ کی نقل وحمل ہوتی ہے۔ تجارتی مال کی اتنی بڑی مقدار کی ڈھلوائی کے باوجود ہندوستان کا حصہ اس میں بہت ہی حقیر ہے۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ ہندوستانیوں کا حصہ ساحلی تجارت میں ۲۵ فی صد اور سمندر کی تجارت میں صرف ۲ فی صد ہے۔ برطانوی جہاز جو غیر ملکی بحری تجارت میں مصروف تھے اور جو ہندوستانی بندرگاہوں میں داخل ہوئے ان کا تناسب جملہ جہازوں کے وزن کے مقابلے میں ۶۴،۷ فیصد تھا۔ باقی میں برطانوی ہند کا حصہ ۰،۸ فی صد، غیر ممالک کا حصہ ۳۳،۹ فی صد اور دیسی ریاستوں کا حصہ ۰،۶ فی صد تھا۔ برطانوی ہند کے بندرگاہوں سے جو جہاز باہر گئے ان میں مذکورۂ بالا جہازوں کا تناسب علی الترتیب ۶۴،۸ فی صد، ۱،۱ فی صد، ۳۳،۵ فی صد اور ۰،۶ فی صد تھا۔

جیسا کہ مذکورۂ بالا اعداد سے ثابت ہوتا ہے، تجارت نقل و حمل میں ہندوستانیوں کا جو حقیر حصہ یعنی ۲ فی صد ہے اس میں سے بھی قریب قریب ایک تہائی چھوٹی دیسی کشتیوں پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ سال بہ سال ترقی ہو رہی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ملک کا روبار کے ایک انتہائی نفع بخش شعبے سے محروم ہے۔ جہاز رانی کی مجموعی آمدنی کا اندازہ ۵۷ کروڑ روپے کیا گیا ہے۔ اس کے منجملہ ۵۰ کروڑ روپے غیر ملکی دخانی جہاز رانی کی کمپنیوں کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ اس ۵۰ کروڑ روپے میں سے ۹ کروڑ روپے ساحلی جہاز رانی سے، ۳۸ کروڑ روپے سمندر پار کی جہاز رانی سے اور ۳ کروڑ روپے مسافروں سے وصول ہوتے ہیں[1]۔ صلہ ۲۱

ساحلی تجارت کا جزوی اجارہ چند بڑی برطانوی جہاز راں کمپنیوں کے موتمر کے زیر نگرانی ہے اور اس اجارے نے ہندوستانی جہازوں کے ذریعے مال بھیجنے والوں اور ہندوستانی جہازوں کے مالکوں کیلئے بہت ہی ناموافق صورت حال پیدا کر دی ہے سن ۱۹۱۹ء اور سنہ ۱۹۲۵ء کے درمیان ان کمپنیوں کو ادا شدہ اصل پر ۲۰ فی صد سے زائد منافعہ کی وصول یابی سے ثابت ہوتا ہے، کہ جہاز کے ذریعے مال بھیجنے والوں سے کرایۂ بار برداری اعلیٰ شرح سے وصول کیا جا رہا ہے اور اس کا بار آخر میں چل کر ہندوستانی صارفوں پر پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں جیسا کہ مالی کمیشن نے بتلایا ہے، ایک ہندوستانی بندرگاہ سے دوسری ہندوستانی بندرگاہ تک مال کو بذریعۂ جہاز لے جانے کے کرایے کی شرح میں اور ہندوستانی اور غیر ممالک کے درمیان مال کی بذریعۂ جہاز ڈھلوائی کے کرایے کی شرح میں بہت بڑا فرق و عدم مساوات ہے جس کی وجہ سے اس مال کے مقابلے میں جو غیر ممالک سے ہندوستان

[1] دیکھو ساجی کی کتاب، سوم پر "معاشیات جہازی بار برداری" صر ۳۱۷ تا صر ۳۲۲ و صفحہ ۳۷۵۔

اور ہندوستان سے غیر ممالک کو آتا جاتا ہے، ہندوستان کے ساحلی مقامات کو ادھر سے ادھر بھیجے جانے والے مال کی ترسیل میں بہت دقت اور رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، اور اس قدرتی تاہین کا اثر زائل ہوجاتا ہے جس کے اپنے ملک میں پانے کی توقع کوئی صنعت محض اس بنا پر کرسکتی ہے کہ غیر ملکی مصنوعات تیار کرنے والے مرکز سے دور واقع ہیں[1]۔ لیکن ہندوستان کی ساحلی تجارت پر اس غیر ملکی تصرف کی وجہ سے اس سے بھی زیادہ شدید خرابیاں رونما ہوتی ہیں اور وہ اس طرح کہ موتمر منظم اور کامیاب کوششیں کرتی ہے کہ ملکی جہاز رانی کے کاروبار کو اس کے آغاز ہی میں ایسے طریقوں سے کچل دیا جائے جن کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ وہ غیر منصفانہ اور گلو تراش مسابقت کی صورت پیدا کرتے ہیں۔ ہندوستانی جہازوں کے مالکوں کو دو اہم ترین شکایتیں ہیں :-

(۱) کرایے کی رعایت کو ملتوی رکھنے کا طریقہ[2]؛

(۲) شرح کی جنگ۔

کرایے کی رعایت کو ملتوی رکھنا شرحوں کی جنگ۔

۱۴۔ کرایے کی رعایت کو ملتوی رکھنے کے طریق کی تعریف حسب ذیل الفاظ میں کی گئی ہے :-

"جہازی بار برداری کرنے والی کمپنیاں مال بھیجنے والوں کے نام ایک اعلان یا گشتی جاری کرتی اور ان کو یہ اطلاع دیتی ہیں کہ اگر کسی مقررہ مدت کے ختم پر (جو عام طور پر ۴ یا ۶ مہینے ہوتی ہے) انھوں نے موتمر کے ارکان کے جہازوں کے سوا کسی دوسرے جہاز سے مال

---

[1] دیکھو مالی کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۳۱۔

[2] اس طریق کے زیادہ مفصل بیان نیز بذریعہ جہاز بار برداری کرنے والے جتھوں کے بارے میں ملاحظہ ہو حاجی کی کتاب محولۂ بالا باب ۵۔

روانہ نہ کیا ہو تو، ان کے نام ایک ایسی رقم جمع کردی جائیگی جو اس مدت میں ان کے مرسلہ مال کی ڈھلوائی کے کرایوں کی مجموعی مقدار کے کچھ جزو کے مساوی ہوگی (اور یہ رقم عام طور پر ۱۰ فی صد ہوتی ہے)؛ اور یہ کہ یہ رقم انھیں اس وقت ادا کردی جائیگی جبکہ وہ مزید کچھ مدت تک (جو عام طور پر ۴ یا ۶ ماہ ہوتی ہے) موتمر کے ارکان کے جہازوں کے ذریعے سے مال بھجوانے کو جاری رکھیں۔ اس طرح جو رقم ادا کی جاتی ہے اس کو رعایتی کرایے کا التوا کہا جاتا ہے[1]، یہ طریقہ محض اس غرض سے نکالا گیا کہ جہاز سے مال بھیجنے والے ایک عرصے کے لیے موتمر کے ساتھ بلا شرکت غیرے وابستہ ہوجائیں اور اس طرح مال بھیجنے کے بارے میں ان کی آزادی سلب کرلی جاتی ہے۔ یہ طریقہ، جہاز کی ملکی کمپنیوں کے کاروبار کا گلا گھوٹنے کے لیے موتمر کے ہاتھ میں ایک طاقتور ہتھیار بھی بن جاتا ہے۔ مالی کمیشن اس امر کی پرزور سفارش کرتا ہے کہ اس اصول کے خلاف صہ ۲۱۹
دوسرے ملکوں میں جن اصول پر آئینی کارروائی کی گئی ہے ان ہی اصول پر یہاں بھی کرنی چاہیئے۔

یہ بتلانا اس طریق کے خلاف کوئی اعتراض نہیں ہے کہ کرایے کی رعایتی کمی کے التوا کا طریق صرف ہندوستان کے خلاف ہی نہیں بلکہ ہر ملک کے نئے حریفوں کے خلاف مساوی طاقت کے ساتھ عمل کرتا ہے۔ زیر بحث موضوع یہ ہے کہ یہ طریق ہندوستانی جہازرانی کو سخت نقصان پہنچاتا ہے۔ علاوہ ازیں ہندوستانیوں کے سوا کسی دوسری قوم کے حریف اپنی حکومتوں کے سہارے پر بھروسہ کرسکتے ہیں جو انھیں مالی امداد اور جہازسازی کے لیے براہ راست رقمی امداد دیتی ہیں۔ نیز ان کی ساحلی تجارت بھی عام طور پر انہی کے لیے

---

[1] حاجی کی کتاب بحوالۂ بالا صہ ۱۲۶ ۔

محفوظ رکھی جاتی ہے۔

جہازی نقل وحمل کی برطانوی کمپنیوں کو کامل اجارہ وارانہ تسلط حاصل ہے اور ان میں سے بعض کو ہندوستان میں حکومت کی سرپرستی بھی حاصل ہے۔ چنانچہ وہ ڈاک اور سرکاری سامان لے جانے کے عوض میں مالی امداد پاتی ہیں۔ اس قسم کی کوئی امداد دیسی جہازی کمپنیوں کو نہیں دی گئی۔ غیر ملکی جہازی کمپنیوں کے جتھے کرایے کی رعایتی کمی کے التوا کے طریق کے علاوہ ایک اور ہتھیار بھی استعمال کرتے ہیں، یعنی اپنے ہندوستانی حریفوں کے مقابلے میں اس خیال سے کم کرایہ وصول کرتے ہیں کہ حریفوں کو میدان سے نکال باہر کرنے کے بعد شرحوں کو پہلے سے بھی زیادہ بڑھا دیں۔ پس یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ گزشتہ کم وبیش ۳۵ سال میں ہندوستانی کاروبار کرنے والوں نے جہازی باربرداری وجہاز رانی کے امید افزا میدان میں داخل ہونے کی جو کوششیں کیں ان کا انجام عام حیثیت سے ناقابل تلافی ناکامی رہا، اور جو کمپنیاں اس غرض سے قایم ہوئیں ان میں سے اکثر بند ہونے پر مجبور ہوگئیں۔ ایک اور مشکل جو ہندوستانی جہاز رانی کے کاروبار کی راہ میں حائل ہے یہ بتائی جاتی ہے کہ یوروپین بیمے کی کمپنیاں ہندوستانی جہازی کمپنیوں کے ساتھ بیجا اور ناروا سلوک کرتی ہیں، چنانچہ وہ ایسے ہندوستانی جہازوں کو بھی دوسرے درجے میں شمار کرتی ہیں جن کو جوکھم کے لحاظ سے لندن کے ماہر درجۂ اول کا خیال کرتے ہیں، اور یہ سلوک محض اس بنا پر کیا جاتا ہے کہ کمپنیوں کے مالک ہندوستانی ہیں۔

جہاز رانی کے غیر ملکی اجارے کی دوسری خرابیوں کو مختصر طور پر بیان کر دینا مناسب ہوگا۔ غیر ملکی جہازی کمپنیاں عام طور پر ساحلی جہازوں میں عرشے کے مسافروں کے آرام کا کوئی خیال نہیں رکھتیں۔ چنانچہ ان کی شکایتیں کئی کمپنیوں کی تحقیقات کا موضوع رہی ہیں۔ علاوہ ازیں باوجود اس کے کہ ساحلی اور بحری اسٹیمروں کے ملاحوں کا عملہ زیادہ تر ہندوستانی

ہوتا ہے، اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کو بہت ہی کم تعداد میں مقرر کیا جاتا ہے اور بہت ہی کم غیر ملکی جہازی کمپنیوں نے اب تک اس امر کے متعلق مستعدی کا اظہار کیا ہے کہ ہندوستانی کارآموزوں کی تربیت کا انتظام اپنے یہاں کریں اور ان کو سہولتیں بہم پہنچائیں کہ وہ جہازوں پر انتظامی افسروں اور انجنیروں کی حیثیت سے کام کرنے کی قابلیت و مہارت حاصل کریں۔

ہندوستانی جہاز سازی کی صنعت کی صورت حال

۲۴۔ ہندوستانی جہاز سازی کی صنعت کی حالت ہندوستانی جہاز رانی کی حالت سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں گزشتہ جنگ عظیم سے دس سال پیشتر ۱۰۰ ٹن یا اس سے زائد وزن کے جو جہاز بنائے گئے ان کی تعداد ۱۷ ہزار تھی اور ان کا مجموعی وزن ۲ کروڑ ۹۰ لاکھ ٹن سے بھی زائد تھا۔ حال کے زمانے تک اسی قسم کے جو جہاز بنائے گئے ہیں ان کے مجموعی وزن کو معلوم کرنے کے لیے ان اعداد میں خاصا اضافہ کرنا پڑے گا۔ لیکن ہندوستان کے بنائے ہوئے جہازوں کی کل تعداد گزشتہ جنگ عظیم سے پیشتر اور بعد صرف ۲۲ ہے[1]۔ موجودہ زمانے میں صرف چھوٹے جہازوں کی حد تک غیر ہندوستانی جہاز سازوں سے مسابقت ممکن ہے، اس لیے کہ ان جہازوں کو ہندوستان تک لانے میں ان کی لاگت کو دیکھتے ہوئے زیادہ مصارف ہوتے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں جہاز سازی کی بہت عمدہ گودیاں ہیں۔ ہندوستان میں بڑے جہاز بنانے کے لیے جہاز سازی کی موزوں گودیاں نہیں ہیں اور جو چند مرمت کے کارخانے

[1] ان ملکوں اور دوسرے ملکوں میں ملکی جہاز سازی و جہاز رانی کو جو مالی امداد دی جاتی ہے ان کی مختلف شکلوں کا حال معلوم کرنے کے لیے دیکھو حاجی کا مصنفہ رسالہ موسوم بہ "قومی جہاز رانی کے لیے سرکاری امداد"۔

موجود ہیں وہ بھی غیر ہندوستانیوں کی نگرانی میں ہیں۔

۳۴۔ ہندوستان کے لیے تجارتی جہازی بیڑے کی ضرورت۔ ان صنعتوں کو خصوصی تامین دینے کے حق میں جو دلائل پیش کئے گئے ہیں ان کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ یہ صنعتیں ان شرائط کو پورا کرتی ہیں جو امتیازی تامین کی پالیسی کے تحت مقرر کی گئی تھیں۔ چنانچہ یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کو جہاز رانی اور جہاز سازی کی سہولتیں یقینی طور پر حاصل رہیں" نیز یہ کہ دوسرے ملکوں مثلاً جاپان ریاستہائے متحدۂ امریکا اور جرمنی میں سرکاری مداخلت بہت ہی اہم عنصر رہی ہے اور یہی عنصر ان ملکوں کو طاقتور تجارتی بیڑے حیرت انگیز طور پر چھوٹی مدت میں مہیا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ انگلستان کی بحری عظمت کو بھی عام طور پر ایک حد تک اسی تامین سے منسوب کیا جاتا ہے جو قوانین جہاز رانی کی رو سے دی گئی۔ چنانچہ یہ قوانین کم و بیش ۲ صدیوں تک نافذ اور جاری رہنے کے بعد گزشتہ صدی کے وسط میں منسوخ کئے گئے۔ آخر میں یہ کہ ہندوستانی جہاز رانی کے کاروبار نے اپنے علاقے کے سمندر میں غیر ملکی اجارے سے مقابلہ کرنے کی جو کوششیں کیں ان میں سے اکثر وں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ لہٰذا اس کو قدرتی طور پر اس بات کی معقول دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ حکومت کو مستقل عزم کے ساتھ مداخلت کرنی چاہئے۔

ہندوستان کو بحری تجارتی بیڑے کی جو شدید ضرورت ہے اس کو آسانی کے ساتھ ثابت کیا جا سکتا ہے۔ ان دقتوں کو دور کرنے کے علاوہ جن کو پہلے بیان کیا جا چکا ہے اور جن میں ہندوستانی مالکان جہاز، جہاز سے مال بھیجنے والے اور مسافر موجودہ زمانے میں مبتلا ہیں، دوسرے اور بھی قطعی فوائد اور سہولتوں کا لحاظ ضروری ہے۔ چنانچہ جنگی بحری بیڑے کے معاون اور مدافعت کے دوسرے مورچے کی

حیثیت سے تجارتی جہازی بیڑے کو جو اہمیت حاصل ہے وہ عام طور
پر تسلیم کی جاتی ہے، اور جبکہ ہندوستان میں بھی ایک شاہی ہندوستانی
بحریے کی بنیاد ڈال دی گئی ہے، ہندوستان مسئلے کے اس پہلو کو کس طرح
نظر انداز کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان کی ساحلی اور سمندری
تجارت مقداریں اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اس کے لیے ایک
ہندوستانی تجارتی جہازی بیڑے کا رکھنا ضروری ہو گیا ہے۔ ہندوستان
کا جو انحصار غیر ملکی جہازی کمپنیوں پر ہے وہ اس کی راہ میں بہت
بڑی مشکل ہے۔ چنانچہ گزشتہ جنگ عظیم میں جہازوں کی کمی کو
جو خود اس کی اور سلطنت برطانیہ کی معاشی حیثیت و حالت کو
بہت کمزور بنانے والا عنصر ہے، بہت شدت سے محسوس
کیا گیا۔ علاوہ ازیں اگر تجارتی جہازی بیڑے کو مناسب ترقی دی جائے
تو اس کی بدولت ہندوستانیوں کو کام سے لگانے کی نئی راہیں
کھل جائیں گی۔ بحری جہاز رانی، بحری انجینیری اور بحری بیمہ صد۲۲
یہ سب کاروبار کے بہت ہی نفع بخش شعبے ہیں لیکن ہندوستانیوں
کے لیے ان کے دروازے بالکل بند ہیں۔ یہ دلیل کہ ہندوستانیوں
میں اس امر کا میلان یا خواہش نہیں پائی جاتی کہ ملاحی کا پیشہ اختیار
کریں قائل کرنے والی یا یقین پیدا کرنے والی بات نہیں ہے،
اور خود ہندوستان کا پچھلا کارنامہ اس دلیل کو غلط ثابت کر دیتا
ہے۔ اس بات پر بہت زور دینا اس لیے بیجا ہے کہ ہندوستانیوں
کو اپنی موزونیت اور صلاحیت ثابت کر دکھانے کا موقع اب تک
بہت کم دیا گیا۔ یہ ذہن نشین رکھنا بھی مفید ہوگا کہ کچھ عرصہ قبل
اسی قسم کا الزام جرمنوں پر بھی لگایا جاتا تھا، حالانکہ جیسا کہ آجکل
ہر شخص تسلیم کریگا ملاح گری اور جہاز رانی کے لیے جن اوصاف اور
قابلیتوں کی ضرورت ہے ان کی حد تک جرمن باشندے کسی دوسری
قوم سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ یہ بات بہت پر معنی ہے کہ تجارتی

جہازی بیڑے کی کمیٹی اس بارے میں کوئی پیش اندازہ نہیں کرتی کہ اگر اچھے کردار کے تعلیم یافتہ اشخاص کو آخر میں چل کر تجارتی بیڑے میں افسروں کے عہدے تک ترقی دینے کی توقع دلائی جائے تو ایسے اشخاص کے حاصل کرنے میں کوئی دقت ہوگی۔

۴۴۔ تجارتی جہازی بیڑے کی کمیٹی (۱۹۲۳ء) جب ایک ہندوستانی تجارتی جہازی بیڑہ قایم کرنے کے حق میں جم کر شورش مچائی گئی تو اس کے جواب میں حکومت نے آخرکار حرکت کی اور فروری ۱۹۲۳ء میں ہندوستانی تجارتی جہازی بیڑے کی کمیٹی کا تقرر کیا تاکہ یہ کمیٹی اس بارے میں غور کرے کہ ہندوستانی جہازرانی اور جہازسازی کی صنعتوں کی ترقی کے لیے کون سی تدابیر ضروری تھیں اور ان کے متعلق رپورٹ پیش کرے۔ چنانچہ اس کمیٹی کی سفارشوں کو مختصر طور پر ذیل میں بیان کردینا مناسب ہوگا:-

(۱) ہندوستانی تجارتی جہازی بیڑے کے قایم کرنے کے لیے جو افسر ناگزیر تھے ان کو تربیت دینے اور آیندہ خدمت پر مامور کرنے کا انتظام کرنے کی غرض سے ایک ٹریننگ جہاز اور رہرکاری کشتی حکومت کی طرف سے بمبئی میں رکھی جائے۔ حکومت نے اس سفارش کو منظور کرلیا اور شاہی ہندوستانی بحری جہاز "ڈفرن" میں اس غرض سے ترمیم کی گئی کہ اس میں کیڈٹوں کی تعلیم ہوسکے، اور اب اس سے تجارتی جہازی بیڑے کے افسروں اور انجینیروں کے لیے ٹریننگ جہاز کا کام لیا جارہا ہے۔

(۲) انجینیری کالجوں میں بحری انجینیروں کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور سمندر میں مزید تجربہ حاصل کرنے کے لیے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

(۳) ساحلی تجارت کو ان جہازوں کے لیے محفوظ رکھا جائے

جو ملکیت و انتظام کو آخر میں چل کر ہندوستانی ہاتھوں میں دینے کے لیے تیار ہوں۔ اس تجویز کو روبہ عمل لانے کی صورت یہ ہے کہ اجازت ناموں یا پروانوں کا طریق رائج کیا جائے، جیسا کہ آسٹریلیا میں ہو رہا ہے۔ باربرداری کی کسی جہازی کمپنی پر اجازت نامہ حاصل کرنے کے لیے حسب ذیل شرائط کی پابندی لازمی قرار دی جائے:-

(ا) کمپنی کی رجسٹری ہندوستان میں ہو؛

(ب) اس کی ملکیت و انتظام کسی ہندوستانی شخص یا کسی ایسی ہندوستانی انجمن سرمایۂ مشترک (خانگی یا سرکاری) کے ہاتھ میں ہو جس کی رجسٹری ہندوستان میں کی جائے؛ اس کا سرمایہ روپے کی شکل میں ہو، اس کی مجلس نظماء میں ہندوستانیوں کی اکثریت ہو اور اس کے حصے زیادہ تر ہندوستانیوں کی ملک ہوں؛ اور

(ج) ایسی کمپنیوں کی نگرانی زیادہ تر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہو۔

(۴) رفتار زمانہ کے ساتھ دوسری شرائط بھی مقرر کرنی چاہئیں، مثلاً افسر اور ملاح سب کے سب ہندوستانی ہوں، اور اجازت ناموں کی درخواست دینے والے جہاز ہندوستان ہی میں بنائے جائیں۔ علاوہ ازیں ایک خاص مدت کے بعد جس کا تعین حکومت کرے تمام جہازوں پر یہ لازم گردانا جائے کہ وہ ہندوستانی کارآموزوں کو خدمت دینے اور اپنے افسروں اور انجینیروں کے عہدوں کو ہندیانے کی ذمہ واری قبول کریں۔ اجازت نامہ جاری کرنے والے عہدہ دار کو یہ اختیار بھی دیا جا سکتا ہے کہ وہ حکومت ہند ص۲۲۲ کی منظوری سے کرایے کی رعایت کا التوا، شرحوں کی جنگ یا بعض ایسی شرایط کے بارے میں جو تجارت پر بے جا بندشیں عائد کرتی ہیں مناسب کارروائی کرے۔

(۵) حکومت ہند کی طرف سے یہ انتظام ہونا چاہئے کہ

ساحل کے موجودہ برطانوی لائینوں میں سے ایک کو جس کا کاروبار اچھی طرح چل رہا ہو خریدلے اور اس کی نگرانی کے لیے نظما کا تقرر کرے جن میں ہندوستانیوں کی اکثریت ہو۔ آخر میں اس لائن کے جہازوں کی ملکیت منظورہ ہندوستانی مالکوں کو منتقل کردینی چاہئے تاکہ انجام کار کاروبار ہندوستانی کمپنیوں کے ہاتھ میں چلا جائے۔

(۶) جوں ہی تربیت یافتہ ہندوستانی افسروں کی کافی تعداد مہیا ہوجائے اور ہندوستانی مالکان جہاز یہ ثابت کردیں کہ وہ ساحلی اسٹیمروں کو چلانے اور ان کا انتظام کرنے کے قابل ہوگئے ہیں، بحری تجارت کی حد تک خالص ہندوستانی کمپنیوں کو جہازرانی کے لیے مالی امداد دینے کے مسئلے پر غور اً مناسب لحاظ کیا جائے۔

(۷) ایسی صورت میں جبکہ اجازت نامہ کا طریق جس کی کمیٹی نے سفارش کی ہے، برطانوی قانون جہازرانی بابتہ ۱۸۹۴ء کے منافی پایا جائے، ہندوستانی ملکیت اور انتظام کے تحت چلنے والے جہازوں کے لیے مالی امداد کا طریق اختیار کرنا چاہئے، ان کو ڈاک لے جانے کے ٹھیکے دینے چاہئیں اور ان ہی کو سرکاری سامان کی ڈھلوائی کے لیے ترجیح دینی چاہئے۔

(۸) کلکتے کو کلوں سے چلنے والے جہاز بنانے والے مرکز کی حیثیت سے ترقی دینی چاہئے، اس لیے کہ کوئلہ اور فولاد پیدا کرنے والے علاقوں کی قربت کی وجہ سے اس کا محل وقوع بہترین ہے اور دوسرے مرکزوں کے مقابلے میں اس کو زیادہ تجربہ ہے۔ کمیٹی یہ سفارش کرتی ہے کہ جہازسازی کی صنعت کو مالی امداد کی شکل میں تامین دی جائے، تاکہ ہندوستان اور غیر ملکوں میں جہاز کی تیاری کی اقل لاگت میں جو فرق ہو وہ دور ہوجائے۔ مگر مالی امداد غیر ملکوں کی لاگت کا زیادہ سے زیادہ پچیس فیصد ہو۔

(۹) حکومت کسی ہندوستانی کمپنی کو جہاز سازی کا کارخانہ کھولنے میں حسب ذیل طریقوں سے مدد دے سکتی ہے:-

(ا) کارخانہ قایم کرنے کی مناسب جگہ حاصل کرنے کے لیے ارزاں نرخ پر قرضہ مہیا کیا جائے اور مالی امداد دی جائے۔

(ب) مصارف کے بارے میں بعض شرائط کے تحت حکومت اور محکمۂ بندرگاہ کی سرپرستی کو توسیع دی جائے؛ اور

(ج) جہاز سازی کا ایسا موزوں کارخانہ قائم اور مکمل ہوجانے کے بعد ساحلی تجارت کا اجازت نامہ حاصل کرنے والے تمام جہازوں کے لیے یہ شرط قانون کے ذریعے سے لازم گردانی چاہیے کہ وہ ہندوستان ہی کے بنے ہوئے ہوں۔

(۱۰) جہاز سازی کے لیے ابتداءً غیر ملکی خصوصی ماہروں سے مدد لینی چاہیے۔ لیکن حکومت کو چاہیے کہ جہاز سازی کی تعلیم کے لیے انگلستان کی طرح ہندوستان ہی میں مدرسے اور کالج کھولے۔ اس معاملے میں حکومت کو جاپان اور ریاستہائے متحدہ امریکا کی تقلید ۲۲۳ د
کرنی چاہیے، اور ہندوستانیوں کو برطانیہ بھیجنا چاہیے تاکہ وہ وہاں کے مدرسوں اور جہاز سازی کی گودیوں میں تعلیم حاصل کریں اور لوٹنے پر یہاں معلم اور صنعت کے رہنما بننے کے قابل ہوں۔ اس اثنا میں انجینیری کالجوں کو ترقی دینی چاہیے اور وہاں ڈگری کے علاوہ جہاز سازی کے زائد نصاب کا انتظام کرنا چاہیے۔

۵۴ ہندوستانی جہازوں کے لئے ساحلی جہاز رانی کو محفوظ کرنے کے بارے میں مسودۂ قانون

بجز اس کے کہ ایک ٹریننگ جہاز "ڈفرن" کا انتظام کیا گیا، حکومت نے تجارتی جہازی بیڑے کی کمیٹی کی دوسری اہم سفارشوں میں سے کسی کو بھی عملی جامہ نہیں پہنایا۔ اس لیے مسٹر حاجی نے مجلس قانون ساز کے ستمبر ۱۹۲۸ء کے اجلاس میں ایک مسودۂ قانون پیش کیا جو ساحلی تجارت کو محفوظ کرنے کے بارے میں

تھا۔ اس میں یہ تحریک کی گئی تھی کہ سرمایہ کا ۷۵ فی صد حصہ برطانوی ہند کے باشندوں کے لیے محفوظ رکھا جائے۔ انجمن سرمایہ مشترک کی حد تک یہ ضروری قرار دیا گیا کہ مجلس نظماء کا صدر نشین اور انتظامی فرم کے ارکان اور نظما میں سے کم از کم ۷۵ فی صد تعداد برطانوی ہند کے باشندوں پر مشتمل ہو۔ مسودۂ قانون میں اس کو بھی لازمی قرار دیا گیا تھا کہ برطانوی ہند کے ان باشندوں میں سے ۷۵ فیصد کو جو رکن یا ناظم ہوں حق رائے دہندگی دی جائے" اور گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو مجاز گردانا جائے کہ وہ ہندوستانی ساحلی تجارت میں حصے لینے والوں کو اجازت نامہ جاری کریں۔ مسودۂ قانون میں اس کا بھی انتظام کیا گیا کہ ساحلی تجارت کو مذکورۂ بالا طریق پر تدریجی طور سے محفوظ کرنے کے لیے ایک پانچ سالہ دور مقرر کیا جائے اور مسودۂ قانون کی شرایط کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائیں دی جائیں۔

ساحلی تجارت کو محفوظ کرنے کا اصول جو مذکورۂ بالا مسودۂ قانون میں موجود ہے اس کو تقریباً سب ملکوں نے جو اپنے تجارتی جہازی بیڑے کو ترقی دینے کے آرزومند ہیں اختیار کرلیا ہے، اور ہندوستان کی یہ فطری خواہش ہے کہ اس معاملے میں ان ہی سے سبق سیکھے۔ اس دلیل پر بہت زیادہ زور نہ دینا چاہئے کہ اس مسودۂ قانون میں نسلی امتیاز قایم کیا گیا ہے، اس لیے کہ اس قسم کے امتیاز کے متعلق یہ خیال قائم کیا جانے لگا ہے کہ وہ ان جائز اعمال کے حدود کے اندر آتا ہے جس کو اختیار کرنے کا کسی قوم کو اخلاقی حق حاصل ہے، گو یہ ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے دوسرے ملکوں کو دقتیں اٹھانی پڑیں۔ ہندوستان کی اس جائز آرزو کو پورا کرنے کی غرض سے کہ وہ ایک تجارتی جہازی بیڑہ رکھے امتیاز کرنا ضروری ہے اور اس لحاظ سے اس کو ایک ناخوش گوار ضرورت کی حیثیت سے قبول کرلینا چاہئے۔ گو دوسری تمام تاءینی تدبیروں کے مثل، ہندوستانی جہازوں کے لیے ساحلی تجارت کے محفوظ کرنے میں

بھی ملک کو ایک مدت تک لازمی طور پر بھاری مصارف برداشت کرنے پڑیں گے، لیکن اس کو بالعموم اس توقع کی بنا پر حق بجانب قرار دیا جاتا ہے کہ کچھ ہی مدت کے بعد تامین کی ضرورت باقی نہیں رہیگی۔ کیونکہ تامین کے تحت ہندوستانی کاروبار بہت جلد اس قابل ہوجائیگا کہ ملک کی ضرورتوں کو اس سے زیادہ کارگر طریق پر پورا کرے جتنا کہ وہ آج کل کر رہا ہے۔

رہا موجودہ حقوق قایمہ کے ساتھ سلوک کا مسئلہ تو بیدخلی کی انتہائی اور شدید کارروائی سے قطع نظر کرتے ہوئے دو طریقوں میں سے ایک کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ یعنی یا تو موجودہ لائینوں کو حکومت اس خیال صہ ۴۴۴
سے خرید سکتی ہے کہ آخر میں چل کر انھیں ہندوستانی کمپنیوں کے حوالے کردیے یا ان لائینوں کو یہ اختیار دیا جاسکتا ہے کہ پانچ سال یا کسی اور معینہ مدت کے اندر اپنے سب عہدوں پر ہندوستانیوں کو مقرر کریں، تاکہ ساحل پر جہازرانی کی مجاز ہوسکیں۔ مسودۂ قانون میں پانچ سال کی مدت تجویز کی گئی تھی۔ اس شرط پر یہ اعتراض کیا گیا کہ اس سے بیدخلی کی نوبت آئیگی[1] لیکن بے دخلی یا ضبطی کے معنی تو یہ ہیں کہ کافی معاوضہ دیے بغیر ملکیت سے محروم کردیا جائے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک غیر ملکی باربرداری کمپنی سے ان تجارتی سہولتوں کے ہٹا لینے کے لیے اس لفظ کا استعمال بہت زیادہ سخت نہیں ہے۔ سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کا اس کو بطور نوازش موقع دیا گیا تھا اور ان کا مطالبہ اب وہ حق کے طور پر نہیں کرسکتی۔ ممکن ہے کہ حقوق قایمہ کا پاس ولحاظ اس بات کو ضروری بنادے کہ پانچ سال کی مجوزہ مدت میں کچھ توسیع کی جائے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہندوستانیوں کے زیر نگرانی چلنے والے

---

[1] ملاحظہ ہو سر جارج رینی کی اختلافی یادداشت منتخب کمیٹی کی رپورٹ میں۔

جہازوں کے لیے ساحلی تجارت کو کامل طور پر محفوظ کرنے میں کوئی مزاحمت ہو۔ بہرحال یہ ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ بین قومی قانون کے تحت ساحلی تجارت متعلقہ ملک کے باشندوں کے لیے مخصوص ہوا کرتی ہے اور اس معاملے میں ہندوستانی اغراض کا لحاظ سب سے مقدم ہونا چاہیئے۔

مسودۂ قانون تحفظ تجارت ساحلی منتخب کمیٹی کی منزل سے اپریل ۱۹۲۹ء میں بعض تبدیلیوں کے ساتھ نکلا۔ ہندوستانی جہاز رانی کی کانفرنس ۳ و ۴ جنوری ۱۹۳۰ء کو بمقام دہلی وائسرائے کی صدارت میں منعقد ہوئی اور اس میں ان برطانوی اور ہندوستانی کمپنیوں کے نمایندے شریک ہوئے جو ہندوستان کی ساحلی تجارت میں حصہ لے رہے تھے۔ لیکن برطانوی اور ہندوستانی اغراض کے نمایندوں کے درمیان اساسی اختلافات کے باعث یہ کانفرنس کسی سمجھوتے پر نہ پہنچ سکی۔ حکومت ہند نے آیندہ طریق کا تعین کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ حکومت نے آگے چلکر یہ اعلان کیا کہ وہ اس معاملے میں اسوقت تک کوئی کارروائی نہیں کرسکتی جب تک کہ امتیازی آئین و قوانین اور ہندوستان اور برطانیہ کے باہمی تجارتی تعلقات کے مسئلے کا تصفیہ نہ ہوجائے جو اس وقت گول میز کانفرنس میں پیش تھا۔ کل کانفرنس کی کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء میں مندرجۂ ذیل فقرہ اقلیتی ذیلی کمیٹی کی رپورٹ میں شامل کیا:۔

"برطانوی تجارتی طبقے کی تجویز کے مطابق اس اصول سے عام طور پر اتفاق کیا گیا کہ ہندوستان میں تجارت کرنے والے برطانوی تجارتی طبقے، فرم اور کمپنیوں کے حقوق اور ہندوستانیوں کے حقوق کے درمیان کوئی امتیاز نہ ہونا چاہیئے اور ان حقوق کو منظم کرنے کی غرض سے کوئی مناسب قاعدہ جو باہمی رعایت پر مبنی ہو مقرر کرنا چاہیئے[1]

[1] ہندوستانی گول میز کانفرنس کی ذیلی کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۹۴۔

صـ۲۲۵

۱۴۶ - کرایے کی رعایتی کمی کے التوا کے طریق کی منسوخی کا مسودۂ قانون۔

مسٹر حاجی نے مجلس قانون ساز کے اجلاس دہلی منعقدۂ فروری ۱۹۲۹ء میں ہندوستانی ساحلی جہاز رانی کی حد تک کرایے کی رعایتی کمی کے التوا کے طریق کی منسوخی کے بارے میں بھی ایک مسودۂ قانون پیش کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ یہ "مسودۂ قانون تحفظ تجارت ساحلی" کے حق میں ضمنی قانون کا کام کرے گا۔ جہاں اس مسودۂ قانون کی غایت یہ تھی کہ جہاز رانی کی آمدنی کو ہندوستان ہی کے اندر رکھا جائے، وہیں مسٹر حاجی کے مسودۂ قانون کا منشا یہ تھا کہ ساحلی تجارت کے محفوظ ہوجانے کے بعد ہندوستانی جہاز راں کمپنیوں میں کاروبار مناسب طور پر تقسیم ہوجائے گا۔ مسٹر حاجی نے اس بات پر زور دیا کہ ان کا مسودۂ قانون اول الذکر مسودۂ قانون کی منظوری پر موقوف نہیں ہونا چاہیئے بلکہ واقعی صورت حال سے فوراً نبٹنے کے لیے ضروری تھا۔ کرایے کی رعایتی کمی کے التوا کے طریق کو منسوخ کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ جہاز رانی کے متعلق اجارہ دارانہ اتحادوں کا خاتمہ ہوجائے گا، خواہ وہ غیر ہندوستانی کمپنیوں پر مشتمل ہوں یا ہندوستانی کمپنیوں پر یا دونوں پر، اور اس منسوخی سے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا جس میں ہندوستان کی ساحلی تجارت کی حد تک جہاز رانی کا موجودہ اجارہ ختم ہوجائے گا اور نئی ہندوستانی کمپنیوں کے لیے کاروبار کا نیا راستہ کھل جائے گا۔ سر جارج رینی رکن تجارت نے اس مسودۂ قانون پر اس بنیاد پر نکتہ چینی کی کہ اس میں شرح کی جنگ کو روکنے کے لیے کچھ نہیں کیا گیا تھا، اور یہ کہ کرایے کی رعایتی کمی کے التوا کے طریق سے نقل وحمل بروقت ہونے، کرایۂ بار برداری کو ایک حالت پر قائم رکھنے اور زیادہ اور کم سامان بھیجنے والوں کے درمیان مساوات قائم کرنے میں یقینی مدد مل رہی تھی۔ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ جیسا کہ اسٹریٹ سٹیلمنٹس میں ہو رہا ہے، ایک

نئی تدبیر نکالنی چاہیئے جس کی رو سے سامان بھیجنے والے کرایہ کی رعایتی کمی کا نقصان اٹھائے بغیر موتمر کو تین سال میں ایک دفعہ چھوڑنے کے لیے آزاد ہوں۔ رکن تجارت نے اس بات پر بھی زور دیا کہ مسودۂ قانون کو کم از کم اس وقت تک پیش نہ کرنا چاہیئے جب تک کہ ایوان مسودۂ قانون تحفظ تجارت ساحلی کے بارے میں موافق یا مخالف فیصلہ صادر نہ کر دے۔

اس فصل میں اور پچھلی فصل میں جس قسم کی آئین سازی پر بحث کی گئی اس کو آیندہ سے امتیاز کے بارے میں قانون حکومت ہند بابت ۱۹۳۵ء کی شرائط کا تابع رہنا پڑے گا جن کا خلاصہ جلد اول باب ۱۲ میں پیش کیا جا چکا ہے۔ ان شرائط کے تحت ہندوستانی ساحل پر کاروبار کرنے والی برطانوی جہاز راں کمپنیوں کے خلاف امتیاز سے کام لینا ناممکن ہو جائے گا (دیکھو دفعہ ۱۱۳ اور دفعہ ۱۱۵ قانون حکومت ہند بابت ۱۹۳۵ء)۔

جہاز سازی کی صنعت کی حد تک ہم کو ان سفارشوں سے اتفاق ہے جو تجارتی جہازی بیڑے کی کمیٹی نے اس کی ترقی کے لیے پیش کی ہیں اور ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ انھیں کسی مزید تاخیر کے بغیر عملی جامہ پہنانا چاہیئے۔

۴۷۔ ساحلی جہاز رانی کی تنظیم کی حالیہ کوششیں۔ حال ہی میں یعنی ستمبر ۱۹۳۷ء میں ساحلی جہاز رانی کے متعلق ایک غیر سرکاری مسودۂ قانون جس کو سر اے۔ ایچ غزنوی نے مرکزی مجلس قانون ساز میں پیش کیا تھا، منتخب کمیٹی کے پاس بھیجا گیا[1]۔ جیسا کہ محرک نے بتلایا، ان کے پیش کردہ مسودۂ قانون میں برطانوی

[1] اس قسم کا ایک مسودۂ قانون جس کو مسٹر پی، ان، سپرو نے کونسل آف اسٹیٹ میں پیش کیا تھا اسی زمانے میں اس کونسل میں مسترد ہو گیا۔

۲۲۶ اور ہندوستانی جہاز رانی کے درمیان کوئی امتیاز قائم نہیں کیا گیا تھا۔ اس مسودۂ قانون کا مقصد یہ تھا کہ ساحلی جہاز رانی کی حد تک شرح کرایہ کو کم کرنے اور کرایہ میں رعایتی کمی کرنے کی شکل میں جو غیر منصفانہ مسابقت جاری تھی اس کو روکا جائے۔ یہ مسابقت ہندوستانی سرمایہ کو ساحلی جہاز رانی میں مصروف کرنے کی راہ میں ایک سنگین رکاوٹ ہے۔ اس مسودۂ قانون کا خاکہ منتخب کمیٹی میں از سر نو مرتب کیا گیا اور اس کی رو سے مرکزی حکومت کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ بعد تحقیقات ساحلی جہاز رانی میں غیر منصفانہ مسابقتی طریقوں کو روکے اور مسافروں اور مال کے لانے لیجانے کے کرایہ کی اقل شرح مقرر کرے۔ اس کے علاوہ مرکزی حکومت کی مقرر کی ہوئی شرحوں سے کم شرح وصول کرنا تعزیری جرم قرار دیا گیا ہے۔ حکومت ہند اس مسودۂ قانون کی اس لیے مخالف ہے کہ وہ غیر ضروری اور ناقابل عمل ہے۔ اور یہ خیال کرتی ہے کہ اس قانون کو نافذ کرنے کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ جہاز رانی کی کمپنیاں کھیلنے کا جنون رونما ہو۔ دوسری طرف حکومت اس کے لیے تیار رہے کہ ساحلی جہاز رانی کو حدود کے اندر منظم کرے۔ سمجھا جاتا ہے کہ حکومت کا ارادہ یہ ہے کہ پہلے میدان صاف کرے یعنی ۱۸۳۸ء کا پرانا قانون منسوخ کردے جس نے ہندوستان کی ساحلی جہاز رانی کو تمام قوموں کے لیے بے قید رکھا؛ اور اس کے بعد ساحلی جہاز رانی کو منظم کرنے کے لیے اختیارات کو کام میں لائے۔ یہ کارروائی ہندوستان کی ساحلی تجارت میں خاص طور پر جاپانیوں کی روزافزوں دخل اندازی اور اس سے کم درجے پر جرمن جہاز رانی کے خلاف اختیار کی گئی ہے۔

۴۲۷

چھٹا باب

ہندوستان کی تجارت

اس باب میں ہندوستان کی تجارت سے بحث کی گئی ہے اور سہولت تفہیم کی خاطر بحث کو حسب ذیل طریق پر دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :۔ (۱) خارجی تجارت جو (ا) بحری تجارت، (ب) درآمد برآمد کی تجارت اور (ج) سرحد پار کی تجارت پر مشتمل ہے، اور (۲) داخلی تجارت جس میں اندرون ملک کی اور ساحلی تجارت شامل ہے۔

تجارت خارجہ

اپنے پچھلے واقعات پر ایک نظر۔

ہندوستانی تجارت کی ابتدائی تاریخ کو سردست نظرانداز کیا جاتا ہے، اس لیے کہ ہمارا اساسی تعلق عہد جدید کی تجارت کی ترقی سے ہے جو گزشتہ صدی کے وسط سے

شروع ہوتا ہے۔ اس کی کافی شہادت موجود ہے کہ قدیم زمانے میں ہندوستان کے تجارتی تعلقات دور دور کے ملکوں سے تھے۔ ہندوستان کے تجارتی تعلقات تین ہزار سال قبل ولادت مسیح بابل سے بھی قایم تھے۔ دو ہزار پہلے کی مصری ممیاں بہترین قسم کی ہندوستانی ململ میں لپٹی ہوئی ملی ہیں۔ "روما میں ہندوستانی مصنوعات کا صرف بہت کثیر تھا۔ اس کی تصدیق پلینی کلاں کے بیان سے ہوتی ہے۔ چنانچہ پلینی کو یہ شکایت تھی کہ ہندوستان سے تجارت کرنے میں سالانہ زر کی بہت بڑی مقدار صرف ہوا کرتی تھی۔ ڈھاکے کی ململ اہل یونان کے یہاں "گنجیٹکا" کے نام سے مشہور تھی[1]۔ ہندوستان دوسرے ملکوں سے بھی تجارت کرتا تھا، چنانچہ ان میں سے چند چین، ایران اور عربستان تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان تمام قدیم ملکوں کی طرح نادر اور بیش بہا اشیا کی تجارت کرتا تھا جو مقدار میں چھوٹی اور قیمت میں بڑی ہوتی تھیں۔ بخلاف موجودہ زمانے کے کہ کم قیمت اور بوجھل اشیا کی نقل وحمل دور دور کے ملکوں کو ہوتی ہے جن سے عوام کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ اہم برآمدی اشیا پارچے کی مصنوعات، دھات کے برتنوں، ہاتھی دانت، عطر، رنگنے کے سامان، مسالے وغیرہ پر مشتمل تھیں؛ اور درآمدی اشیا میں پیتل، ٹن، سیسہ جیسی معدنی پیداوار جو ہندوستان میں کمیاب تھی اور گھوڑے، شراب وغیرہ تھے۔ سونے کی خالص درآمد بہت بڑی مقدار میں ہوتی تھی جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ درآمد کے مقابلے میں برآمد کا پلہ بھاری رہتا تھا۔ چنانچہ شروع ہی سے دوسرے ملکوں کے ساتھ تجارت میں ہندوستان کو یہ امتیازی خصوصیت حاصل رہی۔ درآمد کیے ہوئے سامان کی برآمد بھی کسی حد تک ہوتی تھی۔ چنانچہ یہ بات زیادہ تر ریشم اور چین کے برتنوں کے بارے میں جو پہلے چین سے درآمد کئے جاتے تھے، موتیوں کے بارے میں جو سیلون سے درآمد کئے جاتے تھے اور قیمتی پتھروں کے بارے میں جو ہندی مجمع جزائر سے درآمد کئے جاتے تھے،

---

[1] دیکھو مالویہ جی کا اختلافی نوٹ صنعتی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۲۹۵ میں۔

صادق آتی تھی۔ درآمد کیے ہوئے سامان کی برآمد کو اس بات کی علامت سمجھا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے پاس تجارتی جہازوں کا بڑا موجود تھا۔
مسلمانوں کے دور حکومت میں جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ گیارھویں صدی سے شروع ہوا، بعض نئے عاملین نے ہندوستان کی
۲۲۸ تجارت خارجہ پر اثر ڈالا۔ ابتدائی اسلامی دور حکومت میں سابقہ ہندو دور حکومت سے زیادہ بدنظمی رہی اور اس کی وجہ سے ہندوستان کی تجارتی ترقی پر لازمی طور پر مضر اثر پڑا۔ دوسری طرف شمال مغربی سرحد کی راہ سے ہندوستان سے جو تعلقات قائم ہوئے انھوں نے ہندوستان کی سرحد پار کی تجارت کے حق میں محرک کا کام کیا۔ جیسا کہ مورلینڈ نے بتلایا ہے سرحد پر دو راستے تھے۔ ایک لاہور سے کابل کو اور دوسرا ملتان سے قندھار کو جاتا تھا۔ کابل ایک بڑا تجارتی مرکز تھا؛ اور ہندوستان، ایران اور شمالی ملکوں کے تاجر یہاں آیا جایا کرتے تھے۔ دوسری طرف کابل مغربی چین اور یورپ کے درمیان کاروانی شاہراہ پر واقع تھا۔ قندھار، ایران کے بیشتر حصے میں داخل ہونے کا دروازہ تھا۔ اگر اس زمانے کے مروجہ حالات کے معیار سے جانچا جائے تو دونوں راستوں پر تجارتی مال کی اچھی خاصی مقدار کی نقل و حمل ہوتی تھی۔[1] علاوہ ازیں مغلوں کے دور حکومت میں نقل و حمل کے ذرایع ہندو دور کے مقابلے میں زیادہ اطمینان بخش تھے۔ مغلوں نے عمدہ سڑکیں بہت زیادہ تعداد میں بنائیں۔ ملک کے دریاؤں سے خاصکر شمالی ہند میں تجارت کے اغراض کے لیے پورا فائدہ حاصل کیا گیا اور ہندوستانی ساحلوں پر بھی بہت تجارتی گرماگرمی رہی۔ مغلیہ درباروں کی سرپرستی نے ہندوستانی صنعتوں کے حق میں بہت بڑے محرک کا کام کیا، خاصکر ان صنعتوں کے حق میں جو اشیائے تعیش سے متعلق تھیں۔ جہازرانی اور بذریعہ جہاز مال لانے لے جانے کی تجارت

له۔ دیکھو مورلینڈ کی کتاب "ہندوستان اکبر اعظم کی وفات کے زمانے میں" صفحہ ۲۱۹۔

تھا مگر ساحل مالابار پر اور اس سے کم درجہ پر خلیج کیمبے میں اور کورومنڈل ساحل پر مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی۔ البتہ بعد میں چل کر کورومنڈل ساحل کی تجارت پر زیادہ تر ہندوؤں اور چیٹاروں نے اپنا تسلط جمالیا۔ مشرق بعید اور بحر احمر کی تقریباً تمام تجارت کی منڈی مالابار تھا۔ اور کیلی کٹ اس تجارت کی اہم بندرگاہ تھا۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں تجارت کی عام حالت اور رفتار غیر متبدل رہی، "اور حقیقت یہ ہے کہ گبن کی چبھتی ہوئی جامع تعریف کہ "مشرق کی تجارتی اشیا خوشنما مگر غیر اہم تھیں" سولھویں صدی پر بھی اسی قدر صادق آتی ہے جس قدر کہ دوسری صدی عیسوی پر۔"[1] زیادہ تر حسب ذیل اشیا درآمد کی جاتی تھیں:- سونا، سکہ سازی، زیورات اور نمایش کے لیے، گھوڑوں کی بہت بڑی تعداد، تانبا، ٹن، جست، سیسہ، پارے جیسی دھاتیں، عنبر اور قیمتی پتھر جیسی اشیائے تعیش۔ ان درآمدی اشیا کے معاوضے میں ہندوستان یہاں کے بنے ہوئے مختلف قسم کے کپڑے، نیل جیسا رنگنے کا سامان، افیون، اور دوسری دوائیں اور نشہ آور چیزیں، سیاہ مرچ اور چند معمولی مسالے وغیرہ باہر بھیجتا تھا۔

پندرھویں صدی کے اختتام پر "راس امید" سے ہوکر ہندوستان کا کاملاً بحری راستہ دریافت ہو جانے کی وجہ سے تجارتی راہوں میں عہد آفریں تغیرات رونما ہوئے۔ راس امید نے مشرق اور مغرب کے
درمیان نتیجہ خیز ربط قایم کردیا۔ اس وقت تک یورپ سے جو ص ۲۲۹
راست تجارت ہو رہی تھی اس کا راستہ بحر ہند میں عدن تک تھا۔ تجارتی مال جہازوں سے خلیج سویز میں اتار دیا جاتا تھا اور اس کے بعد بری اور بحری راستے سے بحر متوسط کے ساحل پر پہنچتا تھا۔ یہاں سے جینوا (genoa) اور وینس کے اطالوی تاجر اس کو یا تو مغرب کی طرف سمندر سے لے جاتے تھے یا آلپس پر سے ہوتے ہوئے

لہ۔ ملاحظہ ہو مورلینڈ کی کتاب موسومہ بہ "ہندوستان اکبر اعظم کی وفات کے زمانے میں" صفحہ ۱۹۶۔

بری راستے سے انٹ ورپ پہونچاتے تھے اور اس کے بعد رھائن تک لے جاتے تھے جو اس زمانے میں مغربی یورپ کا سب سے بڑا تقسیمی مرکز تھا۔ اپنے دشمن یعنی وینس والوں کی بجائے خود اس تجارت کا منافع حاصل کرنا اور عیسائی مذہب کی تبلیغ کرنا ہی وہ مقصد تھا جس نے پرتگالیوں کو ہندوستان کا راستہ دریافت کرنے کی ترغیب دی۔ یہاں ہم یہ بحث نہیں کریں گے کہ مغربی یورپ کی مختلف طاقتیں یعنے پرتگالی، ولندیزی، انگریز اور فرانسیسی کس طرح ایک دوسرے سے رقابت کرتے رہے اور نہ اس کا کوئی ذکر کریں گے کہ کس طرح انگریزوں کو آخر میں چل کر سب پر فتح حاصل ہوئی اور ہندوستان میں ان کا اقتدار مستحکم ہوا۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ یورپین تاجروں کو ہندوستان کھینچ لانے والا محرک اشیائے خام نہ تھیں بلکہ کپڑے، کیلی کو، جواہرات، زردوزی کے کام، ریشمی اور اونی مصنوعات تھیں۔ چنانچہ ان ہی چیزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی نفع بخش تجارت کی بنا ڈالی اور جب سات سالہ جنگ کے بعد فرانسیسی مسابقت کا خاتمہ ہوگیا تو ایسٹ انڈیا کمپنی کو مشرق سے تجارت کا حقیقی اجارہ حاصل ہوگیا۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ انگلستان میں اس بات کی مخالفت کی جا رہی تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان سے تجارت کرے، اس لیے کہ انگلستان میں ہندوستانی کیلی کو اور مسالوں کی مانگ بہت تھی اور ان کی درآمد کے معاوضے میں فلزہ ہندوستان بھیجنی پڑتی تھی جہاں[۱] انگلستان کے اونی کپڑوں کی نکاسی کے مواقع بہت کم تھے۔ سترھویں صدی کے اختتام تک مخالفت کی یہ تحریک اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اس زمانے کے بعد سے انگلستان میں ہندوستانی کپڑوں کی درآمد کی کامل ممانعت کرکے یا بھاری محصول عائد کرکے ہندوستانی کپڑوں کے

---

[۱] جب بنگال کی "دیوانی" حاصل ہوگئی اور مشغولات کا مذموم طریقہ اختیار کیا گیا یعنے ہندوستانی آمدنی سے اشیا خرید کر برآمد کی جانے لگیں تو اس کی وجہ سے انگلستان سے ہندوستان کو فلز کی برآمد میں کمی ہوگئی اور ہندوستان سے تجارت کرنے کی مخالفت میں کمی ہوگئی۔

استعمال کو قابل سزا قرار دیا گیا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی میلانات نے پہلے ہندوستانی صنعتوں کی ہمت افزائی کی اور اس کی تجارت کا دارومدار ان ہی صنعتوں پر تھا۔ لیکن انگلستان کے حقوق قائمہ کے دباؤ نے کمپنی کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ اس پالیسی کو منسوخ کر دے۔ اس کے نتیجے کے طور پر اب ہندوستان پر خاص طور پر اس حیثیت سے نظر ڈالی جانے لگی کہ وہ خام اشیا کا ایک بیش قیمت ذریعہ تھا جو انگلستان کی مصنوعات کو ترقی دینے کے لیے ضروری تھیں، کیوں کہ صنعتی انقلاب کے زمانے میں انگلستان کی مصنوعات بہت تیزی سے ترقی کر رہی تھیں۔ ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ ہندوستان کی دیسی صنعتوں کے زوال کے مختلف اسباب کیا تھے اور انیسویں صدی کے آخری نصف حصے میں بے کار دستکاروں نے زراعت کا پیشہ کس طرح اختیار کیا۔

یہ سب امور ہندوستان کی تجارت خارجہ کے رُخ اور نوعیت کے تعین پر دور رس اثرات ڈالنے میں ناکام نہیں رہے۔ انیسویں صدی سنہ ۲۳
کے نصف اول میں ہندوستان اور انگلستان کی باہمی تجارت کی نوعیت میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔ چنانچہ اس کے بعد سے ہندوستان کو درآمد میں ٹھیک وہی اشیا وصول ہونے لگیں جو اب تک اس کی برآمدی تجارت کا بڑا حصہ تھیں یعنے سوتی کپڑے اور شکر۔ لنکا شائر کی سوتی کپڑوں کی صنعت میں اس درجہ ترقی ہوگئی تھی کہ ہندوستان میں غیر ممالک سے جتنا تجارتی مال درآمد کیا گیا اس کے نصف حصے کی نمایندگی صرف سوتی کپڑوں کی درآمد کر رہی تھی[1]۔

---

[1] ملاحظہ ہو سی، ڈبلیو، ای کاٹن کی کتاب موسوم بہ Hand bork of Comme rcial Information for India ص ۹۶

۲۔ ہندوستان کی تجارت سال ۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۵ء کے بعد۔

سنہ ۱۸۶۹ء میں نہر سویز جہاز رانی کے لیے کھول دی گئی اور یہی وہ سال تھا جو ہندوستانی تجارت کی تاریخ میں تمام اغراض کے لیے دور جدید کے آغاز کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس دور کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ برآمدی و درآمدی تجارت کی مقدار میں تدریجی ترقی ہوئی[1]۔ اس سلسلے میں مندرجۂ ذیل اعداد و شمار دلچسپ ثابت ہوں گے۔ ان میں گذشتہ سات سال میں تجارتی مال کی قیمت (لاکھ روپے میں) اور گذشتہ ستر سال میں پنج سالہ اوسط بتلائے گئے ہیں[2]:۔

تجارت درآمد و برآمد کی مالیت

سال	درآمد	برآمد	میزان
پنجسالہ اوسط:۔	لاکھ روپیہ	لاکھ روپیہ	لاکھ روپیہ
سنہ ۱۸۶۴ء تا سنہ ۱۸۶۹ء	۳۱۷۰	۵۵۸۶	۸۷۵۶
سنہ ۱۸۶۹ء تا سنہ ۱۸۷۴ء	۳۳۰۴	۵۶۲۵	۸۹۲۹
سنہ ۱۸۷۴ء تا سنہ ۱۸۷۹ء	۳۸۳۶	۶۰۳۲	۹۸۶۸
سنہ ۱۸۷۹ء تا سنہ ۱۸۸۴ء	۵۰۱۶	۷۹۰۸	۱۲۹۲۴
سنہ ۱۸۸۴ء تا سنہ ۱۸۸۹ء	۶۱۵۱	۸۸۶۴	۱۵۰۱۵
سنہ ۱۸۸۹ء تا سنہ ۱۸۹۴ء	۷۰۷۸	۱۰۴۹۹	۱۷۵۷۷

[1] معاشی کساد بازاری کے حالیہ سالوں میں ہندوستان کی تجارت خارجہ کی مالیت میں جو کمی ہوئی اس کے اسباب آگے چل کر بیان کیے گئے ہیں۔

[2] ملاحظہ ہو ایک رپورٹ موسوم بہ "تبصرہ بر تجارت ہند برائے سنہ ۱۹۳۶ء تا سنہ ۱۹۳۷ء" صفحہ ۱۷۶۔

سال	درآمد	برآمد	میزان
پنجسالہ اوسط:-	لاکھ روپیہ	لاکھ روپیہ	لاکھ روپیہ
۱۸۹۴ء تا ۱۸۹۹ء	۷۳۶۷	۱۰۷۵۳	۱۸۱۲۰
۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۴ء	۸۴۶۸	۱۲۴۹۲	۲۰۹۶۰
۱۹۰۴ء تا ۱۹۰۹ء	۱۱۹۸۵	۱۶۵۴۴	۲۸۵۲۹
۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۴ء	۱۵۱۶۷	۲۲۴۲۳	۳۷۵۹۰
۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۹ء	۱۵۹۲۵	۲۲۵۸۳	۳۸۵۰۸
۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۴ء	۲۶۷۰۵	۳۰۶۳۸	۵۷۳۴۳
۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۹ء	۲۵۱۰۲	۳۵۳۵۱	۶۰۴۵۳
۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۴ء	۱۶۱۱۴	۱۹۸۶۰	۳۵۹۷۴
یکسالہ اعداد:-			
۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء	۱۷۳۰۶	۲۲۶۵۰	۳۹۹۵۶
۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء	۱۳۰۶۴	۱۶۱۲۰	۲۹۱۸۴
۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء	۱۳۵۰۲	۱۳۶۰۷	۲۷۱۰۹
۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء	۱۱۷۳۰	۱۵۱۱۷	۲۶۸۴۷
۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء	۱۳۴۵۸	۱۵۵۵۰	۲۹۰۰۸
۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء	۱۳۶۷۷	۱۶۴۶۰	۳۰۱۳۷
۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء	۱۲۷۷۲	۲۰۲۴۹	۳۳۰۲۱

ان اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۹ء کے پانچ سال میں
برآمد کی سالانہ اوسط مالیت ۵۵،۸۶ کروڑ روپے تھی جو ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۹ء ۴۳۱
کے پانچ سال میں بڑھ کر اوسطاً ۳۵۳،۵۱ کروڑ روپے سالانہ ہوگئی۔
اسی مدت میں درآمد کی مالیت بھی ۳۱،۷ کروڑ روپے سے بڑھ کر

۱۵۲ کروڑ روپیے ہوگئی [۱]

اب اس ترقی کے اہم اسباب کو مختصر طور پر بیان کردینا مناسب ہوگا۔ گذشتہ صدی کے وسط تک ہندوستان پر برطانوی تسلط تقریباً مکمل ہوچکا تھا اور لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کا معقول انتظام ہوگیا تھا جو تجارت کی ترقی کے لیے بہت ضروری تھا۔ ذرائع آمد و رفت کی اصلاح و ترقی کی بدولت تجارت کو ملک کے اندر ہر جگہ توسیع و ترقی ہوئی۔ اس ترقی میں ریلوں اور سڑکوں نے جو اہم حصہ لیا اس کو گذشتہ باب میں بیان کیا جاچکا ہے۔ یہاں صرف برقی تار اور ڈاک کے رسل و رسائل کی ترقی کے اثر کا اضافہ کردینا مناسب ہوگا۔ اہم ترین واحد سبب یہ تھا کہ نہر سویز کھول دی گئی جس کی وجہ سے ہندوستان انگلستان سے ۴ ہزار میل تک قریب تر ہوگیا۔ نہر سویز نے بحرِ متوسط سے مشرق کو جانے والے راستے کو ازسرِ نو منظم کردیا اور فرانس، آسٹریا اور اٹلی جیسے ملکوں کو جو بحرِ متوسط کے کنارے واقع تھے نئے مواقع بہم پہنچائے۔ بمبئی اور سویز کے درمیان تحت بحر تاروں کے بچھا دیے جانے کی وجہ سے اس راستے کا افادہ بہت بڑھ گیا۔ اس سہولت نے نیز بحری جہازوں کی صنعت کی عظیم اصلاح و ترقی اور مختلف ملکوں کے زیر سرپرستی تجارتی جہازی بیڑوں کے اضافے نے دور دور کے ملکوں سے ہندوستان کا تجارتی تعلق قایم کرنے میں بہت بڑے محرک کا کام کیا؛ اور ہندوستان کی تجارت کی مقدار اور نوعیت میں مستقل طور پر انقلاب پیدا کردیا۔ ہندوستان کی برآمدی اشیا کا بیشتر حصہ اب ایسی اشیا پر مشتمل ہونے لگا جو مقدار میں بڑی اور مقابلۃً کم قیمت ہوتی ہیں۔ کرایہ کم ہونے سے یہ چیزیں اب ہزاروں میل دور اس غرض سے بھیجی جاسکتی ہیں کہ روز افزوں

[۱] نیز ملاحظہ ہو ایچ، اے، ایف، لنڈ سے ہندوستانی تجارتی کمشنر کا ایک مضمون ایک کتاب موسوم بہ "سلطنت برطانیہ کے معاشی ذرائع" میں جو ڈبلیو، ڈرہوک کے زیرِ ادارت شائع ہوئی ہے۔

بین قومی طلب کو پورا کیا جائے گیہوں، چاول اور چائے جیسی غذائی اشیا اور کپاس، سن، روغن دار تخم، چمڑے اور کھالیں جیسی اشیائے خام اب روز افزوں مقدار میں برآمد کی جانے لگی ہیں[^1]۔ ان اشیا کی قیمت انگلستان اور بعد میں جرمن، جاپان اور ریاستہائے متحدۂ امریکہ بھی جن کی صنعتیں نمایاں طور پر ترقی کر رہی تھیں اپنے یہاں سے سوتی کپڑے، کلیں، آہنی سامان، ریلوں کا سامان، شیشہ، آلات وغیرہ برآمد کر کے دیتے تھے۔ ایک اور عامل نے ہندوستان کی تجارت کے حق میں محرک کا کام کیا اور وہ یہ تھا کہ ہٹ دھرمی کے ساتھ آزاد تجارت کی پالیسی اختیار کی گئی۔ تجارت کی راہ میں درآمدی و برآمدی محصولوں کی جو بے شمار بندشیں ایک زمانۂ دراز سے رکاوٹ ڈال رہی تھیں وہ سب ۱۸۵۳ء تک ہٹالی گئیں۔ آزاد تجارت کا اصول جس کا گذشتہ صدی کے تقریباً وسط میں انگلستان میں بہت زور تھا اس کا اطلاق ہندوستان پر بلا تامل کر دیا گیا۔ تقریباً سب برآمدی محصولوں کو ۱۸۷۴ء تک منسوخ کر دیا گیا اور غیر ملکی جہازوں کے مقابلے میں برطانوی جہازوں کے حق میں جو امتیاز تھا اس کو بھی ہٹالیا گیا لیکن آزاد تجارت کو سب سے بڑی فتح اس وقت حاصل ہوئی جب کہ لنکا شائر کے دباؤ کے تحت ۱۸۸۲ء میں جملہ درآمدی محصولوں کو بجز چند مستثنیات کے منسوخ کر دیا گیا[^2]۔ ۲۳۲

[^1]: ہندوستان میں اس زمانے کی حکومت کی زرعی پالیسی کا محرک زیادہ تر یہ خیال تھا کہ ہندوستان کی زرعی پیداوار کی برآمد کو ترقی دی جائے۔ چنانچہ بڑی حد تک اس پالیسی کو فروغ دینے ہی کی غرض سے پنجاب، صوبۂ متحدہ اور سندھ میں بڑے کارہائے آب پاشی کو شروع کرنے کی ذمہ داری لی گئی۔

[^2]: یہ صحیح ہے کہ روپیے کی قیمت مبادلہ گر جانے کی وجہ سے ہندوستان کے مالیے پر بہت سخت بار پڑا تو ۱۸۹۴ء میں آمدنی کے اغراض کے لیے درآمدی محصولوں کو از سر نو عاید کرنا پڑا، لیکن ان محصولوں کو عام طور پر ۵ فی صد بہ لحاظ قیمت کی ادنیٰ شرح پر برقرار رکھا گیا۔

اس سلسلے میں ان ارادی اور منظم کوششوں کا ذکر کر دینا مناسب ہوگا جو جرمنی اور جاپان جیسے کئی ملکوں نے گذشتہ جنگ عظیم سے کم و بیش ۲۵ سال پیشتر اس غرض سے کیں کہ ہندوستان سے تجارتی تعلقات قایم کیے جائیں اور ہندوستان کی بین قومی تجارت میں برطانیۂ عظمیٰ کو جو غالب حیثیت حاصل تھی اس کا مقابلہ کیا جائے۔ اس زمانے میں ہندوستان کی تجارت میں سلطنت متحدہ[1] کا جو بڑا حصہ تھا اس کا سبب آسانی سے بتلایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ پہلے یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قایم ہو گئی تھی، رقیب یورپین قوموں کو ہزیمت اٹھانی پڑی اور کمپنی نے ہندوستانی اشیا میں اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے اپنے سیاسی اقتدار کو استعمال کیا۔ گو کہ کمپنی کا تجارتی اجارہ ۱۸۱۳ء میں منسوخ کر دیا گیا اور سب قوموں کو ہندوستان سے تجارتی تعلقات قایم کرنے کی پوری آزادی دے دی گئی۔ نیز سب غیر ممالک کو جہاز رانی وغیرہ کی حد تک بتدریج انگلستان کے مساوی رتبہ دیا گیا، لیکن اس کے باوجود برطانوی قوم کو حال حال تک یورپ کی تجارت پر کم و بیش اجارہ دارانہ تسلط حاصل رہا۔ اس طویل مدت میں سلطنت متحدہ ہندوستانی پیداوار کو درآمد کر کے اس کی برآمد میں بڑا حصہ لیتی رہی اور اس کو دوسرے یورپین ملکوں میں تقسیم کرتی تھی۔ برطانیہ کو جن عاملین نے غالب حیثیت دی تھی وہ یہ تھے کہ ہندوستانی ریلوں اور دوسرے کاروبار میں برطانوی سرمایہ مصروف تھا، ریلوں کا انتظام برطانوی کمپنیوں کے ہاتھ میں تھا، جہاز رانی اور بینک کاری برطانوی نگرانی میں تھی، برطانوی برآمد گھر اور یورپین (برطانوی) ایوان ہائے تجارت جیسے تجارتی نظامات ملک میں قایم تھے، اور برطانیہ کو ملک کی مالی و محصولی پالسی کی رہنمائی و نگرانی کا اختیار حاصل تھا۔

[1] اعداد کی تفصیلات کے لیے دیکھو فصل ۱۲۔

۳۔ ہندوستانی منڈی کے لیے کشاکش۔ لیکن گذشتہ صدی کے آخری دہے میں اس تسلط اور غالب حیثیت کی بنیاد بتدریج کھوکھلی پڑنے لگی۔ چنانچہ جرمنی پہلی طاقت تھی جس نے برطانیہ کو ٹوکا اور جرمنی کے نقش قدم پر جاپان بھی خم ٹھوک کر آگے بڑھا جس کی ہندوستانی تجارت میں دلچسپی روسی جاپانی جنگ کے بعد بہت بڑھ گئی تھی۔ ان دول کا مقصد ابتدائً یہ تھا کہ اپنی مصنوعات کی فروخت کو ہندوستان میں ترقی دیں۔ لیکن اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے جو نظام بنایا گیا تھا اس نے ۲۳۴
بھی ہندوستانی اشیائے خام اور غذائی اجناس کی برآمد کے حق میں محرک کا کام کیا۔ ان ملکوں کو اپنی صنعتوں کو ترقی دینے کے لیے ان اشیا کی ضرورت تھی اور ان کو حاصل کرنے کے لیے حسب ذیل اہم طریقے اختیار کیے گئے تھے:۔

(۱) قومی جہاز رانی کی خدمات کی ترقی (۲) جرمن ایشیاٹک بنک اور جاپانی یکوہاما اسپیشی بنک جیسے قومی بنکوں کی شاخیں کھولی گئیں جو اپنے ہم قوموں کو اعتبار اور قرضے کی خاص سہولتیں بہم پہنچاتی تھیں، اور (۳) بمبئی و کلکتے جیسے اہم تجارتی مرکزوں میں غیر ممالک کی تجارتی کوٹھیاں قایم کی گئیں۔ یہ کہنے کی بہ مشکل ضرورت ہے کہ ان کوششوں کو متعلقہ حکومتوں کی پوری ہمدردی اور تائید حاصل تھی اور ہندوستان میں ان کے قونصلوں نے اپنے ملکوں کی تجارت کو ہندوستان میں فروغ دینے کے لیے بر وقت اور کارآمد امداد دی۔ لیکن ریاستہائے متحدۂ امریکہ ایک زمانۂ دراز تک لندن کے توسط سے ہندوستان سے تجارت کرنے پر قانع رہیں اور جنگ عظیم کے آغاز تک راست تجارتی تعلقات کو ترقی دینے کے لیے انھوں نے جرمنی اور جاپان کی طرح اٹل اور ارادی کوشش نہیں کی[1]۔

---

[1] ہندوستانی تجارت میں دلچسپی لینے سے فرانس کی سستی کی وجہ یہ واقعہ تھا کہ اس کی برآمد زیادہ تر اشیائے نعیش پر مشتمل تھی جن کے لیے ہندوستان میں کوئی بڑی مانگ نہ تھی۔ دیکھو آر، ایم، جوشی کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان کی برآمدی تجارت" باب ۔

گذشتہ جنگ عظیم سے پیشتر کے حالات کا خلاصہ

مذکورۂ بالا تمام عاملین کا متحدہ نتیجہ یہ رونما ہوا کہ ہندوستان کی برآمدی و درآمدی تجارت میں بہت اضافہ ہوگیا، اگرچہ جو اعداد دیے گئے ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیر نظر مدت میں یہ اضافہ اور ترقی یکساں رفتار کے ساتھ رونما نہیں ہوئی۔ سنہ ۱۸۷۳ء تک برآمدی اشیا میں کثیر اضافہ ہوا۔ یہ بات سنہ ۱۸۶۴ء اور سنہ ۱۸۶۹ء کے درمیانی زمانے پر خاص طور پر صادق آتی ہے۔ چنانچہ امریکہ کی خانہ جنگی کے باعث ہندوستان سے کپاس بہت بڑی مقدار میں اعلیٰ قیمتوں پر برآمد کی گئی اور انگلستان کو کپاس کی معمولی رسد حاصل کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں ان کی وجہ سے ہندوستان میں کپڑوں کی درآمد میں رکاوٹ پیدا ہوگئی تھی۔ سنہ ۱۸۷۳ء اور انیسویں صدی کے اواخر کے درمیانی زمانے میں تجارتی ترقی کی رفتار مقابلۃً سست رہی[1]۔ اس کا زیادہ تر باعث چند خاص عامل تھے۔ اولاً یہ کہ روپے کی قیمت سونے میں بتدریج گھٹ رہی تھی چنانچہ سنہ ۱۸۷۲ء میں ایک روپے کی قیمت ۲ شلنگ تھی جو سنہ ۱۸۹۳ء میں گر کر کم و بیش ۱۴ پنس ہوگئی۔ روپے کی قیمت کے غیر معمولی اتار چڑھاؤ نے معیار طلائی کے ملکوں کے ساتھ تجارت خارجہ میں عدم تیقن اور تخمین کا عنصر داخل کر دیا اور اس تجارت کی معمولی ترقی کو روک دیا۔ علاوہ ازیں سنہ ۱۸۷۶ء تا سنہ ۱۸۷۸ء کے قحط

[1] جوشی اپنی محولۂ بالا کتاب میں صفحہ ۵ پر یہ بتلاتے ہیں کہ سنہ ۱۸۳۴ء اور سنہ ۱۸۵۵ء کے درمیان برآمد ۸ کروڑ روپے سے ۲۳ کروڑ روپے تک بڑھ گئی اور سنہ ۱۸۵۵ء اور سنہ ۱۸۷۳ء کے درمیان ۲۳ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۶۰ کروڑ روپے ہوگئی۔ سنہ ۱۸۷۳ء اور سنہ ۱۸۹۳ء کے درمیان اضافہ ۶۰ کروڑ روپے سے صرف ۱۰۰ کروڑ روپے ہوا۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۹۹ء تک کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ البتہ سنہ ۱۸۹۹ء اور سنہ ۱۹۱۴ء کے درمیان برآمد کی مالیت میں ۱۰۰ کروڑ روپے سے ۲۰۲ کروڑ روپے تک نمایاں اضافہ ہوا۔

اور دوا ور قحطوں نے جو انیسویں صدی کے آخر میں رونما ہوئے نیز طاعون کے متواتر حملوں نے جو بمبئی میں سب سے اول ۱۸۹۶ء میں آیا، اس صورت حال کو بد سے بدتر کر دیا۔ آخر میں، گو ۱۸۹۸ء اور ۱۹۱۴ء کے
۲۳۴ درمیان روپے کو ۱ شلنگ ۴ پنس کی شرح پر کامیابی کے ساتھ مستحکم کر دینے کی وجہ سے معیار طلا کے ملکوں کے ساتھ ہندوستان کی تجارت کا راستہ صاف ہو گیا، لیکن روپے کی قیمت کی بیشی نے، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، چین اور جاپان کے ساتھ کپڑوں کی تجارت کو کسی حد تک نقصان پہنچایا۔

بیسویں صدی کے ابتدائی چودہ سال میں خاصکر ۱۹۰۵ء کے بعد ہندوستان کی تجارت خارجہ میں نمایاں توسیع ہوئی۔ سب سے بڑا اضافہ جنگ عظیم کے پیشتر کے پانچ سالوں میں رونما ہوا۔ چنانچہ برآمد کی مالیت کا اوسط ۲۲۴،۲۳ کروڑ روپے اور درآمد کی مالیت کا اوسط ۱۵۱،۶۷ کروڑ روپے تھا۔ اس کے مقابل ۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۴ء کے پانچ سالوں میں برآمد کا اوسط ۱۲۴،۹۲ کروڑ روپے اور درآمد کا اوسط ۸۴،۶۸ کروڑ روپے تھا۔ اس چودہ سالہ مدت میں روپے کی شرح بڑی حد تک مستحکم رہی، ریلوں اور آب پاشی جیسے کارہائے عامہ کو بہت پر زور طریقے پر آگے بڑھایا جا رہا تھا۔ پچھلی صدی کے اختتام پر جیسے شدید قحط رونما ہوئے تھے ویسے رونما نہیں ہوئے۔ اور طاعون کی شدت میں بھی کمی ہو رہی تھی۔ علاوہ ازیں جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ جرمن اور جاپان اور کچھ کم درجے پر ریاستہائے متحدہ امریکہ اس بات کی منظم کوشش کر رہے تھے کہ اپنی تجارت کو آگے بڑھائیں جو ان ملکوں میں معاشی حالات کی تبدیلی کی بدولت تیزی کے ساتھ روز بروز بڑھ رہی تھی۔ اس طرح یہ ملک بھی صنعتی حیثیت سے انگلستان کے ہم پلہ بن رہے تھے۔

۵ جنگ عظیم کے اثرات ہندوستان کی تجارت پر

مندرجۂ ذیل جدولوں[۱] سے یہ معلوم ہوگا کہ ہندوستان کی تجارت پر جنگ عظیم کے کیا اثرات پڑے۔

جدول (۱)

سمندر پار کی کل تجارت کی مالیت بحساب ملین پاؤنڈ

تجارت	سنہ ۱۹۱۳ تا سنہ ۱۹۱۴	سنہ ۱۹۱۴ تا سنہ ۱۹۱۵	سنہ ۱۹۱۵ تا سنہ ۱۹۱۶	سنہ ۱۹۱۶ تا سنہ ۱۹۱۷	سنہ ۱۹۱۷ تا سنہ ۱۹۱۸	سنہ ۱۹۱۸ تا سنہ ۱۹۱۹
درآمد	۱۲۷،۵	۹۶،۵	۹۲،۱	۱۰۶،۸	۱۰۹،۶	۱۲۵،۷
برآمد	۱۶۶	۱۲۱،۴	۱۳۳	۱۶۷،۹	۱۶۳،۳	۱۷۰،۲

جدول (۲)

سمندر پار کی تجارت کی مالیت بحساب ملین پاؤنڈ

(تجارتی مال کی مالیت کا اندازہ سنہ ۱۹۱۳ تا سنہ ۱۹۱۴ کی قیمتوں کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔)

قسم تجارت	سنہ ۱۹۱۳ تا سنہ ۱۹۱۴	سنہ ۱۹۱۴ تا سنہ ۱۹۱۵	سنہ ۱۹۱۵ تا سنہ ۱۹۱۶	سنہ ۱۹۱۶ تا سنہ ۱۹۱۷	سنہ ۱۹۱۷ تا سنہ ۱۹۱۸	سنہ ۱۹۱۸ تا سنہ ۱۹۱۹
درآمد	۱۲۷،۵	۹۵،۶	۷۳،۱	۶۲،۸	۵۱،۹	۴۶،۹
برآمد	۱۶۶	۱۱۹	۱۲۹،۱	۱۴۰،۹	۱۳۰،۶	۱۱۳،۵

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ تجارت کی مقدار پر جنگ کے اثرات کیا پڑے ۲۳۵
قیمتوں کے اس اضافے کا لحاظ کرنا ضروری ہے جو جنگ کے زمانے میں

---

[۱] ملاحظہ ہو ایس، جی، ہینڈ یکر کی کتاب موسوم بہ "جنگ عظیم کے معاشی نتائج و عواقب" صفحہ ۴۴ تا صفحہ ۴۵ ۔

رونما ہوا اس کا اطلاق خاص طور پر درآمد پر ہوتا ہے جس کی مالیت میں برآمد کے مقابلے میں بدرجہا اضافہ ہوا۔ اگر ۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۴ء کی برآمد اور درآمد کی قیمتوں کو ۱۰۰ مانا جائے تو ۱۹۱۸ء تا ۱۹۱۹ء میں جہاں درآمد کی مالیت ۲۶۸ تک بڑھی وہاں برآمد کی مالیت میں صرف ۱۵۰ تک اضافہ ہوا۔ اگر برآمد اور درآمد کی صرف درج شدہ مالیتوں ہی کا لحاظ کیا جائے تو اوپر کی جدول (۱) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تجارت خارجہ کے دونوں شعبوں میں جنگ عظیم کے آغاز پر کمی ہو گئی۔ اور یہ کہ گو برآمدی اشیاء کی مالیت میں ۱۹۱۶ء تا ۱۹۱۷ء کے بعد پھر اضافہ ہوا درآمدی اشیاء کی مالیت متعاقب زمانے یعنی ۱۹۱۸ء تا ۱۹۱۹ء میں بھی سال قبل از جنگ کے مقابلے میں کم رہی لیکن جدول (۲) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تجارت اور خاص کر درآمدی تجارت کی مقدار میں بہت زیادہ کمی ہوئی۔ اور جنگ کے پورے زمانے میں وہ مسلسل گھٹتی ہی گئی۔ یہاں ان اسباب کا مختصر طور پر ذکر کرنا مناسب ہوگا جنھوں نے یہ صورت حال پیدا کی جنگ کی وجہ سے دشمن ملکوں کے ساتھ تجارت بالکل رک گئی۔ جرمنی سے تجارت کا موقوف ہونا خاص اہمیت رکھتا تھا، اس لئے کہ زمانۂ قبل از جنگ میں برطانیہ کے بعد جرمنی ہی ہندوستان کا بہترین گاہک تھا۔ اسی کے ساتھ برطانیہ، فرانس اور بلجیم جیسے اتحادی ملکوں سے بھی زمانۂ قبل از جنگ کی سطح پر تجارت اس وجہ سے برقرار نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ یہ ملک جنگ میں شریک تھے۔ رہے غیر جانب دار ملک تو ان سے تجارت پر اس غرض سے بندشیں عائد کی گئی تھیں کہ ہندوستان سے ان ملکوں کے ذریعے سے جرمنی کو اسلحہ اور جنگی سامان کے پہنچنے کو روکا جائے اور ہندوستان سے صرف اتحادی ملکوں کو رسد پہنچائی جائے اس سے زیادہ تکلیف دہ سبب یہ تھا کہ سمندروں سے دشمن کے جہازوں کے ہٹ جانے اور جنگی ضرورتوں کی فراہمی کا بار باقی ماندہ جہازوں پر پڑ جانے سے باربرداری کے کرایے میں بہت نمایاں اضافہ ہو گیا۔ جہازوں کی کمی نے ہندوستان کو خاص طور پر متاثر کیا، اس لئے کہ یورپ کو خام اشیاء بھیجنے

والے دوسرے ملکوں مثلاً ارجن ٹائن، برازیل، کینیڈا، اور ریاستہائے متحدہ امریکا کے مقابلے میں ہندوستان مغربی یورپ سے بہت زیادہ دور واقع تھا۔ اس عامل نے اس فائدے کو بڑی حد تک زائل کر دیا جو ہندوستان اپنی اشیاء کی یورپ میں بڑھی ہوئی مانگ سے دوسری صورت میں حاصل کر سکتا تھا۔ "ایمڈن" اور "کانگسبرگ" کی تباہ کن کارروائیوں کے باعث سمندر غیر محفوظ ہوگئے تھے اور تجارت خارجہ درہم وبرہم ہوگئی تھی۔ چنانچہ ان وجوہ نے بھی تجارت کی رفتار میں رکاوٹ پیدا کی۔ لیکن ملک خود کو بہت جلد جنگ کے حالات کے مطابق بنانے لگا۔ خندقوں کی جنگ کے لئے ریت کے تھیلوں کی اور سپاہیوں کے جوتوں کے لئے چمڑے کی بہت بڑی مقدار میں ضرورت تھی اس مانگ نے برآمد کے حق میں بہت بڑے محرک کا کام کیا۔ کونسل بلوں کی فروخت کی کمی سے برآمد کے مالیہ کے بارے میں جو مشکلات پیدا ہوگئی تھیں وہ رونما نہ ہوتیں اور حکومت برآمد پر نگرانی عائد نہ کرتی تو برآمدی تجارت میں اور بھی زیادہ اضافہ ہوتا۔ اگرچہ درآمدی تجارت میں اسی قسم کا احیاء رونما نہیں ہوا، پھر بھی ہندوستان کی منڈی میں جو کمی پیدا ہوگئی تھی وہ ریاستہائے
ص ۲۳۶ متحدہ امریکا اور جاپان سے زیادہ مقدار میں اشیاء درآمد کئے جانے کی وجہ سے ایک حد تک پوری ہوگئی۔ اور اس موقعہ سے ان ملکوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ غرض جنگ عظیم نے ہندوستانی تجارت پر جس قدر مخالف اثر ڈالا اتنا جاپان جیسے دوسرے ملکوں کی تجارت پر نہیں پڑا۔ "ایک طرف ہندوستانی تجارت، جنگ کے اختتام تک، محض اس بات کی پرزحمت کوشش کرتی رہی کہ جنگ عظیم کے نقصان رساں اثرات سے نجات حاصل کرے جس نے تجارت کی توسیع کی توقع کو بے نتیجہ بنا دیا تھا، تو دوسری طرف التوائے جنگ تک جاپان کی برآمدی تجارت سہ گونہ سے بھی زیادہ بڑھ گئی تھی اور درآمدی تجارت میں ۲½ گونہ اضافہ ہوگیا تھا"[۱]

[۱] دیکھو پینڈیکر کی محولۂ بالا کتاب صفحہ ۵۵۔

لیکن ہندوستان کی جنگ کے زمانے کی تجارت خارجہ کی ایک خوش آیند خصوصیت یہ تھی کہ مصنوعات کی برآمد میں اضافہ ہوا، چنانچہ ۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۴ء میں کل برآمدی تجارت کے مقابلے میں مصنوعات کی برآمد کا جو تناسب ۲۲،۴ فی صد تھا وہ ۱۹۱۸ء تا ۱۹۱۹ء میں ۳۶،۱ فیصد تک بڑھ گیا۔ اگرچہ کنیڈا جیسے دوسرے ملکوں کی حد تک یہ اضافہ اور بھی زیادہ نمایاں تھا۔ پہلے یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جنگ عظیم نے کپاس، سن، چرم، فولاد اور آہن جیسی ہندوستانی صنعتوں کے حق میں مصنوعی محرک کا کام کیا۔ چنانچہ مصنوعات کی برآمد میں انہی کی بدولت اضافہ ہوا۔ لیکن اگر ہندوستان اپنی منڈیوں سے غیر ملکی مسابقت کے عارضی طور پر ہٹ جانے سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہوتا تو وہ مصنوعات کی اور بھی زیادہ مقدار برآمد کر سکتا تھا۔ اس سلسلے میں اس خیال کی اصلاح کر دینا ضروری ہے کہ جنگ عظیم کی بدولت ہندوستان بہت خوشحال ہو گیا۔ ہندوستان کے موافق توازن تجارت میں جو غیر معمولی اضافہ ہوا وہ خالص نعمت ہی نہیں تھا۔ بلکہ اس کی وجہ سے زر کی مقدار میں زائد از ضرورت اضافہ ہو گیا، چنانچہ کاغذی زر اور روپے کے سکوں کی بڑی مقدار رائج ہو گئی[1]۔ درآمد میں جبری کمی کی وجہ سے بہت سخت مشکلات رونما ہوئیں۔ گو بعض تاجروں نے خاصکر بڑے شہروں میں اپنی ضرورت اور اپنے مصرف سے بظاہر بہت زیادہ روپیہ کما لیا، لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ عام طور پر معیار زندگی میں اضافہ ہوا، اور یہ بالکل یقینی ہے کہ قیمتوں کے عظیم اضافے کی وجہ سے عوام کی بہت بڑی تعداد پر مضر اثر پڑا[2]۔

۵۔ زمانۂ بعد از جنگ کی تجارت ۱۹۱۹ء تا ۱۹۳۷ء

زمانۂ بعد از جنگ میں تجارت میں جو تغیر اور ترقی رونما ہوئی اس کی بحث کی تمہید کے طور پر مندرجۂ ذیل اعداد کار آمد ثابت ہو سکتے ہیں۔

---

[1] اس مسئلے کی زیادہ مفصل بحث کے لیے دیکھو باب۔

[2] دیکھو بینڈ یکر کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۷۶ تا صفحہ ۷۸۔

کئی دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی زمانۂ بعد از جنگ کے ابتدائی حصے کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ زمانۂ جنگ میں برآمد پر جو بندشیں عائد کی گئی تھیں ان میں سے اکثر کے ہٹا لیے جانے کی وجہ سے نیز اس وجہ سے کہ جہازی باربرداری کے کرایے میں کمی ہوئی اور غنیم ملکوں کے ساتھ تجارتی تعلقات بتدریج دوبارہ قائم ہو گئے، تجارتی گرم بازاری رونما ہوئی۔

کل اشیا بہ شمول سرکاری سامان کی بحری تجارت کی مالیت بحساب کروڑ روپیہ

سال	درآمد	برآمد	خالص برآمد[1]
سنہ ۱۹۱۹ تا سنہ ۱۹۲۰	۲۲۱؍۷۰	۳۳۶؍۰۲	+۱۱۴؍۳۲
سنہ ۱۹۲۰ تا سنہ ۱۹۲۱	۳۴۷؍۵۶	۲۶۷؍۷۶	-۷۹؍۸۰
سنہ ۱۹۲۱ تا سنہ ۱۹۲۲	۲۸۲؍۵۹	۲۴۸؍۶۵	-۳۳؍۹۴
سنہ ۱۹۲۲ تا سنہ ۱۹۲۳	۲۴۶؍۱۹	۳۱۶؍۰۷	+۶۹؍۸۸
سنہ ۱۹۲۳ تا سنہ ۱۹۲۴	۲۳۷؍۱۸	۳۶۳؍۳۷	+۱۲۶؍۱۹
سنہ ۱۹۲۴ تا سنہ ۱۹۲۵	۲۵۳؍۳۷	۴۰۰؍۳۴	+۱۴۶؍۸۷
سنہ ۱۹۲۵ تا سنہ ۱۹۲۶	۲۳۶؍۰۰	۳۸۶؍۸۲	+۱۵۰؍۸۲
سنہ ۱۹۲۶ تا سنہ ۱۹۲۷	۲۴۰؍۸۲	۳۱۱؍۰۵	+۷۰؍۲۳
سنہ ۱۹۲۷ تا سنہ ۱۹۲۸	۲۶۱؍۵۳	۳۳۰؍۲۶	+۶۸؍۷۳
سنہ ۱۹۲۸ تا سنہ ۱۹۲۹	۲۶۳؍۴	۳۳۹؍۱۵	+۷۵؍۷۵
سنہ ۱۹۲۹ تا سنہ ۱۹۳۰	۲۴۹؍۷۱	۳۱۸؍۹۹	+۶۹؍۲۸
سنہ ۱۹۳۰ تا سنہ ۱۹۳۱	۱۷۳؍۰۶	۲۲۶؍۵۰	+۵۳؍۴۴
سنہ ۱۹۳۱ تا سنہ ۱۹۳۲	۱۳۰؍۰۴	۱۶۱؍۲۰	+۳۱؍۱۶
سنہ ۱۹۳۲ تا سنہ ۱۹۳۳	۱۳۵؍۰۳	۱۳۶؍۰۷	+۱؍۰۵
سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴	۱۱۷؍۳۱	۱۵۰؍۲۳	+۳۲؍۹۲
سنہ ۱۹۳۴ تا سنہ ۱۹۳۵	۱۳۴؍۵۹	۱۵۵؍۰۴	+۲۰؍۴۵
سنہ ۱۹۳۵ تا سنہ ۱۹۳۶	۱۳۴؍۴۳	۱۶۴؍۲۹	+۲۹؍۸۶
سنہ ۱۹۳۶ تا سنہ ۱۹۳۷	۱۲۵؍۲۴	۲۰۲؍۳۷	+۷۷؍۱۳

[1] گزشتہ سات سال میں سرکاری سامان کو خارج کر کے خانگی تجارتی مال (بحری تجارت) کی خالص

مغربی ملکوں میں صنعتوں کی تنظیم جدید کے لیے ہندوستانی پیداوار کی مانگ بھی بہت زیادہ تھی۔ اگر ہندوستان میں ریلوں کی مصروفیت دوسرے کاموں میں زیادہ نہ ہوتی، قیمتیں اعلیٰ نہ ہوتیں، مزدوروں کے جھگڑے رونما نہ ہوتے، مبادلات خارجہ مستحکم ہوتے، روپے کی قیمت مبادلہ میں اضافہ نہ ہوتا اور سنہ ۱۹۱۸ء تا سنہ ۱۹۱۹ء کی بارش کی کمی کے باعث غلے کی برآمد پر بندشیں عائد نہ کی جاتیں تو، تجارت کا احیاء خاصکر برآمد کی حدتک اور بھی زیادہ نمایاں ہوتا۔ بہرحال زمانہ بعد از جنگ کی تجارتی گرماگرمی بہت تیز رفتار تھی، اور یہ ناگزیر تھا کہ بہت زمانہ گزرنے سے قبل سرد بازاری اس کی جگہ لے۔ چنانچہ سال سنہ ۱۹۲۰ء تا سنہ ۱۹۲۱ء کے آخری حصے میں اس کی علامتیں صاف طور پر نمایاں ہوگئیں۔ برآمدی تجارت پہلے متاثر ہوئی۔ برطانیہ عظمیٰ، ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جاپان ہندوستان کے بہترین گاہکوں میں سے تھے۔ ان کی منڈیاں ہندوستانی پیداوار سے بھر گئیں اور ان کی مانگ میں خاص کمی رونما ہوئی۔ مرکزی یورپ کے ملک زمانۂ قبل از جنگ میں ہندوستانی پیداوار کے لیے بہت ہی قابل قدر منڈی رہ چکے تھے، اور ان کو ہندوستانی پیداوار کی اب بھی سخت ضرورت تھی۔ لیکن چونکہ ان کے ذرایع تباہ ہوگئے تھے اور قوت خرید میں کمی ہوگئی تھی اس لیے وہ خریداری نہ کر سکتے تھے ان ملکوں میں زر کی مسلسل افراط ہوتی رہی، غیر ملکی زروں کے اعتبار سے ان کے زر کی قیمت میں غیر معمولی کمی ہوگئی تھی اور اس کے ساتھ ان میں یہ قابلیت نہ رہی تھی کہ غیر ممالک میں اعتبار حاصل کریں۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی حالت بد سے بدتر ہوگئی۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ برآمد (یعنی وہ فاضل برآمد جو مجموعی برآمد میں سے مجموعی درآمد کو منہا کرنے کے بعد ہوئی) حسب ذیل ہوئی۔ سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۱ء میں ۱۹ کرور روپیہ، سنہ ۱۹۳۱ء تا سنہ ۱۹۳۲ء میں ۳۴ کرور روپیہ، سنہ ۱۹۳۲ء تا سنہ ۱۹۳۳ء میں ۳ کرور روپیہ، سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء میں ۳۵ کرور روپیہ، سنہ ۱۹۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء میں ۲۳ کرور، سنہ ۱۹۳۵ء تا سنہ ۱۹۳۶ء میں ۳۱ کرور روپیہ، سنہ ۱۹۳۶ء تا سنہ ۱۹۳۷ء میں ۷۲ کرور روپیہ۔

ہندوستان میں بارش غیر اطمینان بخش ہوئی اور غذائی اشیا کی قیمتیں چڑھ گئیں۔ اس لیے یہ ضروری ہوگیا کہ غذائی اشیا کی برآمد پر بندش کو جاری رکھا جائے۔ جاپان میں سخت تجارتی بحران رونما ہوا جس کی وجہ سے جاپان کو ہندوستانی کپاس کی برآمد رک گئی۔ حکومت نے بے بنگ ٹن اسمتھ کمیٹی[1] کی سفارش پر روپے کی قیمت مبادلہ سونے میں ۲ شلنگ پر مستحکم کرنے کی جو بد انجام کوشش کی ھ ۲۳۸
اس نے برآمدی تجارت کو جو پہلے سے کمزور تھی اور بھی مفلوج کر دیا۔ برخلاف اس کے درآمدی تجارت میں بہت تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا۔ جنگ کے زمانے میں درآمدی اشیا کی حد تک ہندوستان کی مانگ تشنہ رہ گئی تھی اور کلوں اور دوسری مصنوعات کی فرمائشیں جنگ کے زمانے میں اور التوائے جنگ کے بعد اس شرط کے ساتھ روانہ کی گئی تھیں کہ کارخانے والے اپنی سہولت کے لحاظ سے مال روانہ کریں۔ یہ مال اب ملک میں آنا شروع ہوگیا۔ اعلیٰ شرح مبادلہ نے بھی درآمدی تجارت کے حق میں طاقتور محرک کا کام کیا اور غیر ملکی مصنوعات کے لیے کثیر مقداروں میں فرمائشیں روانہ کی گئیں۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ توازن تجارت ہندوستان کے بہت زیادہ مخالف ہوگیا۔ چنانچہ اس کی مقدار ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۱ء میں ۷۹٫۸۰ کروڑ روپیہ اور اس کے بعد کے سال ۳۳٫۹۴ کروڑ روپیہ تھی۔ ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۲ء میں کساد بازاری دور نہیں ہوئی، اور روپے کی قیمت کے گر جانے اور اس کو دو شلنگ کی شرح پر مستحکم کرنے کی ناکامی کی وجہ سے سامان درآمد کرنے والوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔

۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۳ء کے بعد بحالی کے آثار نمودار ہوئے۔ کم از کم درآمدی تجارت کی حد تک معمولی حالات کی طرف بحالی کا میلان ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء تک مسلسل نمایاں رہا۔ تدریجی بحالی کے لیے جو اسباب کام کر رہے تھے وہ یہ تھے کہ یورپین ملکوں کے زر بتدریج مستحکم ہو رہے تھے، وسطی یورپ کے ملکوں کی اعتباری حیثیت میں

۱۔ دیکھو باب (۷)۔

اصلاح و ترقی ہو رہی تھی اور ۱۹۲۴ء میں تاوان کے مسئلے کا تصفیہ ڈاز اسکیم کے ذریعہ سے ہو گیا تھا۔ یہاں یہ کہدینا مناسب ہوگا کہ مجلس اقوام نے آسٹریا اور ہنگری کے زردن کے استحکام میں مدد دے کر بحالی کی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے میں مفید مدد کی۔ گو صورت حال کی اصلاح ہو گئی لیکن وہ پوری طرح اطمینان بخش ہرگز نہیں ہوئی جس کا باعث دوسرے اسباب کے منجملہ ایک یہ واقعہ تھا کہ بین قومی مالی مسئلہ صورت حال پر چھایا ہوا تھا اور یورپ کو ابھی تک زمانۂ جنگ کے ترکے یعنی محصولات کی بندشوں سے چھٹکارا نہیں ملا تھا۔ اسی کے ساتھ محصولات کی شرحوں میں غیر معمولی تغیرات ہو رہے تھے۔ اور اعتبار پیدائش دولت اور قوت خرید میں انقباض پایا جاتا تھا۔ لیکن یورپ کے علاوہ دوسرے ملکوں کے معاشی حالات میں زیادہ استحکام پیدا ہو رہا تھا۔ چنانچہ برطانیہ عظمیٰ کو کوئلے کی کانوں کی طویل ہڑتال کے پستی پیدا کرنے والے اثرات سے افاقہ ہو گیا تھا، اٹلی معیار طلا پر واپس آگیا تھا، اور فرانسیسی مبادلہ بڑی حد تک مستحکم ہو گیا تھا۔ یہ ترقی ۲۹-۱۹۲۸ء تک جاری رہی لیکن اس کے بعد ہی ایسی کساد بازاری رونما ہوئی جو اپنی وسعت کے اعتبار سے عالمگیر اور بے نظیر تھی۔

۷۔ عالمی معاشی کساد بازاری کے زمانے میں ہندوستان کی تجارت

ص ۲۲۹ وال اسٹریٹ کی حالت اچانک سقیم ہوتے ہی اکتوبر ۱۹۲۹ء میں تجارت میں زوال کا میلان شروع ہوا اور اس کے بعد ہی دنیا کے اکثر ملکوں میں بھی پھیل گیا۔ ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۴ء تک سات سال کے دوران میں تجارتی کساد بازاری کا دور دورہ رہا جس کے اسباب کا حسب ذیل خلاصہ کیا جا سکتا ہے:۔ (۱) خام اشیاء اور مصنوعات کی حد تک عام طور پر اور خام اشیا کی حد تک خاص طور پر صرف کی معمول شرح کے مقابلے میں پیدائش کی شرح بہت زیادہ رہی۔ (۲) مالی اسباب، خاص کر یہ کہ امریکا اور فرانس میں سونا جمع ہو گیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے ملکوں کے مرکزی بنکوں کے محفوظ ذخیروں میں کمی ہو گئی اور اس کے نتیجے کے طور پر ان بنکوں نے

زر کے اجرا میں تفریطی پالیسی سے کام لینا شروع کیا یہاں تک کہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں برطانیہ عظمیٰ نے معیار طلا کو ترک کر دیا۔ چنانچہ ہندوستان اور اکثر دوسرے ملکوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ (۳) سیاسی بے اطمینانی اور بے چینی دنیا کے اکثر ملکوں، خاصکر ہندوستان، چین، جنوبی امریکا اور بعد میں چل کر دوسرے ملکوں میں پھیل گئی۔ مبادلات کی شرحوں کے غیر مستحکم ہو جانے کے زمانے میں جس کا آغاز تمام دنیا میں معیار طلا کے ترک کر دیے جانے کی وجہ سے ہوا تجارت پر محصولوں، حصہ رسدی، مبادلے کی نگرانی وغیرہ کی شکل میں کئی بندشیں عائد تھیں اور ان کا اثر عالمی تجارت پر اور بھی زیادہ مضر پڑا۔ ان سب عاملوں نے ہندوستان کی تجارت خارجہ کی راہ میں رکاوٹ پیدا کی۔ چنانچہ اس واقعے کو صفحہ ۲۳۷ اور صفحہ ۲۴۳ پر مندرجہ جدولوں میں اور صفحہ ۲۴۴ اور ۲۴۷ پر مندرجہ جدول ۱۱۳ میں بخوبی واضح کر دیا گیا ہے۔ برآمدی اشیا کی مالیت کی کمی کا باعث زیادہ تر یہ تھا کہ زرعی خام اشیا[1] کی قیمتوں میں تباہ کن کمی ہو گئی تھی اور ہندوستان کی معیاری برآمدی اشیا کی غیر ملکی طلب گھٹ گئی تھی۔ درآمدی اشیا کی مالیت کی کمی کا باعث زیادہ تر یہ تھا کہ ہندوستان میں صارفوں کی قوت خرید میں کمی ہو گئی تھی، ملک کی سیاسی صورت حال نازک ہو گئی تھی اور ملک کے اندر پارچہ اور شکر کی تیاری نے وسعت حاصل کر لی تھی جس کے حق میں امتیازی تامین کی اس پالیسی نے محرک کا کام کیا جس کو ہندوستان نے ۱۹۲۴ء سے اختیار کر رکھا تھا۔

درآمدی اشیا کے مقابلے میں برآمدی اشیا کی کمی فطری طور پر بہت زیادہ رہی۔ اس کا باعث یہ واقعہ تھا کہ زرعی پیداوار اور خام اشیا جن پر ہندوستانی برآمد کا بڑا حصہ مشتمل ہوتا تھا ان کی قیمتیں مصنوعات کی قیمتوں کے مقابلے میں جن پر ہندوستانی درآمدی اشیا کا بڑا حصہ مشتمل ہوتا تھا بہت زیادہ گر گئی تھیں۔ اگر برطانیہ کے معیار طلا سے ہٹ جانے کے بعد ہندوستان سے سونے کی

[1] دیکھو باب (۹)۔

بہت بڑی مقدار برآمد نہ کی جاتی تو ہندوستان کے موافق جو توازن تجارت
تھا وہ گھٹ کر بہت ہی معمولی رہ جاتا[1]۔ برآمدی تجارت کی کساد بازاری سب
سے زیادہ شدید ۱۹۳۲ء میں رہی۔ چنانچہ برآمدی اشیا کی مالیت اس سال
۱۳۶ کروڑ روپے تک گھٹ گئی تھی اور تجارتی مال کی حد تک ظاہری توازن تجارت صفحہ ۲۴۰
صرف بقدر ۳ کروڑ روپیہ تھا۔ موافق توازن تجارت کے اس قدر کم ہو جانے کی
اس سے پیشتر کوئی نظیر نہیں ملتی۔ عالمی کساد بازاری کی بدترین حالت ۱۹۳۲ء میں
ختم ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۳۳ء کے ابتدائی مہینوں میں زر کی قیمت گر جانے اور اس
کی ارزانی کی وجہ سے اکثر ملکوں میں کاروباری گرما گرمی کا بہت بڑی حد تک
احیاء ہوا۔ اسی کے ساتھ معاشی قومیت کا عام میلان رونما ہوا جس کے اثر کے
تحت ہر ملک یہ کوشش کرنے لگا کہ اپنی منڈیوں کو اپنے قوم والوں کے لیے
محفوظ رکھے، اور لندن میں (۱۹۳۳ء میں) عالمی معاشی و مالی کانفرنس منعقد ہوئی
جو دنیا کے زروں کو مستحکم کرنے میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مخالفانہ طرز عمل کے
باعث ناکام رہی۔ ان دونوں باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کی تجارت کی بحالی میں
رکاوٹ پیدا ہو گئی۔

صدر جمہوریہ امریکا روزویلٹ کی "بحالی کی تجویز" میں مالیہ اور صنعت کو
اشتراکیت کے اصول پر ڈھالنے کا جو عظیم الشان تجربہ کیا گیا اس نے جہاں دنیا کی
قیمتوں پر کسی حد تک مفید اثر ڈالا وہیں دنیا کی اشیا کی قیمتوں کے قدرتی اور حقیقی
اضافے کے آغاز کو دھندلا کر دیا، وہ اس طرح کہ امریکا میں زر کے افراطی اجرا کی
توقع کی بنا پر سٹہ شروع ہوا جس کی وجہ سے قیمتوں میں بہت بڑا مصنوعی اضافہ
ہو گیا۔ ڈالر کی قیمت کی بے ثباتی کے زمانے نے بڑھتی ہوئی بین قومی تجارت
کی مشکلات کو غالباً اور بھی بڑھا دیا۔ "بحالی کی تجویز" نے بعض صورتوں میں موجودہ
عدم تیقن میں اضافہ کر دیا اور کاروبار کے موجودہ ڈھنگ اور مروجہ طریق میں خلل
پیدا کر دیا۔ گزشتہ چند سالوں کی تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ اندرونی تنظیم اور سدھار کی

[1] - دیکھو فصل (۱۶)، نیز باب (۸)۔

تدابیر معاشی بحالی کے لیے محرک بہم پہنچانے میں صرف محدود طریقے پر کامیاب ہوتی ہیں۔ پھر بھی بحیثیت مجموعی ۱۹۳۳-۳۴ء میں اس بات کی خفیف علامتیں پائی جاتی تھیں کہ مشکل دور سے نکلنے کا وقت قریب آگیا تھا اور یہ کہ کساد بازاری میں کم از کم کچھ اصلاح ہوئی تھی۔ جولائی تا اگست ۱۹۳۲ء میں جو شاہی معاشی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں حکومت ہند اور حکومت سلطنت متحدہ کے درمیان "راضی نامۂ اوٹاوا" طے پایا اور اس کے نتیجے کے طور پر ترجیحی محصول عائد کیے گئے تھے۔ چنانچہ ہندوستان میں ۱۹۳۳-۳۴ء ان محصولوں کے عائد کیے جانے کے بعد پہلا سال تھا۔ اس راضی نامہ کے نتائج کی جانچ کے لیے دیکھو باب ۱۳۔ راضی نامۂ اوٹاوا سے قطع نظر کرتے ہوئے، ہندوستان کی صورت حال میں بعض قوانین کے حال ہی میں وضع ہونے کی وجہ سے بڑی حد تک تبدیلی ہوگئی ہے (دیکھو باب ۳)۔ ان قوانین کا مقصد یہ تھا کہ شدید جاپانی مسابقت سے نبٹا جائے۔ جاپان کے ساتھ جدید تجارتی راضی نامے کا طے پا جانا بہت اہمیت رکھتا تھا۔ چنانچہ راضی نامہ ۱۹۳۴ء کے اوائل میں نافذ ہوا (دیکھو باب ۱۳)۔ اس معاہدے کا اس غیر سرکاری گفت وشنید سے بہت گہرا تعلق تھا جس کے نتیجے کے طور پر "موڈی لیز" راضی نامہ طے پایا۔ چنانچہ آخری باب میں اس راضی نامے پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ۱۹۳۳-۳۴ء میں ہندوستان کی برآمدی تجارت اور ظاہری توازن تجارت میں کچھ ترقی نمودار ہوئی۔ لیکن زرعی حالت بڑی حد تک ویسے ہی رہی۔

۸۔ دنیا کی معاشی بحالی اور ہندوستان کی تجارت

ص ۲۱۱ ۱۹۳۴-۳۵ء، ۱۹۳۵-۳۶ء اور ۱۹۳۶-۳۷ء میں معاشی بحالی کے تدریجی عمل میں مزید ترقی رونما ہوئی۔ شروع شروع میں اصلاح وترقی خاص ملکوں یا صنعتوں تک محدود تھی۔ لیکن ۱۹۳۶ء میں ایسا معلوم ہوا کہ دنیا عظیم کساد بازاری کے تباہ کن حالات سے قطعی طور پر باہر نکل گئی۔ کئی اسباب نے اکثر اشیا کی قیمتوں میں اضافہ کردیا۔ مثلاً بنیادی اشیاء کے ذخیروں کا ۱۹۳۴ء سے تدریجی طور پر ختم ہونا، بعض بڑے تاجروں کا مختلف اشیا کی تیاری کی تنظیم کے لیے بندش کی تجویزوں کا اپنی

خوشی سے اختیار کر لینا، معیار طلا رکھنے والے ملکوں میں جن کی قیادت فرانس کر رہا تھا، حالات کا نازک ہو جانا اور ستمبر ۱۹۳۶ء میں سابقہ سونے کے سکوں کی قیمت کا گر جانا۔ ۱۹۳۷ء میں قیمتوں کا اضافہ نمایاں ہو گیا جس کا باعث ایک خاص عامل تھا۔ یعنی یہ کہ اکثر ملکوں کی حکومتوں نے اسلحہ پر بھاری رقمیں خرچ کرنی شروع کیں۔ چنانچہ ان بھاری مصارف نے بھاری صنعتوں کے حق میں بہت بڑے محرک کا کام کیا اور عام معاشی صورت حال پر بھی مفید اثر ڈالا۔ بحالی اب بھی زیادہ تر قومی نوعیت رکھتی تھی اور اس کی وجہ سے بین قومی تجارت میں اسی کے مثل ترقی نہیں ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء کے مقابلے میں ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں اس کی مقدار ۱۵ فیصد کم رہی۔ بین قومی تجارت کے حالات و شرایط کساد بازاری کے ختم کے زمانے سے زیادہ آزاد نہ تھے جب کہ خاص کر جرمنی اور اٹلی جن سے اکثر ملکوں نے اعلی درآمدی محصول، حصۂ رسدی، تصفیہ حسابات کے راضی ناموں اور تجارت کو منتظم کرنے کی دوسری تدابیر اختیار کر رکھی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ چند سالوں میں دنیا کی تجارت کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک یہ رہی ہے کہ دور رخا میلان روز افزوں ہے۔ کچھ سال ادھر سے خاصکر جب سے کہ براعظم یورپ کے زروں کی قیمت گھٹ گئی، تجارت کو زیادہ آزاد بنانے اور اس کی راہ سے مصنوعی رکاوٹوں کو دور کرنے کی تحریک نے خصوصاً دنیا کی تین بڑی جمہوریتوں یعنی انگلستان، فرانس اور امریکا میں زیادہ مقبولیت اور طاقت حاصل کر لی ہے۔ لیکن اس کے باوجود خیالات کی اس تبدیلی کے مادی نتائج بہت کم ظاہر ہوئے ہیں[1]۔

ہندوستان نے بھی بحالی کی طرف دنیا کے عام میلان کا ساتھ دیا۔ لیکن ہندوستان کے خاص خیالات کا باعث ہندوستان کی بحالی کی رفتار دوسرے ملکوں کے مقابلے میں کسی قدر مختلف تھی۔ باوجود اس کے کہ صنعتی کارخانے بہت تیزی کے ساتھ کھلے، ہندوستان اب بھی غالب حیثیت سے ایک زراعتی ملک ہے؛ اور اس کے باشندوں کی معاشی خوشحالی کا انحصار بڑی حد تک ہندوستان کے اندر

---

[1] ملاحظہ ہو ایک رپورٹ موسومہ "تبصرہ بر تجارت ہند بابت ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۷" صفحہ ۱ اور ۲۔

اور باہر کے زرعی حالات پر ہے۔ ۱۹۲۹ء میں جو کساد بازاری شروع ہوئی اس نے ہندوستان جیسے زرعی ملکوں کو بہت سخت نقصان پہنچایا اس لیے کہ بنیادی پیداوار کی قیمتوں میں اتنی کمی ہوگئی کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ یوں تو زرعی پیداوار کی قیمتوں کا اضافہ کچھ پہلے ہی شروع ہوچکا تھا، لیکن صرف ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں ہندوستان کی زرعی پیداوار کی قیمتوں میں قابل لحاظ اور نمایاں اضافہ ہوا (اس سلسلے میں ملاحظہ ہو باب ۱۰)۔ تاہم اس سال کا اضافہ بھی اکثر اشیا کی حد تک ۱۹۲۸ء تا ۱۹۲۹ء کے مقابلے میں بدرجہا کم تھا۔ یہ نمایاں اصلاح و ترقی اس بحالی کا نتیجہ تھی جو بنیادی اشیا اور خام مال کی طلب میں رونما ہوئی تھی۔ صنعتی و زرعی پیداوار کی قیمتوں کے درمیان جو بل تھا وہ ۱۹۳۶ء کے وسط کے بعد سے خاص طور پر نمایاں ہوگیا، اور ہندوستان جیسے زرعی ملکوں کے معاشی حالات پر اس فرق کی تدریجی اصلاح کا مفید اثر پڑا۔ اس کے نتیجے کے طور پر ہندوستان کی تجارت، خاصکر برآمدی تجارت میں بہت بڑی حد تک بحالی رونما ہوئی۔ یہ بات ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء کے لیے خاص طور پر صادق آتی ہے چنانچہ ایک سال پیشتر کے مقابلے میں کم و بیش ۳۶ کرور روپیہ کی ترقی ظاہر ہوئی۔ ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں خانگی تجارتی مال کی حد تک ہندوستان کے موافق توازن تجارت ۳ کرور روپے تک گھٹ گیا تھا لیکن ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں ۷۸ کرور روپے تک بڑھ گیا۔[1] ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں برآمدی سامان کی مالیت ۱۹۶ کرور روپیہ تھی، پھر بھی یہ مقدار کساد بازاری سے پیشتر کے سال یعنی ۱۹۲۸ء تا ۱۹۲۹ء کے مقابلے میں ۱۴۳ کرور روپیہ یا ۴۱ فیصد کم تھی۔ اتنے بڑے گھاٹے کا باعث تمامتر یہ امر تھا کہ برآمد کردہ اشیا کی قیمتیں کم تھیں۔ ۲۴۲

---

[1] ۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۸ء میں خاصکر اس سال کے آخری حصے میں ہندوستان کی تجارت کی ترقی میں کمی ہوئی اس کا باعث کسی حد تک یہ امر تھا کہ جاپان سے ہندوستان کی جو برآمدی تجارت تھی اس پر چین و جاپان کی جنگ کے اثرات پڑے اور کسی حد تک یہ امر تھا کہ عام کساد بازاری کا اثر ہندوستان پر پڑا۔ کپاس کی عالمی قیمت کے بڑی حد تک گر جانے کی وجہ سے بھی اس نتیجے کے پیدا ہونے میں مدد ملی۔ غرض ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ موافق توازن تجارت سابقہ سال کے مقابلے میں گھٹ گیا۔

خیا سنہ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں اس کمی کا تناسب ۱۹۲۸ء تا ۱۹۲۹ء کے مقابلے میں ۴۱ فیصد تھا۔ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں برآمد کردہ اشیا کی مجموعی مقدار ۱۹۲۸ء تا ۱۹۲۹ء کے مقابلے میں کچھ ہی زیادہ رہی۔ برخلاف اس کے ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں درآمدہ اشیا کی مالیت ایک سال پیشتر کے ۱۳۴ کروڑ روپے کے مقابلے میں ۱۲۵ کرور روپے تھی۔ ۱۹۲۸ء تا ۱۹۲۹ء میں درآمدہ اشیا کی مالیت ۲۵۳ کروڑ روپیہ تھی جس کے مقابلے میں ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں بقدر ۵۱ فیصد کمی ہوئی۔ لیکن اس کمی کا باعث صرف کسی حد تک قیمتوں کی کمی تھی۔ ۱۹۲۸ء تا ۱۹۲۹ء کے مقابلے میں درآمدہ اشیا کی قیمتوں میں صرف بقدر ۳۵ فیصد کمی ہوئی تھی اور اس لحاظ سے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ درآمدہ اشیا کی مقدار میں برآمد کردہ اشیا کے برعکس کساد بازاری سے پیشتر کی سطح کے مقابلے میں بہت زیادہ کمی ہوئی۔

۹۔ ہندوستانی تجارت کی مقدار

مندرجۂ ذیل جدول سے مذکورۂ بالا بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ تجارت کی مقدار کے تغیرات کو واضح کرنے کے لیے درآمدی و برآمدی اشیا کی مالیتوں کو ان مالیتوں کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے جن کی تفصیل ۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۸ء میں بحساب فی اکائی بتلائی جا چکی تھی اور ان کو ذیل میں درج کر دیا گیا ہے۔ ۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۸ء کے مقابلے میں درآمدی و برآمدی اشیا کی قیمتوں کی سطح میں جو تغیرات ہوئے وہ بھی انڈکس نمبروں کے ذریعے سے بتلا دیے گئے ہیں اور یہ انڈکس نمبر اس سال کے اعداد سے ہر سال کی قلمبند کی ہوئی حقیقی مالیتوں کا مقابلہ کر کے حاصل کیے گئے ہیں۔ اگرچہ اعداد و شمار لازمی طور پر پوری طرح صحیح نہیں ہیں، پھر بھی ان سے ہندوستان کی تجارت اور قیمتوں کی رفتار کا تخمینی حال معلوم ہو جاتا ہے۔

صہ ۲۲۳

تجارت کی مقدار اور قیمتوں کی سطح

سال	مقدار		قیمتوں کی سطح	
	برآمدی اشیا	درآمدی اشیا	برآمد	درآمد
	کروڑ روپیہ	کروڑ روپیہ		
سنہ ۱۹۲۷ء تا سنہ ۱۹۲۸ء	۳۱۹٫۲ (۱۰۰٫۰)	۲۴۹٫۸ (۱۰۰٫۰)	۱۰۰٫۰	۱۰۰٫۰
سنہ ۱۹۲۸ء تا سنہ ۱۹۲۹ء	۳۳۸٫۶ (۱۰۶٫۱)	۲۶۲٫۸ (۱۰۵٫۲)	۹۷٫۵	۹۶٫۴
سنہ ۱۹۲۹ء تا سنہ ۱۹۳۰ء	۳۴۴٫۶ (۱۰۸٫۱)	۲۵۸٫۴ (۱۰۳٫۴)	۹۰٫۲	۹۳٫۲
سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۱ء	۳۰۸٫۴ (۹۶٫۶)	۲۰۶٫۰ (۸۲٫۵)	۷۱٫۵	۸۰٫۰
سنہ ۱۹۳۱ء تا سنہ ۱۹۳۲ء	۲۶۳٫۳ (۸۲٫۵)	۱۶۹٫۳ (۷۰٫۶)	۵۹٫۲	۷۱٫۷
سنہ ۱۹۳۲ء تا سنہ ۱۹۳۳ء	۲۳۹٫۲ (۷۴٫۹)	۲۰۳٫۴ (۸۱٫۴)	۵۵٫۳	۶۵٫۲
سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء	۲۷۵٫۲ (۸۶٫۲)	۱۸۱٫۷ (۷۲٫۷)	۵۳٫۵	۶۳٫۵
سنہ ۱۹۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء	۲۸۰٫۴ (۸۷٫۸)	۲۱۰٫۰ (۸۴٫۱)	۵۴٫۱	۶۳٫۰
سنہ ۱۹۳۵ء تا سنہ ۱۹۳۶ء	۲۸۲٫۱ (۸۸٫۴)	۲۱۶٫۴ (۸۶٫۶)	۵۶٫۹	۶۲٫۱
سنہ ۱۹۳۶ء تا سنہ ۱۹۳۷ء	۳۴۳٫۹ (۱۰۷٫۴)	۱۹۹٫۴ (۷۹٫۸)	۵۷٫۳	۶۲٫۸

اس جدول سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی برآمدی اشیا کی مقدار ۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۸ء اور ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء کے درمیان قریب قریب ۸ فیصد بڑھنے کے بعد اکتوبر ۱۹۲۹ء میں فطری طور پر گھٹ گئی جب کہ کساد بازاری کا آغاز ہوا۔ انتہائی کمی ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں رونما ہوئی۔ چنانچہ اس کا تناسب ۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۸ء کی سطح کا ۷۵ فیصد اور ۱۹۲۸ء تا ۱۹۲۹ء کی سطح کا تقریباً ۷۱ فیصد تھا۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء سے اس تناسب میں بتدریج اضافہ شروع ہوا، ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں اضافہ خاص طور پر نمایاں ہوگیا۔ چنانچہ وہ ۱۹۲۸ء تا ۱۹۲۹ء کے عدد کے مقابلے میں ۱ فیصد زیادہ اور ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء کے عدد کے مقابلے میں صرف ½ فیصد کم تھا۔ درآمدی اشیا کی مقدار ۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۸ء کے مقابلے میں ۱۹۲۸ء تا ۱۹۲۹ء میں ۵ فیصد بڑھ گئی۔ ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء میں ۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۸ء کے مقابلے میں ۲۹ فی صد کم رہی۔ ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں درآمدی تجارت میں کچھ ترقی ہوئی، لیکن دوسرے ہی سال اس میں پھر کمی ہوگئی اور ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء کی کمترین مقدار سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں ہندوستان میں کچھ زیادہ مقدار میں درآمد کی گئیں چنانچہ ان کا تناسب ۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۸ء کے عدد کے مقابلے میں ۸۴ فیصد اور ۸۷ فیصد تھا۔ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں درآمدی اشیا کی مقدار پھر کم ہوگئی، اور بنیادی سال (۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۸ء) کا صرف ۸۰ فیصد رہی[1]

۱۰۔ ہندوستان کی بحری تجارت کی خصوصیات

اب ہندوستان کی بحری تجارت کی اہم خصوصیات کو جانچنا مناسب ہوگا۔ مندرجۂ ذیل جدول (۱) اور جدول (۲) میں پانچ قسموں کے تحت خانگی درآمدی مال اور خانگی برآمدی مال کی مالیت بتلائی گئی ہے اور جدول (۳) اور جدول (۴) میں یہ بتلایا گیا ہے کہ برطانوی ہند میں جو اہم اشیا درآمد کی گئیں اور برطانوی ہند سے جو اہم اشیا برآمد کی گئیں ان کی تقابلی اہمیت کیا تھی۔ ص ۲۴۴

[1] ملاحظہ ہو ایک رپورٹ موسوم بہ "تبصرہ بر تجارت ہند برائے ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء" صفحہ ۲۹۔

جدول (۱)

(درآمد)[۱]

بحساب کروڑ روپیہ

اشیا کی قسمیں	زمانۂ قبل از جنگ کا اوسط	زمانۂ جنگ کا اوسط	زمانۂ بعد از جنگ کا اوسط	سنہ ۱۹۳۵ء تا سنہ ۱۹۳۶ء	سنہ ۱۹۳۶ء تا سنہ ۱۹۳۷ء
۱۔ غذائی اشیاء مشروبات اور تمباکو	۲۱؍۸	۲۶؍۴	۳۷؍۸	۱۳؍۲	۱۱؍۱
۲۔ خام اشیا پیداوار اور مال جو مصنوعات کی تعریف میں داخل نہیں ہے	۱۰؍۱	۹؍۹	۱۹؍۰	۱۹؍۲	۱۹؍۴
۳۔ مکمل یا غیر مکمل مصنوعات	۱۱۱؍۸	۱۰۸؍۲	۱۹۳؍۶	۹۹؍۴	۹۲؍۴
۴۔ زندہ حیوانات	۰؍۴	۰؍۵	۰؍۲	۰؍۳	۰؍۳
۵۔ ڈاک سے موصولہ سامان جس کی صراحت نہیں کی گئی ہے	۱؍۷	۲؍۸	۴؍۴	۲؍۴	۲؍۱
حاصل میزان	۱۴۵؍۸	۱۴۷؍۸	۲۵۴؍۰	۱۳۴؍۴	۱۳۵؍۲

۱؎۔ ملاحظہ ہو ایک رپورٹ موسوم بہ تبصرہ بر تجارت ہند برائے سنہ ۱۹۳۶ء تا سنہ ۱۹۳۷ء صفحہ ۱۷۸-۱۷۹۔

جدول (۲)

(برآمد) سلہ

بحساب کروڑ روپیہ

اشیاء کی قسمیں	زمانۂ قبل از جنگ کا اوسط	زمانۂ جنگ کا اوسط	زمانۂ بعد از جنگ کا اوسط	۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء	۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء
۱۔ غذائی اشیاء مشروبات اور تمباکو	۶۳ر۰	۵۹ر۶	۵۹ر۷	۳۷ر۱	۴۰ر۲
۲۔ خام اشیاء پیداوار اور خام مال جو مصنوعات میں شمار نہیں ہو سکتا۔	۱۰۴ر۶	۸۶ر۴	۱۴۵ر۹	۷۹ر۲	۱۰۲ر۶
۳۔ مکمل یا غیر مکمل مصنوعات	۵۰ر۶	۶۸ر۴	۷۷ر۹	۴۲ر۲	۴۸ر۹
۴۔ زندہ حیوانات	۰ر۳	۰ر۲	۰ر۳	۰ر۱	۰ر۱
۵۔ ڈاک کے ذریعے موصولہ سامان	۰ر۹	۱ر۳	۲ر۵	۱ر۹	۴ر۳
صدر میزان	۲۱۹ر۴	۲۱۵ر۹	۲۸۶ر۳	۱۶۰ر۵	۱۹۶ر۱

سلہ۔ تبصرہ پر تجارت ہند برائے ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء صفحہ ۱۸۰، ۱۸۱۔

جدول ا تا ہ میں اس بیان کی توضیح و تشریح اعداد میں کی گئی ہے جس کو بار بار دھرایا گیا ہے کہ ہندوستان کی برآمدی اشیا زیادہ تر غذائی اشیا اور خام مال پر اور درآمدی اشیا مصنوعات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ہم اوپر بیان کرچکے ہیں کہ موجودہ زمانے کے ہندوستان کی تجارت کی یہ خصوصیت گزشتہ صدی کے ابتدائی دہوں کی تجارت خارجہ کی خصوصیت سے کس طرح نمایاں تضاد رکھتی ہے، اور اس کا بھی ذکر کرچکے ہیں کہ کس طرح ایک خصوصیت سے دوسری خصوصیت میں بتدریج تبدیلی ہوئی۔ اس سوال پر بھی بحث کی جاچکی ہے کہ ہندوستان سے غذائی اشیا اور خام مال برآمد کرنے کے بارے میں کون سی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ [ا۵] اسی طرح گزشتہ بابوں میں اس بات پر امکانی شدومد کے ساتھ زور دینے میں کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا گیا کہ ملک میں صنعتی ترقی کی رفتار کو تیز کرنا نہ صرف مناسب بلکہ ضروری ہے، تاکہ غیر ملکی مصنوعات پر موجودہ زمانے میں ہمارا جو انحصار ہے اس میں بڑی حد تک کمی ہوجائے۔

جنگ عظیم سے بہت پیشتر ہی سے اس سمت میں خفیف سی اصلاح و ترقی رونما ہوئی۔ چنانچہ مجموعی برآمدی اشیا کے مقابلے میں مصنوعات کی برآمد کا تناسب بتدریج بڑھ گیا تھا، اگرچہ زمانۂ قبل از جنگ کے مثل اس وقت بھی برآمدی سامان کا بیشتر حصہ غذائی اشیا اور خام مال پر مشتمل تھا جنگ عظیم کے زمانے میں ان اسباب کی بنا پر جن کو پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ اس تناسب میں خاصا اضافہ ہوگیا۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۴ء میں تناسب ۲۲.۴ فیصد تھا اور ۱۹۱۸ء تا ۱۹۱۹ء میں ۳۶.۰ فیصد تک بڑھ گیا۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ کچھ اصلاح و ترقی کے باوجود ہندوستان کی تجارت کی نمایاں خصوصیات ابھی تک اساسی طور پر وہی ہیں جو کہ اوپر بیان کی جاچکی ہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں درآمدی اشیا کا

[ا۵] ملاحظہ ہو جلد اول باب ۶۔

۹ر۳۷ فیصد مکمل یا غیر مکمل مصنوعات پر اور برآمدی اشیا کا قریب قریب ۹ر۳۷ فیصد خام مال اور غذائی اشیا پر مشتمل تھا۔

۱۱۔ درآمد و برآمد کا سرسری تجزیہ ۳۶-۱۹۳۵ء اور ۳۷-۱۹۳۶ء۔

(۱) درآمد۔ جدول (۳) سے معلوم ہوگا کہ درآمدی اشیا میں سوت اور سوتی کپڑوں کو خاص حیثیت حاصل ہے، اگرچہ ان کا تناسب مجموعی درآمدی اشیا کے مقابلے میں زمانۂ قبل از جنگ کا پنج سالہ اوسط یعنے ۳۶ فیصد سے ۳۶-۱۹۳۵ء میں ۲۰ر۷۶ فیصد تک اور ۳۷-۱۹۳۶ء میں ۱۸ر۶۳ فیصد تک گھٹ گیا۔ باب (۲) میں ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ سوتی کپڑوں کی درآمد میں نمایاں کمی ہونے کے کیا اسباب تھے۔ ۳۶-۱۹۳۵ء میں سوتی مصنوعات کی درآمد کی مجموعی مالیت ½۲۱ کروڑ روپے تھی لیکن ۳۷-۱۹۳۶ء میں یعنے دوسرے ہی سال درآمدہ سوتی مصنوعات کی مجموعی مالیت ۱۸ کروڑ روپے تک گھٹ گئی تھی۔ اس عام کمی میں سوت اور سوتی کپڑے دونوں شریک تھے ۳۷-۱۹۳۶ء میں سوت اور سوتی دھاگا ۲ کروڑ ۵۵ لاکھ روپے کی مالیت کا درآمد کیا گیا، اور یہ مالیت جس مقدار کی نمایندگی کر رہی تھی وہ وزن میں ۲۸ر۵ ملین پاونڈ تھی۔ اس سے پیشتر کے سال کے مقابلے میں وزن میں ۱۶ ملین پاونڈ یا ۳۶ فیصد اور مالیت میں ۱ کروڑ ۱۶ لاکھ روپے یا ۳۱ فیصد کی کمی ہوئی۔ یہ کمی زیادہ تر بھورے رنگ کے سوت کی درآمد میں ظاہر ہوئی اس کے برخلاف سفید، رنگین اور ملائم اور چمکیلے سوت کی درآمد میں نسبتہً زیادہ کمی نہیں ہوئی۔ ۴۴۸ص ۳۶-۱۹۳۵ء میں درآمدہ خام کپاس کی مقدار ۷۷ ہزار ٹن اور مالیت ۶ کروڑ ۴۷ لاکھ روپے تھی لیکن ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۷ء میں مقدار ۶۵ ہزار ٹن اور مالیت ۵ کروڑ ۸۵ لاکھ روپے تک گھٹ گئی۔ اس کپاس کو درآمد کرنے کی ضرورت اس وجہ سے ہوتی ہے کہ یہاں اس سے اعلیٰ درجے کا مہین سوت تیار کیا جاتا ہے اور باریک اور لانبے ریشے کی کپاس جس سے یہ تیار ہوتا ہے دستیاب نہیں ہوتی۔

سوت اور سوتی مصنوعات کی درآمد کے بعد اہمیت میں دوسرے درجے پر کلیں اور ملوں کا سامان، دھاتیں اور کچی دھاتیں ہیں۔ کلوں

جدول (۳) درآمد (الف)

مندرجۂ ذیل جدول[1] میں یہ بتلایا گیا ہے کہ برطانوی ہند میں جو اہم اشیا سنہ ۱۹۳۶ء تا سنہ ۱۹۳۷ء میں اور پانچ سابقہ سالوں میں درآمد کی گئیں ان کی تقابلی اہمیت کیا ہے۔ (اعداد بہ شکل لاکھ روپے دیے گئے ہیں)۔

اشیا	سنہ ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء	سنہ ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء	سنہ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء	سنہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء	سنہ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء	سنہ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء	۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء کے مجموعی درآمدہ مال کا فیصد
سوت اور سوتی کپڑے	۶۲۹۰	۳۴۰۸	۲۱۳۰	۲۷۰۵	۲۷۹۰	۲۳۳۳	۱۸٫۶۳
کلیں اور چکی کا سامان	۱۸۲۲	۱۰۵۴	۱۲۷۷	۱۲۶۳	۱۳۶۸	۱۴۱۴	۱۱٫۲۹
دھاتیں اور کچی دھات	۲۳۶۲	۹۷۳	۹۵۰	۱۱۳۸	۱۲۰۳	۹۶۹	۷٫۷۳
تیل اور روغن	۱۱۶۸	۸۰۰	۶۷۵	۶۹۷	۷۲۵	۷۲۵	۵٫۷۹
مختلف قسم کی سواریاں	۱۰۸۵	۳۸۲	۴۷۷	۶۶۰	۶۹۲	۶۵۸	۵٫۲۵
آلات اوزار اور ساز و سامان	۵۳۸	۳۸۵	۴۰۲	۴۷۳	۵۱۸	۵۱۹	۴٫۱۵
مصنوعی ریشم	—	۴۱۶	۲۷۴	۲۵۹	۳۱۶	۳۸۶	۳٫۰۸
ریلگاڑی کا سامان وغیرہ	۵۶۴	۲۹۳	۲۷۲	۲۸۹	۳۱۲	۳۲۰	۲٫۵۶
رنگ	۲۴۳	۲۵۰	۲۴۶	۳۰۸	۳۳۴	۳۰۱	۲٫۴۱
آہنی سامان	۵۰۷	۲۹۹	۲۸۸	۳۰۵	۳۲۷	۲۸۹	۲٫۳۱
خام اُون اور اُونی مصنوعات	۴۲۸	۲۹۶	۲۵۵	۳۸۶	۲۷۹	۲۸۷	۲٫۲۹
کاغذ اور دفتی	۳۷۲	۳۸۶	۲۶۳	۲۷۳	۲۹۹	۲۸۲	۲٫۲۵
کیمیاوی اشیا	۲۷۹	۲۷۱	۲۷۰	۲۹۲	۳۱۲	۲۷۲	۲٫۱۷
خام ریشم اور ریشمی مصنوعات	۴۵۸	۴۳۳	۳۵۹	۳۳۷	۲۷۸	۲۴۲	۱٫۹۳
شراب	۳۷۷	۲۲۶	۲۲۷	۲۳۶	۲۴۸	۲۴۰	۱٫۹۱
ربر کی مصنوعات	۲۳۳	۱۹۸	۱۸۸	۲۰۶	۲۰۷	۲۱۱	۱٫۶۹
ادویات	۲۲۶	۱۸۶	۱۹۳	۱۹۲	۲۱۱	۲۰۷	۱٫۶۵
گرم مسالے	۳۲۶	۱۷۳	۱۵۶	۱۵۵	۱۶۳	۱۸۸	۱٫۵۰
میوے اور ترکاریاں	۱۸۳	۱۱۷	۱۰۰	۱۳۰	۱۳۳	۱۴۲	۱٫۱۳
شیشہ و آلات	۲۵۲	۱۴۲	۱۲۲	۱۳۳	۱۳۹	۱۲۸	۱٫۰۲
بے جڑے ہوئے قیمتی پتھر (نگینے) اور موتی	۱۱۰	۸۴	۷۵	۵۰	۴۸	۹۸	۰٫۷۸
رنگ اور رنگریزی کا سامان	۱۴۷	۹۲	۹۲	۹۷	۱۰۲	۹۷	۰٫۷۷
تمباکو	۲۷۰	۹۷	۷۲	۶۲	۶۲	۸۱	۰٫۶۵
کھاد	۹۹	۵۳	۵۲	۶۷	۷۱	۸۰	۰٫۶۴
لباس	۱۷۱	۸۴	۸۲	۸۲	۷۱	۸۰	۰٫۶۴
سامان تحریر	۱۰۵	۷۲	۶۶	۶۹	۷۶	۷۵	۰٫۶۰
غلہ، دال اور آٹا	۵۴۲	۷۱	۸۴	۲۶۶	۱۶۲	۷۲	۰٫۵۷
تعمیر اور انجنیری کا سامان	۱۳۴	۴۷	۶۴	۶۰	۷۳	۶۷	۰٫۵۴
سنگار کا سامان	۷۳	۵۸	۵۷	۶۴	۶۶	۶۷	۰٫۵۴
آلات حرب گولہ بارود اور فوجی ذخائر	۶۵	۳۳	۴۳	۴۳	۴۹	۶۶	۰٫۵۳
خردہ فروش بزاز اور بساطی کی دکان کا سامان اور ٹوپی اور کلاہ سازی کا سامان	۱۰۴	۶۸	۵۵	۶۷	۵۹	۶۴	۰٫۵۱
دوسری متفرق اشیا	۴۴۴۷	۸۷۰	۱۶۷۰	۱۴۷۵	۱۴۵۱	۱۵۶۴	۱۲٫۴۹
درآمدہ اشیا کی مجموعی مالیت	۲۴۰۸۰	۱۳۲۵۸	۱۱۵۳۶	۱۳۲۲۹	۱۳۴۴۳	۱۲۵۲۴	۱۰۰٫۰۰

[1] اس کے اعداد ایک رپورٹ موسوم بہ "تبصرہ بر تجارت ہند برائے سنہ ۱۹۲۹ء تا سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۳۶ء تا سنہ ۱۹۳۷ء" سے لیے گئے ہیں۔

درمیان صفحہ ۴۳۶ و ۴۳۷

ہند

جدول (۴) برآمد (ب)

…ایا گیا ہے کہ برطانوی ہند سے ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں اور پانچ سابقہ سالوں میں جو اہم اشیا برآمد کی گئیں انکی تقابلی اہمیت کیا ہے۔ (…

…یا	۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء	۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء	۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء	۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء	۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء	…۱۹۳۶ء
	۶۵۶۰	۲۰۷۰	۲۷۹۱	۳۵۴۵	۳۴۴۷	…۷
	۷۱۹	۳۲۹	۲۷۳	۲۶۵	۲۹۳	…۸
	۲۷۱۷	۹۷۳	۱۰۹۳	۱۰۸۷	۱۳۷۱	…۷
	۵۱۹۳	۲۱۷۱	۲۱۳۷	۲۱۴۷	۲۳۴۹	…۵
	۲۶۰۰	۱۷۱۵	۱۹۸۵	۲۰۱۳	۱۹۸۲	…۴
	۲۶۴۷	۱۱۳۱	۱۳۶۶	۱۰۵۴	۱۰۳۳	…۷
	۳۴۷۹	۱۶۰۸	۱۱۷۵	۱۱۸۴	۱۲۴۱	…۸
	۱۰۳۴	۴۶۸	۵۴۹	۵۹۱	۷۷۳	…۲
	۸۱۶	۴۷۶	۵۸۳	۵۴۸	۵۶۳	…۶
	۷۹۸	۲۷۷	۴۲۵	۳۱۳	۴۱۳	…۳
	۵۳۳	۱۷۸	۲۷۲	۲۱۹	۲۹۳	…۴
	۶۹۷	۱۲۴	۲۴۶	۳۳۰	۱۵۸	…۴
	۳۱۲	۱۹۷	۱۶۵	۱۹۷	۱۸۲	…۷
	۳۱۸	۲۰۴	۲۲۹	۱۹۲	۲۲۸	…۶
	۱۸۰	۵۶	۸۴	۱۱۰	۱۳۵	…۷
	۹۱	۷۰	۹۰	۱۰۸	۱۶۵	…۰
	۱۷۹	۹	۳۱	۶۶	۸۹	…۴
	۱۱۹	۷۰	۴۷	۷۷	۷۳	…۶
	۱۰۳	۳۲	۴۵	۶۹	۸۳	…۴
	۱۰۶	۷۷	۹۴	۸۲	۹۲	…۳
	۱۴۵	۱۱۰	۱۰۲	۷۳	۱۰۲	…۴
	۱۰۵	۶۰	۷۷	۸۰	۸۸	…۱
	۷۲	۵۴	۵۷	۵۵	۶۴	[illegible]
	۶۸	۳۲	۲۶	۳۹	۶۰	…۹
…ن	۱۱۲	۷۵	۷۹	۷۲	۷۰	…۲
	۱۹۶	۷۲	۷۲	۷۷	۵۵	…۵
	۱۱۸۱	۵۹۱	۹۱۳	۵۷۴	۶۵۰	…۷
	۳۱۰۸۰	۱۳۲۲۷	۱۴۷۲۵	۱۵۱۶۷	۱۶۰۵۲	…۲

…اعداد ایک رپورٹ موسوم بہ "تبصرہ بر تجارت ہند برائے ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء" سے لیے گئے ہیں۔

اور ریلوں کے سامان میں اپریل ۱۹۲۸ء سے ریلوے کے انجن کوئلے کے ڈبے اور پرزے شامل کر لیے گئے ہیں۔ چنانچہ اس قسم کے درآمدہ سامان کی مالیت ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں ۱۳ کروڑ ۶۸ لاکھ روپے اور اس کے مقابلے میں ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں ۱۴ کروڑ ۱۴ لاکھ روپے تھی۔ دھات اور کچی دھات کی درآمد ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء کے ۱۲ کروڑ ۳ لاکھ روپے سے ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں ۹ کروڑ ۶۹ لاکھ روپے تک گر گئی۔ آہنی و فولادی مصنوعات ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں ۴۴۶۰۰۰ ٹن وزن اور ۷ کروڑ ۲۰ لاکھ ۵۰ ہزار روپے مالیت کی اور اس کے مقابلے میں ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں ۳۶۰۰۰۰ ٹن وزن اور ۵ کروڑ ۹۳ لاکھ روپے مالیت کی درآمد کی گئیں۔ المونیم، پیتل، تانبا، سیسا، ٹن، جست، جرمن سلور وغیرہ جیسی دھاتوں کی درآمد کی مقدار ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں ۸۴ ہزار ٹن اور مالیت ۴ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے تھی، لیکن ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں مقدار ۶۱ ہزار ٹن اور مالیت ۳ کروڑ ۷۳ لاکھ روپے تک گھٹ گئی۔ ہندوستانی درآمدہ سامان میں شکر، کچھ عرصے قبل تک سوتی کپڑوں کے بعد دوسرے نمبر پر تھی، لیکن اب درآمدی تجارت میں اس کی مقدار گھٹ گئی ہے جس کا باعث یہ ہے کہ ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء میں تامین دیے جانے کی وجہ سے ملک کے اندر ہی صنعت کی ترقی و توسیع کی رفتار تیز ہو گئی ہے، (ملاحظہ ہو جلد اول باب ۷) چنانچہ ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء میں ہر قسم کی درآمدہ شکر کی مقدار ۱۰ لاکھ ۱۲ ہزار ٹن اور مالیت ۱۵ کروڑ ۷۷ لاکھ روپے تھی، لیکن ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں مقدار ۲ لاکھ ۱ ہزار ٹن اور مالیت ۱ کروڑ ۱۹ لاکھ روپے تک گھٹ گئی۔ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں تیزی کے ساتھ اور اچانک کمی ہوئی، چنانچہ درآمدہ مقدار ۲۳ ہزار ٹن اور مالیت ۲۴ لاکھ روپے تھی۔ دوسری اہم درآمدی اشیا یہ ہیں:-

(۱) تیل اور روغن جن کی مالیت ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں ۷ کروڑ ۲۸ لاکھ روپے

اور ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں ۷ کروڑ ۵۲ لاکھ روپے تھی۔ (۲) سواریاں، خاص کر موٹر کاریں جن کی مالیت ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں ۶ کروڑ ۹۲ لاکھ روپے اور ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں ۶ کروڑ ۵۸ لاکھ روپے۔ (۳) آلات، اوزار، مصنوعی ریشم، رنگائی کا سامان، رنگ، آہنی اشیا، خام اون، اونی مصنوعات، کاغذ، کیمیاوی اشیا، خام ریشم، ریشمی مصنوعات، شراب، ربر کی مصنوعات وغیرہ۔

(۲) برآمد۔ جیسا کہ مندرجۂ بالا جدول (۴) سے معلوم ہوتا ہے برآمد میں کپاس اور سن بہت اہم اشیا ہیں۔ برآمد کردہ کپاس کی مقدار ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں ۳۳،۹۷،۰۰۰ گانٹھ اور ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں ۴۲،۶۸،۰۰۰ گانٹھ تھی۔ ہندوستانی کپاس کا بہترین گاہک حسب معمول جاپان ہی رہا۔ چنانچہ اس نے ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں ۲۴،۲۶،۰۰۰ گانٹھ یا ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء کے مقابلے میں ۶،۶۷،۰۰۰ گانٹھ زیادہ خریدے۔ یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جاپان میں مجموعی طور پر جتنی خام کپاس درآمد ہوتی ہے اس میں ہندوستان کا حصہ ہندوستانی جاپانی تجارتی معاہدے سے قبل ۱۹۳۴ء میں ۳۲ فیصد تھا، لیکن یہ تناسب ۱۹۳۵ء میں ۴۳ فیصد اور ۱۹۳۶ء میں ۴۴ فیصد تک بڑھ گیا، اور یہ زیادتی زیادہ تر ریاستہائے متحدہ امریکہ کے نقصان سے ہوئی۔ ہر قسم کے تجارتی مال کی مجموعی برآمد کے مقابلے میں خام کپاس کی برآمد کا تناسب ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں ۲۱٫۴۷ فیصد تھا، لیکن ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں ۲۳٫۳۰ فیصد تک بڑھ گیا۔ لنکاشائر ۴۴۹ کی ہندوستانی کپاس کمیٹی نے لنکاشائر کی گرنیوں میں ہندوستانی کپاس کے روز افزوں استعمال کو ترقی دینے کی جو کوششیں کیں زیادہ تر انھی کی بدولت ہندوستانی کپاس کی برآمد ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء کے ۳،۴۲،۰۰۰ گانٹھ سے بڑھ کر ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں ۶،۰۱،۰۰۰ گانٹھ تک ہو گئی۔ ہندوستانی سوتی کپڑوں کی برآمد کا

تناسب مجموعی ہندوستانی پیداوار کے مقابلے میں بہت ہی معمولی رہا۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں ۲ فیصد، تو ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں ۳ فیصد رہا۔ کچھ سال ادھر سے اس مقدار میں بھی کمی ہو گئی جو ایران اور عراق کو جاتی تھی، اور اس کا باعث زیادہ تر یہ تھا کہ یورپین ممالک میں ان ملکوں کو شمال اور مغرب سے سامان مہیا کرنے کے لیے سخت مسابقت ہو رہی تھی اور ایران میں غیر ملکی پارچہ کی درآمد پر بندشیں تھیں۔ ہندوستانی سوتی کپڑوں کی اہم ترین منڈی سیلون ہے۔

خام سن اور سن کی مصنوعات کی مجموعی برآمد ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں ۱۵،۲۳،۰۰۰ ٹن تھی جس کے مقابلے میں ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں برآمد کی مقدار ۱۷،۹۲،۰۰۰ ٹن رہی۔ گویا ۱۸ فیصد کا اضافہ ہوا۔ اسی طرح اس سامان کی مالیت میں بھی ۳۷ کروڑ روپے سے ۴۳ کروڑ روپے تک یا ۱۶ فیصد کی ترقی ہوئی۔ خام سن اور سن کی مصنوعات، دونوں کی برآمد میں اضافہ رونما ہوا۔ ۱۹۲۸ء تا ۱۹۲۹ء کے بعد سے خام سن کی برآمد سب سے بڑی مقدار میں ہوئی اور اس کی مالیت ۱۴ کروڑ ۷ لاکھ روپے تھی۔ سن کی مصنوعات کی برآمد کی مالیت ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں ۲۴ کروڑ روپے اور ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں ۲۸ کروڑ روپے تھی۔

ہندوستان کی برآمدی تجارت میں سن کے بعد دوسری اہم ترین شئے چائے ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں ۳۱۳ ملین پاونڈ وزن اور ۱۹ کروڑ ۲۸ لاکھ روپے مالیت اور ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں ۳۰۲ ملین پاونڈ وزن اور ۲۰ کروڑ ۱۸ لاکھ روپے مالیت کی چائے برآمد ہوئی۔ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں جتنی چائے تیار ہوئی تھی اس کی مجموعی مقدار کا ۷۷ فیصد حصہ غیر ممالک کو بحری راستے سے برآمد کیا گیا۔ موجودہ زمانے میں بین قومی تحدیدی اسکیم کے ذریعے سے چائے کی برآمد کی نگرانی کی جاتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں ہندوستان کا حصۂ رسدی ۳۰۹ ملین پاونڈ مقرر کیا گیا تھا، حالانکہ اس سال

یہاں سے در اصل ۳۴.۰۲ ملین پاونڈ چائے برآمد کی گئی۔ اس تجویز کی رو سے ہندوستانی چائے کی صنعت اس قابل ہوئی کہ اکثر دوسری صنعتوں کی بہ نسبت بہتر طریق پر تجارتی کساد بازاری کا مقابلہ کرے۔ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں ۳۱۴۳ ملین پاونڈ مجموعی مقدار برآمد کی گئی اس کے منجملہ سلطنت متحدہ کو ۲۷۶ ملین پاونڈ بھیجی گئی، اس کے مقابل ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں جو مجموعی مقدار برآمد کی گئی یعنے ۳۴.۰۲ ملین پاونڈ اس کے منجملہ سلطنت متحدہ کو ۲۵۶ ملین پاونڈ روانہ کی گئی۔ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں ہندوستانی برآمدی اشیا میں روغن دار تخم چوتھے نمبر پر تھے۔ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں روغن دار تخموں کی برآمد کی مقدار ۰۰۰ر۳۴۷،۶ ٹن اور مالیت ۱۰ کروڑ ۲۹ لاکھ روپے تھی۔ لیکن ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں مقدار ۰۰۰ر۵۵،۱۱ ٹن اور مالیت ۱۸ کروڑ ۴۴ لاکھ روپے ہو گئی۔ گویا مقدار میں ۲۷ فیصد اور مالیت میں ۹۷ فیصد اضافہ ہوا۔ اندرون ملک کا صرف روز افزوں ہونے کے باوجود بجز تخم ارنڈی کے اہم روغن دار تخموں کی برآمد میں اضافہ ہوا۔ گو ایک طرف یورپین ملکوں خاص کر جرمنی اور اٹلی میں درآمد پر بندش اور تحدید قایم ہونے کی وجہ سے ہندوستان کی برآمدی ۲۵۰
اشیا کی طلب پر مضر اثر پڑا۔ لیکن دوسری طرف سلطنت متحدہ کا انحصار خام اشیا کی ضرورتوں کے مدنظر سلطنت کے روغن دار تخموں کے ذرایع پر زیادہ ہو جانے اور سلطنت متحدہ کی منڈی میں جانے والی السی کے محصول میں ۱۰ فیصد کی ترجیحی رعایت ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے برآمد کردہ تخموں اور قیمتوں پر موافق اثر پڑا۔ سلطنت متحدہ میں ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء و ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں السی کی جو مجموعی مقدار درآمد کی گئی اس میں ہندوستان کا حصہ علی الترتیب ۸۵ فیصد، ۲۹ فیصد اور ۵۷ فیصد تھا۔ ارجنٹائن میں فصل کم ہونے کی وجہ سے بھی ہندوستان سے السی کی زیادہ مقدار برآمد ہونے میں مدد ملی۔ مونگ پھلی ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں ۰۰۰ر۱۲۳،۱۴ ٹن

وزن اور ۶ کروڑ ۶۵ لاکھ روپیے مالیت کی برآمد کی گئی لیکن ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں مقدار ۷,۳۹,۰۰۰ ٹن اور مالیت ۱۲ کروڑ ۲۹ لاکھ روپے تک بڑھ گئی۔ فرانس میں درآمدی محصول کی کمی کی وجہ سے مونگ پھلی کی زیادہ مقدار جانے لگی ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں ہندوستان کی برآمدی اشیا میں غذائی اجناس اور آٹے کا پانچواں نمبر تھا۔ چنانچہ ان کی برآمد کی مجموعی مقدار ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں ۱۵,۵۳,۰۰۰ ٹن اور مالیت ۱۲ کروڑ ۴۱ لاکھ روپے تھی۔ لیکن ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں مقدار ۱۸,۸۷,۰۰۰ ٹن اور قیمت ۱۵ کروڑ ۳۸ لاکھ روپے تک بڑھ گئی۔ جوار، باجرا، مکئی کو مستثنیٰ کرکے اہم غذائی اجناس یعنے چاول، گیہوں، دال، جو وغیرہ کی برآمد میں اضافہ ہوا۔ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں غذائی اجناس اور آٹے کی جو مجموعی مقدار برآمد کی گئی اس میں چاول کا حصہ ۸۷ فیصد تھا۔ ہندستان اور برما سے ملاکر ۱۴,۴۶,۰۰۰ ٹن چاول برآمد کئے گئے اور اس برآمد میں تنہا برما کا حصہ ۸۴ فیصد تھا۔ چاول کی کنکی کی درآمد پر جو زیادہ تر سیام سے آتی ہے ۱۲ آنے فی من کا جو تاملینی محصول عائد کیا گیا تھا اس کا نفاذ ختم مارچ ۱۹۳۸ء تک رہا۔ اس محصول نے بھی ہندوستان میں غیر ملکی چاول کی درآمد پر روک قائم کرنے میں مدد دی۔ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں ۹۶۰۰ ٹن گیہوں مالیتی ½ ۹ لاکھ روپے کا برآمد کیا گیا تھا، لیکن ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں ہندوستان سے ۲,۳۱,۵۰۰ ٹن گیہوں جس کی مالیت ۲ کروڑ ½ ۹ لاکھ روپے تھی برآمد کیا گیا۔ سلطنت متحدہ ہی گیہوں کی سب سے بڑی خریدار تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں وہاں ۲,۰۳,۴۰۰ ٹن گیہوں برآمد کیا گیا۔ ہندوستان میں غیر ملکی گیہوں کی درآمد کی مقدار بہت ہی کم رہی۔

ہندوستان سے ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں جو چمڑے اور کھالیں برآمد کی گئیں ان کا وزن ۴۸,۸۰۰ ٹن اور مالیت ۴ کروڑ ۱۳ لاکھ روپے تھی، لیکن ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں مقدار ۵۱,۲۰۰ ٹن اور مالیت ۴ کروڑ

۴۳ لاکھ روپے رہی گویا مقدار میں ۵ فیصد اور مالیت میں ۷ فیصد اضافہ ہوا۔ دباغت کردہ چرسوں اور کھالوں کی تجارت کی ترقی ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں بھی جاری رہی۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں جہاں برآمد کی مقدار ۲۰,۳۰۰ ٹن اور مالیت ۵ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے تھی وہاں ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں برآمد ۲۵,۴۰۰ ٹن کی ہوئی جس کی مالیت ۶ کروڑ ۴۷ لاکھ روپے تھی۔ اس کے بعد برآمد میں دھات اور کچی دھات ہماری توجہ کی طالب ہیں۔ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں کچی دھاتوں کی مجموعی برآمد ۷۴۸,۰۰۰ ٹن یا ایک سال پیشتر کے مقابلے میں ۴۵ ہزار ٹن کم تھی۔ اس مجموعی برآمد میں منگنیز کا حصہ ۹۱ فیصد تھا۔ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء کی طرح ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں بھی سلطنت متحدہ ہی اس کی بہترین گاہک تھی، چنانچہ اس نے ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں تو صرف ۹۷,۰۰۰ ٹن درآمد کی مگر اپنی فولادی صنعت کے بڑھتے ہوئے کاروبار کے سلسلے میں ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں ۲۱۶,۰۰۰ ٹن منگنیز درآمد کی۔ خام سیسہ اور خام لوہے کی برآمد میں بھی ترقی رونما ہوئی۔ خام اون
ص ۲۵۱ کی تجارت میں ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں ترقی ہوئی۔ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں برآمد کی مقدار ۴۹,۴ ملین پاونڈ اور مالیت ۲ کروڑ ۱۰ لاکھ روپے تھی، اس کے مقابلے میں ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں مقدار ۵۱,۹ ملین پاونڈ اور مالیت ۲ کروڑ ۸۲ لاکھ روپے ہو گئی۔ لاک کی برآمد کی مقدار ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں ۴۸۷,۰۰۰ ہنڈرڈ ویٹ تھی جو ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں ۸۰۳,۴۰۰ ہنڈرڈ ویٹ تک بڑھ گئی۔ اس کی مالیت میں بھی ۱ کروڑ ۵۸ لاکھ روپے سے ۲ کروڑ ۴۳ لاکھ روپے تک ترقی ہوئی۔ کھلی کی مقدار ان دو سالوں میں ۳۹۰,۰۰۰ ٹن سے بڑھ کر ۶۳۲,۰۰۰ ٹن ہو گئی اور مالیت ۱ کروڑ ۸۲ لاکھ روپے سے ۲ کروڑ ۷۲ لاکھ روپے تک بڑھ گئی جس کا باعث یہ تھا کہ بجز السی کے باقی سب تخموں کی کھلی زیادہ مقدار میں باہر بھیجی گئی۔

۱۲۔ ہندوستان کی تجارت کی تقسیم مندرجہ ذیل جدول (۱) و جدول (۲) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی مجموعی تجارت میں دوسرے ملکوں کا فیصد حصہ کتنا تھا:۔

تجارت میں دوسرے ملکوں کا فیصد حصہ کتنا تھا :-

جدول (۱)

درآمد کا فی صد تناسب

ممالک	۱۹۱۳-۱۴	۱۹۱۸-۱۹	۱۹۲۲-۲۳	۱۹۳۳-۳۴	۱۹۳۴-۳۵	۱۹۳۵-۳۶	۱۹۳۶-۳۷
سلطنت متحدہ	۶۴٫۱	۴۵٫۵	۶۰٫۲	۴۱٫۷	۴۰٫۶	۳۸٫۸	۳۸٫۴
جرمنی	۶٫۹	—	۵٫۱	۷٫۷	۷٫۶	۹٫۶	۹٫۷
جاوا	۵٫۸	۶٫۶	۵٫۵	۲٫۱	۱٫۴	۱٫۳	۰٫۳
جاپان	۲٫۶	۱۹٫۸	۶٫۲	۱۴٫۲	۱۵٫۷	۱۶٫۳	۱۷٫۰
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۲٫۶	۹٫۵	۵٫۷	۶٫۲	۶٫۴	۶٫۷	۶٫۵
بلجیم	۲٫۳	۰٫۸	۲٫۷	۲٫۳	۱٫۶	۱٫۸	۲٫۲
آسٹریا اور ہنگری	۲٫۳	—	۰٫۱	۰٫۵	۰٫۵	۰٫۵	۰٫۴
اسٹریٹس سٹلمنٹس	۱٫۸	۳٫۳	۱٫۹	۲٫۶	۲٫۳	۲٫۷	۳٫۱
ایران، عرب، عراق، ایشیائی ترکی اور سوماٹرا	۱٫۵	—	—	۱٫۹	۲٫۵	۲٫۵	۲٫۹
فرانس	۱٫۵	۱٫۱	۰٫۸	۱٫۳	۱٫۲	۱٫۰	۰٫۹
موریشس	۱٫۳	۱٫۵	۰٫۴	—	—	—	—
اٹلی	۱٫۲	۰٫۵	۰٫۹	۲٫۵	۲٫۳	۱٫۵	۱٫۰
چین	۰٫۹	۱٫۴	۱٫۲	۱٫۹	۱٫۶	۱٫۴	۱٫۱
ہالینڈ	۰٫۸	۰٫۱	۰٫۹	۱٫۶	۱٫۰	۱٫۰	۱٫۱
آسٹریلیا	۰٫۵	۱٫۳	۰٫۴	۰٫۹	۰٫۷	۰٫۹	۰٫۹
ہانگ کانگ	۰٫۵	۱٫۰	۰٫۶	۰٫۴	۰٫۳	۰٫۳	۰٫۴
ولندیزی باریو	۰٫۴	—	—	۰٫۳	۰٫۲	۰٫۲	۰٫۲
سیلون	۰٫۴	۱٫۷	۰٫۶	۱٫۱	۱٫۰	۱٫۱	۱٫۴
سوٹزرلینڈ	۰٫۳	—	—	۰٫۸	۱٫۰	۱٫۱	۱٫۱
کینیا اور زنجبار	۰٫۳	—	—	۲٫۱	۲٫۴	۲٫۶	۲٫۸

ص ۲۵۲

جدول (۲)

برآمد کا فیصد تناسب

ملک	۱۹۱۳-۱۴	۱۹۱۸-۱۹	۱۹۲۲-۲۳	۱۹۳۲-۳۳	۱۹۳۳-۳۴	۱۹۳۴-۳۵	۱۹۳۵-۳۶
سلطنت متحدہ	۲۳٫۴	۲۹٫۲	۲۲٫۰	۳۲٫۳	۳۱٫۶	۳۱٫۵	۳۲٫۲
جرمنی	۱۰٫۶	—	۷٫۵	۶٫۵	۴٫۵	۵٫۹	۴٫۷
جاپان	۹٫۱	۱۲٫۱	۱۳٫۴	۸٫۵	۱۶٫۱	۱۳٫۴	۱۵٫۰
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۸٫۷	۱۳٫۸	۱۱٫۵	۹٫۶	۸٫۳	۱۰٫۱	۹٫۵
فرانس	۷٫۱	۳٫۶	۵٫۱	۴٫۹	۳٫۲	۴٫۴	۳٫۹
بلجیم	۴٫۸	۰٫۰۰۴	۳٫۸	۳٫۰	۳٫۶	۳٫۴	۳٫۶
آسٹریا و ہنگری	۴٫۰	۰٫۰۶	۰٫۴	—	—	—	—
سیلون	۳٫۶	۴٫۲	۴٫۱	۴٫۲	۴٫۵	۴٫۵	۳٫۸
ایران، عراق، عرب، ترکی و سوماٹرا	۳٫۲	۴٫۰	۳٫۴	۱٫۸	۱٫۹	۱٫۷	۱٫۹
اٹلی	۳٫۱	۲٫۲	۲٫۲	۳٫۸	۳٫۸	۲٫۲	۲٫۴
ہانگ کانگ	۳٫۱	۲٫۹	۲٫۵	۰٫۸	۰٫۶	۰٫۳	۰٫۳
اسٹریٹس سٹلمنٹس	۲٫۷	۱٫۱	۴٫۶	۲٫۳	۱٫۹	۲٫۳	۲٫۲
چین	۲٫۳	۰٫۰۳	—	۳٫۰	۱٫۹	۱٫۱	۰٫۶
مرکزی وجنوبی امریکہ	۲٫۲	—	—	۲٫۲	۲٫۶	۲٫۰	۲٫۳
ہالینڈ	۱٫۷	۲٫۶	۱٫۳	۲٫۷	۱٫۹	۲٫۳	۲٫۲
آسٹریلیا	۱٫۶	—	۱٫۸	۲٫۰	۱٫۹	۱٫۸	۱٫۶
کینا و زنجبار	۱٫۰	—	—	۰٫۵	۰٫۶	۰٫۴	۰٫۴
اتحاد جماہیر شوروئیہ روس	۰٫۹	—	۰٫۰۰۳	۰٫۱	—	۰٫۳	۰٫۲

ہسپانیہ	۰٫۰۸	—	—	۰٫۰۵	۰٫۰۶	۱٫۱	۰٫۰۳
جاوا	۰٫۰۸	۱٫۴	۱٫۰	۰٫۰۳	—	۰٫۰۳	۰٫۰۴

ان اعداد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ درآمد میں سلطنت متحدہ اور عام طور پر یورپ کو غلبہ حاصل ہے اور اس کے برعکس برآمدی تجارت کی تقسیم کی ایک خصوصیت ہمیشہ یہ رہی ہے کہ اس میں ملکوں کی ایک بڑی مقدار حصہ لیتی رہی ہے، اگرچہ سلطنت متحدہ اب بھی ہندوستانی اشیائے برآمد کی سب سے بڑی خریدار ہے۔ ہندوستان کی تجارت میں سلطنت متحدہ کو جو غلبہ حاصل ہے اس کے اسباب بیان کئے جا چکے ہیں اور یہ مذکور ہو چکا ہے کہ زمانۂ قبل از جنگ میں جرمنی اور جاپان نے اور جنگ عظیم میں اور اس کے بعد ریاستہائے متحدۂ امریکہ نے ہندوستان سے براہ راست تجارتی تعلقات قائم کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اب زمانۂ جنگ، زمانۂ قبل از جنگ اور زمانۂ بعد از جنگ میں ہندوستان کی تجارت کی تقسیم کے بارے میں ان اہم میلانات پر بحث کرنا مناسب ہوگا جو مذکورۂ بالا اعداد سے ظاہر ہوتے ہیں۔

۱۳۔ ہندوستان کی تجارت کی تقسیم زمانۂ قبل از جنگ میں

زمانۂ قبل از جنگ میں یہ میلان تھا کہ ہندوستان کی درآمدی و برآمدی تجارت کا رخ سلطنت متحدہ سے ہٹ کر دوسرے ملکوں کی طرف پھر رہا تھا۔ گذشتہ صدی کے ختم پر ہندوستانی درآمد میں سلطنت متحدہ کا حصہ ۶۹ فیصد تھا، جرمنی کا حصہ صرف ۲٫۴ فیصد، ریاستہائے متحدہ کا حصہ ۱٫۷ فیصد، جاپان کا حصہ بہت ہی معمولی یعنی ۰٫۶ فیصد تھا۔ لیکن سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء تک ہمیں نمایاں تبدیلی دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ جہاں سلطنت متحدہ کا حصہ ۶۴٫۱ فیصد تک گھٹ گیا وہاں جرمنی کا حصہ ۶٫۹ فیصد ہوگیا اور جاپان اور ریاستہائے متحدۂ امریکہ میں سے ہر ایک کا ۲٫۶ فیصد تھا۔ سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء میں سلطنت متحدہ کے بعد ہی جرمنی کا (ہ ۲۵۳ص) نمبر تھا۔ جرمنی کے تجارتی مال کی درآمد میں جو اضافہ ہوا اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ جرمنی میں بعض شعبوں میں خصوصی فنی مہارت نے بہت ترقی کر لی تھی،

دوسرے یہ کہ قیمتی برطانوی مال کی جگہ جرمنی کے ارزاں سامان نے بطور بدل کے لے لی تھی جن کی ہندوستانی بازار میں فوراً کھپت ہو جاتی تھی، اور تیسرے یہ کہ جرمنوں نے ہندوستانی گاہکوں کی ضرورتوں اور ذوق کا بہت ہی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ ہندوستانی درآمد میں بلجیم کا حصہ ۱۹۰۳-۱۹۰۴ء میں ۳ء۹ فیصد تھا لیکن ۱۹۱۳-۱۴ء میں ۲ء۳ فیصد تک گھٹ گیا۔ اس کے برعکس جاوا اپنی شکر کی بڑھی ہوئی برآمد کی وجہ سے آگے بڑھ گیا۔ چنانچہ ۱۹۱۳-۱۴ء کی مجموعی ہندوستانی درآمد میں اس کا حصہ ۵ء۸ فیصد تھا اور اس طرح وہ تیسرے نمبر پر آ گیا۔

برآمدی تجارت میں بھی اسی قسم کا میلان رونما ہوا، اور زمانۂ قبل از جنگ میں اس کا رُخ سلطنت متحدہ سے دوسرے ملکوں کی طرف پھر گیا۔ موجودہ صدی کے آغاز میں برآمدی اشیا کا کم و بیش ۲۹ فیصد سلطنت متحدہ کو، ۲۵ فیصد براعظم یورپ کو، ۴۲ فیصد مشرق بعید کو، ۷ فیصد ریاستہائے متحدۂ امریکہ کو، اور باقی ۱۵ فیصد دوسرے ملکوں کو گیا۔ لیکن ۱۹۱۴ء تک سلطنت متحدہ کا حصہ ۲۴ فیصد تک گھٹ گیا، براعظم یورپ کا حصہ بڑھ کر ۲۹ فیصد ہو گیا، مشرق بعید کا حصہ افیون اور سوت کی برآمد کی کمی کے باعث صرف ۱۷ فیصد رہا، ریاستہائے متحدۂ امریکہ کا حصہ ۹ فیصد تک بڑھ گیا اور دوسرے ملکوں کا حصہ ۲۱ فیصد تھا۔ اس طرح یہ معلوم ہو گا کہ اس زمانے میں سلطنت متحدہ کے حصے میں جتنی کمی ہوئی اتنا ہی براعظم یورپ کے حصے میں اضافہ ہوا۔ مشرقی بازار میں جو کمی ہوئی اس کی تلافی دوسرے چھوٹے چھوٹے ملکوں کے اضافے سے ہو گئی۔ ملکوں کی تجارت کو علیحدہ علیحدہ دیکھا جائے تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت متحدہ سے قطع نظر کرتے ہوئے جو ہندوستانی اشیا کی سب سے بڑی خریدار تھی، جرمنی جو ۱۹۰۰ء کی فہرست میں تیسرے نمبر پر تھا ترقی کر کے ۱۹۱۴ء میں دوسرے نمبر پر آ گیا۔ چنانچہ ہندوستانی اشیا کی برآمد جرمنی کو ۱۹۰۰ء میں ۵ ملین پاؤنڈ مالیت کی ہوتی تھی اور یہ ۱۹۱۴ء میں ۵ء۱۷ ملین پاؤنڈ تک بڑھ گئی۔ جاپان کی خریداری میں بھی اسی قسم کی ترقی ظاہر ہوئی چنانچہ اس نے ۱۹۰۰ء میں ۲ء۴ ملین پاؤنڈ اور ۱۹۱۴ء میں ۵ء۱۱ ملین پاؤنڈ

مالیت کا ہندوستانی مال درآمد کیا۔ اس طرح خریداری میں پہلے اس کا نمبر چھٹا تھا، اب وہ تیسرے نمبر پر آگیا۔ اس کے برخلاف چین اپنے دوسرے نمبر سے ہٹ گیا جس پر وہ ۱۹۰۰ء سے جما ہوا تھا اور ۱۹۱۴ء میں چھٹے نمبر پر آگیا۔[1]

جنگ عظیم کے زمانے میں زمانۂ قبل از جنگ کا یہ میلان ترقی کرتا گیا کہ درآمدی تجارت سلطنت متحدہ سے ہٹ جائے چنانچہ سلطنت متحدہ کا مال ہندوستانی بازاروں میں کمیاب ہوگیا اس کا باعث اولاً یہ تھا کہ سلطنت متحدہ جنگ میں مصروف تھی، دوسرے یہ کہ سلطنت متحدہ کی برآمد پر حکومت کی نگرانی قائم تھی اور تیسرے یہ کہ مال بہت مہنگا تھا۔ ہندوستان کی درآمدی
تجارت میں سلطنت متحدہ کا حصہ ۱۹۱۳ء-۱۴ کے ۶۴ فیصد سے کم ہو کر ۱۹۱۸-۱۹ء میں ۲۵۴
۴۵.۵ فیصد رہ گیا۔ ہندوستانی بازار میں ایک تو برطانوی مال میں کمی ہوگئی دوسرے جرمنی کا مال آنا موقوف ہوگیا۔ درآمدی تجارت میں اس طرح جو کمی ہوگئی اس کے ایک جزو کو جاپان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ نے تیزی کے ساتھ پورا کردیا۔ چنانچہ لوہا، فولاد، اور آہنی سامان جس کی سربراہی پہلے سلطنت متحدہ سے ہوتی تھی اب انہی ملکوں سے درآمد کیا جانے لگا۔ شیشہ و آلات، سوتی کپڑے، کاغذ وغیرہ جاپان سے اور رنگائی کا سامان ریاستہائے متحدہ سے درآمد کیا گیا۔ ان دونوں ملکوں نے ہندوستانی بازار کی ضرورتوں کی تحقیق کرنے کی اسی طرح خاص کوششیں کیں جس طرح جرمنی نے زمانۂ قبل از جنگ میں کی تھیں اور ملک میں اپنے تجارتی نظام کو ترقی دی۔ بلکہ جاپان نے تو اس سلسلے میں اہم ہندوستانی شہروں میں خردہ فروشی کے ذخائر تک کھول لیے۔ ہندوستان کے جاپانی مبادلہ بنکوں نے درآمد کرنے والوں کے لئے خاص مالی سہولتیں فراہم کیں۔[2]

۱۔ دیکھو آر، ایم، جوشی کی کتاب موسومہ بہ "ہندوستانی برآمدی تجارت" صفحہ ۱۵۹ تا ۱۶۰۔

۲۔ جاپانیوں نے اپنی تجارت خارجہ کو ترقی دینے کے لئے جو انتظام کیا تھا اس کی سب سے

رہی برآمد تو، ہندوستان نے جنگ کے زمانے میں جو اشیا خریدیں اور اس خریداری کے لئے جو خاص تدابیر اختیار کی گئیں جن میں غیر جانب دار ملکوں کے ساتھ تجارت پر بندشوں کا عائد کرنا اور بعض نوآبادیات کو قرضے کی سہولتوں کا مہیا کرنا بھی شامل تھا، ان کے نتیجے کے طور پر تجارت کا رُخ سلطنت متحدہ اور سلطنت برطانیہ کی طرف عارضی طور پر پلٹ گیا۔ چنانچہ ہندوستانی برآمد میں سلطنت متحدہ کا حصہ ۱۴-۱۹۱۳ء میں ۴، ۲۳ فیصد تھا، لیکن ۱۹-۱۹۱۸ء میں بڑھ کر ۲، ۲۹ فیصد ہوگیا اور بحیثیت مجموعی سلطنت برطانیہ کے حصے کا اوسط زمانۂ قبل از جنگ کے ۱، ۴۱ فیصد کے مقابلے میں زمانۂ جنگ میں ۷، ۵۱ فیصد تک بڑھ گیا۔ جرمنی، ہندوستانی بازار سے خریدار کی حیثیت سے یقیناً غائب ہوگیا۔ فرانس اور بلجیم کا حصہ بھی اس بنا پر گھٹ گیا کہ جرمنی نے ان کے بعض علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ برخلاف اس کے جاپان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کا حصہ ۱۴-۱۹۱۳ء میں علی الترتیب ۲، ۹ فیصد اور ۹، ۸ فیصد تھا، لیکن ۱۹-۱۹۱۸ء میں ۱، ۱۲ فیصد اور ۸، ۱۳ فیصد ہوگیا۔ کئی عامل اس زیادتی کا باعث تھے۔ مثلاً ان ملکوں کو "متحدین" کی حیثیت سے خاص حقوق حاصل تھے یہ ملک لڑائی کے میدانوں سے دور تھے، ان کی ہندوستان کے ساتھ بڑھی ہوئی برآمدی تجارت نے ان کی ساکھ کو مستحکم کر دیا تھا، دونوں ملکوں نے ہندوستان سے راست تجارتی تعلقات کو

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ تجارتی جد و جہد کے سب شعبوں مثلاً تجارتی کوٹھیوں، بنکوں اور جہازرانی کی کمپنیوں نے جاپانی حکومت کی امداد سے قومی اغراض کو ترقی دینے کے لئے گہرا اتحاد قائم کر لیا تھا، اور غیر ملکی حریفوں کے مقابلے میں اپنی قوم والوں کے ساتھ ترجیحی سلوک کر کے ایک دوسرے کے لئے کاروبار حاصل کرتا تھا اور اس کو غیر ملکی حریفوں کے ہاتھوں میں جانے سے روکتا تھا۔ قومی فلاح و بہبود کی ترقی کے تمام اغراض کے اس اتحاد نے اتنی وسعت اختیار کر لی تھی جو کسی دوسری قوم حتیٰ کہ جرمنی کو بھی جنگ اعظیم سے پیشتر حاصل نہ تھی" دیکھو پنڈت ہیکر کی کتاب موسوم بہ "جنگ عظیم کے اثرات ہندوستان پر" صفحہ ۴۸۔

ترقی دینے کے لئے ارادی کوششیں کیں۔ لیکن بیرونی ممالک میں معمولی صنعتی کاروبار کے لئے ہندوستانی پیداوار کی مانگ میں عام طور پر کمی بھی ہوگئی۔ ص ۲۵۵ چنانچہ بحیثیت مجموعی جنگ عظیم کے زمانے میں ہندوستان کو اپنی پیداوار ایک محدود رقبے میں فروخت کرانی پڑی' اور اگرچہ اس کو زمانۂ قبل از جنگ کے مقابلے میں اعلیٰ قیمتیں وصول ہوئیں لیکن درآمدہ اشیا کے لئے جو قیمتیں ادا کرنی پڑیں وہ کہیں زیادہ اعلیٰ تھیں۔

۱۴ ہندوستانی تجارت خارجہ کے زمانۂ بعد از جنگ کے میلانات [1]

زمانۂ بعد از جنگ کے اوائل میں درآمدی تجارت میں عارضی اور جزوی بحالی کے بعد سلطنت متحدہ کا حصہ پھر کم ہوگیا' اور درآمدی تجارت میں اس کے حصے کی تدریجی کمی ۱۹۲۶ـ۲۷ء میں نمایاں ہوگئی جس کا باعث یہ تھا کہ سلطنت متحدہ میں کوئلے کی ہڑتال طویل مدت تک جاری رہی جس کی وجہ سے اس کی صنعتیں سخت متاثر ہوئیں۔ چنانچہ اس سال ہندوستان کی مجموعی درآمدی تجارت میں اس کا حصہ کم ہوکر ۴۷٫۸ فیصد رہ گیا۔ ۱۹۲۷ـ۲۸ء میں یہ صورت حال بہت بڑی حد تک سابقہ سال ہی کی طرح رہی لیکن ۱۹۲۸ـ۲۹ء میں نمایاں کمی ہوگئی۔ چنانچہ اوسط زمانۂ قبل از جنگ کے ۶۴٫۱ فیصد کے مقابلے میں ۴۴٫۷ فیصد تھا۔ ۱۹۲۹ـ۳۰ء میں یہ اوسط ۴۲٫۸ فیصد ۱۹۳۰ـ۳۱ء میں ۳۷٫۲ فیصد اور ۱۹۳۱ـ۳۲ء میں ۳۵٫۵ فیصد تک کم ہوگیا۔[2] آخری دو سال میں جو کمی ہوئی اس کا باعث ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال تھی۔ سلطنت متحدہ کو ہندوستانی بازار میں جرمنی' جاپان اور ریاست ہائے متحدہ جیسے ملکوں کی مسابقت کا پھر سامنا کرنا پڑا۔ ہم پہلے

[1] نیز ملاحظہ ہو ویرا آنسٹے کی کتاب موسوم بہ "بحر ہند کی تجارت" صفحہ ۷۴ تا صفحہ ۷۹۔

[2] اسی طرح کل سلطنت برطانیہ کا حصہ ۱۹۲۹ـ۳۰ء کے ۵۱٫۵ فیصد سے ۱۹۳۰ـ۳۱ء کے ۴۶٫۱ فیصد تک گھٹ گیا۔

بیان کر چکے ہیں کہ جاپانی مسابقت ہندوستانی بازار میں سوتی کپڑوں کے بارے میں نہ صرف ہندوستانی گرنیوں سے بلکہ لنکاشائر کی گرنیوں سے بھی تھی ہندوستان سے برطانیہ عظمیٰ کی درآمد تجارت کی کمی کی ایک اور وجہ اس واقعہ میں ملتی ہے کہ ۳۷-۱۹۳۶ء تک برطانیہ عظمیٰ نے ہندوستان کے ہاتھ جتنا مال بیچا اس سے کم مال ہندوستان سے خریدا۔ اس کے برخلاف جاپان، جرمنی اور ریاستہائے متحدہ امریکہ ہندوستان سے عموماً زیادہ سامان خریدتے رہے اور اس طرح زیادہ مال فروخت کرنے کے قابل ہوئے ۳۳-۱۹۳۲ء اور ۳۴-۱۹۳۳ء کے درمیان برطانیہ عظمیٰ کی صورتِ حال میں اصلاح ہوئی۔ چنانچہ ۳۴-۱۹۳۳ء میں اس کا حصہ ۱ء۴۱ فیصد تک بڑھ گیا۔ اس بحالی کو بڑی حد تک اس موافق صورتِ حال کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے جو برطانیہ عظمیٰ کے لئے ہندوستانی بازار میں اوٹاوا کی ترجیحات کی رو سے جن کا نفاذ یکم جنوری ۱۹۳۳ء سے ہوا پیدا ہوئی۔ لیکن کچھ سال ادھر سے پھر سلطنت متحدہ کے حصے کا تناسب بتدریج گھٹ رہا ہے چنانچہ ۳۷-۱۹۳۶ء میں وہ ۴ء۳۸ فیصد تھا۔ جاپان اور ریاست ہائے متحدہ نے جنگ کے زمانے میں جو ترقی کی تھی اس فطری طور پر وہ کسی حد تک پیچھے ہٹ گئے، اور جاپان کے حصے میں ۲۱-۱۹۲۰ء کے تجارتی بحران کے باعث خاص طور پر کمی ہوگئی۔ ان دونوں ملکوں کی اشیا کی درآمد کو متاثر کرنے والا ایک اور سبب یہ تھا کہ پرانے حریف پھر میدان میں آگئے اور ہندوستانی بازاروں میں مسابقت کے معمولی حالات پھر پیدا ہوگئے۔ چنانچہ ۳۴-۱۹۳۳ء میں جاپان کا حصہ جو ۲ء۱۴ فیصد تھا ۳۷-۱۹۳۶ء میں ۱۷ فیصد ہوگیا۔ اس کے برخلاف ریاست ہائے متحدۂ امریکہ کا حصہ ۳۶-۱۹۳۵ء میں ۷ء۶ فیصد تھا جو ۳۷-۱۹۳۶ء میں ۵ء۶ فیصد تک گھٹ گیا۔ ہندوستانی درآمد میں جرمنی کا حصہ ۳۶-۱۹۳۵ء میں ۲ء۹ فیصد تھا جس کو جرمنی نے ۳۷-۱۹۳۶ء میں ۷ء۹ فیصد تک بڑھا لیا۔ جنگ عظیم کے پیشتر کے سال یعنی ۱۴-۱۹۱۳ء میں جرمنی کا حصہ ۹ء۶ فیصد تھا وہ ۲۳-۱۹۲۲ء میں ۱ء۵ فیصد تک گھٹ گیا تھا۔ ۳۷-۱۹۳۶ء میں بلجیم کا حصہ ۲ء۲ فیصد اور فرانس کا حصہ کچھ کم ۱ فیصد تھا۔

۲۵۶

جیسا کہ توقع کی جا سکتی تھی، جنگ عظیم کے بعد برآمدی تجارت کا میلان سلطنت متحدہ سے قطعی طور پر پلٹنے کی جانب تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء-۱۴ء میں اس کا حصہ ۴ء۲۳ فیصد تھا اس کے مقابل ۱۹۲۶ء-۲۷ء میں ۴ء۲۱ فیصد تک گھٹ گیا۔ ۱۹۲۷ء-۲۸ء میں عارضی اضافہ یعنی تناسب ۰۰ء۲۵ ہونے کے بعد ۱۹۲۸ء-۲۹ء میں پھر ۴ء۲۱ فیصد تک کم ہو گیا۔ ۱۹۲۹ء-۳۰ء میں یہ تناسب ۸ء۲۱ فیصد تھا، لیکن ۱۹۲۹ء-۳۰ء میں ۲۴ فیصد تک، ۱۹۳۱ء-۳۲ء میں ۹ء۲۷ فیصد تک اور ۱۹۳۳ء-۳۴ء میں ۲ء۳۲ فیصد تک بڑھ گیا۔ ۱۹۳۵ء-۳۶ء میں ۵ء۳۱ فیصد تک کم ہو جانے کے بعد ۱۹۳۶ء-۳۷ء میں پھر ۵ء۳۲ فیصد تک بڑھ گیا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ سال ادھر سے ہندوستان کی برآمدی تجارت میں سلطنت متحدہ کے حصے میں خاصی ترقی ہوئی ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ سلطنت متحدہ کی حد تک ہندوستانی برآمد کی جو زیادتی تھی وہ ۱۹۳۶ء-۳۷ء میں ۱۸ کروڑ روپے کے موافق توازن تجارت میں مبدل ہو گئی۔ برآمدی تجارت میں جاپان کی اضافی حیثیت میں بھی نمایاں ترقی ظاہر ہوئی۔ چنانچہ ہندوستان سے خام کپاس، دھاتیں، کچی دھات، ٹاٹ کے تھیلے اور لاکھ جاپان کو کثیر مقدار میں برآمد ہونے کے باعث جاپان کا حصہ ۱۹۳۴ء-۳۵ء میں ۲ء۷ فیصد سے ۷ء۱۵ تک بڑھ گیا۔ ۱۹۳۵ء-۳۶ء میں ۴ء۱۳ فیصد تک گھٹنے کے بعد ۱۹۳۶ء-۳۷ء میں اس میں پھر ۱۵ فیصد تک بیشی ہو گئی۔ ہندوستانی برآمد میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے حصے میں ۱۹۳۵ء-۳۶ء میں کچھ ترقی ہوئی تھی، لیکن ۱۹۳۵ء-۳۶ء میں ۱ء۱۰ فیصد ہونے کے بعد ۱۹۳۶ء-۳۷ء میں پھر کمی ہوئی اور وہ ۵ء۹ فیصد رہ گئی۔ جرمنی کا حصہ برآمدی تجارت میں پہلے سے کم ہو گیا، یعنی ۱۹۲۷ء-۲۸ء میں ۹ء۹ فیصد اور ۱۹۳۵ء-۳۶ء میں ۹ء۵ فیصد تھا اس کے مقابل ۱۹۳۶ء-۳۷ء میں ۷ء۴ فیصد ہو گیا۔ ۱۹۳۶ء-۳۷ء میں بلجیم کا حصہ ۶ء۳ فیصد اور فرانس کا حصہ ۹ء۳ فیصد رہا۔

ہندوستانی تجارت خارجہ کے زمانۂ بعد از جنگ کے عام میلان کے متعلق مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ زمانۂ قبل از جنگ کا یہ میلان کہ ہندوستانی

درآمدی و برآمدی تجارت کا رخ سلطنت متحدہ سے پلٹ جائے خاص کر درآمدی تجارت کے بارے میں شدت کے ساتھ از سر نو رونما ہوا اور ۱۹۳۱-۳۲ء تک قایم رہا۔ اس کے بعد جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، سلطنت متحدہ کے حصے میں خاص کر ہندوستان کی برآمدی تجارت کی حد تک ترقی ہوئی۔ جاپان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ، ہندوستانی بازار میں انگلستان کے سب سے طاقتور حریف ہیں۔ جرمنی نے ہندوستانی درآمد کی حد تک اپنی سابقہ حیثیت دوبارہ حاصل کر لی ہے، اگرچہ ہماری برآمدی تجارت میں اس
۲۵۷ کا حصہ حالیہ سالوں میں کچھ کم ہو گیا ہے۔ ان سب قوموں نے ہندوستان کے ساتھ اپنی تجارت کو ترقی دینے کے لئے بہت اچھا کاروباری نظام قائم کیا ہے، اور اس بارے میں وہ سلطنت متحدہ پر سبقت لے گئے ہیں۔ لیکن اب سلطنت متحدہ نے ان کے نقش قدم پر چلنے کی ضرورت کو محسوس کرنا شروع کیا ہے۔ "اوٹاوا کی ترجیحات" کا نفاذ ۱۹۳۳ء کے اوائل میں ہوا اور یہ بھی سلطنت متحدہ ہندوستان کی تجارت خارجہ میں اپنی سابقہ حیثیت دوبارہ حاصل کرنے میں کسی حد تک مد دے رہے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں تامین کے زیر سایہ جو صنعتی ترقی ہو رہی ہے اس کی وجہ سے سلطنت متحدہ کے حصے کا ہندوستان کی درآمدی تجارت میں بڑھنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو گیا ہے۔

مندرجہ ذیل جدول (۳) اور جدول (۴) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ درآمد اور برآمد کی جانب بعض اہم اشیا کی حد تک ہندوستان کی تجارت کا کیا رخ رہا ہے اور اس میں کیا تغیرات ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی تجارت کے رخ کی اکثر اہم خصوصیات ان جدولوں میں صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہیں اور ان کو ذیل کی عبارت میں مختصر طور پر بیان کر دینا مناسب ہوگا۔

(۱) درآمد۔ جدول (۳) سے یہ معلوم ہوگا کہ سلطنت متحدہ کو تقریباً سب شعبوں میں مسابقت کا خطرہ ہے۔ ان میں وہ شعبے بھی شامل ہیں جن کے متعلق اب تک یہ خیال کیا جاتا رہا ہے کہ برطانیہ کو غالب حیثیت

جدول (۳) ہندوستانی تجارت کا رخ[1] ۴۵۲ (الف)

درآمدہ اشیا کا فی صد تناسب۔ جہاں اعداد درج نہیں ہیں ان کا یہ مطلب ہے کہ یا تو تجارت نہیں ہوئی یا کم ہوئی۔

ملک	سوتی مصنوعات		شکر		لوہا اور فولاد		کلیں		آہنی سامان		موٹر کار وغیرہ		معدنی تیل		کاغذ اور دفتی	
	۱۹۱۳ تا ۱۹۱۴	۱۹۳۶ تا ۱۹۳۷	۱۹۱۳ تا ۱۹۱۴	۱۹۳۶ تا ۱۹۳۷	۱۹۱۳ تا ۱۹۱۴	۱۹۳۶ تا ۱۹۳۷	۱۹۱۳ تا ۱۹۱۴	۱۹۳۶ تا ۱۹۳۷	۱۹۱۳ تا ۱۹۱۴	۱۹۳۶ تا ۱۹۳۷	۱۹۱۳ تا ۱۹۱۴	۱۹۳۶ تا ۱۹۳۷	۱۹۱۳ تا ۱۹۱۴	۱۹۳۶ تا ۱۹۳۷	۱۹۱۳ تا ۱۹۱۴	۱۹۳۶ تا ۱۹۳۷
سلطنت متحدہ	۹۰٫۱	۵۰٫۷	۱٫۸	۴٫۸	۶۹٫۹	۵۶٫۳	۸۹٫۸	۶۵٫۵	۵۷٫۲	۳۴٫۱	۷۱٫۳	۴۱٫۹	۵٫۷	۵٫۳	۵۶٫۰	۳۰٫۵
ریاست ہائے متحدہ امریکہ	۰٫۴	۰٫۱	—	—	۲٫۶	۱٫۵	۳٫۳	۸٫۹	۹٫۷	۸٫۹	۱۵٫۱	۳۸٫۰	۵۶٫۱	۱۵٫۷	—	۱٫۱
جرمنی	۲٫۱	۰٫۳	—	—	۱۴٫۵	۱۲٫۰	۵٫۶	۱۴٫۳	۱۸٫۲	۳۲٫۴	—	۶٫۰	۷٫۳	۳٫۴	۱۷٫۰	۲۵٫۲
بلجیم	—	۰٫۱	—	۰٫۳	۱۱٫۵	۱۳٫۱	—	۲٫۲	—	۱٫۰	۴٫۵	—	—	—	—	—
جاپان	۱٫۸	۴۳٫۲	—	۳٫۲	—	۷٫۹	—	۱٫۳	۱٫۵	۱۱٫۸	—	۰٫۷	—	—	—	—
فرانس	—	۰٫۳	—	—	—	۲٫۳[2]	—	۰٫۳[2]	—	۰٫۶	۴٫۵	۰٫۳	—	—	—	۰٫۴
اٹلی	۱٫۵	۰٫۲	—	—	—	—	—	—	—	—	—	۱٫۱	—	—	—	—
ہالینڈ	۱٫۶	۰٫۵	—	۷٫۴	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	۲٫۵	۳٫۹
آسٹریلیا	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—
ناروے	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	۵٫۰	۱۰٫۸
سویڈن	—	—	—	—	—	۱٫۹	—	۱٫۳	۰٫۹	۵٫۳	—	—	—	—	۳٫۱	۱۱٫۵
کنیڈا	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	۱۱٫۴	—	—	—	—
بارنیو سوماٹرا وغیرہ[2]	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	۲۵٫۱	۱۹٫۳	—	۰٫۱
جاوا اور اسٹریٹس سٹلمنٹس	—	—	۷۱٫۸	۵۵٫۷	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—
ماریشس	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—
ایران	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	۳٫۷	۳۳٫۵	—	—
اتحاد جماہیر شورائیۂ روس	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—
چین	۰٫۱	۲٫۱	۲۷٫۲	—									۰٫۹	۲۰٫۳	—	—
سوئٹزرلینڈ	—	۱٫۷	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—
آسٹریا	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	۸٫۳	۳٫۱
مذکورۂ بالا ملکوں کی مجموعی تجارت کا فیصد تناسب	۹۷٫۶	۹۵٫۳	۹۰٫۵	۹۸٫۶	۹۸٫۵	۹۶٫۰	۹۸٫۷	۹۳٫۸	۸۷٫۵	۹۴٫۱	۹۵٫۴	۹۹٫۲	۹۸٫۸	۹۸٫۵	۹۱٫۹	۸۶٫۶
تجارت کی مالیت (کروڑ روپیہ)	۶۶٫۳	۱۷٫۵	۱۴٫۹	۰٫۲۳	۱۲٫۰	۵٫۹	۷٫۸	۱۳٫۱	۳٫۸	۲٫۹	۱٫۵	۴٫۵	۴٫۱	۵٫۹	۱٫۶	۲٫۸

[1] یہ اعداد ایک رپورٹ موسوم بہ "تبصرہ بر تجارت ہند برائے ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء" سے ماخوذ ہیں۔

[2] اس میں اسٹریٹس سٹلمنٹس اور دوسرے جزائر شامل ہیں۔

جدول (۴۲) ۔ ہندوستانی تجارت کا رخ[1] ۴۵۲ (ب)

برآمد کردہ اشیا کا فیصد تناسب ۔ جہاں اعداد درج نہیں ہیں ان کا یہ مطلب ہے کہ یا تو تجارت نہیں ہوئی یا کم ہوئی ۔

ملک	چائے		خام سن		سن کی مصنوعات		خام کپاس		چرسے اور کھالیں (خام اور دباغت کردہ)		روغن دار تخم		غذائی اجناس	
	۱۹۱۳ تا ۱۹۱۴	۱۹۳۶ تا ۱۹۳۷	۱۹۱۳ تا ۱۹۱۴	۱۹۳۶ تا ۱۹۳۷	۱۹۱۳ تا ۱۹۱۴	۱۹۳۶ تا ۱۹۳۷	۱۹۱۳ تا ۱۹۱۴	۱۹۳۶ تا ۱۹۳۷	۱۹۱۳ تا ۱۹۱۴	۱۹۳۶ تا ۱۹۳۷	۱۹۱۳ تا ۱۹۱۴	۱۹۳۶ تا ۱۹۳۷	۱۹۱۳ تا ۱۹۱۴	۱۹۳۶ تا ۱۹۳۷
سلطنت متحدہ	۷۲٫۱۳	۸۵٫۱۶	۳۸٫۵۰	۲۳٫۱۶	۶٫۳	۹٫۱۷	۳٫۱۵	۱۴٫۶۲	۲۵٫۶۹	۶۷٫۱۱	۲۲٫۱۳	۲۸٫۱۰	۲۹٫۶۷	۱۶٫۶۳
کنیڈا	۳٫۱۳	۳٫۶۷	—	۰٫۱۱	—	۳٫۳	.	.	.	.	.	.	.	.
آسٹریلیا	۳٫۱۱	۰٫۶۲	—	۰٫۰۲	۱۰٫۶۲	۸٫۱۵	.	.	.	.	.	.	.	.
ریاست ہائے متحدہ امریکہ	۰٫۶۷	۲٫۱۱	۱۱٫۶۹	۱۰٫۰۸	۴۱٫۱۵	۳۱٫۱۹	—	۴٫۵۰	۲۴٫۱۳	۱۵٫۱۳	۱٫۰۲	۱٫۶۸	—	۰٫۶۲
جرمنی	—	—	۲۱٫۰۸	۱۵٫۰۹	—	۰٫۶۲	۱۴٫۶۹	۵٫۱۱	۲۰٫۱۳	۵٫۵۰	۱۹٫۶۰	۸٫۵۶	۷٫۰۸	۳٫۱۱
جاپان	—	—		۳٫۰۹	۰٫۵۵	۲٫۱۳	۴۷٫۲۲	۵۷٫۲۳	—	۲٫۱۳	—	۰٫۱۳	۳٫۰۸	۴٫۰۰
فرانس	—	—	۹٫۰۹	۱۰٫۶۷	—	۰٫۱۱	—	۳٫۰۶	—	۲٫۱۳	۴۱٫۶۴	۱۲٫۱۵	—	۱٫۰۰
اٹلی	—	—	۵٫۱۵	۹٫۱۵	.	.	۶٫۱۷	۳٫۰۸	۵٫۰۳	۱٫۱۱	۵٫۰۰	۲٫۰۸	—	۰٫۰۶
بلجیم	—	—	۰٫۱۵	۸٫۰۴	.	۰٫۰۸	۱۰٫۰۳	۷٫۶۳	—	۰٫۰۲	۱۶٫۶۰	۲٫۶۹	.	۰٫۱۵
سیلون	۱٫۱۶	۰٫۰۹	—	.	.	۰٫۰۱	.	۰٫۰۱	.	.	.	۰٫۰۶	۱۱٫۵۵	۲۴٫۰۸
اتحاد جماہیر شورائیہ روس	۱۱٫۰۱	۰٫۰۶	—	.	.	.	.	.	.	.	.	.	.	.
ایران، عرب وغیرہ	۱٫۶۳	۵٫۰۰	—	۲٫۰۰	.	۰٫۰۸	.	.	.	۰٫۰۳	.	۰٫۰۳	۵٫۰۶	۴٫۰۰
جاوا	—	—	—	.	۲٫۰۵	۲٫۱۵	.	.	.	.	.	.	.	.
جمہوریۂ ارجن ٹائن	—	—	—	۰٫۰۹	۱۰٫۰۴	۱۰٫۰۳	—	.	.	.	.	.	.	.
چین	.	—	—	.	.	.	۱٫۶۷	۱٫۰۶	.	.	.	.	.	۱٫۶۳
ہسپانیہ	—	—	۲٫۰۸	۲٫۰۰	.	.	.	۰٫۰۶	۲٫۰۸	.	.	۰٫۰۳	.	.
ہالینڈ	—	—	—	.	.	.	.	۱٫۱۱	۳٫۱۳	۱٫۰۰	۱٫۱۱	۷٫۰۳	۶٫۰۸	۲٫۰۲
اسٹریٹ سٹل منٹس	—	—	—	.	.	.	.	—	.	۰٫۰۱	.	۰٫۰۳	۶٫۰۷	۸٫۰۸
سوماٹرا اور جاوا	—	—	—	.	.	.	.	.	.	.	.	.	۱٫۰۰	۲٫۰۱
مصر	۰٫۶۵	۰٫۱۱	—	۰٫۰۸	۲٫۰۱	۳٫۰۱	.	.	.	.	.	.	.	.
اتحاد جنوبی افریقہ	—	۰٫۱۱	—		۱٫۶۶	۱٫۶۷	.	.	.	.	.	.	.	.
سیام	—	—	—		۱٫۶۲	۱٫۰۶	.	.	.	.	.	.	.	.
مذکورۂ بالا ملکوں کی مجموعی تجارت کا فیصد تناسب	۹۴٫۱۹	۹۸٫۱۳	۹۰٫۱۴	۸۸٫۰۸	۷۶٫۱۲	۷۸٫۵۰	۸۵٫۱۰	۹۶٫۶۴	۸۱٫۶۹	۹۴٫۱۹	۹۲٫۰۸	۸۰٫۳۸	۶۹٫۶۶	۶۸٫۶۹
تجارت کی مجموعی مالیت (کروڑ روپیہ)	۵۵٫۰۰	۳۰٫۰۰	۳۰٫۰۸	۱۴٫۰۸	۲۸٫۱۲	۲۸٫۶۰	۳۱٫۱۰	۳۳٫۱۳	۱۵٫۶۹	۱۱٫۶۰	۲۵٫۱۶	۱۸٫۶۳	۳۵٫۰۱	۱۵٫۶۳

[1] یہ اعداد ایک رپورٹ موسوم بہ "تبصرہ بر تجارت ہند برائے ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء" صفحہ ۱۳۳ تا صفحہ ۱۳۴ سے ماخوذ ہیں ۔

حاصل ہے۔ گو سلطنت متحدہ، ہندوستان کو سوتی مصنوعات ابھی تک سب سے زیادہ مقدار میں روانہ کرتی ہے، پھر بھی ہندوستانی درآمد میں اس کا حصہ ۲۹-۱۹۲۸ء میں ۳ء۱۷ فیصد تک اور ۳۷-۱۹۳۶ء میں ۰۰ء۵ فیصد تک تدریج گھٹ گیا۔ اس کے مقابل ۱۴-۱۹۱۳ء میں تناسب ۱ء۰۹ فیصد تھا۔ جاپان کا حصہ ۱۴-۱۹۱۳ء میں ۰۸ء۱ فیصد تھا، لیکن ۲۹-۱۹۲۸ء کے ۳ء۱۸ فیصد کے مقابل ۳۷-۱۹۳۶ء میں ۲ء۳۴ فیصد تک بڑھ گیا، اور بیشی زیادہ تر سوتی دھاگے، سوت، اور بھورے اور رنگین سوتی کپڑوں میں ہوئی۔ ہندوستان میں شکر کی درآمد کا اہم ذریعہ جاوا ہی رہا۔ اگرچہ شکر کی مجموعی درآمدہ مقدار زیادہ نہیں رہی ہے۔ ۳۷-۱۹۳۶ء میں تجارت کی خصوصیت یہ تھی کہ چین (بشمول ہانگ کانگ) سے تجارت میں بہت بیشی ہوئی جہاں سے دوسرے ملکوں کی تیار کی ہوئی شکر کی بڑی مقدار ہندوستان بھیجی گئی۔ زمانۂ بعد از جنگ میں جہاں لوہے، فولاد، کلوں اور آہنی سامان کی آمد سلطنت متحدہ سے کم ہوئی وہاں ریاستہائے متحدۂ امریکہ، جرمنی، بلجیم اور جاپان سے زیادہ ہوگئی حالانکہ سلطنت متحدہ ہی خاص کر لوہا، فولاد اور کلیں مہیا کرنے میں مقابلۃً سب ملکوں سے بڑھا رہا۔ لوہے اور فولاد کی حد تک سلطنت متحدہ نے اپنی غالب حیثیت برقرار رکھی اور ۳۷-۱۹۳۶ء میں اس کا حصہ کل ہندوستانی تجارت میں زائد از ۵۲ فیصد رہا۔ اس سے پیشتر کے سال میں بھی مقدار اتنی ہی رہی تھی۔ جرمنی، فرانس اور لکسمبرگ کے حصے میں بیشی اور بلجیم کے حصے میں کمی ہوگئی۔ کچھ سال او مصر سے جاپان کا حصہ بتدریج بڑھ گیا ہے چنانچہ ۳۶-۱۹۳۵ء میں ۶ فیصد تھا اور ۳۷-۱۹۳۶ء میں ۸ فیصد ہوگیا ۳۵-۱۹۳۴ء سے کلوں کی حد تک جاپان کے حصے میں اضافہ سلطنت متحدہ کے نقصان سے ہوا۔ لیکن اس کے باوجود سلطنت متحدہ ہی کی کلیں سب سے زیادہ مقدار میں درآمد ہوئی ہیں۔ دوسرے ملکوں کے منجملہ ریاستہائے متحدۂ امریکہ، جرمنی، بلجیم اور سویڈن کے حصوں میں بھی گذشتہ سال کے مقابلے میں بیشی ہوئی۔ آہنی سامان کی حد تک سلطنت متحدہ کا حصہ ۳۷-۱۹۳۶ء میں بڑھ گیا

چنانچہ ۳۶-۱۹۳۵ء میں وہ ۸ء۳۱ فیصد تھا اور ۳۷-۱۹۳۶ء میں اس میں ۱ء۳۴ فیصد تک بیشی ہوئی۔ جاپان کا حصہ بھی ۹ء۱۰ فیصد سے بڑھکر ۸ء۱۱ فیصد ہو گیا۔ اس کے برخلاف جرمنی، ریاستہائے متحدہ امریکہ اور سوئیڈن کا حصہ کم ہو گیا۔ صفحہ ۲۶

معدنی تیلوں کی حد تک روس اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کا حصہ کم ہو گیا، لیکن بورنیو اور سوماٹرا کے حصے میں کافی بیشی ہوئی۔ موٹر کی سواریوں کی حد تک سلطنت متحدہ کا حصہ ۳۶-۱۹۳۵ء میں ۷ء۱۴ فیصد تھا، لیکن ۳۷-۱۹۳۶ء میں وہ ۹ء۴۱ فیصد تک بڑھ گیا، اور انھی برسوں میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کا حصہ ۵ء۳۵ فیصد سے ۰ء۳۸ فیصد تک بڑھ گیا۔ جرمنی کا حصہ ۶ فیصد تک بڑھا۔ اس کے برخلاف کینیڈا کا حصہ ۳۶-۱۹۳۵ء میں ۱۷ فیصد تھا، لیکن ۳۷-۱۹۳۶ء میں ۲ء۱۱ فیصد تک گھٹ گیا۔

(۲) برآمد۔ برآمد کی جانب سلطنت متحدہ، ہندوستانی چائے کی سب سے بڑی واحد خریدار ہے۔ چنانچہ اس نے مجموعی برآمد میں سے ۳۶-۱۹۳۵ء میں ۶ء۸۹ فیصد حصہ اور ۳۷-۱۹۳۶ء میں ۶ء۸۵ فیصد حصہ لیا۔ کینیڈا کا حصہ ۳۶-۱۹۳۵ء میں ۲ء۳ فیصد تھا، لیکن ۳۷-۱۹۳۶ء میں بڑھکر ۷ء۳ فیصد ہو گیا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے حصے میں بھی ۳۶-۱۹۳۵ء کے ۹ء۱ فیصد سے ۳۷-۱۹۳۶ء کے ۱ء۲ فیصد تک بیشی ہوئی۔ آجکل چائے کی راست تجارت روس سے بہت کم مقدار میں ہوتی ہے، لیکن زمانۂ قبل از جنگ میں چائے کی مجموعی برآمد میں سے روس نے ۱۱ فیصد حصہ لیا۔ خام سن کی حد تک سلطنت متحدہ نے ۳۶-۱۹۳۵ء میں ۶ء۲۱ فیصد اور ۳۷-۱۹۳۶ء میں ۶ء۲۳ فیصد حاصل کیا۔ دوسرے یورپی ملکوں میں جرمنی اور ہسپانیہ نے بہت کم اور دوسری طرف فرانس، بلجیم اور اٹلی نے زیادہ حصہ لیا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جاپان کے حصوں میں اضافہ ظاہر ہوا۔ ہندوستان سے سن کی مصنوعات کی برآمد حسب معمول سب سے زیادہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہوئی لیکن اضافی حیثیت سے اس کا حصہ ۱ء۳۲ فیصد سے ۹ء۳۱ فیصد تک گھٹ گیا۔

اس کے برخلاف سلطنت متحدہ اور ارجن ٹائن کے حصوں میں علی الترتیب
۸٫۸ فیصد سے ۹٫۷ فیصد تک اور ۸٫۸ فیصد سے ۱۰٫۴ فیصد تک اضافہ
ہوا۔ آسٹریلیا کا حصہ ۹٫۳ فیصد سے گھٹکر ۸٫۵ فیصد رہ گیا۔ ہندوستانی سن
کی مصنوعات کے دوسرے گاہک سیام، کینڈا، اتحاد جنوبی افریقہ اور جاپان
ہیں۔ خام کپاس کا سب سے بڑا خریدار جاپان ہے۔ چنانچہ مجموعی ہندوستانی
برآمد میں سے اس نے ۱۹۳۵-۳۶ء میں ۵۳٫۱ فیصد اور ۱۹۳۶-۳۷ء میں ۵۷٫۲
فیصد خریدا۔ سلطنت متحدہ کی خریداری کی مقدار ۱۹۳۵-۳۶ء میں ۱۳٫۴ فیصد
تھی اور ۱۹۳۶-۳۷ء میں بڑھکر ۱۴٫۲ فیصد ہوگئی۔ جہاں بلجیم کی خریداری کا تناسب
۵٫۶ فیصد سے ۷٫۳ فیصد تک بڑھا، وہاں جرمنی، فرانس اور اٹلی کا حصہ
گھٹ گیا۔ غذائی اجناس کی حد تک، ہندوستانی چاول کا بہترین خریدار سیلون
ہے۔ چنانچہ غذائی اجناس کی مجموعی برآمد کردہ مقدار میں سے اس نے
۱۹۳۵-۳۶ء میں ۳۱٫۱ فیصد اور ۱۹۳۶-۳۷ء میں ۲۴٫۸ فی صد خریدا۔
سلطنت متحدہ، اسٹریٹس سٹل منٹس، چین، سوماٹرا و جاوا، جرمنی اور بلجیم،
ہندوستانی غذائی اجناس کے دوسرے بڑے گاہک ہیں چنانچہ ۱۹۳۵-۳۶ء
میں سلطنت متحدہ نے ۵٫۲ فیصد خریدا، لیکن ۱۹۳۶-۳۷ء میں گیہوں زیادہ
مقدار میں خریدنے کی وجہ سے اس کے حصے کا تناسب بڑھکر ۱۶٫۲ ۲۶۱
فیصد ہوگیا۔ روغن دار تخموں کی حد تک، فرانس دوسرے ملکوں کے مقابلے
میں مونگ پھلی کی زیادہ مقدار درآمد کرتا ہے۔ سلطنت متحدہ، جرمنی، اٹلی اور
ہالینڈ دوسرے اہم ملک ہیں جو ہندوستان سے روغن دار تخموں کو درآمد
کرتے ہیں۔ سلطنت متحدہ کا حصہ ۱۹۳۵-۳۶ء میں ۲۵ فیصد تھا، لیکن ۱۹۳۶-۳۷ء
میں ۲۸ فیصد ہو جانا خاص بیشی کو ظاہر کرتا ہے۔ اٹلی کے حصے میں ۴٫۷
فیصد سے ۸٫۶ فیصد تک اور بلجیم کے حصے میں ۲٫۲ فیصد سے ۲٫۹
فیصد تک بیشی ہوئی۔ اس کے برعکس فرانس اور جرمنی کے حصوں میں کمی ہوگئی۔
چمڑے اور کھالوں کے سب سے بڑے خریدار سلطنت متحدہ اور
ریاستہائے متحدہ امریکہ ہیں۔ سلطنت متحدہ نے ۱۹۳۵-۳۶ء میں

۶ء۲۷ فیصد اور ۳۷-۱۹۳۶ء میں ۱ء۲۶ فیصد حصے کی خریداری کی۔ فرانس کا حصہ ۵ء۱ فیصد سے ۴ء۲ فیصد تک بڑھ گیا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے حصے میں بہت ہی نمایاں کمی ہوگئی۔ چنانچہ پہلے سال ۷ء۱۹ فیصد تھا اور دوسرے سال ۳ء۱۵ فیصد تک گر گیا۔ جرمنی زمانۂ قبل از جنگ میں ہندوستانی چیزوں کے بہترین خریداروں میں سے تھا، لیکن اب اس کی خریداری میں بہت کمی ہوگئی ہے۔ اٹلی بھی پہلے کے مقابلے میں اب بہت کم مقدار درآمد کرتا ہے۔

۱۵ ہندوستان کی مکرر برآمد کی تجارت

کسی ملک کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ اشیا کی لوٹ کر برآمد کر رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اشیا کو پہلے درآمد کرتا ہے اور اس کے بعد اُن کو پھر برآمد کرتا ہے۔ گویا زیرِ بحث ملک محض ایک تقسیمی مرکز کا کام کرتا ہے۔

ہندوستان میں اس قسم کی مکرر برآمد کی تجارت بہت قدیم زمانے سے جاری ہے، جس کی بڑی وجہ اس کا جغرافی محلِ وقوع ہے۔ چونکہ ہندوستان مشرقی نصف کرۂ ارض کے وسط میں واقع ہے، اس لئے مشرقِ بعید اور مغرب کے درمیان جو تجارتی مال گزرتا ہے اس کے ٹھیرانے کی یہی موزوں جگہ ہے۔ چنانچہ قدیم زمانے میں یہ حصۂ تجارت زیادہ تر چین سے ریشمی کپڑوں اور ظروف، اسیلون سے موتی اور مشرقی مجمع جزائر سے قیمتی پتھر اور مسالے کی درآمد پر مشتمل ہوتا تھا، اور اس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ مغرب کے ملکوں کو یہ اشیا دوبارہ برآمد کی جائیں۔ اسی طرح مغربی ممالک کی اشیا مثلاً دینی شیشہ وغیرہ مشرقی ملکوں کو مکرر برآمد کیا جاتا تھا[۱]۔ لیکن موجودہ زمانے میں ہندوستان کی مکرر برآمد کی تجارت میں کچھ سال ادھر تک بتدریج توسیع ہوئی۔ چنانچہ ۸۳-۱۸۸۲ء میں اس کی مالیت

---

[۱] ملاحظہ ہو کے، ٹی، شاہ کی کتاب موسوم بہ "ہندوستانی تجارت، محصول، اور نقل و حمل" صفحہ ۹۲۔

۵ء۸۰ کرور روپے تھی، لیکن ۱۹۲۰-۲۱ء میں ۱۸ء۰۴ کرور روپے ہوگئی۔ البتہ موخرالذکر سال کے بعد سے اس میں کمی ہوگئی۔ چنانچہ اس کی مالیت ۱۹۲۴-۲۵ء میں ۱۳½ کرور روپے ۱۹۲۵-۲۶ء میں ۱۰½ کرور روپے ۱۹۲۶-۲۷ء میں ۸ کروڑ روپے ۱۹۲۷-۲۸ء میں ۹½ کروڑ روپے ۱۹۲۸-۲۹ء میں ۷ء۸۳ کروڑ روپے، ۱۹۲۹-۳۰ء میں ۷ کرور روپے ۱۹۳۰-۳۱ء میں ۵ کرور روپے ۱۹۳۱-۳۲ء میں ۴ء۶۵ کرور روپے اور ۱۹۳۲-۳۳ء میں ۳ء۲۲ کروڑ روپے رہی۔ ۱۹۳۳-۳۴ء میں غیر ملکی تجارتی مال کی مکرر برآمد میں ۳ء۲۲ کرور روپے سے ۳ء۴۲ کرور روپے تک خفیف سی بیشی ہوئی۔ ۱۹۳۴-۳۵ء اور ۱۹۳۵-۳۶ء کے دو سالوں میں مزید ترقی ہوئی۔ چنانچہ مکرر برآمد کی مالیت علی الترتیب ۳،۵۵ کرور روپے اور ۳ء۷۶ کرور روپے تھی۔ ۱۹۳۶-۳۷ء میں اس قسم کی تجارت میں نمایاں ترقی ہوئی چنانچہ اس کی مالیت ۶ء۲۴ کرور روپے تھی ۲۶۲
۱۹۳۶-۳۷ء میں ہندوستان کی مکرر برآمد کی تجارت میں دوسرے اہم ملکوں کے حصے کا فی صد تناسب حسب ذیل تھا:۔ سلطنت متحدہ ۴۹ فی صد؛ ریاستہائے متحدہ امریکہ ۱۱ فیصد؛ سیلون، عدن اور ماتحت علاقے ۵ فیصد؛ جاپان ۴ فیصد؛ عراق ۴ فیصد؛ عرب، ایران اور کینیا کی نوآبادی میں سے ہر ایک ۳ فیصد؛ اور جرمنی، اسٹریٹس سٹل منٹس، انگریزی مصری سوڈان اور جزائر بحرین میں سے ہر ایک ۲ فیصد۔ مکرر برآمد کی تجارت کا بیشتر حصہ حسب معمول بمبئی میں سے گزرا۔ چنانچہ اس کی مقدار ۷۸ فیصد تھی۔ کراچی کا تناسب ۱۲ فیصد تھا اور وہ دوسرے نمبر پر تھا اور بنگال کا حصہ ۸ فیصد تھا۔

مندرجۂ ذیل جدول[1] میں ان اہم غیر ملکی تجارتی اشیا کی مالیت بتلائی گئی ہے جو ہندوستان سے مکرر برآمد کی گئیں۔ اعداد بہ لحاظ مدارج اہمیت ترتیب دیے گئے ہیں اور زمانۂ قبل از جنگ کے پانچ سالوں کے اوسط کے مقابلے میں ۱۹۳۶-۳۷ء کے حقیقی اعداد درج کیے گئے ہیں۔

لہ۔ ملاحظہ ہو ایک رپورٹ موسوم بہ "تبصرہ بہ تجارت ہند برائے ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء" صفحہ ۱۹۷، صفحہ ۱۹۸۔

مکرر برآمد کردہ اشیا کی مالیت
(بحساب ہزار روپیہ)

اشیا	زمانۂ قبل از جنگ کا اوسط[1]	سنہ ۱۹۲۳-۲۴ء	اشیا	زمانۂ قبل از جنگ کا اوسط	سنہ ۱۹۲۳-۲۴ء
خام چمڑے اور کھالیں	-	۲۵۱۶۵	آہنی سامان	۱۳۸۹	۱۵۶۷
			شکر	۵۲۹۵	۱۴۵۹
خام اون	۴۲۵۰	۳۸۲۹	میوے اور ترکاریاں	۱۳۱۱	۱۳۶۰
اونی مصنوعات	۴۱۶	۱۴۶۵	کلیں اور گرمی کا سامان	۵۶۸	۱۲۹۵
			لباس	۱۵۸۹	۵۹۳
میزان	۴۶۶۶	۵۲۹۴	گوند اور رال	۱۰۵۴	۵۱۵
دھاتیں اور کچی دھات	۲۰۰۵	۴۱۴۱	بساطی کی دکان اور کلاہ سازی کا سامان اور ٹوپیاں	-	۴۵۵
خام کپاس	۱۴	۱۶۴			
سوتی کپڑے	۱۵۷۵۱	۲۷۵۰			
میزان	۱۵۷۶۵	۲۹۱۴			
سواریاں	۷۵۲	۲۷۱۵	ربر کی مصنوعات	۱۱۲	۲۷۹

[1] زمانۂ جنگ کا اوسط ۸۱۴۳۸۰۰۰ روپے اور زمانہ بعد از جنگ کا اوسط ۱۵۶۴۷۴۰۰ روپے تھا۔

خام ریشم	۱۲۳	۲۹	ڈاک کے ذریعے مرسلہ اشیا	۱۶۲۴	۱۷۹
ریشمی مصنوعات وغیرہ	۷۰۳	۲۴۹۹	دوسری متفرق اشیا	۹۲۱۲	۱۱۹۴۸
میزان	۸۲۶	۲۵۲۸	مکرر برآمد کردہ اشیا کی مجموعی مالیت	۴۶۱۸۸	۶۲۴۰۷

مذکورۂ بالا جدول سے معلوم ہوگا کہ مکرر برآمد کی تجارت زیادہ تران مصنوعات کی بابت ہوئی جو مغربی ملکوں سے درآمد کی گئیں۔ چنانچہ خاصکر سوتی کپڑے ایران، مسقط اور مشرقی افریقہ روانہ کئے گئے۔ مغربی ملکوں کو جو اہم شے مکرر برآمد کی گئی وہ خام اون ہے جو ہندوستان کی بری سرحد پار سے درآمد کی جاتی اور جس کا بیشتر حصہ سلطنت متحدہ کو بھیجا جاتا ہے۔ ایران ص ۲۶۳ کی سنجاب اور پوستین کی کچھ مقدار بمبئی سے برآمد کی جاتی ہے۔ جزائر بحرین اور مسقط وغیرہ سے موتی درآمد کرکے بمبئی کی بندرگاہ سے دوسرے ملکوں کو برآمد کئے جاتے ہیں۔

گو ہندوستان، خاصکر ان ایشیائی ملکوں کے لئے جو بحری ساحل سے محروم ہیں اور جن کے لئے ہندوستانی بندرگاہیں ہی دوسرے ملکوں سے تجارتی تعلقات برقرار رکھنے کا سب سے قریبی وسیلہ ہیں کسی حد تک تقسیمی مرکز کی حیثیت ہمیشہ قائم رکھیگا۔ پھر بھی ہندوستان کی مکرر برآمدی تجارت کا مستقبل اس امر کے مدنظر درخشاں نہیں ہے کہ مختلف ملکوں میں راست تجارتی تعلقات قائم کرنے کا میلان روزافزوں ہے جس کی وجہ سے مکرر برآمدی مرکز کی حیثیت سے ہندوستان پران کا انحصار کم ہو جائے گا۔

۱۶ توازن تجارت اور توازن حسابات

ہندوستان کی تجارت خارجہ کی ایک معمولی اور بہت نمایاں خصوصیت یہ ہوا کرتی تھی کہ خانگی تجارتی مال کی درآمد کے مقابلے میں برآمد کی مقدار بہت زیادہ ہوتی تھی۔ گاہ گاہ توازن تجارت ہندوستان کے خلاف بھی ہو جایا کرتا تھا یعنی تجارتی مال کی برآمد کے مقابلے میں درآمد زیادہ ہوتی تھی چنانچہ جیسا کہ

اس باب کی فصل (۶) میں اوپر بیان کیا جا چکا ہے ۲۱-۱۹۲۰ء اور ۲۲-۱۹۲۱ء میں یہی صورت پیش آئی درآمد کے مقابلے میں برآمد میں جو زیادتی یا موافق توازن تجارت ہوتا ہے اس کی ادائی ایک حد تک قیمتی فلز یعنی سونا چاندی کی درآمد کے ذریعے سے ہوتی تھی اور کسی حد تک غیر ملکی سرمایہ کے سود اور "مطالبات وطن" کی ادائی کے ذریعے ہوتی تھی (دیکھو فصل ۱۷)۔ تجارتی مال کی حد تک ہندوستان کے موافق توازن تجارت کا اوسط زمانۂ قبل از جنگ کے پانچ سالوں میں ۷۸ کروڑ روپے، زمانۂ جنگ کے پانچ سالوں میں ۷۶ کروڑ روپے، اور زمانہ بعد از جنگ کے پانچ سالوں میں، جو ۲۴-۱۹۲۳ء کے سال پر ختم ہوتے ہیں، ۵۳ کروڑ روپے تھا۔ اس کے بعد کے پانچ سالوں میں جو ۲۹-۱۹۲۸ء کے سال پر ختم ہوتے ہیں اوسط ایک ارب ۱۳ کروڑ روپے تک بڑھ گیا، لیکن ۳۴-۱۹۳۳ء پر ختم ہونے والے پانچ سالوں میں ۴۳ کروڑ روپے تک گھٹ گیا۔ ۳۳-۱۹۳۲ء کا سال سب سے ناموافق سال تھا، اس لئے کہ موافق توازن تجارت گھٹکر ۳ کروڑ روپے سے کچھ ہی زیادہ رہ گیا۔ ۳۴-۱۹۳۳ء میں موافق توازن تجارت بڑھکر ۳۵ کروڑ روپے تک ہو گیا لیکن اس کے بعد کے سال یعنی ۳۵-۱۹۳۴ء میں تخفیف ہوئی اور موافق توازن ½۲۳ کروڑ روپے تک گھٹ گیا۔ ۳۶-۱۹۳۵ء میں اس میں ½۳۰ کروڑ روپے تک بیشی ہوئی اور ۳۷-۱۹۳۶ء میں دگنے سے زیادہ اضافہ ہوا اور وہ ۳/۴ ۷۷ کروڑ روپے ہو گیا۔ موافق توازن کی اتنی بڑی مقدار اس بات کا نتیجہ تھی کہ برآمد میں ۳۸ کروڑ روپے کی بیشی اور درآمد میں ۹ کروڑ روپے کی کمی ہوئی تھی ۱۹۲۹ء سے تجارتی کساد بازاری رونما ہوئی، اشیا کی آزادانہ نقل و حرکت پر بندشیں عائد کی گئیں، اور بین الاقوامی تجارت کی نوعیت اور مقدار بدل گئی۔ ان چیزوں نے خاصکر کساد بازاری کے نازک دور میں ہندوستان کے توازن تجارت پر مخالف اثر ڈالا۔ گو فی نفسہٖ موافق توازن تجارت میں کمی ہونا کوئی تشویش کی بات نہیں ہے، لیکن ہندوستان کی حد تک یہ مسئلہ

بہت اہم ہے، اس لئے کہ ہندوستان کو سمندر پار کے واجبات کثیر مقدار
میں پورے کرنے پڑتے ہیں۔ ان واجبات کو کم کرنے میں اس واقعے ع۲۶۴
سے مدد ملی ہے کہ ہندوستان ۱۹۳۱ء سے سونا برآمد کر رہا ہے[1]۔ ہندوستان
کا سونا درآمد کرنے والے ملک کی حیثیت سے سونا برآمد کرنے والے ملک
میں تبدیل ہو جانا ان اہم ترین عاملوں میں سے ایک ہے جو اس کی بین الاقوامی
تجارت کے حسابات کو متاثر کرتے ہیں۔ اس کو صفحہ ۲۶۹ پر اچھی طرح
واضح کر دیا گیا ہے۔ قیمتی دھاتوں کی معمولی درآمد میں سب سے اول
۱۹۳۱-۳۲ء میں رکاوٹ پیدا ہوئی جبکہ الٹی ۵۸ کروڑ روپے کی مالیت
کے سونے کی خالص برآمد ہوئی۔ ۱۹۳۲-۳۳ء اور ۱۹۳۳-۳۴ء میں جتنے سونے
کی خالص برآمد ہوئی اس کی مالیت علی الترتیب ۶۵½ کروڑ روپے اور
۵۷ کروڑ روپے تھی۔ ۱۹۳۴-۳۵ء میں خالص برآمد کی مالیت ۵۲½ کروڑ
روپے تھی۔ سونے کی برآمد ۱۹۳۵-۳۶ء میں ۳۷½ کروڑ روپے تک اور
۱۹۳۶-۳۷ء میں ۲۸ کروڑ روپے تک گھٹ گئی[2]۔ یہ قابل لحاظ ہے کہ
تجارتی مال کی حد تک موافق توازن تجارت کے اضافے کے ساتھ
سونے کی برآمد میں کمی ہو گئی۔ چاندی کی خالص درآمد کی مالیت ۱۹۳۴-۳۵ء
میں ۳۷ لاکھ روپے اور ۱۹۳۵-۳۶ء میں ایک کروڑ ۲۷ لاکھ روپے تھی،
لیکن وہ ۱۹۳۶-۳۷ء میں ۱۳ کروڑ ۵۹ لاکھ روپے تک بڑھ گئی۔ ظاہری
توازن تجارت کا اندازہ خانگی تجارتی مال اور زر و جواہر کے اعداد و شمار
سے ہوتا ہے، ۱۹۳۴-۳۵ء میں ۷۶ کروڑ روپے ۱۹۳۵-۳۶ء میں ۶۷
کروڑ روپے اور ۱۹۳۶-۳۷ء میں ۹۲ کروڑ روپے کی حد تک موافق تھا۔ انگلستان ۲۰/ستمبر ۱۹۳۱ء
کو معیارِ طلا سے ہٹ گیا، اس تاریخ کے بعد سے جتنا سونا ہندوستان سے برآمد کیا گیا

---

[1] کچھ سال ادھر سے سونے کی کثیر مقدار میں برآمد کے اس غیر معمولی واقعے کو باب ۸ میں جانچا گیا ہے۔

[2] ۳۱/ مارچ ۱۹۳۶ء کو ختم ہونے والے سال میں نہ صرف موافق توازن تجارت
بلکہ سونے کی خالص برآمد میں بہت بڑی کمی ہوئی۔

اس کی مجموعی مالیت ۲۵/ جون ۱۹۳۴ء تک ۳ ارب ۲۰ و ۱۵ کرور روپے تھی ۔

حسابات یا ادائیوں کے ٹھیک توازن کے لئے یہ ضروری ہے کہ برآمد اور درآمد میں پوری طرح مساوات ہو اور یہ مساوات بظاہر اس وقت قائم ہو سکتی ہے جبکہ ظاہری مدات Visible Item اور مخفی مدات Invisible Item دونوں کو محسوب کیا جائے۔ ظاہری مدات میں وہ سب مدیں شامل ہیں جو کروڑگیری کے اعداد و شمار میں درج ہوتی ہیں اور مخفی مدات میں وہ مدیں شامل ہیں جن کا اس طرح اندراج نہیں ہوتا۔

ہندوستان کی فرد حساب میں لین داری اور دین داری کی مدیں

اب ہم اس بات پر غور کریں گے کہ ایک مکمل بین الاقوامی فرد حساب کے لیے کن مدوں کا لحاظ کرنا ضروری ہے اور ان میں سے ہر ایک کے بارے میں ہندوستان کیا حیثیت رکھتا ہے؟[1]

(۱) تجارتی مال کی درآمد و برآمد ۔ اس عنوان کے تحت جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، ہندوستان ایک لین دار ملک ہے ۔

(۲) ۔ زر و جواہر ۔ ہندوستان کچھ سال ادھر ۱۹۳۱ء تک زر و جواہر جتنی مقدار میں برآمد کرتا تھا اس سے زیادہ مقدار میں درآمد کیا کرتا تھا، اور اسی لئے اس مد کی حد تک وہ ایک دین دار ملک تھا۔ ۲۶۵ع
لیکن ۱۹۳۱-۳۲ء سے جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے یہ صورت حال تبدیل ہو گئی ہے اور سونا بڑی مقدار میں برآمد کر رہا ہے جس کی بنا پر اس مد کی حد تک وہ لین دار بن گیا ہے ۔

(۳) ۔ غیر ممالک سے لئے ہوئے یا موصولہ قرضے ۔ جس وقت قرضہ جاری کیا جاتا ہے تو قرضہ حاصل کرنے والی قوم لین دار ہوتی ہے

---

[1] ملاحظہ ہو موربین کی کتاب موسوم بہ Economic Transition in India باب (۸) ۔

اور قرضہ دینے والی قوم دین دار بن جاتی ہے۔ اس عنوان کے تحت ہندوستان ایک لین دار ملک ہے، اس لئے کہ اس کو انگلستان سے وقتاً فوقتاً کثیر مقدار میں قرضہ لینا پڑا۔

(۴)۔ جو سرمایہ مصروف کیا جا چکا ہو اس کا سالانہ سود۔ اس کا اثر مخالف پڑتا ہے، اس لئے کہ قرضہ گیرندہ ملک دین دار اور قرضہ دہندہ ملک لین دار بن جاتا ہے۔ چونکہ ہندوستان کو لیے لئے ہوئے قرضوں کا سود سالانہ ارسال کرنا پڑتا ہے اس لئے وہ اس عنوان کے تحت دین دار کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۵)۔ اصل قرضے کی واپسی بھی قرضہ گیرندہ ملک کو دین دار اور قرض دہندہ ملک کو لین دار بنا دیتی ہے۔ چونکہ ہندوستان سالانہ سود کی ادائی کے علاوہ اپنے ذمے کے غیر ملکی قرضے کے کچھ حصے کو مستقل طور پر ادا کر رہا ہے، اس لئے وہ اس عنوان کے تحت دین دار ملک ہے۔ قرضے کی واپسی یہ شکل اختیار کر سکتی ہے کہ ہندوستانی روپے کے وہ پرامیسری نوٹ خریدیں جو انگلستان میں رکھے گئے ہیں اور اس طرح لئے ہوئے قرضے کو اپنے ہی ملک میں لے آئیں۔ حکومت اپنی آمدنی سے قرضہ ادا کرے تب بھی نتیجہ یہی ہوگا یعنی اس طرح ہندوستان کے ذمے کے غیر ملکی واجبات اس حد تک کم ہو جاتے ہیں۔

(۶)۔ ہندوستان سے باہر رہنے والے ہندوستانیوں اور ہندوستان میں مقیم بیرونی اشخاص کی آمدنیوں کا وہ حصہ جو یہ اشخاص اپنے متعلقہ وطن کو بھیجتے ہیں۔ اول الذکر صورت میں ہندوستان لین دار ملک ہے اور موخر الذکر صورت میں دین دار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندوستانی تاجر اور قلی جو ہندوستان سے باہر مقیم ہیں ہندوستان کو جتنی رقم بھیجتے ہیں اس سے کہیں زیادہ مقدار اس رقم کی ہوتی ہے جو ہندوستان میں مقیم یورپی تاجر، کاروباری اشخاص، بنک کاری کرنے والے اور سرکاری عہدہ دار باہر روانہ کرتے ہیں۔

(۷)۔ غیر ملکی بنکوں، جہاز رانی اور ان کی کمپنیوں کا منافع ہندوستان سے جو رقمیں بنک کاری کے منافع، جہاز راں کمپنیوں کے وصول کردہ کرایے اور بیمے کی اقساط کے عنوان کے تحت باہر روانہ کی جاتی ہیں ان کا صحیح حساب نہیں لگایا گیا ہے، لیکن اس رقم کی مجموعی مقدار لازمی طور پر بہت زیادہ ہوگی۔ بہر حال یہ سب کی سب ہندوستان کو دین دار بنا دیتی ہیں۔

(۸)۔ وہ رقمیں جو غیر ممالک کے باشندے کسی ملک کو خیراتی کاموں کے لئے بھیجتے ہیں یا وہ رقمیں جو کوئی ملک بطور چندہ باہر روانہ کرتا ہے۔ اس عنوان کے تحت ہندوستان ایک لین دار ملک ہے، اس لئے کہ اس کو یورپ اور امریکہ سے تبلیغی اغراض اور تبلیغی مدارس کی امداد کے لئے اور ہندوستان میں قحطوں اور دوسری مصیبتوں سے نجات دلانے کی غرض سے جتنی رقمیں وصول ہوتی ہیں وہ اس رقم سے بدرجہا بڑی ہوتی ہیں جو ہندوستان غیر ممالک کو اسی قسم کے اغراض کیلئے روانہ کرتا ہے۔

(۹)۔ کسی ملک کی حکومت کے مصارف غیر ممالک میں اس ملک کو اس حد تک دین دار بنا دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف کسی ملک میں دوسرے ملکوں کی حکومتوں کے مصارف اس ملک کو اس حد تک لین دار بنا دیتے ہیں۔ اس مد میں ہندوستان دین دار ملک ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان اپنے زر کی بہت بڑی مقدار انگلستان ۲۶۶
میں خرچ کرتا ہے، اور وہ اس طرح کہ ہندوستان میں ملازم یورپی عہدہ دار طویل رخصت کی تنخواہ یا وظیفہ لیکر وہیں چلے جاتے ہیں، اور دوسرے یہ کہ وہاں ہندوستان کے لئے سامان بہت بڑی مقدار میں خریدا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں حکومتِ انگلستان، ہندوستان کے لئے مختلف قسم کے کاموں پر جو زر خرچ کرتی ہے اس کا ادا کرنا ہندوستان کے لئے ضروری ہے۔ اس طرح انگلستان میں حکومت ہند کی مد سے

جملہ مصارف کو "مطالبات وطن" کے عنوان کے تحت شامل کیا جاتا ہے۔

(۱۰)۔ خراج یا تاوان۔ ظاہر ہے کہ خراج یا تاوان ادا کرنے والا ملک دین دار اور وصول کرنے والا ملک لین دار ہو گا۔ لیکن چونکہ ہندوستان تاوان یا خراج ادا اور وصول نہیں کرتا، اس لئے اس مد کو بالکل نظر انداز کر دینا پڑے گا۔

(۱۱)۔ غیر ملکی سیاحوں کے مصارف ہندوستان میں اور ہندوستانی سیاحوں کے مصارف غیر ممالک میں۔ اس عنوان کے تحت ہندوستان لین دار ہے، اس لئے کہ غیر ممالک کے جو باشندے تفریح اور سیر کے لئے ہندوستان آتے ہیں ان کی تعداد ان ہندوستانیوں سے بہت زیادہ ہوتی ہے جو غیر ممالک کو جاتے ہیں۔ اس طرح جو رقم خرچ کی جاتی ہے اس کی مقدار کم و بیش اکرور روپیہ سالانہ ہے اور توقع ہے کہ آیندہ اس رقم میں مزید اضافہ ہو گا۔

فرد حساب

مد واجبات (دین داری)	مد واصلات (لین داری)
۱۔ زر و جواہر کی درآمد۔ ۲۔ غیر ممالک سے حاصل کیے ہوئے قرضوں کا سود۔ ۳۔ باہر سے لئے ہوئے قرضوں کی ادائی۔ ۴۔ یوربین تاجروں، وکیلوں، اور سرکاری عہدہ داروں وغیرہ کی مرسلہ رقمیں۔	۱۔ تجارتی اسباب کی برآمد۔ ۲۔ غیر ممالک سے حاصل کئے ہوئے قرضے۔ ۳۔ ہندوستان کو غیر ممالک کی مرسلہ رقمیں تبلیغی اغراض اور مدرسوں کے لئے، نیز امداد قحط اور دوسرے خیراتی کاموں کے سلسلے میں۔

۵۔ غیر ملکی بنکوں کا منافع، بیمہ کمپنیوں کی اقساط اور غیر ملکی جہازراں کمپنیوں کا باربرداری کا کرایہ ۶۔ حکومت ہند کے مصارف ہندوستان کے باہر سرکاری مد میں یعنی عہدہ داروں کی رخصت کے زمانے کی تنخواہ اور وظائف، حکومت ہند کے لئے سامان اور فلز وغیرہ کی خریداری (مطالبات وطن)۔ ۷۔ ہندوستانی طلبا کو ہندوستان سے غیر ممالک میں مرسلہ رقمیں۔	۴۔ غیر ملکی سیاحوں کے مصارف۔

غرض فرد حساب کی تکمیل کے لئے ان سب مدوں کو محسوب کرنا پڑے گا اور اگر یہ کیا جا سکتا ہے تو حساب کی ان دونوں مدوں کا ایک دوسرے کو متوازن کرنا ضروری ہے۔ ص۲۶۷

مندرجۂ بالا فرد حساب یا توازن حساب میں، دائیں جانب ہندوستان کی دین داری کی مدیں درج ہیں۔ یعنی یہ وہ مدیں ہیں جن کے تحت ہندوستان اس سے زیادہ رقم ادا کرتا ہے جتنی کہ اس کو وصول ہوتی ہے۔ بائیں جانب واصلات یا لین داری کی مدیں ہیں۔ یہ وہ مدیں ہیں جن کے تحت ہندوستان کو غیر ممالک سے اس سے زیادہ زر وصول طلب ہے جتنا کہ ہندوستان کے ذمے غیر ممالک کو واجب الادا ہے۔

۱۸
ہندوستان کا ظاہری توازن حسابات

صفحہ ۲۶۹ پر مندرجہ گوشوارے[۵] سے اگرچہ سرکاری سامان اور سرکاری مال و دولت کو خارج کر دیا گیا ہے پھر بھی یہ

۵۔ اس کے اعداد ایک رپورٹ موسوم بہ "تبصرہ بر تجارت ہند برائے ۳۷-۱۹۳۶ء" صفحہ ۱۷۰ سے لئے گئے ہیں۔

گوشوارہ اس توازن تجارت سے زیادہ مفصل ہے جس میں صرف تجارتی سامان اور سونے چاندی کو شریک کیا جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اس میں اس رقم اور سرمایۂ محفوظ کو شامل کرکے جو حکومت کے توسط سے ہندوستان سے بیرون ہند اور بیرون ہند سے ہندوستان کو منتقل ہوتا ہے ایک مکمل توازن حسابات تیار کیا گیا ہے۔

اس گوشوارے میں تفصیل کے ساتھ یہ بتلایا گیا ہے کہ ہندوستان کے ظاہری توازن حسابات میں کونسی مدیں شامل ہیں۔ اعداد مفصل طور پر اس طرح تیار کئے گئے ہیں جس سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ پلہ کہاں بھاری یا کہاں ہلکا ہے۔ چنانچہ علامت جمع (+) اور علامت نفی (-) خالص درآمد کی نمایندگی کرتی ہے۔ اس کا اطلاق مندرجۂ ذیل تینوں قسم واری مدوں میں سے ہر ایک پر ہوتا ہے:۔ (۱) خانگی تجارتی سامان کی درآمد و برآمد؛ (۲) خانگی طور پر سونے چاندی کی درآمد و برآمد، اور (۳) حکومت کے توسط سے مرسلہ رقمیں۔ اور ان سب کی میزان بھی علامت جمع (+) یا علامت نفی (-) کے ساتھ بتلادی گئی ہے۔

گوشوارے میں جو ظاہری توازن حسابات دیا گیا ہے اس کے متعلق یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ ان خفیہ مدوں کے خالص اثر کو ظاہر کرتا ہے جو ہندوستان کے توازن حسابات میں شریک ہیں، مثلاً جہاز رانی کی خدمات، خانگی ترسیلات، سرمایے کی درآمد و برآمد، بیمے کی اقساط اور سیاحوں کے مصارف وغیرہ۔ ان مدول کو گوشوارے میں شامل اس لئے نہیں کیا گیا کہ ان کے اعداد کا صحیح حساب نہیں لگایا جاسکتا۔ گوشوارے سے معلوم ہوگا کہ درآمدی تجارت کے مقابلے میں برآمدی تجارت جو بڑھی رہتی تھی اس میں کمی ہوئی جس کو کچھ سال ادھر سے سونے کی برآمد نے بڑی حد تک پورا کردیا ہے۔ ہندوستان کو اس قابل بنانے کے لئے کہ وہ اپنے ذمے کے غیر ملکی واجبات یعنی خفیہ درآمدی

قیمت ادا کرسکے، یہ ضروری ہے کہ ظاہری توازن تجارت ہندوستان کے موافق ہو چنانچہ سونے کی برآمد نے اس موافق توازن تجارت کو برقرار رکھنے میں بھی مدد دی[1]۔

۱۹ دولت کے اخراج کی تعریف

ہندوستان میں درآمد کے مقابلے میں برآمد کی جو زیادتی ص۶۸۰
مسلسل رونما ہوتی رہی ہے اس نے "اخراج دولت" کا نظریہ پیدا کر دیا ہے۔ یہ نظریہ خواہ اس کے دوسرے خیالی مضمرات کچھ ہی کیوں نہ ہوں، اس حد تک ضرور کارآمد ثابت ہوا کہ اس نے اس بہت ہی عام تجارتی مغالطے کو ہندوستان کے لوگوں کے دل سے نکال دیا کہ موافق توازن تجارت یا درآمد پر برآمد کی زیادتی لازمی طور پر اچھی شے اور برآمد پر درآمد کی زیادتی لازمی طور پر خراب شے ہے۔ بعض لوگوں نے برآمد کی اس زیادتی کے

---

[1] ہندوستان کے توازن حسابات کے بارے میں مزید تفصیلات کے لئے قاری کو مجلس اقوام، شعبۂ اشاعت معاشی معلومات کی مرتب کردہ ایک کتاب موسوم بہ "توازن حسابات" (شایع شدہ ۱۹۳۶ء) کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اس میں حکومت ہند نے ان اعداد سے تجاوز کرنے کی کوشش کی ہے جو "توازن تجارت" اور "مال و دولت کی نقل" کے متعلق ایک سالانہ رپورٹ موسوم بہ "تبصرہ بر تجارت ہند" میں شائع ہوئے ہیں۔ توازن حسابات حسب ذیل دو بڑی قسموں کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ (۱) رواں مدات اشیا، خدمات اور سونا؛ اور (ب) سرمایہ کی مدات۔ اول الذکر کی حسب ذیل مدیں قائم کی گئی ہیں: (۱) اسباب تجارت (۲) بڑی مدت اور چھوٹی مدت کے سرمایے پر سود اور مقسوم۔ (۳) دوسری خدمات مثلاً بندرگاہ کی فیس؛ کمیشن؛ بیمہ یا دلالی کی اجرت؛ ڈاک، تار اور ٹیلیفون؛ سیاحوں اور سفارتی انتظامات کے مصارف؛ ترک وطن کرنے والوں اور توطن خارجی اختیار کرنے والوں کی ترسیلات؛ ہرجانے بصورت نقد اور دوسرے سرکاری واصلات اور مصارف۔ (۴) سونا (سکہ اور غیر مسکوک فلز)۔ سرمایے کی مدوں میں حکومت ہند کے بڑی مدت اور چھوٹی مدت کے قرضوں کے کاروبار یعنی طبدی قرضہ جات داخل ہیں۔

ہندوستان کی ادائیوں کا توازن

(بحساب لاکھ روپیہ)

۳۶۹

	زمانۂ قبل از جنگ کا اوسط	زمانۂ جنگ کا اوسط	۱۹۳۲-۳۳ء	۱۹۳۳-۳۴ء	۱۹۳۴-۳۵ء	۱۹۳۵-۳۶ء	۱۹۳۶-۳۷ء
ہندوستانی تجارتی اسباب کی برآمد (خانگی)	+۲۱۹۵۰	+۲۱۵۹۷	+۱۳۲۲۷	+۱۴۷۲۵	+۱۵۱۶۷	+۱۶۰۵۲	+۱۹۶۱۳
غیر ملکی تجارتی اسباب کی مکرر برآمد (خانگی)	+۴۶۲	+۸۱۴	+۳۲۲	+۳۴۲	+۳۵۵	+۳۷۶	+۶۲۴
غیر ملکی تجارتی اسباب کی درآمد (خانگی)	-۱۴۵۸۵	-۱۴۷۸۰	-۱۳۲۲۷ [۱]	-۱۱۵۰۰ [۱]	-۱۳۱۸۰ [۱]	-۱۳۳۷۵ [۱]	-۱۲۴۶۰ [۱]
تجارتی اسباب کا توازن تجارت	+۷۸۲۷	+۷۶۳۱	+۳۲۲	+۳۵۶۷	+۲۳۴۲	+۳۰۵۳	+۷۷۷۷
سونا (خانگی)[۲]	-۲۸۸۷	-۷۸۱	+۶۵۵۲	+۵۷۰۵	+۵۲۵۴	+۳۷۳۵	+۲۷۸۵
چاندی (خانگی)[۲]	-۷۲۱	-۲۹۹	-۷۳	-۱	-۳۷	-۱۲۷	-۱۳۵۹
کاغذی زر (خانگی)	-	-	+۱۴	+۱۹	+۳۷	+۲۹	+۲۴
مال و دولت (خانگی) کے لین دین کا توازن	-۳۶۰۸	-۱۰۸۰	+۶۴۹۳	+۵۷۲۳	+۵۲۵۴	+۳۶۳۷	+۱۴۵۰
ظاہری توازن تجارت کی میزان	+۴۲۴۹	+۶۵۵۱	+۶۸۱۵	+۹۲۹۰	+۷۵۹۶	+۶۶۹۰	+۹۲۷۰
اسٹرلنگ کی خریداری رزرو بنک آف انڈیا کی طرف سے[۳]	-۴۱۳۵	-۳۴۹۶ [۴]	-۴۸۱۸	-۵۹۹۷	-۴۹۸۲	-۴۵۵۸	۷۰۸۷
اسٹرلنگ کی فروخت رزرو بنک آف انڈیا کی طرف سے[۵]	+۵	+۵۵۰	-	-	-	-	-
سرکاری تمسکات کے انتقالات	-۸۷	-۳۸	-۱۳	-۱۱	+۳۲	-۵۶	-۱۸
حکومت ہند کے تمسکات کے بارے میں سود کے ڈرافٹ	-۴۴	-۳۰	-۳۲	-۳۶	-۲۸	-۳۱	-۲۹
رقوم کی ترسیلات کا توازن	-۴۲۶۱	-۳۰۱۴	-۴۸۶۳	-۶۰۴۴	-۴۹۷۸	-۴۶۴۵	-۷۱۳۴
حسابات (ادائیوں) کے ظاہری توازن کی میزان	-۱۲	-۳۵۳۷	+۱۹۵۲	+۳۲۴۶	+۲۶۱۸	+۲۰۴۵	+۲۰۹۳

[۱] ۔ اس میں اس ریلوے سامان کی مالیت شامل نہیں ہے جس کو کمپنی کے زیر انتظام چلنے والی ریلوں نے براہ راست درآمد کیا۔ یہ قیمت معمولی طریق پر ادا نہیں کی گئی اور اسی لئے توازن تجارت تیار کرنے میں اس کو محسوب نہیں کیا گیا ہے۔

[۲] ۔ اس سے وہ لین دین خارج ہیں جو توازن تجارت میں شامل نہیں ہوتے۔

[۳] ۔ مئی ۱۹۲۳ء سے پیشتر کے برسوں کے اعداد کونسل بلوں اور انتقالات برقی کو تعبیر کرتے ہیں جو ہندوستان میں ادا کئے گئے۔ جون ۱۹۲۵ء سے ان اعداد کا تعلق بالکل اسٹرلنگ کی خریداری سے ہے۔

[۴] ۔ اس میں ۵۰ لاکھ روپے شامل ہیں جن کا انتظام حکومت نے گیہوں کی خریداری میں مدد دینے کے لئے کیا تھا۔

[۵] ۔ اس سے پیشتر کے برسوں کے اعداد جو اس مد کے تحت درج کیے گئے وہ لندن کے موسومہ اسٹرلنگ کے انتقالات کو تعبیر کرتے ہیں جو ہندوستان میں فروخت کئے گئے۔

متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ ایک طرح کا خراج ہے جو ہندوستان اپنی سیاسی محکومی کے باعث انگلستان کو ادا کرتا ہے۔ زائد برآمد کی شکل میں جو دولت ملک کے باہر جاتی ہے اس سب کے بدلے میں ہندوستان کو یقیناً کسی نہ کسی قسم کا معاوضہ ملتا ہے، اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، واصلات کی مختلف مدوں سے اس کی تشریح کی جا سکتی ہے۔ لیکن، جیسا کہ ہسپانوی کہاوت ہے۔ "حسابات تو بالکل ٹھیک ہیں، لیکن خزانہ خالی ہے"۔ اصل موضوع بحث یہ نہیں ہے کہ آیا کسی نہ کسی قسم کا مساوی معاوضہ حاصل ہوتا ہے یا نہیں، بلکہ یہ کہ آیا جو معاوضہ ملتا ہے وہ پوری طرح کافی ہے یا نہیں۔

ہر تھیوڈور موریسن نے "اخراج دولت" کی تعریف یوں کی ہے کہ "دولت کا اخراج" ہندوستان کے واجبات کا وہ جزو ہے جس کے لئے کسی مقررہ سال میں ہندوستان کو کوئی مساوی مادی شئے زر یا اشیا کی شکل میں وصول نہیں ہوتی۔ لیکن وہ اس تعریف پر کئے جانے والے ایک ممکنہ اعتراض کا بھی پہلے ہی سے ذکر کر دیتے ہیں۔ یعنی یہ کہ کسی مقررہ سال میں برآمد کی زیادتی اس سے کم معلوم ہو سکتی ہے جتنی کہ وہ دراصل ہو، اس لیے کہ یہ ممکن ہے کہ کسی غیر ملک سے قرضہ لیا گیا ہو اور مختلف قسموں کی اشیا کی درآمد کی شکل میں وصول کیا گیا ہو۔ چنانچہ اس قسم کی درآمد برآمد کی حقیقی زیادتی کو کم کر دے گی۔ اور زائد برآمد کا صحیح حساب لگانا اور اس کے جوانہ کو ثابت کرنا مشکل ہو گا۔ قرضے کو بعد کے سالوں میں ادا کرنا ضروری ہے جس کی وجہ سے برآمد میں اور "اخراج دولت" کی مقدار میں بیشی ہو جائے گی۔

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ۔۔ بدقسمتی سے ان خانگی واصلات واثاثے اور واجبات کے متعلق کوئی معلومات مہیا نہیں کی گئیں جو غیر ممالک میں ہیں۔ لہذا یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ہند زیادہ مفصل اور صحیح اعداد اسی طرح فراہم کرے جس طرح کہ سلطنت متحدہ میں محکمۂ تجارت برطانیہ کرتا ہے اور معلومات عامہ کے لئے ان کو سالانہ رپورٹ موسوم بہ تبصرہ بر تجارت ہند میں شریک کر دے۔

اور اس لئے یہ کوئی حقیقی فائدے کی صورت نہیں کہی جا سکتی۔ اس اعتراض کا جواب دینے کی غرض سے سر تھیوڈور "اخراج دولت" کے معنے "دولت کا حقیقی اخراج" لیتے ہیں۔ یعنے واجبات کا وہ جزو جو قرضوں کی عدم موجودگی میں ہندوستان کے ذمے واجب الادا ہو اور جس کے عوض میں ہندوستان کو کسی ایک سال میں مساوی القدر مادی اشیا وصول ہوئی ہوں بہر حال اولذکر تعریف دوسری تعریف کے مقابلے میں قابل ترجیح ہے۔ کیونکہ ہمارا سروکار چونکہ "اخراج دولت" کی مقدار کی صحیح تشخیص سے اتنا نہیں جتنا اس عام بحث سے کہ خارج شدہ دولت کا موجب ہونے والی مختلف مدوں کو کس حد تک مناسب نعم البدل قرار دیا جا سکتا ہے اور چونکہ قرضے کا سود ان مدوں میں سے ایک اہم مد ہے جس سے اہم مسائل رونما ہوتے ہیں اس لیے یہ نامناسب ہوگا کہ ایک ایسی تعریف کو مان لیا جائے جو ہمیں اس کے نظر انداز کرنے پر مجبور کرتی ہو۔ صفحہ ۲۷

۲۰ مطالبات وطن

ہندوستان کی درآمد پر برآمد کی زیادتی کی توجیہ بڑی حد تک ان مدوں سے ہوتی ہے جن کو "مطالبات وطن" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

مندرجۂ ذیل اعداد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۹-۶۰ء اور ۱۹۳۳-۳۴ء کے درمیان مطالبات وطن میں کتنی بڑی ترقی ہوئی ہے۔[۱]

انگلستان میں مجموعی مصارف کی مقدار بحوالۂ اسٹرلنگ

سال	خرچ کی مقدار (پونڈ)	سال	خرچ کی مقدار (پونڈ)	سال	خرچ کی مقدار (پونڈ)
۱۸۵۹-۶۰ء	۵۰۴۲۹۴۵	۱۹۱۳-۱۴ء	۲۰۳۱۱۶۷۳	۱۹۲۸-۲۹ء	۲۹۷۴۴۹۹۳
۱۸۶۹-۷۰ء	۷۶۷۷۸۵۰	۱۹۱۸-۱۹ء	۳۶۲۹۴۹۵	۱۹۲۹-۳۰ء	۳۱۵۵۸۷۱۵

[۱] ۱۹۱۸-۱۹ء تک کے اعداد شاہ کی کتاب موسومہ "۶۰ سالہ ہندوستانی مالیہ" دوسرا ایڈیشن

۱۸۷۹-۸۰ء	۱۴۵۴۳۲۷۷	۱۹۲۲-۲۳ء	۳۱۸۶۰۱۷۸	۱۹۳۰-۳۱ء	۳۱۴۲۳۱۴۷
۱۸۸۹-۹۰ء	۱۴۸۴۸۹۲۳	۱۹۲۴-۲۵ء	۳۱۸۸۸۷۷۶	۱۹۳۱-۳۲ء	۳۰۸۹۹۳۳۳
۱۸۹۹-۱۹۰۰ء	۱۶۳۹۲۸۶۴	۱۹۲۶-۲۷ء	۲۹۵۰۷۴۷۳	۱۹۳۲-۳۳ء	۲۹۵۵۶۴۰۱
۱۹۰۹-۱۰ء	۱۹۱۲۲۹۱۶	۱۹۲۷-۲۸ء	۲۸۸۶۴۷۶۵	۱۹۳۳-۳۴ء	۲۸۸۶۲۱۷۷

مصارف کی وہ اہم مدیں جو حکومت ہند کی آمدنی کے مقابلے میں بہ شکل اسٹرلنگ انگلستان میں ہونے والے اخراجات کی صورت میں درج ہیں اور جو مطالبات وطن میں شامل ہیں صفحہ ۱۷۲ پر مندرجہ گوشوارے میں دیگئی ہیں۔(۱) ہم موجودہ بحث سے اس ادائگی کو خارج کردیں گے جو انگلستان میں ہندوستان کے لئے سامان کی خریداری کے سلسلے میں کی جاتی ہے اس لئے کہ یہ سامان ایک مادی مساوی معاوضہ ہے اور درآمد کے اعداد میں محسوب کیا جاتا ہے۔ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ یہ قابل بحث مسئلہ ہے کہ آیا حکومت کے لئے سامان مقابلۃً زیادہ ارزاں خریدا جاسکتا ہے یا نہیں اور آیا اس کی بہم رسانی کے لئے زیادہ تر ہندوستانی بازار پر تکیہ کرنا قابل عمل ہے یا نہیں۔ لیکن "اخراج دولت" کے بحث مباحثے میں ہمارا تعلق ہندوستان کے ذمے کے واجبات کے اس جزو سے ہے جس کے لئے (۱) کوئی مساوی "مادی" یا "غیر مادی" معاوضہ وصول نہ ہوا ہو اور (۲) اس جزو سے ہے جس کے لئے وصول شدہ مساوی معاوضہ "غیر مادی" ہو اور اشیا یا زر کی شکل نہ رکھتا ہو۔

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ:- صفحہ ۱۸۷ تا ۱۸۸ سے اور اس کے بعد کے بیشتر کے اعداد ایک رپورٹ موسوم بہ "اعدادی خلاصہ" برائے ۱۹۲۶-۲۷ء تا ۱۹۳۳-۳۴ء سے لئے گئے ہیں۔

(۱) یہ گوشوارہ ایک رپورٹ موسوم بہ "برطانوی ہند کا اعدادی خلاصہ" برائے ۱۹۳۳-۳۴ء کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔

صـ ۲۷۱

مطالبات وطن

انگلستان میں ہونے والے مصارف کی اہم مدیں (سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء)	مرکزی وصوبائی
	پونڈ
(۱)۔ آمدنی پر راست مطالبات	۱,۵۴,۲۹۱
(۲)۔ ریلوے کی آمدنی کی مد:۔	
سرکاری ریلیں:۔	
قرضے کا سود	۸۶,۴۸,۴۶۵
کمپنیوں اور ہندوستانی ریاستوں کے فراہم کردہ سرمایہ کا سود	۹,۳۸,۹۵۵
ریلوے کے متفرق مصارف۔	۸۷,۴۲۱
میزان	۹۶,۷۴,۸۴۱
(۳)۔ آب پاشی۔ دوسرے مصارف جو معمولی آمدنی سے پورے کیے گئے	۶۲,۸۲۷
(۴)۔ قرضے:	
ریلوں کے قرضے کے سوا دوسرے قرضوں کا سود	۶۱,۱۲,۷۴۲
دوسری واجب الادا رقموں کا سود	۴۳,۴۷۶
میزان	۶۱,۵۷,۲۱۸

انگلستان میں ہونے والے مصارف کی آسم لائن (۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء)	مرکزی و صوبائی پونڈ
(۵)۔ سول نظم و نسق	۱,۶۷,۶۴,۳۷۹
(۶)۔ وظیفہ ملازمت اور الاؤنس:۔ علاقہ داری اور سیاسی وظیفے .... پیرانہ سالی کے وظیفے اور الاؤنس	 ۷,۳۸۵ ۴۵,۹۶,۰۶۵
میزان	۲۶,۰۳,۴۵۰
(۷)۔ لکھائی اور چھپائی کا سامان	۵۵,۴۶۴
(۸)۔ دفاعی خدمات:۔ برسرکار[1] .... غیر برسرکار	 ۴۴,۳۱,۳۸۸ ۳۷,۴۴,۸۱۷
میزان	۸۱,۷۶,۲۰۵
(۹)۔ کاغذی زر اور ٹکسال	۶,۳۰۵
(۱۰)۔ کارہائے سول (غیر فوجی)	۱,۲۲,۵۶۲
(۱۱)۔ متفرق	۱,۹۴,۶۳۵
صدر میزان مصارف جن کا مطالبہ آمدنی سے کیا گیا۔	۲,۸۸,۶۲,۱۷۷

[1] ۔ برسرکار خدمات کے مطالبات میں برطانوی فوجوں ملازموں کے رخصت کے الاؤنس

۲۱ بیرونی قرضوں کے سلسلے میں ادائیاں

مطالبات وطن کی اہم ترین مدوں میں سے ایک مد اس قرضے کا سود ہے جو حکومت نے ریلوں اور کارہائے آبپاشی وغیرہ کی مالی امداد کے لئے انگلستان میں حاصل کیا ۔ ان مختلف مسائل پر پہلے بحث کی جا چکی ہے جو ہندوستان میں غیر ملکی سرمایے کے لگانے سے پیدا ہوتے ہیں[1] چنانچہ اب اس امر پر زور دینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ باہر سے قرضہ حاصل کرنا لازمی طور پر بری چیز نہیں ہے، بلکہ اس کے برخلاف غیر ملکی قرضوں کو عام طور پر "معاشی نشو و نما کے جائز لوازم" خیال کیا جا سکتا ہے ۔ اکثر ملک جن کے پاس قومی ذرائع اچھے اور سرمایہ کم ہوتا ہے، دوسرے ملکوں سے قرضہ حاصل کرنا ضروری اور نفع بخش پاتے ہیں ۔ چنانچہ کنیڈا جیسے بعض قرض گیرندہ ملک دنیا کے سب سے خوشحال ملکوں میں سے ہیں اور غیر ملکی سرمایے کی مدد سے ان کی خوش حالی میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے ۔ ظاہر ہے کہ ایسے قرضوں کے سود کو "دولت کے اخراج" کی تعریف میں داخل کرنا لغو ہے ۔ چونکہ بیرونی قرضوں کا سود مطالبات وطن اور ہندوستان کے دوسرے بیرونی مصارف کی مدوں میں سب سے نمایاں اور اہم حیثیت رکھتا ہے اس لئے سر تھیوڈور موریسن "اخراج دولت" جیسے گمراہ کن لفظ کے بدلے میں جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ ادائیاں ملک کے لئے نقصان رساں ہیں، "بیرونی ادائیوں" یا "خالص بیرونی ادائیوں" کے سادہ الفاظ تجویز کرتے ہیں ۔ سر تھیوڈور یہ استدلال کرتے ہیں کہ ہندوستان کی قرضداری کے اس جزو یعنی سود کے متعلق یہ نہیں خیال کیا جا سکتا کہ وہ ہندوستان کے ذرائع پر بار ہے جو اس کو اس وجہ سے

ص ۴۴۲

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ :۔ فوجی خدمت اور اخراجات سفر وغیرہ شامل ہیں اور غیر عسکری خدمات مطالبات میں برطانوی فوجوں کے وظائف حسن خدمت، پنشن وغیرہ اور برسرکار اور وظیفہ یاب ہندوستانی افسروں کی تنخواہیں اور پنشن شامل ہیں ۔

[1] ۔ دیکھو جلد اول باب ۱۳ ۔

برداشت کرنا پڑ رہا ہے کہ ہندوستان سیاسی طور پر انگلستان سے وابستہ ہے۔ اس لئے کہ اگر سلطنت برطانیہ سے ہندوستان کا کوئی تعلق نہ بھی ہوتا تو بھی اپنے ذرائع کو ترقی دینے کے لئے یہ قرضہ لینا ضروری ہوتا۔ رہی یہ بات کہ قرضے انگلستان میں لئے گئے تو اس کا اس امر سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ ہندوستان سیاسی طور پر انگلستان کا محکوم ہے۔ لندن میں قرضے اس واسطے لئے جاتے ہیں کہ دنیا میں لندن ہی زر کا سب سے ارزاں بازار ہے۔ یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی انگلستان سے سیاسی وابستگی ہندوستان کے حق میں کسی حال میں نقصان دہ نہیں ہے، بلکہ اس معاملے میں نمایاں طور پر مفید ہے۔ اس لئے کہ اس کی بدولت ہندوستان کا اعتبار اور اس کی ساکھ غیر ممالک میں بڑھ گئی ہے اور وہ اس قابل ہو گیا ہے کہ زیادہ مفید شرائط پر قرضہ حاصل کرے جو دوسری صورت میں ممکن نہیں۔ حکومت انگلستان، ہندوستان کی ساکھ کی براہ راست ضمانت نہیں دیتی، لیکن ہندوستان کی برطانوی حکومت نے نظم و نسق کے استحکام کو یقینی بنا کر اور ملک کے معاشی نشو و نما کو ترقی دیکر ہندوستان کی ساکھ کو غیر ممالک میں بڑھا دیا ہے۔ چنانچہ جا پان جیسے کئی دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہندوستان بدیہی طور پر بہت ادنیٰ شرح سود پر باہر سے قرضہ حاصل کر سکتا ہے، اور یہ مسلسل اور روز افزوں فائدہ ہے، اس لئے کہ ابھی ایک مدت دراز تک ہندوستان کو بڑے پیمانے پر قرضہ لینا پڑے گا۔ تاکہ اس کی مدد سے وہ صنعتی ترقی کے کام کو جس میں وہ گرمجوشی کے ساتھ دلچسپی لے رہا ہے۔ اطمینان بخش طور پر جاری رکھ سکے۔ اگر اس کو ۱ فیصد کم شرح سود ہی سے قرضہ مل جائے تو ہر سو ملین پونڈ پر جس کو وہ بطور قرض حاصل کرے گا ایک ملین پاؤنڈ کی قطعی بچت ہوگی۔ لیکن اس بیان پر کہ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہندوستان زیادہ ارزاں شرائط پر قرضہ حاصل کرنے کے قابل ہوا، اعتراض کیا گیا ہے، اور یہ تبلایا جاتا ہے کہ جنوبی امریکہ کے جمہوریے تک اس اعتبار سے گھاٹے میں نہیں رہے۔ خواہ یہ صحیح ہو یا غلط، ہمیں اس بالکل فرضی سوال پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ

صـ۲۷۳

آیا آزاد ہندوستان ان شرائط سے مختلف شرائط پر قرضہ حاصل کرنے کے قابل ہوتا یا نہیں جن پر وہ موجودہ زمانے میں حاصل کررہا ہے۔ ہمیں اپنی بحث کو آیندہ کے امکانات سے زیادہ صرف موجودہ حالت تک محدود رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ موجودہ بحث میں ہمیں صرف اس بات کا فیصلہ کرنا ہے کہ آیا بہتر انتظام سے قرض یعنی اصل اور سود دونوں کے حقیقی بار کو قابل لحاظ حد تک کم کیا جاسکتا تھا یا نہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں اپنی توجہ صرف ان قرضوں پر مرتکز کرنی چاہیئے جو ہمارے جملہ قرضوں میں اہم ترین ہیں اور ہمارے جملہ قرضوں کی بہترین طریق پر نمایندگی کرتے ہیں یعنی وہ قرضے جو ہندوستان میں ریلوے بنانے کے واسطے لئے گئے۔ ان کے متعلق جو مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں یہ ہیں کہ آیا وہ سب ریلیں جو بنائی گئیں ملک کے بہترین اغراض کے لئے تھیں یا نہیں ؛ آیا نقل وحمل میں سہولتیں پیدا کرنے کی ضرورت کو سڑک اور نہر جیسے دوسرے وسائل نقل وحمل کمتر مصارف سے مہیا کرکے پورا کیا جاسکتا تھا یا نہیں؛ آیا وہ سرکاری روپیہ جو ریلوں پر لگایا گیا کارہائے آب پاشی جیسے زیادہ مستحق توجہ امور کو کسی حد تک قربان اور نظر انداز کرکے خرچ کیا گیا یا نہیں ؛ آیا وہ ترغیبیں جو غیر ملکی سرمایے کو شرح سود کی ضمانت کی شکل میں دی گئیں زائد از ضرورت تھیں یا نہیں ؛ آیا ریلوے کے نظام کو تا حد امکان قابلیت اور کم مصارف کے ساتھ ہمیشہ قومی اغراض کے مطابق چلایا گیا یا نہیں۔ ان سب سوالات پر پہلے بحث کی جاچکی ہے۔ چنانچہ یہاں ہمیں صرف اس امر کا اعادہ کرنے کی ضرورت ہے کہ ان سب معاملات میں غلطیوں کا ارتکاب کیا گیا اور اس حد تک ان قرضوں کے سلسلے میں ہندوستان نے جو رقمیں ادا کیں ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا پورا معاشی معاوضہ بھی مل گیا۔ مانا کہ ریلیں بحیثیت مجموعی ہندوستان کی معاشی خوشحالی کا پیش خیمہ بنیں اور حقیقی بالواسطہ اور بلاواسطہ فوائد کا پلہ ریلیں بنانے کے مصارف کے مقابلے میں بھاری ہے۔ لیکن

اصل تنقیح طلب سوال یہ ہے کہ آیا ریلوں کے یہ عظیم الشان فوائد غیر ضروری بھاری مصارف برداشت کر کے حاصل کئے گئے یا نہیں۔

ہندوستان میں حکومت کی مداخلت یا وساطت کے بغیر جو غیر ملکی سرمایہ شغل کی غرض سے داخل ہوتا رہتا ہے اور اس کے سود اور نفع کی شکل میں جو ادائیاں کی جاتی ہیں وہ "مطالبات وطن" کے تحت تو درج نہیں کی جاتیں، لیکن ہندوستان کی برآمد کی زیادتی کا بڑا حصہ الٰہی کی وجہ سے رونما ہوتا ہے۔ یہاں بھی وہی مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان کو غیر ملکی سرمایے سے کیا فوائد اور نقصانات ہیں۔ چنانچہ ہم قاری کی توجہ ان متعلقہ فصلوں کی طرف مبذول کراتے ہیں جن میں اس موضوع پر بحث کی گئی ہے[1] اس موقع پر ہم نے بیان کیا تھا کہ غیر ملکی سرمایے کے داخلے پر کوئی بندش عائد نہ ہونے کی وجہ سے بعض بڑے اور غیر مشتبہ فوائد کے ساتھ ساتھ چند خرابیاں بھی رونما ہوئی ہیں، اور اس لحاظ سے یہ بیان کہ "ہندوستان اس بات کی سب سے بدیہی مثال پیش کرتا ہے کہ غیر ملکی سرمایے کو مستعار لینے میں فائدہ ہے"[2] غیر مشروط طور پر قبول نہیں کیا جا سکتا۔ صفحہ ۲۷۴

۲۲ سول اور فوجی خدمات

اب ہم ہندوستان کے ذمے کی ادائیوں کے اس جزو کا ذکر کریں گے جو سول اور فوجی خدمت کے لئے کی جاتی ہیں۔ یہاں اس سوال کا جواب کہ آیا ہندوستان اپنی ادائیوں کا کافی معاوضہ پاتا ہے، مندرجۂ ذیل سوالوں کے جواب پر منحصر ہے۔ اس ملک میں جو یوروپین ملازم رکھے جاتے ہیں کیا وہ ناگزیر ہیں؟ اگر ناگزیر ہیں تو کس حد تک؟ آیا وہ تنخواہیں جو موجودہ زمانے میں موزوں قسم کے یوروپین اشخاص کو خدمت عامہ

---

[1] دیکھو جلد اول باب ۱۳ فصل ۱۳ تا ۱۹۔

[2] مورسین کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۲۱۸۔

کے مختلف شعبوں میں آنے کی ترغیب دینے کے لئے ضروری خیال کیجاتی ہیں زیادہ ہیں یا نہیں؟ آیا خدمات کو ہندیانے کے طریق پر وہاں تک عمل کیا گیا ہے جہاں تک کہ خوبی کار و کارکردگی کو خطرے میں ڈالے بغیر یا دوسری سخت خرابیاں پیدا کئے بغیر عمل کرنا ممکن ہے؟ ان سوالات کا جواب مختلف لوگ مختلف دیں گے۔ لیکن یہ احساس بہت قوی ہے کہ ان سب مدوں کی بابت ہندوستان کو ضرورت سے زائد مصارف برداشت کرنے پڑ رہے ہیں۔ جہاں کہیں ممکن ہو یوروپین عامل کے بدل کے طور پر ہندوستانی عامل کو مقرر کرنے کا مطالبہ محض اس بنیاد پر مبنی نہیں ہے کہ ایسا کرنے میں مصارف مقابلۃً کم ہوں گے۔ بلکہ دوسرے اور بھی قابل غور امور مساوی طور پر اہم ہیں۔ چنانچہ ایک اہم امر تو یہ ہے کہ ملک، یوروپین افسر کے برخلاف ہندوستانی افسر کے تجربے سے اس کے وظیفے پر علحدگی سے محروم نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں جہاں کہیں ہندوستانی کی اضافی کمتری کا پایا جانا مسلمہ ہو وہاں اکثر صورتوں میں اُس کی تاویل یہ کیجاسکتی ہے کہ ہندوستانی کو کافی موقع نہیں دیا جاتا۔ لیکن دوسرے سب امور سے زیادہ اہم امر یہ ہے کہ اس کا یہ پیدائشی حق ہے کہ اس کے ملک کے مصافی اور غیر مصافی عہدوں کے تقرر کے لئے اس کو ترجیح دی جائے، خواہ وہ یوروپین سے کسی قدر کمتر ہی کیوں نہ ہو، اور جب ہندوستانی یوروپین ہی کی طرح قابل اور موزوں ہو تو اس کا یہ حق بہت زیادہ مرجح ہونا چاہیئے۔

ہندیانے کے مسئلے سے قطع نظر فوجی مصارف کے سلسلے میں ایک اور سوال یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں ہندوستان میں جو فوج رکھی گئی ہے آیا اس کی تعداد ہندوستان کی حقیقی ضرورتوں سے زیادہ ہے یا نہیں۔ غیر سرکاری اشخاص کی رائے یہ ہے کہ ہندوستان کی حفاظت کی غرض سے جتنی فوج مطلوب ہے اس سے موجودہ فوج بہت زیادہ ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ

ہندوستان کی فوج کے مصارف اس سے زیادہ ہیں جتنے کہ خالص ہندوستانی نقطۂ نظر سے ضروری ہیں تو بھی، ہندوستان بحیثیت مجموعی فائدے میں ہے اس لئے کہ ہندوستان برطانوی بحریے کے مصارف کی ضمن میں صرف تھوڑی سی رقم ادا کرتا ہے[1] حالانکہ یہ بحریہ ہندوستان کو حملے سے محفوظ
رکھنے کے لئے ناگزیر ہے۔ اگر ہندوستان سے کہا جائے کہ وہ اپنی بحری ۲۷۵ص
حفاظت خود ہی کرلے تو، اس کو اپنے بحری بیڑے پر بہت بڑی رقم خرچ کرنی پڑے گی۔ لیکن دوسری طرف یہ ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ برطانوی بحریہ کاملاً اس غرض سے نہیں رکھا جاتا کہ ہندوستان کے ساحلوں کو حملے سے محفوظ رکھے۔ چنانچہ آسٹریلیا برطانوی بیڑے سے ہندوستان کے مقابلے میں غالباً زیادہ فائدہ حاصل کرتا ہے، اگرچہ آسٹریلیا کی موجودہ مالی امداد اس فائدے کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔ آسٹریلیا سے یہ بھی نہیں کہا گیا ہے کہ وہ شاہی اغراض کے لئے اپنی حقیقی ضرورتوں سے زیادہ تعداد میں فوج رکھے۔ ہندوستانی فوج کی تعداد اس اصول کے مطابق قائم رکھنی چاہئے کہ وہ ٹھیک اتنی ہی ہو جتنی کہ ملک کی حفاظت کے لئے کافی ہو۔ چنانچہ یہی وہ واحد معیار ہے جس کو اس امر کے متعلق فیصلہ کرنیکے بارے میں استعمال کرنا چاہئے کہ آیا ہندوستان کے فوجی اخراجات صرف فوج کی سائز اور تعداد کی حد تک زائد از ضرورت ہیں یا نہیں[2] اس میں شک نہیں کہ انگلستان سے یہ توقع رکھنا غیرواجبی ہے کہ وہ بدستور بحریے کے

[1] یہ امداد یکم اپریل سنہ ۱۹۳۰ء سے موقوف کردی گئی۔ دیکھو باب ۱۱۔

[2] ہندوستانی فوج کی تعداد اس کی معمولی ضرورتوں سے اس وجہ سے بھی زیادہ ہے کہ ملک کے اندر اس کے استعمال کی ضرورت ہے اور بیرونی حملے کے خلاف حفاظت کا جائز کام انجام دینے کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ فوج کے سلسلے میں شکایت کی ایک اور عام بنیاد وہ طریق ہے جس کے تحت حکومت ہند کو ان برطانوی رنگروٹوں کی تعلیم کے مصارف برداشت کرنے پڑتے ہیں جو بعد میں ہندوستان بھیجے جاتے ہیں۔

بیشتر مصارف بخوشی برداشت کئے جائیں جبکہ اس بحریہ کی خدمات نہ صرف انگلستان کو بلکہ سلطنت برطانیہ کے ہر جزو کو درکار ہوتی ہیں۔

چنانچہ آیندہ غالباً یہ تجویز پیش کیجائے گی کہ مصارف کو سلطنت برطانیہ کے مختلف اجزا میں تقسیم کر دیا جائے، تاکہ اس سلسلے میں انگلستان کے سر پر ذمہ داری کا جو بوجھ ہے وہ ہلکا ہو جائے۔ لیکن یہ مشورہ دینا لغو ہے کہ سلطنت برطانیہ کے اجزائے ترکیبی میں سے ہر ایک اتنی رقم ادا کرے جو برطانوی بحریے سے اس کے استفادے کے پوری طرح متناسب ہو۔ اس سے زیادہ معقول اصول یہ ہوگا کہ ہر رکن اپنی صلاحیت کے مطابق زائد بار برداشت کرے، اور ہندوستان کا نسبتہً نادار ہونا اس امر کی قوی دلیل ہو سکتا ہے کہ اس پر معمولی سا مطالبہ عائد کیا جائے۔ اس کے باوجود یہ اغلب ہے کہ وہ اس سے زیادہ حصہ ادا کرے جتنا کہ اس وقت کر رہا ہے، اور اگر معاملات اس کے سامنے مناسب طریق پر پیش کئے جائیں تو وہ ہرگز دریغ نہ کرے گا اور نہ اس کو دریغ کرنا چاہیئے۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ سلطنت برطانیہ کی بحری حفاظت کے کل مسئلے کو بالکل جدا طور پر جانچا جائے اور اس سوال کے ساتھ خلط ملط نہ کیا جائے کہ آیا ہندوستان کے موجودہ فوجی مصارف بڑی حد تک کم کئے جا سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر ہندوستانی فوج صرف اس غرض سے رکھی گئی ہے کہ ملک کو بیرونی حملے سے محفوظ اور آزاد رکھا جائے تو اس کی تعداد، اس میں کام کرنیوالے اشخاص اور اس کے انتظام جیسے امور کے متعلق تصفیہ اس صورت سے بالکل جداگانہ طریق پر کرنا چاہیئے جس میں کہ فوج شاہی اغراض کے لئے رکھی گئی ہو۔ مجلس قانون ساز نے اس خیال کو مسترد کر دیا جو ایشر کمیٹی سنہ ۱۹۲۱ء

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ:۔۔۔ ان مصارف کو "فردواری مصارف" (Capitation Charges) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو باب ۱۲۔

(۱۹۱۹ء) کی رپورٹ میں مضمر ہے کہ ہندوستانی فوج کو سلطنت برطانیہ کی کل مسلح افواج کا ایک جزو خیال کرنا چاہئیے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی فوج کو بسا اوقات سلطنت کے اغراض کے لئے استعمال کیا گیا۔ اس لحاظ سے یہ استدلال کہ اگر اس پالیسی پر قائم رہنا مقصود ہے تو ہندوستان کے فوجی اخراجات کے ایک جزو کا بار انگلستان کو برداشت کرنا چاہئیے غیر معقول نہیں معلوم ہوتا[1]۔

۲۳ بنکوں اور جہازرانی اور بیمے کی کمپنیوں کا منافعہ

مذکورۂ بالا خدمات کے علاوہ دوسری خدمات بھی ہیں جن کا معاوضہ ہندوستان کو باہر ادا کرنا پڑتا ہے اور جو مطالبات وطن کے تحت درج نہیں ہوتا، اور یہ غیر ملکی بنکوں، یورپ کی جہازراں کمپنیوں، اور بیمہ کمپنیوں وغیرہ کی خدمات ہیں۔ ہندوستان کے لوگوں کی دلی تمناؤں میں سے ایک یہ ہے کہ اس قسم کے کاموں کا بڑا حصہ بطور خود انجام دینے کے جلد قابل بنیں۔ لیکن یہ مانتے ہوئے بھی کہ یہ ایک پسندیدہ امنگ ہے اس واقعے کو فراموش نہ کرنا چاہئیے کہ دولت مند ملک بھی بعض اوقات اس قسم کی خدمات کو غیر ممالک سے خریدنا فائدہ بخش پاتے ہیں۔ چنانچہ ریاستہائے متحدۂ امریکہ کم از کم جنگ عظیم سے پیشتر بحری نقل و حمل کی خدمت، بنک کاری، بیمے اور دوسری مالی اور تجارتی خدمات کے لئے یورپ کی بڑی طاقتوں کی بڑی حد تک دست نگر اور مقروض رہا کرتی تھیں۔ لیکن یہ عذر کہ ہندوستان کو ان معاملات میں اپنے پر بھروسا کرنا سیکھنا چاہئیے اس خیال پر مبنی ہے کہ یہ قابلیت پیدا کرنے کے بعد وہ ایک طرف یقیناً بڑے بڑے معاشی اور دیگر فوائد حاصل کرے گا اور دوسری طرف "اخراج دولت" کی مقدار میں کمی ہو جائے گی۔

---

[1] چنانچہ اس اصول کو برطانوی حکومت نے حال ہی میں ایک حد تک قبول کر لیا ہے۔ ملاحظہ ہو باب[11]۔

۲۴
"اخراج دولت" کی بحث کے بعض بنیادی مفروضات

"اخراج دولت" کی وجہ سے ہندوستان کو جو مختلف نقصانات برداشت کرنے پڑتے ہیں ان کی تلافی کے طور پر بعض اوقات اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ بہ ہر صورت انگلستان نے ہندوستان کو امن و امان کی ان مول نعمت عطا کی ہے اور ملک کی ہمہ جہتی نشو و نما کو ممکن بنایا ہے۔ اس لحاظ سے "اخراج دولت" کی وجہ سے ہندوستان کو جو گھاٹا آتا ہے وہ ان نعمتوں کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ لیکن یہ عذر پیش کر کے حکومت کے ہر قسم کے اسراف اور ہر قسم کی بے انصافی کو بجا ثابت کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے اکثر ذی فہم باشندے ان عظیم الشان فوائد کو بے تامل تسلیم کر لیں گے جو ہندوستان کو برطانوی تعلق کی بنا پر حاصل ہیں۔ لیکن محض اس وجہ سے کہ فوائد بے پایاں ہیں ان کو شمار کرنے کی کوئی کوشش بھی نہ کرنی چاہیئے ایک ایسی بحث میں جس کا تعلق زیادہ قطعی اور قابل شمار اگرچہ غالباً کم اساسی معاملات سے ہے ان فوائد کے مسئلے کو خواہ مخواہ کھینچ لانے سے بعینہ اسی طرح پرہیز کرنا چاہیئے جس طرح کہ اس بحث کے جزو کے طور پر ان بیشمار فوائد پر غور کرنے سے جو انگلستان کو ہندوستان سے حاصل ہوتے ہیں۔ ہم کم از کم ان فوائد اور مواقع کا تخمینی اندازہ تو کر سکتے ہیں جو انگلستان کے کاروباری اشخاص کو اپنی جد و جہد اور اپنے کام کے لئے ہندوستان کی وسیع جولانگاہ میں میسر آتے ہیں۔ لیکن اس فائدے کا کس حسابی طریق سے اندازہ لگایا جائے گا جو انگلستان کو ہندوستان کے قبضے کی بدولت اقوام عالم میں اپنی شہرت و ناموری بڑھانے سے حاصل ہوا ہے؟ کیا اس قوت اور کرّ و فر کی قیمت روپے آنے پائی میں مقرر کریں گے جو انگریز اس شاندار سلطنت کے بارے میں محسوس کرتے ہیں؟ اور اس کا کس طرح حساب لگایا جا سکتا ہے کہ انگلستان کے سپاہیوں مدبروں اور ارباب نظم و نسق کی تربیت کے لئے ہندوستان جو لاجواب میدان مہیا کرتا ہے وہ انگلستان کے نزدیک کس قدر بیش بہا ہے؟ اگر

اخراج دولت" کے مسئلے کی بحث سے مفید نتائج پر پہنچنا مقصود ہے تو اس کے دائرے سے ان سب غیر ضروری مباحث کو خارج کر دینا چاہیئے ۔

ان لوگوں کے مقابلے میں جو اس بات سے متاثر ہیں کہ برطانوی حکمرانی سے ہندوستان کو عظیم فوائد حاصل ہوئے ہیں، ایسے اشخاص بھی ہیں جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ سیاسی آزادی کی عدم موجودگی کی تلافی حقیقت میں کوئی چیز بھی نہیں کر سکتی ۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس خیال کے لوگوں کو اس قسم کی بحث میں حصہ لینے کا کوئی حق نہیں ہے ۔ اس لئے کہ نظریۂ اخراج دولت" اس سوال کا جواب طلب کرتا ہے ۔ کہ برآمد کی زیادتی کی بنا پر ملک سے باہر جانے والی دولت کے بدلے ہندوستان جو کچھ پاتا ہے اس کو کس حد تک کافی معاوضہ خیال کیا جا سکتا ہے؟ اور سوال کے اس طرح مرتب کرنے میں معاوضے کا امکان شامل ہے ۔ پس اگر برطانیہ کے قائم کردہ امن وامان کے متعلق دلائل کو ناجائز قرار دینا بجا ہو سکتا ہو تو سلب آزادی سے رونما ہونے والی ذلت وخواری کے متعلق دلائل کو مسترد کرنا بھی اسی طرح جائز ہونا چاہیئے ۔

۲۵ مسئلۂ "اخراج دولت" کے سیاسی ومعاشی پہلو

مذکورۂ بالا بحث سے واضح ہو گیا ہو گا کہ "نظریۂ اخراج دولت" کے بیشتر حصے نے اپنی موجودہ شکل میں ہندوستان کی برطانوی حکمرانی پر کسی قدر پراگندہ اور بالکل بے سود نکتہ چینی کی حیثیت اختیار کر لی ہے ۔ سیاسی شورش اور پروپگنڈا سے اس نظریے کا تعلق کئی غیر معاشی خیالات کا ذمہ دار رہا ہے ۔ چنانچہ اس نظریے کی ابتدائی خامیوں میں سے ایک یہ خیال تھا کہ دولت کا سالانہ اخراج دراصل خراج تھا جو انگلستان، ہندوستان سے سونے چاندی کی شکل میں وصول کرتا تھا۔ لیکن یہ ثابت ہو گیا کہ یہ واقعات کے بالکل خلاف تھا، جنھوں نے ثابت کر دیا کہ ہندوستان کافی سونا اور چاندی درآمد کر رہا تھا۔ اس کے بعد کی منزل میں یہ خیال قائم کیا گیا کہ برآمد کی زیادتی سب کی سب ملک کے

خالص نقصان کو تعبیر کرتی تھی ۔ یہ استدلال بھی ترک کر دیا گیا؛ اور جیسا کہ ابھی بیان کیا جا چکا ہے، اب یہ بات معمولاً تسلیم کی جانے لگی ہے کہ مختلف قسم کی خدمات کی شکل میں کچھ نہ کچھ معاوضہ وصول ہو رہا ہے۔ تاہم اکثر لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ہندوستان کو ان خدمات کی قیمت بہت بھاری ادا کرنی پڑتی ہے ۔ ان پے در پے ترمیموں کے نتیجے کے طور پر "نظریۂ اخراج دولت" نے اپنی اصلی اور ابتدائی قوت و نوعیت بڑی حد تک کھو دی ۔ لیکن اس سلسلے میں جو تجزیہ کیا گیا وہ ابھی تک کارآمد ہے، اس لئے کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف امور میں اصلاح کی ضرورت ہے ۔ بہرحال ہمارا یہ خیال ہے کہ معاشیات ہند کی سب اصطلاحوں میں یہ بہت زیادہ مستعملہ اصطلاح ہے، اور حکومت
کی ہر مذموم حرکت کے متعلق اظہار خیال کرنے میں اس سے بہت کثرت سے ۲۷۸
کام لیا گیا ہے ۔ اس لفظ نے کم از کم دو نسلوں سے محبان وطن کیلئے تمام رنج والم اور جوش انگیز خیالات کا اظہار کرنے کی خدمت انجام دی ہے دادابھائی نوروجی کے زمانے کے اکثر ہندوستانیوں کو بھی "اخراج دولت" کا لفظ اس لئے خاص طور پر موزوں معلوم ہوا کہ ایک سنکی وزیر ہند جو گفتگو میں محتاط نہیں تھا یہ کہا کرتا تھا کہ ہندوستان کا خون چوسنا ضروری تھا۔[1]

۱۔ لارڈ سیلس بری وزیر ہند نے ۱۸۷۵ء میں کہا تھا کہ :۔

"چونکہ ہندوستان کا خون چوسنا ضروری ہے اس لئے نشتر ان حصوں پر مارنا چاہیے جہاں خون بہت جمع یا کم از کم کافی مقدار میں ہو اور ایسے حصوں پر نشتر نہ دینا چاہیئے جو خون کی کمی کی وجہ سے کمزور ہوں" ہندوستان میں اس کے متعلق جب بے سخت غم و غصے کا اظہار کیا گیا وہ نہ تو یہ تھا کہ یہ بیان غیر معمولی صفائی اور سچائی کی نوعیت رکھتا تھا اور نہ یہ کہ وہ ایک خاص خیال اور معنی ذہن نشین کرتا تھا (اس لئے کہ سیاق عبارت پر نظر کرتے ہوئے یہ خیال بہت زیادہ مذموم بھی نہ تھا) بلکہ یہ کہ

ہندوستان میں معاشیات کی ابتدا سیاسیات کے رفیق کی حیثیت سے ہوئی، اور ان دونوں کے ملاپ کی پہلی پیداوار نظریہ "اخراج دولت" تھی اس نظریے نے یہ خیال پیدا کیا کہ ہندوستان کے انتہائی افلاس کا باعث کامل طور پر نہیں تو بڑی حد تک وہ خراج تھا جو انگلستان ہندوستان سے وصول کرتا تھا۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ کس طرح حال میں کئی ضروری ترمیموں کے بعد نظریۂ "اخراج دولت" کی بہت کچھ اصلاح ہو گئی ہے اور کس طرح اب بھی وہ کئی حقیقی شکایتوں کی موجودگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ لیکن وہ ہندوستان کے افلاس کی کوئی مکمل تشریح و توجیہ نہیں کرتا۔ پہلا ہندوستانی مفکر جس نے افلاس کے کئی دوسرے زیادہ اہم اسباب پر زور دینے کی ضرورت کو محسوس کیا وہ راناڈے تھا جس نے اس معاملے اور کئی دوسرے معاملات میں رہنمائی کی[1] بعد کے مصنفوں نے راناڈے کی سی بالغ نظری اور اس کی سی اعلیٰ حسِ تناسب ظاہر نہیں کی۔

۲۶ برّی سرحد کی تجارت

ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں ایک وسیع برّی سرحد ہے جس کا طول کم وبیش ۶۰۰۰ میل ہے۔ یہ لمبائی اس کے بحری ساحل کی لمبائی سے بہت زیادہ ہے۔ لیکن برّی سرحد پر گھنے اور ناقابل گذر جنگل اور رسائی سے بالاتر پہاڑوں کے باعث اکثر مقامات میں تجارت کی راہ میں مشکلات حائل ہیں۔ چونکہ شمال مغربی سرحد پر درۂ بولان جیسے درّے یا راستے بہت ہی کم ہیں، اس لئے سرحد پار کے ملکوں سے آمدورفت مشکل ہے۔ ہندوستان کی تجارت خارجہ کے بارے میں ہم اپنے تاریخ وار تبصرے

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ:- خون آشام اور بے رحمانہ زبان استعمال کی گئی تھی۔ چنانچہ اسی وجہ سے یہ بیان بہت بدنام ہوا۔

[1] نیز ملاحظہ ہو ڈی، اے، شاہ کی کتاب "معاشیات میں ہندوستانی نقطۂ نظر" صفحہ ۱۲۔

میں اس کی برّی سرحد کی قدیم تجارت کی نوعیت کی طرف توجہ منعطف کراچکے ہیں۔ چنانچہ مغلیہ دور میں خاطر خواہ تجارتی گرم بازاری تھی۔ حال میں سرحد پار کے رسل ورسائل کی حد تک خاص کر شمال مغربی سرحد پر صورت حال کی بڑی حد تک اصلاح ہوگئی ہے۔ گو سرحدی علاقے میں ریلوے بنانے کی بڑی محرک حربی وفوجی ضرورت تھی۔ لیکن یہ ریلوے تجارتی شاہراہ کا بھی کام دے رہی ہے۔ سرحد پار کے ملک جن سے ہندوستان کے تجارتی تعلقات ہیں۔ افغانستان، وسطی ایشیا، ایران، نیپال اور تبت ہیں۔ سنہ ۲۵-۱۹۲۴ کو
۲۷۹ ختم ہونے والے سالوں میں بری سرحد کی تجارت کی مختصر کیفیت مندرجہ ذیل جدول میں دی گئی ہے۔ ان اعداد میں برّی سرحد پار کے ملکوں مثلاً ریاستہائے شان، مغربی چین اور سیام کے ساتھ تجارت کے اعداد بھی شامل ہیں۔

برّی سرحد کی تجارت (بحساب کرور روپیہ)

	سنہ ۱۹۱۶ تا سنہ ۱۹۱۷	سنہ ۱۹۱۸ تا سنہ ۱۹۱۹	سنہ ۱۹۲۰ تا سنہ ۱۹۲۱	سنہ ۱۹۲۴ تا سنہ ۱۹۲۵	یکم اپریل سنہ ۱۹۲۵ سے اعداد کی اشاعت موقوف ہے۔
درآمد	۱۲٫۸۱	۱۵٫۹۶	۱۸٫۱۶	۲۳٫۰۸	
	۱۰٫۳۴	۱۴٫۸۷	۱۵٫۸۱	۱۸٫۷۳	
مجموعی بری تجارت	۲۳٫۱۵	۳۰٫۸۳	۳۳٫۹۷	۴۱٫۸۱	

اگرچہ یہ اعداد، ہندوستان کی مجموعی سالانہ بحری تجارت کے مقابلے میں ہیچ ہیں، پھر بھی ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تدریجی ترقی ہوئی ہے،

اور اس کا امکان ہے کہ سرحد پار کے رسل و رسائل کی مزید اصلاح و توسیع سے اس ترقی کی رفتار اور تیز ہو۔

ہندوستان کی بڑی سرحد بہ شمول برما کی تجارت کی رجسٹری کا طریقہ اپریل ۱۹۲۵ء سے نافذ کیا گیا جس کی خصوصیت یہ ہے کہ صرف بعض منتخب اشیا کی درآمد و برآمد کو ان ریلوے اسٹیشنوں پر درج رجسٹر کیا جاتا ہے جو سرحد پار کے زیادہ اہم تجارتی راستوں سے ملحق ہیں۔ یکم اپریل ۱۹۲۶ء سے اس طریق کے تحت برما کو بھی شریک کر لیا گیا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ان اسٹیشنوں پر جو درآمدی تجارت ہوتی ہے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے بڑے حصے کو سرحد پار منتقل کیا جائے؛ اور جو برآمدی تجارت ہوتی ہے اس کا بڑا حصہ ایسی اشیا پر مشتمل ہوتا ہے جو سرحد پار سے آتی ہیں لیکن ان اسٹیشنوں پر جتنی مجموعی تجارت کی رجسٹری ہوتی ہے اس سے حقیقی سرحدی تجارت کے صحیح تناسب کو متعین کرنا ناقابل عمل ہے۔

یکم فروری ۱۹۳۷ء سے یہ انتظامات کئے گئے ہیں کہ ہندوستان اور افغانستان کی باہمی تجارت کی رجسٹری تورخم، تھال اور چمن پر کیجاتی ہے، اور قیمتیں بھی درج کیجاتی ہیں۔ موجودہ زمانے میں سرحد پار ملکوں سے جو اشیا درآمد کیجاتی ہیں وہ غذائی اشیا، مثلاً گیہوں، غلہ، دال اور چاول ہیں۔ افغانستان سے میوے، ترکاریاں اور گری دار میوے؛ افغانستان اور تبت سے خام اون؛ نیپال سے خام سن اور روغن دار تخم؛ زندہ جانور بالخصوص نیپال سے اور خام ریشم وغیرہ درآمد کئے جاتے ہیں۔ برآمد میں زیادہ اہم اشیا غیر ملکی اور ہندوستانی سوتی کپڑے؛ سوت، غلہ اور دال؛ شکر؛ خام کپاس؛ لوہا اور فولاد (جس میں چاقو قینچی اور آہنی سامان شامل ہے؛) پٹرول؛ چرمی مصنوعات؛ ریشمی کپڑے؛ چائے؛ نمک؛ تمباکو وغیرہ ہیں[1]۔

---

[1] ملاحظہ ہو ایک رپورٹ موسوم بہ "تبصرہ بر تجارت ہند برائے ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء" صفحہ ۱۲۳۔

اس میں واضح طور پر ہندوستان کا فائدہ ہے کہ اپنی تجارت خارجہ
کے اس شعبے کو امکانی حد تک ترقی دے، خاصکر اس لئے کہ ہندوستان میں صفحہ ۲۸
مصنوعات تیار کرنے والے کارخانوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ سرحد پار کے
بازاروں کی نشوونما کی اہمیت پہلے سے بہت بڑھ جائے گی۔

۲۷ تجارت بین الاقوام اور معاشی خوشحالی

ہندوستان کی تجارت کی مقدار اتنی کافی ہے کہ اس کی بنا پر دنیا کے ملکوں میں ہندوستان پانچویں نمبر کا مستحق بن جاتا ہے۔ ان ملکوں کے نام بہ لحاظ ترتیب حسب ذیل ہیں۔ سلطنت متحدہ، ریاستہائے متحدہ امریکہ، فرانس، جرمن، ہندوستان۔ لیکن تجارت کا حساب فی کس نکالا جائے تو ہندوستان کا درجہ بہت گھٹ جاتا ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل جدول میں بتلایا گیا ہے۔ اعداد عالمی تجارتی کساد بازاری کے دور کے پیشتر کے زمانے سے متعلق ہیں۔

تجارت خارجہ بحساب فی کس آبادی

صرف سامان کی تجارت ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ڈالروں کے حساب سے[1]

ملک	۱۹۱۳ء	۱۹۲۱ء	۱۹۲۵ء
آسٹریلیا	۱۵۵	۱۷۵	۲۵۵
کنیڈا	۱۴۲	۲۵۸	۲۴۴
ڈنمارک	۱۳۴	۲۳۳	۲۳۳
سلطنت متحدہ	۱۲۶	۲۵۴	۲۰۸

[1] ملاحظہ ہو ایک رپورٹ موسومہ بہ "تجارت خارجہ کے توازن کے بارے میں مجلس اقوام کی یادداشت" جلد اول صفحہ (۱۵۰) جس کا حوالہ مسٹر ایس سی بوس نے اپنے ایم اے کے مقالے موسومہ بہ "ہندوستان کی تجارت خارجہ" میں دیا ہے۔

بلجیم	۲۰۹	۲۱۲	۱۹۲
فرانس	۷۴	۱۳۰	۱۰۵
جرمنی	۷۴	۴۸	۸۰
ریاستہائے متحدۂ امریکہ	۴۳	۶۳	۷۹
جاپان	۱۲	۳۸	۳۳
ہندوستان	۴٫۳	۷٫۰	۷٫۳
روس	۸٫۵	۳٫۲	۴٫۷
چین	۱٫۶	۳٫۷	۳٫۲

ظاہر ہے کہ ہندوستان جیسے بڑے ملک کی حد تک جس کی آبادی بہت زیادہ ہے، اس بات کی ضرورت ہے کہ مجموعی تجارت کی مقدار بھی بہت زیادہ ہو، تاکہ چھوٹے ملکوں کے مقابل اس میں بحساب فی کس تجارت کی زیادہ مقدار ظاہر ہو۔

ہم کسی ملک کی تجارت خارجہ کے فرد واری حساب کو اس ملک کی معاشی خوشحالی کی قطعی علامت نہیں قرار دے سکتے۔ اس لئے کہ اگر ایسا کریں تو یہ نتیجہ نکالنا پڑے گا کہ سلطنت متحدہ، ریاستہائے متحدۂ امریکہ سے بہت زیادہ دولت مند ہے، حالانکہ صحیح اور اصلی صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ سلطنت متحدہ کے وجود کا انحصار سر بسر تجارت خارجہ پر ہے۔ اس کے برخلاف ریاستہائے متحدہ امریکہ کے لئے، اس کی داخلی تجارت کے مقابلے میں اس کی خارجی تجارت بہت ۲۸۱
کم اہمیت رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں عام طور پر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بین الاقوامی مبادلہ بڑے ملکوں کے مقابلے میں چھوٹے ملکوں کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ طالب علم کے لئے سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ وہ ذہن نشین رکھے کہ تجارت بین الاقوام تجارت کرنے والے ملکوں کے تمول یا افلاس کے نہیں بلکہ اصول مصارف متقابلہ کے

تابع ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ مجموعی آمدنی کی مقدار یا کسی حد تک فی کس آمدنی کی مقدار بھی ملکوں کی اضافی معاشی طاقت کے بارے میں ان نتائج کی تصدیق کا کام دے جو فی کس آمدنی سے زیادہ یقینی معیاروں سے اخذ کئے جائیں۔ لیکن محض اس آمدنی کو ایسے نتائج اخذ کرنے کی واحد بنیاد قرار دینا بہت خطرناک ہے۔ ڈاکٹر مارشل نے اسی کل مسئلے کے تمام پہلوؤں پر حسب عادت قابلیت اور تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور ہمیں قابل معافی سمجھا جائے گا اگر ہم ان کے الفاظ آزادی کے ساتھ نقل کریں۔ وہ ہندوستان کا جزائر غرب الہند سے ایسے زمانے میں مقابلہ کرتے ہوئے جبکہ انگلستان دنیا کا کارخانہ نہیں بنا تھا، کہتے ہیں کہ: "جب فطری اور مصنوعی اسباب ملکر جزائر غرب الہند کو شکر کی پیدائش کا کم وبیش اجارہ دار بنا رہے تھے اس وقت ان جزائر میں سے بعض نہ صرف اپنے کل مطلوبہ پارچے اور مصنوعات کی بلکہ اپنی تمام ضروری غذا کی درآمد کر رہے تھے۔ دوسری طرف ہندوستان کو لیجئے باوجود اس کے کہ اس کی آبادی بڑی تھی اور یورپ اس کی کئی قسم کی پیداوار کا طالب تھا، اس کی تجارت خارجہ اس زمانے میں بہت ہی تھوڑی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کو یورپی ممالک کی پیداوار بہت کم مطلوب تھی یا وہ ان اشیا میں سے جن کی اس کو ضرورت تھی، اکثر کو خود ہی مہیا کر سکتا تھا؛ اور یورپی اقوام اس کی بڑی اور زرخیز زمین کے صرف ایک جزوی خطے تک رسائی رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں جزائر غرب الہند کی تجارت خارجہ دنیا کی سب سے بڑی تجارت میں سے ایک شمار ہوتی تھی وہاں، ہندوستان جیسے براعظم کی خارجی تجارت بہت ہی ادنی تھی"[1] پھر بھی جزائر غرب الہند کے مقابلے میں ہندوستان بہت زیادہ دولت مند ملک تھا۔ ڈاکٹر مارشل نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ "ممکن ہے کہ کسی ملک کی تجارت خارجہ میں

[1] ملاحظہ ہو ڈاکٹر مارشل کی تصنیف موسوم بہ "صنعت وتجارت" صفحہ ۲۵۔

ان صنعتوں کی ترقی کی بدولت اضافہ ہو جائے جو دوسرے ملکوں کی اسی قسم کی
صنعتوں سے پہلے ہی سے آگے ہوں۔ اس لئے کہ ان صنعتوں کی ترقی کی
بدولت نفع کے ساتھ ملک کی برآمد کرنے کی طاقت بھی بڑھ جاتی ہے۔
اس کے برعکس اگر اس ملک میں ایسی صنعتوں کو فروغ ہو جو پہلے نسبتہً کمزور
تھیں تو ایسی صورت میں ملک کی تجارت خارجہ میں تخفیف یا تجارتی ترقی
میں رکاوٹ پیدا ہونے کا امکان ہوتا ہے اس لئے کہ ایسی صنعتوں کی
ترقی اس ملک کی برآمد کی ضرورت کو کم کردیگی" اگر کسی ملک کی تجارت خارجہ
کی مقدار بحساب فی کس بڑی ہو تو "اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملک
بین الاقوامی مبادلۂ اشیا میں حصہ لیکر آسائش اور تعیش کی اشیا سے لطف اندوز
ہو رہا ہے اور خوشحال ہے۔ یا دوسری طرف اس سے یہ بھی نتیجہ نکالا
جا سکتا ہے کہ لوگ ایک بنجر اور غیر زرخیز علاقے میں رہتے ہیں اور
اس بات پر مجبور ہیں کہ اپنی خدمات دیں اور زندگی کی ضرورتوں کی سادہ
اشیا سیدھی سادی خوراک اور لباس، ایندھن، عمارت سازی کی اشیا اور
بعض اوقات پینے کا پانی بھی درآمد کریں، جیسا کہ جنوبی عربستان میں عدن
میں کیا جاتا ہے[1]۔ لیکن اسی کے ساتھ حقیقی تجربہ یہ بتلاتا ہے کہ خاصکر ۴۸۲
جب ہم تجارت خارجہ کی بڑی مقدار فی کس پر نہیں بلکہ اس سے زیادہ بڑی مجموعی
مقدار پر غور کرتے ہیں تو کسی ملک کی تجارت کی زیادتی تقریباً ہمیشہ اس بات
کا ثبوت دیتی ہے کہ یہ ملک اعلیٰ درجے کی صنعتی قوت رکھتا ہے"۔ اس لئے
کہ کردار کی وہی قوت اور توانائی جو کسی قوم کو صنعتی برتری و بزرگی بخشتی ہے
اس کے تاجروں کو بھی مستعد اور چوکس بنا سکتی ہے، تاکہ وہ اپنے ملک کی
بہترین پیداوار کو ان ملکوں سے روشناس کرانے کے ہر موقع سے فائدہ
اٹھائیں جو ان اشیا کو مقابلتہً ویسی ہی عمدگی اور آسانی کے ساتھ تیار نہیں
کر سکتے جیسا کہ دوسری چیزوں کو جو اس ملک کے بازار میں طلب کیجاتی
ہیں لیکن مقابلتہً اتنی ہی آسانی سے وہاں (اس ملک میں) تیار نہیں کیجا سکتیں
یہ استدلال اس وقت خاص طور پر قوی ہو جاتا ہے جبکہ برآمد زیادہ تر

[1]۔ ڈاکٹر مارشل کی تصنیف محولۂ بالا، صفحہ ۱۴۔

اعلیٰ درجے کی پیداوار پر مشتمل ہوتی ہے"۔ مجموعی تجارت کی بڑی مقدار عام طور پر یہ بتلاتی ہے کہ صنعتی کارکردگی اعلیٰ ہے۔ وہ یہ ثابت کرتی ہے کہ زیر بحث ملک میں ہر قسم اور ہر درجے کی مہارت اسی کام میں لگائی جاتی ہے جس کے لئے وہ خاص طور پر موزوں ہو؛ مشین اور اس کے متعلقات کو تیزی سے اصلاح وترقی دیجاتی ہے؛ اوراس میں جو چیز بہترین کام نہ کرے فوراً نکال دیجاتی ہے اور عام طور پر ان ملکوں کو برآمد کردی جاتی ہے جن کی صنعتیں پسماندہ حالت میں ہوں"۔

مذکورۂ بالا امور کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ہندوستان میں ریلوے اور اسٹیمر جیسے وسائل نقل وحمل کی سہولتوں کی توسیع کی بدولت موجودہ زمانے میں ہندوستان کی تجارت خارجہ میں جو عظیم اضافہ ہوا ہے اس کے بارے میں یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ وہ صنعتی برتری وامتیاز کی علامت ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ اس کی تمہید یا ابتدا ہے۔ اگر ہندوستان اپنی ہی مصنوعات کو نشو ونما دے تو ہوسکتا ہے کہ اس کے نتیجے کے طور پر، کم از کم شروع میں ہندوستان کی تجارت خارجہ میں خاصی کمی ہوجائے؛ اس لئے کہ وہ ان مصنوعات کو خود ہی تیار کرنے لگیگا جن کو موجودہ زمانے میں باہر سے درآمد کرتا ہے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ آیندہ چلکر اس کی مصنوعات اس حد تک ترقی کرلیں کہ ملکی بازار میں، غیر ملکی مصنوعات کی جگہ لینے کے بعد ملک کی سرحدوں سے باہر جانے لگیں اور بیرونی دنیا میں پھیل جائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی صورت حال کو اس بات کی مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے کہ تجارت خارجہ اور معاشی خوشحالی کا باہمی تعلق غیر یقینی ہوتا ہے۔ گو معاشی ترقی کے میدان میں ہندوستان نے جو پہلا قدم اٹھایا ہے اس کی بدولت تجارت میں خاصی ترقی ہوئی پھر بھی ترقی کی دوسری منزل میں جب وہ قدم اٹھائے گا تو اس کی علامت یہ ہوگی کہ اس کی تجارت بین الاقوام میں کمی ہوجائے گی، اور اس کی معاشی ارتقا کی آخری منزل میں یہ ہوسکتا ہے کہ اس کی تجارت خارجہ میں پھر اضافہ ہو۔

باب ۶

داخلی تجارت

۲۸
(۱) ساحلی تجارت

ص ۲۸۳ ہندوستانی جہازوں کے لئے ساحلی تجارت کو محفوظ کرنے کی تجویز پر ہم نے جو بحث کی تھی اس کے سلسلے میں یہ بتلایا جاچکا ہے کہ مستقبل میں ہندوستان کے لئے اس کی ساحلی تجارت کی کیا اہمیت ہے اور موجودہ زمانے میں کیا صورت حال ہے۔ ہندوستان کی ساحلی تجارت کو اس کی داخلی تجارت کا جزو خیال کیا جاسکتا ہے، اگرچہ اس میں خارجی تجارت کی کچھ مقدار بھی شامل ہے[۱]۔

مندرجۂ ذیل جدول میں اس ہندوستانی اور غیر ملکی سامان کی مالیت درج کی گئی ہے جو برطانوی ہند کے بحری ساحل رکھنے والے صوبوں میں برطانوی اور دوسرے ہندوستانی بندرگاہوں سے درآمد یا برآمد کیا گیا۔

ساحلی تجارت

(بحساب ہزار روپیہ)[۲]

صوبے	سنہ ۱۹۱۸ء تا درآمد	سنہ ۱۹۱۹ء برآمد	سنہ ۱۹۳۵ء تا درآمد	سنہ ۱۹۳۶ء برآمد
بنگال	۱۴۱۶۲۸	۱۱۴۶۷۰	۱۵۰۳۶۰	۹۹۳۹۳

۱ سنہ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں درآمدہ خانگی تجارتی اسباب کی مالیت ۹۵ء۷۳ کرور روپے تھی اس کے منجملہ ہندوستانی اسباب کی مالیت ۴۲ء۶۸ کرور روپے اور غیر ملکی سامان کی مالیت ۵۳ء۰۵ کرور روپے تھی۔ اسی طرح برآمد کردہ سامان کی مجموعی مالیت ۳۱ء۹۴ کرور روپے تھی اس کے منجملہ ہندوستانی سامان کی مالیت ۱۸ء۷۷ کرور روپے اور غیر ملکی سامان کی مالیت ۱۳ء۱۷ کرور روپے تھی۔

۲ ۔ دیکھو ایک رپورٹ موسومہ بہ برطانوی ہند کا امدادی خلاصہ بابت سنہ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء جدول نمبر (۲۷۴)

بہار و اوڑیسہ	٢٤٣٣	١٠٦٧	٩٩٩ [1]	١٢٩٢ [1]
بمبئی	٣٨٦٠٣٥	٢١٣٤٠٤	١٨٥٤٧٥	٢٢٢٨٧٢
سندھ	٨٠٩٠٥	٦٠٢٧٣	٩٠٣٢٧	٨٥٢٩٦
مدراس	٩٥٢٠٦	٨٥٨٠٦	٣١٣٠٠٥	٩٣٣٠٧
برما	١٦٩٥١١	٢٠٢٢٤٨	٩٩٣٥٢	٣٤٠٩٣٥
میزان	٨٧٥٧١٨	٦٧٧٤٦٨	٧٥٩٥١٨	٨٤٣٠٩٥

سرکاری سامان اور سونے چاندی کو شامل کرنے پر ساحلی تجارت کی مجموعی مالیت ١٩١٨-١٩ء اور ١٩٣٥-٣٦ء میں علی الترتیب ١٦٦٥٩ لاکھ روپے اور ١٦١٨٥٩ لاکھ روپے تھی۔ برما اور ہندوستانی صوبوں کی باہمی تجارت خاص طور پر جاذب توجہ ہے۔ اس لئے کہ برما سے بری آمد و رفت بہت مشکل ہے۔ ١٩٣٦-٣٧ء میں برما میں جو سامان درآمد کیا گیا اس کی مالیت ١٠ کروڑ ٣٩ لاکھ روپے اور برما سے جو مال برآمد کیا گیا اس کی مالیت ٣٤ کروڑ ٩٢ لاکھ روپے تھی۔ برما میں ساحلی راستے سے جو اہم اشیا درآمد کی گئیں وہ کوئلہ، سوتی کپڑے ٹاٹ کے تھیلے، دال، چھالیہ، آہنی اشیا، گیہوں کا آٹا، تمباکو، سگریٹ، مونگ پھلی کا تیل، سوکھی مچھلی، چائے اور شکر ہیں۔ اس کے برعکس برما سے جو اہم اشیا برآمد کی جاتی ہیں وہ چاول، مٹی کا تیل، پٹرول، موم بتی، لاکھ، ساگوانی لکڑی، چوبینہ، چنا، دال وغیرہ ہیں [2]۔ ص ٢٨٧

١٩٣٥ تا ١٩٣٦ء میں ہندوستان کی آٹھ بڑی بندرگاہوں کی مجموعی تجارت خارجہ اور ساحلی تجارت (درآمد و برآمد) کا اندازہ مندرجۂ ذیل جدول سے

[1] یہ اعداد صرف اوڑیسہ کے متعلق ہیں۔

[2] مزید تفصیلات کے لئے دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "تبصرہ بر تجارت ہند برائے ١٩٣٦ء تا ١٩٣٧ء" صفحہ ١٦٥۔

ہوتا ہے

آٹھ بڑی بندرگاہوں کی مجموعی تجارت[1]

(بحساب لاکھ روپے)

بندرگاہیں	غیر ملکی تجارت		ساحلی تجارت		مجموعی تجارت	
	زمانۂ قبل از جنگ کا اوسط	۳۶-۱۹۳۵ء	زمانۂ قبل از جنگ کا اوسط	۳۶-۱۹۳۵ء	زمانۂ قبل از جنگ کا اوسط	۳۶-۱۹۳۵ء
بمبئی	۱۱۳۱۵	۸۷۸۵	۳۲۳۰	۴۱۶۵	۱۴۵۴۵	۱۲۹۱۰
کلکتہ	۱۴۱۰۶	۹۸۹۶	۱۸۷۲	۲۳۲۷	۱۵۹۷۸	۱۲۲۲۳
رنگون	۲۹۹۳	۲۸۱۸	۱۹۰۳	۳۹۵۹	۴۸۹۶	۶۷۷۷
کراچی	۳۸۸۷	۳۲۴۳	۹۰۰	۱۷۵۵	۴۷۸۷	۴۹۴۸
مدراس	۱۶۸۰	۲۰۸۲	۲۸۱	۸۲۰	۱۹۶۱	۲۹۰۲
کوچین	۲۷۲	۶۰۸	۳۵۶	۷۳۷	۶۲۸	۱۳۴۵
ٹیوٹی کارن	۵۵۶	۳۰۷	۱۶۷	۶۳۹	۷۲۳	۹۴۶
چٹاگانگ	۵۷۱	۶۰۶	۱۷۶	۲۳۸	۷۴۷	۸۴۴

ان اعداد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی مجموعی خارجی اور ساحلی تجارت میں بمبئی، کلکتہ اور رنگون کا حصہ زیادہ اور کراچی و مدراس کا حصہ کم ہے[2]

[1] ۔ ان اعداد میں بجز سرکاری سامان کے جملہ خارجی و ساحلی تجارت کے اعداد شامل ہیں دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "برطانوی ہند کا اعدادی خلاصہ برائے سنہ ۱۹۲۵ء تا سنہ ۱۹۳۶ء جدول نمبر ۲۶۰)

[2] ۔ اہم بندرگاہوں کی تجارت کا دلچسپ حال معلوم کرنے کے لئے ملاحظہ ہو ویرا آنسٹے کی

باب ۶ ہندوستان کی ساحلی تجارت کو پوری طرح فروغ دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ بندرگاہوں کی ترقی کی ایک جامع تجویز مرتب کی جائے، ہندوستانی تجارتی جہازوں کا ایک بیڑہ تیار کیا جائے، اور ساحلی وسائل نقل وحمل اور ریلوے کو ایک دوسرے سے مربوط کیا جائے۔ لیکن ان مباحث پر ہم پہلے مفصل طور پر خیالات ظاہر کر چکے ہیں [1]۔

۲۹

(۲) داخلی تجارت ہندوستان میں امریکہ کے مثل لیکن سلطنت متحدہ کے برعکس، اپنی خارجی تجارت کے مقابلے میں اپنی داخلی تجارت کو زیادہ اہمیت ہے۔ یہ بات ہندوستان کے رقبے کی وسعت، اس کی آبادی کی کثرت، اس کے طبیعی وموسمی حالات کے تنوع و اختلاف اور قدرتی ذرائع کی گوناگونی اور بہتات پر نظر کرتے ہوئے تعجب خیز نہیں ہے۔ موجودہ زمانے میں ذرائع آمد ورفت اور وسائل نقل وحمل کی اصلاح و ترقی کی بدولت داخلی تجارت کی مقدار بہت بڑھ گئی ہے، اور عام معاشی ترقی اور انتظام کی اصلاح، شہر اور دیہات کے درمیان مبادلے کی وسعت کو بڑھا کر اس تجارت کو اور بھی زیادہ فروغ دیگی۔

ہندوستان کی داخلی تجارت کی عظیم اہمیت کا ناکافی طور پر اندازہ کیا جاتا ہے۔ کپاس، سن، چاول، گیہوں، روغن دار تخموں وغیرہ کی برآمد کے متعلق بڑے بڑے اعداد، ہندوستان کی مجموعی پیداوار کے صرف ایک قلیل جزو کی نمایندگی کرتے ہیں چنانچہ مجموعی پیداوار کا کچھ حال پہلے بیان ہو چکا ہے۔ لیکن اتنا یقیناً صحیح ہے کہ برآمد کے بعد پیداوار کا جو حصہ ملک کے اندر رہ جاتا ہے وہ سب کا سب فروخت کے لئے نہیں پیش کیا جاتا۔ بلکہ اس کے ایک جزو کو پیداوار تیار کرنے والے خود ہی صرف کرتے ہیں۔ چنانچہ ملکی کاشتکار جو غذائی اشیا پیدا کرتے ہیں ان کا بڑا حصہ ۲۸۵ ن

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ:۔ کتاب موسوم بہ "بحر ہند کی تجارت" صفحہ ۹، تا صفحہ ۸۵۔

[1] دیکھو باب (۵)۔

اپنے ذاتی استعمال میں لاتے ہیں۔ ہندوستان کے لئے اس کی داخلی تجارت جو عظیم اہمیت رکھتی ہے وہ اس امر پر غور کرنے سے بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ "اگر ہندوستان کی مجموعی زرعی پیداوار کو محسوب کیا جائے تو حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ برآمد کے لئے غلہ، روغن دار تخم، ریشے، چائے وغیرہ جیسی اشیا پیدا کرنے والی ہر ایک ایکڑ زمین کے مقابل ۱۱ ایکڑ زمین ملک کی داخلی ضرورتوں کے لئے کاشت کی جاتی ہے"[1] اس زرعی پیداوار میں جو داخلی صرف کے لئے ملک کے اندر رہ جاتی ہے، معدنی پیداوار اور مصنوعات جیسی غیر زرعی پیداوار کا بھی اضافہ کرنا چاہئے جس کا صرف ایک قلیل جزء برآمد کیا جاتا ہے۔

ملک کی داخلی تجارت کی مقدار اور مالیت کے متعلق صحیح اور بھروسے کے قابل اعداد و شمار دستیاب نہیں ہوتے۔ ساحلی تجارت کے بیشتر حصے کو جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ملک کی داخلی یا بین صوبہ جاتی تجارت کا جزء خیال کیا جا سکتا ہے۔ اور اس جزء کی حد تک زیادہ اطمینان بخش مواد دستیاب ہوتا ہے لیکن خالص داخلی تجارت کی حد تک چند سالوں تک ریلوے کے ذریعے سامان کی نقل و حمل کے اعداد کے سوا کوئی اور معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔ ۱۹۲۳ء تک مرکزی محکمہ اعداد و شمار ایک رپورٹ بنام "ہندوستان کی داخلی تجارت (بذریعہ ریل و دریا)" شائع کیا کرتا تھا، اور سب صوبے بھی اس قسم کی مطبوعات شائع کرتے تھے۔ ان رپورٹوں میں ان پانچ یا چھے حلقوں میں سے ہر ایک کی اہم اشیا کی برآمدی و درآمدی تجارت کے اعداد درج کئے جاتے تھے جن میں صوبے منقسم تھے۔ علاوہ ازیں بحیثیت مجموعی ہندوستان کو ۱۸ بڑے تجارتی حلقوں میں تقسیم کرکے ان کی درآمد و برآمد کے اعداد درج کئے جاتے تھے لیکن

---

[1] دیکھو ورس وک کی کتاب موسوم بہ "سلطنت برطانیہ کے معاشی ذرائع" صفحہ ۱۴۵۔

Economic Resources of the British Empire

یہ سب اعداد صرف مقدار کے متعلق ہوتے تھے، اور مالیت کے اعداد صرف چند ہی صورتوں میں دیئے جاتے تھے اور وہ بھی مسلمہ طور پر تخمینی ہوتے تھے۔ داخلی تجارت کے اعداد دوسرے اعتباروں سے بھی ناقص ہوتے تھے۔ ایک ہی حلقے کے اندر جو تجارت ہوتی تھی اس کا اندراج نہیں کیا جاتا تھا؛ ریلوں کے ذریعے سے جو سامان بھیجا جاتا تھا اس میں بھی کچھ نظروں سے بچ کر نکل جاتا تھا؛ اور سڑکوں کے ذریعے سے جو تجارت ہوتی تھی اس کو محسوب ہی نہیں کیا جاتا تھا حالانکہ اس کی مقدار بہت خاصی ہوتی تھی[1]۔ بہرحال ان نقائص کے باوجود یہ اعداد و شمار تھوڑے بہت کارآمد تھے۔ لیکن بدقسمتی سے تخفیف مصارف کی کمیٹی کی سفارش کی بنا پر ۱۹۲۳ء میں مرکزی محکمے کی رپورٹ (موسوم بہ "ہندوستان کی داخلی تجارت بذریعۂ ریل و دریا") اور بجز ایک یا دو صوبوں کے باقی سب صوبوں کی سالانہ رپورٹوں کی اشاعت موقوف ہوگئی۔ معاشی تحقیقاتی کمیٹی نے بجا طور پر اس بات پر زور دیا کہ داخلی تجارت کے متعلق اعداد و شمار شایع کئے جائیں اور ان میں اصلاح و ترمیم کی جائے تاکہ وہ ان جدید وضع کے گوشواروں کے ہم پلہ ہوجائیں جو ریاستہائے متحدہ جیسے ملکوں کی طرف سے شائع کئے جاتے ہیں۔ یہ امر اطمینان بخش ہے کہ حکومت ہند نے اپریل ۱۹۳۳ء سے ان اعداد و شمار کی از سر نو اشاعت شروع کر دی ہے، اور ایک ماہانہ رپورٹ بنام "ہندوستان کی داخلی تجارت بذریعۂ ریل و دریا کی کیفیت" شایع کر رہی ہے۔ اس میں ہر مہینے ہندوستان کی داخلی تجارت کی مختصر کیفیت اور اس کے ساتھ سرکاری سال کے شروع سے سرسری میزانیں دی جاتی ہیں۔ محکمۂ معلومات تجارت و اعداد و شمار یہ نیا سلسلہ شایع کرتا ہے جس میں قدیم رپورٹ کی اساسی خصوصیات باقی ہیں۔ اس میں اعداد و شمار اس داخلی تجارت کے متعلق دیئے جاتے ہیں جس کی نقل و حمل ریلوے اور اسٹیمر کے ذریعے ہوتی ہے اور بحیثیت مجموعی صوبے یا اہم بندرگاہ یا بندرگاہوں کی درآمدی و برآمدی ۲۸۶

[1] ملاحظہ ہو "معاشی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ" صفحہ ۱۴۔

تجارت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اہم بندرگاہ یا بندرگاہوں کی تجارت اس صوبے کی تجارت سے الگ درج کیجاتی ہے جس میں یہ بندرگاہ یا بندرگاہیں واقع ہوں اس طرح اس مد کے تحت جو تجارت ہوتی ہے وہ حسب ذیل عنوانوں میں سے کسی میں درج ہوتی ہے:۔ (۱) ایک صوبے کی تجارت دوسرے صوبے سے؛ (۲) اہم بندرگاہ کی تجارت اس صوبے سے جس میں یہ بندرگاہ واقع ہو؛ (۳) اہم بندرگاہوں کی تجارت دوسرے صوبوں سے۔ ایک ہی صوبے یا اہم حلقے کے اندر ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن تک جو سامان منتقل کیا جاتا ہے وہ اس مد کی غرض کے لئے درج نہیں کیا جاتا۔ ان اعداد و شمار کو درج رجسٹر کرنے کی غرض سے ملک کو حسب ذیل اہم حلقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:۔ (۱) برطانوی ہند کی نمایندگی کرنے والے ۹ حلقے؛ (۲) اہم بندرگاہوں کی نمایندگی کے لئے ۴ حلقے یعنی کلکتہ، بمبئی، مدراس اور کراچی؛ اور (۳) ہندوستانی دیسی ریاستوں کے لئے ۵ حلقے۔ ریل کے ذریعے جتنی تجارت کی نقل و حمل کی جاتی ہے اس کو برما میں درج رجسٹر نہیں کیا جاتا۔ اعداد و شمار صرف مقداروں اور اقسام اشیا کے متعلق ہوتے ہیں۔ اور مالیت و قیمت کے اعداد نہیں دئیے جاتے[۱] صحیح وزن ۸۲½ پاونڈ فی معیاری من کے حساب سے دیئے گئے ہیں۔ اس طرح جدید سلسلے کے

[۱]۔ چونکہ ریلوے اور اسٹیمر کے بیجکوں میں مقدار کے اعداد بتلائے جاتے ہیں اس لئے مذکورۂ بالا حساب کے اعداد و شمار صرف مقداروں کے متعلق ہیں۔ ملک کے مختلف حصوں میں ایک ہی شئے کی قیمت مختلف ہونے کی وجہ سے مالیت کے متعلق معیاری اعداد کا مرتب کرنا ممکن نہیں ہے، اور گزشتہ تجربہ بتلاتا ہے کہ خواہ کسی بنیاد پر قیمتیں مشخص کی جائیں یہ اکثر صورتوں میں حقیقت سے بہت ہی بہم قربت رکھتی ہیں۔ اس لحاظ سے متعلقہ صوبوں کا صحیح اور حقیقی توازن تجارت مرتب کرنے کے لئے ان قیمتوں سے عام طور پر بنیاد کے طور پر کام نہ لینا چاہئے۔ دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ ہندوستان کی داخلی تجارت بذریعۂ ریل و دریا کے متعلق حسابات شائع شدہ مارچ ۱۹۳۷ء صفحہ ۱ تا ۲۔

اعداد میں بھی وہی نقائص ہیں جو فی ہیم رپورٹ میں پائے جاتے تھے۔
صفحہ ۲۸۸ پر مندرجہ جدول میں یہ بتلایا گیا ہے کہ یکم اپریل ۱۹۳۶ء تا ۳۱/ مارچ ۱۹۳۷ء کے بارہ مہینوں میں ہر صوبے، دیسی ریاست اور اہم بندرگاہ کے درمیان ہر قسم کی اشیا کی تجارت من کے حساب سے کتنی مقدار میں ہوئی[1]

داخلی تجارت کے متعلق مکمل اور بھروسے کے قابل اعداد موجود نہ ہونے کی ۲۸۷
وجہ سے اس ملک کی تجارت خارجہ کے مقابلے میں تجارت داخلہ کی وسعت اور اضافی اہمیت کے بارے میں کوئی صحیح رائے نہیں قائم کیجا سکتی۔ ہندوستان کی داخلی تجارت برائے ۱۹۲۰ء-۲۱ نامی رپورٹ کے بموجب داخلی تجارت کی مالیت تقریباً ۱۵۰۰ کروڑ روپے تھی، اس طرح تجارت داخلہ اور تجارت خارجہ کا باہمی تناسب ۲½ : ۱ ہوتا ہے[2] بہرحال جو اعداد دستیاب ہوتے ہیں ان سے یہ بات غیر مشتبہ طور پر ثابت ہوتی ہے کہ ملک کی وسعت اور آبادی کے مقابلے میں داخلی تجارت کا تناسب بہت ہی ادنیٰ ہے۔ اگر ملک کے معاشی ذرائع کو زیادہ مکمل طور پر نشوونما دی جائے تو داخلی تجارت کی مقدار، موجودہ حالت کے مقابلے میں لازمی طور پر کئی گنا بڑھ جائے گی۔ خارجی تجارت کی غیر یقینی نوعیت اور ہندوستان کی برآمدی تجارت میں خاصی کمی رونما ہونے کے مدنظر یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کی داخلی تجارت کو باقاعدہ طور پر ترقی دینے کی پالیسی پر عمل کیا جائے۔ ہماری خارجی تجارت کا احیا، داخلی تجارت کے حق میں یقیناً محرک کا کام کریگا۔

[1] ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں اہم اشیا کی حد تک داخلی تجارت کی مجموعی مقدار ۶۲۸۴۶۴ ہزار من تھی، لیکن ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء میں یہ بڑھ کر ۷۳۶۸۳۹ ہزار من ہوگئی یا ۱۷ فی صد اضافہ ہوا۔ اس کو ملک کی جزوی معاشی بحالی کی علامت خیال کیا جا سکتا ہے۔

[2] کے۔ ٹی۔ شاہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ یہ اندازہ حقیقت سے کم ہے اور وہ اس کا تخمینہ ۲۵۰۰ کروڑ روپے کرتے ہیں۔ دیکھو ان کی کتاب موسوم بہ "تجارت، محصول اور نقل وحمل" صفحہ ۱۲۲۔

لیکن مناسب یہ ہوگا کہ داخلی تجارت کو اس امر کا لحاظ کئے بغیر ترقی دیجائے کہ تجارت خارجہ سے اس کا کیا تعلق ہے۔

۳۰۔ ہندوستان کے بڑے تجارتی مرکز[۱]

اب ہندوستان کے بڑے بڑے تجارتی مرکزوں کا حال مختصر طور پر بیان کرتے اور اس کے بعد تجارتی معلومات اور تجارتی نظامات کے بارے میں چند لفظ لکھکر اس باب کو ختم کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے تجارتی مرکزوں کے بیان میں یہ مناسب ہوگا کہ اولاً ہندوستان کی ۴ اہم بندرگاہوں یعنی کلکتہ، بمبئی، کراچی اور مدراس کا ذکر کردیا جائے۔ کلکتہ اور بمبئی نہ صرف اہم بندرگاہ ہیں بلکہ ہندوستان کے اہم ترین صنعتی مرکز بھی ہیں۔ علاوہ ازیں بمبئی، سوتی کپڑوں کی بہت بڑی درآمدی تجارت کے لئے مغربی ہندوستان کا سب سے بڑا تقسیمی مرکز ہے۔ کلکتے کے برعکس بمبئی میں تجارت کا بڑا اور غالب حصہ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے اور کلکتے میں زیادہ تر یوروپین لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ کراچی گیہوں کی تجارت کا مرکز ہے۔ مدراس بھی ایک بڑا تجارتی اور صنعتی مرکز ہے، لیکن بمبئی یا کلکتے کے مقابلے میں اس کی اہمیت کم ہے۔ ان چار بڑی بندرگاہوں[۲] کے علاوہ دوسرے تجارتی مرکز کانپور، دہلی، احمد آباد، امرتسر، آگرہ، لاہور، بنارس، لکھنؤ، ناگپور وغیرہ ہیں۔ کانپور، صوبۂ متحدہ کا ایک اہم ریلوے جنکشن ہے اور بمبئی اور کلکتے کے ٹھیک درمیان واقع ہونے کی وجہ سے مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ غیر ملکی اور ملکی اشیا کا ایک موزوں تقسیمی مرکز ہے۔ دہلی،

---

[۱] ملاحظہ ہو کائن کی کتاب موسوم بہ Handbook of Commercial Information for India. تیسرا ایڈیشن صفحہ ۶۲ تا صفحہ ۱۱۳؛ نیز کتاب ہذا جلد اول باب (۲)۔

[۲] ان اہم بندرگاہوں کے علاوہ کاٹھیاوار کی بعض بندرگاہیں بھی تھوڑی بہت اہمیت رکھتی ہیں مثلاً ریاست ناونگر میں بیڈی، ریاست بڑودے میں اوکھا؛ پوربندر اور بھاونگر۔

آج کل ہندوستان کا پایۂ تخت اور نور ریلوے لائینوں کا جنکشن ہے ۔

ہندوستان کی داخلی تجارت (بذریعہ ریلوے و دریا) بابتہ سنہ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء

۲۸۸ص

اشیا	من	اشیا	من
ہڈی ۔	۴۶۷,۰۷۲۳	(۳) ہندوستانی کپڑے گٹھوں میں ۔	۹,۱۳۹,۹۲۱
سمنٹ ۔	۱۹,۹۴۸,۲۷۵		
کوئلہ اور کوک ۔	۳۹۷,۸۱۶,۶۸۰	(۴) ہندوستانی کپڑے ڈبوں میں	۲۲۰,۲۳۹
قہوہ ۔	۲۱۰,۹۸۵		
خام کپاس:۔			
(۱) کپاس	۵۳۷,۵۲۹	میزان	۱۰,۵۲۰,۹۸۰
(۲) تیار گانٹھیں	۲۸,۶۶۹,۵۹۵		
		رنگ کھال رنگنے کا مسالہ اور ہڑ	۱,۶۲۲,۷۸۹
میزان خام کپاس	۲۹,۲۰۷,۱۲۴		
		خشک میوہ	۱۰,۰۶۴,۵۵۴
سوتی دھاگہ اور سوت:۔		شیشہ	۹۶۹,۸۲۷
		غلہ اور دال	
(۱) غیر ملکی	۲۷۰,۹۸۰	(۱) دھان	۷,۱۱۷,۲۵۰
(۲) ہندوستانی	۲,۶۸۲,۲۴۰	(۲) چاول	۴۲,۹۸۰,۸۸۷
میزان	۲,۹۵۳,۲۲۰	(۳) گیہوں	۲۸,۱۰۸,۵۹۷
		(۴) گیہوں کا آٹا	۵,۹۱۵,۰۲۹
سوتی کپڑے:۔		(۵) دوسری قسمیں	۴۵,۱۱۱,۰۳۷
(۱) غیر ملکی کپڑے گٹھوں میں	۶۴۳,۳۵۸		
(۲) غیر ملکی کپڑے ڈبوں میں	۵۱۷,۴۶۲	میزان غلہ اور دال	۱۲۹,۲۳۲,۸۰۰

اشیا	من	اشیا	من
ہندوستانی سن اور دوسرے ریشے (سن کو خارج کرکے)	۱۷۴۵۸۱۲	(۲) نباتی نیل	۴۵۵۱۹۷۱
خام چمڑے	۱۹۹۶۲۲۳	میزان	۲۰۱۵۵۹۲۱
خام کھالیں	۱۱۶۰۴۳۳		
دباغت کردہ چمڑے اور کھالیں اور چرم	۵۸۶۸۲۳	روغندار تخم:-	
		(۱) ارنڈی	۱۶۹۷۷۰۶
خام سن:-		(۲) بنولہ	۸۹۶۴۴۸۲
(۱) کھلا ہوا سن	۱۲۸۶۸۳۴	(۳) مونگ پھلی	۱۶۵۷۲۰۶۹
(۲) پختہ گانٹھ	۳۶۹۳۸۳۹۰	(۴) السی	۶۰۴۴۹۴۸
		(۵) رائی اور سرسوں	۷۱۴۸۲۲۲
میزان	۳۸۲۲۵۲۲۴	(۶) تل	۲۳۴۷۰۲۱
ٹاٹ اور ٹاٹ کے تھیلے	۵۱۵۱۹۸۲	میزان	۴۳۷۷۴۴۴۸
آہنی و فولادی سلاخ، چادریں، شہتیر اور لوہے اور فولاد کی دوسری تجارتی اشیا	۳۹۳۱۷۲۸۸	گھی	۶۹۲۲۳۶
		نمک	۳۰،۰۰۱،۸۵۴
		شورا	۵۰۹،۸۶۳
لاکھ اور چپڑا	۱۲۴۵۶۰۷	شکر:-	
مینگنیز کی کچی دھات	۲۱۲۱۳۳۷۴	(۱) صاف شکر اور غیر صاف شدہ شکر	۲۴،۹۸۷،۶۵۹
ابرک	۲۵۹۹۸۶		
کھلی	۸۴۰۰۶۷۸	(۲) گڑ، راب اور دیسی شکر وغیرہ	۱۵،۴۰۰،۳۱۰
تیل:-			
(۱) مٹی کا تیل	۱۵۶۰۳۹۵۰	میزان	۴۰،۳۸۷،۹۶۹

اشیا	من	اشیا	من
چائے	۴۶۲۶۴۳۶۸	(۲) دوسری لکڑی	۱۲۹۹۰۰۸۴
خام تمباکو	۳۲۹۵۹۳۶	میزان	۱۵۰۸۸۹۱۹
لکڑی اور چوبینہ			
(۱) ساگوان	۲۰۹۸۸۳۵	خام اون	۷۷۰۴۲۶

۴۸۹ علاوہ ازیں صوبۂ متحدہ کے مغربی حصے اور پنجاب کے لئے، خاصکر سوتی، اونی اور ریشمی کپڑوں کی حد تک دہلی ایک اہم تجارتی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ بمبئی پریسیڈنسی میں شہر بمبئی کے بعد احمد آباد اہم ترین مرکز ہے۔ پنجاب میں امرتسر نہ صرف کپڑے کے تھانوں کی حد تک مکرر برآمد کی تجارت کا بڑا مرکز ہے بلکہ کھالوں اور چرسے کا بھی بڑا کاروبار کرتا ہے، اور اس کی قالین بافی کی صنعت بہت مشہور ہے۔ آگرے میں قالین، دری، پتھر اور زردوزی کے کاموں کے کارخانے بکثرت ہیں، اور اس کے علاوہ آگرہ اعلیٰ درجے کے چرسوں کو جمع کرنے کا مرکز ہے۔ لاہور پنجاب کی زرعی پیداوار کا اہم تجارتی مرکز ہے۔ بنارس زیادہ تر اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ وہ صنعت ریشم بافی کا اہم مرکز ہے۔ لکھنؤ اودھ کی وافر زرعی پیداوار کو جمع اور تقسیم کرنے کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ ناگپور کو اس کی پارچہ بافی کی گرنیوں، روئی اوٹنے اور دبانے کے کارخانوں اور اطراف واکناف کی وسیع منگنیز کی کانوں کی بدولت تجارتی اہمیت حاصل ہے۔ ان تجارتی مرکزوں کے علاوہ دوسرے شہروں مثلاً جبل پور، مرزا پور، مدورا، گوالیار، ڈھاکہ، مانڈلے، سرینگر، شولاپور، امراوتی، حیدرآباد (دکن) الہ آباد، جے پور، بڑودہ، بنگلور اور میسور کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۱۳۔ تجارتی معلومات اور انتظام تجارت مہذب ملکوں میں صنعت و تجارت میں بین قومی مسابقت کے مدنظر حکومتوں کے لئے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ

تجارتی وصنعتی معلومات کو جمع کریں، احتیاط کے ساتھ تحلیل کریں اور سوچ سمجھ کر شایع کریں چنانچہ جرمنی، جاپان اور ریاستہائے متحدہ جیسے ملکوں کی خوشحالی کا باعث بہت بڑی حد تک یہی ہے کہ ان کے پاس تجارتی معلومات کا نظام بہت اچھا ہے۔ غیر ممالک میں نظماء تجارت اور قونصل مقرر کئے جاتے ہیں اور ان کے ذمے سب سے اہم کام یہی ہوتا ہے کہ اپنے متعلقہ ملکوں کو غیر ملکی بازاروں کے بارے میں معلومات مہیا کریں۔ ان سب اعتباروں سے ہندوستان بہت ہی ناکافی لوازمات رکھتا ہے۔ گو یہاں محکمۂ معلومات تجارت بہت مدت پہلے ۱۹۰۵ء میں قائم ہوا، لیکن صنعتی کمیشن کے سامنے یہ شہادت پیش کی گئی کہ کوئی واضح اور قطعی وسیلہ ایسا موجود نہ تھا کہ اس کے ذریعے سے حکومت ان معلومات کو جو تجارتی معاملات کے بارے میں اس کے قبضے میں تھیں عوام یا انفرادی درخواست گزاروں تک پہنچا سکتی[1] صنعتی کمیشن نے اس سلسلے میں کئی مفید سفارشیں پیش کیں، جن کے منجملہ ایک یہ تھی کہ مشرقی افریقہ اور اعراق جیسے غیر ملکوں میں ہندوستانی تجارتی ایجنٹ مقرر کئے جائیں۔ موجودہ زمانے کی صورت حال پچھلے چند سالوں کے مقابلے میں کسی قدر زیادہ اطمینان بخش ہے۔ ۱۹۲۲ء میں محکمۂ معلومات تجارت و اعداد شمار کو از سر نو منظم کیا گیا اور وہ اب تاجروں کے عام طبقے اور حکومت ہند کے درمیان ربط قائم کرنے والی کڑی بن گیا ہے۔
ص ۲۹۰ یہ محکمہ سمندر پار کی تجارت سے تعلق رکھنے والی ان معلومات کو جمع کرتا ہے جو ہندوستانی فرموں کے لئے مفید ہو سکتی ہیں اور تجارت، صنعت وغیرہ کے متعلق کل ہند اہمیت کے اعداد و شمار مدون اور شائع کرتا ہے۔ اس محکمے کی طرف سے تجارت کے متعلق استفساروں کا جواب دیا جاتا ہے، تجارتی فرموں کا تعارف کرایا جاتا ہے اور ایک ہفتہ وار اخبار بنام "انڈین ٹریڈ جرنل" شائع کیا جاتا ہے جس میں مفید تجارتی اعداد و شمار اور دوسری

[1] ملاحظہ ہو صنعتی کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۱۸۰۔

معلومات درج ہوتی ہیں۔ محکمۂ مذکور ان تجارتی تحریکوں اور ترقیوں سے ربط قائم رکھتا ہے جو ہندوستان کے لئے مفید ہیں۔ انگلستان میں تجارت کی اشاعت وتشہیر کے جو مواقع رونما ہوتے ہیں ان سے ہندوستان کے مفاد کے لئے ہندوستانی ناظم تجارت مقیم لندن کے توسط سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور ۱۹۲۶ء سے ایک عہدہ دار اشاعت وتشہیر تجارت کا تقرر ہندوستانی ناظم تجارت مقیم لندن کے مددگار کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ اس تدبیر کی بدولت بعض مفید نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ محکمۂ تجارت معلومات واعداد و شمار ہندوستانی ناظم تجارت مقیم ہمبرگ سے بھی قریبی تعامل کرتا ہے۔ ان عہدہ داروں کے تقرر کے بعد سے یورپ کی بعض اہم نمائشوں اور میلوں میں ہندوستانی اشیا کے مظاہرے کے انتظامات کئے گئے ہیں[لہ] محکمۂ تجارتی معلومات' برطانوی نظمائے تجارت مقیم ہندوستان و نوآبادیات اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں مقرر کردہ قونسلوں اور سفیروں سے بھی اس غرض سے ربط قائم کئے ہوئے ہے کہ سمندر پار ملکوں میں ہندوستانی پیداوار اور مصنوعات کی مانگ کو ترقی دے۔ ہندوستانی ہائی کمشنر مقیم لندن کا عہدہ سنہ ۱۹۲۰ء میں قائم کیا گیا اور اس افسر سے بہت سے معاملات اور مالی کاروبار میں کام لیا جارہا ہے۔ اس کے ذمے کے کاموں میں اہم ترین حکومت ہند کے لئے اشیا کی خریداری ہے۔ متعدد کام کرنے کی وجہ سے وہ ہندوستان کے بیرونی تجارتی اغراض کو ترقی دینے کے لئے خود کو بہت زیادہ کارآمد ثابت نہیں کرسکتا۔ مذکورۂ بالا نظام کا زیادہ تر تعلق اس امر سے ہے کہ ہندوستانی بازاروں میں غیر ملکی اشیا کے امکانات کے بارے میں غیر ممالک کو معلومات مہیا کی جائیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی مساوی طور پر ضروری ہے کہ اس کے مثل ایک اور نظام قائم کیا جائے۔

لہ۔ دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "ہندوستان سنہ ۱۹۲۶ء-۲۷ میں" صفحہ ۲۰۹ یا "ہندوستان سنہ ۱۹۲۷ء-۲۸ میں" صفحہ ۲۰۸ تا ۲۰۹۔

جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ ہندوستانی اشیا کے لئے غیر ملکی بازاروں کے بارے میں ہندوستان کو معلومات مہیا کرے۔ اس سلسلے میں اس تجارتی وفد نے کچھ کام کیا ہے جو حکومت نے پارچے سے متعلق ٹیرف بورڈ (۱۹۲۶ء) کی سفارش پر باہر بھیجا تھا تاکہ وہ ہندوستانی پارچے کے لئے برآمد کے مواقع دریافت کرے[1]۔ اس تجارتی وفد نے اپنی رپورٹ میں یہ تجویز کیا کہ ہندوستان کی جانب سے تین تجارتی قونصل مقرر کئے جائیں جو سکندریہ، مومباسا اور ڈربن میں قیام کریں۔ ہندوستانی تجارتی ایجنسیوں اور آزاد ہندوستانی قونصل خانوں کا انتظام جیسا کہ خود اختیاری نوآبادیات کرتی ہیں اس اعتبار سے پوری طرح حق بجانب ہوگا کہ ان کی مدد سے غیر ملکوں کے ساتھ تجارتی تعلقات کو اس طور پر ترقی دیجا سکتی ہے کہ ہندوستان کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچے۔ حکومت ہند نے جنوری ۱۹۳۰ء میں ایک اسکیم مرتب کی جس کی
رو سے چھ شہروں یعنی میلان، نیویارک، ڈربن، مومباسا، ہیمبرگ اور اسکندریہ ۲۹۱
میں چھ نظمائے تجارت کو مقرر کرنا طے پایا۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں ایک ناظم تجارت ہیمبرگ میں مقرر کیا گیا۔ ۱۹۳۵ء میں اسی قسم کا تقرر میلان میں کیا گیا۔ ۱۹۳۷ء میں ہندوستان کے ایک ناظم تجارت کا دفتر جاپان میں بمقام اوساکا کھولا گیا۔ دسمبر ۱۹۳۷ء کے اختتام پر مشرقی افریقہ کے لئے بمقام مومباسا ایک ہندوستانی ناظم تجارت مقرر کرنے کا انتظام کیا گیا۔ جون ۱۹۳۸ء میں بمقام نیویارک نظامت تجارت کا دفتر کھولا گیا۔ اسکندریہ میں ناظم تجارت کے تقرر کا مسئلہ زیر غور ہے[2]۔

۱۔ دیکھو اس کتاب کا پچھلا حصہ صفحہ ۳۸، نیز ایک رپورٹ موسوم بہ ہندوستان ۱۹۲۸-۲۹ء میں صفحہ ۱۸۔

۲۔ دیکھو وائسرائے کا خطبہ جو انہوں نے اسوسیٹیڈ چیمبرس آف کامرس کے اجلاس منعقدہ ۲۰ر دسمبر ۱۹۳۷ء میں پڑھا۔

۳۲ ہندوستان میں تجارتی انتظام

ہندوستان کے اہم ترین اور بہترین طریق پر منتظم غیر سرکاری تجارتی نظامات یورپی تاجروں نے قائم کئے ہیں۔ مثلاً اسوشی ایٹیڈ چیمبرز آف کامرس آف انڈیا، ایوان تجارت کلکتہ (۱۸۳۴ء) ایوان تجارت بمبئی (۱۸۳۶ء) ایوان تجارت مدراس (۱۸۳۶ء) ایوان تجارت رنگون، ایوان تجارت کراچی۔ اسی قسم کے ایوان تجارت دوسرے اہم مرکزوں میں بھی قائم کئے گئے ہیں۔ ان کے ارکان کی غالب تعداد بجز بمبئی کے یورپین اشخاص کی ہے، اگرچہ ہندوستانی بھی ان کے رکن بن سکتے ہیں۔ یورپی تاجروں نے ہندوستان اور مغرب کے درمیان تجارتی تعلقات قائم کرنے کی ابتدا جو کوشش کی اسی کا یہ فطری نتیجہ ہے۔ ایوان ہائے تجارت کے علاوہ دوسری انجمنیں بھی ہیں جو تجارت کے خاص شعبوں، مثلاً سن کی گرنیوں اور سوتی کپڑے کی گرنیوں اور بڑے مرکزوں کے خردہ فروشوں کی نمایندگی کرتی ہیں۔ ہندوستان کے تجارتی طبقے نے اب تک اس لئے نقصان اٹھایا کہ اس کی کوئی منظم انجمن نہ تھی جس کے ذریعے سے وہ اپنی جائز شکایتوں کو دور کراتا، اور یہ اس زمانے کی ایک خوش آیند علامت ہے کہ ہندوستانی تاجر خود کو منظم کرنے کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔ اب کچھ خالص ہندوستانی انجمنیں بھی ہیں کہ مثلاً قومی ایوان تجارت بنگال[1] جو ۱۸۸۷ء میں قائم ہوا اور ہندوستانی تجارتی طبقے کا سب سے قدیم نظام ہے؛ دفتر و ایوان تاجران ہند بمبئی[2] جو ۱۹۰۷ء میں قائم ہوا؛ ایوان تجارت جنوبی ہند مدراس جو ۱۹۰۹ء میں قائم کیا گیا؛ ہندوستانی ایوان تجارت کلکتہ جو ۱۹۲۵ء میں قائم ہوا؛ اور مہاراشٹرا چیمبر آف کامرس جو ۱۹۲۷ء میں قائم ہوا۔ ان کے علاوہ ایک کل ہند وفاق ایوان ہائے تجارت وصنعت ہندوستان[3] بھی موجود ہے۔ ہندوستان میں تجارتی

---

[1] National Chamber of Commerce.

[2] Indian Merchants' Chamber and Bereau

[3] All-India Fedration of Indian Chambers of Commerce and Industry

خیالات کو ایک مرکز پر لاتے اور ملک کی تجارتی وصنعتی ترقی پر اثر ڈالنے والے مسائل کے متعلق حکومت کی رہنمائی کرنے کی غرض سے یہ سب نظامات بے حد مفید ثابت ہو سکتے ہیں[۲]۔

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ:۔ ہندوستان کے مختلف تجارتی ایوانوں اور انجمنوں کے متعلق ایک سبق آموز اور جامع بیان کے لئے ملاحظہ ہو کاٹن کی کتاب محولۂ بالا حصۂ چہارم۔

[۲] یہاں یہ کہہ دینا نامناسب نہ ہوگا کہ بعض اہم ایوان ہائے تجارت کو مرکزی وصوبائی مجالس قانون ساز میں اپنے نمایندے بھیجنے کا حق بھی دیا گیا ہے۔

۲۹۲

باب (۷)

زر اور مبادلہ

پہلا حصہ [1]

ہندوستانی زر برطانوی حکمرانی سے پیشتر [ا]

شہنشاہ اکبر کے زمانے سے شمالی ہندوستان میں طلائی مہر اور چاندی کا روپیہ بطور زر رائج ہوا اور ان میں سے ہر ایک کا وزن ۵ء۱۷۰ گرین ٹرائے تھا۔ ان کے درمیان کوئی قانونی تناسب تو مقرر نہیں کیا گیا تھا، البتہ سلطنت مغلیہ

[1] ۔ اس باب کا تعلق زر اور مبادلے کے اس نظام کی تاریخ سے رہے گا جو ۱۹۲۵ء میں ہلٹن ینگ کمیشن کے تقرر سے پیشتر تک ہندوستان میں پایا جاتا تھا۔ اس کے بعد کے باب میں اولاً ان مختلف اعتراضوں سے جو اس نظام پر کئے گئے ہیں اور دوسرے

کے تانبے کے سکے "دام" سے دونوں کا قانونی تناسب معین تھا[۱]۔ جنوبی ہند میں جہاں سلطنت مغلیہ کا کامل قبضہ کبھی نہیں ہوا۔ زیادہ تر سونے کا سکہ رائج تھا۔ ہندو راج میں سونے کے سکے کو عام طور پر ترجیح دیجاتی تھی اور مسلمانوں کا میلان زیادہ تر چاندی کے سکے کی طرف تھا۔ جب مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور اس کی باقیات پر بہت سی آزاد ریاستیں قائم ہوئیں تو ان میں سے اکثر نے اپنی آزادی کا اعلان اپنا خاص سکہ جاری کرکے کیا، اس لیے کہ سکے کا جاری کرنا بادشاہی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ سکوں کے قدیم نام عام طور پر برقرار رکھے گئے، پھر بھی ان کے وزن اور کھرے پن میں بہت کچھ فرق و تغیر ہوگیا۔ بعد میں چلکر جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے عنان حکومت سنبھالی تو وہ یہ دیکھکر پریشان ہوگئی کہ رائج الوقت زر انواع و اقسام کے طلائی و نقرئی سکوں پر مشتمل تھا چنانچہ اندازہ کیا گیا کہ قریب قریب ۹۹۴ چاندی یا سونے کے سکے مختلف وزن اور کھرے پن کے رائج تھے[۲]۔ لوگوں کے پاس جو سکے تھے ان کو آنکنے اور ان کی قیمت معلوم کرنے کے لئے اکثر پیشہ ور صرافوں سے کام لیا جاتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے محسوس کیا کہ زر کی اس بدنظمی کی حالت سے ان کے تجارتی کاروبار میں سخت رکاوٹ پیدا ہورہی تھی اس لئے ہندوستانی زر کی تنظیم کی خاطر اس نے اصلاحات کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ چنانچہ ان تجربوں کی کیفیت بیان کرنا اس باب کا موضوع ہے۔

۲۔ انیسویں صدی میں چار دور۔ انیسویں صدی کے ہندوستانی زر کی تاریخ کو چار دوروں میں تقسیم کرنا مناسب ہوگا[۳]۔

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ ہلٹن ینگ کمیشن کی تجویز کے مطابق اس نظام کی تنظیم جدید سے بحث کیجائیگی۔

[۱]۔ ملاحظہ ہو بی۔ آر۔ امبیڈکر کی کتاب موسوم بہ "روپے کا مسئلہ" صفحہ ۳۔

[۲]۔ ایچ۔ ڈی۔ میکلیوڈ کی کتاب موسوم بہ "ہندوستانی زر" صفحہ ۱۳ ملاحظہ ہو۔

[۳]۔ ملاحظہ ہو فنڈلے شراس کی کتاب موسوم بہ "ہندوستانی مالیہ و بنک کاری" صفحہ ۹۳۔

(۱) پہلا دور (۱۸۰۱ء تا ۱۸۳۵ء)۔ اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ کمپنی کے تمام مقبوضات کے لئے واحد معیار کے طور پر ایک ہی قسم کا روپیہ چلانے کی کوشش کی گئی۔

(۲) دوسرا دور (۱۸۳۵ء تا ۱۸۷۴ء)۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ ۲۹۳
ہے کہ اس میں سونے کا سکہ رائج کرنے کی کوشش کی گئی اور اس سلسلے میں کئی تجویزوں پر بحث ہوئی، لیکن اس بحث نے معیار طلا اور سونے کا سکہ جاری کرنے کے بارے میں کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچایا۔

(۳) تیسرا دور (۱۸۷۴ء تا ۱۸۹۳ء)۔ اس میں چاندی کی قیمت مسلسل گرتی گئی جس کی وجہ سے روپے کی قدر مبادلہ کم اور غیر مستحکم ہوگئی۔ اس دور میں بین الاقوامی دو فلزی طریق کے مطابق زر کی اصلاح کرنے کیلئے بہت کچھ ہلچل جاری رہی۔

(۴)۔ چوتھا دور (۱۸۹۳ء تا ۱۹۰۰ء)۔ اس میں خاص بات یہ ہوئی کہ ہندوستان کے سرکاری دار الضرب میں چاندی کی آزاد سکہ سازی موقوف کردی گئی اور اس کے بعد ہندوستانی زر کو معیار طلا سے منسلک کردیا گیا۔ یہ عمل ۱۸۹۹ء میں مکمل ہوا جبکہ برطانوی ساورن کو روپے کے ساتھ غیر محدود زر قانونی تسلیم کرلیا گیا اور ان دونوں کا باہمی قانونی تناسب ۱ : ۱۵ مقرر کیا گیا۔

اب ہم ان چاروں دوروں پر تفصیلی نظر ڈالیں گے۔

۳۔ پہلا دور (۱۸۰۱ء تا ۱۸۳۵ء)

ایسٹ انڈیا کمپنی نے زر کی عام بدنظمی کو دور کرنے کی جو پہلی کوشش کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سونے اور چاندی کے سکّے کمپنی کی مہر کے ساتھ ایک ہی وقت جاری کئے گئے اور ان دونوں سکوں کی قیمت کا تناسب، وزن، اور کھرا پن مقرر کردیا گیا۔ لیکن معلوم یہ ہوا کہ ان دونوں دھاتوں کی بازاری قدر کے تغیرات کے باعث دونوں کی قیمت کے باہمی تناسب کو برقرار رکھنا ناممکن تھا۔ حکومت کے مقررہ تناسب کے لحاظ سے سونے کی قدر کم ہوتی تھی اس لئے اس کی جگہ چاندی نے لے لی۔ اس زمانے میں لارڈ لیورپول کی

ایک تصنیف موسومہ Treatise on the Coins in the Realm "سلطنت کے سکے" انگلستان میں شائع ہوئی جس میں یہ اصول پیش کیا گیا تھا کہ صرف ایک ہی دھات معیاری اور غیر محدود زر قانونی ہونی چاہیئے۔ اسی کے ساتھ دوسری دھاتوں کے سکے بھی ڈھالے جا سکتے ہیں اور بازاری قدر کے لحاظ سے ان کو گردش میں رہنے دیا جا سکتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظما نے ہندوستانی زر کی خرابیوں کو دور کرنے کے خیال سے اور لارڈ لیورپول کی کتاب سے متاثر ہو کر چاندی کا انتخاب کیا تاکہ اس سے ہندوستان میں واحد معیار قدر کے طور پر کام لیا جائے۔ لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے ۱۸۰۶ء میں بنگال اور مدراس کی حکومتوں کے موسومہ مراسلے میں اس بات کا بہ نظر احتیاط ذکر کیا کہ جہاں کہیں سونا پیمانۂ قدر کی حیثیت سے رائج تھا اس کو ہٹانے کا وہ ارادہ نہ رکھتے تھے۔ کمپنی نے روپے اور طلائی مہر کی قیمت کے باہمی تناسب کو برقرار رکھنے کی کوشش کی لیکن اس صورت میں طلائی مہروں کی قدر کم ہوتی تھی چنانچہ وہ رواج سے غائب ہو گئیں۔ ۱۸۰۶ء کی نظما کی سفارش کے متعلق ہندوستان کے حکام کو اجازت دیگئی تھی کہ وہ ان سفارشوں کو اپنے حسب صوابدید مناسب وقت اور طریق پر عملی جامہ پہنائیں۔ اسی لئے ان پر فوراً عمل نہیں کیا گیا۔ بالآخر ۱۸۱۸ء میں مدراس پریزیڈنسی کے طلائی "پیگوڈا" کی بجائے چاندی کا روپیہ جس کا وزن ۱۸۰ گرین تھا اور جس میں $\frac{11}{12}$ حصے چاندی تھی جاری کیا گیا۔ مدراس میں پیگوڈا کی ٹکسال روک دی گئی۔ لیکن عوام کی سہولت کی خاطر یہ اعلان کیا گیا کہ سونے کے سکے جاری کئے جائیں گے اور تمام سرکاری دفاتر میں ان کا لین دین ایسی شرحوں ۲۹۴ ص
پر ہوگا جو اعلانات کے ذریعے وقتاً فوقتاً مقرر کی جائیں گی۔ چنانچہ ابتدائی شرح ۱:۱۵ اختیار کی گئی۔

اس اثنا میں ۱۸۲۳ء میں بمبئی کا روپیہ مدراس کے روپے کے بالکل مماثل کر دیا گیا، اور آخری کارروائی یہ کی گئی کہ ۱۸۳۵ء میں ہندوستانی روپیہ اپنی موجودہ شکل اور سائز میں جاری کیا گیا جو وزن اور کھرے پن کے لحاظ سے

بالکل ۱۸۱۸ء کے مدراس کے روپے کی طرح تھا۔ اس روپے کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تمام علاقوں میں لین دین کے لئے واحد زر قانونی قرار دیا گیا۔ روپے کی آزاد تسکیک کے لئے دارالضرب کھولے گئے اور ہندوستانی زر کے نظام نے دو فلزی طریق یا متوازی معیار کی بجائے جو اب تک رائج تھا چاندی کے یک فلزی طریق کی شکل اختیار کر لی۔ روپے میں جتنی چاندی ہوتی تھی اس کی قدر اور روپے کی قانونی قدر ایک ہی تھی۔ یہ قانون ۱۸۹۳ء تک نافذ رہا۔

۴۔ دوسرا دور ۱۸۳۵ء تا ۱۸۷۴ء

۱۸۳۵ء کے قانون نے مجاز گردانا کہ اگر عوام مطالبہ کریں تو طلائی مہریں اور پانچ روپے، دس روپے اور تیس روپے کے سونے کے سکے بازاری قدر کے لحاظ سے ڈھالے جائیں۔ ۱۸۴۱ء میں ایک اعلان جاری کیا گیا جس کی رو سے سرکاری خزانوں کو اس بات کا مجاز گردانا گیا کہ سرکاری مطالبات طلائی مہروں کی شکل میں ان کی قدر عرفی کے لحاظ سے یعنی ۱:۱۵ کی شرح سے قبول کریں۔ ۱۸۴۸ء اور ۱۸۴۹ء میں آسٹریلیا اور کیلی فورنیا میں سونے کی دریافت کی وجہ سے سونے کی قیمت چاندی کے حوالے سے گر گئی۔ لیکن ۱:۱۵ کے سرکاری تناسب کے لحاظ سے سونا اب بیش قدر ہو جاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اپنے سونے کے سکوں کے معاوضے میں بازار میں جتنی چاندی حاصل کر سکتے تھے اس سے زیادہ سرکاری شرح کے لحاظ سے وصول کر سکتے تھے اور اس موقع سے انھوں نے فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ سرکاری مطالبات کی ادائی روپے کی بجائے سونے کے سکوں کی شکل میں کی جانے لگی۔ اس چال نے حکومت کو سخت الجھن میں ڈال دیا۔ اس لئے لارڈ ڈلہوزی کی حکومت نے ۱۸۴۱ء کا اعلان منسوخ کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سونے کے سکے کا رواج موقوف ہو گیا۔ ان تدابیر کی وجہ سے زر کی قلت محسوس ہونے لگی جس کا اثر تجارت کے پھیلاؤ کے باعث خاص طور پر شدت سے محسوس کیا گیا۔ ۱۸۵۰ء کے بعد چاندی کی رسد طلب کے مقابلے میں

گھٹ گئی۔ علاوہ ازیں روپے بہت بڑی مقدار میں چلن سے نکال لیے جا رہے تھے اور سکے کے طور پر چلانے کے بجائے دوسری ضرورتوں میں استعمال کئے جا رہے تھے۔ گویا بقول کیسلز ایک طرف تو دار الضرب میں چاندی کو پگھلا کر صبر و تحمل اور دیدہ ریزی کے ساتھ روپے ڈھالے جا رہے تھے تو دوسری طرف عوام روپے کو گلا کر کڑا اور چوڑی بنا رہے تھے۔[1] زر کی کمی کی وجہ سے جو دباؤ پڑ رہا تھا اس کو دور کرنے کے لئے نہ تو کوئی قابل ذکر اعتباری ذرائع موجود تھے اور نہ بنک کاری ہی نے کوئی معقول ترقی کی تھی۔ ان حالات میں لوگوں نے ایک انوکھا چارہ کار اختیار کیا، جیسا کہ ایوان تجارت بمبئی نے حکومت کی موسومہ عرض داشت میں سونے کا سکہ جاری کرنے کی درخواست کرتے ہوئے تبلایا۔ ایوان نے لکھا تھا کہ "ملک کے باشندوں میں یہ میلان روز افزوں ہے کہ سونے کی اینٹوں کو بطور زر چلایا جائے اور یہ بھونڈی تدبیر انھوں نے موجودہ روپے صـ ۲۹۵
کی خرابیوں کو دور کرنے کی خاطر اختیار کی ہے۔ چنانچہ سونے کی اینٹیں جن پر بمبئی کے بنکوں کی مہر ثبت ہوتی ہے ملک کے اکثر حصوں میں بطور زر استعمال کی جا رہی ہیں"[2] امریکی روئی کے قحط کی وجہ سے ہندوستانی روئی برآمد کرنے والوں کو سونے میں من مانی قیمتیں وصول ہوئیں اور سونا بہت بڑی مقدار میں درآمد ہوا۔ اس بنا پر یہ مطالبہ کیا گیا کہ سونے کا سکہ جاری کیا جائے جس کی تینوں ایوان ہائے تجارت نے پرزور تائید کی۔ اس مطالبے کو اس لحاظ سے اور بھی زیادہ تقویت پہنچی کہ سونے کی قدر کی کمی کا جو اندیشہ کیا جا رہا تھا اس کو حقیقی تجربے نے بڑی حد تک غلط ثابت کر دیا۔ اس لئے حکومت ہند نے نومبر ۱۸۶۴ء

[1] ملاحظہ ہو امبیڈکر کی کتاب موسومہ بہ "روپے کا مسئلہ" The Problem of the Rupee صفحہ ۳۴۔

[2] ملاحظہ ہو امبیڈکر کی کتاب محولہ بالا صفحہ ۲۷۔

ہیں یہ اعلان جاری کیا کہ ساورن اور نصف ساورن سرکاری خزانوں پر علی الترتیب ۱۰ روپے اور ۵ روپے کی شرح سے لئے جائیں گے اور حکومت ہند بھی اپنے لینداروں کو حسب سہولت اور عندالمطالبہ ساورن اور نصف ساورن دیگی ۱۸۶۶ء میں ایوان تجارت کلکتہ نے سونے کا سکہ جاری کرنے پر دوبارہ زور دیا اور حکومت ہند نے ایک کمیشن موسومہ بہ مینس فیلڈ کمیشن کا تقرر کیا۔ یہ ان کمیٹیوں اور کمیشنوں میں سب سے پہلا کمیشن ہے جو وقتاً فوقتاً ہندوستانی زر کے مسئلے کے متعلق غور و فکر کرنے کے لئے مقرر کئے گئے اور جو ملک کے زر کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے متضاد تدابیر یکے بعد دیگرے پیش کرتے رہے۔ مینس فیلڈ کمیشن نے حسب ذیل سفارشیں پیش کیں:۔

(۱) ۱۵ روپے، ۱۰ روپے اور ۵ روپے کے سونے کے سکے جاری کئے جائیں، اس لئے کہ لوگ ان کو اسی قیمت کے نوٹوں پر ترجیح دیں گے اور سونے کے سکے کا چلن، کاغذی زر کی ترویج میں مدد دے گا۔

(۲) زر، سونے کے سکے، چاندی کے سکے اور کاغذی زر پر مشتمل ہونا چاہیئے۔ لیکن ایسے اسباب کی بنا پر جن کی کبھی صاف طور پر تشریح نہیں کی گئی مینس فیلڈ کمیشن کی رپورٹ کے بارے میں کوئی قطعی کارروائی نہیں کی گئی۔ ۱۸۶۸ء میں ایک اعلان جاری کیا گیا جس کی رو سے ساورن اور نصف ساورن علی الترتیب ۱۰ روپے اور ۵ روپے کی بجائے ۱۰ روپے ۸ آنے اور ۵ روپے ۴ آنے کے حساب سے قبول کرنا طے پایا، اس لئے کہ اول الذکر شرح بازاری شرح کے مطابق نہ تھی اور سرکاری خزانے میں سونے کو کھینچ کر لانے میں ناکام ہوئی تھی۔ حکومت نے مینس فیلڈ کمیشن کا صاف طور پر حوالہ دیے بغیر یہ تدابیر اختیار کیں اور یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ آخر میں چل کر سونے کے سکے کو زر قانونی بنا دیگی۔ لیکن نتائج کو مستقل قانونی شکل دینے اور طلائی زر قانونی کے اجرا کا خود کو قطعی پابند بنا لینے سے پیشتر حکومت اس بات کا اطمینان کر لینا چاہتی تھی کہ ہندوستان میں سونے اور

چاندی کی باہمی قدر کیا ہونی چاہیئے۔ سر رچرڈ ٹمپل نے ۱۸۷۲ء میں حکومت ہند کے ملاحظے میں ایک یادداشت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ ہندوستان کو طلائی معیار اور سونے کے سکے کی واقعی ضرورت تھی اور اس بات کا قطعی طور پر تصفیہ کرنے کے لئے کہ سونے اور چاندی کی قدر کا باہمی تناسب کیا رکھا جائے ایک کمیشن مقرر کرنا چاہئے لیکن چونکہ گورنر جنرل کی کونسل متفق الرائے نہ ہوئی اس لئے حکومت ہند نے اس تجویز کو نامنظور کیا۔ یہ فیصلہ ۱۸۷۴ء میں ہوا اور اسی کے ساتھ ہندوستان کے زر کی سرگزشت کا دوسرا دور ختم ہوا۔ ص ۲۹۶

۵۔ تیسرا دور ۱۸۷۴ء تا ۱۸۹۳ء

۱۸۷۴ء تک سکہ سازی کے نقطۂ نظر سے چاندی کی حیثیت میں بہت بڑا تغیر ہو گیا تھا۔ جرمنی نے ۱۸۷۳ء میں چاندی کا رواج سکے کی حیثیت سے موقوف کر دیا۔ سویڈن ڈنمارک اور ناروے نے بھی ۱۸۷۴ء میں یہی طریقہ اختیار کیا اور چاندی کی آزاد سکہ سازی کے لئے اپنے دار الضرب بند کر دیے۔ لاطینی اتحاد میں جو ملک شریک تھے ان کو بھی اسی صف میں شریک ہونا پڑا نتیجہ یہ ہوا کہ چاندی کی بہت بڑی مقدار رواج سے ہٹ کر بازار میں آ گئی۔ اس کے علاوہ چاندی کی نئی کانیں اور چاندی نکالنے کے جدید طریقے دریافت ہونے کی وجہ سے چاندی کی پیداوار میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ دوسری طرف سونے کی مانگ بڑھ رہی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ یورپ اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں سونا ہی واحد معیار بن گیا تھا اور تجارت میں عام طور پر توسیع ہوئی تھی۔ اس کے برعکس سونے کی رسد میں کمی ہو رہی تھی۔ سونے اور چاندی کی حیثیت باہمی تعلق کے لحاظ سے محض اشیا جیسی ہو گئی اس لئے کہ ان کو ملانے والی کوئی کڑی زر کی شکل میں موجود نہ تھی۔ کم قدر چاندی چاندی کا معیار رکھنے والے ملکوں میں بہت بڑی تعداد میں جانے لگی چنانچہ ہندوستان نے بھی چاندی کی پہلے سے کہیں زیادہ مقدار

درآمد کی جس کا بڑا حصہ روپے ڈھالنے کے لئے ہندوستانی ٹکسالوں نے حاصل کیا۔ ہندوستان میں قیمتوں کی سطح کے قطعی طور پر بڑھ جانے کے جو اسباب تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ روپے کی ڈھلائی کثیر مقدار میں ہوئی تھی۔ چنانچہ جیسا کہ آگے چلکر بیان کیا جائے گا قیمتوں کے اضافے کا یہ میلان سنہ ۱۹۰۱ء کے بعد بہت زیادہ نمایاں ہو گیا۔ چاندی کی قیمت سنہ ۱۸۷۵ء میں ۵۸ پنس فی اونس تھی۔ لیکن سنہ ۱۸۷۹ء میں ½۵۲ پنس فی اونس، سنہ ۱۸۸۸ء میں ۴۳ پنس فی اونس سنہ ۱۸۹۲ء میں ½۳۷ پنس فی اونس اور سنہ ۱۸۹۹ء میں ۲۷ پنس فی اونس تک گر گئی۔

چاندی کی قیمت کے اتار کے ساتھ روپے کی قدر مبادلہ ساورن کے حساب سے گھٹنی شروع ہو گئی۔ دوسرے الفاظ میں سونے کی مقررہ مقدار کے معاوضے میں روپیہ سستا ہو گیا۔ ایک روپے کے معاوضے میں سونے کی کم مقدار ملنے لگی۔ چنانچہ سنہ ۱۸۷۱ء میں ایک روپے کی شرح مبادلہ ۲ شلنگ تھی جو سنہ ۱۸۹۲ء میں ۱ شلنگ ۲ پنس تک گر گئی لیکن یہ بحث ذرا قبل از وقت ہے۔ لہذا اصلی بحث کی طرف رجوع کرتے ہوئے یہ بیان کر دینا مناسب ہو گا کہ ہندوستان میں زر کی اصلاح کے لئے جو ہلچل مچی اس کا رخ زیادہ تر اس بات کی طرف تھا کہ معیار طلا آخر کار اختیار کرنے کے خیال سے ٹکسالوں میں چاندی کی آزاد سکہ سازی موقوف کر دی جائے۔ ایوان تجارت بنگال اور انجمن تجارت کلکتہ نے سنہ ۱۸۷۶ء میں گورنر جنرل کے پاس ایک محضر روانہ کیا جس میں یہ درخواست کی گئی کہ ہندوستانی ٹکسالوں میں چاندی کی سکہ سازی کا لزوم عارضی طور پر موقوف کر دیا جائے۔ لیکن حکومت نے اس درخواست کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ اس سلسلے میں حکومت نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اس قسم کی کارروائی اس وقت تک اختیار نہیں کی جا سکتی جب تک کہ طلائی معیار بدل کے طور پر اختیار نہ کر لیا جائے اور طلائی معیار اس وجہ سے اختیار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ موجودہ حالات ناقابل اعتبار اور غیر یقینی تھے

جس کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ چاندی کی قیمت گری ہوئی تھی بلکہ یہ بھی کہ سونے کی قیمت بڑھ گئی تھی۔ لیکن ۱۸۷۸ء میں خود حکومت ہند نے وزیر ہند کے پاس یہ تحریک روانہ کی کہ طلائی معیار اور سونے کا سکہ جاری کرنے کے لئے قطعی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں اور اس اثنا میں ۲۴۷
ہندوستان کے عوام سے زائد اجرت تسکیک کی شکل میں روپے کی ڈھلائی کے مصارف بڑھا کر وصول کرنے چاہئیں تاکہ سونے کے سکے اور روپے کے درمیان کوئی قطعی تناسب قائم کیا جا سکے اور اس تناسب میں ضرورت کے لحاظ سے وقتاً فوقتاً تبدیلی کیجا سکے۔ وزیر ہند نے اس تجویز کو ایک کمیٹی میں رائے کے لئے بھیجا۔ کمیٹی نے کئی اسباب کی بنا پر تجویز کی مخالفت کی اور کسی قدر بزرگانہ شان سے یہ مشورہ دیا کہ "بہتر یہ ہے کہ چپکے بیٹھے رہو اور گھبراہٹ اور پریشانی میں کوئی ایسا ادھورا قانون وضع نہ کرو جس کے نتیجے کے متعلق کوئی پیش گوئی نہ کی جا سکتی ہو اور جس کے اثر کا کوئی اندازہ نہ کیا جا سکتا ہو" حکومت ہند نے بدرجۂ مجبوری طلائی معیار کے عوض بین قومی دو فلزی طریق کو پسند کیا اور ایسے زمانے میں جبکہ دنیا کی ہر قوم اس طریق سے دست بردار ہو رہی تھی وہ انتہائی عقیدتمندی کے ساتھ مدت دراز تک اس سے چمٹی رہی۔ ۱۸۶۷ء اور ۱۸۹۹ء کے درمیان کم و بیش ۴ بین قومی زر کی کانفرنسیں ہوئیں جن کو منعقد کرنے کا مقصد یہ تھا کہ یورپ کے مختلف ملکوں اور ریاستہائے متحدۂ امریکہ کے زر کی مشکلات کو دور کرنے کی تجاویز پیش کیجائیں۔ ہندوستان اول سے آخر تک بین قومی دو فلزی طریق کا حامی تھا جس کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ اس کو اس بات کا یقین تھا کہ اس طریق کا اختیار کرنا اس کے لئے خاص طور پر یوں فائدہ مند ہوگا کہ وہ چاندی کو دنیا کے زروں میں اس کی سابقہ حیثیت پر بحال کرنے میں مدد دے گا جس کی بدولت اس کو امید تھی کہ چاندی کی قیمت بڑھ جائے گی اور اس طرح ہندوستان کے راستے سے مبادلے کی مشکلات دور ہو جائیں گی۔ لیکن یہ تجویز

زیادہ تر اس لئے ناکام ہوئی کہ انگلستان اس کا مخالف تھا اور دوسری یورپی قومیں بھی جو انگلستان کی تقلید میں طلائی معیار اختیار کرنے کی آرزومند تھیں چاندی کے معیار والے ملکوں میں دو فلزی طریق کے رواج کو ناپسند کرتی تھیں۔ ان کو یہ خوف تھا کہ اگر چاندی کے معیار والے ملکوں میں دو فلزی طریق رائج ہوا تو سونے کی مانگ بڑھ جائے گی جس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ سونے کی قیمتیں بہت چڑھ جائیں گی اور یورپی ممالک جو اپنے زروں کو یک فلزی معیار طلائی کی مستحکم بنیاد پر قائم کرنے میں مصروف تھے، پریشانی میں مبتلا ہو جائیں گے۔

۶- چوتھا دور (۱۸۹۳ء تا ۱۹۰۰ء)

اس اثنا میں چاندی کی قیمت مسلسل گر رہی تھی اور ریاستہائے متحدہ کی حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ قانون شرمن کو جس کی رو سے حکومت مذکور پر سکہ سازی کی غرض سے سالانہ ۵۴ ملین اونس چاندی کی خریداری لازم تھی، منسوخ کر دیا جائے۔ ان دونوں چیزوں نے نہ صرف چاندی بلکہ ہندوستانی روپے کی حالت کو بھی ہمیشہ سے زیادہ اندیشناک بنا دیا۔ ان حالات میں حکومت ہند نے ۱۸۹۲ء میں وزیر ہند کے پاس مکرر یہ تحریک روانہ کی کہ اگر بین قومی زر کانفرنس جو اس وقت برسلز میں اپنے اجلاس کر رہی تھی بین قومی کارروائی کے حق میں کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر رہے تو ہندوستانی ٹکسالوں میں چاندی کی آزاد سکہ سازی اس خیال سے موقوف کر دی جائے کہ آخر کار طلائی معیار اختیار کیا جائے گا۔ نظر بریں ۱۸۹۲ء میں ہرشل کمیٹی بٹھائی گئی تاکہ حکومت ہند کی مذکورۂ بالا تجویز کی روشنی میں زر اور مبادلے کی صورت حال پر غور کرے۔ ہرشل کمیٹی کی نشست ابھی جاری ہی تھی کہ برسلز کانفرنس سخت ناکامی کے ساتھ برخاست ہو گئی۔ ہرشل کمیٹی کو اس وقت کے ہندوستانی نظام زر کے مندرجۂ ذیل اہم نقائص دور کرنے کے لئے تدابیر پیش کرنا تھیں:- (۱) چاندی کے یک فلزی

ص ۲۹۸

طریق کے رواج اور طلائی معیار والے ملکوں کے مقابلے میں شرح مبادلہ کے اتار کی وجہ سے حکومت ہند کی مالی مشکلات ؛ (ب) شرح مبادلہ کے گر جانے کی وجہ سے ہندوستان کے لوگوں اور اس کی تجارت پر مضر اثرات ؛ اور (ج) گری ہوئی شرح مبادلہ کی وجہ سے ہندوستان کے یورپی عہدہ داروں کی مشکلات ۔

(۲) **حکومت ہند کی مالی مشکلات**[1] ۔ حکومت ہند کو زیادہ تر اس وجہ سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا کہ اس کو اپنے ذمے کے واجبات یا مطالبات وطن سونے میں ادا کرنے کی غرض سے ہر سال بہت بڑی رقم انگلستان بھیجنی پڑتی تھی۔ روپے کی جو کچھ قیمت سونے میں قرار پاتی اسی سے ہندوستان پر اس مطالبے کے حقیقی بار کا تعین ہوتا تھا۔ یہ قیمت یا شرح مبادلہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ۱۸۷۳ء سے مسلسل گر رہی تھی اور آیندہ اور بھی گرنے کا اندیشہ تھا۔ سر ڈیوڈ باربر نے جو گورنر جنرل کی کونسل میں ۱۸۸۲ء سے ۱۸۹۳ء تک رکن مالیہ رہے ان مشکلات کو جن سے حکومت اس صورت حال کے باعث دوچار تھی حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے :۔

ہماری مشکلات کا فوری سبب جو سر دست اہم ترین سبب بنا ہوا ہے یہ ہے کہ چاندی کی قیمت سونے میں گر رہی ہے جس کی وجہ سے ہندوستان پر دو سال کے اندر ۴ کرور روپے سے زائد مصارف کا بار پڑا۔ اگر چاندی کی قیمت کے اتار کو روک دیا جائے اور ہندوستان اور انگلستان کے زروں کی شرح مبادلہ خواہ وہ موجودہ ادنیٰ سطح پر ہی کیوں نہ ہو مستقل طور پر مقرر کر دی جائے تو موجودہ گھاٹے سے نمٹنے میں بڑی آسانی ہوگی ہمارے آیندہ سال کے مالیے کا دار و مدار اولاً شرح مبادلہ پر اور دوسرے ان لوگوں پر ہے جو چاندی کی قیمت پر

---

[1] ۔ ملاحظہ ہو ہرشل کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۳ تا ۶ ۔

اثر ڈالنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اگر ہم ۱۵۹۵۱۰۰ روپے کے موجودہ گھاٹے کے لئے موازنے میں رقم شامل کریں اور شرح مبادلہ میں ایک پنی کی بیشی ہو تو ہمارے موازنے میں توفیر ہو جائے گی۔ اگر شرح مبادلہ میں ایک پنی کی کمی ہو تو موازنے میں ۳ کرور روپے سے زائد کا گھاٹا آئے گا۔ اگر ڈیڑھ کرور کا محصول لگایا جائے اور شرح مبادلہ میں خفیف سی کمی ہو تو محصول میں اتنی ہی مقدار کا اور اضافہ کرنا پڑے گا۔ اگر شرح میں ذرا سا اضافہ ہو جائے تو ممکن ہے کہ محصول لگانے کی ضرورت ہی نہ ہو۔

۸۔ (ب) ہندستان کے لوگوں پر شرح مبادلہ کے آثار کا اثر[1]

حکومت کے لئے ضروری تھا کہ اپنے ذمے کے واجبات بہ شکل اسٹرلنگ ادا کرنے کی غرض سے روپے کی بڑھی ہوئی تعداد مہیا کرتی جس کے یہ معنی تھے کہ محصول لگا کر یہ زائد روپیہ حاصل کیا جاتا۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں محصول کے بار کا مستقل طور پر بڑھ جانا لازمی نہ تھا اس لیے کہ ہوسکتا تھا کہ مرور زمانہ کے ساتھ ہندوستان میں چاندی کے حساب سے اشیا کی قیمتوں کا اضافہ محصول کے زائد بار کو متوازن کر دے اور اس طرح روپوں کی زیادہ تعداد پیداوار کی اسی مقررہ مقدار کو تعبیر کرے۔ ۲۹۹
ایسی حالت میں محصول کے بار کا واجبی پیمانہ پیداوار کی مقدار ہوگا نہ کہ پیداوار کی نمایندگی کرنے والے روپے کی تعداد۔ لیکن مکمل توازن یا مطابقت قائم ہونے کے لئے وقت لگنا ضروری ہے اور اس اثنا میں ہندوستانی رعیت کو پیداوار کی شکل میں زیادہ ادائی کرنی ہوگی۔ ہرشل کمیٹی نے یہ بتلانے کی کوشش کی کہ گو شرح مبادلہ کے گر جانے کی وجہ سے آخر کار باشندوں پر بحیثیت مجموعی زیادہ بار نہیں پڑے گا۔ پھر بھی یہ ممکن تھا کہ بار ایک جماعت سے دوسری جماعت پر منتقل ہو جائے۔ چنانچہ شرح مبادلہ کی کمی کی وجہ سے ان لوگوں کا بار ہلکا ہو گیا تھا جو دوامی

[1] ملاحظہ ہو ہرشل کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۳۲ تا ۳۴۔

بند وبست کے تحت مقررہ مالگزاری ادا کر رہے تھے۔ اسی طرح ان لوگوں کا بار بھی ہلکا ہو گیا جن کی مالگزاری عارضی بند وبست کے سلسلے میں دوبارہ مقرر نہیں ہوئی تھی۔ لیکن دوسری طرف نمک کا بڑھا ہوا محصول عوام پر بار ڈال رہا تھا اور ان لوگوں کے حق میں اور بھی بوجھل بن گیا تھا جو چاندی کی قیمت سونے میں گر جانے کی وجہ سے روپے کے حساب سے اشیا کی بڑھی ہوئی قیمتوں کا بار اٹھا رہے تھے۔

جو لوگ نقرئی معیار کو جاری رکھنے کے حق میں تھے یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ شرح مبادلہ کی کمی برآمد کے حق میں محرک تھی اور نظری طور پر درآمد کے لئے ناموافق ہونے کے باوجود ہندوستان کی درآمدی تجارت اس کمی سے حقیقی طور پر متاثر نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے کہ درآمدی اشیا کی قیمتیں سونے کے لحاظ سے گر گئی تھیں اور اس سے زیادہ تیزی سے گر رہی تھیں جتنی کہ روپے کی قیمت سونے میں گر رہی تھی اس طرح یورپ سے اشیا کی جو مقدار ہندوستان میں درآمد ہو رہی تھی اس کا اوسط ایک روپے اور ایک ساورن کے حساب سے ۱۸۷۲ء تا ۱۸۷۳ء کے مقابلے میں یقیناً کم نہ تھا۔ جیسا کہ کیمرر نے کہا ہے "ہرشل کمیٹی کی رپورٹ شایع ہونے سے قبل بیس سالہ مدت میں اشیا کی درآمدی و برآمدی تجارت کی حقیقی نشو و نما ایسی نہ تھی کہ اس کی بنا پر نقرئی معیار کو قصوروار ٹھیرانا حق بجانب ہوتا" [1]

اب رہا شرح مبادلہ کی کمی کا برآمد کے حق میں محرک ہونا تو ظاہر ہے کہ یہ ایک عارضی اور سرسری فائدہ ہے، اس لئے کہ یہ توقع نہیں کیجا سکتی کہ شرح مبادلہ غیر محدود طریقے پر گھٹتی رہے گی۔ علاوہ ازیں اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ شرح کی کمی برآمد کے حق میں محرک ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو کیمرر کی کتاب موسوم بہ "جدید اصلاحات زر" Modern Currency Reforms صفحہ ۲۷ و ۲۸۔

تو یہ بھی تو دیکھنا چاہیئے کہ اس کے مقابل میں وہ درآمد کی روک تھام کرتی ہے۔ مانا کہ ہندوستان درآمدی اشیا کی اتنی ہی مقدار حاصل کر رہا تھا جتنی کہ شرح مبادلہ کی کمی سے پیشتر اس کو وصول ہو رہی تھی تو اس کی وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ درآمدی اشیا کی قیمتیں سونے کے لحاظ سے کم ہو گئی تھیں۔ لیکن اگر ہندوستانی شرح مبادلہ کم نہ ہوئی ہوتی اور اس کے ساتھ ہی اشیا کی قیمتیں سونے کے لحاظ سے گری رہتیں تو ہندوستان کو درآمدی اشیا اس سے زیادہ مقدار میں وصول ہوتیں جتنی کہ حقیقت میں وصول ہوئیں۔

برآمد کی عارضی بیشی اور درآمد کی عارضی کمی کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو زر کے معیار کو بدستور رہنے دینے کے خلاف ایک اور اہم دلیل یہ تھی کہ ہندوستان کی مجموعی درآمدی اشیا کا کم و بیش ۷۴ فیصد طلائی معیار والے ملکوں سے اور صرف ۲۶ فیصد نقرئی معیار والے ملکوں سے آرہا تھا۔
اس طرح طلائی معیار والے ملکوں سے ہندوستان کے تجارتی و مالی ص۳۰۰
تعلقات گہرے ہو گئے تھے۔ لیکن روپے کی قیمت کے مستقل اتار کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہندوستان کی خارجی تجارت میں سخت الجھن پیدا ہو اور اس میں سٹے کا نقصان رساں عنصر داخل ہو جائے۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ روپے کی گری ہوئی قیمت ہندوستانی آجر کو عارضی فائدہ پہنچا رہی تھی تو یہ فائدہ مزدور کے نقصان سے حاصل ہو رہا تھا اس لئے کہ اجرتیں قیمتوں کے مقابلے میں ذرا دیر سے بڑھتی ہیں۔ اس طرح بحیثیت مجموعی ہندوستان کے فائدے کا لحاظ کرتے شرح مبادلہ کے مسلسل اتار کو اچھا نہیں کہا جا سکتا۔

حکومت نے محض اس امر کے مدنظر کہ سرکاری مالیے اور تجارتی طبقے کے لئے دشواریاں پیدا ہو گئی تھیں نقرئی معیار ترک کر کے طلائی معیار جاری کرنے کی کوشش کی۔ ایسی حالت میں حکومت پر شدید نکتہ چینی قابل اعتراض ہو گی۔ اس میں شک نہیں کہ دوسرا چارہ کار یہ تھا کہ درآمدی محصول جیسا کوئی محصول عائد کر کے جو عوام میں نامقبول نہ ہو آمدنی بڑھائی جاتی اور

سرکاری مصارف میں سختی کے ساتھ کاٹ چھانٹ کی جاتی جس کا اختیار کرنا حکومت کے لئے قطعاً محال نہ تھا۔ لیکن ایسی حالت میں جبکہ روپے کی قدر مبادلہ میں مسلسل تغیرات ہو رہے ہوں، لگاتار محصول لگانے اور کفایت شعاری سے کام لینے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ پیچیدگیاں غیر معمولی طور پر بڑھ جاتیں اور ناقابل اطمینان اور غیر یقینی حالات پیدا ہو جاتے۔ اس لحاظ سے اس امر کا اعادہ نامناسب نہ ہوگا کہ حکومت کی یہ آرزو کہ عدم تیقن اور بے اطمینانی کو دور کرنے کی خاطر نقرئی معیار کے عوض طلائی معیار اختیار کرے نہ صرف قدرتی بلکہ مستحسن بھی تھی۔

۹۔ شرح مبادلہ کا اتار اور غیر ملکی سرمایہ

شرح مبادلہ میں بھاری کمی کا اثر یہ ہوا کہ ہندوستان میں برطانوی اصل کا شغل بڑی حد تک رک گیا اور اسی کے ساتھ ملک کی ترقی بھی جس کا اس شغل اصل پر بڑی حد تک انحصار تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ لندن قرضے کا بازار ہے اور تمام لین دین سونے میں کرتا ہے۔ برطانوی اصل کے ہندوستان آنے میں دو باتوں نے سخت مزاحمت پیدا کی۔ ایک تو یہ کہ شغل اصل پر مقررہ سود ملنے کا اطمینان نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ مصروف اصل کو یہاں سے انگلستان منتقل کرنا ہو تو اس کی مقدار کم ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ بیرونی فرموں کو ہندوستان میں اپنا کاروبار چلانے کے لئے یورپی ملازموں کی ضرورت تھی لیکن شرح مبادلہ کے اتار نے ان کی خدمات حاصل کرنے میں بھی دشواری پیدا کر دی۔ غیر ملکی اصل کو ہندوستان آنے کی ترغیب دینا مشکل ہو گیا جس کی وجہ سے ہندوستان کی مقامی جماعتوں کے مالیے پر بھی مضر اثر پڑا۔

۱۰۔ (ج) یورپی عہدہ داروں کی حالت

حکومت ہند کو ان مشکلات کا بھی سامنا کرنا تھا جو اس کے عہدہ داروں کو پیش آ رہی تھیں۔ انھوں نے یہ مطالبہ شروع کیا کہ انھیں اس نقصان کا معاوضہ دیا جائے جو وہ شرح مبادلہ کے اتار کی وجہ سے اٹھا رہے تھے۔

ان کو تنخواہ روپے میں ملتی تھی اور اپنے اہل و عیال کی پرورش اور اپنے بچوں کی تعلیم کے اخراجات انگلستان کو اسٹرلنگ کی ایک مقررہ رقم میں بھیجنے پڑتے تھے جس کے لئے ان کی آمدنی کا پہلے سے بہت زیادہ حصہ خرچ ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ سے ان میں سخت بے اطمینانی پیدا ہو گئی تھی۔

۱۱۔ ہرشل کمیٹی کی سفارشیں

ہرشل کمیٹی نے یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ موجودہ زر کے نظام میں اصلاح کی شدید ضرورت تھی اصلاحی تدابیر پیش کرنی شروع کیں۔ دو فلزی طریق اس وقت ص ۱۰۳ خارج از بحث تھا۔ لیکن چاندی کا رواج زر کی حیثیت سے بند کر دینے اور طلائی معیار رائج کرنے کی بجائے ایک طرح کے معیار لنگ کی سفارش کی گئی جس کی رو سے سونے یا چاندی کی آزادانہ سکہ سازی روک دی گئی۔ اور روپیہ بدستور غیر محدود زر قانونی رکھا گیا۔ رہا سونا تو اس کو عبوری دور میں صرف جزوی حیثیت سے زر کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ البتہ عبوری دور کے اختتام پر مکمل طلائی معیار کو جاری کرنے کے بارے میں مزید تدابیر اختیار کی جانے والی تھیں۔

۱۲۔ ہرشل کمیٹی کی رپورٹ کے بارے میں حکومت کی کارروائی

حکومت ہند نے رپورٹ منظور کر لی اور ۱۸۹۳ء میں ایک قانون پاس ہوا جس کی رو سے قانون سکہ سازی بابتہ ۱۸۷۰ء اور قانون ہندوستانی زر کاغذی بابتہ ۱۸۸۲ء کی ترمیم ہو گئی۔ ۱۸۹۳ء کے قانون کی رو سے یہ قرار پایا کہ ہندوستانی ٹکسالوں میں چاندی کی آزادانہ سکہ سازی فوراً بند کر دی جائے۔ البتہ حکومت ہند کو روپیہ ڈھلوانے کا اختیار دیا گیا۔ علاوہ ازیں تین انتظامی اعلان بھی ایک ساتھ جاری کئے گئے۔ پہلے اعلان میں یہ قرار دیا گیا کہ سرکاری ٹکسالوں میں جو سونا اور سونے کے سکے داخل کیے جائیں ان کے مبادلے میں ۱۶ پنس فی روپیہ کے حساب سے روپے دیے جا سکیں گے۔ دوسرے اعلان میں سرکاری واجبات کی ادائی میں سونے کے ساورن اور نصف ساورن اسی شرح مبادلہ سے قبول کرنے کا مجاز گردانا گیا۔

تیسرے اعلان کی رو سے یہ انتظام کیا گیا کہ محکمۂ زر کاغذی سے کرنسی نوٹ یا کاغذی زر جاری کیا جائے اور اسی شرح سے سونے کے سکے یا سونے کے مبادلے میں دیا جائے۔

ان انتظاموں کا مقصد اولاً یہ تھا کہ روپے کی قدر مبادلہ بڑھادی جائے یا کم از کم قیمت کے اتار کو روکا جائے۔ دوسرے یہ کہ غیر ملکی سرمایے کی درآمد کو بڑھایا جائے۔ تیسرے یہ کہ سونے کے سکے کے استعمال سے لوگوں کو پوری طرح واقف کرایا جائے۔ آخر میں یہ کہ چاندی کی درآمد کو روکا جائے۔ عام منصوبہ یہ تھا کہ ان ابتدائی تدابیر کو اختیار کیا جائے جو بعد میں طلائی معیار کو رائج کرنے میں مدد دیتیں اور ہندوستان کو طلائی معیار کے ملکوں سے فوراً منسلک کر دیا جائے۔ طلائی معیار کو جاری کرنے سے بیشتر عبوری دور کو ضروری خیال کیا گیا۔

۱۳۔ فاولر کمیٹی (۱۸۹۸ء) کے تقرر کے اسباب

۱۸۹۳ء کے بعد زر کی حیثیت مسلمہ طور پر عبوری اور عارضی ہوگئی اور کچھ نہ کچھ قطعی کارروائی کرنا ضروری تھا۔ تجارتی طبقے کے زور دینے پر یہ کارروائی جلد اختیار کرلی گئی۔ زر کے بازار میں زر کی قلت کے سبب یہ طبقہ سخت دشواریاں محسوس کر رہا تھا۔ زر کی قلت کا سبب یہ تھا کہ ٹکسالوں میں آزاد سکہ سازی بند کر دی گئی تھی اور کونسل بلوں کی فروخت عارضی طور پر موقوف ہوگئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بٹے کی شرحیں بہت بڑھ گئیں۔ اس اثناء میں روپے کی قدر مبادلہ بتدریج چڑھ رہی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہندوستان میں طلائی معیار رائج کرنے یا کم از کم اس مقصد کے پیش نظر کچھ نہ کچھ کارروائی کرنے کا وقت قریب آپہنچا ہے چنانچہ اس بنا پر ۱۸۹۸ء میں فاولر کمیٹی کا تقرر کیا گیا۔ صفحہ ۳۰۲

۱۴۔ حکومت ہند کی تجویز

کمیٹی نے کئی تجویزوں پر غور کیا۔ پہلی تجویز حکومت ہند کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ روپے کی تعداد میں مزید کمی کی جائے تاکہ روپے کی قیمت ۱۶ پنس تک بڑھ جائے۔

۱۸۹۸ء تک حکومت ہند اس نتیجے پر پہنچ گئی تھی کہ چاندی کا رواج زر کی حیثیت سے بند کر دینا چاہئے اور ایسی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جن کا انجام طلائی معیار کے رواج پر ہو۔ ٹکسالوں میں چاندی کی آزاد سکہ سازی کی موقوفی کا تجربہ حکومت کو اپنے نقطۂ نظر سے نہایت کامیاب معلوم ہوا۔ اس لئے کہ اس کے بعد سے روپے کی قدر مبادلہ بتدریج چڑھتی جا رہی تھی۔ جیسا کہ مندرجۂ ذیل گوشوارے سے معلوم ہوگا۔

تقویمی سال	چاندی کے لحاظ سے روپے کی قدر ذاتی	روپے کی اوسط قدر مبادلہ
		شلنگ - پنس
۱۸۹۴ء	۱۱ ½ پنس	۱ - ۱ ½
۱۸۹۵ء	۱۱ ⅜	۱ - ۱ ⅜
۱۸۹۶ء	۱۱ ⅝	۱ - ۲ ½
۱۸۹۷ء	۱۰ ½	۱ - ۳ ¼
۱۸۹۸ء	۱۰ ⅜	۱ - ۳ ⅝

حکومت ہند نے طلائی معیار قائم کرنے کی ابتدائی تدابیر کے طور پر حسب ذیل تجویز پیش کی :-

(۱) انگلستان میں زر قرض لیا جائے اور اس کا ایک جزو سونے کی شکل میں ہندوستان بھیجا جائے تاکہ اس سے ایک بنیادی ذخیرۂ طلا کا کام لیا جائے۔ (۲) کچھ روپیہ رواج سے ہٹا کر گلا دیا جائے تاکہ روپے کی قیمت ۱۶ پنس تک بڑھ جائے[ل] (۳) روپیہ گلانے سے جو چاندی نکلے اسے بیچ کر سونا

ل۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نظریۂ مقدار زر پر کامل عقیدہ رکھتی تھی۔ لیکن تجربہ بتلاتا ہے کہ نظریے کے لحاظ سے روپے کی قیمت کی بیشی اور روپے کی مقدار کی تحدید کے درمیان جو تعلق ہونا چاہئے تھا وہ حقیقت میں موجود ہی نہ تھا۔ اس لئے کہ

حاصل کیا جائے اور یہ سونا بھی محفوظ ذخیرۂ طلا میں شریک کر دیا جائے۔ (۴) حکومت کو چاہیئے کہ سونے کو اپنے پاس سے اس وقت تک الگ نہ کرے جب تک کہ روپے کی قدر مبادلہ ۱۶ پنس تک نہ بڑھ جائے۔ گویا طلائی زر قانونی کو زر کی پالیسی کا آیندہ نصب العین مانتے ہوئے ہندوستان میں سونے کو اس وقت تک زر قانونی نہ بنایا جائے جب تک کہ روپے کی قدر مبادلہ کی سطح اونچی نہ ہو جائے۔ ص ۳۰۳

یہ تجویز اس خیال پر مبنی تھی کہ ہندوستانی ٹکسالوں میں آزاد سکہ سازی کی موقوفی کی وجہ سے زر کی رسد کا طلب کے مقابلے میں کم ہو جانا ہی روپے کی قدر مبادلہ کی بیشی کا اصلی سبب تھا۔ اور یہ کہ جب تک یہ سبب عمل کرتا رہیگا اس وقت تک شرح مبادلہ میں مزید اضافے کی توقع کیجا سکتی تھی یہاں تک کہ آخر کار ۱۶ پنس کی شرح قائم ہو جائے گی۔ فاؤلر کمیٹی نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا کہ روپے کی قدر مبادلہ کی بیشی کا باعث سراسر زر کی تخفیف تھی

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ شرح مبادلہ کی بیشی کا یہ نتیجہ توقع کے مطابق رونما نہیں ہوا کہ اولاً ملک کے اندر اشیا کی قیمتیں گریں اور اس کے بعد درآمد میں کمی اور برآمد میں بیشی ہوتی جس کی وجہ سے شرح مبادلہ موافق ہو جاتی۔ واقعہ یہ ہے کہ ٹکسالوں میں آزاد سکہ سازی کی موقوفی کے بعد ہندوستان میں اشیا کی قیمتیں ۱۸۹۳ء اور ۱۸۹۷ء کے درمیان کم وبیش پانچ سال تک ایک حالت پر قائم رہیں اور ۱۸۹۸ء میں تیزی کے ساتھ بڑھ گئیں۔ یہ بات بھی معنی خیز ہے کہ شرح مبادلہ میں استحکام ۱۹۰۰ء میں ٹھیک اس وقت رونما ہوا جبکہ حکومت نے روپیہ بڑے پیمانے پر ڈھالنا شروع کر دیا تھا۔ روپے کی قدر مبادلہ کو بڑھانے والا اصل سبب یہ تھا کہ چاندی سے جو روپیہ بنایا جاتا تھا اس کا تعلق سکے کی حیثیت سے چاندی سے ٹوٹ گیا تھا چنانچہ اسی وجہ سے روپے کی قیمت میں بیشی اور چاندی کی قیمت میں کمی رونما ہوئی۔ ان حالات میں حکومت نے جو تدابیر اختیار کیں ان سے اس سے بہتر نتائج پیدا ہوئے جو کہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے نقطۂ نظر سے اس کے ذہن میں تھے۔ ملاحظہ ہو برٹ رینڈ نوگارو کی کتاب موسوم بہ "زر (La Momaic) صفحہ ۴۴ تا ۵۰ اور وی جی کالے کی کتاب موسوم بہ معاشیات ہند جلد دوم صفحہ ۴۲۹ حاشیہ۔

کمیٹی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ روپے کی قیمت بحوالۂ طلا کو متاثر کرنے والی قوتوں کا عمل پیچیدہ اور مبہم تھا، اس لیے کمیٹی ویسی سخت کارروائی کی سفارش کیلئے تیار نہ تھی جیسی کہ حکومت ہند نے تجویز کی تھی، خاصکر اس لئے بھی کہ ایسی کارروائی ہندوستانی زر کے بازار میں قلت کو بڑھادے گی اور تجارتی طبقوں کو مخالفت کی ترغیب دے گی۔

۱۵ لنڈسے کی تجویز

کمیٹی کے سامنے جو دوسری تجویزیں پیش ہوئیں ان میں سے اس تجویز کا ذکر خاص طور پر ضروری ہے جو اے ایم لنڈسے بنک آف بنگال کے نائب معتمد و خزانہ دار نے پیش کی تھی۔ یہ تجویز اس لئے اہمیت رکھتی ہے کہ وہ اس طریق کار سے گہری مشابہت رکھتی ہے جو بعد میں چلکر اختیار کیا گیا۔ اس تجویز میں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ لندن میں ۱۰ ملین پاونڈ کی رقم بطور قرض طویل مدت کے لئے حاصل کیجائے اور محفوظ ذخیرۂ معیار طلا کے طور پر وہیں رکھی جائے ۱۸۹۳ء کے انتظام کا منشا یہ تھا کہ حکومت پر سونے یا طلائی ساورن کے مبادلے میں روپے دینے کی پابندی عائد کرکے روپے کی قیمت کو ۱۶ پنس سے اوپر چڑھنے سے روکا جائے۔ لنڈسے کا مقصد یہ تھا کہ اس عمل میں اتنا اضافہ اور کیا جائے کہ روپے کی قیمت کو ۱۶ پنس سے نیچے گرنے سے روکنے کے لئے روپے کے معاوضے میں اسٹرلنگ دینے کا انتظام کیا جائے۔ اسی لئے یہ تجویز پیش کی گئی کہ حکومت ہند کو چاہئے کہ لندن کے موسومہ اسٹرلنگ ڈرافٹ کم از کم ایک ہزار پاونڈ کے اشلنگ $\frac{1}{4}$ ۱۶ پنس کی شرح سے ہندوستان میں فروخت کرے اور لندن میں ان کو وہاں کے ذخیرۂ طلا سے ادا کیا جائے۔

اسی طرح لندن میں روپے کے ڈرافٹ درخواست گذاروں کے ہاتھ اشلنگ $\frac{1}{4}$ ۱۶ پنس کی شرح سے فروخت کئے جائیں جن کی مقدار کم از کم ۱۵ ہزار روپے ہو۔ اگر ہندوستان میں اسٹرلنگ ڈرافٹ فروخت کرنے سے زائد روپیہ جمع ہو جائے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ لندن کے ذخیرۂ طلا میں کمی ہو جائے تو زائد روپیہ فلز کے طور پر بیچ کر اتنی ہی قیمت کا

سونا لندن کے ذخیرۂ طلا میں بھرتی کر دیا جائے۔ اور اگر ہندوستان کے روپے کے ذخیرے میں کمی ہو جائے تو لندن کے ذخیرۂ طلا کے سونے سے چاندی خرید کر روپیہ ڈھالنے کے لئے ہندوستان بھیجدی جائے۔ اس تدبیر کا لب لباب یہ تھا کہ ہندوستان میں روپے ہی کو چلنی سکہ رکھا جائے اور سونے کو زر قانونی نہ بنایا جائے۔ فاؤلر کمیٹی نے
صفحہ ۳۰۷ یہ تجویز اس اندیشے سے رد کر دی کہ اس کو اختیار کرنے سے ہندوستان میں برطانوی اصل کی آمد رک جائے گی جس پر ہندوستان کی معاشی ترقی کا بڑی حد تک انحصار تھا۔ اس تجویز کی مخالفت میں کمیٹی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر ہندوستان میں یہ نظام مستقل طور پر قائم کر دیا جائے تو ہندوستان کا طلائی معیار ہمیشہ کے لئے لندن کے چند ملین پاونڈ کے طلائی ذخیرے سے وابستہ ہو جائے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان کے ذخیرے میں روپے کی تعداد غیر معین طور پر بڑھتی جائے گی اور اس کے معاوضے میں سونا لندن بھیجنے کی ذمہ داری سر پر عائد ہو جائے گی۔

۱۶ چاندی کی طرف عود

کمیٹی کے سامنے ایک اور تجویز یہ تھی کہ چاندی کے ایک فلزی طریق کی طرف عود کیا جائے۔ سرکاری ٹکسالوں میں آزاد سکہ سازی کی موقوفی عمل میں آنے سے پیشتر عرصۂ دراز تک اس مسئلے پر گرما گرم بحثیں ہوتی رہیں اور سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں اس کے نفاذ کی سخت مخالفت کی گئی۔ چنانچہ آر ' ہارڈی بنک آف بنگال کے خزانہ دار اور معتمد نے اپنی ایک یادداشت میں جو ۱۸۸۶ء میں پیش کی گئی تھی حسب ذیل استدلال کیا تھا: "ہندوستان کی بدیسی تجارت مال وجنس کی برآمد پر مشتمل ہے ان برآمدی اشیا سے نہ صرف ہندوستان کے ذمے کے واجبات سونے میں ادا کئے جاتے ہیں بلکہ درآمدی اشیا کی قیمت بھی ادا کی جاتی ہے اور سب مطالبات کو پورا کرنے کے بعد توازن ہمیشہ اس کے موافق رہتا ہے اس کو یہ فاضل واجب الوصول رقم چاندی میں وصول ہوتی ہے۔ اگر چاندی سستی ہو تو اس کو یہ فلز زیادہ مقدار میں اور گراں ہو تو کم مقدار میں

ملتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا اسی میں زیادہ فائدہ ہے کہ چاندی کی زیادہ مقدار میں ملے۔ ہندوستان کو بحیثیت مجموعی اپنے واجبات سونے میں ادا کرنے میں کتنا بار اٹھانا پڑتا ہے اس کا انحصار چاندی کی قیمت پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ ان واجبات کی ادائی کے لئے برآمد کردہ اشیا کی کتنی قیمت سونے میں وصول ہوئی۔ لیکن اس معاملے پر جو ایک لحاظ سے قومی اہمیت رکھتا ہے یہ امر کوئی اثر نہیں ڈالتا کہ حکومت اپنے محاصل چاندی میں وصول کرتی ہے اور اس لئے حکومت کا یہ واضح فریضہ ہے کہ اس گھاٹے کو جو مالیے میں شرح مبادلہ کے اتار کی وجہ سے آئے محصول بڑھا کر یا مصارف میں کاٹ چھانٹ کرکے یا دونوں طریقوں سے پورا کرے۔ اس مشکل کو دفع کرنے کی غرض سے معیار قدر کی تبدیلی جیسا انتہائی طریق کار اختیار کرنا میرے خیال میں خارج از بحث ہے اور میں یہ خیال اس رائے پر قایم رہتے ہوئے ظاہر کرتا ہوں کہ آیندہ چاندی کی قدر مبادلہ میں اور بھی خاصی کمی ہوگی

اسی طرح جے ویسٹ لینڈ کنٹرولر اور آڈیٹر جنرل نے ۱۸۸۶ء میں لکھا کہ میں یقینا یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کو طلائی معیار سے محض اس لئے دلچسپی ہے کہ وہ اس کو اختیار کرکے مطالبات وطن زیادہ سہولت کے ساتھ ادا کر سکتا ہے۔ لیکن جب نقرئی معیار ہندوستان کے دوسرے تمام تعلقات اور کاروبار کے لئے بہتر ہے تو میں مطالبات وطن کے متعلق مسئلے کو دوسرے تمام مسائل سے زیادہ اہمیت دینے کا قائل نہیں ہو سکتا۔ جو یورپی عہدہ دار ہندوستان میں اپنے قیام کو عارضی سمجھتے ہیں اور یہاں کسب معاش کرکے اپنی آیندہ زندگی اپنے ملک میں بسر کرنا چاہتے ہیں وہ ہندوستان کے نقرئی معیار کو قابل ترجیح خیال کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس واقعے سے ہماری نظروں میں ان ترسیلات کی اہمیت کسی قدر بڑھ جائے جو ہندوستان سے انگلستان کو ہوتی ہیں لیکن اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں دوامی طور پر قیام کریں اور ہمارے بعد

ہمارے بچے بھی یہاں اسی طرح رہیں جس طرح ہندوستانی باشندوں کی بڑی تعداد رہتی ہے تو مجھے اس کا یقین نہیں کہ وہ بڑھتی ہوئی قدر والے طلائی معیار کو ایک ایسے معیار پر ترجیح دیں گے جو مطلق قیمت کی پیمائش کی حد تک سابق میں خاصا مستحکم رہا۔

مسٹر ڈیوڈ باربر جب حکومت ہند کے محکمۂ مالیہ و تجارت کے معتمد تھے تو ہندوستان میں طلائی معیار کے رواج کی سخت مخالفت کرنے والوں میں سے تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان کو اپنے ذمے کے مطالبات ہمیشہ سونے میں ادا کرنے پڑتے ہیں جس کی وجہ سے حکومت ہند سے قطع نظر کرتے ہوئے خود ہندوستان کو جو نفع یا نقصان ہوتا ہے اس کا انحصار اس کی برآمدی اشیا کی ان قیمتوں پر ہے جو اس کو سونے میں وصول ہو سکتی ہیں۔ ہندوستانی زر میں کسی قسم کا جوڑ توڑ ان قیمتوں کو متاثر نہیں کر سکتا جو ہندوستان کو اس کی برآمدی اشیا کی فروخت سے سونے میں وصول ہوتی ہیں اور نہ یہ جوڑ توڑ خواہ حکومت کی مالی حالت پر اس کا کچھ ہی اثر پڑے ہندوستان کو بحیثیت ملک کوئی امداد دے سکتا ہے۔ حکومت کو جتنا نفع ہو ٹھیک اتنا ہی نقصان ہندوستان کے باشندوں کو اٹھانا ضروری ہے[1]

لیکن ۱۸۹۳ء تک اس مخالفت کا زور بڑی حد تک ٹوٹ چکا تھا جو چاندی کی آزاد سکہ سازی کی موقوفی کے بارے میں کی جا رہی تھی۔ چنانچہ یہ بات معنی خیز ہے کہ مسٹر باربر چند سال پہلے تک تو اس تجویز کے سخت مخالف تھے لیکن رکن مالیہ بن جانے کے بعد اس تبدیلی کے مؤید بن گئے جو ۱۸۹۳ء میں واقع ہوئی۔ باربر کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان کی نجات اسی میں تھی کہ تمام دنیا میں دو فلزی طریق اختیار کر لیا جائے لیکن جب انھوں نے یہ دیکھا کہ اس خیال کا بروئے کار لانا محال ہے تو اپنی عقیدت مندی کو اس طریق سے ہٹا کر طلائی معیار سے وابستہ کر دیا۔

[1] یہ سب اقتباسات پروفیسر کالے نے اپنی محولۂ بالا کتاب کے ساتویں ایڈیشن جلد دوم میں ص ۴۹۸ تا ص ۴۹۹ پر نقل کئے ہیں۔

چنانچہ پانچ سال بعد فاؤلر کمیٹی نے ٹکسالوں کو دوبارہ کھولنے کے مسئلے پر غور و خوض شروع کیا تو اس کو معلوم ہوا کہ نقرئی معیار کے چند ہی حامی باقی رہ گئے ہیں۔ حتیٰ کہ سر جیمس ویسٹ لینڈ نے بھی جن کا خیال نقرئی معیار کو ترک کرنے کے بارے میں اوپر بیان ہو چکا ہے حکومت ہند کے رکن مالیہ کی حیثیت سے ۱۸۹۸ء میں نقرئی معیار کی بحالی کی مخالفت کی۔ وہ اب چاندی کے سکے کے چلن کا موقوف ہو جانا ایک طے شدہ امر سمجھتے تھے اور دیانت داری کے ساتھ اسی تاویل پر اڑے رہے کہ طلائی معیار کیلئے یہ ضروری ہے کہ ٹکسالوں میں چاندی کی سکہ سازی نہ صرف عوام بلکہ حکومت کے لئے بھی بند کر دی جائے۔ چنانچہ ۱۸۹۸ء میں بعض لوگوں نے جب یہ مطالبہ کیا کہ حکومت کو چاہیئے کہ زر کی قلت کو دور کرنے کے لئے روپیہ از سر نو ڈھالنا شروع کر دے تو سر جیمس نے کہا کہ "ہماری رائے میں نقرئی معیار اب قصۂ ماضی بن چکا ہے۔ اس میں پڑنا خود کو ایسی مصیبت میں پھنسانا ہے جس سے بچ کر نکلنا مشکل ہوگا۔ ہمارے سامنے صرف ایک سوال ہے اور وہ یہ ہے کہ طلائی معیار کو اختیار کرنے کی بہترین شکل کیا ہو سکتی ہے۔ ہم آزاد سکہ سازی کی طرف نہیں لوٹ سکتے۔ اس کی طرف لوٹنے کی صرف دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ٹکسالوں کو عوام کے لئے عام طور پر کھولا جائے۔ دوسرے یہ کہ حکومت اپنے اغراض کے لئے سکہ سازی (ص ۳۰۶) شروع کرے۔ بہر حال نتیجہ ایک ہی ہوگا۔ یعنی یہ کہ روپے کی قیمت گر کر چاندی کی قیمت کے قریب پہنچ جائے گی۔ چنانچہ اگر دار الضرب عوام کیلئے کھول دیے جائیں تو روپے کی قیمت تیزی سے گرے گی۔ اگر حکومت روپے ڈھلوانے کے لئے ٹکسال کھولے تو روپے کی قیمت آہستہ آہستہ گرے گی۔ بہر حال قیمت کا اتار بالکل یقینی ہے۔"

۱۷ فاؤلر کمیٹی کی سفارشیں

اس طرح فاؤلر کمیٹی کو اس عذر کے مسترد کرنے میں کوئی زیادہ دشواری نہیں ہوئی جو نقرئی معیار کی بحالی کے متعلق پیش کیا گیا تھا، اس لئے کہ کوئی تازہ دلیل

پیش نہیں کی گئی تھی اور ۱۸۹۳ء کے بعد سے نقرئی معیار کا عملاً متروک رہنا خود گویا اس کی کمزوری کی بین دلیل تھی۔ کمیٹی نے یہ نتیجہ نکالا کہ مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ہندوستان میں طلائی معیار اور سونے کا سکہ سونے کی آزادانہ درآمد و برآمد کے اصولوں پر جاری کیا جائے اور اس مقصد کے مدنظر حسب ذیل تجویزیں پیش کیں:۔ (۱) ہندوستانی ٹکسالیں ساورن اور نصف ساورن کی ڈھلائی کے لئے اسی طرح کے شرائط و حالات کے تحت کھولی جائیں جن کے تحت شاہی ٹکسالوں کی تینوں آسٹریلوی شاخیں کام کررہی تھیں۔

۱۸۹۳ء کے فیصلے کے مطابق چاندی کی آزاد سکہ سازی کے لئے ٹکسالیں اس وقت تک بند رکھی جائیں جب تک کہ زر کی مجموعی مقدار میں سونے کے تناسب کا عوام کی ضرورتوں سے متجاوز ہونا نہ پایا جائے۔

(۲) روپے کی طلائی قدر قطعی طور پر ۱شلنگ ۴پنس مقرر کردی جائے، اس لئے کہ یہی شرح مستقل طور پر قائم ہوچکی تھی اور اشیا کی قیمتیں بھی اس کے مطابق مقرر و مروج تھیں جس کی وجہ سے کسی دوسرے تناسب کے مقابلے میں اس شرح کو برقرار رکھنا نسبتاً آسان ہوگا۔

(۳) روپے کا چلن غیر محدود زر قانونی کے طور پر جاری رکھا جاسکتا ہے اس لئے کہ جس وقت تک تحدید کا اصول موثر طور پر کار فرما ہے اور کوئی تازہ روپیہ نہ ڈھالا جائے، روپے کی قیمت مقرر کردہ شرح پر برقرار رہے گی چنانچہ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس غرض کو پورا کرنے کے لئے روپیہ محدود زر قانونی بنا دیا جائے۔

(۴) حکومت کو چاہئے کہ سونے کے عوض روپے دینے کا سلسلہ جاری رکھے۔ لیکن روپے کے عوض سونا دینے کا ذمہ حکومت کو نہ لینا چاہئے، اس لئے کہ اس ذمہ داری کا پورا کرنا مشکل ہوگا اور یہ ممکن ہے کہ سونے کا اچانک مطالبہ کردیا جائے جس کو ادا کرنے کے لئے بعض اوقات اسٹرلنگ کا قرض بھاری نقصان سے حاصل کرنا

ضروری ہے۔

(۵) روپے کی ساورن میں بدل پذیری کو یقینی بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ حکومت وہ سب منافع جو آئندہ چاندی کے سکے ڈھالنے سے وصول ہو ایک "ذخیرۂ طلا" میں جمع کر دے یہ ذخیرۂ طلا ایک خاص ذخیرے کے طور پر محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی اور معمولی خزانے کے فاضلات سے بالکل الگ رکھا جائے۔ اس لئے کہ اگرچہ حکومت پر روپے کے عوض سونا دینے کی کوئی قانونی پابندی عائد نہ کی جائے گی پھر بھی اگر حکومت کے ذخائر سونا ادا کرنے کی اجازت دیں اور لوگ سونا قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوں تو سونا دینے سے بڑی سہولت ہوگی۔

(۶) حکومت کو چاہئے کہ سونا فراہم کرنے کے لئے تیار رہے خاصکر برآمد کے لئے جبکہ توازن تجارت ہندوستان کے خلاف ہو۔ کمیٹی نے یہ توقع ظاہر کی کہ یہ سونا عام طور پر محفوظ طلائی ذخیروں سے اور خاصکر کمیٹی کے مجوزہ ذخیرۂ طلا سے حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن آخر میں چلکر چالو کرنسی سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ معیار طلا اور طلائی زر کے رواج کی بدولت سونے کی بہت بڑی مقدار گردش میں آجائے گی۔

مختصر یہ کہ فاؤلر کمیٹی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ صرف ایک موثر طلائی معیار کا رواج ہی ایک مستحکم شرح مبادلہ کا قطعی یقین دلا سکتا ہے۔ کمیٹی نے "معیار لنگ" کو قابل تقلید نمونہ قرار دیا جسے لاطینی اتحاد اور ریاستہائے متحدہ امریکہ نے اختیار کیا تھا۔ اس معیار کے تحت سونا اور چاندی دونوں غیر محدود زر قانونی تھے اور ان کا باہمی قانونی تناسب مقرر تھا۔ لیکن ٹکسالیں صرف سونے کی آزاد سکہ سازی کیلئے کھلی ہوئی تھیں حکومت ہند نے فاؤلر کمیٹی کی تقریباً سب سفارشیں منظور کرلیں اور ۱۸۹۹ء کے قانون کی رو سے ساورن اور نصف ساورن تمام ہندوستان میں اسی تناسب سے زر قانونی قرار دیے گئے جس کی

فاؤلر کمیٹی نے سفارش کی تھی۔

ہندوستان میں سونے کا سکہ ڈھالنے کی ٹکسال کھولنے کی بات چیت بھی شروع کر دی گئی۔ لیکن برطانوی خزانے کی مخالفت کے سبب یہ بات چیت لاحاصل ثابت ہوئی۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں حکومت کی ضرورت کے لحاظ سے جو روپیہ ڈھالا گیا اس کے منافع میں سے ایک محفوظ ذخیرۂ معیار طلا قائم کیا گیا اور سنہ ۱۸۹۳ء کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ روپے کی ڈھلائی شروع ہوئی۔

۱۸۔ زر کی قلت کو دور کرنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی گئیں

(۱) سونے کی گردش۔ فاؤلر کمیٹی کی سفارشوں کے عین مطابق مذکورۂ بالا کارروائی کرنے کے بعد حکومت کی پالیسی تھوڑی مدت میں ڈگمگا گئی اور بغیر کسی مقصد کے بھٹکتی رہی یہاں تک کہ وہ اس مقام پر پہنچ گئی جسے معیار مبادلۂ طلائی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

فاؤلر کمیٹی نے یہ سفارش کی تھی کہ تازہ روپیہ اس وقت تک نہ ڈھالا جائے جب تک کہ گردشی زر میں سونے کے تناسب کا عوام کی ضرورتوں سے متجاوز ہونا نہ پایا جائے۔ لیکن حکومت کئی واقعات کے دباؤ کے تحت سکہ سازی پھر شروع کرنے پر مجبور ہو گئی۔ ٹکسالوں کے بند ہو جانے کی وجہ سے ایک مالی انقباض پیدا ہو گیا تھا جو تجارت کی توسیع اور آبادی کے اضافے کی بنا پر زیادہ شدت سے محسوس کیا گیا۔ اس صورت حال سے نپٹنے کی عارضی تدبیر کے طور پر قانون نمبر ۲ بابت ۱۸۹۸ء منظور کیا جا چکا تھا۔ چنانچہ اس قانون کی رو سے "وزیر ہند کی کونسل بلوں کی فروخت سے حاصل کو محفوظ ذخیرۂ ہندوستانی زر کاغذی کے جزو کے طور پر بنک آف انگلینڈ میں سونے میں الگ رکھا جا سکتا تھا۔ حکومت ہند اس طرح الگ رکھے ہوئے سونے کی بنیاد پر نوٹ جاری کر سکتی تھی اور اس حد تک اپنے خزانے کے فاضلات میں کمی کئے بغیر وزیر ہند کے ڈرافٹوں کو ان نوٹوں کے ذریعے

ص ۳۰۸ ادا کر سکتی تھی"[1] اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت ہند کے روپے کے ذخیرے پر بار بڑھ گیا۔ حکومت نے عوام کو سونے کے سکے سے پوری طرح واقف کرانے اور تازہ روپے کی ڈھلائی کی مانگ کا توڑ کرنے کی غرض سے ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۰ء میں ساورن کا رواج عام کرنے کی موثر کوشش کی اور ڈاکخانوں، زر کاغذی کے محکموں، ضلع وار خزانوں اور ریلویز کے نام ہدایتیں جاری کی گئیں کہ سونے کے سکے کے لین دین کی ہمت افزائی کی جائے۔ لیکن اس طرح جو سونے کے سکے جاری کئے گئے ان میں سے اکثر حکومت کے پاس جلد واپس آگئے جس کے معنی حکومت نے یہ لئے کہ عوام کو آلۂ مبادلہ کے طور پر ساورن استعمال کرنے کی ترغیب دینے کا جو تجربہ کیا گیا تھا وہ ناکام ہو گیا۔ اس طرح اپنی شکست کا اعتراف کرنے میں حکومت نے بظاہر بہت جلدی اور مستعدی سے کام لیا۔ خود سرکاری عہدہ داروں میں سے بعضوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اس تجربے کے حقیقی نتائج کو ناقابل اطمینان قرار دینے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ چنانچہ سر سی، ای، ڈاکنس نے اپنے مالیے کے گوشوارے بابت ۱۹۰۰ء تا ۱۹۰۱ء میں یہ رائے زنی کی کہ "میں خیال کرتا ہوں کہ سونے کا سکہ جس رفتار سے استعمال کیا جا رہا ہے ممکن ہے اس میں اضافہ ہو جائے اور ہماری بندرگاہوں اور بڑے شہروں میں سونے کے سکوں کا چلن بتدریج عام ہو جائے۔ یہ توقع کبھی نہیں کی گئی اور نہ یہ خواہش کرنے کی کوئی معقول وجہ

---

[1] جیسا کہ کیمرر نے بتلایا ہے، یہ تدبیر اختیار کر کے حکومت نے دراصل "لنڈسے تجویز" پر عمل کیا تھا جو ایک سال کے بعد فاؤلر کمیٹی کی سفارش پر مسترد کر دی گئی۔ اس تدبیر کی رو سے وزیر ہند لندن میں ہنڈی کو ہندوستان کے محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی کے نام ایسی شرحوں پر فروخت کرتا تھا جو لندن کے لئے دراصل سونے کی برآمد کے مقام کی نمائندگی کرتی تھیں اور اس کا اساسی مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں سکے کی مانگ کو پورا کرنے کے لئے زر مہیا کیا جائے۔ ملاحظہ ہو کیمرر کی کتاب محولۂ بالا ص ۱۰۲۔

ہے کہ سونے کا سکہ ملک کے اندرونی حصوں میں رائج ہوگا یا یہ کہ ملک میں لین دین کا بڑا حصہ چاندی یا تانبے کے سکوں کے سوا کسی اور آلۂ مبادلہ کے ذریعے انجام پائے گا۔ سونے کا سکہ توقع کے مطابق بہت اچھی طرح کام دے رہا ہے۔ ڈاکٹر کینن بھی یہ خیال کرتے ہیں کہ "یہ حجت کرنا کہ ہندوستان کے باشندے سونے کے سکے کو ناپسند کرتے ہیں محض خیالی بات ہے۔ یہ الزام بھی بدگمانی کے لحاظ سے اس قدیم الزام کے مانند ہے کہ انگریز باشندہ سونے کے سکوں کو کاغذی زر پر ترجیح دیتا ہے حالانکہ اس میں اس واقعے کے سوا کوئی اور بنیاد نہ تھی کہ قانون کی رو سے انگلستان اور ویلز میں ۵ پاونڈ سے کم قیمت کے نوٹ جاری کرنے کی ممانعت کر دیگئی تھی اور اس کے برعکس اسکاٹ لینڈ آئرلینڈ اور انگریزی بولنے والے دوسرے تمام ملکوں میں ایک پاونڈ یا اس سے کم رقم کے نوٹ جاری کرنے کی اجازت دیگئی تھی اور وہ آزادی کے ساتھ گردش کر رہے تھے۔ یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ ہندوستان میں چاندی کا موجودہ رتبہ اس پالیسی کا نتیجہ ہے جو کمپنی نے طلائی معیار اور نقرئی زر علامتی کا طریق انگلستان میں ۱۸۱۶ء میں اتفاقاً رونما ہونے اور اس طریق کی ماہیت سمجھ میں آنے سے بہت قبل اختیار کی تھی۔ اب یہ رتبہ نہ صرف اس وجہ سے برقرار رکھا گیا ہے کہ ہندوستانی سونے کے سکے کو ناپسند کرتے ہیں بلکہ اس وجہ سے بھی کہ اہل یورپ سونے کے سکے کو اس قدر عزیز رکھتے ہیں کہ اس کے کسی جزو کو بھی اپنے پاس سے جدا کرنے کے روادار نہیں ہیں"[۱]۔ صرف یہی نہیں کہ ہندوستان میں جو تجربہ کیا گیا اس میں کافی طویل مدت تک ثابت قدمی سے کام نہیں لیا گیا بلکہ تجربہ غیر معمولی طور پر ناسازگار حالات میں

---

[۱]۔ ملاحظہ ہو ڈاکٹر کینن کا پیش لفظ ابمیڈکر کی کتاب موسوم بہ "روپے کا مسئلہ" میں صفحہ (XIII) پر۔

شروع کیا گیا۔ اس لئے کہ ملک میں قحط کے اثرات نے روپے کی مانگ بہت بڑھادی تھی۔ چنانچہ سراڈ ورڈ لا رکن مالیہ نے اس واقعے کی تاویل یوں کی کہ "آبادی کا بڑا حصہ بالکل زراعت پیشہ ہے۔ کاشتکار کو یوں تو عموماً چاندی کے سکے کی شکل میں زر کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ جتنی غذا صرف کرتا ہے اس کا بڑا حصہ خود ہی پیدا کر لیتا ہے اور اس کی دوسری احتیاجیں جن کو پورا کرنے کیلئے اشیا کی خریداری کرنی پڑے بہت ہی تھوڑی ہیں۔ لیکن قحط کے زمانے میں صورت حال بالکل بدل جاتی ہے۔ مصیبت زدہ کاشتکار کو غذا کا سامان خریدنا اور اس کی قیمت ادا کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ چونکہ مصیبت کے زمانے میں ادھار لین دین بند ہو جاتا ہے اس لئے اس کو اپنی دوسری تمام ضرورتیں پوری کرنے کے لئے نقد قیمت برابر ادا کرنی پڑتی ہے۔" آر جی ہاٹرے نے اس خیال پر تنقید کرتے ہوئے یہ رائے زنی کی کہ ۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۰ء میں روپے کی مانگ کے بڑھ جانے کی جو تاویل سراڈ ورڈ لا نے کی وہ محض قیاسی توجیہ سے زیادہ کچھ نہ تھی[1]۔ ہاٹرے یہ خیال کرتے تھے کہ روپے کی مانگ تجارتی گرم بازاری کے زمانے میں بڑھی تھی۔ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ چڑھتی ہوئی شرح مبادلہ کے دور ۱۸۹۶ء تا ۱۹۰۰ء میں دو سخت قحطوں یعنی ایک کا ۱۸۹۶ء تا ۱۸۹۷ء میں اور دوسرے کا ۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۰ء میں رونما ہونا ایک نہایت ہی عجیب واقعہ ہے اور اسی نے سراڈ ورڈ لا کے پیش کئے ہوئے نظریے کو بظاہر ذرا معقول اور خوشنما بنا دیا پھر بھی ہاٹرے اس نظریے کو مسترد کرتے ہوئے یہ استدلال کرتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ خوشحالی کے دور کے مقابلے میں قحط سالی کے زمانے میں نقد زر کا لین دین بڑھ جائے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ لوگ نقد فاضلات بھی

---

[1] ملاحظہ ہو آر جی ہاٹرے کی کتاب موسوم بہ "زر اور اعتبار" صفحہ ۳۴۵ تا صفحہ ۳۴۷۔

زیادہ مقدار میں رکھیں گے۔ (۲) کاغذی زر اور روپوں کا اجرا۔ خواہ کچھ ہی ہو حکومت سنہ ۱۹۰۰ء میں روپے کی ڈھلائی بڑے پیمانے پر شروع کرنے پر مجبور ہو گئی۔ چنانچہ اس غرض کے لئے جو چاندی درکار تھی وہ اس سونے سے خریدی گئی جو لندن میں محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی میں موجود تھا۔ ہم اوپر قانون نمبر ۲ بابت سنہ ۱۸۹۸ء کا ذکر کر چکے ہیں جس کی رو سے وزیر ہند کی فروخت کردہ کونسل بلوں کے حاصل کو محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی کی تجوری میں الگ رکھا جاتا تھا اور اس کی بنیاد پر ہندوستان میں نوٹ جاری کئے جاتے تھے۔ یہ محض ایک عارضی انتظام تھا اور قانون کی رو سے یہ قرار دیا گیا تھا کہ اس طرح جو سونا رکھا جائے وہ وزیر ہند کی تحویل میں لندن میں اس وقت تک رہے جب تک کہ ان کو یہ رقم سونے کے سکے میں یا سونے میں ہندوستان روانہ کرنی پڑے یا اس وقت تک رہے جب تک کہ حکومت ہند اس کو اپنے کام میں لائے اور ہندوستان میں محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی کے جزو کے طور پر حکومت ہند کے سکّے کی ایک مقدار جو اس طرح کے نوٹوں کی مالیت کے برابر ہو الگ رکھے۔ لیکن اس قانون کو اولاً ۲½ سال کے لئے توسیع دی گئی اور پھر سنہ ۱۹۰۰ء میں ۲ سال کی مزید توسیع دی گئی۔ چنانچہ اس سال وزیر ہند کو مجاز گردانا گیا کہ انھیں کونسل بلوں کی فروخت سے جو سونا وصول ہو اُسے روپے کی ڈھلائی کے لئے چاندی خرید کر ہندوستان بھیجنے کے کام میں لائیں اور اس طرح جو چاندی آنے والی ہو اور روپے کی ڈھلائی کے کام میں لائی جا رہی ہو اس کو "محفوظ ذخیرۂ زر کاغذ" کا جزو تصور کریں۔ اس طرح لندن کے ذخیرۂ محفوظ سے تین جداگانہ کام لئے گئے۔ (۱) حسب ضرورت چاندی کی سکہ سازی کی غرض سے لندن میں چاندی خریدنے کے لئے اس فنڈ سے رقم فراہم کرنا۔ (۲) جب کبھی توازن تجارت ہندوستان کے خلاف ہو یا کونسل بلوں کی فروخت موجب نقصان یا ناممکن ہو ہندوستانی

شرح مبادلہ کو مستحکم کرنے کے لئے اس فنڈ کو استعمال کرنا۔ ان حالات میں اپنے مصارف کو پورا کرنے کے لئے وزیر ہند "محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی" کا سونا استعمال کر سکتے تھے اور ہندوستان میں محفوظ ذخیرۂ زر کاغذ میں اسی قدر رقم منتقل کر دی جاتی تھی[1] (۳) آخر میں یہ کہ اس فنڈ میں وزیر ہند اپنی ضروریات سے زائد کونسل بلوں کی فروخت کے حاصل کو اس غرض سے جمع کر سکتے تھے کہ شرح مبادلہ کے بے جا اضافے اور ہندوستان کو سونے کی ترسیل کے نامناسب میلان کو روکا جائے۔ اس جمع شدہ رقم کے مقابلے میں ہندوستان میں نوٹ جاری کئے جا سکتے تھے۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں یہ قانونی شرایط مستقل طور پر نافذ کر دی گئیں۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں ہندوستان کے ذخیرۂ محفوظ میں جو ۵ ملین پاونڈ جمع ہو گئے تھے وہ لندن کو اس غرض سے روانہ کر دیے گئے کہ بنک آف انگلینڈ کی "زر کاغذی کی پیٹی" میں بطور خاص محفوظ کر دیے جائیں (ایسی صورت میں سونا معمولی کاموں پر خرچ نہیں کیا جاتا)۔ علاوہ ازیں "محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی" کا ایک مقررہ جزو اسٹرلنگ کے تمسکات میں مصروف کیا گیا۔ سنہ ۱۹۰۰ء سے "محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی" کا ایک معتدبہ حصہ سونے کی شکل میں رکھا جانے لگا۔

۱۹ محفوظ ذخیرۂ معیار طلا

سنہ ۱۹۰۰ء میں حکومت ہند نے یہ تحریک کی کہ فاؤلر کمیٹی کی خواہش کے مطابق ہندوستان میں ایک "محفوظ ذخیرۂ طلا" قائم کیا جائے۔ حکومت نے یہ بھی تجویز پیش کی کہ "محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی" کو بتدریج اصلی حالت پر لایا جائے اور اس سے صرف نوٹ بھنانے کا کام لیا جائے۔ اس کے علاوہ یہ ذخیرہ زیادہ تر روپے اور تمسکات پر مشتمل ہو۔ دوسری طرف "محفوظ ذخیرۂ طلا" میں زیادہ تر سونا رکھا جائے۔ لیکن وزیر ہند نے اس تجویز کو نامنظور کیا۔

[1] ملاحظہ ہو فصل (۲۰)۔

وہ یہ چاہتے تھے کہ سونا لندن میں رکھا جائے اور سونے کو اسٹرلنگ کے تمسکات میں مصروف رکھا جائے۔ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ چونکہ لندن ہی ایسا مقام ہے جہاں ذخیرۂ محفوظ کو ناگہانی ضرورت کے موقع پر استعمال کرنا پڑے گا اور ایسی ہی ضرورت کے مدنظر یہ ذخیرہ قائم کیا گیا تھا اس لئے ذخیرے کو رکھنے کا بہترین مقام لندن ہی ہوسکتا ہے۔ اس طرح ذخیرۂ طلا کے جو اصل کام تھے یعنی سونے کی صورت میں ادا شدنی رقمیں بیباق کرنا اور روپے کی شرح مبادلہ کو برقرار رکھنا ان کے بجائے اب یہ ذخیرہ مجموعی سرکاری فاضلات کا ایک جزو اور ایک طرح کا "ضمنی ذخیرۂ محفوظ" خیال کیا جانے لگا۔ رہا روپے کی شرح مبادلہ کو برقرار رکھنا تو یہ کام زیادہ تر "محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی" اور لندن میں کونسل بلوں کی فروخت کے ذریعے انجام پانے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی ہی مدت میں تین ذخیروں یعنی محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی، محفوظ ذخیرۂ طلا اور وزیر ہند کی فاضلات کے کاموں میں گڈمڈ ہوگئی۔ آخری ذخیرے کا کام جو دراصل مالیاتی تھا دوسرے دو ذخیروں کے کاموں سے جو دراصل کرنسی سے متعلق تھے بری طرح خلط ملط ہوگیا۔

وزیر ہند کو جس تجویز پر اصرار تھا اس کے مطابق روپے کی ڈھلائی کا منافع تشغل اصل کی غرض سے لندن روانہ کردیا جاتا تھا جس کی صورت یہ تھی کہ لندن میں محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی سے سونا ہٹا لیا جاتا تھا اور ۳۱۱
ص۳۱۱ اس کے معاوضے میں ہندوستان میں تازہ روپے ڈھالے جاتے تھے۔ روپوں کی مانگ کو پورا کرنے کی دشواری کے باعث ۱۹۰۶ء میں ہندوستان میں روپے کا ایک خصوصی ذخیرہ محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی سے الگ "محفوظ ذخیرۂ معیار طلا کی شاخ نقرہ"[۲] کے نام سے قائم کیا گیا۔

---

[۱] یہاں سے جو بحث شروع ہوتی ہے وہ زیادہ تر چیمبرلین کمیشن کی رپورٹ پر مبنی ہے۔

[۲] "محفوظ ذخیرۂ طلا" اس تاریخ سے "محفوظ ذخیرۂ معیار طلا" کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔

روپے کا محفوظ ذخیرہ قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ شرح مبادلہ کو ا شلنگ ۴ پنس سے اوپر چڑھنے سے روکا جائے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں اس شرح پر ساورن کے عوض روپے بے روک ٹوک دینے کا انتظام کرنا پڑا۔ ۱۸۹۳ء کا وہ اعلان واپس لے لیا گیا جس کی رو سے اس امر کی اجازت دی گئی تھی کہ ساورن سے جداگانہ طور پر جو سونا پیش کیا جائے اس کی بنیاد پر نوٹ یا روپے اجرا کئے جائیں۔ اس اثنا میں ہندوستان کے مختلف محفوظ ذخیروں میں جمع شدہ سونے کی لندن کو روانگی غیر ضروری طور پر پیش خرچ پائی گئی۔ اس لئے ۱۹۰۴ء کے بعد سے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ کونسل ڈرافٹ پہلے جس غرض سے فروخت کئے جاتے تھے اس سے متجاوز مقدار میں فروخت کئے جانے لگے۔ چنانچہ اس سال وزیر ہند نے غیر محدود رقم کے کونسل بلز ا شلنگ ۴$\frac{1}{8}$ پنس کی شرح پر فروخت کرنے کا اعلان کیا۔ ان کی ادائی کے لئے ہندوستان کے نقد فاضلات ناکافی ہونے کی صورت میں ہندوستان کے محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی سے روپے نکال کر مانگ کو پورا کیا جا سکتا تھا اور اس کے مقابل مساوی رقم لندن کی کاغذی زر کی تجوری میں سونے میں جمع کرنی ہوتی تھی۔ چونکہ ہندوستان کو ساورن کی برآمد روکنے میں ا شلنگ ۴$\frac{1}{8}$ پنس کی شرح کامل طور پر موثر ثابت نہیں ہو رہی تھی اور ساورن کافی تعداد میں حکومت ہند کے پاس جمع ہوتے جا رہے تھے اس لئے یہ طے کیا گیا کہ ان ساورنوں کے مقابلے میں جو مصر اور آسٹریلیا سے ہندوستان آنے والے ہوں "برقی انتقالات" جاری کئے جائیں اور ان انتقالات کی شرح ا شلنگ ۴ پنس اور ا شلنگ ۴$\frac{1}{32}$ پنس کے درمیان ہو یعنی اس سے کم جو کونسل بلز کی شرح ہے تاکہ ایسے ساورنوں کے مالک کو اپنے ساورن ہندوستان کی بجائے لندن بھیجنا زیادہ فائدہ بخش ثابت ہو۔

جون ۱۹۰۷ء میں ہندوستانی ریلوں کے مالیے پر غور و خوض کرنے کے لئے جو کمیٹی بنام "میکے کمیٹی" بٹھائی گئی اس نے یہ سفارش کی کہ ۱۹۰۸ء میں

روپے کی ڈھلائی پر جو نفع ہو اس میں سے ایک ملین ساورن ریلوں پر خرچ کئے جائیں۔ وزیر ہند نے کمیٹی کی سفارش سے تجاوز کر کے یہ فیصلہ کیا کہ آیندہ سے روپے کی ڈھلائی کے منافع کا نصف حصہ ریلوں پر اس وقت تک خرچ کیا جائے جب تک کہ محفوظ ذخیرۂ معیار طلا کی مقدار ۲۰ ملین پاونڈ ہو جائے جس سے بظاہر ان کا مقصد معلوم ہوتا تھا کہ ذخیرہ اپنی انتہائی مقدار کو پہنچ جانے کے بعد کل منافع ریلوں ہی پر خرچ کیا جائے۔ حکومت ہند نے برقیے کے ذریعے وزیر ہند سے یہ درخواست کی کہ قبل اس کے کہ منافع کو ریلوں پر خرچ کیا جائے محفوظ ذخیرۂ معیار طلا کے اس حصے کو جو اسٹرلنگ تمسکات پر مشتمل ہو ۲۰ ملین پاونڈ تک بڑھنے دیا جائے وزیر ہند اس کو نا منظور کرتے ہوئے اپنے ہی فیصلے پر اڑے رہے لیکن ۱۹۰۷ء تا ۱۹۰۸ء مبادلے نے جو نازک صورت اختیار کر لی اس کے مد نظر انھیں یہ فیصلہ ۱۹۰۹ء میں منسوخ کر دینا پڑا۔

باب ۳۱۲

۲۰ ۱۹۰۷ء-۱۹۰۸ء کی نازک صورتِ حال

بعض علاقوں میں فصلوں کی جزوی خرابی اور بعض علاقوں میں حقیقی قحط کے رونما ہونے کی وجہ سے ہندوستانی اشیا کی برآمد گھٹ گئی۔ یورپ میں بھی خوشحالی کے دور کے بعد جو ۱۹۰۷ء میں اپنے اوج پر تھی تجارتی سرد بازاری رونما ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے روزگاری بڑھ گئی اور کاروبار مندا پڑ گیا۔ اس طرح یورپ کی قوت خرید گھٹ گئی اور نیویارک میں مالی بحران ہونے کی وجہ سے زر کی عام قلت رونما ہوئی جس نے صورت حال کو اور بھی زیادہ نازک بنا دیا۔ ایک طرف سن، گیہوں، کپاس وغیرہ جیسی ہندوستانی اشیا کی برآمد گھٹ گئی تو دوسری طرف اشیا کی درآمد میں اضافہ ہو گیا۔ کم از کم ایک شے یعنی چاندی کی درآمد یقیناً بڑھ گئی جس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی قیمت بہت گر گئی تھی۔ ان سب عاملین نے ہندوستانی شرح مبادلہ کو نیچے اتارنے میں اہم حصہ لیا۔

جب ساورن کے ذخیرے میں تیزی کے ساتھ کمی ہونے لگی تو مبادلہ بنکوں نے لندن کے موسومہ برقی انتقالات کی فروخت پر زور دیا۔ لیکن حکومت نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ البتہ محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی سے سونا دیا جاتا تھا اور وہ بھی بعض شرائط کے تحت مثلاً یہ کہ کسی ایک شخص کو ایک دن میں ۱۰ ہزار پاونڈ سے زیادہ مالیت کا سونا نہیں دیا جائے گا۔ جب صورت حال بدتر ہوگئی تو وزیر ہند نے حکومت ہند کو یہ مشورہ دیا کہ لندن کے موسومہ برقی انتقالات یا "ریورس کونسلز" ۱ شلنگ $3\frac{29}{32}$ پنس فی روپے کی شرح سے فروخت کرے اور خود وزیر ہند نے ان روپوں کے مقابل جو ہندوستانی خزانوں سے محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی" میں منتقل کئے گئے لندن کے محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی سے سونا نکال لیا۔ چونکہ اس وقت کونسل بلز فروخت نہیں کئے جا سکتے تھے اس لئے وزیر ہند کو اپنے ذرایع آمدنی برقرار رکھنے کی خاطر $4\frac{1}{2}$ ملین پاونڈ کا قرض اسٹرلنگ میں لینا پڑا۔ اس نے "ریورس کونسلز" کو نقد میں تبدیل کرنے کے مطالبے کو اس طرح پورا کیا کہ محفوظ ذخیرۂ معیار طلا کے اسٹرلنگ کے تمسکات گری ہوئی قیمت پر بازار میں فروخت کئے۔ ان تدابیر کی بدولت صورت حال میں کچھ اصلاح ہوئی اور دوسرے سال شرح مبادلہ ۱ شلنگ ۴ پنس پر پہنچ کر ٹھیر گئی۔ شرح میں اس طرح کا استحکام پیدا کرنے میں ہندوستان کی برآمدی تجارت کے احیا نے بہت مدد دی۔

۲۱
طلائی معیار یا معیار مبادلۂ طلا؟

اس نازک وقت کا سامنا کرنے میں حکومت نے جو چند کارروائیاں کسی قدر غیر ارادی اور آزمائشی طریق پر کیں وہ اس کو معیار مبادلۂ طلا کی طرف لے گئیں۔ ابتداً تو سونا روپے کے مبادلے میں داخلی استعمال کے لئے بے روک ٹوک دیا گیا، لیکن غیر ممالک کو خانگی طور پر برآمد کرنے کے لئے مہیا کرنے میں بہت کچھ پس و پیش کیا گیا۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ

باب۔ حکومت نے معیار مبادلۂ طلا پر ابھی تک اچھی طرح غور نہیں کیا تھا اور نہ اس کو قطعی طور پر اختیار کر لیا تھا۔ لیکن بعد میں ریورس کونسلز کی فروخت سے ایک نظیر قائم ہوگئی اور ہندوستانی زر کا نظام لنڈسے کی تجویز سے بہت زیادہ قریب آگیا یہ طریق تو کچھ مدت پہلے ہی سے رائج تھا کہ لندن کے محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی میں جو سونا جمع کیا جائے اس کے مقابل ہندوستان میں روپے اور نوٹ اجرا کئے جائیں اور وزیر ہند نے ۰۴-۱۹۰۳ء میں اپنی رضامندی ظاہر کردی تھی کہ یہ سلسلہ غیر محدود طریقے پر جاری رکھا جائے گا اور کونسل بل غیر محدود مقدار میں ایک مقررہ شرح پر فروخت کئے جائیں گے۔ ۰۸-۱۹۰۷ء میں بین قومی اغراض کے لئے روپے کے مبادلے میں اسٹرلنگ مہیا کرنے کی خاطر جو ریورس کونسل فروخت کیے گئے ان کو معیار مبادلۂ طلا کی عمارت کا سنگ بنیاد کہنا بے جا نہ ہوگا۔ ۳۱۳

بایں ہمہ حکومت ہند نے ابھی تک باقاعدہ طور پر کامل معیار مبادلۂ طلا کا مسلک قبول نہیں کیا تھا۔ چنانچہ ۰۸-۱۹۰۷ء کے نازک وقت کے کچھ مدت بعد بھی ہم اُسے ایسی تجاویز پیش کرتے ہوئے پاتے ہیں جو آخر میں قایم شدہ معیار مبادلہ کے طریق سے اہم اعتباروں سے مختلف تھیں۔ مثلاً حکومت ابھی تک اس بات پر پوری طرح راضی نہیں ہوئی تھی کہ محفوظ ذخیرۂ طلا کو لندن میں رکھا جائے اور اس بات کا مصمم ارادہ نہیں کیا تھا کہ ذریعۂ مبادلہ کی حیثیت سے سونے کے سکے کے رواج کو ہندوستان میں روکا جائے۔

نازک حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے جو کارروائیاں کی گئیں ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے سونے کے ذخیرے میں بڑی کمی ہوگئی چنانچہ لندن میں زر کی پیٹی میں جو ساورن تھے ان کی مقدار، ملین پاونڈ سے ½ ملین پاونڈ تک گھٹ گئی اور ہندوستان میں سونے کے سکوں کا کل ذخیرہ ختم ہوگیا۔[1]

[1] ملاحظہ ہو ایچ ایف ہاورڈ کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان اور طلائی معیار" صفحہ ۳۵۔

اس طرح حکومت نے یہ محسوس کیا کہ آیندہ ایسی نازک صورتوں کا مقابلہ زیادہ اطمینان کے ساتھ کرنے کے قابل بننے کے لئے یہ ضروری تھا کہ محفوظ ذخیرۂ طلا میں اضافہ کیا جائے۔ چنانچہ حکومت ہند نے وزیر ہند کے یہاں یہ تحریک کی کہ خطرے سے بچنے کے لئے ذخیرے کی لا اقل حد ۲۵ ملین پاونڈ قرار دی جائے اور رقم اس مقدار تک پہنچنے تک اس کا کوئی جزو ریلوں کے مصارف سرمایہ میں نہ لگایا جائے۔ حکومت نے اس بات پر بھی زور دیا کہ محفوظ ذخیرۂ معیار طلا زیادہ سیال شکل میں رکھا جائے۔

وزیر ہند نے جواب دیا کہ اس کی رائے میں زیادہ مناسب یہی تھا کہ محفوظ ذخیرۂ معیار طلا اور محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی کے لئے مجموعی طور پر ۲۵ ملین پاونڈ کا معیار مقرر کیا جائے اور ان دونوں ذخیروں کی مقدار مجموعی طور پر ۲۵ ملین پاونڈ جمع ہونے تک محفوظ ذخیرۂ معیار طلا سے کوئی رقم الگ نہ کی جائے۔ البتہ اتنی رقم جمع ہو جانے کے بعد مسئلے پر مکرر غور کیا جا سکتا ہے۔

وزیر ہند نے اس دوسری تجویز سے سراسر اتفاق نہیں کیا جو محفوظ ذخیرۂ معیار طلا کو سیال شکل میں رکھنے کے متعلق پیش کی گئی تھی بلکہ یہ طے کیا کہ اس ذخیرے میں صرف ایک ملین پاونڈ سیال شکل میں رکھا جائے اور وہ اس طرح کہ یہ رقم لندن کے معتبر قرض گیرندوں کو معتبر ضمانت پر قلیل مدت کے لئے بطور قرض دی جائے اور باقی حصہ ایسے اعلیٰ درجے کے تمسکات میں جن کی ادائی کی تاریخ قریب ہو یا کنسولز (Consols) اور دوسرے اسٹاک خرید کر مصروف رکھا جائے۔

۱۹۱۲ء میں وزیر ہند نے حکومت ہند کی خواہشوں کا لحاظ کرتے ہوئے اور ہندوستان میں عام نکتہ چینی کے مد نظر یہ فیصلہ کیا کہ "محفوظ ذخیرۂ معیار طلا" کی معیاری حد ۲۵ ملین پاؤنڈ ہونی چاہیے اور ۳۱۴
۵ ملین پاونڈ بنک آف انگلینڈ میں بطور امانت رکھنے کیلئے مختص کر دینا چاہیے[1]

[1]۔ دیکھو فنڈلے شراس کی کتاب محولہ بالا صفحہ ۲۱۵۔

مذکورۂ بالا مختلف کارروائیوں میں حکومت نے تقریباً اپنے منشا کے خلاف طلائی معیار کے اس دشوار راستے سے مستقل طور پر انحراف کیا جس کی فاؤلر کمیٹی نے سفارش کی تھی اور اس کی وجہ سے حکومت کو زمانے کی مناسبت کے لحاظ سے یکے بعد دیگرے جو تدابیر اختیار کرنی پڑیں وہ اس کو آخر میں لنڈسے کی پیش کردہ تجویز کی طرف لے گئیں۔ اس نظام نے جس طور پر ترقی کی اس کا ۱۸۹۳ء میں کسی کو خیال بھی نہ تھا اور حکومت اور فاؤلر کمیٹی دونوں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ علاوہ ازیں کسی ایک تاریخ کا تعین کرنا بھی ممکن نہیں ہے جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہو کہ اس میں اس نظام کو دانستہ طور پر اختیار کیا گیا۔

سونے کی سکہ سازی اور سونے کی ٹکسال کی تحریکیں سر ڈھل داس ٹھاکر سے کے ایما پر زندہ ہوئیں۔ چنانچہ سر ڈھل نے اس کے متعلق مرکزی مجلس قانون ساز میں ایک قرارداد پیش کی۔ اس سلسلے میں کم و بیش ایک سال تک مشورے ہوتے رہے اور اس کے بعد یہ طے ہوا کہ یہ مسئلہ دوسرے مسائل کے ساتھ مجوزہ زر کے کمیشن کے سامنے پیش کیا جائے۔

۲۲ معیار مبادلۂ طلا کا نظام

معیار مبادلہ کے جس نظام کے ارتقا کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اس پر ۹۹-۱۸۹۸ تا ۱۶-۱۹۱۵ء میں پوری طرح عملدرآمد ہوتا رہا ہے۔ ایم کینس جو اس نظام کے قابل ترین ترجمانوں میں سے ہیں اس کی اہم خصوصیات کی مختصر طور پر حسب ذیل تشریح کرتے ہیں۔

(۱) روپیہ غیر محدود زر قانونی ہے اور قانون کی رو سے غیر بدل پذیر ہے۔ (۲) ساورن فی پاونڈ ۱۵ روپلے کے حساب سے غیر محدود زر قانونی ہے اور اس شرح سے اس وقت تک بدل پذیر ہے جب تک کہ وہ اعلان واپس نہ لیا جائے جس کی رو سے حکومت سے ایک پاونڈ کے معاوضے میں ۱۵ روپلے طلب کئے جا سکتے ہیں۔ (۳) انتظامی عمل کے لحاظ سے حکومت اس شرح سے روپے کے

عوض ساورن دینے کے لئے بالعموم آمادہ ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات یہ عمل موقوف کر دیا جاتا ہے اور روپے کے معاوضے میں سونے کی بڑی مقدار ہمیشہ حاصل نہیں کی جا سکتی۔ (۴) انتظامی عمل کے لحاظ سے حکومت روپے کے معاوضے میں کلکتے میں ایسی ہنڈیاں فروخت کرتی ہے جو لندن میں قابل ادائی ہوتی ہیں اور جن کی شرح فی روپیہ اشلنگ $\frac{29}{32}$ ۳ پنس سے زیادہ نا موافق نہیں ہوتی۔

ان شرائط میں سے چوتھی شرط روپے کی قیمت کو اسٹرلنگ میں برقرار رکھنے کے لئے ناگزیر ہے۔ گو حکومت نے اس بات کی کوئی قطعی حامی نہیں بھری کہ وہ یہ شرح برقرار رکھے گی، لیکن اگر اس کو قایم رکھنے میں ناکامی ہو تو بڑی حد تک کہا جا سکتا ہے کہ اس کا نتیجہ اس نظام کی کامل شکست ہوگا۔

اس طرح جہاں دوسری شرط روپے کی قدر اسٹرلنگ کو اشلنگ ۴ پنس سے زیادہ اتنا بڑھنے دیتی ہے جتنے کہ ہندوستان کو ساورن کی روانگی کے مصارف ہوتے ہیں۔ وہاں چوتھی شرط اس شرح کو اشلنگ $\frac{29}{32}$ ۳ پنس کے نیچے گرنے سے روکتی ہے۔ اس کا نتیجہ عملاً یہ ہوتا ہے کہ روپے کی قدر اسٹرلنگ کے تغیرات اشلنگ $\frac{1}{8}$ ۴ پنس اور اشلنگ $\frac{29}{32}$ ۳ پنس کی دو انتہاؤں کے درمیان ہوتے ہیں۔[۱] ۳۱۵

معیار مبادلۂ طلا کے حق میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ایک طرف

---

[۱] ملاحظہ ہو کینس کی تصنیف، محولۂ بالا ص۶۔ تا ص۔ ایک اور مقام یعنی صفحہ ۲۰ پر کینس نے معیار مبادلۂ طلا کے لوازم اس طرح بیان کئے ہیں، "مقامی زر کا استعمال جو زیادہ تر طلائی سکوں پر مشتمل نہ ہو، مقامی زر کے معاوضے میں طلائی سکہ مقامی طور پر مہیا کرنے میں کچھ تامل، لیکن مقامی ہنڈیاں زر کے معاوضے میں بڑی سے بڑی شرح پر فروخت کرنے میں بڑی آمادگی، اور اس کے لئے بیرونی امانتوں کا استعمال۔

وہ طلائی معیار اور طلائی زر سے بدرجہا زیادہ کم خرچ ہے تو دوسری طرف موخرالذکر طریق کی تمام خوبیوں کا حامل ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں معیار مبادلۂ طلا کا اصل مقصد روپے کی شرح مبادلہ کو سونے کے ساتھ برقرار رکھنا تھا۔ اگر شرح میں اتار کے آثار پائے جائیں تو حکومت سے توقع کیجاتی تھی کہ وہ اسٹرلنگ (ریورس کونسل) فروخت کرنے لگے گا اور جب روپے کی قیمت بڑھنے لگے تو مقامی زر (کونسل بل) کی فروخت شروع کر دے گی۔ چنانچہ حکومت کی اس مداخلت کے موثر ہونے کا دارومدار اس بات پر تھا کہ سونے اور روپے کے محفوظ ذخیروں کی مقدار کافی ہو۔

۲۳ کونسل ڈرافٹ کا طریق

زمانۂ قبل از جنگ میں ریورس کونسل اور کونسل بل کا طریق معیار مبادلۂ طلا کے نظام کا ایک جزو رہا۔ لیکن حکومت نے از روئے قانون ریورس کونسل یا اسٹرلنگ کی ہنڈیاں فروخت کرنے کا خود کو کبھی پابند نہیں بنایا۔ علاوہ ازیں ان کو فروخت کرنے کے مواقع بھی بہت شاذ پیدا ہوئے۔ لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کونسل ڈرافٹ یعنی کونسل بل اور برقی انتقالات کا طریق ہندوستانی زراور مبادلے و مالیے کا بہت ہی اہم جزو تھا۔

ہندوستان کی موسومہ ہنڈیاں فروخت کر کے ہندوستان سے رقم حاصل کرنے کا طریق ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے شروع ہوا تھا[۱] لیکن ۱۸۹۳ء تک کونسل ڈرافٹ[۲] محض وزیر ہند کی ان حقیقی ضروریات کے لحاظ سے فروخت کئے جاتے تھے جو وہ مطالبات وطن

---

[۱] اس کے بعد کا بیان چیمبرلین کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۱۷۰ تا ۱۷۱ کا کم و بیش خلاصہ ہے۔

[۲] "کونسل ڈرافٹ" ایک عام اصطلاح ہے جو "کونسل بل" اور "انتقالات" کے لئے مشترک طور پر استعمال کیجاتی ہے۔

کو پورا کرنے کے لئے محسوس کرتے تھے۔ اس طریق کی بدولت وزیر ہند اس قابل ہوتے تھے کہ ممکنہ طور پر موافق شرح پر رقوم فراہم کریں۔ یہ طریق تجارت کے لئے بھی اس لحاظ سے سہولت بخش تھا کہ ہندوستان کو اپنی درآمد پر برآمد کی زیادتی کی وجہ سے غیر ممالک کے اشخاص سے جو رقم واجب الوصول ہوتی تھی اس کے بڑے حصے کی بیباقی کا یہ ایک آسان طریق تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ معمولی زمانے میں اس زیادتی کی وجہ سے ہی کونسل ڈرافٹ کا طریق ممکن اور نفع بخش ہوتا تھا۔

۱۸۹۳ء کے بعد چند سالوں تک کونسل ڈرافٹ کی فروخت عارضی طور پر بند کر کے روپے کی قدر مبادلہ چڑھا دی گئی۔ گویا اس نظام کو ایک طرح سے معطل کر کے الٹا کام لیا گیا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روپیہ کم آزادی سے ملنے لگا اور اس کی قیمت اسٹرلنگ میں بڑھ گئی۔ ۳۱۶

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ کس طرح ۱۸۹۸ء میں روپے کی قیمت آخر کار اشلنگ ۴ پنس تک بڑھ جانے کے بعد قانون نمبر (۲) بابت ۱۸۹۸ء کی رو سے کونسل ڈرافٹ کی فروخت اس شرط کے ساتھ جائز قرار دی گئی تھی کہ اس کے بدلے کا سونا محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی کے جزو کے طور پر بنک آف انگلینڈ میں الگ رکھ دیا جائے اور اس کے مقابل اتنی ہی مالیت کے نوٹ کونسل ڈرافٹ کی ادائی کے لئے ہندوستان میں جاری کئے جاتے تھے۔ اس کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ مطالبات وطن کو پورا کرنے کے لیے ہندوستان سے رقم حاصل کی جائے بلکہ یہ بھی کہ ہندوستان میں جب زر کی قلت ہو اور حکومت ہند کے خزانے میں کونسل ڈرافٹ کی ادائی کے لئے فاضلات نہ ہوں تو ہندوستان میں زر کی مقدار فوراً بڑھا دی جائے تاکہ خانگی طور پر باہر سے ساورن درآمد ہونے کی ضرورت لاحق نہ ہو۔

ایک مزید کارروائی یہ کی گئی کہ لندن میں جمع شدہ سونا جو کونسل ڈرافٹ کی فروخت سے حاصل ہوتا تھا اور جس کی بنیاد پر ہندوستان میں نوٹ

جاری کئے گئے تھے ہندوستان میں چاندی کی سکہ سازی کے لئے چاندی خریدنے کے لئے قابل حصول قرار دیا گیا۔ یہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ ۱۹۰۴ء سے کونسل بل کی فروخت کا مستقل انتظام کر دیا گیا تھا۔ اس طرح کے واقعات کے سلسلے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزیر ہند نے وقت کے اقتضا کے لحاظ سے ان ساورنوں کے مقابل کونسل ڈرافٹ کی فروخت کے اعلانات کئے جو آسٹریلیا اور مصر سے ہندوستان آنے والے تھے۔ اس کا محرک صرف یہ تھا کہ چونکہ ہندوستان میں ایک خاص مقدار سے زیادہ ساورن درکار نہ تھے اس لئے اس خرچ اور نقصان سے بچا جائے جو چاندی خریدنے کے لئے ساورن کو پہلے ہندوستان اور پھر ہندوستان سے لندن ارسال کرنے میں عائد ہوتا۔

۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۰ء میں ان روپوں کی کثیر مقدار کے عوض جو بحران کے زمانے میں لندن میں ریورس کونسل کی فروخت سے ہندوستان کے محفوظ ذخیرۂ معیار طلا میں جمع ہو گئے تھے لندن میں سونا حاصل کرنے کی خاطر کونسل ڈرافٹ آزادی سے فروخت کئے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محفوظ ذخیرۂ معیار طلا لندن کو واپس لایا گیا۔

روپے کی ڈھلائی کا منافع جو دراصل ابتداءً روپے کی شکل میں حاصل ہوا لندن میں اسٹرلنگ میں تبدیل کر دیا گیا اور منافع کی نمایندگی کرنے والے روپوں کا اجرا ہندوستان میں کیا گیا تاکہ لندن میں فروخت کردہ کونسل ڈرافٹ کی ادائی کیجائے۔

کونسل ڈرافٹ کے طریق کی غرض و غایت محض یہ تھی کہ وزیر ہند کو رقوم فراہم کر کے مطالبات وطن پورا کرنے کے قابل بنایا جائے۔ لیکن اب اس سے دوسرے اور بھی کام لئے جانے لگے جن سے اس کی اہمیت بڑھ گئی مثلاً تجارت میں سہولت پیدا کرنا اور حکومت کے مالی ذریعے کے صرف اور جائے مقام میں اس طرح تبدیلیاں کرنا کہ زرمبادلہ اور مالیے کے معاملات پر حکومت کی پالیسی اچھی طرح اثر انداز ہو۔

اس بیان کو ختم کرنے سے پیشتر کونسل ڈرافٹ کی فروخت کے طریقے کا بھی ذکر کر دینا مناسب ہوگا۔

جب کبھی ہندوستان کو رقم ارسال کرنے کی ضرورت ہوتی اور وزیر ہند کو کسی کام کے لئے زر درکار ہوتا تا ہر چہار شنبے کو یہ اعلان کیا جاتا تھا کہ آیندہ چہار شنبے کو زیادہ سے زیادہ اتنی رقم کے کونسل بلز اور برقی انتقالات[۱] یعنی ہنڈیاں فروخت کی جائیں گی اور برقی انتقالات کی شرح کونسل بلز کی شرح سے معمولاً فی روپیہ ۱/۳۲ پنس زیادہ ہوتی تھی۔ جو لوگ ہندوستان کو رقم بھیجنا اور بل خریدنا چاہتے تھے ان سے تخمینے طلب کئے جاتے تھے اور جن کی بولی سب سے زیادہ ہوتی تھی ان کے نام بل جاری کئے جاتے تھے بہ شرطیکہ وہ ایک معین اقل شرح سے کم نہ ہوتی۔ مقررہ دن کے علاوہ ہفتے کے اور دنوں میں بھی درمیانی یا خاص بل کچھ زیادہ شرح سے فروخت کئے جاتے تھے اور درمیانی ہنڈیوں کی ٹھیک شرح اور زیادہ سے زیادہ مقدار اس ہفتے کے لئے ہر چہار شنبے کو مقرر کی جاتی تھی۔ ۳۱۷

ہر چہار شنبے کو جو انتظامات کرنے ہوتے انھیں منظوری کے لئے انڈیا آفس یا کونسل کی فینانس کمیٹی کے آیندہ اجلاس کے بعد خود انڈیا کونسل کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔

حکومت کے ذخائر مالی اور ان پر عائد ہونے والے مطالبات

۲۴۔ چیمبرلین کمیشن نے جن کی سفارشیں اگلی فصل میں مذکور ہیں حکومت کے جملہ مالی ذرائع کی نوعیت اور ان کے استعمال و صرف کو معین کرنے والے اصول بہت اچھی طرح حسب ذیل طریق پر بیان کئے ہیں:۔

---

[۱] اب اس کی بجائے حکومت نے اسٹرلنگ خریدنے کا طریق اختیار کر رکھا ہے۔ اس پر آیندہ باب میں بحث کی گئی ہے۔

ہندوستانی مالیے اور زر کے نظام پر غور و بحث کرنے میں سب سے پہلا اصول باب
یہ ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ ہندوستان میں حکومت کی فاضلات، لندن میں دفتر ہند کی فاضلات اور محفوظ ذخایر معیار طلا و زر کاغذی کے اجزا جو ہندوستان اور لندن میں الگ الگ رکھے گئے ہیں، یہ سب دراصل ایک واحد فنڈ کی نمایندگی کرتے ہیں۔ اس فنڈ کے اجزائے ترکیبی کو جو نام دیے گئے ہیں ان سے ان ضرورتوں اور واجبات کی نوعیت و وسعت کا کسی حد تک حال معلوم ہوتا ہے جن کو بحیثیت مجموعی پورا کرنے کے لئے یہ فنڈ قایم کیا گیا ہے۔ ہر جزو کو دیے ہوئے نام سے اس جزو کا اساسی کام معلوم ہوتا ہے۔ لیکن نظری یا عملی لحاظ سے اس فنڈ کے مختلف اجزا کو ان مقاصد کے لئے پورے کا پورا کبھی مخصوص نہیں رکھا گیا جو ان کے نام سے ظاہر ہوتے ہیں۔

"یہ ذخائر درحقیقت جن ضرورتوں اور واجبات کو پورا کرنے کے لئے مہیا کئے گئے تھے ان کو مختصر طور پر حسب ذیل پانچ عنوانوں کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے:۔

"(۱) حسب ذیل کاموں کے لئے ہندوستان میں رواں فاضلات، (ا) ہندوستان کی مرکزی و صوبائی حکومتوں کی آمدنی اور سرمایے کی مدیں رواں مصارف؛ (ب) ان مقامی مجلسوں اور بلدیوں کے مصارف جن کے لئے مرکزی حکومت ساہوکار کے طور پر کام کرتی ہے؛ (ج) حکومت کے سیونگ بنک؛ اور (د) متفرق رقوم اور خدمات جیسے عدالتی رقمیں۔

"(۲) سلطنت متحدہ میں رواں فاضلات، آمدنی اور سرمایے کی مدیں حکومت ہند کے ذمے کے مطالبات وطن کے لئے جن میں اکثر ہندوستانی ریلوں کے سرمایے کے [illegible] شامل ہیں۔

"(۳) ایک محفوظ ذخیرہ روپے کی قدر مبادلہ کو سا ورن کے ساتھ برابری پر قایم رکھنے کے لئے۔

"(۴) حکومت ہند کے نوٹوں کی بدل پذیری کا یقین دلانے کے لئے ایک ذخیرہ۔ ۳۱۵

"(۵) مسکوک روپے اور ساورن کی تازہ رسد سرکاری شرح پر ہندوستان میں مہیا کرنا۔ علاوہ ازیں اس نظام سے ہندوستان کے موافق توازن تجارت کی ادائی کے لئے کونسل بل اور انتقالات برقی کے ذریعے رقم بہ سہولت ارسال کرنے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی فاضلات کا یہ استعمال صرف ان ذخائر کی مقدار پر موقوف ہوتا ہے جو کونسل بلز کی ادائی کے لئے ہندوستان میں موجود ہوتی ہیں اور کونسل بلز کی فروخت اس اعلان کے تابع ہوتی ہے کہ وہ غیر محدود طور پر اشلنگ $\frac{1}{۸}$۴ پنس کی شرح سے جاری کئے جائیں گے"۔[۱]

۲۵۔ چیمبرلین کمیشن حکومت کی زر اور مبادلے کی پالیسی پر جو متواتر اور سخت نکتہ چینی کی گئی اس کے مدنظر اپریل ۱۹۱۳ء میں ایک کمیشن مسٹر (بعد میں سر) آسٹین چیمبرلین کی صدارت میں مقرر ہوا۔ کمیشن نے فروری ۱۹۱۴ء میں اپنی رپورٹ پیش کی کمیشن کے اخذ کردہ نتائج اور سفارشیں حسب ذیل تھیں:-

(۱) روپے کی قدر مبادلہ کو مستحکم بنیاد پر قایم کرنا ہندوستان کے لئے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ (۲) روپے کی قدر مبادلہ کو برقرار رکھنے کی تدابیر ۱۸۹۸ء کی کمیٹی کی سفارشوں کی ہر لحاظ سے براہ راست تکمیل میں نہیں بلکہ لازمی اور بجا طور پر ان کے ضمیمے کے طور پر اختیار کی گئی تھیں۔ (۳) ۱۹۰۸ء-۱۹۰۷ء کا نازک وقت ہی وہ واحد موقع تھا جبکہ ان تدابیر کی سخت آزمائش ہوئی جس کے بعد وہ اطمینان بخش ثابت ہوئیں۔ چونکہ حکومت اس نظام پر عمل کرنے کا کوئی تجربہ نہیں رکھتی تھی اور اس نازک وقت سے نبٹنے کے لئے کوئی پیشگی خاکا

---

[۱] ملاحظہ ہو چیمبرلین کمیشن کی رپورٹ فقرہ (۹) و (۱۰)۔

تفصیلات کے ساتھ مرتب نہیں کیا گیا تھا' اس لئے ابتداءً حکومت نے یقیناً غلطیاں کیں۔ چنانچہ دفتر ہند کے خیال کے مطابق ذخیرۂ معیار طلا کا اصل یا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس سے کونسل بل فروخت نہ ہو سکنے کی صورت میں وزیر ہند کی ضروریات پورا کرنے کا کام لیا جائے۔ اس طرح حکومت ہند کی غلطی یہ تھی کہ اس نے محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی کی برآمد کی خاطر سونا دینے سے انکار کیا حالانکہ سونے کے اخراج کو داخلی استعمال کے لئے روا رکھا۔ دفتر ہند اور حکومت ہند دونوں یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ ذخیرۂ طلا کا اصل مقصد یہ ہے کہ جب کبھی شرح مبادلہ نقام فلز کے نیچے گر جائے تو بیرونی ترسیلات کے لئے اس فنڈ کو آزادی سے استعمال کرنا چاہئے۔ بہر حال ان غلطیوں کی بہت جلد تلافی کر دی گئی اور شرح مبادلہ بحال کرنے اور برقرار رکھنے کے لئے ضرورت کے لحاظ سے جو کارروائیاں کی گئیں وہ مناسب ثابت ہوئیں۔ (۴) گزشتہ پندرہ سال کے واقعات نے یہ ثابت کر دکھایا کہ طلائی زر کا عام چلن معیار طلا کی کوئی لازمی شرط نہیں ہے۔ چنانچہ اس شرط کے بغیر معیار طلا مستحکم طور پر قایم رہا۔ (۵) ملک کے اندر سونے کے سکوں کا زیادہ چلنا ہندوستان کے حق میں مفید نہ ہو گا۔ (۶) ہندوستان کے لوگ یہ خواہش یا احتیاج نہیں رکھتے کہ سونا زر کے طور پر کثیر مقدار میں رائج رہے۔ چنانچہ ان کی داخلی ضرورتوں کو نوٹ اور روپے نہایت موزوں طریقے پر پورا کر رہے تھے۔ (۷) زر یا مبادلے کے لئے سونے کی ٹکسال کھولنا ضروری نہیں تھا۔ لیکن اگر ہندوستانی اس کو حقیقت میں ضروری خیال کریں اور حکومت ہند بھی مصارف برداشت کرنے کو آمادہ ہو تو ہندوستان یا شاہی نقطۂ نظر سے اس تجویز میں اصولاً کوئی پہلو قابل اعتراض نہیں ہے بہ شرطیکہ یہاں جو طلائی سکے ڈھلیں وہ ساورن یا نصف ساورن ہی ہوں۔ بہر حال یہ تجویز ایسی ہے جس میں ہندوستانیوں کے خیال اور خوشی کا لحاظ مقدم ہونا چاہئے۔ (۸) اگر سونے کی ٹکسال

۳۱۹

نہ کھولی جائے تو بمبئی کی ٹکسال میں زر کے معاوضے میں خالص سونا قبول کیا جائے۔ (۹) حکومت کا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ لوگوں کو زر اسی شکل میں دے جس کا وہ مطالبہ کریں خواہ یہ روپے ہوں یا نوٹ یا سونا۔ لیکن نوٹوں کے استعمال کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے۔ (۱۰) مبادلے کے کاروبار کے لئے اس اندرونی زر کو سونے اور اسٹرلنگ کے محفوظ ذخیرے کی کافی تعداد کے ذریعے تقویت دینی چاہیئے (۱۱) محفوظ ذخیرۂ معیار طلا میں زیادہ سے زیادہ کتنی مقدار رکھی جائے اس کے لئے کوئی حد مقرر نہ کرنی چاہیئے۔ شرح مبادلہ کے استحکام کیلئے محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی سے صرف اسی حالت میں اور اس وقت تک کام لینا چاہیئے جب کہ تنہا محفوظ ذخیرۂ معیار طلا استحکام کے لئے ناکافی ثابت ہوتا ہو۔ (۱۲) روپے کی ڈھلائی کا جملہ منافع محفوظ ذخیرۂ معیار طلا میں جمع کرنے کا سلسلہ ابھی ایک مدت تک جاری رکھنا چاہیئے۔ (۱۳) محفوظ ذخیرۂ معیار طلا کا پہلے سے زیادہ بڑا حصہ نقد سونے میں رکھنا چاہیئے۔ محفوظ ذخیرۂ معیار طلا اور محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی کے اثاثے کے باہمی مبادلے سے ۱۰ ملین پاؤنڈ کی مجموعی مقدار سونے میں حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ مقدار موقع کے لحاظ سے ۱۵ ملین پاؤنڈ تک بڑھا دینی چاہیئے اور اس کے بعد حکومت کو اپنا مقصد یہ قرار دینا چاہیئے کہ محفوظ ذخیرۂ معیار طلا کی مجموعی مقدار کا نصف حصہ سونے میں رکھے۔ گو ذخیرۂ طلا سب کا سب سونے میں رکھنا بالکل غیر ضروری اور ایک طرح کا اسراف ہے پھر بھی آفت کے زمانے میں تمسکات کو مجبوراً فروخت کرکے نقصان اٹھانے سے بچنے کے لئے سونے کی مقدار سیال شکل میں رکھنی چاہیئے۔ (۱۴) محفوظ ذخیرۂ معیار طلا کی ہندوستانی شاخ بند کردینی چاہیئے اس لئے کہ اس پر بہت کچھ نکتہ چینی کی گئی تھی اور محفوظ ذخیرۂ معیار طلا کی افادیت کے بارے میں بہت زیادہ الجھن اور شبہے پیدا ہوگئے تھے۔

(۱۵) لندن ہی وہ مناسب مقام تھا جہاں محفوظ ذخیرۂ معیار طلا سب کا سب رکھا جا سکتا تھا۔ (۱۶) حکومت کو ضرورت کے لحاظ سے ہندوستان میں لندن کی موسومہ ہنڈیاں اشلنگ $\frac{۲۹}{۳۲}$ ۳ پنس کی شرح پر فروخت کرنے کا ذمہ لینا چاہیئے[۱]

اس طرح کمیشن نے مبہم نظام زر کو خوب جی کھول کر سراہا جو کم و بیش اتفاقی طور پر رونما ہو گیا تھا۔

صہ ۳۲ حکومت اس نظام سے کامل طور پر مطمئن نہیں تھی اور ذمہ دار عہدہ دار کبھی کبھی اس کا ذکر اس طرح کرتے تھے گویا معیار مبادلۂ طلا جو ہندوستان میں رونما ہو گیا تھا محض عارضی طریق پر تھا اور اصلی منزل مقصود طلائی معیار تھی جس کے معمولی لوازم میں سونے کا سکہ بھی شریک تھا[۲]

۱۹۱۲ء میں حکومت ہند نے ملک کی اس عام ہلچل سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے جو بمبئی میں سونے کی ٹکسال کھولنے کے لیے جاری تھی اور جس نے آخر میں سر وٹھل داس تھیکرسے کی مذکورۂ بالا قرار داد کی شکل اختیار کی، وزیر ہند کو اس معاملے کے متعلق مراسلہ بھیجا اور اس بات پر

---

[۱] ملاحظہ ہو چیمبرلین کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۲۲۳۔

[۲] سر جیمس میسٹن نے سنہ ۱۹۱۱ء کے بجٹ کے مباحثے میں تقریر کرتے ہوئے حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا۔ "ہم نے ہندوستان کو دنیا کے سونا استعمال کرنیوالے ملکوں سے ملحق کر دیا ہے۔ ہم معیار مبادلۂ طلا پر آگئے ہیں اور اس کی اصلاح و ترقی کی برابر کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کے بعد کی اور آخری کارروائی یہ ہوگی کہ سونے کا سکہ جاری کیا جائے۔ مجھے ہر طرح امید ہے کہ ایک نہ ایک دن سونے کا سکہ جاری ہوگا۔ لیکن وقت سے پہلے خواہ مخواہ جاری نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری بنک کاری کے انتظامات کی پسماندہ حالت، لوگوں کی عادت اور بدگمانیاں، تحریک امداد باہمی کا ابتدائی دور میں ہونا، یہ سب چیزیں اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالتی ہیں۔ لیکن آخری کارروائی اس وقت کی جائے گی جبکہ ملک اس کے لئے تیار ہو۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس میں زیادہ تاخیر نہ ہوگی

زور دیا کہ سونے کی سکہ سازی کے عام مطالبے کو بلا تامل مان لیا جائے۔ لیکن چیمبرلین کمیشن نے حکومت کے خیالات کو دوسری طرف پلٹانے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس نے حکومت کو ایک حد تک یہ یقین دلا دیا کہ معیار مبادلۂ طلا کا طریق اختیار کر کے حکومت نے زر کے معاملات میں ہندوستان کو امتحان طور پر دنیا کی قوموں کی اولین صف میں پہنچا دیا تھا۔

چیمبرلین کمیشن کی مختلف سفارشوں پر غور و خوض کرنے اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے حکومت کو کافی وقت ملنے سے قبل ہی جنگ عظیم چھڑ گئی۔ اس جنگ نے جو انوکھے حالات اور نت نئے مسائل پیدا کئے ان پر اب بحث کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

جنگ عظیم کے اثرات ہندوستانی زر پر[ا]

پہلا دور ۲۶ اگست ۱۹۱۴ء تا خزاں ۱۹۱۵ء

ان اثرات پر دو اہم دوروں کے تحت غور کرنا مناسب ہوگا۔ (۱) پہلا دور اگست ۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑنے سے لیکر ۱۹۱۵ء کے موسم خزاں تک۔ اس دور میں زر اور مبادلے کا نظام درہم برہم ہوگیا اور اس نظام میں کمزوری پیدا ہوگئی۔ (۲) دوسرا دور ۱۹۱۵ء کے موسم خزاں اور ۱۹۱۹ء کے اختتامی زمانے کے درمیان۔ اس دور کو بحالی کا دور خیال کیا جاسکتا ہے جس کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ پیدائش دولت کے لئے پورا زور لگایا گیا۔ اس دور میں شرح مبادلہ اوپر

بقیہ مضمون حاشیہ صفحۂ گذشتہ۔ اس لئے کہ اس کارروائی کے ساتھ ہی ہمارے موجودہ طریق کی عام خرابیاں، مشکلات اور تصنع آمیزیاں نیست و نابود ہو جائیں گی۔

ا۔ یہ بحث زیادہ تر بے بنگ ٹن اسمتھ کمیٹی کی رپورٹ شائع شدہ ۱۹۲۰ء پر مبنی ہے۔

۳۲۱ چڑھ گئی اور چاندی کی طلائی قیمت اس قدر نمایاں طور پر بڑھ گئی کہ اس سے قبل کبھی نہیں بڑھی تھی۔

جنگ نے سرکار کی ساکھ کو عوام کی نظروں میں گرا دیا اور تجارت اور کاروبار میں عام بدنظمی پیدا ہو گئی جس کی سب سے نمایاں علامات یہ تھیں کہ مبادلے کی شرح گر گئی، سیونگ بنکوں سے امانتیں نکال لی گئیں، نوٹوں کے عوض روپے کا مطالبہ ہونے لگا اور ہندوستان کے سونے کے ذخیروں پر یورش ہوئی۔

حکومت نے اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے فوری تدابیر اختیار کیں جن سے ساکھ پھر قایم ہو گئی۔ شرح مبادلہ کے اتار کو روکنے کے لئے ریورس کونسل جاری کئے گئے جو فروری ۱۹۱۵ء تک کم وبیش ۸ ملین پاؤنڈ کی مقدار میں فروخت ہوئے۔ اس کے بعد کونسل بل کی مانگ پھر شروع ہو گئی اور بجز عارضی کمی کے جو کبھی کبھی واقع ہوئی ہندوستانی شرح مبادلہ دوسرے دور میں اول سے آخر تک مستحکم رہی یہاں تک کہ کونسل بل کی طلب اتنی بڑھ گئی کہ اس کو پورا کرنا مشکل ہو گیا۔

جنگ عظیم کے ابتدائی دو مہینوں میں سیونگ بنکوں سے ۲۴½ کروڑ کی مجموعی امانتوں کے منجملہ ایک بڑی رقم یعنی ۶ کروڑ روپے نکال لے گئے۔ تقریباً ۸ کروڑ روپے نکالے جا چکے تھے کہ ۱۹۱۵ء-۱۹۱۶ء میں حالات بدل گئے۔ مطالبات بے روک ٹوک پورے کیے گئے۔ یہ عمل ساکھ کو بحال کرنے اور امانتوں کو پھر بنکوں میں کھینچ لانے کے لئے کارآمد ثابت ہوا۔ چنانچہ ۱۹۱۸ء تا ۱۹۱۹ء کے اختتام تک امانتیں پھر ۱۸ کروڑ روپے تک بڑھ گئیں۔ گویا ابتدائی مقدار سے ½۶ کروڑ روپے کم تھیں۔

نوٹوں کو روپے میں تبدیل کرنے کا مطالبہ بھی بلا تامل پورا کیا گیا چنانچہ مارچ ۱۹۱۵ء تک سرکاری خزانوں میں ۱۰ کروڑ روپے کے نوٹ واپس کئے گئے۔ لیکن اس کے بعد سے نوٹوں کا چلن برابر بڑھتا گیا۔

آخر میں ہندوستانی سونے کے ذخیرے پر یورش ہوئی ۔ وہ اس طرح کہ نوٹوں کے بدلے میں سونے کا زبردست مطالبہ کیا گیا۔ خانگی استعمال کے لئے سونا دینا ترک کر دیا گیا کیونکہ وہ سب تدابیر بے سود ثابت ہوئیں جو سونے کے خانگی استعمال کو روکنے کے لئے اختیار کی گئی تھیں اور اس کے بعد نوٹوں کے بدلے صرف روپے دیئے گئے۔ پہلے دور کے اختتام پر یہ سب پریشان کن حالات دور ہو گئے۔ بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ حکومت نے صورت حال کا مقابلہ ہمت اور کامیابی سے کیا۔ حکومت کی ساکھ پھر سے قایم ہو گئی کیونکہ بنک کار اور تجارتی طبقے کو یہ اطمینان دلایا گیا کہ بیرونی ترسیلات کے لئے مستقل طور پر کافی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی ۔ اس کے علاوہ حکومت نے نوٹوں کو جب کبھی وہ پیش کئے گئے روپے میں بلا تامل تبدیل کر دیا۔

۲۷ دوسرا دور ۱۹۱۵ء تا ختم ۱۹۱۹ء

جنگ عظیم کے ابتدائی دور کی بدنظمی اور بے اعتباری دور ہو جانے کے بعد زر کا نظام کچھ مدت تک اطمینان بخش طور پر عمل کرتا رہا اور ۱۹۱۶ء کے اختتام تک کوئی پیچیدہ مسائل پیدا نہیں ہوئے ۔ چاندی کی قیمت ایکدم بڑھنا شروع ہوئی ۔ اس لئے ہندوستان میں چاندی کے سکوں کی غیر معمولی مانگ کو پورا کرنے کی خاطر چاندی کا حاصل کرنا مشکل ہوتا گیا ۔

۳۲۲ اولاً درآمد کے مقابلے میں برآمد بہت بڑھ گئی اور توازن تجارت جو جنگ کے آغاز پر ہندوستان کے مخالف تھا اب موافق ہونے کے باوجود پریشانی کا باعث بن گیا ۔ حالانکہ جنگ کی وجہ سے ابتداءً تجارت برآمد پر برا اثر پڑا تھا لیکن بعد میں اس کی حالت سنبھل گئی کیونکہ متحدین کی طرف سے جنگی اغراض کے لئے ہندوستانی اشیا کی مسلسل مانگ رہی ۔ اس کے برخلاف جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے درآمدی تجارت پر زیادہ برا اثر پڑا[۱]۔

---

۱ ۔ ملاحظہ ہو باب فصل (۵) ۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درآمد کے مقابلے میں برآمد زیادہ رہی اور اس زائد برآمد کی قیمت ادا شدنی رہتی تھی ۔

حکومت ہند کو حکومت برطانیہ کی طرف سے جو قابل بازیافت بھاری مصارف برداشت کرنے پڑے ان کی وجہ سے صورت حال اور بھی زیادہ پیچیدہ ہوگئی ۔ ۱۹۱۴ء سے دسمبر ۱۹۱۹ء تک حکومت ہند کو جنگ کے مشرقی میدانوں میں فوجی ساز و سامان پر اور مقبوضہ علاقوں میں غیر فوجی کاموں پر ۲۴۰ ملین پونڈ خرچ کرنے پڑے ۔ اس کے علاوہ بعض برطانوی مقبوضات و نوآبادیات کی طرف سے ہندوستان میں اشیاء کی خریداری کے لئے رقمی انتظام کرنا پڑا اور اسی قسم کے مالی انتظامات ان افریقی تاجروں کے لئے بھی کرنے پڑے جو ہندوستان کی پیداوار خریدا کرتے تھے ۔

بحیثیت مجموعی ان سب چیزوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی زر کی مانگ بہت بڑھ گئی ۔ یہ صورتِ حال اس لئے اور بھی زیادہ پیچیدہ بن گئی کہ غیر ممالک کی حکومتوں نے قیمتی دھاتوں کی برآمد پر بندشیں عائد کردی تھیں جن کی وجہ سے ہندوستان میں قیمتی دھاتوں کی درآمد گھٹ گئی ۔ چونکہ اب موافق توازن تجارت کی بے باقی میں وہ سہولتیں موجود نہ تھیں جیسی کہ جنگ عظیم سے پیشتر پائی جاتی تھیں اس لئے حکومت کو کوئی نہ کوئی دوسرا انتظام کرنا ضروری تھا تاکہ برآمدی تجارت میں جو جنگ کی کامیابی کے لئے ناگزیر تھی کوئی رخنہ یا رکاوٹ نہ پیدا ہو ۔ چنانچہ حکومت کو لندن میں کونسل بل بڑی تعداد میں جاری کرنے پڑے تاکہ اس طرح ہندوستانی برآمدی اشیاء کی قیمت ادا ہوسکے ۔ ان ہنڈیوں کی رقم ادا کرنے کے لئے کافی تعداد میں روپیہ ڈھالنے کی ضرورت تھی ۔ لیکن اس کام میں سخت مشکلات کا سامنا تھا ۔ کیونکہ چاندی بعض وجوہ سے خلاف توقع بہت مہنگی ہوگئی تھی ۔

۲۸ ۔ چاندی کی قیمت کا اضافہ زر کے معاملات میں سب سے پیچیدہ مسئلہ چاندی کی غیر معمولی گرانی کا تھا ۔ میکسیکو کے اندرونی فسادات

اور چاندی کے مصارف پیدائش کی زیادتی کی وجہ سے چاندی کی پیداوار قبل جنگ کے مقابلے میں بہت کم ہوئی تھی ۔ دوسری طرف چونکہ سونا کمیاب تھا اور شریک جنگ اور غیر جانب دار ملک اس کے ذخیرے محفوظ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے اس لئے چاندی کی عالمی طلب خصوصاً سکہ سازی کے لئے غیر معمولی طور پر بڑھ گئی تھی۔ چنانچہ ہندوستان اور چین میں اس کی مانگ سب سے زیادہ تھی۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان کے موافق توازن تجارت کی بے باقی اور برطانوی محکمۂ جنگ ۳۲۳ کی طرف سے اشیا کی قیمت ادا کرنے کا بار زیادہ تر حکومت ہند پر عائد ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی زر خاصکر روپیوں کی مانگ بہت بڑھ گئی۔ اس طلب میں اس وجہ سے اور اضافہ ہوگیا کہ امتناعی قانون کے باوجود روپے گلائے جانے لگے ۔ روپے گلانے کی وجہ یہ ہوئی کہ چاندی کی قیمت بڑھنے سے روپے کی قدر ذاتی قدر قانونی سے بڑھ گئی تھی ۔

نیویارک و لندن کی باہمی شرح مبادلہ یعنی ڈالر و اسٹرلنگ کی شرح بھی چاندی کی گرانی کا ایک سبب تھی ۔ چنانچہ جب یہ شرح انگلستان کے خلاف ہونے لگی تو دونوں ملکوں کی حکومتوں نے ملکر مبادلے کی شرح فی پاؤنڈ ۴٫۷۶ ڈالر مقرر کر دی[1]۔ یہ کارروائی دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات کو جنگ کے زمانے میں برقرار رکھنے کے لئے ضروری تھی۔ ڈالر کا مبادلہ انگلستان کے خلاف اس لئے ہوگیا کہ امریکہ کے مقابلے میں انگلستان کی دین داری لین داری سے زیادہ ہوگئی تھی۔ دوسرے یہ کہ عملی طور پر انگلستان طلائی معیار سے ہٹ چکا تھا اور ملک میں ایسے زر کاغذی کی افراط ہوگئی تھی جو تقریباً غیر نقد پذیر تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سونے اور پاونڈ اسٹرلنگ میں فرق ہوگیا ۔ چنانچہ امریکی طلائی ڈالر کے مقابلے میں جو ایک موثر طلائی بنیاد پر قائم تھا پاؤنڈ اسٹرلنگ کی قیمت

[1] جنگ سے بیشتر مبادلہ فی پونڈ ۴٫۸۶ کے حساب سے برابری پر ہوتا تھا۔

گر گئی۔ جب مارچ ۱۹۱۹ء سنہ میں اسٹرلنگ و ڈالر کی باہمی شرح کو قانونی بندش سے آزاد کر دیا گیا تو شرح مبادلہ اور بھی زیادہ انگلستان کے خلاف ہو گئی اور گرتے گرتے آخر کار فی پاونڈ اسٹرلنگ ۳٫۴۰ ڈالر تک پہنچ گئی۔

ہندوستان کے لئے جو چاندی خریدی جاتی تھی اس کی قیمت وزیر ہند ڈالر کی شکل میں امریکہ کو ادا کرنے پر مجبور تھا۔ لیکن اسٹرلنگ کی قیمت لگاتار گرتی جا رہی تھی جس کی وجہ سے لندن میں چاندی کا بھاؤ بحوالہ اسٹرلنگ چڑھا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں چاندی کی قیمت کا روپے کے حوالے سے بھی بڑھنا یقینی تھا بجز اس صورت کے کہ روپے کی قدر بحوالہ اسٹرلنگ متناسب طریق پر بڑھا دی جاتی۔

چاندی کی گرانی کے اسباب بیان کر دینے کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس کی قیمتیں کس رفتار سے بڑھیں۔ ۱۹۱۵ء سنہ میں چاندی کا بھاؤ زیادہ سے زیادہ فی اونس ۲۷ پنس رہا۔ ۱۹۱۶ء سنہ میں انتہائی نرخ فی اونس ۳۷ پنس تھا۔ اگست ۱۹۱۷ء سنہ میں نرخ ۴۳ پنس فی اونس سے زیادہ ہو گیا جو روپے کی فلزی قدر کے مساوی ہے یعنی اس قیمت پر روپے کی قدر مبادلہ ۱ شلنگ ۴ پنس کے حساب سے روپے کی قدر فلزی یا قدر ذاتی کے مساوی ہوتی ہے۔ ستمبر ۱۹۱۷ء سنہ میں چاندی کی قیمت ۵۵ پنس تک بڑھ گئی۔ اس موقع پر برطانیہ، امریکا اور کینیڈا نے قیمت کی روک تھام کی غرض سے چاندی کی تجارت کو اپنی نگرانی میں لے لیا اور اجازت اور تعین قیمت کے بغیر اس کی برآمد کی ممانعت کر دی۔ ان تدابیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاندی کی قیمت فی اونس ۴۱ پنس اور ۴۹ پنس کے حدود کے اندر گھٹتی بڑھتی رہی۔ لیکن مئی ۱۹۱۹ء سنہ میں ریاستہائے متحدہ امریکا اور سلطنت متحدہ نے اپنی نگرانی ہٹا لی جس کے بعد ہی چاندی کی قیمت میں اضافہ رونما ہوا۔ چنانچہ اس مہینے میں قیمت فی اونس ۵۸ پنس ہو گئی جس کے بعد تمام سال قیمت بڑھتی ہی رہی یہاں تک کہ دسمبر میں وہ ۷۸ پنس فی اونس ہو گئی۔ انتہائی گرانی فروری ۱۹۲۰ء سنہ میں ہوئی جبکہ لندن میں اس کا ۳۲۲

نرخ ۹۰ پنس فی اونس تھا۔

۲۹ حکومت کی اختیار کردہ تدابیر

(۱) مبادلے پر حکومت کی نگرانی۔ جب ملک جنگ عظیم کے پہلے صدمے کو سہہ گیا تو تجارت برآمد میں اضافہ ہوا اور اس کے ساتھ کونسل بل کی طلب پھر بڑھ گئی۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء تک کونسل بل کی طلب بڑی حد تک حسب معمول رہی۔ اس کے بعد موافق توازن تجارت کی وجہ سے بڑھنا شروع ہوئی۔ اس موافق توازن تجارت کے بارے میں پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اس کو معمولی طور پر فلزر درآمد کر کے باقی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کونسل بل کی طلب میں اضافہ ہونے سے ہندوستان میں روپے کے ذخائر پر غیر معمولی بار پڑا جس کی وجہ سے نوٹوں کی بدل پذیری خطرے میں پڑ گئی۔ اس لئے دسمبر ۱۹۱۶ء میں کونسل بل کی فروخت بند کر دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بازاری شرح مبادلہ اور سرکاری شرح میں فرق پیدا ہو گیا۔ یہ فرق برآمدی تجارت کے لئے نقصان رساں تھا جس کو خلل کے بغیر جاری رکھنا جنگ کو کامیاب انجام تک پہنچانے کے لئے ضروری تھا۔ اس لئے حکومت نے نگرانی کی غرض سے بعض تدابیر اختیار کیں۔ چنانچہ جنوری ۱۹۱۷ء میں شرح مبادلہ اشلنگ ۴/۱ ۴ پنس مقرر کر دی گئی۔ کونسل بل کی فروخت چند منتخب بنکوں اور فرموں تک محدود رکھی گئی اور ان پر لازم کیا گیا کہ وہ ان ہی مجوزہ شرحوں پر دوسروں سے بھی کاروبار کریں اور اپنے ذرائع کو زیادہ تر ان چند منتخب برآمدی اشیا پر صرف کریں جو متحدین کے لئے اہمیت رکھتی تھیں۔ بنکوں کے تعاون عمل اور سرکاری نگرانی کی وجہ سے شرح مبادلہ کے مزید تغیرات آئندہ کچھ مدت کے لئے رک گئے۔

(۲) شرح مبادلہ میں اضافہ۔ بہت جلد یہ چیز واضح ہو گئی کہ یہ تدابیر شرح مبادلہ کو مستحکم رکھنے کے لئے کافی نہ تھیں کیونکہ جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے چاندی کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا تھا۔

حکومت ۱۶ پنس کی شرح سے روپیہ فروخت نہیں کر سکتی تھی جب کہ چاندی کی مسلسل گرانی کی وجہ سے خود روپے کی لاگت ۱۸ اور ۲۰ پنس سے بھی زیادہ ہوتی تھی ۔ ہندوستان کے کچھ لوگوں کا یہ مشورہ کہ اس نقصان کی تلافی محفوظ ذخیرۂ معیار طلا سے کرنی چاہئیے جو خاص طور پر مبادلے کے استحکام کے مقصد سے قایم کیا گیا تھا حکومت نے قبول نہیں کیا ۔ حکومت نے اس بات کو تسلیم کیا کہ ذخیرہ قائم کرنے کا یہ مقصد تھا اور یہ طے کیا کہ یہ نقصان ان لوگوں پر عائد کیا جائے جو اس سے روپیہ طلب کریں ۔

اس پالیسی کے مطابق اگست ۱۹۱۷ء میں شرح مبادلہ ۱ شلنگ ۵ پنس تک بڑھا دی گئی اور کچھ ہی مدت بعد وزیر ہند نے یہ اعلان کیا کہ وہ اس بات پر آمادہ ہے کہ چاندی کی جو کچھ قیمت بہ لحاظ اسٹرلنگ رہے اسی کے مطابق شرح مبادلہ مقرر کرے گا اور اگر چاندی کی ۳۲۵
ان قیمتوں میں اضافہ ہو تو شرح مبادلہ بھی بڑھا دی جائے گی [1] اس کارروائی کا نتیجہ مندرجہ ذیل اعداد سے واضح ہوگا ۔

روپے کی شرح مبادلہ کے تغیرات

تاریخ	مبادلہ بحوالہ اسٹرلنگ	تاریخ	مبادلہ بحوالہ اسٹرلنگ
۳ر جنوری ۱۹۱۷ء	۱ شلنگ ۴¼ پنس	۱۲ر اگست ۱۹۱۹ء	۱ شلنگ ۱۰ پنس
۲۸ر اگست ۱۹۱۷ء	۱ شلنگ ۵ پنس	۱۵ر ستمبر ۱۹۱۹ء	۲ شلنگ ۰ پنس
۱۲ر اپریل ۱۹۱۸ء	۱ شلنگ ۶ پنس	۲۲ر نومبر ۱۹۱۹ء	۲ شلنگ ۲ پنس
۱۳ر مئی ۱۹۱۹ء	۱ شلنگ ۸ پنس	۱۲ر دسمبر ۱۹۱۹ء	۲ شلنگ ۴ پنس

[1] "یہ اعلان گویا اس بات کا قطعی اقرار تھا کہ ہندوستان میں پھر اسی طرح کا نقرئی معیار جاری کیا جا رہا تھا جو کہ ۱۸۷۳ء سے قبل موجود تھا ۔ ۱۸۷۳ء تا ۱۸۹۳ء ہندوستان کے پیمانۂ قدر میں چاندی کی طلائی قیمتوں کے لحاظ سے تغیرات ہوئے تھے ۔ چنانچہ کسی اچھے

بازاری شرح مبادلہ اور بعد میں ان ریورس کونسلز کی فروخت کی شرح جو فروری ۱۹۲۰ء سے جاری کئے گئے جنوری تا مارچ ۱۹۲۰ء ۲ شلنگ ۶ پنس، ۲ شلنگ ۸ پنس، ۲ شلنگ ۱۰ پنس اور ۲ شلنگ ۱۱ پنس رہی اور شرح اپنی انتہا پر ۱۹۲۰ء کے ابتدائی مہینوں میں پہنچی۔

(۳) چاندی کی خریداری۔ زر کی رسد بڑھانے کے لئے خاص تدابیر اختیار کرنی پڑیں۔ چنانچہ فروری ۱۹۱۶ء سے چاندی اسی غرض سے خریدی گئی۔ حکومت نے نجی خریداروں کی مسابقت کو روکنے کے لئے ستمبر ۱۹۱۷ء سے چاندی کی خانگی طور پر درآمد ممنوع قرار دی۔ ۱۹۱۸ء میں ریاستہائے متحدہ کی حکومت سے جو بات چیت ہوئی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ موخرالذکر نے "قانون پٹ من" منظور کیا جس کی رو سے محفوظ ذخیرے کی چاندی کی فروخت کی اجازت دیگئی۔ چنانچہ حکومت ہند نے اس طرح ۱۰۱½ سنٹ فی اونس کی شرح سے ۲۰۰ ملین اونس خالص چاندی خریدی۔

(۴) چاندی کا تحفظ اور اس کے استعمال میں کفایت۔ چاندی کے تحفظ اور اس کو بہ کفایت استعمال کرنے کے لئے مزید تدابیر اختیار کی گئیں۔ جون ۱۹۱۷ء میں زر کے متعلق ایک قانون منظور کیا گیا جس کی رو سے سونے اور چاندی کے سکے گلانے کی ممانعت کر دیگئی۔ دسمبر ۱۹۱۷ء میں ایک روپیے اور ڈھائی روپیے کے نوٹ جاری کئے گئے۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں پہلی دفعہ نکل کی دوانی، چونی اور اٹھنی جاری کی گئی۔ اور ان کو ایک روپیے تک زرِ قانونی قرار دیا گیا۔ جون ۱۹۱۷ء سے حکومت ہند نے بلالحاظ اس بڑھوتری کے جو سونے پر تھی نجی طور پر درآمد کیا ہوا سونا روپیے اور اسٹرلنگ کی معین کردہ شرح کے مطابق

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ:۔ ۱۶۵ گرین چاندی کی جو قیمت سونے میں ہوتی تھی اس کے لحاظ سے ہندوستان میں انشیا کے مبادلے کا پیمانہ قدر مقرر ہوتا تھا۔ یہی بیان مذکورۂ بالا حالات پر صادق آتا ہے۔ ملاحظہ ہو کیبل اور ہوجکن کی تصنیف موسوم بہ "ہندوستانی زر اور قیمتیں" صفحہ ۱۱۲۔

حاصل کیا۔ اس طرح حاصل کئے ہوئے سونے کی بنیاد پر چاندی کے زر کی کمی کو پورا کرنے کے لئے نوٹ جاری کئے گئے اور طلائی مہریں اور ساورن ڈھالے گئے۔ جون ۱۹۱۹ء میں امریکا سے سونے کی برآمد پر عائد کی ہوئی بندشیں ہٹائی گئیں اور جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا کے سونے کے بازاروں میں کوئی روک ٹوک باقی نہیں رہی جس کی وجہ سے ہندوستان میں سونا زیادہ مقدار میں درآمد کیا گیا اور حکومت نے بھی اس کو حاصل کیا۔ سونے کی درآمد کو بڑھانے کی خاطر حکومت نے اپنی سونا حاصل کرنیکی قیمت میں اضافہ کر دیا تاکہ اس قیمت میں وہ بڑھوتری بھی شامل رہے جو اسٹرلنگ کے مقابلے میں سونے پر تھی۔ حکومت اس طرح حاصل کیا ہوا سونا اگست ۱۹۱۹ء سے عوام کے ہاتھ پندرھویں روز فروخت کرتی تھی تاکہ سونے پر بڑھوتری کم ہو جائے۔

(۵) کاغذی زر کا کثیر اجرا۔ زر کی مشکلات سے بچنے کے لئے یہ طریقہ نکالا گیا کہ خلاف معمول فلزی بنیاد کے بغیر نوٹ کثیر مقدار میں جاری کئے گئے۔

علاوہ ازیں نوٹوں کے بھنانے پر بندشیں عائد کی گئیں اور روپے میں نوٹوں کو تبدیل کرنے کی ماسوائے قانونی سہولتیں ہٹالی گئیں۔ ایک اور تدبیر یہ اختیار کی گئی کہ انفرادی طور پر نوٹ پیش ہونے پر روزمرہ جو روپے ادا کئے جاتے تھے ان کی روک تھام کی گئی۔

(۶) مالی تدابیر۔ معمولی اور بڑے مصارف ممکنہ طور پر کم رکھے گئے اور حکومت کی قوت خرید کو بڑھانے کے لئے زائد ٹیکس لگایا گیا۔ علاوہ ازیں روپے کثیر مقدار میں قرض لینے کی غرض سے ہندوستان میں تمسکات جاری کئے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تین سال کی مدت یعنی ۱۹۱۷ء، ۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ء میں ۸۱ کروڑ ۳۰ لاکھ روپیہ حاصل ہو گیا۔ یہ رقم زمانۂ قبل از جنگ کے اعداد اور توقعات سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء سے ۳ ماہ تا ۱۲ ماہ کی قلیل مدت کی ہنڈیاں خزانہ بھی

جاری کی گئیں۔

ان سب تدابیر سے ہندوستان کو رقم بھیجنے کی غرض سے زر کے مطالبات اور ہندوستان میں زر کی مانگ کو براہ راست پورا کرنے میں مدد ملی۔

۳۰ - بے بنگٹن اسمتھ کمیٹی

چیمبرلین کمیشن کی سفارشوں پر ابھی غور و خوض ہی ہو رہا تھا کہ جنگ چھڑ گئی اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے زمانۂ جنگ کے واقعات کی وجہ سے بہت سے نئے مسائل اور نئی مشکلات اچانک طور پر رونما ہوئیں اس لیے وزیر ہند نے ۳۰ / مئی ۱۹۱۹ء کو ماہروں کی ایک کمیٹی سر ہنری بے بنگٹن اسمتھ کی صدارت میں مقرر کی۔

۳۱ - شرح مبادلہ کو مستحکم رکھنے کی اہمیت اور اس کے طریقے

جیساکہ اسمتھ کمیٹی نے کہا "شرح مبادلہ کا استحکام تجارتی کاروبار میں روانی پیدا کرنے کی لازمی شرط تو نہیں ہے۔ البتہ وہ تجارت میں بہت بڑی سہولت پیدا کرتا ہے۔" لیکن اگر شرح مبادلہ کے تغیرات معاشی اسباب کی بجائے حکومت کی انتظامی کارروائیوں کا نتیجہ ہوں تو غیر مستحکم مبادلے کی خرابیاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ سرکاری مداخلت کے اندیشے کی وجہ سے تجارتی طبقے کے لئے شرح مبادلہ کے اتار چڑھاؤ کے خطرات سے بچنے کا انتظام کرنا دشوار ہو جاتا ہے اس لئے ہندوستانی زر کے نظام جیسے نظام کی حد تک جس کی باگ ڈور حکومت کے ہاتھ میں ہو شرح مبادلہ کا استحکام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کمیٹی نے ابتداءً چند ایسی تجاویز پر غور کیا جن میں شرح کو اسٹرلنگ ہو پنس کی قدیم سطح پر مستحکم کرنا مقصود تھا۔

ان تجویزوں کے منجملہ ایک یہ تھی کہ روپے کا وزن گھٹا دیا جائے ۳۲۷
یا اس میں خالص چاندی کی مقدار کم کر دی جائے تاکہ قدر مبادلہ قدیم سطح پر قائم کی جا سکے اور چاندی کی قیمت زیادہ سے زیادہ چڑھ جانے کے

باوجود روپے کو اس کی اصلی قیمت سے زیادہ قیمت پر رائج رکھا جا سکے۔ باب ۷
کمیٹی نے یہ تجویز اس بنا پر مسترد کر دی کہ ایسی کارروائی سے حکومت کی ساکھ گر جانے کا اندیشہ تھا۔ دوسرے یہ کہ قانون گریشم کے مطابق عملدرآمد شروع ہو جائے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پورے وزن کے پرانے سکے رواج سے غائب ہو جائیں گے اور بحیثیت مجموعی خراب معاشی و معاشرتی نتائج پیدا ہوں گے۔

دوسری تجویز یہ تھی کہ روپے کی ڈھلائی عارضی طور پر موقوف کر کے اس کی بجائے دو روپے یا تین روپے کی قیمت کا ایک چاندی کا سکہ جاری کیا جائے جس میں چاندی کا تناسب موجودہ روپے کے چاندی کے تناسب کے مقابلے میں کم ہو اور روپے کے ساتھ ساتھ یہ نیا سکہ بھی رواج میں رکھا جائے۔ کمیٹی نے یہ تجویز اس لئے مسترد کر دی کہ اس پر بھی بڑی حد تک وہی اعتراضات صادق آ سکتے تھے جو پہلی تجویز پر کئے گئے تھے۔ علاوہ ازیں اس تجویز کے خلاف یہ دلیل بھی پیش کی گئی کہ ہندوستان میں چلر کاروبار اور روزمرہ کے لین دین کے لئے اتنے بڑے سکے اپنی جسامت کے لحاظ سے ناموزوں تھے۔ کمیٹی نے اسی طرح کے وجوہ کی بنا پر اس تجویز کی بھی مخالفت کی جو نکل کے روپے کے چلن کے متعلق پیش کی گئی تھی۔

آخر میں کمیٹی کو یہ تجویز بھی پسند نہ آئی کہ جب تک چاندی کی قیمت چڑھی رہے اس وقت تک نوٹوں کو کلی یا جزوی طور پر غیر بدل پذیر بنا دیا جائے۔ کمیٹی نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اس کارروائی سے حکومت کی ساکھ گر جائے گی اور وہ عوام کا اعتماد کھو بیٹھے گی۔ علاوہ ازیں چونکہ نوٹوں کا رواج ہندوستان میں عام نہیں ہوا تھا اس لئے سنگین خطرات کے بغیر اس تدبیر پر عمل کرنا ممکن ہی نہ تھا۔

۳۲۔ کمیٹی کی سفارشیں۔ سوال یہ تھا کہ آیا شرح مبادلہ پرانی سطح کے لحاظ سے مقرر کی جائے یا اس نئی سطح کے لحاظ سے جس پر

وہ اب پہنچ چکی تھی۔ کمیٹی نے اپنا فیصلہ موخر الذکر چارۂ کار کے حق میں اس لئے صادر کیا کہ صرف اس ذریعے سے بے اعتباری کو کم کرنا معاشی نظم و ترتیب کے خلل کو روکنا اور عوام کی بے اطمینانی کو دور کرنا ممکن تھا (ملاحظہ ہو فصل ۳۲۳) کمیٹی کی اہم سفارشوں کا خلاصہ حسب ذیل ہے:[1]

(۱) روپے کا وزن اور اس میں خالص چاندی کی مقدار کو برقرار رکھتے ہوئے روپیہ غیر محدود زر قانونی رکھا جائے۔ (۲) روپے کی قدر مبادلہ فی روپیہ ۱۱.۳۰۰۱۶ گرین خالص سونے کے حساب سے یا ساورن کے سونے کا ۱/۱۵ مقرر کرنی چاہئیے۔ (۳) ساورن کو جس کی شرح مبادلہ سابق میں قانوناً ۱۵ روپے مقرر تھی اب نظر ثانی کے بعد فی ساورن دس روپے کی شرح سے ہندوستان میں زر قانونی قرار دیا جائے۔

۳۲۸ (۴) جوں ہی فی ساورن ۱۰ روپے کی قانونی شرح نافذ کردی جائے سونے کی درآمد و برآمد پر سے نگرانی ہٹالی جائے اور عوام جو سونا داخل کریں اس کے ڈھالنے کے لئے بمبئی میں سونے کی ٹکسال کھولی جائے۔ (۵) حکومت کو اپنا وہ اعلان واپس لے لینا چاہئیے جس میں ساورن کے معاوضے میں روپے دینے کی ذمہ داری قبول کی گئی تھی۔ (۶) چاندی کی بھی درآمد و برآمد کی ممانعت ہٹالی جائے اور اگر مالگزاری کے نقطۂ نظر سے چاندی کا درآمدی محصول باقی رکھنا ضروری نہ ہو تو منسوخ کردیا جائے۔ (۷) محفوظ ذخیرۂ معیار طلا میں سونے کی معقول مقدار ہونی چاہئیے اور مقصدیہ ہونا چاہئیے کہ باقی ذخیرہ ان تمسکات کی شکل میں رکھا جائے جو حکومت ہند کے سوا سلطنت برطانیہ کے دوسرے علاقوں کی حکومتیں جاری کریں اور جن کی ادائی کی مدت بارہ مہینے ہو۔ ذخیرے میں

---

[1] یہ خلاصہ ہلٹن ینگ کمیشن (۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۶ء) کی ہندوستانی زر کے متعلق تحقیقاتی رپورٹ کے ضمیمہ (۳) سے لیا گیا۔ لیکن محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی کے قیام اور ترکیب کے متعلق سفارشیں حذف کردی گئی ہیں۔

جتنا سونا ہو اس کا ایک جزو جو نصف سے زائد نہ ہو ہندوستان میں رکھا جائے۔

روپے کی قدر مبادلہ فی روپیہ ۲ شلنگ کے حساب سے مقرر کرنے کی سفارش پر مندرجۂ ذیل رائے زنی نے ایک قید لگادی:۔

"اگر توقع کے خلاف دنیا کی اشیا کی قیمتیں تیزی سے اور بہت زیادہ گر جائیں اور ہندوستان میں مصارف پیدائش مساوی رفتار سے قیمتوں کی گری ہوئی سطح کے مطابق نہ ہوں تو اس مسئلے پر از سرنو غور کرنا ضروری ہو سکتا ہے"۔

۳۳ شرح بڑھا کر مقرر کرنے کے لئے کمیٹی کی دلیل

کمیٹی نے شرح مبادلہ کی جو سفارش کی اس کی وجہ یہ تھی کہ کمیٹی یہ سمجھ رہی تھی کہ چاندی کی قیمت آئندہ ایک مدت دراز تک چڑھی رہے گی۔ اس لئے کمیٹی نے یہ خیال کیا کہ اگر روپے کی قدر مبادلہ کم از کم ۲ شلنگ مقرر کر دی جائے تو روپیہ علامتی سکے کی حیثیت مکرر حاصل کر لے گا اور اس کا قابل اطمینان طور پر گردش میں رہنا یقینی ہو جائے گا۔

کمیٹی نے بڑھی ہوئی شرح مبادلہ کے عام معاشی اثرات کا لحاظ کرتے ہوئے بھی اس شرح کو ترجیح دی۔ گھٹی ہوئی شرح کے معنی یہ ہوں گے کہ اشیا کی قیمتیں بڑھ جائیں جس کی وجہ سے غریب طبقے اور مقررہ آمدنی پانے والے سخت مصیبت میں مبتلا ہو جائیں اور عام بے چینی اور بے اطمینانی پیدا ہو جائے۔

اگرچہ بڑھی ہوئی شرح مبادلہ کی وجہ سے درآمد میں بیشی اور برآمد میں کمی ہوگی۔ لیکن یہ اثرات عارضی نوعیت کے ہوں گے اور اس وقت غائب ہو جائیں گے جبکہ اجرت اور مصارف پیدائش کے دوسرے عناصر ترکیبی نئی شرح مبادلہ کے مطابق ہو جائیں۔ برآمدی تجارت میں عارضی طور پر یقیناً کمی ہوگی لیکن بعض لوگ جتنا اندیشہ کر رہے تھے اس سے کم ہوگی۔ اس لئے کہ دنیا میں خام مال اور غذائی اشیا کی عام قلت کی وجہ سے

ہندوستانی اشیا کی طلب بہت بڑھ جائے گی۔ علاوہ ازیں بڑھی ہوئی شرح مبادلہ اور درآمدی اشیا کی عام طور پر گری ہوئی قیمتوں کی وجہ سے ہندوستان میں دولت پیدا کرنے والا بہت فائدے میں رہے گا۔ چنانچہ شرح مبادلہ بڑھا کر مقرر کرنے سے درآمدی ذخائر اور کلیں روپے کے حساب سے کم قیمت پر حاصل ہوں گی جس کی وجہ سے مصارف پیدائش کم ہو جائیں گے اور ہندوستان میں اشیا کی قیمتیں گر جانے کی وجہ سے اجرت کی شرحیں بھی کم ہو جائیں گی یا کم از کم اوپر چڑھنے نہ پائیں گی۔

آخر میں یہ کہ اگر ۱ شلنگ ۶ پنس کی پرانی شرح ترک کر کے ۲۲۹
فی روپیہ ۲ شلنگ سونے کی شرح مقرر کی جائے تو شرح مبادلہ کے اضافے سے حکومت کا مالیہ بہت بڑھ جائے گا۔ چنانچہ حکومت کے ذمے کے اسٹرلنگ کے واجبات کے سلسلے میں سالانہ ۱۲½ کروڑ روپے کی بچت ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ لندن میں حکومت ہند کے اسٹرلنگ کے مشغولات اور سونے کا حساب اس شرح سے روپے میں از سر نو کرنے پر نقصان آئے گا۔ لیکن یہ نقصان تین سال کے اندر اس بچت سے زائل ہو جائے گا جو مطالبات وطن کے سلسلے میں ہوگی۔ چنانچہ اس کے بعد جو فاضل آمدنی ہوتی رہے گی اس کو ملک کی معاشی ترقی میں اور محصول کا بار کم کرنے میں کارآمد طریقے پر لگایا جا سکتا ہے۔

روپے کا تعلق اسٹرلنگ کی بجائے سونے سے قائم کرنے کی سفارش کرنے میں کمیٹی کے پیش نظر صرف یہ مقصد تھا کہ روپے کی قدر مبادلہ ممکنہ طور پر جلد ایسی مستحکم شرح کے حساب سے مقرر کی جائے جس کی وجہ سے روپے کا علامتی سکے کے طور پر برقرار رہنا یقینی ہو جائے اور اسٹرلنگ کی قیمت کے تدریجی اتار کی وجہ سے چاندی کی قیمت میں بحساب اسٹرلنگ جو لگاتار اضافہ ہو رہا تھا اس کا مقابلہ کرنے کے لئے روپے کی قدر مبادلہ میں مزید اضافے کی ضرورت نہ پیش آئے۔ کمیٹی نے یہ بھی دلیل پیش کی کہ روپے کا تعلق سونے سے

قائم کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شرح مبادلہ کو گھٹا بڑھا کر خلل پیدا کرنے والا کم از کم ایک سبب ناپید ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اگر چاندی کی قیمت اسٹرلنگ میں بڑھی تو اس کا اثر روپے کی قیمت کے بھی اسٹرلنگ میں خود بخود چڑھ جانے سے متوازن یا زائل ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں روپے اور ساورن دونوں کو زر قانونی کے طور پر ہندوستان میں رائج کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ ان دونوں کا باہمی تعلق مقرر کر دیا جائے۔ اس لئے کہ دو سکوں کو رائج رکھنا اور ساتھ ہی دونوں کی باہمی نسبت متغیر ہونے دینا نامناسب تھا۔

۴۳- مسٹر دلال کی اختلافی یادداشت

مسٹر (حال سر) دادی با مرو انجی دلال نے اپنے رفقائے کار کے تقریباً سب اخذ کردہ نتائج سے اختلاف کرتے ہوئے ایک جوشیلی اور زوردار یادداشت تحریر کی۔

حکومت کی طرف سے چاندی کی قیمت کے اضافے کی جوابی کارروائی کے طور پر روپے کی شرح مبادلہ کو بڑھانے کی جو دلیل پیش کی گئی تھی اس کارروائی کا حقیقی یا واحد سبب ماننے سے مسٹر دلال نے انکار کر دیا۔ اس لئے کہ حکومت کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ چاندی کی قیمت گر جانے پر بھی شرح مبادلہ بڑھی ہوئی رکھی جائے۔ مسٹر دلال نے یہ خیال ظاہر کیا کہ جنگ ختم ہو جانے کے بعد چاندی کی برآمد پر سے ممانعت ہٹا کر چاندی کی قیمت کے اضافے کو روکا جا سکتا تھا۔ لیکن جنگ کے بعد اس کی بجائے شرح مبادلہ میں بہت اضافہ کر دیا گیا۔ ہندوستان چاندی کم خرچ کر کے آسانی سے چاندی کی برآمد کی گنجائش نکال سکتا تھا۔ اور یہ برآمد نہ صرف ہندوستان کے لئے نفع بخش ہوتی بلکہ چاندی کی قیمت کے عظیم اضافے کو بھی روک سکتی تھی۔ ص ۲۳۰
چنانچہ چاندی کے بازار میں قلت محسوس ہونے اور چاندی کی قیمت بڑھ جانے کی وجہ زیادہ تر یہی تھی کہ ہندوستان سے چاندی برآمد کرنے کی

ممانعت کردی گئی تھی اور ہندوستان کو چاندی کا فروشندہ بنانے کی بجائے امکانی خریدار بنا دیا گیا تھا۔

مسٹر وادی بادلال شرح مبادلہ کو بڑھانے کے اس لئے سراسر مخالف تھے کہ وہ اس کے نتائج کو ہندوستان کے لئے نقصان رساں خیال کرتے تھے۔ چنانچہ شرح کا اضافہ لین دار اور دین دار کے باہمی تعلقات کو درہم برہم کر دے گا اکثر ہندوستانی صنعتوں کی نظم و ترتیب میں خلل ڈالکر ان کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرے گا ہندوستانی پیداوار کی برآمد میں مسلسل کمی کر دے گا اور ہندوستان کے موافق توازن تجارت کو اس کے خلاف کر دے گا۔ اگر شرح مبادلہ بڑھی ہوئی رکھی جائے تو نہ صرف ان ذخائر کی قیمت روپے میں کم ہوجائے گی جو اسٹرلنگ کے تمسکات میں مشغول تھے بلکہ اس سونے کی قیمت بھی جو نوٹوں کے اجرا کی فلزی بنیاد کے طور پر رکھا گیا تھا اور اس کی وجہ سے بہت نقصان اٹھانا پڑے گا۔ علاوہ ازیں اگر ان ساورنوں کے معاوضے میں جو عوام کے پاس تھے فی ساورن ۱۵ روپے کی قانونی شرح سے روپے دیئے جائیں تو اس کی وجہ سے بھی بھاری نقصان عائد ہوگا۔

شرح مبادلہ میں رد و بدل ہمیشہ قابل اعتراض ہوتا ہے۔ زر کی ادائیوں کے قانونی معیار کے متعلق بالعموم اور بجا طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں غالباً کسی دوسری قانونی کارروائی کے مقابلے میں تنسیخ یا ترمیم کی بہت کم گنجائش ہوتی ہے۔ اس قانونی معیار سے عوام کے ان حقوق کا تعین ہوجاتا ہے کہ وہ اپنی محنت یا اشیا کے معاوضے میں کس قسم کا زر طلب کر سکتے ہیں۔ ان حقوق کی تنسیخ یا ترمیم عام نقصان اور بے اطمینانی پیدا کئے بغیر ممکن نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جنگ عظیم کے دباؤ کی وجہ سے زر کے معیاروں کو نظرانداز کیا گیا اور اکثر ملکوں نے حکومت کے اخراجات کے لئے زائد از ضرورت زر جاری کیا۔ لیکن ہندوستان کی حد تک

ایسا نہیں ہوا۔ یہاں جنگ کے زمانے میں حقیقی ضرورت کے لحاظ سے زیادہ زر جاری کیا گیا۔ اس کے برخلاف اکثر شریک جنگ ملکوں میں یہ طریقہ مصنوعی تھا۔ ہندوستان میں زائد زر اس وجہ سے جاری کرنا پڑا کہ ہندوستان کو باہر سے رقوم واجب الوصول تھیں۔ ان مطالبات کی ادائی لندن میں اسٹرلنگ کی شکل میں کی گئی لیکن یہ رقوم حسب معمول ہنڈی یا فلز روانہ کر کے ہندوستان نہیں بھیجی جا سکتی تھیں۔

بد قسمتی سے ہندوستان اس وقت مالی حیثیت سے اس قابل نہیں تھا کہ اپنی اس آمدنی کو جو موافق توازن تجارت کی وجہ سے ہو رہی تھی قیمتی فلز کے علاوہ کسی اور طرح مشغول کرے۔ ہندوستان میں موافق تجارت کو بے باق کرنے کے لئے ملک کے باہر مشغولات اصل کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ یہ زر کے سرکاری انتظام کی خرابیوں میں سے ایک خرابی تھی۔ جنگ کے زمانے میں حکومت برطانیہ کے قرضے کے تمسک ہندوستان میں کامیابی سے جاری کئے جا سکتے تھے۔ اس کے علاوہ اگر ہندوستان کے اضلاع کے سرکاری خزانوں کے توسط سے لندن میں حکومت ہند کے رکھے ہوئے اسٹرلنگ کے تمسکات کی فروخت کا انتظام کر کے ان کو خریدنے کے لئے ہندوستانی شغل اصل کرنے والوں کی ہمت افزائی کی جاتی تو بھی بہت کچھ سہولت پیدا ہو سکتی تھی۔

جنگ کے زمانے میں معیار سے ہٹنا حق بجانب رہا ہو۔ لیکن جنگ کے اختتام پر یہ ضروری تھا کہ ملک کے زر کے معیار میں کسی مزید ترمیم کو روک کر لوگوں کے حقوق کا تحفظ کیا جاتا۔ اگر صرف یہ سوال تھا
۳۳۱ کہ تجارت کی مشکلات برداشت کی جائیں یا قانونی معیار سے انحراف کیا جائے تو اول الذکر چارۂ کار کو بلا پس و پیش ترجیح دینی چاہئے تھی۔ تجارت کو زر کے معیار کے مطابق ہو جانا چاہئے تھا نہ کہ زر کے معیار کو تجارت کے مطابق۔

باب ۷

چاندی کی گرانی بالکل مصنوعی تھی۔ اگر اس کی برآمد کی بندشیں ہٹالی جاتیں اور ساتھ ہی شرح مبادلہ کو بڑھانے سے انکار کر دیا جاتا (اور اس حد تک چاندی کی فروخت کو غیر نفع بخش بنا دیا جاتا) تو چاندی کی قیمت خود بخود گر جاتی۔ اس کے علاوہ اس صورت حال کا مقابلہ حکومت اس طرح بھی کر سکتی تھی کہ تازہ روپے کی ڈھلائی موقوف کر دیتی اس لئے کہ ملک میں روپیہ کافی سے زیادہ موجود تھا۔ دوسرے یہ کہ وزیر ہند کی ضروریات سے زیادہ کونسل بل فروخت نہ کرتی۔

اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ حکومت کے لئے صرف یہی دو راستے کھلے ہوئے تھے کہ شرح مبادلہ بڑھا دی جائے یا چاندی کے سکوں میں کھوٹ ملائی جائے تو بھی موخرالذکر چارہ کار کمتر خرابی کا باعث ہوتا۔ یہ کوشش کہ شرح مبادلہ چاندی کے نرخوں کے مطابق رہے بے سود تھی۔ اس کے علاوہ چاندی کی گرانی کے زمانے میں سونے کی بجائے اس کا استعمال کفایت شعاری کے خلاف تھا۔

۳۵ رپورٹ کے بارے میں حکومت کی کارروائی

حکومت نے کمیٹی کی سفارشیں منظور کر لیں اور ان کو نافذ کرنے کے لئے حسب ذیل کارروائی کی:-

(۱) مبادلے کی نگرانی۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں کونسل ڈرافٹ کی طلب موقوف ہوگئی تھی اور ریورس کونسل کی طلب بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ جنوری کے مہینے میں ڈرافٹ فی روپیہ ۲ شلنگ کی شرح کے حساب سے فروخت کئے گئے جو کونسل بل کی فروخت کا نرخ تھا لیکن کمیٹی کی سفارش کے مطابق حکومت نے یہ اعلان کیا کہ کونسل ڈرافٹ اور برقی انتقالات ہر ہفتے مسابقتی نرخوں کی کوئی اقل شرح مقرر کئے بغیر فروخت کئے جائیں گے اور یہ کہ آئندہ سے ریورس ڈرافٹ اور برقی انتقالات ضرورت کے موقع پر ہندوستان میں بھی جاری کئے جائیں گے اور ان کی قیمت ۱۱،۳۰۰۱۶ گرین خالص سونے کے مساوی القدر اسٹرلنگ کے برابر ہوگی جس کا انحصار اسٹرلنگ

اور ڈالر کی باہمی شرح مبادلہ پر ہوگا۔ البتہ اس قیمت میں سونے کے مصارف ترسیل کی کمی ہو جائے گی۔

(۲) زر قانونی کی حیثیت سے ساورن کی قدر مبادلہ میں تغیر۔
فی ساورن ۱۰ روپے کی شرح کو اندرون ملک اس وقت تک موثر نہیں بنایا جا سکتا تھا جب تک کہ سونے پر اس شرح کے مقابلے میں بڑھوتری مل رہی تھی جس کی کمیٹی نے سفارش کی تھی۔ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ کچھ سال ص ۳۳۲
بیشتر ۱۹۱۷ء میں حکومت نے کس طرح نجی طور پر درآمد کیا ہوا سونا لازمی طور پر حاصل کرنا اور ستمبر ۱۹۱۷ء سے اس کی بڑھوتری کو کم کرنے کی خاطر ہر پندرھویں روز فروخت کرنا شروع کیا۔ لیکن اس کے باوجود سونے پر بڑھوتری اس قیمت کے مقابلے میں زیادہ رہی جس کی اسمتھ کمیٹی نے سفارش کی تھی۔ فروری ۱۹۲۰ء میں حکومت نے یہ اعلان کیا کہ آئندہ چھ مہینے میں کم از کم ۵ ملین تولے خالص سونا فروخت کیا جائے گا۔ لیکن اس پروگرام میں توسیع کر کے اگست اور ستمبر میں بھی فروخت کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ سونے کی بڑی مقدار اوسطاً فی تولہ ۲۳ روپے کے حساب سے فروخت کرنے کے بعد اکتوبر ۱۹۲۰ء میں اس کی فروخت موقوف کر دی گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سونے کی قیمت جو حکومت کے سونا فروخت کرنے کی وجہ سے کسی حد تک قابو میں آگئی تھی پھر چڑھ گئی۔ اس لئے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ حکومت کی پالیسی کے اس جزو کو ناکامی ہوئی۔

ضابطہ نمبر (۳) بابت ۲۱/ جون ۱۹۲۰ء کی رو سے ساورن اور نصف ساورن کی حیثیت لین دین میں زر قانونی کی نہیں رہی۔ لیکن ۲۱ دن کی مہلت دی گئی جس میں حکومت ان کو فی ساورن ۱۵ روپے کی شرح سے لے سکتی تھی۔ اس مدت کے ختم پر برطانوی سونے کے سکوں کی درآمد کی بندشیں بھی ہٹا لی گئیں۔ بہرحال ۲۱ دن کی مہلت کے زمانے میں زر کے دفاتر اور خزانوں میں تقریباً ½۲ ملین پاؤنڈ کی مالیت کے ساورن اور نصف ساورن داخل کئے گئے۔

۱۹۲۰ء میں ہندوستانی سکہ سازی کا ترمیمہ قانون منظور ہوا جس میں زر کی کمیٹی کی اس سفارش کو عملی جامہ پہنایا گیا کہ ساورن کو ۱۵ روپے کی بجائے ۱۰ روپے کی شرح سے ہندوستان میں زر قانونی قرار دیا جائے۔ اس قانون نے ساورن اور نصف ساورن کے زر قانونی ہونے کے رتبے کو بحال کر دیا جو ضابطہ نمبر (۳) بابت ۲۱/ جون ۱۹۲۰ء کے لحاظ سے ان سے لے لیا گیا تھا۔ جدید قانون میں فی ساورن ۱۰ روپے کی شرح مقرر کی گئی اور خزانوں اور زر کے دفتروں کے نام ہدایتیں جاری کر دی گئیں کہ اگر ساورن اور نصف ساورن پیش کئے جائیں تو انھیں بہ ترتیب ۱۰ روپے اور ۵ روپے کے حساب سے قبول تو کر لیا جائے لیکن جاری نہ کیا جائے۔ چونکہ ساورن کی بازاری قیمت ۱۰ روپے سے زائد رہی اس لئے وہ نئی شرح پر زر کے طور پر رواج نہ پا سکا۔ اسی لئے بمبئی میں سونے کی ٹکسال کھولنا غیر ضروری خیال کیا گیا۔

(۳) جنگ کے زمانے کی بندشوں کی تنسیخ۔ فروری ۱۹۲۰ء میں چاندی درآمد کرنے کی اجازت مل گئی (البتہ برآمد کرنے کی ممانعت بدستور قایم رہی) اور چاندی پر سے فی اونس ۴ آنے کا درآمدی محصول بھی اٹھا لیا گیا۔ اسی طرح وہ اعلانات بھی منسوخ کر دیے گئے جن میں جنگ کے زمانے میں سونے اور چاندی کے سکوں کو زر کے سوا کسی اور طریقے پر کام میں لانے یا بڑھوتری پر ان کا لین دین کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ مئی ۱۹۲۰ء سے چاندی کی قیمت گرنا شروع ہوئی اور چاندی کے سکے جو چل رہے تھے واپس آنے لگے۔ ان حالات میں ان بقیہ بندشوں کا ہٹا لینا بھی ممکن ہو گیا جو جنگ کے زمانے میں قیمتی دھاتوں کی نقل و حرکت پر عائد کی گئی تھیں۔
۲۱/ جون کو سونے اور بدیسی سکوں کی درآمد کی بندشیں اٹھا لی گئیں۔ چند ہی روز کے بعد وہ پابندی بھی ہٹا لی گئی جو حکومت کی طرف سے رقوم کی
ادائی میں چاندی کے استعمال پر لگائی گئی تھی اور خزانے کے عہدہ داروں ۳۳۳
کو ہدایت کر دی گئی کہ آیندہ سے رقم حاصل کرنے والا جس قسم کا زر طلب کرے

وہ اس کو دیا جائے۔ نوٹوں کو روپے میں تبدیل کرنے کی سہولتیں جو ملتوی کر دی گئی تھیں ان کو از سر نو جاری کرنے کی کوشش کی گئی۔ مثلاً خزانے کے عہدہ داروں کو ہدایت کر دی گئی کہ اگر نوٹ مناسب طور پر تھوڑی مقدار میں پیش کئے جائیں تو ان کے معاوضے میں امکانی حد تک چاندی دی جائے۔ مختصر یہ کہ سنہ ۱۹۲۰ء کے اختتام سے قبل چاندی کی حد تک زر کی کمیٹی کی سفارشوں پر پوری طرح عمل ہو گیا۔

محفوظ ذخیرہ زر کاغذی کو جدید طریقے پر قائم کرنے کے بارے میں جو تدابیر اختیار کی گئیں ان کا حال بعد میں چل کر بیان کیا جائے گا۔

۳۶ ریورس کونسلز کی فروخت

اب تفصیل سے یہ بیان کیا جائے گا کہ کس طرح حکومت نے فی روپیہ ۲ شلنگ سونے کی نئی شرح کو برقرار رکھنے کی کوشش کی اور کیوں اس میں سخت ناکامی ہوئی۔ جس دن اسمتھ کمیٹی کی رپورٹ شایع ہوئی ہے انگلستان اور امریکہ کی باہمی شرح مبادلہ[1] ۱ پاونڈ = ۳٫۶۵ ڈالر تک گر چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ اگر حکومت روپے کی قدر مبادلہ ۲ شلنگ سونے کے حساب سے برقرار رکھنے پر تلی رہتی تو روپے اور اسٹرلنگ کی موجودہ شرح مبادلہ میں بھی بہت کچھ اضافہ ہونا ضروری تھا۔ ان حالات میں ہندوستان کے برآمد کرنے والے تاجر اپنی برآمدی ہنڈیوں کو جلد سے جلد نقد کرانے کی فکر میں تھے۔ غرض یہ تھی کہ شرح مبادلہ کے اضافے سے خود کو محفوظ کر سکیں۔ ہنڈیوں کو روپوں میں تبدیل کرانے کے لئے برآمد کرنے والے تاجروں کی یہ یورش خود روپے کی قدر اسٹرلنگ بڑھانے کے لئے کافی تھی چنانچہ

---

[1] لندن اور نیویارک کی باہمی شرح ہندوستان میں "امریکن کراس ریٹ" یا "نیویارک کراس ریٹ" American cross Rate or New york cross Rate کہلاتی ہے "کراس ریٹ" (cross Rate) وہ شرح مبادلہ ہے جو اپنے ملک سے باہر کسی دو ممالک کے درمیان ہو"۔ ملاحظہ ہو اسٹانلی جیونس کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۲۱ حاشیہ۔

ایسا ہی ہوا اور فی روپیہ ۲ شلنگ سونے کی شرح کے اعلان کے ۳ دن کے اندر ہی روپے اور اسٹرلنگ کی شرح مبادلہ ۲ شلنگ $\frac{1}{2}$ ۸ پنس ہوگئی۔ ڈالر اور اسٹرلنگ کی شرح مبادلہ میں مزید کمی ہوئی اور اس کی وجہ سے روپے کی شرح اور بھی بڑھ گئی۔ چنانچہ ۱۱/ فروری کو یہ شرح ۲ شلنگ $\frac{1}{2}$ ۱۰ پنس تھی۔ اتنے اضافے کی اس سے قبل کوئی نظیر نہیں ملتی۔ لیکن اس کے بعد رد عمل شروع ہوا۔ اپنی ہنڈیوں کو نقد کرانے کے لئے برآمد کرنے والوں کی یورش میں کمی ہوگئی تھی۔ لیکن دوسری طرف حکومت کے شرح مبادلہ کے متعلق فیصلے کی وجہ سے اسٹرلنگ کی طلب روز بہ روز بڑھتی گئی۔ کاروباری فرموں اور نجی اشخاص نے انگلستان کو رقم روانہ کرنے میں جلدی شروع کی، حالانکہ معمولی حالات میں وہ شرح مبادلہ کے اتفاقی اضافے سے فائدہ اٹھانے کے لئے کئی مہینے انتظار کیا کرتے تھے۔

جنگ کے زمانے میں عوام کے بعض حلقوں نے جو کثیر نفع کمایا اس کی وجہ سے نئی کمپنیاں قائم کرنے کی دھوم دھام شروع ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بدیسی کلوں اور مشینوں کے لئے غیر معمولی طور پر بڑی بڑی فرمائشیں بھیجی گئیں اور ان فرمائشوں کے ساتھ پیشگی رقم روانہ کی گئی تاکہ جس وقت تک بڑھی ہوئی شرح مبادلہ رہے اس سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے۔ مبادلے میں سٹے کا بھی زور رہا۔ اس لیے کہ بڑھی ہوئی شرح مبادلہ کے زمانے میں روپے کے اسٹرلنگ اور شرح گرنے پر جس کا سٹہ بازوں کو بخوبی اندازہ ہوتا تھا اسٹرلنگ کے روپے بنا کر کافی منافع کمایا جا سکتا تھا۔ صد ۳۳۲

اسٹرلنگ کی طلب بڑھ جانے سے اس کی قدر مبادلہ بڑھ گئی دوسرے الفاظ میں روپے کی قدر مبادلہ گر گئی۔ اس طرح بازاری شرح اور سرکاری شرح میں جو فرق پیدا ہوگیا اور جو بعض اوقات ۳ پنس اور ۴ پنس تک ہو جاتا تھا اس کی وجہ سے ریورس کونسل کی طلب میں

بہت اضافہ ہوگیا۔

شرح مبادلہ کے گھٹنے کی غالباً سب سے اہم وجہ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے یہ تھی کہ جنوری ۱۹۲۰ء سے توازن تجارت ہندوستان کے خلاف ہوتا نظر آرہا تھا۔ تجارت کا یہ میلان ماہ بہ ماہ زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔ ابتداءً ۵ فروری سے حکومت نے فی روپیہ ۲ شلنگ ۸ پنس کے حساب سے ریورس کونسل فروخت کرنا شروع کئے۔ ۱۲/ فروری کو یہ شرح بڑھ کر ۲ شلنگ ۲۷/۳۲ .۱۰ پنس کر دی گئی۔ لیکن اس تاریخ کے بعد سے جیسے جیسے اسٹرلنگ کی قدر مبادلہ بڑھی اس شرح میں بھی کمی ہوتی گئی۔ ماہ جون کے ختم تک توازن تجارت ہندوستان کے بالکل خلاف ہوگیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مبادلے کی بازاری شرحیں نہ صرف سونے کی قیمت سے بے تعلق ہوگئیں بلکہ فی روپیہ ۲ شلنگ اسٹرلنگ کی شرح سے بھی نیچے آگئیں۔ اس کے بعد حکومت نے فی روپیہ ۲ شلنگ اسٹرلنگ شرح قائم کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ۲۴/ جون اور اس کے بعد کی تاریخوں میں فوری برقی انتقالات کا نرخ ۱ شلنگ ۱۹/۳۲ ۱۱ پنس رکھا گیا۔ ایسا کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ یہ نرخ اس شرح کی نمایندگی کرتا تھا جو اسٹرلنگ اور سونے کی قیمتوں میں مطابقت پیدا ہونے پر قائم ہونے والی تھی۔ لیکن سچ پوچھو تو اس کا یہ مطلب تھا کہ حکومت اسمتھ کمیٹی کی سفارش کے مطابق ۲ شلنگ سونے کی شرح کو روبہ عمل لانے سے مایوس ہو چکی تھی۔ کیونکہ پچھلے مہینے کی قلیل مدت کے اندر یہ شرح بڑھی بھی اور بالآخر گر گئی۔ مبادلے کی بازاری شرح کے گرنے کا سلسلہ جاری رہا اور حکومت اس کے اتار کو نہ روک سکی۔ آخر میں حکومت بازاری شرح کے مطابق اپنی شرح کو کم کرنے پر مجبور ہوگئی۔ البتہ یہ اصول رکھا گیا کہ سرکاری شرح بازاری شرح کے مقابلے میں کسی قدر زیادہ رہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ اصول زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لئے حکومت نے شرح مبادلہ کی نگرانی ترک کر دی۔ ستمبر ۱۹۲۰ء کے اختتام پر شروع سال سے

جاری کئے ہوئے ریورس کونسل کی مالیت ۵۵٫۳۸٫۲۰۰ پاونڈ ہو چکی تھی۔ ریورس کونسل کی ادائی لندن میں ان رقوم سے ہوتی تھی جو ذخیرۂ زر کاغذی کے اسٹرلنگ تمسکات اور خزانے کی ہنڈیوں کی فروخت سے حاصل ہوتی تھیں۔ یہ تمسکات اور ہنڈیاں فی پاونڈ ۱۵ روپے کے حساب سے خریدی گئی تھیں۔ لیکن اب ان کو فی پاونڈ ۷ تا ۱۰ روپے کے حساب سے فروخت کیا گیا قیمت خرید اور قیمت فروخت کے اس فرق سے ہندوستانی مالیہ پر جو نقصان عائد ہوا اس کی مجموعی مقدار ۳۵ کروڑ روپیہ ہوئی۔ ۳۳۵ ص

علاوہ اس بھاری نقصان کے جو ہندوستانی مالیہ کو ریورس کونسلز کی فروخت کے سلسلے میں برداشت کرنا پڑا شرح مبادلہ کے آخر میں گر جانے کی وجہ سے کاروبار بھی کئی طرح سے مندا ہو گیا۔ ریورس کونسلز کی فروخت کی وجہ سے زر کی مقدار ملک میں بہت کم ہو گئی تھی۔ چنانچہ یکم فروری سنہ ۱۹۲۰ء اور ۱۶/ستمبر سنہ ۱۹۲۰ء کے درمیان نوٹوں کا چلن ۱۸۵ کروڑ روپے سے گھٹ کر ۱۵۸ کروڑ روپے رہ گیا۔ اس لئے کہ حکومت کو ریورس کونسلز کے معاوضے میں جو نوٹ وصول ہوتے تھے ان کو وہ زائل کر دیتی تھی۔ زر کی مقدار میں اس طرح کمی ہو جانے پر بھی شرح مبادلہ برقرار نہ رہ سکی جس کی وجہ یہ تھی کہ درآمدی تجارت میں غیر معمولی گرم بازاری رہی اور اس کے جواب میں برآمدی تجارت میں کوئی سرگرمی نہیں پیدا ہوئی۔ دوسری طرف زر کی کمی سے ملک میں اس کی قلت محسوس ہونے لگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشیا کی قیمتیں گر گئیں۔ ان دونوں واقعات کا اثر مجموعی طور پر یہ پڑا کہ کاروباری اشخاص کی مشکلات بہت بڑھ گئیں اور وہ اپنے مال کو انتہائی کم داموں فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے جس سے ان کو کافی نقصان ہوا۔

لیکن تجارتی طبقے کو سب سے زیادہ نقصان اس وجہ سے اٹھانا پڑا کہ اس نے حکومت پر اعتماد کیا کہ وہ اپنی بڑھائی ہوئی شرح مبادلہ کو برقرار رکھیگی۔ دوسرے ملکوں کو اشیا کی فرمائشیں اسی امید اور یقین کے ساتھ بھیجی گئی تھیں کہ بڑھی ہوئی شرح مبادلہ بہت گر چکی تھی۔ اس کا نتیجہ

اس بات کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ بہت سے درآمد کرنے والے تاجروں کا دیوالہ نکل گیا جو حکومت پر پورا بھروسا کئے بیٹھے تھے کہ وہ ان کے موافق بڑھائی ہوئی شرح مبادلہ کو برقرار رکھ سکے گی اور جنھوں نے اسی امید پر مبادلے کے بارے میں حفاظتی تدابیر اختیار نہیں کیں ۔

۳۷ حکومت کی پالیسی پر نقد و نظر

لیکن ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اکثر دوراندیش اور پختہ کار کاروباری اشخاص اعلیٰ شرح مبادلہ کے قیام کو ناممکن نہیں خیال کرتے تھے خواہ اس کے مناسب ہونے کے بارے میں ان کا کچھ ہی خیال رہا ہو۔

حکومت کو خود یقین تھا کہ شرح مبادلہ فی روپیہ ۲ شلنگ سونا برقرار رکھنا ممکن ہے لیکن بے بینگ ٹن اسمتھ کمیٹی کی رپورٹ سے مکرر یقین ہو گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ مسٹر دلال نے اپنی قابلانہ اختلافی یادداشت میں بڑھی ہوئی شرح کے خلاف پر زور دلائل پیش کیے اور اس کی خرابیوں کو تفصیل سے واضح کیا ۔ لیکن انھوں نے بھی بظاہر اس بات پر کوئی خاص زور نہیں دیا کہ اس شرح کو طویل مدت تک برقرار رکھنا قطعاً ناممکن تھا ۔

بہر حال یہ عجیب بات ہے کہ خلاف توقع کسی نے اس بارے میں کوئی شبہہ نہیں کیا کہ نئی شرح برقرار رکھی جا سکتی ہے ۔ جب حکومت نے بے بینگ ٹن اسمتھ کمیٹی کی سفارشوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا ہے تو اس کے سامنے ایسے کئی واقعات تھے جو زر کے معیار میں رد و بدل کرنے سے اس کو باز رکھ سکتے تھے ۔ مثلاً اگست ۱۹۲۰ء میں جب کہ جدید شرح کا نفاذ ہونے والا تھا سونا فی تولہ ۲۳½ روپے کے حساب سے بک رہا تھا حالانکہ نئی شرح کے حساب سے سونے کی قیمت ۱۵ روپے ۱۴ آنے ہونی چاہئے تھی ۔ ظاہر ہے کہ اتنا بڑا فرق موجود ہوتے ہوئے فی روپیہ ۲ شلنگ سونے کی شرح کو برقرار رکھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا ۔ اس کے علاوہ یہ خطرہ تقریباً دور ہو چکا تھا کہ روپے گلائے جائیں گے اس لئے کہ چاندی کی قیمت بھی تقریباً

فی اونس ۴۴ پنس تک گر گئی تھی۔ اور اگر تھوڑے بہت روپے گلا بھی جاتے تو کچھ ایسا مضایقہ نہ تھا کیونکہ بہ افراط روپے چل رہے تھے[1]

بے بنگ ٹن اسمتھ کمیٹی نے چاندی کی گرانی کو شرح مبادلہ کے اضافے کا ایک اہم سبب قرار دیا۔ لیکن سچ پوچھو تو واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے صورت حال کا صحیح مطالعہ نہیں کیا۔ حقیقت میں روپے کی قدر بحوالۂ اسٹرلنگ بڑھ جانے کا سب سے اہم سبب یہ تھا کہ اشیار کی قیمتیں روپے میں جتنی بڑھی تھیں اس سے زیادہ بحوالۂ اسٹرلنگ بڑھ گئی تھیں۔ اصول مساوات قوت خرید کے مطابق توازن قایم کرنے کے لئے شرح مبادلہ کا بڑھنا لازمی تھا۔ یہ اصول اس کمی کی بھی توجیہ کرتا ہے جو بعد میں شرح مبادلہ میں ہوئی اور جس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۲۰ء سے ہندوستانی اشیا کی قیمتوں کے مقابلے میں دنیا کی اشیا کی قیمتیں بحوالۂ اسٹرلنگ زیادہ تیزی سے گر گئی تھیں۔ اسی لئے یہ صورت حال روپے کے خلاف ثابت ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۰ء میں اور اس کے چند سال بعد تک اس کی قدر بحوالۂ اسٹرلنگ گری ہوئی رہی اور اس کے بعد پھر اس میں اضافہ ہوا یہاں تک کہ وہ ۱ شلنگ ۶ پنس تک پہنچ گئی[2]

---

[1] ملاحظہ ہو امبیڈکر کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۲۰۷۔

[2] "چاندی کی گرانی حقیقت میں محض اتفاقی تھی جو بڑی حد تک سٹے کی وجہ سے رونما ہوئی تھی۔ ہندوستانی زر کے بارے میں اسمتھ کمیٹی کی رپورٹ میں سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اشیا کی قیمتوں کے پے در پے تغیرات کو غیر اہم سمجھکر نظر انداز کر دیا گیا تھا اور محض چاندی کی ان قیمتوں پر توجہ مرکوز کی گئی تھی جو سٹے کا نتیجہ تھیں۔ روپے کا تعلق سونے سے بہ شرح ۲ شلنگ قایم کر کے اسمتھ کمیٹی نے چاندی کی گرانی کی حقیقی نوعیت سے چشم پوشی کی اور اس شرح کو برقرار رکھنے کے لئے زر کی مقدار میں جس حد تک کمی ہونی چاہیے تھی اس کا بھی اندازہ گھٹا کر کیا۔ دوسرے ملکوں میں قیمتوں کی رفتار کے متعلق کمیٹی نے جو پیشین گوئیاں کی ہیں وہ اس درجہ مضحکہ خیز ہیں کہ

فی روپیہ ۲ شلنگ سونے کے معنی یہ ہوئے کہ اُس وقت بازار میں ایک روپے کا جس قدر سونا مل سکتا تھا اس سے کہیں زیادہ اس کی قدر بڑھا دی گئی۔ اس کے علاوہ روپے کی قدر سونے میں مقرر کرنے کی کوشش قبل از وقت تھی، اس لئے کہ خود سونے کی قیمت میں انتہائی سرعت سے تغیرات ہو رہے تھے اور بین قومی تجارت کے حالات نہایت غیر مستحکم تھے [1]

ایک حد تک چاندی کی گرانی اس وجہ سے ہوئی کہ نہ صرف روپے بلکہ اسٹرلنگ کی قیمت بھی بحوالۂ اشیا عام طور پر گر گئی تھی۔ اب اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ شرح مبادلہ میں اضافہ خاصکر چاندی کی گرانی سے ہوا تھا تو یہ گرانی بھی محض سٹہ بازی کا نتیجہ تھی، کیونکہ چاندی کی قیمت میں جو عظیم تغیرات ہوئے جیسا کہ مندرجۂ ذیل جدول میں بتلایا گیا ہے [2] ان سے بخوبی اندازہ ہو سکتا تھا کہ یہ حالت بالکل عارضی اور ناپایدار تھی۔ صـ ٣٣٧

چاندی کی قیمت بحساب فی اونس اسٹرلنگ (پنس) میں

سال	انتہائی نرخ	کم سے کم نرخ	اوسط	تغیرات کا فرق
۱۹۱۶ء	٣٧ ١/٨	٢٦ ١١/١٦	٣١ ٥/١٦	١٠ ٧/١٦
۱۹۱۷ء	٥٥	٣٥ ١١/١٦	٤٠ ١/٨	١٩ ١١/١٦
۱۹۱۸ء	٧٩ ١/٨	٤٧ ٣/٤	٥٧ ١/١٦	٣١ ٣/٨
۱۹۲۰ء	٨٩ ١/٢	٣٨ ١/٢	٦١ ٧/١٦	٥٠ ٥/٨
۱۹۲۱ء	٤٣ ١/٨	٣٠ ٥/٨	٣٧	١٢ ٣/٤

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ تاریخ میں ان کی مثال ملنا مشکل ہے۔" ملاحظہ ہو وکیل اور مورنجن کی کتاب محولہ بالا صـ ٣٤٠ تا صـ ٣٤١۔

[1] ملاحظہ ہو گشتا و کیسیل کی یادداشت ہلٹن ینگ کمیشن کی رپورٹ جلد سوم ضمیمہ ٩٢ میں۔

[2] ملاحظہ ہو ابیڈکر کی کتاب محولۂ بالا صـ ٢٠٤۔

حکومت اپنے بچاؤ میں صرف یہ کہہ سکتی تھی کہ جب اس نے خصوصی ماہروں کی ایک کمیٹی بٹھادی تھی تو وہ اس کمیٹی کے مشورے پر عمل کرنے کے لئے مجبور تھی، خاصکر اس لئے بھی کہ اس وقت کے صرا مر غیر معمولی حالات کی وجہ سے وہ آیندہ واقعات کا صاف طور پر اندازہ نہیں لگا سکتی تھی ۔ لیکن حکومت پر سب سے بھاری الزام یہ نہیں تھا کہ کیوں اس نے اپنی پالیسی ابتداءً بے بنگ ٹن اسمتھ کمیٹی کے مشورے کے مطابق مقرر کی تھی بلکہ فی روپیہ ۲ شلنگ سونے کی شرح کو موثر طور پر قائم رکھنے کی کوشش بے سود پانے کے باوجود وہ کیوں بدستور ریورس کونسل جاری کرتی رہی ۔ جون ۱۹۲۰ء کے اختتام پر یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی تھی کہ حکومت نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اس کا پورا کرنا محال تھا اور اس لئے جرأت اور دانشمندی اسی میں تھی کہ حکومت ابتدا ہی میں علانیہ ہار مان لیتی ۔ لیکن باوجود اس کے حکومت بڑھی ہوئی شرح مبادلہ کو قائم رکھنے پر اڑی رہی اور اس میں اپنے سونے کا بہت سا ذخیرہ ضائع کر دیا اور تجارت وصنعت میں بری طرح خلل انداز ہوئی ۔ چنانچہ بقول سر اسٹانلی ایڈ ” وہ پالیسی جو حقیقت میں شرح مبادلہ کے استحکام کے لئے اختیار کی گئی تھی وہ ایک معتبر ملک کے مبادلے کی شرحوں میں زبردست تغیرات اور اس کی تجارت میں عام خلل کا باعث ہوئی ۔ اس سے حکومت کو بھی بھاری نقصان اٹھانا پڑا اور سیکڑوں بڑے بڑے تاجروں کی حالت اس درجہ نازک ہوگئی کہ صرف دیوالہ نکلنا باقی رہ گیا “۔

۳۸ دانشمندانہ خاموشی کی پالیسی ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۵ء	شرح مبادلہ کے استحکام کی ناکام کوشش کے بعد حکومت کچھ عرصے تک کوئی قطعی کاروائی کے بغیر واقعات کی رفتار کا بغور مطالعہ کرتی رہی ۔

۱۹۲۱ء میں توازن تجارت ہندوستان کے خلاف رہا ۔ برآمدی تجارت کی کساد بازاری کی وجہ یہ تھی کہ دنیا میں اشیا کی قیمتیں سونے میں گر گئی تھیں اور اس سے بھی بڑھ کر ایک وجہ یہ تھی کہ قیمتیں بحوالہٗ اسٹرلنگ اور بھی

زیادہ کم ہوگئی تھیں، کیونکہ انگلستان نے دوبارہ اسٹرلنگ اور سونے کی قیمتوں کو مساوات پر قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان حالات میں وہی ہوا جس کی توقع تھی اور روپے کی قدر بحوالہ اسٹرلنگ گر گئی۔ ۱۹۲۱ء کے دوران میں حکومت نے زر کے چلن میں تقریباً ۳۱ لاکھ ۵۸ ہزار روپے کی کمی کر دی۔ لیکن یہ کارروائی شرح مبادلہ کے اتار کو روکنے کے لئے ناکافی ثابت ہوئی۔ چنانچہ شرح گھٹتے گھٹتے ۱ شلنگ ۳ پنس پر آگئی۔ ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۳ء میں بھی زر کی مقدار کم کرنے کا سلسلہ جاری رہا اور وہ اس طرح کہ لندن میں جو اسٹرلنگ کے تمسکات رکھے ہوئے تھے انھیں وزیر ہند کے نقد فاضلات میں منتقل کر دیا گیا اور ہندوستانی خزانے کی ہنڈیوں کو ذخیرے سے خارج کر دیا گیا۔ روپے کی قدر مبادلہ کی مزید کمی کو روکنے کی خاطر وزیر ہند نے کونسل ڈرافٹ کی فروخت بھی موقوف کر دی۔

۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۳ء میں ہندوستان کی زرعی پیداوار اور یورپی ملکوں کی قوت خرید میں اضافہ ہونے سے ہندوستان کی برآمدی تجارت میں ترقی شروع ہوئی۔ زر کی مقدار کے گھٹ جانے اور برآمدی تجارت کے بڑھ جانے کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ روپے کی قدر مبادلہ بتدریج بڑھنے لگی۔ ستمبر ۱۹۲۳ء میں روپے کی قدر تقریباً ۱ شلنگ ۴/۱ ۳ پنس سونے کے مساوی ہوگئی اور اس موقع پر زمانۂ قبل از جنگ کی ۱ شلنگ ۴ پنس کی شرح ملک کے کسی طبقے کو نقصان پہنچائے بغیر آسانی سے بحال کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ اس بارے میں ہندوستانی ایوان تجارت نے حکومت پر اثر ڈالنے کی ناکام کوشش بھی کی۔ لیکن حکومت بظاہر یہ کوشش کر رہی تھی کہ شرح بڑھا کر ۱ شلنگ ۶ پنس تک لے جائے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اکتوبر ۱۹۲۴ء میں روپے کی قیمت بڑھ کر ۱ شلنگ ۶ پنس اسٹرلنگ ہوگئی۔ اس کے بعد حکومت کی کوشش یہ رہی کہ روپے کی قیمت کو اس حد سے آگے بڑھنے سے روکا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے

حکومت نے رقوم کی ترسیل کے لئے حسب ضرورت یا زائد از ضرورت اسٹرلنگ آزادی سے خریدنا شروع کیا اور ان خریداریوں کے مقابلے میں تازہ زر جاری کیا گیا۔ اس طرح ضمنی طور پر زر کی وہ قلت کسی حد تک کم ہوگئی جو حکومت کی زر کی مقدار گھٹانے کی پالسی سے پیدا ہوگئی تھی۔ اپریل ۱۹۲۵ء میں ۳۳۹
روپے کی قدر مبادلہ ا شلنگ ۶ پنس سونے تک پہنچ گئی اور ۱۲ ستمبر ۱۹۳۱ء تک یہی شرح قائم رہی یا جیسا کہ حکومت کے نقادوں کا کہنا ہے اس کو قائم رکھا گیا[1]

اب حکومت کی خاموش رہنے کی پالسی ختم ہوتی نظر آرہی تھی۔ حکومت ہند نے مختلف حلقوں کی متواتر استدعاؤں کے جواب میں یہ وعدہ کیا کہ خصوصی ماہروں کی ایک کمیٹی زر کی صورت حال کی تحقیق کے لئے ۱۹۲۵ء کے اوائل میں مقرر کی جائے گی جو اپنا کام سال ختم ہونے سے پہلے مکمل کرلیگی اور اس وقت تک حکومت کو یہ توقع تھی کہ دنیا کے حالات میں بھی کافی ثبات وسکون پیدا ہو جائے گا۔ ۲۵ اگست ۱۹۲۵ء کو ہندوستانی زر اور مبادلے کے بارے میں ایک شاہی کمیشن لفٹنٹ کمانڈر ہلٹن ینگ کی صدارت میں مقرر کیا گیا۔

اس کمیشن کے دلائل اور فیصلوں پر غور کرنے سے پہلے اصل موضوع سے ہٹ کر ہندوستانی زر کاغذی کے نظام کے ارتقا کا حال بیان کرنا مناسب ہوگا جس کے بیان میں غالباً ضرورت سے زیادہ تاخیر ہو چکی ہے۔

ہندوستانی زر کاغذی

۳۹ ابتدائی تاریخ	۱۸۰۹ء ۱۸۴۰ء اور ۱۸۴۳ء کے قوانین کے تحت بنگال بمبئی اور مدراس کے پریسیڈنسی بنک انتہائی مقدار اور

[1] ملاحظہ ہو باب ۔

محفوظ ذخائر کی بابت چند شرائط کے تابع نوٹ جاری کرنے کے مجاز کئے گئے جو حامل کو عند الطلب قابل ادائی تھے۔ لیکن ان کا چلن محدود رکھا گیا اور صرف تین پریسیڈنسی شہروں میں ان کو رواج دیا گیا۔ ۱۸۶۰ء میں جیمس ولسن ہندوستان کے پہلے رکن مالیہ نے سرکاری زر کاغذی کے متعلق اور پریسیڈنسی بنکوں کو دیے ہوئے حقوق کی تنسیخ کے بارے میں ایک تجویز مرتب کی۔ سر چارلس وڈ اس وقت کے وزیر ہند نے انگلستان کے بنک چارٹر ایکٹ بابت ۱۸۴۴ء کے نہج پر مندرجۂ ذیل اصول قرار دیے:-

نوٹ جاری کرنے کا کام بنک کاری سے بالکل الگ کر دیا جائے جیسا کہ جیمس ولسن نے بھی مشورہ دیا تھا۔ دوسرے خود سر چارلس وڈ کے الفاظ میں سرکاری تمسکات کی بنا پر جو نوٹ جاری کئے جائیں ان کی مقدار اس طرح مقرر کر دی جائے کہ وہ لین دین کی اقل ترین ضروریات سے کسی حالت میں متجاوز نہ ہوں۔ اس حد سے تجاوز کرنے کی صورت میں سکے یا فلز کی بنیاد پر نوٹ جاری کئے جائیں۔[1] چنانچہ ۱۸۶۱ء میں زر کاغذی کا قانون منظور ہوا۔ انگلستان کے برعکس ہندوستان کو نوٹ جاری کرنے والے تین حلقوں میں تقسیم کیا گیا جن کے مرکز کلکتہ بمبئی اور مدراس تھے۔ بعد میں چل کر ان حلقوں کی تعداد بڑھ گئی اور ۱۹۱۰ء تک یہ تعداد سات ہو گئی تھی۔ مزید چار حلقے رنگون، کراچی، کانپور اور لاہور تھے۔ نوٹ ۱۰ روپے، ۲۰ روپے، ۵۰ روپے، ۱۰۰ روپے، ۱۰۰۰ روپے
اور دس ہزار روپے کی رقموں کے جاری کئے گئے۔ اس سے کم رقم ۳۴۰ ص
یعنی ۵ روپے کا نوٹ ۱۸۹۱ء میں جاری کیا گیا۔ یہ نوٹ عوام کو روپوں یا برطانوی سونے کے سکوں کے معاوضے میں غیر محدود طور پر جاری کیے جا سکتے تھے۔ اور اگر ناظم زر درخواست کرے تو سونے کے

۱؎ ۔ ملاحظہ ہو کینس کی کتاب محولۂ بالا ص ۳۹ ۔

معاوضے میں بھی جاری کئے جا سکتے تھے ۔ یہ اعلان کر دیا گیا کہ یہ نوٹ متعلقہ حلقے کی حد تک سرکاری خزانوں اور نجی لین دین میں غیر محدود زر قانونی رہیں گے ۔

جاری کردہ نوٹوں کی پوری مالیت کے برابر فلز اور سکے کا ایک محفوظ ذخیرہ قائم کیا گیا ۔ البتہ اس ذخیرے کا کچھ حصہ حکومت ہند کے روپے کے تمسکات میں جن کی نقد پذیری یقینی تھی مشغول رکھا گیا ۔

ہر حلقے کے صرف صدر دفتر میں استحقاقاً نوٹوں کے روپے طلب کئے جا سکتے تھے ۔ سرکاری خزانوں پر مسافر اور ریلوے کمپنیاں دوسرے حلقوں کے نوٹوں کے روپے طلب کر سکتی تھیں ۔ سرکاری رقمیں ہر حلقے کے نوٹوں سے ادا کی جا سکتی تھیں ۔

نوٹوں کو ترانے اور بطور زر قانونی چلانے کے بارے میں بندشیں

ہندوستان بہت بڑا ملک ہے اور تجارت کی وجہ سے سال کے مختلف حصوں میں زر کی بہت بڑی نقل و حرکت ادھر سے ادھر ہوتی ہے ۔ اس لئے نوٹوں کو اولاً ترسیل رقوم کے واسطے استعمال کیا جا سکتا تھا اور فلز کی بجائے انہیں بھیجنے میں زیادہ سہولت تھی ۔ اگر حکومت نوٹوں کا چلن زر قانونی کے طور پر صرف حلقۂ اجرا تک محدود نہ رکھتی تو اسے مجبوراً ایک مقام سے دوسرے مقام کو سکہ بھیجنا پڑتا ۔ اس کے برخلاف اگر نوٹ عام طور پر تمام ملک کے لئے زر قانونی بنا دیئے جاتے اور ان کی نقد پذیری بدستور صرف تین پریسیڈنسی شہروں تک محدود رہتی تو واقعہ یہ ہے کہ سال کے بعض حصوں میں سکوں پر بڑھوتری ہو جاتی جس کی وجہ سے نوٹوں کی ہر دلعزیزی میں فرق آ جاتا ۔

لیکن نوٹوں کی ترویج اور مقبولیت کی جو معمولی رفتار ہونی چاہئے تھی اس میں حلقہ وار طریق نے بہت زیادہ رکاوٹ پیدا کی ۔ اس لئے سنہ ۱۹۰۳ء میں پہلی کارروائی یہ کی گئی کہ یہ طریق منسوخ کر دیا گیا ۔ چنانچہ

۵ روپیے کا نوٹ بجز برما کے ہر جگہ زر قانونی قرار دیا گیا اور ۱۹۰۹ء سے یہ بندش بھی اٹھالی گئی۔ اسی طرح ۱۹۱۰ء میں ۱۰ اور ۵۰ روپئے کے نوٹ تمام ملک کے لئے رائج کئے گئے اور یہ اختیار حاصل کیا گیا کہ اس سے زیادہ رقم کے نوٹ انتظامی حکم کی بنا پر بطور عام زر قانونی رائج کیے جاسکیں، چنانچہ ۱۰۰ روپیے کے نوٹ اسی طرح عام استعمال کے لئے جاری کئے گئے۔ چیمبرلین کمیشن نے سفارش کی کہ ۵۰۰ روپیے کا نوٹ بھی تمام ملک کے لئے عام کیا جائے۔ ۱۹۳۱-۳۲ء میں ۵۰۰ اور ۱۰۰۰ روپے کے نوٹ عام زر قانونی قرار دیے گئے[1]۔

نوٹوں کو اس طرح عام زر قانونی کے طور پر رائج کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوٹ جلد بہ افراط چلنے لگے۔ کئی جگہ سرکاری خزانوں پر نوٹ بھنانے کی زائد از قانونی سہولتیں مہیا کی جاچکی تھیں۔ اب پریسیڈنسی بنکوں نے بھی ان سہولتوں کو اپنے صدر دفتروں اور شاخوں تک وسیع کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ جنگ کے زمانے میں اس سمت میں مزید ترقی رک گئی، کیونکہ اس زمانے میں حسب ضرورت کافی روپے ڈھلوانے میں دقتیں پیش آرہی تھیں اور نقد پذیری کے لئے محفوظ ذخیرے کا انتظام کیے بغیر نوٹ کثیر مقدار میں جاری کردیئے گئے تھے۔ بے بنگٹن اسمتھ کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ نوٹوں کو زیادہ مقبول بنانے کے لئے جنگ کے زمانے کی بندشوں کو اٹھا لیا جائے اور نوٹ بھنانے کے لئے قانونی سہولتوں کے علاوہ دوسری آسانیاں مہیا کی جائیں۔ چنانچہ یہ آسانیاں پھر مہیا کردی گئیں۔

۱۴۲ محفوظ ذخیرۂ زر کا غذی — ۱۸۶۱ء کے قانون نے اعتباری اجرا کی انتہائی مقدار سرکاری تمسکات کی شکل میں ۴ کرور روپیے مقرر کی بعد میں خصوصی قوانین کے ذریعے اس مقدار میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں کی گئیں چنانچہ انتہائی مقدار ۱۸۷۱ء میں ۶ کرور روپے، ۱۸۹۰ء میں ۸ کرور روپے، ۱۸۹۷ء میں ۱۰ کرور روپے اور

ص ۳۴۱

[1] دیکھو ناظم زر کی رپورٹ بابت ۱۹۳۱-۳۲ء فقرہ (۶۰)

۱۹۰۵ء میں ۱۲ کرور روپے مقرر کی گئی۔ اس وقت تک تمسکات زیادہ تر حکومت ہند کے تمسکات کی شکل میں تھے جو ہندوستان میں رکھے جاتے تھے۔ لیکن ۱۹۰۵ء کے قانون نے اس کا مجاز گردانا کہ انگلستان میں بھی تقریباً دو کرور روپے کے اسٹرلنگ کے تمسکات رکھے جائیں۔ ۱۹۰۵ء سے محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی کا جو حصہ مشغول رکھا جاتا ہے اس میں سے کچھ اسٹرلنگ کے تمسکات کی شکل میں بھی ہوتا ہے[۱]۔ ۱۹۱۱ء میں محفوظ ذخیرے میں جملہ تمسکات کی انتہائی مقدار ۱۴ کرور روپے مقرر کی گئی جس میں اسٹرلنگ کے تمسکات ۴ کرور روپے کے رکھے جا سکتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ۱۸۹۸ء تک محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی بجز ایک مقررہ اعتباری حصے کے سب کا سب ہندوستان میں چاندی کے سکے کی شکل میں رکھا جاتا تھا۔ ۱۸۹۸ء کے گولڈ نوٹ ایکٹ سے حکومت مجاز ہو گئی کہ محفوظ ذخیرے کے فلزی حصے کو سونے کی شکل میں رکھے۔ ۱۹۰۵ء کے قانون کے مطابق حکومت کو پورا اختیار ہو گیا کہ محفوظ ذخیرے کے فلزی حصے کو یا فلزی حصے کے کسی جزو کو خواہ لندن میں رکھے یا ہندوستان میں، خواہ سونے کی شکل میں رکھے یا سونے کے سکوں کی شکل میں، خواہ روپے کی شکل میں رکھے یا چاندی کی شکل میں۔ لیکن شرط یہ تھی کہ تمام مسکوک روپے ہندوستان ہی میں رکھے جائیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے بجز اعتباری حصے کے جس کی انتہائی مقدار میں وقتاً فوقتاً تبدیلی کی گئی باقی تمام ذخیرہ یا تو سونے اور چاندی کی شکل میں رکھا جاتا تھا یا سکوں کی شکل میں۔ جیسے جیسے زیادہ نوٹ چلنے لگے ذخیرے کے اس جزو میں کمی ہو گئی جو مشغول رکھا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ محفوظ ذخیرے کے سیال حصے میں بھی اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ وہ بعض اوقات ۸۰ اور ۸۵ فیصد تک پہنچ جاتا تھا۔ اس کا سبب

---

[۱] دیکھو اس باب کی فصل (۱۸)، صفحہ ۳۱۰۔

یہ تھا کہ پالیسی میں دانستہ طور پر رد و بدل کیا گیا اور ذخیرے کے سیال حصے کو ایک نئے کام میں مشغول کر دیا گیا۔ وہ کام یہ تھا کہ اس سے حسب ضرورت شرح مبادلہ کو مستحکم کیا جائے۔ یہ طریقہ حقیقت میں بحیثیت مجموعی زر کے نظام کا پہلا دفاعی امور چہ خیال کیا جاتا تھا۔

اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ نقد پذیری کو یقینی بنانے کے لئے محفوظ ذخیرے کو ضرورت سے زیادہ محفوظ حالت میں رکھا گیا جو کفایت شعاری کے خلاف تھا۔ اس سے بچنے کی یہ صورت ہو سکتی تھی کہ ۳۴۲
مشغول حصہ بڑھا دیا جاتا اور اس کو بڑھانے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ جاری کردہ نوٹوں کی مجموعی مقدار سے نقد کا تناسب مقرر کر دیا جاتا۔ ایسا کرنے میں ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ اعتباری حصے کی مقدار بڑھانے کے لئے بار بار قانون نافذ کرنے کی نوبت نہ آتی۔

۳۴۳ محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی کی ترکیب پر اعتراضات مندرجۂ ذیل جدول[1] سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جنگ سے پہلے محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی کی ترکیب کیا تھی اور وہ کہاں کہاں رکھا جاتا تھا۔

بحساب لاکھ روپیہ

۳۱ مارچ	جاری کردہ مجموعی نوٹ	محفوظ ذخیرے کی ترکیب اور مقام: چاندی	سونا		تمسکات			محفوظ ذخیرے کے تمسکات کا فیصد تناسب مجموعی نوٹوں سے
		ہندوستان	ہندوستان	انگلستان	ہندوستان	انگلستان	میزان	
۱۸۶۲ء تا ۱۸۷۱ء (اوسط)	۷۶۳	۴۸۰	۳	-	۲۸۰	-	۲۸۰	۳۷

[1] ملاحظہ ہو فنڈلے شراس کی کتاب "ہندوستانی مالیات اور بنک کاری" ص ۲۵۶۔

۱۸۷۲ء تا ۱۸۸۱ء (اوسط)	۱۱۸۲	۵۹۰	–	–	۵۸۴	–	۵۸۴	۴۹
۱۸۸۲ء تا ۱۸۹۱ء "	۱۵۷۴	۹۶۴	–	–	۶۱۰	–	۶۱۰	۳۹
۱۸۹۲ء تا ۱۹۰۱ء "	۲۷۲۹	۱۵۷۴	۲۳۲	۲۳	۹۰۰	–	۹۰۰	۳۳
۱۹۰۲ء تا ۱۹۱۱ء "	۴۳۸۴	۱۹۴۵	۹۱۵	۴۰۲	۱۰۰۰	۱۲۰	۱۱۲۰	۳۶
۱۹۱۲ء	۶۱۳۶	۱۵۴۸	۲۲۴۳	۸۵۵	۱۰۰۰	۴۰۰	۱۴۰۰	۲۳
۱۹۱۳ء	۶۸۹۸	۱۶۴۵	۲۹۳۸	۹۱۵	۱۰۰۰	۴۰۰	۱۴۰۰	۲۰
۱۹۱۴ء	۶۶۱۲	۲۰۵۳	۲۲۴۴	۹۱۵	۱۰۰۰	۴۰۰	۱۴۰۰	۲۱

جنگ سے پہلے کے محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی کی ترکیب پر اہم اعتراض یہ تھے کہ (۱) ذخیرے میں فلزی حصے کی مقدار ضرورت سے زیادہ تھی؛ (۲) خاص قانون نافذ کئے بغیر مقررہ اعتباری ذخیرے کو نہیں بڑھایا جا سکتا تھا؛ اور (۳) محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی کے ایک حصے کو انگلستان میں اسٹرلنگ کے تمسکات میں مشغول کیا جاتا تھا۔

پہلے اور دوسرے عمل سے اس نظام میں لچک باقی نہیں رہتی۔ تیسرے عمل کو یہ کہکر حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ اسٹرلنگ کے تمسکات کا رکھنا روپے کی قدر مبادلہ کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری تھا اور ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ ہندوستان میں نازک حالات پیدا ہونیکی صورت میں ان تمسکات کی قیمت میں کمی ہونے کا اندیشہ نہیں تھا۔ اس کی تردید میں یہ کہا گیا کہ حقیقت میں محفوظ ذخیرہ زر کاغذی اس لئے نہیں تھا کہ اس سے روپے کی قدر مبادلہ کو برقرار رکھنے کا کام لیا جائے۔
اس کے علاوہ اسٹرلنگ کے تمسکات کی قیمت بھی گر سکتی تھی اگر انگلستان میں ۳۴۳
زر کی حد تک کوئی نازک صورت حال پیدا ہوتی۔ اس لئے نوٹوں کے چلن کے بارے میں حکومت کی ساکھ عوام میں پیدا کرنے کا صرف یہی طریقہ ہو سکتا تھا کہ تمام کا تمام ذخیرۂ محفوظ ہندوستان میں رکھا جاتا۔[۱]

[۱] محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی کے مقام پر مزید اعتراضات ... کے لئے ملاحظہ ہو آیندہ باب۔

نوٹ جاری کرنے کا کام بنک کاری سے بالکل الگ رکھا گیا تھا اور کوئی ایسا مرکزی بنک بھی نہ تھا جو بحیثیت سرکاری بنکر کے کام کرسکتا۔ البتہ رزرو خزانوں کا طریقہ موجود تھا جس میں ہوتا یہ تھا کہ بجزان قلیل رقوم کے جو پریزیڈنسی بنکوں کی تحویل میں تھیں جملہ سرکاری رقم خزانوں میں بیکار پڑی رہتی تھی اس سے یہ ہوتا تھا کہ سال کے اس حصے میں روپے کی قلت ہو جاتی تھی جبکہ کاروبار کی کثرت ہوتی تھی۔ عام کاروبار کے لئے ہو یا خاص اغراض کے لئے اندرون ملک زر کی مقدار میں کمی بیشی کی مطلق گنجایش نہ تھی اور بجز اس کے کہ کونسل خرید کر باہر سے رقم حاصل کی جائے یا ساورن درآمد کئے جائیں زر کو عارضی طور پر بڑھانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اسی طرح کی خرابیوں کو دوسرے ملکوں مثلاً انگلستان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں امانتوں اور چکوں سے کام لیکر یا تجارتی ہنڈیوں کی بنیاد پر نوٹ جاری کرکے اور سرکاری رقوم کو مرکزی بنک میں رکھکر دور کر دیا گیا ہے۔

پہلا طریقہ یعنی چکوں اور امانتوں کا بجز چند بڑے تجارتی شہروں کے ہندوستان میں عام طور پر رائج نہیں ہے۔ دوسرے طریقے کے بارے میں اسمتھ کمیٹی نے سفارش کی تھی جس کو منظور کرلیا گیا ہے۔ رہا تیسرا طریقہ تو وہ بھی اختیار کرلیا گیا۔ وہ اس طرح کہ محفوظ ذخیرے کے (رزرو) خزانوں کو بند کرکے سرکاری رقوم امپیریل بنک آف انڈیا میں جمع کردی گئیں ہیں جو رزرو بنک کے کھلنے سے پہلے ۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۵ء سرکاری بنک کی حیثیت رکھتا تھا۔ چیمبرلین کمیشن اور اسمتھ کمیٹی نے علی الترتیب دو طریقے بتلائے جن سے زر میں لچک نہ ہونے کی شکایت دور ہو سکتی تھی۔ اول الذکر نے یہ سفارش کی کہ سرکاری رزرو خزانوں میں جس قدر نوٹ ہوں وہ اور ان کے علاوہ خالص جاری شدہ نوٹوں کے ایک تہائی کے مساوی اعتباری محفوظ رہنا چاہئے۔ (یہاں خالص جاری شدہ نوٹوں سے مراد نوٹوں کی وہ مقدار ہے جو

چلن کی مجموعی مقدار میں سے زر و خزانوں میں رکھی ہوئی مقدار کو منہا کرنے سے حاصل ہوتی ہے) اصول یہ ہے کہ اعتباری نوٹ کل جاری کردہ نوٹوں کی مجموعی مقدار کے ایک مقررہ فیصد تناسب سے کسی حالت میں متجاوز نہ ہونے پائیں۔ اسمتھ کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ ذخیرے کا فلزی حصہ جاری کردہ نوٹوں کی مجموعی مقدار کے ایک اقل فیصد تناسب سے کم نہ ہو اور یہ تناسب ۴۰ فیصد ہونا چاہئے۔ البتہ اس قانونی حد میں توسیع کی گنجائش رہنا چاہئے خصوصاً ایسے زمانے کے لئے جبکہ گرم بازاری ہو۔ بہر حال جیسے جیسے نوٹوں کا چلن بڑھے گا اعتباری محفوظ ذخیرے میں بھی از خود اضافہ ہوتا رہے گا اور اس بارے میں بار بار قوانین نافذ کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس لئے اس طریقے میں کفایت بھی ہوگی
اور لچک بھی جیسا کہ آئندہ چلکر مذکور ہوگا حکومت نے اسمتھ کمیٹی کی رائے ۳۴۴
۱۹۲۰ء میں مان لی اگرچہ ذخیرے کے فلزی حصے کو بڑھا کر ۵۰ فیصد کر دیا گیا ہے[1]

۳۴۳ جنگ کے اثرات زر کاغذی پر

یہ اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ کس طرح جنگ کے شروع میں عام خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا جس کی وجہ سے زر کاغذی کے دفاتر پر سخت یورش ہوئی اور جنگ شروع ہونے کے آٹھ مہینے کے اندر اندر دس کروڑ روپے کے نوٹ واپس آگئے لیکن جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے حکومت کی ساکھ عوام میں بتدریج پھر قائم ہوگئی اور نوٹوں کا چلن آہستہ آہستہ بڑھ گیا۔ مارچ ۱۹۱۵ء سے زر کاغذی پر جنگ کے جو اثرات پڑے ان کو مختصر طور پر ذیل میں بیان کیا گیا ہے:-

(۱) چونکہ زر کی بڑھتی ہوئی طلب سب کی سب نئے روپے ڈھال کر پوری نہیں کی جا سکتی اس لئے زر کاغذی کثیر مقدار میں جاری کیا گیا۔ طلب کے

---

[1] ملاحظہ ہو فصل (۳۴۴)۔

اس غیر معمولی اضافے کے اسباب بیان کئے جا چکے ہیں۔
(۲) ایک کے بعد ایک جو متعدد قوانین نافذ ہوئے ان کے بموجب ذخیرے کے اعتباری حصے میں بہت اضافہ ہوگیا جیسا کہ مندرجہ ذیل جدول سے معلوم ہوگا:۔

بحساب کرور روپیہ

قوانین	مستقل مشغولات اصل	عارضی مشغولات اصل جن کی اجازت تھی	میزان
قانون نمبر (۷) بابت ۱۹۱۱ء (قبل جنگ)	۱۴	—	۱۴
قانون نمبر (۵) بابت ۱۹۱۵ء	۱۴	۶	۲۰
قانون (۹) بابت ۱۹۱۶ء	۱۴	۱۲	۲۶
قانون نمبر (۱۱) بابت ۱۹۱۷ء	۱۴	۳۶	۵۰
قانون نمبر (۱۹) بابت ۱۹۱۷ء	۱۴	۴۸	۶۲
قانون نمبر (۵) بابت ۱۹۱۸ء	۱۴	۷۲	۸۶
قانون نمبر (۲) بابت ۱۹۱۹ء	۱۴	۸۶	۱۰۰
قانون نمبر (۲۶) بابت ۱۹۱۹ء	۲۰	۱۰۰	۱۲۰

ان قوانین کے ساتھ گورنر جنرل نے ذیلی گشتیاں بھی جاری کیں۔ ذخیرے کے مشغول حصے میں یہ غیر معمولی اضافہ کرنے کی ضرورت اس وجہ سے پڑی کہ ان قوانین کے ساتھ ساتھ گورنر جنرل نے گشتیاں بھی جاری کیں۔ ذخیرے کے مشغول حصے کو اس وجہ سے بہت زیادہ بڑھانا پڑا کہ ذخیرے میں رکھنے کے لئے کافی روپیہ حاصل کرنے میں حکومت کو دشواری پیش آرہی تھی۔ اس کے علاوہ جنگی اغراض کے لئے ہندوستان میں انگلستان کی خاطر جو مصارف ہو رہے تھے ان کی ادائی لندن میں

وزیر ہند کو کردی جاتی تھی مگر ان رقوم کو سونے کی شکل میں لندن کے محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی کے لئے مختص کر دینا شاہی اغراض کے منافی خیال کیا گیا۔ اس لئے ان کو برطانوی ہنڈیات خزانہ یا قلیل مدت کے اسٹرلنگ کے تمسکات میں مشغول کر دیا گیا اور[1] کچھ حصہ ہندوستانی خزانے کی ہنڈیوں کی شکل میں بھی مصروف رکھا گیا۔

(۳) محفوظ ذخیرے کا فلزی حصہ ۱۹۱۴ء میں ۹ء۷۸ فیصد تھا جو گھٹ کر ۱۹۱۹ء میں ۵ء۳۵ فیصد رہ گیا۔

(۴) ایک روپیے اور ۲½ روپیہ کے نئے نوٹ علی الترتیب
۳۴۵ دسمبر ۱۹۱۷ء اور جنوری ۱۹۱۹ء میں جاری کیے گئے تاکہ چاندی کے استعمال میں کفایت ہو۔ بظاہر یہ طریقہ انگلستان کی تقلید میں اختیار کیا گیا کیونکہ جنگ کے زمانے میں وہاں بھی ایک پاؤنڈ اور دس شلنگ کے نوٹ جاری کئے گئے تھے۔ شروع میں عوام نے ان کو پسند نہیں کیا۔ لیکن بتدریج ایک روپیے کا نوٹ مقبول ہوتا گیا۔ چنانچہ ۳۱/ مارچ ۱۹۱۹ء کو ایک روپیے کے نوٹوں کی چلن کی مقدار ۱۰ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے تھی اور اس کے مقابل ۲½ روپے کے نوٹ صرف ا کروڑ ۸۴ لاکھ روپے کے چل رہے تھے[2]۔

(۵) روپیوں کی قلت کی وجہ سے نوٹ تڑانے کی وہ آسانیاں ہٹالی گئیں جو قانونی سہولتوں[3] کے علاوہ مہیا کی گئی تھیں۔ اس نے

---

[1] رقم کو برطانوی ہنڈیات خزانہ میں مشغول کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ ہنڈیاں قلیل مدت کی تھیں اور اس لئے ان کی قیمت گھٹنے کا اندیشہ کم تھا۔ اس کے برعکس دوسری ہنڈیوں کی قیمت جنگ کی وجہ سے کافی گھٹ گئی تھی۔

[2] حکومت ہند نے طے کیا کہ ایک روپیہ اور ۲½ روپیے کے نوٹوں کا اجرا یکم جنوری ۱۹۲۶ء سے قطعاً بند کر دیا جائے۔ ان کی بجائے کچھ تو روپیے اور کچھ دس روپے کے نوٹ جاری کر دیے گئے۔

[3] جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے ۱۹۲۰-۲۱ء میں یہ سہولتیں پھر مہیا کر دی گئیں اور ان

نوٹوں پر خاصکر چھوٹی رقموں کے نئے نوٹوں پر بعض مقامات پر ۹ افیصدی تک بٹہ ہوگیا تھا۔

(۶) امریکہ سے ۲۰۰ ملین اونس چاندی پٹ من ایکٹ کے تحت درآمد کی گئی تاکہ اپریل ۱۹۱۸ء کی زر کاغذی کی نازک حالت کی روک تھام کی جائے۔

مندرجۂ ذیل گوشوارے سے بخوبی واضح ہو جائے گا کہ محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی کی ترکیب اور مقام پر جنگ عظیم کے کیا اثرات پڑے۔[۱]

بحساب لاکھ روپیہ

۳۱ مارچ	نوٹوں کا مجموعی چلن	محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی کی ترکیب اور مقام: چاندی	سونا			تمسکات (قیمت خرید)			انگلستان میں محفوظ ذخیرہ کا فیصدی تناسب
		ہندوستان	ہندوستان	انگلستان	میزان	ہندوستان	انگلستان	میزان	
۱۹۱۴ء	۶۶,۱۲	۳۰,۵۳	۲۲,۴۴	۹,۱۴	۳۱,۵۹	۱۰,۰۰	۴,۰۰	۱۴,۰۰	۲۱
۱۹۱۵ء	۶۱,۶۳	۳۲,۳۴	۷,۶۴	۷,۶۵	۱۵,۲۹	۱۰,۰۰	۴,۰۰	۱۴,۰۰	۲۳
۱۹۱۶ء	۶۷,۷۳	۳۳,۵۷	۱۲,۲۴	۱۱,۹۲	۲۴,۱۶	۱۰,۰۰	۱۰,۰۰	۲۰,۰۰	۲۹
۱۹۱۷ء	۸۶,۳۷	۱۹,۲۱	۱۲,۰۰	۶,۷۶	۱۸,۷۶	۱۰,۰۰	۳۸,۴۹	۴۸,۴۹	۵۶
۱۹۱۸ء	۹۹,۷۹	۱۰,۷۹	۲۶,۸۵	۶۷	۲۷,۵۲	۱۰,۰۰	۵۱,۴۸	۶۱,۴۸	۶۲
۱۹۱۹ء	۱۵۳,۴۶	۳۷,۳۹	۱۷,۳۷	۱۲	۱۷,۴۹	۱۶,۰۸	۸۲,۵۰	۹۸,۵۸	۶۵
۱۹۲۰ء	۱۷۴,۵۲	۳۹,۸۰	—	—	۴۷,۷۰	—	—	۸۶,۸۶	۵۰

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ :- سہولتوں میں اس وجہ سے اور اضافہ ہوگیا ہے کہ امپیریل بنک کی متعدد شاخیں کھول دی گئی ہیں جہاں عوام نوٹ تڑا سکتے ہیں۔

[۱] ملاحظہ ہو فنڈلے شراس کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۲۶۴۔

۴۴ محفوظ ذخیرۂ زرکاغذی کی ازسرنو ترتیب

۳۴۶ ستمبر ۱۹۱۹ء میں زرکاغذی کے قانون میں عارضی ترمیم کرکے محفوظ ذخیرۂ زرکاغذی کے مشغول حصے کی انتہائی مقدار بڑھاکر ایک ارب ۲۰ کروڑ روپیے کردی گئی جس میں سے ایک ارب روپیہ برطانوی خزانے کی ہنڈیوں میں مشغول رکھنا لازمی تھا۔

مارچ ۱۹۲۰ء میں ایک عارضی قانون چھے مہینے کے لئے منظور کیا گیا اور اس کے مطابق ذخیرے کے مشغول حصے کی مقدار بدستور ایک ارب ۲۰ کرور روپے رکھی گئی۔ لیکن اس مشغول اصل کو کہاں کہاں رکھا جائے اور روپے کی شکل میں کتنا اور اسٹرلنگ کی شکل میں کتنا حصہ مشغول رکھا جائے یہ سب بندشیں اس قانون نے ہٹا لیں۔ ایسا کرنا اس وجہ سے ضروری تھا کہ اس وقت لندن کو بھیجنے کے لئے رقم کا سخت مطالبہ ہو رہا تھا اور اس رقم کو پوری طرح وزیر ہند کی فاضلات سے ادا کرنا دشوار تھا۔ رقم کے اس مسلسل مطالبے کی ادائی کی ایک صورت یہ ہوسکتی تھی کہ ان اسٹرلنگ کے تمسکات کو فروخت کردیا جائے جو لندن میں محفوظ ذخیرۂ زرکاغذی میں تھے۔ لیکن اس وقت کے قانون کے لحاظ سے اسٹرلنگ کے تمسکات کی فروخت صرف اس حالت میں ممکن تھی جبکہ ان تمسکات کے ہمقدر روپوں کے نوٹ اس شرح سے جس شرح سے کہ ذخیرے میں تمسکات رکھے گئے تھے یعنی فی پاؤنڈ ۱۵ روپے کے حساب سے ہندوستانی چلن سے واپس لیکر خارج کر دیے جائیں۔

مارچ ۱۹۲۰ء کے عارضی قانون کی بجائے ایک نیا قانون نافذ کرنا ضروری خیال کیا گیا تاکہ چیمبرلین کمیشن اور اسمتھ کمیٹی کے اعتراضات اور جنگ کے زمانے کے تجربوں کی روشنی میں زرکاغذی کو اطمینان بخش بنیاد پر قائم کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی زرکاغذی کا ایک ترمیمی قانون[1] یکم اکتوبر ۱۹۲۰ء کو نافذ ہوا۔ اس قانون کی دفعات

---

[1] یہ معمولاً ۱۹۲۳ء کا زرکاغذی کا قانون کہلاتا ہے جس میں ۱۹۲۰ء کے ترمیمی قانون کو ضم کردیا گیا تھا۔

دو حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں یعنی مستقل اور عارضی ۔

(۱) مستقل دفعات[۱] :۔

(۲) ۔ ذخیرے کا فلزی حصہ کل ذخیرے کے کم از کم ۵۰ فیصد کے برابر رکھا جائے ۔ اسمتھ کمیٹی نے ۴۰ فیصد کے تناسب کی رائے دی تھی ۔ لیکن اس سے بھی بڑھا ہوا تناسب رکھنے کے اسباب یہ تھے :۔ (۱) ہندوستان جیسے ملک میں نوٹوں کے بدلے بلاتامل نقد مہیا کرنا ضروری تھا ! (۲) ذخیرے میں روپیہ کافی مقدار میں رکھنا ضروری تھا تاکہ گرم بازاری کے زمانے میں جبکہ نوٹوں کے بدلے نقد کی مانگ کثیر ہوتی ہے زرعی پیداوار کی منتقلی کے لئے مالی انتظامات کئے جا سکیں ۔

(ب) بجز ۲۰ کرور روپے کے تمسکات کے جو ہندوستان میں رہیں، باقی تمام حصہ انگلستان میں اسمتھ کمیٹی کی رائے کے مطابق قلیل مدت کے تمسکات کی شکل میں رکھا جائے اور یہ مدت بارہ ماہ سے زیادہ نہ ہو ۔

(ج) ناظم زر کو اختیار دیا گیا کہ اندرون ملک بٹہ کٹی ہوئی ہنڈیوں کے مقابلے میں جو تاریخ اجرا سے ۹۰ یوم کے اندر پختہ ہونے والی ہوں، ۵ کرور روپے کے نوٹ جاری کر سکتا ہے ۔ یہ زائد نوٹ امپیریل بنک کے قرضے کی شکل میں جاری کئے جاتے تھے جو حکومت کو ۸ فیصد سود ادا کرتا ص ۳۴۷
تھا اور سکاری ہوئی ہنڈیوں کو حکومت کے پاس امانت رکھتا تھا ۔ (سنہ ۱۹۲۳ء کے ہندوستانی زر کاغذی کے ترمیمی قانون کے بموجب اس ۵ کرور روپے کی حد بڑھا کر ۱۲ کرور روپے کر دی گئی)[۲] ذخیرے کے فلزی حصے کو ۵۰ فیصد

---

[۱] یہ دفعات اسمتھ کمیٹی کی سفارشوں کے تقریباً مطابق ہیں ۔

[۲] ۔ ۱۲ کرور روپے میں سے پہلے ۴ کرور روپے کے نوٹ اس وقت جاری کئے جا سکتے تھے جبکہ بنک کی شرح ۶ فیصد ہو، دوسرے ۴ کرور روپے کے نوٹ اس وقت جاری کئے جا سکتے تھے جبکہ بنک کی شرح ۷ فیصد ہو اور باقی ۴ کرور روپے کے نوٹ بنک کی شرح کے ۸ فیصد ہو جانے پر جاری کئے جا سکتے تھے ۔ ستمبر سنہ ۱۹۲۴ء میں اس طریق کار پر نظر ثانی

رکھنے کی قانونی شرط بلا لحاظ اس زاید اجرا کے عائد کی گئی تھی اور ذخیرے کے فلزی حصے کی مقدار مقرر کرنے میں اس اجرا کا لحاظ ضروری نہ تھا۔

(د)۔ وزیر ہند لندن میں ۵ ملین پاؤنڈ سے زیادہ رقم سونے کی شکل میں نہ رکھے۔

(۲)۔ عارضی دفعات :۔

چونکہ بجائے ۱۵ روپیہ کے ۱۰ روپے فی پاؤنڈ کے حساب سے محفوظ ذخیرے کے سونے اور اسٹرلنگ کے تمسکات کی مالیت کا دوبارہ تعین کرنا پڑا جس کی وجہ سے مشکلات پیدا ہوگئی تھیں اس لئے مستقل دفعات کی تکمیل کا وقت آنے تک بعض عارضی دفعات کا نفاذ ضروری ہوگیا۔ دس روپے فی پاؤنڈ کے حساب سے مالیت کا دوبارہ تعین کیا جاتا تو ذخیرے کا فلزی حصہ ۵۰ فیصد سے کم رہ جاتا تھا۔ اس لئے یہ قرار دیا گیا کہ ذخیرے کے مشغول حصے کی حد سر دست ۸۵ کرور روپے مقرر کی جائے [۱] (ایک ارب ۲۰ کرور روپے کے نوٹوں کی سابقہ حد اب بے ضرورت ہوگئی تھی، کیونکہ چلن میں نوٹوں کی مقدار ایک حد تک کم ہوگئی تھی۔ اس کمی کی وجہ یہ تھی کہ ریورس کونسل جاری کئے جا رہے تھے جن کی ادائی اسٹرلنگ کے تمسکات بیچ کر کی جاتی تھی)۔ ایک اور دقت یہ پیش آئی کہ اس کمی کو پورا کرنا ضروری ہوگیا جو سونے اور اسٹرلنگ کے تمسکات کی مالیت میں پیدا ہوگئی تھی۔ اس کمی کی وجہ یہ ہوئی کہ

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ :۔ کی گئی جبکہ مندرجۂ ذیل قواعد جاری کئے گئے :۔

(۱)۔ کوئی قرضہ نہیں دیا جائے گا جب تک بنک کی شرح ۶ فیصد تک نہ ہو جائے۔

(۲)۔ واجب الادا رقم پر بنک کی شرح کے حساب سے سود لگایا جائے گا جو پہلے ۴ کرور روپے پر ۶ فیصد سے کم اور باقی ۸ کرور روپے پر ۷ فیصد سے کم نہ ہوگا۔

[۱] ۔ زر کی قلت کو دور کرنے کی غرض سے فروری ۱۹۲۵ء کے ترمیمی قانون کے بموجب یہ مقدار بڑھا کر ایک ارب روپیہ کردی گئی۔ اس قانون نے یہ بھی قرار دیا کہ حکومت ہند کے جاری کردہ تمسکات کی مجموعی مقدار ۵۰ کرور روپے سے متجاوز نہ ہو۔

تمسکات کی قیمت پہلے کے مقابلے میں صرف دو تہائی رہ گئی تھی۔ اس مشکل کو آسانی سے حل کر لیا گیا۔ وہ اس طرح کہ حکومت ہند مجاز کی گئی کہ اپنے طور پر روپے کے تمسکات جاری کرے (جو "خصوصی تمسکات" کے نام سے موسوم ہوئے) اور محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی میں جمع کر دے۔ چونکہ ان نئے تمسکات کی وجہ سے روپے کے تمسکات اس حد سے متجاوز ہو جاتے جو قانون نے مقرر کی تھی اس لئے یہ قرار دیا گیا کہ زائد تمسکات میں رفتہ رفتہ کمی کر کے ان کی بجائے اسٹرلنگ کے تمسکات رکھے جائیں۔ لیکن چونکہ کثیر مقدار میں اسٹرلنگ کے تمسکات خریدنے کے لئے رقم فوراً مہیا نہیں ہو سکتی تھی اس لئے یہ طے کیا گیا کہ محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی کے تمسکات کا سود، نئے روپے ڈھالنے کا
منافع، ذخیرۂ معیار طلا کا سود جبکہ ذخیرہ ۴۰ ملین پاونڈ سے متجاوز ہو جائے ۳۴۹
(جیسا کہ ۳۰/ستمبر ۱۹۲۱ء کو ہو گیا تھا) اور آخر میں ان تجارتی ہنڈیوں کا سود جو ناظم زر کے پاس ہنگامی نوٹوں کی اجرائی کے سلسلے میں محفوظ تھیں؛ یہ سب محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی میں جمع کیا جائے تاکہ نئے تمسکات میں اس حد تک کمی ہو سکے جس حد تک کہ وہ ۱۲ کرور کی معینہ حد سے متجاوز ہوں۔ اس ترکیب سے قانون کی مستقل دفعات کے مطابق عملدرآمد ہو سکتا تھا۔ لیکن غیر اطمینان بخش مالی حالت کی وجہ سے بعد کے سالوں میں منظورہ قوانین مالیہ کے بموجب ان ذرائع آمدنی کو عام محاصل میں محسوب کر لیا گیا بجز ۲۲-۱۹۲۱ء کے جبکہ محفوظ ذخیرۂ معیار طلا کے زائد حصے کو "خصوصی تمسکات" کے خارج کرنے میں استعمال کیا گیا۔

محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی کے سونے اور اسٹرلنگ کے تمسکات جن کی قیمت ۱۹۲۰ء سے ۱۰ روپے فی پاونڈ کے حساب سے لگائی جاتی تھی ۱۹۲۷ء کے ہندوستانی زر کے قانون کے شرائط کے مطابق تاریخ نفاذ یعنی یکم اپریل ۱۹۲۷ء سے ان کی مالیت کا تعین از سر نو ۱۳ روپے ۲ آنہ ۳ پائی فی ساورن کے حساب سے کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سونے اور اسٹرلنگ کے تمسکات کی مالیت میں ۹ کرور ۳۰ لاکھ روپے کا اضافہ نکلا جس کو اس طرح زائل کر دیا گیا کہ

ہندوستانی خزانے کی ہنڈیوں میں اسی حد تک کمی کر دی گئی چنانچہ ان کی مقدار ۴۹ کرور ۷۷ لاکھ روپے سے گھٹا کر ۴۰ کرور ۴۴ لاکھ روپے کر دی گئی[1]

۴۵ محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی کی ترکیب اور مقام ۳۱/مارچ ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۵ء

بحساب کرور روپیہ

۳۱/مارچ کو	مجموعی چلن	ہندوستان میں چاندی کے سکے	ہندوستان میں سونے کے سکے اور ڈلے	سکہ ڈھالنے کے لئے چاندی	تمسکات		اندرونی تجارتی بل	مجموعی چلن کے مقابلے میں دھات کا فیصد تناسب
					ہندوستان میں روپے کے	انگلستان میں انگریزی سکے کے		
۱۹۲۵ء	۱۸۴٫۱	۷۰٫۲	۳۲٫۳	۶٫۷	۵۷٫۱	۲۰٫۱	۸٫۰	۴۰٫۸
۱۹۲۶ء	۱۹۳٫۳	۷۴٫۲	۲۲٫۴	۷٫۶	۵۷٫۱	۲۹٫۰	—	۴۴٫۶
۱۹۲۷ء	۱۸۴٫۱	۹۵٫۹	۲۲٫۳	۸٫۵	۴۹٫۷	۵٫۵	۲٫۰	۳۱٫۱
۱۹۲۸ء	۱۸۴٫۸	۹۸٫۷	۲۹٫۷	۷٫۶	۳۷٫۹	۳٫۷	۷٫۰	۲۶٫۴
۱۹۲۹ء	۱۸۸٫۰	۹۴٫۹	۳۲٫۲	۴٫۹	۴۳٫۲	۱٫۶	۲٫۰	۲۸٫۷
۱۹۳۰ء	۱۷۷٫۲	۱۰۸٫۱	۳۲٫۲	۲٫۸	۳۳٫۸	۰٫۱	—	۱۹٫۱
۱۹۳۱ء	۱۶۰٫۸	۱۱۷٫۸	۲۵٫۸	۶٫۹	۱۰٫۲	—	—	۶٫۳

[1] زر کاغذی کے بارے میں ہلٹن ینگ کمیشن کی سفارشوں کے لئے دیکھو آئندہ باب۔ رزرو بنک آف انڈیا ایکٹ بابت ۱۹۳۴ء کے بموجب نوٹ جاری کرنے کا کام رزرو بنک آف انڈیا کو منتقل کر دیا گیا۔ اس کے متعلق اور جاری کردہ نوٹوں کے مقابلے میں جو ذخیرہ یکم اپریل ۱۹۳۵ء سے رکھا گیا اس کے متعلق باب ۱ میں بحث کی گئی ہے۔

۱۹۳۲ء	۱۶۸٫۱	۱۰۲٫۰	۵٫۲	۹٫۲	۵۷٫۹	—	۳٫۸	۳۲٫۴
۱۹۳۳ء	۱۶۷٫۹	۹۶٫۳	۲۶٫۰	۱۵٫۵	۳۹٫۱	—	—	۲۲٫۱
۱۹۳۴ء	۱۷۷٫۲	۸۶٫۵	۴۱٫۵	۱۱٫۵	۲۹٫۵	۸٫۲	—	۲۱٫۲
۱۹۳۵ء	۱۸۶٫۱	۷۷٫۲	۴۱٫۶	۱۳٫۱	۳۵٫۹	۱۸٫۳	—	۲۹٫۱

مندرجۂ بالا جدول سے بعض اہم تغیرات کا حال معلوم ہوتا ہے ۳۴۹
جو محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی میں ۱۹۲۵ء اور ۱۹۳۵ء کے درمیان ہوئے۔ اولاً ۱۹۲۹ء-۳۰ء اور ۱۹۳۰ء-۳۱ء میں زر کی مقدار کم کر دینے سے نوٹوں کے مجموعی چلن میں کافی کمی ہوگئی۔ زر کی مقدار گھٹانے کا سبب یہ تھا کہ نیویارک کی وال اسٹریٹ کی تباہی کے ساتھ ہی جب ۱۹۲۹ء-۳۰ء کے آخری حصے میں اشیا کی قیمتیں گرنا شروع ہوگئیں تو زر کی ضرورت پہلے کی طرح باقی نہیں رہی ایک اور چیز یہ تھی کہ شرح مبادلہ کمی کی طرف مائل تھی۔ یہ کمی کچھ تو اس وجہ سے ہوئی کہ اہم برآمدی اجناس کی قیمتیں گرگئی تھیں اور کچھ اس وجہ سے کہ اصل ملک سے باہر منتقل کیا جارہا تھا۔ اصل کی منتقلی کے وجوہ یہ تھے کہ اس زمانے میں ملک کی سیاسی حالت ناقابل اطمینان تھی اور ایک شلنگ ۴ پنس کی پرانی شرح کے دوبارہ مقرر کئے جانے کا اندیشہ تھا۔ شرح مبادلہ کم ہونے سے ایک طرف مطالبات وطن کو پورا کرنے کے لئے وزیر ہند کے پاس رقم روانہ کرنے میں زیادہ مشکلات ہونے لگیں تو دوسری طرف ۱۹۳۱ء تک محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی میں اسٹرلنگ کے تمسکات ختم ہوگئے۔ کیونکہ یہ تمسکات وزیر ہند کے پاس منتقل کرنے پڑے تھے اور اس کے مقابل ہندوستان میں نوٹوں کی تعداد میں کمی کرنی پڑی[ل] ۱۹۳۰ء-۳۱ء میں زر کی مقدار میں جو مزید کمی کی گئی اس کی وجہ سے روپے کے تمسکات میں بھی کمی ہوگئی۔ اسی سال محفوظ ذخیرے میں سونے کی مقدار اس لئے کم ہوگئی تھی کہ ۸½ کرور روپے کا سونا محفوظ ذخیرۂ معیار طلا

[ل] اس کے ساتھ ملاحظہ ہو آیندہ باب فصل (۲۴)۔

کی ہندوستانی شاخ میں منتقل کر دیا گیا تھا اور اس کے بدلے میں ۴۲،۶ ملین پاؤنڈ کے اسٹرلنگ کے تمسکات انگلستان کے محفوظ ذخیرہ معیار طلا کی شاخ سے خارج کر دیے گئے تاکہ ہندوستانی خزانے کی فاضلات کو تقویت دیجائے اور نومبر ۱۹۳۰ء اور فروری ۱۹۳۱ء کے درمیان اسٹرلنگ $\frac{49}{64}$ ۵ پنس کی قانونی شرح کے حساب سے اسٹرلنگ کی فروخت کے سلسلے میں رقوم کی فراہمی کا انتظام کیا جائے اور اس طرح عوام کے مطالبے کو پورا کیا جائے۔ یہ مطالبہ، جیساکہ مذکور ہو چکا ہے، شرح مبادلہ کی غیر یقینی حالت اور ملک کی ناقابل اطمینان سیاسی صورت حال کی وجہ سے بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی کی ترکیب میں ایک اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ محفوظ ذخیرے میں روپیوں کی تعداد زیادہ ہو گئی جس کے اسباب ذیل میں درج ہیں۔[1] یہ اضافہ اور بھی زیادہ ہوتا اگر ہلٹن ینگ کمیشن کی سفارش کے مطابق کچھ چاندی فروخت کی غرض سے نہ نکال لی جاتی۔

حکومت ہند نے ۱۹۲۷ء سے لیکر ۳۱/مارچ ۱۹۳۵ء تک جو چاندی فروخت کی اس کی مجموعی مقدار ۲۲۸۱۸۲۲۵۵ اونس تھی۔ اس طرح جو رقم حاصل ہوئی وہ اسٹرلنگ کے تمسکات میں مشغول کر دی گئی جو محفوظ ذخیرۂ معیار طلا میں منتقل کر دیے گئے کیونکہ اس ذخیرے سے سونا محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ اس سونے کے ہمقدر روپیے کے تمسکات محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی سے خارج کر دیے گئے۔ وزیر ہند کی جاری ضرورتوں سے ۳۵۰ ص
زائد اسٹرلنگ خریدنے سے جو رقم وصول ہوئی وہ بھی اسٹرلنگ کے تمسکات میں مشغول کر دی گئی۔ اس طریقے سے محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی میں سونے کی مقدار بڑھ گئی[2] اور اسی تناسب سے روپے کے تمسکات کم کر دیے گئے۔

---

[1] ملاحظہ ہو فصل (۴۶)۔

[2] ۳۱/مارچ ۱۹۳۵ء کو رزرو بنک کو تفویض کرتے وقت جو سونا حکومت ہند کے پاس موجود تھا اس کی مالیت ۴۴ کرور ۴۲ لاکھ روپیہ تھی جس کے منجملہ ۴۱ کرور ۵۵ لاکھ روپیہ کا

چاندی فروخت کرنے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی میں چاندی اور چاندی کے سکوں کی مقدار کم ہو گئی ۔ ۱۹۳۳ء-۳۴ء اور اس کے بعد کے سالوں میں ہندوستان کے خزانے کے فاضلات اور چاندی کی فروخت کی رقم کو اسٹرلنگ کے تمسکات کی خریدی میں لگایا گیا ۔ اور اس طرح محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی کے اسٹرلنگ کے اثاثے میں اضافہ ہو گیا جس سے ذخیرے کو ایسے زمانے میں استحکام حاصل ہو گیا جبکہ حکومت اپنے زر کے انتظامات رزرو بنک کے تفویض کرنے والی تھی [1]

حالیہ سالوں میں یعنی ستمبر ۱۹۳۱ء کے اواخر سے جب سے کہ ہندوستان نے نجی طور پر سونے کی فروخت اور برآمد شروع کی ہے نوٹوں کا مجموعی چلن کافی بڑھ گیا ہے ۔ چنانچہ ۳۱/ مارچ ۱۹۲۵ء کو ۱۸۶ء۱۱ کرور روپے اور ۳۱/ دسمبر ۱۹۳۶ء کو ۲۱۴ء۰۰ کرور روپے کے نوٹ چل رہے تھے ۔ منجملہ اور اسباب کے زر کے اس اضافے کی یہ وجہ بتائی جاتی ہے کہ کچھ روز سے قیمتیں چڑھنا شروع ہو گئی ہیں نیز عوام اس سونے کے بدلے میں زر کا مطالبہ کر رہے ہیں جو ان کے پاس اندوختوں کی حیثیت رکھتا ہے ۔ غرض یہ ہے کہ اس طرح زر حاصل کر کے اس کو اپنے اندوختوں کا قائم مقام بنائیں ۔ ان اندوختوں میں سے تقریباً ۳ ارب ۸ کرور روپے کا سونا دسمبر ۱۹۳۶ء کے اختتام تک برآمد کیا جا چکا تھا جس کی وجہ یہ ہوئی کہ سونے کی قیمت روپے کے حوالے سے بہت بڑھ گئی تھی اور سونا اس وجہ سے گراں ہو گیا تھا کہ برطانیہ کے ۲۰/ ستمبر ۱۹۳۱ء کو طلائی معیار سے ہٹنے کے

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ :- سونا محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی میں اور ۲ کرور ۷ ۸ لاکھ روپے کا سونا محفوظ ذخیرۂ معیار طلا میں فی روپیہ ۷۴ء۸ گرین سونے کی قانونی قیمت کے حساب سے رکھا ہوا تھا ۔ اس سونے کی بازاری قیمت اس زمانے میں تقریباً ۶۷ کرور روپے ہوتی تھی ۔

[1] دیکھو باب ؛ نیز ناظم زر کی رپورٹیں بابت ۱۹۳۳ء-۳۴ء فقرہ ۳۹ و بابت ۱۹۳۴ء-۳۵ء فقرہ ۳۱ ۔

بعد ہی روپے کی قدر مبادلہ ۱ شلنگ ۶ پنس اسٹرلنگ مقرر کر دی گئی تھی[1]

۴۶۔ نوٹوں کا چلن اور زر کی کھپت

یہاں تین اہم مسائل پر بحث کرنا مقصود ہے یعنی (۱) جاری کردہ اور چالو نوٹوں کی مجموعی مقدار؛ (۲) نوٹوں کے چلن کی کیفیت؛ اور (۳) مختلف قسموں کے زر کی کھپت۔

(۱) جاری کردہ اور چالو نوٹوں کی مجموعی مقدار۔ جب کبھی زر کاغذی کے چلن کا ذکر کیا جائے تو یہ واضح کر دینا چاہئے کہ جاری کردہ نوٹ مراد ہیں یا چالو نوٹ۔ (الف) جاری کردہ نوٹوں سے مراد وہ تمام نوٹ ہیں جو جاری کئے گئے اور جن کی رقم ادا نہیں کی گئی۔ (ب) چالو نوٹوں سے مراد (یکم اپریل ۱۹۳۵ء سے جبکہ نوٹوں کا اجرا زرزرو بنک آف انڈیا کو منتقل کر دیا گیا) وہ نوٹ ہیں جو جاری کردہ نوٹوں میں سے رزرو بنک کے شعبۂ بنک کاری کے نوٹوں کو منہا کرنے کے بعد باقی بچیں[2]

مندرجۂ ذیل جدول سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ۱۹۰۴ء-۰۵ء اور ۱۹۳۶ء-۳۷ء کے درمیان مجموعی جاری کردہ اور چالو نوٹوں کی تعداد میں اوسطاً کتنا اضافہ ہوا۔ ۳۵۱

جدول (۱)

بحساب کرور روپیہ

سال	مجموعی اجرا	چالو نوٹ	سال	مجموعی اجرا	چالو نوٹ
۱۹۰۴ء-۰۵ء	۳۹٫۲	۲۸٫۱	۱۹۱۳ء-۱۴ء	۶۵٫۵	۴۶٫۶
۱۹۰۶ء-۱۰ء	۴۹٫۶	۳۷٫۲	۱۹۱۴ء-۱۵ء	۶۴٫۰	۴۵٫۴

[1] مزید تشریح کے لئے دیکھو اگلا باب فصل (۲۷)۔

[2] دیکھو باب (۱۰)۔

١٩١٧ء۔١٨ء	١٠١٫٧	٧١٫٨	١٩٣٢ء۔٣٣ء	١٧٣٫٨	١٥٣٫٠
١٩١٩ء۔٢٠ء	١٢١٫٦	١٥١٫١	١٩٣٣ء۔٣٤ء	١٧٨٫١	١٥٧٫١
١٩٢٣ء۔٢٤ء	١٢٩٫٠	١٥٦٫٩	١٩٣٤ء۔٣٥ء	١٨٣٫٢	١٦١٫٦
١٩٢٧ء۔٢٨ء	١٨٠٫١	١٦٢٫٦	١٩٣٥ء۔٣٦ء	١٩٢٫٢	١٦٣٫٠
١٩٢٩ء۔٣٠ء	١٨٣٫١	١٦٣٫٠	١٩٣٦ء۔٣٧ء	٢٠٢٫٠	١٧٥٫٤
١٩٣١ء۔٣٢ء	١٦٣٫٦	١٥٢٫٦	.	.	.

حالیہ سالوں میں چالو نوٹوں کی تعداد کا اضافہ یہ بتلاتا ہے کہ ملک میں نوٹوں کا استعمال بڑھ رہا ہے اور کاروبار بحال ہو گیا ہے۔

(۲)۔ نوٹوں کے چلن کی نوعیت۔ مندرجۂ ذیل گوشوارے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۳۱/ مارچ ١٩٣٥ء اور اس سے پہلے کے سالوں میں مختلف رقموں کے نوٹ ایک دوسرے کے مقابلے میں کتنے مقبول تھے۔ اس گوشوارے میں دس ہزار روپے کے نوٹوں کو نہیں شامل کیا گیا ہے کیونکہ ان کا چلن بالکل محدود ہے اور صرف سہولت کی خاطر ان کو امپیریل بنک اور سرکاری خزانوں کے درمیان بڑی بڑی رقموں کی منتقلی کے وقت استعمال کیا جاتا ہے۔

جدول (۲)

مدت	مجموعی اجرا کے مقابلے میں مختلف رقموں کے نوٹوں کا چلن									
	ایک روپیہ	۲½ روپے	۵ روپے	۱۰ روپے	۲۰ روپے	۵۰ روپے	۱۰۰ روپے	۵۰۰ روپے	۱۰۰۰ روپے	میزان
١٩١٣ء۔١٤ء	-	—	٣٫٢	٣٤٫٩	٠٫٢	٣٫٥	٣٥٫٠	٥٫٢	١٨٫٠	١٠٠
١٩١٨ء۔١٩ء	٧٫٨	١٫٤	٦٫٨	٣٤٫٨	—	٣٫٦	٣٢٫٥	١٫٩	١١٫٢	١٠٠

سنہ ۱۹۲۱ء-۲۲ء	۶٫۲	۰٫۲	۱۰٫۰	۳۶٫۳	–	۲٫۵	۳۴٫۲	۱٫۳	۹٫۳	۱۰۰
سنہ ۱۹۲۳ء-۲۴ء	۶٫۶	–	۹٫۳	۳۳٫۴	–	۱٫۸	۴۰٫۵	۰٫۹	۷٫۵	۱۰۰
سنہ ۱۹۲۶ء-۲۷ء	۰٫۳	–	۹٫۹	۴۳٫۷	–	۱٫۳	۳۶٫۱	۰٫۷	۸٫۰	۱۰۰
سنہ ۱۹۲۸ء-۲۹ء	۰٫۲	–	۱۳٫۲	۴۱٫۴	–	۱٫۱	۳۶٫۵	۰٫۶	۷٫۰	۱۰۰
سنہ ۱۹۳۱ء-۳۲ء	۰٫۲	–	۱۳٫۲	۴۱٫۱	–	۰٫۹	۳۷٫۳	۰٫۴	۶٫۹	۱۰۰
سنہ ۱۹۳۳ء-۳۴ء	۰٫۲	–	۱۲٫۹	۴۰٫۲	–	۰٫۸	۳۸٫۸	۰٫۴	۶٫۷	۱۰۰
سنہ ۱۹۳۴ء-۳۵ء	۰٫۲	–	۱۳٫۵	۳۹٫۵	–	۰٫۷	۳۵٫۵	۰٫۳	۱۰٫۳	۱۰۰
سنہ ۱۹۳۶ء	۰٫۲	–	۱۶٫۵	۴۰٫۲	–	۰٫۸	۳۵٫۹	۰٫۲	۶٫۲	۱۰۰

اس جدول سے یہ ظاہر ہے کہ دس روپے اور سو روپے کے نوٹ سب سے زیادہ مقبول ہیں۔ پرانی وضع کے ۵ روپے کے نوٹ اس وجہ سے غیر مقبول رہے کہ وہ سائز میں بڑے تھے اور دیکھنے میں پرانی وضع کے ۱۰ روپے والے نوٹوں سے مشابہت رکھتے تھے۔ ۲½ روپے کے ۳۵۲
نوٹ کبھی مقبول نہیں ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک روپیہ کے نوٹوں کا اجرا جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے یکم جنوری سنہ ۱۹۲۶ء سے موقوف کر دیا گیا اور یہ نوٹ جب خزانے اور زر کے دفتروں پر واپس آتے ہیں تو ان کو خارج کر دیا جاتا ہے۔ دس روپے اور سو روپے والے نوٹوں کی موجودگی میں بیس روپے والے نوٹ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس لئے سنہ ۱۹۱۰ء سے ان کا اجرا موقوف کر دیا گیا۔ ۵۰ روپے کا ایک نئی وضع کا نوٹ جو سائز میں بہت چھوٹا تھا سنہ ۱۹۳۰ء-۳۱ء میں جاری کیا گیا۔ لیکن اس کے اجرا سے نوٹوں کے چلن کے تناسب پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ پچاس اور پانچ سو والے نوٹوں کا رواج چونکہ برائے نام ہے اس لئے ہندوستان کے زر و بنک نے حال میں (سنہ ۱۹۳۶ء) یہ طے کیا ہے کہ وہ اس قسم کے نوٹ نہیں جاری کرے گا۔ البتہ حکومت ہند کے جاری کردہ اس قسم کے نوٹ بدستور زر قانونی رہیں گے۔

(۳) مختلف قسموں کے زر کی کھپت۔ مندرجۂ ذیل گوشوارے[۱] سے نوٹوں اور روپوں کی اوسط سالانہ کھپت کا حال معلوم ہوتا ہے:-

جدول (۳)

بحساب لاکھ روپے

	روپے	نوٹ	میزان
پانچ سالہ اوسط سنہ ۱۰-۱۹۰۹ء تا سنہ ۱۴-۱۹۱۳ء	۸ر۷۷	۳ر۰۱	۱۱ر۷۸
پانچ سالہ اوسط سنہ ۱۵-۱۹۱۴ء تا سنہ ۱۹-۱۹۱۸ء	۲۲ر۰۸	۱۶ر۷۲	۳۸ر۸۰
سنہ ۲۰-۱۹۱۹ء	۲۲ر۰۹	۲۰ر۲۰	۴۰ر۲۹
سنہ ۲۱-۱۹۲۰ء	-۲۵ر۶۸	-۵ر۹۰	-۳۱ر۵۸

[۱] مندرجۂ ذیل جدول سے ساورن اور نصف ساورن حذف کر دیے گئے ہیں۔ یکم اپریل سنہ ۱۹۲۷ء سے ساورن اور نصف ساورن کی حیثیت زر قانونی کی نہیں رہی اور سنہ ۱۹۱۴ء ہی سے ان کا استعمال ترک ہو چکا ہے۔ یکم اپریل سنہ ۱۹۳۵ء سے جبکہ زرزرو بنک نے زر کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا زر کی کھپت یا واپسی کے اعداد مندرجۂ ذیل طریقے پر حاصل کئے جاتے ہیں۔ زر کی کھپت یا واپسی کا اندازہ اس فرق سے ہوتا ہے جو چالو نوٹوں کی مجموعی تعداد سے ظاہر ہو۔ یہ تعداد بنک کے شعبۂ اجرا کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتی ہے۔ آجکل چالو نوٹوں میں عوام کے مستعمل نوٹوں کے علاوہ وہ نوٹ بھی شمار کیے جاتے ہیں جو سرکاری خزانوں میں موجود ہوں۔ روپوں کی کھپت یا واپسی کا اندازہ علی الترتیب اس کمی یا زیادتی سے ہوتا ہے جو بنک کے شعبۂ اجرا کے روپوں کی تعداد میں واقع ہو۔ رزرو بنک کے کھلنے سے پہلے زر کے چلن کا حساب کرنے کے طریق کے متعلق دیکھو ناظم زر کی پرانی سالانہ رپورٹیں اور رزرو بنک آف انڈیا کی شایع کردہ رپورٹیں زر اور مالیے کے بارے میں سنہ ۳۶-۱۹۳۵ء اور سنہ ۱۹۳۶ء

۱۹۲۳ء-۲۴ء	۷٫۶۲	۷٫۹۶	۱۵٫۵۸
۱۹۲۵ء-۲۶ء	-۸٫۱۱	۱٫۱۶	-۶٫۹۵
۱۹۲۶ء-۲۷ء	-۱۹٫۷۶	-۳٫۴۰	-۲۳٫۱۶
۱۹۲۷ء-۲۸ء	-۳٫۱۷	۱۰٫۲۲	۶٫۱۵
۱۹۲۸ء-۲۹ء	-۳٫۰۳	۳٫۶۶	۶۳
۱۹۲۹ء-۳۰ء	-۲۱٫۷۱	-۱۸٫۸۰	-۴۰٫۵۱
۱۹۳۰ء-۳۱ء	-۲۱٫۵۸	-۱۱٫۳۷	۳۲٫۹۵
۱۹۳۱ء-۳۲ء	۳٫۹۳	۱۷٫۲۴	۲۱٫۱۷
۱۹۳۲ء-۳۳ء	-۷٫۵۶	-۱۴٫۸۳	۲۲٫۳۹
۱۹۳۳ء-۳۴ء	-۳۰	۱۳٫۵۴	۱۳٫۲۴
۱۹۳۴ء-۳۵ء	-۳٫۲۱	-۳۲	-۳٫۵۳
۱۹۳۵ء-۳۶ء	-۹٫۴۶	۱٫۸۲	-۷٫۶۴
۱۹۳۶ء-۳۷ء	-۲٫۴۹	۲۵٫۵۳	+۲۳٫۰۴

مندرجۂ بالا جدول سے جنگ کے زمانے میں اور اس کے بعد ۳۵۳
مختلف قسم کے زر کی کم یا زیادہ مقبولیت اور رغبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان اعداد سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ کس طرح جنگ کے زمانے میں ان اسباب کی بنا پر جن کو بیان کیا جا چکا ہے زر کی مقدار میں اضافہ ہوا اور روپوں اور نوٹوں میں زیادتی ہوئی۔ ۱۹۲۰ء-۲۱ء میں زر کی مقدار کم کرنے کی وجہ یہ تھی کہ توازن تجارت مخالف تھا اور ریورس کونسل فروخت کئے جا رہے تھے۔ حالیہ سالوں میں ایک طرف روپے اندوختوں سے باہر آئے تو دوسری طرف روپوں کی جگہ کسی حد تک نوٹوں نے لے لی۔ روپوں کے اندوختوں سے نکلنے کے اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ اندوختوں میں روپوں کی جگہ سونا جمع کیا جانے لگا کیونکہ اس زمانے میں ہندوستان میں سونے کی قیمت روپے کے حوالے سے گرنا شروع ہو گئی تھی۔

یہاں تک کہ قبل از جنگ زمانے کی قیمتوں سے بھی کم ہوگئی تھی۔ البتہ اس کے بعد ۲۰ ستمبر ۱۹۳۱ء سے جبکہ ہندوستان طلائی معیار سے ہٹا سونے کی قیمت میں سرعت سے پھر اضافہ ہوگیا۔ (ملاحظہ ہو اگلا باب)۔ روپیوں کی طلب میں کمی ہونے کئے وجوہ یہ تھے کہ نوٹوں کی مقبولیت بڑھ رہی تھی، بنک کاری کی سہولتوں میں اضافہ ہوگیا تھا اور عند الطلب چکوں کا رواج بڑھ گیا تھا۔ عوام میں روپیہ روک رکھنے کی عادت کم ہو رہی ہے۔ حالیہ سالوں میں کپاس اور جوٹ جیسی تجارتی پیداوار کی قیمتوں کے گر جانے اور عام تجارتی کساد بازاری کی وجہ سے روپیوں اور نوٹوں کا چلن کم ہوگیا ہے۔ اس زمانے میں حکومت کی زر کی پالیسی پر اس بناپر اعتراض کیا گیا کہ ۳۰-۱۹۲۹ء اور ۳۱-۱۹۳۰ء میں زر کی مقدار بہت گھٹا دی گئی جس کی وجہ سے ملک میں زر کی قلت محسوس ہونے لگی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اشیا کی قیمتیں گرنے لگیں اور تجارت میں مشکلات پیش آنے لگیں۔ مگر سر جارج شوسٹر کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان میں زر کی مقدار میں ضرورت سے زیادہ کمی نہیں کی گئی تھی اور جو کچھ بھی کی گئی تھی وہ بین الاقوامی ارزانی کا نتیجہ تھی[1] اس میں شک نہیں کہ حالیہ سالوں میں نوٹوں کی زیادہ کھپت ہو رہی ہے مگر ایک حد تک یہ اضافہ اس وجہ سے زائل ہوگیا کہ عوام روپیہ واپس کرنے لگے۔ ہم عوام میں نوٹوں کی طلب کا ذکر کر چکے ہیں جو اندوختوں میں سونے کی بجائے جمع کئے جارہے تھے اور سونا فروخت اور برآمد کیا جارہا ہے۔ ماہ بہ ماہ زر کی کھپت کی رفتار کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زر کی کھپت عام طور پر نومبر تا جون کی گرم بازاری کے زمانے میں ہوتی ہے اور جولائی تا اکتوبر کی سرد بازاری کے زمانے میں زر کے دفتروں اور خزانوں کو زر واپس آجاتا ہے[2]

[1] دیکھو مرکزی حکومت کا میزانیہ ۳۲-۱۹۳۱ء صفحہ ۲۸-۲۹؛ نیز باب ۸ فصل (۲۴)۔

[2] اس کے ساتھ دیکھو باب (۱۰) فصل (۲۷) و (۳۰)۔

آٹھواں باب ۳۵۴

زر اور مبادلہ۔ دوسرا حصہ

ہلٹن ینگ کمیشن کی کارگذاری

ہلٹن ینگ کمیشن کی رپورٹ ۴/ اگست ۱۹۲۶ء کو شائع ہوئی۔ کمیشن کی سفارشوں کو تین حصوں میں تقسیم کرنا مناسب ہوگا یعنی (۱) زر کے معیار کا انتخاب؛ (۲) روپے کو مستحکم بنانے کے لئے مناسب شرح مبادلہ کا تعین اور (۳) ہندوستان کے لئے ایک رزرو بنک یا مرکزی بنک کا قیام۔ پہلے دو مسائل پر اس باب میں غور کیا جائے گا اور تیسرے مسئلے پر "بنک کاری اور اعتبار" کے باب میں بحث کی جائے گی۔

ا۔ معیار مبادلہ طلا کی خرابیاں

ہندوستانی زر کے معیار کے بارے میں اپنی کوئی اسکیم پیش کرنے سے پہلے کمیشن نے ان خرابیوں کو واضح کیا

جو رائج الوقت نظام زر میں موجود تھیں۔[1]

(۱) یہ نظام پیچیدہ تھا اور یہ سمجھنا کہ روپے کا استحکام کس چیز پر مبنی ہے غیر تعلیم یافتہ طبقے کی فہم سے بالاتر تھا۔[2] کرنسی دو طرح کے زر وضعی یعنی روپوں اور روپے کے نوٹوں پر مشتمل تھی جو ملک میں چالو تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ ایک پوری قدر کا غیر ضروری سکہ بھی تھا جو چالو نہیں تھا۔ روپیہ ایک بیش قیمت زر علامتی تھا جس میں دوسرے زر علامتی یعنی روپے کے نوٹوں کو غیر محدود طور پر تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر چاندی کی قیمت ایک خاص حد سے بڑھ جاتی تو اس کی حیثیت زر علامتی کی باقی نہیں رہ سکتی تھی۔

(۲) کئی کئی ذخیرے قائم کر رکھے تھے مثلاً ذخیرہ معیار طلا، ذخیرۂ زر کاغذی اور بنکوں کے ذخیرے جن کی ذمہ داری دقیانوسی اور خطرناک طریقے کے مطابق علحدہ علحدہ تھی۔ پہلے دو ذخیرے کرنسی پالیسی کے ذمہ دار تھے اور تیسرا ذخیرہ اعتباری پالیسی کے متعلق تھا۔ دوسرے ملکوں میں یہ سب کام ایک مرکزی بنک کے تفویض ہوتے ہیں۔
۳۵۵ ہندوستان میں زر کی نگرانی حکومت کرتی تھی اور اعتبار کا انتظام جس حد تک بھی تھا امپیرل بنک کے ہاتھ میں تھا۔

(۳) اس نظام میں اس کا کوئی انتظام نہ تھا کہ زر کی مقدار

---

[1] دیکھو ہلٹن ینگ کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۲۱۔

[2] یہی نہیں کہ مسئلہ آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتا تھا بلکہ دوسری خرابیاں بھی تھیں۔ مسٹر ڈیننگ ناظم زر لکھتے ہیں کہ "اس نظام میں روپے کی قدر مبادلہ کی از خود استحکام پذیری کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اگر حکومت اسٹرلنگ ½ ۱ پنس کی شرح سے کونسل بلز کی طلب کو کامل طور پر پورا نہ کرے تو بھی شرح مبادلہ کو بالائی مقام طلا سے متجاوز ہونے سے روک سکتی ہے۔ لیکن زر میں قانوناً کوئی ایسا انتظام نہیں کیا گیا تھا کہ شرح مبادلہ کو زیرین مقام طلا سے گرنے سے روکا جائے۔ شرح مبادلہ کی اسی کمی کو عملی طور پر ریورس کونسلز

بلا نفاذ قانون گھٹائی اور بڑھائی جا سکے۔ اس کمی بیشی کا انحصار زیادہ تر زر کا انتظام کرنے والی جماعت یعنی حکومت پر تھا۔ اس نظام میں یہ بھی پابندی نہیں تھی کہ ذخائر میں کمی واقع ہونے کی صورت میں اندرون ملک زر کی مقدار میں کمی کی جاتی [1]

جہاں تک کہ زر کی مقدار میں اضافے کا تعلق ہے اس میں بھی یہی ہوتا تھا۔ حکومت نے جب ضابطے کے بموجب اسٹرلنگ خریدے تو بعض اوقات اسی تناسب سے زر کی مقدار میں اضافہ نہیں کیا۔ اسٹرلنگ کی خریدی ابتداءً خزانے کے فاضلات کی بنیاد پر کی گئی اور زر کی مقدار میں اضافہ کرنا حکومت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔

(۴) آخر میں یہ کہ اس نظام میں لچک نہیں تھی۔ اسمتھ کمیٹی کی سفارش کی بنا پر لچک پیدا کرنے کا یہ انتظام کیا گیا کہ ہندوستانی تجارت کے لئے مالی سہولتیں فراہم کرنے کے طریقے اختیار کئے گئے جن کے تحت نقد قرضے دیے گئے یا عند المطالبہ پرامیسری نوٹوں پر پیشگی رقم فراہم کر دی گئی۔ اس طرح زر کے موسمی اضافے کے مقابلے میں داخلی تجارتی ہنڈیوں کی تعداد کفالت کے لئے ناکافی ثابت ہوتی تھی اس لئے حکومت کو ستمبر ۱۹۲۴ء میں یہ اعلان کرنا پڑا کہ وہ حسب ضرورت

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ :۔ جاری کر کے روکا جاتا تھا۔ لیکن حکومت ایسا کرنے کے لئے قانوناً پابند نہ تھی۔" دیکھو ہلٹن ینگ کمیشن کی رپورٹ جلد دوم ضمیمہ۔

[1] جیسا کہ مسٹر ڈیننگ نے اپنی یادداشت میں جو کمیشن کے سامنے پیش کی گئی تبلایا" زر کی مقدار میں کمی کرنے کا انتظام خاص طور پر ناقص تھا۔ ریورس کونسل فروخت کرنے سے جو قیمت وصول ہوئی تھی اس کے بدلے اسٹرلنگ کے تمسکات خرید کر ذخیرۂ زر کاغذی میں رکھ دیے جاتے تو ظاہر ہے کہ زر کی مقدار میں کمی ہو سکتی تھی۔ لیکن حکومت ایک اور انتظام بھی کر سکتی تھی۔ ریورس کونسل بلز کی رقوم ادا کرنے کے لئے

اپنے اختیارات کو کام میں لاکر لندن کے محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی میں خزانے کی ہنڈیاں بطور امانت رکھکر ان کی بنیاد پر نوٹ جاری کرے گی۔

دوسرے قابل اعتراض امور جن کو ہلٹن ینگ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں نمایاں جگہ نہیں دی مگر جن سے زیر بحث کرنے والے بخوبی واقف ہیں یہاں بیان کر دینا مناسب ہوگا۔

۲۔ محفوظ ذخیرے اور فاضلات

یہ پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ کس طرح ان ذخائر اور فاضلات سے جو خاص اغراض کے لئے بنائے گئے تھے بے جا کام لیا گیا۔ ذخائر اور فاضلات سے استفادہ کرنے میں ہم آہنگی کی پالیسی پر کبھی عمل نہیں کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان سے بعض اوقات علٰحدہ علٰحدہ کام لیا گیا اور کبھی ملا کر جس سے بہت کچھ پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں۔

۳۵۷ محفوظ ذخیرۂ طلا کی ترکیب ٹھیک نہیں تھی۔ اس ذخیرے کو زیادہ تر طویل مدت کے تمسکات میں مشغول کیا گیا اور اس کا بہت کم حصہ سیال حالت میں رکھا گیا۔ چیمبرلین کمیشن نے سفارش کی تھی کہ ذخیرے کا بڑا حصہ سیال[ا] اور آسانی سے فروخت ہونے والے تمسکات کی شکل میں رکھا جائے اور یہ کہ ذخیرۂ معیار طلا کی چاندی کی شاخ کو ختم کر دیا جائے۔ حکومت نے موخرالذکر مشورے پر تو عمل کیا لیکن دوسری سفارشوں کو جنگ کے چھڑ جانے کی وجہ سے عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ جنگ کے زمانے میں تقریباً تمام کا تمام ذخیرہ لندن میں تمسکات کی شکل میں رکھا گیا اور اس سے برطانوی جنگی تمسکات اور خزانے کی ہنڈیاں خریدی گئیں۔ اس سفارش کو کہ تمسکات ایسے ہونے چاہییں جو آسانی سے فروخت ہوسکیں اس طرح عملی جامہ پہنایا گیا کہ

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ:۔ وہ ذخیرۂ معیار طلا سے قرض لے سکتی تھی اور اس طرح ملک میں زر کی مقدار بدستور قائم رہ سکتی تھی۔ دیکھو کرنسی کمیشن کی رپورٹ جلد دوم ضمیمہ۔

ا۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۳۱۹۔

قلیل مدت کے تمسکات میں رقم مشغول کی گئی۔

اسمتھ کمیٹی نے سفارش کی کہ ذخیرے کے بڑے حصے کو سونے کی شکل میں رکھنا چاہئے۔ کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی کہ تمسکات قلیل مدت کے ہونے چاہییں جو حکومت ہند کے سوا سلطنت برطانیہ کی کسی حکومت کے جاری کردہ ہو سکتے ہیں۔

جیسا کہ مندرجۂ ذیل اعداد سے ظاہر ہوگا یکم اپریل ۱۹۳۵ء[1] کو محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی میں ضم کئے جانے اور ریزرو بنک آف انڈیا میں منتقل ہونے سے پیشتر ذخیرۂ معیار طلا کی حالت یہ تھی کہ وہ زیادہ تر لندن میں تھا اور اس کا بیشتر حصہ مختلف قسموں کے قلیل مدت کے تمسکات میں مشغول تھا۔

محفوظ ذخیرۂ معیار طلا کے فاضلات کی تفصیل بتاریخ ۳۱/مارچ ۱۹۳۵ء[2] انگلستان میں:۔

	پاونڈ
۳۱/مارچ ۱۹۳۵ء کو ۳۶۶۴۸۰۰۰ پاونڈ کے اسٹرلنگ کے تمسکات کی مالیت	۳۷۸۴۵۵۲۹
سونا	۲۱۵۲۳۳۴
بنک آف انگلینڈ میں نقد	۲۱۳۷
میزان	۴۰،۰۰۰،۰۰۰

تقریباً تمام ذخیرۂ معیار طلا اور محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی کا کچھ حصہ لندن میں رکھا جاتا تھا۔ چیمبرلین کمیشن نے محفوظ ذخیرۂ معیار طلا کو

---

[1] ملاحظہ ہو فصل ۱۳۱ اور باب ۱۔

[2] مشغولات اصل کی مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو ناظم زر کی رپورٹ بابت ۱۹۳۵ء-۳۶ گوشوارہ (۱۷)۔

لندن ہی میں رکھنا اس لئے مناسب خیال کیا کہ لندن تمام دنیا کا حساب گھر اور زر کا بازار تھا۔ اس کے علاوہ سلطنت متحدہ ہندوستان کی سب سے بڑی گاہک تھی اور لندن ہی وہ مرکزی مقام تھا جہاں ایک طرف وزیر ہند کو ہندوستان کی جانب سے خرچ کرنے کے لیے رقم درکار ہوتی تھی تو دوسری طرف ہندوستان کو اپنے ذمے کے تجارتی مطالبات انگلستان اور تمام دنیا کو ادا کرنے کے لیے رقم بھیجنی پڑتی تھی اگر ذخیرہ ہندوستان میں رکھا جاتا تو اسے لندن کو جہاز ۳۵۷
سے بھیجنا پڑتا جس سے نہ صرف غیر ضروری تاخیر واقع ہوتی بلکہ بلا وجہ مصارف بھی برداشت کرنے پڑتے۔ ایک اور وقت یہ تھی کہ ہندوستان میں قلیل مدت کے قرضوں کا کوئی بازار نہ تھا۔ اس لئے یہاں ذخیرہ رکھنے میں نقصان تھا کیونکہ کوئی سود نہیں مل سکتا تھا۔ مزید یہ کہ بعض یورپی ملکوں کے مرکزی بنکوں کا یہ طریقہ کہ وہ غیر ملکی ہنڈیاں اپنے پاس رکھتے تھے ہندوستانی زر کے نظام کے لئے ذخیرے کو لندن میں رکھنے کی ایک قابل تقلید مثال تھا۔

ذخیرہ رکھنے کے ان پیچیدہ انتظامات کا غالباً اصل مقصد یہ تھا کہ اگر ناموافق توازن تجارت کی وجہ سے شرح مبادلہ گر جائے تو اس کو سنبھال لیا جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی حد تک ناموافق توازنِ تجارت کبھی اتفاق سے یعنی اوسطاً دس سال میں ایک دفعہ رونما ہوتا ہے اور اس لئے ایسے اتفاقی واقعے کے لئے باضابطہ مستقل انتظامات کرنا غیر ضروری تھا۔

وزیر ہند ذخیرے کو لندن میں رکھے بغیر اپنے اخراجات کے لئے آسانی سے رقوم فراہم کر سکتا تھا۔ ذخیرے کو وزیر ہند کے اخراجات کے لئے لندن میں رکھنے کی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ اپنے اخراجات کے لئے اس ذخیرے کے بغیر بھی رقم کا انتظام کر سکتا تھا۔

رہا ہندوستان میں قلیل مدتی قرضوں کے بازار کی عدم موجودگی

کا معاملہ تو جیسا کہ جنگ کے زمانے اور اس کے بعد کے تجربے نے ثابت کر دیا ہے یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں قلیل مدت کے مشغولات اصل کی گنجایش نہیں ہے۔ بہر صورت ذخیرے کے مقام کا تعین کرنے میں سود کے ملنے یا نہ ملنے کو معیار انتخاب قرار دینا مناسب نہیں ہے۔

بعض ملک ایسے بھی ہیں جن کا توازن تجارت بین قومی تجارت میں عام طور پر ناموافق رہتا ہے۔ لیکن اس پر بھی وہ کسی غیر ملک میں اپنا کوئی ذخیرہ نہیں رکھتے۔ چنانچہ کوئی دوسرا ملک اس بنا پر کہ وہ سال بہ سال ہندوستان کا دین دار رہتا ہے اپنے ذمے کی رقوم کے تصفیے کے لئے ہندوستان میں اپنا کوئی ذخیرہ نہیں رکھتا۔

رہا محفوظ ذخیرۂ زر کاغذی تو یہ بالکل بے قاعدہ بات تھی کہ کسی ذخیرے کو جو کسی ملک کے مروجہ نوٹوں کی نقد پذیری کے لئے قائم کیا گیا ہو اسی ملک میں رکھنے کے بجائے اس کے کسی جزو کو ۶ ہزار میل دور کسی مقام پر رکھا جائے اور اس طرح نوٹوں کی ساکھ کو کمزور کر دیا جائے۔ اس طریق عمل کی تائید میں ایک دلیل یہ بھی پیش کی گئی کہ چاندی کا سب سے منظم اور ارزاں بازار لندن ہی تھا۔ اس لئے چاندی خریدنے کے لئے وہیں کافی رقم رکھنا مناسب تھا۔ لیکن جب انگلستان چاندی کا بہترین بازار ہو سکتا ہے باوجودیکہ وہاں چاندی نہیں نکلتی تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان میں بھی اعلیٰ درجے کا چاندی کا بازار قایم نہ ہو سکے بہ شرطیکہ حکومت چاندی کی خریداری ملک ہی میں کرتی رہتی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ حکومت ۳۵۸ نے ایسی کوئی کوشش کرنے کے بجائے چاندی کی درآمد پر محصول عائد کر کے بازار قائم ہونے میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ اس کے علاوہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ لندن میں چاندی خریدنا ضروری تھا تو رقم لندن میں پیشگی جمع رکھنے کے بجائے خریدی کے وقت ہندوستان سے وہاں حسب ضرورت روانہ کرنے میں کوئی خاص نقصان نہیں تھا۔ اس میں جو بھی زائد خرچ

اور وقت اٹھانی پڑتی اس کی تلافی اس طرح ہو جاتی کہ عوام کے شبہات اور بے اطمینانی کا ازالہ ہو جاتا۔ شدید ضرورت کے وقت یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہندوستان سے انگلستان رقم آنے تک انگلستان ہی میں بنک آف انگلینڈ کی مدد سے مطلوبہ رقم فراہم کرالی جاتی۔ آخر میں یہ کہ چاندی خریدنے کے جو طریقے تھے ان کو انتہائی راز میں رکھا گیا تھا جس کی وجہ سے لوگوں کو اعتراض کا موقع ملتا تھا۔

۳- رقوم کی روانگی کا انتظام

جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے ہندوستان سے لندن کو رقم منگانے کی ترکیب یہ تھی کہ وزیر ہند کونسل ڈرافٹ فروخت کرتا تھا۔ اس طریقے پر یہ اعتراض تھا کہ اس کی مدد سے غیر ضروری طور پر بڑی بڑی رقمیں ہندوستان سے لندن کو منتقل کی جاتی تھیں جس میں ۱۹۰۴ء کے بعد سے خاص طور پر شدت ہو گئی تھی۔ اس کارروائی کی وجہ یہ بتلائی گئی کہ اس کی بدولت وزیر ہند اپنی مالی حالت کو تقویت دے سکتا تھا۔ لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ اس طرح تقویت دینے کا منشا کیا تھا۔ کونسل ڈرافٹ کی فروخت اس لئے بھی مناسب خیال کی گئی کہ جب کبھی موقع ہو وزیر ہند ان کی غیر معمولی اعلیٰ شرح سے نفع کما سکے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ سوال کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کہ وزیر ہند کو رقم کی ضرورت ہے یا نہیں۔ یہ بھی استدلال کیا جاتا تھا کہ وزیر ہند اپنے اخراجات سے زیادہ رقم حاصل کر کے قرضے میں کمی کر سکتا یا اس سے بچ سکتا تھا۔ لیکن زائد از ضرورت رقم طلب کرنے کی وجہ سے ہندوستان میں سرمایہ کو وافر رکھنے کی پالیسی کی ترغیب ہوتی تھی۔ قرضوں کو کم کرنے یا ان سے بچنے سے یہ زیادہ بہتر ہوتا کہ ہندوستان میں محصول کا بار کم کرنے کی کوشش کی جاتی[1]۔ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھا گیا کہ وزیر ہند کے فاضلات کافی مقدار میں ہونے کے باوجود لندن میں بڑے بڑے قرضے لئے گئے۔

اس طریقے سے وزیر ہند کے پاس جو فاضل رقم جمع ہو جاتی تھی وہ لندن

[1] دیکھو باب ۱۱ فصل ۲۷ تا ۳۰۔

کے معتبر قرض گیرندوں کو جن کی فہرست وزیر ہند کے پاس ہوتی تھی بہت ہی ادنیٰ شرح سود پر قرض دی جاتی تھی ۔ یہ شکایت عام تھی کہ ان قرضوں کے دینے میں بڑی حد تک پاس داری سے کام لیا جاتا تھا ۔ یہ شکایت اس وجہ سے اور بھی زیادہ قابل لحاظ تھی کہ وزیر ہند کی کونسل کی فینانس کمیٹی کے ارکان زیادہ تر نظما اور کاروباری اشخاص ہوتے تھے جو قرضہ پانے والوں کا انتخاب اپنے اغراض کے تحت کیا کرتے تھے ۔ ص ۳۵۹

ایک اور قابل اعتراض طریقہ یہ تھا کہ کونسل بلز عام طور پر ایسی شرحوں پر فروخت کئے جاتے تھے جو مقام درآمد فلز سے گری ہوئی ہوتی تھیں حالانکہ اس وقت لندن میں رقوم کی کوئی فوری ضرورت نہ ہوتی تھی ۔

وزیر ہند کی ضروریات سے زائد کونسل بلز فروخت کرنے کے طریقے کی تائید میں ایک اہم دلیل یہ بھی پیش کی گئی کہ اس سے ہندوستان کی خارجی تجارت کو بڑی تقویت ہوتی تھی ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تجارت اس امداد کی محتاج نہ تھی اور بہ آسانی مالی امداد حاصل کرنے کے کوئی دوسرے طریقے تلاش کر سکتی تھی ۔ چنانچہ جب کبھی کونسل بلز کی فروخت کم کر دی گئی تجارت نے دوسری مالی سہولتیں بہت آسانی سے فراہم کر لیں ۔ ایسی حالت میں حکومت کو اپنے معمول سے ہٹ کر تجارت کو مالی امداد دینے کی چنداں ضرورت نہ تھی ۔ اگر وہ صرف یہ کرتی کہ برآمد کے لیے حسب ضرورت سونا آزادی کے ساتھ فراہم کر دیتی تو بالکل کافی تھا ۔

حقیقت میں کونسل بل کے طریقے کو دیکھنے سے صاف یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہندوستان میں سونے کی درآمد کو روکنے اور ہندوستان کے لئے سونا فراہم کرنے کی زحمت اور مصارف سے لندن کو بچانے کی ایک باقاعدہ ترکیب تھی ۔ اس کے علاوہ اس طریقے سے ہندوستان کا سونا جس قدر بھی ممکن تھا انگلستان کو مل جاتا تھا جہاں وہ رکھا ہی نہیں جاتا تھا بلکہ استعمال کیا جاتا تھا ۔[1]

---

[1] ملاحظہ ہو "ہندوستانی زر اور مالیہ" شایع شدہ "ٹائمز آف انڈیا پریس" ۱۹۱۳ء صفحہ ۵ ۔

سر اسٹانلی ریڈ نے بے بنگ ٹن اسمتھ کمیٹی کے سامنے جو یادداشت پیش کی اس میں یہ سفارش کی تھی کہ وزیر ہند شرح مبادلہ کے بارے میں جو انتظام کرتا ہے اس کو برخاست کر دیا جائے۔ سر اسٹانلی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اکثر ہندوستانی نہ صرف حکومت ہند کو بلکہ اس کے ساتھ وزیر ہند کو بھی شبہے کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتلایا کہ وزیر ہند ہندوستان کے بڑے مالی مرکزوں سے ۶ ہزار میل دور بیٹھا ہوا اپنا کاروبار کرتا تھا اور ایسے افراد کے زیر اثر ہوتا تھا جن کو ہندوستانی اغراض و مقاصد سے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ رازمیں کارروائیاں کرتا تھا اس لئے کہ اس کی اختیار کی ہوئی تدابیر کا کچھ بھی علم ہندوستان میں نہیں ہو سکتا تھا اور اگرچہ یہ تدابیر بجائے خود کتنی ہی دانشمندانہ اور عملی طور پر مفید نہ ہوتی ہوں پھر بھی ان کا سمجھنا مشکل تھا اور ہندوستان میں ان کے متعلق غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے کامل اختیارات کو جن سے یہاں کے لوگ متاثر ہوتے ہوں اتنی دور بیٹھے استعمال کیا جائے تو کیا کچھ سیاسی خرابیاں پیدا نہ ہوں گی؟

ہندوستانی زر کے نظام پر اصلی اعتراض یہ نہ تھا کہ اس پر نگرانی رکھی گئی تھی کیونکہ تمام مہذب ممالک میں انتظام و نگرانی بہر حال ضروری ہے، بلکہ یہ کہ انتظام ناقص تھا یا کم از کم ان ہندوستانیوں کی اکثریت اس کو عام طور پر ناقص خیال کرتی تھی جو زر کے معاملات پر ذرا بھی عبور رکھتی تھی۔ بقول
پروفیسر نکلسن "اگر عوام یہ خیال کرنے لگیں کہ زر کے نظام میں کچھ خرابی ہے ف۳۶
تو یہ چیز ملک کے لئے اچھی نہیں ہوتی" اور خواہ معیار مبادلہ طلا کے کچھ ہی محاسن کیوں نہ ہوں مگر اس کی وجہ سے ہندوستانی یہ خیال کرنے لگے تھے کہ کہ ان کے زر کے نظام میں کچھ نہ کچھ شدید نقائص ضرور ہیں۔

۴ زر کی افراط اور قیمتوں کا اضافہ

جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے، ہلٹن ینگ کمیشن نے یہ بتلایا تھا کہ ہندوستانی زر کے نظام میں یہ صلاحیت نہیں تھی کہ زر کی مقدار حسب ضرورت کم یا زیادہ

کی جا سکے[1] خصوصاً زائد از ضرورت زر کی مقدار گھٹانے میں بہت مشکل ہوتی تھی - اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ زر کی مقدار میں ضرورت سے زیادہ اضافہ ہو جاتا تھا اور ہندوستان میں قیمتیں انتہائی طور پر بڑھ جاتی تھیں[2] جیسا کہ چیمبرلین کمیشن کی رپورٹ پر تنقید کرتے ہوئے پروفیسر نکل سن نے خیال ظاہر کیا تھا کہ روپوں کی نقد پذیری چونکہ جزوی تھی اور بسا اوقات روک دی جاتی تھی اس لئے ایسی صورت میں روپے مسلسل ڈھالنے کا مجموعی اثر یہ ہوتا تھا کہ عام طور پر قیمتیں بڑھ جاتی تھیں -

انتہائی نیک نیتی کے باوجود ملک میں زر کی مانگ کا صحیح اندازہ کرنے میں حکومت سے غلطیاں سرزد ہو سکتی تھیں[3] بعض اوقات روپوں کی طلب بالکل حقیقی اور ضروری معلوم ہوتی تھی حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہوتا تھا - اندازہ قایم کرنے میں آسانی سے غلطی خاصکر اس لئے بھی ہوتی تھی کہ روپے ایک مرتبہ عوام کو جاری کر دینے کے بعد دیہات میں پہنچ جاتے تھے جہاں سے وہ جلد واپس نہیں آتے تھے -

---

[1] - دیکھو فصل (۱)

[2] - دیکھو باب (۹)

[3] "ہندوستان کی حکومت ضرورت سے زیادہ کوشش کرتی رہی ہے - اس نے کل مطلوبہ زر کی ذمہ داری اپنے سر عائد کرلی اور مختلف موقعوں پر حسب ضرورت زر مہیا کرنے کی کوشش کی حسب ضرورت زر مہیا کرنا ایک ایسا کام ہے جو دنیا کے کسی دوسرے بڑے ملک کے بنک کے بھی تفویض نہیں کیا جاتا - یہ کام حکومت کے بس سے باہر ہے اور اس کی وجہ سے حکومت پر نامناسب وبا ؤپڑا حقیقت یہ ہے کہ ٹکسالوں کے بند ہونے کے بعد سے ہندوستانی زر کا نظام انگلستان سے بھیجے ہوئے نئے نئے عہدہ داروں کی مرضی پر موقوف رہا - ایک عہدہ دار زر کی مقدار میں اضافہ کرتا تو دوسرا اس میں کمی کر دیتا - کوئی باضابطہ نظام العمل موجود نہ تھا اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی نیا تجربہ کیا جاتا تھا، مثلاً سونے کی ٹکسال چاندی پر

۵۔ بے اصول اور بیش خرچ نظام

ہندوستان معیار مبادلۂ طلا سلسلہ وار انتظامی اعلانات کی وجہ سے رونما ہوا اور حقیقت میں وہ کسی باقاعدہ اور دانستہ طور پر اختیار کئے ہوئے نصب العین کے مطابق نہ تھا۔ ایسے متعدد طریقہ ہائے کار اس نظام کے تحت اختیار کیے گئے جو کوئی قانونی جواز نہ رکھتے تھے۔ جیسا کہ مسٹر دلال نے اپنی اختلافی یادداشت (فقرہ ۵۹ ـ ۶۰) میں بیان کیا بحیثیت مجموعی اس نظام کا کوئی باقاعدہ اور قطعی خاکا مرتب نہیں کیا گیا تھا اور اسی وجہ سے عام طور پر اس کی حالت ناقابل اطمینان تھی۔

معیار مبادلۂ طلا کو بالعموم یہ کہکر سراہا گیا کہ وہ خالص طلائی معیار کے مقابلے میں کم خرچ تھا۔ لیکن اگر معیار مبادلۂ طلا کی مذکورۂ بالا تمام خرابیوں کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ نظام سستا ہونے کے باوجود بہت مہنگا پڑا! ۳۶۱

یہ نظام اندوختہ کرنے کی عادت کو دور کرنے میں ناکام رہا اور عوام کو یہ بھی نہ سکھا سکا کہ کم خرچ زر کے استعمال کے کیا فائدے ہوتے ہیں۔[۱]

۶۔ اندرونی و بیرونی استحکام کا مقابلہ

انصاف کے یہ معنی ہیں کہ معیار مبادلۂ طلا کی کامیابیوں اور ناکامیوں دونوں کو واضح کیا جائے۔ اس کا ایک کارنامہ تو یہ ہے کہ اس کی وجہ سے ملک میں مبادلے کی حالت کافی عرصے تک مستحکم رہی۔ گو جنگ کے زمانے میں مبادلہ بالکل درہم و برہم ہو گیا تھا۔ لیکن اس صورت حال سے دنیا کا کوئی زر کا نظام بھی نہ بچ سکا۔

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ اتفاقی محصول اور اسی طرح جو جی میں آیا کیا گیا"۔ ملاحظہ ہو مورٹن فروٹن کا بیان جو اس نے چیمبرلین کمیشن کے سامنے دیا۔ نیز ایچ۔ ال چبلانی کی کتاب موسوم بہ Studies in Indian Currency and Exchange. صفحہ ۹۳ـ۹۴ـ

[۱] ۔ دیکھو فصل (۱۵) ـ

واقعہ یہ ہے کہ نقرئی معیار کے مقابلے میں معیار مبادلۂ طلا مبادلات خارجہ کو مستحکم رکھنے میں کامیاب رہا۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ معیار مبادلۂ طلا کے بعض نقاد اس حد تک بھی تسلیم نہیں کرتے اور ان کا یہ کہنا ہے کہ جنگ کے زمانے کے قطع نظر بھی یہ نظام مبادلے کے استحکام میں کامیاب نہیں رہا۔ جنگ سے قبل صرف ۱۹۰۷ء۔۱۹۰۸ء کے نازک زمانے میں اس نظام کی آزمائش ہوئی تھی اور اس زمانے میں اس کو بیرونی امداد سے قائم رکھا گیا۔ حکومت کو یہ وعدہ کرنا پڑا تھا کہ اگر ضرورت ہوگی تو وہ شرح مبادلہ کو برقرار رکھنے کے لئے قرضہ لے گی۔ اس کے علاوہ حکومت کو محاصل بھی بڑھا دینے پڑے تھے تاکہ اس طرح سونا فراہم کیا جائے۔ اس لئے یہ نظام صرف موافق حالات میں قائم رہ سکتا تھا اور حالات ذرا بھی ناموافق ہوں تو اس کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ بہر حال اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ اس کی وجہ سے کافی مدت تک مبادلات کی حالت مستحکم رہی تو بھی اس کے خلاف یہ کہنا پڑے گا کہ اندرون ملک قیمتوں کو قرار نہیں رہا اور عام رجحان یہ تھا کہ اس کی وجہ سے قیمتیں بڑھ رہی تھیں۔ اکثر معاشیین کے نزدیک اندرون ملک قیمتوں کا استحکام مبادلات خارجہ کے استحکام سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اس کے علاوہ مبادلات میں استحکام پیدا کرنے کے لئے صرف معیار مبادلۂ طلا ہی واحد ذریعہ نہیں تھا بلکہ معیار طلا کے تحت بھی قیمتوں کے استحکام کے ساتھ ساتھ مبادلے کا استحکام ممکن ہے۔ لیکن طلائی معیار سخت تقاضوں کے باوجود اختیار نہیں کیا گیا۔

معیار مبادلۂ طلا کی ان خرابیوں کی وجہ سے عوام اس سے بہت بدظن ہو گئے تھے اور یہ بدظنی اس وجہ سے اور بڑھ گئی تھی کہ اس نظام کا انحصار محض انتظامی کارروائیوں پر تھا اور زر کے معاملے میں حکومت کے فرائض کے متعلق کوئی باضابطہ قواعد موجود نہ تھے۔ گو ماضی میں بیرونی استحکام بڑی حد تک حاصل ہو گیا تھا، لیکن زر کے نظام میں اس تیقن اور سادگی کا فقدان تھا جو ان پڑھ عوام میں اعتماد پیدا کرنے

اوران کی اندوختہ کرنے اور اصل مشغول نہ کرنے کی عادت کو چھڑانے کے لئے ضروری ہے [۱] ۳۶۲

اصلاح کی تجویزیں

اصلاح کے متعلق کمیشن نے بعض متبادل تجاویز پر غور کیا۔ مثلاً (۱) اصلاح یافتہ معیار مبادلہ اسٹرلنگ [۲]؛ (۲) معیار مبادلہ طلا [۳]؛ اور (۳) معیار طلا طلائی زر کے ساتھ یا بغیر طلائی زر کے۔

کمیشن نے معیار مبادلہ اسٹرلنگ اور معیار مبادلہ طلا دونوں کو اس وجہ سے مسترد کردیا کہ خواہ وہ کتنے ہی اصلاح یافتہ کیوں نہ ہوں ان دونوں کا انحصار ہمیشہ چاندی کے نرخ پر رہے گا۔ اگر چاندی کی قیمت روپیہ گلانے کے نقطے سے ذرا بھی

---

[۱] چیمبرلین کمیشن کی اکثریت سے اختلاف کرتے ہوئے سر جیمس بگ بی نے یہ بتلایا تھا کہ روپیہ جو زر وضعی تھا سونے کو رواج سے ہٹا رہا تھا اور یہ مشورہ دیا کہ عوام کو اپنا اندوختہ کیا ہوا سونا استعمال کرنے کی ترغیب دینے کے لئے یہ اطمینان دلانا ضروری تھا کہ ان کو سونا واپس مل سکیگا۔ اسی خیال کو مسٹر (اب سر) داوی یا دلال نے اپنی اختلافی یادداشت (فقرہ ۶۱) میں دہرایا جو بے بنگ ٹن اسمتھ کمیٹی کی رپورٹ میں شریک ہے۔

[۲] ۔ اس طرح کا معیار قائم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ (۱) از روئے قانون ذخیرۂ معیار طلا اور ذخیرۂ زر کاغذی کو ملا کر ایک ذخیرہ قائم کیا جائے جو زر کے ایک ہی محکمے کی نگرانی میں ہو، اور (۲) قانون کے بموجب زر کے متعلقہ محکمے پر یہ لازم کیا جائے کہ معینہ شرح کے بالائی مقام طلا کے حساب سے بلاتعین مقدار اسٹرلنگ کے بدلے روپیہ فروخت کرے اور اسی طرح مقررہ شرح کے زیریں مقام طلا پر روپے کے بدلے اسٹرلنگ فروخت کرے۔

[۳] ۔ معیار مبادلہ طلا کی ایک صورت یہ ہوسکتی تھی کہ (اسٹرلنگ کے معیار مبادلہ کی طرح) اسٹرلنگ کی خرید و فروخت کی ذمہ داری لینے کی بجائے محکمۂ زر یہ ذمہ داری اپنے سر لیتا کہ طلائی معیار والے اہم ملکوں میں سے کسی ملک کے زر کی خرید و فروخت بلاتعین مقدار علی الترتیب بالائی و زیریں مقام طلا کی شرح پر کرے گا۔ دیکھو ہلٹن ینگ کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۲۶۔

متجاوز ہو تو یہ سکہ غائب ہونے لگے گا۔ اس کے علاوہ معیار مبادلۂ طلا خواہ کسی قسم کا رکھا جائے اندرون ملک نوٹ صرف روپوں سے نقد پذیر رہے گا نہ کہ سونے سے۔ معیار مبادلۂ اسٹرلنگ پر یہ اعتراض بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس کے تحت اگر اسٹرلنگ کی قیمت زیادہ گر جائے تو اس کی وجہ سے نہ صرف مبادلہ غیر مستحکم ہو جائے گا بلکہ اندرون ملک قیمتوں میں بھی خلل واقع ہو گا۔

اس کے علاوہ اس نظام میں وہ سادگی مفقود ہے جو عوام کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے ضروری قرار دی گئی ہے۔ معیار مبادلہ کے نظام میں بہت سی باریکیاں ہیں اور نقد پذیری کا حق ضرورت سے زیادہ دقیق ہے جس سے ہندوستان کے موجودہ حالات کے تحت عوام کو براہ راست کوئی سروکار نہیں ہے۔ زر وضعی کی بنیاد بہت ہی پوشیدہ اور ناقابل فہم ہے۔ اس کے علاوہ معیار مبادلۂ طلا کے نظام میں ہندوستانی مفاد کے خلاف الٹ پھیر کا جو امکان ہے اس سے عوام کی بدظنی اس طریقے کی کامیابی کے لئے مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ ہندوستانی عوام صرف اسی وقت مطمئن ہو سکتے ہیں جبکہ ملک کے زر کی بنیاد سونے پر قائم ہو۔ اس غرض کے لئے ملک کے زر اور سونے کا باہمی رشتہ نہ صرف حقیقی بلکہ واضح اور قطعی ہو اور اس لئے یہ بتلایا گیا کہ حقیقی طلائی معیار ہی ہندوستانی زر کی پالیسی کا نصب العین ہونا چاہئے۔ ۳۶۳

ہندوستان کے لئے طلائی معیار

محکمۂ فینانس کی تجویز[۱] سر بیسل بلاکٹ اور حکومت ہند کے محکمۂ فینانس کے دوسرے عہدہ داروں نے کمیشن کے سامنے طلائی معیار کی جو اسکیم پیش کی اس میں یہ تجویز کیا گیا تھا کہ دس سال کے بعد

۱۔ دیکھو ہلٹن ینگ کمیشن کی رپورٹ جلد دوم ضمیمہ ۵ ۔ ۷۔

روپے کی حیثیت زر قانونی کو ختم ہو جانا چاہئے البتہ ۵۰ روپے تک کی چھوٹی رقمیں مستثنیٰ رہیں۔ اور اس اثنا میں روپے کو سونے کے سکے سے نقد پذیر رکھا جائے۔ حقیقت میں پیش نظر نظام اس وقت برطانیۂ عظمیٰ میں نافذ تھا جس کے تحت صرف نوٹ غیر محدود زر قانونی تھا اور پاونڈ اسٹرلنگ کی طلائی قیمت کو اس قانونی پابندی کے ذریعے مستحکم کیا گیا تھا جو بنک آف انگلینڈ پر عائد کی گئی تھی اور جس کے بموجب سونے کی خرید و فروخت ایسی شرحوں پر کرنی ضروری تھی جو مساوات مبادلہ کے کم و بیش مطابق ہوں۔ لیکن ہندوستان کے حالات میں ایسا تغیر واقع ہونے کے لئے جبکہ فلزی زر قانونی کی ضرورت باقی نہ رہے ایک عرصہ درکار ہے۔ انگلستان کے جیسے نظام کو جلد حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ نوٹ بڑے پیمانے پر چلائے جائیں اور اس کی صورت یہ ہے کہ ان میں صرف کم قدر روپوں ہی سے نہیں بلکہ پوری قدر رکھنے والے سونے کے سکوں سے نقد پذیر بنا دیا جائے۔ ایسا کرنے سے عوام کی اندوختہ کرنے کی عادت چھوٹ جائے گی کیونکہ انھیں یہ یقین ہو جائے گا کہ بنکوں وغیرہ میں امانتیں رکھتے وقت ان کی رقوم کی سونے میں جو مالیت ہے واپس لیتے وقت بھی وہی مالیت قائم رہے گی۔ زر قانونی کی حیثیت سے روپے کی مجوزہ تحدید کا منشا یہ تھا کہ کرنسی کے نظام کو ان اثرات سے محفوظ رکھا جائے جو چاندی کی قیمت میں اضافہ ہونے سے پیدا ہو سکتے تھے اور ذخائر کی ترکیب کو سادہ بنا دیا جائے۔

کمیشن نے اس تجویز کو کئی وجوہ سے مسترد کر دیا۔ اس تجویز پر کمیشن کے اصل اعتراض یہ تھے کہ ہندوستان میں سونے کی طلب بڑھ جانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا کے زر اور اعتبار کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور جتنی چاندی رواج سے خارج ہوگی اس کی فروخت کا اثر دنیا کی چاندی کے بازار اور ہندوستان کے چاندی کے اندوختوں پر پڑے گا۔ؔ

ؔ ۔ دیکھو ہلٹن ینگ کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۵۵-۵۲

۹۔ معیار خشت طلا

کمیشن نے یہ دلیل پیش کی کہ سونے کا سکہ رائج کئے بغیر بھی حقیقی طلائی معیار قائم کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ کمیشن نے یہ تجویز کی کہ ہندوستان میں عام طور پر روپیہ اور کرنسی نوٹ ہی جاری رہیں اور بحوالۂ طلا اس زر کو مستحکم رکھنے کی صورت یہ ہے کہ اس کو ۳۶۴
جملہ اغراض کے لئے سونے سے براہ راست نقد پذیر بنا دیا جائے لیکن سونے کو زر کی حیثیت سے رائج نہ کیا جائے۔ سونے کا سکہ ہرگز رائج نہ کیا جائے، ابتدا میں نہ آخر میں کسی وقت اس سکے کی ضرورت نہیں" (فقرہ ۵۴)۔

سونے کے سکے کو رائج کرنے کے بارے میں کمیشن کا اصل اعتراض یہ ہے کہ سونے کے سکے جتنی زیادہ مقدار میں رائج ہوں گے اتنی ہی سونے کے ذخیروں میں کمی ہوگی اور جو اعتباری نظام ان مختصر ذخیروں کی بنا پر قائم ہوگا اس میں بھی لچک کم ہوگی۔ ہلٹن ینگ کمیشن نے چیمبرلین کمیشن کے اس خیال سے اتفاق کیا کہ یہ لازمی نہیں کہ سونے کے سکے رائج ہونے سے مبادلے میں استحکام پیدا ہو۔ ہلٹن ینگ کمیشن نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ معیار خشت طلا قائم کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت جلد مکمل طلائی معیار قائم ہو جائے گا اور کسی عبوری دور کی ضرورت باقی نہ رہے گی جیسی کہ دوسری تجویزوں میں ہونے کا امکان تھا۔ ایک طرف اس اسکیم میں سونے کے ذخائر کو تدریجی طور پر ایسی رفتار سے تقویت دینے کا انتظام کیا گیا تھا کہ دنیا کے حالات میں کوئی خلل نہ پڑے تو دوسری طرف اسکیم میں یہ صلاحیت تھی کہ اگر آیندہ طلائی زر رائج کرنا مقصود ہو تو بآسانی جاری کیا جا سکتا تھا، کیونکہ سونے کے سکے فوراً رائج کرنا ناممکن تھا، البتہ اس کے لئے گنجائش رکھی گئی تھی کمیشن کی اپنی ذاتی رائے یہ تھی کہ سونے کے سکے کا رواج کسی حالت میں مناسب نہیں ہے اور اس نے یہ امید ظاہر کی کہ ہندوستانی خود آیندہ چلکر اس طریقے کو دقیانوسی اور فرسودہ خیال کرنے لگیں گے۔ جنگ عظیم نے یورپی اقوام کو

یہ سبق سکھایا تھا کہ طلائی زر کو جو ایک بیش خرچ طریقہ تھا ترک کر دیں ۔ ۱۹۲۵ء میں انگلستان میں طلائی معیار کی بحالی سونے کا سکہ دوبارہ جاری کئے بغیر عمل میں لائی گئی اور محض معیار خشت طلا اختیار کیا گیا۔ ریاستہائے متحدہ میں بھی سونے کا سکہ محض نظری طور پر رائج تھا اور عملاً اس کا چلن نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض مستند ماہروں کے نزدیک سونے کے سکے کا رواج پسماندہ تہذیب کی علامت خیال کیا جانے لگا ہے۔ کمیشن کی اسکیم کے بموجب زر کے محکمے پر قانوناً یہ ذمہ داری عائد کی جانے والی تھی کہ غیر محدود طریقے پر سونے کی خرید و فروخت کرے اور ایسی شرحوں پر جو روپے اور سونے کی معینہ شرح مساوات کے لحاظ سے قرار پائے۔ البتہ اس خرید و فروخت کے لئے سونے کی مقدار ۴۰۰ خالص اونس سے کم نہ ہو۔ اس بارے میں کوئی تحدید عائد نہیں کی گئی کہ کس غرض سے سونا طلب کیا جائے گا جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ یہ یقین دلایا جائے کہ روپے اور سونے کی باہمی قدر قائم رہے گی اور مبادلہ مقررہ شرح مساوات کے مطابق مقامات طلا کے اندر اندر مستحکم رہے گا۔ اس طرح سونے کو قدر کا حقیقی معیار بنایا گیا اور روپے کا تعلق اسٹرلنگ یا کسی دوسرے ملک کی کرنسی سے نہیں قائم کیا گیا بلکہ اس کا تعلق براہ راست سونے سے قائم کیا گیا۔ گویہ نظام قطعی طور پر طلائی معیار تھا اور معیار مبادلۂ طلا سے مختلف تھا جو پہلے ملک میں رائج تھا، کیونکہ اس نظام میں روپے اور نوٹ ہر کام کے لئے سونے کی اینٹوں سے نقد پذیر تھے، پھر بھی مبادلات کا سابقہ انتظام محفوظ رکھا گیا کیونکہ سونے کی اینٹوں کا شمار کرنسی میں نہیں ہو سکتا۔ زر کا محکمہ جب سونے کی اینٹوں کے بدلے میں نوٹ یا روپے ادا کرے گا تو کرنسی میں اضافہ ہو جائیگا اور نوٹوں اور روپوں کے عوض سونے کی اینٹیں دے گا تو زر کی مقدار میں کمی ہو جائے گی۔ ص ۳۶۵

روپوں کی سونے کی اینٹوں میں نہ کہ سونے کے سکوں میں

نقد پذیری، ساورن کو زر قانونی نہ رکھنا (یہ اس لئے تجویز کیا گیا کہ اندوختوں میں جو سونے کے سکے موجود تھے وہ چلن میں نہ آنے پائیں) اور طلائی سیونگ سرٹیفکیٹوں کا طریق (جس کو فصل ۱۱ میں بیان کیا گیا ہے) ان سب کی اس لئے سفارش کی گئی کہ اندوختوں کو معطل کر دیا جائے تاکہ ان سے اندرون ملک قیمتوں اور شرح سود میں خلل پڑنے کا اندیشہ باقی نہ رہے۔

۱۰۔ سونے کی خرید و فروخت کی شرحیں اگر سونے کی خرید و فروخت صرف روپے کی معینہ شرح کے مطابق کی جاتی اور سونے کی درآمد کے مصارف یا کرنسی کی قدر کا معینہ شرح سے کم یا زیادہ ہونے کے امکان کا لحاظ نہ رکھا جاتا تو کرنسی کے محکمے کا سونے کا سب سے ارزاں بازار ہو جانے کا احتمال تھا۔ یہ صورت نہ صرف ہندوستان میں سونے کے بازار کو نقصان پہنچاتی بلکہ کرنسی کے محکمے پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہو جاتی کہ زر کے اغراض کے سوا دوسرے اغراض کے لئے بھی سونا فروخت کرے جو اس کے فرائض میں داخل نہیں ہے۔ اس ذمہ داری سے اس کو نجات دلانے کے لئے کمیشن نے یہ سفارش کی کہ سونے کی فروخت کے نرخ ایسی شرح سے مقرر کئے جائیں کہ سونے کے ذخیرے میں جو بھی کمی واقع ہو اس کو نقصان اٹھائے بغیر لندن سے درآمد کر کے پورا کرنا ممکن ہو[1]

---

[1] کمیشن نے روپے کی قدر مساوات ۱ شلنگ ۶ پنس (یا ۸ء۴۷ گرین خالص سونا) تجویز کی تھی۔ دوسرے الفاظ میں ایک پاونڈ کو ۱۳٫۳۷ روپے کے مساوی قرار دیا تھا۔ اس شرح سے ایک تولہ سونے کی قیمت ۲۱ روپے ۳ آنے ۱۰ پائی ہوتی تھی۔ کمیشن نے لندن کو ہندوستان کے لئے سونا حاصل کرنے کا بازار قرار دیتے ہوئے سونے کی فروخت کی تین مختلف شرحیں تجویز کی تعیین یعنی (۱) جب لندن کے نام برقی انتقالات کی شرح بالائی مقام طلا کے برابر یا زیادہ ہو (یعنی ۱ شلنگ $6\frac{13}{64}$ پنس تو بمبئی میں سونا

کمیشن نے یہ تجویز کی کہ جب تک ذخائر میں سونے کی مقدار اتنی نہ ہو جائے جو سونے کا سکہ جاری کرنے کے لئے کافی ہو اور جب تک سونے کے سکے کے حق میں کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو جائے اس وقت تک کے لئے ساورن کی زر قانونی کی حیثیت منسوخ نہ رکھی جائے ۔ ورنہ اس کا امکان ہے کہ ذخائر سے سونا نکل کر رواج میں چلا جائے جس سے حسب ضرورت کرنسی کی مقدار گھٹنے میں رکاوٹ پیدا ہو اور کرنسی کی مقدار گھٹنے کا جو اثر مبادلات میں ہوتا ہے وہ نہ ہونے پائے ۔

۱۱ سیونگ سرٹیفکیٹ سونے میں قابل ادائی

چونکہ کرنسی کے محکمے پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی تھی کہ سونے کی خرید و فروخت ۴۰۰ اونس کی مقدار سے کم نہ ہو اس لئے اس شرط سے صرف بنکر اور سونے کے تاجر استفادہ کر سکتے تھے نہ کہ عوام ۔ کرنسی کے نظام
کے متعلق عوام کا اعتماد حاصل کرنے کی غرض سے کمیشن نے سفارش کی کہ ۳۶۶
حکومت ایک تولہ اور اس کے کسور کے سیونگ سرٹیفکیٹ فروخت کرے جو تین یا پانچ سال میں خریدار کے حسب مرضی زر قانونی یا سونے میں قابل ادائی ہوں اور شرح سود ایسی رکھی جائے کہ عوام کو ان کے خریدنے کی ترغیب ہو اس انتظام کے لئے یہ یقیناً ضروری ہوگا کہ کرنسی کے ذخائر میں سونے کی حالت مستحکم رکھی جائے ۔ ان صداقت ناموں کی بدولت شغل اصل میں اضافہ ہوگا اور اندوختے باہر نکل آئیں گے ۔ اس کے علاوہ عوام پر یہ اچھی طرح

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ :۔ فروخت کرنے کی شرح وہی ہو جو خریدنے کی ہو یعنی فی تولہ خالص سونا ۲۱ روپے ۔ ۳ آنے ۔ ۱۰ پائی ۔

جب لندن کے نام کے برقی انتقالات کی شرح بالائی مقام طلا سے کم ہو تو (۲) لندن میں ادا شدنی سونے کی فروخت کی شرح (لندن تک مصارف ترسیل کی گنجائش رکھتے ہوئے) ۲۱ روپے ۷ آنے ۹ پائی فی تولہ ہو اور (۳) بمبئی میں سونا ادا کرنا ہو تو (دوہرے مصارف ترسیل کی گنجائش رکھکر) ۲۱ روپے ۱۱ آنے ۔ ۹ پائی فی تولہ شرح رکھی جائے ۔ ہلٹن ینگ کمیشن کی رپورٹ صـ ۹۵ ۔

واضح ہو جائے گا کہ سونا ہی معیار نقد رہے اور روپے اور سونا ایک دوسرے میں بدل پذیر رہیں۔

۱۲۔ نوٹوں کی نقد پذیری

کمیشن نے سفارش کی کہ ہندوستانی زر کے نظام کی یہ بے قاعدگی کہ حکومت ایک قسم کے نوٹ یعنی زر کاغذی کے بدلے دوسری قسم کے چاندی کے نوٹ یعنی روپے دینے کی پابند ہے دور کر دی جائے تاکہ زر کے نظام کو اس خطرے سے محفوظ کر دیا جائے جو چاندی کی قیمت کے بڑھ جانے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ یقیناً ضروری ہے کہ موجودہ نوٹوں کو روپوں میں تبدیل کرنے کا وعدہ ایفا کیا جائے۔ لیکن نئے نوٹوں کی حد تک نقد کرنے کی ذمہ داری سر پر نہ لینی چاہیئے۔ اس کے ساتھ عوام میں نوٹوں کی ساکھ قائم کرنے اور ان کی مقبولیت کو بڑھانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ جب تک عوام روپے حاصل کرنا چاہیں ان کو نوٹوں کے بدلے روپے حاصل کرنے کی سہولتیں مہیا کی جائیں۔

کمیشن نے یہ تحریک کی کہ ایک روپے والے نوٹ پورے زر قانونی کے طور پر پھر جاری کئے جائیں اور ان کو بھی دوسرے جدید نوٹوں کی طرح قانونی طور پر روپوں سے نقد پذیر نہ بنایا جائے۔ اس انتظام سے نوٹوں کے چلن کو مقبول بنانے میں مدد ملے گی اور اگر چاندی کی قیمت روپے کے گلانے کے مقام سے کبھی متجاوز ہو تو اس سے بچنے کا راستہ نکل آئیگا۔

اگر نوٹوں کو روپوں میں تبدیل کرانے کے موجودہ قانونی حق کی تنسیخ کی جائے تو اس کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ زر کے محکمے پر یہ قانونی پابندی عائد کی جائے کہ بجز ایک روپے والے نوٹ کے باقی تمام نوٹوں کی عند المطالبہ زر قانونی سے نقد پذیری کا انتظام کیا جائے یعنی کرنسی کے محکمے کی صوابدید پر نوٹوں کے بدلے چھوٹی رقموں کے نوٹ یا روپے دیئے جائیں۔ لیکن عمل یہ ہونا چاہیئے کہ فلزی زر کی حد تک عوام کے جملہ معقول مطالبات پورے کئے جائیں۔

۱۳- ذخائر کا الحاق اور ترکیب

کمیشن نے یہ سفارش کی کہ ذخیرۂ زر کاغذی اور ذخیرۂ معیار طلا کو ملا کر کرنسی کا ایک ہی ذخیرہ کر دیا جائے تاکہ وہ کارگر ثابت ہو اور عوام کے لئے آسان اور قابل فہم بن جائے۔

اس نئے ذخیرے کے بارے میں کمیشن نے سفارش کی کہ (۱) ذخیرے کی ترکیب اور تناسب بذریعہ قانون مقرر کیا جائے تاکہ زر کی مقدار میں از خود کمی بیشی ہوتی رہے اور مبادلے کے اثر کا متوازن ہونا یقینی ہو جائے؛ (۲) متناسب ذخیرے کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے اور سونے اور سونے کے تمسکات کا تناسب کل ذخیرے کا کم از کم ۴۰ فیصد ہونا چاہئے۔ کرنسی کے محکمے کو یہ کوشش کرنی چاہئے کہ ذخیرے کا تناسب ۵۰ تا ۶۰ فیصد ہو جائے۔ ذخیرے میں سونے کا تناسب بڑھا کر جلد از جلد ۲۰ فیصد اور دس سال کی مدت میں ۲۵ فیصد کر دینا چاہئے۔ اس دوران میں یہ خیال رکھنا چاہئے کہ سونے کے تناسب کو بڑھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے پائے مجموعی سونے کا کم از کم نصف حصہ ہندوستان میں رکھا جائے۔ (۳) دس سال کے عبوری دور میں ذخیرے میں چاندی کی مقدار کافی کم کر دی جائے۔ (۴) باقی ذخیرہ خود سے باق ہونے والی تجارتی ہنڈیوں اور حکومت ہند کے تمسکات کی شکل میں رکھا جائے۔ دس سال کے اندر ذخیرے میں "مصنوعی تمسکات" کی جگہ قابل فروخت تمسکات لے لیں۔ (۵) چلن میں روپوں کی تعداد کم ہونے سے جو ادائی کی ذمہ داری عائد ہوگی اس کے لئے کم از کم ۵۰ کرور روپے رکھے جائیں اور چالو روپوں کی تعداد میں جو بھی کمی بیشی ہو اس کی قیمت مرقومہ کا ۱/۵ اس واجب الادا رقم میں اضافہ یا اس میں سے منہا کرنا چاہئے اور اس سلسلے میں جو بھی انفع نقصان ہو وہ سرکاری محاصل سے متعلق کر دیا جائے۔

کمیشن نے یہ خیال ظاہر کیا کہ سونے کے ذخائر کو مذکورۂ بالا طریقے پر

مستحکم کرنے میں کم سے کم خطرہ اور نقصان ہے اور ایسا کرنا اس لئے ضروری ہے کہ (۱) کرنسی کے محکمے کو اس قابل بنایا جائے کہ کرنسی کے بدلے سونا فروخت کرنے کی ذمہ داری کو پورا کر سکے خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ نوٹوں کو نئی حیثیت حاصل ہوگئی تھی اور وہ سونے سے نقد پذیر تھے۔ (۲) حکومت کو اس قابل بنایا جائے کہ طلائی صداقت نامے اگر مقبول ہوں تو ان کو نقد کر سکے۔ اور (۳) اگر سونے کے سکے رائج کرنا ہوں تو ان کی ترویج میں سہولت پیدا کی جائے۔

کمیشن نے یہ رائے ظاہر کی کہ طلائی معیار کے نظام میں چاندی کے ذخائر کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ لیکن چونکہ روپیہ ایک خاص حیثیت رکھتا ہے، مجموعی چالو زر میں روپے کی مقدار بہت زیادہ ہے اور اس کے چلن میں کافی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اس لئے ذخیرے میں کچھ حصہ چاندی کا رکھنا ضروری ہے۔ ایک روپے والے نوٹ جاری کرنے سے روپے کی طلب میں کمی ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے ذخیرے میں چاندی کے حصے کو عبوری دور میں کم کر کے بجائے ۸۵ کروڑ روپے کے (جیسا کہ ۳۰ اپریل ۱۹۲۶ء کو تھا) ۲۵ کروڑ روپے کر دینا چاہئے۔

کمیشن نے سفارش کی کہ حکومت ہند کے روپے کے تمسکات جو ذخائر میں رکھے گئے تھے ان کی مقدار گھٹا کر چالو زر کی اس مقدار کے مساوی کر دینی چاہئے جس کا چلن سے ہٹنے کا امکان نہ ہو۔ ان تمسکات میں کچھ اضافہ ایسے تمسکات کا بھی کیا جا سکتا ہے جنھیں حکومت کی ساکھ کو متاثر کئے بغیر بیچ کر رقم وصول کی جا سکتی ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسے تمسکات اثاثے کی حیثیت سے تجارتی ہنڈیوں کے مقابلے میں خراب خیال کئے جاتے ہیں۔ تجارتی ہنڈیوں میں اول الذکر کے برعکس یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ کرنسی کے محکمے کی رائے یا مرضی پر انحصار کئے بغیر ملک کی ضروریات کے لحاظ سے زر کی مقدار میں از خود کمی یا بیشی کر سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ اگر سرکاری ۲۶۸

تمسکات زیادہ مقدار میں رکھے جائیں گے تو ضرورت کے موقع پر ان کو نکال کر رقم حاصل کرنا مشکل ہوگا ۔ اپریل ۱۹۳۵ء میں رزرو بنک آف انڈیا کے قائم ہونے کے بعد سے زر کاغذی کے اجرا کے نئے انتظامات اور ذخیرۂ زر کاغذی کی جو حالت ہے اس کو باب (۱۰) میں بیان کیا گیا ہے ۔

معیار خشت طلا اور معیار زر طلا کا مقابلہ

۱۴۱۔ معیار خشت طلا پر تنقید

سر اسٹانلی ریڈ کا یہ بیان ہے کہ ہلٹن ینگ کمیشن پر جو ذمہ داری عائد کی گئی تھی وہ صرف یہی نہیں تھی کہ روپے کی حالت کو مستحکم کیا جائے بلکہ ایسا معیار قائم کیا جائے جس کو ہندوستان میں کافی اعتماد حاصل ہو اور روپے کا تعلق اس معیار سے قائم کیا جائے نیز اس معیار کی نگرانی از خود جاری رہنے اور استحکام کا انتظام کیا جائے ۔ اس کے علاوہ زر اور اعتبار کا انتظام ایک ہی محکمے کے تفویض ہو اور ہندوستانی زر اور مبادلے کے نظام کو چاندی کی قیمتوں کے تغیرات سے محفوظ رکھا جائے ۔ مختصراً کمیشن کے ذمے یہ کام کیا گیا تھا کہ محض انتظامی صوابدید کو جائز رکھنے کے بجائے قواعد ضوابط کی پابندی کرائے[1] ۔ کمیشن جو سونے کے معیار کا حامی اس معیار کی تائید میں یہ کہتا تھا کہ وہ سونے کو واحد معیار قدر بناتا ہے اور ہر کام کے لئے ملک میں چالو زر کی سونے میں قطعی نقد پذیری کا یقین دلاتا ہے ۔ البتہ انتظامات ایسے کئے جانے والے تھے کہ ہندوستان میں زر کے معاوضے میں سونا ہمیشہ دستیاب ہو سکتا تھا ۔ لیکن یہ سونا زر کے طور پر استعمال کئے جانے کی بجائے

[1] ۔ دیکھو انڈین ایر بک (۱۹۲۷ء) صفحہ ۳۰۲ ۔

مرکزی ذخائر میں محفوظ رکھا جاتا تھا تاکہ زر کی قدر مبادلہ کو مستحکم کرنے کے لئے اس کو استعمال کیا جا سکے[1] موخر الذکر مقصد کو پورا کرنے کا طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ ساورن کو بطور زر رواج سے خارج کر دیا جائے اور کرنسی کا محکمہ سونا اینٹوں کی شکل میں فروخت کرے۔ اگر عوام اس محکمے سے سونے کو زر کے علاوہ دوسرے اغراض کے لئے خرید نا چاہیں تو اس کی روک تھام کی صورت یہ تھی کہ سونا کم از کم ۴۰۰ اونس (یا ۱۰۶۵ تولے) کی مقداروں میں فروخت کیا جائے اور وہ بھی ایسے وقت اور ایسی شرحوں پر جس میں لندن سے بمبئی کو سونا درآمد کرنے کے مصارف شامل رہیں۔

زر قانونی کو سونے کی اینٹوں میں نقد پذیر رکھنا بنکوں اور بنکروں کے لئے تو کافی کارآمد ہو سکتا ہے لیکن عوام کے لئے یہ طریقہ ناقابل فہم اور غیر اطمینان بخش ہے۔ اس کے علاوہ بہ یک وقت کم از کم ۴۰۰ اونس کی خریدی کی قید ضرورت سے زیادہ ہے اور یہ قید زر اور سونے کے باہمی مبادلے میں اتنی زیادہ رکاوٹ پیدا کر دیتی ہے کہ یہ مبادلہ بالکل مصنوعی بن جاتا ہے۔ ساورن اور نصف ساورن کو جو زر کی حیثیت سے خارج کیا گیا اس پر عام طور پر یہ اعتراض کیا گیا کہ وہ ایک رجعتی طریقہ تھا۔ کیونکہ جنگ سے پہلے معیار مبادلۂ طلا کے تحت بھی ساورنوں کی بہت بڑی تعداد یعنی تقریباً ۶۰ لاکھ پاونڈ چلن میں تھی۔ خود انگلستان میں ۱۹۲۵ء کے جدید زر کے انتظامات کے تحت ساورن کا بہ حیثیت زر اخراج نہیں کیا گیا تھا۔ ۳۶۹

۱۵۔ ہندوستان میں طلائی زر کے معیار کا مسئلہ	یہ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۲۵ء میں انگلستان میں طلائی معیار کا فلزی معیار کی شکل میں بحال کیا جانا اس بین الاقوامی معیار مبادلہ کے مثالی نظام کی جانب ایک اقدام تھا جس کی سفارش ۱۹۲۲ء میں جنیوا کانفرنس نے کی تھی۔

[1] دیکھو ۔ سر بیسل بلاکٹ کی تقریر بمقام دہلی بتاریخ ۲۳ / نومبر ۱۹۲۶ء ۔

اس سفارش کے بموجب اندرون ملک غیر نقد پذیر زر کاغذی رائج ہونا چاہیئے اور سونا صرف بیرونی قرضوں کو بیباق کرنے کے لئے مہیا کیا جائے۔ لیکن انگلستان جیسے ترقی یافتہ ملک کے لئے جو طریقہ مفید ہے ممکن ہے کہ ہندوستان جیسے پسماندہ ملک کے لئے مناسب نہ ہو۔ انگریز قوم ہندوستانیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تعلیم یافتہ اور کرنسی کے محکمے پر نسبتہً زیادہ اعتماد رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ انگلستان میں طلائی زر کے قدیم نظام کے تحت عوام بنک کاری اور شغل اصل کے اچھی طرح عادی ہو چکے ہیں۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں معیار مبادلۂ طلا کی متزلزل حالت اور سرکاری نگرانی کی وجہ سے اس نظام کی ساکھ عوام میں خراب ہو گئی اور اندوختہ کرنے کی عادت اور زیادہ پختہ ہو گئی۔ عوام دقیق اور منطقی زر کے نظام کو شبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے معیار طلا کی اس قسم کو ترجیح دیتے ہیں جو سادہ مگر آزمودہ ہے۔ اس کے علاوہ طلائی زر کے مطالبے کو پورا کرنے سے حکومت کے مسلسل انکار نے عوام کے شوق کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ ہندوستان میں اکثر لوگ اتنا بھی حساب نہیں جانتے کہ یہ سمجھ سکیں کہ ایک طلائی روپیہ ۱۵،۴۷۴ء۵ گرین سونے کے مساوی ہوتا ہے۔ اس لئے کمیشن[1] کی یہ تجویز کہ ایسے سرٹیفکیٹ جاری کئے جائیں جو سونے کی اینٹوں میں نقد پذیر ہوں عوام پر یہ واضح کرنے کے لئے بالکل ناکافی ہے کہ ان کا زر سونے کی مستحکم بنیاد پر قائم ہے۔

طلائی زر کے معیار کو کسی طرح زر کا بہترین نظام نہیں کہا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت بیش خرچ ہے اور اگرچہ یہ طریقہ قیمتوں کے استحکام کے لحاظ سے معیار مبادلۂ طلا کے اس طریقے سے بہتر ہے جو ہندوستان میں قائم رہ چکا ہے۔ پھر بھی قیمتوں کے بے موقع تغیرات کی

[1] دیکھو فصل (۱۱)۔

کامل روک نہیں کر سکتا۔ بقول ڈاکٹر کینن آنجہانی "یہ طریقہ کہ زر کی قوت خرید کو صرف ایک ہی فلز سے وابستہ کر دیا جائے خواہ یہ فلز کتنی ہی عمدہ کیوں نہ ہو اور کمیاب ہونے کی صورت میں جس کے بہت سے مصرف ہو سکتے ہوں صرف دور بربریت کے لئے موزوں ہو سکتا ہے"[1] ریکارڈو کے زمانے سے اس وقت تک بہت سی انوکھی تجویزیں زر کے نظام کو زیادہ مستحکم بنانے کی غرض سے پیش کی جا چکی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اس سلسلے میں ترقی کرنا مقصود ہے تو محض ان کے مطالعے پر اکتفا کرنے کے بجائے ان کا مسلسل اور محتاط تجربہ کیا جائے تاکہ ان کے عملی افادے کی آزمائش ہو سکے۔ لیکن عام طور پر خیال یہ ہے کہ ایسے تجربوں سے اس وقت کچھ کامیابی کی توقع ہو سکتی ہے جبکہ تمام ممالک پہلے مستحکم طلائی معیار قائم کر لیں۔ جب دنیا کی سب قومیں سونے کے رشتے میں منسلک ہو جائیں گی[2] تو بہ آسانی زر کے سلسلے میں نسبتاً اعلیٰ قسم کے ضابطے مرتب کر سکیں گی۔ کوئی ملک کون سا طلائی معیار اختیار کرے اس ملک کے خصوصی حالات پر منحصر ہو گا۔ ۱۹۲۶ء میں ہندوستان کے حالات ایک ایسے طلائی معیار کے متقاضی تھے جس کے ساتھ ساتھ سونے کا سکہ بھی رائج ہو۔ ہندوستان میں اس وقت کے حالات کے تحت یہ خیال نہیں کیا جا سکتا تھا کہ سونے کے سکے کا استعمال غیر ضروری تعیش تھا یا یہ کہ محض قدیم رواج کی بنا پر معیار طلا کے ساتھ سونے کے سکوں کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے جملہ ہندوستانی گواہوں اور ڈاکٹر کینن اور ڈاکٹر گریگوری جیسے چند واقف کار گواہوں[3] نے ہلٹن ینگ کمیشن کے

---

[1] دیکھو اکنامک جرنل بابت جون ۱۹۲۴ء صفحہ ۱۶۱ –

[2] دیکھو ڈی۔ ام۔ مین کی کتاب موسوم بہ "زر کی پالسی ۱۹۱۴ء تا ۱۹۲۸ء" صفحہ ۱۰۸۔

[3] دیکھو ہلٹن ینگ کمیشن کی رپورٹ ضمیمہ ۸۰ و ۸۱ –

سامنے نہایت شد و مد کے ساتھ یہ بیان دیا کہ طلائی زر کا معیار قائم کرنا ضروری تھا۔ اپنی دہلی والی تقریر میں خود مسٹر بیسیل بلاکٹ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ قبل اس کے کہ ہندوستان کسی مثالی نظام کا تصور کرسکے غالباً اس کو ایک ایسے طلائی سکے کے دور سے گزرنا پڑے گا جس میں زر کے دوسرے اقسام سونے کے سکوں سے حسب مرضی نقد پذیر ہوں۔ گو کمیشن کو یہ تسلیم ہے کہ ہندوستان کے لئے وہی نظام موزوں ہوسکتا ہے جو سادہ اور عام فہم ہو۔ لیکن اس کے باوجود اس کے تجویز کردہ معیار خشت طلا میں یہ خصوصیات نمایاں طور پر موجود نہیں ہیں۔

۱۶ کمیشن کی تجاویز پر دوسرے اعتراضات

کمیشن نے سونے کی خرید و فروخت کے نرخوں کے متعلق جو تجاویز پیش کی تھیں ان پر بھی سخت اعتراض کیے گئے۔ نرخوں کا اس طرح مقرر کرنا کہ کرنسی کا محکمہ صرف اُس وقت سونا خریدے جبکہ وہ بازار میں انتہائی ارزاں ہو اور اس وقت فروخت کرے جبکہ وہ انتہائی گراں ہو ہندوستان کے اندر سونے کی خرید و فروخت کو ناممکن بنادے گا۔ عوام صرف اس وقت سونا خریدیں گے جبکہ برآمد کی غرض سے اس کا خریدنا ضروری ہو۔ اس کے علاوہ کمیشن کی یہ تجویز ہے کہ جس وقت شرح مبادلہ بالائی مقام طلا سے کم ہو بمبئی کے مقابلے میں لندن میں زیادہ موافق شرح پر سونا فروخت کرانے کا بندوبست کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سونے کی بہم رسانی لندن میں کی جائے گی یا ایسا کرنے کی ترغیب ہوگی۔ چنانچہ اس صورتِ حال پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس سے معیار مبادلۂ طلا کا ایک اہم نقص بدستور قائم رہے گا[۱]۔ اس سلسلے میں کمیشن کی اس سفارش کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ "رزرو بنک میں جتنا سونا یا سونے کے سکے ہوں ۳۷۱

[۱] دیکھو پی۔ بی۔ جن نارکر کی کتاب موسوم بہ "کرنسی کمیشن کی رپورٹ پر نقد و نظر" صفحہ ۵۵۔

ان میں سے کم از کم نصف مقدار ہندوستان میں اس بنک کے پاس رہے اور باقی حصہ ہندوستان سے باہر اس بنک کی شاخوں یا ایجنسیوں یا اس بنک کے نام سے دوسرے بنکوں میں جمع کیا جائے۔ بنک کا سونا جو کہ ٹکسال میں ہو یا راستے میں ہو بنک کے ذخیرے کا حصہ سمجھا جائے گا" (فقرہ ۱۴۵) کمیشن نے سونے کے تمسکات زیادہ مقدار میں رکھنے کی جو سفارش کی ہے اس کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ذخیرے کا اسقدر حصہ بیرونی تمسکات میں مشغول کیا جائے۔ لندن میں سونے کا ذخیرہ رکھنے کی وجہ سے جو بدظنی اور بے اعتمادی پیدا ہو چکی ہے اس کے لحاظ سے یہ ضروری تھا کہ کوئی ایسے انتظامات تجویز کئے جاتے جن کی وجہ سے ہندوستان کی رقوم لندن میں رکھنے کی نوبت نہ آتی۔ زر کے انتظامات کے بارے میں عوام کے اعتماد کے سوال کے قطع نظر اگر سونے کا اثاثہ بڑی مقدار میں ہندوستان سے باہر تمسکات کی شکل میں رکھا جائے تو معیار خشت طلا کو معیار زر طلا میں تبدیل کرنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ کمیشن کا خود یہ خیال ہے کہ اگر عوام اس تبدیلی کی خواہش کریں تو اس میں کسی قسم کی مزاحمت نہیں ہونی چاہیئے۔

گو ۱۹۲۶ء کے حالات کے تحت ہم ہندوستان میں معیار زر طلا کو حق بجانب قرار دیتے ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ ستمبر ۱۹۳۱ء سے جب کہ دنیا کے اکثر ملکوں نے معیار طلا ترک کر دیا اس وضع کے معیار کو کامیابی سے چلانے کے لوازم باقی نہیں رہے اور اس معیار کا مستقبل بھی تاریک ہو گیا ہے۔ ایسی حالت میں طلائی زر تو کیا معنی طلائی فلز کے معیار سے متعلق بھی فوری تدابیر اختیار کرنے کا خیال سردست ترک کر دینا چاہیئے۔ اگر ہم مستقبل قریب میں جبکہ دنیا کے حالات ہمیں معیار طلا پر واپس آنے کی اجازت دیں معیار خشت طلا ہی کی کوئی ذرا بہتر صورت اختیار کرنے میں کامیاب ہوں تو اس کو غنیمت سمجھنا چاہیئے۔

کمیشن نے یہ سفارش کر کے ہندوستان کی بیش بہا خدمت کی کہ

معیار مبادلۂ طلا جو بہت کچھ بے اطمینانی کا سبب تھا قطعی طور پر منسوخ کردیا جائے اور زر و مبادلے پر سے سرکاری نگرانی ہمیشہ کے لئے اور پوری طرح ہٹالی جائے۔ لیکن طلائی فلز کا معیار جو کہ کمیشن نے معیار مبادلۂ طلا کی تمام خرابیوں کو دور کرنے کی غرض سے تجویز کیا تھا ناقابل اطمینان تھا اور اس سے ہندوستان کے عوام کی تشفی نہیں ہوئی۔ ۱۹۲۶ء میں جبکہ کمیشن نے سفارش کی تھی اگر کسی وجہ سے خالص طلائی زر کا معیار قائم کرنا ممکن نہ تھا تو ہندوستان کے حالات کے مطابق کم از کم کوئی حقیقی وضع کا معیار خشت طلا تجویز کیا جاتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔ آج کل (۱۹۳۸ء میں) ہندوستان میں کون سا زر کا معیار ہے اور آئندہ کیا معیار ہونا چاہئے ان مسائل پر اس باب میں آگے چلکر بحث کی گئی ہے۔

روپے کا استحکام

۱۷ استحکام کی ضرورت

(اپریل ۱۹۲۵ء میں) انگلستان میں طلائی معیار کی بحالی اور بتجوالہ طلا اسٹرلنگ کی قیمت کا اپنی اصلی حالت ص ۳۷۲
پر آجانا برطانوی نوآبادیات اور دوسرے ملکوں کی طلائی معیار پر واپسی اور دنیا کی قیمتوں میں کسی حد تک استحکام یہ سب چیزیں بظاہر کمیشن کے اس عقیدے کو تقویت دے رہی تھیں کہ روپے کی حالت کو مستحکم کرنے کے لئے یہی وقت بالکل مناسب تھا۔ فوری استحکام اس لئے ضروری تھا کہ آئندہ کے لئے مبادلے کے متعلق ہر قسم کے تذبذب کو دور کیا جائے اور شرح مبادلہ کے اختیاری رد و بدل کو روکا جائے۔ ستمبر ۱۹۲۳ء ہی میں (جبکہ روپے کی شرح مبادلہ تقریباً اشلنگ ۴ پنس سونا تھی) عوام کے ایک باا ثر طبقے نے اس استحکام کی خواہش کی تھی۔

لہ - دیکھو صفحہ ۳۳۸ -

جس کا مقصد یہ تھا کہ اس مصنوعی صورت حال کو ختم کر دیا جائے جو کنابچۂ قانون میں فی روپیہ ۲ شلنگ سونے کی فرضی شرح برقرار رکھنے سے پیدا ہوئی تھی۔

۱۸ روپے کے استحکام کے لیے شرح مبادلہ کا تعین

کمیشن نے سفارش کی کہ ۱شلنگ ۶ پنس کی شرح مبادلہ کے مطابق روپے اور سونے کا باہمی تعلق مستحکم کیا جائے تاکہ روپے کی قیمت ۷،۴۸ گرین سونا رہے۔ کمیشن کا خیال تھا کہ اس شرح پر ہندوستان کی قیمتیں باقی دنیا کی قیمتوں سے بڑی حد تک مطابق ہو چکی تھیں اور اگر اس شرح میں کوئی تبدیلی کی گئی تو قیمتوں میں مطابقت پیدا ہونے میں کافی وقت لگے گا اور معاشی نظام میں عام خلل واقع ہوگا۔ کمیشن کا استدلال حسب ذیل تھا:۔

(۱)۔ دسمبر ۱۹۲۲ء تا جون ۱۹۲۴ء کے ۱۸ مہینوں میں جبکہ روپے کی قیمت ۱شلنگ ۳ پنس سونا تھی روپے کے حوالے سے قیمتوں کا اوسط تقریباً ۱۷۶ تھا۔

(۲)۔ بعد کے سال میں جبکہ روپے کی قیمت ۱شلنگ ۶ پنس سونے تک بڑھ گئی تھی روپے کے حوالے سے قیمتوں کا اوسط گر کر ۱۶۰ ہو گیا تھا۔ (جنوری تک روپے کی قیمت بڑھ کر تقریباً ۱شلنگ ۶ پنس سونا ہو گئی تھی اور مئی ۱۹۲۵ء کے اختتام کے بعد ۱شلنگ ۶ پنس کے طلائی مقامات کے اندر رہی۔ جولائی ۱۹۲۴ء سے جون ۱۹۲۵ء تک روپے کے حوالے سے قیمتوں کا اوسط ۱۷۹ سے گر کر ۱۵۷ ہو گیا تھا۔)

(۳) جون ۱۹۲۵ء سے جبکہ روپیہ کی قیمت تقریباً ۱شلنگ ۶ پنس سونا تھا روپے کے حوالے سے قیمتوں کا اوسط کم وبیش ۱۵۸ رہا، اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ان قیمتوں نے دنیا کی گرتی ہوئی قیمتوں کا ساتھ دینا شروع کر دیا ہے۔

پہلے دور کے شروع میں اور دوسرے دور کے اختتام پر سونے کے حوالے سے قیمتوں کا اوسط کم وبیش ایک ہی رہا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تبدیلی کے زمانے میں قیمتوں اور شرح مبادلہ کے درمیان مطابقت پیدا ہوگئی تھی اور یہ کہ تقریباً ۱۹۲۵ء کے وسط تک بڑی حد تک توازن قائم ہوگیا تھا جس کے بعد وہ متواتر برقرار رہا۔

جو لوگ ۱ شلنگ ۶ پنس کی شرح سے قیمتوں کی مطابقت کو تسلیم نہیں کرتے تھے ان کا اصل استدلال یہ تھا کہ جون ۱۹۲۵ء تک روپے کی
شرح مبادلہ ۱ شلنگ ۶ پنس سونا نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے دنیا کی ۳۷۳
قیمتوں کے ساتھ روپے کے حوالے سے قیمتیں تقریباً مستحکم رہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مطابقت ہونا باقی تھا۔ کمیشن نے اس کا یہ جواب دیا کہ گو جون ۱۹۲۵ء تک قطعی طور پر روپے کی قیمت ۱ شلنگ ۶ پنس نہیں ہوئی تھی پھر بھی اس نے جولائی ۱۹۲۴ء اور جنوری ۱۹۲۵ء کے درمیان ۱ شلنگ ۴ پنس سے ۱ شلنگ ۶ پنس کی طرف جانے کا ۸۰ فیصد سے زیادہ راستہ طے کر لیا تھا اور جون ۱۹۲۵ء سے پہلے ہی دنیا کی قیمتوں کے مقابلے میں روپے کے حوالے سے قیمتیں بہت زیادہ گر چکی تھیں جو شرح مبادلہ کے تیزی سے بڑھ جانے کا لازمی نتیجہ تھا۔

اس سے پہلے کے بارہ مہینوں میں شرح مبادلہ کے مستحکم رہنے سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اندرونی اور بیرونی قیمتوں کا فرق دور ہو کر توازن قائم ہو چکا تھا۔

مبادلے کو ۱ شلنگ ۶ پنس کی شرح پر برقرار رکھنے کے لئے حکومت کی نام نہاد الٹ پھیر کی محض یہ غرض تھی کہ گرم بازاری کے زمانے کی ضروریات کے لحاظ سے زر کی مقدار میں اضافہ کیا جائے اور جب یہ دور ختم ہوتا تو زر کی مقدار میں اتنی ہی کمی کر دی جائے۔

اس بات کا ثبوت کہ اندرونی اور بیرونی قیمتوں کی سطح میں فرق نہیں تھا اس واقعے سے بھی ملا کہ درآمد یا برآمد پر کوئی مخالف اثر نہیں پڑا۔

۱۹۔ اجرت

کمیشن نے یہ استدلال کیا کہ جب مبادلہ اور قیمتیں کافی مدت سے مستحکم چلی آرہی ہیں تو یہ فرض کرنا حق بجانب ہے (تاوقتیکہ اس کے خلاف علامات نہ پائی جائیں) کہ اجرتوں میں بھی مطابقت پیدا ہوگئی ہے۔ اس مفروضے کی تائید میں تجارت خارجہ کے اعداد و شمار پیش کئے جا سکتے ہیں۔ زراعت جو ہندوستان کی سب سے بڑی صنعت ہے اس میں کساد بازاری کے رونما ہونے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ زرعی مزدوروں کی اجرت اور شرح مبادلہ کے درمیان مطابقت نہیں پیدا ہوئی تھی۔ سرکاری خدمات کا جہاں تک تعلق ہے روپے کی قدر مبادلہ کے اٹھارہ پنس تک بڑھ جانے سے حکومت تنخواہوں کے اضافے کے اس مطالبے کو مسترد کرنے کے قابل بن گئی جس کی مقاومت بصورت دیگر مشکل ہوتی۔ صنعتوں کی حد تک خاصکر بنگال کے جوٹ کے کارخانوں میں اجرتوں کا معیار قیمتوں اور مصارف زندگی کے معیار کے مطابق تھا۔ فولاد کی صنعت کی جو حالت خراب تھی اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اجرت زیادہ دینی پڑ رہی تھی بلکہ بیرونی مسابقت کا دباؤ پڑ رہا تھا۔ یہ مسابقت اس وجہ سے بھی زیادہ ہوگئی تھی کہ بعض ممالک خصوصاً بلجیم نے اپنی شرح مبادلہ کو گرا دیا تھا۔ سوتی کپڑے کی صنعت میں اجرتیں اب بھی بظاہر بہت زیادہ تھیں، کیونکہ کپڑے کی مزدوروں کی اجرت کا انڈکس نمبر ۱۹۱۴ء کے ۱۰۰ کے مقابلے میں) ۲۳۱ تھا۔ اور تھوک فروشی کی قیمتوں، اجناس کی خردہ فروشی کی قیمتوں اور مصارف زندگی کے انڈکس نمبر علی الترتیب ۱۵۰، ۱۵۰ اور ۱۵۳ تھے۔ اس صورت حال سے یہ ظاہر ہوا کہ یا تو جنگ سے پہلے کی شرح اجرت بہت کم تھی یا موجودہ شرح بہت زیادہ تھی۔ جو کچھ بھی ہو یہ بالکل نامناسب تھا کہ ادنیٰ شرح اختیار کرکے اجرتوں میں پوشیدہ طور پر کمی کی جاتی۔ اس کے علاوہ یہ بھی یقینی نہیں تھا کہ اس طریقے سے مطلوبہ مطابقت پیدا ہوسکے گی۔

۲۰ - معاہدوں پر اثرات

۳۷۴ کمیشن نے یہ تسلیم کیا کہ مالگزاری کے اکثر چالو بندوبست ایسے زمانے میں کئے گئے تھے جبکہ شرح مبادلہ اشلنگ ۴ پنس تھی ۔ لیکن ۱۹۱۴ء سے قیمتوں میں بہت اضافہ ہو جانے کی وجہ سے مالگزاری کا حقیقی بار اشیا کے حوالے سے بہت بڑی حد تک کم ہو گیا تھا اور اسی لئے اشلنگ ۶ پنس کی شرح کو بہت زیادہ تکلیف دہ نہیں خیال کیا جا سکتا تھا ۔ رہے دوسرے طویل مدت کے معاہدے تو گزشتہ اٹھ یا نو سالوں میں ہندوستانی شرح مبادلہ کم و بیش متزلزل رہی اور بہت زمانے تک اشلنگ ۴ پنس یا اس کے لگ بھگ بھی نہیں ہوئی ۔ اس لئے اس پرانی شرح سے مطابقت کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے ۔ ۱۹۱۴ء سے پہلے جو معاہدے اور انتظامات کئے گئے اور جو اب بھی چالو ہیں ان کا اثر ملک کی معاشی زندگی پر اس قدر نہیں ہے جس قدر کہ ان معاہدوں اور انتظامات کا جو بعد کے ۸½ سال میں کئے گئے جبکہ شرح مبادلہ بڑھی ہوئی تھی ۔ بہر حال اتنی طویل مدت تک زر کے معاملات درہم برہم رہنے کے بعد یہ ممکن تھا کہ کوئی خاص شرح مبادلہ اس طرح معین کیجائے کہ طویل مدت کے لین دار اور دین دار کے ساتھ قطعی انصاف کیا جا سکتا ۔

۲۱ - شرح مبادلہ اشلنگ ۶ پنس کی تائید میں دلائل

اس دلیل کے بارے میں کہ روپے کی حقیقی شرح مبادلہ اشلنگ ۴ پنس ہی ہو سکتی ہے کمیشن نے یہ استدلال کیا کہ صرف وہی شرح حقیقی اور مناسب خیال کیجا سکتی ہے جس پر کہ قیمتیں کرنسی کی موجودہ مقدار کے مطابق اور بیرونی قیمتوں سے متوازن ہوں ۔ چنانچہ اس نقطۂ نظر سے اس وقت کے حالات کے تحت ان کے نزدیک مناسب شرح قطعی طور پر اشلنگ ۶ پنس ہی ہو سکتی تھی ۔ اگر حقیقی شرح سے مراد ایسی شرح تھی جو قانون کے نفاذ یا انتظامی کارروائی کے بغیر خود بخود قائم ہو جائے تو ہندوستان جیسے ملک میں جہاں تجارت

ہمیشہ یکساں حالت میں نہیں رہتی اس مفروضے کی بنا پر شرح مبادلہ میں اتنے زیادہ تغیرات ہوں گے کہ یہ تمیز کرنا ناممکن ہو جائے گا کہ کون سی شرح حقیقی ہے۔

یہ استدلال غیر متعلق ہے کہ اشلنگ ۶ پنس کی شرح حکومت کی ترکیبوں کی وجہ سے وجود میں آئی تھی۔ جب اس وقت کی موجودہ شرح مبادلہ کے لحاظ سے ہندوستان کی قیمتیں اور دوسرے حالات تمام دنیا کے حالات اور قیمتوں کے مطابق تھے تو یہ سوال کہ کس طریقے سے یہ شرح وجود میں آئی تھی اس امر سے غیر متعلق تھا کہ شرح مبادلہ میں تغیر کرنے سے معاشی حالات میں کس حد تک یا کس شدت کے ساتھ تغیر رونما ہوگا۔

اگر یہ تسلیم نہ بھی کیا جائے کہ قیمتوں اور اجرتوں میں اشلنگ ۶ پنس کی شرح سے کافی مطابقت پیدا ہو گئی تھی تو یہ دعویٰ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ قیمتیں اور اجرتیں اشلنگ ۴ پنس کی شرح کے مطابق تھیں، کیونکہ گزشتہ آٹھ یا نو سال میں اشلنگ ۴ پنس کی شرح کبھی زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہی۔ جو کچھ بھی مطابقت پیدا ہوئی ہوگی اشلنگ ۳۷۵ص
۶ پنس کی اعلیٰ شرح سے ہوئی ہوگی۔ ان حالات میں شرح تبدیل کر کے اشلنگ ۴ پنس مقرر کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ قیمتیں تقریباً ۱۲ ½ فیصد بڑھ جائیں اور یہ ایک ایسی تبدیلی ہے جو عام صارفوں پر اور خاصکر خواندہ طبقوں کے کم تنخواہ پانے والے ارکان پر بارگراں ثابت ہوتی۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہوتا کہ مزدوروں کی اجرت صحیحہ میں بلاوجہ کمی ہو جاتی اور یہ صورت انصاف اور مصلحت کے منافی تھی۔ اشلنگ ۴ پنس کی شرح پر عود کر آنے سے مرکزی اور صوبہ واری حکومت کا مالیہ بھی سخت متاثر ہوگا اور صوبوں سے مرکزی حکومت کو امداد کی تنسیخ کا دیرینہ اور پر زور مطالبہ کافی مدت تک پورا نہ ہو سکے گا۔

۲۲۔ اختلافی یادداشت

سر پرشوتم داس ٹھاکر داس نے اپنی اختلافی یادداشت میں بتلایا کہ کس طرح حکومت نے شرح مبادلہ کو بڑھا کر اشلنگ ۶ پنس کرنے کا ارادہ کر لیا تھا چنانچہ یہ شرح ایک امر فیصل شدہ کی صورت میں کمیشن کے روبرو پیش کی گئی تاکہ اس سے کمیشن کی تحقیق اور سفارشیں متاثر ہوں۔ پرشوتم داس نے یہ بھی بتلایا کہ کس طرح ستمبر و اکتوبر ۱۹۲۴ء میں حکومت نے اشلنگ ۴ پنس کی جنگ سے پہلے کی شرح پر روپے کو مستحکم کرنے کے موقع کو ہاتھ سے کھو دیا تھا اور دستکاریچہ قانون میں فی روپیہ ۲ شلنگ کی فرضی شرح درج کر کے اس سے شرح مبادلہ بلند کرنے کا کام لیا۔ اس کارروائی کی وجہ سے کرنسی کی مقدار میں بہت کمی کرنی پڑی۔

سر پرشوتم داس نے حسب ذیل اہم نتائج اخذ کئے:۔

(۱)۔ اجرتیں شرح مبادلہ کے مطابق نہیں ہوئی تھیں اور بغیر کشمکش کے ایسا ہونا ممکن بھی نہ تھا۔ (۲)۔ تاوقتیکہ مکمل مطابقت نہ پیدا ہو اشلنگ ۶ پنس کی شرح موثر طریقے پر بیرونی صناع کے حق میں ۱۲½ فیصد کی بالواسطہ مالی امداد کا کام دے رہی تھی جس سے ہندوستانی صنعتوں پر سخت بار پڑ رہا تھا۔ (۳)۔ شرح کو بدلنے کے یہ معنی ہوتے کہ مقروض طبقے کے بڑے حصے پر جو زیادہ تر زراعت پیشہ تھا ۱۲½ فیصد کا زائد بار عائد کیا جا رہا ہے۔ چونکہ قرضہ بہت پرانا تھا اس لئے قدرتی طور پر یہی کہا جا سکتا تھا کہ یہ قرضہ زیادہ تر اس زمانے میں حاصل کیا گیا ہوگا جبکہ شرح اشلنگ ۴ پنس تھی۔ (۴)۔ اشلنگ ۴ پنس کی شرح پر واپسی سے ملک کے مالیات پر کتنا مضر اثر پڑے گا اس بارے میں بہت کچھ مبالغے سے کام لیا گیا تھا۔ اگر ایک طرف انگلستان میں اسٹرلنگ کے واجبات کی حد تک روپے کے حوالے سے مصارف بڑھ جائیں گے تو دوسری طرف ہندوستان میں اشلنگ ۴ پنس کی شرح سے کروڑگیری کی آمدنی میں ۲ کروڑ ۶۲ لاکھ روپے کا اضافہ ہوگا۔

انکم ٹیکس سے بھی زیادہ آمدنی وصول ہوگی، کیونکہ صنعتیں اس کشمکش سے محفوظ ہو جائیں گی جو شرح کے اشلنگ ۶ پنس ہونے کی صورت میں لازمی طور پر واقع ہوتی، نیز صنعتوں کو بیرونی مسابقت سے محفوظ رکھنے کے لئے مالی امداد وغیرہ کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ حکومت کو جو کچھ فائدہ ہوگا اس کی ادائی حقیقت میں دولت پیدا کرنے والا کریگا جسے اپنی پیداوار کے معاوضے میں پہلے کے مقابلے میں روپوں کی کم تعداد لینی پڑے گی۔ (۵)۔ اشلنگ ۴ پنس کی شرح سے آبادی کے اس مختصر حصے (تقریباً ۲۱ فیصد) پر جو خواندہ طبقے کے کم آمدنی پانے والوں پر مشتمل ہے جو مضر اثرات پڑیں گے وہ اس تکلیف کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے جو باقی ماندہ ۷۹ فیصد آبادی کو شرح مبادلہ بڑھا دینے کی صورت میں برداشت کرنی پڑے گی۔ اب رہا مزدوروں ۳۷۶
کا مسئلہ تو ان کی اجرتوں کی موجودہ شرح اتنی بلند تھی کہ اشلنگ ۴ پنس کی شرح اختیار کرنے سے قیمتوں میں جو ممکنہ اضافہ ہو اس سے محفوظ رہ سکتی تھی۔ بہر حال ایک یہ فائدہ ضرور تھا کہ مزدور مستقل طور پر کام سے لگ جاتے، کیونکہ کمتر شرح مبادلہ سے صنعت اور زراعت کی ترقی یقینی تھی۔ اس کے برخلاف اعلیٰ شرح سے صنعت و زراعت دونوں کو نقصان پہنچنا لازمی تھا۔ (۶) دوسرے ملکوں کی شرحوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی جنگ سے پہلے کی اشلنگ ۴ پنس کی شرح متزلزل ہوئی تھی۔ لیکن دوسرے ملکوں نے جنگ سے پہلے کی شرحوں کو بحال کرنے کی کوشش کی۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ دونوں صورتوں میں مساوی خلل واقع ہوتا تو بھی فیصلہ اشلنگ ۴ پنس کے حق میں ہونا چاہئے۔

۲۳۔ شرح کی بحث پر نقد و نظر

کمیشن کی اکثریت کی رپورٹ اور اختلافی یادداشت نے اچھا خاصا مواد فراہم کر دیا جس کو فریقین شرح مبادلہ کے مباحث کی تائید اور مخالفت میں بطور دلائل جوش وخروش کے ساتھ پیش کرتے رہے۔ بادی النظر میں یہ دلائل

خواہ کتنے ہی معقول کیوں نہ ہوں نظر غائر ڈالنے سے نئی شرح کے حامیوں اور مخالفوں کے دلائل میں بہت سی خامیاں ملیں گی۔

(ا)۔ اکثریت کے دلائل کی تنقید۔ اکثریت نے ابتدا ہی میں یہ چیز واضح کر دی تھی کہ اشلنگ ۶ پنس کی شرح سے قیمتوں کے مطابق ہونے کی حد تک جن انڈکس نمبروں پر اس کے دلائل مبنی ہیں وہ کچھ زیادہ قابل اعتبار نہیں ہیں۔ مگر نہ معلوم کس طرح انھی ناقص انڈکس نمبروں سے نتائج اخذ کرتے وقت وہ قطعی طور پر یہ باور کر لیتی ہے کہ شرح مبادلہ اور قیمتوں میں مطابقت پیدا ہو چکی تھی اور نہایت جوش عقیدت کے ساتھ اشلنگ ۶ پنس کے حق میں اپنا فیصلہ صادر کرتی ہے اور یہ بالکل بھول جاتی ہے کہ خود اسی نے انڈکس نمبروں کے غیر معتبر ہونے کا اعلان کیا تھا۔ (سر پرشوتم داس بھی اسی طرح کے اعتراض کا مورد بن جاتے ہیں جبکہ وہ انھی اعداد و شمار سے کام لیکر جن کو اکثریت نے استعمال کیا تھا بالکل برعکس نتیجہ اخذ کرتے اور اس نتیجے کو پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ بالکل صحیح خیال کرتے ہیں)۔

یہ ثابت کرنے کے لئے کہ زراعتی مزدوروں کی اجرتیں اشلنگ ۶ پنس کے مطابق ہو چکی تھیں اکثریت کوئی اعداد نہیں پیش کرتی۔ البتہ صرف جوٹ کی صنعت کے بارے میں وہ قطعی طور پر یہ ثابت کرتی ہے کہ مروجہ قیمتوں اور مصارف زندگی سے اجرتیں مطابقت رکھتی تھیں۔ لیکن سوتی صنعت جیسی اہم صنعت کی حد تک وہ یہ ماننے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ اجرتوں اور قیمتوں میں کوئی مطابقت نہیں تھی۔ اکثریت نے صرف یہی ثابت کرنے پر اکتفا نہ کی کہ اکثر معاہدے قلیل مدت کے تھے اور اس لئے وہ جدید شرح سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ اپنے حدود سے تجاوز کر کے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ طویل مدت کے معاہدوں کے لئے بھی ۳۷۷
اشلنگ ۶ پنس کی شرح کوئی دشواری نہیں پیدا کرتی، مثلاً مالگزاری کا بندوبست جس میں مالگزاری کا حقیقی بار اس لئے ہلکا ہو گیا تھا کہ

۱۹۱۴ء سے قیمتوں میں بہت اضافہ ہوگیا تھا۔ شرح مبادلہ کی الٹ پھیر سے گرنی کے مزدوروں کی اجرت میں غیر محسوس طور پر کمی کرنے کے خلاف جب اکثریت دلائل پیش کر چکی تھی تو طریقۂ استدلال میں یکسانیت کی خاطر اسے یہ چاہئے تھا کہ بند وبست کے سلسلے میں مالگزاری کے غیر محسوس اضافے کو اشلنگ ۶ پنس کی شرح کے خلاف ایک قوی دلیل تسلیم کرتی۔

اس واقعے کی بنیاد پر کہ ۱۹۱۷ء کے بعد سے تقریباً ۱/۲ ۸ سال کے زمانے میں شرح مبادلہ اشلنگ ۴ پنس یا اس کے قریب صرف چند روز ہی رہی، اکثریت یہ استدلال کرتی ہے کہ معاہدوں کے سلسلے میں جو رقوم واجب الادا ہیں ان کا بڑا حصہ اس زمانے کا ہے جبکہ شرح اشلنگ ۶ پنس تھی یا جبکہ مبادلہ اشلنگ ۴ پنس کی شرح سے ہٹ چکا تھا۔

جیساکہ کمیشن کا بیان ہے کہ ۸ یا ۹ سال تک شرح میں تغیرات ہوتے رہے، باوجود اس کے یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ اشلنگ ۴ پنس کی شرح کے لحاظ سے کافی تعداد میں معاہدے طے کئے گئے ہوں۔ کیونکہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہی شرح مستقل اور حقیقی خیال کی جارہی تھی اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ۱۸۹۸ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان جنگ سے پہلے کے طویل دور میں اسی شرح کا مسلسل راج رہا۔ اس زمانے میں عام طور پر یہی توقع کی جارہی تھی کہ جنگ کے پیدا کئے ہوئے انقلابی حالات کا زور ٹوٹ جانے اور معمولی حالات کے دوبارہ قائم ہونے کے بعد جنگ سے پہلے کی شرح بحال ہو جائے گی۔ بظاہر اکثریت نے اپنی رپورٹ کے فقرہ (۱۹۸) میں یہ تسلیم کیا ہے کہ ایسی عام توقع موجود تھی کیونکہ یہ ذکر کیا گیا ہے کہ اپریل ۱۹۲۶ء میں شرح مبادلہ کے گرنے کا میلان عوام کی اس پیش قیاسی کا نتیجہ تھا کہ شاید کمیشن اشلنگ ۶ پنس سے کمتر شرح کی سفارش کرے۔

اکثریت کا یہ خیال بجا و درست تھا کہ حکومت کے مالیے پر شرح کا جو اثر پڑے گا اسی کو فیصلہ کن چیز نہیں تصور کرنا چاہئے لیکن اس کے

باوجود اس نے اس دلیل سے اپنے مفید مطلب جو کچھ بھی کام لیا جا سکتا تھا
لینے سے دریغ نہ کیا ۔ ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ سرکاری مالیے پر جو کچھ اثر پڑے
اس کا کسی حال لحاظ نہ کرنا چاہئے ۔ چنانچہ ۱۸۹۳ء میں چاندی کے
سکوں کی آزاد تسکیک کے خلاف حکومت نے جو کارروائی کی تھی اس کی
تائید میں یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ حکومت کو جن مالی مشکلات اور
ناقابل اطمینان حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا ان کا لحاظ کرتے ہوئے
ٹکسالوں میں روپیہ کی ڈھلائی موقوف کر دینا مناسب تھا ۔ لیکن ۱۹۲۵ء
میں ایسا کوئی مواد موجود نہ تھا جس سے یہ ثابت کیا جا سکتا کہ ۱ شلنگ
۴ پنس کی شرح سے حکومت کی مالی مشکلات اتنی زیادہ ہو جاتیں کہ کوئی
خاص کارروائی کئے بغیر چارہ نہ تھا ۔ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ۱۹۲۰ء میں
جب حکومت نے فی روپیہ ۲ شلنگ سونے کی شرح منظور کی تو وہ
ایسا کرنے پر زیادہ تر مالی اسباب کی بنا پر مجبور ہوئی تھی ۔ دستوری
اصلاحات عنقریب نافذ ہونے والے تھے اور ان کے تحت مرکزی
حکومت اور صوبہ داری حکومتوں کا مالیہ الگ ہو جانے والا تھا جس کے
یہ معنی تھے کہ حکومت ہند صوبوں پر مالی بار اتنی آزادی سے عائد نہیں
کر سکتی تھی جیسا کہ وہ اب تک کرتی آ رہی تھی ۔ اسی وجہ سے بڑھی ہوئی ص ۳۷۸
شرح مبادلہ کو حکومت ایک غیبی تائید سمجھ رہی تھی جس کی مدد سے وہ
اس قابل ہوئی کہ زائد محصول عائد کر کے عوام میں بے اطمینانی پیدا
کئے بغیر اپنے میزانیے کو متوازن کر لے[1] ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ اس
سلسلے میں بے بنگٹن اسمتھ کمیٹی کی رپورٹ کی بنا پر حکومت نے
جو کارروائی کی تھی اس سے کیا کیا تباہ کن نتائج پیدا ہوئے تھے ۔
اکثریت نے ۱ شلنگ ۴ پنس کی شرح پر لوٹ آنے پر اس لئے
اعتراض کیا کہ اس کی وجہ سے خواندہ طبقوں کے غریب افراد کو ناحق

۱۔ [illegible] تا صفحہ ۳۰۶

مصیبت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں ان طبقوں کو اُس وقت کی قیمتوں کے اضافے سے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا اور تابین کی جدید پالسی جو اُس زمانے میں شروع کی گئی تھی اس کی توسیع سے ان پر بہت کچھ بار پڑنا یقینی تھا۔ ان حالات میں یہ استدلال کرنا بجا ہوگا کہ بادی النظر میں کوئی ایسی کارروائی کرنا بالکل حق بجانب تھا جس سے متوسط اور زیریں طبقوں کو فائدہ پہنچایا جا سکتا۔ لیکن اکثریت کا یہ خوف کہ شرح گھٹ کر اسٹرلنگ ۶ پنس ہو جانے سے یقیناً قیمتوں میں ۱۲½ فیصد اضافہ ہو جائے گا محض اس مفروضے پر مبنی تھا کہ قیمتیں پوری طرح اسٹرلنگ ۶ پنس کی شرح کے مطابق ہو چکی تھیں مگر اس مفروضے کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ پوری طرح مطابقت ہو گئی تھی تو بھی یہ توقع کرنے کی معقول وجہ موجود تھی کہ ۱۲½ فیصد کا پورا اضافہ حقیقت میں ظاہر نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ دنیا کی قیمتوں کے گرنے کے میلان کی وجہ سے اس میں بھی ایک حد تک کمی ہو جاتی۔

اکثریت نے سب سے اہم دلیل یہ پیش کی کہ اعلیٰ شرح ایک سال سے زائد مسلسل قایم رہی اور اس لئے مطابقت بڑی حد تک واقع ہو چکی تھی۔ لیکن اس پر بھی یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ کلی مطابقت پیدا کرنے کے لئے ایک سال سے کچھ زیادہ کی مدت کافی طویل خیال نہیں کی جاتی۔ لہذا یہ تسلیم کرنے کی بجائے کہ مطابقت ہو گئی تھی یہ کہنا زیادہ قرین صحت ہوتا کہ مطابقت واقع نہیں ہوئی تھی۔[1]

[1] - اپنی اختلافی یادداشت (فقرہ ۸۰) میں سر پرشوتم داس ٹھاکر داس نے مسٹر جے۔ ایم۔ کینز کے اس خیال کی طرف اشارہ کیا کہ سلطنت متحدہ جیسے ملک میں شرح مبادلہ میں ۱۰ فیصد تغیر ہو تو قیمتوں کے اس کے مطابق بیٹھنے کے لئے کم از کم دو سال درکار ہوتے ہیں۔ اگر یہ صورت حال ایک ایسے ملک کی ہو جس کی تجارت بڑی حد تک

(۲) اسٹرلنگ ۶ پنس کی شرح کے تائیدی دلائل پر تنقید ۔ یہ چیز ثابت کی جا سکتی ہے کہ اسٹرلنگ ۶ پنس کی شرح کے حامیوں نے بھی ہمیشہ ایسے دلائل سے کام نہیں لیا جو سراسر ناقابل اعتراض ہوں ۔ مثلاً انھوں نے کرنسی کی مقدار کی کمی پر بہت زور دیا جو حکومت اسٹرلنگ ۶ پنس کی شرح کو برقرار رکھنے کے لئے کر رہی تھی ۔ لیکن اگر زر کی مقدار میں اتنی ہی زیادہ کمی کی گئی تھی جتنی کہ ظاہر کی گئی تو یہ ضروری تھا کہ اس کی وجہ سے قیمتوں میں کافی کمی ہو جاتی ۔ اب اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قیمتوں میں بڑی حد تک کمی ہو گئی تھی تو یہ ماننا پڑے گا کہ اعلیٰ شرح سے قیمتوں کی کامل مطابقت ہو چکی تھی ۔ ۳۷۹

اعلیٰ شرح کے مخالفوں کا یہ بیان ہے کہ اس کی وجہ سے دیہی قرضداری کے بار میں بہت اضافہ ہو گیا تھا ۔ لیکن انھوں نے ان اہم فوائد کو نظر انداز کر دیا جو کاشتکار کو آلات ارزاں دستیاب ہونے اور عام طور پر مصارف پیدائش میں کمی ہو جانے سے حاصل ہو رہے تھے ۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی نظر انداز کر دیا کہ عموماً زراعتی قرضے کا بڑا حصہ جنس کی شکل میں حاصل کیا جاتا ہے نہ کہ زر کی شکل میں اور اس قرضے کا کچھ حصہ قلیل المدت ہوتا ہے[۱]

پرانی شرح کی تائید میں سب سے قوی دلیل یہ پیش کی گئی کہ اسٹرلنگ ۶ پنس کی شرح کو قائم رکھنے کی کوشش گویا معیار قدر میں بے ضرورت مداخلت تھی ۔ اگر ہم اسٹرلنگ ۶ پنس کے حامیوں کے حسب منشا یہ بھی فرض کر لیں کہ اسٹرلنگ ۶ پنس کی شرح کے تحت معاشی حالات میں نسبتہً زیادہ

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ :۔ بیرونی ممالک سے ہوتی ہے تو ہندوستان جیسے ملک میں جس کی داخلی تجارت، خارجی تجارت کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ ہے مطابقت کے لئے لازمی طور پر زیادہ مدت درکار ہوگی ۔

[۱] ۔ دیکھو کاباجی کی کتاب موسوم بہ "ہندوستانی زرمبادلہ اور بنک کاری کے مسائل" صفحہ ۱۰ ۔

خلل واقع ہوتا تو بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس خلل سے پیدا ہونے والی خرابیوں کو عوام زیادہ خوشی سے قبول کر لیتے۔ بہر حال پرانی شرح سے جو انحراف کیا گیا اس کی وجہ سے زر کے شاکیوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا اور حکومت کے نقادوں کو ایک نئی شکایت ہاتھ آگئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئی شرح کی حقیقت وہی ہو گئی جو نظریۂ اخراج (Drain Theory) کی تھی اور اس کو ہر قابل تصور خرابی کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔

جو کوئی ملک کی معاشی تاریخ لکھے گا نئی شرح کے نفاذ کے بعد کے دور کو ہرگز خوشحال ترین دور نہیں تصور کرے گا اور چونکہ ملک اس زمانے میں بہت ہی تاریک دور میں سے گزر رہا اس لئے حکومت کی مبادلے کی پالیسی پر اور زیادہ شدت سے حملہ کیا جا رہا ہے۔ یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ اگر ملک میں پرانی شرح دوبارہ نافذ کر دی جاتی تو صنعت و تجارت کی حالت اور بھی بدتر ہو جاتی۔ لیکن اس استدلال میں یہ فرض کیا گیا ہے کہ ا شلنگ ۶ پنس کا ۵۰ فیصد سے زیادہ راستہ طے ہو چکا تھا۔ مگر حقیقت میں یہی وہ چیز ہے جس کو ثابت کرنا ہے۔ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ کمیشن نے تحقیقات کے شروع میں جو خیال ظاہر کیا تھا کہ مطابقت بڑی حد تک ہو چکی ہے کچھ زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ہمارا ایک استدلال یہ بھی ہے کہ اگر ا شلنگ ۴ پنس کی شرح پر واپس ہونے سے کچھ زیادہ خلل واقع ہو (اور زیادہ سے زیادہ یہی نتیجہ شہادتوں سے اخذ کیا جا سکتا ہے) تو قدیم معیار کی خاطر ان خطروں کو برداشت کرنے میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ لیکن یہ بالکل واضح ہونا چاہیئے کہ جدید شرح کے نفاذ کی مدت جتنی طویل ہوتی جائیگی
اتنا ہی یہ قیاس زیادہ قوی ہوتا جائے گا کہ حالات بڑی حد تک[1] ص ۳۸۰
جدید شرح کے ہم آہنگ ہو گئے ہیں اور پرانی شرح کو بحال کرنے کا استدلال اتنا ہی کمزور ہو جائے گا۔ اب چونکہ نئی شرح گیارہ سال سے زیادہ مدت سے قایم ہے اس لئے پرانی شرح کے مقابلے میں اس کو یقیناً معیار کی تنظیم کا

بہتر ذریعہ خیال کیا جا سکتا ہے[1]

۲۴۔ شرح مبادلہ کے مباحث جو بعد میں ہوئے اپریل ۱۹۲۷ء تا ستمبر ۱۹۳۱ء

۱۹۲۹ء میں دنیا کے مالیے، تجارت اور صنعت کے انتظام میں سخت خلل اور رخنہ پڑا جس کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ ریاستہائے متحدۂ امریکہ میں سٹے کی گرم بازاری رہی اور امریکی فیڈرل ریزرو بنک کے حکام نے سٹہ بازی کو روکنے کی تدابیر اختیار کیں۔ ریزرو بنک کے حکام نے قرضے کی روک تھام کے لئے اپنے وسیع اختیارات سے کام لیا تاکہ سٹہ بازی کی غرض سے قرض حاصل کرنے کو مشکل اور بیش خرچ بنا دیا جائے۔ اس طرح سود میں جو اضافہ ہوا اس کی وجہ سے دنیا کے دوسرے ملکوں سے کثیر رقوم امریکہ میں آنا شروع ہو گئیں۔ دوسرے ملکوں کے کرنسی کے محکموں کو بھی اپنے بنکوں کی شرحیں بڑھانی پڑیں تاکہ ضرورت سے زائد رقمیں ملک سے باہر نہ جائیں اور مبادلات کی حالت مستحکم رہے۔ تجارت اور قیمتوں میں اچانک خلل پڑنے کو روکنے کے لئے امریکی حکام نے بتدریج زر کی مقدار میں کمی کرنے کی جو کوشش کی وہ ناکام رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیویارک کے صرافے کی ساکھ پے در پے بگڑتی رہی۔ تجارتی کاروبار کے درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے قیمتیں سرعت کے ساتھ گرنا شروع ہو گئیں اور اس میں اس وجہ سے اور بھی شدت پیدا ہوئی کہ فرانس، جرمنی اور بعض دوسرے یورپی ملکوں نے اپنے کرنسی کے ذخائر میں سونا جمع کرنا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان بھی اس عالمگیر کساد بازاری سے متاثر ہوا جس میں ریاستہائے متحدہ کے واقعات کی وجہ سے اور زیادہ شدت پیدا ہو گئی تھی قیمتوں میں بہت کمی ہو جانے کی وجہ سے ہندوستان کی جوٹ، کپاس اور فولاد جیسی اہم صنعتوں پر بہت برا اثر پڑا۔ زرعی پیداوار

[1] ملاحظہ ہو فصل (۲۷)، (۳۰) و (۳۲)۔

اور خام اشیا کی قیمتیں سب سے زیادہ متاثر ہوئیں اور کپاس، جوٹ، کافی اور مونگ پھلی جیسی اہم ہندوستانی برآمدی اشیا خاص طور پر متاثر ہوئیں۔

اس نازک صورتِ حال میں جس کی ابتدا امریکہ سے ہوئی تھی دنیا بھر میں مسکات کی قیمت گر گئی۔ ہندوستان کے مسکات کا بھی یہی حشر ہوا۔ ان حالات میں شغل اصل کرنے والوں کا تامل بالکل قدرتی امر تھا۔ چنانچہ یہ لوگ اصل کو مشغول کرنے سے دست کش رہے اور اصل روپے کی شکل میں آنے سے گریز کرتا رہا۔ اس میلان کو اس لئے اور زیادہ تقویت ہوئی کہ ہندوستان میں سیاسی صورتِ حال بہت نازک ہوگئی تھی اور دسمبر ۱۹۲۹ء میں نیشنل کانگریس نے اپنے لاہور والے اجلاس میں چند قرار دادیں منظور کی تھیں اور بتلایا تھا کہ اگر قومی حکومت قائم ہوئی تو وہ ان سب قرضوں کو منسوخ کر دے گی جو ہندوستان کے اغراض کے سوا دوسرے کاموں کے لئے حاصل کئے گئے تھے۔

ان حالات میں حکومت اس بات پر مجبور ہوگئی کہ اشٹلنگ ہ پنس کی شرح مبادلہ برقرار رکھنے کے لئے خاص مالی تدابیر اختیار کرے، مثلاً کرنسی کی مقدار میں کمی کرے، مبادلے کے استحکام کی خاطر قرضوں پر نگرانی رکھنے کی غرض سے مبادلہ بنکوں اور دوسرے خریداروں کو خزانے کی ہنڈیاں جاری کرے اور امپیریل بنک آف انڈیا کی بنک کی شرح کو بڑھائے۔ ۳۸۱

اشٹلنگ ہ پنس کی شرح کے مخالفوں کا یہ استدلال ہے کہ مارچ ۱۹۲۷ء میں کتابچۂ قانون میں جدید شرح کے اندراج کے بہت زمانے بعد بھی یعنی ۱۹۳۱ء تک (جس سے غالباً صرف ۱۹۲۸ء کا سال مستثنیٰ تھا) اس شرح کو برقرار رکھنے کے لئے بہت کچھ انتظام اور الٹ پھیر کی ضرورت پیش آتی رہی جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ معاشی حالات اس شرح کے مطابق نہیں ہوئے تھے اور اشٹلنگ ہ پنس کی پرانی شرح پر

واپس جانا ہی مناسب تھا ۔ بڑھی ہوئی شرح کے نامناسب ہونے کے ثبوت میں ایک اور واقعہ یہ پیش کیا گیا کہ حکومت کو ۳۰-۱۹۲۹ء اور ۳۱-۱۹۳۰ء کے دو سالوں میں لندن کو رقم بھجوانے کی غرض سے اسٹرلنگ کی ضروری مقدار حاصل کرنے میں دشواری پیش آئی تھی ۔ چنانچہ وزیر ہند کی ضروریات دوسرے طریقوں سے پوری کرنی پڑیں ۔ وہ اس طرح کہ ہندوستان میں روپیوں کی تعداد گھٹا کر اس کے مقابلے میں لندن میں ذخیرۂ زر کاغذی سے رقم وزیر ہند کی فاضلات میں منتقل کی گئی اور لندن میں اسٹرلنگ کی کثیر مقدار بطور قرض حاصل کی گئی ۔ نومبر ۱۹۳۰ء اور مارچ ۱۹۳۱ء کے درمیان صورت حال اور بھی زیادہ خراب ہوگئی ۔ یہی نہیں کہ حکومت کو اسٹرلنگ خریدنے کی نوبت نہیں آئی بلکہ الٹے ۷ء۵ ملین پاونڈ کے اسٹرلنگ فروخت کرنے پڑے تاکہ اسٹرلنگ کی بڑھتی ہوئی طلب کو پورا کیا جائے ۔ بعد میں چلکر جون اور ۱۹ / ستمبر ۱۹۳۱ء کے درمیان روپیے کو مستحکم کرنے کے لئے حکومت کو ۱۳ ملین پاونڈ کے ریورس کونسل فروخت کرنے پڑے ۔

اس استدلال کے جواب میں کہ حکومت کی ترسیل زر کی مشکلات ۱ شلنگ ۶ پنس کی شرح کی ناکامی کا ثبوت تھیں، یہ بتایا گیا کہ ۱۹۲۹ء کے بعد کے انتہائی غیر معمولی اور ناقابل اطمینان حالات کے تحت مبادلے کے بالکل غیر متاثر رہنے کی توقع کرنا بالکل بے جا تھا۔ نیویارک کی نازک صورت حال کے اثرات اور اشیا کی قیمتوں کی عظیم تخفیف جس کا سلسلہ شدت کے ساتھ ستمبر ۱۹۳۱ء تک جاری رہا، ان اسباب کے علاوہ شرح مبادلہ کو کمزور بنانے والے دوسرے اسباب بھی تھے ۔ مثلاً ہندوستان کی ناقابل اطمینان سیاسی حالت کی وجہ سے منجملہ دوسری خرابیوں کے ایک وقت یہ پیدا ہو رہی تھی کہ اصل ہندوستان سے باہر جا رہا تھا ۔ اس کے علاوہ ۱ شلنگ ۴ پنس کی شرح کے دوبارہ نافذ ہونے کے امکان کے مدنظر مبادلے میں سٹہ بازی

ہو رہی تھی [1]

حالیہ سالوں میں کرنسی کی مقدار میں کمی کرنے اور بنک کی شرح بڑھانے کی جس پالیسی پر حکومت وقتاً فوقتاً کاربند رہی اس کے بارے میں حکومت ہند نے یہ استدلال کیا کہ وہ حقیقت میں ملک کی کرنسی کے لئے وہی کام انجام دے رہی تھی جو دوسرے ملکوں میں مرکزی بنک انجام دیا کرتے ہیں۔ البتہ اس بارے میں ہندوستان میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ صرف کرنسی کے معاملات حکومت کے ہاتھ میں ہیں بلکہ رقموں کی منتقلی میں بھی حکومت کو بڑا دخل ہے

خاصکر اسٹرلنگ ۶ پنس کی شرح کو ملک کی موجودہ کساد بازاری کا ذمہ دار ٹھیرانا درست نہیں ہے۔ اگر اثر ظاہر ہونے کے لئے کچھ وقفہ ضروری قرار دیا جائے تو بھی اس شرح سے معاشی حالات میں جو بھی عدم مطابقت رونما ہوسکتی تھی وہ ان سالوں میں زیادہ نمایاں ہونی چاہئے تھی جو شرح کی تاریخ نفاذ سے قریب تھے اور جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا صورت حال کمتر خراب ہونی چاہئے تھی۔ ص ۳۸۲

واقعہ یہ ہے کہ اگر حالات میں غیر معمولی تغیرات واقع ہو جائیں تو کسی لمحے بھی شرح میں تبدیلی کرنا مناسب ہوسکتا ہے، خواہ یہ شرح کسی زمانے میں کتنی ہی متوازن کیوں نہ رہی ہو۔ ستمبر ۱۹۳۱ء میں جب سے کہ انگلستان نے معیار طلا کو چھوڑا بعض ایسے واقعات رونما ہوئے جن کے مدنظر یہ حجت کی جاسکتی ہے کہ صورت حال پر مکرر غور کرنا ضروری ہوگیا ہے [2] لیکن خالص معاشی نقطۂ نظر سے یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مسئلہ صرف اسٹرلنگ ۶ پنس اور اسٹرلنگ ۴ پنس کے درمیان انتخاب کا

---

[1] - ملاحظہ ہو ناظم کرنسی کی رپورٹ سنہ ۱۹۲۹ء - ۳۰ء و سنہ ۱۹۳۰ء - ۳۱ء -

[2] - ملاحظہ ہو فصل (۲۷) و (۳۲) -

مسئلہ ہے۔ اگر موجودہ شرح کو ترک کر دیا جائے تو اس کے لازمی طور پر یہ معنی ہیں کہ ا شلنگ ۴ پنس کی پرانی شرح پر لوٹا جائے۔ اگر صورت حال کے مکمل اور غیر جانبدار جائزے سے یہ معلوم ہو کہ موجودہ شرح (یعنی ا شلنگ ۶ پنس اسٹرلنگ) کو بدلنا ضروری ہے تو ہمیں یہ ماننے کے لئے بھی بالکل تیار رہنا چاہیئے کہ بدلے ہوئے حالات میں ا شلنگ ۴ پنس کے سوا کسی دوسری شرح کا موزوں ثابت ہونا ممکن ہے۔

۲۵۔ ہلٹن ینگ کمیشن کی رپورٹ کو حکومت منظور کرتی ہے۔

۱۶؍ جنوری ۱۹۲۷ء کو حکومت نے تین قانونی مسودے شائع کئے جو کمیشن کی سفارشوں پر مشتمل تھے۔ یہ مسودے حسب ذیل تھے :۔ ایک مسودۂ قانون برطانوی ہند کے لئے معیار زر طلا اور رزرو بنک آف انڈیا قائم کرنے کی غرض سے ؛ (۲)۔ ایک مسودۂ قانون ۱۹۲۰ء کے امپیریل بنک آف انڈیا ایکٹ کی ترمیم کی غرض سے اور (۳) ایک مسودۂ قانون ۱۹۰۶ء کے سکہ سازی کے قانون اور ۱۹۲۳ء کے زر کاغذی کے قانون کی بعض دفعات کی مزید ترمیم کے لئے اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ مبادلے کے سلسلے میں سونے (جس کو بعد میں اسٹرلنگ کر دیا گیا) کے مبادلے کی خرید و فروخت کے بارے میں حکومت پر چند پابندیاں عائد کی جائیں۔ ابتدائی دو مسودوں پر بنک کاری کے باب میں بحث کی جائے گی۔ یہاں ہمارا سروکار صرف تیسرے مسودۂ قانون سے ہے جسے ۷؍ مارچ ۱۹۲۷ء کو سر بیسل بلاکٹ نے مجلس قانون ساز میں پیش کیا تھا۔ وزیر مالیہ نے زر کے مسودۂ قانون کے اصول کی توضیح کرتے ہوئے بتلایا کہ روپے کو مستحکم کرنے کا وقت آگیا تھا اور اسی لئے ہندوستانی مالیے کی تاریخ میں پہلی دفعہ مسودۂ مذکور میں یہ تجویز کی گئی تھی کہ روپے کی مقررہ شرح کو برقرار رکھنے کے لئے کرنسی کے محکمے پر قانونی ذمہ داری عائد کی جائے۔ روپے کو سونے کی مقررہ شرح سے نیچے گرنے سے روکنے کے لئے جنگ سے

پہلے تک کوئی قانونی دفعہ موجود نہیں تھی۔ اس لیئے روپے اور سونے کا باہمی تعلق ناقص رہا۔ سر بیسل بلاکٹ نے یہ بیان کیا کہ اس مسودۂ قانون کی حیثیت ایک عارضی انتظام سے زیادہ نہ تھی اور مقصد یہ تھا کہ تاریخ منظوری سے لیکر معیار طلا اور زر رو بینک کا قانون نافذ ہونے تک ہی اس کو جاری رکھا جائے۔ ہر منزل پر اس مسودۂ قانون
۳۸۴ کی سخت مخالفت کی گئی۔ لیکن آخر میں وہ چند جزوی ترمیموں کے ساتھ اور سخت اور یادگار بحث کے بعد بہت ہی تھوڑی اکثریت سے منظور ہوگیا۔ کونسل آف اسٹیٹ نے بھی اس کو بغیر ترمیم کے منظور کر لیا۔ اس طرح ہندوستانی کرنسی کے مسودۂ قانون نے قانون کی شکل اختیار کر لی اور یکم اپریل ۱۹۲۷ء سے نافذ ہوگیا۔

۲۶۔ کرنسی کا قانون بابت مارچ ۱۹۲۷ء

جدید قانون کی بموجب شرح ۱ شلنگ ۶ پنس قرار پائی اور یہ طے کیا گیا کہ بلا تعین مقدار حکومت بمبئی کی ٹکسال میں سونا فی تولہ ۲۱ روپے ۔ ۳ آنے ۔ ۱۰ پائی[1] کے حساب سے خریدے گی۔ یہ سونا اینٹوں کی شکل میں ہوگا جن کا وزن کم از کم ۴۰ تولے یا ۱۵ اونس ہوگا۔ زر قانونی (یعنی روپے اور نوٹ) جن کے پاس ہوں ان کو مجاز کیا گیا کہ ناظم زر کلکتہ یا نائب ناظم زر بمبئی کو درخواست دیکر یا تو بمبئی کی ٹکسال سے سونا حاصل کریں یا حکومت کی صوابدید کے لحاظ سے لندن کو فوراً روانہ کرنے کے لئے اسٹرلنگ لیں بہ شرطیکہ ۲۱ روپے ۔ ۳ آنے ۔ ۱۰ پائی فی تولہ خالص سونے کے حساب سے وہ کم از کم ۱۰۶۵ تولے (یا ۴۰۰ اونس) سونے یا اسٹرلنگ کا مطالبہ کریں اور اس کی قیمت ادا کر دیں[2]۔ اسٹرلنگ بھی اسی نرخ سے فروخت کرنے کا انتظام کیا گیا۔ البتہ اس نرخ میں بمبئی سے

[1] ۔ ایک روپیہ ۸ء۴۷۵۱۲ گرین خالص سونے کے مساوی القدر قرار پایا۔
[2] ۔ دیکھو ڈاکٹر ال، سی، جین کی کتاب موسومہ بہ "ہندوستان کے زر کے مسائل" صفحہ ۴۳۔

لندن تک کے مصارف نقل و حمل کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ حکومت نے اسٹرلنگ کی قیمت فروخت ۱ شلنگ ۵ $\frac{49}{64}$ پنس فی روپیہ قرار دی[1]۔ یکم اپریل ۱۹۲۷ء کو جبکہ ۱۹۲۷ء کا ہندوستانی زر کا قانون نافذ ہوا ان شرائط کو شائع کیا گیا جن کے تحت بمبئی کی ٹکسال میں سونا قبول کیا جا سکتا تھا۔

اس قانون کی رو سے ہندوستان میں ساورن اور نصف ساورن زر قانونی کی حیثیت سے خارج کر دیے گئے[2] لیکن حکومت پر یہ ذمہ داری عائد کر دی گئی کہ وہ اپنے جملہ کرنسی کے دفتروں اور خزانوں پر ان سکوں کو ان کی فلزی قیمت پر ۲۱ روپے - ۳ آنے ۱۰ پائی فی تولہ خالص سونے یا فی ساورن ۱۳ روپے - ۵ آنے ۴ پائی کے حساب سے وصول کرے۔ لیکن زر قانونی کی حیثیت سے موقوف کر دیے جانے کے باوجود یہ سکے ہندوستان میں کافی تعداد میں درآمد ہوتے رہے۔ ۱۹۲۷ء کے کرنسی کے قانون کے بموجب ہندوستان میں معیار خشت طلا یا معیار مبادلۂ اسٹرلنگ قائم ہو گیا۔ چونکہ حکومت کو یہ اختیار حاصل تھا کہ سونے کے بجائے اسٹرلنگ میں ادائی کرے، اس لئے سچ پوچھو تو قائم شدہ معیار معیار مبادلۂ اسٹرلنگ تھا۔ البتہ عملی طور پر ۲۱ ستمبر ۱۹۳۱ء تک یہ نظام معیار مبادلۂ طلا کی حیثیت سے رائج رہا، کیونکہ اس زمانے میں اسٹرلنگ اور سونا مساوی القدر تھے (دیکھو فصل ۲۷)۔ اگر حکومت اپنے دوسرے اختیار کو کام میں لاتی یعنی روپے کے بدلے میں سونا دیتی تو ہندوستان میں کرنسی کا معیار قانونی لحاظ سے نہیں تو عملی طور پر ضرور معیار طلا

---

[1] دیکھو ناظم زر کی رپورٹ برائے ۲۷-۱۹۲۶ء صفحہ ۳۔

[2] یہاں یہ کہہ دینا مناسب ہوگا کہ ۱۹۲۵ء کے برطانوی طلائی معیار کے قانون کے بموجب طلائی سکوں کا رواج موقوف نہیں کیا گیا بلکہ آزاد سکہ سازی کا حق منسوخ کر دیا گیا۔

کہا جا سکتا تھا۔ غرض ۱۹۲۷ء کا معیار، معیار مبادلۂ اسٹرلنگ ہونے کے باوجود معیار طلا بننے کی صلاحیت رکھتا تھا جس سے قطعی طور پر اس بات ۳۸۴
کا پتا چلتا ہے کہ حکومت کا نصب العین "معیار طلا" تھا[۱]۔ ۱۹۲۷ء کا معیار مبادلۂ اسٹرلنگ پہلے کے معیار مبادلہ کے مقابلے میں یقیناً بہتر تھا، کیونکہ اول الذکر میں روپے اور سونے کی باہمی شرح قانوناً مقرر کر دی گئی تھی اور حکومت پر یہ قانونی ذمہ داری عائد کر دی گئی تھی کہ وہ مقررہ شرحوں پر سونا خریدے اور سونا یا اسٹرلنگ فروخت کرے۔ لیکن دوسرے اعتباروں سے معیار مبادلۂ اسٹرلنگ میں وہ تمام خرابیاں موجود تھیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے (دیکھو فصل ۱ ۔ ۶)۔

۲۷ ۔ اسٹرلنگ کا سونے سے قطع تعلق اور ہندوستان پر اس کے اثرات

۱۹۲۷ء کے قانون کے بموجب جو معیار زر قائم ہوا اس کو حقیقی معیار خشت طلا بننے کا موقع نہیں ملا۔ کیونکہ برطانیۂ عظمیٰ اور دنیا کے دوسرے بہت سے ملکوں میں معیار طلا قائم نہ رہنے کی وجہ سے ان کے زر اور مبادلے کے نظام میں اچانک تبدیلیاں واقع ہو گئی تھیں برطانیۂ عظمیٰ نے ۲۱ ستمبر ۱۹۳۱ء سے معیار طلا ترک کر دیا جس کے بعض اہم اور ناگزیر اثرات ہندوستانی زر اور مبادلے کے نظام پر پڑے جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، ۱۹۲۷ء کے زر کے قانون نے زر کے محکمے یعنی حکومت پر یہ ذمہ داری عائد کی تھی کہ وہ سونا خریدے اور اپنی صوابدید کے لحاظ سے سونا یا اسٹرلنگ فروخت کرے۔ چنانچہ حکومت ۱۹ ستمبر ۱۹۳۱ء تک زیر بحث مقام طلا کی شرح سے سونا خریدتی اور اسٹرلنگ فروخت کرتی رہی۔ ۲۰ ستمبر کو یہ خبر آئی کہ برطانیہ نے معیار طلا ترک کر دیا۔ ۲۱ ستمبر کو گورنر جنرل نے ایک گشتی جاری کی جس میں سونے یا اسٹرلنگ کی فروخت کی ذمہ داری کو منسوخ کیا گیا۔

---

[۱] ملاحظہ ہو جین کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۳۵۔

اس عمل کو ہندوستان میں عام طور پر اس طرح تعبیر کیا گیا کہ حکومت آیندہ روپے کی کسی خاص قدر مبادلہ کو قائم رکھنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ لیکن اس دن وزیر ہند نے یہ اعلان کیا کہ انھوں نے روپے کی شرح ۱شلنگ ۶ پنس اسٹرلنگ مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ۲۴/ستمبر کو گورنر جنرل نے ایک اور گشتی سونے اور اسٹرلنگ کی فروخت کے قواعد کی گشتی کے نام سے جاری کی جس کے بموجب پہلے کی گشتی منسوخ ہوگئی اور ۱۹۲۷ء کے زر کے قانون کی دفعات اصولی لحاظ سے بحال ہوگئیں۔ لیکن عملی طور پر اسٹرلنگ کی فروخت پر موثر نگرانی رکھی گئی تاکہ ایک محدود معیار مبادلہ اسٹرلنگ رائج ہو سکے۔ جدید گشتی کے لحاظ سے اسٹرلنگ ہر کس وناکس کو نہیں بلکہ صرف مسلمہ بنکوں کو فروخت کیا جا سکتا تھا جن سے یہ توقع تھی کہ وہ اس معاملے میں اپنی ذمہ داریوں کو پیش نظر رکھیں گے۔ پہلے جو شرح نافذ تھی یعنی ۱شلنگ ۵ $\frac{49}{64}$ پنس اس کے حساب سے اسٹرلنگ معمولی تجارتی ضروریات اور ۲۱/ستمبر سے پہلے کے طے شدہ معاہدوں کی سربراہی اور
جائز شخصی اور نجی اغراض کے لئے فروخت کیا جا سکتا تھا۔ سونے کی ۳۸۵
اینٹوں کی درآمد یا مبادلے کی سٹہ بازی کے لئے اسٹرلنگ فروخت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ احتیاطی تدابیر اس وجہ سے اختیار کی گئی تھیں کہ حکومت کے سونے اور اسٹرلنگ کے ذخائر پر ضرورت سے زیادہ بار نہ پڑے اور اصل ہندوستان سے باہر جانے نہ پائے۔ نگرانی کا کام امپیریل بنک سے لیا جانے والا تھا۔ چونکہ روپیہ اسٹرلنگ سے منسلک تھا اس لئے سونے یا سونے پر مبنی دوسرے زروں مثلاً ڈالر اور فرانک کے مقابلے میں جب اسٹرلنگ کی قیمت گری تو روپیہ بھی لازمی طور پر متاثر ہوا۔ بحوالۂ اسٹرلنگ سونے کی قیمت کا اضافہ جس کا اظہار اسٹرلنگ اور ڈالر کی شرح مبادلہ سے ہوتا ہے یہ معنی رکھتا تھا کہ سونے کی قیمت بحوالۂ روپیہ بھی بڑھ گئی۔ فلز کے بازار میں سونے کی قیمت اگست ۱۹۳۱ء کے اختتام پر ۲۱ روپیہ ۱۳ آنے ۳ پائی فی تولہ تھی جو بڑھ کر دسمبر ۱۹۳۱ء میں

۲۹ روپے - ۱۲ آنے ہوگئی[1] بڑھی ہوئی قیمتوں نے اور اس کے ساتھ کسی حد تک دیہی علاقوں کی معاشی پریشانی نے عوام کو اپنا سونا فروخت کرنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ آخر ستمبر ۱۹۳۱ء سے فروری ۱۹۳۲ء کے اختتام تک ہندوستان سے تقریباً ۵۵ کروڑ روپے کا سونا برآمد کیا گیا۔ تجارتی اغراض سے اتنی کثیر مقدار میں سونے کی جو برآمد ہوئی اس کا اثر ہندوستان کے توازن تجارت پر اچھا پڑا۔ سونے کی برآمد کے سلسلے میں جو اسٹرلنگ مہیا ہوگیا وہ طلب سے زیادہ ثابت ہوا اور اس لیئے حکومت کی طرف سے اسٹرلنگ کی فروخت پر جو بندشیں عائد کی گئی تھیں ان سے کام لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس صورت حال کی بنا پر حکومت نے ۳۱/جنوری ۱۹۳۲ء کو سونے اور اسٹرلنگ کی فروخت کے قواعد کے متعلق گشتی منسوخ کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصول ۱۹۲۷ء کا زر کا قانون پوری طرح بحال ہوگیا لیکن عملاً کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ وزیر ہند کا یہ اعلان کہ روپئے کو اشلنگ ۶ پنس اسٹرلنگ کی شرح پر برقرار رکھا جائے بدستور نافذ رہا اور حسب سابق معیار مبادلۂ اسٹرلنگ جاری رہا۔ ہندوستان کی موجودہ صورت حال اور آئندہ کے معیار زر پر آگے چلکر بحث کی گئی ہے[2]

زر اور مبادلے کے بارے میں حکومت کی پالسی کا یہ رخ سخت مباحث کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ہندوستانی مجلس قانون ساز سے مشورہ کئے بغیر وزیر ہند نے جو زر کی ایک جدید پالسی کا اعلان کر دیا اس سے ملک میں

---

[1] - اس کے بعد کے سالوں میں سونے کی قیمت اور بھی زیادہ ہوگئی۔ چنانچہ ۷؍مارچ ۱۹۳۵ء کو ۳۰ روپے - ۱۳ آنے - ۳ پائی فی تولہ تھی اور یہی سب سے زیادہ قیمت تھی جو برطانیہ کے معیار طلا کو چھوڑنے کے بعد سے ہوئی تھی۔ دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "بازاروں کا سالانہ تبصرہ" شایع کردہ پریم چند رائے چند اینڈ سنز ۱۹۳۵ء صفحہ ۸۰ -

[2] - دیکھو فصل ۳۰، ۳۱ و ۳۳ -

غم و غصے کا اظہار کیا گیا۔ اس کے قطع نظر جو اعتراضات حکومت پر کئے گئے وہ دو حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ (۱) اسٹرلنگ کے ساتھ روپے کا ایک شلنگ ۶ پنس کی شرح سے الحاق اور (۲) بغیر کسی روک ٹوک کے ہندوستان سے سونے کی برآمد۔

۲۸ - روپے کا الحاق اسٹرلنگ سے ۱ شلنگ ۶ پنس کی شرح پر

حکومت کی اختیار کردہ پالیسی کی تائید میں جو اصل دلائل پیش کئے گئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) - حکومت کو دو باتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا
ضروری تھا۔ ایک تو یہ کہ روپے کا اسٹرلنگ سے الحاق ۳۸۷
کرکے اس کو کسی حد تک مستحکم کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ روپے کی کوئی شرح مبادلہ مقرر نہ کیجائے اور شرح مبادلہ کے تغیرات سے جو عدم استحکام کی صورت پیدا ہو اس کو برداشت کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے اول الذکر طریق عمل قابل ترجیح تھا۔

(۲) - گو ہلٹن ینگ کمیشن نے روپے کا الحاق اسٹرلنگ سے کرنے کی مخالفت کی تھی لیکن اس کا یہ مشورہ معمولی زمانے کے لئے کافی معقول ہونے کے باوجود ان مقامی حالات میں جیسے کہ اس وقت پائے جاتے تھے قابل عمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ہندوستان کے ذمے سالانہ ۳۳ ملین پاؤنڈ اسٹرلنگ واجب الادا ہوتے تھے اور ۱۵ ملین پاؤنڈ اسٹرلنگ کا ایک قرضہ ۱۹۳۲ء کے اوائل میں واجب الادا ہونا تھا۔ ان کاموں کے لئے جو رقوم درکار تھیں ان کے حاصل کرنے کی مشکلات بہت بڑھ جاتیں اگر روپے کا الحاق اسٹرلنگ سے نہ کیا جاتا۔ روپے اور اسٹرلنگ کی شرح مبادلہ کے استحکام کے بغیر ہندوستانی میزانیے کی حیثیت مبادلے میں "سٹے" کی ہو جاتی۔

(۳) - جب تک ہندوستان کی حیثیت دیندار ملک کی ہے روپے کو اس کے حال پر چھوڑ دینا اور سوچے سمجھے بغیر اچانک کوئی

قدم اٹھانا انگلستان جیسے لین دار ملکوں کی صورت حال کے مقابلے میں بہت زیادہ خطرناک ہوتا۔

(۴)۔ انگلستان اور دوسرے ملکوں سے جن کی کرنسی کا تعلق اسٹرلنگ سے تھا ہندوستان کی جو تجارت ہوتی تھی وہ اس کی مجموعی بین الاقوامی تجارت کا خاصا بڑا حصہ تھی۔ اس لئے اگر ممکن ہو تو کم از کم اس تجارت کی خاطر مبادلے کو مستحکم رکھنا مناسب تھا۔

(۵)۔ سونے کے مقابلے میں روپے کی قیمت گھٹ جانے سے ہندوستان کی برآمدی تجارت معیار طلا والے ملکوں سے گو عارضی طور پر بڑھتی لیکن مفید ثابت ہوتی۔

(۶)۔ حکومت کے جو نقاد یہ چاہتے تھے کہ روپے کی اشلنگ ہنس سے کم شرح قائم کریں انھیں ایسی حالت میں شکایت کا کوئی حق نہ تھا جبکہ ڈالر اور اسٹرلنگ کی مروجہ شرح کے حساب سے روپیہ اشلنگ ہپنس سونے سے بھی کم قدر رہ چکا تھا۔

دوسری جانب حسب ذیل دلائل پیش کئے گئے۔

(۱)۔ روپے کا تعلق اسٹرلنگ سے کر دینے سے ہندوستان اسٹرلنگ کے تغیرات سے متاثر ہونے پر مجبور ہوا، حالانکہ یہ تغیرات انگلستان کے معاشی حالات کے آئینہ دار ہوتے ہیں نہ کہ ہندوستان کے۔ اس کے علاوہ اگر روپے کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کی شرح متزلزل تو بے شک رہے گی لیکن اس کے تغیرات سے خود ہندوستان کے حالات کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ اس طرح ہندوستان اس آزادی سے محروم ہو گیا جو اپنے ملک کی تجارت خارجہ اور قیمتوں کی ضروریات کے لحاظ سے شرح مبادلہ مقرر کرنے کے لئے ضروری ہے۔

(۲)۔ ایک طرف یہ فائدہ تھا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ جیسے معیار طلا والے ملکوں کو برآمد بڑھ گئی تھی تو دوسری طرف یہ خرابی تھی کہ ان ملکوں سے درآمد زیادہ ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ روپے کا اسٹرلنگ سے

تعلق ایک لحاظ سے انگلستان کے حق میں شاہی ترجیح کا کام دے رہا تھا۔

(۳)۔ حکومت کی اس کوشش سے کہ اشلنگ ۶ پنس کی زیریں قیمت طلا کے لحاظ سے روپے کی شرح مبادلہ مقرر کی جائے یہ بھی اندیشہ تھا کہ ملک میں رہے سہے سونے کے ذخائر ختم ہو جاتے۔ (لیکن یہ اندیشہ کچھ زیادہ قابل لحاظ نہیں تھا۔ کیونکہ حکومت نے ذخائر کو محفوظ رکھنے کا بندوبست کر دیا تھا، مثلاً عوام کے ہاتھ اسٹرلنگ فروخت کرنے کے بارے میں بندشیں عائد کر دی گئی تھیں)۔

۳۸۷ (۴)۔ ایک استدلال یہ بھی تھا جیسا کہ مسٹر (اب سر) شان مکم چیٹی نے مجلس قانون ساز میں کہا کہ اسٹرلنگ سے روپے کا تعلق قائم کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ جب کبھی حالات اسٹرلنگ کو سونے سے متعلق کرنے کی اجازت دیں تو بلالحاظ ہندوستان کے معاشی حالات کے روپے کا تعلق دوبارہ خودبخود سونے سے قائم ہو جائے۔ (لیکن اتنا کہہ دینا مناسب ہوگا کہ ۱۹۳۴ء کے رزرو بنک آف انڈیا کے قانون کی تمہید میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ معیار مبادلۂ اسٹرلنگ ایک عارضی انتظام ہے جو دنیا کے زر کے حالات کے اعتدال پر آنے تک قائم رہے گا جس کے بعد رزرو بنک آف انڈیا ہندوستان میں مستقل معیار زر کی تجاویز پیش کرے گا)۔

(۵) آخری دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ اگرچہ روپے کی قیمت بحوالۂ طلا گر گئی ہے، پھر بھی اس کی قیمت اشلنگ ۶ پنس بحوالۂ اسٹرلنگ بدستور بڑھی ہوئی ہے۔ اس کے برخلاف "ین" اور دوسرے زروں کی قیمت بحوالۂ اسٹرلنگ گر چکی ہے۔ اس طرح ہندوستان کو نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔

۲۹۔ ہندوستان سے سونے کی برآمد	حکومت پر یہ نکتہ چینی کی گئی کہ اس نے سونے کی بے روک ٹوک برآمد کو روا رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سونے کی بہت بڑی مقدار ملک سے باہر چلی گئی۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۳۱ء سے

جبکہ برطانیہ نے معیار طلا کو ترک کیا ہندوستان سے جو سونا باہر گیا اس کی مجموعی قیمت ۳۰/ جولائی ۱۹۳۱ء تک ۳ ارب ۱۸ کرور روپے ہوئی ۔ اس صورت حال سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ہندوستان کے سونے کے ذخائر ضائع کئے جارہے ہیں دیسی بنک کاری کے نظام کو نقصان پہنچایا جارہا ہے اور نسلوں کی جمع کی ہوئی دولت باہر چلی جارہی ہے ۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ سونے کی اس غیر معمولی برآمد نے اس چیز کو ظاہر نہیں ہونے دیا کہ روپے کی اسٹرلنگ ۶ پنس کی شرح زیادہ تھی ۔ یہ کہا جاتا ہے کہ بے روک ٹوک سونے کی برآمد ہونے سے ملک کے لئے یہ ناممکن ہوجاتا ہے کہ اپنا نصب العین یعنی معیار طلا حاصل کرسکے ۔ یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ہندوستان اس وقت خلاف معمول بڑی مقدار میں جو سونا برآمد کررہا ہے اس کو آئندہ خرید کر واپس حاصل کرنا مشکل ہوگا ۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ دنیا کا تقریباً ہر ملک اپنے سونے کی حفاظت کررہا ہے اور ممکنہ طریقے سے اپنے سونے کے ذخیرے کو بڑھا رہا ہے ۔ آخری دلیل یہ ہے کہ جو بھی سونا ملک سے باہر گیا ہے وہ مصیبت زدہ لوگوں کا ہے اور عوام اپنے اصل پر زندگی بسر کررہے ہیں ۔ یہ صورت حال زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتی ۔ ملک میں اس بات کے لئے بہت شور مچایا جارہا ہے کہ یا تو سونے کی برآمد بالکل ممنوع قرار دی جائے یا اس کی برآمد پر محصول لگایا جائے ۔ اس کے علاوہ یہ بھی تجویز کی گئی ہے کہ حکومت (یا زرو بنک آف انڈیا) خود اس سونے کو ایسی قیمت پر خریدے جو ڈالر اور اسٹرلنگ اور فرانک اور اسٹرلنگ کی شرح مبادلہ کے لحاظ سے قرار پائے اور اس طرح اپنے سونے کے ذخائر کو مستحکم کرلے[1]

لیکن حکومت کی پالیسی[2] کی تائید میں یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ جو سونا

---

[1] دیکھو سرام وس ویسویریا کی کتاب (Planned Economy for India) صفحہ ۱۸۴ ۔

[2] ۔ مالیے کے متعلق اپنی تقریر (۱۹۳۵ء) کے دوران میں سرجیمس گرگ نے حکومت کی طرف سے

فروخت کیا جا رہا ہے وہ کرنسی کا نہیں ہے بلکہ تجارتی ہے اور اس کی ۳۸۸
حقیقت محض ذخیرۂ قدر کی ہے۔ سونا اس وجہ سے فروخت کیا جا رہا ہے
کہ اس کے مالکوں کو اس سے منافع ہوتا ہے[۱]۔ اس کے فروخت کرنے کی یہ بھی
وجہ ہے کہ بہت سے لوگ اپنے ذمے کی واجب الادا رقموں کی بے باقی
کے لئے اپنے اثاثے کو نقد میں تبدیل کرنے پر خود کو مجبور پا رہے ہیں۔
یہ واقعہ کہ لوگ مالی پریشانی میں مبتلا ہیں قابل افسوس ہے۔ لیکن پریشان
آدمی کا اسی میں فائدہ ہے کہ اُسے اپنا سونا زیادہ سے زیادہ قیمت پر
فروخت کرنے کی کامل آزادی ہو۔ اس کے علاوہ یہ بات ذہن نشین
رکھنی چاہئیے کہ حکومت عوام کا سونا خواہ کسی غرض کے لئے ہو اس وقت تک
نہیں حاصل کر سکتی جب تک کہ قیمت خرید مالکوں کے لئے ترغیب دہ نہ ہو۔
یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ جتنا سونا برآمد کیا جا چکا ہے وہ ہندوستان
کے سونے کے مجموعی ذخیرے کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔
اندازہ یہ ہے کہ یہاں سونے کے ذخیرے کی مجموعی مقدار ۵۰۰ ملین پاؤنڈ
ہے[۲]۔ جب سونا ارزاں ہو جائے گا جیسا کہ آخر میں چلکر ہونا ضروری ہے تو

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا"۔ میں ان خیالات کی تائید
نہیں کر سکتا جن میں سونے کی برآمد کو زر کے لئے کسی نہ کسی حیثیت سے برا ٹھیرایا گیا ہے اور نہ مجھے
ان خیالات میں اس بات کا کوئی ثبوت ملتا ہے کہ ہندوستان مالی پریشانی سے اپنی جوڑی ہوئی
دولت کو جدا کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ مجھے اس کی کوئی کافی وجہ نظر نہیں
آتی کہ کیوں سونے کی برآمد کو کسی دوسری شے کی زائد مقدار کی برآمد سے علیحدہ مد میں شمار کیا جاتا ہے
اسی لئے مجھے اس میں افسوس یا خوف کی کوئی وجہ نہیں دکھائی دیتی کہ ہندوستان اب بھی اس
قابل ہے کہ گذشتہ سالوں کے جمع کئے ہوئے سونے سے کثیر منافع کمائے"۔ دیکھو مرکزی
حکومت کا بجٹ برائے ۱۹۳۵-۳۶ء فقرہ ۲۳۔

۱۔ ہندوستان میں اس وقت (اگست ۱۹۳۵ء) سونے کی بازاری قیمت تقریباً ۳۲ روپے فی تولہ ہے۔

۲۔ یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ ہندوستان جیسے دین دار ملک کی حد تک جس کے ذمے بیرونی ممالک کے

اس کو پھر خریدا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ خیال کرنا غلط ہے کہ سونے کی غیر معمولی طلب جس کے لئے ہندوستانی مشہور ہیں فوری معدوم ہو جائے گی۔ اس اثنار میں سونے کی برآمد سے تجارت اور پیداآور کاموں میں سہولت ہو گی۔ سونے کی برآمد کا اثر توازن تجارت پر بھی اچھا پڑا اور جو فلز بے مصرف پڑی ہوئی تھی وہ اب کارآمد کرنسی کا کام دے رہی ہے۔ جہاں تک کہ وزیر ہند کو اسٹرلنگ کی روانگی اور اسٹرلنگ کے ذخائر کے استحکام کا تعلق ہے، سونے کی برآمد سے حکومت کی مالی حالت پر اچھا اثر پڑا۔ اس کے علاوہ اس نے اشلنگ ۶ پنس پر روپے اور اسٹرلنگ کی شرح مبادلہ کو بظاہر مستحکم رکھا ہے اور شہر لندن اور دنیا کے دوسرے مرکزوں میں ہندوستان کی ساکھ کو بڑھا دیا ہے۔ سونے کی برآمد کے باعث نوٹوں کا چلن بڑھ گیا ہے، پوسٹل کیش سرٹیفیکٹ کی زیادہ بکری ہوئی ہے، بنک کی امانتوں میں اضافہ ہوا ہے، زر کے بازار میں عام طور پر زر آسان شرایط پر ملنے لگا ہے اور ملک کا کاروبار پھر سنبھل گیا ہے۔

حکومت کے سونا خرید لے کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ سونے کے تخمینی کاروبار میں حصہ لے گی کیونکہ ڈالر واسٹرلنگ اور فرانک واسٹرلنگ کی شرح مبادلہ کے تغیرات کے لحاظ سے سونے کی قیمت خرید مقرر کرنی پڑے گی۔ یہ شکایت بجا ہے کہ حکومت نے ہلٹن ینگ کمیشن کی سفارشوں کے مطابق اپنے سونے کے ذخائر کے استحکام کی کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ لیکن یہ زمانہ حکومت کے سونا خریدنے کے لئے مناسب نہیں ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ قیمت میں کمی اور ثبات پیدا ہونے تک انتظار کیا جائے۔ اس تجویز کے ص ۳۸۹

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ:۔ ۵۰ تا ۷۰ کروڑ روپے سالانہ واجب الادا ہوتے ہیں، انہی میں سونے کا درآمد کا بڑا حصہ تعیش کی حیثیت رکھتا ہے اور جمع وخرچ کے تخمینے میں ادائی کی ایک اہم مد ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو سونے کی موجودہ برآمد کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ پچھلا حساب برابر ہو رہا ہے۔ دیکھو اخبار ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۷ / جنوری ۱۹۳۶ء۔

متعلق کہ سونے کی برآمد پر محصول لگایا جائے خود سر جیمس گرگ نے حال میں (۱۹۳۶ء) مجلس قانون ساز میں بتلایا کہ محصول کا بار سونے کے اصل فروشندے پر پڑے گا اور یہ کاشتکار ہوگا۔ حکومت کو چاہئے کہ سونے کی آزادانہ فروخت پر اس وقت تک کوئی پابندی عائد نہ کرے جب تک کہ یہ خوف کرنے کی معقول وجہ نہ ہو کہ اس عدم مداخلت کی پالیسی کی وجہ سے رزرو بنک آف انڈیا کو موجودہ اور آیندہ ضرورتوں کے لحاظ سے سونے کے کافی ذخائر فراہم کرنے میں دقت ہوگی۔ ساتھ ہی اس بات کی انتہائی کوشش کرنی چاہئے کہ ہماری برآمدی تجارت پھر بڑھے اور موافق توازن تجارت میں ترقی ہو[1]۔

۳۰۔ ہندوستان کا موجودہ معیار زر

ہم یہ پہلے بیان کر چکے ہیں کہ کس طرح ستمبر ۱۹۳۱ء میں روپے کا اسٹرلنگ سے الحاق کیا گیا اور کس طرح ہندوستانی زر کا نظام دوبارہ معیار مبادلہ اسٹرلنگ کی طرح کام کرنے لگا حالانکہ اصولی حیثیت سے مارچ ۱۹۲۷ء کا کرنسی کا قانون ضابطے میں بدستور درج رہا۔ جس وقت یہ سوال پیدا ہوا کہ مجوزہ رزرو بنک آف انڈیا پر شرح مبادلہ کے سلسلے میں کس نوعیت کی ذمہ داریاں عائد ہوں گی، موزوں معیار زر اور شرح مبادلہ کا کل مسئلہ پھر معرکتہ الآرا بحث کا مرکز بن گیا۔ لندن میں جو کمیٹی رزرو بنک کی قانون سازی کے متعلق بٹھائی گئی تھی اس نے اپنی رپورٹ (اگست ۱۹۳۳ء) میں بیان کیا کہ رزرو بنک پر مبادلے کے متعلق عائد کیجانے والی ذمہ داریوں کے سلسلے میں جو مسائل رونما ہوتے ہیں وہ موجودہ حالات کے لحاظ سے بہت پیچیدہ ہیں۔ آجکل دنیا میں زر کی صورت حال میں

---

[1] ہندوستان سے سونے کی برآمد کی تائید اور مخالفت میں مفصل بحث کے سلسلے میں دیکھو پروفیسر بی۔ آر۔ شنیای اور پروفیسر بی۔ پی۔ اڈارکر کے مضامین "انڈین جرنل آف اکنامکس" بابت جولائی ۱۹۳۵ء و جنوری ۱۹۳۶ء۔

جو عام بدنظمی پائی جاتی ہے اس کی وجہ سے زر و بنک کے مسودۂ قانون میں ان دفعات کا شریک کرنا ناممکن ہے جو آیندہ زر کے نظاموں کے دوبارہ منظم و مستحکم ہونے کی صورت میں درکار ہوں گے۔ ان حالات میں ہمارے نزدیک ہندوستان کے لئے صرف یہی طریقہ مناسب ہے کہ وہ معیار اسٹرلنگ پر قائم رہے۔ اگر ایسا کیا گیا تو شرح مبادلہ کے متعلق وہ ذمہ داریاں جو مسودۂ قانون میں شریک کی جائیں گی لازمی طور پر روپے اور اسٹرلنگ کی اس شرح کے مطابق ہوں گی جو مسودۂ قانون کے پیش ہونے کے زمانے میں موجود ہو۔ لیکن اس بیان سے اس رائے کا اظہار نہیں ہوتا جو کمیٹی موجودہ شرح مبادلہ کے مفید یا مضر ہونے کے بارے میں رکھتی تھی مسودۂ قانون میں شرح مبادلہ کے متعلق جو دفعات ہیں ان میں اس چیز کو اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ محض زر و بنک ایکٹ کے نافذ ہو جانے سے موجودہ صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ ہم اس بات پر متفق ہیں کہ قانون ص ۳۹ کی تمہید میں اس چیز کو واضح کر دینا چاہئے کہ بین الاقوامی صورتِ حال کے دوبارہ قابلِ اطمینان اور مستحکم ہو جانے پر جبکہ مستقل دفعات مرتب کرنا ممکن ہوگا ہندوستان کے لئے بہترین معیار زر کے انتخاب کے مسئلے پر از سر نو غور کیا جائے گا" (فقرہ ۱۹) جیسا کہ خود کمیٹی نے تسلیم کیا ہندوستانی نمایندوں کی بڑی اکثریت نے اس خیال کا اظہار ضروری سمجھا کہ مناسب شرح مبادلہ زر و بنک بنک کی کامیابی کے لئے لازمی تھی۔ اس نے یہ بتلایا کہ گزشتہ چند سالوں میں دنیا کے تقریباً ہر ملک کے زر کے معیار اور زر کی پالیسی میں کافی تغیرات ہو چکے تھے۔ کمیٹی کے خیال میں حکومت ہند اور مجلس قانون ساز کا یہ فریضہ تھا کہ وہ ان معاملات اور دوسرے متعلقہ مسائل پر غور کرے۔ سر پرشوتم داس ٹھاکر داس نے ایک علیحدہ یادداشت میں اس بات پر زور دیا کہ زر و بنک کے قائم ہونے سے پہلے شرح مبادلہ پر نظر ثانی کی جائے اور آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور ریاستہائے متحدۂ امریکہ کی مثال پیش کرتے ہوئے بتلایا کہ قیمتوں کو

بڑھانے اور اپنے توازن تجارت کو ٹھیک کرنے کے لئے ان ملکوں نے اپنے اپنے زر کی قدر گھٹا دی تھی۔ انھوں نے یہ بھی بتلایا کہ ہندوستان میں یہ خیال زور پکڑ رہا تھا کہ اشلنگ ۶ پنس کی موجودہ شرح میں کمی کرنے سے کاشتکار کو بہت سہولت ہوگی۔ ستمبر ۱۹۳۳ء میں زرزو بنک کا مسودۂ قانون جس مخلوط منتخب کمیٹی کے پاس بھیجا گیا اس کے ارکان میں بھی اسی طرح کا اختلاف رائے تھا۔ اکثریت نے لندن کمیٹی کی اس سفارش کو منظور کیا کہ حالت موجودہ برقرار رکھی جائے اور مستقل تدابیر کا مسئلہ مستقبل پر چھوڑ دیا جائے۔ جب زرزو بنک کا مسودۂ قانون منتخب کمیٹی کی رپورٹ کے بعد نومبر ۱۹۳۳ء میں مجلس قانون ساز کے سامنے آیا تو ارکان نے شرح مبادلہ کی دفعات کے متعلق متعدد ترمیمیں پیش کیں۔ لیکن وہ ترمیمیں جن کی غرض یہ تھی کہ روپے کو آزاد چھوڑ دیا جائے پیش نہیں کی گئیں۔ مسٹر راجو کی ترمیم کہ اشلنگ ۴ پنس شرح مبادلہ رکھی جائے ناکام رہی۔ یہی حشر اس دوسری ترمیم کا ہوا جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ زرزو بنک وہی شرح مقرر کرے جو گورنر جنرل مرکزی مجلس قانون سازی کی رائے سے تجویز کرے۔ ابھی مسودۂ قانون مجلس قانون ساز کی منزل بھی طے کرنے نہ پایا تھا کہ انڈین کرنسی لیگ نے اشلنگ ۶ پنس کی شرح مبادلہ کی مخالفت میں ملک کے طول و عرض میں مجاہدہ شروع کر دیا۔

۱۳۱ زر کے نئے محکمے کی حیثیت سے زرزو بنک آف انڈیا کی ذمہ داریاں مبادلے کے بارے میں

زرزو بنک کے قانون کے سلسلے میں جو لندن کمیٹی بٹھائی گئی تھی اس کی اکثریت کی سفارشیں شرح مبادلہ کے متعلق ۱۹۳۴ء کے قانون کی دفعات (۴۰ و ۴۱) کی شکل میں نافذ کر دی گئیں۔ زرزو بنک پر یہ لازم گردانا گیا ہے کہ مقررہ بالائی وزیریں مقامات طلا کے درمیان موجودہ شرح مبادلہ (اشلنگ ۶ پنس اسٹرلنگ) کو برقرار رکھے جس سے یہ معلوم ہو کہ روپیہ سونے سے متعلق ہے۔

ط ۳۹

دفعہ ۴۰ کے بموجب بنک پر یہ لازم کیا گیا ہے کہ وہ ہر اس شخص کو اسٹرلنگ فروخت کرے جو بنک کی بمبئی، کلکتہ، دہلی، مدراس یا رنگون کی شاخوں میں اسٹرلنگ کا مطالبہ کرے اور لندن کو فوری روانگی کے لئے فی روپیہ کم از کم ۱ شلنگ $\frac{۴۹}{۶۴}$ ۵ پنس کی شرح سے قیمت ادا کرے۔ اس دفعہ کا مقصد یہ ہے کہ روپے کی قیمت کو ۱ شلنگ $\frac{۴۹}{۶۴}$ ۵ پنس سے کم ہونے سے روکا جائے جو روپے کے زیرین مقام طلا کے برابر ہے (یعنی اسٹرلنگ کی اتنی مقدار کو لندن پہنچانے کے مصارف ۱ شلنگ ۶ پنس میں سے منہا کرنے کے بعد ہی رقم بچتی ہے)۔ دوسری طرف دفعہ ۴۱ نے بنک کے لئے یہ لازم قرار دیا ہے کہ کسی ایسے شخص سے اسٹرلنگ خرید ے جو بنک کے دفتر واقع بمبئی، کلکتہ، دہلی، مدراس یا رنگون سے لندن کو فوری روانگی کی غرض سے ۱ شلنگ $\frac{۳}{۱۶}$ ۶ پنس فی روپے کی شرح سے اسٹرلنگ کا مطالبہ کرے۔ یہ شرح بالائی مقام طلا کے برابر ہوگی (یعنی ۱ شلنگ ۶ پنس میں وہ مصارف شامل کرنے کے بعد جو اسٹرلنگ کو لندن سے بمبئی تک لانے میں ہوں گے)۔ قانون کی رو سے یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی شخص ۱۰ ہزار پاؤنڈ سے کم اسٹرلنگ کی خریدی یا فروخت کی درخواست نہ کر سکے گا۔

اس طرح رزرو بنک ایکٹ کی رو سے موجودہ شرح مبادلہ کی حیثیت قانونی ہوگئی اور ہندوستان میں عارضی طور پر ایک بہتر قسم کا معیار مبادلہ اسٹرلنگ قائم ہوگیا۔ یہ بات کم از کم اس حد تک صحیح ہے کہ قانوناً روپے کی ایک خالص شرح قطعی طور پر مقرر کردی گئی ہے اور قانون کے تحت رزرو بنک پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ روپے کی اس معینہ شرح کو برقرار رکھے۔ اس کے علاوہ کرنسی کے دو جداجدا محفوظ ذخیرے توڑ کر ایک کر دیے گئے اور رزرو بنک کو زر کا جدید محکمہ بنا دیا گیا جس کا کام یہ ہوگا کہ نوٹ جاری کرے، محفوظ ذخیرۂ زر کی نگرانی کرے اور زر کے نظام کو چلائے غرض رزرو بنک نے

حکومت کی جگہ لے لی ہے جو اب تک زر کے متعلق فرائض انجام دے رہی تھی[1]۔ اس ترقی یافتہ معیار مبادلۂ اسٹرلنگ پر بھی چند اعتراضات عاید ہوتے ہیں جن کا ذکر اس باب کے اوائل (فصل ۱ تا ۶) میں ہو چکا ہے لیکن رزرو بنک کے قانون کی تمہید میں لندن کمیٹی کے اس مشورے کو شامل کر لیا گیا ہے کہ اس مسئلے کو کہ ہندوستان کے لئے کون سا معیار زر بہترین ہوگا اس وقت زیر غور لانا چاہیئے جبکہ زر کی بین الاقوامی صورت حال میں اتنا کافی اعتدال پیدا ہو جائے کہ مستقل تدابیر مرتب کرنا ممکن ہو۔ قانون کی دفعہ (۵۵) میں بنک کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ (مذکورۂ بالا حالات پیدا ہونے پر) اس بارے میں گورنر جنرل کے سامنے اپنی رائے پیش کرے کہ آیندہ ہندوستان کے لئے کون سا طریقۂ زر موزوں و مستحکم ہو سکتا ہے اور آیندہ کے زر کے معیار کے متعلق تدابیر اختیار کرے۔

۳۱۲ روپے کی قدر گرا دینے کا مسئلہ[2]

یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ یہ انتظام حکومت کی زر کی پالیسی کے نقادوں اور روپے کی قدر کی تخفیف کے ان حامیوں کو اطمینان دلانے میں ناکام رہا جو ہندوستانی کاروباری طبقے سے تعلق رکھتے تھے (نیز دیکھو فصل ۳۰۲ تا ۳۹۲)۔ مثلاً بمبئی کے ایوان تجارت کے صدر مسٹر مانو صوبہ دار نے سر جیمس گرگ وزیر مالیہ کا اگست ۱۹۳۵ء میں خیر مقدم کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا کہ قیمتیں بڑھانے اور کسان کی مدد کرنے کے خیال سے شرح مبادلہ کی نظر ثانی کی جائے۔ رکن مالیہ نے حسب عادت یہ واضح جواب دیا کہ وہ موجودہ شرح مبادلہ کی الٹ پھیر کے حامی نہیں۔ اشیائے خام کی قیمتوں کے مناسب طور پر بڑھنے کو اچھا بتلاتے ہوئے انھوں نے

---

[1] ۔ دیکھو باب ۱۱ ۔

[2] ۔ روپے کی قدر میں تخفیف کے متعلق مفصل اور تنقیدی بحث کے لئے دیکھو بی ان اڈارکر کی کتاب Devaluation of the Rupee شائع شدہ ۱۹۳۷ء ۔

یہ خیال ظاہر کیا کہ شرح مبادلہ کو کم کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زرعی پیداوار کی قیمتیں قائم رہیں گی یا غالباً کم ہو جائیں گی اور مصنوعات کی قیمتیں بڑھ جائیں گی زرعی پیداوار کی قیمتوں اور دوسری اشیا کی قیمتوں میں موجودہ فرق کی وجہ سے کسان کی حالت اور بھی زیادہ خراب ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ رکن مالیہ کا یہ خیال تھا کہ شرح مبادلہ کو کم کر دینے سے ہندوستان کے موازنے کے مسائل جو اب بھی کافی پیچیدہ ہیں قطعی طور پر ناقابل حل ہو جائیں گے۔ (لیکن گزشتہ چند سالوں سے موازنے میں جو بچت ہو رہی ہے اس سے اس استدلال کی تائید نہیں ہوتی)۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں زر کی موجودہ افراط اور ارزانی جو کسی ملک کے لئے قیمتیں بڑھانے کا آسان ذریعہ ہو سکتی ہے ہندوستان کی حد تک نقصان رساں سٹہ بازی کا باعث ہی ہوئی ہے۔ اس صورت حال سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ زرعی ملک میں محض زر کا ارزاں ہونا قیمتوں کو بڑھانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ رکن مالیہ کے خیال میں ارزاں زر کے علاوہ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ دنیا کی مختلف قومیں اپنے اپنے زر کو مستحکم کرنے اور بین الاقوامی تجارت پر بندشوں کو کم کرنے کے لئے آپس میں کوئی سمجھوتہ کریں۔ ستمبر ۱۹۳۶ء کے آخر میں فرانک اور دوسرے معیار طلا والے ملکوں کی کرنسی کی قدر گر جانے سے ہندوستان پر جو اثرات پڑے ان کی وجہ سے ہندوستان میں بھی اکتوبر ۱۹۳۶ء کے اوائل میں روپے کی قیمت گھٹانے کے متعلق زور و شور کے ساتھ بحث شروع ہوئی۔ جو لوگ قدر گھٹانے کے حامی تھے انھوں نے ۸/ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو مجلس قانون ساز کے جلسے میں تحریک التوا پیش کرتے ہوئے اس مسئلے کو اٹھایا لیکن یہ تحریک التوا صدر نشین کی فیصلہ کن رائے سے مسترد ہو گئی[1]

۱۔ یہ تحریک جو مسٹر اے آئنگار نے پیش کی تھی اس امر سے متعلق تھی کہ حکومت ہند کو بھی یہ چاہئے تھا کہ فرانس، اٹلی اور دوسرے یورپی ممالک کی کرنسی کم قدر ہو جانے کے بعد

شرح مبادلہ کو گھٹانے کی تائید میں یہ استدلال کیا گیا کہ جب فرانک اور دوسرے زروں کی شرح مبادلہ گھٹ چکی تو ایسی حالت میں ہندوستانی زر کی از سر نو تنظیم ضروری تھی، روپے کی شرح اشلنگ ۶ پنس اسٹرلنگ ہونے کے باوجود کچھ زیادہ ہی تھی، شرح مبادلہ کے گھٹانے سے صرف ہندوستان کی اشیائے خام کی قیمتیں ہی نہیں بڑھیں گی بلکہ برآمدی تجارت اور موافق توازن تجارت کی ترقی میں بھی مدد ملے گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سونے کی برآمد رک جائے گی۔ روپے کی شرح مبادلہ کی تخفیف مقروض کسان کو تقویت پہنچائے گی، ملک کی صنعتی ترقی کی رفتار کو تیز کرے گی ح ۳۹۳
اور عام طور پر کاروبار کی بحالی میں مدد دے گی۔

دوسری جانب سر جیمس گرگ اور دوسرے لوگوں نے جو شرح مبادلہ کی تخفیف کے مخالف تھے یہ دلیل پیش کی کہ اگر ہندوستان ایسے نازک زمانے میں اپنے زر کی قدر کو گھٹائے گا تو یہ اس سہ دولی زر کے معاہدے کی خلاف ورزی ہوگی جس پر (۱۹۳۶ء میں) سلطنت متحدہ، ریاستہائے متحدہ امریکہ اور فرانس نے دستخط کئے تھے۔ اس کے علاوہ آیندہ بین الاقوامی حیثیت سے زر کے استحکام کے امکانات بہت کم ہوجائیں گے۔ ہندوستان کے روپے کی قدر کو گھٹانے سے دوسرے ملکوں میں بھی انتقام کا جذبہ پیدا ہوگا اور اس طرح زر سے متعلق باہمی کشمکش شروع ہو جائے گی۔ روپے کی شرح مبادلہ میں مزید کمی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ جب سے روپے کا الحاق اسٹرلنگ سے ہوا تھا روپے کی قیمت بحوالہ طلا بقدر ۴۰ فیصد گھٹ چکی تھی جس کی وجہ سے اسٹرلنگ والے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی معاشی بحالی ہو رہی تھی۔ روپے کی شرح مبادلہ کو زیادہ نہیں کہا جا سکتا تھا، کیونکہ اس میں بیش قدر زر کی کوئی علامتیں

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ :- ہندوستانی زر اور مبادلے کی پالیسی پر نظر ثانی کرتی لیکن ایسا کرنے سے اس نے گریز کیا۔ دیکھو مجلس قانون ساز کے مباحث (۸/ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

نہیں پائی جاتی تھیں، مثلاً قاصر موازنہ، اعلیٰ شرح سود، محفوظ ذخیرۂ زر سے سونے کا اخراج، ناموافق توازن تجارت اور زر کی تفریط۔ یورپی ملکوں نے جو اپنے زر کی قدر گرا دی تھی اس سے ہندوستان کچھ زیادہ متاثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے ملکوں کے زروں کی کم قدری کی وجہ سے اشیا کی جو بھرمار ہو اس سے یہاں کی صنعتوں کو محفوظ رکھنے کے لئے ہندوستان میں ۱۸۹۴ء کا قانون محصول موجود تھا۔ رہی ہماری تجارت برآمد کو بڑھانے کی دیرینہ خواہش تو اس میں یہ اندیشہ تھا کہ کہیں شرح مبادلہ کی تخفیف انتقامی کارروائی کا اشتعال دلاکر موجودہ صورت حال کو اور بھی زیادہ خراب نہ کردے۔ حقیقی دشواری یہ تھی کہ دوسرے ملکوں نے معاشی قومیت کی جارحانہ پالسی اختیار کر رکھی تھی اور تجارت پر بندشیں عاید کردی تھیں۔ اس دشواری کا مناسب حل یہی تھا کہ اقوام عالم کے درمیان اعتماد، امن پسندی اور زروں کا استحکام پیدا کیا جائے۔ آخری دلیل یہ ہے کہ ہندوستان کے لئے شرح مبادلہ کی تخفیف مناسب نہ ہوگی، کیونکہ اس کی وجہ سے دستور جدید کے تحت صوبہ واری خود مختاری حاصل ہونے سے قبل ہی سر آٹو نیمیر کا مرتب کردہ مالی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

(اپریل تا اگست ۱۹۳۸ء) کے حالیہ مہینوں میں روپے کی شرح مبادلہ کو بدلنے کے لئے ہندوستان میں بہت کچھ مجاہرہ ہوا۔ اس زمانے میں ہندوستان کے ظاہری توازن تجارت میں کمی ہونے سے روپیے کی قدر مبادلہ میں کمزوری پیدا ہوئی جس کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ زر و بنک نے اپنی اسٹرلنگ خریدنے کی شرح میں کمی کر دی تھی۔ ان حالات کے پیدا ہو جانے سے ایک اور بہانہ مل گیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی مجلس عاملہ نے اس مسئلے کو اٹھایا ہے اور صوبوں کی کانگریسی وزارتیں بھی شرح مبادلہ پر نظر ثانی کے متعلق مواد فراہم کر رہی ہیں اور عنقریب اس مسئلے کو مرکزی حکومت کے سامنے پیش کرنے والی ہیں۔ مرکزی حکومت

موجودہ قانونی شرح مبادلہ کے بدلنے کی مخالف ہے۔ چنانچہ ۶/ جون ۱۹۳۸ء کے ایک ابلاغیے میں اس نے اپنے اس اطمینان کا اظہار کیا ہے کہ ہندوستان کے مفاد کی خاطر روپے کی موجودہ شرح مبادلہ کو برقرار رکھنا ضروری ہے اور اس مقصد میں کامیابی کے لئے رزرو بنک (اور حکومت ہند) کے پاس اسٹرلنگ کا اثاثہ کافی سے زیادہ موجود ہے۔ ۳۹۴
باوجود اس کے شرح مبادلہ کو گھٹانے کی تحریک زور پکڑ رہی ہے۔ چنانچہ مرکزی مجلس قانون ساز کے سات غیر سرکاری ارکان نے ۲/ ستمبر ۱۹۳۸ء کو اپنی قراردادوں پر بحث کرنے کی اجازت حاصل کرلی جن میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ ایک کمیٹی کا تقرر کیا جائے جو روپے کی شرح مبادلہ کے کل مسئلے کے بارے میں اپنی رپورٹ پیش کرے اور ہندوستانی نظام زر کے لئے کوئی مستقل معیار تجویز کرے۔

۴۳ ہندوستان کا آیندہ معیار زر

ہندوستان کے آیندہ معیار زر کا مسئلہ دو طرح سے غیر یقینی ہے اول تو یہ کہ کوئی قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ کب زر کی پیچیدہ بین الاقوامی صورت حال میں اتنا سکون پیدا ہوگا جو رزرو بنک کے قانون میں بتلائے ہوئے طریقوں کے مطابق رزرو بنک کوئی کارروائی کرسکے۔
دوسرے یہ کہ آجکل دنیا کی مختلف قوموں میں اس بات پر اتفاق رائے نہیں ہے کہ آیندہ معیار زر کیا ہو اور دنیا کے زروں کو مستحکم کرنے کے بارے میں جلد کسی متفقہ کارروائی کا امکان نہیں ہے[1]۔ جون ۱۹۳۳ء میں بمقام لندن جو دنیا کی مالی و معاشی کانفرنس منعقد ہوئی تھی گو زر کے متعلق اس کی ماہرانہ رائے یہ تھی کہ معیار طلا کو بحال کردیا جائے پھر بھی یہ بات عام طور پر محسوس کی جاتی ہے کہ اس کارروائی کے لئے موجودہ زمانہ مناسب نہیں ہے۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء کے سہ فرقی زر کے

[1] دیکھو ال' ال' بی' انگس کی کتاب موسوم بہ "مبادلہ خارجہ کا مسئلہ" باب ۱۱۔

معاہدے سے جو امید دنیا کے زروں میں جلد استحکام پیدا ہونے کے بارے میں کی جا رہی تھی وہ اب تک پوری نہیں ہوئی؛ اور کوئی بھی یقین کے ساتھ یہ پیشین گوئی نہیں کر سکتا کہ کب ایسے حالات پیدا ہوں گے جو بین الاقوامی معیار طلا کو کامیابی سے جاری کیا جا سکے گا۔ ظاہر ہے کہ آیندہ کے معیار زر کے متعلق ہندوستان اس وقت کوئی قطعی ارادہ نہیں کر سکتا۔ بہتر یہی ہوگا کہ وہ آیندہ کے تغیرات پر نظر رکھے اور وقت کا منتظر رہے۔ بظاہر مصنوعی زر کا طریقہ ہندوستان کے لئے موجودہ حالات میں ضرورت سے زیادہ اعلیٰ معلوم ہوتا ہے؛ لیکن کرنسی کی پالیسی کے نصب العین کی حیثیت سے اس سے بہتر کسی دوسرے معیار کا مشورہ نہیں دیا جا سکتا۔ دنیا میں معمولی حالات پھر قایم ہونے تک ہندوستان کو چاہیے کہ کسی موزوں قسم کے معیار طلا کی تلاش میں رہے اور کوئی اچھا موقع ملتے ہی اس کو اختیار کر لے۔ جو لوگ ہندوستان میں موجودہ معیار مبادلہ اسٹرلنگ کو برقرار رکھنے کے حامی ہیں وہ بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مستقل انتظام کی حیثیت سے یہ کوئی مثالی معیار نہیں ہے۔ اس پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ ہمارے زر کے نظام کو بڑی حد تک دوسرے ملک کی کرنسی کی پالیسی کے تابع کر دیتا ہے؛ اور وہ بھی ایسی حالت میں جبکہ دونوں ملکوں کے معاشی حالات کی مطابقت کا کوئی شائبہ تک نہیں ہے۔ ان غیر یقینی حالات میں کم از کم یہ بالکل واضح رہے کہ ملک میں سونے کے ذخائر قائم و مستحکم کرنے کے لئے رزرو بنک کو کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنا چاہئے کیونکہ یہی ذخائر دنیا کی عام معاشی بدنظمی سے ملک کو محفوظ رکھنے کا واحد ذریعہ ہیں۔

۳۴ اسٹرلنگ کی خریدی

کونسل ڈرافٹ کے طریقے کا ذکر کرتے ہوئے یہ بیان ۲۹۵
کر دیا گیا ہے کہ حکومت چند سال سے اسٹرلنگ خرید کر رہی ہے۔ اس طرح کونسل بل کے طریقے میں ایک اہم تبدیلی ہوگئی ہے[لہ] ہم نے سرسری طور پر یہ بھی

لہ - دیکھو باب ۶ فصل (۲۳) -

بتلا دیا تھا کہ یہ جدید طریقہ شرح مبادلہ کو ایک خاص حد سے بڑھنے سے روکنے کے لئے کام میں لایا گیا ہے[1] اس جدید نظام کے مفصل بیان پر اس باب کو ختم کرنا مناسب ہوگا ۔ ۲۴-۱۹۲۳ء میں اس نظام پر عمل شروع ہوا ۔ اس سال اگرچہ کونسل بلز کی ہفتہ وار فروخت حسب سابق جاری رہی لیکن اعلیٰ شرح پر درمیانی بلز کی فروخت روک دی گئی اور ان کے بجائے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ جو بنک اور بنجی کوٹھیاں ہندوستان میں روپے لیکر ان کے بدلے لندن میں اپنے اسٹرلنگ فروخت کرنا چاہتی تھیں ان سے ہندوستان میں اسٹرلنگ خریدا جانے لگا ۔ یہ خریدی امپیریل بنک کے توسط سے حکومت خود کرتی تھی ۲۵-۱۹۲۴ء میں جبکہ اسٹرلنگ کی خریدی کو رقمیں روانہ کرنے کا اصل ذریعہ قرار دیا گیا اس طریقے میں مزید توسیع کی گئی اور کونسل بلز کی ہفتہ وار فروخت صرف اس وقت شروع کی جاتی تھی جبکہ ان کی مستقل اور مسلسل طلب ہو ۔ ۲۶-۱۹۲۵ء میں کونسل بلز فروخت ہی نہیں کئے گئے اور اس وقت سے کونسل ڈرافٹ کے طریقے کے بجائے ہندوستان میں اسٹرلنگ کی خریدی کا جدید طریقہ اختیار کر لیا گیا[2] ہلٹن ینگ کمیشن نے سفارش کی تھی کہ علی الاعلان مسابقتی ٹنڈر طلب کرکے اور ترسیلات کے ہفتہ وار اعداد شائع کرکے اسٹرلنگ خریدا جائے ۔ چنانچہ اپریل ۱۹۲۷ء سے عام اعلان کے ذریعے ٹنڈر طلب کرکے ہندوستان میں اسٹرلنگ کی خریدی کا سلسلہ شروع کیا گیا ۔ ہفتہ میں صرف ایک دن بالعموم چہارشنبہ کو کلکتہ، بمبئی، مدراس اور کراچی میں ایک ساتھ ٹنڈر وصول کئے جاتے ہیں اور اس کے دوسرے دن ان شہروں میں سے ہر ایک میں تفصیلات

---

[1] ۔ دیکھو باب فصل (۳۸)

[2] ۔ دیکھو مینک واٹرس کی یادداشت ہندوستانی کرنسی کے بارے میں جو ہلٹن ینگ کمیشن کے سامنے پیش کی گئی ۔ رپورٹ جلد دوم صفحہ ۲ ۔

شائع کر دی جاتی ہیں کہ کتنی مقدار کس شرح پر خریدی گئی جس دن ٹنڈر وصول کئے جاتے ہیں اس کے سوا دوسرے دونوں میں ان شہروں میں رزرو بنک آف انڈیا[1] کی شاخوں پر انٹرمیڈیٹ Intermedietis فروخت کئے جاتے ہیں جن کی شرح گزشتہ ٹنڈر وصول ہونے کے روز اسٹرلنگ کی خریدی کی جو زیادہ سے زیادہ شرح رہی ہو اس سے $\frac{1}{32}$ پنس زیادہ ہوتی ہے۔ ترسیلات کے متعلق ہفتہ وار گوشوارے بھی شایع کئے جاتے ہیں۔

یکم اپریل ۱۹۳۵ء سے اسٹرلنگ کی خریدی اور مطالبات وطن کے سلسلے میں وزیر ہند کو ترسیلات کی ذمہ داری رزرو بنک آف انڈیا کو منتقل کر دی گئی ہے۔ کونسل بلز کے نظام کی طرح اسٹرلنگ کی خریدی کی بدولت رزرو بنک مستحکم یا بڑھتی ہوی شرح مبادلہ سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ رزرو بنک آف انڈیا روپے کی شرح مبادلہ کو
ص ۳۹۶ اس خاص حد سے بڑھنے سے روک سکتا ہے جس کا تعین رزرو بنک آف انڈیا کے قانون میں کر دیا گیا ہے (دیکھو فصل ۱۳۱)۔ اس جدید انتظام کی اصل غرض یہ ہے کہ شرح مبادلہ میں روزمرہ تغیرات پیدا کرنے والے اسباب کا فوری صحیح اندازہ ہندوستان ہی میں لگایا جاسکتا ہے اور بازار کے تغیر پذیر حالات کے لحاظ سے اسٹرلنگ کی خریدی کا زیادہ قابل اطمینان انتظام کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ حکومت کی ترسیلات کا انتظام اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ شرح مبادلہ میں شدید تغیرات واقع نہوں جس سے نہ صرف تجارت بلکہ کل ملک کو فائدہ پہنچتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے ۱۹۲۴ء ۲۵ کے اوائل میں جبکہ شرح مبادلہ بڑھ کر ۱ شلنگ ۶ پنس ہو گئی تھی حکومت نے اسٹرلنگ خرید کر شرح مبادلہ کو اور زیادہ بڑھنے سے روکا۔ اس کام کے لئے حقیقت میں مبادلہ بنک ہی زیادہ موزوں ہیں کیونکہ وہ اپنے لندن کے فاضلات کی بنا پر

[1] پہلے امپیریل بنک کہلاتا تھا۔

زر روبنک آف انڈیا کو اسٹرلنگ فروخت کر سکتے ہیں اور چونکہ ہندوستان میں برآمدی ہنڈیوں کی خریدی کی وجہ سے مبادلہ بنکوں کے لندن کے فاضلات بڑھ جاتے ہیں اس لئے وہ ہندوستان میں رقوم کی کمی کو فوراً پورا کر سکتے ہیں[1]

اس نظام میں بھی اس طرح کی خرابیاں موجود ہیں جن کی بنا پر قدیم کونسل بلز کے نظام پر اعتراض کئے جاتے تھے۔ مثلاً تا وقتیکہ حکومت اپنی حقیقی ضروریات کے مطابق اسٹرلنگ کی خریدی کو محدود رکھنے میں احتیاط سے کام نہ لے اس کا امکان تھا کہ اسٹرلنگ کی خریدی کا سلسلہ بڑھ کر اس نوبت پر آجائے کہ ہندوستان میں سونے کی آزادانہ درآمد بڑی حد تک رک جائے۔ اسی طرح خریدی کی شرح ایسی رکھی جا سکتی تھی کہ اس سے بھی ایسا ہی نتیجہ پیدا ہو سکتا تھا۔ اگر حکومت بالائی مقام طلا سے کمتر شرحوں پر روپے فروخت کرے تو ہندوستان میں سونے کی درآمد بالکل موقوف ہو سکتی تھی۔ آجکل ان سب خرابیوں سے ہندوستان کے متاثر ہونے کا امکان کم ہو گیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اسٹرلنگ کی خریدی کی ذمہ داری رزروبنک آف انڈیا کو منتقل کر دی گئی ہے اور یہ توقع کیجاتی ہے کہ حکومت ہند کے ایک محکمے کے مقابلے میں رزروبنک یہ کام بہتر طریقے پر انجام دے سکے گا۔ جدید انتظام میں ایک اور خرابی یہ بتلائی جاتی ہے کہ عام ٹنڈر کے طریقے سے ہندوستان ہی میں اسٹرلنگ فروخت کرنے کی وجہ سے بیرونی مرکزوں کے لوگوں کو ہندوستان سے بیوپار کرنے میں دقت ہوتی ہے۔ قدیم نظام کے تحت کونسل بلز کی فروخت لندن میں ہوتی تھی جو دنیا کے مالی معاملات میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ ایسی حالت میں ہندوستان کے موسومہ ڈرافٹوں کی خریدی میں بیرونی ممالک آسانی سے مسابقت کر سکتے تھے۔ بیرونی ممالک

[1] دیکھو باب ۱۰ فصل ۱۱، ۱۲ اور ۲۴۔

کی طرف سے ہندوستان میں روپوں کا مطالبہ اُسی قوت کے ساتھ ہونا بہت مشکل ہے اور اسی لئے روپے کی بہترین قیمت حاصل کرنا حکومت کے لئے ناممکن ہے[1]۔ بحیثیت مجموعی ہندوستان میں اسٹرلنگ کی خریدی کا جدید انتظام کونسل بلز کے نظام کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے اور اب جبکہ رزرو بنک اس کا ذمہ دار بن گیا ہے اس سے قابل اطمینان نتائج برآمد ہونے کی توقع ہے۔

---

[1] دیکھو رام چندر راؤ کا مضمون "اسٹرلنگ کی خریدی" میسور اکنامک جرنل جون ۱۹۲۶ء۔

۳۹۷

نواں باب

ہندوستان میں قیمتیں

۱۔ قیمتوں کے مسئلے کی اہمیت

کسی ملک کے معاشی حالات کی بحث میں قیمتوں کے تغیرات کے مسائل بہت مشکل اور اہم مانے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں مالگزاری کے بندوبست کا زیادہ تر انحصار قیمتوں کے تغیرات پر ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قیمتوں کے تغیرات کی نوعیت و وسعت کو سمجھنا کسقدر اہمیت رکھتا ہے۔ قیمتوں کی تبدیلیوں کو حکومت ہند کی کرنسی کی پالیسی سے بھی منسوب کیا جاتا ہے اور یہ مسئلہ کہ آیا قیمتوں کے تغیرات بڑھتی ہوئی خوشحالی کی علامت ہیں یا اس کے برعکس لاانتہاہی اور تلخ مباحث کا مرکز رہا ہے۔ اس باب میں ہندوستان کے قیمتوں کے تغیرات پر روشنی ڈالنے اور ان کی اہمیت معلوم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

گذشتہ صدی کے ساتویں عشرے کے اوائل میں ہندوستان میں قیمتوں کے تغیرات جاذب توجہ بننا شروع ہوئے جس کی وجہ یہ تھی کہ معیار طلا والے ملکوں میں صنعت و تجارت میں کساد بازاری رونما ہوئی اور تقریباً ۱۸۷۴ء کے بعد سے چاندی کی قیمت گھٹنے لگی تھی انیسویں صدی کے اختتام کے قریب مختلف معیاروں کے تحت قیمتوں کے استحکام کے مسئلے کے بارے میں بہت کچھ مباحث شروع ہوئے۔ عام خیال یہ تھا کہ معیار طلا والے ملکوں کے مقابلے میں ہندوستان جیسے نقرئی معیار والے ملکوں میں قیمتیں کہیں زیادہ مستحکم رہی تھیں۔ چنانچہ اس خیال کی صحت کی آزمائش کی غرض سے ایف۔ جے اٹکن سن نے اپنی کتاب موسومہ ۱۸۶۱ء سے ہندوستان میں قیمتیں بحوالہ نقرہ" میں وہ اعداد پیش کئے جو ۱۸۶۱ء کے بعد سے ہندوستان میں قیمتوں کے تغیرات سے متعلق تھے[۱] لیکن سچ پوچھو تو قیمتوں کے مسلسل اضافے کے میلان کے متعلق مباحث نے معاشیات ہند کی کتابوں میں موجودہ صدی کے اوائل سے نمایاں جگہ حاصل کی۔ عام طور پر یہ خیال تھا کہ قیمتوں کے مسلسل اضافے کے بارے میں فوری تحقیق ہونی چاہئے تھی۔ حکومت کے نقاد جن کی تائید میں گوکھلے آنجہانی بھی تھے[۲] یہ خیال کرتے تھے کہ اس خرابی کا باعث حکومت کی کرنسی کی پالیسی تھی۔ ۱۹۱۰ء میں حکومت ہند نے اس مسئلے کی مفصل تحقیقات کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ کام ایک کمیٹی (دت کمیٹی) کے تفویض کیا۔ اس کمیٹی کی رپورٹ حکومت ہند کی قرارداد کے ساتھ اکتوبر ۱۹۱۴ء میں شایع ہوئی۔ دت کمیٹی کی تحقیقات پر بحث کرنے سے پہلے مناسب یہ ہوگا کہ ۱۸۹۰ء سے قبل قیمتوں کے عام میلان کا کچھ حال ۴۹۸

[۱] دیکھو کیل اور مرجن کی کتاب محولہ بالا صفحہ ۱۳۴ تا ۱۳۵۔

[۲] دیکھو جی کے گوکھلے آنجہانی کی تقریریں صفحہ ۱۵۰ تا ۱۵۳۔

بیان کر دیا جائے۔ کیونکہ اس سال سے ۱۸۹۰ء-۱۹۱۲ء کے اس دور کی ابتدا ہوتی ہے جو کمیٹی کے زیر تحقیقات تھا۔

۱۸۶۱ء کے بعد سے قیمتوں کے تغیرات کا مختصر حال[۲]

مندرجۂ ذیل جدول سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ۱۸۶۱ء کے بعد سے معیاری سال کے مقابلے میں قیمتوں کی عام رفتار کیا رہی[۱]۔ عام انڈکس نمبر ۳۹ اشیا کی (۲۸ برآمدی اشیا اور ۱۱ درآمدی اشیا) تھوک قیمتوں پر مبنی ہے۔ البتہ غلہ مثلاً جوار، باجرا، جوڑ راگی اور چنا ان میں شامل نہیں ہیں کیونکہ ان کی ۱۸۹۷ء سے پہلے قیمتیں معلوم نہ ہو سکیں۔

سال	۳۹ اشیا کا عام انڈکس نمبر (بلا لحاظ اہمیت)[۲]	بہ لحاظ اہمیت انڈکس نمبر (۱۰۰ اشیا) کے معیاری سال ۱۸۷۳ء کے ۱۰۰ کے مقابلے میں[۳]	سال	۳۹ اشیا کا عام انڈکس نمبر (بلا لحاظ اہمیت)[۲]	بہ لحاظ اہمیت انڈکس نمبر (۱۰۰ اشیا کے) معیاری سال کے ۱۸۷۳ء کے مقابلے میں[۳]
۱۸۶۱ء ۱۸۶۵ء	۹۰ ۱۰۷	۹۳ ۱۰۹	۱۹۲۹-۳۰ء ۱۹۳۰ء	۲۷۶ ۲۸۱	۳۰۱ ۳۰۲

[۱] ۱۸۷۳ء کو معیاری سال کے طور پر اس لیے منتخب کیا گیا کہ اس سال فصلیں اوسط رہی تھیں۔ اس کے علاوہ تقریباً اسی سال کے بعد سے چاندی کی قیمت میں کمی اور اسکی وجہ سے روپے کی قدر میں تخفیف شروع ہوئی۔

[۲] دیکھو ایک رپورٹ "ہندوستانی قیمتوں کے انڈکس نمبر ۱۸۶۱ء-۱۹۳۱ء" اور اس کا سالانہ ضمیمہ۔ مندرجۂ بالا جدول کے تیسرے اور چھٹے کالم میں جو انڈکس نمبر بہ لحاظ اہمیت درج ہیں ان کو ابتداءً محکمۂ فینانس کے ایک کارکن مسٹر ایف۔ جے۔ اٹکن سن نے مرتب کیا تھا۔ ۱۹۰۹ء کے بعد کے سالوں کے انڈکس ان ہی کے طریق حساب سے محکمۂ اعداد و شمار میں مرتب کئے گئے ہیں مزید تفصیلات کے لئے دیکھو ہندوستانی قیمتوں کے انڈکس نمبر صفحہ ۲۲ ضمیمہ (ج)۔

[۳] دیکھو ہندوستانی قیمتوں کے انڈکس نمبر ۱۸۶۱ء-۱۹۳۱ء۔

۱۸۷۰ء	۱۰۲	۱۰۷	۱۹۲۱ء	۲۳۶	۲۷۳
۱۸۷۵ء	۹۴	۹۶	۱۹۲۲ء	۲۳۲	۲۶۶
۱۸۸۰ء	۱۰۴	۱۰۹	۱۹۲۳ء	۲۱۵	۲۵۹
۱۸۸۵ء	۸۷	۱۰۶	۱۹۲۴ء	۲۲۱	۲۵۷
۱۸۹۰ء	۱۰۰	۱۱۷	۱۹۲۵ء	۲۲۷	۲۶۵
۱۸۹۵ء	۱۰۴	۱۲۰	۱۹۲۶ء	۲۱۶	۲۶۰
۱۹۰۰ء	۱۱۶	۱۴۱	۱۹۲۷ء	۲۰۲	-
۱۹۰۵ء	۱۱۰	۱۳۵	۱۹۲۸ء	۲۰۱	-
۱۹۱۰ء	۱۲۲	۱۵۰	۱۹۲۹ء	۲۰۳	-
۱۹۱۳ء	۱۴۳	۱۸۲	۱۹۳۰ء	۱۷۱	-
۱۹۱۴ء	۱۴۷	۱۸۷	۱۹۳۱ء	۱۲۷	-
۱۹۱۵ء	۱۵۲	۱۸۲	۱۹۳۲ء	۱۲۶	-
۱۹۱۶ء	۱۸۴	۱۸۵	۱۹۳۳ء	۱۲۱	-
۱۹۱۷ء	۱۹۶	۱۸۶	۱۹۳۴ء	۱۱۹	-
۱۹۱۸ء	۲۲۵	۲۱۵	۱۹۳۵ء	۱۲۷	-
			۱۹۳۶ء	۱۲۵	-

جدول کے خانہ (۴) اور (۵) کے سرکاری انڈکس نمبر جو ایک
رپورٹ موسوم بہ "ہندوستانی قیمتوں کے انڈکس نمبر" سے لئے گئے ہیں
بلا لحاظ اہمیت ہیں۔ اشیا کو مساوی درجہ دیے جانے کی وجہ سے
قیمتوں کے تغیرات کی نوعیت و اہمیت ان انڈکس نمبروں سے پوری طرح
واضح نہیں ہوتی۔ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے جس کی مجموعی پیدائش
۳۹۹ دولت میں زراعتی پیداوار کا بہت بڑا حصہ ہے اور یہ زیادہ تر چاول،
گیہوں، کپاس، جوٹ وغیرہ جیسی اجناس پر مشتمل ہے جن کے مقابلے میں
دوسری اجناس کم اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن قیمتوں کے متعلق جو نتیجہ اخذ

کیا گیا ہے اس میں سوتی کپڑے، سوت، خام ریشم اور کوئلے کے اعداد کو بہت زیادہ دخل ہے اور قیمتوں کے پورے سلسلے میں درآمدی اشیا اور ان سے براہ راست مسابقت کرنے والی اشیا کا غلبہ ہے[1]۔ چونکہ کل ہندوستان کا انڈکس نمبر جس کے لئے ۱۸۷۳ء کو معیاری سال قرار دیا گیا ہے دقیانوسی ہو چکا ہے اس لئے آجکل عداً بمبئی اور کلکتے کی تھوک قیمتوں کے انڈکس نمبروں کا حوالہ دیا جاتا ہے (دیکھو فصل ۹)۔ اس لحاظ سے ۱۸۷۳ء کے معیاری سال کو مقابلہ کرنے کے لئے موزوں نہیں خیال کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ ابتداءً جبکہ انڈکس نمبر مرتب کئے گئے تھے اس وقت کے مقابلے میں اب اشیا کی اضافی اہمیت بھی بدل گئی ہے۔

۱۸۶۱ء تا ۱۸۹۳ء کا دور

ہم ذیل میں قیمتوں کے ان تغیرات کو بیان کریں گے جو ۱۸۶۱ء اور ۱۸۹۳ء کے درمیان ہوئے۔

(۱) بڑھتی ہوئی قیمتیں (۱۸۶۱ء - ۶۶ء)۔ امریکی خانہ جنگی کی وجہ سے روئی کی قلت رونما ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روئی بہت مہنگی ہو گئی۔ روئی کی اس گرانی کی وجہ سے ہندوستان میں فلز کثیر مقدار میں درآمد ہوئی اور سکے کثیر مقدار میں ڈھالے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں قیمتیں بڑھ گئیں۔ قیمتوں کے اس اضافے سے پہلی دفعہ یہ واضح ہوا کہ ہندوستان میں قیمتیں بیرونی حالات کا اثر قبول کر رہی تھیں۔

(۲) گرتی ہوئی قیمتیں (۱۸۶۶ء - ۸۳ء)۔ قحط سالی کی وجہ سے ۱۸۷۶ء اور ۱۸۷۹ء کے درمیان غذائی اشیا کی قیمتوں میں جو اچانک اضافہ ہو گیا تھا اس کے قطع نظر ۱۸۶۶ء تا ۱۸۸۳ء قیمتیں گرتی ہی رہیں۔ ابتدائی

---

[1] دیکھو وکیل اور مورنجن کی کتاب محولۂ بالا ص ۱۴۰۔

[2] دیکھو ۱۸۲۵ء تا ۱۹۰۰ء قیمتوں کے عام میلان کے مطالعہ کے لئے جی ڈی جوشی کی کتاب (Writings and Speeches) صفحہ ۵۹۰ — ۶۰۰ اور ۱۸۶۱ء تا ۱۹۱۳ء میں قیمتوں کے عام میلان کے مطالعے کے لئے وکیل اور مورنجن کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۳۱۱ — ۳۲۱۔

زمانے میں قیمتوں میں جو عام تخفیف ہوئی وہ غالباً اس سے پہلے کے زمانے کی بڑھی ہوئی قیمتوں کا ردعمل تھی اور بعد کے سالوں میں جو کمی ہوئی وہ قیمتوں کی تخفیف کے اس عام میلان کا نتیجہ تھی جو تقریباً ۱۸۷۴ء سے مغربی ملکوں میں رونما ہو چکا تھا۔ اس تخفیف کے اسباب حسب ذیل بتائے گئے ہیں۔
سونے کی پیداوار میں کمی، ان ملکوں کا معیار طلا اختیار کر لینا جو پہلے معیار نقرہ رکھتے تھے، ٹکسالوں میں چاندی کی آزاد سکہ سازی کی موقوفی کی وجہ سے چاندی کی کرنسی کا استعمال محدود ہو جانا، بنک کاری کی ترقی کی رفتار کا دھیما پڑنا، مصارف نقل و حمل کی کمی کی وجہ سے تجارت کا بڑھ جانا اور پیدائش دولت کے طریقوں میں اصلاح و ترقی ہونا۔[1]

(۳) ۔ بڑھتی ہوئی قیمتیں (۱۸۸۳ء-۹۳ء) ۔ روپے کی قیمت گر جانے کی وجہ سے مغرب کے معیار طلا والے ملکوں کے مقابلے میں ہندوستان میں بہت پہلے ہی قیمتوں کا گرنا موقوف ہو گیا تھا۔ لیکن یہ واضح رہنا چاہئے کہ اگرچہ تقریباً ۱۸۷۴ء کے بعد سے چاندی کی قدر میں بحوالہ طلا تخفیف ہو چکی تھی، پھر بھی اشیا کی پیدائش میں عام اضافہ ہونے سے تقریباً ۱۸۸۳ء تک قیمتوں میں کمی واقع ہوتی رہی۔ ۱۸۸۵ء سے جبکہ اشیا کی پیدائش پر چاندی کی
پیدائش سبقت لے گئی، ہندوستان میں قیمتوں کے اضافے کا سلسلہ شروع ۲۰۰
ہوا جو ۱۹۰۲ء تک برابر جاری رہا۔ البتہ ۱۸۹۳ء-۹۵ء کے مختصر درمیانی وقفے میں قیمتوں میں کسی قدر کمی واقع ہوئی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ٹکسالیں بند ہو جانے سے ملک میں زر کی قلت ہو گئی تھی۔ لیکن زر کی قلت کا جو اثر ہونا چاہئے تھا وہ ان قحطوں کی وجہ سے کسی حد تک زائل ہو گیا جو اس دور میں رونما ہوئے۔
قیمتوں کے بڑھنے کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ چاندی ارزاں ہو گئی تھی اور ۱۸۸۱ء اور ۱۸۹۲ء کے درمیان کثیر مقدار میں روپے ڈھالے گئے تھے۔ ہم اوپر چاندی کی ارزانی کے اسباب کا ذکر کر چکے ہیں اور یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ

[1] ۔ دیکھو ارونگ فشر کی کتاب موسوم بہ "زر کی قوت خرید" صفحہ ۱۴۲۔

کس طرح جرمنی اور دوسرے یورپی ملکوں کے چاندی کا استعمال زر کی حیثیت سے موقوف کر دینے کی وجہ سے چاندی ہندوستان میں اس وقت تک کثیر مقدار میں آتی رہی جب تک کہ ٹکسالوں میں آزاد سکہ سازی جاری رہی۔

۴۔ قیمتوں کی تحقیقاتی کمیٹی (قیمتیں ۱۸۹۰ء سے ۱۹۱۲ء تک)

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے ۱۸۹۰ء سے ۱۹۱۲ء تک کا زمانہ قیمتوں کی تحقیقاتی کمیٹی کے زیر غور رہا اور ۱۸۹۰-۹۴ء کے پانچ سال معیاری قرار دیے گئے جن سے بعد کے سالوں کی قیمتوں کے اعداد کا مقابلہ کرنے کا کام لیا گیا۔ اس معیاری زمانے میں ایک حد تک اعتدال رہا اور قیمتوں میں ویسے شدید تغیرات نہیں ہوئے جیسے کہ بعد میں چلکر اس صدی کے اختتام پر دو سخت قحطوں کی وجہ سے رونما ہوئے۔

ہندوستان میں روپے اور سونے کے حوالے سے عام اوسط قیمتوں کے انڈکس نمبر (۱۸۹۰ء تا ۱۹۱۲ء)[1]

سال	قیمتیں روپے کے حوالے سے	قیمتیں سونے کے حوالے سے	سال	قیمتیں روپے کے حوالے سے	قیمتیں سونے کے حوالے سے
۱۸۹۰ء	۹۷	۱۱۳	۱۹۰۲ء	۱۱۱	۱۱۵
۱۸۹۱ء	۹۸	۱۰۶	۱۹۰۳ء	۱۰۷	۱۱۱
۱۸۹۲ء	۱۰۳	۱۰۰	۱۹۰۴ء	۱۰۶	۱۱۰
۱۸۹۳ء	۱۰۲	۹۶	۱۹۰۵ء	۱۱۶	۱۲۰
۱۸۹۴ء	۱۰۰	۸۵	۱۹۰۶ء	۱۲۹	۱۳۴
۱۸۹۵ء	۱۰۱	۸۹	۱۹۰۷ء	۱۳۳	۱۳۸
۱۸۹۶ء[2]	۱۰۶	۹۹	۱۹۰۸ء	۱۴۳	۱۴۷

۱۔ کے ایل دت کی رپورٹ ہندوستان میں قیمتوں کے اضافے کی تحقیقات کے بارے میں ۱۹۱۴ء صفحہ ۲۹۔
۲۔ ان سالوں میں قحط پڑا۔

سنہ ۱۸۹۷ء له	۱۲۱	۱۲۰	سنہ ۱۹۰۹ء	۱۳۳	۱۳۸
سنہ ۱۸۹۸ء	۱۰۶	۱۰۹	سنہ ۱۹۱۰ء	۱۳۲	۱۳۷
سنہ ۱۸۹۹ء	۱۰۴	۱۰۸	سنہ ۱۹۱۱ء	۱۳۴	۱۳۹
سنہ ۱۹۰۰ء له	۱۲۲	۱۲۶	سنہ ۱۹۱۲ء	۱۴۱	۱۴۷
سنہ ۱۹۰۱ء	۱۱۶	۱۲۰			

سنہ ۱۸۹۸ء میں روپے کی قیمت بحوالۂ طلا ۱ شلنگ ۴ پنس پر مستحکم ہونے تک روپے اور سونے کے انڈکس نمبروں میں فرق رہا۔ سنہ ۱۸۹۰ء اور سنہ ۱۸۹۳ء کے درمیان چاندی کی قیمت بحوالۂ طلا بتدریج گھٹتی رہی۔ اس زمانے میں روپے
۴۰۱ کے حوالے سے قیمتوں میں بالکل معمولی تغیرات ہوئے۔ لیکن بحوالۂ طلا اشیا کی قیمتیں گھٹتے گھٹتے ۱۱۳ سے ۸۵ ہو گئیں۔ بحوالۂ طلا روپے کی قدر میں جو مسلسل کمی ہوئی اس کے ساتھ بحوالۂ طلا عام قیمتوں کی سطح بھی بتدریج گھٹ گئی۔ سنہ ۱۸۹۵ء تا سنہ ۱۸۹۷ء جبکہ شرح مبادلہ میں سرعت سے اضافہ ہو رہا تھا۔ سنہ ۱۸۹۴-۹۵ کے پنجسالہ اوسط کے مقابلے میں روپے کے حوالے سے قیمتوں کی سطح بحوالۂ طلا قیمتوں کی سطح سے بلند تھی۔ سنہ ۱۸۹۸ء کے بعد جبکہ روپے کی شرح مبادلہ ۱ شلنگ ۴ پنس پر کم و بیش مستحکم ہو چکی تھی، روپے اور سونے کے حوالے سے قیمتوں کے انڈکس نمبروں کا میلان توقع کے مطابق ایک ہی سمت میں رہا، اگرچہ موخر الذکر کے مقابلے میں اول الذکر ۴ تا ۵ درجے زیادہ رہا۔

اگر سنہ ۱۸۹۰ء تا ۱۹۱۲ء کی کل مدت کو لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس زمانے میں تمام ہندوستان میں قیمتیں عام طور پر بڑھی رہیں اور یہ میلان سنہ ۱۹۰۵ء کے بعد خاص طور پر نمایاں ہو گیا۔ چمڑے اور کھالیں، غلہ (دال اور اناج) عمارتی سامان اور روغندار تخم کی حد تک قیمتوں کا اضافہ خاص طور پر نمایاں رہا چنانچہ

له - ان سالوں میں قحط پڑا۔

معیاری سالوں کی سطح کے مقابلے میں ۴۰ فیصد اضافہ ہوا۔ روئی اور جوٹ میں علی الترتیب کم وبیش ۳۳ فیصد اور ۱۳ فیصد اضافہ ہوا اور دوسری غذائی چیزوں، دھاتوں، دوسری خام اشیا اور مصنوعات کی قیمت میں تقریباً ۲۵ فیصد اضافہ ہوا۔ دیسی شکر کی قیمت میں معمولی اضافہ ہوا۔ لیکن دوسری طرف چائے، قہوہ، درآمدہ شکر، رنگ سازی اور دباغت کے سامان اور خالص نیل، کوئلہ اور لاک کی قیمتوں میں کافی کمی ہوئی۔ اس طرح دوسرے کپڑوں کی قیمتیں بھی کسی حد تک کم ہوگئیں۔

ہندوستان کے طول وعرض میں قیمتوں میں یکساں طور پر اضافہ نہیں ہوا۔ چنانچہ بندیل کھنڈ، برار، سندھ، شمالی ومغربی صوبۂ آگرہ، مشرقی پنجاب، مغربی پنجاب، دکن اور جنوبی مدراس جیسے قحط زدہ علاقوں میں بہت گرانی رہی۔ آسام جو قحط سے کم وبیش بچا رہتا ہے اس میں گرانی نسبتاً کم ہوئی۔ بمبئی، کلکتہ، مدراس، رنگون وغیرہ جیسی بندرگاہوں میں اکثر شمالی علاقوں کے مقابلے میں گرانی زیادہ نہیں تھی۔ بندرگاہوں پر قیمتوں میں کم اضافہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ان پر تغیرات کا اثر کم پڑتا تھا، کیونکہ ان کو ایک بڑے رقبے سے اشیا کی رسد حاصل ہوسکتی تھی۔ ابتدائی سالوں میں بھی بندرگاہوں میں عام طور پر قیمتیں نسبتاً زیادہ رہی تھیں۔ ایسی حالت میں اگر قیمتیں بڑھیں تو ظاہر ہے کہ اضافے کی شرح شمالی علاقوں کے مقابلے میں کم ہوگی۔

لیکن ایک طرف اچھے اور برے سالوں کی قیمتوں کے درمیان نمایاں فرق تھا تو دوسری طرف بازاروں کا الحاق ریلوں سے ہونے سے مختلف علاقوں اور رقبوں کے درمیان فرق گھٹتا نظر آرہا تھا اور تمام ملک میں قیمتوں میں یکسانیت پیدا ہوچکی تھی۔

۵۔ ہندوستان اور دنیا کی قیمتوں کی سطح کا مقابلہ

مندرجۂ ذیل جدول میں مختلف ملکوں کی قیمتوں کے اضافے کا حال بہ ترتیب مدارج بیان کیا گیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ معیاری دور اور ۱۸۹۶ء-۱۹۰۰ء کے پانچ سالہ اوسط کے مقابلے میں جبکہ بجز ہندوستان کے تمام دوسرے ملکوں میں

۴۰۲

قیمتیں انتہائی گری ہوئی تھیں۔ ۱۹۰۷ء-۱۱ء کے پانچ سالوں میں قیمتوں کا کیا اوسط رہا۔

ملک	۱۸۹۰ء-۹۴ء کے مقابلے میں	۱۸۹۴ء-۹۸ء کے مقابلے میں
ہندوستان	۴۰	۴۰
بلجیم	۲۵	۲۶
جرمنی	۲۴	۳۸
ریاستہائے متحدہ	۲۰	۳۸
کناڈا	۱۹	۳۱
اٹلی	۱۴	۲۴
آسٹریلیا	۱۳	۲۰
فرانس	۱۲	۲۶
سلطنت متحدہ	۹	۲۱
نیوزی لینڈ	۱	۹

اس جدول سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں قیمتوں میں سب سے زیادہ اضافہ ہوا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جرمنی میں بھی کافی اضافہ ہوا۔ لیکن اس کی وجہ یہ بیان کی جاسکتی ہے کہ ان ملکوں کے تامینی محصولوں میں بہت اضافہ ہوا تھا اور صنعتی و تجارتی اتحادوں کا اثر پڑا تھا۔ لیکن یہ چیزیں ہندوستان میں موجود نہیں تھیں۔

ہندوستان میں زمانۂ قبل از جنگ عظیم کی قیمتوں کے اضافے کے اسباب

قیمتوں کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کا سب سے زیادہ متنازعہ فیہ حصہ وہ ہے جس میں اس غیر معمولی گرانی کے اسباب کا تجزیہ کیا گیا ہے جو جنگ سے پہلے ہندوستان میں پائی جاتی تھی۔ کمیٹی نے اسباب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے یعنی (۱)۔ اسباب جو صرف ہندوستان تک محدود تھے (۲) وہ اسباب جو ہندوستان تک محدود نہ تھے بلکہ عالمی حیثیت رکھتے تھے لیکن کمیٹی نے

یہ تسلیم کیا ہے کہ ان دونوں قسم کے اسباب نے ایک دوسرے پر اثر ڈالا ۔

(۱)۔ ہندوستان سے مختص اسباب ۔ کمیٹی کے خیال میں ہندوستان سے مختص اسباب حسب ذیل تھے :۔ (ا) زراعتی پیداوار اور خام اشیا کی رسد میں قلت ؛ (ب) ان اشیا کی طلب میں اضافہ ؛ (ج) ہندوستان میں ریلوں اور دوسرے ذرایع آمد و رفت کی ترقی و توسیع ۔ اور خود ہندوستان کے اندر اور ہندوستانی بندرگاہوں اور بیرونی ممالک کے درمیان راست اور بالواسطہ مصارف نقل و حمل میں کمی ؛ (د) زر اور بنک کاری میں عام طور پر سہولتوں کا بڑھ جانا اور اعتبار کی فراوانی ہونا ؛ اور (ھ) ذریعۂ مبادلہ کی مقدار کا اضافہ ۔

(۲)۔ عالمی اسباب ۔ عالمی اسباب حسب ذیل تھے :۔ (ا) دنیا کے بازاروں میں خام اشیا کی رسد کی قلت اور ان کی طلب میں اضافہ ؛ (ب) دنیا کی سونے کی کانوں سے بڑی مقداریں سونے کا نکلنا ؛ (ج) اعتبار کی ترقی ؛ (د) تباہ کن جنگیں ، اکثر مغربی ملکوں اور ریاستہائے متحدۂ امریکہ میں مستقل بری اور بحری فوجوں میں اضافہ جس کی وجہ سے اصل نے غیر پیدآور راستے اختیار کئے اور بہت سی قسموں کی اشیا کی طلب بڑھ گئی ۔ ۱۸۹۳ء میں معیار نقرہ چھوڑ دینے کی وجہ سے ہندوستان کے زر کے نظام کا تعلق باقی دنیا کے زر کے نظام سے ہو گیا ۔ چنانچہ مذکورۂ بالا اسباب کی بنا پر باقی دنیا کی قیمتوں کے تغیرات کا اثر ہندوستان پر بھی پڑا ۔ لیکن ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیوں دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہندوستان میں قیمتوں کی سطح زیادہ بلند رہی ۔ ۴۴۳

۷۔ ان اسباب کا تجزیہ جو خاص کر ہندوستان سے متعلق تھے[۱]

کمیٹی کی رپورٹ میں زیادہ تر رسد کی کمی کو اور خصوصاً زرعی اجناس کی قلت کو ہندوستان کی قیمتوں کے اضافے کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے ۔ اس قلت کے اسباب یہ تھے کہ (۱) زراعت کی ترقی آبادی کے اضافے کا ساتھ نہیں دے رہی تھی

[۱] ۔ دیکھو ایچ ۔ ایل چھبلانی کی کتاب موسومہ بہ Studies in Indian Currency and Exchange. صفحہ ۵۶ - ۶۲ ۔

(۲)۔ بارش بے موسم ہو رہی تھی؛ (۳)۔ غذائی فصلوں کی بجائے غیر غذائی فصلیں بوئی جا رہی تھیں؛ (۴)۔ کاشت کے لئے جو نئی زمینیں لی گئی تھیں وہ ادنیٰ درجے کی تھیں۔ مندرجہ ذیل جدول میں اضافۂ آبادی کا مقابلہ غلّے کی پیداوار کی ترقی اور کاشت کی توسیع سے کیا گیا ہے۔

اِنڈکس نمبر (سنہ ۱۸۹۰-۹۱ء تا سنہ ۱۸۹۴-۹۵ء کا اوسط = ۱۰۰)

	پانچ سالہ اوسط					
	سنہ ۱۸۹۰-۹۱ء تا سنہ ۱۸۹۴-۹۵ء	سنہ ۱۸۹۵-۹۶ء تا سنہ ۱۸۹۹-۱۹۰۰ء	سنہ ۱۹۰۰-۱ء تا سنہ ۱۹۰۴-۵ء	سنہ ۱۹۰۵-۶ء تا سنہ ۱۹۰۹-۱۰ء	سنہ ۱۹۱۰ء تا سنہ ۱۹۱۱ء	سنہ ۱۹۱۱ء تا سنہ ۱۹۱۲ء
آبادی	۱۰۰	۱۰۱٫۶	۱۰۳٫۷	۱۰۵٫۷	۱۰۷٫۸	۱۰۸٫۴
زیر کاشت مجموعی رقبہ	۱۰۰	۹۸	۱۰۳	۱۰۵	۱۰۸	۱۰۶
رقبہ غذائی اجناس کے تحت	۱۰۰	۹۶	۱۰۱	۱۰۲	۱۰۶	۱۰۳
غلّے کی پیداوار	۱۰۰	۹۸	۱۰۵	۹۹	۱۱۳	۱۰۹

مسٹر دت نے اس جدول سے یہ نتیجہ نکالا کہ زیر تحقیق دور میں آبادی میں جو فیصد اضافہ ہوا وہ مجموعی زیر کاشت رقبے، غلّے کی کاشت کے رقبے یا غلّے کی مجموعی پیداوار کے مقابلے میں بہت زیادہ تھا۔ اس کے علاوہ اسی زمانے میں ہندوستانی غلّے کی بیرونی طلب بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ اندرون ملک غلّے کی طلب میں جو اضافہ ہوا اس کو مسٹر دت نے اس بات کی طرف منسوب کیا کہ آبادی کے بڑے حصے خاصکر جوٹ، روئی، روغندار تخموں اور گیہوں کی کاشت کرنے والوں کا معیار زندگی بلند ہو گیا تھا۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے[۱] کہ حکومت ہند نے اس رائے کو اس بنا پر تسلیم نہیں کیا کہ مسٹر دت کا اخذ کیا ہوا نتیجہ زیادہ تر قیاسی اور ناقابل اعتبار تھا۔ حکومت کا استدلال یہ تھا کہ آبادی کے اضافے کے ساتھ زیر کاشت رقبے میں عام

[۱] دیکھو جلد اول صفحہ ۸۰۔

باب ۹ طور پر اور غلے کی کاشت کے رقبے میں خاص طور پر توسیع ہوئی تھی اور آب پاشی کی توسیع
وترقی کی وجہ سے غلے کی پیداوار میں اضافہ ہو گیا تھا۔ یہاں اتنا کہہ دینا
مناسب ہوگا کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ آبادی کے اضافے کے ساتھ ساتھ
۴۰۴ زیر کاشت رقبہ بڑھ گیا تھا تو اس سے یہ بات لازمی طور پر ثابت نہیں ہوتی
کہ اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا کیونکہ ظاہر ہے
کہ جو نئی زمینیں زیر کاشت لائی گئی ہونگی وہ ان زمینوں کے مقابلے میں گھٹیا
درجے کی ہوں گی جو پہلے سے زیر کاشت تھیں اور اسی وجہ سے نئی زمینوں
کی کاشت اس وقت تک منفعت بخش نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ پیداوار کی
قیمت میں اضافہ نہ ہو۔ البتہ حکومت کا یہ استدلال کچھ معقول تھا کہ آب پاشی
کی سہولتوں کے بڑھ جانے کی وجہ سے زمین سے زیادہ پیداوار حاصل
ہوئی تھی۔

کمیٹی نے یہ بتلایا تھا کہ اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں کے اضافے کے
اسباب میں سے ایک سبب یہ تھا کہ اجناس کی بجائے غیر خورا کی فصلوں کی
کاشت ہو رہی تھی[1] لیکن واقعہ یہ ہے کہ کاشت کی یہ تبدیلی اتنی زیادہ
نہیں ہوئی تھی کہ غلہ کی قیمتوں پر اس کا کچھ زیادہ اثر پڑتا۔ پھر بھی اگر غلے کی
واقعی قلت ہوتی تو اس کی وجہ سے صرف غلے کی قیمتیں متاثر ہوتیں۔ ہمارے
سامنے اصل تشریح طلب یہ مسئلہ ہے کہ عام قیمتوں میں اضافہ ہوا اور اس کے لئے
کسی عام سبب یا اسباب کا ہونا ضروری ہے۔ مسٹر دت کی ساری بحث میں
سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ انھوں نے خاص اور عام اسباب میں صاف
طور پر امتیاز نہیں کیا۔ اس کے علاوہ ان کا وہ استدلال بھی غلط ہے جس کا یہ مطلب
ہے کہ قیمتوں کی سطح کا انحصار اشیا اور ذریعۂ مبادلہ کی مقداروں کے
باہمی تعلق پر نہیں ہے بلکہ اشیا کی مقدار اور آبادی کی تعداد کے باہمی تعلق پر ہے۔
مسٹر دت کا یہ کہنا کہ غلے کی طلب میں اس وجہ سے اضافہ ہو گیا تھا کہ آبادی کے

[1] دیکھو چھبلانی کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۶۲۔

سب طبقوں کی خوشحالی میں عام اضافہ ہوا تھا مفروضہ حالات میں بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے۔ جب آبادی کے تناسب سے غلے کی رسد میں اضافہ نہیں ہوا تو ہندوستان جیسے ملک کو عام طور پر مصیبت میں مبتلا ہو جانا چاہئے تھا، کیونکہ وہ بجز تھوڑی سی مقدار درآمد کرنے کے تمام غلہ خود ہی پیدا کرتا ہے اور زراعت ہی اس کے باشندوں کا واحد پیشہ ہے۔ اگر معیار آسائش عام طور پر بلند ہو جاتا تو اس کی وجہ سے دولت پیدا کرنے کی صلاحیت میں بھی ترقی ہوتی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا (بہ شرطیکہ کرنسی میں اسی کے تناسب اضافہ نہ ہو) کہ قیمتیں بڑھنے کی بجائے گھٹ جائیں۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ زر کی مقدار میں کچھ بھی اضافہ نہیں ہوا تو بھی ذرائع نقل و حمل کی ترقی کا یہ میلان ہوتا کہ وہ ایک طرف زر کی گردش میں سرعت پیدا کر کے قیمتوں کو بڑھا دیتی تو دوسری طرف کاروبار کو بڑھا کر قیمتوں میں کمی کر دیتی۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ موخر الذکر میلان اول الذکر میلان پر غالب رہا۔ ذرائع نقل و حمل کا سب سے اہم اثر یہ ہوتا ہے کہ قیمتوں میں یکسانی پیدا ہو جاتی ہے یہاں تک کہ وہ بعض مقامات میں پہلے سے زیادہ ہو جاتی ہیں تو بعض مقامات میں پہلے سے کم ہو جاتی ہیں۔ لیکن ہم تو اس بات کا سبب تلاش کر رہے ہیں کہ کیوں قیمتوں میں عام طور پر ہر جگہ اضافہ ہوا۔ ۴۰۵
مسٹر دت فلزی زر کے دائرے سے اعتبار کے اثر کو علیحدہ کر دیتے ہیں۔ وہ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ کاروبار کی ترقی کے مقابلے میں فلزی زر کی مقدار میں زیادہ اضافہ ہوا تھا۔ بلکہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ہندوستان میں زیر تحقیق دور میں اعتبار بہت بڑھ گیا تھا۔ جیسا کہ ہم عنقریب ثابت کریں گے ان کا پہلا دعوی غلط تھا۔ جہاں تک دوسرے دعوے کا تعلق ہے واقعہ یہ ہے کہ بنک کاری اور اعتبار میں اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی کہ قیمتوں کے اضافے پر ان کا اثر پڑتا[1]

[1] اس بارے میں دیکھو برج نرائن کی کتاب موسوم بہ Indian Economic Life صفحہ ۱۲۰-۱۲۴

رہا یہ امر کہ خوراکی اجناس کی برآمد کی وجہ سے ہندوستان میں قیمتیں بڑھ گئی تھیں تو اس سلسلے میں مندرجۂ ذیل امور ذہن نشین رکھنے چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ زیر بحث دور میں مجموعی تجارت کے مقابلے میں برآمد کا تناسب کبھی ۷ فی صد سے متجاوز نہیں ہوا۔ اسی وجہ سے برآمد کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ جن سالوں میں برآمد سب سے زیادہ ہوئی تھی ان میں قیمتیں سب سے کم رہیں۔ سچ پوچھو تو یہ استدلال بھی مساوی طور پر قوی ہے کہ قیمتوں کی سطح ادنیٰ رہنے کی وجہ سے برآمد میں اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے غلے کی مجموعی پیداوار کے مقابلے میں گیہوں (جو برآمد کردہ غلے میں سب سے اہم تھا) کی پیداوار کا تناسب صرف ۱۰ فیصد تھا اور اس دس فیصد پیداوار کے ایک حصے کی برآمد کا جو اثر اشیائے خورونوش کی قیمتوں کی سطح پر پڑ سکتا ہے اس کو کچھ زیادہ قابل لحاظ نہیں کہا جا سکتا۔

دوسرے جو اسباب پیش کئے گئے یہ ہیں:۔ اجرتوں میں اضافہ ہندوستان میں اصل کی درآمد اور سوداگروں کے اجاروں کا اثر۔ پہلے سبب کی حیثیت اضافی تھی۔ کیونکہ زراعت اور صنعت میں اجرتوں کے عام طور پر بڑھ جانے کی کوئی علامت ہی نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ پہلے قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کے بعد اجرتوں میں۔ رہی بیرونی اصل کی درآمد تو یہ کوئی موثر اور نتیجہ خیز سبب نہیں ہے کیونکہ بعض سالوں میں ہندوستان جو سود ادا کرتا ہے وہ اس اصل سے متوازن ہو جاتا ہے جو ہندوستان میں داخل ہوتا ہے۔ اسی طرح مذکورۂ بالا آخری سبب یعنی سوداگروں کے اجاروں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اضافی سبب تھا اور کسی حال موثر نہ تھا۔

زر کی مقدار میں اضافہ اصلی سبب تھا

تنقیح کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کرنسی (اور ہندوستان میں کرنسی کے معنی صرف فلزی کرنسی ہو سکتے تھے کیونکہ اعتبار نے کافی ترقی نہیں کی تھی) کا اضافہ ہی قیمتوں کے اضافے کا اصلی سبب تھا۔[1] چونکہ روپے کی حیثیت چاندی پر چھپے ہوئے نوٹ سے

[1] ۔ مسز ویرا آنسٹی کا یہ خیال ہے کہ بیرونی قیمتوں کے مقابلے میں ہندوستانی قیمتوں میں زیادہ

زیادہ نہ تھی اور وہ سونے سے بھی بدل پذیر نہیں تھا، اس لئے غیر نفذ پذیر زر کاغذی ہی کی طرح باآسانی زیادہ مقدار میں جاری کیا جا سکتا تھا۔ حکومت جس کی صوابدید پر روپے کی سربراہی کا انحصار تھا روپے کے اجرا کا اجارہ رکھتی تھی۔ روپیوں کی ضرورت حقیقت میں نہ ہونے کے باوجود حکومت بالعموم یہ غلط اندازہ لگاتی تھی کہ مزید روپیوں کی ضرورت ہے اور ان کو ڈھالنا شروع کر دیتی تھی چنانچہ بعض موقعوں پر مثلاً ۱۹۰۵ء-۱۹۰۷ء میں غلط اندازے کی بنا پر روپے ضرورت سے زیادہ ڈھالے گئے۔ اس واقع کو جے ام کینس نے بھی علی الاعلان تسلیم کیا ہے۔ جے ام کینس جو ہندوستان میں معیار مبادلۂ طلا کے نہایت سرگرم حامیوں میں تھے اپنی کتاب "ہندوستانی زر اور مالیات" میں حسب ذیل عبارت لکھتے ہیں:۔ سکے کثیر مقدار میں ڈھالنے سے متعدد نتائج رونما ہو سکتے ہیں۔ اسبات کو سمجھنے سے ہندوستان کے حکام قاصر رہے۔ وہ بظاہر اس ناموزوں استقرائی استدلال کے زیر اثر تھے کہ چونکہ ۱۹۰۵ء-۱۹۰۷ء میں زر کی طلب بہت زیادہ ہوی تھی، اس لئے ۱۹۰۶ء-۱۹۰۷ء میں بھی طلب زیادہ ہوگی اور جب ۱۹۰۶ء-۱۹۰۷ء میں طلب حقیقتہً زیادہ ہوی تو اس بات کو اور بھی زیادہ ممکن خیال کیا جانے لگا کہ ۱۹۰۷ء-۱۹۰۸ء میں زیادہ زر طلب کیا جائے۔ ان حکام نے اپنی پالسی یہ سمجھکر مرتب کی تھی کہ گویا قوم کرنسی کو اسی طرح مستقل طلب کے ساتھ صرف کرتی ہے جس طرح بعض قومیں "بیر" صرف کرتی ہیں۔

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ۔۔۔ اضافہ ہوا تھا، کیونکہ ۱۹۱۴ء سے پہلے دنیا کی قیمتوں میں جو اضافہ ہوا وہ مصنوعات سے متعلق تھا جن کی قیمتیں کم بڑھی تھیں اور جو صنعتی ملکوں کی پیداوار کے بڑے حصے پر مشتمل تھیں (اور ہندوستان کی درآمد کی فہرست میں اہم حیثیت رکھتی تھیں)۔ اس کے برعکس خوراکی اجناس اور خام اشیا کی قیمتوں میں بہت سریع اضافہ ہوا تھا اور یہ قیمتیں ہندوستانی پیداوار (خاصکر ہندوستانی برآمدی اشیا) کے بڑے حصے پر مشتمل تھیں۔ دیکھو وی آنسٹی کی کتاب۔ The Ecnomic Devolopment of India) صفحہ ۲۵۰۔ لیکن مذکورۂ بالا وجہ سے جو فصل (۷) میں پیش کئے جا چکے ہیں ہم کرنسی کی مقدار کے اضافے ہی کو اصل سبب خیال کر سکتے ہیں۔

۵۔ دیکھو صفحہ ۱۳۴۔

اس خیال کو کہ زیادہ تر کثیر مقدار میں سکہ سازی ہی قیمتوں کے اضافے کی ذمہ دار تھی ۱۹۰۶ء میں گوکھلے آنجہانی نے مرکزی مجلس قانون ساز میں حسب ذیل الفاظ میں ظاہر کیا :۔ "ہندوستان میں ۱۸۹۸ء سے پہلے تک کے روپوں کے ذخیرے کا اندازہ ایک خصوصی ماہر مسٹر ہیریسن نے ایک ارب ۳۰ کرور روپے کیا تھا۔ گزشتہ دس سال میں حکومت نے اس ذخیرے میں ایک ارب روپے سے زیادہ کا اضافہ کیا۔ اچانک طور پر اتنی کثیر مقدار کے اضافے سے قیمتوں میں عام اضافہ ہونا یقینی ہے۔ اس وقت غالباً یہی ہو رہا ہے۔ تجارتی اغراض کے لئے حکومت جو کچھ روپے جاری کرتی ہے وہ اندرون ملک ان لوگوں کے پاس چلے جاتے ہیں جن سے سامان خریدا جاتا ہے۔ لیکن یہ روپے جلد تجارتی مرکزوں یا بنکوں کو واپس نہیں ہوتے اور اس طرح جس کاروبار کے لئے پرانے روپے کافی ہو سکتے تھے نئے روپے حاصل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس اثناء میں روپیوں کا گلانا موقوف ہو جانے سے (کیونکہ ۱۸۹۳ء سے جبکہ ٹکسالیں آزاد سکہ سازی کے لئے بند کر دی گئی تھیں روپے کی قدر مبادلہ مصنوعی طور پر بڑھا کر مقرر کی گئی تھی جس کی وجہ سے روپیہ بلحاظ نوعیت زر وضعی ہو کر رہ گیا تھا) ہر زائد اجرا کرنسی کی مقدار میں خالص اضافہ کرتا ہے"۔

مسٹر دت یہ استدلال کرتے ہیں کہ روپے کی افراط نہیں تھی۔ کیونکہ فلزی کرنسی کے مقابلے میں کاروبار کی مقدار بہت بڑھی ہوئی تھی۔ لیکن اگر کاروبار میں زیادہ تیزی سے ترقی ہوئی تھی تو یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ آخر قیمتوں میں کیوں اضافہ ہوا۔
اس کے علاوہ کاروبار کی توسیع کا اندازہ کرنے میں مسٹر دت ایک بہت بڑی غلطی ۴۰۷
کرتے ہیں اور وہ یہ کہ تجارت کے سلسلے میں منتقلہ مال کی مادی مقداروں کو لینے کے بجائے وہ ان کی قدر بحوالۂ زر (مفرط کرنسی) کو لیتے ہیں جس کی وجہ سے قیمتوں کا فیصد اضافہ ناواجبی طور پر زیادہ ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح مسٹر دت ایک طرف کاروبار کی ترقی کے اندازے میں مبالغے سے کام لیتے ہیں تو دوسری طرف کرنسی کی مقدار کے اضافے کا حقیقت سے کم اندازہ کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ چالو ساورن، نصف ساورن اور چاندی کے چھوٹے سکوں کو محسوب ہی نہیں کرتے[1]۔

لہ۔ دیکھو چھبلانی کی کتاب محولہ بالا صفحہ ۶۲۔

اس مسئلے پر پروفیسر وکیل اور مورنجن کی بحث کے نتائج ذیل میں درج کئے گئے ہیں:۔

سنہ ۱۸۹۹ء تا سنہ ۱۹۱۳ء کا دور

سنہ ۱۸۹۹ء-۱۹۱۳ء چالو کرنسی میں اضافہ	سنہ ۱۸۹۹ء-۱۹۱۳ء قیمتوں میں اضافہ	سنہ ۱۸۹۹ء-۱۹۰۳ء تا سنہ ۱۹۰۱ء-۱۹۱۳ء اشیا میں اضافہ
۹۸،۸ فیصد	۵۰،۴ فیصد	۴۲،۶ فیصد

یہ مصنف ان اعداد سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اگر یہ فرض کیا جائے کہ اس زمانے میں قیمتوں میں تقریباً ۲۵ فیصد اضافہ ہوا تو سنہ ۱۸۹۹ء سے سنہ ۱۹۱۳ء تک کرنسی میں جو مجموعی اضافہ کیا گیا اس کے کم از کم ایک چوتھائی حصے کو لازمی طور پر ضرورت سے زیادہ خیال کرنا چاہیے۔[1]

قیمتوں کے عام اشاری اعداد کی اس مجموعی تخمینی مقدار سے نمایاں مطابقت رکھتے ہیں جو سنہ ۱۹۰۳ء اور سنہ ۱۹۰۷ء کے درمیان کے سالوں میں تھی، جیسا کہ مندرجۂ ذیل جدول سے معلوم ہوتا ہے:۔

سال	قیمتوں کے عام اشاری اعداد	ہر سال یکم اپریل کو کرنسی کی مجموعی تخمینی مقدار	سال	قیمتوں کے عام اشاری اعداد	ہر سال یکم اپریل کو کرنسی کی مجموعی تخمینی مقدار
سنہ ۱۹۰۳ء	۱۰۰	۱۰۰	سنہ ۱۹۰۶ء	۱۳۱	۱۲۷
سنہ ۱۹۰۴ء	۱۰۲	۱۱۰	سنہ ۱۹۰۷ء	۱۴۰	۱۳۶
سنہ ۱۹۰۵ء	۱۱۲	۱۱۵			(یکم دسمبر)

[1] دیکھو وکیل اور مورنجن کی کتاب (Currency and Prices in Indlia) صفحہ ۳۳۳۔

لیکن مسٹر دت کا یہ خیال ہے کہ یہ مطابقت بالکل اتفاقی ہے وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ۱۸۷۴ء-۷۵ء تا ۱۸۹۲ء-۹۳ء کے مقابلے میں ۱۸۹۲ء-۹۳ء تا ۱۹۱۱ء-۱۲ء میں سکوں کی ڈھلائی کا خالص اوسط بہت کم تھا۔ لیکن وہ اس امر کو فراموش کر دیتے ہیں کہ موخر الذکر زمانے میں سکے بہت بڑی تعداد میں گلائے گئے اور کرنسی میں سالانہ خالص ۴۰۸
اضافہ نہیں ہوا۔ اس کے برخلاف اول الذکر زمانے میں سکوں کا گلانا موقوف رہا جس کی ایک وجہ دوسرے اسباب کے منجملہ یہ تھی کہ ٹکسالیں آزاد سکہ سازی کے لئے بند کر دی گئی تھیں۔ اسی لئے ہر نیا سکہ جو ڈھالا گیا روپوں کے موجودہ ذخیرے میں قطعی طور پر اضافہ کرتا گیا۔ اس کے علاوہ ۱۸۹۳ء سے پہلے تک روپے کی قدر کا انحصار چاندی کی قیمت پر تھا اور چاندی کی قیمت کا انحصار اس کی رسد کے تغیرات پر تھا (اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس کی طلب یکساں تھی)۔ ہر سال چاندی کی درآمد سے اس کی رسد میں جو اضافہ ہوا وہ ملک کے موجودہ مجموعی ذخیرے کے مقابلے میں اسقدر تھوڑا تھا کہ وہ فلز کی قیمت اور روپے کی قدر میں کوئی نمایاں تغیر نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن ۱۸۹۳ء کے بعد روپے کی قدر کو معین کرنے والا اہم عنصر روپوں (نہ کہ چاندی) کی وہ مقدار رہا جو کسی مقررہ وقت موجود ہوتی تھی اور چونکہ سالانہ سکہ سازی کی وجہ سے چالو روپوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو جاتا تھا اس لئے روپے کے حوالے سے قیمتوں پر نمایاں اثر پڑتا تھا[1]۔

مسٹر دت کا یہ استدلال ہے کہ اگر روپوں کی تعداد کسی طویل مدت تک ضرورت سے زائد رہتی تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ سونے کی برآمد شروع ہو جاتی اور شرح مبادلہ مسلسل گرتی رہتی اور اس نتیجے کے رونما ہونے سے نظریۂ افراط زر غلط ثابت ہوتا ہے۔ لیکن مسٹر دت کا یہ خیال غلط ہے کہ اعلیٰ قیمتیں مبادلے پر مذکورۂ بالا اثر ڈال سکتی ہیں اور وہ بھی اس صورت میں جبکہ اعلیٰ قیمتیں کرنسی کی افراط کا نتیجہ ہوں۔ سچ پوچھو تو جہانتک ان کے اعتراض کے صحیح ہونے کا تعلق ہے، وہ نہ صرف قیمتوں کے اضافے کے کسی خاص مبینہ سبب کی تردید کی حد تک صحیح ہے بلکہ اس سے اس بیان کی بھی

---

[1] دیکھو جھلانی کی کتاب محولۂ بالا ص ۶۷ تا ص ۶۸۔

تردید ہوتی ہے کہ عالمی قیمتوں سے ہندوستانی قیمتیں زیادہ بڑھتی ہوئی تھیں لیکن فی نفسہ اس واقعے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ایک لحاظ سے خود سٹروت کی تحقیق کی علت غائی یہی ہے۔

قیمتیں جنگ کے زمانے میں اور اس کے بعد

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ جنگ سے پہلے قیمتوں میں بڑھنے کا میلان رہا۔ اب جنگ کے پیدا کئے ہوئے حالات کی وجہ سے ۲۰-۱۹۱۶ء میں اور خاصکر اس دور کے آخری حصے میں یہ میلان غیر معمولی شدت کے ساتھ رونما ہوا۔ لیکن ہندوستان میں قیمتوں میں جو اضافہ ہوا وہ دوسرے ملکوں خاصکر جنگ میں راست حصہ لینے والے ملکوں کے مقابلے میں کم تھا جیسا کہ صفحہ ۷۰۹ پر مندرجہ جدول سے معلوم ہوگا۔

بیرونی ممالک میں قیمتوں کے زیادہ بڑھنے کی روک تھام اس طرح کیجا سکتی تھی کہ زیادہ اشیا برآمد کی جاتیں اور کم اشیا درآمد کی جاتیں۔ اس طریقے سے ہندوستان میں جو فلز درآمد ہوتی وہ اندرون ملک قیمتوں کو بڑھا دیتی یہاں تک کہ وہ بیرونی قیمتوں کی سطح کے برابر ہو جاتیں۔ لیکن فلز کی درآمد اور اشیا کی برآمد کی بندشیں اور جنگ کے زمانے میں قیمتوں پر حکومت کی نگرانی اس قسم کی مطابقت پیدا ہونے میں مزاحم ہوئیں۔ اس طرح ہندوستان کے دولت پیدا کرنے والے اعلیٰ قیمتوں کے فوائد سے محروم ہو گئے۔

ہندوستان اور بعض بیرونی ممالک میں تھوک قیمتوں کے انڈکس نمبر ۷۰۹

سال	ہندوستان (کلکتہ) (ا) ۱۹۱۴ء = ۱۰۰	سلطنت متحدہ ۱۹۱۳ء = ۱۰۰ (محکمہ تجارت)	(ب) ریاستہائے متحدہ امریکہ	فرانس ۱۹۱۳ء = ۱۰۰	جاپان ۱۹۱۴ء = ۱۰۰
۱۹۱۳ء	–	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	–

(ا)۔ دیکھو ایک رپورٹ ہندوستان کی تجارت پر تبصرہ برائے ۲۸-۱۹۲۷ء اور ناظم زرکی رپورٹ ۲۸-۱۹۲۷ء گوشوارہ (۱)

(ب)۔ ۱۹۱۳ء = ۱۰۰ ۱۹۲۶ء تک۔ اس کے بعد ۱۹۲۶ء = ۱۰۰

سنہ ۱۹۱۴ء	۱۰۰	۱۰۰	۹۸	۱۰۲	۱۰۰
سنہ ۱۹۱۵ء	۱۱۲	۱۲۶	۱۰۱	۱۴۰	۹۷
سنہ ۱۹۱۶ء	۱۲۸	۱۶۰	۱۲۶	۱۸۸	۱۱۷
سنہ ۱۹۱۷	۱۴۵	۲۰۶	۱۷۷	۲۶۴	۱۴۹
سنہ ۱۹۱۸	۱۷۸	۲۲۶	۱۹۴	۳۳۹	۱۹۶
سنہ ۱۹۱۹ء	۱۹۶	۲۴۲	۲۰۶	۳۵۶	۲۳۶
سنہ ۱۹۲۰ء	۳۰۱	۲۹۵	۲۲۶	۵۰۹	۲۵۹
سنہ ۱۹۲۱	۱۷۸	۱۸۲	۱۴۷	۳۴۵	۲۰۰
سنہ ۱۹۲۲	۱۷۶	۱۵۹	۱۴۹	۳۲۷	۱۹۶
سنہ ۱۹۲۳ء	۱۷۲	۱۵۹	۱۵۴	۴۱۹	۱۹۹
سنہ ۱۹۲۴ء	۱۷۳	۱۶۶	۱۵۰	۴۸۹	۲۰۷
سنہ ۱۹۲۵ء	۱۵۹	۱۵۹	۱۵۹	۵۵۰	۲۰۲
سنہ ۱۹۲۶ء	۱۴۸	۱۴۸	۱۰۰	۷۰۳	۱۷۹
سنہ ۱۹۲۷ء	۱۴۸	۱۴۱	۹۵	۶۱۷	۱۷۰
سنہ ۱۹۲۸ء	۱۴۵	۱۴۰	۹۷	۶۲۰	۱۷۱

دوسرے اسباب کے منجملہ یہی ایک سبب تھا کہ کیوں وہ جنگ کے زمانے کی گرم بازاری کے بعد کی سرد بازاری میں بہت بڑے ذخائر فہیا نہ کرسکے اور مسابقتی سامان درآمد کرنے کے مقابلے میں گھاٹے میں رہے۔ اس کے علاوہ اگر حکومت مداخلت نہ کرتی تو شرح مبادلہ بہت پہلے ہی اور زیادہ تیزی سے بڑھ جاتی اور اس کی وجہ سے اشیا کی درآمد میں اضافہ ہوجاتا اور ان کی قیمت میں مقابلتہً جو زیادہ اضافہ ہوا تھا اس میں کمی ہوجاتی۔ ہندوستان کو اپنی برآمد کردہ اشیا کی بھی اچھی قیمت وصول ہوتی اور وہ جنگ کے بعد کی تعمیر جدید کے مصارف برداشت کرنے کے بھی زیادہ قابل ہوتا لیکن مبادلے میں مداخلت کرنے پر حکومت کو جس چیز نے آمادہ کیا تھا وہ یہ تھی کہ اگر مبادلہ کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تو جنگ کے

بہت ہی نازک زمانے میں تجارت میں سخت خلل واقع ہوتا۔[1]
جنگ کے زمانے میں ہندوستان کی تقریباً جملہ اشیا بہ شمول ضروریات زندگی بہت گراں ہوگئیں۔ جنگ کے آغاز سے ۱۹۱۹ء تک غلے کی قیمتیں اوسطاً ۹۳ فی صد بڑھ گئی تھیں۔ دوسری طرف جہاں تک سوتی اشیا کا تعلق ہے درآمدہ کپڑوں کی قیمتوں میں ۱۹۰ فیصد سے کچھ ہی کم کا اور ہندوستانی کپڑوں کی قیمتوں میں ۶۰ فیصد سے کچھ زیادہ اضافہ ہوا تھا۔ ہم پہلے یہ بیان کر چکے ہیں کہ برآمد کردہ اشیا کے مقابلے ۴۱۰ میں سوتی اشیا، لوہے، فولاد، شکر، رنگ سازی کے سامان جیسی درآمدہ اشیا کی قیمتوں میں عام طور پر زیادہ اضافہ ہوا اور اس فرق کی وجہ بھی بتائی جا چکی ہے۔[2] یورپ کی بڑی قوموں کی جدوجہد کا رخ پیدائش دولت کی بجائے تباہ کاری کی طرف پھر جانے کی وجہ سے تمام دنیا میں ضروریات زندگی کی قلت رونما ہوئی۔ پیدائش دولت کی قلت، شریک جنگ ملکوں میں ہر قسم کی اشیا کی غیر معمولی سابقتی طلب اور اسی کے ساتھ جنگ کے اغراض کے لئے نقد اور اعتبار کا کثیر مقدار میں اجرا یہ سب قیمتوں کے غیر معمولی اضافے کے ذمے دار تھے۔ جلد یا دیر سے ان عالمی حالات کا ردعمل ہندوستان پر بھی ہونا یقینی تھا اور وہ اس طرح ہوا کہ نہ صرف اس کی پیداوار کی طلب بیرونی ممالک میں بڑھ گئی بلکہ اس کی درآمد کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوگیا۔ لیکن جہازوں کی قلت اور حکومت کی نگرانی کے باعث برآمد پر جو بندشیں عائد ہوئیں ان سے ہندوستان میں قیمتوں کے اضافے کا کسی حد تک انسداد ہوگیا۔

کرنسی کی افراط

۱۰۔ یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ جنگ چھڑنے کے کچھ زمانے بعد تک توازن تجارت ہندوستان کے بہت موافق رہا۔ اس کے ساتھ سونے اور چاندی کی درآمد میں بہت کمی ہوگئی جس کی وجہ سے تجارت برآمد کے لئے مالی ذرائع مہیا کرنے کی کل ذمہ داری حکومت پر عائد ہوگئی اور اسی لئے حکومت نے روپیوں اور نوٹوں کی شکل میں زائد کرنسی کثیر مقدار میں جاری کی۔ زائد از ضرورت

---

[1] ۔ دیکھو آنس نے کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۵۰۴ تا ۵۰۸۔

[2] ۔ دیکھو باب (۶) فصل (۵)۔

کرنسی کے اجرا کو ان طریقوں سے بھی تقویت پہنچی جو حکومت نے جنگ کے لئے مالی ذرایع مہیا کرنے کے سلسلے میں اختیار کئے تھے۔ جنگ کے کثیر مصارف کو پورا کرنے کی غرض سے حکومت نے محصول بڑھا کر۔ قرضے حاصل کر کے اور مصنوعی طور پر قوت خرید تخلیق کر کے اپنے واسطے ذرائع ادائی مہیا کئے تھے۔ چونکہ حکومت کو نوٹ کے اجرا کا قطعی اجارہ حاصل تھا اس لئے وہ نقد ذخیرے کا انتظام کئے بغیر کاغذی کرنسی جاری کر کے اپنے لئے براہ راست ادائی کا ذریعہ مہیا کرنے کے قابل ہوگئی۔ حکومت کے جنگی قرضوں کی وجہ سے بھی زر کی مقدار لامحالہ ضرورت سے زیادہ ہوگئی۔ ان قرضوں کا صرف ایک مختصر حصہ عوام کو حقیقی لیں اندازیوں سے حاصل ہوا۔ باقی حصہ بنک کے قرضوں یا مصنوعی امانتوں کی شکل میں تھا جو چک کے ذریعے سے نکالی جاسکتی تھیں اور جن کو بنکوں نے حکومت کی امداد کے لئے خود اپنے حساب میں یا اپنے ان گاہکوں کے حساب میں قائم کیا تھا جو جنگی قرضوں میں رقم مشغول کرنا چاہتے تھے[۱] موازنوں کے مسلسل گھاٹوں کو پورا کرنے کے لئے حکومت ہند نے جو قلیل مدت کی خزانے کی ہنڈیاں جاری کیں وہ بھی زائد از ضرورت زر کے اجرا کا ایک سبب بن گئیں، کیونکہ بنک ان ہنڈیوں اور جنگی بونڈز کی کفالت پر آزادی سے قرض دے رہے تھے۔ اس طرح
۳۱۱ بنک کی امانتوں (قرضوں) اور ان کی گردش کی رفتار میں بہت اضافہ ہوگیا تھا (جیسا کہ بنک کے حسابی گوشواروں سے معلوم ہوتا ہے[۲]) جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوت خرید میں بہت اضافہ ہوگیا اور اسی لئے قیمتیں بڑھ گئیں[۳]

کیونکہ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہندوستان میں قیمتیں زیادہ نہیں بڑھیں اس کے کئی اسباب کے منجملہ ایک سبب یہ تھا کہ ہندوستان میں جو زائد از ضرورت زر جاری کیا گیا تھا اس کی مقدار بحیثیت مجموعی بہت زیادہ ہونے کے باوجود دوسرے ملکوں کے مقابلے میں نسبتہً کم تھی۔ زر کی افراط کے ساتھ ساتھ اس کی گردش کی رفتار بھی

۱۔ دیکھو ہنڈیکر کی کتاب محولہ بالا ص ۳۱۷ تا ص ۳۱۸۔

۲۔ دیکھو باب (۱۰)۔

۳۔ دیکھو فنڈلے شراس کی کتاب محولہ بالا ص ۲۳۲ و ص ۱۰۔۲۱۱۔

بہت تیز ہوگئی تھی جو عوام کے اعتماد کے متزلزل ہو جانے کا نہ صرف ثبوت بلکہ سبب بھی تھی چنانچہ جرمنی اور روس میں ایسا ہی ہوا۔ لیکن ہندوستان میں یہ صورت حال بہت ہی چھوٹے پیمانے پر رونما ہوئی [1]

گرانی کے دوسرے اور بھی اسباب تھے۔ چنانچہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ جنگ کے زمانے میں ریلوے کا نظام ٹوٹ گیا تھا اور ریل کے ڈبوں اور انجنوں کا توڑا پڑ گیا تھا۔ اس صورت حال نے سامان کی نقل و حمل میں مشکلات پیدا کر دیں اور اس طرح مقامی قلت کو شدید بنا دیا جس کا ضمنی نتیجہ یہ ہوا کہ نفع کمانے والوں کو سنہری موقع ہاتھ آیا۔ اس کے علاوہ ۱۹۱۸ء-۱۹ء میں ہندوستان میں بارش عام طور پر کم ہوئی جس کی وجہ سے اشیائے خورد و نوش کی سخت قلت ہو گئی۔ ۱۹۲۰ء کے آخری حصے میں بھی بارش کم ہوئی جس سے اسی طرح کے نتائج رونما ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں قیمتیں انتہائی طور پر بڑھ گئیں اور کلکتہ کا اشاری عدد ۱۹۱۴ء کے ۱۰۰ کے مقابلے میں ۲۰۱ ہو گیا۔

ہندوستانی قیمتوں کو کم کرنے میں اشلنگ ۴ پنس کی شرح کا کیا اثر پڑا اس پر تفصیل کے ساتھ بحث کی جا چکی ہے۔ اب اس سلسلے میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۱۔ قیمتوں کے اضافے کے اثرات

قیمتوں کی تحقیقاتی کمیٹی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان میں جنگ سے پہلے قیمتوں میں جو اضافہ ہوا اس سے بحیثیت مجموعی تمام ملک کو فائدہ پہنچا۔ کمیٹی کی رپورٹ (۱۹۱۴ء) سے متعلق اپنی قرارداد میں حکومت نے اس وقت اس خیال سے اتفاق کیا۔ کمیٹی کا یہ استدلال تھا کہ ہندوستان ایک دین دار ملک ہے اور اس کے ذمے بیرونی ممالک کی کثیر رقوم واجب الادا رہتی ہیں جن کو وہ اپنی پیداوار کا ایک حصہ برآمد کر کے ادا کرتا ہے اس لئے اس پیداوار کی قیمت زیادہ ہو تو اس کا فائدہ ہے کیوں کہ اس صورت میں وہ اپنے ذمے کے بیرونی مطالبات کو اشیا کی نسبتہً کم مقدار برآمد کر کے پورا کر سکتا ہے۔ لیکن برآمد کردہ اشیا کی اعلیٰ قیمتوں کے مقابلے میں درآمدہ اشیا کی

---

[1] دیکھو ڈی۔ ٹی۔ جیک کی کتاب (Restoration of European Currencies

بڑھی ہوئی قیمتوں اور مصارف پیدائش کی زیادتی کو بھی شمار کرنا پڑے گا۔ بہر صورت یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ بڑھی ہوی قیمتیں خاصکر جبکہ وہ زر کی افراط کا نتیجہ ہوں ملک کو بحیثیت مجموعی کوئی مستقل فائدہ پہنچا سکتی ہیں اور یہ فائدہ اتنا بڑا ہو سکتا ہے کہ افراط زر کے نقصانات کی تلافی کر سکے۔ آنریبل جی' وی' جوشی آنجہانی نے اس معاملے کے متعلق صائب رائے ظاہر کی تھی جب انھوں نے یہ کہا تھا کہ "دولت اور خوشحالی کی حقیقی فراوانی قوموں کو اسی طرح نصیب ہوتی ہے جس طرح افراد کو لیکن یہ روپوں کو اندھا دہند جوڑنے یا قیمتوں کے اضافے (جو ہندوستان میں تقریباً ہمیشہ فصلوں کی خرابی اور قحط ۴۱۲
کے زمانے میں ہوتا ہے) سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ ایک طرف صنعتی جدوجہد، محنت اور کارکردگی سے تو دوسری طرف اصل سے روزافزوں نفع آور طریقے سے کام لینے سے۔"[1] بڑھتی ہوئی قیمتیں پیداآور جدوجہد کو یقیناً فروغ دیتی ہیں۔ لیکن اس عمل کا تدریجی ہونا ضروری ہے اور عمل کے تدریجی ہونے کا حال صرف اس طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ بڑھی ہوی خوشحالی کا آزاد ثبوت ملے۔ یہ خیال کرنا خطرناک ہے کہ اگر قیمتیں بڑھ رہی ہیں تو یہ خود اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ قوم کی خوشحالی ترقی کر رہی ہے، اگر ایسا ہوتا تو زر کی افراط کے ذریعے ارادی طور پر قیمتوں کی سطح بڑھا کر مادی ترقی آسانی سے اور موثر طریقے پر حاصل کی جا سکتی۔ مسز وی' آنسٹے نے اپنی کتاب موسوم بہ "ہندوستان کی معاشی ترقی"[2] کے ایک دلچسپ اور غور طلب باب میں جنگ سے پہلے اور جنگ کے بعد کے زمانے میں ہندوستان کی قیمتوں اور اجرتوں کے تغیرات سے قومی خوشحالی کے متعلق چند نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنفہ کا استدلال یہ ہے کہ اس طریقے سے حاصل شدہ نتائج ان نتائج سے زیادہ قابل اعتماد ہیں جو مختلف تاریخوں کے فی کس آمدنی کے غیر یقینی اندازوں پر مبنی ہیں جن کا ذکر ہم باب (۴) میں کر چکے ہیں۔ لیکن یہ واضح رہنا چاہئے کہ محض قیمتوں کے تغیرات کے دیکھنے سے اس بات کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ آیا پیدائش دولت کے نقطۂ نظر سے کوئی ترقی

[1] دیکھو جی' وی' جوشی کی کتاب (Speeches and Writings) صفحہ ۶۱۰۔
[2] صفحہ ۴۴۵ اور آگے کے صفحات۔

ہوئی ہے یا تنزل۔ اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیمتوں کی سطح میں کوئی کمی بیشی
ہونے سے آبادی کے مختلف طبقوں میں دولت کی تقسیم کس طریقے سے متاثر ہوئی ہے۔ اس کے
علاوہ قیمتوں کی کمی بیشی سے بحیثیت مجموعی قوم کو جو نفع یا نقصان پہنچتا ہے اس کے
متعلق اس کے اخذ کردہ نتائج چند مفروضات پر مبنی ہیں جن کے مطابق یہ طے کرلیا جاتا
ہے کہ آبادی کے طبقوں کے مفاد کو زیادہ اہمیت دینی چاہئے۔ مثلاً یہ خیال ظاہر کیا گیا
ہے کہ "ہندوستان کے باشندوں کا بڑا حصہ ان جماعتوں سے تعلق رکھتا ہے جو قیمتوں
کے اضافے سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور یہ کہ بحیثیت مجموعی دین دار جماعتیں زیادہ مستحق
ہیں، یہاں تک کہ اگر وہ لین دار جماعتوں کے نقصان سے فائدہ اٹھاتی ہیں تو یہ کوئی
قابل افسوس امر نہیں ہے کیونکہ لین دار جماعتیں زیادہ تر ایسے قرض دہندوں پر مشتمل
ہوتی ہیں ہیں جو محض دوسروں کا خون چوستے ہیں۔ لیکن امتیاز سے کام لیکر سوسائٹی
کے بعض طبقوں کو مستحق اور دوسروں کو غیر مستحق قرار دینا غیر مستحسن حرکت ہے۔ دراصل
قومی ترقی کے یہ معنی ہیں کہ تمام طبقے مجموعی طور پر خوشحال ہوں نہ کہ چند طبقے باقی طبقوں
کے نقصان سے خوشحالی حاصل کریں۔ اس کے علاوہ پیچیدگی پیدا کرنے والی
۷۱۳ ایک اور چیز یہ ہے کہ اکثر لوگ ایک ہی وقت میں دین دار بھی ہوتے ہیں اور لین دار
بھی۔ یہ بھی نامناسب معلوم ہوتا ہے کہ تمام کی تمام قرض دہندہ جماعت کو قابل الزام
ٹھیرایا جائے۔ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ کس طرح قرض دہندہ موجودہ زمانے میں دیہی
برادری کا ایک ناگزیر رکن ہے اور اگر کسی عام سبب سے اس کو نقصان پہنچے تو اس کا
مضر اثر کاشتکار پر بھی پڑ سکتا ہے جس کی ضرورتوں کو قرضدہندہ پورا کرتا ہے۔ یہ خیال
کرنے کی معقول وجہ ہے کہ جنگ سے پہلے بحیثیت مجموعی ۱۹۰۰ء اور ۱۹۱۴ء کے
درمیان ہندوستان میں معاشی ترقی مسلسل ہوتی رہی اگرچہ اس کی رفتار دھیمی تھی۔ لیکن ہمارا
یہ استدلال ہے کہ تنہا قیمتوں کے اعداد و شمار سے ایسا کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا۔
مسز آنسٹے کا یہ خیال ہے کہ جنگ سے پہلے تک قیمتوں میں جو تغیرات ہوئے
وہ ایسی نوعیت کے تھے کہ ان سے کم از کم ہندوستان کے کاشتکاروں کی بڑی جماعت
کو یقیناً فائدہ پہنچا۔ کیونکہ برآمدی اشیا جو کاشتکار نے فروخت کیں ان کی قیمتوں کا اضافہ
مثلاً جوٹ (۳۴ فیصد)، چمڑے اور کھالیں (۵۹ فیصد)، روغندار تخم (۴۵ فی صد)

خوراکی غلہ (۴۲ فیصد) ان درآمدی اشیا کی قیمتوں کے مقابلے میں جو کاشتکار نے خریدیں مثلاً سوتی مصنوعات (۲۵ فیصد)، فلزات (۲۰ فیصد)، شکر (۹ فیصد)، مٹی کا تیل (کوئی تبدیلی نہیں ہوئی)، نمک (جس کی قیمت بلالحاظ محصول کی کمی کے ۳۰ فیصد کم ہوگئی) نمایاں طور پر زیادہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ قیمتوں میں اس نوعیت کا اضافی تغیر ایسے حالات پیدا کرتا ہے جن کے تحت کاشتکار فائدہ حاصل کرسکتا ہے لیکن اس کا یقین نہیں ہوسکتا کہ کاشتکار ہمیشہ ان مواقع سے فائدہ اٹھائے گا مثلاً یہ ہوسکتا ہے کہ کاشتکار کے منافع میں بہت سے دوسرے اغراض بھی شریک ہوجائیں۔ اس لئے قبل اس کے کہ ہم اس امر کو قطعی طور پر تسلیم کریں کہ کاشتکار کو فائدہ ہوا ہے یہ ثابت کرنے کی خاص طور پر ضرورت ہے کہ اس کے فائدے میں دوسرے لوگ زیادہ شریک نہیں ہوئے ہیں۔

جنگ عظیم کے زمانے میں برآمدی اشیا کے مقابلے میں درآمدی اشیا کی قیمتوں میں زیادہ اضافہ ہوا۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاشتکار کی آمدنی کے مقابلے میں اس کا خرچ بڑھ گیا اور یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ اسی وجہ سے زرعی طبقے بری طرح متاثر ہوئے۔ اس طرح یہ واقعہ اس عام نظریئے کی تردید کرتا ہے کہ قیمتوں کے اضافے سے ہندوستان کے باشندوں کی اکثریت کو لازمی طور پر فائدہ پہنچے گا۔ ڈاکٹر مان نے جن کی تحقیقات کے نتائج کو مختصر طور پر ذیل میں بیان کیا گیا ہے، حقیقت میں یہ ثابت کیا ہے کہ قیمتوں کے اضافے کے نتائج قطعی طور پر نقصان رساں ہوسکتے ہیں۔ (دیکھو فصل ۱۴ اسی باب میں)۔ زر کے عدم استحکام کی وجہ سے منافع منصوبہ اور توقع کے مطابق نہیں ملتا اور سکون اور اطمینان کی وہ فضا باقی نہیں رہتی جو اعتماد اور یقین کے ساتھ معاشی جد وجہد میں حصہ لینے کے لئے ضروری ہے۔ ان عام اسباب کی بناء پر ان تمام کوششوں کو بدگمانی کی نظر سے دیکھنا چاہیئے جو یہ ثابت کرنے کے لئے کی جائیں کہ قیمتوں کے عظیم تغیرات خواہ کسی سمت میں ہوں بحیثیت مجموعی ملک کے حق میں مفید ہیں۔

جہاں تک کہ قوم کے خاص خاص طبقوں کو قیمتوں کے تغیرات سے عارضی
فائدہ یا نقصان پہنچنے کا تعلق ہے، شرح مبادلہ کی بحث کے سلسلے میں اس مسئلے کے ۴۱۴

ایک حصے کا تذکرہ کیا جاچکا ہے۔ اس وقت ہمیں یہ بیان کرنے کا موقع ملا تھا کہ کس طرح مختلف جماعتیں قیمتوں کے گرنے سے متاثر ہوتی ہیں اور استخراجاً یہ بھی بیان کردیا گیا تھا کہ ان جماعتوں پر قیمتوں کے اضافے سے کیا اثرات پڑتے ہیں۔ قیمتوں کے بڑھنے سے جو عارضی نفع اور نقصان ہوتا ہے ان کا اندازہ کرنے کے لئے صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ ان اصولوں کو الٹ دیا جائے جو قیمتوں کی کمی کے سلسلے میں پیش کئے گئے تھے۔

لیکن حال میں ہندوستان میں قیمتوں میں جو مدوجزر ہوا ہے ان کے نتائج کو زیادہ واضح طور پر بیان کرنا اور یہ دیکھنا کہ کس طرح آبادی کے مختلف طبقے اس مدوجزر سے متاثر ہورہے ہیں سبق آموز ہوگا۔

۱۲ کاشتکاروں پر اثرات

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر زرعی پیداوار کی قیمت بڑھے تو اس سے زمیندار اور دیہات کے باشندوں کو عام طور پر فائدہ ہونا ضروری ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ صرف وہی لوگ نفع حاصل کریں گے جن کے پاس زائد ضرورت پیداوار بغرض فروخت موجود ہو اور وہ بھی صرف اس صورت میں جبکہ ان اشیا کی قیمت میں جو انھیں خریدنا ہیں اسی تناسب سے اضافہ نہ ہوا ہو جتنا کہ ان کی فروخت شدنی اشیا کی قیمت میں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ اوپر تذکرہ کیا جاچکا ہے ہندوستان کے کاشتکاروں کے نفع میں بہت بڑی حد تک درمیانی اشخاص کا ایک انبوہ کثیر شریک ہوجاتا ہے اور اسی وجہ سے اعلیٰ قیمتیں کاشتکاری کی معاشی حالت کی درستی کی شکل میں کوئی نتیجہ نہیں پیدا کرسکتیں۔ ہمیں اس واقعے کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ جہاں کاشتکار خود اپنی زمینوں پر یا طویل پٹے پر لی ہوئی زمینوں پر اپنی ذاتی محنت سے زائد از ضرورت پیداوار اگاکر اعلیٰ قیمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں وہاں یہ بات ان لوگوں کے بارے میں صادق نہیں آتی جو لگان بہ شکل جنس ادا کرتے ہوں یا جنھیں پیشگی رقم اس شرط پر دی گئی ہو کہ اس کی ادائی غلے کی شکل میں کی جائے گی۔ اسی طرح یہ بات ان لوگوں پر بھی صادق نہیں آتی جنھوں نے زمین قلیل مدت کے لئے لگان پر لی ہو یا جنھیں مزدور اجرت پر حاصل کرنے پڑتے ہوں۔ اس کے علاوہ دونوں قسم کے کاشتکاروں کو زائد مصارف پیدائش اور

کپڑا، تیل اور دوسری معیاری اور رسمی ضروریات زندگی کے سامان کی اصلی قیمتوں کو محسوب کرنا پڑتا ہے۔

۱۳ دیہی مزدور

یہ بات تقریباً کلیے کے طور پر مانی جاتی ہے کہ قیمتوں کے تغیرات کے مقابلے میں اجرتوں کے تغیرات پیچھے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب قیمتیں بڑھتی ہیں تو یہ ضروری ہے کہ اجرت کمانے والے قلیل یا طویل مدت تک تکلیف برداشت کریں۔ اس سلسلے میں یہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ ہندوستان کے اکثر ٹٹ پونجیے چھوٹے کاشتکار مزدوری بھی کیا کرتے ہیں۔ لیکن بقول مسٹر دت جنگ سے پہلے چلر قیمتوں کے مقابلے میں دیہی مزدوروں (زرعی مزدوروں اور دیہی دستکاروں) کی اجرتوں میں زیادہ تیزی سے اضافہ ہوا اور سب سے زیادہ اضافہ دیہات میں ہوا جہاں ان جماعتوں کی اجرت صحیحہ میں ۸۰ فیصد اضافہ ہوا[1]۔ اسی طرح جنگ کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی دیہی اجرتیں تدریجی طور پر قیمتوں کے مطابق ہوگئی تھیں مگر یہ صورت عدم مطابقت کے زمانے کی انتہائی تکالیف ۴۱۵
کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ اس پورے زیر تنقید زمانے (۱۹۲۱ء-۲۲ء) میں غیر ماہر زرعی مزدوروں کو اتنی اعلیٰ اجرتیں مل رہی تھیں کہ ہندوستان کے بعض حصوں میں کاشتکاروں کو زراعتی کاروبار کے مقابلے میں مزدوری زیادہ قابل اطمینان اور نفع بخش ذریعۂ معاش معلوم ہوئی۔ ۱۹۲۱ء کے بعد سے قیمتوں میں جو کمی ہوئی اس کی وجہ سے بھی دیہی مزدور کی اجرت صحیحہ میں مزید اضافہ ہوا[2]۔

لیکن ۱۹۲۶ء سے خاصکر دیہی علاقوں میں اجرتوں کی کمی کا میلان نمایاں ہوگیا ہے۔ معاشی کساد بازاری کے زمانے (۱۹۲۹ء-۳۳ء) میں یہ میلان بہت قوی ہوگیا۔ چنانچہ ان سالوں میں دیہی اجرتوں میں بہت کمی ہوگئی۔ البتہ خوراکی اجناس اور دوسری ضروریات زندگی کی ارزانی کی وجہ سے اجرت کی کمی کا مضر اثر نہیں پڑا۔ (دیکھو فصل ۲۰)۔

---

[1]۔ کے، ال، دت کی کتاب محولہ بالا صفحہ ۱۶۹۔

[2]۔ دیکھو ایک رپورٹ "ہندوستان ۱۹۲۱ء-۲۲ء میں" صفحہ ۱۰۳۔

۱۴ بڑھی ہوئی قیمتوں کے اثرات عام دیہی خوشحالی پر

عام دیہی خوشحالی پر بڑھی ہوئی قیمتوں کے جو اثرات پڑ سکتے ہیں ان کی حد تک ڈاکٹر مان کے اخذ کئے ہوئے نتائج اسقدر سبق آموز ہیں کہ ہم معذرت کے بغیر ان کے خلاصے کو نقل کرتے ہیں۔

(۱)۔ (ل) اجرتوں میں متناسب اضافے کے بغیر قیمتوں میں ۵۰ فیصد اضافہ ہو تو اس سے ان لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے جن کے پاس اتنی زمین ہو کہ اس پر اپنی ذاتی محنت سے کاروبار کر کے اطمینان بخش حالت میں زندگی کر سکیں۔ (ب) سب سے زیادہ فائدہ اس شخص کو ہوگا جو زمین کا مالک ہونے کے باوجود خود کاشت کرنے کے بجائے مزدوروں سے کام لے (ج) جہاں گذر بسر کا انحصار ایک طرف اس آمدنی پر ہو جو مزدوری کر کے حاصل کی جائے تو ایسی حالت میں کوئی قطعی فیصلہ اس تناسب پر منحصر ہوگا جو خود کاشت زمیں کی آمدنی اور ذاتی محنت کی آمدنی کے درمیان پایا جائے۔ (د) لیکن دیہی آبادی پر عام طور پر نقصان رساں اثر پڑیگا اور گاؤں سے تعلق رکھنے والے خاندانوں کے موازنوں کا گھاٹہ بہت بڑھ جائے گا

(۲) اگر قیمتوں کے ساتھ ساتھ اجرتوں میں بھی ۵۰ فیصد اضافہ ہو تو جماعت (ل) سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو اور بھی زیادہ فائدہ ہوگا۔ (ب) خود کاشت نہ کرنے والے مالک زمین پر کوئی اثر نہیں پڑے گا بجز اس صورت کے جبکہ اس کے ذمے بھاری قرضہ ہو۔ جماعت (ج) کے لوگوں کی حالت اور بھی بہتر ہوجائے گی اور یہ بہتری قیمتوں کے اضافے کے تناسب سے کسی حد تک زیادہ ہوگی۔ (د) دیہی آبادی پر عام اثر یہ پڑے گا کہ ان کی معاشی حالت کمزور ہوجائے گی۔

(۳) خواہ اجرتوں میں اضافہ ہو یا نہ ہو قیمتوں کے اضافے سے بظاہر نتائج رونما ہوں گے۔ (ل) مستطیع اور غیر مستطیع دیہاتیوں کے درمیان فرق زیادہ نمایاں ہوجائے گا۔ چنانچہ جو لوگ پہلے سے خوشحال تھے ان میں کے اکثر اور زیادہ مستطیع ہوجائیں گے اور اس کے برعکس غیر مستطیع گروہ کی حالت اور بھی ابتر ہوجائے گی (ب) دوسری طرف چونکہ سود کی شرح جو ہندوستان میں ہمیشہ اعلیٰ رہتی ہے۔

۴۱۶ قیمتوں کے اضافے کے ساتھ نہیں بڑھتی، اس لئے وہ لوگ جنھوں نے سابق میں

بھاری قرضہ لیا تھا دوسروں کے مقابلے میں نسبتہً کم نقصان اٹھائیں گے۔
بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ قیمتوں کا اضافہ ہندوستان میں تمام دیہی آبادی کے معاشی اختلافات کو وسیع کرنے کا میلان رکھتا ہے۔ چنانچہ خوشحال لوگ زیادہ خوشحال اور غریب لوگ زیادہ غریب ہو جائیں گے۔

یہ صحیح ہے کہ مذکورۂ بالا نتائج عام کلیہ اور باقاعدہ علمی تعمیمات ہونے کا ادعا نہیں کرتے۔ ان کا مقصد محض یہ بتلانا ہے کہ ایسے حالات کے تحت جیسے کہ دیہات میں پائے جاتے ہیں اور جو ۱۹۱۷ء کے لگ بھگ ڈاکٹر مان کی تحقیق کا موضوع تھے قیمتوں کے متفرہ اضافے کے کیا ممکنہ اثرات ہوتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے قیمتوں کے اضافے کے معنی لازمی طور پر یہ ہیں کہ اس سے معاشی حالت کمزور ہو جائے گی لیکن ہم یہ بھی دعویٰ نہیں کر سکتے کہ اس سے لازمی طور پر فائدہ پہنچے گا۔ چنانچہ ڈاکٹر مان کی تحقیق میں بھی یہی توجہ دلائی گئی ہے۔

۱۵۔ لگان وصول کرنیوالوں پر اثرات

جہاں تک نقد لگان پر قیمتوں کے اضافے کے اثرات کا تعلق ہے محفوظ یا مراعات یافتہ اور غیر محفوظ اسامیوں کے حلقوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔ اول الذکر صورت میں جس کی مثال دخیلکار کاشتکاروں کا طبقہ ہے قدرتی طور پر لگان میں نسبتاً کم اضافہ ہوگا۔ اس کے برخلاف دوسری صورت میں ممکن ہے کہ لگان میں بہت زیادہ اضافہ ہو[1]

۱۶ صنعت پر اثرات

(و) دستکاری۔ ہم اس بات کا پہلے تذکرہ کر چکے ہیں کہ مشینوں کے بنے ہوئے سامان کی مسابقت کی وجہ سے ملکی دستکاروں کی معاشی حالت ابتر ہے۔ اگر قیمتوں کے اضافے کا کچھ اثر ہوا تو یہ کہ اس مسابقت میں اور زیادہ شدت پیدا ہو گئی اور دستکاروں کی حالت پہلے سے

[1]۔ یہ بیان کر دینا مناسب ہوگا کہ زرعی مزدوروں اور اسامیوں کی طرف سے حال میں جو آئینی مداخلت کی گئی ہے اس کے قطع نظر بھی خود ان طبقوں نے حالیہ سالوں میں "اسامی سبھائیں" اور "کسان سبھائیں" قائم کر کے اپنے لئے اجتماعی طور پر معاملات طے کرنے کی سہولتیں حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

زیادہ کمزور ہو گئی۔

(ب) سرمایہ دار صناع سرمایہ دار صناعوں کی حالت اور بھی زیادہ پیچیدہ ہے کیونکہ عام طور پر دیکھا جائے تو قیمتوں کے اضافے کا فوری اثر یہ نہیں ہوتا کہ بہ شمول اجرت تمام مصارف پیدائش میں متناسب اضافہ ہو۔ اسی وجہ سے بادی النظر میں اس طبقے کو کم از کم شروع میں لازماً فائدہ ہوگا۔ لیکن جیسا کہ آگے چلکر تشریح کیجائیگی مشینوں کی صنعتوں میں اکثر صورتوں میں مزدوروں کی بڑھی ہوئی اجرتیں قیمتوں کے اضافے سے زیادہ تھیں۔ سنہ ۱۹۲۰ء سے قیمتوں کے گرجانے کی وجہ سے کارخانے کے مزدوروں کی اجرت صحیحہ اور بھی بڑھ گئی ہے اور چونکہ کارکردگی میں ابتک متناسب اضافہ نہیں ہوا ہے، اس لئے اجرتوں کی ادائی کی حد تک بحیثیت مجموعی صناعوں نے نقصان اٹھایا اس میں شک نہیں کہ جنگ کے زمانے میں اور زمانۂ بعد از جنگ کے اوائل میں قیمتوں میں جو اضافہ ہوا اس کی وجہ سے صناعوں کو کثیر منافعہ ہوا اور اگر حکومت مداخلت نہ کرتی تو منافعہ اس سے بھی زیادہ وصول ہوتا۔ لیکن یہ منافعہ
۴۱۷ زیادہ تر اس وجہ سے ضائع ہوگیا کہ اس سے محفوظ ذخیروں کو تقویت دینے کی بجائے بے احتیاطی سے اعلیٰ مقسوم تقسیم کئے گئے۔ بظاہر کمپنیوں کے مالکوں کا عمل اس مقولے کے مطابق تھا کہ "کاروبار کو روز افزوں ترقی دو اور نتائج کی پروا نہ کرو" اور وہ اس پالیسی کا خمیازہ آجکل بھگت رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انتہائی پیش بینی اور احتیاط کے باوجود کساد بازاری کے موجودہ دور کی مشکلات سے پوری طرح بچنا محال تھا۔ لیکن پیش بینی کے فقدان نے ان مشکلات کو یقیناً بہت بڑھا دیا ہے۔

۱۷ دیہی علاقوں اور شہروں کے مزدور

زمانہ قبل از جنگ میں جیسا کہ مسٹر کے ال دت نے بتلایا ہے۔ مزدوروں کی مختلف جماعتوں کی اجرت متعارفہ صحیحہ میں اضافہ ہوا۔ البتہ شہروں میں اجرت صحیحہ میں جو اضافہ ہوا وہ دیہی علاقوں کے مقابلے میں کم تھا۔ چنانچہ دیہی علاقوں میں ۸ فیصد اور شہروں میں ۲۸ فیصد اضافہ ہوا۔ جنگ کے زمانے میں اور اس کے بعد صنعتی مزدوروں کی اجرت میں جو تغیرات ہوئے ان کا حال بمبئی کے حالات کے سلسلے میں ہم بیان کرچکے ہیں۔ سنہ ۱۹۱۷ء اور سنہ ۱۹۲۰ء کے درمیان قیمتوں میں سریع اضافہ ہوا اس کے باعث

ملک میں ہر طرف ہڑتالیں ہوئیں اور بعض صورتوں میں روٹی کے لئے بلوے ہوئے اور بازار لوٹ لئے گئے۔ لیکن ۱۹۲۱ء کے بعد نہ صرف اجرتوں کے اضافے بلکہ صرف مصارف زندگی کی تدریجی تخفیف کے باعث صنعتی مزدوروں کی حالت میں قطعی طور پر ترقی رونما ہوئی۔ حالیہ کساد بازاری کے زمانے میں صنعت بری طرح متاثر ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اجرت کمانے والے حلقوں میں ادنیٰ اجرت کے روزگاری اور تکلیف و پریشانی کا دور دورہ رہا لیکن اب (۱۹۳۶ء) کسی قدر اصلاح ہوئی ہے۔

۱۸۔ مقررہ آمدنی پانیوالوں پر اثرات

گرانی سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والے وہ لوگ ہیں جو زر کی شکل میں مقررہ آمدنیاں پاتے ہیں مثلاً پنشن پانے والے اہلکار اور چھوٹی تنخواہ پانے والے سرکاری اور تجارتی کمپنیوں کے ملازم، تمسکات اور حصص کی آمدنی پر گزارہ کرنے والے اور پیشہ ور اشخاص جن کا گذارہ مقررہ محنتانے پر ہے۔ یہ طبقے جن کو مجموعی حیثیت سے "متوسط طبقے" کہا جاتا ہے گرانی کے زمانے میں اس وجہ سے تکلیف اٹھاتے ہیں کہ زر کی شکل میں ان کی آمدنیاں مقررہ ہوتی ہیں اور ان کے مصارف غذا، کپڑے، روشنی، مکان کے کرایے اور خانگی ملازموں کی تنخواہ وغیرہ کے سلسلے میں بہت بڑھ جاتے ہیں۔ ان کی سماجی حیثیت ان کو بعض قسم کے کاموں میں حصہ لینے سے روکتی ہے۔ دوسری طرف جن پیشوں میں جگہ حاصل کرنے کے لئے وہ خود مسابقت کرتے ہیں وہاں طلب کے مقابلے میں رسد بہت زیادہ ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ انھیں ابھی تک یہ نہیں معلوم ہوا ہے کہ تنظیم اور اجتماعی طور پر معاملہ طے کرنے کی اہمیت کیا ہے۔

۱۹۔ تازہ ترین صورت قیمتوں کا گرنا

۱۹۲۰ء میں ہندوستان میں قیمتیں اپنی انتہائی بلند سطح پر پہنچنے کے بعد ۱۹۲۱ء سے گرنا شروع ہوئیں، اور کچھ زمانے تک ہندوستان کے مقابلے میں سلطنت متحدہ میں اس میلان کی رفتار زیادہ تیز رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی روپیے کو ۲ شلنگ سونے کی شرح پر مستحکم کرنے کی پالیسی خطرے میں پڑ گئی۔ ۱۹۲۰ء میں ریورس کونسلوں کی فروخت اور ساتھ ہی کرنسی کی مقدار میں تخفیف کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیمتیں گر گئیں۔ اس کے علاوہ ۲۱-۱۹۲۰ء اور ۲۲-۱۹۲۱ء میں توازن تجارت ہندوستان کے مخالف ہونے کی وجہ سے یہاں سے حقیقت میں سونے کی برآمد ہوئی۔ آخر میں یہ کہ ہندوستان پر عالمی قوتوں کا اثر پڑا جس سے اس امر کی تشریح ہوتی ہے کہ کیوں ۱۹۲۹ء تک ہندوستان، ریاستہائے متحدہ امریکہ اور سلطنت متحدہ میں ایک ساتھ قیمتوں میں نمایاں تخفیف کا سلسلہ جاری رہا۔

(دیکھو صفحہ ۹۰۴ پر مندرجہ جدول)۔ ہندوستانی قیمتوں کو گرانے میں اسٹرلنگ ۱۸ پنس فی روپیہ کی شرح کا جو اثر پڑا اس پر مفصل بحث کیجا چکی ہے۔ اس لئے اس سلسلے میں یہاں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(اکتوبر ۱۹۲۹ء میں) امریکہ میں وال اسٹریٹ کی تباہی کے بعد قیمتوں کے گرنے کی رفتار بہت زیادہ تیز ہوگئی۔[1] چنانچہ صفحہ ۹۱۴ پر مندرجہ جدول میں اس کو واضح کر دیا گیا ہے۔ قیمتوں کا گرنا ایک ایسا واقعہ تھا جس سے مہذب دنیا کا کوئی حصہ نہ بچ سکا۔ مصنوعات کے مقابلے میں خام پیداواروں کی قیمتوں میں زیادہ کمی ہوئی جس کی وجہ سے سلطنت متحدہ جیسے صنعتی ملکوں کے مقابلے میں ہندوستان جیسے زراعتی ملک بہت بری طرح متاثر ہوئے۔ ہندوستان میں قیمتیں کہاں تک گر گئی تھیں اس کا اندازہ ان اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے جو قیمتوں کے اشاری اعداد کے متعلق جدول میں صفحہ ۹۱۴ پر درج ہیں۔ کلکتے کی تھوک قیمتوں کا اشاری عدد جولائی ۱۹۱۴ء میں ۱۰۰ تھا تو ستمبر ۱۹۲۹ء میں بڑھ کر ۱۴۳ ہوگیا۔ ستمبر ۱۹۳۱ء میں جبکہ برطانیہ عظمیٰ نے معیار طلا کو چھوڑا اشاری عدد ۹۱ تھا (یعنی جنگ سے پہلے کی سطح سے بھی کم تھا)۔ روپیہ جس کا الحاق اس وقت اسٹرلنگ سے کیا گیا تھا، اس پر ان فوری اثرات کا ردعمل ہوا جو اسٹرلنگ کے سونے سے علیحدہ ہو جانے سے پیدا ہوئے لہٰذا اسی سال دسمبر میں قیمتوں کی سطح بڑھ کر ۹۸ ہوگئی یہ صورت حال ۱۹۳۲ء میں برقرار نہیں رہی۔ چنانچہ قیمتیں بتدریج گھٹ کر اس سے بھی نیچی سطح تک آگئیں۔ اشاری عدد گھٹ کر دسمبر ۱۹۳۲ء میں ۹۸ اور مارچ ۱۹۳۳ء میں ۸۳ ہوگیا۔ لیکن اس کے بعد سے قیمتوں کی سطح میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۳۳ء میں اشاری عدد ۸۹ ہوگیا۔ جنوری ۱۹۳۴ء میں ایک درجے کی ترقی ظاہر ہوئی جو بعد کے مہینے میں غائب ہوگئی، اور مارچ میں اشاری عدد گھٹ کو ۸۸ ہوگیا۔ ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء میں قیمتوں کی سطح میں عام طور پر دو درجوں کا فرق ظاہر ہوا اور کمی کی بجائے میلان زیادہ تر بیشی کی طرف رہا۔

---

[1] دیکھو باب (۸) فصل (۲۴)؛ نیز دیکھو باب (۶) فصل (۷)۔

لیکن جنوری ۱۹۳۵ء ایک غیر معمولی مہینہ تھا اور اس میں سابقہ مہینے کے ۸۸ کے مقابلے میں تیزی کے ساتھ ۶ درجوں کا اضافہ ہوا۔ لیکن یہ محض عارضی اضافہ تھا جس کا باعث یہ تھا کہ اناج اور روغندار تخموں کی قیمتیں تخمین کی وجہ سے بڑھ گئیں تھیں۔ اشاری عدد مارچ ۱۹۳۵ء کے ۸۷ سے بڑھ کر دسمبر ۱۹۳۵ء میں ۹۳ ہوگیا۔ اس کے بعد سے میلان کمی کی طرف رہا اور اپریل ۱۹۳۶ء میں اشاری عدد ۹۰ تھا۔ آگے چلکر خفیف سی اصلاح ہوی اور سال کے اختتام پر ۹۴ ہوگیا۔ اگست ۱۹۳۷ء تک جبکہ کلکتے کا اشاری عدد ۱۰۵ تھا قیمتوں میں ۱۱ درجے ترقی ہوی تھی۔ اس اضافے کی وجہ کسی حدتک یہ بھی کہ تمام دنیا میں اسلحہ بندی کی مہم شروع ہوچکی تھی اور گرم بازاری اور سٹہ بازی کا دور دورہ تھا۔ اس کے بعد سے جو معاشی کساد بازاری ریاستہائے متحدہ امریکہ میں شروع ہوئی اس کی وجہ سے ہندوستان میں بھی قیمتیں کم ہوگئیں جیساکہ اپریل ۳۸ء میں کلکتے کی قیمتوں کے اشاری عدد کے گھٹ کر ۹۴ ہوجانے سے معلوم ہوتا ہے[1] ۴۱۹

مندرجۂ ذیل جدول سے یہ معلوم ہوگا کہ سلطنت متحدہ کنیڈا اور آسٹریلیا کے مقابلے میں ہندوستان میں قیمتیں زیادہ گرگئی تھیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں مارچ ۱۹۳۳ء تک قیمتیں نقصان رساں طریق پر گرتی رہیں جس کے بعد حالیہ جمود سے پہلے حالات رو بہ اصلاح نظر آنے لگے۔ اپریل ۱۹۳۵ء میں امریکہ میں تھوک قیمتوں کی سطح ۸ درجے اوپر چڑھ گئی جس کا باعث یہ تھا کہ ڈالر کی قدر گھٹا دیگئی تھی اور نیز قومی بحالی اور زراعتی پیداور کی قیمتوں میں مطابقت کا انتظام شروع کردیا گیا تھا۔ جاپان جس نے ۱۹۳۱ء میں معیار طلا چھوڑا اس میں خاصکر ۱۹۳۵ء سے قیمتوں میں قطعی طور پر بڑھنے کا میلان ہے۔ فرانس جو سونا استعمال کرنے والے ملکوں میں سب سے اہم حیثیت رکھتا ہے اس میں قیمتیں کم وبیش مسلسل گرتی گئیں یہاں تک کہ ستمبر ۱۹۳۶ء کے آخر میں فرانک کم قدر کردیا گیا اور معیار طلا بالکل ترک کردیا گیا۔ اس کے بعد سے فرانس میں قیمتیں بہت بڑھتی رہیں۔ لیکن یہ قابل غور ہے کہ ہندوستان میں قیمتوں میں اس حدتک اضافہ نہیں ہوا ہے جتناکہ دوسرے ملکوں میں۔

تھوک قیمتوں کے اشاری اعداد کلکتہ بمبئی اور بعض بیرونی ممالک میں[2]

---

[1] دیکھو رزرو بنک آف انڈیا کا شائع کردہ اعداد کا خلاصہ (جولائی ۱۹۳۸ء) صفحہ ۲۔

[2] دیکھو رپورٹ کرنسی اور مالیے کے بارے میں (۱۹۳۷ء۔۳۸ء) صفحہ ۶۔

	ہندوستان (کلکتہ)		ہندوستان (بمبئی)[1]		سلطنت متحدہ (انگلستان)	ممالک متحدہ امریکہ	جرمنی	آسٹریلیا (ملبورن)	جاپان	فرانس
	جولائی سنہ ۱۹۱۴ء = ۱۰۰	سنہ ۱۹۲۹ء = ۱۰۰	جولائی سنہ ۱۹۱۴ء = ۱۰۰	سنہ ۱۹۲۹ء = ۱۰۰	سنہ ۱۹۲۹ء = ۱۰۰					
سنہ ۱۹۲۹ء اوسط	۱۴۱	۱۰۰٫۰	۱۴۵	۱۰۰٫۰	۱۰۰٫۰	۱۰۰٫۰	۱۰۰٫۰	۱۰۰٫۰	۱۰۰٫۰	۱۰۰٫۰
سنہ ۱۹۳۰ء 〃	۱۱۶	۸۲٫۳	۱۲۶	۸۷٫۹	۸۷٫۵	۹۰٫۷	۹۰٫۷	۸۸٫۵	۸۲٫۴	۸۸٫۴
سنہ ۱۹۳۱ء 〃	۹۶	۶۸٫۱	۱۰۹	۷۵٫۲	۷۶٫۸	۶٫۶	۷۵٫۴	۷۹٫۲	۶۹٫۶	۸۰٫۰
سنہ ۱۹۳۲ء 〃	۹۱	۶۴٫۵	۱۰۹	۷۵٫۲	۷۴٫۹	۶۸٫۰	۶۹٫۸	۷۸٫۳	۷۳٫۳	۶۸٫۲
سنہ ۱۹۳۳ء 〃	۸۷	۶۱٫۷	۹۸	۶۷٫۶	۷۵٫۰	۶۹٫۳	۷۰٫۲	۷۸٫۲	۸۱٫۶	۶۳٫۶
سنہ ۱۹۳۴ء 〃	۸۹	۶۳٫۱	۹۵	۶۵٫۵	۷۷٫۱	۷۸٫۶	۷۴٫۹	۸۱٫۶	۸۰٫۸	۶۰٫۰
سنہ ۱۹۳۵ء 〃	۹۱	۶۴٫۵	۹۹	۶۸٫۳	۷۷٫۸	۸۳٫۹	۷۵٫۴	۸۱٫۵	۸۴٫۴	۵۴٫۰
سنہ ۱۹۳۶ء 〃	۹۱	۶۴٫۵	۹۶	۶۶٫۲	۸۲٫۷	۸۴٫۸	۷۸٫۰	۸۵٫۶	۸۹٫۹	۶۵٫۵
جنوری سنہ ۱۹۳۷ء 〃	۹۸	۶۹٫۵	۱۰۴	۷۱٫۷	۹۰٫۱	۹۰٫۱	۸۵٫۰	۹۱٫۲	۱۰۶٫۱	۸۵٫۸
اگست سنہ ۱۹۳۷ء 〃	۱۰۵	—	۱۰۶	—	۹۸٫۰	۹۲٫۰	—	—	۱۰۷	—
مارچ سنہ ۱۹۳۸ء 〃	۹۶	—	۱۰۰	—	۹۱٫۰	۸۴٫۷	—	—	۱۱۴	—

۴۲۰ ہندوستان میں قیمتوں کے آثار کا ایک پریشان کن پہلو یہ ہے کہ خام اشیا اور مصنوعات کی قیمتوں کی سطحوں میں فرق ہے۔ یہ چیز نہ صرف برآمد کردہ اشیا جو زیادہ تر خام اشیا[2] پر

[1] جدول سے معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے کے اشاری عدد کے مقابلے میں بمبئی کا اشاری عدد دوسرے ملکوں کا کم وبیش ساتھ دیتا رہا۔ لیکن سنہ ۱۹۳۶ء کے وسط کے بعد بمبئی کا اشاری عدد بہت آگے بڑھ گیا۔ چنانچہ مارچ سنہ ۱۹۳۷ء میں وہ دس درجے زیادہ تھا۔

[2] چاول، گیہوں، جوٹ، روغندار تخموں اور روئی جیسی زرعی پیداوار کی قیمتیں خاص کر سنہ ۳۳-۱۹۳۰ء میں بہت زیادہ گر گئی تھیں۔

مشتمل ہیں) بلکہ درآمد شدہ سامان (جس میں زیادہ تر مصنوعات ہیں) کی قیمتوں کے اشاری اعداد سے ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۲۹ء کے مقابلے میں دسمبر ۱۹۳۱ء میں برآمد کردہ اشیا کی قیمتوں میں (کلکتے کے اشاری عدد کے لحاظ سے) ۲۹ فی صد کمی ہوئی۔ اس کے برخلاف درآمد شدہ سامان میں صرف ۷ فیصد کمی ہوئی لیکن حالیہ سالوں میں خاصکر ۱۹۳۶ء کے وسط سے (جبکہ خام اشیا کی قیمتیں بہت بڑھ گئی تھیں) مصنوعات (درآمد شدہ اشیا) کی قیمتوں میں روز بروز برآمد کردہ اشیا کی قیمتوں سے مطابقت کا میلان پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر ۱۹۲۹ء معیاری سال قرار دیا جائے تو اس کے مقابلے میں برآمد کردہ اشیا میں جہاں صرف ۲۹ فیصد کمی ہوئی وہاں درآمد شدہ اشیا کی قیمتوں میں ۲۵ فیصد کمی ہوئی۔ اس طرح دونوں کا فرق گھٹتے گھٹتے ۴ درجے تک آگیا[1]۔ ہندوستان کی معیشت پر اس چیز کا بہت ہی مفید اثر پڑا کیونکہ ہندوستان بہت بڑی حد تک زراعتی ملک ہے اور خام پیداوار تیار کرتا ہے۔

۲۰ — قیمتوں کے گرنے کے اسباب اور نتائج

اشیا کی قیمتیں تمام دنیا میں گرنے کے جو اسباب تھے ان کا تعلق زر کے معاملات کے علاوہ دوسرے معاملات سے بھی تھا[2]۔ چند سال پہلے تک تمام دنیا میں جتنا سونا کانوں سے نکالا وہ طلب کو پورا کرنے کے لئے ناکافی ثابت ہوا۔ رسد و طلب کی یہ عدم مطابقت اس وجہ سے بڑھ گئی کہ جو رسد دستیاب ہوئی وہ بدانتظامی کے ساتھ تقسیم ہوئی اور بیشتر حصے کی کھپت ریاستہائے متحدہ اور فرانس میں ہوگئی۔ اس صورت حال کی وجہ سے دوسرے ملکوں کے مرکزی بنکوں کے محفوظ ذخیروں میں کمی واقع ہوئی اور وہ اپنے زر کی مقدار بہت کم کر دینے پر مجبور ہوئے۔ زر کے معاملات سے قطع نظر قیمتوں کی کمی کا اصل سبب یہ تھا کہ خام اشیا اور مصنوعات خاصکر خام اشیا خلاف معمول ضرورت سے زیادہ مقدار میں تیار کی گئی تھیں۔ دنیا کے اکثر علاقوں، خاصکر ہندوستان، چین اور جنوبی امریکہ کی سیاسی بے چینی بھی کساد بازاری کو بڑھانے اور قیمتوں کو گرانے کا ایک سبب تھی اس خیال پر پہلے

[1] دیکھو تبصرہ بر تجارت ہند (۱۹۳۶-۳۷ء) صفحہ ۲۲۔

[2] دیکھو پال آئن زگ کی کتاب (The Woorld Economic Cvisis) باب ۶ و باب ۶،
نیز ٹیچ "ایف" فریزر کی کتاب (Great Britain and the Gold Standard

روشنی ڈالی جاچکی ہے کہ ہندوستان میں قیمتوں کے گرنے کا باعث یہ تھا کہ روپے کی قدر بڑھاکر ۱ شلنگ ۶ پنس مقرر کی گئی تھی۔ جہاں تک اس سبب کے اثر کا تعلق ہے اس کا اطلاق قیمتوں کی عدم مطابقت کے ابتدائی دور پر ہوسکتا ہے نہ کہ بعد کے زمانے پر۔ واقعہ یہ ہے کہ اندرونی اسباب کے مقابلے میں عالمی اسباب زیادہ قابل الزام ہیں۔

سنہ ۱۹۲۹ء-۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۶ء-۳۷ء قیمتوں کے گرنے سے ہندوستان کی تجارت خارجہ
۴۲۱ اور توازن تجارت پر جو مضر اثرات پڑے ان پر پہلے بحث کی جاچکی ہے (دیکھو باب فصل ۷، (۱۲)۔ کاشتکار کو بہت سخت مشکلات کا سامنا اس وجہ سے کرنا پڑا کہ جہاں قیمتوں کے گرنے سے[1] اس کی آمدنی کم ہوگئی وہاں اس کے ذمے کی واجب الادا رقمیں جو مالگزاری، لگان اور مطالبات سود وغیرہ کی شکل میں تھیں بظاہر معین رہنے کے باوجود روز بروز گراں بار ہوتی گئیں۔ اس صورت حال نے کاشتکار کی قوت خرید کو گھٹا دیا ہے جس کی وجہ سے ملک میں معاشی کساد بازاری کی شدت ہوگئی ہے لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ زراعتی پیداوار کی قیمتوں کے گرجانے کے باوجود قیمتوں کی کمی کے ساتھ ساتھ زراعتی پیداوار کی مقدار میں کمی نہیں ہوئی بلکہ بعض صورتوں میں پیداوار کے بڑھنے کا میلان نمایاں رہا۔ ہندوستانی حالات کے تحت کاشتکار کو جو کچھ بھی قیمت مل سکے وہی لینی پڑتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک فاسد دائرہ قائم ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے قیمتوں کے گھٹنے سے پیدایش کچھ زیادہ ہوجاتا ہے اور زائد پیدائش سے قیمتیں اور بھی گھٹ جاتی ہیں جوٹ اور ربر جیسی صنعتی خام اشیاء کی پیدائش میں کچھ کمی ظاہر ہوئی۔ اس معاشی تلاطم نے مالیات عامہ کو بھی بری طرح متاثر کیا۔

[1] اگر بحیثیت مجموعی آٹھ صوبوں (برما، بنگال، بہار واڑیسہ، مدراس، بمبئی، پنجاب، صوبۂ متحدہ اور صوبۂ متوسط وبرار) کو لیا جائے تو سنہ ۱۹۲۸ء-۲۹ء کے مقابلے میں سنہ ۱۹۳۳ء-۳۴ء میں زرعی پیداوار کی قیمت میں ۵۴٫۶ فیصد کمی ہوئی۔ اسی زمانے میں ان آٹھ صوبوں کی اہم فصلوں کی مجموعی پیداوار کی مالیت ۱۰ ارب ۲۱ کروڑ روپے سے گھٹ کر ۴ ارب ۴۰ کروڑ روپے ہوگئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کاشتکار کی قوت خرید کتنی زیادہ گھٹ گئی تھی۔

محصول کی زیادتی، اخراجات میں اندھادھند تخفیف اور قاصر مواز نے، بھی وہ چند مجموعی اثرات ہیں جو قیمتوں کے گرنے سے مالیہ پر پڑے۔

کاشتکار کی قوت خرید میں بہت بڑی کمی اور محاصل کا بھاری بوجھ (مثلاً انکم ٹیکس کا تیزی سے بڑھ جانا اور دوسرے محصولوں کا عائد کیا جانا) ان دونوں چیزوں نے صنعت اور مزدوروں کے روزگار کے مواقع پر برا اثر ڈالا، حالانکہ ان میں کساد بازاری کا اثر اتنا نمایاں نہیں تھا جتنا کہ زراعت میں۔ گزشتہ چار سال میں معاشی حالت کچھ بہتر ہوئی ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان بحران کے نازک ترین دور سے گزر چکا ہے۔ دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان کو بھی پستی کا سامنا کرنا پڑا جیسا کہ اشیا اور تمسکات کی قیمتوں اور صنعتی منافعہ کی شرح کے گرنے سے ثابت ہوتا ہے۔ لیکن یہ پستی اب کم ہوتی معلوم ہوتی ہے۔[1]

---

[1] کساد بازاری کے تفصیلی حالات اور ہندوستان پر قیمتوں کے گرنے سے جو اثرات ہوئے ان کے لئے قاری کو برج نرائن کی کتاب (India and the Crisis) بے سی کویاجی کی کتاب (World Depression) کے ٹی، شاہ کی کتاب (The Wold Econamic Depression) اور پی، ایس نرائن پرشاد کا مقالہ (World Depression in India) جو ۱۹۳۵ء میں انڈین جرنل آف اکنامکس میں شایع ہوا) دیکھنا چاہئے۔

۴۲۲

دسواں باب

بنک کاری اور اعتبار[۱]

۱۔ ہندوستانی زر کے بازار کے اجزا[۲]

ہندوستانی زر کے بازار اور بنک کاری کے نظام میں مندرجۂ ذیل اہم اجزا شامل ہیں:۔ (۱) رزرو بنک آف انڈیا؛ (۲) امپیریل بنک آف انڈیا (جس کا ماخذ پریذیڈنسی بنک تھے)؛

[۱]۔ ہندوستانی بنک کاری اور اعتبار کی سب سے مستند اور تفصیلی بحث بنک کاری کی مختلف صوبہ وارى اور مرکزی تحقیقاتی کمیٹیوں کی رپورٹوں اور شہادتوں میں موجود ہے۔ جامع تحقیقات کے لیئے عوام کے مسلسل مطالبے کے جواب میں ۳۰-۱۹۲۹ء میں مرکزی تحقیقاتی کمیٹی مقرر ہوی تھی۔ اپنی رپورٹ پیش کرنے سے پہلے بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کو صوبہ واری کمیٹیوں کی رپورٹوں پر غور و خوض کرنا پڑا۔ وہ رائیں بھی اس کے پیش نظر زیر غور آئیں جو خاص طور پر مقرر کئے ہوئے بیرونی ماہروں کی جماعت نے پیش کی تھیں۔ بیرونی ماہروں نے ایک علیحدہ رپورٹ لکھی جو مرکزی کمیٹی کی رپورٹ میں شامل کر لی گئی۔

[۲]۔ زر کے بازار میں مختلف قسم کے خصوصی ادارے، مثلاً بنک، صراف، ہنڈی والے، دلال،

(۳) مبادلہ بنک (جو زیادہ تر یورپی یا غیر ملکی تھے)؛ (۴) ہندوستانی مشترک سرمایہ بنک جو یورپی اصول پر قایم کیے گئے؛ (۵) امداد باہمی کے بنک؛ (۶) دیسی بنک کاروں اور دلالوں کی کثیر اور مختلف النوع جماعت جو ملک کے مختلف حصوں میں مختلف ناموں سے موسوم ہے، مثلاً صراف، ملتانی، بنیا، مارواڑی، ساہوکار، مہاجن اور چیٹی جن کا کاروبار تقریباً سب کا سب ہندوستان کے اندرونی حصوں تک محدود ہے۔ ہندوستانی زر کا بازار عام طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (۱) رزرو بنک، امپیریل بنک، مبادلہ بنک، اور ہندوستانی مشترک سرمایہ بنک مرکزی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کو یورپی زر کا بازار کہا جا سکتا ہے۔ (۲) ساہوکار اور دیسی بنکر، بنگال کے قرضہ گھر، مدراس کے نیدھی اور چیٹ فنڈ، یہ سب زر کے دیسی بازار سے متعلق ہیں۔ ان دونوں کے بین بین امداد باہمی کے بنک ہیں۔ بمبئی اور کلکتے کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ زر کے قومی بازار ہیں اور یہ زر کے ان متعدد چھوٹے مقامی بازاروں سے مختلف ہیں جو اندرون ملک پائے جاتے ہیں۔ اس طرح ہندوستان میں زر کا بازار متعدد اجزا پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے سے باقاعدہ ربط نہیں رکھتے اور وہ لندن کے زر کے بازار سے جو بہت منظم اور مربوط ہے نمایاں تضاد رکھتا ہے۔ ۴۲۳
اس موضوع پر آگے چلکر فصل ۲۵ – ۲۸ میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

ان اہم قسموں کے علاوہ دوسرے ادارے بھی موجود ہیں مثلاً ڈاکخانے کے سیونگ بنک اور زمین گروی بنک جو حال میں کھولے گئے ہیں اور صرافے جو بمبئی، کلکتہ، مدراس اور لاہور میں قایم ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ :۔ سکار گھر، ٹرسٹ اور فینانس کمپنیاں اور دوسری خصوص اعتباری انجمنیاں شامل ہیں جن کا کام یہ ہے کہ زر کی مطلوبہ مقدار مہیا کریں خواہ وہ حکومتی زر ہو یا تجارتی زر یا زر قانونی کے بدل جو نمایندہ زر یا بنک کا زر کہلاتے ہیں۔ دیکھو بی رام چندر راؤ کی کتاب Bank's and the Money Market) پہلی تقریر۔

ہندوستانی بنک کاری کی تاریخ

۲- دیسی بنک کاری

ہندوستانی بنک کاری اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ ہندوستانی تجارت۔ ہندوستان دنیا کے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں بنک کاری کے متعلق غالباً بہت پہلے سے اور بہت زیادہ معلومات رکھتا تھا[1]۔

چانکیا کی "ارتھ شاستر (تقریباً ۳۰۰ سنہ ق۔م) میں تاجر ساہوکاروں کی طاقتور پنچایتوں کا تذکرہ موجود ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ وہ امانتیں وصول کرتے تھے قرضے دیتے تھے اور مختصر یہ کہ جدید بنکوں کے کاموں سے ملتے جلتے بہت سے کام انجام دیتے تھے۔ میڈو ز ٹیلر اپنی کتاب (Students manual of the History of India) میں قدیم بنک کاری کے متعلق مبالغہ آمیز خیالات حسب ذیل الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں۔ "منو کے قوانین سے پتا چلتا ہے کہ کس طرح ۳ ہزار سال قبل بھی باقاعدہ فن بنک کاری موجود تھا۔ اس زمانے میں بنکر قدر زر کے تغیرات سمجھتے اور ان کے مطابق عمل کرتے تھے۔ وہ حسابات کے رجسٹر اور بہی کھاتے رکھتے تھے جن میں اکہرے اور دوہرے اندراجات کئے جاتے تھے۔ وہ سادہ اور مرکب سود لیتے تھے۔ بحری اور برّی بیمہ کرتے تھے، ہنڈی قبول کرتے تھے۔ غرض ان کا عمل موجودہ زمانے کے طریقوں کے مطابق تھا جو قدیم قواعد سے ذرا بھی مختلف نہیں ہیں"۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے حملوں سے جو ہیجان اور بدامنی پیدا ہوئی وہ

---

[1] "ساہوکار قدیم ترین زمانے سے ہندوستانی معاشرے کا ایک ناگزیر رکن رہا ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی مواد موجود ہے کہ مغربی خیالات کے رائج ہونے سے پہلے بھی بنک کاری کے تصور سے ہندوستان نابلد نہیں تھا"۔ دیکھو ام، ال تائن کی کتاب Banking Land and Practice in India صفحہ ۲۱۔ بائز دیکھول، سی، جین کی کتاب Indigenous Banking in India صفحہ ۳ تا ۱۶۔

بنک کاری کے ان قدیم اداروں کے لئے نقصان دہ تھی۔ لوگوں کو یہ اطمینان نہ رہا کہ ان کی آمدنی کی بچت ان میں بطور امانت محفوظ رہے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اپنی پس انداز رقوم چھپاکر، رکھنے لگے۔ بعض بنکر بدستور خوشحال رہے اور وہ بنک کاری کے ساتھ تجارتی کاروبار بھی کرتے تھے۔ وہ حکومت کو قرضہ دیتے تھے اور ان کے بہت سے با اثر خاندان کسی نہ کسی ریاستی دربار سے وابستہ ہوگئے چنانچہ ایسا کوئی دربار نہ تھا جس میں ریاستی بنکر نہ ہو اور اس کو بالعموم وزارت کے اختیارات بھی تفویض کئے جاتے تھے۔ جگت سیٹھ کے خاندان والے جو نوابان بنگال کے موروثی ساہوکار تھے ان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی سیاسیات میں ان ساہوکاروں کا کس قدر اہم حصہ تھا[1] قرضوں اور رقمی ترسیلات کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی بھی ہندوستانی ساہوکاروں کی محتاج تھی۔ چنانچہ یہ لوگ یورپی ایجنسی گھروں کے قائم ہونے تک ریاستی مہاجنوں کی حیثیت سے بہت ذی اثر تھے ان ایجنسی ۴۴۴
گھروں کی مسابقت کے علاوہ اٹھارویں صدی کے آخر میں بہت سے ایسے حالات رونما ہوئے جن سے دیسی ساہوکاروں کی خوشحالی میں رکاوٹ پیدا ہوگئی۔ مثلاً پریزیڈنسی بنک جیسے یورپی طرز کے بنکوں کا قیام اور یکساں کرنسی کا اجرا جس نے ان ساہوکاروں کے تبادلۂ زر کے کاروبار کے معتد بہ حصے کو بٹھا دیا۔ باوجود ان مخالف حالات کے یہ ساہوکار باقی رہے۔

موجودہ زمانے میں بھی دیسی بنک کاری کا طریق ہندوستانی زر کے نظام میں نہایت اہم کام انجام دے رہا ہے۔ ہندوستانی بنکر[2] ہندوستان کے ہر گاؤں،

---

[1]۔ دیکھو مِسٹر سنہا کی کتاب (Eatly European Banking in India صفحہ ۱ تا صفحہ ۳۔

[2]۔ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی نے اس کی حسب ذیل تعریف کی ہے:۔ دیسی بنکر کے مفہوم میں امپیریل بنک آف انڈیا، مبادلہ بنکوں، مشترک سرمائے کے بنکوں اور امداد باہمی کی انجمنوں کے سوا نہ صرف تمام بنکر شامل ہیں بلکہ ہر انفرادی یا نجی فرم بھی رقوم بطور امانت رکھتی ہے، ہنڈی کا لین دین کرتی ہے اور زر بطور قرض دیتی ہے۔" فقرہ ۱۰۷۔ جو لوگ رقوم بطور امانت نہیں رکھتے وہ دوسری دیسی اعتباری ایجنسیوں کی ذیل میں آتے ہیں مثلاً گاؤں کا قرض دہندہ۔

ہر قصبے اور ہر شہر میں موجود ہے ۔ گاؤں کے چھوٹے موٹے بنئے بقال سے لیکر بڑے دولتمند مہاجنوں تک متعدد مدارج کے ساہوکار ہیں۔ بڑے بڑے ساہوکاروں کے کاروبار خوب جمے ہوئے ہیں اور وہ عام طور پر برادری کی شکل میں چلتے ہیں اور ان کی ایجنسیاں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ہندوستان کے باہر بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ ان ساہوکاروں کی ایک خاص شکل مدراس میں چیٹیوں کا فرقہ ہے ۔ اس پورے فرقے میں کم وبیش مشترکہ ذمہ داری کی سی حالت پائی جاتی ہے[1] نٹوکوٹائی چیٹی تاجروں اور ساہوکاروں کی حیثیت سے خاص طور پر مشہور ہیں اور ان کا کاروبار تقریباً تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستانی صراف اور ساہوکار یقیناً بنک کاری کا بہت ہی کثیر کاروبار کرتے ہیں ہندوستانی ساہوکاروں کے کاروباری دیانت کا معیار عام طور پر بہت ہی اعلیٰ تسلیم کیا جاچکا ہے۔ دیسی ہندوستانی بنک کاری مشترک سرمایے کے اصول کے مطابق منظم نہیں ہے۔ اس کے علاوہ وہ عام طور پر اصل کا مقابلۃً بہت ہی قلیل حصہ امانتی رقوم سے فراہم کیا جاتا ہے اور جو رقمیں بطور امانت رکھوائی جاتی ہیں وہ نقدی شکل میں واپس لی جاتی ہیں نہ کہ چکوں کے ذریعے سے۔ اصل حصص کے ذریعے سے فراہم نہیں کیا جاتا اور ذمہ داری انفرادی ہوتی ہے یا شرکت کی صورت میں مشترکہ بھی ہوتی ہے، لیکن بہ لحاظ نوعیت غیر محدود ہوتی ہے۔ بنک کاری کا ہندوستانی فرم یا صراف عام طور پر قرض کے کاروبار کے ساتھ تجارت بھی کرتا ہے[2]
اٹھارھویں صدی کے انگریزی بنکوں کے برعکس ہندوستانی صرافوں نے کبھی عندالمطالبہ نوٹوں کا اجرا نہیں کیا حالانکہ بہت زمانے تک نوٹ جاری کرنے کے متعلق کوئی قانونی ممانعت ۴۲۵

[1] دیکھو ایم' یس' ام گھپے کی کتاب (Indigenous Banking in India) صفحہ ۱۱-۱۲-
[2] خیال یہ ہے کہ منجملہ دوسرے اسباب کے بہت سے کاموں کو ایک ساتھ انجام دینے کی وجہ سے ہندوستانی بنک کاری ترقی کی ایک خاص منزل پر پہنچنے کے بعد آگے ترقی نہ کرسکی۔ خالص بنک کاری کے سوا دوسرے کاروبار میں حصہ لینے کا میلان روز افزوں ہے جس کا باعث جدید بنک کاری اور ترسیل رقم کی سہولتیں اور تجارت اور صنعت کی توسیع وترقی ہے۔
دیکھو ال' سی' جین کی کتاب محولہ بالا صفحہ ۴۳-۴۴-

نہ تھی۔ یورپی طرز کی جدید بنک کاری اور دیسی بنک کاری کے نظام کے درمیان بڑا اختلاف اس بنا پر ہے کہ موجودہ زمانے میں بنک مشترک سرمایہ سے چل رہے ہیں اور رقموں کی ادائی میں چک عام طور پر استعمال کئے جاتے ہیں جس میں حساب گھروں کا نظام معاون ہے۔ سابق میں صرافوں کا اصل کاروبار زر کا تبادلہ تھا اور ایسے زمانے میں جبکہ ہر چھوٹی ریاست بھی اپنا معیاری سکہ ڈھالتی تھی اور ملک میں مختلف وضع اور قطع کا فلزی زر کثیر تعداد میں رائج تھا اس کاروبار نے خاص اہمیت حاصل کر لی تھی۔ اس کے علاوہ صراف اعتباری رقعے لکھتے تھے اور ہنڈیوں کا لین دین کرتے تھے جو آجکل کے چکوں یا داخلی ہنڈیوں کے مماثل تھے۔ کبھی کبھی یہ صراف حکومت کو بڑے کاروبار کے لئے قرضہ مہیا کرنے میں بھی مدد دیتے تھے۔

۳۔ دیسی بنک کاری کی حالت موجودہ زمانے میں

صراف اس زمانے میں بھی ہندوستانی زر کے بازار اور وسیع تجارتی طبقے کے درمیان ایک ناگزیر کڑی کے طور پر ملک کے مالی نظام میں بدستور اہم خدمت انجام دے رہا ہے۔ وہ کاشتکار اور چھوٹے تاجر کو قرض دیتا ہے، تجارتی منڈیوں اور بندرگاہوں تک زرعی پیداوار کی نقل وحمل میں مدد دیتا ہے اور اندرون ملک ہر قسم کی اشیا تقسیم کرتا ہے۔ وہ عندالضرورت فصل کی کٹائی کے زمانے میں اپنے گماشتوں کو روپے دیکر ریل سے روانہ کرتا ہے یا سرکاری خزانوں کی موسومہ ہنڈیاں خریدتا ہے اور جب کبھی خود کو روپے کی ضرورت ہوتی ہے اپنی ہنڈیوں کو امپیریل بنک یا تجارتی شہروں میں دوسرے بنکوں کے ہاتھ فروخت کرتا ہے[1] دیسی ساہوکار بعض حیثیتوں سے مشترک سرمایہ کے ان بڑے بنکوں کے سخت رقیب بن جاتے ہیں جو جدید اصول کے مطابق منظم ہیں۔ چونکہ وہ شرح سود زیادہ ادا کرتے ہیں اس لئے بعض اوقات بڑے بنکوں کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے امانتیں حاصل کرتے ہیں۔ ساہوکار شخصی ضمانت پر بھی

---

[1] ۔ دیکھو شراس کی کتاب "ہندوستانی مالیہ وبنک کاری" (Indian Fianance and Banking) صفحہ ۲۴۱۔

قرضہ دیتے ہیں اور عام طور پر دیکھا جائے تو ضمانت کی حد تک ان کی جو شرائط ہوتی ہیں ان کا پورا کرنا بنکوں کے مقابلے میں زیادہ آسان ہوتا ہے۔ وہ اس لحاظ سے بھی فائدے میں ہیں کہ موجودہ حالات کے تحت ہندوستان کے جدید بنک کبھی یہ توقع نہیں کرسکتے کہ ملک کے طول و عرض میں جو تجارتی طبقہ آباد ہے اس کے معاملات سے تفصیلی واقفیت حاصل ہوسکے گی اور وہ اس قابل ہوں گے کہ صرف چند بڑے تاجروں کے سوا دوسروں کو قرضہ دے سکیں۔ اس وجہ سے موجودہ حالات میں ہندوستانی ساہوکار ناگزیر طور پر درمیانی حیثیت رکھتے ہیں۔ بے بنگ ٹن اسمتھ کمیٹی نے حسب ذیل الفاظ میں یہ بیان کیا ہے کہ کس طرح جدید زر کے نظام سے دیسی ساہوکارہ ربط پیدا کرتا ہے:۔ بنک بڑے شہروں میں زیادہ تر بڑے اور معتبر صرافوں سے براہ راست معاملہ کرتے ہیں۔ یہ صراف اپنے ذاتی اصل سے کاروبار کرتے ہیں اور عام طور سے دیکھا جائے تو جتنا اصل فراہم کرسکتے ہوں وہ سب دوسرے صرافوں اور بالعموم چھوٹے صرافوں سے ہنڈیاں خریدنے
میں مصروف کرکے پریزیڈنسی بنکوں کے پاس پہنچتے ہیں۔ بڑے صراف جن ۴۲۶
صرافوں سے ہنڈیاں خریدتے ہیں انھوں نے بھی ممکن ہے کہ اپنے سے چھوٹے صرافوں یا مہاجنوں سے ہنڈیاں خریدی ہوں اور یہ سلسلہ اسی طرح سب سے چھوٹے صراف یعنی گاؤں کے بنئے یا غلہ فروش یا سنار تک پہنچا ہو۔ مثلاً ممکن ہے کہ امرتسر کا صراف ایک ایسی ہنڈی خریدے جو لاہور کے ایک بڑے صراف نے لکھی ہو اور پریزیڈنسی بنک کے ہاتھ فروخت کردے۔ بنک اس ہنڈی کی رقم حاصل کرنے کے لئے اسے بمبئی کی شاخ کو بھیج دے گا یا ممکن ہے کہ یہ ہنڈی تجارتی ہنڈی کے برعکس کوٹھی کی ہنڈی ہو جو دست گرداں ہنڈی کہلاتی ہے[1]۔

[1] ہنڈیاں تین جدا جدا اغراض کے لئے لکھی جاتی ہیں :۔ (۱) قرضہ حاصل کرنے کے لئے (اس صورت میں ہنڈی کی حیثیت "کوٹھی کی ہنڈی" یا دست گرداں ہنڈی کی ہوتی ہے)؛ (۲) تجارت کے لئے رقم مہیا کرنے کی غرض سے' اس صورت میں اس کی حیثیت مبادلہ کی ہنڈی کی ہوتی ہے (لیکن مبادلے کی ہنڈی کے برعکس ہنڈی ہمیشہ دستاویز حقیت مثلاً مال کی فروخت کے اقرارنامے' بیجک اور گودام گھر کے رسائد کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ بالعموم ان کے بغیر ہوتی ہے)؛

جدید بنک کاری کی ترقی سے صراف کے کاروبار پر کوئی قابل لحاظ اثر نہیں پڑا۔ اس کے برعکس اس ترقی سے خوش ہونے کی اس کے پاس معقول وجہ ہے کیونکہ اسی کی بدولت روپیہ بھیجنے اور قرضہ حاصل کرنے کے بارے میں صراف کی بہت سی مشکلات دور ہوگئی ہیں ساہوکار تجارتی طبقے کی لکھی ہوئی ہنڈیاں خرید تا ہے اور ان سے بٹے کی ایسی شرح وصول کرتا ہے جو بنک کی شرح سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس طرح ان دونوں شرحوں کا فرق اس کا منافعہ ہوتا ہے[۱]۔ اگرچہ دیسی بنک کاری کے بعض نجی فرم نجی بنکوں میں تبدیل کئے جارہے ہیں جو جدید اصول پر کاروبار کرتے اور چک جاری کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر اب بھی اپنے قدیم روایات کے مطابق کام کررہے ہیں

۴۔ بنک کاری کے پرانے اور نئے نظاموں کے درمیان ربط پیدا کرنے کی ضرورت

یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ ملک کے اصل کے ذرایع کو موثر طور پر کام میں لانے اور اعتباری نظام پر کسی قسم کی مرکزی نگرانی قائم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مشترک سرمائے کے جدید نظام سے دیسی بنک کاری کے نظام کا کوئی منظم تعلق پیدا کیا جائے۔ مجلس قانون ساز میں زرزرو بنک کے مسودۂ قانون (۱۹۳۲ء) کے متعلق رائے زنی کرتے ہوئے سر جارج شوستر نے حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا تھا۔ "ہندوستانی بنک کاری اور اعتبار کے سارے نظام میں دیسی ساہوکار جو خدمت انجام دے رہا ہے اس کو جتنی بھی زیادہ اہمیت دی جائے کم ہے۔ میرے خیال میں یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ اس نظام میں ساہوکار کے کاروبار کا حصہ ۹۰ فیصد سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن دیہات میں امداد باہمی
۴۲۷ کی انجمنوں کے قایم ہوجانے اور امپیریل بنک آف انڈیا کی ایک سو نئی شاخیں کھل جانے کے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔۔ (۲) تجارتی اغراض یا دوسرے اغراض سے زر کو ایک مقام سے دوسرے مقام کو بھیجنے کے لیے۔

[۱]۔ صرافوں کے درمیان انتہا سخت مسابقت کے باعث بنک کی شرح کے مقابلے میں بازاری ہنڈی کے ریڈ شرح کلکتے میں بالعموم ۲ یا ۳ فیصد اور بمبئی میں تقریباً ½ ۱ فیصد زیادہ ہوتی ہے۔

باوجود بدقسمتی سے اب بھی یہ کہنا درست ہے کہ اس کل نظام اور ہندوستان کے جدید بنک کاری کے نظام کے درمیان باقاعدہ اور گہرا ربط قائم نہیں ہوا ہے۔ جب تک زر کے جدید ترقی یافتہ بازار سے جس کی نگرانی کا مرکز رزرو بنک ہے بنک کاری اور اور اعتبار کے اس وسیع نظام کو مربوط نہیں کیا جائے گا جس کی نمایندگی دیسی ساہوکار کرتا ہے اس وقت تک نہ صرف ہندوستان کی کرنسی اور اعتبار کی کامل نگرانی جو مغربی ممالک میں مرکزی بنک کا فرض خیال کی جاتی ہے محال ہوگی بلکہ معقول شرائط پر ہندوستان کی دیہی آبادی کے لئے اعتبار اور بنک کاری کی ان سہولتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھانا بھی ناممکن ہوگا جو بنک کاری کا ایک منظم نظام مہیا کر سکتا ہے۔

دیسی بنک کاری کا عام ہندوستانی بنک کاری سے اور خاص طور پر بنک کاری کے مرکزی نظام سے باہمی ربط بڑھانے کے خیال سے بنک کاری مرکزی تحقیقاتی کمیٹی نے سلسلہ وار کئی قیمتی سفارشیں پیش کیں۔ کمیٹی اس بات کی حامی تھی کہ جب کبھی رزرو بنک آف انڈیا قایم ہو تو اس سے دیسی ساہوکاروں کا براہ راست الحاق کر دیا جائے۔ کمیٹی نے یہ مشورہ بھی دیا کہ جن ساہوکاروں کو رزرو بنک اپنی منظورہ فہرست میں داخل کرے ان پر چند شرائط عائد کی جائیں' مثلاً کاروبار صرف خالص بنک کاری تک محدود رکھنے کا پابند بنانا' ذاتی اصل کا ایک مناسب معیار مقرر کرنا (جو مشترک سرمایے کے بنکوں کے مقابلے میں ادنیٰ ہو) بہی کھاتوں کا باضابطہ انتظام، مسلمہ محاسبوں کے ذریعے سالانہ حسابات کی جانچ اور تنقیح کے لئے حساب کتاب کو رزرو بنک کے پاس پیش کرنا لیکن رزرو بنک کے لینے کے ابتدائی پانچ سال تک رزرو بنک میں رقوم بطور امانت رکھنے کا لزوم جس قاعدے کے تحت ہے (اور جس کا اطلاق مشترک سرمایے کے بنکوں پر ہوتا ہے' اس سے ان ساہوکاروں کو مستثنیٰ کر دینا چاہیئے' بہ شرطیکہ ان کے پاس جمع کردہ امانتیں ان کے اصل کی پانچ گنی مقدار سے متجاوز نہ ہوں۔ رزرو بنک سے جو دیسی ساہوکار ملحق ہو جائیں انھیں چند خاص حقوق دیئے جائیں۔ مثلاً ان کی تجارتی ہنڈیوں پر رزرو بنک مکرر بٹہ کاٹے' ان کی رقمیں ان ہی شرحوں پر ارسال کی جائیں جو مشترک سرمایے کے سب بنکوں کے لئے مقرر ہیں' اور ساہوکاروں کے بہی کھاتوں کی شہادت کے

قانون (Banker's Books Evidence Act [1] (فقرہ ۱۳۹۔۱۴۲) کے خاص حقوق سے استفادے کا موقع دیا جائے۔

جب رزرو بنک آف انڈیا کا مسودۂ قانون (۱۹۳۳ء) مجلس قانون ساز میں زیر غور تھا تو یہ توقع کی گئی تھی کہ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشوں کو مسودۂ قانون میں شامل کر لیا جائے گا۔ جب ایسی کوئی دفعہ نہیں مرتب کی گئی تو ملک کو بہت مایوسی ہوئی۔ لیکن اس فروگذاشت کو یہ کہکر حق بجانب قرار دیا گیا کہ حکومت اس مسئلے کو فوراً حل نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ اس سلسلے میں کچھ کارروائی ضروری خیال کی گئی۔ چنانچہ رزرو بنک آف انڈیا کے قانون (۱۹۳۴ء) کی دفعہ ۵۵ (۱) کے بموجب رزرو بنک پر یہ قانونی ذمہ داری عائد کی گئی کہ وہ بعجلت ممکنہ کم از کم تین سال کے اندر گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے پاس ایک رپورٹ پیش کرے اور اگر مناسب خیال کرے تو ایسا قانون بنانے کے بارے میں تجاویز پیش کرے جس کی بموجب مندرجہ فہرست بنکوں[2] سے متعلق قانون کی دفعات کو ان اشخاص اور فرموں سے بھی متعلق کر دیا جائے جو برطانوی ہند میں بنک کا کاروبار کرتے ہوں لیکن درج فہرست بنکوں کی تعریف میں داخل نہ ہوں۔

---

[1]۔ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی نے دیسی ساہوکاروں کے متعلق بعض دوسری سفارشیں بھی کیں، مثلاً رزرو بنک اور مشترک سرمایے کے بنک چکوں اور ہنڈیوں کی رقم وصول کرنے کے لئے اپنے گماشتوں کی حیثیت سے اِن ساہوکاروں سے اس طرح کام لیں جس طرح بنکوں سے لیتے ہیں، رزرو بنک کی منظورہ فہرست میں جن ساہوکاروں کے نام درج ہوں انھیں اس کا مجاز کر دانا جائے کہ جب ساہوکاروں کی مرکزی انجمن قائم ہو جائے تو اعزاز کے طور پر اپنے نام کے ساتھ "رکن مرکزی انجمن ساہوکاران" لکھا کریں۔ لیکن کمیٹی اس بات کی حامی نہیں تھی کہ ساہوکاروں کے لئے اجازت نامہ لینا لازم کیا جائے کیونکہ اس کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر اجازت نامے کو لازمی بنا دیا جائے تو ساہوکار خوف زدہ اور بنک کاری کے پیشے سے بر داشتہ خاطر ہو جائیں گے۔

[2]۔ دیکھو فصل (۵۵)۔

۵۔ دیسی ساہوکاروں کا الحاق کرنے کے بارے میں رزرو بنک کی تجویز

اس ذمہ داری کے سلسلے میں ۶/مئی ۱۹۳۷ء کو رزرو بنک نے تمام مندرجہ فہرست بنکوں اور بڑے دیسی ساہوکاروں کے نام ایک گشتی خط جاری کیا تاکہ رزرو بنک سے دیسی ساہوکاروں کے الحاق کے امکانات کے بارے میں ان کے خیالات معلوم ہو سکیں۔ چونکہ دیسی بنکروں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ان کے کاروبار کی نوعیت بہت زیادہ شخصی اور سیال تھی، اس لئے رزرو بنک نے یہ تجویز کی کہ وہ صرافوں سے کسی نہ کسی کارندے مثلاً مندرجہ فہرست بنکوں کے توسط سے معاملہ کرے گا جو نہ صرف مالی ذمہ داری میں شریک ہوں گے بلکہ صرافوں کے حسابات کا تفصیلی معائنہ بھی کریں گے جو قرضہ دینے کی صورت میں ضروری ہوگا۔ اس عارضی تجویز کے تحت یہ قرار دیا گیا کہ صراف اپنے نوٹ اور ہنڈیوں پر درج فہرست بنکوں میں بٹہ کٹوائیں جو ان دستاویزات کو اپنے طور پر رزرو بنک کو فروخت کریں گے۔ ساتھ ہی رزرو بنک نے وہ شرائط بھی مقرر کردیں جن کے تحت وہ براہ راست الحاق کرنے کے لئے تیار تھا۔ چنانچہ ان شرائط کے منجملہ چند یہ تھیں۔ دیسی ساہوکاروں پر یہ لازم گردانا جائے کہ وہ خود کفیل قانونی اکائیوں کے طور پر منظم ہو جائیں، کم از کم ۵ لاکھ روپے کا ذاتی سرمایہ مہیا کریں (جیسا کہ درج فہرست بنکوں کے لئے ضروری ہے)، رزرو بنک میں اتنی ہی دھروت رکھیں جتنی کہ مندرجہ فہرست بنک رکھتے تھے، اپنے بنک کاری کے کاروبار کو دوسرے کاروبار سے علیحدہ کرلیں اور حسابات کی باقاعدہ تنقیح اور جانچ کرائیں۔

اس عارضی تجویز میں بالواسطہ الحاق کو ترجیح دی گئی تھی اور راست الحاق کے لئے نہایت سخت شرائط مقرر کی گئی تھیں۔ اسی وجہ سے اس تجویز کے خلاف پرزور احتجاج کیا گیا۔ یہ بتایا گیا کہ بنک نے راست الحاق کی مشکلات کو بڑھا دیا تھا اور بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشوں اور مرکزی مقننہ کی خواہشوں کو نظر انداز
کر دیا تھا۔ صرافوں کی انجمن اور کاروباری کوٹھیوں کی طرف سے جو جواب وصول ۷۲۹
ہوئے ان کی روشنی میں رزرو بنک کے گورنر مسٹر جیمس ٹیلر نے ۲۶/اگست ۱۹۳۸ء کو نجی ساہوکاروں کے راست الحاق کے لئے ایک دوسری اسکیم کا مسودہ گشت کرایا جو

نہ صرف بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشوں کے لحاظ سے مرتب کی گئی تھی بلکہ بنک کاری کی کمپنیوں کے ان قواعد کے بھی مطابق تھی جو ہندوستانی کمپنیوں کے قانون مرمہ ۱۹۳۶ء میں ضم کرلئے گئے تھے[1] مختصراً زرو بنک کی تجویز یہ تھی کہ اگر دیسی ساہوکار زرو بنک سے ملحق ہونا چاہیں تو ان کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ اپنی بنک کاری کے طریقوں کو مشترک سرمایے کے بنکوں کے اصول کے مطابق بنائیں اور بنک کاری کے اس حصے کو خاص طور سے ترقی دیں جس کا تعلق امانتوں سے تھا۔ اگر دیسی ساہوکار کم از کم ۲ لاکھ روپے کا سرمایہ فراہم کرلیں جو ۵ سال کے اندر بڑھا کر ۵ لاکھ کرلیا جاسکے تو وہ یہ درخواست دے سکیں گے کہ نجی ساہوکاروں کی حیثیت سے ان کا داخلہ زرو بنک کے رجسٹروں میں کرلیا جائے۔ ان کے لیے یہ بھی ضروری ہوگا کہ کسی مناسب مدت کے اندر بنک کاری کے سوا دوسرا سب کاروبار بند کردیں۔ ان کے لئے دضروت کی رقم داخل کرنا اس وقت تک ضروری نہ ہوگا جب تک کہ ان کے ذمے کی میعادی اور عندالمطالبہ رقوم واجب الادا ان کے کاروباری اصل کے پانچ گونہ سے متجاوز نہ ہوجائے۔ ان کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ حسابات کے مناسب رجسٹر رکھیں اور ان کی تنقیح رجسٹری شدہ محاسبوں سے کرائیں۔ زرو بنک کے پاس وقتاً فوقتاً اپنے معاملات کی کیفیت پیش کرنا اور اپنے جمع کنندوں کے مفاد کی خاطر بنک کاری کی کمپنیوں کی طرح اعداد وشمار کا شائع کرنا بھی ان ساہوکاروں کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ جو دیسی ساہوکار ان شرایط کو پورا کریں انھیں یہ امتیازی حق دیا جائے گا کہ زرو بنک کے پاس قابل قبول دستاویزات پر مکرر بٹہ کٹوا سکیں گے، سرکاری تمسکات کی کفالت پر قرضے حاصل کرسکیں گے اور رقوم کی ترسیل کی ان سب سہولتوں سے فائدہ اٹھاسکیں گے جو درج فہرست بنکوں کو حاصل ہیں۔

اس اسکیم کے متعلق صرافوں اور کاروباری جماعتوں کے پاس سے جو جواب وصول ہوئے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیسی ساہوکار ان تجاویز کے عام طور پر مخالف ہیں جو امانتوں کی واپسی کے طریقوں اور حسابات کی اشاعت سے متعلق ہیں۔

[1] دیکھو فصل ۲۱۔

وہ اس بات کے لئے بھی آمادہ نہیں ہیں کہ اپنے کاروبار کو صرف بنک کاری تک محدود رکھیں۔ غرض وہ رزرو بنک کی اسکیم میں ایسی ترمیم چاہتے ہیں جس کے قبول کر لیے جانے کے بعد اسکیم اصل تجاویز کے مطابق نہ رہے گی۔ اسی وجہ سے رزرو بنک نے حکومت سندھ کو اطلاع دی کہ رزرو بنک کے قانون کی ترمیم کیلئے فوراً کوئی ایسا قانون بنانے کی وہ سفارش نہیں کر سکتا جس سے رزرو بنک کے قانون کی ان دفعات کو جو درج فہرست بنکوں کے متعلق تھے نجی ساہوکاروں سے متعلق کیا جا سکے۔ البتہ جیسا کہ زراعتی قرضے کے متعلق رزرو بنک کی رپورٹ (جو دسمبر ۱۹۳۷ء میں شایع کی گئی) میں ذکر کیا گیا ہے وہ پیش کش اب بھی قائم رہے گا جو رزرو بنک نے اپنے مراسلے مورخہ ۲۶/ اگست ۱۹۳۷ء میں دیا تھا اور بنک اس حد تک قانون میں ترمیم کرنے کی غرض سے حکومت سے بات چیت کرنے کے لئے امادہ ہوگا، اگر دیسی ساہوکار اس کی شرائط کو قبول کر لینے کے لئے راضی ۷۴۰
ہوں یا کوئی دوسرا قابل عمل چارۂ کار تجویز کریں۔ اس اثنا میں رزرو بنک اس مسئلے پر غور کر رہا ہے کہ تجارتی ہنڈیوں کے بارے میں کھلے بازار کے کاروبار کو کس حد تک فروغ دیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس طریقے کی بدولت ساہوکاروں کے موجودہ کاروباری طریقوں میں لازمی طور پر کوئی اساسی تبدیلی کئے بغیر درجۂ اول کے دیسی ساہوکاروں سے زیادہ قریبی ربط پیدا کرنا ممکن ہوگا[۱]۔

انتہائی بدقسمتی ہے کہ موجودہ زمانے میں رزرو بنک اور دیسی ساہوکاروں کے باہمی تعلقات میں تعطل کی حالت پائی جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ مسئلہ باہمی مفاہمت ہی سے بہتر طریق پر حل ہو سکتا ہے۔ ایک طرف رزرو بنک کو یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ جدید بنک کاری کے معیاری طریقوں کا فوری اطلاق صرافوں پر نہیں ہو سکتا اور کچھ مدت تک قواعد کو نرم اور سہل بنانا ضروری ہوگا تاکہ ساہوکار رزرو بنک کے حلقۂ اثر میں آسکیں تو دوسری طرف صرافوں کو بھی چاہیئے کہ نہ صرف اپنے مفاد کی خاطر

---

[۱]۔ دیکھو سالانہ رپورٹ رزرو بنک آف انڈیا (۱۹۳۷ء) اور زراعتی قرضے کے بارے میں رزرو بنک کی قانونی رپورٹ صفحہ ۴۲۔۴۴۔

درج فہرست بنکوں کے اصول کار کے مطابق کاروبار کریں بلکہ رزرو بنک کو سہولت مہیا کرنے کی خاطر بھی، کیونکہ رزرو بنک کو ملک کے مرکزی بنک کی حیثیت سے ہندوستانی بنک کاری کے نظام کے مختلف اجزا میں توازن قائم رکھنا پڑتا ہے۔

رہی رزرو بنک کی یہ توقع کہ یہ مسئلہ آخر کار یوں حل ہو سکتا ہے کہ ہنڈیوں کے ایک کھلے بازار کو فروغ دیا جائے جس میں اعلیٰ درجے کی ہنڈیوں کا آزادی سے لین دین ہو تو جیسا کہ خود بنک نے تسلیم کیا ہے اس کی راہ میں متعدد مشکلات حائل ہیں۔ اس مسئلے پر فصل (۲۹) میں مفصل بحث کی گئی ہے۔

۶۔ جدید بنک کاری کا آغاز

کلکتے کی آڑھت کوٹھیوں نے ہندوستان میں یورپی اصول کے مطابق بنک کاری کی بنا ڈالی چنانچہ انھوں نے اپنے کاروبار کی سہولت کی خاطر اس کے پہلو بہ پہلو بنک کاری بھی شروع کی۔ بنکروں کی حیثیت سے آڑھت کوٹھیاں ہندوستان کے بڑے تاجروں اور زراعتی کمپنیوں سے معاملہ کرتی تھیں اور جہازوں، نیل کے کارخانوں وغیرہ کو رہن رکھکر قرضہ دیتی تھیں۔ ہندوستان کے یورپی باشندے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز افسر اپنی پس انداز رقوم سرکاری تمسکات میں مصروف کرنے کی بجائے ان کوٹھیوں میں بطور امانت رکھوانے کو ترجیح دیتے تھے، کیونکہ یہ کوٹھیاں سود کی ترغیب دہ شرحیں دیتی تھیں۔ سٹے کے کاروبار میں حصہ لینے کی وجہ سے یہ آڑھت کوٹھیاں مصیبت میں مبتلا ہو گئیں اور ۱۸۲۹ء-۳۲ء کے تجارتی بحران نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ یورپی اصول کے مطابق کاروبار کرنے والے بنکوں کی حیثیت ابتداءً مشترک سرمایہ بنکوں کی نہ تھی اور نہ موجودہ زمانے میں ان کی یہ خصوصیت ہے۔ یورپی فرم مثلاً کاکس یا گرنڈلے اور جہازرانی کی کمپنیاں مثلاً پننسولر اینڈ اورین ٹل اپنے کاروبار کے ساتھ ساتھ بنک کاری بھی کرتی ہیں۔ پہلا خالص بنک کاری کا ادارہ جو یورپی اصول کے مطابق کاروبار کرتا تھا "بنک آف ہندوستان" تھا جو مسرز الکزنڈر اینڈ کمپنی نے کلکتے میں کھولا تھا۔ ۱۸۲۹ء-۳۲ء کے بحران میں جبکہ دوسرے فرموں کے ساتھ مسرز الکزنڈر اینڈ کمپنی ۱۸۳۱ء
دیوالیہ ہو گئی، یہ بنک بھی بند ہو گیا۔ اس کے تباہ ہونے پر ایک اور بنک بنام "یونین بنک" وجود میں آیا۔ یہ مشترک سرمایے کا بنک تھا جو کلکتے کی بڑی کوٹھیوں کے باہمی تعاون سے

کھلا تھا۔ لیکن ۱۸۴۸ء میں اس کا بھی خاتمہ ہو گیا [1]

پریزیڈنسی بنک انیسویں صدی کے اوائل میں ملک کی تجارت خارجہ کی مقدار نسبتہً کم تھی اور تجارت داخلہ کے لئے رقموں کی فراہمی کا انتظام دیسی ساہوکار کرتے تھے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ جب تجارت نے رفتہ رفتہ کی تو یورپی طرز کے بنکوں کی ضرورت محسوس ہوئی خود کمپنی کی حکومت کو اپنے بنک کاری کے کاروبار چلانے کے لئے اس معاملے میں دلچسپی لینی پڑی۔ اڑھت کی کوٹھیوں یا صرافوں پر بھروسا کرنا اس قدر گراں اور ناقابل اطمینان ثابت ہو رہا تھا کہ کمپنی کو نئے بنک کاری کے اداروں کے فروغ دینے میں ویسا تامل نہیں رہا جیسا کہ اب تک تھا۔ ان حالات میں "بنک آف بنگال" جو پریزیڈنسی بنکوں میں سب سے پرانا اور طاقتور بنک تھا، ۱۸۰۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے جاری کردہ منشور سے شہر کلکتے میں کھولا گیا۔

اس بنک کا سرمایہ ۵۰ لاکھ روپے تھا جس کے منجملہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۰ لاکھ روپے فراہم کئے تھے۔ پہلا بنک آف بمبئی ۱۸۴۰ء میں قایم ہوا۔ اس کا سرمایہ ۲۵ لاکھ روپے تھا جس میں حکومت کا حصہ بقدر ۳ لاکھ روپے تھا۔ امریکہ کی خانہ جنگی اور روئی کے قحط کے باعث سٹے کی جو گرم بازاری ہوئی اس میں حصہ لینے کی وجہ سے ۱۸۶۸ء میں یہ بنک ٹوٹ گیا۔ اسی سال دوسرا بنک آف بمبئی ایک کروڑ روپے کے سرمایے سے کھلا۔ ۱۸۴۳ء میں بنک آف مدراس ۳۰ لاکھ روپے کے سرمایے سے کھولا گیا جس کے منجملہ ۳ لاکھ روپے ایسٹ انڈیا کمپنی نے فراہم کئے تھے۔

ان تین بنکوں کے قایم ہو جانے سے یہ امکان باقی نہیں رہا کہ بنک آف بنگال کل ہندوستان کا بنک ہو جیسا کہ کچھ عرصے سے افواہ پھیلی ہوئی تھی۔

ابتدا ہی سے پریزیڈنسی بنکوں اور حکومت کے باہمی تعلقات گہرے تھے۔ چنانچہ حکومت نے نہ صرف اس کے اصل کا ایک حصہ فراہم کیا بلکہ ان کے

---

[1] ہندوستان میں اس کے بعد مشترک سرمایہ کے جو بنک قایم ہوئے ان کی ترقی پر فصل (۱۵) میں تبصرہ کیا گیا ہے۔

چند نظما کو نامزد کرنے کا بھی اس کو حق حاصل تھا۔ ۱۸۵۶ء تک معتمد اور خزانہ دار کے عہدوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے سول سرونٹ مامور ہوا کرتے تھے۔ اس کے معاوضے میں بنک چند مراعات سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ چنانچہ سب سے اہم رعایت یہ تھی کہ ان کو حکومت کی ساہوکاری کا اجارہ حاصل تھا۔ عملی طور پر نوٹ جاری کرنے کا حق اس وجہ سے بہت کم اہمیت رکھتا تھا کہ اُس پر بہت سی بندشیں عائد تھیں۔ مثلاً یہ کہ عندالطالبہ واجبات کی مجموعی مقدار ابتداءً نقد ذخائر کے تین گونہ اور بعد میں چار گونہ سے متجاوز نہ ہو۔ ۱۸۳۹ء سے نوٹوں کے اجرا کی انتہائی مقدار ۳۲ھ بھی معین کر دی گئی۔ ۱۸۶۲ء میں جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، نوٹ جاری کرنے کا حق ان بنکوں سے لے لیا گیا اور حکومت نے اپنے طور پر زر کاغذی جاری کیا۔ اس کی تلافی کے طور پر حکومت کی نقد فاضلات پریزیڈنسی کے شہروں میں پریزیڈنسی بنکوں میں رکھی گئیں۔

۱۸۷۶ء کے پریزیڈنسی بنکوں کے قانون کے بموجب حکومت نے سرمایہ کے اس حصے کو واپس لے لیا جو خود اس نے فراہم کیا تھا اور نظما معتمد اور خزانہ دار کے تقرر کے اختیار سے دست کش ہو گئی۔ اس کے بعد پریزیڈنسی بنکوں کی سرکاری حیثیت باقی نہیں رہی۔ لیکن وہ دوسرے بنکوں کے مقابلے میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے، کیونکہ وہ ۱۸۷۶ء کے خاص قانون کے تابع رہے اور حکومت اور عوام دونوں ان کو ملک کی بنک کاری کے نظام کے اہم ترین اجزا اور ہندوستانی خزانے کے نظام کا اساسی حصہ خیال کرتے تھے۔ ان کے کاروبار کا بڑا حصہ کسی معمولی بنک کی طرح ہوتا تھا، یعنی امانتوں کا جمع کرنا اور بٹہ کاٹنا۔ لیکن وہ ایک حد تک حکومت کے ساہوکار کی حیثیت سے بھی کاروبار کرتے تھے۔ مثلاً وہ حکومت ہند کے عارضی قرضۂ عامہ کا انتظام کرتے تھے اور سرکاری فاضلات کو ایک خاص اقل حد تک استعمال کرنے کا حق رکھتے تھے۔ گو وہ سرکاری بنک نہ تھے، لیکن حکومت سے ان سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رہتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۷۶ء کے خاص قانون کے بموجب حکومت کو یہ اختیار حاصل تھا کہ ان کے حسابات کی تنقیح کرے، کیفیت طلب کرے اور ان پر یہ لازم گردانے کہ اپنے حسابات کی ہفتہ واری کیفیت شایع کریں۔

اس سرکاری نگرانی کا مقصد یہ تھا کہ حکومت کے اغراض کی حفاظت کی جائے اور ملک میں بنک کاری کو مستحکم بنیادوں پر ترقی دیجائے۔

۸۔ زرِ رو خزانے کا طریق

۱۸۶۲ء اور ۱۸۷۶ء کے درمیان جملہ سرکاری فاضلات جو مستقر پر ہوتے تھے پریزیڈنسی بنکوں میں رکھے جاتے تھے۔ لیکن جب بنک آف بنگال اور بنک آف بمبئی سے سرکاری رقوم واپس لینے میں مشکلات پیش آئیں تو حکومت ہند نے ۱۸۷۶ء میں اپنے زرِ رو خزانے بمبئی، کلکتے اور مدراس میں قایم کئے۔ اس کے بعد سے سرکاری فاضلات بڑی حد تک ان ہی تینوں زرِ رو خزانوں میں رکھی جانے لگیں اور صرف چھوٹی رقمیں جو روز مرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے اور آمد سے کے لئے کافی ہوں ضلع اور تعلقے کے خزانوں میں رکھی جاتی تھیں۔ ۱۸۷۶ء میں جو نئے انتظامات عمل میں آئے ان کی بموجب حکومت نے یہ اقرار کیا کہ وہ حقیقی امانتوں اور امانتوں کی اقل ترین مقررہ مقدار کے فرق پر اگر اول الذکر موخر الذکر سے کم ہو جائے تو ان بنکوں کو سود ادا کرے گی۔ لیکن حکومت نے اس بات کا کوئی وعدہ نہیں کیا کہ وہ بنکوں میں اپنے فاضلات رکھے گی۔ درحقیقت بنکوں کے پاس نقد فاضلات عام طور پر مقررہ مقدار سے زیادہ ہی ہوتے تھے لیکن بنک اس صورت حال سے کچھ زیادہ مطمئن نہ تھے۔ سرکاری خزانوں میں محاصل کی رقم بہت کثیر مقدار میں جمع ہوتی تھی اور بیکار پھنسی رہتی تھی حالانکہ اس زمانے میں زر کے بازار میں اس کی سخت ضرورت ہوتی تھی۔ عام حیثیت سے دیکھا جائے تو ہندوستان میں نومبر تا جون گرم بازاری کا زمانہ ہوتا ہے اور جولائی تا اکتوبر سرد بازاری کا زمانہ ہے (بجز کلکتے کے جہاں جولائی تا اکتوبر گرم بازاری کا زمانہ
ہے)۔ جنوری تا اپریل چار مہینوں میں محاصل سب سے زیادہ وصول ہوتے ہیں۔ ۴۲۳
اس طرح زیادہ محاصل وصول ہونے کا زمانہ اور کاروباری گرم بازاری کا زمانہ ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ حکومت کو کاروبار کی غرض سے فاضلات کی بہت بڑی مقدار پاس رکھنی پڑتی ہے کیونکہ سال کے دوران میں جہاں محاصل بہت ہی غیر یکساں طریق پر وصول ہوتے ہیں وہاں مصارف کی رفتار یکساں رہتی ہے[۱] لیکن یہ بات عام طور پر محسوس کی گئی کہ

۱۔ دیکھو پی کے' وٹل کی کتاب (The System of Financial adminis tration in British India) صفحہ ۲۰۰ تا ۲۰۲

اپنی سلامتی کو خطرے میں ڈالے بغیر زر کے بازار کو تقویت دینا حکومت کے لئے ممکن تھا۔

عوام کو زر و خزانوں سے پریزیڈنسی بنکوں کے توسط سے قلیل مدت کے لیے قرضے دینے کے بارے میں متعدد تجاویز پیش کی گئیں ان تجاویز کے منظور کرنے میں حکومت کو اس بنا پر تامل تھا کہ ہندوستان کے خاص حالات میں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ مبادا حکومت سے اچانک مطالبات کر دیئے جائیں یا کوئی اتفاقی ضرورت پیش آجائے۔ اس کے علاوہ قرضہ دینا نہ صرف حکومت کے لئے غیر محفوظ تھا بلکہ تجارت کے لئے بھی نامناسب تھا کیونکہ اگر قوم کی پس انداز کی ہوئی رقم کی بجائے اس اصل پر بھروسا کیا جاتا تو تجارت کے مخدوش حد تک بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔ لیکن مسلسل مطالبات کی بنا پر کچھ کارروائی کی گئی۔ چنانچہ حکومت ہند نے ۱۸۹۸ء میں وزیر ہند کے پاس یہ تحریک پیش کی کہ خزانے کی فاضلات کا کاروباری اصول پر انتظام کرنے کی غرض سے ہر سال جنوری تا مئی پریزیڈنسی بنکوں کو معلنہ اقل شرح سود سے ۱ فیصد کم شرح سے روپیہ بطور قرض دیا جائے۔ وزیر ہند نے اس تجویز کو اس شرط کے تابع منظور کیا کہ ان قرضوں کی وجہ سے ہندوستان میں حکومت کے اخراجات اور مطالبات وطن کی ترسیل متاثر نہ ہونے پائے۔ اس کے علاوہ قرضے بنک کی مروجہ شرح کے حساب سے دیئے جائیں۔ چونکہ یہ شرائط بہت سخت تھیں، اس لئے حکومت سے قرضہ لینے کی بہت کم نوبت آئی۔ چیمبرلین کمیشن نے یہ تجویز پیش کی کہ رزرو خزانے کے طریق کی جزوی یا کامل تنسیخ اور ان خزانوں کی رقوم کی پریزیڈنسی بنکوں کو منتقلی کے بجائے مذکورۂ بالا شرائط کو نرم کر دیا جائے اور ابتداءً پریزیڈنسی بنکوں ہی کو بنک کی شرح سے ایا ۲ فیصد کم شرح پر قرض دیا جائے۔ جنگ عظیم کے زمانے میں حکومت نے بہت بڑی رقمیں جو مقررہ اقل مقدار سے بہت زیادہ تھیں پریزیڈنسی بنکوں میں بطور امانت رکھیں تاکہ جنگی قرضوں کے سلسلے میں عوام کے لئے شغل اصل کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ ۱۹۲۱ء میں رزرو خزانے کا طریق منسوخ
۴۴۴ کر دیا گیا اور ضلع اور اس کے تحت کے خزانوں کی رقوم کے علاوہ حکومت کے فاضلات امپیریل بنک کے صدر دفتروں اور شاخوں میں رکھی جاتی تھیں۔ یہ عمل ۱۹۳۵ء تک جبکہ رزرو بنک قایم ہوا جاری رہا۔ چنانچہ اس سال سے فاضلات رزرو بنک کے تفویض

کی جانے لگیں۔

۹۔ پریزیڈنسی بنکوں کا اجازتی اور ممنوع کاروبار

پریزیڈنسی بنک بعض قسموں کا کاروبار کرنے کے مجاز تھے اور بعض کاموں کی حد تک ان پر قیود و شرایط عائد تھیں۔ مختصر یہ کہ (۱) بنک مبادلات خارجہ کے کاروبار میں شریک نہیں ہو سکتے تھے (بجز بنک آف مدراس کے جسکو سیلون کی حد تک اس کی اجازت تھی) (۲) ان بنکوں کے لئے بیرونی ممالک سے قرضہ حاصل کرنا ممنوع قرار دیا گیا تھا؛ اور (۳) قرضے کی مقدار اور مدت اور کفالتی تمسکات کے بارے میں چند قیود اور شرایط عائد تھیں۔

اب اس کاروبار کو لیجئے جو یہ بنک کرنے کے مجاز تھے۔ وہ امانتیں لے سکتے تھے اور حکومت کے تمسکات نیز پبلک اداروں اور شخصیوں کے خاص خاص تمسکات میں روپیہ مشغول کر سکتے تھے۔ ان کو ایسی ہنڈیاں لکھنے اور ان پر بٹہ کاٹنے کی اجازت تھی جو ہندوستان میں قابل ادائی ہوں۔ وہ سکاری ہوئی ہنڈیوں اور پرامیسری نوٹوں کی کفالت پر رقم قرض دے سکتے تھے تمسکات محفوظ رکھنے کے لئے لے سکتے تھے، سونے اور چاندی کی خرید و فروخت کر سکتے تھے اور پریزیڈنسی کے شہروں میں حکومت اور بعض بلدیوں کی جانب سے قرضے کے کاروبار کا انتظام کر سکتے تھے۔ بعض قیود خاصکر لندن میں قرضہ حاصل کرنے کے متعلق ایسٹ انڈیا کمپنی کے حسد کے باعث عائد کئے گئے تھے مبادلۂ خارجہ کے کاروبار میں حصہ لینے کی ممانعت کی وجہ یہ تھی کہ اس کاروبار کو ناقابل اطمینان خیال کیا جاتا تھا۔

۱۰۔ پریزیڈنسی بنکوں کی ترقی اور اضافی حیثیت

لیکن ان تمام قیود اور موانع کے باوجود پریزیڈنسی بنکوں کو کافی ترقی اور خوشحالی میسر ہوئی۔ گو حقیقت میں جتنی ترقی ہوئی تھی اس سے زیادہ بھی ہو سکتی تھی اگر یہ بندشیں رکاوٹ پیدا نہ کرتیں پھر بھی ان ہی بندشوں کے طفیل میں بنکوں کو استحکام اور ثبات نصیب ہوا۔ جیساکہ اوپر تذکرہ کیا جا چکا ہے حکومت بنکوں میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ فاضلات رکھا کرتی تھی جو بالعموم مقررہ مقدار سے متجاوز ہو جایا کرتی تھیں اور جہاں کہیں بنکوں کی شاخیں ہوتی تھیں وہاں یہ بنک حکومت کی عام بنک کاری کا کام بھی کرتے تھے

جس کے لئے انھیں مقررہ معاوضہ ملتا تھا۔ اس کے علاوہ ان بنکوں نے نوٹوں کو مقبول عام بنانے کے لئے اپنی شاخوں میں اُن کو بھنانے کی بھی خاص سہولتیں مہیا کی تھیں۔ حکومت سے بنکوں کے اس اتحاد اور تعاون نے ان کے وقار کو بہت بڑھا دیا تھا، اور یہ چیز ان کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوئی تھی، کیونکہ اس کی بدولت نجی امانتیں اور بنک کاری کے کاروبار زیادہ نفع بخش شرائط پر ملنے لگے اور وہ ہندوستانی بنک کاری کے نظام میں اپنے امتیازی مرتبے کو برقرار رکھنے کے قابل ہو گئے۔ مندرجہ ذیل جدول سے اس ترقی کا کچھ اندازہ ہوتا ہے جو سنہ ۱۸۹۵ء سے سنہ ۱۹۲۰ء تک ان تینوں بنکوں نے کی۔

۴۳۵ (لاکھ روپے کے حساب سے)

سال	حصص	محفوظ ذخیرہ	سرکاری امانتیں	دوسری امانتیں	نقد	پیشگیات	شرح منافع
بنک آف بنگال							
سنہ ۱۸۹۵ء	۲۰۰	۶۸	۱۸۴	۶۶۷	۴۲۲	۱۳۲	۱۰
سنہ ۱۹۱۳ء	۲۰۰	۱۹۱	۳۰۱	۱۸۲۲	۸۴۰	۳۱۹	۱۴
سنہ ۱۹۲۰ء	۲۰۰	۲۱۰	۴۳۴	۳۳۹۸	۱۲۲۱	۹۱۰	۱۹ ½
بنک آف بمبئی							
سنہ ۱۸۹۵ء	۱۰۰	۵۱	۷۶	۳۵۸	۲۲۸	۱۰۵	۱۱
سنہ ۱۹۱۳ء	۱۰۰	۱۰۶	۲۰۰	۱۰۱۵	۴۷۷	۲۳۲	۱۴
سنہ ۱۹۲۰ء	۱۰۰	۱۳۰	۳۴۹	۲۷۴۸	۸۷۶	۲۹۸	۲۲

بنک آف مدراس

سنہ ۱۸۹۵ء	۵۰	۱۶	۴۵	۲۷۸	۱۴۴	۴۵	۱۰
سنہ ۱۹۱۳ء	۷۵	۷۳	۸۶	۸۰۵	۲۱۹	۱۷۷	۱۲
سنہ ۱۹۲۰ء	۵۰	۴۵	۱۱۸	۱۵۷۹	۵۰۵	۲۱۱	۱۸

جیساکہ مندرجۂ بالا جدول سے معلوم ہوتا ہے، مالی استحکام کے لحاظ سے بنک آف بنگال اول نمبر پر، بنک آف بمبئی دوسرے نمبر پر اور بنک آف مدراس تیسرے نمبر پر تھا۔ ان بنکوں کے کھلنے کے بعد سے ان میں سے کسی کے اصل میں کچھ بھی اضافہ نہیں ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصل اور مجموعی کاروبار کے درمیان عدم تناسب بڑھتا گیا۔ اس جدول سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نجی امانتوں کی مقدار خاصکر جنگ کے زمانے میں بتدریج بہت بڑھ گئی تھی۔ ان بنکوں کی حالت نقدی کے اعتبار سے مستحکم تھی، کیونکہ واجب الادا رقوم کے مقابلے میں ان کے نقد ذخائر کی مقدار اوسطاً ۳۰ فیصدی سے زیادہ رہی۔ ان بنکوں کے کاروبار کی سریع ترقی کا اندازہ صاف طور پر اس بات سے ہو سکتا ہے کہ جنگ کے زمانے میں خاصکر بنک کے مشغولات میں روزافزوں ترقی ہوئی اور مقسوم کی اعلیٰ شرحوں کا اعلان کیا گیا۔

۱۱- مبادلہ بنک (بیرونی بنک)

جیساکہ اوپر تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ مبادلۂ خارجہ کا کاروبار کرنا اور ہندوستان کے باہر سے قرضہ حاصل کرنا پریزیڈنسی بنکوں کے لئے ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ لیکن جیسے جیسے ملک کی تجارت میں توسیع ہوئی یہ دونوں کاروبار زیادہ سے زیادہ اہمیت اختیار کرتے گئے اور ایک ادر قسم کے بنکوں کے لئے جو زیادہ تر مبادلۂ خارجہ کا کاروبار کریں کافی گنجائش ہو گئی۔

ہندوستان کے مشترک سرمایے کے بنک اس کاروبار میں بہت کم حصہ لیتے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس تربیت اور تجربے سے بے بہرہ تھے جو اس کاروبار کے لئے ضروری تھی اور لندن کے زر کے بازار تک ان کی رسائی نہیں تھی۔ جنگ سے

پہلے بنک صرف ایک ہی اہم ہندوستانی مشترک سرمایہ بنک ایسا تھا جس کی ایک شاخ مبادلہ بنکوں کی طرح لندن میں قائم تھی۔ یہ انڈین اسپیشی بنک تھا۔ لیکن لندن میں اس کی شاخ بظاہر اس غرض سے کھولی گئی تھی کہ بیرون ہندوستان چاندی اور موتیوں کے متعلق بنک کے کاروبار میں سہولت پیدا کی جائے۔ دی الائنیس بنک آف شملہ (جو ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوگیا) اور ٹاٹا انڈسٹریل بنک (جو ۱۹۲۳ء میں سنٹرل بنک آف انڈیا میں ضم ہوگیا) نے بھی مبادلۂ خارجہ کا اتنا ہی کاروبار کیا جتنا کہ کسی دوسرے ہندوستان کے مبادلہ بنک نے اپنے ابتدائی چند سال میں کیا تھا[1]۔ مشترکہ سرمایے کے چند موجودہ بنک اس کاروبار میں حصہ ضرور لیتے ہیں لیکن انھوں نے اس کو بہت زیادہ فروغ نہیں دیا ہے۔

اس طرح سچ پوچھو تو مبادلۂ خارجہ کا کاروبار بیرونی بنکوں کا اجارہ ہے۔ مستحکم غیر ہندوستانی مبادلہ بنکوں کی مسابقت، لندن اور دوسرے بیرونی مرکزوں میں ہندوستانی بنکوں کی شاخوں (جو ہنڈی اور راست مبادلے کے کاروبار کے لئے ضروری ہیں) کی عدم موجودگی اور اپنے محدود مالی ذرایع کی وجہ سے ہندوستانی اب تک اپنے مبادلہ بنک قائم نہیں کرسکے۔ بیرونی مرکزوں میں شاخیں کھولنے میں حسب ذیل مشکلات ہیں۔ (۱) کثیر مقدار میں اصل نہ ہونے کی وجہ سے ان مرکزی زر کے بازاروں میں قرضہ حاصل کرنے میں دقتیں۔ (۲) بیرونی شاخوں کے خودکفیل ہونے تک کاروبار کا ابتداءً نقصان سے چلنا۔ (۳) بین الاقوامی مبادلے کا کام کرنے کے لئے تربیت یافتہ اور قابل اعتماد عملے کی عدم موجودگی۔ (۴) بیرونی بنکوں کی مخاصمت اور (۵) ہندوستان میں بیرونی بنکوں کے صدر دفتروں کی موجودگی جو ہندوستانی بنکوں کی راہ میں موانع پیدا کرتے ہیں تاکہ وہ نہ تو زر کے بین الاقوامی معاملات کا پورا حال معلوم کرسکیں اور نہ درآمدی و برآمدی ہنڈیاں یا رقمی ہنڈیاں حاصل کرسکیں[2]۔

---

[1] دیکھو ایچ سنہا کی کتاب (Early European Banking in India) صفحہ ۲۲۔

[2] دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۲۲۴، نیز جی پینڈ بکر کی کتاب (Ban Rking in India) ۱۵۶۔۱۵۷۔

ایک بہت ہی قابل تعریف کام ۱۹۳۶ء میں یہ ہوا کہ لندن میں سنٹرل بنک آف انڈیا کے زیر سرپرستی سر سوراب جی پوچکھن والا آنجہانی نے پہلا ہندوستانی مبادلہ بنک سنٹرل اکسچینج بنک آف انڈیا کے نام سے کھولا۔ یہ بنک دو سال تک کاروبار چلاتا رہا اور بہت ہی افسوس کے ساتھ یہ خبر معلوم ہوئی کہ حال (۱۹۳۸ء) میں اس کو بارکلیز بنک لندن میں ضم کر دیا گیا۔

چونکہ ہندوستان کی تجارت خارجہ میں انگلستان غلبہ رکھتا تھا اور لندن دنیا کے مالی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا، اس لئے ہندوستان میں ابتداءً انگریزوں کی جد وجہد کی وجہ سے مبادلہ بنک قائم ہوئے۔ لیکن بعد میں چلکر جیسے جیسے دوسری قوم والے بھی ملک میں آزادی سے داخل ہونے لگے، انگلستان کے سوا بعض دوسرے ملکوں کے بڑے بنکوں کی شاخیں بھی یہاں کھلنے لگیں۔ ہندوستانی تجارت کی روش میں تبدیلی واقع ہونا اور بعض بیرونی ملکوں کو جو ہندوستان کی تجارت خارجہ میں پہلے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے اب اہم حیثیت حاصل ہو جانا یہی وہ اسباب تھے جنھوں نے بیرونی ملکوں کو اپنی شاخیں یہاں کھولنے میں بہت مدد دی۔ اس طرح گو ہندوستان میں کاروبار کرنے والے مبادلہ بنک زیادہ تر ان بنکوں کی شاخیں ہیں جن کے صدر دفتر لندن میں ہیں۔ لیکن ایسے بنکوں کی تعداد بھی بڑھ گئی ہے جن کے صدر دفتر یورپ کے دوسرے ملکوں، مشرق بعید اور ریاستہائے متحدہ
میں ہیں۔ مبادلہ بنکوں کی حسب ذیل قسمیں قرار دی جا سکتی ہیں۔ (۱) وہ بنک جو ہندوستان ۴۲۷
میں بہت زیادہ کاروبار کرتے ہیں۔ (۲) وہ بنک جو ان بڑے بنکوں کی محض ایجنسیاں ہیں جو تمام ایشیا میں کاروبار کرتے ہیں۔ اول الذکر کی مثال نیشنل بنک آف انڈیا، مرکنٹائل بنک آف انڈیا، ہنری سولر اینڈ اور نیشنل بنکنگ کارپوریشن اور چارٹرڈ بنک آف انڈیا ہیں۔ موخر الذکر کی مثال انٹرنیشنل بنکنگ کارپوریشن، بنک آف ٹائیوان، دی یکوہاما اسپیشی بنک، اور بنکو نیشنیل الٹرامیر بنو ہیں۔

۱۲۔ مبادلہ بنکوں کا کاروبار اور موجودہ حالت

ابتداءً مبادلہ بنکوں کا کاروبار زیادہ تر ہندوستان کی تجارت خارجہ کے لیے رقم مہیا کرنے تک محدود رہا۔ لیکن حالیہ زمانے میں اکثر بنکوں نے ان مقامات میں جہاں ان کی شاخیں ہیں اندرونی تجارت کے لئے قرضہ فراہم کرنے میں بھی کافی حصہ لیا ہے مثلاً دہلی اور امرتسر کے کپڑے کی تجارت اور کانپور کی چمڑے کی تجارت کے لئے زیادہ تر وہی مالی ذرایع مہیا کرتے ہیں۔ یہ بنک معمولی بنکوں کے طرز پر بھی تھوڑا بہت کاروبار کرتے ہیں لیکن ہندوستان

میں ان کا اصل کاروبار بیرونی ہنڈیاں خرید کر اور ان پر بٹہ کاٹ کر بیرونی تجارت کے لئے مالی وسائل مہیا کرنا ہے۔ درآمد کی ہنڈیوں کی خرید و فروخت انگلستان اور دوسرے بیرونی مرکزوں میں ہوتی ہے اور وہ ہندوستان میں قابل ادائی ہوتی ہیں۔ لیکن مبادلہ بنکوں کا ہنڈیوں کا سب سے زیادہ کاروبار برآمدی ہنڈیوں کے متعلق ہوتا ہے۔ یہ برآمدی ہنڈیاں ہندوستان سے مال برآمد کرنے والے ان امانتوں کے مقابلے میں لکھتے ہیں جو لندن کے سامان درآمد کرنے والے لندن کے بنکوں یا ساہوکاری کوٹھیوں میں اپنے حساب میں جمع کراتے ہیں۔ یہ ہنڈیاں جو بالعموم وصول ہونے کے تین مہینے کے بعد واجب الادا ہوتی ہیں ان کی نوعیت زیادہ تر "قبولیت طلب ہنڈیوں" کی ہوتی ہے۔ انھیں "ڈی" اے بلز"[1] کہا جاتا ہے۔ البتہ چند ہنڈیوں کی نوعیت "میعادی دستاویزات" کی ہوتی ہے۔ انھیں "ڈی" پی بلز"[2] کہا جاتا ہے۔ ڈی' پی بلز واپس ہونے تک یا ختم میعاد پر ادا ہونے تک مبادلہ بنکوں کے لندن کے دفتروں میں رکھی رہتی ہیں۔ ڈی' اے بلز سکارے جانے کے فوراً بعد بٹے پر فروخت یا مکرر فروخت کی جاتی ہیں سلطنت متحدہ میں بٹے پر ان کی مکرر فروخت یا تو انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کے مشترک سرمایے کے بنک کرتے ہیں یا بنک آف انگلینڈ کرتا ہے۔ اس طرح مبادلہ بنک ہندوستان میں جتنے روپے ادا کرتے ہیں ان کے مساوی رقم انھیں اسٹرلنگ کی شکل میں واپس مل جاتی ہے۔ اگر تجارت میں سرد بازاری ہو اور ہندوستان میں فنڈ سے کام لینے کی فوری ضرورت نہ ہو تو اس کا امکان ہوتا ہے کہ ان ہنڈیوں کو یہ بنک اپنے پاس میعاد ختم ہونے تک رکھیں[3]۔ اس طرح زیادہ تر برطانوی بنکوں کے فنڈ ہی ہندوستان کی برآمدی تجارت کے لئے

---

[1] (Documents on Acceptance) (D.A. Bills ۔

[2] (Documents on Payment) D.P. Bills)

[3] ۔ ہندوستان اور یورپ ریاستہائے متحدۂ امریکہ اور نوآبادیات کی باہمی تجارت میں ہنڈیاں زیادہ تر اسٹرلنگ کے حوالے سے لکھی جاتی ہیں۔ اس کے برخلاف ہندوستان اور جاپان کے درمیان ہنڈیوں کا لین دین "ین" کی شکل میں ہوتا ہے۔ ہندوستان اور چین کے درمیان ہنڈیاں روپوں کی شکل میں لکھی جاتی ہیں۔

مالی ذرایع مہیا کرتے ہیں۔ لندن کے بازار میں ایک طرف ہندوستان کے مقابلے میں بٹے کی بالعموم ادنیٰ شرح ہوتی ہے تو دوسری طرف ہنڈیوں پر مکرر بٹہ کاٹنے کی سہولتیں موجود ہیں جن سے مبادلہ بنکوں کو بہت مدد ملتی ہے۔ کیونکہ وہ جتنی ہنڈیاں ختم میعاد تک اپنے پاس رکھ سکتے ہوں ان سے کہیں زیادہ خرید سکتے ہیں۔ ہندوستان کے مشترک
سرمایہ کے بنکوں کی حد تک اس سہولت کی عدم موجودگی ان کے لئے اس بات کو انتہائی ۴۳۸
مشکل بنا دیتی ہے کہ مبادلہ بنکوں سے مسابقت کریں جو مستقل اور مستحکم سہولتوں کی بدولت کثیر منافع حاصل کرتے ہیں۔

جب مبادلہ بنک ہندوستانی برآمد کی ہنڈیاں خریدتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ ان کا فنڈ لندن کو منتقل کیا جائے۔ اپنے فنڈ کو ہندوستان واپس لانے کے لئے مبادلہ بنک لندن میں کونسل بلز اور برقی انتقالات اس وقت تک خریدا کرتے تھے جب یہ طریقہ موجود تھا۔ آجکل وہ فنڈ کی منتقلی کا یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ ریزرو بنک آف انڈیا کو (جو وزیر ہند کو اسٹرلنگ کی شکل میں رقم ارسال کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے) اپنے لندن کے فاضلات کے مقابلے میں اسٹرلنگ فروخت کرتے ہیں۔ وہ ہندوستان میں اپنے فنڈ میں اضافہ کرنے کے لئے دوسرے طریقے بھی اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً درآمدی ہنڈیوں کو ختم میعاد پر نقد کرتے ہیں؛ ڈرافٹ فروخت کرتے ہیں؛ ہندوستانی طلباء ہندوستان سے باہر جانے والے سیاحوں اور دوسرے اشخاص کے لئے جو ہندوستان سے باہر روپیہ بھیجنا چاہتے ہوں برقی انتقالات بھیجتے ہیں؛ لندن میں روپے کی ہنڈیاں خرید کر ہندوستان میں فروخت کرتے ہیں۔ آخری طریقہ یہ ہے کہ جب توازن تجارت بہت موافق ہوتا ہے تو وہ لندن، مصر اور آسٹریلیا سے سونے اور چاندی کی اینٹیں اور ساورن درآمد کرتے ہیں۔ اس طرح جب ادائیوں کا توازن ہندوستان کے خلاف ہوتا ہے تو مبادلہ بنک سونا یا چاندی ہندوستان سے باہر بھیجتے ہیں۔ سابق میں جب کبھی حکومت ہند ریورس کونسلز فروخت کرتی تھی مبادلہ بنک ان کو خریدا کرتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں ریزرو بنک آف انڈیا قائم ہونے کے بعد سے لندن کو اسٹرلنگ روانہ کرنے کے لئے مبادلہ بنک اس بنک سے اسٹرلنگ ڈرافٹ خرید سکتے ہیں۔

ہندوستان کی درآمدی تجارت کے لئے رقم کا انتظام یا تو ڈی، پی ڈرافٹ کے
ذریعے سے کیا جاتا ہے جو وصول ہونے کے ۶۰ یوم بعد واجب الادا ہوتے ہیں۔
اور ہندوستان کے سامان درآمد کرنے والوں کے نام لکھے جاتے ہیں یا "ہاوزپیپر"
Housepaper کے ذریعے سے جن کو لندن کے بنک سکارتے ہیں۔ اول الذکر طریقہ
بالعموم اس صورت میں اختیار کیا جاتا ہے جبکہ ہندوستان کے لوگ سامان درآمد کرتے ہیں۔
ان ڈرافٹوں کو (جو بحوالہ اسٹرلنگ لکھے جاتے ہیں) لندن میں مبادلہ بنکوں میں بٹہ کٹنے
کے بعد مبادلہ بنکوں کے توسط سے رقم وصول کرنے کے لئے ہندوستان بھیجدیا جاتا ہے
جہاں مبادلہ بنک ان کو قبولیت اور ادائی کی غرض سے سامان درآمد کرنے والوں کے
پاس پیش کرتے ہیں۔ لیکن سامان درآمد کرنے والے رقم کی ادائی سے قبل سامان حاصل
کر سکتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ مبادلہ بنکوں کے پاس کفالت نامے داخل کرکے رقم کی
کامل ادائی تک بنکوں کے امین کے طور پر سامان اپنی تحویل میں لے لیتے ہیں۔ رہا دوسرا
طریقہ تو اس سے سامان درآمد کرنے والے وہ یورپی فرم مستفید ہو سکتے ہیں جن کی معتبر
کوٹھیاں لندن میں ہوں۔ یہ کوٹھیاں مبادلہ بنکوں کی لندن کی شاخوں کے نام ہنڈیاں
لکھتی ہیں جو ان ہنڈیوں کو سکارتی ہیں۔ اس کے بعد ہنڈیوں پر لندن کے زر کے
بازار میں سہولت سے بٹہ کٹایا جا سکتا ہے۔ لندن کے سکارنے والے بنک متعلقہ
دستاویزات اپنی ہندوستانی شاخوں کے پاس بھیجدیتے ہیں تاکہ وہ ہندوستان میں سامان
کی قیمت وصول کرلیں۔ یہ رقم لندن کو یا تو ہنڈیوں کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی
روانہ کردی جاتی ہے یا مدت ختم ہونے پر جبکہ ان کی ادائی کی جائے۔ ہندوستان کی
۴۳۹ درآمدی تجارت کے لئے رقم کا انتظام کرنے میں زیادہ تر حصہ مبادلہ بنکوں کے وہ
صدر دفتر اور شاخیں لیتی ہیں جو ہندوستان کے باہر ہیں۔ اس کاروبار میں مبادلہ بنکوں کی
ہندوستانی شاخوں کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ درآمدی ہنڈیوں کی مدت ختم ہونے پر
ان کی رقم وصول کریں اور اپنی شاخوں کو ہنڈی لکھنے والوں کی مالی حیثیت و حالت کے
متعلق معلومات فراہم کریں۔ برآمدی ہنڈیوں کے برعکس درآمدی ہنڈیوں پر ہندوستان
میں مکرر بٹہ نہیں کاٹا جاتا۔ اس طرح برآمدی تجارت کے مقابلے میں کہیں زیادہ درآمدی
تجارت کے لئے رقوم کا انتظام مبادلہ بنکوں کے فنڈ سے کیا جاتا ہے۔ درآمدی ہنڈیوں کی

بڑے پر خرید و فروخت کو فروغ دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ ہنڈیاں روپے کے حوالے سے لکھی جائیں اور حتی الامکان "ڈی ۔ اے بلز" کی شکل میں ہوں۔ ان اصلاحات کی بدولت ہندوستان کے سامان درآمد کرنے والوں کی جائز شکایات بھی اس سلسلے میں دور ہو جائیں گی۔

کینس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بادی النظر میں ہندوستان کے مالی نظام کے استحکام کو اس وجہ سے خطرہ لاحق ہے کہ اس کے زر کے بازار کو زیادہ تر ایسے سرمایے سے تقویت پہنچتی ہے جو مستقل طور پر نہیں بلکہ قلیل مدت کے لئے ایک بہت ہی دور کے بیرونی مرکز میں مہیا کیا جاتا ہے[ل] لیکن حالیہ سالوں میں خود ہندوستان ہی میں اس سرمایے کو روز افزوں زیادہ مقدار میں فراہم کرنے میں مبادلہ بنکوں کو جو بڑی کامیابی ہوئی ہے اور جس کا حال مندرجۂ ذیل جدول سے معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ سے لندن کے زر کے بازاروں پر مبادلہ بنکوں کا انحصار اس حد تک گھٹ گیا ہے۔

(لاکھ روپے کے حساب سے)

سال ۳۱/دسمبر	مبادلہ بنکوں کی تعداد	امانتیں (ہندوستان میں)	سال ۳۱/دسمبر	مبادلہ بنکوں کی تعداد	امانتیں (ہندوستان میں)
۱۸۷۹ء	۳	۵۲	۱۹۲۳ء	۱۸	۶۸۴۴
۱۸۹۰ء	۵	۷۵۳	۱۹۲۶ء	۱۸	۷۱۵۴
۱۹۰۰ء	۸	۱۰۵۰	۱۹۲۸ء	۱۸	۷۱۱۴
۱۹۱۰ء	۱۱	۲۴۷۹	۱۹۲۹ء	۱۸	۶۶۶۶
۱۹۱۳ء	۱۲	۳۱۰۳	۱۹۳۱ء	۱۸	۶۷۴۷
۱۹۱۸ء	۱۰	۶۱۸۵	۱۹۳۳ء	۱۸	۷۰۷۸
۱۹۲۰ء	۱۵	۷۴۸۰	۱۹۳۴ء	۱۷	۷۱۴۰
۱۹۲۱ء	۱۷	۷۵۱۹	۱۹۳۵ء	۱۷	۷۶۱۸

ل ۔ دیکھئے، ام کینس کی کتاب "کرنسی اور مبادلہ" صفحہ ۲۱۲۔

اس طرح گو ہندوستان میں امانتیں حاصل کرنے میں مبادلہ بنکوں سے نے بہت نمایاں کامیابی حاصل کی، پھر بھی سلامتی کی خاطر مناسب یہی ہے کہ انگلستان یا ہندوستان میں جو رقمیں نسبتۂ کم مہلت پر حاصل کی جائیں وہ ان مقاموں کے موجود اثاثے سے متجاوز نہ ہوں [1] یہ بھی ضروری ہے کہ امانتوں کے سلسلے میں ان کے ذمے جو رقوم واجب الادا ہوں ان کی ادائی کے لئے کافی نقد ذخیرہ رکھا جائے۔ ہندوستان کی حالیہ بنک کاری کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ انگلستان کے پانچ بڑے بنکوں میں سے ایک ہندوستان میں آگیا ہے۔ جس کا باعث یہ ہوا کہ لائڈز بنک نے کاکس اینڈ کو کا کاروبار خود لے لیا ہے۔

مندرجۂ ذیل جدول سے مبادلہ بنکوں کی حالت کا جو ۳۱ر دسمبر ۱۹۳۵ء ۴۴۰
کو تھی ایک عام اندازہ ہوتا ہے۔

نقد فاضلات: ہندوستان میں [4]	نقد فاضلات: ہندوستان سے باہر	امانتیں: ہندوستان میں	امانتیں: ہندوستان سے باہر	محفوظ ذخیرہ اور گلہ	ادا شدہ اصل	بنکوں کی تعداد
(۱۰۰۰ روپے)	(۱۰۰۰ پاؤنڈ)	(۱۰۰۰ روپے)	(۱۰۰۰ پاؤنڈ)	(۱۰۰۰ پاؤنڈ)	(۱۰۰۰ پاؤنڈ)	
۷۷۳۲۲	۱۱۷۳۳	۵۰،۴۹،۶۵	۶۷،۴۹۳	۸۹۸۵	۱۰،۰۱۹	الف [2] ۷
۴۸۱۸۶	۱۹۹۵۷۲	۲۵،۶۸،۶۸	۹۷۸،۹۷۳	۴۹۰۰۱	۴۹،۰۲۹	ب [3] ۱۰

[1] - دیکھو کینیس کی کتاب محولۂ صفحہ ۲۱۲ - ۲۱۳۔

[2] - الف سے مراد ایسے بنک جو اپنے کاروبار کا بڑا حصہ ہندوستان میں کرتے ہیں اور جن کی امانتوں کا ۲۵ فیصد یا اس سے زائد حصہ ہندوستان میں رہتا ہے۔

[3] - ب سے مراد ایسے بنک ہیں جو محض بنک کاری کی ان بڑی کمپنیوں کی ایجنسیاں ہیں جو اپنے کاروبار کا بڑا حصہ ہندوستان سے باہر کرتی ہیں اور جن کی امانتوں کا ۲۵ فیصد سے بھی کم حصہ ہندوستان میں رہتا ہے۔ دیکھو ایک رپورٹ Statis tical Table relating to Banks in India شائع شدہ ۱۹۳۵ء صفحہ ۵۔

[4] - ان میں وہ فاضلات شامل ہیں جو رزرو بنک آف انڈیا میں رکھے گئے ہیں۔

۱۳ بیرونی بنکوں پر بندشیں

یہ مسئلہ کہ قومی اغراض کے تحفظ کے لئے بیرونی بنکوں پر چند بندشیں عائد کی جائیں ملک میں غیر ملکی اصلدارانہ جد و جہد کی نگرانی کے عام مسئلے کا ایک حصہ ہے۔ چنانچہ اس پر پہلے بحث کی جا چکی ہے[1] اور موجودہ مبادلہ بنکوں جیسے بنک کاری کے بیرونی اداروں کی نگرانی کی حمایت انھی دلائل پر مبنی ہے جن کو اس بحث کے دوران میں واضح کیا جا چکا ہے۔ ہندوستان میں بنک کے کاروبار میں بیرونی اصل کے شغل کے بارے میں قومی نقطۂ نظر سے وہی اعتراضات کئے جاتے ہیں جو دوسرے کاروبار میں بیرونی اصل کو مشغول کرنے کے بارے میں کئے جاتے ہیں اور اسی بنا پر کم و بیش سختی کے ساتھ اس کی روک تھام کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کی تجارت خارجہ میں ہندوستانیوں کا حصہ ۶ ارب روپے کے مجموعی کاروبار میں ۱۵ فیصد سے بھی کم ہے۔[2] اس طرح غیر ہندوستانیوں کو کمیشن دلالی اور بیمہ کی رقم ملنے کی وجہ سے ہندوستان کو کافی نقصان ہوتا ہے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کی تجارت خارجہ میں غیر ملکی عنصر کے غلبے کی وجہ یہ ہے کہ غیر ملکی مبادلہ بنک اپنے ہم قوموں کو جو ہندوستان میں کاروبار کرتے ہیں بہت بڑی سہولتیں مہیا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، ہندوستان کی تجارت خارجہ کے لئے رقم کا انتظام کرنے کا اجارہ تقریباً سب کا سب مبادلہ بنکوں کو حاصل ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ یہ بنک اپنی اجارہ دارانہ حیثیت سے اس طرح کام لیتے ہیں کہ ہندوستانی تاجروں کو نقصان پہنچتا ہے[3]

---

[1] جلد اول، باب ۱۳ فصل ۱۵ - ۱۸ -

[2] کساد بازاری سے پہلے کے اعداد ہیں۔

[3] بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے ہندوستان کے متعدد تجارتی اداروں نے مختلف شکایتیں کیں۔ مثلاً یہ کہ مبادلہ بنک غیر ممالک کے سامان برآمد کرنے والوں کو ہندوستانی کاروباری کوٹھیوں کے متعلق غیر اطمینان بخش بنکوں کے حوالے دیتے تھے، ہندوستان کے سامان درآمد کرنے والوں کو ڈی اے بلز D.A. Bills کی سہولتیں حاصل نہیں تھیں، ہندوستان کے سامان درآمد کرنیوالے فرموں سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ سامان کی قیمت کی ۱۰ تا ۱۵ فیصد رقم مبادلہ بنکوں ہی میں اس غرض سے

۶۶۱ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے بعض گواہوں نے اس بات پر زور دیا کہ مبادلہ بنکوں کے کاروبار کی نگرانی کی جائے کیونکہ ہندوستان میں ان پر کسی قسم کی قانونی بندش عائد نہیں تھی اور وہ ان محدود قانونی ذمہ داریوں سے بھی مستثنیٰ تھے جو ہندوستان میں رجسٹری شدہ ہندوستانی مشترک سرمایہ بنکوں پر عائد کی گئی تھیں جس کی وجہ سے مبادلہ بنکوں کے ہندوستانی کاروبار کے متعلق کوئی علیحدہ معلومات حاصل نہیں ہوسکتی تھیں اس کے علاوہ اس امر پر بھی زور دیا گیا کہ ان کو ہندوستان میں امانتیں لینے کا اختیار تو دیا گیا تھا لیکن ہندوستانی امانت رکھنے والوں کی کوئی حفاظت نہیں کی گئی تھی۔ آخر میں جاپان جیسے دوسرے ملکوں کی طرح وسیع قومی نقطۂ نظر سے ان بنکوں کے کاروبار پر نگرانی کی حمایت کی گئی ہے جس کا مقصد مبادلہ بنکوں کی مبینہ مخالف ہندوستان پالیسی کی اصلاح کرنا اور ہندوستانی تاجروں کی مشکلات کو دور کرنا ہے (بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۴۴۷)۔ کمیٹی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ متعدد ملکوں کے قوانین میں ایسی دفعات موجود ہیں جنکے بموجب کوئی مستند ادارہ اجازت ناموں کے ذریعے بیرونی بنکوں کی نگرانی کر سکتا ہے۔ اس لیے کمیٹی نے سفارش کی کہ ہندوستان میں بھی اسی طرح کا طریق رائج کیا جائے تاکہ اس سے نہ صرف امانت رکھانے والوں کے اغراض کی حفاظت ہو بلکہ بیرونی ممالک میں ہندوستانی بنکوں کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کئے جانے کا یقین حاصل ہو۔ اس کے علاوہ اس ملک میں کاروبار کرنے والے بنکوں کی نگرانی کے لئے رزرو بنک کو کچھ نہ کچھ اختیار دیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ غیر ملکی بنکوں کی درخواستوں پر غور کرنے اور مناسب

بقیہ حاشیہ مضمون صفحہ گذشتہ ۔۔۔ وہ شرط رکھیں کہ ان کے نام اعتباری رقم منظور کیا جا سکے۔ (بیرونی کوٹھیوں پر ایسی کوئی شرط عائد نہیں کی گئی ہے)، درآمدی ہنڈیاں اسٹرلنگ کے حوالے سے لکھی جاتی ہیں اور ان پر شرح سود بھی بہت زیادہ (۶ فیصد) لگائی جاتی ہے، ہندوستانی جہازرانی اور بیمے کی کمپنیوں کے خلاف تخصیص پیدا کی جاتی ہے، مبادلہ بنک ہندوستانیوں کو ذمہ دارانہ عہدوں پر مامور نہیں کرتے وغیرہ۔ (دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۴۳۹ - ۴۴۵)۔ رپورٹ میں یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ حکومت ہند کو چاہیے کہ مبادلہ بنکوں سے بات چیت کرکے مناسب قواعد مرتب کرے تاکہ مختلف شکایتیں دور کی جا سکیں۔

صورتوں میں اجازت نامے عطا کرنے کے لئے رزرو بنک ہی سب سے موزوں ادارہ ہوگا۔ لیکن کمیٹی نے یہ بھی مشورہ دیا کہ جو بنک پہلے سے قائم ہوں ان سے رواداری کرتے ہوئے ان کو آزادی کے ساتھ اجازت نامے دیئے جائیں۔ ہر اجازت نامہ ایک معین مدت کے لئے جاری کیا جائے اور اس کی تجدید کی جائے اگر اجازت نامہ دینے والے ادارے کو اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ ہندوستانی قانون کی ان دفعات کی جن کا بنک پر اطلاق ہو سکتا ہو اور دوسری شرایط کی جو اجازت نامے میں درج ہوں تعمیل کی گئی ہے۔ جو غیر ہندوستانی بنک ہندوستان میں کاروبار کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے اجازت نامہ کی حسب ذیل شرایط کی پابندی لازم ہونی چاہیئے:۔

(۱) رزرو بنک کے پاس سالانہ گوشوارے بھیجے جائیں جن میں رزرو بنک کی ہدایت کے مطابق واجبات اور واصلات درج ہوں۔

(۲) آیندہ چند سالوں تک رزرو بنک کے پاس ہندوستانی اور غیر ہندوستانی کاروبار کی کیفیت پیش کریں۔

(۳) دوسری شرایط جوابی برتاؤ کے طور پر عائد کی جا سکتی ہیں۔ غیر ممالک کے قوانین وہاں کاروبار کرنے والے غیر ملکی بنکوں پر مختلف بندشیں عائد کرتے ہیں ۴۴۲
ہندوستان کے غیر ملکی بنکوں کو اجازت نامہ دیتے وقت اگر اسی طرح کی بندشیں اور شرایط عائد کرنے کا اختیار حکومت ہند کو حاصل ہو تو وہ غیر ہندوستانی بنکوں کے ساتھ جوابی سلوک کرنے کے قابل ہو جائے گی۔ (دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۴۵۱)۔

لیکن مسٹر مانو صوبیدار کا یہ خیال ہے کہ اجازت ناموں کے طریق کا اطلاق صرف بیرونی بنکوں پر کرنا چاہیئے تاکہ ہندوستان میں بنک کاری کا میدان صرف ان اداروں کے لئے محفوظ رہے جن کی رجسٹری ہندوستان میں ہوئی ہو۔ بیرونی بنکوں کو اجازت نامہ دینے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف طبقوں اور اداروں کو غیر مستند بیرونی بنکوں کی بے ضابطگیوں، ناواجب مسابقت اور معاشرت وقومیت کے خلاف طرز عمل سے محفوظ رکھا جائے۔ بیرونی بنکوں کا یہ مطالبہ کہ ان کے ساتھ ہندوستانی بنکوں کے مساوی برتاؤ کیا جائے یہ معنی رکھتا ہے کہ ہر قسم کی نگرانی ان پر سے

اٹھالی جائے۔ مسٹر مانو صوبیدار کے خیال میں ہندوستان میں کاروبار کرنے والے مبادلہ بنکوں پر بندشیں عائد کرنے کے لئے جوابی برتاؤ کا طریق بالکل ناموزوں ہے کیونکہ موجودہ زمانے میں صرف ایک یا دو ہندوستانی بنک ایسے ہیں جن کا کاروبار ہندوستان سے باہر چل رہا ہے۔ اس طریق کو اختیار کرنے کے یہ بھی معنی ہوں گے کہ مختلف ملکوں کے بنکوں پر جو یہاں کاروبار کریں مختلف بندشیں عائد کی جائیں۔ آخری دلیل یہ ہے کہ جوابی برتاؤ کے طریق کے تحت برطانوی بنک جن کی تعداد سب بنکوں سے زیادہ ہے قانون کی گرفت سے بچ نکلیں گے کیونکہ برطانیہ عظمیٰ میں بیرونی بنکوں پر صرف چند ہی بندشیں ہیں۔ مسٹر مانو صوبیدار کی یہ تجویز ہے کہ اجازت نامہ حسب ذیل شرائط کے ساتھ جاری کیا جائے۔

(۱) اجازت یافتہ بنک ہندوستان میں ہندوستانی باشندوں یا مشترک سرمایہ بنکوں سے جو ہندوستان میں رجسٹری شدہ ہوں امانتیں نہ لیں۔

(۲) اجازت یافتہ بنک کو چاہیئے کہ اپنی شاخیں صرف بندرگاہوں کے علاقے تک محدود رکھے اور کوئی شاخ اندرون ملک نہ کھولے۔

(۳) مذکورۂ بالا شرائط کا مقصد فوت کرنے یا کسی اور غرض سے ہندوستانی اداروں میں براہ راست یا بالواسطہ انتظامی حقوق حاصل نہ کریں۔ بیرونی بنکوں کی موجودہ شاخیں اندرون ملک سے پانچ سال کے اندر ہٹالی جائیں۔

(۴) ان بنکوں کی ہر شاخ میں بجز ایک مینیجر اور ایک مددگار کے باقی تمام عملہ ہندوستانی ہونا چاہیئے۔ (دیکھو اقلیت کی رپورٹ' بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۲۰۴)[۱]

۱۴۔ ہندوستانی مبادلہ بنک کھولنے کی تجویز۔ بیرونی بنکوں پر ان بندشوں کے عائد کرنے سے موجودہ صورت حال کی خواہ کتنی ہی اصلاح کیوں نہ ہو' یہ بندشیں ایک بنیادی کمزوری کو دور نہیں کرسکتیں جو اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ درآمدی و برآمدی

[۱] جدید دستور کے تحت جو قانون حکومت ہند (۱۹۳۵ء) کی رو سے قائم ہوا ہے ہندوستان میں کاروبار کرنے والے برطانوی بنکوں پر صرف وہی بندشیں عائد کی جاسکتی ہیں جو برطانیہ میں کاروبار کرنیوالے ہندوستانی بنکوں کے لئے ہیں۔

بنک کے انتظام کے لئے بنک کے صدر دفتر میں سات اشخاص کی ایک مجلس بنائے" ساتھ ہی اہم مرکزوں میں جہاں بنک کی شاخیں موجود ہوں پانچ پانچ اشخاص کی مجالس قایم کرے اور نہ صرف مرکزی بلکہ مقامی مجالس کے ارکان کی نامزدگی خود ہی کرے۔ یہ اطمینان کرنے کے لئے کہ بنک کی ابتدا اچھی ہو سرکاری رقوم کی ترسیل اس بنک کے توسط سے کی جائے۔ جب زرزو بنک قائم ہو جائے تو کھلے بازار میں حکومت کی طرف سے کاروبار کرتے وقت مبادلہ بنک محض زرزو بنک کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرے۔ تمام عملہ ہندوستانی ہونا چاہئے بجز اس صورت کے جبکہ رکن مالیہ ابتدا میں چند سالوں کے لئے باہر سے کسی غیر ملکی ماہر کی خدمات لینا مناسب سمجھے۔ (دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۳۰) ان چھ ارکان کا یہ خیال ہے کہ جہاں ہندوستانی مبادلہ بنک قائم کرنے سے ایک فوری ضرورت پوری ہوگی وہاں اکثریت کی سفارشوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کئی سال درکار ہوں گے۔

(۵) آخر میں ہم بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی ایک تجویز کی طرف توجہ مبذول کرانا مناسب خیال کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ مساوی شرکا کی حیثیت سے ہندوستانیوں اور غیر ہندوستانیوں کی نگرانی میں مشترک بنک قائم کئے جائیں۔ یہ تجویز اچھی معلوم ہوتی ہے۔ جب بین الاقوامی تجارت دو فریقوں کے درمیان ہو تو یہ بالکل معقول بات ہے کہ اس تجارت کے مالی وسائل مہیا کرنے میں دونوں ملکر کام کریں۔

۱۵ مشترک سرمایے کے بنکوں کی تاریخ

ہندوستان میں داخلی تجارت کی روز افزوں ترقی جدید طرز کی منظم بنک کاری کی متقاضی تھی۔ پریذیڈنسی بنک جو متعدد قیود میں جکڑے ہوئے نیم سرکاری ادارے تھے اور جن کی شاخیں صرف چند بڑے شہروں میں تھیں یا مبادلہ بنک جو زیادہ تر بیرونی تجارت کے لئے مالی ذرایع فراہم کرنے میں مصروف تھے ملک کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے
کے لئے کافی نہیں تھے۔ ۱۸۶۰ء تک چونکہ ہندوستان میں محدود ذمہ داری کا اصول تسلیم نہیں ۴۴۵
کیا گیا تھا منظم بنک کاری کی ترقی کی رفتار سست رہی۔ ۱۸۶۵ء کی روئی کی گرم بازاری کی وجہ سے اور روپے کی قدر مبادلہ کے گر جانے سے بمبئی میں جو مالی بحران رونما ہوا وہ بنک کاری کی ترقی میں حائل ہوا۔ محدود ذمہ داری کے اصول پر سب سے پہلے (۱۸۶۳ء میں) بنک آف اپر انڈیا کھولا گیا۔ اس کے بعد ۱۸۶۵ء میں الہ آباد بنک کھلا۔ اس طرح

چند اور بنک بھی کھلے جن میں سے ایک الائنس بنک آف شملہ (۱۸۷۴ء) تھا جو ۱۹۲۳ء میں بند ہو گیا۔ ۱۸۷۰ء میں اس قسم کے سات بنک موجود تھے۔ ۱۸۹۴ء میں ان کی تعداد بڑھ کر ۱۴ ہو گئی۔ ان میں سے اکثر یورپی انتظام کے تحت اس وقت بھی تھے اور اب بھی ہیں۔ ہندوستانی مساعی کا پہلا نمونہ اودھ کمرشل بنک تھا جو ۱۸۸۱ء میں کھلا۔ ۱۸۹۴ء میں پنجاب نیشنل بنک لالہ ہرکشن لال کی کوششوں سے قائم ہوا جو ۱۹۰۱ء میں پیپلز بنک کے قائم کرنے کے بھی ذمہ دار تھے۔ پیپلز بنک نے بہت ترقی کی یہاں تک کہ ۱۹۱۳ء میں جب کہ وہ بند کر دیا گیا اس کی تقریباً ۱۰۰ شاخیں ہو گئی تھیں اور امانتیں ۱½ کروڑ روپے سے زائد تھیں۔[1] ۱۹۰۵ء میں سودیشی کی تحریک کے سلسلے میں خاصکر مغربی ہندوستان، صوبۂ متحدہ، اور پنجاب میں بہت سے نئے بنک قائم ہوئے۔ چنانچہ بنک آف انڈیا، بنک آف برما، انڈین اسپیشی بنک، سنٹرل بنک آف انڈیا، انڈیا بنک (مدراس) پنجاب اینڈ سندھ بنک، بنک آف میسور، بنک آف بڑودہ اور بمبئی بنکنگ کمپنی نے اسی دور میں جنم لیا۔

۱۶ بنکوں کی ناکامیاں

ابتدائی چند سالوں تک ان بنکوں میں سے اکثروں نے اچھی ترقی کی۔ لیکن متعدد بنک غیر محتاط اور تخمینی نوعیت کا کاروبار کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے ذمہ رقوم واجب الادا کے مقابلے میں ان کے نقد ذخائر اس قدر قلیل تھے کہ مسٹر جے، ام، کینس جیسے ماہر اور قابل مبصر نے ان کے جلد تباہ ہو جانے کی پیش گوئی کر دی اور بہت جلد مسٹر کینس کو اپنی اس پیش گوئی کو پورا ہوتے دیکھنے کا موقع ملا۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۱۳ء کو پیپلز بنک کے ٹوٹتے ہی کئی دوسرے بنک بھی ٹوٹ گئے جن میں اسپیشی بنک بھی شامل تھا جو نومبر ۱۹۱۳ء میں ختم ہو گیا۔ ۱۴-۱۹۱۳ء میں کم سے کم ۵۵ بنک بند ہوئے۔ جنگ کے زمانے اور اس کے بعد کی گرم بازاری میں متعدد نئے بنک

[1] جے، ام کینس نے ۱۹۱۳ء میں ہندوستان میں بنکوں کے دیوالیہ ہونے سے پہلے لکھا تھا کہ:—
"جہاں تک چھوٹے بنکوں کا تعلق ہے وہ ایسے گاہکوں سے معاملہ کر رہے ہیں جن کے لئے بنک کاری ایک نئی چیز ہے اور وہ ایسے ملک میں کاروبار کر رہے ہیں جہاں رقوم کا اندوختہ کرنے کا رواج عام ہے۔ اس کے علاوہ ظاہری حالات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نقد فاضلات مایوس کن طریقے پر ناکافی ہیں۔ اس لئے اس میں شاید ہی شبہہ کی گنجائش ہے کہ آنے والے خراب زمانے میں وہ بالکل بیٹھ جائیں گے"۔ (دیکھو ان کی کتاب

کھلے لیکن کساد بازاری رونما ہوتے ہی ان میں کے اکثر بند ہوگئے۔ ۱۹۱۵ء میں ۱۱ بنک ٹوٹے، ۱۹۱۶ء میں ۱۳ بنک ختم ہوئے اور ۱۹۱۸ء میں ۱۶ بنک دیوالیہ ہوئے۔ ۱۹۱۳-۲۴ء ہندوستان میں مشترک سرمایہ بنکوں کے لئے بہت ہی نازک زمانہ تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں کم از کم ۱۶۱ بنکوں کا دوالہ نکلا۔ ان بنکوں کے اداشدہ اصل کی مجموعی مقدار کم و بیش ۶¾ کروڑ روپے تھی۔ جنگ عظیم کے بعد کے زمانے کی بنکوں کی تباہی میں سب سے زیادہ اہم الائینس بنک آف شملہ کی ۱۹۲۳ء میں تباہی ہے جس کے اثرات بہت ہی دوررس اور نقصان رساں تھے۔ امانت رکھانے والوں کو جن میں سے اکثر متوسط طبقوں سے تعلق رکھتے تھے براہ راست نقصان اٹھانا پڑا۔ لیکن اس سے زیادہ سخت نقصان اس طرح پہنچا کہ عوام کی نظروں میں بنکوں کی ساکھ متزلزل ہوگئی، عوام کے شغل اصل کے میلان میں رکاوٹ پیدا ہوگئی اور صنعت و تجارت کی ترقی کو ضرر پہنچا۔ ۷۴۷

۱۷ بنکوں کی تباہی کے اسباب

بنکوں کو تباہی اور بالخصوص اس تباہی کے اسباب جو ۱۹۱۳-۱۴ء میں ہوئی حسب ذیل ہیں:- (۱) مد امانت کی واجب الادا رقموں کے مقابلے میں نقد کا تناسب بہت قلیل یعنی اوسطاً ۱۰ اور ۱۱ کے درمیان ہونا۔ (۲) امانتیں حاصل کرنے کی غرض سے کاروباری اصول کے خلاف سود کی اعلیٰ شرحوں کا پیش کیا جانا۔ (۳) بنک کے کاروبار کے اصول اور طریقوں کی معلومات اور مہارت رکھنے والے قابل منیجروں اور نظما کا فقدان اور مجلس نظما کی طرف سے باقاعدہ نگرانی اور انتظام کی کمی[۲]۔ (۴) بعض نظما اور منیجروں کا کاروبار میں دغا و فریب کرنا۔ (۵) مجوزہ اصل اور موعودہ اصل کے درمیان اور موعودہ اصل اور اداشدہ اصل کے درمیان باقاعدہ تناسب نہ ہونا۔ (۶) امانت رکھانے والوں کا اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے فردحساب کی پرفریب ترتیب اور اعلیٰ مقصدوں سے خواہ وہ اصل ہی سے کیوں نہ ادا کئے گئے ہوں دھوکے

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گزشتہ:- موسومہ بہ ہندوستانی کرنسی اور مالیہ" صفحہ ۲۲۵۔

[۱] بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۲۹۔

[۲] اس کی مثال ایسی فوج سے دی جاسکتی ہے جو تربیت یافتہ افسروں اور اعلیٰ کمان کے احکام کے بغیر لڑائی پر جائے۔

میں آجانا۔ (۷) حکومت یا نیم سرکاری اداروں کی طرف سے خرابیوں کو دور کرنے کی غرض
سے اصلاحی تدابیر کا اختیار نہ کیا جانا[1]

بعض نقادوں نے ناسمجھی سے یہ خیال ظاہر کیا کہ بنکوں کی ان ناکامیوں سے یہ
بات ثابت ہو گئی کہ ہندوستانی جدید طرز کی منظم بنک کاری کو انجام دینے کی صلاحیت ہی
نہیں رکھتے۔ لیکن یہ بات ذہن سے نہ نکال دینی چاہئے کہ خود انگلستان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ
میں بھی جو آجکل بنک کاری کے معاملات میں دنیا کے ملکوں میں سب سے پیش پیش ہیں مشترک
سرمائے کی بنک کاری کی ابتدائی تاریخ کی عام خصوصیات اسی قسم کی ناکامیاں تھیں۔ اس کے
علاوہ جیسا کہ مسٹر دوراسوامی کا خیال ہے " اب تک جتنے ہندوستانی بنک ٹوٹے ان کی
فہرست میں سب سے زیادہ تعداد ان اداروں کی ہے جو یورپی مینجروں کے زیر انتظام
تھے"[2] چنانچہ وہ اس سلسلے میں پہلے بنک آف بمبئی (۱۸۶۶ء) اور آربتھ ناٹ بنک کی
تباہی کو پیش کرتے ہیں۔ ان ناموں میں ہم اپنی طرف سے ایک اور بڑے بنک الائینس
بنک آف شملہ کا اضافہ کرتے ہیں جو حال ہی میں ٹوٹا۔ گو بعض صورتوں میں یہ ثابت ۴۴۷
ہوا کہ فریب سے کام لیکر معاملات میں الٹ پھیر کی گئی پھر بھی بنکوں کا یوں جو بکثرت دوالہ
نکلا اس کا اصل سبب یہ تھا کہ بنکوں کے کارکن تجربہ اور معلومات نہ رکھتے تھے بنکوں کی
تباہی نے یہ بات ذہن نشین کرا دی کہ بنک کاری ناسمجھ اور دغا باز لوگوں کا کام نہیں ہے۔
بنک کاری کے نظام کی اصلاح کے لئے عہدہ داروں، نظما اور محاسبوں کا احتیاط سے
انتخاب اور بنک کاری کے محتاط طریقے اختیار کرکے بنکوں کی ناکامیوں کے امکانات
کم کئے جا سکتے ہیں۔

بنکوں کی ناکامیوں کا کم از کم ایک اچھا اثر ضرور پڑا۔ وہ یہ کہ انھوں سے

۱۔ خود بنکوں میں باہمی تعاون نہ تھا اور یورپی بنکوں کے خلاف یہ بدگمانی تھی کہ انھوں نے ہندوستانی مشترک سرمایہ بنکوں کی امداد کے لئے کچھ زیادہ مستعدی کا اظہار نہیں کیا۔ مثلاً بنک آف بنگال نے پیپلز بنک آف انڈیا کو سرکاری دستاویزات کی کفالت پر بھی قرضے دینے سے انکار کر دیا۔ خالص ہندوستانی بنکوں میں بھی باہمی تعاون و تعامل کا فقدان تھا۔

۲۔ دیکھو ایس، وی، دوراسوامی کی کتاب "ہندوستانی مالیہ کرنسی اور بنک کاری" صفحہ III

ہندوستانی بنک کاری کے نظام سے کمزور بنکوں کا خاتمہ کر دیا' اگرچہ بہت سے خراب بنکوں کے ساتھ بعض اچھے بنک بھی تباہ ہو گئے۔ اس کے علاوہ ان تباہیوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ بنک آف انگلینڈ کی طرح کا ایک مرکزی بنک ضروری ہے تاکہ وہ نازک زمانے میں بنک کاری کی عام پالسی کی نگرانی کر سکے اور یہ دیکھے کہ معمولی زمانے میں بنک کا کاروبار معقول و مستحکم طریقوں سے چلایا جا رہا ہے۔ جیساکہ فنڈلے شراس نے بتلایا ہے ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں مستحکم بنک کاری کا دار و مدار نہ صرف اچھے قواعد پر ہے بلکہ اچھے بنکروں پر بھی ہے۔ بنکوں کی تباہی نے یہ ثابت کر دیا کہ بنک کاری کے نظریے اور عمل کی مکمل تعلیم کا مناسب انتظام کسقدر ضروری تھا۔ مستحکم بنک کاری کے لئے جہاں اچھے قواعد اور اچھے تربیت یافتہ بنکر ضروری ہیں وہاں بنک کے معاملات کی وسیع اشاعت بھی مساوی طور پر ضروری ہے تاکہ کسی وقت ان کے معائنے سے عوام کو بنک کی کاروباری حالت کا فوراً اندازہ ہو سکے۔ یہ صحیح ہے کہ صرف چند ہی ایسے حصہ دار اور امانت رکھانے والے ہوں گے جو فرد حساب کی باریکیوں کو سمجھ سکیں خواہ حسابات کتنے ہی سادہ کیوں نہ ہوں۔ لیکن جو لوگ بنک کے معاملات کا بغور مطالعہ کرنا چاہیں ان کے لئے ممکنہ سہولت مہیا کرنی چاہئے۔ یہ بہت ہی اچھی بات ہوگی کہ ایسے لوگوں کی تعداد ملک میں زیادہ ہو جائے جو ہوشیار' زود فہم اور دور اندیش ہوں اور بنک کے انتظام کی تفصیلی تنقیح کرنے کی خواہش اور صلاحیت رکھتے ہوں۔ دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ خود بنک اعلیٰ روایات قائم کریں اور عوام کے سامنے جوابدہ بننے کے احساس کو ترقی دیں۔

۱۸ نقد ذخائر کی کافی مقدار رکھنے کی اہمیت

مستحکم بنک کاری کا سب سے پہلا اور اساسی اصول یہ ہے کہ نقد ذخائر کافی مقدار میں رکھے جائیں۔ لیکن اکثر ملکوں میں بنک اس فائدہ مند اصول کے اس وقت قائل ہوئے جبکہ اس کو نظر انداز کر کے غیر محتاط حرکتیں کرنے کی وجہ سے متواتر حادثات پیش آئے۔ ہندوستانی مشترک سرمایہ بنک کاری کو اس کی اہمیت کا اندازہ بنکوں کے دوالوں سے کافی نقصان اٹھانے کے بعد ہوا۔ لیکن آخر کار یہ چیز اب اچھی طرح سمجھ میں آگئی ہے اور نقد ذخائر کافی مقدار میں رکھنے کا میلان کچھ عرصے سے بہت نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔

مندرجۂ ذیل جدول سے معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے تینوں قسموں کے بنکوں نے اس سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی کس حد تک کوشش کی ہے۔

مبادلہ بنکوں کی حد تک فیصدی اعداد کا حساب صرف ان امانتوں اور نقد فاضلات پر لگایا گیا ہے جو ہندوستان میں موجود ہیں۔

۳۱/ دسمبر تک مختلف قسم کے بنکوں کی رقوم واجب الادا بمد امانت
۴۴۸ **کے مقابلے میں نقد ذخائر کا فیصد تناسب**

	۱۹۰۰ء	۱۹۰۸ء	۱۹۱۰ء	۱۹۱۳ء	۱۹۱۸ء	۱۹۲۰ء	۱۹۲۳ء	۱۹۲۵ء	۱۹۲۸ء	۱۹۳۰ء	۱۹۳۲ء	۱۹۳۵ء
(۱) امپیریل بنک آف انڈیا[1]	۴۰	۳۳	۳۱	۳۴	۴۵	۳۰	۱۸	۲۱	۱۸	۲۳	۲۳	۲۵
(۲) ا۔ مبادلہ بنک[2]	۲۹	۱۷	۱۶	۱۹	۴۰	۳۰	۱۹	۱۳	۱۵	۱۲	۱۰	۱۵
ب۔ مبادلہ بنک[3]	۳۴	۲۷	۲۱	۱۷	۱۶۰	۵۸	۲۷	۱۵	۱۰	۶	۱۳	۱۹
(۳) ا۔ مشترک سرمایہ بنک[4]	۱۲	۱۵	۱۱	۱۸	۲۵	۲۳	۱۷	۱۹	۱۴	۱۵	۱۵	۲۳
(۴) ب۔ مشترک سرمایہ بنک[5]	-	-	-	۱۶	۲۱	۱۸	۱۹	۲۰	۱۳	۱۷	۱۴	۱۶

مندرجۂ بالا اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں جنگ کے پہلے تک نقد ذخائر کا تناسب عام طور پر سب بنکوں میں کم رہا، وہاں بحیثیت مجموعی پریزیڈنسی بنکوں کی حالت اس اعتبار سے قابل اطمینان رہی۔ مبادلہ بنکوں کی حالت اس سے کم قابل اطمینان تھی اور ہندوستانی مشترک سرمایہ بنکوں کی حالت سب سے خراب تھی۔

[1] ۱۹۲۱ء سے پہلے تک پریزیڈنسی بنک تھے۔

[2] جو ہندوستان میں زیادہ تر کاروبار کرتے ہیں۔

[3] یہ ان بڑے بنکوں کی ایجنسیاں ہیں جو تمام ایشیا میں کاروبار کرتے ہیں۔

[4] ان بنکوں کا اصل اور محفوظ ذخیرہ ۵ لاکھ یا اس سے زائد ہوتا ہے۔

[5] ان بنکوں کا اصل اور محفوظ ذخیرہ ۵ لاکھ اور ۱ لاکھ روپے کے درمیان ہوتا ہے۔

جیسا کہ نقد ذخائر کے بڑھتے ہوئے تناسب سے ثابت ہوتا ہے ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۴ء کے بنکوں کے دوالوں سے بظاہر تمام قسموں کے بنکوں خاصکر ہندوستان مشترک سرمایہ بنکوں نے احتیاط سے کام لینا سیکھا۔ ان کو محتاط بنانے میں کچھ حصہ جنگ کی پیدا کی ہوئی پریشانی کا تھا جس کی وجہ سے نقد کے ذخائر کو معمول کے خلاف بڑھانا ضروری ہوگیا تھا۔ جنگ کے اختتام کے بعد سے نقد ذخیروں کا تناسب جنگ کے زمانے کے مقابلے میں کچھ کم ہوتا جارہا ہے۔ یہ صورت حال خاص توجہ کی محتاج ہے اور اس کی روک تھام کی ضرورت ہے۔ اس معاملے کی اہمیت کے مدنظر بمبئی کی بنک کاری تحقیقاتی کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی طرح یہاں بنک کاری کے اداروں کو قانوناً مجبور کیا جائے کہ نقد کا ذخیرہ کافی مقداریں رکھیں۔ لیکن مرکزی بنک کاری تحقیقاتی کمیٹی نے اس تجویز کی تائید نہیں کی۔ اس کو یہ اندیشہ ہوا کہ مبادا بنک کے منتظم اقل قانونی مقدار کو انتہائی معیار سمجھ لیں۔ اس کے علاوہ متعدد طریقوں سے قانونی لوازم سے بچنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ کمیٹی نے اس بات کو زیادہ مناسب خیال کیا کہ یہ معاملہ خود بنکوں کی صوابدید اور دوراندیشی پر چھوڑ دیا جائے۔ (دیکھو مرکزی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۴۰۶)۔ لیکن ہندوستانی کمپنیوں کے لئے مرممہ (۱۹۳۶ء) قانون کی بموجب نقد ذخیرے کی ایک اقل مقدار رکھنا ضروری ہوگیا ہے۔

۴۴۹ **۱۹ مشترک سرمایہ بنک کاری کی ترقی** — مندرجۂ ذیل اعداد[۱] سے اس ترقی کا ایک سرسری اندازہ ہوتا ہے جو مشترک سرمایہ بنک کاری نے ہندوستان میں گزشتہ کم و بیش ۶۰ سال میں کی۔

بڑے مشترک سرمایہ بنکوں کا اصل محفوظ ذخیرہ

امانتیں اور نقد فاضلات (لاکھ روپے کے حساب سے)

قسم اول۔ وہ بنک جن کا اصل اور محفوظ سرمایہ ۵ لاکھ روپیہ یا اس سے زاید ہے[۲]

سال ۳۱ دسمبر	اطلاع دینے والے بنک	اداشدہ اصل	محفوظ ذخیرہ اور کلکہ	امانتیں	نقد فاضلات
۱۸۷۰ء	۲	۹۸	۱۸	۱۳	۵

۱۔ دیکھو ہندوستانی بنکوں کے متعلق اعداد و شمار کے گوشوارے (۱۹۳۵ء) گوشوارہ نمبر (۴)

۲۔ یہ بنک رزرو بنک آف انڈیا کے قانون کے گوشوارے میں درج ہیں۔

سنہ ۱۸۸۰ء	۳	۱۸	۳	۶۳	۱۶
سنہ ۱۸۹۰ء	۵	۳۳	۱۷	۲۷۰	۵۵
سنہ ۱۹۰۰ء	۹	۸۲	۴۵	۸۰۷	۱۱۹
سنہ ۱۹۱۰ء	۱۶	۲۷۵	۱۰۰	۲۵۶۵	۲۸۰
سنہ ۱۹۱۳ء	۱۸	۲۳۱	۱۳۲	۲۲۵۹	۴۰۰
سنہ ۱۹۱۴ء	۱۷	۲۵۱	۱۴۱	۱۷۱۰	۳۵۳
سنہ ۱۹۱۸ء	۱۹	۴۳۶	۱۲۵	۴۰۵۹	۹۴۸
سنہ ۱۹۲۰ء	۲۵	۸۳۷	۲۵۵	۷۱۱۴	۱۶۳۰
سنہ ۱۹۲۱ء	۲۷	۹۳۸	۳۰۰	۷۶۸۹	۱۵۶۵
سنہ ۱۹۲۳ء	۲۶	۶۸۹	۲۸۴	۴۴۵۲	۷۳۷
سنہ ۱۹۲۵ء	۲۸	۶۷۳	۳۸۶	۵۴۴۹	۱۰۰۶
سنہ ۱۹۲۹ء	۳۳	۷۸۷	۳۶۷	۶۲۷۲	۹۰۵
سنہ ۱۹۳۲ء	۳۴	۷۸۲	۴۴۰	۷۲۳۴	۹۷۶
سنہ ۱۹۳۳ء	۳۴	۷۷۸	۴۵۵	۷۱۶۸	۱۰۹۲
سنہ ۱۹۳۴ء	۳۶	۷۹۹	۴۶۸	۷۶۷۷	۱۱۱۴
سنہ ۱۹۳۵ء	۳۸	۸۱۷	۵۰۲	۸۴۴۵	۱۹۲۱[1]

بڑے مشترک سرمایہ بنکوں کا اصل محفوظ ذخیرہ

(امانتیں اور نقد فاضلات (لاکھ روپے کے حساب سے)

قسم دوم ۔ وہ بنک جن کا اصل اور محفوظ سرمایہ ۱ لاکھ روپے اور ۵ لاکھ روپے کے درمیان ہے۔

سال (۳۱ دسمبر)	اطلاع دینے والے بنک	ادا شدہ اصل	محفوظ ذخیرہ اور گلہ	امانتیں	نقد فاضلات
سنہ ۱۹۱۳ء	۲۳	۳۹	۱۱	۱۵۱	۲۴
سنہ ۱۹۱۴ء	۲۵	۴۲	۱۳	۱۲۶	۲۷

[1] اس میں وہ فاضلات شامل ہیں جو رزرو بنک آف انڈیا میں رکھے گئے ہیں۔

۱۹۱۸ء	۲۸	۴۸	۱۴	۱۵۵	۳۶
۱۹۲۰ء	۳۳	۶۱	۱۹	۲۳۳	۴۲
۱۹۲۱ء	۳۸	۷۷	۲۳	۳۲۶	۴۳
۱۹۲۴ء	۴۳	۸۱	۳۰	۳۲۶	۶۱
۱۹۲۵ء	۴۶	۸۰	۳۷	۳۴۱	۶۷
۱۹۲۹ء	۴۵	۷۵	۴۰	۳۵۸	۴۵
۱۹۳۲ء	۵۲	۸۵	۴۴	۳۹۳	۶۸
۱۹۳۳ء	۵۵	۸۷	۴۳	۴۷۵	۸۲
۱۹۳۴ء	۶۹	۹۴	۵۴	۵۱۱	۷۱
۱۹۳۵ء	۶۷	۹۴	۵۷	۵۴۴	۸۵

۳۱/دسمبر ۱۹۳۵ء کو ہندوستان میں ۱۰۵ ایسے مشترک سرمایہ بنک تھے جن کا اصل اور محفوظ ذخیرہ ۱ لاکھ روپے یا اس سے زائد تھا۔ ان کا اداشدہ اصل ۹ کروڑ ۱۱ لاکھ روپئے محفوظ ذخیرہ وغیرہ ۵ کروڑ ۵۹ لاکھ روپئے امانتیں ۸۹ کروڑ ۸۹ لاکھ روپے اور نقد فاضلات ۱۹ کروڑ ۷ ۹ لاکھ روپے تھے۔ امانتوں کا بیشتر حصہ ان بنکوں کے جملہ چھ بنکوں سے متعلق تھا۔ بنک آف میسور اور بنک آف بڑودہ کو چھوڑ کر جن کو سرکاری سرپرستی حاصل ہے باقی چار ادارے ایسے ہیں جو ہندوستان کی مشترک سرمایہ
۴۵۰ بنک کاری میں خالص نجی جدوجہد کی مثال ہیں۔ ان بنکوں کے نام یہ ہیں: بنک آف انڈیا سنٹرل بنک آف انڈیا، پنجاب نیشنل بنک، الہ آباد بنک (کلکتہ)[۱]۔ ان میں سے صرف سنٹرل بنک آف انڈیا اور پنجاب نیشنل بنک ہندوستانی انتظام کے تحت کام کر رہے ہیں۔ مندرجۂ بالا جدول سے حسب ذیل امور معلوم ہوتے ہیں۔ (۱) ۱۹۱۳ء-۱۹۱۴ء کے دوالوں کی وجہ سے بنک کاری میں رکاوٹ پیدا ہوگئی۔ لیکن (۲) ۱۹۱۵ء سے بنک کاری کے وسائل خاصکر امانتوں میں بتدریج اضافہ ہوا یہاں تک کہ یہ امانتیں ۱۹۲۱ء میں بڑھکر

[۱] دیکھو گیبے کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۴-۵۔

۸۰ کروڑ روپئے تک پہنچ گئیں (اس ترقی کا باعث کسی حد تک یہ تھا کہ جنگ کے زمانے میں امانتوں میں اضافہ ہوگیا تھا اور جنگ کے بعد کی گرم بازاری میں بنک کاری کی نئی کمپنیاں قائم ہوئی تھیں)۔ (۳) ۱۹۲۱ء سے جو تنزل شروع ہوا وہ ۱۹۲۳ء میں جو جنگ کے بعد کے زمانے میں بنکوں کے لئے منحوس سال تھا خاص طور پر نمایاں ہوگیا۔ (۴) اس کے بعد بحالی کے آثار نمودار ہوئے۔ بحیثیت مجموعی معاشی کساد بازاری نے امانتوں کے بارے میں بنکوں کی حالت پر برا اثر نہیں ڈالا جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اصل دائمہ کو آزادی کے ساتھ کام میں نہیں لگایا گیا اور جو سونا برآمد ہوا اس کی قیمت کا ایک حصہ بنکوں کو منتقل کر دیا گیا تھا۔ خاصکر ۱۹۳۶ء میں مشترک سرمایہ بنک کاری میں کافی توسیع ہوئی جیسا کہ خصوصاً جنوبی ہند میں بنکوں کی شاخوں کے بڑھتے ہوئے کاروبار سے ثابت ہوتا ہے (دیکھو فصل ۶۶)۔ پھر بھی مشترک سرمایہ بنکوں کی حالت کو بہت زیادہ مستحکم نہیں کہا جا سکتا۔ انکی مشکلات امپیریل بنک اور اس کی شاخوں، مبادلہ بنکوں اور ان کی اندرونی شاخوں، امداد باہمی بنکوں، ڈاک خانے کے سیونگ بنکوں اور نقد سرٹی فیکٹ کے طریقوں کی مسابقت کی وجہ سے بڑھ گئی ہیں حکومت اور سرکاری اداروں کی طرف سے بنکوں کی ابھی تک بہت کم ہمت افزائی کی گئی ہے۔

ہندوستانی مشترک سرمایہ بنکوں کی تاریخ کے دو اہم واقعات جو ۱۹۲۳ء میں رونما ہوئے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پہلا واقعہ یہ تھا کہ ٹاٹا انڈسٹریل بنک جو ۱۹۱۸ء میں کھلا تھا سنٹرل بنک آف انڈیا میں ضم ہوگیا جس نے ہندوستانی تنظیم کے تحت ملک کے سربرآوردہ بنکوں میں اپنی حیثیت آجکل ممتاز کرلی ہے۔ ہندوستانی بنک کاری میں یہ انضمام ایک استثنائی حیثیت رکھتا ہے۔ ورنہ عام طور پر اس کے خلاف رجحان پایا جاتا ہے۔

دوسرا واقعہ جس کا ۱۹۲۳ء میں بنک کاری کے حالات پر گہرا اثر پڑا یہ تھا کہ الائنس بنک آف شملہ ٹوٹ گیا۔ الائنس بنک کے ذمے امانت رکھانے والوں کی جو رقمیں واجب الادا تھیں اس کا ۵ فیصد ادا کرنے کا بیڑا امپیریل بنک نے اس شرط سے اٹھایا کہ حکومت ہند اس بات کی ذمہ داری لے کہ وہ بنک کے ٹوٹ جانے سے جو نقصان ہوگا اس کو برداشت کرے گی حکومت ہند نے مداخلت کو اس بنا پر حق بجانب قرار دیا کہ اس

بنک کے ٹوٹنے سے دوسرے بنکوں کو نقصان پہنچے گا اور اگر فوری کاروائی کرکے خوف
اور پریشانی کو دور نہیں کیا گیا تو ہندوستانی بنک کاری میں ایک اور رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔ ۴۵۱
حکومت پر نکتہ چینی کرنے والوں نے بتلایا کہ حکومت اور امپیریل بنک نے ایک طرف
الائینس بنک آف شملہ سے پرجوش ہمدردی ظاہر کی تو دوسری طرف ہندوستانی مشترک سرمایہ
بنکوں سے ۱۹۱۳ء۔۱۴ میں جبکہ وہ آفت میں مبتلا ہو گئے تھے بے اعتنائی برتی لیکن اگر حکومت
اور موجودہ زر رو بنک آیندہ اس مثال کی تقلید کرتے ہوئے اچھے بنکوں کی حسب ضرورت
امداد کریں تو وہ تلخ احساسات دور ہو جائیں گے جو اس مبینہ طرفداری سے پیدا ہو گئے تھے۔

حال میں قائم شدہ زر رو بنک کی نگرانی میں مشترک سرمایہ بنکوں کی توسیع کی ملک
میں بہت گنجائش موجود ہے۔ خود مشترک سرمایہ بنک اپنے متعدد حریفوں سے بہت کچھ
سیکھ سکتے ہیں۔ جیسا کہ مرکزی بنک کاری کمیٹی نے بتلایا ہے انھیں چاہیئے کہ جہاں دیسی
ساہوکاروں کے کفایت شعارانہ انتظام کو اختیار کریں وہیں مغربی طرز کے اداروں
کی کارکردگی اور جدید طریقوں کے مطابق کام کریں۔ (دیکھو مرکزی بنک کاری کی تحقیقاتی
کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۵۶۸)۔

۲۰۔ بنک کاری کی نگرانی

بنکوں کے مذکورۂ بالا دوالوں کے پریشان کن تسلسل کے مدنظر اور
مستحکم قومی اصول پر بنک کاری کی ترقی کو یقینی بنانے کی خاطر
خاص نگرانی کی ضرورت عام طور پر محسوس کی جاتی ہے۔ کچھ عرصہ قبل
(۱۹۳۶ء) تک اس اعتبار سے ہندوستان کی صورت حال ناقابل اطمینان تھی کیونکہ حکومت
عدم مداخلت کی روایتی پالیسی پر عمل پیرا تھی ۱۹۳۶ء تک دوسری مشترک سرمایہ کمپنیوں
کے ساتھ مشترک سرمایہ بنک بھی ۱۹۱۳ء کے ہندوستانی کمپنیوں کے قانون کے تابع
تھے جس کی صرف چند دفعات مشترک سرمایہ بنک کاری سے خاص طور پر متعلق تھیں۔
اس کے علاوہ پرانے قانون میں جو کچھ لازم تھا صرف یہ تھا کہ فرد حساب کی تیاری میں چند
قواعد کی پابندی کی جائے اور سال میں دو دفعہ ایک خاص شکل میں کاروبار کی حالت کے متعلق
گوشوارہ شایع کیا جائے۔

غیر ملکی سرمایے کی کمیٹی کے سامنے بعض بااثر گواہوں نے اس بات پر زور دیا کہ
بنکوں کی نشو و نما کی نگرانی میں حکومت کو زیادہ سرگرمی سے حصہ لینا چاہیئے۔ مثلاً پروفیسر

اسٹانلی جیونس کی یہ رائے تھی کہ ہندوستان میں بنک کاری کو صحیح طریقے پر ترقی دینے کی خاطر حکومت کو چاہیے کہ مشترک سرمایہ بنکوں کا معائنہ اور تنقیح اپنے ذمے لے تاکہ اس بات کا یقین ہو جائے کہ کاروبار کے جائز طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں۔ نیز ابتدا ہی میں ایسے کاروبار کی خاص طور پر گرفت کرے جو امانت رکھانے والوں اور حصہ داروں کے اغراض کے منافی ہوں اور گرفت و انکشاف کا خوف دلا کر ان کی روک تھام کرے۔ کمیٹی نے اس معاملے کے متعلق کوئی قطعی سفارش پیش نہیں کی بلکہ سرکاری نگرانی کے خلاف جو دلیل پیش کی گئی ہے اس پر اکتفا کیا یعنی اسی نگرانی سے بنکوں اور ان کے نظما میں ذمہ داری کا احساس کم ہو جاتا ہے اور کارکردگی پر برا اثر پڑتا ہے۔ دراصل بنک کاری کی مستقل و مستحکم ترقی کا سارا دارومدار کاروبار کی مسابقت، اشاعت اور ہمت افزائی پر ہے۔ بنکوں کی حکومتی نگرانی کے خلاف ایک اور دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ اس سے ایک طرف خود بنکوں میں ذمہ داری ۴۵۴
کا احساس کم ہوتا ہے تو دوسری طرف بنکوں کی ناکامی یا خراب انتظام کی صورت میں سارا الزام حکومت پر عائد ہوتا ہے۔

بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی نے اس مسئلے کی اچھی طرح چھان بین کر کے ہندوستان میں مشترک سرمایہ بنکوں کی نگرانی کی ایک اسکیم مرتب کی۔ کمیٹی نے سفارش کی کہ بنکوں کا ایک خصوصی قانون منظور کیا جائے جس میں ہندوستانی کمپنیوں کے قانون کی متعلقہ دفعات کچھ ترمیم کے بعد شامل کر لی جائیں اور اس میں (۱) نگرانی (۲) انتظام (۳) تنقیح حسابات و معاینہ اور (۴) کاروبار کے موقوف اور ضم کرنے کے متعلق چند دفعات کا اضافہ کیا جائے[۱]۔

۲۱۔ ہندوستانی کمپنیوں کے ترمیمہ قانون ۱۹۳۶ء میں بنک کاری کی کمپنیوں کے متعلق بعض خاص دفعات

تقریباً پانچ سال کے سکوت کے بعد حکومت ہند نے یہ فیصلہ کیا کہ بنک کاری کی کمپنیوں کے متعلق خاص دفعات کو ہندوستانی کمپنیوں کے ترمیمہ مسودۂ قانون میں شریک کر لے۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں اس مسودے نے قانون کی شکل اختیار کی۔ بنکوں کے لئے ایک علحدہ قانون بنانے کے مقابلے میں حکومت نے اس طریق کار کو اس وجہ سے

[۱]۔ دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ باب ۲۵؛ نیز ایم ال، تانن کی کتاب موسوم بہ

ترجیح دی کہ اس وقت اس خاص مسئلے کے متعلق قانون سازی پر غور کرنے کا موقع نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ایک حد تک "رزرو بنک کے قانون" ہی میں بڑے بنکوں کے متعلق قواعد موجود تھے۔ ان جدید دفعات کو[۱] جو ذیل میں درج ہیں ترتیب دیتے وقت بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشوں کو ملحوظ رکھا گیا۔

(۱) بنک کاری کی کمپنی کی تعریف حسب ذیل کی گئی ہے:۔ ایسی کمپنی جو اپنے اصل کاروبار کے طور پر بمد رواں اور دوسری مدوں میں امانتیں اس شرط سے قبول کرے کہ وہ چکوں، ڈرافٹ یا حکم ناموں کے ذریعے سے واپس لی جائیں۔ اس سے بحث نہیں کہ امانتوں کے علاوہ وہ بعض دوسرے کاروبار چند یا سب انجام دیتی ہو مثلاً قرضہ دینا، ہنڈیوں پر بٹہ کاٹنا، بیرونی ہنڈیاں فروخت کرنا، اعتباری رقعے جاری کرنا، قیمتی اشیا بغرض حفاظت رکھنا، اسٹاک، حصص، ڈبنچر وغیرہ کا کاروبار کرنا، کسی سنڈیکیٹ کے توسط سے یا اس کے بغیر کسی کاروبار کے لئے مالی وسائل اور سہولتیں مہیا کرنا اور اوقاف کا کاروبار کرنا۔

(۲) اس قسم کی بنک کاری کی کمپنیوں کی جد و جہد معمولی بنک کاری کے کاروبار تک محدود رکھی گئی ہے اور اس قانون کے تحت ہر بنک کاری کی کمپنی کی رجسٹری کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ اپنے کاروباری قواعد (Kemwrandum of Association) میں اس پابندی کا اقرار کرے۔

(۳) آیندہ سے بنک کاری کی کمپنیوں کے انتظام کے لئے مینجنگ ایجنٹوں کا طریقہ ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

(۴) اس بات کا اطمینان کرنے کے لئے کہ کاروبار شروع کرنے سے پہلے کافی کاروباری اصل موجود ہے ایک صداقت نامہ پیش کرنا ضروری ہے کہ حصص سے ۵۰ ہزار روپے کا اصل کاروبار کے لئے جمع کر لیا گیا ہے۔

(۵) بنک کاری کی کمپنی مجاز نہیں ہے کہ اپنے غیر ادا شدہ اصل کی بنا پر اپنے اوپر

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ Regulation of Banks in India)

[۱] قانون نمبر ۲۲ بابتہ ۱۹۳۶ء جزو (x.A.) دفعات ۲۷۷ الف تا ۲۷۷ ہیں۔ (اس قانون کی بموجب ۱۹۱۳ء کے ہندوستانی کمپنیوں کے قانون میں بعض اغراض کے لئے ترمیم کی گئی)۔

کوئی کاروباری ذمہ داری عائد کرے۔

۴۵۴ (۶) یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ مقسوم کا اعلان کرنے سے پہلے سالانہ منافع میں سے رقم الگ کرکے محفوظ سرمایہ قائم کیا جائے جس میں منافع کا کم از کم ۲۰ فی صد جمع کیا جائے یہاں تک کہ یہ فنڈ ادا شدہ اصل کے مساوی ہو جائے۔

(۷) یہ ضروری ہوگا کہ نقد کا ایک محفوظ ذخیرہ قائم کیا جائے۔ جو میعادی واجبات کے ۱½ فیصد اور عندالطلب واجبات کے ۵ فیصد پر مشتمل ہو اور درج فہرست بنکوں کے سوا بنک کاری کی دوسری سب کمپنیوں پر لازم ہوگا کہ محفوظ ذخیرہ اور میعادی و عندالطلب واجبات کے متعلق ماہانہ گوشوارے مرتب کرکے رجسٹرار کے پاس روانہ کیا کریں۔

(۸) بنک کاری کی کمپنی مجاز نہیں ہے کہ کسی ذیلی کمپنی کے حصے جاری کرے یا خریدے بجز اس صورت کے جبکہ اس ذیلی کمپنی کو خود اسی نے اوقاف یا جائداد ول کا انتظام کرنے اور اماتنوں کے متعلق کاروبار کرنے کی غرض سے قائم کیا ہو۔

(۹) عارضی مشکلات کے زمانے میں بنک کاری کی کمپنی کو بر خاستگی سے بچانے کے لئے مہلت دینے کا انتظام کیا گیا ہے۔ وہ اس طرح کہ عدالت کو مجاز کیا گیا ہے کہ وہ بنک کاری کی کمپنی کی درخواست پر اس کمپنی کے خلاف کارروائی کو روک دے بہ شرطیکہ درخواست کے ساتھ رجسٹرار کی رائے بھی منسلک ہو۔ رجسٹرار کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ اس غرض کے لئے کمپنی کی مالی حالت کی تنقیح کرے جس کے مصارف کا بار کمپنی کے ذمے ہوگا۔

جہاں ہم اس نئے قانون کے وضع ہونے سے خوش ہیں وہاں اس تجویز کو بھی نہایت معقول خیال کرتے ہیں کہ ایک علحدہ بنک کا قانون بنایا جائے تاکہ ہندوستان میں بنکوں کی قابل اطمینان نگرانی یقینی ہو جائے[لہ]۔

لہ۔ بظاہر بنک کاری کے قانون کی ضرورت نہ صرف اس وجہ سے ہے کہ امانت رکھانے والوں اور حصہ داروں کو بنک کاری کے غیر محتاط انتظام سے محفوظ رکھا جائے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ خود بنکوں کے استحکام میں کمزوری پیدا نہ ہونے دی جائے، ساتھ ہی عوام، امانت رکھانے والوں اور حصہ داروں کے اس حق کا تحفظ بھی ضروری ہے کہ وہ بنکوں کے انتظامات کے متعلق تنقید کرسکیں۔ یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ کمپنیوں کے قانون میں کچھ ترمیم ضروری ہے۔ یہ بھی مشورہ دیا گیا ہے کہ بنکوں کے خلاف شکایتوں کو عدالت کے سامنے پیش ہونے کی اجازت حکومت کے کسی ذمہ دار عہدہ دار مثلاً اڈووکیٹ جنرل یا مشترک سرمایہ

۴۴ ۔ حساب گھر

اٹھارھویں صدی کے آخری ربع حصے میں انگلستان میں حساب گھروں کا طریقہ رایج ہوا ۔ اس طریقے کی بدولت نقدی یا زر کے استعمال کے بغیر بے شمار باہمی مطالبات کا بہ سہولت تصفیہ ممکن ہوگیا۔ اس طریقے کی وجہ سے انگلستان اور دوسرے ملکوں میں چکوں کے استعمال میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے ۔ اس طریقے کو زیادہ کامیاب بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ حساب گھر کے ۴۵۴
رکن بنکوں میں سے کوئی ایک بنک تصفیہ کنندہ بنک یا بنکوں کے بنک کی حیثیت سے کام کرے اور دوسرے بنک اس کے پاس اپنے کچھ فاضلات رکھیں تاکہ باہمی مطالبات کا تصفیہ زیادہ آسان اور مکمل طریقے پر ہو سکے ۔

ہندوستان میں بڑے حساب گھر کلکتہ، بمبئی، مدراس، کراچی اور رنگون (یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو برما کی علیحدگی عمل میں آنے سے پہلے تک) میں ہیں۔ کانپور، لاہور، دہلی، شملہ، احمد آباد اور کولمبو میں بھی حساب گھر کھولے گئے ہیں۔ امپیریل بنک آف انڈیا یہ چاہتا تھا کہ حساب گھر اور مقامات مثلاً امرتسر، راول پنڈی اور پشاور میں بھی قایم کرے ۔ اکثر مقامات میں جہاں کوئی حساب گھر نہیں ہے حسابات کے تصفیے کا ایک اور طریقہ رائج ہے ۔ وہ یہ کہ مقامی بنکوں کے ذمے آپس میں جو رقمیں واجب الادا ہوں ان کو چکانے کے لئے امپیریل بنک آف انڈیا کے نام چک لکھے جاتے ہیں ۔ رزرو بنک، امپیریل بنک، مبادلہ بنک، انگریزی بنک کاری کے فرم اور کوٹھیاں اور سربرآوردہ ہندوستانی مشترک سرمایہ بنک تقریباً سب کے سب حساب گھروں کے رکن ہیں ۔ رزرو بنک آف انڈیا آجکل تصفیہ کنندہ بنک یا بنکوں کے بنک کی حیثیت سے کام کرتا ہے ۔ ہر رکن بنک کا کوئی گماشتہ ہر کاروبار کے دن مقررہ وقت پر حساب گھر کے جلسے میں شریک ہوتا ہے ۔ چونکہ بالعموم سب ارکان رزرو بنک کے کھاتہ دار

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ :- کمپنیوں کے رجسٹرار کی سرسری تنقیح اور منظوری کے بغیر نہ دی جائے لیکن اس میں یہ اندیشہ ہو سکتا ہے کہ کسی واقعے کی ظاہری اصلیت کی بنا پر اجازت دید ینے سے متعلقہ بنک کی حالت اور بھی زیادہ نازک ہو جائے ۔ ان تمام مشکلات کے مدنظر بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی نے اس مسئلے کو مجلس قانون ساز کی صوابدید پر چھوڑ دینا مناسب سمجھا تاکہ وہ یہ غور کرے کہ بنکوں کے خلاف فرضی عدالتی کارروائیوں کے تدارک کے لئے کون سا طریق کار موزوں ہو سکتا ہے ۔

ہوتے ہیں اس لئے آپس کے مطالبات کا باہمی تصفیہ ہو جانے کے بعد آخر میں جو رقم واجب الادا ہوتی ہے وہ چیکوں کے ذریعے سے اور کھاتوں میں درج کر کے چکا دی جاتی ہے اور اس طرح نقدی کو کسی شکل میں بھی استعمال کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے مسٹر میک ڈونالڈ امپیریل بنک کے مینجنگ گورنر نے یہ مشورہ دیا کہ حساب چکانے والے بنکوں کی ایک انجمن بنائی جائے اس انجمن کے خاص قواعد مرتب کئے جائیں اور یہ انجمن ہر حساب گھر کی تفصیلی طور پر نگرانی کرے۔ اس کے علاوہ جس طرح ہر رکن بنک کے لئے اپنا بنکر رکھنا ضروری ہے اسی طرح یہ انجمن بھی اپنا بنکر رکھے۔ ہندوستان میں ورزرو بنک آف انڈیا قائم ہونے تک یہ سب کام زیادہ تر امپیریل بنک انجام دیتا تھا۔ اس طرح پیچیدگی پیدا ہوتی تھی اور اس بنا پر اکثر بنک یہ خیال کرنے لگے تھے کہ ان کی جو رقمیں امپیریل بنک میں تھیں ان کا مصرف صرف یہ تھا کہ حسابات کے چکانے میں کام آئیں اور وہ اس چیز کو نظر انداز کر دیتے تھے کہ کاروبار کے لائق رقم جس طرح دوسرے معمولی بنکوں میں رکھی جاتی تھی اسی طرح امپیریل بنک کے پاس بھی جمع رکھیں۔ حساب گھروں کے مندرجۂ ذیل حسابات سے تجارت اور بنک کاری کی تدریجی ترقی کا کچھ پتا چلتا ہے اگرچہ خاصکر سنہ ۱۹۳۱ء اور سنہ ۱۹۳۲ء میں معاشی کساد بازاری کی وجہ سے اس ترقی پر برا اثر پڑا۔ چیکوں کا استعمال ابھی تک عام نہیں ہوا ہے اور صرف تجارتی شہروں تک محدود ہے۔ پھر بھی رفتہ رفتہ اس طریقے کا رواج دیہی علاقوں میں بڑھ رہا ہے اور جب سے امپیریل بنک کی متعدد شاخیں قائم ہو گئی ہیں یہ میلان خاص طور پر نمایاں ہو گیا ہے۔ امداد باہمی کے بنکوں میں چیکوں کے استعمال ہونے کی وجہ سے بھی اندرون ملک کے لوگ اس نئے طریقے سے واقف ہوتے جا رہے ہیں۔ ۴۵۵

مندرجۂ ذیل اعداد سے چیکوں کے استعمال کی ترقی کا حال معلوم ہوتا ہے۔

حساب گھروں کے اعداد۔ چیکوں کے ذریعے چکائے ہوئے مطالبات کی مجموعی مقدار۔

(بحساب کروڑ روپیہ)

سال	مقدار	سال	مقدار
سنہ ۱۹۰۰ء	۲۱۲	سنہ ۱۹۲۸ء	۱۹۶۶

سنہ ۱۹۰۵ء	۳۰۳	سنہ ۱۹۲۹ء	۲۰۴۸
سنہ ۱۹۱۰ء	۴۶۵	سنہ ۱۹۳۰ء	۱۸۱۶
سنہ ۱۹۱۳ء	۶۵۰	سنہ ۱۹۳۱ء	۱۵۷۴
سنہ ۱۹۱۸ء	۱۳۹۵	سنہ ۱۹۳۲ء	۱۵۹۰
سنہ ۱۹۲۰ء	۳۱۴۹	سنہ ۱۹۳۳ء	۱۶۳۴
سنہ ۱۹۲۱ء	۲۰۲۱	سنہ ۱۹۳۴ء	۱۷۲۴
سنہ ۱۹۲۲ء	۲۰۲۲	سنہ ۱۹۳۵ء	۱۸۸۵
سنہ ۱۹۲۳ء	۱۸۵۵	سنہ ۱۹۳۶ء-۳۷ء	۱۹۳۲
سنہ ۱۹۲۴ء	۱۷۷۸	سنہ ۱۹۳۷ء-۳۸ء	۲۰۵۱[۱]

حساب گھر کے طریقے کو عام کرنے اور پھیلانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اندرون ملک کے نجی فرموں کے چکوں کے تصفیے کے لئے زیادہ سہولتیں مہیا کی جائیں اور حساب گھروں کی سہولتیں موزوں حیثیت کے رجسٹری شدہ نجی بنکوں تک وسیع کی جائیں۔ اگر چکوں کا استعمال بڑھ رہا ہے پھر بھی وہ ملک اور اس کی آبادی کے لحاظ سے زیادہ نہیں ہے۔ اس طریقے کی ترقی میں جو مزاحمتیں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ عوام کی بہت بڑی تعداد ناخواندہ ہے۔ اس کے علاوہ چک لکھنے کے لئے صرف یہی ضروری نہیں ہے کہ کوئی شخص خواندہ ہو بلکہ اس کا انگریزی جاننا بھی ضروری ہے۔ اس دشواری کو رفع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ امانت کے مشترک سرمایہ بنک اپنے بعض طریقوں کی اصلاح کریں اور اپنے کاروبار میں خاصکر چکوں، پاس بک اور امانت کے رسائد کی حد تک ہندوستانی زبانوں کا استعمال کریں[۲] لیکن چکوں کے استعمال میں سب سے بڑی رکاوٹ اس وجہ سے پڑ رہی ہے

[۱] یہ رقم جو سنہ ۱۹۲۱ء-۲۲ء کے بعد سے سب سے بڑھی تھی حسب ذیل منقسم تھی (بحساب کروڑ روپے)۔ کلکتہ ۱۱۶۷ بمبئی ۵۱۸، مدراس ۱۱۰، کراچی ۴۳، رنگون ۸۲، کانپور ۱۲، لاہور ۱۱، دہلی ۱۸۔

دیکھو رزرو بنک کی رپورٹ کرنسی اور مالیہ کے بارے میں سنہ ۱۹۳۷ء-۳۸ء جدول ۱۷۔

[۲] چکوں پر محصول اسٹامپ منسوخ کر دیئے جانے سے بھی ان کا استعمال بڑھ گیا ہے۔

کہ بنک کاری کی سہولتیں کم ہیں۔

چکوں کے استعمال کو ترقی دینے کے لئے بمبئی کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی نے جو سفارشیں کیں ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:۔

(۱) مالگزاری، مقامی محصولوں (Rates) اور عام ٹیکس کی ادائی کے سلسلے میں چک قبول کئے جائیں۔

(۲) امپیریل بنک کو اندرون ملک کے چکوں کے لئے شرح مبادلہ کم رکھنی چاہئیے۔

(۳) مشترک سرمایہ بنکوں اور امداد باہمی کے بنکوں کو چاہئے کہ اپنے سیونگ بنک کے حسابات سے چکوں کے ذریعے رقوم نکالنے کی اجازت دیں[1]۔

۲۳۔ ڈاکخانے کے سیونگ بنک وغیرہ

۴۵۶ ۱۸۳۳ء اور ۱۸۳۵ء کے درمیان سرکاری سیونگ بنک پریزیڈنسی شہروں میں قائم کئے گئے۔ ۱۸۷۰ء میں بعض منتخب ضلع واری خزانوں سے ملحق ضلع واری سیونگ بنک کھولے گئے۔ ۱۸۸۲ء اور ۱۸۸۳ء میں ہندوستان کے طول وعرض میں ڈاک خانے کے سیونگ بنک کھولے گئے جن میں ۱۸۸۶ء میں ضلع واری سیونگ بنکوں کا کاروبار اور ۱۸۹۶ء میں پریزیڈنسی بنکوں کا کاروبار ضم کر لیا گیا۔ اس لئے موجودہ زمانے میں سرکاری سیونگ بنک ڈاک خانے کے انتظام کا ایک شعبہ ہیں۔ یہ امانت اپنے ذمے کے واجبات کو پورا کرنے کے لئے حکومت کوئی خاص نقد ذخیرہ نہیں رکھتی۔ اس لئے ان واجبات کی حیثیت قابل واپسی سرکاری قرضے کی ہوتی ہے جو اصل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ڈاکخانے کے سیونگ بنک متوسط اور زیریں متوسط طبقوں کے لئے اپنی پس انداز کردہ چھوٹی رقوم امانت رکھانے کا ایک محفوظ ذریعہ ہیں کیونکہ حکومت کے عام فاضلات ان امانتوں کے ضامن ہوتے ہیں۔ زرعی اور صنعتی مزدوران بنکوں سے بہت کم کام لیتے ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں حکومت نے امانت رکھانے والوں کے لئے مزید سہولتیں مہیا کیں۔ وہ اس طرح کہ کوئی امانت رکھانے والا جتنی رقم سال بھر میں جمع کرانے کا مجاز تھا اس کی مقدار بڑھا دی گئی اور سرکاری تمسکات میں رقم مشغول کرنے کی خاطر امانت رکھانے والوں کے لیے آسانیاں پیدا کر دی گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کثیر امانتیں وصول ہوئیں خاصکر اس لیے بھی

[1]۔ دیکھو بمبئی کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۳۰۳-۳۰۶۔

۱۹۱۳ء-۱۴ء کے بنکوں کے دوالوں کی وجہ سے نجی بنکوں کی طرف سے عوام کا اعتماد متزلزل ہوگیا تھا۔ جنگ عظیم نے سیونگ بنکوں کی امانتوں میں عارضی طور پر کمی کردی لیکن حال میں اس صورت حال کی اصلاح ہوگئی ہے جیسا کہ مندرجۂ ذیل جدول سے ظاہر ہوتا ہے:-

ڈاکخانے کے سیونگ بنکوں میں امانتوں کی ترقی

سال	ختم سال پر بنکوں کی تعداد	امانت رکھانیوالوں کی تعداد	حکومت کے پاس امانتوں کی مجموعی مقدار (بحساب کروڑ روپیہ)
۱۹۱۳ء-۱۴ء	۹۸۲۴	۱۶۳۹۰۰۰	۲۳٫۱۶
۱۹۱۴ء-۱۵ء	۱۰۱۶۱	۱۶۴۴۰۷۴	۱۴٫۸۹
۱۹۱۸ء-۱۹ء	۱۰۵۸۷	۱۶۷۷۴۰۷	۱۸٫۲۲
۱۹۲۳ء-۲۴ء	۱۰۵۳۵	۲۰۳۹۳۱۴	۲۴٫۷۹
۱۹۲۵ء-۲۶ء	۱۱۱۶۲	۲۳۱۷۳۹۰	۲۷٫۲۳
۱۹۲۶ء-۲۷ء	۱۱۹۹۴	۲۵۱۸۱۴۲	۲۹٫۵۰
۱۹۲۸ء-۲۹ء	۱۲۶۸۴	۲۰۲۰۸۳۲	۳۴٫۴۹
۱۹۳۰ء-۳۱ء	۱۲۸۴۶	۲۴۷۷۶۱۳	۳۷٫۰۳
۱۹۳۲ء-۳۳ء	۱۲۶۹۰	۲۷۳۶۶۴۵	۴۳٫۴۵
۱۹۳۳ء-۳۴ء	۱۲۶۷۷	۳۰۸۹۲۶۷	۵۲٫۲۳
۱۹۳۴ء-۳۵ء	۱۲۶۷۹	۳۱۰۰۳۶۸	۵۸٫۳۰
۱۹۳۵ء-۳۶ء	۱۲۹۲۶	۳۵۴۱۵۵۳	۶۷٫۲۵

جنگ سے پہلے کے مقابلے میں ۱۹۲۲ء-۲۳ء سے (جبکہ امانتوں کی مقدار ۱۹٫۲۳ کروڑ ۴۵۷
روپے تھی) امانتیں بڑھنا شروع ہوئیں اگرچہ اس امر کا لحاظ کرتے ہوئے کہ اس متعاقب دور میں

۱؎ - ۳۱ مارچ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کو ڈاکخانے کے سیونگ بنکوں کی امانتوں کی مقدار (برما کو علٰحدہ کرکے) علی الترتیب ۶۸٫۴۷ کروڑ روپے اور ۶۵٫۹۷ کروڑ روپے تھی۔ دیکھو برطانوی ہند کے اعدادی خلاصہ (۱۹۳۶ء-۳۷ء)

روپے کی قوت خرید گری رہی اس ظاہری ترقی کو زیادہ قابل اطمینان نہیں کہا جاسکتا۔ حالیہ زمانے میں امانتوں میں کافی اضافہ ہوا جس کی وجہ یہ تھی کہ سونے کی فروخت کے حصل کا ایک حصہ ان میں مشغول کر دیا گیا تھا۔ ۳۶-۱۹۳۵ء میں برطانوی ہند کے تقریباً پانچ لاکھ دیہات کے لئے صرف ۱۲۹۲۶ سیونگ بنک تھے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سیونگ بنکوں کی ترقی کی ابھی کافی گنجایش ہے۔ متعدد دیہات کی یہ حالت ہے کہ یہاں سے سیونگ بنک کئی میل کے فاصلے پر واقع ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ گاؤں والوں کو اپنی امانتیں وہاں رکھانے میں بہت دقت ہوتی ہے۔

حالیہ سالوں میں عوام کے شغل اصل کی ایسی مختلف شکلیں پیدا ہوگئی ہیں جو ڈاکخانے کے سیونگ بنکوں سے مسابقت کر رہی ہیں۔ مثلاً جنگی قرضوں نے ایسے بہت سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا جو اپنی رقوم بصورت دیگر ڈاکخانے کے سیونگ بنکوں میں امانت رکھاتے۔ دوسرے حریف یہ ہیں:۔ امداد باہمی کی انجمنیں امپیریل بنک مبادلہ بنک اور مشترک سرمایہ بنک۔

ڈاکخانہ کے سیونگ بنکوں کو عوام میں مقبول بنانے کے لئے جو مشورے دیئے گئے ہیں ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:۔ (۱) امانتوں پر نسبتہً اعلیٰ شرح سود جو دوسرے مقامات کی شرحوں کے زیادہ مطابق ہو۔ (۲) سال بھر میں اور مجموعی حیثیت سے جتنی رقم امانت رکھی جاسکتی ہے اس کی انتہائی مقدار کے تعین میں مزید نرمی بہ شرطیکہ رقوم کی اچانک واپسی کے متعلق مناسب احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں [1] (۳) چکوں کی شکل میں امانتیں قبول کرنا نیز چکوں کے ذریعے امانتیں واپس لینے کی سہولت بہم پہنچانا۔ (۴) سیونگ بنکوں کے نئے دفتر کھولنے کے لئے پروپگنڈا کرنا [2]

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ:۔ جدول نمبر ۲۴۲ اور ایک رپورٹ کرنسی اور مالیہ کے بارے میں (۳۸-۱۹۳۷ء) جدول ۱۳۔

[1] ایک سال میں جتنی رقم امانت رکھی جاسکتی ہے اس کی انتہائی مقدار ۷۵۰ روپے ہے اور مجموعی حیثیت سے انتہائی مقدار ۵ ہزار روپے ہے۔ کم سے کم رقم جو کسی وقت جمع کی جاسکتی ہے ۴ آنے ہے اور ہفتے میں صرف ایک بار رقم واپس لی جاسکتی ہے۔ شرح سود ۳ فیصد سے گھٹا کر ۱۹۳۴ء میں ۲½ فیصد اور ۱۹۳۶ء میں ۲ فیصد کر دی گئی۔

[2] بمبئی کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ تجربی دور میں بعض منتخب علاقوں میں انجمن امداد باہمی

ڈاکخانے کو ایک اور طریقے یعنی کیش سرٹیفکیٹ کے ذریعے سے بھی عوام کی پس انداز کی ہوئی رقوم سے سابقہ پڑتا ہے۔ کیش سرٹیفکیٹ دس روپے یا دس روپے کے حاصل ضرب کے مساوی رقم کے جاری کئے جاتے ہیں اور ایک شخص زیادہ سے زیادہ دس ہزار روپے کی قیمت کے کیش سرٹیفکیٹ خرید سکتا ہے۔ یہ سرٹیفکیٹ تاریخ خریدی کے پانچ سال کے بعد قابل ادائی ہوتے ہیں، بٹہ کاٹ کر جاری کئے جاتے ہیں اور پورا سود یا مندرجہ قیمت پانچ سال کے بعد قابل ادائی ہوتی ہے۔ جنگ کے بعد سے ڈاکخانے سے سرکاری قرضے کی ایک شاخ بھی منسلک کر دی گئی ہے۔ جہاں تک ڈاکخانے کے سرٹیفکیٹ کا تعلق ہے یہ طریقہ
۴۵۰ اس لایق ہے کہ وسیع کیا جائے اور زیادہ مقبول عام بنایا جائے تاکہ صوبہ واری حکومتوں کے تعمیری مصارف کے بڑے حصے کو پورا کرنے میں اس سے مدد لی جا سکے۔ ۱۹۳۰-۳۱ء میں ۴۴ء۳۸ کروڑ روپے کے ڈاکخانے کے کیش سرٹیفکیٹ فروخت کئے گئے۔ اس کے برخلاف ۱۹۲۴-۲۵ء میں ان کی مقدار صرف ۱۲ء۱۳ کروڑ روپے اور ۱۹۱۷-۱۸ء میں جبکہ یہ طریقہ پہلی دفعہ رائج کیا گیا ۸ء۸۸ کروڑ روپے تھی۔ حالیہ زمانے میں جاری کردہ کیش سرٹیفکیٹ کی مقدار بہت بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ ۳۱/ مارچ ۱۹۳۶ء کو شرح سود پے در پے گھٹا دینے کے باوجود ان کی مقدار ۹۸ء۶۵ کروڑ روپے تھی[۱] یہ نتیجہ زیادہ تر اس بات کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے کہ سونا بڑھی ہوئی قیمتوں پر فروخت کیا گیا اور اس طرح جو رقم وصول ہوئی اُس کو کیش سرٹیفکیٹ کی شکل میں مشغول کر دیا گیا۔ کیش سرٹیفکیٹ کو اور زیادہ مقبول عام بنانے کی خاطر یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ چونکہ ہر گاؤں میں ایک ڈاکخانہ کھولنا ممکن نہیں ہے اس لئے گاؤں کے پٹیل اور محاسب جو مالگزاری جمع کرتے ہیں کیش سرٹیفکیٹ کا کاروبار آسانی سے انجام دے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مالگزاری کے ادائی کے سلسلے میں کیش سرٹیفکیٹ بازاری قیمت پر قبول کئے جا سکتے ہیں[۲]

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ: ۔کے عہدہ داروں یا دیہی معلموں کو جو جزووقتی پوسٹ ماسٹروں کی حیثیت سے کام کرتے ہوں امانتیں وصول کرنے کا کام تفویض کرنا۔ دیکھو رپورٹ فقرہ (۴۸۹)۔

[۱] ۳۱/ مارچ ۱۹۳۸ء کو یہ مقدار گھٹ کر ۵۳ء۰۶ کروڑ روپے (برما کے ۴۲ لاکھ روپے شامل کر کے) ہوگئی۔

[۲] دیکھو واڈیا اور جوشی کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۳۵۹۔

حیثیت مجموعی کیش سرٹیفکیٹ کا طریقہ بہت کارآمد ثابت ہوا ہے۔ لیکن بنکوں اور بنکروں کو ناواجب مسابقت سے بچانے کے لئے کیش سرٹیفکیٹ کے سود میں کمی کر دینا مناسب ہوگا۔ اس کے علاوہ اس شکایت کو دور کرنے کے لئے کہ موجودہ زمانے میں دیہی علاقوں سے بہت زیادہ رقم باہر چلی جاتی ہے یہ مناسب ہوگا کہ ڈاکخانے کے توسط سے کچھ روپیہ امداد باہمی کی انجمنوں کے تفویض کیا جائے یا افراد کو تقاوی کے طور پر قرض دیا جائے۔

۲۴۔ ہندوستانی بنک کاری پر جنگ کے اثرات

ہندوستانی بنک کاری پر جنگ عظیم کے جو اثرات پڑے ان میں سے ایک اثر یہ تھا کہ بنکوں کی امانتیں بہت بڑھ گئیں۔ چنانچہ تمام بنکوں (پریزیڈنسی بنکوں، مشترک سرمایہ بنکوں اور مبادلہ بنکوں[1]) کی امانتوں کی مجموعی مقدار ۱۹۱۳ء میں ۱۵۷،۹۷ کروڑ روپے اور ۱۹۱۸ء میں ۱۶۳،۶۲ کروڑ روپے تھی۔

یہ قدرتی امر تھا کہ جنگ کے زمانے میں بعض صنعتوں مثلاً روئی اور جوٹ کی گرنیوں کو جو نفع حاصل ہوا اس کی وجہ سے بنکوں میں نقد امانتوں کی مقدار بڑھ گئی۔ اس کے علاوہ جنگی قرضوں کے اجرا اور خزانے کی ہنڈیوں میں رقم مشغول کرنے کے سلسلے میں بھی بنکوں نے نہ صرف حکومت کو بلکہ نجی افراد اور اداروں کو روپیہ قرض دیا۔ بنکوں نے حکومت کو اس طرح قرض دیا کہ خود بھی جنگی قرضوں میں رقم مشغول کی اور خزانے کی ہنڈیاں خریدیں اور حکومت نے بنکوں سے قرضہ اس طرح حاصل کیا کہ اپنے لین داروں کے نام جن سے جنگی سامان وغیرہ کثیر مقدار میں خریدا گیا تھا بنکوں کے نام چک جاری کئے۔ ان چکوں کو حکومت کے لین داروں نے بنکوں میں لے جاکر اپنے کھاتوں میں جمع کرا دیا۔ اس طرح بنکوں کو یہ بات معلوم ہوئی کہ ۴۵۹
سرکاری قرضوں میں جس قدر انھوں نے حصہ لیا تھا اسی قدر ان امانتوں میں اضافہ ہو گیا۔ جنگی قرضوں اور خزانے کی ہنڈیوں میں رقم مشغول کرنے کے سلسلے میں بنکوں نے نجی افراد اور اداروں کی اس طرح مدد کی کہ ان کو اپنے پاس کھاتہ کھولنے کا موقع دیا۔ اس طرح ان دونوں اسباب کی بنا پر امانتوں کی مجموعی مقدار میں بہت اضافہ ہو گیا۔

[1] مبادلہ بنکوں کی مد تک صرف ان امانتوں کو محسوب کیا جاتا ہے جو ہندوستان میں ہیں۔

جنگ عظیم کا ایک اور اثر یہ پڑا کہ جنگ سے پہلے کی جو صورت حال تھی کہ بنکوں کے کاروبار کے مقابلے میں ان کے پاس اصل کم تھا وہ جنگ کے بعد اور بھی خراب ہوگئی۔ اس کا باعث یہ واقعہ تھا کہ بنک اپنے اصل سے ممکنہ تیزی سے کام لیکر زیادہ سے زیادہ خالص منافع حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔

اس کے علاوہ جنگ کے زمانے میں بنکوں کے نقد ذخائر بہت بڑھ گئے تھے جس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ امانتوں میں اضافہ ہوگیا تھا۔ دوسرے یہ کہ جنگ کے غیر معمولی حالات کے تحت اور ۱۹۱۳ء–۱۹۱۷ء کی ناقابل فراموش بنک کاری کی تباہی کے مدنظر بنک اس بات کو ضروری خیال کر رہے تھے کہ اپنے نقد ذخائر کو مستحکم حالت میں رکھیں۔ بنکوں کے اصل کے مشغولات میں بھی کافی اضافہ ہوگیا تھا جس کی وجہ کسی حد تک تو یہ تھی کہ برآمدی تجارت کی گرم بازاری بہت بڑھ گئی تھی لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ بنکوں نے جنگی قرضوں اور خزانے کی ہنڈیوں میں اپنا روپیہ مشغول کیا تھا۔ اعلیٰ مقسوم، زر کا انقباض، بنک کی بڑھی ہوئی شرحیں، چیکوں کا زیادہ تعداد میں استعمال یہ سب جنگ کے پیدا کیے ہوئے اثرات تھے۔ آخری بات یہ کہ مرکزی بنک کے قیام کو جس کی ضرورت ۱۹۱۳ء–۱۹۱۷ء کی بنکوں کی تباہی نے صاف طور پر ظاہر کر دی تھی جنگ کے تجربوں نے اور بھی زیادہ ضروری بنا دیا۔

۲۵۔ ہندوستانی زر کے بازار کی خصوصیات اور خرابیاں

ہندوستانی زر کے بازار کی متعدد خصوصیات اور خرابیاں ہیں جن میں سے چند پر ذیل میں بحث کی گئی ہے۔ جیسا کہ پہلے تذکرہ کیا جا چکا ہے اولاً یہ کہ ہندوستانی زر کا بازار ایسے متعدد اجزا میں منقسم ہے جو آپس میں نامکمل طور پر مربوط ہیں۔ مختلف قسم کے اداروں مثلاً امپیریل بنک، مبادلہ بنک، مشترک سرمایہ بنک، امداد باہمی کے بنک اور دیسی بنکروں وغیرہ نے اپنے اپنے لئے خاص خاص قسم کے کام مختص کر لئے ہیں، اور اپنے خاص دائرے میں وہ بالکل آزادانہ طور پر کام کرتے ہیں[1] زر کے بازار کے مختلف ارکان کے باہمی تعلقات بہت زیادہ خوشگوار نہیں ہیں۔ چنانچہ مشترک سرمایہ بنک، اس بات پر رشک کرتے ہیں کہ امپیریل بنک کو جو زر رو بنک کے قائم ہونے تک کسی حد تک مرکزی بنک کے

---

[1] ۔ اس اعتراض کا اطلاق زر رو بنک قائم ہونے سے پہلے کے دور پر خاص طور پر ہوتا ہے۔

فرائض انجام دیتا رہا، خاص حقوق حاصل ہیں۔ مبادلہ بنکوں کی حالت بہت مستحکم ہے اور یہ شکایت بالعموم سنی جاتی ہے کہ وہ مشترک سرمایہ بنکوں کے حلقۂ کاروبار میں مداخلت کر رہے ہیں۔ درج فہرست بنکوں کے زمرے میں شامل ہونے سے پہلے ۴۰۰
مبادلہ بنک ہندوستان میں کسی قانون یا ادارے کے سامنے جوابدہ نہیں تھے۔ امداد باہمی کے بنکوں اور دوسرے بنکوں کا باہمی تعلق بھی کمزور رہا ہے۔ لیکن جیسا کہ تذکرہ کیا جا چکا ہے منظم بنک کاری کے اداروں اور دیسی بنک کاری کے درمیان سخت مخاصمت پائی جاتی ہے۔ موخر الذکر یا دیسی ساہوکار کوئی متحدہ و مربوط جماعت نہیں ہے بلکہ کئی جداگانہ حصوں میں تقسیم ہے۔ مثلاً بمبئی کو لیجئے۔ یہاں گجراتی بازار، مرہٹی بازار اور ملتانی بازار ایک دوسرے سے علحدہ موجود ہیں اور ان کی سودی شرحیں بھی ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ حال حال (اپریل ۱۹۳۵ء) تک کوئی حقیقی مرکزی بنک موجود نہ ہونے کی وجہ سے علحدگی اور مرکز گریزی کے میلانات بڑھ گئے تھے اور اگرچہ ریزرو بنک آف انڈیا کام شروع کر چکا ہے پھر بھی مستقبل قریب میں کسی قسم کے غیر معمولی تغیرات کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس کی وجہ اولاً یہ ہے کہ ریزرو بنک اور دیسی بنکروں کے باہمی تعلقات کا ابھی تک تعین نہیں ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ زر کا ایک منظم و مربوط بازار وجود میں آنے کے لئے کچھ وقت ضرور لگے گا تاکہ بنک کاری کا نیا نظام جو نامکمل ہے اس کا اثر ملک کے کل اعتباری نظام میں سرایت کر سکے لہ

۲۶۔ زر کی شرحوں میں بے نظمی اور افراتفری۔

ہندوستان میں زر کے بازار کی پیچیدہ تنظیم کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ زر کی شرحوں میں اختلاف اور بے ترتیبی پائی جاتی ہے۔ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی پر مبالغے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا جب اس نے یہ کہا کہ "یہ واقعہ کہ ۳/۴ فی صد انتہائی قلیل المدت

لہ ریزرو بنک آف انڈیا کے کھلنے سے پہلے ہندوستانی زر کے بازار میں ایک خرابی یہ تھی کہ زر کے بازار پر دوہری نگرانی تھی۔ ایک تو حکومت کی نگرانی محکمۂ زر کے توسط سے دوسرے امپیریل بنک کی نگرانی جو ایک حد تک اعتبار کی نگرانی کرنے والا ادارہ تھا۔ اس کے علاوہ حکومت نے اپنے مالی اور کرنسی کے کاروبار کے ذریعے سے زر کے بازار پر تسلط قائم کر لیا تھا۔ ریزرو بنک کے کھل جانے سے یہ دونوں خرابیاں دور ہو گئیں کیونکہ وہ نہ صرف کرنسی بلکہ اعتبار کی بھی نگرانی کرنے والا ادارہ ہے۔

قرضے کی شرح[1]، ۳ فیصد ہنڈی کی شرح[2]، ۴ فیصد بنک کی شرح[3]، ۶ فیصد چھوٹے تاجروں کی ہنڈیوں کے لئے بمبئی کے بازار کی شرح[4] اور ۱۰ فیصد چھوٹے تاجروں کی ہنڈیوں کے لئے کلکتے کے بازار کی شرح بہ یک وقت رائج رہ سکتی ہے یہ ثابت کرتا ہے کہ مختلف بازاروں کے درمیان اعتبار کی نقل وحرکت کی رفتار بہت سست ہے۔[5] یہ صورت حال لندن کے زر کے بازار سے نمایاں تضاد رکھتی ہے، وہاں زر کی مختلف شرحوں میں قریبی تعلق پایا جاتا ہے اور سب شرحیں بنک کی شرح پر مبنی ہوتی ہیں۔ چنانچہ اگر اس میں کمی بیشی ہو تو وہ فوراً اس کے مطابق ہو جاتی ہیں۔ امپیریل بنک کی پرانی بنک کی شرح اگرچہ فینانشل رسالوں میں دوسرے ملکوں کے مرکزی بنکوں کی بنک کی شرحوں کے ساتھ درج ہوتی تھی پھر بھی اس کا مفہوم مختلف ومحدود تھا۔ چنانچہ مرکزی بنکوں کی شرحوں سے مراد ایسی شرحیں ہیں جن پر مرکزی بنک میں اعلیٰ درجے کی تجارتی ہنڈیوں پر بٹہ کاٹا جا سکتا ہے۔ اس کے برخلاف امپیریل بنک کی شرح بٹے کی شرح نہیں تھی بلکہ قرضے کے سود کی شرح تھی۔ رزرو بنک آف انڈیا کے کھلنے سے پہلے کرنسی اور اعتبار پر علی الترتیب حکومت اور امپیریل بنک کی دوہری نگرانی کی وجہ سے غیر منظم شرحوں میں اور بھی گڑبڑ ہو گئی۔

[1] ۔ انتہائی قلیل المدت قرضے کی شرح سے مراد وہ شرح سود ہے جو اس فاضل رقم پر ادا کی جاتی ہے جو کم از کم ۲۴ گھنٹے کے لئے بطور امانت رکھائی جائے۔

[2] ۔ (امپیریل بنک کی) ہنڈی کی شرح سے مراد وہ شرح ہے جس پر امپیریل بنک تین مہینے کی مدت کی اعلیٰ درجے کی ہنڈیوں پر بٹہ کاٹتا ہے۔

[3] ۔ (پرانی) بنک کی شرح سے مراد ایسی شرح ہے جس پر رزرو بنک آف انڈیا قائم ہونے سے پہلے امپیریل بنک حکومت کے تمسکات کی کفالت پر عندالمطالبہ قرضے دیتا تھا۔ یہ شرح آجکل امپیریل بنک کی قرضے کی شرح کہلاتی ہے۔ رزرو بنک جس بنک کی شرح کا اعلان کرتا ہے اس کی تشریح فصل ۵۸ میں کی گئی ہے۔

[4] ۔ بازاری شرحوں سے مراد وہ شرحیں ہیں جن پر کلکتے اور بمبئی میں چھوٹے تاجروں پر صراف بٹہ کاٹتے ہیں۔

[5] ۔ دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۷۹ ۔

ہندوستان میں زرکی شرحوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ دو بڑے مرکزوں یعنی کلکتے اور بمبئی میں بظاہر مختلف شرحیں رائج ہیں جس کی وجہ سے تمسکات کی قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں اور تجارت کی نقل و حرکت متاثر ہوتی ہے۔ اس صورت حال کا اندازہ مندرجۂ ذیل زرکی شرحوں سے ہوتا ہے :-

ہندوستانی زرکی شرحیں فیصد (سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء)[1]

ہر ماہ کی پہلی تاریخ	بینک کی شرح	غیر میعادی قرضے کی شرح		امپیریل بنک کی ہنڈی کی شرح	ہنڈی کی بازاری شرح	
		کلکتہ	بمبئی		کلکتہ	بمبئی
اپریل سنہ ۱۹۳۶ء	۳	۱/۲	۱/۲	۳	۵-۶	۵ ۱/۴
مئی سنہ ۱۹۳۶ء	۳	۱/۲	۱/۲	۳	۵-۶	۵ ۱/۴
جون "	۳	۱/۲	۱/۲	۳	۵-۶	۶
جولائی "	۳	۱/۴	۱/۲	۳	۵-۶	۴ ۱/۲
اگست "	۳	۱/۴	۱/۲	۳	۵-۶	۳ ۳/۸
ستمبر "	۳	۱/۴	۱/۲	۳	۵-۶	۳ ۳/۸
اکتوبر "	۳	۱/۴	۱/۴	۳	۵-۶	۳ ۳/۸
نومبر "	۳	۱/۴	۱/۴	۳	۵-۶	۳ ۳/۸
دسمبر "	۳	۱/۴	۱/۲	۳	۵-۶	۳ ۳/۸
جنوری سنہ ۱۹۳۷ء	۳	۱/۴	۱ ۱/۲	۳	۵-۶	۵ ۱/۴
فروری "	۳	۱/۴	۱	۳	۵-۶	۵ ۱/۴
مارچ "	۳	۱/۴	۳/۴	۳	۵-۶	۵ ۱/۴

اب اس مسئلے پر مزید غور کرنا مناسب ہوگا کہ امپیریل بنک کی پرانی شرح اور

[1] دیکھو رپورٹ کرنسی اور مالیہ کے بارے میں (سنہ ۱۹۳۶ء/۳۷ء) گوشوارہ ۱۲-

ہنڈی کی بازاری شرح کا باہمی تعلق کیا ہے۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ گرم بازاری کے زمانے میں دیسی ساہوکار غلے کی
نقل و حمل کے لئے زیادہ تر اپنے ہی پاس سے قرضہ دیتا ہے۔ لیکن زائد مطلوبہ رقم
کے لئے اس کا انحصار آخر میں امپیریل بنک اور دوسرے مشترک سرمایہ بنکوں پر ہوتا ہے۔
اسی لیے ایسے زمانے میں جبکہ زر مشکل سے دستیاب ہوتا ہے اعلیٰ درجے کی ہنڈیوں کی
بازاری شرح امپیریل بنک کی شرح کے مطابق ہوتی ہے۔ جیسا کہ پہلے تذکرہ کیا جا چکا
ہے ہنڈیوں کے بٹے کا کاروبار کرنے والے صراف بنک کی شرح کے مقابلے میں اعلیٰ شرح
مقرر کرتے ہیں اور دونوں شرحوں کے فرق سے نفع حاصل کرتے ہیں۔ سرد بازاری شروع
ہونے کے زمانے میں ہنڈی کی شرح کے مقابلے میں بنک کی شرح عام طور پر زیادہ ۴۶۲
ہوتی ہے[1] جب زر کی افراط ہوتی ہے تو دونوں شرحوں میں اتنی مطابقت نہیں ہوتی جتنی
کہ قلت کے زمانے میں ہوتی ہے۔ اس حالت میں صراف بنک کی شرح کو نظر انداز کر سکتے
ہیں اور اس شرح سے کم شرح پر کاروبار کر سکتے ہیں[2]۔ دونوں شرحوں میں کامل مطابقت
کی عدم موجودگی کے سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ صراف نہ تو کبھی یورپی تمسکات پر بٹہ
کاٹتے ہیں اور نہ بیرونی یا اسٹرلنگ کی ہنڈیاں خریدتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ سرکاری
دستاویزات یا اسی طرح کے تمسکات کی کفالت پر قرضہ بھی نہیں دیتے بلکہ اپنے قرضے
کے کاروبار کو ہنڈی پر بٹہ کاٹنے اور سونے اور چاندی کی کفالت پر کاشتکار کو رقم
دینے تک محدود رکھتے ہیں"۔ بنک تاجروں کی ہنڈیوں کی خریداری کے سلسلے میں صرافوں سے
مسابقت نہیں کرتے اور اسی لئے بظاہر صرافے کی شرح اور بنک کی شرح میں بالعموم

---

[1]۔ خالص بنک کی شرح کے ساتھ ساتھ ہنڈی کی شرح گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہے اگرچہ بنک کی شرح
سے کسی قدر بڑھی ہوئی رہتی ہے اور اس کا بڑھا ہوا رہنا بجا ہے کیونکہ ہنڈی کی شرح بٹے کی شرح ہے
اور بنک کی شرح روزمرہ کے قرضوں کے سود کی شرح ہے۔ مثلاً گرم بازاری کے زمانے میں بنک کی شرح کے
مقابلے میں ہنڈی کی شرح بالعموم زیادہ ہوتی ہے اور صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی ہے جب سرد بازاری شروع
ہونے والی ہوتی ہے۔ اس طرح ہنڈی کی شرح آیندہ ہونے والی کاروباری حالت کا بہت پہلے سے پتا دیتی ہے۔

[2]۔ دیکھو فنڈلے شراس کی کتاب موسوم بہ "ہندوستانی مالیات و بنک کاری" صفحہ ۳۴۱-۳۴۲۔

بہت کم تعلق ہوتا ہے ۔ صراف بنکوں سے رقمی امداد کبھی کبھی اور وہ بھی تھوڑی مقدار میں لیتے ہیں جس کی وجہ سے صراف کی شرح اور بنک کی شرح میں کوئی مطابقت نہیں ہوتی ۔ صرافوں کا کاروبار اب بھی بڑی حد تک ملک کے بنک کاری کے نظام سے باہر ہے ۔

اگر ہندوستانی زر کے بازار اور اس بازار میں جو یورپی وضع کی بنک کاری کے اداروں پر مشتمل ہے حقیقی تعلق قائم ہو جائے تو اس کی وجہ سے ایسی تجارتی ہنڈیوں کی تعداد بڑھ جائے گی جو مستند اداروں یا بٹہ گھروں کی دستخطی ہوں ۔ یہ بٹہ گھر دونوں قسم کے زر کے بازاروں سے متعلق رہیں گے اور ایک طرف ایسے تاجروں کی ضروریات پوری کر سکیں گے جو دیسی زر کے بازار کے لچکدار طریقوں کو پسند کرتے ہیں تو دوسری طرف زر اور بٹے کے مرکزی بازاروں تک رسائی حاصل کر سکیں گے ۔ (دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۵۸۱) ۔

زر کی مختلف شرحوں کو گھٹا کر ایک سطح پر لانے میں ابھی ایک مدت درکار ہوگی ۔ " نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ ملک کے سب سیال ذرائع ذخیرے کی شکل میں یکجا کئے جائیں اور اس ذخیرے کی بنا پر ہنڈیاں بلا درمیانی لوگوں کے توسط اور تاخیر کے چلنے لگیں "[1] اب جبکہ زرر و بنک کھل گیا ہے اور یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ زرر و بنک ہندوستان میں ہنڈیوں کا بازار قائم کرنے میں مدد دے گا ، یہ امید کی جا سکتی ہے کہ بنک زر کی شرحوں کے اختلاف اور تغیرات کو ختم کر دے گا اور زر کے بازار میں جو مختلف شرحیں رائج ہیں ان کی روک تھام کرے گا ۔ (دیکھو فصل ۲۸ - ۲۹)

۲۷ ۔ زر کی موسمی قلت

ہندوستانی زر کے بازار کی ایک اور نمایاں خصوصیت (جس کا اوپر ضمناً تذکرہ کیا جا چکا ہے) یہ ہے کہ سال کے ایک حصے میں زر کی قلت رونما ہوتی ہے اور زر کی شرحیں بڑھ جاتی ہیں ۔ ہندوستان میں سال کم و بیش دو نمایاں دوروں میں منقسم ہوتا ہے ۔ (۱) نومبر تا جون جو گرم بازاری کا زمانہ ہے جبکہ زرعی پیداوار کی اندرونی علاقوں سے بندرگاہوں اور اندرونی بازاروں تک نقل و حمل کے لئے روپیہ درکار ہوتا ہے ۔ (۲) جولائی تا اکتوبر جو سرد بازاری کا زمانہ

---

۱ ۔ دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۵۰۱ ۔

ہے جبکہ فلز یا دوسری اشیا کی خریداری کے سلسلے میں زر مالی مرکزوں کو واپس آتا ہے۔ سال کے ان مختلف حصوں میں زر کی شرحوں میں وسیع اختلافات ہوتے ہیں اور گرم بازاری کے زمانے کی انتہائی شرح اور سرد بازاری کے زمانے کی اقل شرح کے درمیان نمایاں فرق ہوتا ہے۔ مثلاً ۱۹۲۴ء میں انتہائی شرح ۹ اور اقل شرح ۴ تھی۔ اس کے مقابلے میں یہ اعداد ۱۹۲۶ء میں ۷ اور ۵، ۱۹۲۹ء میں ۸ اور ۵ اور ۱۹۳۰ء میں ۷ اور ۵ تھے۔

کساد بازاری کے حالیہ زمانے میں بنک کی شرح کسی قدر ادنی رہی اور اس میں سال بھر تک کوئی تغیر نہیں ہوا مثلاً ۱۹۳۳-۳۴ء اور ۱۹۳۴-۳۵ء میں [1] ۳ فیصد پر قائم رہی۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ تجارت میں سرد بازاری ہوگئی ہے، اشیا کی قیمتیں گری ہوئی ہیں، سونے کی فروخت سے جو روپیہ ہاتھ آیا اس نے اعتبار کی مقدار کو بڑھا دیا ہے اور زر کی مقدار بڑھنے سے عوام کے لئے ایک حد تک اعتباری دقتیں کم ہوگئی ہیں۔ زر کی افراط ہوجانے اور اصل کو مشغول کرنے کی خواہش کے بڑھ جانے کی وجہ سے ریزرو بنک اس بات پر مجبور ہوگیا کہ ۲۸/ نومبر ۱۹۳۵ء سے بنک کی شرح کو گھٹا کر ۳ فیصد کردے۔ اس کے بعد سے (ستمبر ۱۹۳۶ء تک) یہی شرح قایم ہے۔ بنک کی شرح کی کمی بیشی زر کی طلب کی شدت پر موقوف ہوتی ہے اور زر کی طلب کی کمی بیشی کا انحصار نہ صرف فصلوں کی نوعیت اور خاصکر برآمد کے لئے اہم زرعی پیداوار (روئی، جوٹ، گیہوں، چاول وغیرہ) کی طلب کی کمی بیشی پر ہوتا ہے بلکہ اس پیداوار کی مروجہ قیمتوں کی سطح پر بھی ہوتا ہے۔ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ کس طرح ابتداءً دیسی ساہوکار فصلوں کے لئے رقمیں مہیا کرتے ہیں اور بہت بڑا کاروبار امپیریل بنک اور دوسرے بنکوں کے لئے فراہم کرتے ہیں جو صرافوں کی ہنڈیوں پر بٹہ اور مکرر بٹہ کاٹتے ہیں۔ زرعی پیداوار کی نقل و حمل کے لئے جو روپیہ درکار ہوتا ہے اس کی وجہ سے زر کے بازار میں زر کی موسمی قلت ہوجاتی ہے۔ یہ قلت اس وجہ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اسی زمانے میں تعطیلات اور شادی بیاہ کی تقریبوں وغیرہ کے سلسلے میں کرنسی کی طلب زیادہ ہوجاتی ہے۔ لیکن زر کی موسمی قلت کے ان اسباب کے قطع نظر ہندوستان میں (معاشی کساد بازاری کے ابتدائی زمانے میں) زر کی شرحوں کے معمولاً بڑھے ہوئے رہنے کے دوسرے اسباب بھی ہیں۔ چنانچہ ہم پہلے اس بات کا تذکرہ کرچکے ہیں کہ زر کی قلت پیدا کرنے میں ریزرو خزانوں کا کتنا حصہ تھا۔ سرکاری رقوم امپیریل بنک

---

[1] امپیریل بنک کی پرانی شرح میں نقد فاضلات کی کمی بیشی کے لحاظ سے معکوس تغیر ہوتا تھا۔ نقد فاضلات گرم بازاری کے زمانے میں گھٹ جاتے تھے اور سرد بازاری کا زمانہ شروع ہوتے ہی بڑھ جاتے تھے۔

(آجکل رزرو بنک) کو منتقل ہو جانے سے زر کے بازار میں روپے کی قلت کسی حد تک دور ۲۷۴
ہوگئی ہے۔ زر کی طلب و رسد کی باہمی عدم مطابقت کی وجہ یہ تھی کہ رزرو بنک آف انڈیا
کو نوٹ جاری کرنے کے اجارے کی منتقلی سے قبل حکومت کو نوٹ جاری کرنے کا اجارہ تو حاصل
تھا مگر بنک کاری سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ۱۹۲۳ء کے زر کاغذی کے قانون کے تحت
گرم بازاری کے زمانے میں اندرونی ہنڈیوں کی بنیاد پر ۱۲ کروڑ روپے تک کرنسی جاری
کرنے کا جو انتظام کیا گیا تھا اس کی وجہ سے نوٹوں کے اجرا میں ایک حد تک ضرور لچک
پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن نوٹوں کی مقدار کا جو تعین کیا گیا تھا وہ بالکل نا واجبی تھا اور تجارتی
طبقے کی یہ عام خواہش تھی کہ اس مقدار میں اضافہ کیا جائے۔ سود کی شرحیں بھی بہت اعلیٰ
خیال کی جارہی تھیں۔ اس کے علاوہ کرنسی کے مفاجی اضافے کی ضمانت کے لئے حقیقی
اندرونی تجارتی ہنڈیوں کی قلت رہی جیسا کہ سر بیسل بلاکٹ نے ہلٹن ینگ کمیشن کے
سامنے بیان کیا۔ امپیریل بنک کو اپنے گاہکوں پر یہ دباؤ ڈالنا پڑا کہ وہ نقد اعتبار کی بجائے
ہنڈیوں کا استعمال کریں تاکہ خود بے باق ہونے والی ہنڈیوں کی تعداد میں اضافہ ہو
اور ان کی بنا پر مفاجی زر حسب ضرورت حاصل کیا جا سکے۔ زر کی قلت اس بات کی طرف
بھی منسوب کی گئی ہے کہ جنگ عظیم چھڑنے کے بعد سے حکومت نے زر کے بازار سے کثیر
قرضہ لیا جس کی وجہ سے امپیریل بنک پس انداز کردہ رقوم کافی مقدار میں حاصل نہ کر سکا اور
اس طرح زر کی شرحیں نا واجبی طور پر اعلیٰ رہیں۔ مبادلے کے بارے میں حکومت کی جو پالیسی
رہی کہ زر کی مقدار گھٹائی جائے یا کرنسی میں خلاف معمول اضافہ نہ کیا جائے اس نے بھی
وقتاً فوقتاً زر کی قلت میں شدت پیدا کی۔ لیکن یہ صورت حال اتفاق ہی سے کبھی
پیش آتی ہے۔ دوسری طرف ہندوستان میں اسٹرلنگ کی خریداری اندرون ملک زر
کی ارزاں ترسیل کے انتظامات اور امپیریل بنک اور دوسرے بنکوں کی زائد شاخوں کا
کھلنا ان سب چیزوں کی وجہ سے گرم بازاری کے زمانے میں زر کی اعلیٰ شرحوں میں کسی
حد تک کمی ہوگئی۔ لیکن حالیہ زمانے کی معاشی کساد بازاری اور زر کی ارزانی و افراط کے
قطع نظر ہندوستان میں زر کی معمولی شرح اب بھی بہت زیادہ ہے اور کاروباری جدوجہد
میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ زر کی اعلیٰ شرح کا ایک اساسی سبب اصل کی قلت ہے جو
عوام کے بڑھتے ہوئے افلاس کا راست نتیجہ ہے۔ عوام کی بہت بڑی اکثریت کی آمدنی

اس قدر قلیل ہے کہ وہ کچھ بھی رقم پس انداز نہیں کر سکتی۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ اصل کا بہت بڑا حصہ اندوختوں کی شکل میں ہے جو محض اس وجہ سے بے کار اور غیر نفع آور حالت میں پڑے ہوئے ہیں کہ بنک کاری اور نفع آور شغل اصل کی کافی سہولتیں موجود نہیں ہیں (حالیہ زمانے میں برآمد کی غرض سے سونے کی جو کثیر مقدار فروخت کی گئی اس نے زر کی قلت کے اس سبب کو کمزور کر دیا۔ اس کے علاوہ اس فروخت کی وجہ سے زر آسان شرائط اور ادنی شرحوں پر دستیاب ہونے لگا)۔ یہ خرابیاں بنک کاری کے ایک ایسے مرکزی ادارے کی ضرورت بتا رہی تھیں جو تمام موجودہ ذرائع کو ملک کے مختلف حصوں اور
سال کے مختلف موسموں میں زیادہ مساوی طور پر پھیلا سکے۔ اب جبکہ رزرو بنک آف ۴۶۵
انڈیا قائم ہو گیا ہے یہ توقع کی جاتی ہے کہ قابل قبول تجارتی تمسکات کی بنا پر خود بخود زائد نوٹوں کا اجرا ہو گا اور سود کی اعلیٰ شرحوں کا مسئلہ رونما نہ ہو گا۔ (دیکھو فصل ۵۳)۔

۲۸۔ ہنڈیوں کے بازار کی عدم موجودگی

ہنڈیوں کا منظم بازار زر کے منظم بازار کا جزو لاینفک اور اعتباری نظام کے بہ سہولت چلانے کے لئے ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ہنڈیوں کا بازار اس لئے بھی ضروری ہے کہ وہ کسی ملک کے مرکزی بنک سے مختلف اعتباری اداروں کو موثر طریقے پر ملحق کرتا ہے۔ اس بارے میں آجکل ہندوستان کی صورت حال نہایت ناقابل اطمینان ہے۔ جیسا کہ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی نے بتلایا، جہاں تک بٹے کے بازار کا تعلق ہے ہندوستان میں ہنڈیوں کی کمی ہے۔ اس کمی کی وجہ سے یہ نہیں ہے کہ لوگ اعتبار کی اس شکل (تجارتی ہنڈی) کے فائدے سے ناواقف ہیں یا اس کے استعمال کو ناپسند کرتے ہیں۔ دیسی ہنڈیاں جو مغربی ہنڈیوں کے مشابہ ہیں اس ملک میں بہت پہلے سے
نہیں تو بارھویں صدی سے ضرور استعمال ہوتی آ رہی ہیں ہنڈیوں کی قلت کا اس سے ۱
اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی بنک ہنڈیاں خریدنے میں اپنے اثاثے کا بہت ہی قلیل حصہ صرف کرتے ہیں۔ اس قلت کو حسب ذیل اسباب کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ (۱) مغربی ممالک کے مقابلے میں ہندوستان کے بنکوں کو اپنے سیال ذخیرے بہت مستحکم حالت میں رکھنے پڑتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کے اثاثے کا بڑا حصہ مستند سرکاری تمسکات کی شکل میں مشغول رہتا ہے۔ اس طریقے کو اس وجہ سے پسند کیا جاتا ہے کہ

سرکاری تمسکات سے بہت اچھی آمدنی ہوتی ہے (۲) بنک عادۃً اپنی ہنڈیوں کو امپیریل بنک
میں بٹہ کٹوانے کے لئے پیش نہیں کرتے کیونکہ ایسا کرنا بازار میں کمزوری کی علامت خیال کیا جاتا
ہے۔ (۳) مشترک سرمایہ بنک مکرر بٹے کے لئے ہنڈیاں پیش کرنے کے مقابلے میں سرکاری
تمسکات کی کفالت پر امپیریل بنک سے قرضہ لینے کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ موخر الذکر بنک
خود ایک حریف تجارتی بنک ہے اور کوئی بنک اس کو پسند نہیں کرتا کہ کسی حریف بنک کو اپنی
ہنڈیوں کے بیوپار کا راز بتلا دے۔ اس کے علاوہ چونکہ امپیریل بنک صرف اپنی پسند کی ہنڈیوں
پر اپنی صوابدید کے لحاظ سے بٹہ کاٹتا ہے اور اس بارے میں کوئی معیار اس کی جانب سے مقرر
نہیں کیا گیا ہے اس لئے مشترک سرمایہ بنک ایسی ہنڈیوں پر جو ان کے اپنے گاہک پیش کرتے
ہیں بھروسا نہیں کر سکتے۔ (۴) ہندوستان میں ہنڈیوں کے بازار کے قائم ہونے کی راہ میں
ایک اور رکاوٹ یہ ہے کہ دیسی ہنڈیوں کی بنیاد ناقص ہوتی ہے جس کی وجہ سے بنک ان کے
فوراً سکارنے میں تامل کرتے ہیں کیونکہ اگر دستخط کرنے والے صراف کا نام صرافوں کی اس
فہرست میں ہو جو بنکوں کی منظورہ ہے تو موجودہ زمانے میں بنک اس کی شخصی ضمانت کا
اطمینان کر لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ دیسی ہنڈی پر نظر ڈالتے ہی یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ آیا وہ
خاص کوٹھی کی ہنڈی ہے یا حقیقی تجارتی ہنڈی کیونکہ اس کے ساتھ بیعنامہ، بیمک یا دستاویزات
ملکیت وغیرہ منسلک نہیں ہوتے جن سے اس بات کا پتا چلے کہ ہنڈی کس قسم کے سامان
باپیداوار سے متعلق یا اس پر مبنی ہے۔ ہنڈیوں کے آزادانہ استعمال کے راستے میں دوسری ۴۴۷
مشکلات یہ ہیں کہ ہنڈیاں مختلف زبانوں میں لکھی جاتی ہیں، رواجی دستوروں کے متعلق مختلف
طریقوں پر عمل کیا جاتا ہے، عوام کی اکثریت ناخواندہ ہے، اور مدتی ہنڈیوں[1] پر بھاری
رسوم اسٹامپ عائد کئے جاتے ہیں، وغیرہ۔ (۵) ہندوستان میں ہنڈیوں کا بازار آزادی
کے ساتھ قائم کرنے سے باز رکھنے والا ایک اور عنصر یہ ہے کہ ہندوستان میں داخلی تجارت
کے لئے رقمی امداد نقد اعتبار کے ذریعے سے مہیا کی جاتی ہے۔ اس طریقے سے قرض دہندے
اور قرض گیرندے دونوں کو کچھ سہولتیں حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً قرض گیرندے کو نقد اعتبار پر
صرف اسی صورت میں سود ادا کرنا پڑتا ہے جبکہ منظورہ اعتبار سے کام لیا جائے اور اگر

[1] (Ussance Aills.

قرض گیرندے کی حالت خراب ہو جائے تو بنک قرضہ دینے سے ہاتھ روک سکتا ہے۔ دوسری طرف ہنڈیوں کے چند فوائد ہیں۔ مثلاً بنک ان کو آسانی سے نقدی میں تبدیل کر سکتے ہیں اور ہنڈیوں کی مدت ختم ہونے تک قرض گیرندے کو یہ یقین رہتا ہے کہ اس کو اعتبار کی ایک مقررہ مقدار ضرور ملے گی۔ اگر بنک ہنڈیوں کے استعمال کو بڑھانے کی کوشش کریں تو یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ہنڈیوں کی مقبولیت بڑھ جائے گی۔

۲۹۔ ہنڈیوں کے بازار کو فروغ دینے کی تدابیر

ہندوستان میں ہنڈیوں کے بازار کو فروغ دینے کے لیے بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی نے مختلف تدابیر اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ (دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۵۹۳)۔

(۱) رزرو بنک آف انڈیا اس بات کی آمادگی ظاہر کرے کہ اپنی معلنہ شرح کے حساب سے (جو اقل شرح ہو) ان اعلیٰ درجے کی ہنڈیوں اور پرامیسری نوٹوں کو خریدے گا یا مکر ربٹہ کاٹے گا جو حقیقی تجارتی کاروبار کی بنا پر لکھے گئے ہوں، اور ان عندالطالبہ قرضوں پر جو مستند تمسکات کی بنیاد پر حاصل کئے جائیں سود کی نسبتہً زیادہ شرح لگائے گا۔ مشترک سرمایہ بنکوں کو چاہیئے کہ رزرو بنک کو اپنے رقیب کی حیثیت سے نہ دیکھیں اور ان سہولتوں سے پورا فائدہ اٹھائیں جو تجارتی دستاویزات پر مکر ربٹہ کاٹنے کے لئے رزرو بنک مہیا کرے۔ (دیکھو فصل ۵۰)۔

(۲) بٹہ کاٹنے کے مصارف میں کمی کر دی جائے تاکہ ہنڈیوں کے استعمال میں زیادہ سہولت پیدا ہو اور تمام صوبہ واری پائے تختوں میں ہنڈیوں کا ایک ایک حساب گھر قائم کیا جائے تاکہ اس طرح ہر جگہ ایک ہی کمیشن وصول کرنے کا طریقہ رائج ہو سکے۔

(۳) ہندوستان کے مختلف حصوں میں مال خانے قائم کئے جائیں تاکہ وہ ہنڈیوں کے استعمال کو ترقی دیں، کیونکہ اس طریقے سے تاجروں اور صرافوں کی لکھی ہوئی خالص کوٹھی کی ہنڈیوں کی بجائے دستاویزی ہنڈیاں استعمال کی جائیں گی جن پر بنک بخوشی بٹہ کاٹیں گے۔

(۴) مدتی ہنڈیوں پر محصول اسٹامپ (۱/۸ پائی فیصدی) کی موجودہ اعلیٰ شرح جو رزر کی موجودہ ادنیٰ شرحوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہونے کے علاوہ ہنڈیوں کے بکثرت استعمال کئے جانے کی راہ میں مزاحم ہے منسوخ ہونی چاہیئے یا کافی کم ہو جانی چاہیئے۔ اس

محصول کو بالکل منسوخ کر دینے کے لئے ہلٹن ینگ کمیشن نے بھی پر زور سفارش کی تھی۔ یہ معلوم کرنا اطمینان افزا ہے کہ رزرو بنک آف انڈیا حکومت ہند پر اور اس کے توسط سے صوبہ واری حکومتوں پر یہ دباؤ ڈال رہا ہے کہ محصول کو گھٹا کر ۲ آنے فی ہزار روپے کی یکساں سطح پر لانے کے بارے میں بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی نے جو مشورہ دیا ہے اس پر عمل کیا جائے۔

(۵) ڈاکخانوں کو چاہئے کہ ہنڈیوں کے فارم انگریزی اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں چھپوا کر رکھیں۔ دستاویز کے مالک کو مشکلات اور پریشانی سے بچانے کے لئے ۴۶۷
بنکوں، صرافوں اور تاجروں کی مسلمہ انجمنوں کو مجاز کیا جائے کہ وہ ہنڈیوں پر قبولیت سے انکار اور وجہ انکار کا اندراج کریں۔ ہنڈیوں کے استعمال کو بڑھانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہنڈیوں کے متعلق جو طریقے رائج ہیں ان کو معیاری بنایا جائے۔ اگر ضرورت ہو تو اس غرض کے لئے قانون بھی وضع کیا جا سکتا ہے۔

(۶) بنکوں کو چاہئے کہ قبولیتی ہنڈیوں[1] کا طریقہ رائج کریں کیونکہ معمولی تجارتی ہنڈیوں کے مقابلے میں اس قسم کی قبولیتی ہنڈیوں کی خرید و فروخت بہت جلد ہوگی۔ اس سلسلے میں ہم ان مساعی کا خیر مقدم کرتے ہیں جو آجکل رزرو بنک کی طرف سے کی جا رہی ہیں۔ رزرو بنک اس بات کی تحقیقات کر رہا ہے کہ سکار گھر زیادہ تعداد میں کھولنے سے ہنڈیوں کا بازار قائم کرنے میں کس حد تک مدد مل سکتی ہے۔

(۷) ہنڈی دلالی کے طریقے کو دیسی ساہوکار کے کاروبار کا اساسی جزو قرار دیکر اور رزرو بنک کی سرپرستی میں ان بنکروں اور ان کے مالدار امانت رکھانے والوں کی طرف سے بٹہ گھر کھلوا کر بٹے کا بازار قائم کیا جائے[2]۔

(۸) حسب ذیل صورتوں میں ہنڈیوں کے استعمال کو بڑھایا جائے۔ (۱) فصلوں کی کاشت کے لئے رعایا کو جو قرضے دیئے جائیں ان کے متعلق زرعی تمسکات کا طریقہ رائج

[1] بنکر کی قبولیتی ہنڈی ایسی ہنڈی ہوتی ہے جس کے متعلق بنک ادھار سامان خریدنے والے سے قبل از قبل یہ معاہدہ کر لیتا ہے کہ اسے سکارے گا اور یہ ہنڈی اشیا فروش کی جانب سے لکھی جاتی ہے۔

[2] دیکھو رزرو بنک آف انڈیا کی اسکیم کا مسودہ دیسی ساہوکاروں کے الحاق کے بارے میں ۲۱/اگست ۱۹۳۷ء

کیا جا سکتا ہے (اگرچہ اس کے رواج پانے میں کچھ مدت لگے گی۔ (ب) فصلیں کاٹنے کے بعد جو قرضہ درکار ہو اس کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ کسان امداد باہمی کے گودام کے رکن بن سکتے ہیں اور ان انجمنوں سے زرعی پیداوار کی کفالت پر قرضہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ انجمنوں کو مجاز کر سکتے ہیں کہ وہ چہار ماہی ہنڈیاں ان (کسانوں کے) نام لکھیں اس قسم کی ہنڈیوں پر مرکزی امداد باہمی کے بنکوں اور دوسرے بنکوں میں بٹہ یا مکرر بٹہ کاٹا جا سکتا ہے۔ (ج) صرافوں کی طرف سے دیہی ساہوکاروں کو قرضہ دیے جانے کی صورت میں مدتی ہنڈیوں کے استعمال کو بڑھایا جائے۔ ان ہنڈیوں پر صرف بنکوں میں بٹہ کٹوا سکتے ہیں۔ (د) باضابطہ مال گودام قائم کر کے زر کے بازار میں قرضوں کے سلسلے میں ہنڈیوں کے استعمال کو عام کیا جا سکتا ہے۔ اور دیہی تاجر چھ مہینے کی زرعی دستاویزی مدتی ہنڈیوں کو استعمال کر سکتے ہیں جن کو رجسٹر شدہ مہاجن سکار سکتا ہے۔ اس طرح کی ہنڈیوں پر زر کے مرکزی بازار میں بٹہ کاٹا جا سکتا ہے (ہ) بندرگاہوں سے اندرون ملک سامان کی منتقلی کے سلسلے میں رقم فراہم کرنے کے لئے موجودہ زمانے میں کمیشن ایجنٹوں کے ذریعے سے اندرون ملک کے تاجروں کو نقد اعتبار دینے کا جو طریقہ رائج ہے اس کی بجائے ہنڈیاں استعمال کی جائیں (و) ملک کی تجارت خارجہ کے سلسلے میں رقم فراہم کرنے کے لئے بھی ہنڈیوں کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسٹرلنگ کی درآمدی ہنڈیوں کے موجودہ طریق کے بجائے روپیہ کی درآمدی ہنڈیاں رائج کرنی چاہئیں کیونکہ اسٹرلنگ کی درآمدی ہنڈیوں کے
۲۲۸ بیوپار میں ہندوستانی زر کے بازار میں دقت محسوس کرتے ہیں۔ درآمدی تجارت کے رقمی انتظام کے لئے بنکوں کی سکارہوئی ہنڈیاں استعمال کرنی چاہئیں[1] سامان درآمد کرنے والوں کو یہ موقع دینا چاہئے کہ وہ امانتی رسائد کے موجودہ طریقے کے بجائے ہنڈیوں کی بنیاد پر سامان وصول کر سکیں۔

ہمارے اعتباری نظام کو زیادہ لچکدار اور منظم بنانے اور زر کی موسمی قلت کو رفع کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہنڈیوں کا ایک منظم بازار قائم کیا جائے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے تجربے سے یہ معلوم ہوا کہ بنک کاری کا مرکزی نظام قائم ہونے کے بعد ہی ہنڈیوں کے

[1] دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۵۹۵ - ۶۰۳ -

بازار نے ترقی کی ہمارے ملک میں بھی اسی طرح کے خوشگوار نتیجے کی توقع کی جا سکتی ہے کیونکہ اب یہاں بھی زرزرو بنک قایم ہو چکا ہے اور وہ مجاز ہے کہ ایسی ہنڈیاں (جن میں درآمدی ہنڈیاں شامل ہوں) اور پرامیسری نوٹ خریدے فروخت کرے اور ان پر بٹہ کاٹے جو درج فہرست بنک یا صوبہ واری امداد باہمی بنک کے دستخطی ہوں۔ اس کے علاوہ زرزرو بنک گرم بازاری کے زمانے میں قابل قبول دستاویزات کی بنیاد پر نوٹ بھی جاری کر سکتا ہے۔ (نیز دیکھو فصل ۵۰ و ۵۳)۔ بازاروں کے حالات کی تحقیق جو آجکل مسٹر لونگ اسٹون مشیر فروخت کی نگرانی میں مرکزی و صوبہ واری مارکٹنگ افسر انجام دے رہے ہیں ہندوستان میں ہنڈیوں کے استعمال کو بڑھانے کے امکانات پر مزید روشنی ڈال سکتی ہے۔

۳۰۔ اندرون ملک ترسیل رقوم کے طریقے[۱]

گرم بازاری کے زمانے میں زرعی پیداوار کی نقل و حمل کے سلسلے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں اور سال کے مختلف زمانوں میں جو کثیر رقوم درکار ہوتی ہیں ان کی بہم رسانی کس طرح کی جاتی ہے۔ اندرون ملک ترسیل رقوم کے اہم طریقوں کی پانچ صورتیں ہو سکتی ہیں:۔ (۱) دیسی ہنڈیوں یا چکوں کے ذریعے رقوم کی ترسیل۔ (۲) امپیریل بنک کے ذریعے انتقالات۔ (۳) سرکاری خزانوں کے ذریعے انتقالات۔ (۴) ریل یا سڑک کے ذریعے روپیوں کی منتقلی، اور (۵) ڈاکخانوں کے ذریعے رقوم کی روانگی۔

(۱) ہنڈی یا چک۔ صرافوں کے کاروبار اور ان کے ہنڈیوں کے بیوپار کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ روپے کو ایک مرکز سے دوسرے مرکز کو منتقل کرنے کے لئے کس طرح ہنڈیاں لکھی جاتی ہیں۔

یہ بھی مذکور ہو چکا ہے کہ کس طرح چکوں کو روز افزوں مقبولیت حاصل ہو رہی ہے اور چکوں کے ذریعے مطالبات کی ادائی میں سہولت پیدا کرنے میں حساب گھروں کا کیا حصہ ہے۔

[۱] دیکھو رپورٹ کرنسی اور مالیہ کے متعلق ۱۹۳۶-۳۷ء اور ۱۹۳۷-۳۸ء کے لئے گوشوارہ (۱۹) تا (۲۱) اندرون ملک ترسیل رقوم کے اعداد و شمار۔

(۲) رزرو بنک اور امپیریل بنک کے ذریعے رقمی انتقالات ۔ ملک کے اندر رقوم کی ارزاں ترسیل کے لئے رزرو بنک اور امپیریل بنک بہت کچھ سہولتیں مہیا کرتے ہیں۔ رزرو بنک برقی انتقالات اور بنک پوسٹ ہنڈیاں Bank-Post Bills جاری اور ادا کرتا ہے۔ امپیریل بنک عند المطالبہ ڈرافٹ خریدتا اور ڈرافٹوں اور برقی انتقالات کی ادائی کرتا ہے[1] دوسرے مشترک سرمایہ بنکوں میں سے اکثر بنک قلیل کمیشن پر بنکرس ڈرافٹ جاری کرتے ہیں۔ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی نے اس امر کی پرزور سفارش کی کہ ہندوستان کے اندر ترسیل رقوم کے مصارف ممکنہ حد تک گھٹا دیے جائیں (فقرہ ۱۵۷)۔

(۳) سرکاری خزانوں کے توسط سے انتقالات۔ گو سرکاری خزانے زیادہ تر انتظامی کاموں کے لئے قائم کئے گئے ہیں پھر بھی وہ عوام کے ہاتھ "رسدی ہنڈیاں" اور انتقالات[2] عام طور پر فروخت کرتے ہیں۔ یہ انتقالات دوسرے خزانوں کے نام لکھے جاتے ہیں بہ شرطیکہ موخر الذکر کے پاس کافی رقوم موجود ہوں۔ اس طرح سہولتیں مہیا کرنے کا قلیل سا محنتانہ بھی وصول کیا جاتا ہے۔ جہاں ترسیل رقوم کی کافی سہولتیں نہ ہوں وہاں امداد باہمی کے بنکوں کو بلا معاوضہ رقوم کی منتقلی کی سہولتیں مہیا کر کے اندرون ملک مبادلے کے کاروبار کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ امداد باہمی کے بنکوں کے لئے یہ سہولت بھی مہیا کی جا سکتی ہے کہ وہ صدر مرکزی بنک کے موسومہ ڈرافٹوں کو بلا معاوضہ ضلع اور تعلقے کے خزانوں میں فروخت کر کے رقوم حاصل کر سکیں۔

(۴) سڑک اور ریل کے ذریعے انتقالات۔ اگرچہ سڑک اور ریل کے ذریعے روپوں کی حقیقی نقل وحمل کے بجائے رفتہ رفتہ مذکورۂ بالا طریقوں کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ پھر بھی ایسے کاشتکاروں اور چھوٹے تاجروں سے زرعی پیداوار خریدنے کے لئے جو سکوں کی شکل میں قیمت حاصل کرنا چاہتے ہیں زرعی پیداوار کی خریداری کے لئے اب بھی روئی اور جوٹ کے علاقوں کو کافی مقدار میں روپے روانہ کیے جاتے ہیں۔ دس روپے کا نوٹ بھی عوام کی ضروریات

[1] رزرو بنک، امپیریل بنک اور حکومت کے توسط سے رقمی ترسیلات کے متعلق تفصیلات کے لئے دیکھو رپورٹ کرنسی اور مالیہ کے بارے میں (۳۶-۱۹۳۵ء اور ۳۷-۱۹۳۶ء) جدول ۱۹-۱

[2] دیکھو رپورٹ کرنسی اور مالیہ برائے ۳۶-۱۹۳۵ء و ۳۷-۱۹۳۶ء جدول ۱۹-۲۱

کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف قسم کی زرعی پیداوار کی نقل و حمل مختلف اوقات میں ہوتی ہے۔ چنانچہ شمالی و مغربی ہندوستان میں روئی کی نقل و حمل دسمبر سے اپریل تک ہوتی ہے۔ شمالی ہندوستان میں گیہوں کے لئے یہ مہینے اپریل، مئی اور جون ہیں۔ برما کے چاول کے لئے یہ زمانہ جنوری سے اپریل تک رہتا ہے۔ اسی طرح جوٹ کی نقل و حمل کا زمانہ اگست سے دسمبر تک ہے[1]۔ غرض سال کے دوران میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں روپوں کی آمد و رفت سیکڑوں میل ادھر سے ادھر جاری رہتی ہے۔ لیکن چلن سے جو روپے واپس آرہے ہیں اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ سکوں کے بجائے نوٹوں کا رواج بڑھتا جارہا ہے۔

(۵) ڈاکخانے کے ذریعے ترسیلات۔ ڈاکخانوں سے منی آرڈر کے ذریعے جو رقمیں بھیجنے کا طریقہ ہے اس سے چھوٹی رقمیں بھجوانے میں بہت سہولت ہوتی ہے۔ البتہ بڑی رقموں کے بھجوانے میں مصارف زیادہ پڑتے ہیں۔ اس لئے مصارف کی شرحوں میں کمی کرنا مناسب ہوگا۔ جیسا کہ بنک کے چکوں کی صورت میں ہوتا ہے ڈاکخانے نے بھی باہمی مطالبات کے بے باق کرنے کا طریقہ جاری کر دیا ہے۔ ڈاکخانے کے ذریعے سے نوٹوں کو بھیجنے کا طریقہ بہت پہلے مقبول ہو چکا تھا اور اسی وجہ سے کرنسی کے انتظام کے سلسلے میں حلقہ وار کی طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی تھی[2]۔

ان تمام طریقوں سے زر کی گردش بڑھ گئی ہے اور زر کی شرحوں میں مختلف مقامات میں ضرورت سے زائد فرق نہیں ہونے پاتا۔

۳۱۔ مرکزی بنکوں کی افادیت

۴۷۰ ۱۹۲۰ء میں جو بین الاقوامی مالی کانفرنس بمقام برسلز منعقد ہوئی اس میں ایک رزولیوشن یہ منظور ہوا کہ "جن ملکوں میں مرکزی بنک موجود نہ ہوں وہاں ایک ایک مرکزی بنک قایم کیا جائے"۔ اس رزولیوشن کی تہ میں یہ خیال مضمر ہے کہ ملک کی مالی حالت کا استحکام اور بنک کاری کے مرکزی ادارے کا وجود لازم و ملزوم ہیں۔ اس رزولیوشن میں جو مشورہ دیا گیا ہے اس پر یورپی ممالک اور

---

[1] ایچ۔ ایس جیونس کی کتاب "ہندوستان میں زر، بنک کاری اور مبادلہ" صفحہ ۹۰-۹۹۔

[2] دیکھو کتاب ہذا باب ۷ فصل ۳۹ و ۴۰۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں جہاں حال حال تک بنک کاری میں عدم مرکزیت موجود تھی چند سال سے عام طور پر عمل کیا جا رہا ہے[1] ہندوستان میں ایک زمانے سے مرکزی بنک کا وجود مختلف اسباب کی بنا پر ضروری خیال کیا جا رہا تھا۔ حالات سے مجبور ہو کر حکومت نے بہت سے اہم فرایض اپنے سے متعلق کر لئے تھے مثلاً نوٹوں کا اجرا، نقد فاضلات کا انتظام بیرونی مبادلات کی نگرانی وغیرہ۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑی کمزوری یہ تھی کہ یہ فرائض ملک کی بنک کاری سے علحدہ تھے۔ اس علحدگی کی وجہ سے دو جداگانہ محفوظ ذخیرے یعنی سرکاری ذخیرہ اور بنک کاری کا ذخیرہ رکھنے پڑتے تھے اور ان دونوں میں کوئی منظم ومربوط تعلق نہ تھا جس کی وجہ سے زر کا نظام انتہائی غیر لچکدار ہو گیا تھا۔ بنک کاری کے مرکزی ادارے کی عدم موجودگی کی وجہ سے ملک کی بنک کاری کی پالسی پر نگرانی کا بھی عام طور پر فقدان رہا۔ اگرچہ نظری اعتبار سے بہت سے ذخائر تھے یعنی مختلف بنک اپنے علحدہ علحدہ ذخیرے رکھتے تھے، لیکن عملاً یہ ذخائر بالکل ناکافی تھے اور یہ اندیشہ رہتا تھا کہ نازک زمانے میں ہر بنک دوسرے بنک کا آسرا لیگا۔ ۱۹۱۳ء کے بنک کے دوالوں نے اس استدلال کو اور قوی بنا دیا۔ مرکزی بنک کھولنے کے دوسرے فوائد یہ ہوں گے کہ بنک کی شرح کے تغیرات میں اعتدال پیدا ہو جائے گا اور ملک کے بنک کاری کے ذخائر میں اضافہ کرنے اور ربط پیدا کرنے سے بنک کی شرح جو عام طور پر بلند رہتی ہے نیچی ہو جائے گی۔ مرکزی بنک کمرشیل بنکوں کو کافی سہولتیں بھی مہیا کرے گا جس کی وجہ سے دوسرے بنک اس قابل ہو جائیں گے کہ اپنے اثاثے کو آسانی کے ساتھ نقد میں تبدیل کر سکیں اور یہ ایک ایسی سہولت ہے جو ان بنکوں کی ساکھ کو بڑھا دے گی۔ اس کے علاوہ سرکاری عہدہ دار جو مختلف قسم کے مالی اور نیم مالی فرائض انجام دیتے تھے اور جن کے انجام دینے کی ان میں پوری صلاحیت ومہارت نہیں تھی ان کے یہ سب فرائض مرکزی بنک اپنے ذمے لیگا۔ ہندوستان میں ماہرانہ مشورے اور تجربے کے فقدان کی وجہ سے مالی معاملات میں مرکزی اقتدار دفتر ہند اور انڈیا کونسل کو حاصل ہو گیا تھا۔ حالانکہ ان کو ہندوستان کے حالات سے کافی واقفیت نہیں ہو سکتی تھی مرکزی بنک ماہرانہ تجربے اور

[1] دیکھئے کش ہائیکس کی کتاب موسوم بہ "مرکزی بنک" صفحہ ۲۔

مشورہ بر سر موقع پیش کر کے اس دقت کو رفع کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مرکزی بنک وزیر ہند کو عوام کی نکتہ چینی سے بچا سکتا ہے۔ ہندوستان میں معیار خشت طلا کا رواج زر کے محکمے کو پابند کر دے گا کہ وہ عند الطلب ایک مقررہ شرح مساوات پر سونے کی خرید و ۴۷۱
فروخت کرے اور سونے کی آزادانہ درآمد و برآمد کے مواقع پیدا کرے۔ مقررہ قیمت پر سونا (یا مبادلۂ طلا) مہیا کرنے کی غیر محدود ذمہ داری پورا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ زر کے محکمے کو یہ اختیار حاصل ہو کہ اپنی بٹے کی شرح بڑھا کر اپنے سونے کے ذخائر کے باہر جانے کی روک تھام کرے برخلاف اس کے اگر سونے کی درآمد شروع ہو جائے تو زر کا محکمہ اپنی بٹے کی شرح کم کر دے۔ کرنسی کے استحکام کی خاطر بٹے کی شرح میں کمی بیشی کرنا مرکزی بنک کے خاص کاموں میں سے ایک کام ہے۔ اس کے علاوہ مرکزی بنک کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ وہ صنعتی و تجارتی کاموں میں سرکاری رقوم کو زیادہ مفید اور وسیع طریقے پر لگانے میں بہت مدد دے سکتا ہے۔ نیز مرکزی بنک چھوٹے بنکوں کو مدد دیکر اور تجارتی طبقے کے فائدے کی خاطر ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں رقوم کی ترسیل کے مصارف میں مسلسل کمی کر کے بنک کاری کی سہولتوں کو وسیع کر سکتا ہے۔ ایک اور فائدہ یہ ہے کہ مرکزی بنک بنک کاری کے مستحکم اور معتبر طریقوں کو رواج دینے کا بہت ہی کارآمد ذریعہ بن سکتا ہے۔ آخر میں یہ کہ زر کی قوت خرید کے استحکام کو برقرار رکھنا روز بروز ایک عالمی مسئلہ تسلیم کیا جا رہا ہے جس کے لئے دنیا کے بڑے ملکوں کا باہمی تعاون ضروری ہے۔ تعاون حاصل کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ ہر ملک میں ایک اچھا مرکزی بنک قائم کیا جائے۔[۱]

۳۲۔ مرکزی بنک قایم کرنے کی تجویز اور اسکی تاریخی کیفیت

ہندوستان کے لئے مرکزی بنک قائم کرنے کا خیال تقریباً ایک صدی پرانا ہے۔[۲] ۱۸۳۶ء میں تاجروں کی ایک بڑی جماعت نے جس کے ایسٹ انڈیز میں مفادات تھے مجلس نظما کے سامنے ایک تجویز پیش کی کہ برطانوی ہند کے لئے بنک کاری کا ایک بڑا دارہ قایم کیا جائے

[۱] دیکھو کش وایلکن کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۳ تا ۵۔

[۲] ہندوستان میں ۱۸۳۶ء کے بعد سے صدر بنک یا مرکزی بنک قائم کرنے کی تمام تجاویز کی تفصیلی تاریخ کے لئے

اور اس تجویز سے حسب ذیل فوائد منسوب کئے۔ (۱) انگریزی اصل انگریزی تجارت میں بہ سہولت مشغول کیا جا سکے گا۔ (۲) ہندوستانی زر کے نظام میں استحکام پیدا ہوگا۔ اور (۳) ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے اس کے مالی انتظامات خاصکر ہندوستان میں مالگزاری وصول کرنے اور مطالبات وطن کے پورا کرنے کے سلسلے میں سہولتیں ہوں گی۔ یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ حکومت جیسے گاہک کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بنک آف بنگال کی موجودگی بالکل ناکافی تھی۔ تین پریزیڈنسی بنکوں کے کھل جانے سے بنک آف بنگال کو بنک آف انڈیا میں تبدیل کرنے کا خیال عملی صورت اختیار نہ کر سکا۔ ۱۸۶۷ء میں مسٹر ڈکسن بنک آف بنگال کے معتمد اور خزانہ دار کی تحریک پر یہ سوال پہلی دفعہ اٹھایا گیا کہ تینوں پریزیڈنسی بنکوں کو ملا کر ایک کل ہند بنک قائم کیا جائے۔ لیکن اس کا عملی نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلا۔ ۱۸۹۸ء
۴۷۲ میں فاولر کمیٹی نے مرکزی بنک کے مسئلے پر محض سرسری طور پر غور کیا۔ ۱۹۰۱ء میں لارڈ کرزن کی حکومت نے اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لیا اگرچہ اس کا بھی کچھ نتیجہ نہیں نکلا پھر بھی حکومت نے اپنے اس ایقان کا اعلان کر دیا کہ وہ پریزیڈنسی بنکوں کو ملا کر ایک سرکاری بنک قایم کرنا مناسب خیال کرتی ہے۔ ۱۹۱۳ء میں انڈیا آفس کے سر لیونل ابراہیم نے اس مسئلے کے متعلق ایک یادداشت مرتب کی جو چیمبرلین کمیشن کے سامنے پیش ہوئی۔ اس کمیشن کے ایک رکن مسٹر جے۔ ام۔ کینس نے بھی ایک دوسرے رکن سر ارنسٹ کیبل کے تعاون سے مرکزی بنک کی ایک تفصیلی اسکیم تیار کی۔ اسی اسکیم کے اساسی عناصر بعد میں چلکر ۱۹۲۱ء کے امپیریل بنک کے قانون میں شامل کر لیے گئے۔ جنگ عظیم کے چھڑ جانے سے یہ مسئلہ اس وقت تک کے لئے ملتوی ہوگیا جب کہ اس پر مکرر غور کرنے کا کوئی زیادہ مناسب موقع ملے۔ بظاہر مرکزی بنک قایم کرنے کی واحد قابل عمل صورت یہی تھی کہ تینوں پریزیڈنسی بنکوں کو ملا دیا جائے۔ ان بنکوں کے کاروبار کا پھیلاؤ، ان کا وسیع تجربہ، ان کے جمے جمائے تعلقات اور ان کی حکومت سے دیرینہ اور مسلسل وابستگی خاصکر جنگ کے زمانے میں ان کی طرف سے حکومت کی مختلف خدمات کی بجا آوری؛ ان سب چیزوں کی موجودگی میں یہ ناممکن تھا کہ مرکزی بنک کے قیام کے مسئلے پر غور کرتے وقت ان کو نظر انداز کر دیا جاتا۔

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ۔۔ دیکھو او۔ پی۔ گپتا کی کتاب موسومہ بہ "ہندوستان میں مرکزی بنک کاری" دستہ ۱۹۳۲ء

خود پریزیڈنسی بنک بھی پہلے کے مقابلے میں اب اس بات کے لئے آرزومند نہیں تو کم ازکم آمادہ ضرور تھے کہ انضمام کی اسکیم کو قبول کرلیں کیونکہ ان کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر اس تجویز سے انھوں نے اتفاق نہیں کیا تو حکومت رائے عامہ کے دباؤ سے خالص سرکاری طریقے پر ایک جدید سرکاری بنک کھولنے اور پریزیڈنسی بنکوں سے اپنا تعلق منقطع کرلینے پر مجبور ہوجائے گی۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۲۰ء میں امپیریل بنک کا قانون منظور ہوکر ۲۷/جنوری ۱۹۲۱ء سے نافذ ہوا۔

۳۳ - امپیریل بنک کا قیام

انضمام کے وقت امپیریل بنک نے تینوں پریزیڈنسی بنکوں کو چالو اداروں کی حیثیت سے مع جملہ واجبات اور واصلات کے اپنے ذمے لے لیا حتیٰ کہ سابقہ پریزیڈنسی بنکوں کے تمام نظما اس نئے بنک کی مقامی مجلسوں کے رکن مقرر رہے۔ مقامی مجلسوں کی ترکیب بعینہ وہی رہی جیسی کہ پرانی مجلس نظما کی تھی۔ صدر مرکزی دفتر کا محل وقوع مقرر کرنے کے لئے کوئی دفعہ نہیں تھی۔ یہ طے ہوا کہ مرکزی مجلس کا انعقاد سال میں کم ازکم ایک دفعہ ہر مقامی صدر دفتر میں ہو۔ مجلس قانون ساز نے یہ طریقہ اس لئے تجویز کیا کہ تینوں پریزیڈنسی شہروں میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا ایک نازک مسئلہ تھا۔ بنک آف انگلینڈ یا بنک آف فرانس کی طرح امپیریل بنک بھی اب ایک نجی ادارہ ہے۔ لیکن حال (۱۹۳۵ء) میں رزرو بنک آف انڈیا کے کھلنے تک امپیریل بنک اس محدود معنی میں سرکاری بنک بھی تھا کہ وہ مجلس قانون ساز کے ایک خصوص قانون کے ذریعے بطور خاص قائم ۴۷۳
کیا گیا تھا۔ اور خاص حدود کے اندر اس کا انتظام اور نگرانی حکومت کے ہاتھ میں تھی بنک آف انگلینڈ اور بنک آف فرانس سے امپیریل بنک اس لحاظ سے مختلف تھا کہ سرکاری بنک کی حیثیت سے اس کے فرائض بہت محدود تھے۔

تینوں پرانے پریزیڈنسی بنکوں کے مجموعی اصل ۷ کروڑ روپے کے مقابلے میں نئے بنک کا اصل اور محفوظ سرمایہ ۱۵ کروڑ روپے تھا جس کے منجملہ مجوزہ اصل ۲۵، ۱۱ کروڑ روپے اور محفوظ سرمایہ ۷۵، ۳ کروڑ روپے تھا۔ مجوزہ اصل پانچ پانچ سو روپے کے حصوں میں تقسیم کیا گیا جو نئے بنک کی طرف سے جاری کئے گئے تینوں پریزیڈنسی بنکوں کے حصول کے معاوضے میں امپیریل بنک کے حصے جاری کردیے جانے کی وجہ سے پرانے بنکوں کے حصہ دار خود بخود نئے بنک کے حصہ دار بن گئے۔ نئے بنک کے تحفظ اور استحکام کی خاطر اور بنک کے کاروبار کی

توسیع کی توقع کے مدنظر بنک کے سرمایے میں اضافہ کرنا مناسب خیال کیا گیا تھا۔ نئے حصے جاری کرکے اصل میں اضافہ کیا گیا اور موجودہ حصہ داروں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ ہر ایک پرانے حصے کے مقابلے میں دو نئے حصے پاسکیں گے۔

۳۴۔ امپیریل بنک کی ترکیب

امپیریل بنک کی نگرانی ایک مرکزی مجلس نظما Central Board of Governors کے تفویض کی گئی اور مقامی مجالس کلکتے، بمبئی اور مدراس میں قائم کئے گئے۔ ساتھ ہی یہ بھی طے کیا گیا کہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی منظوری کے بعد مرکزی مجلس اپنی صوابدید پر دوسرے شہروں میں مقامی مجلسیں قائم کرسکتی ہے۔

سنہ ۱۹۲۰ء کے امپیریل بنک آف انڈیا کے قانون (جس کی ترمیم سنہ ۱۹۳۴ء میں رزرو بنک آف انڈیا کے قانون کے منظور ہونے کی وجہ سے ہوئی) کے تحت مرکزی مجلس نظما حسب ذیل ارکان پر مشتمل تھی:۔ (۱) انتظامی گورنر جو دو سے متجاوز نہ ہوں جن کو مرکزی مجلس کی سفارش پر گورنر جنرل مقرر کرے اور جب تک چاہے رکھے۔ (۲) مقامی مجلسوں کے صدر، نائب صدر اور معتمد جو حصہ داروں کے نمایندے ہوں گے۔ (۳) ناظم کرنسی یا کوئی دوسرا عہدہ دار جس کو گورنر جنرل نامزد کرے۔ (۴) آخر میں گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے نامزد کردہ غیر سرکاری افراد جو چار سے متجاوز نہ ہوں اور عام محصول ادا کرنے والوں اور عوام کے اغراض کی نمایندگی کریں۔ ناظم کرنسی اور مقامی مجلسوں کے معتمدوں کو رائے دینے کا حق نہیں تھا۔ وہ محض شرکت کا حق رکھتے تھے۔ ناظم کرنسی حکومت کی نمایندگی کرتا تھا اور اس کا کام یہ تھا کہ حکومت کے اغراض کی حفاظت کرے۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل مجاز تھا کہ کسی ایسے معاملے میں جو اس کی رائے میں حکومت کی مالی پالسی یا سرکاری فاضلات کے استحکام پر اثر انداز ہوں بنک کے نام ہدایات جاری کرے۔ مرکزی مجلس کے فرایض میں یہ چیزیں داخل تھیں:۔ عام پالسی کے متعلق معاملات کا تصفیہ کرنا، مقامی مجلسوں کی نگرانی کرنے میں اپنے عام
۴۷۴ اختیارات کو کام میں لانا، رقوم کی تقسیم کا تعین کرنا، بنک کی شرح (جو اب قرضے کی شرح کہلاتی ہے) مقرر کرنا، اور بنک کے حسابات کی ہفتہ وار اشاعت کی ذمہ داری لینا۔ دوسری طرف مقامی مجالس اپنے متعلقہ علاقوں میں روزمرہ کے معمولی کاروبار سے نپٹتی تھیں۔ روزمرہ کے

عام مرکزی انتظامات ایک مختصر جماعت کے تفویض کئے گئے تھے جو مرکزی مجلس کے تین ارکان پر مشتمل تھی۔ ان ارکان میں سے ایک ناظم کرنسی تھا۔ ایک نئی بات یہ تھی کہ قانون نے بنک کو مجاز کیا تھا کہ وہ اپنی ایک شاخ لندن میں کھولے۔ لیکن بنک اس کا مجاز نہیں تھا کہ مبادلات خارجہ میں عوام کے ساتھ براہ راست معاملہ کرے۔ ساتھ ہی وہ حکومت ہند اور وزیر ہند، سرکاری اداروں، دوسرے بنکوں اور پریزیڈنسی بنکوں کے قدیم گاہکوں کی طرف سے لندن میں کاروبار کرسکتا تھا۔

۳۵۔ امپیریل بنک کے فرائض

امپیریل بنک کس قسم کے کاروبار کرسکے گا اس بارے میں ۱۹۲۰ء کے قانون میں ۱۸۷۶ء کے قدیم پریزیڈنسی بنکوں کے قانون کی اتباع کی گئی تھی۔ البتہ چند معمولی باتوں خصوصاً لندن کے زر کے بازار میں کاروبار کرنے اور مبادلات خارجہ میں حصہ لینے کے اختیارات کے بارے میں ترمیم کردی گئی۔

امپیریل بنک جن کاموں کا مجاز تھا وہ یہ تھے:۔ (۱) حکومت ہند اور سلطنت متحدہ کے چند خاص تمسکات، پورٹ ٹرسٹ بونڈ، بعض بلدیوں، سرکاری امدادی ریلوں اور مجالس ضلع کے بونڈز میں اصل مشغول کرنا۔ (۲) مذکورۂ بالا تمسکات کی بنیاد پر قرضہ دینا۔ (۳) سکاری ہوئی ہنڈیوں، پرامیسری نوٹوں، اشیا اور ان کفالت ناموں پر قرضہ دینا جو بنک میں امانتہً رکھے گئے ہوں یا بنک کو دیئے گئے ہوں۔ (۴) ہنڈیوں اور دوسرے قابل خرید و فروخت تمسکات جو ہندوستان یا سیلون میں قابل ادائی ہوں لکھنا، سکارنا، فروخت کرنا یا ان پر بٹہ کاٹنا۔ نیز گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی ہدایت کے تابع خاص بنکوں سے یا ان کی طرف سے ایسی ہنڈیوں کی خرید و فروخت یا بٹہ کاٹنے کا کاروبار کرنا جو ہندوستان سے باہر قابل ادائی ہوں۔ بنک مجاز تھا کہ ان لوگوں کے استعمال کے لئے جن کی جائدادوں کا انتظام بنک کر رہا ہو نیز نجی کھاتہ داروں اور گاہکوں کی حقیقی ذاتی ضروریات کو پورا کرنے کی غرض سے ہنڈیاں لکھے اور اعتباری رقعے جاری کرے۔ (۵) ہندوستان میں رقوم مستعار لینا اور امانتیں حاصل کرنا، تمسکات بہ غرض حفاظت رکھنا اور ان کا سود وصول کرنا، اور سونے اور چاندی کی خرید و فروخت کرنا وغیرہ (۶) بنک کی لندنی شاخ مجاز تھی کہ بنک کے کاروبار کی غرض سے بنک کے اثاثے کی کفالت پر انگلستان میں قرضہ حاصل کرتی۔ لیکن وہ

بجز پریزیڈنسی بنکوں کے سابقہ گاہکوں کے نہ تو کسی کو نقد اعتبار دے سکتی تھی، نہ نقد کھاتہ کھول سکتی تھی اور نہ لندن میں کسی سے امانتیں وصول کر سکتی تھی۔ قانون میں بنک اور وزیر ہند کے درمیان دس سالہ معاہدے کی گنجایش رکھی گئی تھی۔ یہ معاہدہ تکمیل پانے کے بعد ایک سال قبل اطلاع دینے پر منسوخ ہو سکتا تھا۔

۳۶۔ سرکاری ادارے کی حیثیت سے بنک کے فرائض

۴۷۵ سرکاری بنک کی حیثیت سے امپیریل بنک کے فرائض حسب ذیل تھے:۔

(۱) بنک، حکومت ہند کی عام بنک کاری کے تمام کاروبار انجام دیتا تھا اور حکومت کی واجب الوصول رقمیں وصول کرتا اور حکومت کی حسب ہدایت رقمیں خرچ کرتا تھا۔ وہ اپنے صدر دفتر اور شاخوں میں سرکاری رقوم اور خزانے کے فاضلات بطور امانت رکھتا تھا۔ (اس کی وجہ سے رزرو خزانے کے طریق کی ضرورت نہیں رہی)۔

(۲) بنک قلیل سے معاوضے پر سرکاری قرضوں کا انتظام کرتا تھا۔

(۳) بنک پر لازم کیا گیا کہ ایک سو نئی شاخیں کھولے جن کے منجملہ حکومت ہند ہر چار شاخوں میں سے ایک کے محل وقوع کا تعین کر سکتی تھی۔ جنوری ۱۹۲۱ء تک جب کہ امپیریل بنک کا قانون نافذ ہوا پریزیڈنسی بنکوں کی شاخوں کی مجموعی تعداد ۵۹ تھی۔ ۳۱ مارچ ۱۹۲۶ء تک اس تعداد میں ۱۰۲ نئی شاخوں کا اضافہ کیا گیا جس سے مجموعی تعداد بڑھ کر ۱۶۱ ہو گئی۔ نئی شاخوں میں سے ۳۶ شاخیں ایسے مقامات پر ہیں جہاں پہلے سے کوئی دوسرا بنک نہیں تھا۔ باقی ۶۶ شاخوں میں سے ۶۱ شاخیں ایسے مقامات میں کھولی گئیں جہاں سرکاری خزانہ موجود تھا۔ اس طرح مجموعی طور پر ۸۹ نئی شاخیں ایسے مرکزوں میں ہیں جہاں سرکاری خزانہ موجود ہے۔

(۴) بنک سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ واجبی شرحوں پر جو ناظم کرنسی کی منظورہ ہوں عوام کے لئے اپنی مختلف شاخوں کے درمیان رقوم کی ترسیل کی ہر ممکنہ سہولت مہیا کرے گا۔ دس ہزار روپے یا اس سے زائد رقم کی ترسیل کی زیادہ سے زیادہ شرح (بجائے ۴ آنے فیصد معمولی شرح کے) ایک آنہ فیصد مقرر کی گئی۔ لیکن حال میں دوسرے بنکوں کے لئے سہولت پیدا کرنے اور امپیریل بنک کے توسط سے رقمی ترسیلات کو فروغ دینے کی

خاطر بنکوں کے لئے شرح گھٹا کر ½ آنہ فیصد مقرر کی گئی۔ یہ طے کیا گیا کہ ایسے دو مرکزوں کے درمیان جہاں امپیریل بنک کاروبار کر رہا ہو حکومت عوام کی رقوم کی ترسیل کا کام ترک کر دے۔

(۵) امپیریل بنک کی لندن کی شاخ نے جو جنوری ۱۹۲۱ء میں کھلی تھی حکومت ہند کے کاروبار کے ایک حصے کو جو سابق میں بنک آف انگلینڈ کے توسط سے انجام پاتا تھا مثلاً ہائی کمشنر کا رواں کھاتہ خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

۳۷۔ کاروبار جس کی امپیریل بنک کو ممانعت تھی

(۱) مبادلات خارجہ کا کاروبار کرنے اور لندن میں قرضہ حاصل کرنے کی بندشوں کے بارے میں جو رعایت اور ترمیم کی گئی تھی اس کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ (۲) اس بات کی صریحی طور پر ممانعت کی گئی تھی کہ گروی پر یا اس کے بغیر، جائداد غیر منقولہ کی ابتدائی کفالت پر یا کفالت ناموں کی بنیاد پر قرضہ دیا جائے۔ لیکن ثانوی کفالت پر قرضہ دیا جا سکتا تھا بشرطیکہ اصل کفالت اس قسم کی ہو جس کا ذکر فصل ۳۵ (۱) میں کیا جا چکا ہے۔ (۳) بنک اپنے ہی تمسکات یا حصوں کی کفالت پر قرضہ نہیں دے سکتا تھا۔ (۴) ذیلی قواعد کے تحت بنک کسی فرد یا شراکت یا فرم کو بٹے کے سلسلے میں یا کسی کی ذاتی کفالت پر جو رقم قرض دے سکتا تھا اس کی مقدار کی تحدید کی گئی تھی۔ (۵) قرضے چھ مہینے سے زیادہ مدت کے لئے نہیں دیے جا سکتے
تھے۔ (۶) ذاتی کفالت پر نہ تو بٹہ کاٹا جا سکتا تھا نہ قرضہ دیا جا سکتا تھا تاوقتیکہ ان کے ۴۷۶
ساتھ کم از کم ایسے دو اشخاص یا فرموں کی انفرادی ضمانت نہ پیش کی جائے جو عام شراکت میں ایک دوسرے سے غیر متعلق ہوں۔

۳۸۔ امپیریل بنک کے خلاف اعتراضات

۱۹۲۱ء میں جب امپیریل بنک قائم ہوا تو وہ بہت سخت نکتہ چینی کا ہدف بنایا گیا۔ اس موقع پر چند اعتراضات کو بیان کرنا مناسب ہوگا۔ سب سے پہلا اعتراض یہ کیا گیا کہ امپیریل بنک خالص سرکاری ادارہ یا حکومتی بنک نہیں تھا۔ وہ ایک نجی ادارہ تھا اور اس میں زیادہ تر یورپی اغراض کی نمائندگی کی وجہ سے یہ بدگمانی ہو رہی تھی کہ اس بنک کی افادیت کا دائرہ ہندوستانی صنعتی و تجارتی اغراض کے لئے کم ہو جائے گا۔ امپیریل بنک نے محض پریزیڈنسی بنکوں کے قدیم انتظام، قدیم پالیسی اور قدیم روایات کو بحال رکھا تھا۔ انگریز منتظم ہندوستانی

تاجروں اور کارخانہ داروں کے ساتھ ہمدردانہ برتاؤ کر سکتے تھے نہ ان کی ضروریات کو سمجھ سکتے تھے۔ مفصلات کی شاخوں کے ایجنٹ زیادہ تر غیر ہندوستانی ہونے کی وجہ سے لوگوں کی مقامی ضروریات کے سمجھنے سے قاصر تھے اور صرافوں سے تعلقات بڑھانے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی تھی۔ بنک کی شاخوں میں جو امانتیں جمع کی جاتی تھیں ان کو مقامی طور پر مشغول نہیں کیا جاتا تھا بلکہ صدر دفتر کو روانہ کر دیا جاتا تھا۔ جو اعتراضات عام طور پر یورپی انتظام کے تحت کام کرنے والے اداروں پر کیے جاتے تھے وہ امپیریل بنک پر بھی صادق آتے تھے یعنی یہ کہ ان میں ہندوستانیوں کی تربیت کا کوئی انتظام نہیں کیا جاتا تھا[۱]۔ ہندوستانی کارآموزوں کے لئے کوئی قابل اطمینان اسکیم نہیں بنائی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بنک نے ذمہ دار عہدوں پر ہندوستانیوں کو مقرر کرنا شروع کیا ہے لیکن جتنے تقررات کئے جا سکتے ہیں اتنے نہیں کئے گئے ہیں۔ امپیریل بنک کے خلاف یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ ہندوستانی فرموں اور ہندوستانی اداروں کے خلاف تعصب سے کام لے رہا ہے اور یورپی فرموں اور یورپی اداروں کے ساتھ جانبدارانہ برتاؤ کر رہا ہے۔ ہندوستانی اغراض کی نمایندگی کے لئے سنہ ۱۹۲۰ء کے قانون کے تحت مرکزی مجلس میں چار غیر سرکاری ہندوستانیوں کی نامزدگی ناکافی خیال کی جا رہی تھی اور عوام کا مطالبہ یہ تھا کہ ان کا انتخاب مجلس قانون ساز کے ذریعے سے عمل میں آنا چاہئے۔ امپیریل بنک ایک نجی ادارہ ہونے کی وجہ سے حکومت اس منافع سے محروم ہو جاتی تھی جو اس بنک کے سرکاری ہونے کی صورت میں اسے ملتا۔ اس کے علاوہ اس کا بھی کوئی انتظام نہ تھا کہ منافع کی تقسیم بنک اور حکومت کے درمیان عمل میں آئے یہ استدلال کیا گیا کہ بنک کے وقار اور مادی اثاثے کی بنیاد بڑی حد تک یہ تھی کہ بنک حکومت سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لئے حکومت بنک کے منافع کا ایک حصہ پانے کی مستحق تھی۔ بنک کی اعلیٰ مقسوم دینے کی پالیسی اس حقیقی مقصد کے مغائر تھی جس کے مد نظر بنک
قائم کیا گیا تھا یعنی قومی خوشحالی کو بڑھانا۔ تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ مرکزی مجلس ۴۷۷
کچھ بھی سرگرمی کا اظہار نہیں کر رہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس کا کام یہ ہے کہ پالیسی کا تعین کرے۔ لیکن اس کی تعمیل کرنا اس کے بس سے باہر ہے۔ مرکزی مجلس کی حیثیت ایک

[۱] دیکھو جلد اول باب ۱۳ فصل (۱۶)۔

اور مجلس اسناکی ہوگئی ہے اور اس کے ہر رکن کا صرف یہ کام رہ گیا ہے کہ اپنے حلقے کے اغراض کی حفاظت کرے۔ مجلس کی طرف سے کوئی ایسی کارروائی یا متحدہ جدوجہد نہیں کی جاتی جو عام طور پر مفید ہو۔ مجلس کے اختیارات منفی حیثیت کے ہیں اور بنک کاری کی ترقی کے مستقل تعمیری پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے کافی نہیں ہیں[1]

بنک پر حکومت کی جیسی موثر نگرانی ہونی چاہئے تھی ۱۹۲۰ء کے قانون کے تحت نہیں تھی کیونکہ ناظم کرنسی سے صرف اس وقت مداخلت کی توقع کی جاتی تھی جبکہ حکومت کا مفاد خطرے میں ہو۔

بنک نے شاخوں کے توسط سے جو کاروبار کیا وہ کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ بنک کی شاخیں بعض اوقات ایسے مقامات میں قایم کی گئیں جہاں بنک کاری کی سہولتیں پہلے سے کافی موجود تھیں۔ اس کی وجہ سے موجودہ بنکوں کو امپیریل بنک کی ناواجب مسابقت سے دوچار ہونا پڑا خاصکر ۱۹۳۵ء میں ریزرو بنک قایم ہونے تک جب کہ امپیریل بنک کو خاص حقوق حاصل تھے اور کثیر سرکاری رقوم اس کے پاس رہتی تھیں۔

بعض دوسرے اعتراضات اس وجہ سے عائد ہوتے ہیں کہ بنک کے کاروبار کا دائرہ بہت محدود کر دیا گیا ہے اور اس لئے اس کی افادیت کم ہوگئی ہے۔ بنک کاری اور کرنسی کے کاروبار کی حد تک جو امپیریل بنک حکومت کی طرف سے انجام دیتا تھا امپیریل بنک یورپ کے مرکزی بنکوں سے بہت کم حقیقی مشابہت رکھتا تھا۔ جہاں تک دوسرے بنکوں کا تعلق ہے بجز سرکاری ٹکسال کے زر انتظام کے تمام معاملات مثلاً محفوظ ذخائر اور سرکاری رقوم کا انتظام اور نوٹ جاری کرنے کا کام وغیرہ مرکزی بنکوں کو تفویض کئے جاتے ہیں لیکن امپیریل بنک کو صرف نقد فاضلات اور عام بنک کاری کی نوعیت کے کام تفویض کئے گئے تھے۔ باقی معاملات مثلاً زر کاغذی محفوظ ذخیرۂ معیار طلا اور مطالبات وطن کے سلسلے میں انگلستان کو رقوم کی ترسیلات اب بھی حکومت کی نگرانی میں تھے۔ چونکہ امپیریل بنک کو نوٹ جاری کرنے کا اختیار نہیں تھا اس لئے دوسرے مرکزی

---

[1] دیکھو کے سی مہندرا کی کتاب موسوم بہ "ہندوستانی کرنسی اور مبادلہ" صفحہ ۱۹۳ تا ۱۹۵۔

بنکوں کی طرح وہ بنک کی شرح کے ذریعے سے زر کے بازار کی موثر نگرانی نہیں کر سکتا تھا۔ سنہ ۱۹۲۰ء کے قانون کے تحت بیرونی مبادلات پر حکومت اور مبادلہ بنکوں کا اجارہ بدستور قایم رہا مبادلے کے کاروبار کے پرخطر ہونے کے بارے میں مبالغے سے کام لیا گیا تھا جس کی تردید مبادلہ بنکوں کے کاروبار کی ترقی سے ہوتی ہے۔ امپیریل بنک پر ایک بندش بھی عائد کی گئی تھی۔ وہ یہ کہ بنک نہ تو کفالت کے بغیر قرضہ لے سکتا تھا اور نہ ہندوستان سے باہر امانتیں وصول کر سکتا تھا۔ یہ دراصل مبادلہ بنکوں کے لئے ایک طرح کی رعایت تھی جو ان کے حسد کی وجہ سے روا رکھی گئی تھی اور محض اسی وجہ سے امپیریل بنک کو مبادلات خارجہ کے کاروبار سے علحدہ رکھا گیا تھا۔ ہندوستانی زر کے بازار کے ۲۷۸ حالات میں اعتدال پیدا کرنے کے لئے بعض اوقات بیرونی ممالک سے قرضے اور امانتیں حاصل کرنا ضروری ہو سکتا ہے۔ آخر میں یہ کہ گو امپیریل بنک کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ وہ بنک کاری کے مختلف اداروں میں ربط پیدا کرے۔ لیکن یہ بنک صحیح معنوں میں بنکروں کا بنک نہ بن سکا۔ اس میں شک نہیں کہ دوسرے بنک اپنی رقوم امپیریل بنک میں رکھتے تھے لیکن ان رقوم کی مقدار بہت ہی قلیل تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی زر کا بازار ویسا ہی غیر مربوط رہا جیسا کہ امپیریل بنک قایم ہونے سے پہلے تک تھا۔

۳۹۔ سنہ ۱۹۳۴ء کا امپیریل بنک کا ترمیمہ قانون

جب ہلٹن ینگ کمیشن کی سفارشوں کے مطابق حکومت ہند نے جنوری سنہ ۱۹۲۷ء میں مجلس قانون ساز میں رزرو بنک کا مسودۂ قانون پیش کیا تو اسی زمانے میں ایک اور مسودۂ قانون سنہ ۱۹۲۰ء کے امپیریل بنک کے قانون میں ترمیم کی غرض سے پیش کیا گیا جس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ بنک پر سے ان بندشوں کو ہٹا لیا جائے جو مخلوط حیثیت کی وجہ سے اس پر عائد تھیں۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ حکومت کی جو نگرانی بنک کے کاروبار پر چلی آ رہی تھی اس میں کمی کر دی جائے [1]۔ اس طرح یہ واضح ہو گا کہ امپیریل بنک کا مسودۂ قانون رزرو بنک کے مسودۂ قانون کا نتیجہ تھا اور چونکہ رزرو بنک کا مسودۂ قانون التوا میں

[1] دیکھو او۔ پی۔ گپتا کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں مرکزی بنک کاری (سنہ ۱۷۷۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء)" صفحہ ۷۷۔ فصل ۴۳ میں اس مسئلے پر بحث کی گئی ہے کہ کیوں امپیریل بنک کو مرکزی بنک میں تبدیل نہیں کیا گیا۔

پڑ گیا اس لئے امپیریل بنک کے مسودۂ قانون کو آگے نہیں بڑھایا جا سکا۔ لیکن جب ۱۹۳۳ء میں ۱۹۳۳ء کا زر و بنک کا تیسرا مسودۂ قانون منظور ہوا تو اسی زمانے میں امپیریل بنک آف انڈیا کے مرممہ مسودۂ قانون نے بھی امپیریل بنک آف انڈیا کے قانون (نمبر ۳ بابت ۱۹۲۰ء) کی شکل اختیار کر لی اور ۶/ مارچ ۱۹۳۴ء کو گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نے اس کو منظور کیا۔ مرممہ قانون کی رو سے حسب ذیل اہم تبدیلیاں کی گئیں:۔

(۱) بنک کی ترکیب میں تغیرات۔ مرکزی مجلس حسب ذیل نظما پر مشتمل ہے:۔
(ا) اس قانون کی رو سے قایم شدہ مقامی مجلسوں کے صدر اور نائب صدر۔ (ب) اس قانون کی رو سے قایم شدہ ہر مقامی مجلس کے ارکان میں سے منتخب کردہ ایک شخص (ج) ایک مینجنگ ڈائرکٹر جس کو مرکزی مجلس پانچ سال کے لئے مقرر کرے اور جس کی مدت میں مرکزی مجلس زیادہ سے زیادہ مزید پانچ سال کی توسیع کر سکتی ہے۔ (د) گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے نامزد کردہ دو غیر سرکاری اشخاص جو دو سے زائد نہ ہوں (ہ) مرکزی مجلس کا مقرر کردہ ایک نائب مینجنگ ڈائرکٹر۔ (و) مقامی مجلسوں کے معتمد۔ (ز) مرکزی مجلس کے صوابدید کے لحاظ سے قانون کے تحت آیندہ جو مقامی مجلسیں قائم ہوں ان کی نمایندگی کرنے والے اشخاص۔ جن نظما کی صراحت (ہ) اور (و) میں کی گئی ہے ان کو مرکزی مجلس کے اجلاسوں میں رائے دینے کا حق نہیں ہے۔ نائب مینجنگ
ڈائرکٹر صرف اس وقت رائے دے سکتا ہے جبکہ مینجنگ ڈائرکٹر غیر حاضر ہو۔ گورنر جنرل ۴۷۹
بہ اجلاس کونسل ایک ایسے عہدہ دار کو نامزد کرے گا جس کو مرکزی مجلس میں شرکت کا حق ہوگا لیکن رائے دینے کا حق نہ ہوگا۔ نئے قانون کے تحت ناظم کرنسی بہ لحاظ عہدہ مجلس کا رکن نہیں رہ سکتا اور گورنر جنرل کے نامزد کردہ اشخاص کی تعداد گھٹا کر دو کر دی گئی۔ اسی طرح مینجنگ ڈائرکٹر کا تقرر بھی براہ راست مجلس کر سکتی ہے۔ اس طرح بنک کے کاروبار پر حکومت کی نگرانی کم کر دی گئی ہے۔

(۲) امپیریل بنک آف انڈیا حکومت کا بنکر نہیں رہا (یہ حیثیت اب زر و بنک کو حاصل ہو گئی ہے)۔ لیکن امپیریل بنک مجاز کیا گیا ہے کہ زر و بنک کے واحد ایجنٹ کی حیثیت سے حکومت کا کاروبار چلانے کے لئے زر و بنک سے معاہدہ کرے۔ (اس پر تفصیلی بحث فصل ۵۶ میں کی گئی ہے)۔

(۳) امپیریل بنک کی لندن کی شاخ کے کاروبار پر سابق میں جو بندشیں عاید کی گئی تھیں وہ اٹھالی گئیں۔ بنک کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ ہندستان اور بیرونی ملکوں میں اپنی شاخیں اور ایجنسیاں کھولے۔

(۴) مرکزی مجلس مجاز کی گئی ہے کہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی پہلے سے منظوری حاصل کئے بغیر مقامی مجلسیں قایم کرے۔ اسی طرح بنک مجاز ہے کہ اس قسم کی منظوری لئے بغیر اپنے اصل میں اضافہ کرے۔ گورنر جنرل کی مالی پالیسی یا حکومت کے فاضلات کی حفاظت پر اثرانداز ہونے والے معاملات سے متعلق گورنر جنرل کو بنک کے نام ہدایات جاری کرنے کا جو اختیار تھا اس کے تابع اب بنک نہیں رہا۔

(۵) بنک کے کاروبار پر سے چند بندشیں اٹھالی گئیں جسب ذیل اہم تبدیلیاں کی گئیں:۔ بنک اب مجاز ہے کہ ایسی ہنڈیاں خریدے جو ہندوستان کے باہر قابل ادائی ہوں، ہندوستان سے باہر قرضہ حاصل کرے اور بیرونی مبادلات کا کاروبار کرے۔ ہو سبھی زراعتی کاروبار کی رقمی امداد کے سلسلے میں جو قرضے دیے جائیں (اور جن ہنڈیوں پر بٹہ کاٹا جائے) ان کی مدت بڑھا کر چھ مہینے کی بجائے نو مہینے کر دی گئی ہے۔ بنک مجاز ہے کہ ایسی جائداد منقولہ یا غیر منقولہ کے متعلق جو بنک کے پاس کسی قرضے کے سلسلے میں مکفول ہو یا کفالت سے کسی اور طرح سے لگاؤ رکھتی ہو اس کی حقیت، ملکیت یا دوسرے حقوق خریدے اور حاصل کرے یا ان کے بارے میں کوئی دوسری قسم کا معاملہ کرے۔ بنک کو یہ بھی اختیار دیا گیا ہے کہ زر رو بنک کے حصوں کی کفالت پر یا کسی بلدی جماعت کے جاری کردہ ڈبنچروں یا دوسرے تمسکات کی بنیاد پر قرضہ دے یا نقد اعتبار مہیا کرے۔ اس کے علاوہ یہ بنک گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی اجازت سے ایسے ڈبنچروں اور تمسکات پر بھی قرض دے سکتا ہے اور نقد اعتبار مہیا کر سکتا ہے جو کسی والی ریاست یا کسی محدود ذمہ داری کی کمپنی کے جاری کردہ ہوں۔ لیکن اس قسم کے قرضوں کے لئے بنک کی مرکزی مجلس کی اجازت ضروری ہے۔ بنک کو یہ بھی اجازت ہے کہ مرکزی مجلس کی منظوری حاصل کر کے ایسے سامان کی کفالت پر قرضہ دے اور نقد اعتبار مہیا کرے۔ جو قرضے کے سلسلے میں بنک کی تحویل میں دیا گیا ہو۔

۴۸۰ چند قدیم بندشیں جو زمین کی گروی کے کاروبار پر یا مذکورۂ بالا تر میموں

کے ساتھ) قرضوں کی مدت پر یا انفرادی قرض گیرندوں کو دیے جانے والے قرضوں کی مقدار کے بارے میں لگائی گئی تھیں اب بھی موجود ہیں اس کے علاوہ بنک کے حصوں کی کفالت پر قرضہ دینا بھی ممنوع ہے۔ یہ بندشیں اس بنا پر حق بجانب قرار دی گئی ہیں کہ امپیریل بنک کو زر و بنک کا واحد ایجنٹ ہونے کا خاص امتیاز حاصل ہے اور اس حیثیت سے وہ حکومت کے خزانے کا کاروبار کر سکتا ہے اور سرکاری فاضلات اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ اس وجہ سے ایک خصوصی قانون کی ضرورت تھی تاکہ امپیریل بنک آف انڈیا کے کاروبار کی تنظیم کی جائے۔

۴۰۔ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشیں امپیریل بنک کے بارے میں

(یہ فرض کر کے کہ ایک جداگانہ زر و بنک قایم کیا جائے گا) بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی نے امپیریل بنک کے بارے میں حسب ذیل سفارشیں کیں:۔ (۱) بنک کو چاہیئے کہ چکوں اور ہنڈیوں کی قسم وصول کرنے کا کام اپنے گماشتوں کی حیثیت سے دیسی ساہوکاروں سے اسی طرح لے جس طرح مشترک سرمایہ بنکوں اور امداد باہمی کے بنکوں سے لیتا ہے۔ (۲) بنک دیسی ساہوکاروں کی ہنڈیوں پر موجودہ سے زیادہ آزادی کے ساتھ بٹہ کاٹے۔ (۳) امداد باہمی کے بنکوں کو نقد اعتبار اور ڈرافٹ کے بارے میں بدستور سہولتیں مہیا کی جائیں۔ (۴) ترسیل رقوم کی سہولتیں امداد باہمی کے بنکوں کے لئے انھی شرایط پر مہیا کی جائیں جن شرایط پر کہ مشترک سرمایہ بنکوں کے لئے مہیا کی جاتی ہیں۔ (۵) بنک کو چاہیئے کہ گودام میں رکھی ہوئی زرعی پیداوار کی بنیاد پر قرضے دینے کی پالسی پر بدستور کشادہ دلی سے عمل کرے۔ (۶) جرمنی کے مشترک سرمایہ بنکوں کی طرح امپیریل بنک کو چاہیئے کہ محفوظ و مناسب حدود کے اندر صنعتوں کی مالی امداد کی پالسی کو وسعت دے۔ (۷) بعض شرایط کے تحت بنک کو چاہیئے کہ ان بنکوں کی صف میں امتیازی جگہ لے جو ہندوستان کی تجارت خارجہ کے لئے رقمیں مہیا کرتے ہیں[1]۔

اب جبکہ امپیریل بنک پر سے ان بندشوں میں سے چند بندشیں ہٹا لی گئی ہیں جو ۱۹۲۰ء کے قدیم قانون نے عائد کی تھیں تو یہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے کہ امپیریل بنک

[1] ۔ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۵۲۶۔

خاصکر صنعتوں کی مالی امداد اور مبادلات خارجہ کے کاروبار کے بارے میں کس طرح اپنی جدوجہد کو وسیع کرتا ہے۔ امپیریل بنک نے مبادلات خارجہ کا ایک علٰحدہ شعبہ قایم کیا ہے اور اپنے مبادلات خارجہ کے کاروبار کو بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ امپیریل بنک کو اس کاروبار کے لئے خاص سہولتیں حاصل ہیں، کیونکہ اس کی ایک شاخ لندن میں کھل گئی ہے، ہندوستان میں متعدد شاخیں قائم ہوگئی ہیں اس کے کاروباری تعلقات وسیع ہوگئے ہیں اور مالی ذرایع بہت کثیر ہیں۔

۱۴۱- امپیریل بنک کی مالی حالت

مندرجۂ ذیل دونوں جدولوں سے سرسری طور پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ امپیریل بنک نے کس درجہ ترقی کی ہے، اس کے مالی ذرایع کیا ہیں اور وہ کس قسم کے کاروبار کرتا ہے۔

(۲) امپیریل بنک آف انڈیا کا اصل، محفوظ سرمایہ، امانتیں اور نقد فاضلات۔ ۴۸۱

(بحساب لاکھ روپے)

سال ۳۱ر دسمبر	ادا شدہ اصل	محفوظ سرمایہ	سرکاری امانتیں	نجی امانتیں	نقد فاضلات	مشغولات اصل (سرکاری اور دوسرے تمسکات جن کی قانون کے تحت اجازت تھی۔)
۱۹۲۱ء	۵و۶۲	۴و۱۵	۶و۸۰	۶۵و۷۸	۱۳و۶۰	۱۲و۴۶
۱۹۲۳ء	۵و۶۳	۴و۵۵	۸و۵۷	۷۴و۲۰	۱۵۰۱	۱۲و۱۸
۱۹۲۵ء	۵و۶۳	۴و۹۲	۵و۳۷	۷۷و۸۳	۱۷و۴۷	۱۷و۰۱
۱۹۲۷ء	۵و۶۳	۵و۲۴	۷و۲۰	۷۲و۰۷	۱۰و۸۹	۱۸و۵۰
۱۹۲۹ء	۵و۶۲	۵و۴۷	۷و۶۰	۷۱و۶۴	۱۴و۰۰	۳۳و۰۰
۱۹۳۱ء	۵و۶۲	۵و۱۴	۸و۳۲	۶۳و۸۶	۱۱و۰۴	۳۰و۲۷
۱۹۳۳ء	۵و۶۳	۵و۴۹	۶و۴۴	۷۴و۱۳	۱۵و۶۰	۳۷و۰۳

۱۹۳۴ء	۵٫۶۲	۵٫۶۶	۰٫۴۷۲	۷۴٫۲۸	۱۸٫۹۷	۴۱٫۵۶
۱۹۳۵ء	۵٫۶۳	۵٫۷۶	[1]	۷۹٫۰۹	[2] ۱۹٫۵۹	۴۶٫۸۸

(ب) امپیریل بنک آف انڈیا کے کاروبار کی کیفیت ۲۲/اپریل ۱۹۳۶ء کو
(بحساب ہزار روپے)

واجبات	روپیہ	روپیہ	واصلات	روپیہ	روپیہ
اصل:-			مشغولات اصل:-		
مجوزہ اصل۔ پانچ پانچ سو روپے فی حصے کے حساب سے ۲ لاکھ ۲۵ ہزار حصے	۱۱۲۵۰۰		سرکاری تمسکات	۳۷۳۱۲۷	
جاری کردہ اصل۔ پانچ پانچ سو روپے فی حصے کے حساب سے ...۷۵ حصے پوری طرح ادا شدہ	۳۷۵۰۰		دوسرے مشغولات جن کی اجازت ۱۹۲۰ء کے امپیریل بنک آف انڈیا کے قانون کے تحت تھی	۱۰۳۲۵	۳۸۳۴۵۲
			قرضے:-		
			قرضے	۷۰۵۷۲	
ڈیڑھ لاکھ حصوں پر بحساب ۱۲۵ روپے فی حصہ حصہ داروں سے وصول شدنی	۱۸۷۵۰	۵۶۲۵۰	نقد اعتبار اور اوورڈرافٹ۔	۲۳۵۴۴۷	
			خریدی ہوئی اور بٹہ کی ہوئی ہنڈیاں	۴۹۲۲۵	۳۵۵۲۴۴
ڈیڑھ لاکھ حصوں پر بحساب ۳۷۵ روپے فی حصہ حصہ داروں سے وصول شدنی بقایا	۵۶۲۵۰		قبولیتی ہنڈیوں کے سلسلے میں کھاتہ دار بنکوں سے واجب الوصول رقمیں		۵۸۵
			بے کار سرمایہ		۱۹۸۴۹
			متفرق		۵۶۵۱
محفوظ سرمایہ		۵۵۰۰۰	فلز		—

[1] یکم اپریل ۱۹۳۵ء کو سرکاری امانتیں رزرو بنک آف انڈیا کو منتقل کر دی گئیں۔
[2] اس رقم میں وہ فاضلات بھی شامل ہیں جو رزرو بنک میں رکھی گئیں۔

طویل مدت کی امانتیں، سیونگ بنک اور رواں حسابات وغیرہ		۸۰۷۲۰	نقد:- نقد بدست اور نقد رزرو بنک آف انڈیا میں	۷۳۶۵۹	
تمسکات کی بنیاد پر لئے ہوئے قرضوں کے سلسلے میں واجب الادا رقمیں		–	دوسرے بنکوں میں رکھی ہوئی رقمیں	۸۰۱۳۳	۱۶۱۷۹۲
کھاتہ دار بنکوں کی قبولیتی ہنڈیوں کے سلسلے میں واجب الادا رقمیں۔		۵۸۵	....		
متفرق		۶۹۱۸	....		
		۹۲۶۵۷۳			۹۲۶۵۷۳

۴۸۲ **۴۲- رزرو بنک کا مسئلہ** اب رزرو بنک کے مسئلے پر بحث کرنا مناسب ہوگا کیونکہ رزرو بنک کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس کو ہندوستانی زر اور بنک کاری کے نئے نظام میں نہایت اہم اور مرکزی حیثیت حاصل رہے گی۔ ہم ان فرائض کا تذکرہ کر چکے ہیں جو نئے بنک کو تفویض کئے جانے والے ہیں۔ چنانچہ منجملہ دوسری چیزوں کے اس بنک سے یہ بھی توقع کی جاتی ہے کہ وہ بنکروں کا بنک رہے گا اور ملک کے بنک کاری اور زر کے ذخائر پر مرکزی نگرانی قائم کرے گا۔ رزرو بنک کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستانی زراعت، تجارت اور صنعت کے لئے قرضے اور بنک کاری کی زائد سہولتیں مہیا کرکے ہندوستان کو اس مالی و معاشی ترقی کی طرف بڑھنے میں مدد دے گا جو اپنے دہلے مختلف کمیشنوں اور کمیٹیوں کا موضوع بحث رہی ہے۔ اس بنک سے یہ بھی توقع ہے کہ وہ بٹے کا بازار قائم کرے گا، ہنڈی سکارنے کے کاروبار کو ترقی دے گا، زرعی پیداوار کی فروخت کے لئے مزید سہولتیں مہیا کرے گا اور ہندوستان کے مادی ذرائع کی ترقی کے لئے ہندوستانی اصل کی فراہمی کے عظیم امکانات کو کام میں لائے گا۔[1] مرکزی بنک کے عام مسئلے پر بحث کی جا چکی ہے۔[2] ہندوستان میں اس قسم کے بنک کی ضرورت عام طور پر نہ صرف

[1]- دیکھو سر بیسل بلاکٹ کی تقریر رزرو بنک کے ابتدائی مسودۂ قانون دسمبر ۱۹۳۲ء کو پیش کرنے کے دوران میں۔
[2]- دیکھو فصل ۱۳۱ اسی باب میں۔

اس وجہ سے محسوس ہو رہی تھی کہ بنک کاری اور زر کے نظام کی ترقی ہو بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ملک کی روز افزوں سیاسی بیداری اس بات کی متقاضی ہے کہ ہر قسم کے قومی ادارے قائم کئے جائیں جن میں سے ایک مرکزی بنک بھی ہے[1]

۴۳۔ ایک بالکل نیا بنک قائم کرنے کا مسئلہ

امپیریل بنک قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ سرکاری بنک کی حیثیت سے کام کرے۔ لیکن ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ کیوں یہ بنک اس غرض کو اطمینان بخش طریقے پر پورا نہ کر سکا۔ وہ حقیقی معنوں میں مرکزی بنک کے ایک یا دو کام انجام دیتا تھا اور اس مسئلے پر بہت بحث ہوی کہ آیا اس کو حقیقی مرکزی بنک میں تبدیل کر دینا مناسب ہوگا یا نہیں۔ لیکن اس تجویز کے خلاف کئی سخت اعتراضات کئے گئے۔ اولاً یہ کہ امپیریل بنک ایک نجی ادارہ تھا جس کی اولین غرض نفع حاصل کرنا تھی چونکہ اس بنک کو جگہ جگہ شاخیں کھولنی پڑی تھیں اس لئے اس کی حیثیت تجارتی بنک کی ہو گئی تھی۔ مگر تجارتی بنک کاری اور مرکزی بنک کے کاروبار میں حقیقت میں کوئی مطابقت نہیں ہے۔ امپیریل بنک کو سنہ ۱۹۲۰ء کے قانون کے تحت جو مراعات حاصل تھیں ان سے زیادہ مراعات مرکزی بنک کی حیثیت سے دوسرے بنکوں کے محفوظ ذخائر اور حکومت کی رقوم رکھنے کے متعلق حاصل ہوں گی۔ ایسی حالت میں اس بنک کو ان دوسرے بنکوں سے مسابقت کا موقع دینا جو ان حقوق اور مراعات سے محروم تھے غیر منصفانہ تھا۔ سچ پوچھو تو بنکروں کے بنک کا کام دوسرے بنکوں کی حفاظت کرنا ہے نہ کہ ان سے مسابقت کرنا۔ اس کے علاوہ متعدد شاخیں قایم کرنے سے کرنسی جاری کرنے والے بنک کو تقویت نہیں پہنچتی بلکہ اس کی راہ میں مزاحمت پیدا ہوتی ہے۔ مرکزی بنک کی شاخیں صرف چند اہم مرکزوں میں قائم کر دینا کافی ہے۔ ۴۸۴
اگر امپیریل بنک کو مرکزی بنک میں تبدیل کرنا ہو تو اس کے منشور کو بالکل تبدیل کرنا پڑے گا تاکہ اس کے تجارتی بنک کاری کے کاروبار کو ممنوع قرار دیا جا سکے۔ ہلٹن ینگ کمیشن کا یہ بھی استدلال تھا کہ امپیریل بنک خاصکر سنہ ۱۹۲۰ء سے ملک کے مختلف حصوں میں شاخیں قایم کر کے ملک کے اعتباری نظام کی بہت ہی مفید خدمت انجام دے رہا تھا۔ ایسی صورت میں بنک کو اس مفید خدمت سے روکنا اور اس پر بندشیں عائد کر کے اس کے

---

[1] دیکھو پی' لویٹ کی کتاب موسوم بہ The Mirror of Investment.

کاروبار کو صرف مرکزی بنک کاری تک محدود رکھنا مناسب نہیں تھا۔ اس کے برعکس مناسب یہ تھا کہ امپیریل بنک کو ان بندشوں سے بالکل آزاد کر دیا جائے جو اس پر ۱۹۲۰ء کے قانون کے تحت عائد کی گئی تھیں۔ ان بندشوں کی ضرورت اس وجہ سے لاحق ہوئی تھی کہ ابتداءً مخلوط قسم کے کاروبار اس بنک کے تفویض کئے گئے تھے۔ اس بنک کو مرکزی بنک کاری کے کاروبار سے الگ کر دینے سے بنک اس قابل ہو جائے گا کہ ہندوستان میں بنک کاری کی سہولتوں کو پھیلانے کے اہم کام کو اچھی طرح انجام دے۔ اسی لئے کمیشن نے یہ سفارش کی کہ ایک علیحدہ اور بالکل نیا مرکزی بنک قائم کیا جائے اور یہ تجویز کیا کہ امپیریل بنک رزرو بنک کے اصل ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرے۔ اس تجویز کو ملک میں عام طور پر پسند کیا گیا۔ پہلے یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ امپیریل بنک عوام میں مقبول نہیں ہوا تھا اور عوام اس کو اس قومی نصب العین سے معرا تصور کرتے تھے جو ایک مرکزی بنک میں ہونا ضروری تھا۔ اس لئے رائے عامہ بحیثیت مجموعی اس بنک کے رزرو بنک میں تبدیل کیے جانے کی مخالف تھی۔

۴۴۔ ہلٹن ینگ کمیشن کی تجاویز

ہلٹن ینگ کمیشن نے تجویز کیا کہ رزرو بنک کو نجی حصہ داروں کا بنک ہونا چاہیئے۔ کمیشن نے رزرو بنک کے لئے جو دستور پیش کیا وہ امپیریل بنک کے دستور سے ملتا جلتا تھا اور ملک کے وسیع رقبے اور مقامی حالات کے اختلافات کے مدنظر کمیشن کے خیال میں سب سے بہتر طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ اہم کاروباری مرکزوں میں مقامی صدر دفتر قائم کئے جائیں جن کا انتظام مقامی مجلسوں کے تفویض ہو اور ان مقامی مجلسوں کے ارکان کا انتخاب متعلقہ حلقوں کے حصہ دار کریں۔ مرکزی اور مقامی مجلسیں حکومت کی مداخلت اور ہر قسم کے سیاسی دباؤ سے آزاد ہوں؛ ارکان کی ایک بڑی اکثریت بنک کے حصہ داروں کی نمایندہ ہو اور ان ہی کی منتخب کردہ ہو اور مجلس کے ارکان کی ایک مختصر اقلیت کو حکومت نامزد کرے۔ حکومت کے نامزد کردہ ارکان کی موجودگی اس لئے ضروری ہے کہ حکومت کو کرنسی کے معاملات کا کافی تجربہ ہے اور اس کے بنک کاری اور ترسیل رقوم کے کاروبار خود بہت بڑے ہیں۔ لیکن سیاسی دباؤ کے خطرے کو رفع کرنے کے لئے منشور میں یہ واضح ہو جانا چاہیئے کہ کوئی ایسا شخص مقامی مجلس کا صدر یا نائب صدر مقرر نہیں کیا جائے گا

۴۸۴ اور نہ مقامی مجلس کا رکن نامزد کیا جائے گا جو گورنر جنرل کی کونسل، کونسل آف اسٹیٹ، مجلس قانون ساز، یا صوبہ وار مجلس انتظامی یا مجلس قانون کا رکن ہو۔

نوٹوں کے اجرا اور محفوظ ذخائر کی ترکیب اور مقام وغیرہ کے متعلق مفصل سفارشیں پیش کی گئی ہیں۔ چنانچہ چند سفارشوں کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے[1] جہاں تک نوٹوں کے اجرا کے سلسلے میں سونے اور طلائی تمسکات کے ذخائر کا تعلق ہے کمیشن نے انگلستان کے ۱۸۴۴ء کے بنک چارٹر ایکٹ کے طریقے کو اس وجہ سے مسترد کر دیا کہ وہ ہندوستان کے حالات کے لحاظ سے موزوں نہیں تھا کیونکہ ہندوستان میں چکوں کا استعمال بہت کم ہے۔ کمیشن نے "متناسب ذخیرے کا طریقہ" تجویز کیا جس کے تحت چالو نوٹوں کی ضمانت کے لئے کم سے کم مقدار سونے یا طلائی تمسکات کی قانوناً معین کر دی جاتی ہے۔ البتہ اس معینہ مقدار میں عارضی مدت کے لئے کمی کی جا سکتی ہے بہ شرطیکہ اس کمی پر ٹیکس ادا کیا جائے اور اس سلسلے میں باضابطہ طور پر حکومت سے اجازت حاصل کی جائے۔ "معینہ اعتباری ذخیرے" کے طریقے کے مقابلے میں "متناسب ذخیرے" کے طریقے میں کرنسی میں کمی بیشی کی زیادہ گنجایش ہے۔ اس کے علاوہ موخرالذکر طریقے میں انگریزی طریقے کے مقابلے میں افراط زر کا بھی زیادہ اندیشہ نہیں ہے کیونکہ انگریزی طریقے میں بھی چکوں کی افراط سے اعتبار میں زائد از ضرورت وسعت ہو جانا ممکن ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر دو طریقوں کے تحت کرنسی اور اعتبار کو کامیابی سے چلانے کے لئے احتیاط اور دوراندیشی کی ضرورت ہے۔

۴۵۔ سرکاری بنک اور حصہ داروں کے بنک کا مقابلہ

جنوری ۱۹۲۷ء میں حکومت نے مذکورۂ بالا اصول کے مطابق ایک مسودۂ قانون (رزرو بنک کا پہلا مسودۂ قانون) پیش کیا جس میں یہ تجویز کیا گیا تھا کہ بنک حصہ داروں کا بنک ہو۔ اس کے نظما تجارتی طبقے میں سے لئے جائیں اور امپیریل بنک سے ایک جدید معاہدہ کیا جائے جس کی رو سے اس کو بعض قدیم بندشوں سے آزاد کر دیا جائے۔ یہ مسودۂ قانون ایک منتخبہ کمیٹی کے تفویض کیا گیا۔ کمیٹی میں اس

---

[1] دیکھو باب (۸) فصل (۱۲) و (۱۳)۔

مسئلے پر سخت اختلاف آرا پیدا ہوگیا کہ آیا رزرو بنک سرکاری بنک ہو یا حصہ داروں کا بنک اور اس کی مرکزی مجلس کی ترکیب کیا ہو۔ جہاں تک اصول کا تعلق ہے یہ مسلمہ ہے کہ حصہ داروں کا بنک قابل ترجیح ہے اور مرکزی بنک کو سرکاری محکمے کے بجائے عوام کا ایک بڑا ادارہ ہونا چاہئے[1]۔ یہ صحیح ہے کہ کسی حد تک سرکاری نگرانی ضروری ہے کیونکہ حکومت کو خود اپنے اغراض کی حفاظت کرنا ہے۔ اس کے علاوہ حکومت کو یہ اختیار ہونا چاہئے کہ وہ بنک کو محض نفع کمانے والا ادارہ بننے اور حقیقی قومی اغراض کے خلاف عمل کرنے سے روکے۔ لیکن بہتر صورت یہ ہوگی کہ بنک کی ابتدا ایک آزاد ادارے کی حیثیت سے ہو اور پہلے سرکاری بنک قائم کرنے اور اس کے بعد اس بنک کو حکومت سے بے تعلق کرنے کی تدابیر اختیار کرنے کے بجائے بہتر یہ ہوگا کہ اس آزاد ادارے کے بارے میں حکومت کو حسب ضرورت خاص اور محدود اختیارات دیدیے جائیں۔

۴۸۵ بنک کے حکومت کی ملکیت میں ہونے سے حکومت کو بیجا مداخلت کا بآسانی بہانہ مل جاتا ہے۔ اس تجویز کے متعلق کہ ہندوستانی مجلس قانون ساز کے ارکان ہی رزرو بنک کے بعض نظما کا انتخاب کریں اور خود بھی ناظم بن سکیں، یہ اعتراض کیا گیا کہ اس طریق کے معنی یہ ہوں گے کہ سیاسی دباؤ کی بدترین صورت یعنی جماعت بندی اور ذاتی اغراض کی صورت پیدا کی جارہی ہے۔ کیونکہ ارکان کی جو فہرست مجلس قانون ساز کی طرف سے پیش کی جائے گی اس میں زیادہ تر اس جماعت کے ارکان ہوں گے جو برسر اقتدار ہوں گے اور اس طرح مجلس نظما میں جو ارکان بھیجے جائیں گے ان کی راست اور ذاتی کارروائیوں کی وجہ سے سیاسی اختلافات کا اثر بنک کی پالیسی پر براہ راست پڑے گا۔ مجلس قانون ساز جس میں پہلے ہی سے اتنا کام ہے کہ بہ مشکل پورا ہو پاتا ہے اس طریقے پر عمل کرنے سے اس کے کام اور بھی بڑھ جائیں گے[2]۔ اس کے علاوہ ایک دلیل یہ بھی پیش کی گئی کہ بڑے اصلداروں خاصکر بیرونی اصلداروں کے تسلط کا اندیشہ اس طرح دور کیا جاسکتا ہے کہ بنک کے حصے چھوٹے حصہ داروں اور ہندوستانی باشندوں کو دیے جائیں۔ سرکاری بنک کے خلاف ایک اور اعتراض یہ کیا گیا کہ اس قسم کا بنک کمزور ادارہ ثابت ہوگا جو ہر معاملے میں

---

[1] دیکھو کش اور ایلکن کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۱۷۔
[2] دیکھو جے، سی، کویاجی کی کتاب موسوم بہ رزرو بنک آف انڈیا صفحہ ۱۸۔

حکومت کی رہنمائی کا محتاج رہے گا۔

لیکن سلیکٹ کمیٹی کی اکثریت نے حصہ داروں کے بنک کی مخالفت حسب ذیل وجوہ سے کی :۔ رزرو بنک جس کے تفویض کرنسی اور اعتبار رہو اس کو اصولاً مجلس قانون ساز کے سامنے جوابدہ ہونا چاہیئے؛ صرف سرکاری بنک ہی ہندوستان کے لوگوں کا اعتماد حاصل کرے گا؛ رزرو بنک کو زیادہ اصل کی ضرورت نہیں ہے اس لئے حصہ داروں کی کثیر جماعت سے اصل فراہم کرنا ضروری نہیں ہے سلیکٹ کمیٹی نے حسب ذیل دلیل پر جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے بہت زور دیا یعنی حصہ داروں کے بنک سے یہ اندیشہ ہے کہ بڑے شہروں کا متمول طبقہ بنک پر حاوی ہو جائے گا۔

مجلس نظما کی ترکیب کے بارے میں منتخبہ کمیٹی کی اکثریت نے یہ تجویز کیا کہ مجلس میں ایک سرکاری عہدہ دار اور ۱۵ گورنر اور گورنروں میں سے اکثر ہندوستانی منتخب کردہ ارکان ہوں جن میں سے تین کا انتخاب مرکزی مجلس قانون ساز کے منتخبہ ارکان کریں اور اسی طرح تین کا انتخاب زراعت کی نمایندگی کے لئے صوبہ دار مجلس قانون ساز کریں۔ گورنر جنرل ۴ اجلاس کونسل جن دو نظما کو مقرر کریں وہ ہندوستانی ہوں، اسی طرح بنک کا گورنر اور نائب گورنر بھی ہندوستانی ہو۔ دو نظما کا انتخاب اسوشیئٹڈ چیمبرس آف کامرس کی طرف سے اور دو کا انتخاب فیڈریشن آف انڈین چیمبرس آف کامرس کی طرف اور ایک ناظم کا انتخاب صوبہ واری امداد باہمی کے بنکوں کی طرف سے کیا جائے۔ سرکاری عہدہ دار کا تقرر گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کریں اور اس کو رائے دینے کا ۴۸۶
حق نہ ہو۔

۴۶۔ رزرو بنک کے پہلے اور دوسرے مسودۂ قانون کا حشر

مسودۂ قانون، سلیکٹ کمیٹی کی ترمیم کے بعد اگست ۱۹۲۷ء میں مجلس قانون ساز کے شملے کے اجلاس میں پیش ہوا مسودۂ قانون میں سرکاری بنک کی تجویز تھی، لیکن مجلس نظما کے بارے میں کوئی تصفیہ نہ ہو سکا حکومت کی یہ تحریک کہ مجلس قانون ساز کا کوئی رکن بنک کا ناظم نہ بن سکے مسترد ہوگئی اور مجلس قانون ساز کے ارکان حکومت کی اس تحریک کے سخت مخالف تھے کہ سلیکٹ کمیٹی کی اس سفارش کو حذف کر دیا جائے کہ بنک کے گورنر اور نائب گورنر ہندوستانی ہوں۔ سر بیسل بلاکٹ نے اصولاً سرکاری بنک

کی اسکیم کو قبول کر لیا اور یس آئینگار کی یہ ترمیم بھی مان لی کہ جو نظما مجالس قانون ساز کے بجائے بنک کے حصہ داروں کے منتخب کردہ ہوں اور بنک کی مجلس نظما میں ہندوستانی ارکان کی اکثریت ہو۔ کامل اتفاق رائے نہ ہونے کی وجہ سے مسٹر بیسل نے نئی تجویز پیش کی جس کے متعلق بظاہر یہ امید تھی کہ وہ آسانی سے اسمبلی میں منظور ہو جائے گی۔ لیکن رکن مالیہ نے ستمبر میں اچانک یہ اعلان کیا کہ موجودہ اجلاس میں حکومت اس مسودۂ قانون کو اس وجہ سے ملتوی کر دینا چاہتی ہے کہ نظما کے مسئلے کا کوئی تصفیہ نہ ہو سکا۔ اس اعلان پر بہت نکتہ چینی کی گئی اور یہ کہا گیا کہ وزیر ہند جو بظاہر اصل تجویز میں کسی ترمیم کا سراسر مخالف تھا اس کے مشورے پر حکومت ہند چل رہی تھی۔

وزیر ہند سے مشورہ کرنے کے بعد حکومت ہند نے اصل مسودۂ قانون ملتوی کر دیا اور ایک نیا مسودۂ قانون (رزرو بنک کا دوسرا مسودۂ قانون) اسمبلی میں پیش کرنے سے پہلے جنوری ۱۹۲۸ء میں شایع کیا۔ نئے مسودۂ قانون میں سرکاری بنک کا خیال ترک کر دیا گیا تھا اور اس کی بجائے حصہ داروں کا بنک تجویز کیا گیا۔ اس مسودے میں یہ لحاظ رکھا گیا تھا کہ بنک کے سرمایے میں کافی لوگ حصہ لیں اور اس غرض کے لئے سو سو روپے کے حصے کرنا تجویز ہوا۔ اس مسودۂ قانون میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ کوئی ایک شخص ایک خاص رقم سے زیادہ کے حصے نہ خریدے۔ بمبئی کے لئے حصوں کی ایک تعداد معین کر دی گئی۔ کلکتہ، مدراس، رنگون اور دہلی میں بنک کی شاخیں کھولنے کی تجویز کی گئی۔ حصہ دار ہونے کے لئے بعض شرائط رکھی گئیں تاکہ بنک کے سرمایے میں زیادہ تر وہی لوگ حصہ لے سکیں جو ہندوستان میں سکونت پذیر ہوں یا ایسی کمپنیاں حصہ لے سکیں جو ہندوستان کی ہوں یا پارلیمنٹ کے قوانین کے تحت رجسٹری شدہ ہوں۔ مسودۂ قانون میں یہ بھی تجویز تھی کہ ایسے بنک مندرج فہرست ہوں جو اپنے ذخیروں کا ایک حصہ مجوزہ رزرو بنک کے پاس رکھیں۔ مجالس قانون ساز کے ارکان کو نظما بننے کی ممانعت کی گئی۔

جدید مسودۂ قانون کا کوئی اچھا حشر نہیں ہوا اور اسمبلی کے دہلی کے اجلاس (۱۹۲۸ء) میں ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی جبکہ صدر مجلس نے رکن مالیہ کو نیا مسودۂ قانون
۴۸۷ پیش کرنے سے اس بنا پر روک دیا کہ مجلس کے ضابطے کے مطابق نیا مسودۂ قانون

اس وقت تک پیش نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ پہلا مسودہ واپس نہ لے لیا جائے یا اس کی میعاد ختم نہ ہو جائے۔ اس پر حکومت نے پہلے مسودۂ قانون پر کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا جس کو اس نے ستمبر ۱۹۲۷ء میں اچانک ملتوی کر دیا تھا۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی پچھلے قضیے پھر پیدا ہو گئے اور بنک کی مجلس نظما کے دستور کے بارے میں حکومت کی اس شدت سے مخالفت ہوئی کہ وہ اپنی تجویز کو آگے نہ بڑھا سکی۔ اس لئے حکومت نے ۱۰ فروری ۱۹۲۸ء کو یہ اعلان کیا کہ وہ مسودۂ قانون کے متعلق کوئی مزید کارروائی کرنا نہیں چاہتی اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ مجلس قانون ساز کے ارکان نے سخت مخالفت کی تھی اور اس وجہ سے حکومت اور مجلس کے ارکان کے درمیان کسی مناسب تصفیے کی توقع نہ تھی۔

۴۷۔ رزرو بنک کے متعلق قانون سازی کے سلسلے میں وہ مسائل جو بعد میں پیدا ہوئے

کچھ عرصے تک ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ شاید یہ تجویز کوئی کارروائی نہ ہونے سے بالکل ختم ہو جائے۔ لیکن ایسی صورت حال پیدا نہ ہونے دینے کا باعث یہ واقعہ تھا کہ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ شائع شدہ ۱۹۳۱ء میں اس بات پر بہت زور دیا تھا کہ رزرو بنک کا قیام فوراً عمل میں لایا جائے۔ اس کے علاوہ اس مسئلے نے از سر نو اہمیت پہلی گول میز کانفرنس کی وفاقی دستور کی ذیلی کمیٹی کی اس سفارش کی بنا پر بھی حاصل کر لی تھی کہ سیاسی اثرات سے بچا کر مستحکم بنیادوں پر جلد ایک رزرو بنک قائم کیا جائے تاکہ ہندوستانی کرنسی اور اعتبار کا اطمینان بخش طور پر انتظام ہو سکے۔ ۱۹۳۳ء کے آغاز میں جبکہ ہندوستانی اصلاحات کے سلسلے میں وھائٹ پیپر شائع کیا گیا تو اس میں یہ شرط تھی کہ مالی معاملات کے متعلق مرکزی حکومت کو خود مختاری تفویض کرنے سے پہلے ایک ایسا مرکزی بنک قائم کرنا ضروری ہے جو سیاسی اثرات سے پاک ہو۔ اس مسئلے پر لندن کی کمیٹی نے بھی جو جولائی ۱۹۳۳ء میں رزرو بنک کے متعلق قانون سازی کے سلسلے میں مقرر کی گئی تھی غور کیا۔ اس اثنا میں تیسری گول میز کانفرنس کی مالی تحفظات کی کمیٹی نے اپنی رپورٹ شائع شدہ دسمبر ۱۹۳۲ء میں یہ شرطیں مقرر کی تھیں۔ حکومت کے موازنے کا استحکام لندن اور ہندوستان میں قلیل مدت کے قرضوں کی مقدار میں کمی کافی؛ قائم

کی فراہمی اور ہندوستان کے موافق برآمدی تجارت کے توازن کی بحالی۔ یہ شرطیں بڑی حد تک پوری ہو چکی تھیں بجز آخری شرط کے جو صرف جزوی طور پر پوری ہوئی تھی۔ اگست ۱۹۳۳ء میں لندن کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کی اور رزرو بنک آف انڈیا کے مسودۂ قانون کو (جو تیسرا مسودۂ قانون تھا) جو کمیٹی کی سفارشوں کے مطابق مرتب کیا گیا تھا سر جارج شوسٹر نے اسمبلی میں پیش کیا۔ یہ مسودۂ قانون ۸/ ستمبر ۱۹۳۳ء کو کونسل آف اسٹیٹ میں پیش ہوا۔ مسودۂ قانون دونوں ایوانوں کی مشترکہ سلیکٹ کمیٹی کی ترمیم کے بعد ۱۵/ نومبر کو اسمبلی میں پیش ہوا، اور ۲۲/ دسمبر ۱۹۳۳ء کو اسے اسمبلی نے منظور کیا۔ فروری ۱۹۳۴ء میں
اس کو کونسل آف اسٹیٹ نے بھی منظور کر لیا اور اس طرح درمیان میں جو دقتیں پیدا ہوگئی ۴۸۸
تھیں ان کو کامیابی کے ساتھ دور کر کے ۶/ مارچ کو گورنر جنرل کی منظوری کے بعد اس نے قانون کی شکل اختیار کر لی[1]۔

۴۸۔ رزرو بنک آف انڈیا ایکٹ (۱۹۳۴ء)

یہ امر مسلمہ ہے کہ اس وقت تک بنک کاری کے سلسلے میں جو قوانین وضع ہوئے ہیں ان میں رزرو بنک کا قانون سب سے جامع اور اہم ہے۔ اس قانون کی تمہید میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے لئے رزرو بنک کا قیام نہ صرف اس لئے ضروری اور مناسب ہے کہ بنک کے نوٹوں کے اجرا اور ذخائر کے رکھنے کا انتظام کیا جائے تاکہ برطانوی ہند کی زر کی حالت کو مستحکم ہو سکے بلکہ عام طور پر اس لئے بھی کہ ملک کے فائدے کی خاطر اس کے کرنسی اور زر کے نظام کو قابل اطمینان طریق پر چلایا جائے۔ اس موقع پر رزرو بنک آف انڈیا کے قانون کی اہم دفعات پر جو بنک کے دستور اور فرائض سے متعلق ہیں ایک نظر ڈالنا مناسب ہوگا[2]۔

۴۹ رزرو بنک کا دستور

(۱) یہ بنک حصہ داروں کا بنک ہے۔ اس کے حقیقی اصل کی مقدار ۵ کروڑ روپے ہے جو سو سو فی حصے کے حساب سے کامل ادا شدہ

[1] رزرو بنک کے متعلق قانون سازی کی دلچسپ بحث کے لئے دیکھو جی فنڈلے شراس کا ایک مضمون اکنامک جرنل (جون ۱۹۳۴ء) میں۔

[2] رزرو بنک آف انڈیا کے قانون کی مختلف دفعات پر بہت ہی دلچسپ اور سبق آموز تبصرے کے لئے دیکھو اے رامیا کی کتاب موسومہ بہ ”رزرو بنک آف انڈیا کا قانون“۔

حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بمبئی، کلکتہ، دہلی، مدراس اور رنگون میں حصہ داروں کے علحدہ رجسٹر رکھنے کا تصفیہ ہوا ہے۔ مختلف رجسٹروں کے لئے جو حصے دے گئے ان کی قیمت متعارفہ حسب ذیل تھی:۔ بمبئی ایک کروڑ ۴۰ لاکھ روپئے کلکتہ ایک کروڑ ۴۵ لاکھ روپئے، دہلی ایک کروڑ ۱۵ لاکھ روپئے، مدراس ۷۰ لاکھ روپئے[۲] اور رنگون ۳۰ لاکھ روپئے حصوں کی اس تقسیم میں کافی تبدیلی واقع ہوگئی ہے اور رجحان یہ ہے کہ صرف چند لوگ جملہ حصوں کے مالک ہوتے جارہے ہیں (خاصکر بمبئی کے حلقے میں یہ صورت زیادہ نمایاں ہے) چنانچہ یہ بات اس واقعے سے ثابت ہوتی ہے کہ حصہ داروں کی مجموعی تعداد جو یکم اپریل ۱۹۳۵ء ۹۲۰۴۷ تھی گھٹ کر یکم دسمبر ۱۹۳۷ء کو ۶۲۵۰۷ ہوگئی۔ اس مدت میں ہر حصہ دار کے حصوں کی اوسط تعداد ۵۴ سے بڑھ کر ۸۰ ہوگئی آجکل رزرو بنک کے قانون کی ایک ترمیم زیر غور ہے جس کی رو سے کوئی شخص اپنے نام سے زیادہ سے زیادہ ۲۰۰ حصے رجسٹری کرانے کا مجاز ہوگا[۱]۔

رزرو بنک کا حصہ دار ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایسا شخص ہندوستان میں سکونت پذیر ہو یا ملک معظم یا کسی ہندوستانی ریاست کی رعایا میں سے ہو یا ایسا برطانوی باشندہ ہو جو زیادہ تر ہندوستان میں مقیم ہو یا ایسی کمپنیاں یا امداد باہمی کی انجمنیں ہوں جو ہندوستان میں رجسٹری شدہ ہوں یا درج فہرست بنک ہوں۔ ہر پانچ حصوں کے لئے کسی حصہ دار کو صرف ایک ووٹ دینے کا حق حاصل ہوگا۔ لیکن کوئی ایک شخص کسی صورت
۴۸۹ میں دس سے زیادہ ووٹ نہیں دے سکتا[۲] یہ تجویز تھی کہ ۲ لاکھ ۲۰ ہزار روپے کے حصے حکومت لے۔ یہ حصے نظما کے ہاتھ فروخت کئے جائیں تاکہ ناظم بننے کے لئے کم سے کم حصے خریدنے کی جو شرط ہے وہ پوری ہوسکے۔

(۲) دفتر، شاخیں اور ایجنسیاں۔ بنک نے اپنی ان ذمہ داریوں کے مدنظر جو قانون نے اس پر عائد کی ہیں اپنے دفتر بمبئی، کلکتہ، دہلی، مدراس اور رنگون میں قائم

---

[۱]۔ دیکھو رزرو بنک کی سالانہ رپورٹ (۱۹۳۷ء) صفحہ ۳ تا ۴۔

[۲]۔ حصوں کی تقسیم کے بارے میں جو طریقہ اختیار کیا گیا تھا اس کی تفصیل فصل (۶۱) میں بیان کی گئی ہے۔

کئے ہیں اور ایک شاخ لندن میں کھولی ہے۔ بنک مجاز ہے کہ اپنی شاخیں یا ایجنسیاں ہندوستان میں کسی دوسرے مقام پر یا گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی اجازت سے ہندوستان کے باہر قائم کرے۔

(۳) انتظام بنک کا عام انتظام اور نگرانی مرکزی مجلس نظما کے تفویض ہے جو حسب ذیل ۱۶ ارکان پر مشتمل ہے:۔ (۱) ایک گورنر اور دو نائب گورنر جن کا تقرر گورنر جنرل باجلاس کونسل مرکزی مجلس کی سفارشوں پر غور کرنے کے بعد کرسکتا ہے (ب) ۴ نظما جن کو گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نامزد کرے گا۔ (ج) ۸ نظما جن میں دو دو بمبئی کلکتہ اور دہلی کے حلقوں سے اور ایک ایک مدراس اور رنگون کے حلقوں سے ہوں گے حصہ داروں کی طرف سے منتخب کئے جائیں گے۔ (د) ایک سرکاری عہدہ دار کو گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نامزد کریں گے اس عہدہ دار کو نیز نائب گورنر کو رائے دینے کا حق نہ ہوگا۔ گورنر جنرل کے ذریعے سے ۴ نظما نامزد کرانے کا مقصد یہ ہے کہ ملک کی معاشی زندگی کے چند اہم عناصر مثلاً زراعت کی نمایندگی اگر ناکافی ہو تو اس کو پورا کیا جاسکے۔ مذکورۂ بالا پانچ حلقوں میں سے ہر ایک کے لئے ایک مقامی مجلس ہوگی جس کے ارکان حسب ذیل ہوں گے:۔ (۱) پانچ رکن جن کا انتخاب حصہ دار کریں گے۔ (ب) علاقہ وار یا معاشی اغراض کی نمایندگی کے لئے جن کا کوئی نمایندہ موجود نہ ہو خاصکر زراعت کی نمایندگی کے لئے مرکزی مجلس نظما زیادہ سے زیادہ تین ارکان کو نامزد کرے گی۔ مقامی مجلس کے ان ارکان میں سے جو بذریعۂ انتخاب مقرر ہوئے ہوں حسب ضرورت ایک یا دو نظما منتخب کئے جائیں گے تاکہ وہ اس حلقے کے رجسٹر کے حصہ داروں کی نمایندگی کریں جس کے لئے مقامی مجلس بنائی گئی ہے مقامی مجلس مرکزی مجلس نظما کو ایسے عام یا خاص معاملات میں مشورہ دے گی جو اس کے پاس بھیجے جائیں گے اور ان فرائض کو انجام دے گی جو مرکزی مجلس نظما اس کو از روئے قانون تفویض کرے۔ اس طرح بنک کی مقامی مجلسیں زیادہ تر مشاورتی نوعیت رکھتی ہیں۔ کوئی ناظم یا مقامی مجلس کا کوئی رکن مرکزی مجلس قانون ساز یا مقامی مجلس قانون ساز کا رکن نہیں بن سکتا۔ یاد ہوگا کہ زر و بنک کا پہلا مسودۂ قانون اسی مسئلے پر اختلاف پیدا ہو جانے کی وجہ سے ناکام رہا تھا۔ کوئی تنخواہ یاب سرکاری عہدہ دار یا کسی

دوسرے بنک کا ملازم یا ناظم بجز امداد باہمی کے بنک کے ملازم یا ناظم کے مقامی مجلس کا رکن یا ناظم نہیں بن سکتا۔

۵۰۔ وہ کام جن کا بنک کو اختیار ہے

۱۹۰ (۱) زر رو بنک مرکزی حکومت، مقامی حکومتوں، بنکوں اور دوسرے لوگوں کی بلا سودی امانتیں رکھ سکتا ہے۔ اس دفعہ کا مقصد یہ ہے کہ زر رو بنک کو دوسرے بنکوں سے مسابقت کرنے سے باز رکھا جائے۔ اس کے علاوہ یہ دفعہ دوسرے ملکوں میں مرکزی بنک کاری کا جو طریقہ ہے اس کے مطابق ہے۔ (۲) ایسی ہنڈیوں اور پرامیسری نوٹوں کی خرید و فروخت اور ان پر بٹہ کاٹنا جو حقیقی تجارتی کاروبار کے سلسلے میں وجود میں آئے اور جن پر دو یا دو سے زائد معتبر دستخط ہوں جن میں سے ایک دستخط کسی درج فہرست بنک کے ہونے چاہئیں اور ہنڈیاں اور پرامیسری نوٹ خریدی یا بٹہ کٹائی کی تاریخ سے رعایتی دنوں کی منہائی کے بعد ۹۰ یوم کے اندر پختہ ہونے والی ہوں۔ زراعتی ہنڈیوں کے بارے میں جو موسمی زرعی کاروبار یا زرعی پیداوار کی فروخت کے رقمی انتظام کے سلسلے میں لکھی یا جاری کی گئی ہوں مدت نو ماہ رکھی گئی ہے اور دو دستخطوں میں سے ایک کا کسی درج فہرست بنک یا صوبہ واری امداد باہمی کے بنک کا ہونا ضروری ہے۔ ایسی ہنڈیوں کی بھی خرید و فروخت کی جا سکتی یا ان پر بٹہ کاٹا جا سکتا ہے جو خریدی کی تاریخ سے ۹۰ یوم کے اندر پختہ ہونے والی ہوں اور جن پر کسی درج فہرست بنک کے دستخط ہوں بہ شرطیکہ یہ ہنڈیاں سرکاری تمسکات کی خرید و فروخت یا ان کو حاصل کرنے کے لئے لکھی جائیں۔ (۳) درج فہرست بنکوں سے اسٹرلنگ کی خرید و فروخت کم سے کم ایک لاکھ روپے کے مساوی رقم کی حد تک کی جا سکتی ہے۔ (۴) ایسی ہنڈیوں کی خرید و فروخت اور ان پر بٹہ کاٹا جا سکتا ہے جو سلطنت متحدہ کے کسی شہر سے یا سلطنت متحدہ کسی شہر کے نام لکھی جائیں بہ شرطیکہ ایسا کاروبار درج فہرست بنکوں سے کیا جائے۔ زر رو بنک اپنی رقوم سلطنت متحدہ کے کسی بنک کے پاس رکھ سکتا ہے۔ (۵) زر رو بنک مستند تمسکات کی کفالت پر یا سونے چاندی یا دوسرے معتبر دستاویزات پر اور ایسے پرامیسری نوٹوں پر جو کسی درج فہرست بنک یا امداد باہمی کے بنک کے لکھے ہوئے ہوں بہ شرطیکہ ان کے ساتھ

سامان کے دستاویزات ملکیت منسلک ہوں ہندوستان کی دیسی ریاستوں مقامی حکومتوں درج فہرست بنکوں یا صوبہ وار امداد باہمی کے بنکوں کو قرضے دے سکتا ہے ایسے قرضے عندالمطالبہ یا مقررہ مدت کے اختتام پر جو ۹۰ یوم سے زائد نہ ہوگی قابل ادائی ہوں گے۔ (۶) رزرو بنک گورنر جنرل با اجلاس کونسل یا مقامی حکومتوں کو چالو اخراجات کے لئے قرضے دے سکتا ہے جو ۹۰ یوم کے اندر قابل ادائی ہوں گے۔ (۷) رزرو بنک حکومت ہند اور سلطنت متحدہ کے تمسکات کی خرید و فروخت ایک مقررہ مقدار کی حد تک کر سکتا ہے۔ (۸) رزرو بنک سونے یا چاندی کی خرید و فروخت اور قرضوں کے انتظام وغیرہ کی حد تک وزیر ہند یا گورنر جنرل با اجلاس کونسل یا مقامی اور صوبہ واری حکومتوں کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کر سکتا ہے۔ (۹) وہ دوسرے ملکوں کے مرکزی بنکوں سے ایجنسی کے متعلق شرائط طے کر سکتا ہے۔ (۱۰) بنک مجاز ہے کہ درج فہرست بنکوں اور دوسرے مرکزی بنکوں سے قرضہ حاصل کرے بہ شرطیکہ اس کی میعاد ایک ماہ سے زائد نہ ہو۔ (۱۱) بنک کو نوٹ جاری کرنے کا اختیار ان شرائط کے تحت ہے جن کا ذکر آگے چلکر کیا گیا ہے۔ (۱۲) وہ عام طور پر ہر قسم کا ایسا کاروبار کر سکتا ہے جو اس کے فرائض اور اختیارات سے متعلق ہو۔ (۱۳) یہ واضح ہونا چاہئیے کہ بنک ایسی ہنڈیوں کی خرید و فروخت کر سکتا اور ان پر بٹہ کاٹ سکتا ہے جو ہندوستان کے نام لکھی گئی ہوں اور جن کی رقم ہندوستان میں قابل ادائی ہو تاکہ یہ بنک روپے کی برآمدی ہنڈیوں پر آیندہ جبکہ اس قسم کی ہنڈیاں چالو ہوں بٹہ کاٹ سکے۔ اس بارے میں بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی نے بھی مشورہ دیا ہے۔ (۱۴) بنک کھلے بازار کے کاروبار کرنے کا بھی مجاز ہے اور یہ کام آجکل دوسرے ملکوں کے مرکزی بنکوں ۴۹۱
کے اہم کاموں میں شمار ہوتا ہے۔ اس لئے جب کبھی بنک کی مرکزی مجلس کے خیال میں ہندوستانی تجارت، صنعت و زراعت کے لئے اعتبار کی تنظیم ضروری ہو تو اس صورت میں بنک مستند دستاویزات (ہنڈیوں اور پرامیسری نوٹوں) کی کھلے بازار میں خرید و فروخت کر سکتا یا ان پر بٹہ کاٹ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ درج فہرست بنک یا امداد باہمی کے بنک کے دستخط کے بغیر قرضے دے سکتا ہے یا اسٹرلنگ کی

خرید و فروخت کر سکتا ہے۔ بنک کی مجلس کی کمیٹی یا گورنزان میں سے جس کسی کو بھی یہ اختیار دیا جائے اپنے اختیار کو صرف خاص خاص صورتوں میں استعمال کر سکتے ہیں (خاص صورتوں سے یہ مراد نہیں ہے کہ شدید ضرورت ہی پیدا ہوئی ہو)۔ اس کے علاوہ اس اختیار کو استعمال کرنے کے لئے بنک کی مرکزی مجلس سے قبل از قبل مشورہ کر لینا ضروری ہے بجز اس صورت کے جبکہ کوئی اچانک ضرورت پیدا ہو۔ اس قسم کی کارروائی سے مرکزی مجلس کو مطلع کرنا ضروری ہے۔

۵۱۔ وہ کام جن کے کرنے کی بنک کو ممانعت ہے

بنک کے لئے حسب ذیل کام ممنوع قرار دیے گئے ہیں:۔ (۱) خود تجارت کرنا یا کسی دوسرے تجارتی اور صنعتی کاروبار میں حصہ لینا بجز اس صورت کے جبکہ اپنے مطالبات کی وصولیابی کے سلسلے میں یہ چیز ضروری ہو جائے۔ (۲) خود اپنے ہی حصے خریدنا یا کسی دوسرے بنک یا کمپنی کے حصے خریدنا یا ایسے حصوں کی کفالت پر قرض دینا۔ (۳) غیر منقولہ جائداد کی کفالت پر قرض دینا یا ایسی جائداد خریدنا بجز اس صورت کے جبکہ بنک کی عمارت کے لئے ایسی جائداد کی ضرورت ہو۔ (۴) امانتوں پر سود ادا کرنا۔ (۵) عندالمطالبہ ہنڈیوں کے علاوہ دوسری ہنڈیوں کا جاری یا قبول کرنا۔ دوسرے ملکوں کے مرکزی بنک کاری کے قوانین میں بھی اس قسم کی بندشیں موجود ہیں اور ہندوستان میں ان کی غرض یہ ہے کہ رزرو بنک کا اثاثہ انتہائی سیال حالت میں رہے۔

۵۲۔ رزرو بنک کے کام بحیثیت مرکزی بنک کے

ان کاموں سے رزرو بنک کے قانون کے تیسرے باب میں بحث کی گئی ہے۔ سب سے اول یہ کہ بنک پر حکومت کی جانب سے کاروبار کرنے کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے یعنی سرکاری رقوم وصول کرنا اور حکومت کی جانب سے رقمیں ادا کرنا، حکومت کے مبادلے کے کاروبار کرنا رقمیں ارسال کرنا اور بنک کاری کے دوسرے کام کرنا جن میں سرکاری قرضے کے انتظامات بھی شامل ہیں۔ یہ خدمات مفت انجام نہیں دی جائیں گی بلکہ ان معاہدوں کی بنا پر انجام دی جائیں گی جو حکومت اور رزرو بنک کے درمیان طے پائیں۔ بنک کو یہ حق ہے کہ ہندوستان میں مرکزی اور صوبہ واری حکومتوں کی طرف سے کاروبار کرے

اور یہ اختیار حاصل ہے کہ ان کی نقد رقوم بغیر سود کے امانت رکھے بجز اس صورت کے جبکہ بنک کی کوئی شاخ یا ایجنسی موجود نہ ہو۔ اگر نئے قرضے لئے جائیں تو ان قرضوں کا اجرا بھی رزرو بنک کے توسط سے ہوگا۔

۵۳۔ بنک کے نوٹوں کا اجرا

دوسرا کام یہ ہے کہ اس بنک کو برطانوی ہند میں بنک کے نوٹ جاری کرنے کا اجارہ بھی حاصل ہے اور کچھ مدت کے لئے حکومت ہند کے جاری کردہ کرنسی نوٹوں کا انتظام بھی جو گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل اس کے تفویض کرے گا اس کے ذمے رہے گا۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل قانون کے تیسرے باب کے نفاذ کے بعد کوئی نوٹ اپنے طور پر نہیں جاری کرے گا۔ بنک آف انگلینڈ کی طرح رزرو بنک آف انڈیا میں بھی شعبۂ اجرا کو شعبۂ بنک کاری سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ البتہ ہندوستانی قانون نے اعتباری اجرا کی معینہ مقدار کے انگریزی طریق کے بجائے ذخائر کے سلسلے میں تناسب طریق تجویز کیا ہے۔ شعبۂ اجرا کے اثاثے اور واجبات کو شعبۂ بنک کاری کے اصلات اور واجبات سے الگ رکھا گیا ہے۔ اس انتظام میں جہاں یہ خوبی ہے کہ وہ حسابات کو سہل ترین شکل میں واضح کر دیتا ہے اور نوٹوں کے اجرا کے بارے میں عوام کا اعتماد حاصل کرتا ہے وہاں یہ خرابی بھی ہے کہ بنک کے ذمے کے واجبات کو ایک جگہ نہیں ظاہر کرتا۔ نوٹ، پانچ، دس، پچاس، سو ہزار اور دس ہزار روپے کے جاری کئے جاسکتے ہیں تاوقتیکہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل مرکزی مجلس کی سفارش پر اس کے خلاف حکم نہ دے۔ (اس طرح ایک ایک روپے کے نوٹ بھی بعد میں جاری کئے جاسکتے ہیں۔) بنک کے نوٹ زر قانونی ہیں اور گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی ضمانت پر جاری کئے جاتے ہیں تاکہ جیسا کہ ہلٹن ینگ کمیشن نے سفارش کی ہے نوٹوں کے اجرا کے بارے میں عوام کے اعتماد کو بڑھایا جائے۔ رزرو بنک آف انڈیا کے نوٹوں کا چلن پہلی دفعہ جنوری ۱۹۳۸ء میں شروع ہوا جبکہ پانچ روپے کے نوٹ جاری کئے گئے فروری ۱۹۳۸ء میں دس روپے کے نوٹ اور ہی ۱۹۳۸ء میں سو روپیہ اور ہزار روپے کے نوٹ جاری کئے گئے۔ اس کے علاوہ بنک نے یہ تصفیہ کیا ہے کہ پچاس روپے اور پانچ سو روپے

۴۹۲

کے نوٹ جاری نہ کئے جائیں گے (جس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ آجکل ان کا چلن بہت کم ہے)۔ البتہ حکومت ہند کے جاری کئے ہوئے اس قسم کے نوٹ بدستور زر قانونی رہیں گے۔ گو یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے برما ہندوستان سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ برما کے کرنسی کے انتظام کی ذمہ داری بدستور رزرو بنک ہی پر ہے۔ حکومت برما کے جاری کردہ کرنسی نوٹ آجکل صرف برما میں زر قانونی ہیں۔ یہی حال رزرو بنک کے خاص نوٹوں کا ہے جن کو صرف برما میں چلانے کے لئے جاری کیا گیا ہے۔

شعبۂ اجرا کے اثاثے کا ۲/۵ حصہ سونے سونے کے سکوں یا اسٹرلنگ کے تمسکات کی شکل میں رہنا ضروری ہے بہ شرطیکہ سونے کی مقدار ۴۰ کروڑ روپے کی مالیت سے کم نہ ہو۔ سونے اور سونے کے سکوں کے کم از کم ۱۷/۲۰ حصے کو برطانوی ہند میں رکھنا ضروری ہے۔ باقی ۳/۵ حصے کا نقد روپیہ، حکومت ہند کے روپے کے تمسکات خواہ وہ کسی میعاد کی ہوں اور ایسی ہنڈیوں اور پرامیسری نوٹوں کی شکل میں ہونا ضروری ہے جنھیں رزرو بنک خرید سکے بہ شرطیکہ روپے کے تمسکات مجموعی اثاثے کے ایک چوتھائی یا ۵۰ کروڑ روپے (ان دونوں میں سے جو رقم بھی زیادہ ہو) سے زائد نہ ہوں البتہ گورنر جنرل کی قبل از قبل منظوری کے بعد اس رقم میں مزید دس کروڑ روپے کا اضافہ کیا جا سکے گا۔ سونے کی مالیت معیاری شرح یعنی فی روپیہ ۸٫۴۷۵۱۲ گرین سونے کے حساب سے، روپے کی مالیت اس کی قدر علامتی کے لحاظ سے اور تمسکات کی قیمت بازاری نرخ کے لحاظ سے معین کی جائے گی۔ اسٹرلنگ کے تمسکات کی تعریف میں حسب ذیل چیزیں داخل ہیں:- ایسی رقوم جو بنک آف انگلینڈ کے شعبۂ اجرا سے وصول طلب ہوں، ایسی ہنڈیاں جو انگلستان کے نام لکھی گئی ہوں اور وہ ہیں ۹۰ یوم کے اندر قابل ادائی ہوں اور سلطنت متحدہ کے ایسے سرکاری تمسکات جو پنجسالہ مدت ۴۹۳
کے ہوں (ان تمسکات کی اس مدت میں رزرو بنک کے قانون کے نفاذ کے بعد مزید دو سال کا اضافہ ہو سکے گا)۔ اس قانون میں یہ بھی طے کر دیا گیا کہ جس تاریخ کو حکومت ہند رزرو بنک کو نوٹ جاری کرنے کا حق عطا کرے اور ذخیرۂ معیار طلا اور ذخیرۂ زر کاغذی زرو بنک کو منتقل کرے اس وقت سونے کے سکے، سونے اور سونے کے تمسکات کی مقدار کل منتقل شدہ رقم کے نصف سے کم نہ ہو اور روپوں کی تعداد ۵۰ کروڑ سے

زائد نہ ہو۔ اگر حکومت کے پاس اس سے زائد روپے ہوں تو وہ اس کو اپنے پاس علحدہ ذخیرے میں رکھے۔ یہ بھی بندوبست کیا گیا ہے کہ بنک اور حکومت کے باہمی تعاون سے اثاثے میں ۵۰ کروڑ روپے یا مجموعی اثاثے کی مالیت کے ½ حصے کے مساوی روپے (ان دونوں میں سے جو بھی رقم زیادہ ہو) رکھے جائیں۔

یکم اپریل ۱۹۳۵ء کو جبکہ رزرو بنک قایم ہوا جاری شدہ نوٹوں کی مجموعی مالیت ایک ارب ۸۶ کروڑ ۹ لاکھ روپے تھی جو بڑھ کر ۲/ستمبر ۱۹۳۶ء کو ۲ ارب ۵ کروڑ ۲۷ لاکھ روپے ہوگئی[1] اسی زمانے میں بنک کے شعبۂ اجرا میں سونے اور سونے کے سکوں کی مالیت کم و بیش بدستور ۴۴ کروڑ ۴۲ لاکھ روپے قایم رہی اسٹرلنگ کے تمسکات کی مقدار ۴۸ کروڑ ۶۳ لاکھ روپے سے بڑھ کر ۶۹ کروڑ ۴۹ لاکھ روپے ہوگئی، اور یہ کہ تمسکات کی مقدار ۴۳ کروڑ ۵ لاکھ روپے سے گھٹ کر ۳۲ کروڑ ۳۸ لاکھ روپے ہوگئی' اور جاری کردہ نوٹوں کی مجموعی مقدار کے مقابلے میں سونے اور اسٹرلنگ کا تناسب ۵۰٫۰۲ فیصد سے بڑھ کر ۵۲٫۹۱ فیصد ہوگیا[2]

ریاستہائے متحدہ امریکہ کے فیڈرل رزرو بنک اور دنیا کے دوسرے بنکوں کی طرح جو تناسب ذخیرے کے طریق پر عمل پیرا ہیں، گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی اجازت سے جو پہلی مرتبہ ایک مہینے کے لئے ہوگی اور جس میں وقتاً فوقتاً پندرہ یوم کا اضافہ ہو سکے رزرو بنک بھی اپنے اثاثے میں سونا، سونے کے سکے یا اسٹرلنگ اپنے کل اثاثے کے ۲/۵ بھی کم رکھ سکے گا۔ جس مدت کے لئے اثاثے کی معینہ ترکیب میں کمی واقع ہوگی اس مدت کے لئے کمی کی حد تک بنک ایک خاص محصول ادا کرے گا۔ جس وقت سونے، سونے کے سکے اور اسٹرلنگ کی مقدار کل اثاثے کے ۳۲½ فیصد سے متجاوز رہے گی اس محصول کی شرح رزرو بنک کی شرح سود سے ۱ فیصد سالانہ

---

[1] نوٹوں کے چلن کے بڑھ جانے کے اسباب کی تفصیل ہم پہلے ہی باب (۷) اور باب (۸) میں بیان کر چکے ہیں۔

[2] دیکھو رپورٹ کرنسی اور مالیہ کے بارے میں ۱۹۳۵ء-۳۶ء اور ۱۹۳۶ء-۳۷ء کے لئے گوشوارہ (۱۹) اور ماہوار اعدادی خلاصے جو رزرو بنک نے جاری کیے۔

کے حساب سے محصول ادا کرنا پڑے گا۔ محصول کی یہ شرح کسی حال ۶ فیصد سالانہ سے کم نہ ہوگی۔ بنک کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ ہر قسم کی کرنسی مہیا کرے اس طرح بنک پر لازم ہے کہ بنک کے نوٹوں اور حکومت ہند کے کرنسی نوٹوں کے بدلے میں عندالمطالبہ روپے ادا کرے یا روپے کے بدلے میں جو زر قانونی ہے کرنسی نوٹ
۴۹۴ یا بنک کے نوٹ دے۔ بنک پانچ روپے یا پانچ روپے سے زائد کے نوٹوں کو چھوٹے نوٹوں یا سکوں میں تبدیل کر سکے گا جو زر قانونی ہوں گے اگر اس کو یہ اطمینان ہو کہ یہ مبادلہ روزمرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل اس قسم کے سکے بنک کو عندالمطالبہ مہیا کرے گا جس طرح حکومت ہند کے جاری کردہ نوٹ غیر محدود نقد پذیری رکھتے تھے بالکل اسی طرح ہندوستان کے خاص حالات کے مدنظر بنک کے جاری کردہ نوٹ بھی غیر محدود طریقے پر بدل پذیر رکھے گئے ہیں۔

۵۴۔ مبادلے کے سلسلے میں زرِ رو بنک کے فرائض

مرکزی بنک کی حیثیت سے زرِ رو بنک کا تیسرا کام یہ ہے کہ وہ اسٹرلنگ کی خرید و فروخت کرے اور کم از کم عارضی طور پر اس وقت تک کے لئے جب کہ آیندہ بین الاقوامی صورت حال میں استقرار پیدا ہونے پر ہندوستان کے لئے کسی موزوں ترین معیار زر کے سلسلے میں مستقل عملی تدابیر اختیار کی جائیں زرِ رو بنک اسٹرلنگ کی خرید و فروخت کے ذریعے سے روپے کی شرح مبادلہ بحساب ۱ شلنگ ۶ پنس میں اسٹرلنگ کے ساتھ استحکام پیدا کرے۔ ہم ان ذمہ داریوں کا ذکر کر چکے ہیں جو اس بنک پر شرح مبادلہ کے سلسلے میں عائد کی گئی ہیں (دیکھو باب ۸ فصل ۳)۔ اس طرح زرِ رو بنک کے قانون کا سر دست مقصد یہ ہے کہ معیار مبادلۂ اسٹرلنگ قائم کیا جائے۔

۵۵۔ درج فہرست بنک

چوتھے یہ کہ ہر اس بنک پر جو برطانوی ہند میں بنک کاری کا کاروبار کرتا ہو اور جو درج فہرست بنکوں[1] میں شامل ہو (یعنی ایسے بنک

---

[1] آجکل ایسے درج فہرست بنکوں کی تعداد ۵۴ ہے۔ یہ تعداد ۱۹۳۶ء میں ۵۰ سے بڑھ کر ۵۴ ہوگئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کے مرکزی بنک سے تعلق رکھنے کے فوائد کا احساس مشترک سرمایہ

جن کے اداشدہ اصل اور محفوظ سرمایے کی مقدار ۵ لاکھ روپے سے کم نہ ہو) کہ رزرو بنک کے پاس اتنی رقم رکھے جو ہندوستان میں اس کے روزمرہ کے عندالمطالبہ واجبات کے ۵ فیصد اور میعادی واجبات ۲ فیصد سے کم نہ ہو۔ یہ شرط ریاستہائے متحدۂ امریکہ کے فیڈرل رزرو قانون کی دفعہ ۱۹ کی اتباع میں اختیار کی گئی ہے اور اس کا مقصد رزرو بنک آف انڈیا کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ ملک کے دوسرے بنکوں کے ذخائر میں مرکزیت پیدا کرے تاکہ وہ ملک کی اعتباری حالت پر قابو پاسکے اور ملحقہ بنکوں کے جاری کردہ اعتباری زر کی مجموعی مقدار کی روک تھام کرسکے۔ اس سے ضمنی طور پر یہ بھی فائدہ ہے کہ ملحقہ بنکوں کی امانتیں ایک حد تک محفوظ ہوجاتی ہیں اور ان کی واپسی یقینی ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ خود ملحقہ بنکوں کے لئے بھی یہ لازمی ہے کہ وہ اپنے پاس کافی رقم سیال حالت میں رکھیں [1] ہر درج فہرست بنک کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ رزرو بنک اور گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل ان دونوں کے پاس ہفتہ وار فرد حساب روانہ کرے جس میں حسب ذیل تفصیلات بتائی گئی ہوں:۔ ہندوستان میں اس کے عندالمطالبہ اور میعادی واجبات، حکومت ہند اور بنک کے نوٹوں کی مجموعی مقدار،
۴۹۵ روپوں اور دوسرے ذیلی سکوں کی مقدار، ہندوستان میں دیے ہوئے قرضوں اور بٹہ کٹی ہوئی ہنڈیوں کی مقدار اور وہ رقوم جو رزرو بنک کے پاس ہوں۔ ذیل میں درج فہرست بنکوں کی کاروباری حالت کی یکجائی کیفیت درج ہے جو رزرو بنک نے شائع کی۔ یہ کیفیت ۲۲/اپریل ۱۹۳۸ء کی ہے۔

درج فہرست بنک

	روپے
۱۔ عندالمطالبہ واجبات:۔	
(الف) ہندوستان میں	۱۲۳۳۳۱۵۰۰۰

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ:۔ بنکوں کو روز بروز زیادہ ہوتا جارہا ہے چنانچہ ان بنکوں میں سے بعضوں نے اپنے حصص کے اصل کو بظاہر اسی مقصد سے بڑھایا کہ وہ درج فہرست بنکوں میں شریک کرلئے جائیں دیکھو سالانہ رپورٹ رزرو بنک آف انڈیا (۱۹۳۵ء) صفحہ ۱۴۔

[1] دیکھو رامیا کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۱۱۹ تا ۱۲۱۔

(ب) برما میں	۵۷۲۹۱۰۰۰
۲۔ میعادی واجبات :۔	
(ا) ہندوستان میں ۔	۱۰۴۹۴۸۰۰۰۰
(ب) برما میں ۔	۴۷۷۲۹۰۰۰
۳۔ نقد :۔	
(۱) حکومت ہند کے کرنسی نوٹ اور بنک کے نوٹ	
(ا) ہندوستان میں ۔	۵۴۵۹۵۰۰۰
(ب) برما میں ۔	۸۸۰۰۰
(۲) برما کے نوٹ :۔	
(ا) ہندوستان میں ۔	۲۹۰۰۰
(ب) برما میں ۔	۲۲۳۶۰۰۰
(۳) روپے :۔	
(ا) ہندوستان میں	۶۹۶۶۰۰۰
(ب) برما میں ۔	۱۲۵۰۰۰
(۴) ذیلی سکے :۔	
(ا) ہندوستان میں	۳۰۵۱۰۰۰
(ب) برما میں	۱۱۶۰۰۰
۴۔ رزرو بنک کے پاس رکھائی ہوئی رقمیں	۱۴۱۵۸۰۰۰۰
۵ قرضے	
(ا) ہندوستان میں	۱۱۸۸۴۶۲۰۰۰
(ب) برما میں ۔	۵۳۴۷۴۰۰۰

٦۔ ہنڈیاں جن پر بٹہ کاٹا گیا۔	
(ا) ہندوستان میں۔..................	٦٨٠٧٦٠٠٠
(ب) برما میں۔..................	٣٠٢١٠٠٠

کیفیت طلب کرنے کے بارے میں بنک کو یہ اختیار دینے کا مقصد یہ ہے کہ اعتباری نظام پر بنک کی موثر نگرانی قائم کی جائے۔ اس قسم کی کیفیتیں صوبہ واری امدادی کے ان بنکوں سے بھی طلب کی جا سکتی ہیں جو زررو بنک سے کاروبار کرتے ہیں۔ البتہ وہ زررو بنک میں اپنی نقد رقم رکھنے کے پابند نہیں ہوتے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے دیسی ساہوکاروں کو ابھی تک بنک کی فہرست میں شریک نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن زررو بنک کے قانون کے بموجب بنک پر ایک شرط یہ بھی عائد کی گئی ہے کہ وہ جلد سے جلد اور بہر صورت تین سال کے اندر یہ رپورٹ پیش کرے کہ درج فہرست بنکوں کے متعلق دفعات کا اطلاق ان اشخاص اور فرموں پر کس حد تک ہو سکتا ہے جو بنک کاری کے کاروبار میں مصروف ہیں۔

۵٦۔ زررو بنک اور امپیریل بنک

زررو بنک کو گورنر جنرل کی اجازت سے امپیریل بنک سے بھی ۱۵ سال کے لئے معاہدہ کرنا ضروری ہے۔ بہ شرطیکہ امپیریل بنک اپنی مالی حالت کو مستحکم رکھے یہ معاہدہ اس وقت تک برقرار رہے گا جب تک کہ فریقین میں سے کوئی ایک پانچ سال قبل نوٹس ٤٩٦
دیکر اس کو فسخ نہ کرے۔ اس معاہدے کے تحت برطانوی ہند کے ان سب مقامات میں جہاں زررو بنک کے قانون کا نفاذ ہوتے وقت امپیریل بنک آف انڈیا کی شاخ موجود ہو اور جہاں زررو بنک کے شعبۂ بنک کاری کی کوئی شاخ نہ ہو امپیریل بنک زررو بنک کے واحد ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرے گا۔ امپیریل بنک ہر سال حکومت کے حساب میں جو رقمیں وصول کرے گا اور اس کی طرف سے جو رقمیں ادا کرے گا ان کی مجموعی مقدار پر زررو بنک امپیریل بنک کو ابتدائی دس سال تک سالانہ کمیشن ادا کرے گا۔ اس کے بعد کمیشن کی شرح پر نظر ثانی کی جائے گی۔ امپیریل بنک کے اپنی شاخوں کی موجودہ تعداد کو برقرار رکھنے کے معاوضے میں زررو بنک امپیریل بنک کو پہلے پانچ سال تک ۹ لاکھ روپے سالانہ،

دوسرے پانچ سال کے لئے ۲ لاکھ روپے سالانہ اور اس کے بعد کے ۵ سال کے لئے ۵ لاکھ روپے سالانہ ادا کرے گا۔ رزرو بنک کی منظوری کے بغیر امپیریل بنک اپنی کسی ایسی شاخ کے بدلے جو اس معاہدے کے نفاذ کے وقت قائم ہو کوئی دوسری شاخ نہ کھول سکے گا۔

۵۷۔ رزرو فنڈ گورنر جنرل کی طرف سے ۵ کروڑ روپے کے تمسکات بنک کو منتقل کر کے ایک ذخیرۂ محفوظ قائم کرنا طے پایا چنانچہ یہ ذخیرہ قائم ہو چکا ہے ذخیرۂ محفوظ کا کافی مقدار میں رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ اگر بنک کے اثاثے کی مالیت میں کوئی کمی واقع ہو جائے تو اس کی تلافی ہو سکے اور بنک کے کاروبار کے استحکام کے متعلق عوام میں اعتماد پیدا ہو۔ مطالبات فرسودگی، ناقابل وصول اور مشتبہ قرضوں کے لئے رقم مختص کر کے خالص سالانہ منافع میں سے مقسوم حصہ داروں میں اسی شرح سے تقسیم کیا جائے جو گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل حصوں کے اجرا کے وقت مقرر کرے۔ (مقسوم کی یہ شرح کسی صورت میں ۵ فیصد[1] سالانہ سے زائد نہ ہو سکے گی)۔ باقی ماندہ منافع میں سے کچھ حصہ مزید مقسوم کی ادائی میں اس شرح سے صرف کیا جا سکے گا جس کا تعین چوتھی جدول میں کر دیا گیا ہے اور جو زیادہ سے زیادہ ۶ فیصد ہوگی۔ اس کے بعد جو منافع بچے گا وہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو ادا کر دیا جائے گا، لیکن شرط یہ ہوگی کہ اگر کسی وقت ذخیرۂ محفوظ بنک کے حصوں کے اصل سے کم ہو تو کم از کم ۵ لاکھ روپے اور اگر باقی ماندہ منافع ۵۰ لاکھ روپے سے کم ہو تو سب کا سب ذخیرۂ محفوظ میں جمع کر دیا جائے۔ بنک کے حصہ داروں میں منافع کی تقسیم کر دینا ضروری ہے تاکہ یہ محض ایک منافع کمانے والا ادارہ بن کر نہ رہ جائے۔ بنک کے زائد منافع کا حکومت کو ملنا اس لئے مناسب قرار دیا جا سکتا ہے کہ یہ منافع زیادہ تر زر کاغذی اور ذخیرۂ معیار طلائی کی آمدنیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

---

[1] بازار میں شرح سود گری ہوئی ہونے کی وجہ سے ابتداءً مقسوم کی شرح ½ ۳ فیصد یکمشت مقرر کر دی گئی ہے۔

۲۹۷ **۵۸۔ بنک کی شرح وغیرہ**

رزرو بنک معیاری شرح کا وقتاً فوقتاً اعلان کرے گا اور اس معیاری شرح پر ہنڈیوں یا دوسری ایسی تجارتی دستاویزات کی خرید و فروخت کرے گا جن کو بنک اس قانون کے تحت خریدنے کا مجاز ہے۔ اس طرح بنک کو یہ اختیار ہے کہ اپنی صوابدید کے لحاظ سے زرعی ہنڈیوں پر رعایتی شرحوں سے بٹہ کاٹے اور ان شرحوں کو تجارتی دستاویزات کے بٹے اور مکرر بٹے کی شرح سے کم رکھے۔ یہ واضح ہونا چاہئے کہ رزرو بنک کے قانون کی اس دفعہ کے برعکس بنک آف انگلینڈ کا یہ طریقہ ہے کہ وہ اپنے گاہکوں کے سوا دوسروں کی ہنڈیوں پر بٹہ کاٹنے کی کم از کم شرح مقرر کر دیتا ہے یہ شرح بالعموم کھلی بازاری شرح سے زیادہ ہوتی ہے[1]

تنقیح ساز حصہ داروں کی طرف سے کم از کم جن دو تنقیح سازوں کا تقرر کیا جائے گا۔ ان کے علاوہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل بھی کسی وقت ایک صدر تنقیح ساز یا اگر مناسب خیال کرے تو دوسرے تنقیح سازوں کو مقرر کر سکتا ہے تاکہ وہ بنک کے حسابات کو جانچیں اور ان کے بارے میں رپورٹ پیش کریں۔

۵۹۔ ہفتہ وار فرد حساب

رزرو بنک پر لازم ہے کہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے پاس مقررہ طریقے پر (یعنی پانچویں جدول کے لحاظ سے) ایک ہفتہ وار فرد حساب پیش کرے۔ یہ فرد حساب گزٹ آف انڈیا میں شائع کی جائے گی۔ اسی طریقے سے سالانہ حسابات کی کیفیت گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے پاس پیش کرنی ضروری ہے۔ یہ واضح ہونا چاہئے کہ ہر ملک کے مرکزی بنک کی ہفتہ وار کیفیت کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس سے زر کے بازار کی مکمل حالت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ ہم ذیل میں ہفتہ مختتمہ ۲۲ / اپریل ۱۹۳۸ء کی بابت رزرو بنک کے شعبۂ اجرا اور شعبۂ بنک کاری کی کیفیت درج کرتے ہیں:۔

رزرو بنک آف انڈیا

شعبۂ بنک کاری

واجبات	روپے
ادا شدہ اصل	۵،۰۰،۰۰،۰۰۰

[1]۔ دیکھو ڈبلیو ایف، اسپالڈنگ کی کتاب موسومہ "لندن کا زر کا بازار" صفحہ ۸۹ تا صفحہ ۹۰۔

رزرو فنڈ	۵,۰۰,۰۰,۰۰۰
امانتیں:۔	
(ا) سرکاری امانتیں[ل]	۱۵,۸۲,۸۳,۰۰۰
(ب) بنکوں کی امانتیں	۱۴,۴۴,۶۲,۰۰۰
(ج) دوسری امانتیں	۵۶,۷۲,۰۰۰
قابل ادائی ہنڈیاں	۹,۹۳,۰۰۰
دوسرے واجبات	۷۸,۱۳,۰۰۰
میزان	۴۱,۷۲,۲۳,۰۰۰
اثاثہ و واصلات	**روپے**
نوٹ:۔	
(ا) ہندوستان میں زرقانونی	۲۹,۱۴,۰۳,۰۰۰
(ب) صرف برما میں زرقانونی	۱۱,۰۰۰
روپے	۶,۰۴,۰۰۰
ذیلی سکے	۳,۷۸,۰۰۰
ہنڈیاں جن پر بٹہ کاٹا گیا	
(ا) داخلی	۷۵,۰۰۰
(ب) خارجی	—
(ج) حکومت ہند کی خزانہ کی ہنڈیاں	۲,۵۰,۰۰۰
رقمیں جو باہر رکھی گئی ہیں[ک]	۴,۸۶,۷۵,۰۰۰

ل۔ اس رقم میں وہ ۱,۶۵,۹۰۰ پونڈ بھی شامل ہیں جو لندن میں ہائی کمشنر کے حساب میں فی روپیہ ۱ شلنگ ۶ پنس کی شرح سے تبدیل کرکے رکھے گئے ہیں۔

ک۔ اس مد میں نقد رقم اور قلیل مدت کے تمسکات شامل ہیں۔

حکومت کو دیئے ہوئے قرضے		۲,۰۰,۰۰۰
دوسرے قرضے		۱,۰۰,۰۰۰
مشغولات اصل		۶,۹۵,۰۰,۰۰۰
دوسرا اثاثہ		۵۹,۳۱,۰۰۰
	میزان	۴۱,۷۲,۲۳,۰۰

شعبۂ اجرا

واجبات	روپے	روپے
نوٹ جو شعبۂ بنک کاری میں رکھے ہوئے ہیں	۲۹,۱۴,۱۴,۰۰۰	
چالو نوٹ :-		
(ا) ہندوستان میں زر قانونی	۱۷۷,۵۸,۷۶,۰۰۰	
(ب) صرف برما میں زر قانونی	۷,۶۱,۸۴,۰۰۰	
مجموعی جاری کردہ نوٹ		۳۱۴,۳۴,۷۴,۰۰۰
مجموعی واجبات		۲۱۴,۳۴,۷۴,۰۰۰

اثاثہ و واصلات	روپے	روپے
(ا) سونا اور سونے کے سکے :-		
(ا) ہندوستان میں	۴۱۵۴۵۳۰۰۰	
(ب) ہندوستان کے باہر	۲۸۶۹۸۰۰۰	
اسٹرلنگ کے تمسکات	۷۸۸۰۷۰۰۰	
میزان (ا)		۱۲۳۲۲۲۱۰۰۰

(۲) روپے		
حکومت ہند کے روپے کے تمسکات		۵۸،۳۳۳۰۰۰
		۳۲۳۹۲۰۰۰۰
اندرونی ہنڈیاں اور دوسرے تجارتی دستاویزات	-	-
میزان		۲۱۴،۳۴،۷۴۰۰

نوٹ ۔میزان (۱) کا تناسب واجبات کے مقابلے میں ۴۸۷، ۵ ہے ۔

زرعی قرضے کا شعبہ

499 ۶۰۔ بنک پر لازم ہے کہ ایک "زرعی قرضے کا شعبہ" قایم کرے ۔اس شعبے کے فرائض حسب ذیل ہوں گے :۔(۱) خصوصی ماہروں کے ایک عملے کا مقرر کرنا تاکہ وہ زرعی قرضے کے تمام مسائل پر غور کرے اور گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل، مقامی حکومتوں، صوبہ وار امداد باہمی کے بنکوں اور بنک کاری کے دوسرے اداروں کو ضرورت کے وقت مشورہ دے ۔(۲) زرعی قرضے کے سلسلے میں بنک کے کاروبار میں ربط پیدا کرنا اور صوبہ واری امداد باہمی کے بنکوں یا کسی ایسے بنک یا ادارے سے جو زرعی قرضے کے کاروبار کرتا ہو اپنا قریبی تعلق قایم کرنا ۔ہندوستان جیسے ملک میں جو اساسی حیثیت سے زراعتی ملک ہے ایسے مرکزی ادارے کی ضرورت پر جتنا زیادہ زور دیا جائے کم ہے ۔یہ دفعہ اصولاً کامن ویلتھ بنک آف آسٹریلیا کے قانون کی اسی طرح کی دفعہ کے مطابق ہے لیکن اصل فرق یہ ہے کہ جہاں کامن ویلتھ بنک آف آسٹریلیا کا دیہی قرضے کا شعبہ اپنا علٰحدہ سرمایہ رکھتا ہے جس کو کسی حد تک خزانے نے اور کسی حد تک بنک نے فراہم کیا ہے وہاں رزرو بنک کے زرعی قرضے کے شعبے کے فرایض خالص مشاورتی نوعیت رکھتے ہیں [1]

رزرو بنک پر لازم تھا کہ جلد سے جلد اور بہر صورت اپنے قیام کے تین سال کے اندر گورنر جنرل کے پاس رپورٹ پیش کرے جس میں فقرہ ۵۵ (۱) (ب) کے بموجب زرعی قرضے

[1] ۔ اس مسئلے پر زیادہ تفصیل کے ساتھ جلد اول باب ۱ میں بحث کی گئی ہے ۔

کے انتظام کو بہتر بنانے اور زراعتی کاروبار اور زرو بنک کے کاروبار کے درمیان قریبی تعلق پیدا کرنے کے لئے قانون سازی کی سفارش کرے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے (فصل ۴۹۵ میں) اسی دفعہ کی ذیلی دفعہ (۱) (۲) کے بموجب بنک پر یہ بھی لازم تھا کہ دیسی ساہوکاروں تک اعتباری سہولتوں کو وسیع کرنے کے بارے میں رپورٹ پیش کرے۔

چنانچہ ایم ایل ڈارلنگ سی آئی ای آئی سی ایس کو مقرر کیا گیا تا کہ وہ اس بارے میں تحقیقات کریں کہ امداد باہمی کے بنکوں اور قرضے کی انجمنوں کی موجودہ حالت کیا ہے اور ملک کی دیہی معیشت میں دیسی ساہوکار کس حد تک حصہ لیتے ہیں۔ مئی ۱۹۳۵ء میں ان کی رپورٹ مکمل ہوئی۔ ان کی رپورٹ اور یادداشت جس میں زرعی قرضے کا شعبہ قایم کرنے کے متعلق تجاویز درج تھیں زرو بنک کو جون ۱۹۳۵ء کے اواخر میں وصول ہوئی۔ بنک کے عہدہ داروں نے تجاویز پر غور و خوض کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ حکومت ہند کے توسط سے مقامی حکومتوں سے یہ درخواست کریں کہ وہ زرو بنک کو امداد باہمی کے بنکوں، قرضے کی انجمنوں اور دوسرے اداروں مثلاً دیسی ساہوکاروں اور قرض دہندوں کے متعلق جو زرعی قرضے کے کاروبار کرتے ہوں مزید تفصیلی معلومات مہیا کریں۔ اس قسم کی تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے لئے چونکہ کافی وقت درکار تھا اس لئے زرو بنک کے نے حکومت ہند کے پاس دسمبر ۱۹۳۶ء
۵۰۰ میں زرعی قرضے کے سلسلے میں ایک ابتدائی رپورٹ پیش کی تا کہ اس قسم کے قرضے سے جو لوگ متعلق ہیں وہ بلا تاخیر اس قرضے کے مسئلے پر اچھی طرح غور کر سکیں۔ اس کے بعد ۱۹۳۷ء کے اواخر میں باضابطہ رپورٹ پیش کی گئی۔ اس رپورٹ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ موجودہ اعتباری اداروں خاصکر امداد باہمی کے اداروں کو کسان کے لئے زیادہ کارآمد بنانے کے لئے کن سمتوں میں اصلاح و ترقی ہونی چاہیئے اور یہ بھی بتلایا گیا کہ اس سلسلے میں زرو بنک کن طریقوں سے سہولتیں مہیا کر سکتا ہے۔ جیسا کہ زرو بنک نے بتلایا ہے یہ توقع نہ کرنی چاہیئے کہ زرو بنک تین سال کی ابتدائی قلیل مدت میں کوئی قطعی تجویز پیش کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ اہم مسائل اب بھی اس کی مسلسل

توجہ کام کرتے ہوئے ہیں[۱]۔

۶۱۔ رزرو بنک آف انڈیا کا قایم ہونا اور کاروبار شروع کرنا

رزرو بنک آف انڈیا کے قانون (۱۹۳۴ء) کے منظور ہونے کے بعد بہت سے مراحل طے کرنے پڑے تب کہیں جا کر رزرو بنک قایم ہونے کی نوبت آئی۔ عام طور پر یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ رزرو بنک یکم اپریل ۱۹۳۵ء سے کام شروع کر دے گا۔ ۱۹۳۴ء کے اواخر میں گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نے سر آسبورن اسمتھ کو (جو اس وقت امپیریل بنک آف انڈیا کے گورنر تھے) رزرو بنک کا پہلا گورنر مقرر کیا اور مسٹر (اب سر) جے، بی، ٹیلر کو جو اس وقت ناظم کرنسی تھے اور سر سکندر حیات خاں سابق گورنر پنجاب کو نائب گورنر مقرر کیا۔ دہلی سے ۱۳/ دسمبر ۱۹۳۴ء کو ایک ابلاغیہ جاری کیا گیا جس میں رزرو بنک آف انڈیا کے قانون کی دفعہ ۱۵ (۳) کے بموجب رزرو بنک کی پہلی مرکزی مجلس کے ارکان کے تقرر کا اعلان کیا گیا۔ مرکزی مجلس نے ایک پراسپکٹس شائع کیا اور ۲۲/ مارچ تا ۲۵ مارچ نئے بنک کے حصے فروخت کئے گئے۔ پانچ کروڑ روپے کا مجوزہ حصص کا (کامل ادا شدہ) اصل بہت جلد ضرورت سے زیادہ جمع ہو گیا۔ یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ تقریباً ۱۳۴۵۵۸ اشخاص نے رزرو بنک کے حصوں کے لئے درخواستیں پیش کیں اور پانچ حلقوں میں پانچ کروڑ روپے کے جو حصے تقسیم کئے جانے والے تھے ان کے مقابلے میں ۹ کروڑ ۵ لاکھ روپے کے حصوں کی درخواست کی گئی تھی۔ چونکہ پانچ یا پانچ سے زائد حصے لینے والوں کی تعداد ضرورت سے زائد تھی اس لئے حصوں کی تقسیم کا تصفیہ قرعہ اندازی کے ذریعے سے کیا گیا۔ لیکن یہ طے کیا گیا کہ کسی ایک حصہ دار کو کسی صورت میں پانچ حصوں سے زیادہ نہ دیے جائیں، اور جن لوگوں نے پانچ حصوں سے کم کی درخواست کی تھی وہ کوئی حصہ نہ پا سکے۔

۵۰۱ یکم اپریل ۱۹۳۵ء کو رزرو بنک آف انڈیا کا باضابطہ افتتاح ہوا، اور رزرو بنک نے

لہ۔ دیکھو رزرو بنک کی سالانہ رپورٹ (۱۹۳۷ء) نیز ابتدائی اور باضابطہ رپورٹیں جو رزرو بنک کے زرعی قرضے کے شعبے نے (۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء) شائع کیں۔

اپنے دفتر بمبئی، کلکتہ، دہلی، مدراس اور رنگون میں کھولے۔ اس کے بعد قانون کے بموجب لندن میں ایک شاخ کھولنے کا انتظام کیا گیا۔ زر رو بنک نے یکم اپریل کو محکمۂ اجرائے زر کاغذی کی نگرانی حکومت ہند سے اور سرکاری قرضوں اور حسابات کا انتظام امپیریل بنک آف انڈیا سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اسی تاریخ کو محکمۂ اجرا کا اثاثہ زر رو بنک کو منتقل کر دیا گیا۔ ۳/ اپریل کو زر رو بنک نے بحیثیت مرکزی بنک کے کام شروع کیا اور اسٹرلنگ کی خریدی کے لئے جو وزیر ہند کو بھیجنا مقصود ہو ٹنڈر طلب کئے۔ بنک نے ۱۶/ اپریل کو ٹنڈر کے ذریعے خزانے کی ہنڈیوں کی فروخت شروع کی۔ لیکن ۴/ جولائی تک جبکہ ملک میں پہلی مرتبہ بنک کی باضابطہ شرح کا اعلان کیا گیا زر رو بنک نے مرکزی بنک کی حیثیت سے اپنے کاموں میں سے کوئی انجام نہیں دیا۔ یہ شرح شروع میں ½ ۳ فیصد تھی اور ۲۸/ نومبر ۱۹۳۵ء سے گھٹا کر ۳ فیصد کر دی گئی۔ بنک کے لئے دوسری کارروائی یہ تھی کہ درج فہرست بنکوں سے باضابطہ تعلق قایم کرے۔ یہ کام ۵/ جولائی ۱۹۳۵ء کو تکمیل کو پہنچا جبکہ درج فہرست بنکوں نے زر رو بنک آف انڈیا کے قانون کے عائد کئے ہوئے لزوم کے مطابق اپنی باضابطہ امانتیں زر رو بنک میں داخل کیں۔ بنک کی مقامی مجلسوں کو قائم کرنے کے لئے جو انتخابات ضروری تھے وہ نومبر ۱۹۳۵ء میں عمل میں لائے گئے۔ دسمبر ۱۹۳۵ء میں مغربی حلقے (بمبئی) کی مقامی مجلس کے منتخب شدہ ارکان نے مرکزی مجلس کے ان دو نظما کے بجائے جن کو اس حلقے کی نمایندگی کی غرض سے گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نے نامزد کیا تھا دو نظما کا انتخاب کیا۔ ۳/ فروری ۱۹۳۶ء کو حصہ داروں کا پہلا سالانہ عام جلسہ منعقد ہوا۔ ہم پہلے ان انتظامات کا ذکر کر چکے ہیں جو زر رو بنک نے ۱۹۳۵ء کے اوائل میں ہندوستان اور برما میں اپنے نوٹ جاری کرنے کے سلسلے میں کئے تھے۔

اس طرح زر رو بنک آف انڈیا کے کامیاب قیام سے ایک دیرینہ امید اور آرزو پوری ہو گئی۔ ہندوستان اب دنیا کے دوسرے مہذب ملکوں کی صف میں داخل ہو گیا ہے اور برطانوی امپائر (مثلاً یونین آف ساؤتھ افریقہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، ہندوستان اور کینیڈا) میں مرکزی بنکوں کا سلسلہ مکمل ہو گیا ہے۔ غیر ضروری تاخیر جو بعض اوقات تکلیف دہ ہو جاتی تھی دراصل مفید ثابت ہوئی کیونکہ ایک فائدہ تو

یہ تھا کہ ۱۹۲۵ء کے بعد سے وقتاً فوقتاً جو مباحث ہوئے ان کی وجہ سے عوام جدید مرکزی
بنک کے اساسی اصولوں سے واقف ہوگئے۔ اس کے علاوہ رزرو بنک آف انڈیا
ایسے سازگار حالات میں وجود میں آیا جبکہ ۱۹۲۷ء-۲۸ء کے زمانے کے سیاسی اختلافات جو اس
بنک کے قیام کے سلسلے میں پیدا ہوئے تھے ختم ہوچکے تھے اور ذخیرے کی حالت مستحکم
ہوچکی تھی۔ رزرو بنک کے شعبۂ اجرا کے قایم ہوتے وقت اس میں بیرونی ذخیرہ (یعنی
سونا اور اسٹرلنگ کے تمسکات) ۵۰ فیصد سے زائد تھا۔ اس کے بعد سے جیسا کہ پہلے
تذکرہ کیا جاچکا ہے ذخیرے میں اسٹرلنگ کے تمسکات میں کافی اضافہ ہوگیا ہے۔
لیکن سونے اور سونے کے سکوں کی مقدار بدستور قایم ہے۔ اگرچہ کہ آجکل سونے
اور اسٹرلنگ کی شکل میں جتنا اثاثہ بنک میں موجود ہے وہ غالباً موجودہ معیار ۵۰۲
مبادلۂ اسٹرلنگ کو برقرار رکھنے کے لئے کافی ہے پھر بھی مناسب یہ ہوگا کہ بنک
اپنے سونے کے ذخیرے میں اضافہ کرے تاکہ آیندہ جبکہ زر کے سلسلے میں بین الاقوامی
صورتِ حال واضح اور مستحکم ہوجائے ہندوستان میں معیار طلا رائج کیا جاسکے۔

رزرو بنک نے اپنے ابتدائی تین سال میں جس طرح کاروبار کیا ہے اس سے
یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس بنک نے مالی استحکام، بنک کاری کی اصلاح اور زر کے
بازار کی ازسرنو تنظیم اور توسیع کی بنا ڈالی۔ مرکزی اور صوبہ واری حکومتوں کے لئے
بہت ادنیٰ شرح سود پر قرضوں کا باقاعدہ انتظام کرنے، وزیر ہند کو رقمیں ارسال
کرنے، خزانے کی ہنڈیاں فروخت کرنے اور روپے کے استحکام کو برقرار رکھنے کے
سلسلے میں رزرو بنک نے بہت کامیاب طریقے پر اپنے فرائض انجام دیے۔ بنک
نے بنک کاری کی کمپنیوں کے متعلق دفعات کو ہندوستانی کمپنیوں کے قانون میں
شریک کرنے کے متعلق قیمتی مشورے دیے۔ بنک نے اندرون ملک رقمی ترسیلات
کی بیش بہا اور ارزاں سہولتیں مہیا کیں اور زر کی شرحوں کو کم سے کم رکھنے کی پوری
کوشش کی۔ اس کے علاوہ وہ ملک میں بنک کاری کی سہولتوں کی توسیع میں بالواسطہ
طور پر محرک ثابت ہوا ہے۔ لیکن اس سے خاصکر ہندوستان میں ہنڈیوں کا بازار
قایم کرنے کے بارے میں جو توقع کی جارہی تھی وہ اب تک پوری نہیں ہوئی ہے۔
چنانچہ اس بات کا ثبوت اس طرح ملتا ہے کہ اس تے درج فہرست بنکوں اور صوبہ واری

امداد باہمی کے بنکوں کی ہنڈیوں پر مکرر بٹہ کاٹنے کا کاروبار بہت ہی محدود پیمانے پر کیا ہے۔ ہم اس مسئلے کی دشواریوں کا پہلے ذکر کر چکے ہیں اور یہ بتلا چکے ہیں کہ زرزو بنک ان دقتوں کو دور کرنے کے لئے کیا کر رہا ہے۔ اس موقع پر یہ بتا دینا بھی مناسب ہوگا کہ زرزو بنک کو دیسی ساہوکاروں کا الحاق اپنے سے کرنے میں ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک یہ الحاق نہیں ہوگا اس وقت تک زرزو بنک نہ تو ہنڈیوں کا بازار قایم کرنے میں کامیاب ہوگا اور نہ ہندوستانی زر کے بازار کے دو اہم اجزا کو ملاکر ایک کر سکے گا۔

اگرچہ بنک اپنی موجودہ حالت میں مکمل ادارہ نہیں کہا جا سکتا اور اس میں ابھی بہت سے امور اصلاح طلب ہیں۔ پھر بھی وہ ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اس وقت پرانے جھگڑوں کو زندہ کرنے سے کوئی نتیجہ نہیں ہے اور بہترین طریق کار یہی ہو سکتا ہے کہ موجودہ بنک ہی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے اور اس کی اصلاح و ترقی کی جدوجہد کی جائے اس دعوے میں بہت زیادہ مبالغہ نہیں ہے کہ ہندوستان میں اس بنک کے قیام کے بعد سے کرنسی اور اعتبار کے ایسے بہتر انتظامات ہو گئے ہیں جو جدید تجربے کے عین مطابق ہیں اور اس طرح ہندوستان کا شمار ترقی یافتہ ملکوں میں ہونے لگا ہے لیکن ابھی اصلاح و ترقی کی بہت کچھ گنجائش موجود ہے اور امید ہے کہ یہ آیندہ عمل میں لائی جائے گی۔ اس معاشی تنظیم کے دور میں ہندوستان جیسے ملک میں جو ابھی معاشی حیثیت سے پسماندہ حالت میں ہے باضابطہ معاشی نشو و نما کے لئے ایک
۵۰ منظم، مستحکم اور اعلیٰ درجے کا مرکزی بنک ناگزیر ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ بہت کچھ انحصار نہ صرف ان روایات پر ہوگا جو بنک قایم کرے گا بلکہ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ یہ بنک کس طرح اپنے ذمے کے فرائض کو پورا کرتا ہے۔

۶۲۔ صنعتی قرضے[۱] ہندوستانی معاشی نظام میں جو بڑی خامیاں ہیں ان میں سے ایک خامی یہ ہے کہ یہاں صنعتی قرضے کا کوئی مناسب اور

۵۔ یہ فصل بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۳۸۵ - ۱۹۴ - پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ

باقاعدہ نظام نہیں ہے۔ جرمنی کے بنک صنعتوں کی مالی ضرورتوں کو پورا کرنے میں بہت اہم حصہ لیتے ہیں۔ وہ صنعتوں کے لئے ابتدائی سرمایے کا بیشتر حصہ مہیا کرتے ہیں جس میں شغل اصل کرنے والے عوام کو بھی بعد میں شرکت کا موقع دیا جاتا ہے۔ نقصان کے اندیشوں کو زیادہ لوگوں میں تقسیم کرنے کے لئے مختلف بنک متحد ہو جاتے ہیں اور جاری کردہ قرضے کی کچھ ذمہ داری اپنے اوپر لے لیتے ہیں۔ لیکن خالص صنعتی بنکوں کی طرح یہ بنک اپنے اصل کو صنعتی کمپنیوں کے حصوں میں طویل مدت کے لئے مشغول نہیں کرتے بلکہ وہ اس کو زیادہ محفوظ خیال کرتے ہیں کہ اپنے ذرایع اعلی درجے کے تمسکات میں اور وہ بھی قلیل مدت کے لئے مشغول کریں۔ اس قسم کے کاموں سے خود بنکوں کا بھی فائدہ ہے کیونکہ ان کی بدولت کاروباری تعلقات میں وسعت پیدا ہوتی اور بنکوں کا اثر بڑھتا ہے۔ جرمنی کی صنعتی کمپنیاں جو نیا اصل فراہم کرنا چاہتی ہیں بالعموم ان بنکوں کے توسط سے اصل حاصل کرتی ہیں جن سے ان کے مستقل بنک کاری کے تعلقات ہیں۔ لیکن یہ واضح ہونا چاہئے کہ بنک اپنے سرمایے کے بہت ہی قلیل جزو کو صنعتی قرضہ دینے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور ان کی جد وجہد کا بیشتر حصہ معمولی بنک کاری کے کاروبار پر مشتمل ہوتا ہے۔ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی میینجنگ ایجنسی کے طریقے کو ختم کر دینے کی تائید میں ہے اور یہ رائے ظاہر کرتی ہے کہ آیندہ ترقی کے لئے زیادہ انحصار تجارتی بنکوں اور صنعتی کمپنیوں کے درمیان قریبی تعلقات کے قیام پر ہونا چاہئے۔ کمیٹی یہ سفارش کرتی ہے کہ جرمن طریق مناسب ترمیمات کے ساتھ اختیار کر لیا جائے اور یہ مشورہ دیتی ہے کہ امپیریل بنک (رزرو بنک کے قائم ہونے کے بعد) اور دوسرے مستند ومشہور تجارتی بنک اس طریق پر عمل شروع کریں۔ اس قسم کے کاروبار کے لئے نہ صرف تجربہ، دوراندیشی اور کافی سرمایہ درکار ہے بلکہ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ تمسکات کی فروخت اور اجرا کے سلسلے میں تخمین سے بالکلیہ احتراز کیا جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بہت کم بنک ان احتیاطوں کو ملحوظ رکھتے ہیں۔[1]

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ :- اس سلسلے میں جلد اول باب (۱۳) فصل (۱۲) کا بھی مطالعہ کرنا مناسب ہوگا۔

[1] ڈاکٹر بی ایس الوکونا قص نے اپنی حالیہ (۱۹۳۵ء) کتاب موسوم بہ Industrial

ہندوستانی بنک کاری میں اس کمزوری کے باوجود اس کا امکان ہے کہ صنعتوں کو ۵۰۴
کافی مالی امداد بہم پہنچائی جاسکے بہ شرطیکہ سربرآوردہ بنک صنعتوں کی ترقی میں واقعی
ہمدردانہ دلچسپی لیں ۔ باہمی اعتماد پیدا کرنے اور ان پیچیدگیوں کو دور کرنے کے لئے جو
اعلیٰ بنک کاری کے منافی ہو، ہندوستان میں بنکوں کے لئے جرمن طریق کی اتباع مناسب
ہوگی ۔ ان بنکوں میں اور ان صنعتوں میں جن کو امداد دینا مقصود ہو قریبی تعلق اس طرح
قائم کیا جاسکتا ہے کہ بنک کے مینیجنگ ڈائرکٹروں یا مینیجروں کو صنعتی اداروں کے
نظما مقرر کیا جائے ۔ بنکوں کو چاہئے کہ مقامی مشاورتی کمیٹیاں قایم کریں تاکہ وہ ان
کے گاہکوں کی مالی حالت کی تشخیص میں مدد دیں اور ان کو اطمینان دلائیں کہ بنکوں کی طرف
سے اچھا اور ہمدردانہ سلوک کیا جائے گا ۔

جیسا کہ اوپر تذکرہ کیا جاچکا ہے جہاں تجارتی بنکوں کے تعاون باہمی سے
اچھے نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے وہاں محض یہی طریق صنعتی ترقی کے لئے کافی نہیں ہوسکتا۔
جدید دستور کے تحت صوبہ واری حکومتوں کو جو فرایض تفویض کئے گئے ہیں ان میں سے
ایک یہ ہے کہ وہ اپنے علاقوں میں صنعتوں کو ترقی دیں ۔ اس فرض کو قابل اطمینان طریق پر
انجام دینے کی ایک کارآمد صورت یہ ہے کہ صنعتی شخصیے قایم کئے جائیں ۔ اگر ضرورت ہو تو
ان کی شاخیں بھی کھولی جائیں اور ان کا کاروباری اصل ابتداءً یا مستقل طور پر متعلقہ
صوبہ واری حکومت مہیا کرے ۔ ان شخصیوں کا مقصد خاص طور پر ایسے کاروبار کی امداد
ہونا چاہئے جو عوام کے فائدے کے لئے کھیے جارہے ہوں جو صوبے کی پیداآور قوت
کو بڑھائیں اور اس کے باشندوں کے لئے روزگار مہیا کریں ۔

صنعتی شخصیے کو اپنا سرمایہ حتی الامکان عوام سے حاصل کرنا چاہئے اور حکومت
اس سرمایے کے صرف اس جزو کو فراہم کرے جس کو عام حصہ دار مہیا نہیں کرسکتے ۔ شخصیے
کے اس اصل میں جو حصص کے ذریعے سے فراہم کیا جائے کچھ اصل ڈبنچروں کے ذریعے سے

بقیہ حاشیہ مضمون صفحہ گذشتہ :۔ Organisation in India (صفحہ ۲۵۱ ۔ ۲۵۲)
میں یہ بتلایا ہے کہ کس طرح ہندوستانی تجارتی بنک کاری کو اس مخلوط بنک کاری کے مطابق بنانے میں دشواریاں
پیش آتی ہیں جن کا یورپ میں رواج ہے ۔ ان کو نظر انداز کرنا یقیناً دور اندیشی کے خلاف ہوگا ۔

بھی حاصل کیا جائے۔ اگر ضرورت ہو تو حکومت ان جاری کردہ ڈبنچروں کے ایک حصے کو اس وقت تک خرید سکتی ہے جب تک کہ ان کا ایک باقاعدہ بازار قایم ہو جائے۔ اس کے علاوہ حکومت ڈبنچروں کے سود کی ایک حد تک ضمانت بھی دے سکتی ہے۔ صنعتی شخصیے کو چاہیئے کہ صنعتوں کو طویل مدت کے لیے سرمایے کی فراہمی کو اپنا خاص کاروبار قرار دے اور صنعتوں کو چاہیئے کہ اپنا کاروباری اصل موجودہ اداروں سے بدستور حاصل کرتے رہیں۔ شخصیہ طویل مدت کی امانتیں کم از کم دو سال کے لئے رکھ سکتا ہے اور اس مدت کے لئے ان امانتوں سے قرضے دیے جاسکتے ہیں۔ جب تک حکومت کا مفاد اور ذمہ داری شخصیے سے وابستہ ہے یہ مناسب ہوگا کہ اس کی مجلس نظما میں حکومت کی نمایندگی رہے۔[1]

اگر وفاقی یا مرکزی مجلس قانون ساز مناسب سمجھے تو ایک کل ہند صنعتی شخصیہ
بھی قایم کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں چند صنعتیں ایسی ہیں اور آیندہ بھی ہوں گی ۵۰۵
جن کو قومی صنعتیں کہا جاسکتا ہے۔ نیز کچھ صنعتیں اتنی اہم تصور کی جاسکتی ہیں کہ ان کو ترقی دینا بجائے صوبہ واری حکومتوں کے وفاقی یا مرکزی حکومت کے فرائض میں شامل ہوگا۔ اس کے علاوہ صوبہ واری حکومتیں خود اس بات کی خواہشمند ہوں گی کہ اس قسم کا ادارہ قایم ہو تاکہ وہ نہ صرف مرکزی حکومت کے ان محکموں سے راست تعلق قایم رکھ سکیں جن کے توسط سے کثیر رقمیں حکومت ہند خرچ کرتی ہے بلکہ وہ اپنے علاقے کی صنعتوں کے لئے ریلوں کے کرایے، محصولات کروڑگیری، اسٹور کی خریدی اور مرکزی حکومت کے دوسرے معاملات سے بھی ربط قایم کر سکیں گی۔ ایک کل ہند صنعتی شخصیہ قایم ہونے تک صوبہ وار شخصیے مشترکہ مفاد کے لئے آپس میں متحد ہو کر ایک مرکزی انجمن قایم کر سکتے ہیں۔ مدراس کی صنعتوں کی سرکاری امداد کے قانون کے اصول پر دوسرے صوبوں میں بھی قانون وضع کئے جاسکتے ہیں تاکہ نئی اور نوخیز صنعتوں یا گھریلو صنعتوں کے لئے اعتباری سہولتیں مہیا کی جاسکیں۔ اس طرح وضع کردہ قانون کے بموجب اصل کی فراہمی کے سلسلے میں جو سرکاری امداد دیجائے وہ صوبہ واری صنعتی شخصیے کے توسط سے دینی چاہیئے اگر ایسا شخصیہ وہاں قایم ہو۔

[1]۔ دیکھو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۴۰۲ — ۴۰۷۔

۶۳ — صوبہ متحدہ میں صنعتی قرضے کی نئی اسکیم

جیساکہ پہلے باب میں تذکرہ کیا جاچکا ہے صوبۂ متحدہ کی حکومت نے جون ۱۹۳۵ء میں صوبہ واری مجلس قانون ساز سے صنعتی قرضے کی ایک انجمن قایم کرنے کی منظوری حاصل کرلی جس کی حیثیت ایک نجی ادارے کی تھی اور جو سرکاری امداد پا رہی تھی۔ اس عارضی اسکیم کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:۔ اس قرضے کی کمپنی کا نام انڈسٹریل کریڈٹ کمپنی۔ یا بنکنگ کارپوریشن ہوگا۔ اس کا مجوزہ اصل تقریباً ۳۰ لاکھ روپے اور ادا شدہ اصل ۱۵ لاکھ روپے ہوگا۔ وہ اپنے ذاتی اصل ہیں طویل مدت کی امانتیں اور قرضے حاصل کرکے اضافہ کرسکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کو ڈبنچر جاری کرنے کا بھی اختیار ہوگا۔ یہ کمپنی ۶ یا ۷ ارکان کی ایک مجلس نظما بھی قایم کرسکتی ہے جن میں سے چند کو نامزد کیا جائے گا۔ کمپنی کے منیجر اور دوسرے اعلیٰ عہدہ داروں کے تقرر کے لئے حکومت کی منظوری ضروری ہوگی۔ کمپنی اپنی شاخیں مفصلات کے اہم مرکزوں میں کھول سکے گی اور ان مرکزوں میں مقامی مجلسیں قائم کرسکے گی حکومت حسب ذیل شکلوں میں مدد دے سکے گی:۔

(۱) ادا شدہ اصل پر ایک مقررہ شرح مقسوم کی ضمانت دی جاسکتی ہے (۲) حکومت کی منظوری سے جو ڈبنچر جاری کئے جائیں گے ان پر ایک مقررہ فیصد شرح سود کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ (۳) انتظام کے مصارف کے لئے رقمی امداد دیجا سکے گی۔ کارخانہ داروں سے معمولاً جو انتہائی شرح سود وصول کی جاسکے گی اس کا تعین کردیا جائے گا۔ مقسوم کی انتہائی شرحیں بھی مقرر کردی جائیں گی۔

جیساکہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے مارکٹنگ اور فینانسنگ کمپنی کی اسکیم کریڈٹ کمپنی کی اسکیم سے متعلق کردیگئی ہے اور موخرالذکر نے ۵ لاکھ روپے سے سرمایے میں شرکت کی ہے۔ مارکٹنگ کمپنی نہ صرف تفویض کردہ سامان کو فروخت اور عام آڑھت ۵۰۶ کا کاروبار کرے گی بلکہ خام اشیا کی خریدی یا تیار شدہ سامان کی کفالت پر جو کمپنی کے پاس امانت رکھا دیا جائے گا قلیل مقدار میں قرضے بھی دے گی۔ حکومت اس کمپنی کی امداد اس طرح کرسکتی ہے کہ سالانہ کچھ رقم بطور انعام اور کچھ چندہ تشہیر و اشاعت اور پروپگنڈا وغیرہ کے لئے دیا کرے۔

مذکورۂ بالا اسکیم ہندوستان میں حکومت کی مدد سے صنعتی قرضے کا انتظام

باضابطہ طریق پر کرنے کی پہلی قابل ذکر کوشش ہے۔ اس لحاظ سے اس اسکیم کا بہت دلچسپی سے مطالعہ کیا جائے گا[1]

۶۴۔ اندوختہ کرنے کی عادت

ہندوستانیوں میں اندوختہ کرنے کی ضرورت سے زیادہ جو عادت ہے وہ ایک زمانے سے یورپ کے معاشیات دانوں کا موضوع بحث رہی ہے۔ ہندوستان کے متعلق یہ مقولہ کافی مشہور ہے کہ وہاں قیمتی فلزات کی سمائی کی کوئی حد نہیں ہے۔ ہندوستان میں سونے اور چاندی کی ضرورت سے زیادہ مانگ کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ "ایک کالی قوم سونے اور چاندی کو زمین سے نکالتی ہے اور دوسری سیاہ فام قوم ان کو دوبارہ زمین میں دفن کر دیتی ہے"۔ بعض لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ سونا جو ایک مرتبہ ہندوستان میں آجائے اس سے دنیا ہمیشہ کے لئے محروم ہو جا سکتی ہے۔ ہندوستان میں حال حال تک متواتر سونے کی جو کھپت ہوتی رہی اس کے متعلق یورپ کے لوگ تعجب اور اطمینان کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ سونے اور چاندی کی پیداوار حالیہ زمانے میں نئی کانیں دریافت ہونے اور کان کنی کے نئے طریقے اختیار کئے جانے کی وجہ سے بہت بڑھ گئی ہے۔ اگر ہندوستان میں چاندی اور سونے کی اتنی مقدار کام میں نہ آئی ہوتی تو یورپی ممالک کے معاشی حالات میں قیمتوں کے بڑھ جانے سے بدنظمی پیدا ہو جاتی۔ لیکن یورپ میں حالیہ رجحان یہ ہے کہ وہاں کے لوگ اس اندیشے کی وجہ سے کہ ہندوستان میں فلزات کی کثیر مقداریں سابق کی طرح آیندہ بھی بدستور جذب ہوتی رہیں گی خوف و ہراس کا اظہار کر رہے ہیں۔ ۲۵-۱۹۲۴ء میں جب کہ انگلستان اور یورپ کے دوسرے ملک اپنے زروں کو مستحکم کرنے کی کوشش کر رہے تھے، ہندوستان کا یورپ کی ضروریات کا کوئی لحاظ کئے بغیر اپنے اندوختوں میں کم از کم ۵ ملین پاونڈ کی مالیت کے سونے کا اضافہ کر لینا موجب حیرت سا تھا[2]

---

[1] حکومت بمبئی نے حال ہی (اپریل ۱۹۳۸ء) میں ایک کمیٹی مقرر کی ہے تاکہ وہ بمبئی پریزیڈنسی کی معاشی و صنعتی تحقیق کرے اور دوسرے امور کے منجملہ اس بارے میں سفارش پیش کرے کہ حکومت پریزیڈنسی میں معاشی نشو ونما کے لئے کیا تدابیر اختیار کر سکتی ہے اور ان کی مالی امداد کے کیا طریقے ہو سکتے ہیں۔

[2] لیکن یہ استدلال اس وقت کچھ زیادہ وقیع نہیں رہتا جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ستمبر ۱۹۳۱ء (جبکہ روپے

۵۰۷ ہندوستانی اندوختوں کے متعلق مختلف اندازے قایم کئے گئے ہیں۔ غالباً سب سے پہلے ایچ، ڈی، میکلیوڈ نے اندازہ لگایا اور یہی پہلا معاشیات داں تھا جس نے ہندوستانی اندوختوں کے متعلق اپنا خیال ظاہر کیا۔ اس نے یہ حساب لگایا کہ ہندوستانی اندوختوں کی مقدار کم از کم ۳۰۰ ملین پاونڈ ہوگی۔ لارڈ کرزن کا تخمینہ ۸ ارب ۲۵ کروڑ روپے تھا اور آرنلڈ رائٹ نے فینانشل ریویو آف ریویوز بابت ڈسمبر ۱۹۱۶ء میں اپنا اندازہ ۷۰۰ ملین پاونڈ بتلایا۔ مسٹر ای۔ ایل پرائس امریکی کمشنر تجارت کے حالیہ تخمینے کو یعنی ۱۰۰۰ ملین پاونڈ کو صحیح خیال کرتا ہے۔ مسٹر فرانسس اسکرائن کے خیال میں یہ یہ اندازہ بھی حقیقت سے کم ہے[۱] سرجیمس گرگ نے اس اندازے کا حوالہ دیا جو بنک فار انٹرنیشنل سٹلمنٹس نے اپنی سالانہ رپورٹ (۱۹۳۴ء-۳۵ء) میں دیا ہے[۲] اس اندازے کے مطابق ۱۴۹۳ء تا ۱۹۳۰ء جتنے سونے کا اندوختہ کیا گیا اس کی مالیت کم از کم ۱۴ ارب ۴۵ کروڑ روپے تھی۔ اس طرح ہر نئے اندازہ لگانے والے نے جو اعداد پیش کئے وہ سابقہ اندازوں کے مقابلے میں بڑھے چڑھے ہیں۔

ہندوستان میں سونے اور چاندی کی کھپت کی شکایت کرتے ہوئے یورپی مصنفین نے ہندوستانی باشندوں پر دوہرا الزام لگایا ہے اور اس طرح ہندوستان پر سونے[۲] کے استعمال کے سلسلے میں جو خاص طور پر غیر معمولی ذمہ داری عائد کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس کا ہندوستانیوں نے بھی منہ توڑ جواب دیا ہے۔ ان میں سے بعض جوابات تردید الزام کی قسم کے ہیں۔ چنانچہ یہ استدلال کیا گیا کہ کثیر مقدار میں سونے کی کھپت صرف

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ کا الحاق اسٹرلنگ سے ا شلنگ ۶ پنس کی شرح پر کیا گیا) اور جولائی ۱۹۳۸ء کے درمیان ہندوستان سے ۳ ارب ۰ا کروڑ روپے کا سونا برآمد کیا گیا۔ نیز دیکھو باب ۸ فصل ۲۹۔ دوسری طرف حالیہ سالوں میں یاستہائے متحدہ امریکہ اور اکثر یورپی ممالک میں سونا کافی مقدار میں اندوختہ کیا جا رہا ہے۔

[۱] دیکھو گیبے کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۲۳ و ۳۸۔

[۲] دیکھو سر اسٹینلی ریڈ کی یادداشت جو انھوں نے بے بنگ ٹن اسمتھ کمیٹی کے سامنے پیش کی۔

ہندوستان ہی میں نہیں ہوتی[1] سنہ ۱۹۱۶ء - ۲۳ میں ریاستہائے متحدہ امریکہ میں بھی ۵۰ کروڑ پاونڈ کی مالیت کے سونے کا انجذاب ہوا اور ایسی حالت میں جبکہ نیویارک اور پیرس میں زر کی ضروریات کو پورا کرنے کے سلسلے میں سونے کی مجموعی رسد کا دوتہائی حصہ موجود ہے اندوختہ کرنے کے شوق کو ہندوستانیوں ہی کا اجارہ نہیں کہا جاسکتا۔ اس میں شک نہیں کہ نیویارک اور پیرس جیسے مرکزوں میں سونے کی جو کثیر مقدار موجود ہے اس کا بڑا حصہ مرکزی بنک کاری کے ذخائر میں رکھا ہوا ہے اور ہندوستان میں سونے سے اس طرح کام لینا ممکن نہیں ہوا ہے۔ لیکن کیا اسکی ذمہ داری کم از کم جزوی حد تک اس ناقص زر کے نظام (معیار مبادلۂ طلا) پر عائد نہیں ہوتی جو ہندوستان میں طویل زمانے تک رائج رہا۔ جو لوگ ہندوستانیوں کے اندوختوں پر نالاں ہیں وہ عام طور پر یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ ہندوستان میں جتنے سونے کا انجذاب ہوتا ہے اس کا ایک حصہ صنعتی اور گھریلو کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ سر اسٹائلی ریڈ نے کہا ہے "دنیا کا ہر ملک سونا اور چاندی صنعتی اور گھریلو کاموں میں استعمال کرتا ہے اور جب ہندوستانی قیمتی فلزات کا ان ہی اغراض کے لئے استعمال کرتے ہیں تو ان کے ان اغراض کو مہمل اور بے معنی اندوختہ کرنے سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے ناواجب اعتراضات سے ہندوستانیوں کو رنج ہوتا ہے"۔ اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ ہندوستان کی آبادی دنیا کی مجموعی آبادی کا ⅕ ہے ہندوستان میں دنیا
کی سونے کی پیداوار کے ۲۰ فیصد سالانہ انجذاب کو غیر متناسب یا غیر ضروری نہیں کہا جاسکتا[2] ۵۰۸

[1] ۔ دیکھو واڈیا و جوشی کی تصنیف محولہ بالا صفحہ ۳۸۸ - ۳۸۹ -

[2] ۔ ہندوستان میں سونے کی کثیر مقدار کی درآمد کو حق بجانب ثابت کرنے کے سلسلے میں یہ بھی دلیل پیش کی جاتی ہے کہ اس درآمد کی وجہ یہ ہے کہ توازن تجارت ہندوستان کے موافق رہتا ہے اور اس موافق توازن تجارت کا باعث یہ ہے کہ بیرونی ممالک میں ہندوستانی اشیاء کی مانگ بہت زیادہ ہے۔ لیکن یہ استدلال ہمارے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوستان اپنی اشیا کو فروخت کرنے کا جسقدر خواہشمند ہے اسی قدر بیرونی ممالک ان اشیا کی خریدی کے خواہشمند ہیں اور اگر ہندوستان کے توازن تجارت کے تصفیے کے سلسلے میں یہ ممالک اس کو سونا بھیجتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان دوسری اشیا کے مقابلے میں

اور تمام امور کا لحاظ کرنے کے بعد جب ایک مرتبہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہندوستان کی سونے اور چاندی کی طلب ضرورت سے زیادہ نہیں ہے تو یہ اعتراض باقی نہیں رہتا کہ ہندوستان دوسرے ملکوں کے زر کے استحکام میں حائل ہے۔ اگر ہندوستان کی قیمتی فلزات کی واجبی طلب دوسرے ملکوں کے لئے پریشان کن ہے تو اس کا علاج یہ ہو سکتا ہے کہ یہ ممالک زر کا ایسا نظام مرتب کریں جو سابق کے مقابلے میں سونے پر کم مبنی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہندوستان آیندہ کسی ایسی عالمگیر تحریک میں شرکت کے لئے تیار ہو جائے جو سونے کے استعمال میں کفایت کی غرض سے جاری کی جائے لیکن ہندوستان یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا کہ وہ خاصکر اس قلت کا ذمہ دار ہے جو دوسرے ملکوں میں محسوس ہو رہی ہے[1]۔

مذکورۂ بالا بحث کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ ہندوستان میں اندوختوں کی حقیقی مقدار کا اندازہ کرنے میں مبالغے سے کام لیا جاتا ہے۔ البتہ اندوختوں کے وجود سے قطعاً انکار کرنا واقعے کے خلاف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں سونا زر کے علاوہ دوسرے کاموں میں زیادہ استعمال کیا جاتا ہے اور سونا جو اندوختوں کی شکل میں لے کار پڑا ہوا ہے اس کی مقدار بہت کافی ہے۔

اس کا ذکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ یہ صورت حال تمول اور خوشحالی کی علامت نہیں ہے۔ یہ اندوختے زیادہ تر منتشر حالت میں اور تھوڑی تھوڑی مقداروں میں بہت سے لوگوں میں منقسم ہیں اور چونکہ ان سے کوئی پیدا آور کام نہیں لئے جاتے اس لئے وہ بجائے خوشحالی کی علامت ہونے کے افلاس کا ثبوت ہیں۔

یہ فیصلہ کرنا ذرا دشوار ہے کہ آیا کل کے کل زیورات کا شمار اندوختوں میں کیا جائے یا نہیں، اگرچہ عموماً ان کو اندوختوں ہی کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ سونا لینے کو ترجیح دیتا ہے۔

[1] ۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے آجکل زیادہ تر ریاستہائے متحدہ امریکہ اور فرانس مورد الزام ہیں، کیونکہ وہ بجائے اس کے کہ کرنسی اور اعتبار کی مقدار بڑھائیں اپنے مرکزی بنکوں کے خزانوں میں دنیا کے سونے کی سالانہ مجموعی پیداوار کا بڑا حصہ محفوظ کر رہے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیوں ان زیورات کو جو زیبائش کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں اندوختوں میں شمار کیا جائے جبکہ اس سونے کو جو دانت منڈھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اندوختوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ سونے کے استعمال کی یہ دونوں صورتیں صرف
دولت کی شکلیں ہیں نہ کہ اندوختہ کرنے کی۔ یہ بلاشبہ صحیح ہے کہ جب ہندوستان ۵۰۹
کے لوگ سونے اور چاندی کو زیورات میں تبدیل کرتے ہیں تو ایسا کرنے میں ان کے دو مقصد ہوتے ہیں، یعنی ایک تو ذاتی زیبائش، دوسرے آڑے وقت کے لئے دولت رکھ چھوڑنا[۱] ان دونوں مقاصد کے درمیان تفریق قایم رکھنا ضروری ہے کیونکہ قیمتی فلزات اندوختوں کی تعریف میں صرف اسی وقت آئیں گے جب ان کا مقصد محض دولت کو جمع کرنا ہو۔

ہندوستانیوں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ زیورات کے شوقین ہیں اور اپنی آمدنی کا بڑا حصہ ان پر صرف کر دیتے ہیں۔ اس قسم کا اعتراض انگریز مزدوروں پر بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ شراب نوشی کے عادی ہیں اور اپنی آمدنی کا بڑا حصہ بیر پر صرف کرتے ہیں جبکہ اس آمدنی کے دوسرے بہتر مصرف ہو سکتے ہیں ہر دو صورتوں کی اصلاح کا انحصار آمدنی کو دوراندیشی اور سلیقے سے خرچ کرنے پر ہے بنک کاری کی ترقی جب شراب نوشی کی عادت کو نہیں چھڑا سکی تو اندوختہ کرنے کی عادت کو کیا چھڑا سکتی ہے (البتہ جس حد تک زیورات کی حیثیت بنکوں کی امانتوں کی سی ہے یہ ہو سکتا ہے کہ بنک کاری کی ترقی سے زیورات کی شکل میں تعطل اصل کی شدت کم ہو جائے)۔ ایک اور اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستانی کسان اپنے اور اپنی بیوی کے لئے زیورات پر روپیہ صرف کرتا ہے جبکہ یہی روپیہ بہتر اور زیادہ غذا کی فراہمی اور مویشیوں کی خریدی پر صرف کیا جا سکتا تھا۔ بعض صورتوں میں رسم و رواج کی پابندیاں سونے اور چاندی کے استعمال کو ضروری بنا دیتی ہیں اور معاشری تقریبوں میں جو مذہب اور روایات

۱؎۔ ببنگ ٹن اسمتھ کمیٹی اس بات کی عملی افادیت کو تسلیم کرتی ہے کہ عورت کو خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان اپنے زیر استعمال سونے چاندی یا سکوں کے بنے ہوئے زیورات پر پورا حق مالکانہ حاصل ہوتا ہے۔

جائز قرار دیتے ہیں قیمتی فلزات کا بہت اہم حصہ ہوتا ہے حقیقت میں یہ صورت حال بہت افسوسناک ہے لیکن اس کی اصلاح اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ ہندوستانیوں میں شعور پیدا ہو اور تعلیم اور عام بیداری معاشری و مذہبی رسوم کی جکڑ بندیوں کو کمزور کر دے۔ اس کے علاوہ یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ روپے کے استعمال کی مذکورۂ بالا مثال میں محض دولت کے بجا اور بے جا صرف سے بحث کی گئی ہے اور اس کو یہ ثابت کرنے سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ دولت کو جمع کرنے کے مقصد سے اندوختہ کیا جا رہا ہے۔

مذکورۂ بالا دلائل کو مان لینے کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ کچھ نہ کچھ اندوختہ کرنے کی عادت موجود ہے۔ چنانچہ یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ یہ خرابی کسی حد تک موجود ہے اب یہ مناسب ہوگا کہ اس کے اسباب پر غور کیا جائے۔ ہم ایک سے زائد مرتبہ اس بات کا ذکر کر چکے ہیں کہ زر کا ناقص نظام بھی اس کا ایک سبب ہے۔
۵۱۰ لیکن اصل سبب یہ ہے کہ ماضی میں ہندوستان کو متعدد حملوں کا سامنا کرنا پڑا ملک میں ہر طرف بدانتظامی تھی اور جان و مال غیر محفوظ تھے۔ جان و مال کے غیر محفوظ رہنے کے زمانے میں جو عادت پڑ گئی تھی اس کا سلسلہ امن و امان قائم ہو جانے کے باوجود اب بھی جاری ہے۔ اس صورت حال کی اصلاح کے راستے میں اس وقت جو چیزیں حائل ہیں یہ ہیں کہ آبادی ناخواندہ ہے اور بنک کاری کی کافی سہولتیں موجود نہیں ہیں۔
ناظم زر کی حالیہ رپورٹوں میں اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا گیا ہے کہ گزشتہ چند سالوں سے سونے کی درآمد میں قابل لحاظ کمی ہو گئی ہے۔ جنگ کے پہلے کے پانچ سال میں سونے کی خالص درآمد کا سالانہ اوسط ۲۸ کروڑ ۱۵ لاکھ روپے تھا اس کے مقابلے میں ۲۷-۱۹۲۶ء اور ۲۸-۱۹۲۷ء میں سالانہ اوسط صرف ۱۸ کروڑ ۷۵ لاکھ روپے رہا۔ ۲۹-۱۹۲۸ء میں خالص درآمد کی مالیت ۱۴ کروڑ ۲۲ لاکھ روپے تھی جس سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ سابقہ سال کے مقابلے میں درآمد تقریباً ایک تہائی کے برابر کم ہو گئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۳۱ء سے ہندوستان سے سونے کی خالص برآمد کثیر مقدار میں ہونے لگی ہے۔ اس بات سے نیز حالیہ سرکاری قرضوں کی خاصی کامیابی سے یہ پتا چلتا ہے کہ تشغیل اصل کی عادت لوگوں میں بڑھتی جا رہی ہے۔ لیکن زیر بحث مسئلہ صرف جزوی حد تک

حل ہوا ہے اور اس کے مکمل حل کے لیے ابھی ہم کو تعلیم عام کرنا اور بنک کاری کی سہولتیں فراہم کرنا ہیں۔ عوام کو ترغیب دلا کر ان کے اندوختوں کو پیدا آور کاموں میں لگانے کا مسئلہ حال ہی میں خاص طور پر اہم بن گیا ہے۔ کیونکہ اگر اس بات میں کوئی اصلیت ہو سکتی ہے کہ اندوختہ کرنے کی عادت زر کا انتظام اچھا نہ ہونیکی وجہ سے فروغ پا رہی ہے تو یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ زر کا کوئی نظام خواہ وہ کتنا ہی اعلیٰ درجے کا کیوں نہ ہو قابل اطمینان طور پر اس وقت تک کام نہیں کر سکتا جب تک کہ اندوختے باہر نہ نکالے جائیں۔ چنانچہ اگر اندوختہ کرنے کا سلسلہ جاری رہا تو زر کے محکمے کو کرنسی اور اعتبار کا ممکنہ طور پر بہترین انتظام کرنے میں انتہائی دشواریاں پیش آئیں گی۔ کہا یہ جاتا ہے کہ بنک کاری کی توسیع سے اندوختہ کرنے کی عادت کم ہو جائے گی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ خود اندوختہ کرنے کی عادت بنک کاری کی ترقی میں حائل ہے۔ کیونکہ جب عوام ہی اپنا روپیہ بنکوں میں رکھنے کے لیے تیار نہ ہوں بنک کس طرح چل سکتے ہیں؟ لیکن دوسری طرف یہ سوال بھی مساوی طور پر معقول ہے کہ اگر کوئی بنک ہی موجود نہ ہو تو لوگ کس طرح اپنا روپیہ بنک میں رکھیں گے؟ اس طرح یہ عمل اور ردِ عمل کی صورت ہے اور اس کی اصلاح کی واحد صورت یہ ہے کہ اعتباری ادارے حتی الامکان زیادہ سے زیادہ تعداد اور مختلف قسم کے قایم کئے جائیں تاکہ وہ لوگوں کی مختلف ضروریات اور مذاق کو پورا کر سکیں اور جو کسر رہ جائے گی وہ تعلیم اور مسلسل پروپگنڈے کے ذریعے سے پوری ہو جائے گی۔

۶۵۔ اندوختوں کی عادت چھڑانا

بنک کاری کے موجودہ نظام کی اصلاح و ترقی اور اندوختوں کی عادت چھڑانے کی غرض سے مختلف قسم کے مشورے دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض پر فرداً فرداً غور کیا جائے تو ممکن ہے کہ وہ ہیچ معلوم ہوں، لیکن ان سب پر مجموعی طور پر عمل کیا جائے تو ان کا لازمی طور پر کافی اچھا نتیجہ نکلے گا۔ ان مشوروں میں سے چند کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

(۱) ڈاکخانہ ملک میں ہر جگہ موجود ہے۔ شغل اصل کی عادت کو فروغ دینے کے لیے اس ادارے کو زیادہ سے زیادہ کام میں لانا چاہئے۔ یہ ادارہ اس

میدان میں اس وقت جو کام کر رہا ہے اس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اور اس سلسلے میں چند ۵۱۱
مشورے بھی دیے جا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے مشورے یہ ہیں ۔
(ا) ڈاکخانے کے پنج سالہ کیش سرٹیفیکٹ کا سود ایک سال کے بعد ادا کرنے کے بجائے جیسا کہ اس وقت کیا جا رہا ہے ہر سہ ماہی کے ختم پر دیا جائے۔ (ب) مشترکہ قابضوں، بنکوں اور امداد باہمی کی انجمنوں کے لیے کیش سرٹیفیکٹ کی مجموعی مقدار کی جو حد مقرر کی گئی ہے وہ دس ہزار روپے سے بڑھا کر بیس ہزار روپے کر دی جائے۔
(ج) سیونگ بنکوں کی پاس بک دو زبانوں والی ہونی چاہیے جن میں سے ایک انگریزی ہو اور دوسرے صوبے کے اس حصے کی اہم زبان ہو جس میں کیش سرٹیفیکٹ جاری کرنے والا صدر ڈاکخانہ واقع ہو۔ چکوں کے ذریعے سے امانتیں رکھانے اور سیونگ بنکوں کی رقمیں بذریعۂ چک نکالنے کی اجازت ہونی چاہیے۔
(د) ڈاکخانے کو چاہیے کہ شغل اصل کرنے والوں کے لیے سرکاری تمسکات کی خرید و فروخت اور ان کو بحفاظت رکھوانے کی مزید سہولتیں مہیا کرے۔
(۲) ہلٹن ینگ کمیشن کے مشورے کے مطابق طلائی سرٹیفیکٹ جس قدر جلد ممکن ہو جاری کئے جائیں۔
(۳) بہار و اڑیسہ کی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ خصوصی زنانی کیش سرٹیفیکٹ "استری دھن سرٹیفیکٹ" کے نام سے جاری کئے جائیں اور یہ صرف عورتوں کے ہاتھ مروجہ شرح سود سے کچھ زیادہ شرح سود پر فروخت کیے جائیں[1]۔
(۴) مرکزی حکومت، بلدیوں اور مقامی حکومتوں کو چاہیے کہ حتی الامکان چکوں کے ذریعے سے مطالبات ادا اور وصول کریں۔
(۵) کفایت شعاری کو فروغ دینے اور چھوٹی رقوم پس انداز کرنے والے

۱۔ سر بی۔ این۔ مترنے بنگلور میں طلبہ کے ایک اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے یہ نصیحت کی کہ وہ اپنے یہاں کی عورتوں کو تفہیم کرائیں کہ ہر اونس سونا جس کا وہ بحیثیت زیورات استعمال ترک کریں گی ملک کو معاشی آزادی دلانے میں کام آئے گا۔

کو شغل اصل کے محفوظ اور نفع بخش طریقوں سے واقف کرانے کی غرض سے انگلستان کی طرح یہاں بھی نیشنل سیونگس ایسوسی ایشن قائم کیے جائیں۔

۶۶۔ بنک کاری کی سہولتوں کی توسیع۔

دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں ہندوستان میں ملک کی حقیقی ضرورتوں کے لحاظ سے بنکوں کی تعداد بالکل ناکافی ہے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۵ء کو ہندوستان کے طول و عرض میں بنکوں کے صدر دفتر ۲۸۵ اور ان کی شاخیں ایجنسیوں کو شامل کر کے ۹۷۴ تھیں[1]۔ ۱۹۲۸ء میں سارے ہندوستان میں صرف ۳۲۹ شہر ایسے تھے جن میں ایک بنک یا بنک کی شاخ یا ایجنسی قائم تھی۔ جملہ ۲۳۰۰ شہروں میں سے صرف ۳۲۹ شہروں میں بنکوں کی موجودگی یہ ثابت کرتی ہے کہ ہندوستان میں تجارتی بنک کاری کو ترقی و توسیع دینے کی سخت ضرورت ہے[2]۔

۱۲ھ مندرجہ ذیل جدول[3] میں مختلف ملکوں کی کساد بازاری سے پہلے کی بنک کاری کی سہولتوں کا دلچسپ طریقے پر موازنہ کیا گیا ہے۔

۳۱ دسمبر ۱۹۲۴ء کو ہندوستان اور بیرونی ممالک کے بنک کاری کے دفاتر

ملک کا نام	بنک کاری کے دفاتر کی تعداد	بنک کاری کے دفاتر کی تعداد بحساب فی ملین آبادی	بنک کاری کے دفاتر بحساب فی ۲،۰۰۰ مربع میل
سلطنت متحدہ	۱۱۹۷۶	۲۸۵	۳۶۲
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۳۰۰۰۰	۲۵۶	۲۰

[1] ان شاخوں کی تقسیم حسب تفصیل ذیل تھی:۔ رزرو بنک کے شعبۂ بنک کاری کے ۸ دفتر اور شاخیں امپیریل بنک کی ۱۶۳ شاخیں، مبادلہ بنکوں کی ۹۵ شاخیں اور ہندوستانی مشترک سرمایہ بنکوں کی ۷۰۸ شاخیں۔

[2] بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ صفحہ (۵۹۹)۔

[3] دیکھو صدارتی خطبہ پرنسپل ایل، ٹاٹا ان انڈین اکنامک کانفرنس اجلاس کلکتہ ۱۹۲۷ء۔

جاپان	۷۴۶۵	۹۲	۸۰
کینیڈا	۴۸۸۳	۴۴۸	۳
ہندوستان	۵۹۶	۲	۱

بعد کے زمانے کے اعداد پر غور کرنے سے ان ملکوں کی صورت حال ایک دوسرے کے مقابلے میں بڑی حد تک بدستور قائم معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً سنہ ۱۹۳۱ء میں ریاستہائے متحدہ میں ۲۲۰۷۱ بنک کاری کے ادارے تھے جن کے اصل اور محفوظ سرمایے کی مقدار ۳۵ ارب ۱۴ کروڑ روپیے اور امانتوں کی مقدار ۱۳۷ ارب ۸۸ کروڑ روپیے تھی۔ اس کے مقابلے میں سلطنت متحدہ کے اعداد یہ تھے۔ ۱۲۵۵۷ ادارے ۳ ارب ۱۹ کروڑ روپیے اصل اور ۳۲ ارب ۲۶ کروڑ روپیے امانت۔ ہندوستان میں سنہ ۱۹۳۵ء میں ۱۲۵۹ بنک کاری کے دفتر تھے (جن میں شاخیں اور ایجنسیاں بھی شامل تھیں)۔ اس سال بنک کی امانتوں کی مقدار ۲ ارب ۴۵ کروڑ روپیے تھی جس کے منجملہ ۹۶ کروڑ روپیے مبادلہ بنکوں میں بطور امانت تھے۔ جیسا کہ سرایم، وسویسوریا نے بتلایا ہے بنک کاری کی امانتوں کا فی کس اوسط ریاستہائے متحدہ میں ۱۱۲۳ روپیے کینیڈا میں ۸۰۴ روپیے، سلطنت متحدہ میں ۶۹۸ روپیے، جاپان میں ۲۱۵ روپیے اور ہندوستان میں ۹ روپیے ۴ آنے ہے[1]۔

جہاں بنک کاری کے اداروں کی تعداد بڑھانا قطعاً ضروری ہے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ مختلف قسم کے ادارے قائم کئے جائیں۔ ہندوستانی حالات کے لیے معمولی قسم کی مشترک سرمایہ بنک کاری موزوں نہیں ہو سکتی۔ دوسرے اس سے زیادہ موزوں ادارے جن کی یہاں آزمایش کی جا سکتی ہے جرمنی اور اٹلی کے مقبول عام امداد باہمی کے بنک ہیں۔

[1] ۔ میکیوسرایم وسویسوریا کی کتاب (Planned Economy for India) سنہ ۱۹۳۴ء صفحہ ۱۸۹

یہ مقبول عام ادارے حصوں کی رقم ممکنہ طور پر چھوٹی رکھتے ہیں تاکہ چھوٹے شغل اصل کرنے والے کو ترغیب ہو۔ اس کے علاوہ مقسوم کا تعین بعض اوقات بذریعۂ قانون اور بعض اوقات بذریعۂ رواج ہوتا ہے۔ غریب شغل اصل کرنے والوں کے لئے خاص سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں تاکہ ان کو رقوم پس انداز کرنے کی ترغیب ہو اور ان کو ادنیٰ شرح سود پر قرضہ دیا جاتا ہے۔ ایسے اغراض کے لیے جن کے متعلق بنک کی منظوری حاصل کر لی گئی ہو شخصی اعتبار پر بھی قرضے دیے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں اس قسم کے ادارے معمولی قسم کے مشترک سرمایہ بنکوں کے مقابلے میں زیادہ کامیاب
۵۱۳ ثابت ہو سکتے ہیں[1]۔ غرض اب یہ رزرو بنک آف انڈیا کا کام ہے کہ وہ دانائی کے ساتھ ہندوستان کی بنک کاری کی ترقی کی رہنمائی کرے۔

رزرو بنک کی ۱۹۳۷ء کی سالانہ رپورٹ سے یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ ہندوستان میں بنکوں کی شاخیں روز افزوں ترقی کر رہی ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں درج فہرست بنکوں کی شاخوں، ادائی کے دفتروں وغیرہ کی مجموعی تعداد ۸۲۸ سے بڑھ کر ۱۱۳۸ ہو گئی اس کے مقابلے میں سابقہ سال میں مجموعی تعداد ۷۲۳ سے بڑھ کر ۸۲۸ ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں مزید ترقی کی ضرورت ہوگی قبل اس کے کہ ہندوستان میں مشترک سرمایہ بنکوں کا جال کافی پھیلا ہوا ہو[2]۔

۶۷۔ ہندوستان کے لیے بنکرس انسٹی ٹیوٹ

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ۱۹۱۳ء-۱۴ء کے بنکوں کے دوالوں کے اسباب میں سے ایک سبب یہ تھا کہ ہندوستان میں لوگ جدید بنک کاری سے عام طور پر ناواقف تھے۔ ۲۰ راپریل ۱۹۲۸ء کو ہندوستانی کمپنیوں کے قانون کے بموجب بمبئی میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف بنکرس کی رجسٹری کا مقصد یہی تھا کہ اس خرابی کو کسی حد تک دور کیا جائے۔ اس ادارے کے

---

[1] دیکھو گپتے کی کتاب محولہ صفحہ ۲۹-۳۲۔

[2] دیکھو رزرو بنک کی سالانہ رپورٹ (۱۹۳۷ء) صفحہ ۱۵-۱۶۔

اصل مقاصد یہ ہیں :- (۱) جو لوگ عام طور پر بنک کاری کے کاروبار میں خصوصاً ہندوستان میں مصروف ہیں یا اس کاروبار سے تعلق رکھتے ہیں ان کے کردار، حیثیت اور مفاد کا تحفظ اور نگرانی کرنا - اور ان پر اثر انداز ہونے والے مسائل پر غور کرنا - (۲) بنک کاری کے نظریے کی تحقیق و تعلیم کو فروغ دینا اور اس مقصد سے امتحانوں کی ایک اسکیم مرتب کرنا اور صداقت نامے، وظائف اور انعامات دینا - (۳) بنک کاری اور متعلقہ مضامین کے بارے میں معلومات مہیّا کرنا اور لکچروں، مباحث، رسالوں، کتابوں کے ذریعے اور عام اداروں یا افراد سے بذریعۂ مراسلت تکمیل نصاب کا انتظام کرنا - (۴) ہندوستان میں بنک کاری کے موضوع سے متعلق اعداد و شمار اور دوسری معلومات فراہم اور شایع کرنا[1]

اس انسٹی ٹیوٹ کے زیر نگرانی جو امتحانات ہوتے ہیں وہ کافی مستند سمجھے جاتے ہیں - اس انسٹی ٹیوٹ سے ایک رسالہ بھی شایع ہوتا ہے - اس ادارے کے زیر سرپرستی بمبئی اور کلکتے میں جن لکچروں کا انتظام کیا گیا تھا ان کے سامعین کی تعداد کافی بڑی تھی - بنک کاری کی تعلیم کی جو بھی سہولتیں اس وقت موجود ہیں وہ پریزیڈنسی کے شہروں تک محدود ہیں - جیسے جیسے مالی حالت اجازت دے ویسے ویسے تکمیلِ نصاب بذریعۂ مراسلت، کتب خانوں کی شاخوں، مقامی تقریروں اور کالجوں کے ذریعے سے ان سہولتوں کو اندرون ملک وسیع کرنا چاہیئے - بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی یہ سفارش کرتی ہے کہ اس انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے مختلف مرکزوں میں اس کے مقررہ درسی مضامین میں جامعاتی تقریروں اور تکمیل نصاب تعلیم کا انتظام ہونا چاہیئے[2]

---

[1] دیکھو ہندوستانی بنکروں کے ادارے کی یادداشت اور رکنیت کے قواعد (۱۹۲۸ء) -

[2] دیکھو رپورٹ بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی کمیٹی، صفحہ (۶۱۷) -

۵۱۴

گیارھواں باب

مالیہ اور محصولات

تمہیدی تبصرہ[۱]

۱۔ حالیہ سالوں میں ہندوستانی مالیے میں بہت نمایاں تبدیلیاں ہوگئی ہیں۔ اِن تبدیلیوں میں سے اکثر براہ راست یا بالواسطہ جنگ عظیم سے منسوب کی جاسکتی ہیں۔ جنگ عظیم سے پہلے تمام ہندوستان کے لیے ایک ہی موازنہ ہوتا تھا اور صوبہ واری حکومتوں کو اپنے طور پر ٹکس لگانے کے اختیارات حاصل نہ تھے۔ مقامی جماعتوں کے محدود اختیارات کو چھوڑ کر صرف مرکزی حکومت ہی ٹکس لگانے کا اختیار رکھتی تھی۔ البتہ جنگ عظیم کے بعد سے صوبہ واری مالیہ مرکزی مالیے سے بالکل علٰحدہ ہوگیا ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں محاصل کے مختلف ذرائع کا تناسب ایک دوسرے کے مقابلے میں کافی بدل گیا ہے۔ اس دوران میں مالگزاری کی دیرینہ غالب اہمیت گھٹ گئی ہے اور محاصل کے دوسرے ذرائع زیادہ اہم ہوگئے ہیں۔[ل]

ل۔ چالیس سال پہلے (۱۸۸۳ئہ۔ ۸۴ئہ میں) مالگزاری ہی پر حکومت کا سارا دار و مدار تھا۔ چنانچہ اس کا تناسب مجموعی آمدنی کے مقابلے میں (۵ء۳۱ء۵) فیصد تھا۔ لیکن اب (۱۹۲۳ئہ۔ ۲۴ئہ میں) یہ تناسب گھٹ کر صرف ۵ء۷ء۲۰ فیصد ہوگیا ہے۔ دوسری طرف کروڑ گیری کا (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۸۶۵ پر دیکھئے)

چند سال سے ہندوستان کا مالی نظام دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے مالی نظام کے بہت کچھ مشابہ ہوتا جارہا ہے جس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ اس کے محصولوں کا تنوع بڑھ رہا ہے اور انکم ٹکس جیسے بلاواسطہ محصول زیادہ سے زیادہ عاید کیے جارہے ہیں ۔ ہندوستانی مالیے میں ایک اور بڑی تبدیلی ریلوں کی صورت حال کے متعلق واقع ہوئی ۔ چنانچہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ کس طرح ریلیں شروع میں ملک کی دولت کو لوٹنے کا آلۂ کار تھیں اور بعد میں ترقی کرکے کچھ آمدنی کا ذریعہ بن گئیں[۱] کچھ زمانے پیشتر افیون کو موازنے کی آمدنی کی مدمیں بہت نمایاں جگہ حاصل تھی اور وہ اہمیت کے لحاظ سے مالگزاری کے بعد دوسرے درجے پر تھی ۔ لیکن جب سے ہندوستان نے انسانی ہمدردی کی خاطر اپنے ذاتی نفع کو قربان کردیا اس مد کی آمدنی میں کافی کمی ہوگئی ہے اور ۱۹۳۵ء سے موازنے کی اس مد میں جو قلیل آمدنی بتائی جارہی ہے وہ بھی صرف ہندوستان ہی میں افیون کے صرف پر چنگی کا محصول عائد کرنے سے وصول ہوتی ہے ۔ ۵۱۵

۲ - ہندوستانی محاصل کی تبویب

ہندوستانی محاصل جو ٹکس کے ذریعے وصول کیے جاتے ہیں ٹکس لگانے والے مقتدر اداروں کے حلقۂ اثر کے لحاظ سے تین جداگانہ مدوں میں ترتیب دیے جاسکتے ہیں یعنی مرکزی، صوبہ واری اور مقامی (بلدیوں اور مقامی مجلسوں کے محاصل) ۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) تناسب جو ۲ فیصد سے بھی کم تھا اب بڑھ کر ۱۲ فیصد ہوگیا ہے اور انکم ٹکس کا تناسب ۲۳ء۱ سے بڑھ کر ۱۲٫۳۰ فیصد ہوگیا ہے ۔ محصول چنگی (بہ شمول محصول نمک کے) کا تناسب ۲۵٫۰۷ فیصد سے گھٹ کر ۲۱٫۶۷ فیصد ہوگیا ہے جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ نمک کا محصول گھٹا دیا گیا ہے ۔ دوسری وجہ بلاشبہ یہ ہے کہ نشیات استعمال کرنے والوں کے خلاف سخت کارروائی کی گئی ہے ۔ محصول اشٹامپ (بہ شمول رجسٹری جائداد کے ٹکس کے) اور مقامی محصولوں کے تناسب میں زیادہ تفاوت نہیں ہوا ہے ۔ دیکھو ہندوستانی محصول کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۴۹۶ ۔ اس فیصد تناسب کا حساب لگانے میں کمیٹی نے ہندوستان کی مجموعی سرکاری آمدنی کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ صرف ٹکس بہ شمول مقامی ٹکس کی مد کی جملہ آمدنی کو محسوب کیا

[۱] لیکن کساد بازاری کے زمانے میں تھوڑی بہت آمدنی کا ملنا بھی موقوف ہوگیا ۔ دیکھو باب (۵) فصل (۱۵) ۔

لیکن عام تبویب کی سب سے سادہ شکل حسب ذیل ہے[1]

(۱) مالگزاری۔ اس مسئلے پر پہلے بحث کی جاچکی ہے کہ آیا مالگزاری لگان ہے یا ٹکس اور یہ بھی بیان کیا جاچکا ہے کہ اس کو لگان کی بجائے ٹکس کہنے کے زیادہ معقول وجوہ ہیں[2] اگر اس خیال کو تسلیم کر لیا جائے تو مالگزاری کی حیثیت انکم ٹکس کی طرح راست محصول کی ہوگی۔ لیکن چونکہ اس بحث میں کسی قطعی فیصلے پر پہنچنا مشکل ہے اس لیے اس پیچیدہ مسئلے کو حل کرنے کا غالباً بہتر طریقہ یہی ہے کہ مالگزاری کو محاصل کی ایک جداگانہ اور خاص قسم شمار کیا جائے۔

(۲) محصولی آمدنی۔ بلاواسطہ اور باواسطہ محصولوں کی تمام معمولی ذیلی قسمیں اس مد میں محسوب ہوتی ہیں۔ اول الذکر میں انکم ٹکس اور دوسرے مشخصہ محصول اور وہ سب ابواب اراضی جو صوبہ واری محصول شمار ہوتے ہیں شامل ہیں۔ یہاں کے باواسطہ محصولوں کی اہم شکلیں نمک کا محصول، چنگی، کروڑگیری، اسٹامپ اور رجسٹریشن ہیں۔

(۳) سرکاری اجارے۔ اس مد میں جنگلات اور افیون کی آمدنیاں داخل ہیں۔

(۴) تجارتی خدمات۔ مثلاً ریلوے، آب پاشی، تعمیرات عامہ، ڈاک اور تار۔

(۵) متفرق آمدنی۔ مثلاً دیسی ریاستوں کی طرف سے ادا کی ہوئی رقمیں اور محکمہ واری آمدنیاں وغیرہ۔

(۶) مقامی اداروں، صوبہ داری حکومتوں اور دیسی ریاستوں کو دیئے ہوئے قرضوں کا سود۔

۳۔ محاصل کے عام اعداد

۵۱۶ محاصل کی بحث کی تمہید کے طور پر ہم ذیل میں ۱۹۳۶ء-۳۷ء کے صوبہ واری و مرکزی محاصل کی اہم مدیں درج کرتے ہیں۔

[1] دیکھو کے، ٹی، شاہ کی کتاب Sixty years of Indian Finance (دوسرا ایڈیشن) صفحہ ۲۱۴ - ۲۱۵۔

[2] دیکھو جلد اول باب (۱۲) فصل (۲۸)

ہندوستان کے (مرکزی و صوبہ واری) محاصل کا عام گوشوارہ

سنہ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء[1]

(ہزار روپے کے حساب سے)

محاصل کی مدیں	مرکزی	صوبہ واری
محاصل کی اہم مدیں :-		
کروڑگیری	۵۳ر۵۶ر۵۱	—
انکم ٹیکس	۱۵ر۳۳ر۵۱	۳ر۷۳
نمک	۸ر۸۱ر۳۶	۲ر۰۰[2]
افیون	۴۷ر۶۶	—
مالگزاری	۱۷ر۴۲	۳۱ر۷۱ر۱۳
چنگی	۳۸ر۶۰	۱۴ر۹۸ر۵۲
اسٹامپ	۳۹ر۰۰	۱۱ر۴۹ر۴۴
جنگلات	۱۴ر۸۱	۴ر۲۵ر۲۰
رجسٹریشن	۱ر۱۴	۱ر۱۶ر۹۱
دیسی ریاستوں سے وصول شدہ رقمیں	۷۳ر۹۲	

۱ - دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ حکومتِ ہند کے مالیے اور محاصل کے حسابات (سنہ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء) جدول ۵ اور ۸ -

۲ - یہ نمک کے درآمدی محصول کا وہ حصہ ہے جو صوبہ واری حکومتوں نے لگایا تھا -

درج فہرست ٹکس	-	۵۳،۸۴
میزان	۸۰،۰۵،۰۳	۶۴،۲۰،۷۷
ریلویز (خالص آمدنی)	۳۲،۶۸،۶۶	۱،۴۲
آب پاشی (خالص آمدنی)	— ۵،۶۵	۹،۹۴،۶۴
ڈاک اور تار (خالص آمدنی)	-۹۳،۳۶	—
(دیئے ہوئے قرضوں کا) سود	۴۰،۲۹	۱،۶۵،۵۲
سیول نظم ونسق	۱۰۳،۳۹	۶،۲۲،۴۹
کرنسی اور ٹکسال	۱،۱۸،۷۱	—
کارہائے سیول	۳۱،۳۸	۲،۳۳،۷۵
متفرق	۹۶،۵۷	۱،۸۹،۹۸
فوجی آمدنی	۵،۲۲،۲۶	—
مرکزی اور صوبہ واری حکومتوں کے درمیان رقوم کی منتقلی	-۴،۹۰،۷۵	۴،۹۰،۷۵
غیر معمولی مدیں :- غیر معمولی آمدنی	۶۷	۱،۱۴،۳۴
میزان	۶۷	۱،۱۴،۳۴
۵۱۷ جملہ محاصل	۱،۱۷،۸۳،۸۹	۹۲[۱]،۳۳،۷۷

لہ ۔ اس میں ۹۹۲،۱۰ روپے کی وہ آمدنی بھی شامل ہے جو انگلستان سے وصول ہوئی۔

۵۱۷ **۴ محصول کروڑگیری کی تاریخ۔**

(الف) جنگ سے پہلے کا درآمدی محصول۔ حالیہ زمانے (سنہ ۱۹۲۴ء) تک ہندوستانی محصول آزاد تجارت کی اساس پر نہایت سختی کے ساتھ قائم رہا اسی وجہ سے درآمدی محصول بہت ہی محدود پیمانے پر عائد کیا جاتا تھا۔ غدر سے پہلے تک درآمدی محصول کی شرح مکمل مصنوعات پر ۵ فیصد اور خام اشیاء پر ۲ ½ فیصد تھی۔ بیرونی جہازوں کے ذریعے جو سامان درآمد کیا جاتا تھا اس پر سنہ ۱۸۴۸ء تک معمولی شرح سے دوگنی شرح کے حساب سے محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس تاریخ کے بعد سے جہازوں کی نقل وحمل میں قومیت کے مسئلے کو نظر انداز کر دیا گیا۔ البتہ سنہ ۱۸۵۹ء تک مختلف ملکوں کے سامان پر مختلف شرحوں سے محصول لگایا جاتا تھا اور غیر برطانوی سامان کے محصول کی شرح معمولی شرح سے دوگنی تھی۔ غدر کے سلسلے میں حکومت پر جو مالی بار پڑا اس کی وجہ سے غدر کے بعد یہ فرق و امتیاز بھی اٹھا لیا گیا اور محصول کی عام شرح بڑھا کر یکساں طور پر ۱۰ فیصد مقرر کی گئی۔ درآمدی محصول گھٹا کر سنہ ۱۸۶۴ء میں ۷ ½ فیصد اور سنہ ۱۸۷۵ء میں ۵ فیصد کر دیا گیا۔ آخر میں چل کر سنہ ۱۸۸۲ء میں جب کہ مانچسٹر کے مفاد کے خیال سے برطانوی حکومت کی طرف سے دباؤ ڈالا گیا تمام درآمدی محصول اس وقت کے وائسرائے لارڈ نارتھ بروک کی مخالفت کے باوجود منسوخ کر دیے گئے۔

اس طرح سچ پوچھو تو سنہ ۱۸۸۲ء تا سنہ ۱۸۹۴ء میں کسی قسم کا درآمدی محصول نہیں لگایا گیا۔ لیکن سنہ ۱۸۹۴ء میں جب کہ روپے کی شرح مبادلہ کے گر جانے کی وجہ سے حکومت کی مالی حالت خراب ہو گئی تو بلحاظ قیمت ۵ فیصد کا ایک عام درآمدی محصول عائد کیا گیا۔ لیکن سوت، سوتی کپڑے اور بعض دوسری اشیاء کو اس محصول سے مستثنیٰ رکھا گیا۔ سنہ ۱۸۹۹ء سے سنہ ۱۹۰۴ء تک جرمن، آسٹریا، ڈنمارک وغیرہ کی شکر کی درآمد پر چند متوازن محصول عائد کیے تاکہ ان ممالک میں شکر کو جو مالی امداد مل رہی تھی اس کی تلافی ہو سکے۔ بعد یہ محصول بھی ہٹا لیے گیے۔ چنانچہ اس قسم کا آخری محصول سنہ ۱۹۱۲ء میں منسوخ کیا گیا۔ اس قسم کے محصولوں کا اثر صرف یہ ہوا کہ جرمنی اور آسٹریا سے شکر کی جو درآمدی تجارت ہو رہی تھی وہ موقوف ہو کر جاوا اور موریشش سے ہونے لگی۔ کیونکہ موخر الذکر علاقوں میں مالی امداد کا طریقہ رائج نہیں تھا۔ جنگ سے پہلے کے زمانے میں

درآمدی محصول میں دوسری اہم تبدیلیاں ۱۹۱۰–۱۱ء میں ہوئیں جب کہ افیون
کی مد کی آمدنی کی کمی کی تلافی کرنے اور بڑھے ہوئے مصارف کو پورا کرنے کی غرض سے
چاندی یا چاندی کے سکوں اور پٹرولیم کی درآمد پر زائد محصول عائد کیے گئے۔

۱۸۹۴ء کے اواخر میں یہ تصفیہ کیا گیا کہ سوت اور سوتی کپڑوں پر ۵ فیصد
درآمدی محصول لگایا جائے اور اسی کے ساتھ مانچسٹر کو خوش کرنے کے لیے ہندوستانی
گرنیوں میں تیار کیے ہوئے ۲۰ یا ۲۰ سے زیادہ تاروں کے سوت پر بھی ۵ فیصد محصول
لگا دیا گیا۔ لیکن چونکہ دیسی سوت پر اس طرح کی چنگی لگانے سے لنکاشائر کا اطمینان
نہیں ہوا اس لئے ۱۸۹۶ء میں سوتی کپڑوں کے درآمدی محصول کو گھٹا کر ۳½ فیصد
کر دیا گیا اور ہندوستانی گرنیوں میں تیار شدہ تمام کپڑوں پر بھی اسی شرح سے
چنگی لگائی گئی۔ لیکن دیسی یا بدیسی سوت کو ہر قسم کے محصول سے قطعاً مستثنیٰ کر دیا
گیا۔

اس کارروائی کو ہندوستان میں سخت ناپسند کیا گیا۔ بظاہر یہ خیال کیا جا رہا ۵۱۸
تھا کہ چنگی جہاں مانچسٹر کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا رہی تھی وہاں ہندوستان کے لئے بھی
نقصان رساں تھی۔ جیسا کہ مسٹر جیمس وسٹ لینڈ نے بتلایا ہندوستانی سوتی کپڑوں کا
۹۴ فی صد حصہ مانچسٹر سے مسابقت کر ہی نہیں سکتا تھا، کیونکہ وہ موٹے اور بھدی قسم
کے تھے (یعنی ۲۴ یا ۲۴ سے کم تاروں کے سوت سے تیار کیے جاتے تھے)۔ اس
کے برخلاف مانچسٹر کو مہین اور عمدہ کپڑے بنانے کا قطعی اجارہ حاصل تھا۔ اس کے علاوہ
مانچسٹر زیادہ تر ایسے کپڑوں کا بیوپار کر رہا تھا جو کم و بیش ۳۰ تاروں والے سوت
سے تیار کیے جاتے تھے یا اس سے بھی بہتر اور زیادہ مہین ہوتے تھے اور ہندوستان
بہت تھوڑی مقدار میں اور وہ بھی بہت مشکل سے صرف ایسے کپڑے تیار کر سکتا تھا
جن کے سوت میں ۲۶ یا ۲۶ سے کچھ ہی زیادہ تار ہوتے تھے۔ آخر میں یہ کہ درآمدی
محصول کو ۵ فی صد گھٹا کر ۳½ فی صد کر دینے سے بدیسی کپڑوں کے متمول خریداروں
کو فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ اس کے برعکس ۳½ فیصد کے محصول چنگی سے غریب طبقے
کے خریداروں کو سخت نقصان پہنچ رہا تھا۔ محصول چنگی کی مخالفت میں جو دلیل پیش
کی گئی تھی وہ ناقابلِ تردید تھی۔ لیکن جیسا کہ مرکزی قانون ساز کونسل کے ایک ہندوستانی

رکن نے لطیف پیرائے میں کہا تھا، جب تک لنکاشائر کے ۶۰ نمایندے پارلیمنٹ کے رکن رہیں گے اس وقت تک برطانوی حکومت بھی ۶۰ معقول دلائل اس محصول کو برقرار رکھنے کی تائید میں پیش کرے گی۔ چنانچہ عوام کی مسلسل مخالفت کے باوجود یہ محصول باقی رہا یہاں تک کہ ۱۹۲۶ء میں اس کو قطعی طور پر منسوخ کر دیا گیا۔

(ب) جنگ سے پہلے کا برآمدی محصول۔ جنگ سے پہلے تک کے برآمدی محصول کی تاریخ کو مختصراً بیان کرنا مناسب ہوگا۔

۱۸۶۰ء تک برآمدی محصول ابتدائی محصولی پالیسی کی اساسی خصوصیت تھے اور تقریباً تمام برآمدی اشیاء پر بہ لحاظ قیمت ۳ فیصد کی شرح سے عام طور پر عائد کیے جاتے تھے۔ اگرچہ ان محصولوں کی شرح ادنیٰ تھی اور وہ محض آمدنی کی غرض سے عائد کیے جاتے تھے، پھر بھی یہ خیال کیا جاتا تھا کہ برآمدی محصولوں کی پالیسی معاشی حیثیت سے مذموم تھی اور بیرونی مسابقت کو فروغ دے کر برآمدی تجارت کو نقصان پہنچا سکتی تھی۔ چنانچہ اسی خیال سے ۱۸۶۰ء سے ۱۸۸۰ء تک ان محصولوں کو منسوخ کرنے کی پالیسی پر مسلسل عملدرآمد رہا، یہاں تک کہ ۱۸۸۰ء میں صرف چاول کے برآمدی محصول کو برقرار رکھا گیا۔ ۱۹۰۳ء میں ہندوستانی چائے کی صنعت کی درخواست پر چائے کی برآمد پر خفیف سا محصول عائد کیا گیا[1]۔

۵۔ جنگ کے زمانے اور اس کے بعد کا محصول

جنگِ عظیم کے زمانے میں اور اس کے بعد کے دور میں محصول میں بہت سے تغیرات کیے گئے۔ ان کی مختصر کیفیت ذیل میں درج کی گئی ہے۔

(ا) درآمدی محصول۔ ۱۹۱۶ء—۱۷ء میں بہ لحاظ قیمت محصول کو عام طور پر بڑھا کر ۷½ فیصد کر دیا گیا (لیکن سوتی کپڑوں کا محصول ۱۹۱۷ء—۱۸ء تک ۷½ فیصد نہیں کیا گیا)۔ ۱۹۲۱ء—۲۲ء میں اس محصول کی شرح (سوتی کپڑوں کو شامل کر کے) ۱۱ فی صد اور ۱۹۲۲ء—۲۳ء میں ۱۵ فی صد مقرر کی گئی (لیکن سوتی کپڑوں کا محصول ۱۱ فیصد ہی

---

[1] دیکھو جلد اول باب (۶) فصل (۷)۔

رکھا گیا)۔ ریلوے کے سامان کا ٹکس ۱۹۱۶-۱۷ء میں ½۲ فیصد مقرر کیا گیا اور ۱۹۲۲-۲۳ء میں اس کو بڑھا کر ۱۰ فیصد کر دیا گیا۔ لوہے اور فولاد کے محصول کو ۱۹۱۶-۱۷ء میں ۱ فیصد سے بڑھا کر ½۲ فیصد اور ۱۹۲۲-۲۳ء میں ۱۰ فیصد کر دیا گیا۔ شکر کا محصول ۱۹۱۶-۱۷ء میں ۵ فیصد سے بڑھا کر ۱۰ فیصد اور ۱۹۲۲-۲۳ء میں ۱۵ فیصد
۵۱۹
سے بڑھا کر ۲۵ فیصد کر دیا گیا۔ سوت کی کتائی اور کپڑا بننے کی مشینری اور سامان پر ۱۹۲۱-۲۲ء میں ½۲ فیصد ٹکس لگایا گیا لیکن بعد میں چل کر ان کو محصول سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ دیاسلائی پر بلحاظ قیمت ½۷ فیصد محصول کے بجائے ۱۹۲۱-۲۲ء میں حساب فی گرس بکس ۱۲ آنے کا بڑا محصول خاص طور پر لگایا گیا۔ ۱۹۲۲-۲۳ء میں اس محصول کو دگنا کر دیا گیا۔ تعیش کے سامان مثلاً موٹر کاروں، سینما فلموں، گھڑیوں، ریشمی کپڑوں وغیرہ کے محصول کو ۱۹۲۱-۲۲ء میں ½۷ فیصد سے بڑھا کر ۲۰ فیصد اور ۱۹۲۲-۲۳ء میں ۳۰ فیصد کر دیا گیا۔ محصول کی تحقیقاتی کمیٹی کی اس اہم سفارش کے مطابق کہ ہندوستان میں موٹروں کے ذریعے نقل و حمل کو فروغ دیا جائے ۱۹۲۷-۲۸ء میں موٹر کاروں کے محصول کو ۳۰ فیصد سے گھٹا کر ۲۰ فیصد اور ٹائروں کے ٹکس کو ۳۰ فیصد سے گھٹا کر ۱۵ فیصد کر دیا گیا۔ محصول کے اس طرح کم کر دیے جانے سے صوبوں کے لیے اس بات کی زیادہ سہولت مہیا ہو گئی کہ وہ موٹر کار استعمال کرنے والوں پر بھی کچھ محصول لگائیں تاکہ اس کے ماحصل کو سڑکوں کی حالت درست کرنے اور ان کو ترقی دینے پر صرف کیا جا سکے۔ تمباکو کا بہ لحاظ قیمت محصول سگار اور سگریٹ کے لئے ۱۹۲۲-۲۳ء میں بڑھا کر ۷۵ فیصد کر دیا گیا۔ ۱۹۲۷-۲۸ء میں غیر خام تمباکو کا محصول فی پاؤنڈ ایک روپیہ سے بڑھا کر فی پاؤنڈ ڈیڑھ روپیہ کر دیا گیا۔ بیرونی سوت پر ۱۸۹۳ء سے محصول معاف تھا، لیکن اب اس پر بھی ۵ فیصد محصول عائد کر دیا گیا۔ بیرونی سوت کے محصول کے تغیرات کو پہلے بیان کیا جا چکا ہے اور اس کا بھی تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ کس طرح ۱۹۳۰ء میں سوتی کپڑوں کا بہ لحاظ قیمت محصول ۱۱ فیصد سے بڑھا کر ۱۵ فیصد کر دیا گیا اور غیر برطانوی کپڑوں پر تین سال کے لیے ۵ فیصد زائد تائیدی محصول عائد کیا گیا[۱] برطانوی سفید سادہ کپڑوں کو اس سامان کی فہرست میں رکھا گیا جس پر فی پاؤنڈ ½۳ آنے کا اقل محصول ادا کرنا لازمی تھا

۱؎ سوتی کپڑوں کے محصول کے ان تغیرات اور بعد کے تغیرات کے لئے دیکھو باب ۷ فصل ۱۰-۱۳۔

مٹی کے تیل اور پٹرولیم کی درآمد پر فی گیلن ایک آنہ محصول لگایا گیا۔ اسی قسم کی ملکی پیداوار پر بھی اسی شرح سے چنگی لگائی گئی۔ شراب کا درآمدی محصول ۱۹۲۱ء ۲۲ء میں بڑھا دیا گیا اور ۱۹۲۲ء ۲۳ء میں اس محصول میں مزید اضافہ کیا گیا۔

۱۹۳۰ء میں چاندی پر فی اونس چار آنے کا درآمدی محصول از سر نو عائد کر دیا گیا (جو ۱۹۲۰ء میں منسوخ کر دیا گیا تھا)۔ ۱۹۳۰ء کے قانون مالیہ نے تمام قسموں کی شکر کے درآمدی محصول میں عام طور پر اضافہ کر دیا۔ مثلاً شکر کی جن قسموں پر فی ہنڈرڈ ویٹ کے حساب سے محصول لگایا جاتا تھا اب ان پر اس محصول کے علاوہ فی ہنڈرڈ ویٹ ڈیڑھ روپیہ زیادہ وصول کیا جانے لگا۔ اسی طرح جن صورتوں میں بلحاظ قیمت محصول لگایا جاتا تھا ان میں بلحاظ قیمت ۲۵ فیصد محصول کے علاوہ فی ہنڈرڈ ویٹ ڈیڑھ روپیہ بھی ادا کرنا ضروری ہو گیا۔

حالیہ سالوں میں شدید معاشی کساد بازاری واقع ہونے اور مرکزی حکومت کے موازنے میں بہت بڑا گھاٹا آنے کی وجہ سے نہ صرف درآمدی محصولوں کی سابقہ شرح میں کافی اضافہ کیا گیا بلکہ بہت سی اشیا پر نئے محصول عاید کیے گئے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۳۱ء کے قانون مالیہ کے بموجب حسب ذیل دو قسم کے تغیرات کیے گئے۔

(۱) مستقل شرحوں میں اضافہ۔ (۲) سابقہ محصول کے علاوہ زائد ٹکس۔ پہلی مد کے تحت
حسب ذیل تغیرات قابل ذکر ہیں۔ (ا) ایل، بیر، سائڈر اور دوسری قسم کی مخمر ۵۲۰
شراب کے محصول کی پرانی شرح میں کم و بیش ۶۶ فیصد اضافہ کیا گیا اور بجز مقلوب روح شراب کے تمام انگوری شرابوں اور روح شراب پر ۳۰ تا ۴۵ فیصد محصول عاید کیا گیا۔

(ب) ہر قسم کی شکر اور مصری کے محصولوں میں فی ہنڈرڈ ویٹ ایک روپیہ چار آنے کا اضافہ کیا گیا جس سے ان اشیا پر مجموعی درآمدی محصول فی ہنڈرڈ ویٹ ۷ روپے ۴ آنے ہو گیا۔ یہی وہ شرح تھی جس کی سفارش ٹیرف بورڈ نے شکر کی صنعت کی تامین کی غرض سے کی تھی[1]۔ اس محصول میں جو اضافہ کیا گیا تھا وہ محض ایک عارضی تدبیر تھی جو ٹیرف بورڈ کی سفارش پر غور ہونے تک زاید آمدنی وصول کرنے کی غرض سے اختیار کی گئی تھی۔ فروری

[1] دیکھو جلد اول باب (۴) فصل (۷)

سنہ ۱۹۳۲ء میں شکر کی صنعت کی تامین کا قانون منظور ہوا۔ (ج) چاندی کے محصول کو فی اونس چار آنے سے بڑھا کر ۶ آنے کر دیا گیا۔ (د) مسالوں، چھالیہ اور سینما فلموں پر بہ لحاظ قیمت ۱۵ فیصد کا جو عام محصول عائد کیا گیا تھا وہ اٹھا لیا گیا اور اس کی بجائے ۳۰ فیصد کا محصول لگایا گیا جو اشیائے تعیش پر لگایا جا رہا تھا۔ مذکورۂ بالا تغیرات کی دوسری مد میں حسب ذیل زاید محصول شامل ہیں۔— (ا) جن اشیا پر ۱۰ فیصد محصول تھا اب ان پر ۲ ½ فیصد زاید محصول وصول کیا جانے لگا۔ (ب) جن اشیا پر ۱۵ فیصد یا عام شرح سے محصول دینا پڑتا تھا اب ان پر ۵ فیصد زائد محصول لگایا گیا۔ (ج) جن اشیا پر تعیش کی شرح یعنی ۳۰ فیصد کے حساب سے محصول عائد تھا ان پر ۱۰ فیصد محصول کا اضافہ کیا گیا۔ (د) دوسرے اہم زاید محصول حسب ذیل تھے۔— سگار پر ۱۵ فیصد، فی ہزار سگریٹ پر ایک روپیہ آٹھ آنے، خام تمباکو پر فی پاؤنڈ بارہ آنے، مٹی کے تیل پر فی گیلن ۹ پائی[1]، پٹرول پر فی گیلن دو آنے، موٹر کاروں اور موٹر سائیکلوں پر ۱۰ فیصد، مصنوعی ریشمی سوت اور دھاگہ پر ۲ ½ فیصد، مخلوط ریشمی کپڑوں پر ½ ۱۰ فیصد اور سمنٹ کی درآمد پر فی ٹن دو روپے۔ سوتی کپڑوں پر ۱۵ فیصد کا جو سابقہ محصول تھا اس پر ۵ فیصد کا مزید اضافہ کیا گیا[2]۔

نومبر سنہ ۱۹۳۱ء کے ضمنی قانون مالیہ نے درآمدی محصولوں میں حسب ذیل مزید اضافہ کیا۔— (۱) خام روئی پر فی پاؤنڈ ۹ پائی کے حساب سے درآمد محصول۔ (۲) مشینری پر ۱۰ فیصد۔ (۳) رنگوں پر ۱۰ فیصد۔ (۴) لال شکر پر ۱ روپے چار آنے (۵) مصنوعی ریشمی سوت پر ۱۵ فی فیصد۔ (۶) مصنوعی ریشمی کپڑوں اور برقی قمقموں پر ۴۰ فیصد۔ (۷) تمام درآمدی اشیا پر جن پر کروڑ گیری لی جاتی تھی ان زاید محصولوں کے علاوہ جو سابقہ قانون مالیہ نے عاید کیے تھے اس کروڑ گیری کی شرح کا ¼ حصہ بطور زاید ٹکس لگایا گیا

لہ۔ مٹی کے تیل اور پٹرول کی چنگی بھی درآمدی محصول کی طرح بڑھا دی گئی۔

لہ۔ اس طرح رد و بدل کرنے کے علاوہ بعض اشیا مثلاً نمک، گیہوں، لوہے و فولاد، جستی چادروں اور سونے چاندی کے تاروں اور کلابتوں کی درآمد پر تامینی محصول بھی عاید کیے گئے۔

اور بجز خام روئی، شیری اور رنگوں کے سب اشیا پر نئے محصول لگائے گئے۔ ان اضافوں کے نتائج قطعی طور پر قابل اطمینان ثابت نہیں ہوئے اور بعض صورتوں میں تقلیل حاصل کا رجحان ظاہر ہوا یعنی درآمدی تجارت کی مقدار میں تناسب سے زیادہ کمی ہوگئی اگرچہ اس کمی کا باعث ایک حد تک شدید تجارتی کساد بازاری بھی تھی۔

۵۲۱ ۱۹۳۲ء کے ہندوستانی محصول (تجارتی معاہدۂ اوٹاوا) کے مرمیہ قانون نے جولائی و اگست ۱۹۳۲ء میں طے شدہ اوٹاوا کے تجارتی معاہدے کو نافذ کیا۔ اس معاہدے نے ہندوستان پر یہ ذمہ داری عائد کی کہ وہ برطانیہ کو بعض قسم کی موٹر کاروں کے محصول میں ۷½ فیصد اور بعض دوسری قسم کے سامان کے محصول میں ۱۰ فیصد ترجیح دے۔ اس کے علاوہ آہنی و فولادی سامان کے لئے بھی خاص سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ یکم جنوری ۱۹۳۳ء سے محصول کے مرمیہ قانون نے ۱۸۹۴ء کے ہندوستانی محصول کے قانون کے جدول (۲) میں ضروری ردوبدل کیا۔ جدول (۲) کے دو ذیلی حصوں (۸) و (۹) میں وہ اشیا درج ہیں جن پر ترجیحی شرحوں سے محصول لگایا جا سکتا ہے۔ مد (۸) میں وہ سب اشیا رکھی گئی ہیں جن پر سابق میں بلحاظ قیمت ۲۵ فیصد محصول بغرض آمدنی لگایا جا سکتا تھا لیکن اب ۳۰ فیصد کی معیاری شرح سے لگایا جاتا ہے اور اسی قسم کی برطانوی اشیا پر ۲۰ فیصد کی ترجیحی شرح مقرر ہے۔ مد (۹) میں وہ سب اشیا رکھی گئی ہیں جو ترجیحی شرح کی فہرست میں داخل ہیں اور جن پر سابق میں خصوصی شرح محصول لگائی جاتی تھی۔ ترجیح دینے کی صورت یہ ہے کہ یا تو سابقہ شرح عام طور پر بڑھا کر مقرر کی گئی ہے یا اس شرح میں جزوی طور پر کمی بیشی کر دی گئی ہے لیکن معیاری شرح کو کسی صورت میں بھی بہ لحاظ قیمت ۵۰ فیصد سے متجاوز نہیں ہونے دیا گیا ہے۔

۱۹۳۴ء کے ہندوستانی مالیے کے قانون نے سگریٹوں کے محصول کو بدل کر بہ لحاظ قیمت ۲۵ فیصد مقرر کیا۔ اس کے علاوہ فی ہزار سگریٹ پر ۸ روپے ۲ آنے یا فی پاؤنڈ ۳ روپے چار آنے (ان میں سے جو بھی زیادہ ہو) محصول لگایا۔ اس قانون نے خام تمباکو کا محصول بڑھا کر فی پاؤنڈ ۳ روپے ۴ آنے (معیاری شرح) اور فی پاؤنڈ ۲ روپے ۱۲ آنے (نوآبادیات کے لئے ترجیحی شرح) مقرر کیا۔ یہ ردوبدل اس وجہ سے

ضروری ہو گیا تھا کہ سابقہ انتظامات کے تحت سگریٹوں پر دراصل دو محصول لگائے جا رہے تھے، یعنی ایک تو تمباکو پر معمولی درآمدی محصول۔ دوسرے سگریٹوں پر زاید محصول۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمباکو کے بعض بیرونی کارخانہ داروں نے اس دہرے محصول سے بچنے کی خاطر ہندوستان میں اپنے کارخانے قائم کر لیے۔ لیکن اس قسم کے واقعات پیش آنے کا گمان نہ تھا اور ان حالات میں تائین کی درخواست کو قبول نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسی قانون مالیہ نے چاندی کا درآمدی محصول فی اونس ۲½ آنے کم کرکے ۵ آنے مقرر کیا۔

۱۹۳۵ء کے قانون مالیہ نے چاندی کا محصول اور بھی گھٹا کر فی اونس ۲ آنے مقرر کیا تاکہ چاندی کی جو تجارت فروغ نہ پا سکے اور چاندی کی تجارت کے از سر نو جاری ہونے میں جو ممکنہ رکاوٹ تھی وہ دور ہو جائے۔ ساتھ ہی چاندی کی چنگی بھی درآمدی محصول کی کمی کے لحاظ سے گھٹا دی گئی۔ لیکن ۱۹۳۶ء کے قانون مالیہ نے آمدنی بڑھانے کے خیال سے نہ صرف چاندی کے درآمدی محصول بلکہ چنگی کو بھی بڑھا کر فی اونس ۳ آنے مقرر کیا[1]۔

(ب) برآمدی محصول۔ ۱۹۱۶ء میں دو نئے برآمدی محصول چائے اور جوٹ پر عاید کیے گئے۔ چائے کی حد تک برآمدی محصول ڈیڑھ روپیہ مقرر کیا گیا۔ یہ محصول ۱۹۲۷ء میں منسوخ کر دیا گیا لیکن اس کی تنسیخ سے پہلے چائے
۵۲۲ کی صنعت کے منافعہ انکم ٹکس میں اضافہ کر دیا گیا۔ جوٹ کا برآمدی محصول ۴۰۰ پاؤنڈ کے ہر گانٹھ پر ۲ روپے ۴ آنے مقرر کیا گیا جو بہ لحاظ قیمت ۵ فیصد محصول کے برابر تھا۔ جوٹ کی مصنوعات محصول کی شرحیں حسب ذیل تھیں: ٹاٹ کے تھیلوں پر فی ٹن ۱۰ روپے اور ٹن کے دوسرے سامان پر ۱۶ روپے۔ ۱۹۱۷ء میں جوٹ اور جوٹ کی مصنوعات کے محصول کی شرحیں دگنی کر دی گئیں۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء میں ہندوستانی دباغی کی صنعت کی تائین کی خاطر خام چمڑے اور خام کھالوں پر بہ لحاظ قیمت ۱۵ فیصد محصول لگایا گیا۔ ہم یہ پہلے بیان کر چکے ہیں کہ آگے چل کر اس محصول میں کیا تغیرات ہوئے اور کس طرح اس محصول کو کم کرکے ۵ فیصد کر دیا گیا[2]۔ ۱۹۳۴ء کے قانون مالیہ نے

[1] شکر کے تائینی محصولوں کے تغیرات کا حال جلد اول باب ۹ میں موجود ہے۔ نیز دیکھو موجودہ باب فصل (۷)

[2] دیکھو باب ۲ فصل (۲۳)

چاول کا برآمدی محصول ایک چوتھائی کم کر دیا یعنی فی من ۳ آنے کے بجائے ۲ آنے ۳ پائی مقرر کیا تاکہ دنیا میں چاول کی قیمت میں جو کمی ہو رہی تھی اس کا مقابلہ کیا جا سکے اور برما کو سیام سے مساوی حیثیت سے مسابقت کرنے کا موقع بہم پہنچایا جا سکے (کیونکہ چاول کی تجارت میں سیام ہی برما کا سب سے رقیب تھا)۔ مقصد یہ تھا کہ برما کے کسانوں کے ساتھ انصاف ہو سکے اور ان کی امداد کی جا سکے۔

سنہ ۱۹۳۴ء کے قانون مالیہ نے خام چمڑے کا برآمدی محصول منسوخ کر دیا، کیونکہ ہندوستان سے اس چمڑے کی برآمدی تجارت خاص کر جرمن سے بہت کم ہو رہی تھی۔ خیال یہ تھا کہ برآمد پر سے محصول اٹھا لینے سے ال کی نکاسی میں سہولت پیدا ہو جائیگی۔ سنہ ۱۹۳۵ء کے قانون مالیہ نے خام کھالوں کے برآمدی محصول کو منسوخ کر دیا تاکہ ان کی تجارت میں عام طور پر از سرنو ترقی ہو۔ ہندوستانی دباغت وچرم سازی کی صنعتوں کے مفاد کی خاطر ان برآمدی محصولوں کو برقرار رکھنے کی تائید میں جو دلائل پیش کیے گئے ہیں ان کو پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے[1]

اس طرح جنگ کے زمانے میں اور اس کے بعد محصولوں میں بہت نمایاں تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ جنگ کے زمانے کی مالی ضرورتوں اور جنگ کے بعد کے موازنے کے گھاٹوں کو پورا کرنے کی غرض سے زیادہ سے زیادہ کروڑگیری کا محصول لگا کر آمدنی بڑھانے کا نمایاں رجحان پیدا ہو گیا ہے۔ ذیل میں محاصل کی آمدنی کے اضافے کو ظاہر کیا گیا ہے جو سنہ ۱۹۱۳ء-۱۴ء تا سنہ ۱۹۳۷ء-۳۸ء ہوتا رہا۔ یہاں واپسی کی رقوم کو منہا کر دیا گیا ہے۔

کروڑگیری کی آمدنی کا اضافہ

سال	کروڑ روپے	سال	کروڑ روپے
سنہ ۱۹۱۳ء-۱۴ء	۱۱٫۱۴	سنہ ۱۹۲۹ء-۳۰ء	۵۱٫۲۸
سنہ ۱۹۱۸ء-۱۹ء	۱۸٫۱۸	سنہ ۱۹۳۰ء-۳۱ء	۴۶٫۸۱

[1] دیکھو باب (۲) فصل (۲۳)

سال	کروڑ روپے	سال	کروڑ روپے
۱۹۲۱ء سے ۲۲ء	۳۴٫۴۱	۱۹۳۱ء سے ۳۲ء	۴۶٫۴۴
۱۹۲۲ء سے ۲۳ء	۴۱٫۳۵	۱۹۳۲ء سے ۳۳ء	۵۱٫۹۶
۱۹۲۳ء سے ۲۴ء	۳۹٫۰۰	۱۹۳۳ء سے ۳۴ء	۴۵٫۷۲
۱۹۲۴ء سے ۲۵ء	۴۵٫۷۵	۱۹۳۴ء سے ۳۵ء	۴۶٫۷۸
۱۹۲۵ء سے ۲۶ء	۴۷٫۷۸	۱۹۳۵ء سے ۳۶ء	۴۶٫۷۳
۱۹۲۶ء سے ۲۷ء	۴۷٫۳۸	۱۹۳۶ء (خام اندازہ)	۴۶٫۹۰
۱۹۲۷ء سے ۲۸ء	۴۸٫۲۱	۳۷ء (بجٹ موازنہ)	۴۴٫۷۸
۱۹۲۸ء سے ۲۹ء	۴۹٫۲۸	۱۹۳۷ء سے ۳۸ء خام اندازہ	۴۲٫۶۰ [۱]

۵۲۳ مذکورہ بالا تمام تغیرات نے جو سخت مالی دقتوں کی وجہ سے عمل میں لائے گئے تھے کروڑ گیری کے محصولوں کی نوعیت اور ان کی وہ حیثیت بھی بدل دی جو ان کو ہندوستانی مالی نظام میں حاصل تھی۔ عام طور سے بڑھا ہوا محصول محصول میں زیادہ عدم یکسانی، محصول سے مستثنیٰ اشیا کی فہرست میں کاٹ چھانٹ، اشیائے تعیش پر خصوصی ٹکس اور نئے برآمدی محصولوں کا نفاذ یہ سب جنگ سے پہلے کی کروڑ گیری کے مقابلے میں جدید مالیاتی نظام کی اہم اور نمایاں خصوصیات ہیں۔

۱۹۲۴ء تک بجز کمائے ہوئے چمڑوں اور کھالوں کے برآمدی محصول کے تمام محصولوں میں صرف آمدنی کی لحاظ تغیرات کیے گئے تھے۔ لیکن بعض محصول اس قدر زیادہ تھے کہ وہ قطعی طور پر تامین کا کام دے رہے تھے۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے

ا۔ اس میں مرکزی حکومت کی چنگی کی آمدنی شامل نہیں ہے۔ جو اندازاً ۱۶ء۱ کروڑ روپے تھی۔ کروڑ گیری کے اس اندازے سے ۱۵ لاکھ روپے بھی خارج ہیں جس کے منجملہ جوٹ کا زاید برآمدی محصول یعنی ۱۲½ فیصد صوبوں کو اور یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے برما کی علیحدگی کے باعث ۲۶ء۴ لاکھ روپے برما کو منتقل کیا گیا۔

کہ کس طرح ہمارے اس استدلال کو تقویت پہنچی کہ بے اصول طریق تامین کے بجائے جو رائج ہوا اچھی طرح سوچ سمجھ کر تامین کا کوئی باضابطہ طریقہ اختیار کرنا چاہیئے ۔ سنہ ۱۹۲۴ء کے فولاد کی تامین کے قانون کے منظور ہونے کے بعد سے علانیہ متعدد تامینی محصول عاید کیے گئے۔ اوٹاوا کے تجارتی معاہدے کے بعد سنہ ۱۹۳۲ء کے ہندوستانی محصول (اوٹاوا کے تجارتی معاہدے) کے ترمیمہ قانون کے نافذ ہو جانے کی وجہ سے ہندوستانی محصول کی یہ خصوصیت کہ سب ممالک کی اشیا کے لئے محصول کی شرحیں یکساں ہوں باقی نہیں رہی اور اس معاہدے کے نافذ رہنے تک برطانیہ، شاہی نوآبادیات اور زیر حفاظت علاقوں سے درآمد کی جانے والی اشیا کی چند قسموں پر ترجیحی محصول لگانا طے پایا۔ اس طرح مختلف ملکوں کی اشیا کے درآمدی محصولوں کی مختلف شرحیں رکھی گئیں ۔

جہاں تک بڑھے ہوئے محصولوں کے بار کا تعلق ہے محصولات کی تحقیقاتی کمیٹی نے یہ رائے ظاہر کی کہ کروڑگیری کی آمدنی جو سنہ ۱۴-۱۹۱۳ء میں ۴ کروڑ ۳۰ لاکھ روپے تھی سنہ ۲۵-۱۹۲۴ء میں بڑھ کر ۱۷ کروڑ ۴۶ لاکھ روپے ہوگئی ۔ یعنی براہ راست صرف تین آنے والی چیزوں کی حد تک جو عوام کے استعمال میں آتی ہیں آمدنی میں ۳۰۷ فیصد اضافہ ہوا ۔ دوسری طرف ان اشیا کی حد تک جن کو زیادہ تر متمول طبقے استعمال کرتے ہیں آمدنی ۴ کروڑ روپیے سے بڑھ کر ۱۴ کروڑ ۱۶ لاکھ روپیے ہوگئی ۔ گویا ۲۵۴ فیصد اضافہ ہوا ۔ محصولات کی کمیٹی کا یہ خیال ہے کہ جہاں تک ان اعداد کا تعلق ہے ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بار کسی حد تک متمول طبقوں پر سے عوام پر منتقل ہوگیا ہے۔ بظاہر یہ صورت حال زیادہ تر اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ شکر پر ۲۵ فیصد محصول عائد کر دیا گیا تھا ۔ چنانچہ اس محصول کی وجہ سے نہ صرف دیسی شکر بلکہ بیرونی شکر کی قیمت بھی بڑھ گئی اور اس طرح سب سے غریب طبقوں پر جو دونوں قسم کی شکر کثیر مقدار میں استعمال کرتے ہیں محصول کا بار بڑھ گیا۔ اسی قسم کا اثر سنہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں رونما ہوا جب کہ نہ صرف شکر بلکہ سوتی کپڑوں اور چاندی کے درآمدی محصولوں میں اضافہ کیا گیا اور سنہ ۱۹۳۰ء کے قانون مالیہ کے بموجب مٹی کے تیل کی چنگی بڑھا دی گئی۔ اسی طرح کے میلانات اس وقت بھی ظاہر ہوئے جب کہ مارچ و نومبر سنہ ۱۹۳۲ء کے قوانین مالیہ کے بموجب درآمدی محصول بڑھا دیے اور زاید محصول عاید کیے گئے اور ۵۲۴

۱۹۳۴ء کے قانون مالیہ کے بموجب شکر اور دیا سلائی پر چنگی عائد کی گئی۔ لیکن ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء میں چاندی کے درآمدی محصول اور چنگی کے محصول میں جو کمی کی گئی اس وجہ سے ہندوستان میں چاندی کے خریداروں کو تھوڑی بہت سہولت حاصل ہوئی۔

۶۔ روئی کی چنگی کی تنسیخ

یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ سوتی کپڑوں کے درآمدی محصولوں میں پے در پے جو اضافے کیے گئے ان کے دوران میں چنگی کا محصول اپنی دیرینہ ۳½ فیصد کی شرح پر بدستور قائم رہا۔ اس صورت حال نے اس ناپسندیدہ محصول کی کامل تنسیخ کا راستہ تیار کیا۔ مارچ ۱۹۲۵ء میں مجلس قانون ساز نے اس محصول کی تنسیخ کے متعلق قرارداد منظور کی اور چنگی کے عملے کے لیے رقم کی منظوری سے انکار کر دیا۔ جب بمبئی کی سوتی کپڑوں کی صنعت کساد بازاری سے دوچار ہوئی تو گرنی کے مالکوں نے یہ تصفیہ کیا کہ مزدوروں کی اجرت میں تقریباً ۱۱½ فیصد تخفیف کی جائے۔ اگست ۱۹۲۵ء کو مزدوروں کی طرف سے ایک وفد نے وائسرائے کے سامنے حاضر ہو کر اس تخفیف کے خلاف احتجاج کیا اور ساتھ ہی یہ درخواست کی کہ روئی کی چنگی منسوخ کر دی جائے۔ اس کے بعد گرنی کے مالکوں کے ایک وفد نے بھی یہی تدبیر اختیار کرنے پر زور دیا۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۲۵ء کو سر پرشوتم داس ٹھاکر داس کی قرارداد جو محصول کو منسوخ کرنے کے متعلق تھی مجلس قانون ساز میں منظور ہو گئی۔ نومبر میں حکومت نے محصول کے التوا کے متعلق ایک گشتی جاری کی اور یکم اپریل ۱۹۲۶ء کو یہ محصول بالآخر منسوخ ہو گیا۔

۷۔ شکر اور دیا سلائی کی نئی چنگیاں[1]

مجلس قانون ساز کے موازنے کے اجلاس (مارچ ۱۹۳۴ء) میں چنگی کے دو نئے محصول یکم اپریل ۱۹۳۴ء سے عاید کیے گئے۔ ۱۹۳۴ء کے شکر کی چنگی کے قانون کے بموجب حسب ذیل چنگی عاید کی گئی:۔

(۱) کھانڈسازی شکر پر فی ہنڈرڈ ویٹ ۱۰ آنے (۲) بجز پامیرا شکر کے جو برطانوی ہند کے کسی کارخانے میں تیار ہو دوسری تمام قسموں کی شکر پر فی ہنڈرڈ ویٹ

---

[1] ۔ مٹی کے تیل، پٹرول اور چاندی کی چنگی کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔

ایک روپیہ یا پانچ آنے[1]۔ یہ نئی چنگی اس بنا پر حق بجانب قرار دی گئی کہ وہ محصولات کی
کی آمدنی کی کمی پورا کرنے کے لئے ضروری ہو گئی تھی۔ محصولات کی آمدنی کے کم ہو جانے
کا سبب یہ تھا کہ شکرسازی کی دیسی صنعت کو تامین دیئے جانے اور سنہ ۱۹۳۱ء کے گواز سنے
میں بیرونی شکر پر زائد محصول عاید کیے جانے کی وجہ سے اس کی درآمد بہت کم ہو گئی تھی
اور اس طرح اس کے درآمدی محصول کی آمدنی گھٹ گئی تھی۔ یہ استدلال کیا گیا کہ حالیہ
سالوں میں شکرسازی کی صنعت کو بہت تیزی کے ساتھ فروغ ہوا ہے اور افراط پیداوار
کا اندیشہ ہے، کیونکہ زاید محصولوں کے عاید کیے جانے سے اس صنعت کو بے اصول اور
غیر یقینی طریقے پر تقویت پہنچائی گئی جو اس تامین کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے جس
کی اس ملکی صنعت کو حقیقت میں ضرورت تھی۔ چنگی کا محصول عاید کرنے کا مقصد یہ تھا کہ
زاید محصول کا توڑ کیا جائے اور آمدنی کی کمی کو پورا کیا جائے۔ دوسری طرف مجلس قانون ساز ۵۲۵
کے بعض ارکان نے شکر کی نئی چنگی کی اس بنا پر مخالفت کی کہ یہ محصول ملکی صنعت کو
تامین دینے کی حکومتی پالیسی کے منافی تھا اور اس پالیسی پر عمل کرنے کے دو سال کے اندر
ہی چنگی عاید کر دینے سے ملکی صنعت کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔ بیرونی شکر
اور سوتی کپڑوں کی درآمد میں مزید کمی ہو جانے سے کروڑگیری کی آمدنی میں جو کمی ہو گئی
اس کو پورا کرنے کی غرض سے سنہ ۱۹۳۷ء کے ہندوستانی قانون مالیہ نے کھانڈسازی شکر کی
چنگی فی ہنڈرڈویٹ ۱۰ آنے سے بڑھ کر ایک روپیہ ۵ آنے کر دی اور کھانڈسازی یا پامیرا
شکر کے سوا دوسری قسموں کی شکر کی چنگی فی ہنڈرڈویٹ ایک روپیہ ۵ آنے سے بڑھا کر
۲ روپے کر دی۔ اس ردوبدل کی وجہ سے شکر کے درآمدی محصول میں تبدیلی کرنا بھی ضروری
ہو گیا۔ چنانچہ درآمدی محصول کی شرح کھانڈسازی اور پامیرا شکر کے سوا دوسری قسم کی شکر
کی چنگی کی شرح کے مساوی مقرر کی گئی۔ اس کے علاوہ باضابطہ تامین کی غرض سے

---

[1] جن صوبوں میں سفید شکر تیار کی جاتی ہے ان کو شکر کی چنگی کے حاصل میں سے فی ہنڈرڈویٹ
ایک آنے کے حساب سے رقم ملے گی۔ جس سے وہ نیشکر کاشت کرنے والوں کی امداد باہمی کی انجمنوں
کی امداد کریں گے تاکہ یہ انجمنیں نیشکر کی واجبی قیمتیں حاصل کرنے میں کاشتکاروں کی مدد کر سکیں۔ نیز
دیکھو جلد اول باب ۶ فصل ۷۔

فی ہنڈرڈ ویٹ ۱۰ روپے ۴ آنے بھی عاید کیے گئے جس کی ملکی صنعت مستحق تھی۔ ۱۹۳۴ء کے شکر کی چنگی کے حکم کی دفعہ (۱۰) کی بموجب کھانڈ سازی شکر کی چنگی کا محصول گھٹا کر فی ہنڈرڈ ویٹ ایک روپیہ کر دیا گیا۔

۱۹۳۴ء کے دیا سلائی کی چنگی کے قانون نے ان دیا سلائیوں پر جو برطانوی ہند میں بنائی جاتی تھیں اور ایسی ڈبیوں میں فروخت کی جاتی تھیں جن میں اوسطاً زیادہ سے زیادہ ۸۰ دیا سلائیاں ہوتی تھیں، چنگی کی حسب ذیل شرحیں مقرر کیں۔ (۱) ۴۰ یا اس سے کم دیا سلائی کی ڈبیوں پر فی گرس ایک روپیہ کے حساب سے (۲) ۴۰ تا ۶۰ دیا سلائی والی ڈبیوں پر فی گرس ڈیڑھ روپیہ کے حساب سے۔ (۳) ۶۰ سے زاید دیا سلائی والی ڈبیوں پر فی گرس دو روپے کے حساب سے ان اختیارات کو کام میں لاتے ہوئے جو اس قانون کی رو سے حاصل تھے دوسری تمام دیا سلائیوں کے لیے چنگی کی شرح ہر ۱۴۴۰ دیا سلائیوں یا ان کے جزو پر ۴ آنے مقرر کی گئی۔ اس قانون نے دیا سلائیوں کے درآمدی محصولوں کی بھی نظر ثانی کر کے ایسی شرحیں مقرر کیں جن میں نہ صرف نئی چنگی کے مساوی محصول شریک تھا بلکہ اس کے علاوہ ملکی صنعت کی تامین کی غرض سے عائد کردہ محصول کی موجودہ شرح بھی برقرار رکھی گئی۔ سر جارج شوستر نے اس کارروائی کو اس بنا پر حق بجانب ٹھیرایا کہ حکومت ہند کو اپنے جوٹ کے برآمدی محصول کی آمدنی میں سے نصف حصہ جوٹ پیدا کرنے والے صوبوں (یعنی بنگال، آسام و بہار) میں تقسیم کرنے کی وجہ سے جو نقصانات برداشت کرنے پڑ رہے تھے ان کی تلافی کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ بنگال جس کے موازنوں میں ۱۹۳۰ء سے لگاتار گھاٹے آ رہے تھے مرکزی حکومت کی امداد کا محتاج تھا۔ اس کے علاوہ اس طرح امداد کرنے کی پالیسی ہندوستانی دستوری اصلاحات (۱۹۳۳ء) کے متعلق شائع کردہ وھائٹ پیپر کی سفارش کے بھی مطابق تھی۔ یہ طے کیا گیا کہ دیا سلائی کی چنگی کی آمدنی اور دیسی ریاستوں کے عاید کردہ اسی طرح کے محصول کے محاصل سے ایک مشترکہ فنڈ قایم کیا جائے جس میں سے ہندوستانی ریاستوں کو ان کی متعلقہ آبادی کی بنیاد پر دیا سلائیوں کے استعمال کے تناسب سے ایک حصہ دیا جائے۔ برما کو ۱۸ لاکھ روپیے واپس کیے جائیں کیونکہ برما نے اپنے یہاں تیار کی ہوئی دیا سلائیوں پر بھی چنگی لگائی تھی۔ یہ محصول بنگال

کی امداد کے آخری مقصد سے عاید کیا جانے والا تھا۔ اس پر بعض بعض صوبوں سے یہ اعتراض کیا گیا کہ ان پر یہ جرمانہ اس وجہ سے عاید کیا جارہا تھا کہ بنگال کے مقابلے میں وہ اپنے مالیات کا بہتر انتظام کررہے تھے۔ اس کے علاوہ دیاسلائی کی چنگی کی وجہ سے ۵۲۶
یہ مثال قایم ہوگئی ہے کہ عام استعمال کی کسی شے پر حکومت ہند محصول عاید کرے تو اس کا ایک حصہ دیسی ریاستوں کو واپس کیا جائے۔ اس صورتِ حال کی وجہ سے کروڑگیری کے محصولوں کے بارے میں بھی پیچیدہ مسائل رونما ہونا یقینی ہے۔[1]

انکم ٹکس کی تاریخ

ہندوستان میں انکم ٹکس کی تاریخ طویل اور گوناگوں ہے۔ غدر کے زمانے کے مصارف کو پورا کرنے کی غرض سے ابتداءً پانچ سال کے لیے ایک عام انکم ٹکس عاید کیا گیا جس سے زرعی آمدنیاں بھی مستثنیٰ نہ تھیں۔ ۱۸۶۵ء میں جب کہ یہ پانچ سال ختم ہوگئے انکم ٹکس بھی موقوف ہوگیا۔ ۱۸۶۷ء میں ایک اور قانون منظور ہوا جس کی بموجب زراعت کو چھوڑ کر سب پیشوں اور کاروبار پر ایک لیسنس ٹکس (محصول اجارہ) عاید کیا گیا جو ۱۸۷۲ء سے ۱۸۷۳ء کے ختم تک برابر عاید رہا۔ اس کے بعد ۱۸۷۷ء تک کسی قسم کے محاصل عاید نہیں کیے گئے۔ ۱۸۷۷ء میں قحط کے بیمہ فنڈ کے ایک جزو کو پورا کرنے کے لئے ایک لیسنس ٹکس عاید کیا گیا اور ۱۸۷۸ء میں اس غرض سے صوبہ متحدہ، پنجاب، مدراس، بنگال اور بمبئی کے لیے قوانین منظور ہوئے جو ۱۸۸۶ء تک نافذ رہے۔ لیکن ۱۸۸۶ء کے انکم ٹکس کے قانون نے جو کل ہندوستان کے لیے بنایا گیا تھا ۱۸۷۸ء کے لیسنس ٹکس کو عام انکم ٹکس میں تبدیل کردیا۔ اس قانون کے بموجب تمام غیر زرعی آمدنیوں پر ٹکس لگایا گیا اور اس غرض کے لیے ان آمدنیوں کو حسب ذیل چار حصول میں تقسیم کیا گیا:۔ (۱) تنخواہ اور وظیفہ؛ (۲) کمپنیوں کا منافعہ؛ (۳) تمسکات کا سود؛ اور (۴) دوسری آمدنیاں۔ تنخواہ اور تمسکات کے سود کی تمام سالانہ آمدنیوں پر جو ۵۰۰ روپے اور ۲ ہزار روپے کے درمیان تھیں فی روپیہ ۴ پائی کا ٹکس عاید کیا گیا اور ۲ ہزار روپے سے زاید آمدنیوں اور سب کمپنیوں کے منافعہ پر فی روپیہ ۵ پائی ٹکس مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد ٹکس کی کوئی مزید درجہ وار شرح نہیں تھی۔ دوسرے ذرایع سے اسی طرح کی جو

[1] دیکھو کے، ٹی شاہ کی کتاب موسوم بہ "ہندوستانی مالیہ پر ایک نظر" دسمبر ۱۹۲۷ء ۱۳۴۶ھ صفحہ ۳۶۔

آمدنیاں حاصل کی جاتی تھیں ان پر بھی ٹکس کی کم و بیش یہی شرح مقرر رہی اور خیرات و مذہبی اوقاف کو مستثنیٰ کر دیا گیا۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں جب کہ مالی حالت اطمینان بخش تھی ۲۰۰۰ سے ہزار روپے تک کی آمدنیوں کو ٹکس سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔

جنگ عظیم سے پہلے تک انکم ٹکس کی آمدنی بہت قلیل یعنی صرف تقریباً ۳ کروڑ روپے ہوتی تھی متمول طبقے بڑی حد تک محفوظ تھے اور اپنی حیثیت کے مطابق محصول کا بار برداشت نہیں کر رہے تھے۔ جنگ کے زمانے میں اور اس کے بعد محصول بڑھا دئے گئے تو سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء میں آمدنی بڑھ کر ۲۲ کروڑ سے زاید ہوگئی (دیکھو فصل ۹)۔ لیکن سنہ ۱۹۲۲ء سے جبکہ محصول میں مزید اضافہ کیا گیا ملک شدید اور طویل کساد بازاری کے دور سے گزر رہا تھا اور اس محصول کی آمدنی جو سنہ ۱۹۲۳-۲۴ء میں ۱۸ کروڑ ۴۹ لاکھ روپے ہوئی تھی گھٹ کر سنہ ۱۹۲۷-۲۸ء میں ۱۵ کروڑ ۴۲ لاکھ روپے ہوگئی۔ بعد میں چل کر جب انکم ٹکس اور زاید ٹکس کی شرحوں میں کافی اضافہ کر دیا گیا تو آمدنی میں کچھ اضافہ ہوا لیکن معاشی کساد بازاری کی وجہ سے آمدنی انکم ٹکس کی شرحوں اور زاید محصولوں کے اضافے کے تناسب سے نہیں بڑھی اور جتنا اندازہ کیا گیا تھا اس سے کم مقدار میں وصول ہوئی۔ انکم ٹکس کی آمدنی صوبوں کے قلیل حصے کو الگ کر کے سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء میں ۱۷ کروڑ ۱۳ لاکھ روپے سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء میں ۱۷ کروڑ ۴۵ لاکھ روپے، سنہ ۱۹۳۵-۳۶ء میں ۱۷ کروڑ ۷۰ لاکھ روپے سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء (پختہ موازنے) میں ۱۵ کروڑ ۳۰ لاکھ روپے اور سنہ ۱۹۳۷-۳۸ء (موازنے) میں ۱۴ کروڑ ۳۰ لاکھ روپے ہوئی۔ موخر الذکر صورت میں ایک کروڑ ۴۰ لاکھ روپے کا نقصان شامل نہیں ہے جو یکم اپریل سنہ ۱۹۳۷ء سے برما کی علحدگی کی وجہ سے ہوا۔ ۵۲۷

۹- جنگ کے زمانے میں اور اس کے بعد انکم ٹکس میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان کی مختصر کیفیت۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں معمولی انکم ٹکس میں تدریجی شرحوں کا طریقہ نافذ کیا گیا۔

سنہ ۱۹۱۷ء میں معمولی انکم ٹکس کے علاوہ ایک زاید ٹکس تدریجی شرح سے عاید کیا گیا۔

سنہ ۱۹۱۸ء میں انکم ٹکس کے طریق کی اصلاح و ترمیم کی گئی۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں (۱) معافی محصول کے لیے آمدنی کی جو اقل حد مقرر کی گئی تھی وہ ایک ہزار روپے سے بڑھا کر ۲ ہزار روپے سالانہ کر دی گئی (۲) زمانۂ جنگ کے زاید منافعہ پر ایک ٹکس ایک سال کے لیے

۳۰ ہزار روپے سے زاید آمدنیوں اور زرعی آمدنیوں پر عاید کیا گیا۔ البتہ پیشہ ور جماعتوں اور سرکاری ملازموں کی آمدنیوں کو اس ٹکس سے مستثنیٰ رکھا گیا۔[1]

۱۹۲۰ء میں زمانہ جنگ کے زاید منافعہ کا ٹکس منسوخ کر دیا گیا اور کمپنیوں اور رجسٹری شدہ فرموں کے منافعہ کی حد تک زاید ٹکس (سوپر ٹکس) کے قانون کی ترمیم کی گئی۔

۱۹۲۱ء میں معمولی انکم ٹکس اور زاید ٹکس کی متزاید شرحیں بڑھا دی گئیں۔

۱۹۲۲ء، ۱۹۳۰ء، مارچ ۱۹۳۱ء اور نومبر ۱۹۳۱ء میں ہر دو قسم کے محصولوں میں بڑی آمدنیوں کے لیے اضافہ کیا گیا، زاید محصول عاید کیے گئے اور معافی محصول کے لیے آمدنی کی جو اقل حد مقرر کی گئی تھی وہ نومبر ۱۹۳۱ء میں گھٹا کر ایک ہزار روپے کر دی گئی۔

۱۹۳۳ء، ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں چھوٹی آمدنیوں کے انکم ٹکس کی شرحوں میں اور زاید محصولوں میں (۱۹۳۵ء سے ۳۶ء) تخفیف کی گئی اور معافی محصول کے لیے آمدنی کی اقل حد بڑھا کر (۱۹۳۶ء میں) دو ہزار روپے کر دی گئی۔

مارچ ۱۹۳۸ء کے ہندوستانی قانون مالیہ کے بموجب معمولی انکم ٹکس کی موجودہ شرحیں حسب ذیل ہیں۔

(الف) ہر فرد واحد، ہندو غیر منقسمہ خاندان، غیر رجسٹری شدہ فرم اور افراد کی دوسری انجمنوں کے لیے جو رجسٹری شدہ فرم یا کمپنی نہ ہوں:-

(۱) جب کہ مجموعی آمدنی ۲ ہزار روپے سے کم ہو ——

[1] حکومت کا مقصد یہ تھا کہ زاید منافعہ کا نصف حصہ خود لے لے۔ زاید منافعہ کی تعریف میں ۱۹۱۸ء ۱۹ء میں وصول شدہ منافعہ اور جنگ سے پہلے کے دو سال اور ابتدائے جنگ کے دو سال میں وصول شدہ منافعہ کے اوسط کا فرق داخل تھا۔ ۳۰ ہزار روپے سے کم آمدنیاں اس ٹکس سے مستثنیٰ تھیں۔

۵۲۸

	شرح فی روپیہ
(۲) جب کہ مجموعی آمدنی ۲ ہزار روپے یا اس سے زاید لیکن ۵ ہزار روپے سے کم ہو ــــــــ	۶ پائی
(۳) جب کہ مجموعی آمدنی ۵ ہزار روپے یا اس سے زاید لیکن ۱۰ ہزار روپے سے کم ہو۔ ــــــــ	۹ پائی
(۴) جب کہ مجموعی آمدنی ۱۰ ہزار روپے یا اس سے زاید لیکن ۱۵ ہزار روپے سے کم ہو۔	آنہ
(۵) جب کہ مجموعی آمدنی ۱۵ ہزار روپے یا اس سے زاید لیکن ۲۰ ہزار روپے سے کم ہو۔	ا آنہ ۴ پائی
(۶) جب کہ مجموعی آمدنی ۲۰ ہزار روپے یا اس سے زاید لیکن ۳۰ ہزار روپے سے کم ہو	ا آنہ ۷ پائی
(۷) جب کہ مجموعی آمدنی ۳۰ ہزار روپے یا اس سے زاید لیکن ۴۰ ہزار روپے سے کم ہو۔	ا آنہ ۱۱ پائی
(۸) جب کہ مجموعی آمدنی ۴۰ ہزار روپے یا اس سے زاید لیکن ایک لاکھ روپے سے کم ہو	۲ آنے ۱ پائی
(۹) جب کہ مجموعی آمدنی ایک لاکھ روپے سے یا اس سے زاید ہو۔	۲ آنے ۲ پائی

(ب) ہر کمپنی اور رجسٹری شدہ فرم کے لئے خواہ اس کی مجموعی آمدنی کچھ ہی ہو فی روپیہ ۲ آنے ۲ پائی شرح۔

ذیلی ہندوستانی قانون مالیہ نے جو نومبر ۱۹۳۱ء میں منظور ہوا ۱۹۳۱ء ۳۲ء کے مالی سال میں ۱۰۰۰ روپے سے ۱۹۹۹ روپے تک کی آمدنیوں پر فی روپیہ ۲ پائی اور ۱۹۳۲ء ۳۳ء کے مالی سال میں فی روپیہ ۴ پائی محصول لگا کر سابق محصول کے لیے آمدنی کی اقل حد گھٹا دی۔ اسی قانون نے ۱۹۳۱ء ۳۲ء کے مالی سال میں انکم ٹکس کی موجودہ شرحوں کے علاوہ ایک زاید محصول جو ان شرحوں کے $\frac{1}{6}$ کے برابر تھا عاید کیا اور ۳۲ء ۳۳ء میں موجودہ شرحوں کا $\frac{1}{4}$ بطور زائد محصول عاید کیا مجلس قانون ساز کی خواہش کے مطابق مارچ ۱۹۳۳ء کے قانون مالیہ نے ایک ہزار روپے سے ۱۴۹۹

روپے تک کی آمدنیوں پر انکم ٹکس کی شرح ۴ پائی سے گھٹا کر ۲ پائی کر دی۔ مارچ سنہ ۱۹۳۵ء میں مزید کمی کی گئی۔ چنانچہ ایک ہزار روپیے سے ۱۴۹۹ روپے تک کی آمدنیوں کا محصول گھٹا کر ۱½ پائی کر دیا گیا اور ۱۵سو سے ۱۹۹۹ روپے تک کی آمدنیوں کے لیے محصول کی شرح کم کر کے ⅔ ۲ پائی مقرر کی گئی۔ ساتھ ہی زاید محصول میں بھی ایک تہائی کمی کر دی گئی۔ سنہ ۱۹۳۶ء-۳۷ء کے وافر موازنے نے ان زاید محصولوں میں بقدر نصف کمی کر دی جو انکم ٹکس کے علاوہ وصول کیے جاتے تھے۔ اس زمانے میں (مارچ سنہ ۱۹۳۶ء) معافی محصول کے لیے اقل آمدنی کی حد پھر بڑھا کر ۲ ہزار روپے کر دی گئی جس سے چھوٹے انکم ٹکس ادا کرنے والوں کو بہت بڑی سہولت ہوگئی۔ یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ بقیہ زاید محصول بھی جو تجارت اور صنعت کے لیے بارگراں بنے ہوئے ہیں بلا تاخیر مزید منسوخ کر دیے جائیں گے۔

یہ معمولی انکم ٹکس کی شرحیں ہیں۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں سب سے بڑی شرح ۲۵ ہزار روپے یا اس سے زائد آمدنی کے لیے فی روپیہ ۱۲ پائی تھی۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں ۴۰ ہزار روپے یا اس سے زاید آمدنی پر فی روپیہ ۱۶ پائی کی شرح عاید کی گئی تھی۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں ۴۰ ہزار روپے یا اس سے زاید آمدنی کے لیے انتہائی شرح بڑھا کر فی روپیہ ۱۸ پائی اور سنہ ۱۹۳۰ء میں ۱۹ پائی کر دی گئی۔ مارچ سنہ ۱۹۳۱ء میں ایک لاکھ روپیے سالانہ یا اس سے زیادہ آمدنی کے محصول کی شرح بڑھا کر ۲ آنے ۲ پائی کر دی گئی۔

۵۲۹

مارچ سنہ ۱۹۳۸ء کے قانونِ مالیہ کے بموجب زاید ٹکس کی موجودہ شرحیں

مجموعی آمدنی ۳۰ ہزار روپے سے زائد ہونے کی صورت میں:-

شرح فی روپیہ

(۱) ہر کمپنی کے لیے:-

(ا) اس زاید آمدنی کے پہلے ۲۰ ہزار روپیہ کے لئے ——— ×

(ب) اس زاید آمدنی کے باقی ماندہ حصے کے ہر روپیہ پر ——— ۱ آنہ

(۲) I ہر غیر منقسمہ ہندو خاندان کے لیے:- ———

(ا) اس زاید آمدنی کے پہلے ۴۵ ہزار روپے کے لیے——— ×

	شرح فی روپیہ
(ب) اس زاید آمدنی کے بعد کے ۲۵ ہزار روپیوں کے لیے	۱ آنہ ۳ پائی

(II) ہر فردِ واحد، غیر رجسٹری شدہ فرم اور افراد کی دوسری انجمنوں کے لیے جو رجسٹری شدہ فرم یا کمپنی کی ذیل میں نہیں آتیں۔

(ا) اس زاید آمدنی کے پہلے ۲۰ ہزار روپے کے لیے	۹ پائی
(ب) اس زاید آمدنی کے بعد کے ۵۰ ہزار روپے کے لئے	۱ آنہ ۳ پائی

(III) ہر فردِ واحد، غیر منقسمہ ہندو خاندان، غیر رجسٹری شدہ فرم اور افراد کی دوسری انجمنوں کے لیے جو رجسٹری شدہ فرم یا کمپنی نہ ہوں۔

(ا) اس زاید آمدنی کے بعد کے ۵۰ ہزار روپے کے لیے	۱ آنہ ۹ پائی
(ب) اس زاید آمدنی کے بعد کے ۵۰ ہزار روپے کے لیے	۲ آنے ۳ پائی
(ج) " " " "	۲ آنے ۹ پائی
(د) " " " "	۳ آنے ۳ پائی
(ہ) " " " "	۳ آنے ۹ پائی
(و) " " " "	۴ آنے ۳ پائی
(ز) " " " "	۴ آنے ۹ پائی
(ح) " " " "	۵ آنے ۳ پائی
(ط) " " " "	۵ آنے ۹ پائی
(ی) باقی ماندہ آمدنی کے ہر روپیہ پر	۶ آنے ۳ پائی

نومبر ۱۹۳۱ء کے ذیلی قانون مالیہ نے انکم ٹیکس کے مذکورۂ بالا زاید محصولوں کی طرح فوقی محصولوں کی حد تک بھی موجودہ شرحوں کے علاوہ زاید محصول عاید کیے ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء

میں یہ زاید محصول اسی طرح کم کردیے گئے جس طرح کہ انکم ٹکس کے زاید محصول ۔

آج کل (۱۹۳۸ئہ) ۱ لاکھ روپے یا اس سے زاید آمدنیوں پر معمولی انکم ٹکس کی انتہائی شرح یعنی فی روپیہ ۲ آنے ۲ پائی اور زاید محصول فی روپیہ $\frac{1}{12}$ کے علاوہ فوقی محصول فی روپیہ ۶ آنے اور زاید محصول فی روپیہ $\frac{1}{12}$ مجموعی انکم ٹکس ادا کیا جاتا ہے ۔ اس طرح زاید محصولوں کو چھوڑ کر ان آمدنیوں پر ۵۰ فی صد سے کچھ زاید ہی انکم ٹکس ادا کیا جاتا ہے ۔

۱۹۱۷ئہ میں جب کہ فوقی محصول (سوپر ٹکس) پہلی مرتبہ عاید کیا گیا ۲ $\frac{1}{2}$ لاکھ ۵۳۰
روپے یا اس سے زاید آمدنیوں کے لیے محصول کی انتہائی شرح فی روپیہ ۳ آنے تھی ۔ ۱۹۲۱ئہ میں ۲ $\frac{1}{2}$ لاکھ روپے اور اس سے زاید آمدنیوں پر شرح فی روپیہ ۴ آنے تھی ۔ ۱۹۲۲ئہ میں ۵ $\frac{1}{2}$ لاکھ روپے اور اس سے زاید آمدنیوں کے لیے یہ شرح بڑھا کر فی روپیہ ۶ آنے ۔ ۱۹۳۰ئہ میں ۶ آنے ۱ پائی اور مارچ ۱۹۳۱ئہ میں ۶ آنے ۹ پائی کردی گئی ۔

۱۹۳۰ئہ کا ترمیمہ قانون نافذ ہونے سے پہلے تک کمپنیوں اور رجسٹری شدہ فرموں کے غیر منقسمہ منافعہ پر فوقی محصول انھی شرحوں سے ادا کیا جا رہا تھا ۔ جیسا کہ ان کی دوسری آمدنیوں پر ۔ لیکن اس قانون نے کمپنیوں اور فرموں کی ۵۰ ہزار روپے سے زاید تمام غیر منقسمہ آمدنی پر فی روپیہ ایک آنہ کی یکساں شرح عائد کردی ۔ یہ تبدیلی اس وجہ سے کرنی پڑی کہ قدیم طریق کمپنیوں کو یہ ترغیب دے رہا تھا کہ اپنے منافعہ کا اس سے زیادہ حصہ بطور مقسوم تقسیم کریں جس کی ان کی حقیقی مالی حالت اجازت دیتی تھی ۔ اور ان کمپنیوں پر محصول عاید کیا گیا جو اپنے ذخائر مستحکم کرنے کی کوشش کر رہے تھے ۔ ۱۹۳۲ئہ میں یکساں شرح بڑھا کر فی روپیہ ۱ $\frac{1}{2}$ آنہ کردی گئی خواہ زاید آمدنی ۵۰ ہزار روپے سے کتنی ہی زیادہ ہو ۔ موجودہ شرح فی روپیہ ایک آنہ ہے ۔

انکم ٹکس کی اصلاح

سائمن کمیشن (۱۹۳۰ئہ) کے مالی اسیسر (تشخیص کنندہ افسر) سر والٹر لےٹن نے ہندوستان کے انکم ٹکس کے موجودہ طریق میں متعدد نقایص بتائے اور ان کی اصلاح کے لئے حسب ذیل چند تدابیر اختیار کرنے کا مشورہ دیا ۔

(۱) ۱۹۳۰ئہ ۔ ۱۹۳۱ئہ میں انکم ٹکس اور سوپر ٹکس کی معافی کے لئے آمدنی کی

جو اقل حدود مقرر کی گئی تھیں وہ خاص کر ہندوستانی حالات کے لحاظ سے بہت زیادہ تھیں، ان کو کم کر دیا جائے۔ (اس اعتراض کے جواب میں نومبر ۱۹۳۱ء کے ضمنی قانون مالیہ نے معافی محصول کے لیے آمدنی کی اقل حد جو مالی مشکلات کے لحاظ سے مقرر کی گئی تھی گھٹا کر علی الترتیب ایک ہزار روپے اور تیس ہزار روپے کر دی[1])۔ لیکن یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ انکم ٹکس کی معافی کے لیے آمدنی کی اقل حد ایک ہزار روپے سے کم کرنا مناسب نہ ہوگا، کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں اس مطالبے کا پورا کرنا کہ بیوی بچوں کے لیے رعایت کی جائے مشکل ہو جائے گا۔ ایسی رعایت کرنے کے خلاف اعتراض یہ ہے کہ ہندوستان میں بہت سے ٹکس ادا کرنے والوں کے ساتھ اس قسم کی رعایت کرنی پڑے گی جس کی وجہ سے اخراجات کا بار بہت بڑھ جائے گا۔ اس کے علاوہ چونکہ شادیوں اور ولادتوں کی رجسٹری کا قابل اطمینان طریقہ موجود نہیں ہے اس لیے مجرمانہ فریب کے بہت سے مواقع پیدا ہوتے رہیں گے اور ان کی روک تھام کی کوشش کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ جن لوگوں کی مالی حالت کی تشخیص کی جا رہی ہے ان کے نجی حالات کی تفتیش اور محاسبہ کیا جائے۔ اس طرح نہ صرف کام بڑھ جائے گا بلکہ کام میں سخت رکاوٹ اور پیچیدگی پیدا ہو جائے گی۔ کسی خاندان کے لیے خواہ اس کے ارکان کی تعداد کچھ ہی ہو یکساں رعایت کرنا اس مشکل کو رفع کرنے کا صرف ایک فوری اور کارآمد طریقہ ہوگا۔ اگرچہ بادی النظر میں معافی کی حد انگلستان کے
۵۱ مقابلے میں زیادہ معلوم ہوتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ انگلستان میں بیوی بچوں کے ۵۳۱
لیے مراعات کا طریقہ رائج ہے، پھر بھی وہاں شادی شدہ مرد کے لیے معافی کی حد نسبتاً زیادہ ہے[2]۔

اس کے علاوہ اگرچہ کہ ہندوستان میں ایک شخص واحد کے لیے قابل محصول آمدنی کی حد نسبتاً زیادہ ہے لیکن چونکہ ہندوستانی انکم ٹکس اور انگلستان کے ٹکس کے درمیان

[1] ۔ لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے یکم اپریل ۱۹۳۹ء سے انکم ٹکس کی معافی کے لیے آمدنی کی اقل حد پھر بڑھا کر ۲ ہزار روپے کر دی گئی۔

[2] ۔ دیکھو حکومت ہند کا مراسلہ سائمن کمیشن رپورٹ کے بارے میں، رپورٹ کا ضمیمہ (۲)

ایک فرق یہ ہے کہ یہاں اکتسابی اور غیر اکتسابی آمدنیوں میں کوئی تمیز نہیں کی گئی ہے، اس لیے اکتسابی آمدنیوں کی صورت میں چھوٹی آمدنیوں کے ٹکس کا فیصد انگلستان کے مقابلے میں بہت زیادہ رکھا گیا ہے۔ سچ پوچھو تو غیر اکتسابی آمدنیوں کی صورت میں بھی جہاں تک کہ ان کا تعلق چھوٹی آمدنیوں مثلاً ۲۴۰۰ روپے سے ہے، ہندوستانی محصول ادا کرنے والے کی حالت مقابلتہً خراب ہے۔

(۲) درمیانی آمدنیوں کے لیے جو ۵ ہزار روپے اور ایک لاکھ روپے کے درمیان ہوں انکم ٹکس کی تدریجی شرح کو اور زیادہ سریع بنایا جائے۔ ۳۲-۱۹۳۱ء سے پہلے تک انکم ٹکس کی درجہ بندی ۳۹ر۹۹۹ روپے تک پہنچ کر رک جاتی تھی۔ سر والٹر لے ٹن نے یہ تجویز پیش کی کہ نہ صرف شرح کی موجودہ درجہ بندی کو سریع بنایا جائے بلکہ اس کو ایک لاکھ روپے تک پہنچایا جائے۔ اس تجویز کو زیادہ تر ان تغیرات کے ذریعے سے روبہ عمل لایا گیا جو ۳۲-۱۹۳۱ء میں نافذ کیے گئے۔

(۳) زرعی آمدنیوں پر انکم ٹکس کی معافی کا طریقہ بتدریج مرحلہ وار تاریخوں تک ختم کر دیا جائے[1]

یہ استدلال قابل اطمینان نہیں ہے کہ دوسرے ملکوں کے انکم ٹکس کے بدلے میں یہاں مالگزاری موجود ہے، اس لیے مالگزاری کے علاوہ انکم ٹکس عاید کرنا گویا دوہرا محصول لگانا ہے، کیونکہ مالگزاری دوامی بندوبست کے علاقوں کو چھوڑ کر عارضی بندوبست کے علاقوں میں بھی بڑھی ہوئی پیداوری کے تناسب سے نہیں بڑھائی جا سکتی۔ مالگزاری کے بندوبست میں وقتاً فوقتاً کافی تبدیلیاں ہونے سے سخت سیاسی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں جو بڑے کھیتوں کے ساتھ چھوٹے کھیتوں کو بھی متاثر کرتی ہیں۔ اگر زرعی آمدنیوں پر انکم ٹکس لگایا جائے تو اس قسم کے اعتراض نہیں پیدا ہوتے۔ زرعی منافعہ کا حساب لگانے کے لیے ان وسیع اور مکمل انتظامات سے موثر طریقے پر کام لیا جا سکتا ہے

[1] محصولات کی تحقیقاتی کمیٹی یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ مختلف قسم کے زمینداروں کے درمیان جو فرق و عدم مساوات ہے وہ اس وجہ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہاں زرعی آمدنیوں پر کوئی انکم ٹکس یا فوقی محصول نہیں ہے جو ترقی یافتہ ملکوں میں محصول ارضی میں تدریجی شرح کا نفاذ کا کام دیتے ہیں۔

جو کاغذات اراضی کی نگہداشت، مالگزاری کے بندوبست اور اس کی وصول یابی کے متعلق پہلے سے موجود ہیں۔ اس ٹیکس[1] کے فوائد میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ زرعی وغیر زرعی ذرائع آمدنی کی تفصیلات معلوم ہو جائیں گی جن کی بنا پر زمینداروں کی غیر زرعی آمدنیوں پر محصول زیادہ شرح سے لگایا جا سکے گا۔ اس کے علاوہ اس نئے محصول کا ایک ضمنی نتیجہ یہ ہوگا کہ محصولات سے بچنے کی خاطر صنعتی منافعہ کو اراضی میں مشغول کرنے کا جو رجحان پایا جاتا ہے اس کی روک تھام ہو جائے گی۔

چونکہ محصول کی شرح کا تعین کرنے کے لیے ذرائع آمدنی کی تمام تفصیلات کو
جانچنا ضروری ہوگا اس لیے مناسب یہ ہوگا کہ محصولات کا نظم و نسق اور محصول کی آمدنی ۵۳۲
وصول کرنے کا انتظام مرکزی حکومت کے ہاتھ میں رہے اور مرکزی حکومت ہی شرح کا تعین بھی کرے۔ البتہ مجموعی آمدنی میں سے مناسب حصہ اس صوبے کو واپس کیا جا سکتا ہے جہاں سے وہ وصول ہو۔

اصل کے بیرونی مشغولات کی آمدنی پر سر دست محصول معاف ہے بجز اس صورت کے کہ اس کو تین سال کے اندر ہندوستان میں لایا جائے۔ اس شرط میں ترمیم کر دینی چاہیے کیونکہ اس کی وجہ سے نہ صرف محاصل پر نقصان رساں اثر پڑتا ہے بلکہ ہندوستانی اصل کو ملک سے باہر بھیجنے اور اس کی آمدنی کو اس وقت تک باہر رکھنے کی ترغیب ہوتی ہے جب تک وہ بلا محصول ملک میں لائی جا سکتی ہے[2]۔

لہ۔ سائمن کمیشن کی رپورٹ کے متعلق اپنے مراسلہ میں حکومت ہند یہ استدلال کرتی ہے کہ زرعی آمدنیوں کی محصول کی معافی کے بارے میں جو اعتراضات کیے جاتے ان کے باوجود یہ معافی دیرینہ روایات کا حوالہ رکھتی ہے اور اراضی کا کاروبار ہمیشہ اس مفروضے کی بنا پر ہوتا رہا کہ یہ معافی باقی رہے گی۔ اس کے علاوہ حکومت ہند یہ بھی بتلاتی ہے کہ اکثر مقامی حکومتیں معافی کو منسوخ کرنے کی قطعی مخالف ہیں اور یہ خیال کرتی ہیں کہ اس اصلاح کو مستقبل قریب میں عمل میں لانا ممکن نہیں ہے —
(دیکھو مراسلہ، فقرہ ۹۲)

ٹہ۔ ۱۹۳۸ء کے انکم ٹیکس کے جدید مرممہ مسودۂ قانون میں محصول سے بچنے کی ان ترکیبوں کی روک تھام کی کوشش کی گئی ہے۔

اکتوبر ۱۹۳۵ء میں حکومت ہند نے ہندوستانی انکم ٹکس کے طریق اور انتظام کی جامع تحقیق کرانے کی غرض سے ایک کمیٹی کا تقرر کیا جو دو برطانوی ماہروں اور انکم ٹکس کے سینیئر ناظموں میں سے ایک ناظم پر مشتمل تھی۔ کمیٹی نے جو سفارشیں ۱۹۳۶ء میں پیش کیں ان کے مطابق ہندوستانی انکم ٹکس کے قانون کی ترمیم کی غرض سے حال ہی (اپریل ۱۹۳۸ء) میں ایک مسودۂ قانون بغرض اظہار رائے مجلس قانون ساز کی ایک منتخبہ کمیٹی کے تفویض کیا گیا ہے۔ اس مسودۂ قانون میں "تدریجی" طریق کی بجائے جس کے تحت آمدنی کے سلسلہ وار اجزاء پر متزائد شرحوں سے محصول لگایا جاتا ہے، موجودہ "یکساں" طریق رکھا گیا ہے جس میں تمام آمدنی پر ایک ہی شرح عاید کی جاتی ہے۔ اس مسودہ قانون کی رو سے آمدنی کی باضابطہ کیفیت پیش کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے اور شوہر اور بیوی کی مجموعی آمدنی پر محصول لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مسودۂ قانون نے اپنا یہ نصب العین قرار دیا ہے کہ ایسے عوام اور فرموں کی محصول سے بچنے کی کوششوں کی روک تھام کی جائے جن پر ٹکس بجا طور پر عاید ہو سکتا ہے لیکن جو قانون سے اس کی موجودہ حالت میں فائدہ اٹھا کر ٹکس وصول کرنے والے کی چھان بین کے باوجود ایسی ترکیبیں چلتے ہیں کہ ان کی آمدنی یا اس کے اجزاء ٹکس کی زد سے بچ جاتے ہیں۔ اس مسودۂ قانون کی متعدد دفعات مشترک سرمایہ کمپنیوں سے متعلق ہیں۔ اگرچہ ان مسوّدۂ قانون کو کاروباری حلقہ بہت اچھی نظر سے نہیں دیکھتا پھر بھی وہ موجودہ صورت حال کی کافی اصلاح کر دیتا ہے اور اس لحاظ سے اس کی قدر کرنی چاہئیے۔

۱۱- نمک نمک کا محصول دوسرے بہت سے محاصل راہداری کے ساتھ برطانوی حکومت کو اپنے پیشروؤں سے ترکے میں ملا۔ ۱۸۴۳ء میں یہ سب محصول منسوخ کر دیئے گئے لیکن نمک کا محصول بدستور قائم رہا بلکہ اس میں اور اضافہ کر دیا گیا۔ ۱۸۸۲ء سے پہلے تک اس محصول کی شرح مختلف صوبوں میں مختلف تھی۔ لیکن اس سال فی من دو روپے کی یکساں شرح مقرر کر دی گئی۔ ۱۸۸۸ء میں شرح مبادلہ کے گر جانے کے زمانے میں یہ شرح بڑھا کر ۲ روپے ۸ آنے کی گئی۔ یہ شرح ۱۹۰۳ء تک مسلسل قائم رہی جب کہ حکومت کی مالی حالت قابل اطمینان ہو جانے سے اس کو گھٹا کر ۲ روپے ۴ آنے کرنے کا موقع ملا۔ ۵۴۴

شرح اور کم کر کے ۱۹۰۵ء میں ڈیڑھ روپیہ اور ۱۹۰۷ء میں ایک روپیہ کر دی گئی اور اس سطح پر وہ مسلسل ۱۹۱۶ء تک قائم رہی جب کہ مالی تنگی کی وجہ سے وہ پھر بڑھا کر ایک روپیہ ۴ آنے کر دی گئی۔ ۱۹۲۳ء کا موازنہ پیش کرتے ہوئے حکومت نے محصول کو بڑھا کر ۲ روپے ۸ آنے کر دینے کی جو تحریک کی اس کو مجلس قانون ساز نے مسترد کر دیا لیکن گورنر جنرل نے اپنے خصوصی اختیارات سے کام لے کر اس کو منظور کر لیا۔ لیکن ۱۹۲۴ء میں مجلس قانون ساز نے اس اختیار سے کام لیا جو اس کو مرکزی حکومت کی طرف سے صوبہ واری حکومتوں کو محاصل میں سے کم حصہ دیئے جانے کی صورت میں نمک کا محصول گھٹا کر فی من ایک روپیہ ۴ آنے کرنے کے متعلق دیا گیا تھا۔ ۱۹۳۱ء کے ضمنی قانون مالیہ نے جس کی بموجب موجودہ شرح کے علاوہ ۲۵ فیصد زائد محصول عاید کیا گیا، ۳۰ ستمبر ۱۹۳۱ء سے نمک کے محصول کو بڑھا کر ایک روپیہ ۹ آنے کر دیا[1]۔ مجلس قانون ساز کے ۱۹۳۵ء کے موازنے کے اجلاس میں کانگریسی جماعت نے یہ کوشش کی کہ نمک کا بنیادی محصول فی من ایک روپیہ ۴ آنے سے گھٹا کر ۱۲ آنے کر دے (جس کے معنی یہ ہوتے کہ ۳½ کروڑ روپے کا نقصان ہوتا) لیکن اس کو ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ اسی جماعت نے مارچ ۱۹۳۶ء کے موازنے کے اجلاس میں بھی نمک کے محصول کی کامل تنسیخ کی ناکام کوشش کی۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان میں کن مختلف ذرایع سے نمک حاصل کیا جاتا ہے اور ان کی اضافی اہمیت کیا ہے (دیکھو جلد اول باب ۲ فصل ۳۹)۔ ملک میں جو نمک تیار کیا جاتا ہے ان پر دو خاص طریقوں سے محصول عاید کیا جاتا ہے۔ (۱) حکومت یا تو خود نمک تیار کرتی ہے یا نمک کی رسد کا اجارہ حاصل کرتی ہے اور نجی تیار کرنے والوں پر یہ لازم گردانتی ہے کہ وہ صرف حکومت کے ہاتھ فروخت کریں۔ اس طرح اس نمک کو خود حکومت محصول لگا کر فروخت کرتی ہے۔ (۲) دوسرا طریقہ جس پر مدراس میں عمل کیا جاتا ہے یہ ہے کہ حکومت چنگی کا محصول عاید کرتی ہے اور نجی طور پر نمک تیار کرنے والے کو اجازت دیتی ہے کہ نجی تاجروں یا خریداروں کے ہاتھ نمک

---

[1] ۔ نمک کے زاید (تاہینی) درآمدی محصول کے لئے (دیکھو جلد اول باب ۲ فصل ۳۹)

فروخت کرے۔ سرکاری کارخانے بعض صورتوں میں نجی افراد کو پٹے پر دیے جاتے ہیں جو حکومت سے اجازت حاصل کر کے نمک تیار اور فروخت کرتے ہیں۔ ہندوستان میں جتنا نمک صرف کیا جاتا ہے اس کی مقدار حالیہ سالوں میں ۵ کروڑ ۱۵ لاکھ اور ۵ کروڑ ۳۷ لاکھ من کے درمیان رہی۔ نمک کے محصول کی آمدنی ۶ کروڑ روپے اور ۷ کروڑ روپے کے درمیان ہوئی۔ اس حساب سے فی کس سالانہ تقریباً ۳½ آنے آمدنی وصول ہوئی۔ لیکن یہ اوسط اس وقت سے پہلے تک کا ہے جب کہ ۱۹۳۱ء کے ضمنی قانون مالیہ کی بموجب نمک کی کروڑگیری اور چنگی کے علاوہ ۲۵ فیصد زاید محصول عاید کیا گیا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ۳۸-۱۹۳۷ء میں نمک کے محصول کی آمدنی ۸ کروڑ ۲۵ لاکھ روپے ہوئی۔

۱۲- نمک کے محصول پر اعتراض۔

اگرچہ کہ نمک کا محصول بہت قدیم ہے لیکن اس کا شمار ہندوستان کے انتہائی غیر مقبول محصولوں میں کیا جاتا ہے۔ اس کو اس بنا پر حق بجانب قرار دیا گیا ہے کہ صرف وہی ایک ایسا محصول ہے جو عوام پر براہ راست عاید کیا جا سکتا ہے۔ آئین مملکت کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ ہر شہری کو حکومت کے مصارف میں کچھ نہ کچھ حصہ خواہ وہ کتنا ہی قلیل کیوں ہو لینا چاہئے۔ یہ
۵۳۴ چیز اس میں ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے میں مدد دے گی وسیع اور بیش خرچ تعیشات کی غیر محتاط طریقے پر تائید کرنے سے باز رکھے گی۔ لیکن اس کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ پہلے سے ایک راست ٹکس یعنی مالگزاری موجود ہے جس کو ہندوستان کے باشندوں کی اکثریت ادا کرتی ہے۔ رہے وہ لوگ جو مالگزاری ادا نہیں کرتے تو ان کے متعلق عام طور پر یہ قابلِ اعتماد نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس قدر مفلس ہیں کہ ان پر ٹکس عاید کرنے کا خیال اس کے معکوس سیاسی اصول کا کوئی لحاظ کیے بغیر ترک کر دینا چاہئے۔
نمک کے محصول کے بارے میں سب سے بڑا اعتراض یہ عاید ہوتا ہے کہ وہ ایسی شے پر عاید کیا جاتا ہے جو ضروریاتِ زندگی میں شمار ہوتی ہے۔ اور جس کے کم مقدار میں استعمال کیے جانے سے لوگوں کی جسمانی نشو و نما پر برا اثر پڑتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۰۳ء سے نمک کے محصول میں جو لگاتار کمی کی گئی اس کی وجہ سے نمک کے استعمال میں کافی اضافہ ہو گیا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس سے پہلے تک محصول کی شرح

ناعاقبت اندیشی سے زیادہ رکھی گئی تھی ۔ یہ ٹیکس ایک رجعتی محصول ہے جس کا بار متمول طبقے کے مقابلے میں غریبوں پر زیادہ پڑتا ہے، کیونکہ غریب لوگ امیر لوگوں کے مقابلے میں اپنی آمدنی کا نسبتہً بڑا حصہ نمک پر خرچ کرتے ہیں۔ نمک کے محصول کی تائید میں بالعموم یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ وہ ایک پرانا محصول ہے اور پرانا محصول، محصول کی تعریف میں اس وجہ سے نہیں آسکتا کہ پرانی عادت کی وجہ سے لوگ اس کو زحمت اور بار خیال کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ گو اس کی فوری تنسیخ عملی اسباب کی بنا پر ناممکن ہے پھر بھی سرکاری پالیسی کا نصب العین یہی ہونا چاہئیے کہ اس کو بتدریج منسوخ کر دیا جائے جس وقت تک اس محصول کو ترک کرنا ممکن نہ ہو اس وقت تک کم از کم اس کی شرح ممکنہ طور پر کم رکھی جائے[1] محصول وصول کرنے کے موجودہ انتظام کے ذریعے سے بہت آسانی کے ساتھ زیادہ آمدنی وصول کی جاسکتی ہے۔ لیکن بجز شدید ضرورت کے مواقع کے کبھی اس محصول میں اضافے کا خیال نہ کرنا چاہئیے اور جو بھی اضافہ کیا جائے اس کو صرف ضرورت کے پورا ہونے تک باقی رکھنا چاہئیے ۔

۱۳- افیون

جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے حالیہ زمانے تک افیون آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ تھی اور کبھی کبھی اس مد سے غیر متوقعہ طور پر کثیر آمدنی حاصل ہونا ایک ایسی بات تھی جو زبان زد خاص و عام تھی۔

جہاں تک افیون کی آمدنی کے انتظامی پہلو کا تعلق ہے بھاری برآمدی محصول عائد کرنے کے بجائے حکومت کے اجارے کے تحت افیون تیار اور فروخت کرنے کا طریقہ ترجیحی طور پر اختیار کیا گیا، کیونکہ وہ نہ صرف آمدنی کے نقطۂ نظر سے زیادہ قابل اطمینان تھا بلکہ چور تجارت کی بھی روک تھام کرتا تھا۔

۱۹۳۵ء کے ختم تک افیون کی آمدنی کے تین اہم ذرایع تھے :- (۱) اس افیون کی فروخت کا نفع اجارہ جو سرکاری کارخانوں میں بیرونی ملکوں کو برآمد کرنے کے خیال سے تیار کی جاتی تھی - (۲) اس افیون پر عائد کیے ہوئے برآمدی محصول کی آمدنی

---

[1] ۔ ڈاکٹر آر، پی، برچ ہائی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ فی من ۸ آنے اس محصول کی مناسب شرح ہوگی۔ دیکھو محصولات کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ (۱۶۸)۔

جو راجپوتانہ اور وسطی ہند کی دیسی ریاستوں سے بھیجی جاتی تھی ۔ (۴) اجازت نامہ کی فیس ۸۲۵
یا فروشندہ کی فیس کی شکل میں نفع اجارہ جو برطانوی ہند میں افیون کے اندرونی صرف پر وصول ہوتا تھا ۔ یہ آمدنی چنگی کی مد کے تحت اور پہلے دو ذرایع کی آمدنی خاص افیون کی مد کے تحت جمع یا ظاہر کی جاتی تھی ۔

۱۹۰۷ء میں حکومت ہند نے حکومت برطانیہ کے اصرار پر چین سے ایک رضی نامہ طے کر کے یہ ذمہ داری لی کہ چین کو ہندوستانی افیون کی برآمد ہر سال بتدریج کم کر کے دس سال کے اندر بالکل روک دی جائے گی ۔ یہ بھی طے پایا کہ چین نہ صرف اپنی پیداوار بلکہ بیرونی ملکوں سے درآمد پر بندشیں عاید کرے گا ۔ ۱۹۱۱ء میں ایک اور معاہدہ ہوا جس کی بموجب دس سالہ مدت میں مزید کمی کر دی گئی ۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء سے چین کو برآمد کرنے کے لیے افیون کی فروخت موقوف ہوگئی ۔ چین کو افیون کی برآمد میں وزیر ہند کے حکم کی بنا پر کمی کی گئی تھی اور وزیر ہند نے یہ حکم اس تحریک سے متاثر ہو کر دیا تھا جو افیون کی تجارت چین سے موقوف کرنے کی تائید میں انگلستان کے طول و عرض میں جاری تھی ۔ اس کارروائی کے بارے میں یہ اعتراض کیا گیا کہ برطانیہ کے نیک ارادوں کو پورا کرنے کی خاطر ہندوستان کے محاصل کا نقصان کیا گیا ۔ یہ بھی شکایت کی گئی کہ چین ان شرائط کو پورا کرنے سے قاصر رہا جو معاہدے کے بموجب اس پر عاید ہوتی تھیں اور اپنی افیون کی پیداوار میں کمی نہ کر سکا ۔ بااین ہمہ ہندوستان کو مطمئن ہونا چاہیئے کہ اس نے چین کے متعلق اپنا فرض ادا کر دیا ہے اور محاصل کے نقصان کا افسوس نہ کرنا چاہیئے ۔ افیون کی برآمد چین کو کم مقدار میں ہونے سے جو مالی نقصان ہوا اس کا فوری اثر اس وجہ سے ظاہر نہ ہو سکا کہ افیون زیادہ قیمت پر فروخت کی گئی ۔ لیکن آج کل (۱۹۳۸ء ۔ ۳۹ء) افیون سے جو آمدنی ہو رہی ہے وہ سابق کے مقابلے میں بہت کم ہے ۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء کے پہلے کے تین سالوں کا سالانہ اوسط تقریباً ۸ کروڑ روپے تھا لیکن اس وقت نصف کروڑ روپے سے بھی کم ہو گیا ہے ۔ فروری ۱۹۲۶ء میں لارڈ ریڈنگ نے یہ اعلان کیا کہ حکومت آیندہ سے بجز خاص طبی اغراض کے تمام دوسرے اغراض کے لیے افیون کی برآمد موقوف کر دینا چاہتی ہے ۔ چنانچہ اپریل ۱۹۲۶ء سے افیون بیرونی اور نوآبادیاتی حکومتوں کو براہ راست فروخت کے طریقے پر برآمد کی جانے لگی اور کلکتے میں

افیون کے نیلام کا پرانا طریقہ ترک کر دیا گیا۔ مجلسِ اقوام کی ہدایت کے مطابق افیون برآمد کرنے کی اجازت حاصل کرنے کی لازمی شرط یہ قرار دی گئی کہ ہر صورت میں افیون درآمد کرنے والے ملک کی حکومت کا جاری کردہ صداقت نامۂ درآمد پیش کیا جائے۔ حکومت ہند نے اس سے اتفاق کر لیا کہ وہ ۱۹۳۵ء کے ختم ہونے سے پہلے ہی افیون کی برآمد روک دے گی۔ چنانچہ سر جیمس گرگ رکن مالیہ نے اپنے موازنے کی تقریر (۱۹۳۶ء۔۱۹۳۷ء) میں بتلایا کہ ۱۹۳۵ء کے تقویمی سال کے اختتام کے بعد سے کھانے کی افیون کی برآمد سے بھی آمدنی کا وصول ہونا موقوف ہو گیا۔ آج کل افیون کی آمدنی صرف اس افیون تک محدود ہے جو ہندوستان میں استعمال کی غرض سے فروخت کی جاتی ہے اندرونی صرف پر سخت نگرانی قایم ہے۔ لیکن مجلسِ اقوام نے جو معیار مقرر کر دیا ہے اس کے لحاظ سے اندرونی صرف بہت زیادہ ہے۔ فی الجملہ بحیثیت ذریعۂ آمدنی افیون کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ہے۔

٥٣٦

صوبہ واری محاصل کی مدیں

۱۴۔ مالگزاری مالگزاری کی مفصل حالت جلد اوّل باب ۸ میں بیان کی جا چکی ہے۔ برطانوی ہند کی مالگزاری کی مجموعی مقدار ۱۹۲۷ء۔۲۸ء کے ۳۵ کروڑ، ۲۷ لاکھ روپیے کے مقابلے میں ۱۹۳۶ء۔۳۷ء میں ۳۱ کروڑ ۸۹ لاکھ روپیے ہوئی۔ یہ کمی دیہی علاقوں میں کساد بازاری رونما ہونے کی وجہ سے واقع ہوئی۔

۱۵۔ چنگی برطانوی ہند میں چنگی کی آمدنی نشہ آور شراب۔ قنب (گانجہ بھنگ وغیرہ) ادویہ، افیون وغیرہ کی تیاری اور فروخت پر وصول کی جاتی ہے۔ وہ ان اشیا کی تیاری اور اجازت نامۂ فروخت پر محصول عاید کر کے وصول کی جاتی ہے۔ اس آمدنی کا بیشتر حصہ نشہ آور شراب سے وصول ہوتا ہے۔ ایسی شراب کی چنگی کے بارے میں یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ پورے ضلع کے لیے تھوک فروشی کا ٹھیکہ دے دیا جاتا ہے اور خردہ فروشی کا حق نیلام کیا جاتا ہے۔ حال میں بمبئی کی دو شراب

کی بھٹیاں حکومت کی کامل نگرانی میں لے لی گئی ہیں اور اس طرح شراب کو ٹھیکے پر کشید کرانے کا طریقہ ایک حد تک روک دیا گیا ہے۔ ۱۸۶۱ء سے ۶۲ء میں چنگی کی آمدنی ۱ کروڑ ۸ لاکھ ۶۱ ہزار ۵ سو ۷۰ روپے اور خرچ ۱۳ لاکھ ۳۵ ہزار ۴ سو ۷۰ روپے تھا۔ ۱۹۲۹ء سے ۳۰ء میں آمدنی اور خرچ بڑھ کر علی الترتیب ۲۰ کروڑ ۴۱ لاکھ ۲۳ ہزار ۲ سو ۸۵ روپے اور ۲ کروڑ ۱۹ لاکھ ۱۸ ہزار ۳ سو ۹۱ روپے ہو گئے۔ خالص آمدنی میں جو حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے آیا اس کو کثرتِ شراب خواری کی علامت خیال کیا جائے یا نہیں ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔ حکومت آمدنی کے اس اضافے کو بڑی حد تک چنگی کے محصول کی شرحوں کے بڑھا دیے جانے اور سخت نگرانی کیے جانے کی طرف منسوب کرتی ہے، اگرچہ کسی حد تک آبادی کے اضافے اور بعض طبقوں کے تمول کے بڑھ جانے کو بھی اس صورت حال کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ حالیہ زمانے میں زیادہ تر معاشی کساد بازاری کی وجہ سے چنگی کی آمدنی میں کافی کمی ہو گئی ہے۔ ۱۹۳۶ء تا ۳۷ء میں اس سے صرف ۱۵ کروڑ ۳۷ لاکھ روپے وصول ہوئے۔

لیکن ہندوستان میں رائے عامہ اس کثیر آمدنی کو کثرت شراب خواری کی قطعی علامت تصور کر کے سخت پریشان ہے۔ ۱۹۲۱ء میں اصلاحات کے نفاذ کے بعد سے مختلف صوبوں کی مجالس قانون ساز اس خرابی کو قبل اس کے کہ وہ موجودہ سے زیادہ شدید صورت اختیار کر لے قابو میں لانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ جولائی ۱۹۲۴ء میں بمبئی کی قانونی کونسل نے ایک قرارداد منظور کی جو ۲۰ سال میں شراب کی بالکل ممانعت کر دینے کی تائید میں تھی۔

اگرچہ اس بارے میں عام اتفاق ہے کہ شراب نوشی کی خرابی کو دور کرنے کے لیے نہایت پرزور کوشش اور ہمت کی ضرورت ہے۔ لیکن اس امر کے متعلق کوئی سمجھوتہ نہیں ہوا ہے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کون سی تدابیر مناسب ہوں گی۔ کانگریسی وزارتوں کے صوبہ واری حکومتوں کے قبول کرنے سے پہلے تک حکومت کی پالیسی زیادہ تر یہ رہی کہ شراب ممکنہ طور پر زیادہ سے زیادہ قیمت پر فروخت کی جائے لیکن قیمت اتنی زیادہ بھی نہ رکھی جائے کہ ناجائز طریقے پر شراب سازی کو فروغ ہو۔ دیسی شراب کے استعمال کو کم کرنے کے متعلق جو دوسری تدابیر اختیار کی گئیں وہ یہ تھیں:۔ شراب کی راتب کا تعین شراب

۵۳۷ کی دوکانوں کی تعداد میں کمی، شراب رکھنے کی مقدار کو گھٹا دینا، شراب کی تیزی میں کمی، شراب کی فروخت کے اوقات کی تحدید وغیرہ۔ غیر سرکاری رائے چنگی کی شرحوں کو بڑھانے کی بجائے اس کو زیادہ مناسب طریق کار خیال کرتی ہے کہ مقدار پر بندشیں عاید کی جائیں اور دوکانیں سختی کے ساتھ منضبط تعداد میں رکھی جائیں۔ ساتھ ہی مقامی حالات کے لحاظ سے مناسب کارروائی کی جائے اور مقامی رائے سے مشورہ کیا جائے۔ جہاں تک دیسی شراب کا تعلق ہے حکومت بمبئی نے جو پالیسی اختیار کی وہ یہ تھی کہ شراب سالانہ معینہ مقدار میں فروخت کی جائے اور اس مقدار کو بھی ہر سال بتدریج گھٹایا جائے۔

جولائی ۱۹۳۷ء میں کانگریسی وزارتیں قایم ہوگئیں اور انھوں نے ترک مسکرات کی پالیسی پر عمل کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔ ان کے برسر اقتدار آتے ہی اس مسئلے نے اور بھی زیادہ اہمیت حاصل کر لی۔ اب کانگریسی صوبوں کی اکثر وزارتوں نے شدومد سے ترک مسکرات کا پروگرام شروع کر دیا ہے جس کی شدت مقامی، انتظامی اور مالی حالات کے لحاظ سے مختلف ہے۔ مدراس کی وزارت نے ہمت سے کام لے کر ایک اچھی مثال قایم کی اور وہ اس طرح کہ ایک ضلع (سیلم) کے سارے علاقے میں ترک مسکرات کی مہم جاری کر دی۔ بہار نے بھی اسی طرح کی کارروائی کی۔ (جولائی ۱۹۳۸ء میں) بمبئی نے احمدآباد کے شہر میں شراب خواری کو ممنوع قرار دیا۔ بعض صوبوں نے اس سے چھوٹے علاقوں کا انتخاب کیا ہے۔ دوسرے صوبے مختلف تدابیر اختیار کر رہے ہیں، مثلاً شراب کی دوکانوں پر پابندیاں عاید کر کے بکری کی روک تھام، اجازت ناموں کا سخت جانچ پڑتال کے بعد اجرا، اور شراب کی تیاری اور خرید و فروخت کے لیے ممنوعہ علاقوں کا اعلان۔ البتہ باہر کی شراب درآمد اور استعمال کرنے کی اجازت ہے۔

یہ ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ اگر کسی قسم کی بے صبری سے کام لیا گیا اور اندھا دھند سخت کارروائی کی گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دو دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا یعنی ایک تو آمدنی کا فوری اور بھاری نقصان اٹھانا پڑے گا۔ دوسرے چور تجارت اور ناجائز کشید کی روک تھام کے سلسلے میں کثیر مصارف لاحق ہو جائیں گے۔ اگر ایک ہی ہلے میں شراب کو کاملاً ممنوع قرار دینے کی کوشش کی گئی تو ظاہر ہے کہ یہ مشکلات نازک شکل اختیار کر لیں گی۔ اس کے علاوہ ایک اور خطرے سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور وہ یہ ہے

کہ اگر اس خرابی کو ایک سمت سے سختی سے روکنے کی کوشش کی جائے تو ممکن ہے کہ وہ دوسری سمت سے اس سے بھی زیادہ بری شکل میں رونما ہو۔ چنانچہ یہ شکایت کی جاتی ہے کہ دیسی شراب کے استعمال کو کم کرنے کی کوشش کی گئی تو بعض صورتوں میں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیرونی شراب کا صرف بڑھ گیا بلکہ لوگوں نے دیسی شراب کی بجائے میتھل ایٹیڈ اسپرٹ کا استعمال شروع کر دیا۔ اس خرابی کو دور کرنے میں پوری کامیابی صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے جب کہ لوگوں میں یہ عام احساس پیدا ہو جائے کہ شراب خواری ایک گناہ ہے اور یہ احساس اس جرم کے مضر نتائج سے واقف ہونے پر پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ دانشمندانہ چنگی کی پالیسی شراب خواری کے مواقع کو کم کرنے کے علاوہ اس کے مضر اثرات کو بھی واضح کرے گی۔ اس استدلال پر کہ اصلاح باہر سے ہونے کی بجائے اندر سے ہونی چاہیئے اس حد تک زور نہ دینا چاہیئے کہ کثرت شراب خواری کی دشواریوں کو بڑھانے کی غرض سے جو تدابیر اختیار کی جا رہی ہوں ان کی افادیت سے بالکل انکار کر دیا جائے۔
یہ تدابیر کم از کم ان لوگوں کے لیے یقیناً مفید ہیں جو ابھی شراب کے قطعی طور پر عادی نہیں ہوئے ہیں۔ ۳۸ ہ
اور اس کے حاصل کرنے کی کوئی سہولت نہ پا کر اس کو بالکل چھوڑ دیں گے۔

عملی مدبر سیاست کو چاہیئے کہ ان تمام خطرات اور دقتوں کو پیش نظر رکھے جو اصلاح کے راستے میں رکاوٹ پیدا کر سکتی ہیں اور اس کی پالیسی کا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ جرات اور احتیاط دونوں کو خوش اسلوبی سے ملا کر کام لیا جائے۔ اس کو دیانت داری سے یہ کوشش کرنا چاہیئے کہ خالص آمدنی بڑھانے کے خیال کو ثانوی حیثیت دے۔ اگر اس اصول پر عمل کیا گیا تو ہمیں یہ توقع رکھنی چاہیئے کہ اس کی وجہ سے چنگی کی آمدنی میں بتدریج کمی ہونے لگے گی۔ سچ پوچھو تو حالیہ زمانے میں اکثر صوبوں کی آمدنی یا تو ایک حالت پر قایم رہی یا درحقیقت کم ہو گئی۔

۱۶۔ محاصل کے دوسرے ذرائع

(۱) اسٹامپ۔ اسٹامپ کے محاصل کی آمدنی عدالتی و تجارتی اسٹامپ سے وصول ہوتی ہے۔ اوّل الذکر مد دیوانی و فوجداری عدالتوں میں پیش ہونے والے عرضی دعووں اور دوسری دستاویزات کی فیس پر مشتمل ہے۔ موخر الذکر مد ان محاصل کی نمایندگی کرتی ہے جو تجارتی معاہدوں جائداد، اراضی، ہنڈیوں وغیرہ کی منتقلی کی تحریری دستاویزات پر عاید کیے جاتے

ہیں۔ عدالتی اسٹامپ سے جو آمدنی ہوتی ہے اس کو بعض لوگ حقیقی محصولات میں شمار نہیں کرتے، کیونکہ وہ ان خدمات کا صلہ یا معاوضہ ہیں جو ایک بیش خرچ محکمہ یعنی محکمۂ عدالت انجام دیتا ہے۔ ۱۹۳۶ء ـ ۳۷ء میں برطانوی ہند میں اسٹامپ کی مد کی آمدنی کی مقدار ۱۱ کروڑ ۸۸ لاکھ روپے تھی۔

(۲) جنگلات۔ اس مد سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ زیادہ تر لکڑی اور دوسری پیداوار کی فروخت، چرائی کے معاوضے، لکڑی کاٹنے اور دوسری پیداوار حاصل کرنے کے متعلق اجازت نامے کی فیس سے وصول ہوتی ہے۔ بازار کے حالات کے لحاظ سے آمدنی میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اگر جنگلوں کی مناسب طریقے سے پرداخت کی جائے اور ان سے اچھی طرح فائدہ اٹھایا جائے تو ان کا مستقبل نہایت شاندار ہوگا۔ ۱۹۲۸ء ـ ۲۹ء میں مرکزی وصوبہ واری جنگلات کی خام آمدنی ۵ کروڑ ۷۹ لاکھ روپے اور مصارف ۳ کروڑ ۳۴ لاکھ روپے ہوئے، جس کے منجملہ صوبوں کی آمدنی اور خرچ کا حصہ علی الترتیب ۵ کروڑ ۵۳ لاکھ روپے اور ۳ کروڑ ۱۱ لاکھ روپیہ تھا۔ ۱۹۳۲ء ـ ۳۳ء میں آمدنی گھٹ کر ۳ کروڑ ۷۷ لاکھ روپے اور مصارف گھٹ کر ۲ کروڑ ۹۱ لاکھ روپے ہوگئے۔ اس کے منجملہ صوبوں کا حصہ علی الترتیب ۳ کروڑ ۵۸ لاکھ روپے اور ۲ کروڑ ۶۸ لاکھ روپے تھا۔ اس طرح عالمگیر تجارتی کساد بازاری کی وجہ سے جنگلات کا خالص منافع گھٹ کر ۱۹۳۲ء ـ ۳۳ء میں ۸۶ لاکھ ۱۴ ہزار روپے اور ۱۹۳۳ء ـ ۳۴ء میں ۷۴ لاکھ ۹۰ ہزار روپے ہوگیا۔ لیکن ۱۹۳۴ء ـ ۳۵ء میں ہوا کا رخ بدلا اور خالص منافع کی مقدار بڑھ کر ۱ کروڑ ۳۴ لاکھ روپے ہوگئی[۵]۔ صوبہ واری حکومتوں کو جن کی تحویل میں جنگلات دیدیے گئے ہیں تجارتی کساد بازاری کے حالیہ سالوں تک کثیر خالص منافع یعنی کم وبیش ۲ ۱/۲ کروڑ روپے سالانہ وصول ہوتے رہے۔ ۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۰ء تک خالص سالانہ آمدنی کی مقدار صرف ۱۴ لاکھ روپے رہی۔ لیکن جنگلات سے اس سے بھی زیادہ اور ترقی پذیر آمدنی کو یقینی بنانے کے لیے کثیر ابتدائی اخراجات لاحق ہوں گے۔ ۱۹۳۶ء ـ ۳۷ء میں جنگلات کی مجموعی خام آمدنی کی مقدار ۴ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے تھی۔

۵۔ دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "ہندوستان ۱۹۳۴ء ـ ۳۵ء میں" صفحہ ۱۹۔

۹۳۶ (۳) رجسٹری وغیرہ ۔ رجسٹری کی آمدنی عدالتی اسٹامپ کی آمدنی کے مشابہ ہے اور رجسٹری شدہ دستاویزات کی مالیت کے لحاظ سے محض رجسٹری کی فیس سے وصول ہوتی ہے بعض دستاویزات کے لیے جو جائداد غیر منقولہ کی ہبہ، منتقلی اور معاملت کے متعلق ہوں رجسٹری لازمی اور دوسری صورتوں کے لیے اختیاری ہے۔ رجسٹری کی فیس کو انجام دادہ خدمات کا معاوضہ خیال کیا جاسکتا ہے، رجسٹری کے فوائد یہ ہیں کہ اس کی وجہ سے مقدمات پر یکسانیت کے ساتھ غور ہو سکتا ہے، فریقین لازمی طور پر مطلع ہو جاتے ہیں اور تشفی بخش ثبوت کے لیے ایک سند فراہم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے یا تو قانونی چارہ جوئی کی نوبت ہی نہیں آتی یا اگر آتی بھی ہے تو عدالتیں اس کا فیصلہ بلا مزید پیچیدگی کے کر سکتی ہیں ۔ اس مد سے بہت کم آمدنی ہوتی ہے ۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء-۳۷ء میں برطانوی ہند سے ۱ کروڑ ۸ لاکھ روپے وصول ہوئے ۔

(۴) مندرجۂ فہرست محصول ۔ یہ وہ محصول ہیں جن کو ۱۹۲۱ء کی اصلاحات کے بعد سے اپنے حسب صوابدید عاید کرنے کا اختیار صوبوں کو دیا گیا ہے۔ لیکن ان کے زیادہ منفعت بخش ثابت نہ ہونے یا دوسرے اسباب کی بناپر اس اختیار سے بہت زیادہ کام نہیں لیا گیا ۔ شرطا اور تفریح پر چار صوبوں یعنی بنگال، بمبئی، مدراس اور برما میں محصول عاید کیے گئے ہیں ۔ ان سے قلیل آمدنی وصول ہوتی ہے ۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء-۳۷ء میں صرف ۳۵ لاکھ ۴۸ ہزار روپے وصول ہوئے ۔ ظاہر ہے کہ بڑے شہروں میں جو پائے تخت ہیں سب سے زیادہ آمدنی وصول ہوتی ہے ۔

۱۷۔ ہندوستان میں سرکاری اخراجات

ہندوستان میں سرکاری اخراجات کے حسب ذیل مدات قایم کیے جاسکتے ہیں[ا]۔

(۱) قومی دفاع یعنی بری، بحری و ہوائی فوج، سرحدی فوجی اہمیت کی ریلوں، گودیوں اور دفاعی مورچوں نیز فوجی کارروائیوں مثلاً سرحدی مہموں وغیرہ کے اخراجات ۔

(۲) اندرون ملک امن و امان کا قیام :- (ا) پولس، عدالت اور محابس کے

ا ۔ دیکھو شاہ کی کتاب محولۂ بالا (صفحہ ۴۴-۴۶) ۔

اخراجات۔ (ب) عام نظم و نسق کے اخراجات۔ (ج) قانون سازی کے اخراجات کو شامل کر کے سیاسی اخراجات۔ بیرونی ممالک میں قونصلوں سفیروں کے ذریعے ملک کی نمایندگی کے اخراجات وغیرہ۔

(۳) قومی نشوونما۔ (ا) اخلاقی نشوونما کے اخراجات (ب) مادی نشوونما کے اخراجات۔ اول الذکر مد میں سائنس اور متفرق محکموں کو شامل کر کے تعلیمات کے اخراجات اور محکمہ طب و حفظ صحت کے اخراجات شمار کیے جا سکتے ہیں۔ موخرالذکر مد میں ریلوں، آب پاشی، تعمیرات عامہ، زراعت، قحط، ڈاک تار اور سرکاری قرضے کے سود کے اخراجات شامل ہیں۔ (غیر پیدا آور قرضے کے سود کو حقیقت میں مد (۱) یا (۲) کے تحت شمار کرنا چاہیے)۔

۱۸۔ سرکاری اخراجات کے اعداد۔

ہندوستان کے سرکاری اخراجات کی بحث کی تمہید کے طور پر ہم ذیل میں مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں کے اخراجات کے عام اعداد پیش کرتے ہیں:۔

۵۴۰ مندرجہ ذیل جدول میں مرکزی و صوبہ واری حکومتوں کے ان اخراجات کی اہم مدیں ظاہر کی گئی ہیں جو ۱۹۳۶ء سنہ ۳۷ء میں انگلستان اور ہندوستان میں وصول شدہ آمدنی پر عاید ہوتے ہیں۔

جدول (۱)

۱۹۳۶ء سنہ ۳۷ء میں انگلستان اور ہندوستان میں وصول شدہ آمدنی کے مقابلے میں سرکاری و صوبہ واری حکومتوں کے اخراجات

(ہزار روپیے کے حساب سے)

اخراجات کی مدیں	مرکزی	صوبہ واری
آمدنی کے مقابلے میں راست مطالبات	۴ ۲۷ ۱۲	۸ ۶ ۹۰۸
جنگلات کے اخراجات اور سرمایے کے دوسرے مصارف جو آمدنی پر عاید ہوتے ہیں	۸۳	۱ ۱۰۲

اخراجات کی مدیں	مرکزی	صوبہ واری
ریلوے کی آمدنی کی مد :-		
قرضے کا سود، مالی امداد اور محفوظ ذخیرہ وغیرہ۔	۳۲۶۸۶۷	۵۱
آب پاشی وغیرہ :-		
آمدنی کی مد کے اخراجات	۹۶۴	۷۶۸۷۰
سرمایے کی مد کے اخراجات جو آمدنی پر عاید کیے گئے	۱۵	۱۷۸
ڈاک اور تار :-		
آمدنی کی مد کے اخراجات	۷۸۸۲	—
سرمایے کی مد کے اخراجات جو آمدنی پر عاید کیے گئے	۳۵۸	—
قرضے کے انتظامات :-		
معمولی قرضے کا سود	۳۵۶۶۱۳	۸۰۷۶۶
ریلوں کو واجب الادا رقم کی منہائی	۲۹۶۱۸۳	۵۰
آب پاشی کو " "	۷۶۷	۵۹۶۶۴
ڈاک اور تار " "	۷۹۲۸	—
جنگلات " "	۶۹	۲۳۵۸
صوبہ واری قرضے کے ذخیرے کو واجب الادا رقم کی منہائی	۷۰۹۶۷۴	—
صوبہ واری حکومتوں " "	۷	—
محکمۂ نمک " "	۴۰۹	—
برقابی اسکیموں " "	—	۴۵۳۲
دوسرے سرکاری تجارتی کاروبار "	۲۸۰	۱۰۹
سڑکوں کی اصلاح و ترقی کی مد کے اخراجات	—	۲۰
باقی رقم جو معمولی قرضے کے سلسلے میں واجب الادا تھی	— ۲۸۷۰۴	۱۳۰۳۳
دوسری واجب الادا رقموں کا سود	۱۲۴۲۹۲	۱۴۵

اخراجات کی مدیں	مرکزی	صوبہ واری
قرضے کو کم کرنے یا اس سے بچنے کے سلسلے میں مصارف	۳۰۰۰۰	۱۴۶۶۶
قرضے کے انتظام کے سلسلے میں مجموعی مصارف	۱۲۵۵۸۸	۲۹۸۴۴
۵۴۱ سول نظم ونسق :—		
عام نظم ونسق	۱۸۰۴۹	۱۰۷۷۲۱
تنقیح	۱۰۹۱۴	—
انتظام عدالت	۸۰۰	۵۲۲۲۳
محابس وغیرہ	۲۲۸۸	۲۲۵۰۳
پولس	۵۵۱۲	۱۲۱۸۰۳
بندرگاہ اور جہاز رانی وغیرہ —	۲۶۶۱	۷۱۲
روشنی مینار اور روشنی جہاز	۹۶۲	—
امور مذہبی	۲۹۷۸	—
سیاسیات	۱۷۸۹۰	—
سرحدی پہرہ چوکی	۲۱۹۴۳	—
سائنسی محکمے	۷۳۶۰	۳۹۲
تعلیمات	۳۰۳۲	۱۲۱۸۸۶
طبابت	۲۶۳۱	۳۷۰۷۷
صحت عامہ	۲۱۰۴	۱۴۹۸۹
زراعت	۴۵۶۷	۲۵۷۲۳
صنعت	۸۱۷	۸۹۵۶
طیارہ رانی	۲۱۷۸	۴
متفرق محکمے	۲۴۱۷	۱۰۲۰۳

اخراجات کی مدیں	مرکزی	صوبہ واری
ہندوستانی محکمۂ خرید اشیاء	۳۲۲۵	—
میزان	۱۱۱۳ ۲۸	۵۲۴۱۹۲
سول نظم و نسق :-		
صنعتی نشو و نما کے سلسلے میں سرمایے کے اخراجات جو آمدنی پر عاید کیے گئے	-	لہ
کرنسی اور ٹکسال :-		
کرنسی	۱۸ ۶۲	—
ٹکسال	۱۹ ۰۹	—
میزان	۳۷ ۷۱	—
کارہائے غیر فوجی :-		
سول کام	۲۶۱۵۵	۸۲۷۶۴
بمبئی کی نشو و نما کی اسکیم	—	۳۶۸
برقابی اسکیموں پر لگائے ہوئے سرمایے کا سود	—	۵۹۴۳
میزان	۲۶۱۵۵	۸۹۰۷۵
سول کاموں پر سرمایے کے مصارف جو محاصل پر عاید کیے گئے	—	۷۹۳

لہ - دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "حکومت ہند کے مالیہ اور محصولات کے حسابات ۱۹۳۶ء-۱۹۳۷ء" جدول ۶ و ۹ -

اخراجات کی مدیں	مرکزی	صوبہ واری
متفرق:-		
امداد قحط	۶	۱۵۳۵
امداد قحط کے سرمایے میں انتقالات	-	۱۸۸۷
پنشن وغیرہ	۲۸۴۷۲	۵۰۸۴۱
متفرق	۱۳۱۰۶	۱۴۲۹۹
میزان	۴۱۳۸۳	۷۸۵۶۲
پنشن کے معاوضے	۵۰۷	۱۰۰۲
فوجی خدمات	۵۰۶۷۲۵	—
غیر معمولی اخراجات	۱۹۲۳	۲۵۰
صدر میزان[1]	۱۱۹۶۲۶۱	۹۱۵۵۰۷[2]

۵۴۲ سنہ ۱۸۵۸ء سے ۵۹ء سے سنہ ۱۹۳۶ء سے ۳۷ء تک سرکاری مصارف میں جو ترقی ہوئی اس کا حال جدول (۲) سے معلوم ہوتا ہے۔

جدول (۲)[3]

مرکزی اور صوبہ واری حکومتوں کے اخراجات کی ترقی

(کروڑ روپے کے حساب سے)

سال	اخراجات کی مقدار	سال	اخراجات کی مقدار
سنہ ۱۸۵۸ء سے ۵۹ء	۵۰.۱۹	سنہ ۱۹۲۳ء سے ۲۴ء	۲۰۶.۴۸

۱؎ دیکھو حکومت ہند کے مالیے اور محصولات کے حسابات (سنہ ۱۹۳۶ء سے ۳۷ء) جدول (۶) و (۹)۔

۲؎ اس میں ۳ کروڑ ۲۶ لاکھ ۹ ہزار روپے کی وہ رقم بھی شامل ہے جو انگلستان میں خرچ کی گئی۔

۳؎ دیکھو کے، ٹی، شاہ کی کتاب "ہندی مالیے کی ۶۰ سالہ سرگزشت" (دوسرا ایڈیشن) صفحہ (۴۶)۔ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ (۹۰۸))

سال	اخراجات کی مقدار	سال	اخراجات کی مقدار
سنہ ۱۸۶۰ء۔ سنہ ۶۱ء	۴۹ ؍ ۳۹	سنہ ۱۹۲۴ء۔ سنہ ۲۵ء	۲۱۰ ؍ ۲۵
سنہ ۱۸۸۰ء۔ سنہ ۱۸۸۱ء	۵۲ ؍ ۶۴	سنہ ۱۹۲۵ء۔ سنہ ۲۶ء	۲۱۵ ؍ ۷۵
سنہ ۱۸۹۰ء۔ سنہ ۹۱ء	۵۱ ؍ ۹۸	سنہ ۱۹۲۶ء۔ سنہ ۲۷ء	۲۲۱ ؍ ۸۲
سنہ ۱۸۹۸ء۔ سنہ ۹۹ء	۵۸ ؍ ۲۹	سنہ ۱۹۲۷ء۔ سنہ ۲۸ء	۲۱۸ ؍ ۷۳
سنہ ۱۸۹۹ء۔ سنہ ۱۹۰۰ء	۸۸ ؍ ۰۷	سنہ ۱۹۲۸ء۔ سنہ ۲۹ء	۲۲۲ ؍ ۲۱
سنہ ۱۹۰۲ء۔ سنہ ۰۳ء	۷۸ ؍ ۳۴	سنہ ۱۹۲۹ء۔ سنہ ۳۰ء	۲۲۶ ؍ ۸۱
سنہ ۱۹۱۰ء۔ سنہ ۱۱ء	۱۱۵ ؍ ۱۲	سنہ ۱۹۳۰ء۔ سنہ ۳۱ء	۲۳۰ ؍ ۴۲
سنہ ۱۹۱۳ء۔ سنہ ۱۴ء	۱۲۴ ؍ ۳۴	سنہ ۱۹۳۱ء۔ سنہ ۳۲ء	۲۲۰ ؍ ۰۹
سنہ ۱۹۱۶ء۔ سنہ ۱۷ء	۱۴۷ ؍ ۰۷	سنہ ۱۹۳۲ء۔ سنہ ۳۳ء	۲۰۹ ؍ ۵۵
سنہ ۱۹۱۸ء۔ سنہ ۱۹ء	۱۹۶ ؍ ۶۱	سنہ ۱۹۳۳ء۔ سنہ ۳۴ء	۲۰۵ ؍ ۲۷
سنہ ۱۹۲۰ء۔ سنہ ۲۱ء	۲۱۸ ؍ ۶۷	سنہ ۱۹۳۵ء۔ سنہ ۳۶ء	۲۰۰ ؍ ۷۶
سنہ ۱۹۲۱ء۔ سنہ ۲۲ء	۲۲۲ ؍ ۰۲	سنہ ۱۹۳۶ء۔ سنہ ۳۷ء	۲۱۱ ؍ ۱۸

۱۹۔ ہندوستان میں سرکاری اخراجات پر اعتراضات

مندرجۂ بالا جدول (۲) کے اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ صدی کے آغاز سے خاصکر سنہ ۱۹۱۳ء۔ سنہ ۱۴ء سے معاشی کساد بازاری کے حالیہ زمانے تک (جن کی وجہ سے کسی حد تک اخراجات میں لامحالہ کمی کرنی پڑی) ہندوستان میں سرکاری اخراجات میں خاصا اضافہ ہوتا رہا۔ جیساکہ مسٹر گوکھلے آنجہانی نے بہت زمانہ پہلے کہا تھا سرکاری اخراجات کی زیادتی پر افسوس اور پریشانی کا اظہار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس معاملے کا سارا دار و مدار نہ صرف اس بات پر ہے کہ زاید اخراجات

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۰۷) سائمن کمیشن رپورٹ جلد دوم فقرہ (۲۵۴)؛ برطانوی ہند کا اعدادی خلاصہ (سنہ ۱۹۳۵ء۔ سنہ ۳۶ء) جدول (۱۰۸)؛ اور حکومت ہند کے مالیے اور محاصل کے حسابات (سنہ ۱۹۳۶ء۔ سنہ ۳۷ء)۔

جن کاموں کے لیے لاحق ہوئے ان کی نوعیت کیا ہے بلکہ اس بات پر بھی کہ سرکاری روپیہ اس طرح خرچ کرنے سے کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ برطانیہ، فرانس اور اٹلی بلکہ یورپ کے تقریباً تمام ملکوں کے قومی اخراجات بہت بڑھے ہوئے ہیں اور بڑھتے جا رہے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے بڑھے ہوئے اخراجات اور دوسرے ممالک کے بڑھے ہوئے اخراجات کے درمیان ایک نہایت ہی بنیادی صورت میں فرق و اختلاف پایا جاتا ہے۔ جہاں دوسرے ممالک کے اخراجات جن پر عوام کی نگرانی ہے متعلقہ قوموں کو زیادہ طاقت ور اور مستحکم بنانے میں مدد دے رہے ہیں اور عوام کی روشن خیالی اور خوش حالی کو بڑھا رہے ہیں وہاں ہمارے مسلسل بڑھتے ہوئے اخراجات میں استبدادی انتظام، کمزور آئینی نگرانی اور غیر ملکی تسلط کی سب خرابیاں موجود ہیں۔ ان اخراجات نے غیروں کو ہمارے ذرائع سے دوامی فائدہ حاصل کرنے کی روز افزوں سہولتیں بہم پہنچائیں، ہماری قومی ترقی میں رکاوٹ ۵۴۳
پیدا کی، ہمارے قدرتی استحکامات کو کمزور کر دیا اور ہمارے سر پر غیر معین و غیر محدود مالی ذمہ داریاں عاید کر دیں۔ چونکہ برطانوی سرحدی پیش بندی کی پالیسی، ملک گیری کی ناگہانی ضرورت اور سلطنت برطانیہ کی مدافعت کے سلسلے میں اخراجات مجبوراً گوارا کرنے پڑتے ہیں اور بالعموم انگریز تجارتی جماعتوں کے دباؤ سے تجارتی کاموں کے لیے مسلسل قرضوں کا بار اٹھانا پڑتا ہے اس لیے حکومت ہند محصولات میں اس قدر اضافہ کر دینے کے باوجود قومی تعلیم کے کاموں کے لیے بہت کم رقم خرچ کر سکتی ہے[1]" مسٹر گوکھلے نے سرکاری اخراجات کے اضافے کے بڑے حصے کو اس بدگمانی اور بے اعتمادی کی طرف منسوب کیا جو غدر نے پیدا کر دی تھی، جس کی وجہ سے برطانوی عہدہ داروں کو بڑی بڑی تنخواہیں دے کر سول اور فوجی دونوں قسم کی خدمات پر مقرر کرنا پڑا تھا۔ سرکاری اخراجات میں سب سے زیادہ اضافہ جنگ کے زمانے میں اور اس کے بعد ہوا۔ جنگ سے پہلے بھی فوجی خدمات کے لیے ہمارے اخراجات کافی زیادہ تھے، چنانچہ سنہ ۱۴-۱۹۱۳ء میں ان کی مقدار ۲۹ کروڑ ۸۴ لاکھ روپے تھی۔ لیکن وہ بہت تیزی سے بڑھ کر سنہ ۱۸-۱۹۱۷ء

[1] دیکھو جی، کے، گوکھلے کی تحریری یادداشت جو انھوں نے ویلبی کمیشن کے سامنے سنہ ۱۸۹۷ء میں پیش کی۔

میں ۴۴ کروڑ ۶۵ لاکھ روپے، ۱۹۱۸ء-۱۹ء میں ۶۶ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے اور ۱۹۲۰ء-۲۱ء میں ۶۰ کروڑ ۳۸ لاکھ روپے ہوگئے۔ اس کے بعد سے فوجی اخراجات گھٹاکر ۱۹۲۷ء-۲۸ء میں ۵۴ کروڑ ۹۲ لاکھ روپے کردیے گئے۔ ۱۹۲۸ء-۲۹ء میں سالانہ فوجی موازنہ چار سال کے لیے ۵۵ کروڑ ۱۰ لاکھ روپے مقرر کردیا گیا[1]۔ انچ کیپ کمیٹی (۱۹۲۲ء-۲۳ء) نے سفارش کی تھی کہ فوجی اخراجات، ۶۰ کروڑ ۳۸ لاکھ روپے سے فوراً گھٹاکر ۵۰ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے کردیے جائیں اور اس بات پر زور دیا کہ حکومت ہند کو اسی پر قناعت نہ کرنی چاہیے بلکہ فوجی اخراجات کی تفصیلات پر نظر رکھنی چاہیے تاکہ چند سال میں ان کو گھٹاتے گھٹاتے قیمتیں گرجانے کی صورت میں زیادہ سے زیادہ ۵۰ کروڑ روپے مقرر کیا جاسکے۔ سائمن کمیشن نے یہ خیال ظاہر کیا کہ فوجی موازنہ گھٹاکر ۴۵ کروڑ روپے تک اس صورت میں لایا جاسکتا ہے جبکہ فوج کو میکانی بنانے کا موجودہ پروگرام ختم ہوجائے اور اس کے بعد بھی قیمتوں کی کمی کے لحاظ سے یہ اخراجات اور بھی کم ہوسکتے ہیں بہ شرطیکہ مقررہ پالیسی میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ حالیہ زمانے میں[2] دفاعی اخراجات

---

[1] معاشی کساد بازاری اور مالی دباؤ کی وجہ سے منظورہ تعہد کی رقم میں کمی کرنا اور نئے ساز و سامان کی فراہمی کے پروگرام میں کاٹ چھانٹ ضروری ہوگئی۔

[2] حالیہ زمانے میں فوجی اخراجات میں کافی کمی ہوجانے کی وجہ یہ تھی کہ سامان کی قیمتیں گرگئی تھیں، برطانوی سپاہیوں کی تنخواہوں پر نظر ثانی کی گئی تھی، اور کیپی ٹیشن ٹریبیونل (ایک فوجی کمیٹی) کی تجویز کے مطابق ہندوستانی فوجی اخراجات کے لیے حکومت برطانیہ کی طرف سے ۲ کروڑ کی امداد مقرر کی گئی تھی اور فوجی مصارف اور تنخواہوں میں تخفیف کردی گئی تھی (دیکھو رکن مالیہ کی موازنے کی تقریر ۱۹۳۴ء-۳۵ء) حال (۱۹۳۸ء) میں حکومت برطانیہ نے یہ تصفیہ کیا کہ ہندوستان میں متعین برطانوی پیادہ و سوارہ فوج کے دستوں کو میکانی بنانے کے مصارف کے لیے ۵۰ لاکھ روپے کا سرمایہ فراہم کرے گی۔ برطانوی حکومت نے اس کو بھی منظور کرلیا ہے کہ ہندوستان کی طرف سے اس کے بحری دفاع کے لیے سالانہ ایک لاکھ پونڈ کی جو رقم برطانیہ کو دی جاتی تھی اس سے دست بردار ہوجائے بہ شرطیکہ ہندوستان جدید وضع کے بدرقے کے چھ جہازوں کے بحری بیڑے کا قیام و انتظام اپنے ذمے لے اور یہ بیڑہ نہ صرف ہندوستان کی مدافعت کے لیے شاہی بحریے سے تعاون کرنے کے لیے آزاد ہو بلکہ ہندوستانی بندرگاہوں کی مقامی حفاظت کی بھی ذمہ داری قبول کرے۔ (دیکھو رکن مالیہ کی موازنے کی تقریر ۱۹۳۸ء) یہ تجویز نہایت مستحسن ہے کیونکہ وہ شاہی ہندوستانی بیڑے کی نشو و نما کو مدد دے گی۔

بہت گھٹا دیے گئے ہیں (اگرچہ یہ عمل کسی حد تک عارضی نوعیت کی مفاجی کارروائیوں کا نتیجہ ۹۴۵
تھا)۔ چنانچہ فوجی محکمے کی آمدنی کو محسوب کرنے کے بعد ۱۹۳۶ء ۔ ۳۷ء کا پختہ موازنہ ۴۵ کروڑ ۴۵ لاکھ روپے تھا۔ ۱۹۳۷ء ۔ ۳۸ء کا فوجی موازنہ نہ فوجی محکمے کی آمدنی کو جس کا اندازہ ۵ کروڑ ۲۲ لاکھ روپے کیا گیا تھا محسوب کرنے کے بعد ۴۴ کروڑ ۶۲ لاکھ روپے تھا۔ پختہ موازنے میں ۲ کروڑ ۱۰ لاکھ روپے کا اضافہ ظاہر کیا گیا جو زیادہ تر ان مصارف کی وجہ سے ہوا جو وزیرستان میں فوجی کارروائیوں کے سلسلے میں ہوئے۔ ۱۹۳۸ء ۔ ۳۹ء کی مد دفاعی خدمات کے لیے ۴۵ کروڑ ۱۸ لاکھ روپے کی خالص مجموعی رقم فراہم کی گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سابقہ سال کے موازنے کے تخمینے سے ۵۶ لاکھ روپے زیادہ رکھے گئے ہیں۔ وقتاً فوقتاً کفایت کے جو طریقے تجویز کیے گئے ہیں حسب ذیل ہیں:۔ (۱) فوج کی تعداد گھٹا کر ہندوستان کی ضروریات کے لحاظ سے کم کر دی جائے۔ (۲) فوج میں ہندوستانیوں کو مسلسل اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں لیا جائے تاکہ ان کثیر مصارف کی بچت ہو سکے جو انگلستان میں برطانوی محکمۂ جنگ کے توسط سے سپاہی بھرتی کرنے میں لاحق ہوتے ہیں اور غیر موثر مصارف میں بھی بڑی حد تک کمی ہو جائے۔ یہ بھی مشورہ دیا گیا ہے کہ امن کے زمانے میں فوج کو کم و بیش جنگی اساس پر قایم رکھنے کی بجائے رضاکارانہ طریق کے تحت قلیل مدت کی فوجی خدمت کا طریقہ رائج کیا جائے۔

اگر مرکزی و صوبہ واری حکومتوں کے اخراجات کو یکجائی طور پر دیکھا جائے تو ۱۹۳۶ء ۔ ۳۷ء میں مجموعی اخراجات کے مقابلے میں فوجی خرچ کا تناسب ۲۴۷٫۱ فیصد تھا۔ (یہ فیصد اور زیادہ ہوتا اگر صرف مرکزی حکومت کے اخراجات محسوب کیے جاتے)۔ فیصد تناسب کی زیادتی بجائے خود اس بات کی قطعی دلیل نہیں ہو سکتی کہ فوجی اخراجات ضرورت سے زیادہ ہیں۔ چونکہ معاشی اور ہر دوسرے نقطۂ نظر سے حفاظت نہایت ضروری ہے اس لیے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے تقریباً ہر قسم کا ایثار کرنا ضروری ہے۔ کسی ملک کو دفاع پر کتنی رقم خرچ کرنی چاہیے اس کا انحصار نہ صرف ممکنہ دشمنوں کے رجحان اور منصوبوں پر ہوتا ہے بلکہ اس بات پر بھی کہ ملک کی قدرتی سرحدیں کتنی غیر محفوظ اور کمزور ہیں۔ اسی لیے اگر یہ بتلایا جائے کہ اخراجات کا بار تبا ہ کن ہے یا بعض دوسرے ملکوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ہے تو اس کے معنی لازمی طور پر یہ نہیں ہیں کہ

اخراجات کے حقیقی پیمانے کو مذموم قرار دیا جا رہا ہے۔ گو یہ سب کچھ بالکل درست اور بجا ہے، تاہم ہمیں احتیاط کرنی چاہیے کہ فوجی کارکردگی کی اصلاح کی کوشش کو خبط کے درجے تک نہ پہنچائیں۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان جیسے انتہائی غریب ملک کو جو ہر قسم کی قابل تصور ناگہانی ضرورتوں کا سامنا کرنے کے لیے خود کو بالکل تیاری کی حالت میں نہیں رکھ سکتا کسی حد تک اس قسم کے خطرات سے مفر نہیں۔ اس طریقے سے کامل قومی تحفظ حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن اس کا بار عوام کے لیے ناقابل برداشت ہوگا۔

۵۴۵ ہندوستان میں عوام یہ خیال کرتے ہیں کہ تحفظ کو پوری طرح ملحوظ رکھنے کے بعد تمام قابل عمل کفایات باضابطگی کے ساتھ عمل میں نہیں لائی گئی ہیں اور فوجی اخراجات کو نامناسب حد تک بڑھ جانے کا موقع دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ان تمام تحریکات کے لیے جن پر قومی تعمیر کا دارو مدار ہوا کرتا ہے کافی رقم مہیا نہیں ہو سکی۔ حکومت کی طرف سے تردید کیے جانے کے باوجود یہ خیال عام ہے کہ فوجی اخراجات میں کفایت کی خاصی گنجایش ہے۔ یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ حکومت نے ہمیشہ یہ دعویٰ کیا کہ وہ انتہائی کفایت شعاری سے کام لے رہی ہے۔ تاہم جیسا انچ کیپ کمیٹی نے باوجود اس کے کہ شرایط تحقیقات اس کو فوجی مصارف کے بعض اساسی اجزا کی تخفیف پر غور کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے مزید تخفیف کی سفارش کی تو حکومت کو کفایات عمل میں لانا مشکل نہیں معلوم ہوا بلکہ حالیہ زمانے میں اس نے فوجی مواز نے میں اتنی کمی کر دی کہ وہ کمیٹی کے تجویز کردہ معیار سے بھی کم ہو گیا۔ عوام فطری طور پر اگرچہ خلاف منطق یہ استدلال کرتے ہیں کہ اتنی کفایات عمل میں لائے جانے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مزید کفایات ممکن ہیں۔ جب تک فوجی نظم و نسق عوام کے منتخبہ نمایندوں کی نگرانی سے باہر رہے گا اور جب تک فوج کی اندرونی مجلسوں میں عوام کو داخل نہیں کیا جائے گا اس وقت تک عوام کی یہ روش بدستور باقی رہے گی اور فوجی اخراجات کے بارے میں حکومت کے خلاف عوام کی شکایات کا سلسلہ جاری رہے گا۔

ایک اور مسئلہ جس پر لگاتار اعتراضات کی بوچھار کی جاتی رہی ہے یہ ہے کہ سول نظم و نسق کے اخراجات بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ شکایت عام طور پر کی جاتی ہے کہ ہندوستانی نظم و نسق دنیا کے سب سے بیش خرچ نظم و نسق میں سے ہے اور

اعلیٰ عہدوں کے لیے جن پر حال تک یورپین اشخاص مامور کیے جاتے تھے، بیش قرار تنخواہیں اور کافی بڑے الاؤنس دیئے جاتے ہیں۔ اصلاحات نے ان اخراجات میں مختلف طریقوں سے مزید اضافہ کیا۔ لی کمیشن (۱۹۲۴ء) کی اس تجویز کے خلاف سخت اعتراضات کیے گئے جو تنخواہ، الاؤنس اور دوسری مراعات میں اضافے سے متعلق تھی اور جس کی بموجب فوجی اخراجات میں ۱½ کروڑ روپے سالانہ کے زائد خرچ کا اندازہ کیا گیا تھا۔ اس اضافے کو بالکل ناجائز قرار دیا گیا، کیونکہ تنخواہیں پہلے ہی سے اتنی زیادہ تھیں کہ گرانی کے باوجود ان میں کسی مزید اضافے کی ضرورت نہ تھی۔ موجودہ ارزانی اس اعتراض کو اور زیادہ تقویت دیتی ہے۔ اس صورت حال کی حقیقی اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ فوج کو ہندیانے کا کام تیزی سے شروع کر دیا جائے اور ساتھ ہی تنخواہوں کی شرح میں تخفیف کی جائے۔ اس طریقے سے جو کفایات عمل میں آئیں گی ان کی وجہ سے کارکردگی پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا بہ شرطیکہ فرقہ واری ترجیحات کے اصول کو یا تو ترک کر دیا جائے یا حالات اجازت دیں تو زیادہ سے زیادہ محدود طریقے پر کام میں لائیں۔ اگر سرکاری ملازمت میں بعض فرقوں کو ترجیح دینا ضروری ہو تو کچھ نہ کچھ اقل معیار قابلیت پر زور دینا چاہئے اور کسی مقررہ فرقے کے دائرے کے اندر بھی مسابقتی امتحانوں
کے ذریعے انتخاب عمل میں لانا چاہئے۔ ۵۴۶

اس طرح یہ نہایت ضروری ہے کہ نظم و نسق کے تمام شعبوں میں سختی کے ساتھ کفایت عمل میں لائی جائے۔ سرکاری رقوم کے محافظوں کو چاہئے کہ یہ بات بہت اچھی طرح سمجھ لیں کہ ٹکس ادا کرنے والے کے مقابلے میں ان کی حیثیت امانت دار کی ہے اور رقوم کا انتظام باقاعدگی سے کرنے میں زیادہ تندہی دکھائیں۔ ہم اس غیر سرکاری تجویز کا خیر مقدم کرتے ہیں جو مرکزی حکومت کے اخراجات کی تنقیح کے لیے تخفیف مصارف کی ایک کمیٹی مقرر کرنے کی تائید میں حال (اپریل ۱۹۳۸ء) میں مرکزی مجلس قانون ساز میں منظور ہوئی۔ لیکن ساتھ ہی لاتناہی اور بے امتیاز کفایت شعاری کے احمقانہ عمل سے باز رہنا بھی مساوی طور پر ضروری ہے اور تعلیمات[1]، زراعت، صنعت، آب پاشی اور صحت عامہ جیسے محکموں پر حتی الامکان

[1] برطانیہ عظمیٰ میں تعلیم پر فی کس حصہ ۱۲ شلنگ بیٹھتا ہے۔ برطانوی ہند میں تعلیمی خرچ ۹ پنس سے بھی کم ہے۔ دیکھو سائمن کمیشن کی رپورٹ جلد دوم فقرہ ۲۳۰۔

کشادہ دلی کے ساتھ رقم خرچ کرنی چاہئے، کیونکہ جب تک ان پر جی کھول کر روپیہ خرچ نہیں کیا جائے گا اس وقت تک عوام کی معاشی حالت کی اصلاح ناممکن ہے۔

۴۰ - محصولات کا بار

برطانوی ہند کے اعداد و شمار کے خلاصہ (۱۹۳۵ء-۳۶ء) میں برطانوی ہند کے محصولات کے فی کس بار کے متعلق حسب ذیل اعداد دیئے گئے ہیں:-

لاکھ روپے کے حساب سے

	۱۹۲۲ء-۲۳ء	۱۹۲۷ء-۲۸ء	۱۹۳۳ء-۳۴ء	۱۹۳۵ء-۳۶ء
مرکزی و صوبہ داری حکومتوں کے مجموعی محصولات (بشمول مالگزاری[1])	۱۳۲۷۹	۱۴۰۱۸	۱۳۰۷۹	۱۳۹۳۷
یہ فرض کرتے ہوئے کہ تمام محصولات برطانوی ہند کے باشندے ادا کرتے ہیں ۱۹۳۱ء کی مردم شماری[2] کے لحاظ سے فی کس ادائی۔	روپے۔آنے۔پائی ۵-۴-۵	روپے۔آنے۔پائی ۵-۵-۰	روپے۔آنے۔پائی ۴-۱۰-۱۰	روپے۔آنے۔پائی ۴-۱۴-۳

سر پرشوتم داس ٹھاکر داس نے تجارتی وفد کے رکن کی حیثیت سے تخفیف مصارف کے متعلق ایک تقریر میں محصولات کے بار کا مندرجہ ذیل تخمینہ پیش کیا:-

[1] محصولات کی تحقیقاتی کمیٹی کے اس خیال کا پہلے تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ مالگزاری کو بھی محصولات کے بار کا ایک حصہ شمار کرنا چاہئے۔ دیکھو جلد اول باب (۱۲) فصل (۲۸)۔

[2] دو مردم شماریوں کے درمیانی زمانے کی آبادی کے اعداد کا حساب اضافے کی مستقل ہندسی شرح کے مفروضے پر لگایا گیا ہے۔

	روپے - آنے - پائی		روپے - آنے - پائی
سنہ ۱۸۷۱ء	۱ - ۱۳ - ۹	سنہ ۱۹۱۱ء	۲ - ۱۱ - ۳
سنہ ۱۸۸۸ء	۲ - ۲ - ۳	سنہ ۱۹۱۴ء	۲ - ۱۴ - ۵
سنہ ۱۹۰۱ء	۲ - ۹ - ۶	سنہ ۱۹۲۲ء	۶ - ۱ - ۸

ان اعداد کے لحاظ سے ۱۹۲۲ء کے محصولات کا علامتی بار زمانۂ قبل از جنگ ۵۴۷
کے مقابلے میں دوگنا تھا۔ لیکن آیا وہ بار کی حقیقی زیادتی کو ظاہر کرتا ہے یا نہیں اس کا دار و مدار ان اعداد پر ہوگا جو ان دونوں زمانوں کی فی کس آمدنی کے متعلق مرتب کیے جائیں گے[1]

بعض اوقات یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ چونکہ ہندوستان میں فی کس آمدنی کے اوسط (یعنی ۸۰ روپے) کے مقابلے میں فی کس بار محصول کا تناسب بہت کم (یعنی ۸ فیصد) ہے، اس لیے ہندوستان میں محصولات کا بار دوسرے ملکوں مثلاً برطانیہ کے مقابلے میں بہت ہلکا ہے جہاں قومی آمدنی کا ۲۰ فیصد سے بھی زیادہ حصہ محاصل کی نذر ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ خیال حقیقت کے خلاف ہے، کیونکہ محصول کی قلیل مقدار جو قلیل قومی آمدنی پر عاید کی جائے کثیر آمدنی پر بڑے تناسب سے عاید کیے ہوئے محصول سے زیادہ زیر باری کا باعث بن سکتی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف ممالک کے محصولات کے بار کا باہمی موازنہ ان خدمات کی نوعیت کو جانچے بغیر نہیں کیا جا سکتا جو حکومت عوام پر ٹیکس عاید کرنے کے معاوضے میں انجام دیتی ہے۔

۲۱ - محصولات کے بار کی تقسیم

محصولات کے بار کا مسئلہ معاشیات میں نہایت ادق مانا جاتا ہے اور ہندوستان میں تو یہ اور بھی زیادہ پیچیدہ ہے کیونکہ یہاں فی کس آمدنی اور قومی آمدنی کی تقسیم کے متعلق صحیح اعداد دستیاب نہیں ہوتے۔ ان حالات میں محصولات کی تحقیقاتی کمیٹی کو آبادی کے خاص طبقوں کی آمدنی اور معیار زندگی کے متعلق انھی عام قیاسات کی طرف رجوع کرنا پڑا جو کسی دور اندیش رکن مالیہ نے محصولات کی اسکیم کی تیاری یا ترمیم کے وقت اپنی تحقیقات کے سلسلے میں قایم کیے تھے۔ کمیٹی نے آبادی کے چند خاص

[1] دیکھو باب (۴) فصل (۵) -

طبقوں کو چن لیا اور ان کی جو حالت اس وقت (سنہ ۱۹۲۴ ۔ ۲۵ء میں) تھی اور محصول کے نظام میں کسی قسم کے رد و بدل کرنے کی صورت میں آیندہ ہوتی اس کو پیش نظر رکھکر چند آزمایشی نتائج مرتب کیے۔ کمیٹی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ کسی طبقے پر بھی محصول کا بار زیادہ نہیں ہے البتہ اس کی تقسیم غیر مساویانہ ہے۔ بعض طبقے مثلاً بڑے زمیندار اور دیہاتی تاجر محصولات میں اپنا واجبی حصہ ادا کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اگر حالات، جائداد اور پیشوں کے محصول کا زیادہ باقاعدہ اور زیادہ عمومی طریقے سے انتظام کیا جائے تو ان طبقوں کو زاید محصولات کے دائرے میں بخوبی لایا جاسکتا ہے۔[1] جنگ عظیم سے پہلے تک قوم کے مختلف طبقوں میں محصولات کی تقسیم بہت ہی غیر مساویانہ تھی۔ غریب طبقے مالگزاری، نمک کے محصول، چنگی، اسٹامپ وغیرہ محصولات کے سلسلے میں سارا بار برداشت کر رہے تھے اور متمول طبقے اپنی حیثیت کے مطابق محصولات میں حصہ نہیں ادا کر رہے تھے۔ جنگ کے زمانے میں اور اس کے بعد محصولات میں جو تغیرات کیے گئے ان کی وجہ سے جہاں محصولات کا بار عوام پر یقیناً بڑھ گیا ہے وہاں محصولات کے نظام کا یہ عیب بھی کسی حد تک دور ہوگیا ہے اور تدریجی انکم ٹکس، سوپر ٹکس اور تعیش کی اشیا پر خصوصی درآمدی محصول عاید کر دیئے جانے سے بار کی تقسیم زیادہ منصفانہ ہوگئی ہے۔ لیکن جیسا کہ سنہ ۱۹۲۳ ۔ ۲۴ء کے زمانے کے متعلق پروفیسر کے، ٹی شاہ کے ترتیب کیے ہوئے مندرجۂ ذیل اعداد سے معلوم ہوتا ہے اب بھی کافی عدم مساوات موجود ہے[2]:۔ ۵۴۸

(کروڑ روپے کے حساب سے)

محصولات کی مدات	محصولات کا بار جس کو حسب ذیل طبقے برداشت کرتے ہیں	
	متمول طبقے	غریب طبقے
کروڑگیری	۲۰	۲۱

[1] ۔ دیکھو محصولات کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ (۴۷۸ ۔ ۴۹۲)

[2] ۔ دیکھو شاہ اور کھمباٹا کی کتاب موسوم بہ Wealth of Taxable Capacity صفحہ (۲۸۹ ۔ ۲۹۱) اور شاہ کی کتاب موسوم بہ Sixty years of Indian finance (دوسرا ایڈیشن) صفحہ ۳۷۳ ۔ ۳۷۴ ۔

کروڑ روپے کے حساب سے

محصولات کی مدات	محصولات کا بار جس کو حسب ذیل طبقے برداشت کرتے ہیں	
	متمول طبقے	غریب طبقے
مالگزاری اور آب پاشی	٢٠ ½	٢١ ½
انکم ٹکس	٢٠	—
چنگی	—	٢٠
نمک	١ ¼	٦ ½
جنگلات اور رجسٹری	٢	٥
اسٹامپ	٩ ½	٩ ½
ریلوے	٣٣	٩٠
ڈاکخانہ	٥	٥ ½
بلدی ٹکس	٣	١٠
مجلس ضلع کے ٹکس	—	١٠
میزان	١١١ ¼	١٩٦

اس جدول سے پروفیسر شاہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہندوستان کا جز و معاشی اور غیر منتفع طبقہ مالی حیثیت سے محصولات کا نسبتاً زیادہ بار برداشت کرتا ہے۔ مذکورہ بالا چند مدات (ریلوے، ڈاکخانہ وغیرہ) سے جو تھوڑا بہت معاوضہ وصول ہوتا ہے اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جہاں متمول طبقہ اپنی آمدنی میں سے ایک ارب روپے محاصل ادا کرتا ہے وہاں غریب طبقہ ڈیڑھ ارب روپے ادا کرتا ہے۔ گویا ایک طرف اوسطاً ایک ہزار روپے یا اس سے زیادہ سالانہ پانے والے خاندانوں کی آمدنی سے جس کی مجموعی مقدار ٩ ارب روپے ہوتی ہے (جو کہ) آبادی کے $\frac{1}{25}$ سے بھی کم حصہ فائدہ اٹھاتا ہے، مجموعی طور پر ایک ارب روپیہ بطور ٹکس وصول کیا جاتا ہے تو دوسری طرف باقی ٩٦ فیصد آبادی سے جس کے انفرادی

خاندان کی آمدنی تقریباً ایک ہزار روپے سالانہ ہے اور جو صرف ۱۲ ارب روپے کی مجموعی آمدنی سے مستفید ہوتا ہے ڈیڑھ کروڑ روپے منہا کیا جاتا ہے۔ محصولات کی ایسی تقسیم کو کسی حال کفایت شعارانہ یا قرین انصاف نہیں کہا جا سکتا۔

۵۴۹ محصولات کی تحقیقاتی کمیٹی نے اس تفاوت کو دور کرنے کے لیے متعدد تجاویز پیش کی ہیں[1] مثلاً ایک ہزار پاؤنڈ سے دس ہزار پاؤنڈ تک کی آمدنیوں کے لیے محصول کی زیادہ شرح مقرر کرنا، سوپر ٹکس کے لئے معافی کی حد گھٹا کر تیس ہزار پاؤنڈ کرنا، سوپر ٹکس کی نئی شرح مقرر کرنا، مشترک ہندو خاندان کے لیے معافی کی حد گھٹا کر ۹۰ ہزار روپے مقرر کرنا وغیرہ[2] کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی کہ مٹی کے تیل اور شکر پر سے محصول اٹھا لیا جائے کیونکہ وہ قوم کے غریب طبقوں پر غیر متناسب بار ڈالتا ہے۔ کمیٹی نے یہ تجویز کیا کہ ایریٹڈ واٹرس، سگریٹ اور پائپ کے تمباکو پر چنگی عاید کی جائے، دیسی تمباکو کے لیے لائسنس مقرر کیا جائے اور آتش گیر اسلحہ کی لائسنس فیس بڑھا دی جائے، کیونکہ ان محصولوں کا بار بیشتر متمول طبقوں پر پڑنا لازمی تھا۔

یہ امر باعث اطمینان ہے کہ رکن مالیہ سر جیمس گرگ نے اس تجویز سے اتفاق کر لیا جو حال (مارچ سنہ ۱۹۳۸ء) میں مجلس قانون ساز میں پیش کی گئی کہ بار محصول کی تحقیق مشیر معاشیات کے ذریعے سے کرائی جائے۔ سر جیمس نے کہا کہ "مجھے یقین ہے کہ ہندوستان میں محصولات کا بار متمول طبقے پر بہت کم اور غریب طبقوں پر بہت زیادہ پڑ رہا ہے ۔ یہ نہایت گرانقدر کام ہوگا اگر اس معاملے کی تحقیق صحیح اور باقاعدہ طریقے پر کرائی جائے خاصکر یہ اندازہ لگایا جائے کہ تا مین کی موجودہ پالسی حکومت کی خدمات کے لیے نہیں بلکہ ملکی صنعتوں کی مالی امداد کی خاطر صارفین پر کتنا بار ڈال رہی ہے[3]۔"

---

[1] سنہ ۱۹۲۴ء میں یہ کمیٹی قایم کی گئی تاکہ وہ محصولات کے متعلق یہ تحقیق کرے کہ مختلف طبقوں پر ان کا کتنا بار پڑتا ہے اور اسی سلسلے میں اس امر پر بھی غور کرے کہ آیا مرکزی، صوبہ واری اور مقامی محصولات کی تمام اسکیم پر باقاعدہ اور منصفانہ طور پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔

[2] ان سفارشوں پر زیادہ تر سنہ ۱۹۳۱ء، سنہ ۳۲ء کے موازنے کی تجاویز کے سلسلے میں عمل کیا گیا۔

[3] نیز دیکھو فصل ۵۴ جس میں ہندوستانی محصول کے بار کے متعلق سر آٹو نیمیر کے خیالات بیان کیے گئے ہیں۔

۲۲ - ادائی محصول کی استطاعت۔

سر جوشیا اسٹامپ کے الفاظ میں "ادائے محصول کی استطاعت یا مالی ذرائع کا اندازہ دو مقداروں یعنی پیدایش کی مجموعی مقدار اور صرف کی مجموعی مقدار کے فرق سے ہو سکتا ہے[1]"۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے صرف کا معیار بہت ادنی ہے لیکن جیسا کہ پہلے تذکرہ کیا جاچکا ہے پیدایش کا معیار بھی بہت پست ہے۔ اسی وجہ سے ان دونوں کے درمیان جو قلیل فرق ہے وہ ادائے محصول کی محدود گنجایش کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اس گنجایش یا استطاعت کے درجے کا پوری صحت کے ساتھ اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ہندوستان کی قومی آمدنی کی بحث کے سلسلے میں ہم بیان کرچکے ہیں کہ یہاں اعداد و شمار کی شکل میں بالکل ناکافی اور غیر معتبر معلومات دستیاب ہوتی ہیں اور اس کی بنا پر لوگوں کے لیے یہ ممکن ہوگیا ہے کہ وہ اپنے حسب منشا شہادت منتخب کرتے ہیں اور اس اعتبار سے عوام کی معاشی حالت کا تاریک یا روشن نقشہ کھینچتے ہیں۔ بدیہی طور پر یہی بات ادائی محصول کی استطاعت کے بارے میں قایم کیے ہوئے اندازوں کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل مثال[2] جس کو محصول ادا کرنے کی استطاعت کا ایسا قابل اعتماد اور صحیح تخمینہ نہیں کہا جاسکتا جس پر حقیقی عملی پالیسی کی بنیاد قایم کی جاسکے زیادہ تر یہ واضح کرنے کے لیے پیش کی گئی ہے کہ حساب لگانے کے طریقے کا اندازہ ہو سکے۔

برطانوی ہند کی ادائی محصول کی استطاعت ۵۵۰

(لاکھ روپے کے حساب سے)

مدات کی تفصیل	سنہ ۱۹۱۰ء سنہ ۱۱ء (مردم شماری سنہ ۱۹۱۱ء)	سنہ ۱۹۲۰ء سنہ ۲۱ء (مردم شماری سنہ ۱۹۲۱ء)	سنہ ۱۹۲۱ء سنہ ۲۲ء (یہ سال زرعی لحاظ سے اچھا تھا مگر تجارتی کساد بازاری کا تھا)
۱- آمدنی:-			
زرعی	۱۴۱۲۰۰	۱۷۱۵۰۰	۱۹۸۳۰۰
غیر زرعی	۵۳۰۰۰	۸۸۳۰۰	۸۸۳۰۰
مجموعی آمدنی	۱۹۴۲۰۰	۲۵۹۸۰۰	۲۸۶۶۰۰

۱ - دیکھو جوسٹیا اسٹامپ کی کتاب Wealth of Taxable Capacity صفحہ ۱۱۴۔

۲ - یہ مثال فنڈلے شراس کی کتاب موسوم بہ "مالیات" صفحہ ۱۴۶ سے لی گئی ہے۔

برطانوی ہند کی ادائی محصول کی استطاعت

(لاکھ روپے کے حساب سے)

مدات کی تفصیل	سنہ ۱۹۱۰ء سنہ ۱۱ء (مردم شماری ۱۹۱۱ء)	سنہ ۱۹۲۵ء سنہ ۲۶ء (مردم شماری ۱۹۲۱ء)	سنہ ۱۹۲۱ء سنہ ۲۲ء (یہ سال فصل کے لحاظ سے اچھا تھا اگرچہ کساد بازاری کا زمانہ تھا)
۲ - اوّل صرف کے سلسلے میں منہائی	۱۲۱۴۰۰	۲۲۲۰۰۰	۲۲۲۰۰۰
۳ - تخم اور کھاد کے سلسلے میں منہائی	۱۴۱۰۰	۱۶۲۰۰	۱۹۸۰۰
۴ - صرف شدہ سرمایہ کی کمی کو پورا کرنے یا اس میں اضافہ کرنے کے سلسلے میں منہائی	۲۵۰۰	۴۵۰۰	۵۵۰۰
۵ - ادائی محصول کی استطاعت [۱ - (۲ + ۳ + ۴)]	۵۶۲۰۰	۱۶۱۰۰	۳۹۳۰۰
۶ - محصول کی آمدنی :-			
مرکزی و صوبہ واری حکومتوں کی آمدنی	۷۹۸۳	۱۳۰۱۵	۱۳۵۳۰
مقامی مجلسوں کی آمدنی	۶۱۷	۱۱۶۴	۱۱۶۴
میزان	۸۶۰۰	۱۴۱۷۹	۱۴۶۹۴
۷ - اندرونی قرضے کے اخراجات :-			
مرکزی و صوبہ واری حکومتوں کے اخراجات	۵۶۱	۲۱۰۴	۲۴۲۷
مقامی مجلسوں کے اخراجات	۱۷۰	۲۳۴	۲۳۴
میزان	۷۳۱	۲۳۳۸	۲۶۶۱
۸ - موثر محصولات (۶ - ۷)	۷۹۶۹	۱۱۸۹۱	۱۲۹۳۳
۹ - باقی (۵ - ۸)	۴۸۲۳۱	۴۲۳۹	۲۷۲۶۴

مذکورۂ بالا حساب میں قابل محصول آمدنی اور غیر محصول زدہ باقی آمدنی کے جو اعداد بتلائے گئے ہیں ان کی بنا پر قاری کو یہ خیال نہ کر لینا چاہیئے کہ اس میں وہ انتہائی حد بتائی گئی ہے جہاں تک کہ محصول حسب ضرورت بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں سر والٹر لےٹن نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ گو ہندوستان کی آبادی زیادہ تر غریب لوگوں پر مشتمل ہے تاہم ہندوستان میں دولت کے کثیر ذخائر ایسے بھی ہیں جن پر حکومت کے محصول کا بہت تھوڑا بار پڑتا ہے۔ محصول کو ناقابل برداشت بنائے بغیر ہندوستان کے سرکاری محاصل میں کافی اضافہ کیا جا سکتا ہے بہ شرطیکہ محصول کے بار کو محصول ادا کرنے والوں کی قابلیت کے مطابق رکھا جائے اور اساسی ضروریات زندگی کو غیر معمولی طور پر زیر بار نہ کیا جائے"۔[1] لیکن موجودہ زمانے میں

۵۵۱ (عاقبت اندیشی) سے مزید محصول عاید کرنے کا موقع نہیں ہے، کیونکہ سب طبقے کساد بازاری سے بری طرح متاثر ہیں۔

۲۳۔ مالیہ ہندوستانی مالیہ۔ عدم گنجایش کے باعث ایسٹ انڈیا کمپنی اور تاج کے تحت ہندوستانی مالیے کی مفصل تاریخ بیان کرنا دشوار ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں تجارتی اور انتظامی حسابات کا خلط ملط ہونا، کمپنی کے

---

[1] حال (سنہ ۱۹۳۹ء) میں "ہندوستان کی مالی صورت حال" پر تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر پی، جے، تامس نے یہ بتلایا کہ اگرچہ ہندوستان کے محصولات کو بہت زیادہ خیال کیا جاتا ہے پھر بھی بہت سے ایسے ذرائع موجود ہیں جن پر محصول بہت ہلکا ہے۔ اگر طریقۂ محصول میں تنظیم کی جائے تو محاصل میں اضافہ اور محصول کا بار سب پر یکساں ہو سکتا ہے۔ اسی طرح تشخیص مالگزاری کے اصول میں ترمیم کی جائے اور مختلف فصلوں اور کھیتوں کے درمیان محصول کے بار کو مناسب طریقے پر تقسیم کیا جائے تو مالگزاری میں بھی کافی اضافہ کا امکان ہے۔ جب تک خرچ پر دستاویز ہال کی نگرانی تھی اس وقت تک بعض محصولات کے بڑھانے میں دشواری پیش آتی تھی۔ لیکن صوبہ واری خود مختاری کے نفاذ کے بعد ٹکس عاید کرنے میں زیادہ باعزم پالیسی اختیار کی جا سکے گی۔ سنہ ۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند کے بموجب محصولات کے جدید ذرایع مثلاً محصول وراثت اور میقاتی محصول کو زیادہ تر صوبوں کی ضروریات کے لیے مختص کیا گیا ہے، ان میں تمباکو کے محصول اور زرعی محصولوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر ان ذرایع سے آمدنی حاصل کی گئی تو صوبوں میں معاشی ترقی کی پالیسی کو اختیار کرنے کے لیے کافی رقم مہیا ہو جائے گی۔

نظم و نسق میں مسلسل گھاٹے آنا، غدر کے زمانے کا مالی بار، ایک علیحدہ رکن مالیہ کا تقرر، مالی معاملات میں بتدریج عدم مرکزیت کا پیدا ہونا، قحطوں کے باعث مالی مشکلات، سرحدی لڑائیاں، شرح مبادلہ کا گر جانا، حکومت کی قرضے کی پالیسی، تخمیناً موجودہ صدی کے آغاز سے جنگ عظیم سے پہلے تک موازنہ کا وافر رہنا، یہی وہ چند مسائل ہیں جن کا ہندوستانی مالیے کی تاریخ سے تعلق ہے۔ ان میں سے چند پر ہم زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔ لیکن سردست ہم ہندوستانی مالیے سے متعلق ان اہم واقعات کا تذکرہ زیادہ مناسب خیال کرتے ہیں، جو سنہ ۱۹۱۴ء سے ۱۸ء کی جنگ کے شروع ہونے کے بعد سے رونما ہوئے۔

جنگ سے پہلے تک کا ہندوستان کی مالی حالت کا استحکام اور توفیری موازنوں کا سلسلہ جنگ شروع ہوتے ہی اچانک ختم ہو گیا۔

مندرجۂ ذیل جدولوں میں اصلاحات سے پہلے اور بعد کے مرکزی حکومت کے محاصل اور اخراجات کی مجموعی مقدار بتلائی گئی ہے:۔

جدول (ا)[1]

بحساب کروڑ روپے

سال	محاصل	اخراجات	توفیر (+) گھاٹے (-)	سال	محاصل	اخراجات	توفیر (+) گھاٹے (-)
سنہ ۱۹۱۴ء سے ۱۵ء	۷۵٫۸۵	۷۸٫۸۳	-۲٫۹۸	سنہ ۱۹۱۸ء سے ۱۹ء	۱۳۰٫۴۰	۱۳۶٫۱۳	-۵٫۷۳
سنہ ۱۹۱۵ء سے ۱۶ء	۸۰٫۰۱	۸۱٫۷۹	-۱٫۷۸	سنہ ۱۹۱۹ء سے ۲۰ء	۱۳۷٫۱۴	۱۶۰٫۰۹	-۲۳٫۹۵
سنہ ۱۹۱۶ء سے ۱۷ء	۹۸٫۵۳	۸۷٫۳۱	+۱۱٫۲۲	سنہ ۱۹۲۰ء سے ۲۱ء	۱۳۵٫۶۴	۱۶۱٫۶۴	-۲۶٫۰۰
سنہ ۱۹۱۷ء سے ۱۸ء	۱۱۸٫۷۰	۱۰۶٫۵۷	+۱۲٫۱۳				

[1] ۔ ان اعداد میں خاص مدات مثلاً محاصل کی مد محفوظ سے منتقل شدہ یا اس مد میں منتقل شدہ رقوم اور جرمنی کی بے باقی کی مد میں جمع شدہ فاضلات سے خرچ شدہ رقوم شامل نہیں ہیں۔

۵۵۲

جدول (۲) ۱؎

بحساب کروڑ روپے

سال	محاصل۔ علاوہ ان محاصل کے جو ذخیرہ محفوظ میں منتقل کی گئیں	اخراجات۔ علاوہ ان رقوم کے جو محفوظ ذخیرہ محاصل میں منتقل کی گئیں یا قرض کو کم کرنے یا قرض سے بچنے کے لیے استعمال کی گئیں اور علاوہ ان تداکے جو خانہ نمبر ۴ میں ظاہر کیے گئے ہیں۔	[illegible]	نفع (+) یا نقصان (-) [illegible]	[illegible]	[illegible]	(+) (-) [illegible]
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
۱۹۲۱ء-۲۲ء	۱۱۱٫۲۱	۱۳۸٫۰۴	—	۲۳٫۱۹	—	۴٫۴۶	۲۶٫۹۵
۱۹۲۲ء-۲۳ء	۱۲۱٫۴۱	۱۳۱٫۸۸	—	۱۰٫۴۷	—	۴٫۵۵	-۱۵٫۰۲
۱۹۲۳ء-۲۴ء	۱۳۳٫۱۷	۱۲۷٫۱۶	—	+۶٫۰۱	—	۳٫۶۲	+۲٫۳۰
۱۹۲۴ء-۲۵ء	۱۳۸٫۰۴	۱۲۸٫۵۸	—	+۹٫۴۶	—	۳٫۷۸	+۵٫۶۸
۱۹۲۵ء-۲۶ء	۱۳۳٫۳۳	۱۲۵٫۰۵	—	+۸٫۲۸	—	۴٫۹۷	+۳٫۳۱
۱۹۲۶ء-۲۷ء	۱۳۱٫۷۰	۱۲۳٫۷۷	—	+۷٫۹۳	-۲٫۹۶	-۴٫۹۷	—
۱۹۲۷ء-۲۸ء	۱۲۵٫۰۴	۱۲۲٫۲۲	—	+۲٫۸۲	۲٫۲۲	۵٫۰۴	—
۱۹۲۸ء-۲۹ء	۱۲۸٫۲۴	۱۲۳٫۸۸	—	+۴٫۳۶	۰٫۷۴	۵٫۴۲	-۰٫۳۲
۱۹۲۹ء-۳۰ء	۱۳۲٫۶۹	۱۲۶٫۶۸	—	+۶٫۰۱	—	۵٫۷۴	+۰٫۲۷
۱۹۳۰ء-۳۱ء	۱۲۴٫۶۰	۱۳۰٫۰۴	—	-۵٫۴۴	—	۶٫۱۴	-۱۱٫۵۸
۱۹۳۱ء-۳۲ء	۱۲۱٫۶۴	۱۲۶٫۵۰	—	-۴٫۸۶	—	۶٫۸۹	-۱۱٫۷۵
۱۹۳۲ء-۳۳ء	۱۲۶٫۴۰	۱۱۸٫۰۱	—	+۸٫۳۹	—	۶٫۸۴	+۱٫۵۵
۱۹۳۳ء-۳۴ء	۱۲۰٫۳۶	۱۱۴٫۹۵	۲٫۷۷ ۲؎	+۳٫۰۰	—	۳٫۰۰	—

۱؎۔ دیکھو مرکزی حکومت کا بجٹ (۱۹۳۷ء-۳۸ء) صفحہ ۵۷۔

۲؎۔ یہ رقم زلزلے کی مد میں منتقل کی گئی۔ اس میں سے ۰٫۹۳ کو قرضے کی ادائی میں استعمال کیا گیا۔

بقیہ جدول نمبر (۲) صفحہ (۹۲۳)

۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء	۱۲۵٫۱۰	۱۱۶٫۱۴	۴٫۶۰ [۱]	+۳٫۳۶	—	۳٫۰۰	+۰٫۳۶
۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء	۱۲۲٫۰۱	۱۱۷٫۶۴	۴٫۴۵ [۲]	+۴٫۸۴	-۱٫۸۴	۳٫۰۰	—
۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء (تخمینہ)	۱۱۸٫۹۸	۱۱۶٫۹۰	—	+۱٫۰۸	—	۳٫۰۰	-۱٫۹۲
۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۸ء (بجٹ)	۱۱۶٫۵۸	۱۱۴٫۳۵	—	+۱٫۲۳	۱٫۸۴	۳٫۰۰	+۰٫۰۷

جنگ عظیم کی وجہ سے تجارت اور صنعت میں جو خلل پڑا اس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ ۸٫۱ کروڑ روپیہ کی بچت ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۵ء میں ۲٫۶ کروڑ روپے کے گھاٹے میں تبدیل ہو گئی ۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۶ء کے موازنے سے بھی ۷٫۱ کروڑ روپے کا گھاٹا ظاہر ہوتا ہے حکومت نے اس خیال سے کہ جنگ تھوڑے عرصے تک جاری رہے گی۔ قرضہ حاصل کرکے اور انگلستان میں رکھے ہوئے ذخائر سے رقم لے کر اس گھاٹے کی تکمیل کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ محصولات کی موجودہ سطح میں کوئی خلل نہ واقع ہو۔ ریلوں اور آب پاشی کے "مصارف سرمایہ" کے پروگرام میں بھی کافی کمی کر دی گئی۔ لیکن یہ خیال کہ جنگ تھوڑے عرصے تک رہے گی غلط ثابت ہوا۔ اس اعتبار سے ۱۹۱۶ء تا ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۷ء تا ۱۹۱۸ء کے موازنوں میں محصولات میں اہم تبدیلیاں ضروری ہو گئیں اور بجز محکمۂ فوج کے تمام محکموں میں سختی کے ساتھ کفایت شعاری عمل میں لانے کا حکم دیا گیا۔ ۱۹۱۶ء تا ۱۹۱۷ء کے موازنے میں کروڑ گیری، انکم ٹکس، محصول نمک اور چنگی کو بڑھانے کا انتظام کیا گیا۔ اس سال اور بعد کے سالوں میں جنگ کی وجہ سے جو محصول لگائے گئے ان کی تفصیلات پر پہلے بحث کی جا چکی ہے۔ حکومت برطانیہ کو ۱۰۰ ملین پونڈ

له - دیہات سدھار کے لیے ۲٫۴۲، شمال مغربی سرحدی صوبے میں قبائلی علاقوں کے لیے ۰٫۲۵، لاسلکی نشر کے لیے ۰٫۲۰، غیر فوجی ہوائیں ۰ کے لیے ۰٫۹۳ اور سڑک فنڈ کے لیے بطور خاص ۰٫۸۰ ہے۔

له مصارف سرمایہ کے سلسلے میں عمارتوں کے لیے سندھ میں ۰٫۱۷ اور اوڑیسہ میں ۰٫۲۷۔

له - ۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۸ء کے موازنے کے اندازے میں ان تغیرات کو ملحوظ رکھا گیا ہے جو برما کی علیحدگی اور نیمیر کے عطیے کی وجہ سے ہوئے۔ (دیکھو فصل ۴۰) برما کی علیحدگی سے ۳٫۳۲ کروڑ روپے کا نقصان عائد ہوتا ہے صوبہ واری خود مختاری سے مرکزی حکومت پر ۸٫۵۰ کروڑ روپے کا نقصان عائد ہوگا۔

۵۸

کی جنگی امداد دینے کے سلسلے میں جو مصارف ہوئے اس کی وجہ سے ۱۹۱۷ء-۱۸ء کے بجٹ میں محصولات کو اور بڑھانا ضروری ہوگیا۔ اس امداد کے مہیا کرنے کے سلسلے میں یہ طے کیا گیا کہ ہندوستان میں قرضہ جنگ حاصل کیا جائے اور اگر مطلوبہ رقم ہندوستان میں فراہم نہ ہوسکے تو برطانوی قرضے کے تمسکات کا ایک حصہ خرید کر اس کمی کو پورا کیا جائے۔ جنگی امداد کی بنا پر سود اور "قرض ادائی ذخیرہ" کے مصارف کے سلسلے میں سالانہ ۹ کروڑ روپے کا بار عاید ہوتا تھا جن کو پورا کرنے کے لیے سوپر ٹیکس کی شکل میں زاید محصول لگایا گیا، روئی کی درآمد کا محصول بڑھا کر $\frac{1}{2}$ ۳ فیصد کیا گیا، جوٹ کے برآمدی محصول کو دگنا کردیا گیا اور بذریعۂ ریل سامان کی نقل و حمل کے کرایہ میں اضافہ کیا گیا۔ محصولات میں اضافہ کرنے، موازنے کی تیاری میں انتہائی احتیاط سے کام لینے اور تخفیف مصارف عمل میں لانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۶ء-۱۷ء میں ۱۱،۲ کروڑ روپے اور ۱۹۱۷ء-۱۸ء میں ۱۲،۲ کروڑ روپے کی توفیر ہوی۔ اسی وجہ سے ۱۹۱۸ء-۱۹ء میں مزید محصولات عاید کرنے کی ضرورت لاحق نہیں ہوئی۔ البتہ محصولات کی موجودہ شرح کو برقرار رکھا گیا۔ لیکن ۱۹۱۸ء-۱۹ء میں چونکہ حکومت ہند نے ۴۵ ملین پاؤنڈ کی مزید جنگی امداد (جس کی مقدار بعد میں چل کر گھٹا دی گئی) کا وعدہ کرلیا تھا اس لیے زاید ٹیکس عاید کرنا ضروری ہوگیا اور ایک سال کے لیے زاید منافعہ پر محصول عاید کیا گیا۔ ۱۹۱۴ء-۱۵ء تا ۱۹۱۸ء-۱۹ء کے زمانے میں مرکزی حکومت کے محاصل میں کافی اضافہ ہوا۔ چنانچہ وہ ۱۶۱،۷ کروڑ روپے سے بڑھ کر ایک ارب ۳۰ کروڑ ۴ لاکھ روپے ہوگئے۔ اسی طرح مرکزی حکومت کے مصارف بھی ۸۰،۸ کروڑ روپے سے بڑھ کر ایک ارب ۳۶ کروڑ ایک لاکھ روپے ہوگئے[1]۔

۲۴ قاصر موازنے

ان وافر موازنوں کے مقابلے میں جو جنگ سے پہلے کے زمانے کی امتیازی خصوصیت تھی اب مرکزی و صوبہ واری مالیہ میں قاصر موازنوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ پانچ سال کے عرصے میں صرف مرکزی حکومت کے موازنوں کے گھاٹے کی مجموعی مقدار ایک ارب روپے تھی۔ جنگ یورپ
۵۵۴ کی وجہ سے جو زاید اخراجات عاید ہوے ان کے علاوہ افغانستان کے بلاوجہ ہندوستان پر حملہ کردینے سے

---

[1] ہندوستانی کرنسی اور مبادلہ پر زمانۂ جنگ کے جو اثرات پڑے ان پر پہلے بحث کی جاچکی ہے؛ دیکھو باب (۷)۔

بہت سی مشکلات پیدا ہوگئیں اور ہندوستان کے خزانے پر کئی کروڑ روپے کا بار پڑا۔ اس کے علاوہ نہ صرف غیر فوجی بلکہ خاص کر فوجی نظم ونسق کے اخراجات ہر سال بڑھتے چلے گئے۔ ریلوے کے اخراجات میں بھی اضافہ ظاہر ہوا اور جنگ کے بعد کی تجارتی کساد بازاری کے باعث جو مختصر گرم بازاری کے بعد ہی رونما ہوئی ریلوے سے کم آمدنی وصول ہوئی۔ ریلوے کی آمدنی کی کمی کے قطع نظر انکم ٹکس کی مد سے بھی کم آمدنی ہوئی۔ ان سب چیزوں کا مجموعی اثر یہ ظاہر ہوا کہ ۱۹۱۴ء اور ۱۹۲۲ء کے درمیان محصولات میں کافی اضافے کے باوجود محاصل میں گھاٹا آیا۔

۱۹۲۲ء سے ۲۳ء میں ایک تخفیف مصارف کی کمیٹی اس غرض سے مقرر کی گئی کہ مرکزی حکومت کے بڑھے ہوئے مصارف کو کم کرنے کے بارے میں تدابیر پیش کرے۔ کمیٹی نے مختلف مدات میں حسب ذیل طریق پر ۱۹¼ کروڑ روپے کی تخفیف کرنے کا مشورہ دیا۔ فوجی اخراجات ۱۰ء۵ کروڑ روپے، ریلوے ۱۰ء۵ کروڑ روپے غیر فوجی نظم ونسق ۱ء۹۲ کروڑ روپے، ڈاک اور تار ۱ء۳ کروڑ روپے[1]۔ ۱۹۲۳ء سے ۲۴ء میں غیر فوجی اخراجات میں ۶ء۹ کروڑ روپے اور فوجی اخراجات میں ۵ء۵ کروڑ روپے کی تخفیف عمل میں لائی گئی۔ لیکن یہ کارروائی موازنے کے توازن کو بحال کرنے کے لیے کافی نہیں تھی جیسا کہ تذکرہ کیا جا چکا ہے وائسرائے نے مجبوراً محصول نمک کو ایک روپے ۴ آنے سے بڑھا کر دو روپے ۸ آنے کر دیا۔ ۱۹۲۳ء سے ۲۴ء میں حالات کا رخ بدلا اور محاصل کے انداز سے غیر معمولی احتیاط سے مرتب کرنے، روپے کی شرح مبادلہ اسٹرلنگ ۱۶ پنس پر مستحکم کرنے، محصولات کی سابقہ اعلیٰ شرح برقرار رکھنے اور تجارت وصنعت میں بتدریج بحالی رونما ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وافر موازنے کا سابقہ رجحان عارضی طور پر پھر رونما ہوا۔ ان فاضل رقموں کو صوبہ واری امداد کی معافی اور غیر پیدا آور قرضے کی تخفیف کے سلسلے میں استعمال کیا گیا لیکن ۱۹۲۷ء سے ۲۸ء سے موازنہ کے توازن میں پھر خلل واقع ہوا اور جیسا کہ رکن مالیہ نے ۱۹۳۰ء سے ۳۱ء کے موازنے سے متعلق اپنے بیان میں بتلایا کہ اگر محفوظ ذخیرہ محاصل سے منتقل شدہ رقوم غیر معمولی مدات اور اتفاقی آمدنیوں مثلاً تاوان جنگ کے ہندوستانی حصے کو علحدہ رکھا جائے تو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ صوبہ واری امدادی رقم کی کامل معافی کے بعد سے مسلسل کئی سال تک موازنے میں

---

[1] دیکھو تخفیف مصارف کی کمیٹی کی رپورٹ (بابتہ ۱۹۲۹ء سے ۳۰ء اور ۱۹۳۰ء سے ۳۱ء)

خسارہ رہا اور صوبہ واری رقموں کی معافی سے محاصل میں جو کمی ہوئی وہ تجارتی کساد بازاری کو ملحوظ رکھنے کے باوجود اتنی زیادہ تھی کہ اس کی تلافی کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ گھاٹے کی مقدار سنہ ۱۹۲۷ء سنہ ۲۸ء میں ۲ کروڑ ۲۱ لاکھ روپے، سنہ ۱۹۲۸ء سنہ ۲۹ء میں ایک کروڑ ۶ لاکھ اور سنہ ۱۹۲۹ء سنہ ۳۰ء میں ایک کروڑ ۵۶ لاکھ روپے تھی۔ اس خسارے کی تکمیل سنہ ۱۹۲۷ء سنہ ۲۸ء اور سنہ ۱۹۲۸ء سنہ ۲۹ء میں محاصل کے مد محفوظ سے (جس کی وجہ سے یہ مد بالکل ختم ہو گئی) رقوم منتقل کر کے یا سنہ ۱۹۲۹ء میں جرمنی سے وصول شدہ تاوانات سے کی گئی۔ اس کاروائی کی وجہ سے نیز عام محاصل میں ریلوے کا حصہ کم ہو جانے اور ناگزیر نئے خدمات اور مطالبات (مثلاً مردم شماری کے انتظامات، زرعی تحقیقات، ۵۵۵
نیشکر کی کاشت کے انتظام، بنک کاری کی تحقیق، کیش سرٹیفکیٹ کے بقوم کی ادائی کے بہتر انتظام، نشریات اور ہندوستانی نظام تجارت کے تقرر کے لیے رقوم کی فراہمی) کے سلسلے میں ۱ کروڑ ۴۶ لاکھ روپے کے مصارف عاید ہو جانے کی وجہ سے سنہ ۱۹۲۹ء سنہ ۳۰ء کے محصولات کے اعتبار سے ۵ کروڑ ۵۲ لاکھ روپے کا گھاٹا آیا۔ بحیثیت مجموعی ۱ کروڑ ۴۲ لاکھ روپے (غیر فوجی موازنے میں ۶۲ لاکھ روپے اور فوجی موازنے میں ۸۰ لاکھ روپے) کی تخفیف عمل میں لانے کے بعد بھی خالص گھاٹے کی مقدار ۴ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے تھی جس کو پورا کرنے کے لیے سنہ ۱۹۳۰ء سنہ ۳۱ء میں ۵ کروڑ ۱۰ لاکھ روپے کا زاید محصول (جس کا تذکرہ فصل ۵ اور ۹ میں اوپر کیا جا چکا ہے) عاید کرنا پڑا۔ اس طرح ۷۰ لاکھ روپے کی بچت ہوئی جس کو مد محفوظ کے طور پر رکھ دیا گیا۔[1]

۲۵۔ ہندوستانی مالیہ کساد بازاری کے زمانے میں اور اس کے بعد

جیسا کہ مندرجۂ ذیل اعداد سے واضح ہوتا ہے، سنہ ۱۹۳۰ء سنہ ۳۳ء میں مرکزی حکومت (بلکہ اکثر صوبہ واری حکومتوں) کی مالی حالت نے نہایت نازک صورت اختیار کر لی جس کا زیادہ تر باعث شدید اور طویل معاشی کساد بازاری اور قیمتوں کی انتہائی کمی تھی۔ ان حالات کی وجہ سے محاصل کی اکثر اہم مدوں مثلاً کروڑ گیری اور آمدنی کے محصولوں کے محصل میں کمی واقع ہو گئی اور تجارتی محکموں مثلاً ریلوے اور محکمۂ ڈاک و تار کی آمدنیاں متاثر ہوئیں۔ اس صورت حال میں خاص اسباب مثلاً اندرونی ہنگاموں اور بے اطمینانی کے رجحان نے

[1] دیکھو سنہ ۱۹۲۹ء سنہ ۳۰ء اور سنہ ۱۹۳۰ء سنہ ۳۱ء کے بجٹ کے گوشوارے۔

جو اساسی دستوری تغیرات عمل میں آنے کے اندیشے سے پیدا ہو گیا تھا کچھ عرصے تک شدت
پیدا کر دی۔
اب مرکزی حکومت کی حالیہ سالوں کی مالی حالت کی نمایاں خصوصیات کا تذکرہ نامناسب
نہ ہوگا۔ ۳۱-۱۹۳۰ء کے مرممہ اندازوں سے یہ ظاہر ہوا کہ موازنے کی ۸۶ لاکھ روپے کی سابقہ
تخمینی بچت کے مقابلے میں ۱۳٫۵۶ کروڑ روپے کا خالص خسارہ رہا۔ ۳۱-۱۹۳۰ء کے
آمد و خرچ کے اعداد کے لحاظ سے ۱۷٫۲۴ کروڑ روپے کے خسارے کا اندازہ کیا گیا جس کو رکن مالیہ
نے فوجی اخراجات میں ۱٫۷۵ کروڑ روپے اور غیر فوجی اخراجات میں ۹۸ لاکھ روپے کی تخفیف
کرکے ۱۴٫۵۱ کروڑ روپے تک گھٹا دینے کی تجویز پیش کی۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ اس خسارے کو
پورا کرنے کے لیے ۱۴٫۸۲ کروڑ روپے کے محصولات لگائے جائیں۔ یہ اندازہ کیا گیا کہ اس
طریقے پر کروڑگیری سے ۹٫۸۲ کروڑ روپے اور انکم ٹکس سے ۵ کروڑ روپے کی آمدنی ہوگی اور
۳۱ لاکھ روپے کی فاضل بچت ہوگی۔ یہ اندازے بعد کے چھ مہینوں میں قائم نہ رہ سکے اور اس
واقعے کی بنا پر کہ سرکاری ضروریات کو پورا کرنے کے بعد سابق (مارچ ۱۹۳۱ء) کے مسودۂ قانون
سے کافی آمدنی نہ ہوتی تھی ایک ناگہانی ضرورت پیدا ہو گئی جس کو دور کرنے کے لیے ستمبر ۱۹۳۱ء
میں سر جارج شوسٹر نے مجلس قانون ساز میں ایک ضمنی مسودۂ قانون پیش کیا۔ یہ طے پایا کہ یہ
قانون اٹھارہ مہینے کی مدت کے لیے (مارچ ۱۹۳۳ء تک) نافذ رکھا جائے۔ خسارے کا اندازہ
۳۲-۱۹۳۱ء کے لیے ۱۹٫۵۵ کروڑ روپے اور ۳۳-۱۹۳۲ء کے لیے ۱۹٫۵۰ کروڑ
روپے کیا گیا تھا۔ اس طرح ۱۸ مہینے کی مدت میں ۳۹ کروڑ ۵ لاکھ روپے کے خسارے کی تلافی
کرنی پڑی۔ یہ طے پایا کہ اس خسارے کے ۱/۳ حصے کو مصارف گھٹا کر اور تنخواہوں میں ۱۰ فیصد ۵۵
تخفیف کرکے اور باقی ۲/۳ حصے کو ۲۲ کروڑ روپے کے زاید محصول لگا کر پورا کیا جائے۔ کروڑگیری
اور انکم ٹکس کے متعلق محصولات میں جو رد و بدل کیا گیا اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ
اضافۂ محصول کے سلسلے میں جو تدابیر اختیار کی گئیں وہ یہ تھیں کہ چنگی کے تمام محصول بہ شمول
نمک کے محصول کے ایک چوتھائی بڑھا دیئے گئے اور ڈاکخانہ کی شرحیں بڑھا کر خط کے لیے ایک آنہ
تین پائی اور کارڈ کے لیے ۹ پائی مقرر کی گئیں۔
اس طرح ضمنی موازنے کا فوری مقصد پورا ہو گیا اور نہ صرف خسارے کی تکمیل ہو گئی بلکہ
جیسا کہ ۳۳-۱۹۳۲ء کے حقیقی اعداد سے ظاہر ہوا قرضے کی ادائی کے لیے کم و بیش ۷ کروڑ روپے

ہمیا کرنے کے بعد ایک کروڑ ۵۵ لاکھ روپے کی فاضل بچت ہوئی۔ یہ نتیجہ کسی حد تک تخفیف مصارف سے لیکن زیادہ تر محصولات میں خاصا اضافہ کرنے سے حاصل ہوا۔ چنانچہ ان محصولات کی مقدار ۲۴ کروڑ روپے (یعنی ۱۹۳۰ء-۳۱ء میں ۵ کروڑ روپے، ۱۹۳۱ء-۱۹۳۲ء کے موازنے میں ۱۵ کروڑ روپے اور اکتوبر ۱۹۳۱ء سے مارچ ۱۹۳۲ء تک کے ضمنی موازنے میں ۲۲ کروڑ روپے) تھی۔ ۱۹۳۳ء-۳۴ء کے موازنے میں تخفیف شدہ تنخواہوں کا نصف حصہ بحال کردیا گیا اور ۱۹۳۵ء-۳۶ء کے موازنے میں تمام تخفیف شدہ حصے کی بحالی کا انتظام کیا گیا۔ اس کارروائی کو اس بنیاد پر قابل اعتراض ٹھیرایا گیا کہ ٹیکس ادا کرنے والوں اور صنعت و تجارت کی اس درخواست کا لحاظ مقدم تھا کہ انھیں زاید محصولات کے بار سے نجات دلائی جائے۔ ۱۹۳۳ء-۳۴ء میں قرضوں کی ادائی کے لیے سابق سے کم رقم یعنی ۳ کروڑ روپے کا انتظام کرنے کے بعد ۲ کروڑ ۷۲ لاکھ روپے کی بچت ظاہر ہوئی۔ یہ بچت زیادہ تر زلزلہ فنڈ میں منتقل کردی گئی تاکہ ۱۹۳۴ء میں بہار اور اوڑیسہ میں زلزلے کی وجہ سے جو نقصان ہوا تھا اس کی تلافی کے لیے امدادی تدابیر اختیار کی جاسکیں۔ ٹیکس ادا کرنے والے کو صرف یہ سہولت حاصل ہوئی کہ ایک ہزار روپے سے ۱۴۹۹ روپے تک کی آمدنیوں پر انکم ٹیکس کی شرح فی روپیہ ۴ پائی کے بجائے ۲ پائی ہوگئی۔ دوسری طرف ۱۹۳۴ء-۳۵ء کے موازنے میں شکر اور دیا سلائی کی جنگی کی شکل میں نئے محصول عاید کیے گئے۔ شکر پر محصول جنگی عاید کرنے کا مقصد یہ تھا کہ محاصل میں ایک کروڑ ۳۵ لاکھ روپے کے خسارے کو پورا کیا جائے۔ لیکن خام چمڑوں کا برآمدی محصول اٹھالیا گیا اور چاندی کا محصول گھٹا کر فی اونس ۵ آنے کر دیا گیا۔ ۱۹۳۴ء-۳۵ء کے حقیقی اعداد سے ابتدائی اندازے کے مقابلے میں خاصی ترقی ظاہر ہوئی اور زیادہ تر شکر، اگرتی کے کپڑوں اور مصنوعی ریشم کی کروڑ گیری سے زیادہ آمدنی ہونے کی وجہ سے ۴ کروڑ ۹۵ لاکھ روپے کی بچت حاصل ہوئی۔ اس غیر متوالی بچت کو مختلف کاموں میں استعمال کیا گیا۔ چنانچہ اسی سلسلے میں دیہی علاقوں کی اصلاح اور معاشی ترقی کے لیے ایک فنڈ قایم کرنے کے لیے صوبہ واری حکومتوں کو ۲ کروڑ ۱۸ لاکھ روپے دیئے گئے جس کے منجملہ ۱۵ لاکھ روپے امداد باہمی کی تحریک کی ترقی کے لیے مختص کر دیے گئے۔ موجودہ محصولات کے لحاظ سے ۱۹۳۵ء-۳۶ء کے موازنے کے اندازوں سے ایک کروڑ ۵۰ لاکھ روپے کی بچت ظاہر ہوئی جس کو محصول کم کرنے کے کام میں لایا گیا۔ خام چرم کے محصول کی تنسیخ کی وجہ سے بچت گھٹ کر ایک کروڑ ۴۲ لاکھ

روپے ہوگئی۔ اپنے اس وعدے کے مدنظر کہ تنخواہوں کی تخفیف کو برخواست کردینے کے بعد
ہی ٹکس ادا کرنے والے کے لیے پہلی سہولت یہ مہیا کی جائے گی کہ انکم ٹکس اور سوپر ٹکس کے علاوہ ۵۵۷
جو زاید محصول لگایا گیا تھا اس کو اٹھالے گی (اور چھوٹی آمدنیوں کے ٹکس کو اس غرض کے لیے زاید
محصول شمار کیا گیا) حکومت نے زاید محصول اور چھوٹی آمدنیوں کے ٹکس میں ایک تہائی کمی کرنے کا
انتظام کیا جس سے ایک کروڑ ۳۹ لاکھ روپے کا بار پڑا۔ اس طرح بچت کی مقدار صرف ۶ لاکھ
روپے رہ گئی۔ حقیقی اعداد سے ۲ کروڑ ۲۹ لاکھ روپے کی بچت ظاہر ہوئی۔ اس اضافے
کی وجہ یہ تھی کہ شکر کے درآمدی محصول سے خلاف توقع زیادہ آمدنی ہوئی۔ اس کے علاوہ توقع
سے زیادہ تجارت کی بحالی کی وجہ سے انکم ٹکس سے بھی کثیر آمدنی ہوئی اور محاصل کی دوسری
مدات میں بھی توفیر ہوئی۔ یہ طے پایا کہ اس فاضل بچت کو حسب ذیل طریق پر صرف کیا
جائے (۱) تعمیری سامان کے لیے سندھ میں ½ ۱۷ لاکھ روپے اور اوڑیسہ میں ½ ۲۷ لاکھ
روپے۔ اور (۲) صوبہ واری خودمختاری کے پہلے سال میں مرکزی حکومت کے موازنے کو
تقویت دینے کی خاطر محاصل کی مد محفوظ میں منتقلی کے لیے ایک کروڑ ۴۸ لاکھ روپے۔

سنہ ۱۹۳۶ء۔ سنہ ۳۷ء کے موازنے کے لیے ۲ کروڑ ۵ لاکھ روپے کی بچت کا اندازہ کیا
گیا اور یہ طے کیا گیا کہ اس کو حسب ذیل کاموں میں استعمال کیا جائے: (۱) ۲ ہزار روپے
سے کم آمدنیوں پر سے ٹکس اٹھا کر چھوٹے انکم ٹکس ادا کرنے والے کی امداد۔ (۲) انکم ٹکس اور
سوپر ٹکس کے علاوہ جو زاید محصول لگایا جاتا تھا اس میں بقدر نصف کمی (نیز دیکھو فصل ۹)۔
(۳) ایک آنہ میں جو خطوط روانہ کیے جاتے تھے ان کا وزن بڑھا کر ½ تولے سے ایک تولہ کرنا!
اور ۶ لاکھ کی قلیل بچت کو نقد فاضلات کی شکل میں رکھنا۔ لیکن زیادہ تر مالگزاری میں اور
خاص کر کروڑ گیری اور کسی حد تک انکم ٹکس کی کم آمدنی ہونے کی وجہ سے سنہ ۱۹۳۶ء۔ سنہ ۳۷ء کے
مرممہ اعداد سے ایک کروڑ ۹۲ لاکھ روپے کا خسارہ ظاہر ہوا بعد میں چلکر حقیقی خسارے کی مقدار
ایک کروڑ ۹۰ لاکھ روپے پائی گئی) شکر کی درآمد میں حیرت انگیز کمی ہوئی اور عام درآمدی
تجارت بھی گھٹ گئی۔ انکم ٹکس کی مد سے کم آمدنی وصول ہونے کی ایک وجہ یہ تھی کہ شکر کے
کارخانے ضرورت سے زیادہ تعداد میں قایم ہو گئے تھے جس کے باعث ان کی پیداوار
ارزاں فروخت ہوئی اور ان کمپنیوں کی آمدنیوں میں کمی ہوگئی۔ دوسری وجہ کسی حد تک
یہ تھی کہ صوبہ واری دیہی قرضداری کے قوانین کے نفاذ نے قرض دہندوں کی آمدنی میں کمی کر دی۔

محاصل کی کمی کو پورا کرنے کے لیے نہ صرف شکر کی چنگی میں اضافہ کر دیا گیا جیسا کہ فصل (۷) میں بیان کیا جا چکا ہے بلکہ ۱۹۳۶ء کے ہندوستانی قانون مالیہ کے موجب چاندی کا محصول گھٹا کر فی اونس ۳ آنے کر دیا گیا۔ ان محصولات کے لحاظ سے یہ اندازہ کیا گیا کہ ۱۹۳۷ء سے ۳۸ء کے موازنے میں ۷ لاکھ روپے کی قلیل بچت ہوگی۔ ۱۹۳۷ء سے ۳۸ء کے مرمہ اندازوں سے یہ ظاہر ہوا کہ محاصل میں ۳ کروڑ ۹۰ لاکھ روپے کا اضافہ ہوا جس کا سبب یہ تھا کہ دیرپا سامان (مشینری اور موٹر کاروں) اور نیم دیرپا سامان زیادہ مقدار میں درآمد ہونے سے کروڑ گیری اور مرکزی حکومت کی چنگی کی مد میں زیادہ آمدنی ہوئی تھی۔ تجارت کی بحالی کی وجہ سے انکم ٹکس کی آمدنی بڑھ گئی تھی اور ریلوے سے بھی زیادہ آمدنی ہوئی تھی۔ دوسری طرف اخراجات میں ۳ کروڑ ۲۲ لاکھ روپے کا اضافہ ہوا تھا یہ زاید اخراجات کسی حد تک وزیرستان میں جنگی کارروائیوں کے سلسلے میں دفاعی خدمات کی مد میں اور کسی حد تک دوسرے مدات کے تحت عاید ہوے تھے۔ اس طرح ۶۸ لاکھ روپے کی خالص فاضل بچت ہوئی۔
۸۵۵ موازنے کے اندازوں میں ایک کروڑ ۸۴ لاکھ روپے کی مجموعی مدِ محفوظ کو کام میں لانے کے بعد ۷ لاکھ روپے کی ظاہری بچت فراہم کی گئی تھی۔ مرمہ اندازوں کے مطابق جیسا کہ رکنِ مالیہ نے اپنی ۱۹۳۸ء والی موازنے کی تقریر میں بتلایا موازنے کو متوازن کرنے کے لیے صرف ایک کروڑ ۹ لاکھ روپے درکار تھے۔ اس طرح ۱۹۳۸ء سے ۳۹ء کے لیے ۷۵ لاکھ روپے کی سلک باقی رہتی تھی۔

۱۹۳۸ء سے ۳۹ء کے موازنے میں ۹ لاکھ روپے کی قلیل بچت کا اندازہ کیا گیا ہے۔ اس موازنے میں نہ تو زاید محصولات عاید کرنے کے لیے کوئی تجاویز ہیں، نہ موجودہ محصولات کو کم کرنے کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ انکم ٹکس اور سوپر ٹکس پر جو زاید محصول عاید کیا گیا تھا اور جو فی الواقع تجارت و کاروبار کے لیے بار ہے اس سے نجات دلانے کی بھی کوئی تجویز نہیں ہے۔ رکنِ مالیہ نے اپنی آخری (۱۹۳۸ء کی) موازنے کی تقریر میں اپنے کارنامے کے طور پر اس چیز کو بیان کیا کہ صوبہ واری خود مختاری کے نفاذ، برما کی علحدگی اور وزیرستان کی مہم کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے رقم کا انتظام کیا گیا، نیمیر کے فیصلے کے موجب صوبوں میں انکم ٹکس کی آمدنی میں سے ۱۹۳۷ء سے ۳۸ء میں ایک کروڑ ۲۸ لاکھ روپے اور ۱۹۳۸ء سے ۳۹ء میں ایک کروڑ ۲۸ لاکھ روپے تقسیم کیے گئے اور ساتھ ہی ۱۹۳۷ء سے ۳۸ء

اور ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۶ء میں کوئی نیا محصول عاید کیے بغیر متوازن موازنے پیش کیے گئے۔ یہ چیز اس وجہ سے ممکن ہوئی کہ ۱۹۳۰ء کے پورے زمانے میں تجارتی حالات میں مسلسل ترقی ہوتی رہی۔ چنانچہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اسی سبب سے زیادہ تر کروڑ گیری اور ریلوے کی آمدنی سے محاصل میں ۳ کروڑ ۹۰ لاکھ روپے کا اضافہ ہوا۔ صوبہ واری خود مختاری کے نفاذ کے باعث مرکزی حکومت پر جو زاید اخراجات عاید ہوے ان کو پورا کرنے اور ہندوستان کی مدافعت کے سلسلے میں جو بعض ضروری مصارف لاحق ہوے ان کے واسطے رقم فراہم کرنے کے لیے محاصل کا اضافہ اور وہ فاضل بچت بالکل کافی ثابت ہوئی جو آمدنی کی کمی کو پورا کرنے کے لیے مختص کی گئی تھی۔ اس طرح دو سال کے اختتام پر صرف ۹ لاکھ روپے کی قلیل رقم فاضل بچی۔

جہاں یہ سب ٹھیک ہے وہاں اس بات پر بھی زور دینا مناسب ہوگا کہ ان خاص محصولات کے بار کو کم کر دینا ضروری ہے جو ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۲ء کی مالی مشکلات کے زمانے میں عاید کیے گئے تھے۔

۲۶۔ مرکزی حکومت کا عام موازنہ

ہم ذیل میں ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۸ء کے لیے مرکزی حکومت کی آمدنی اور اس خرچ کا گوشوارہ درج کرتے ہیں جو محاصل سے پورا کیا گیا اور ساتھ ہی مقابلے کی غرض سے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۲ء کے حقیقی اعداد بھی پیش کرتے ہیں۔ (دیکھو صفحہ ۵۵۹)۔

۲۷۔ ہندوستان کا سرکاری قرضہ

ہندوستان کے سرکاری قرضے کے آغاز کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی جنگوں سے منسوب کیا جا سکتا ہے جن کی وجہ سے قومی قرضہ ۱۷۹۲ء کے ۷ ملین پونڈ سے بڑھ کر ۱۸۵۶ء سے ۱۸۵۷ء میں غدر سے پہلے ۵۹½ ملین پاؤنڈ ہو گیا۔ ایک سال بعد اس کی مقدار بڑھ کر ۶۰½ ملین پاؤنڈ ہو گئی۔ غدر کے باعث جو اخراجات لاحق ہوے ان کا کل بار ہندوستان پر ڈالا گیا۔ اسی وجہ سے ۱۸۶۰ء میں سرکاری قرضے کی مجموعی مقدار ۱۰۰ ملین پاؤنڈ سے متجاوز ہو گئی۔ جب کمپنی کی حکومت ۱۸۵۸ء میں منسوخ ہوئی تو حکومت ہند نے نہ صرف کمپنی کے علاقہ واری اور دوسرے قرضوں کی ذمہ داری اپنے سر لے لی بلکہ ۱۸۷۴ء میں ایسٹ انڈیا اسٹاک کی ادائی تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے ۱۲ ملین پاؤنڈ کے تمسکات پر مقسوم

(۵۵۹)

مرکزی حکومت کا موازنہ

(بحساب لاکھ روپے)

محاصل	سنہ ۱۹۲۱ء-۲۲ء (حقیقی اعداد)	سنہ ۱۹۳۷ء-۳۸ء (موازنے کا اندازہ)	مخارج	سنہ ۱۹۲۱ء-۲۲ء (حقیقی اعداد)	سنہ ۱۹۳۷ء-۳۸ء (موازنے کا اندازہ)
محاصل کی اہم مدیں:-					
کروڑگیری (مرکزی حکومت کے چنگی کے محصول)	۳۴۴۱	۴۲۶۰	محاصل کے مقابلے پر براہ راست مطالبات	۵۲۷	۳۸۴
		۷۱۶	کارہائے نمک سازی اور سرمایہ کے دوسرے مصارف جو محاصل سے پورے کیے گیے	—	۰۷۵
کارپوریشن ٹکس		۱۴۵			
کارپوریشن ٹکس کے علاوہ آمدنی کے دوسرے ٹکس	۱۸۷۴	۱۲۸۵			
نمک	۶۳۴	۸۲۵	ریلوے (سود اور متفرق مطالبات) (بہ لحاظ ریلوے بجٹ)	۲۴۳۰	۲۹۹۹
افیون	۳۰۷	۵۰	آب پاشی	۱۴	۱۱۷۵
دوسری مدات	۲۲۱	۹۴	ڈاک اور تار	۱۹۶	۸۰
			قرضے کی خدمات	۱۶۰۰	۱۴۱۲
میزان	۶۴۷۷	۷۳۷۵	سول نظم و نسق	۹۴۱	۱۰۴۳
ریلوے[لہ] (ریلوے بجٹ کے لحاظ سے خالص آمدنی)			کرنسی سکہ سازی اور مبادلہ	۱۰۷	۳۴
	۱۵۲۱[لہ]	۳۰۱۴	کارہائے عامہ	۱۵۴	۲۸۷
آب پاشی (خالص آمدنی)	۹	۱	متفرق	۵۵۰	۳۸۳
ڈاک اور تار	۵۷	۷۷	دفاعی خدمات	۷۷۸۸	۴۹۸۴

[لہ] - سنہ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۶ء تک ریلوے بجٹ علیحدہ مرتب نہیں کیا جاتا تھا۔ ریلوے کے مالیے پر باب پنجم میں بحث کی جا چکی ہے۔

سود کی آمدنی	۱۱۱	۷۱			
غیر فوجی نظم و نسق	۷۷	۹۲			
کرنسی اور سکہ سازی	۴۳۷	۱۰۶	غیر معمولی	-	۱
کارہائے عامہ	۱۱	۳۵	مرکزی اور صوبہ واری حکومتوں		۳۱۶
متفرق	۷۱۹	۱۴۳	کے درمیان حسابات کی بے باقی	-	
فوجی محکمہ کی آمدنی	۸۰۷	۵۲۲			
صوبہ واری مالی امداد			مجموعی اخراجات	۱۴۲۸۶	۱۱۹۳۵
اور رقمی لین دین	۱۲۹۸	-			
غیر معمولی مدات	-	۵۰۷	بچت	-	۷
مجموعی محاصل	۱۱۵۲۱	۱۱۹۴۲			
گھاٹا	۲۷۶۵	-			
صدر میزان	۱۴۲۸۶	۱۱۹۴۲	صدر میزان	۱۴۲۸۶	۱۱۹۴۲

کی ادائی بھی اپنے ذمے لے لی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے حکومت ہند کو جو قرضہ ترکے میں ملا وہ ۵۹۰
غیر پیدا آور قسم کا تھا۔ لیکن ۱۸۶۷ء سے جب کہ "غیر معمولی کارہائے عامہ" (جن کو بعد میں چل کر "کارہائے پیدا آور" کے نام سے موسوم کیا جانے لگا) مثلاً ریلوے اور آب پاشی کی تعمیر کی پالیسی پر عمل شروع ہوا تو "معمولی قرضہ" (کیونکہ ۱۸۷۹ء سے "غیر پیدا آور قرضے" کو اسی نام سے منسوب کیا جانے لگا) کے مقابلے میں پیدا آور یا تعمیرات عامہ کے قرضے میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ کمپنیوں سے بعض ریلیں خریدنے یا ان کو قرضہ دینے کے سلسلے میں حکومت کو قرضہ لینا پڑا تو موخر الذکر قرضوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ ۱۸۷۸ء کی منتخب کمیٹی کی سفارشوں کے مطابق کسی خاص سال کی فاضل آمدنی کو قرضے کی ادائی کے لیے استعمال نہیں کیا جا رہا تھا بلکہ ایسے پیدا آور کاموں میں لگایا جا رہا تھا جن کے لیے بصورت دیگر حکومت کو قرضہ لینا ناگزیر ہوتا تھا۔ اسی طرح معمولی قرضے کی تخفیف کا خود بخود نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بالمقابل تعمیرات عامہ کے قرضے میں اضافہ ہو گیا۔ اس عمل سے معمولی قرضہ ۱۹۱۷ء تک بالکل ادا ہو جاتا اگر جنگ کی وجہ سے اس

قرضے کی مقدار بہت زیادہ نہ ہو جاتی۔ مسٹر گوکھلے آنجہانی اس پالیسی کے سخت مخالف تھے کہ فاضل آمدنی کو قرضے کی ادائی میں لگایا جائے اور پیداآور قرضہ بڑھایا جائے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ چونکہ غیر پیداآور قرضے کی مقدار بہت تھوڑی تھی اس لیے حکومت کی معمولی فاضل آمدنی سے اس کی ادائی کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ معافی محصول کے ذریعے اس فاضل آمدنی کو محصول ادا کرنے والوں کو واپس دے دینا چاہیئے تھا یا اس سے بہتر مصرف یہ تھا کہ رفاہ عام مثلاً تعلیم، طبی امداد وغیرہ کے غیر متوالی اخراجات پورے کیے جاتے اور خصوصی صوبہ واری محفوظات کو جن سے یہ اخراجات پورے کیے جا سکتے تھے مرکزی حکومت اپنی فاضل آمدنی سے امدادی رقوم دے سکتی تھی۔

جنگ عظیم سے پہلے تک ہندوستان کے سرکاری قرضے کا بڑا حصہ انگلستان میں حاصل کیا جاتا تھا۔ حکومت نے اس پالیسی کی حمایت میں یہ دلیل پیش کی کہ ہندوستان اور انگلستان کی سود کی شرحوں کا باہمی فرق اس قدر زیادہ تھا کہ اس سے ان تمام خرابیوں کی تلافی ہو جاتی تھی جو انگلستان میں قرضہ حاصل کرنے سے منسوب کی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ حکومت یہ خیال کرتی تھی کہ ہندوستانی زر کے بازار کے وسائل بہت ہی محدود ہیں اور اس کا اندازہ یہ تھا کہ ہندوستان کسی ایک سال ۵ کروڑ روپے سے زیادہ قرضہ مہیا کرنے کی قابلیت ہی نہ رکھتا تھا۔ لیکن جنگ کے زمانے میں اور اس کے بعد یہ بات اچھی طرح ثابت ہو گئی کہ یہ اندازہ غلط تھا۔ اس زمانے میں قرضے کی مقدار جو ۳۱ مارچ ۱۹۱۴ء کو ۳ کروڑ ایک لاکھ روپے تھی تیزی سے بڑھ کر ۳۱ مارچ ۱۹۲۴ء کو ۱۲ ارب ۷۵ کروڑ ۷۰ لاکھ روپے ہو گئی۔ یہ اضافہ ہندوستان کی ۱۰۰ ملین پاؤنڈ کی جنگی امداد[1]، نئی دہلی کے خرچ اور مرکزی حکومت کے موازنے میں متواتر خساروں کی وجہ سے
۵۶۱
ہوا۔ ان مطالبات میں سے چند کو پورا کرنے کے لیے ہندوستان میں لگاتار جنگی قرضے حاصل کیے گئے، کیونکہ انگریزی زر کے بازار کے وسائل پر ان مطالبات کی وجہ سے بہت شدید بار پڑ رہا تھا جو جنگی اغراض کے سلسلے میں حکومت برطانیہ کی طرف سے اس پر کیے جا رہے تھے،

[1] ۱۹۱۸ء میں یہ وعدہ کیا گیا کہ جنگ کے طول کھینچنے کی صورت میں ۴۵ ملین پاؤنڈ کی مزید جنگی امداد دی جائے گی۔ لیکن ۲۰-۱۹۱۹ء میں افغانی جنگ کے باعث ۱۴ ملین پاؤنڈ کے کثیر اخراجات عاید ہو جانے کے مد نظر جنگ عظیم کے سلسلے میں زائد امداد خاصی کم کر دی گئی۔

چنانچہ حکومت ہند نے ۱۹۱۷ء میں ۳۵ کروڑ روپے اور ۱۹۱۸ء میں ۵۷ کروڑ روپے کی کثیر رقم قرض حاصل کی۔ سرکاری قرضوں کے لیے ہندوستانی زر کے بازار کی قوت پہلی دفعہ جنگ عظیم کے زمانے میں ظاہر ہوئی۔ یہ حالت جنگ کے بعد کے زمانے میں بھی برقرار رہی اور حکومت پیداآور اغراض کے لیے اب زیادہ تر ہندوستان ہی میں قرضے حاصل کرتی ہے۔ نہ صرف جنگی قرضوں سے کثیر رقوم حاصل ہوئیں بلکہ ان قرضوں کی ایک اور خوشگوار خصوصیت یہ تھی کہ شغل اصل کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا جس کا باعث یہ تھا کہ تشہیر موثر طریقے پر کی گئی تھی اور سرکاری قرضے کے انتظام کے سلسلے میں صدر اور ذیلی خزانوں میں وافر سہولتیں مہیا کی گئی تھیں۔ اس سلسلے میں ڈاکخانے کی جنگی قرضوں کی شاخ اور کیش سرٹیفیکٹوں کا ذکر بھی خاص طور پر ضروری ہے جنھوں نے سرکاری قرضے کی پالسی میں ایک مستقل جگہ حاصل کرلی ہے

ایک اور نئی چیز جو جنگ عظیم کی وجہ سے وجود میں آئی یہ تھی کہ خزانے کی ہنڈیوں کا طریقہ نافذ کیا گیا۔ چنانچہ یہ ہنڈیاں پہلی مرتبہ ۱۹۱۷ء میں برطانوی محکمۂ جنگ کی طرف سے حکومت کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے جاری کی گئیں۔ اس کے بعد خسارے کو پورا کرنے کے لیے ان ہنڈیوں کا اجرا جنگ کے بعد کے زمانے میں بھی کیا گیا جبکہ نئی ہنڈیاں جاری کرکے پرانی ہنڈیوں کی رقم ادا کی گئی۔ آخر میں خزانے کی ہنڈیوں کی جو کثیر تعداد باقی بچی ان کو کم کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ طویل مدت کے قرضوں سے جو رقم حاصل ہوئی اس سے ان ہنڈیوں کو بے باق کیا گیا۔ یہ طریقہ مالیے کے استحکام کے نقطۂ نظر سے قابل اعتراض تھا۔ ۱۹۲۹ء۔۳۰ء سے خزانے کی ہنڈیوں کا اجرا پھر مرکزی حکومت کے مالیے کی معمولی خصوصیت بن گیا ہے۔

۲۸۔ روپے اور اسٹرلنگ کے قرضے۔

ہندوستان میں جو قرضے حاصل کیے جاتے ہیں انھیں "روپے کے قرضے" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کیونکہ وہ روپے کی شکل میں وصول کیے جاتے ہیں اور سود اور اصل دونوں روپے کی شکل میں ادا کیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ روپے کے قرضے کے تمسکات لازمی طور پر ہندوستان میں رہنے والے خریدتے ہیں یا ان تمسکات کے مالک سب کے سب ہندوستانی ہوتے ہیں۔ قرضے کے تمسکات کا بڑا حصہ ہندوستان میں خریدا جاتا ہے، لیکن کچھ حصے کے خریدار ایسے شغل اصل کرنے والے بھی ہیں جو انگلستان

میں رہتے ہیں اور وہیں سے قرضے کا سود وصول کرتے ہیں ۔ اس کے علاوہ ہندوستانی روپے کے تمسکات کے خریدار نہ صرف ہندوستانی بلکہ یورپین بھی ہوتے ہیں[۱] ۔ یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ روپے یا اسٹرلنگ کا قرضہ خواہ وہ ہندوستان سے حاصل کیا جائے یا انگلستان سے، اگر اس کے تمسکات غیر ہندوستانیوں کے قبضے میں ہوں تو اس کو "بیرونی قرضہ" سمجھنا چاہیئے ۔
۵۶۲ اسی طرح اگر تمسکات ہندوستانیوں کے قبضے میں ہوں تو ایسے قرض کو اندرونی قرضہ خیال کرنا چاہیئے[۲] ۔ اس معیار سے دیکھا جائے تو ہمارے قرضے کا بڑا حصہ بیرونی ہے[۳] ۔ یہ کہنے کی بہ مشکل ضرورت ہے کہ پالیسی یہ ہونی چاہیئے کہ حتی الامکان بیرونی قرضے کی مقدار کو گھٹایا جائے کیونکہ اس سے ہر قسم کی سیاسی مشکلات پیدا ہوتی ہیں اور ہندوستانی مبادلے کا مسئلہ پیچیدہ صورت اختیار کرلیتا ہے ۔

۲۹ — سرکاری قرضے کی کیفیت ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۸ء میں[۳]

مندرجۂ ذیل گوشوارے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ۱۹۱۴ء اور ۱۹۳۶ء کے مالی سالوں کے اختتام پر حکومت ہند کے ذمے کے ان واجبات کی کیا حالت تھی جن پر سود ادا کیا جاتا تھا ۔ اس کے علاوہ اسٹرلنگ اور روپیہ کے قرضے کے اضافے، پیدا آور اور غیر پیدا آور قرضہ اور جنگ کے زمانے میں اور اس کے بعد تغیرات کے بارے میں اوپر جو حالات بیان کیے گئے ہیں ان کی بھی تشریح ہوجاتی ہے ۔

۳۰ — قرضے کی ادائی

جنگ سے پہلے کے زمانے میں ہندوستان کا سرکاری قرضہ دو طریقوں سے کم کیا جارہا تھا ۔ ان میں سے ایک طریقے کا تذکرہ کیا جاچکا ہے یعنی یہ کہ ریلوں، آب پاشی وغیرہ کے مصارف اصل کے لیے حکومت کی فاضل آمدنی کو کام میں لایا جاتا تھا ۔ اس طریقے سے حکومت قرضہ حاصل کرنے سے بچنے اور اسی حد تک غیر پیدا آور قرضے کو کم کرنے کے قابل ہوجاتی تھی ۔ دوسرا طریقہ بعض ریلوں

---

۱ ۔ دیکھو گیان چند کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان کا مالی نظام" صفحہ ۳۱۲ ۔

۲ ۔ ہندوستان کے قومی قرضے (روپے کے قرض، اسٹرلنگ کے قرض، میعادی قرض، غیر میعادی قرض اور سرکاری تمسکات) کی مختلف مدات کی سبق آموز بحث کے لیے دیکھو Guide book for Investors in Govt of India Securities (1921)

۳ ۔ دیکھو ناظم کرنسی کی رپورٹ (۱۹۳۴ء-۳۵ء) اور مرکزی حکومت کا موازنہ (۱۹۳۶ء-۳۷ء)

	۳۱ مارچ سنہ ۱۹۱۴ء	۳۱ مارچ سنہ ۱۹۳۶ء
	کروڑ روپے	کے حساب سے
سودی واجبات :-		
ہندوستان میں :-		
روپے کا قرضہ	۱۴۵،۶۹	۴۲۵،۹۱
خزانے کی ہنڈیاں عوام کے قبضے میں	—	۳۴،۰۹
خزانے کی ہنڈیاں محفوظ ذخیرۂ کاغذی میں	—	
دوسرے واجبات :-		
ڈاک خانے کے سیونگ بینک	۲۳،۱۷	۹۷،۸۰
کیش سرٹیفیکیٹ	—	۶۵،۹۷
پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ	۱۰،۹۳	۹۵،۹۹
ذخیرۂ فرسودگی اور محفوظ ذخیرے	—	۱۲،۷۴
صوبہ واری فاضلات	—	۴،۹۳
مجموعی قرضے	۱۴۵،۶۹	۴۶۰،۰۰
میزان دیگر واجبات	۰۳۴،۱۰	۲۴۷،۴۲
ہندوستان میں لیے ہوئے قرضوں اور واجبات کی میزان	۱۷۹،۷۹	۷۰۷،۴۲
	بحساب	ملین پاؤنڈ
انگلستان میں :-		
اسٹرلنگ کے قرضے	۱۷۷،۰۹	۳۱۷،۷۵
ہندوستان کی جنگی امداد کا غیر اداشدہ حصہ	—	۱۹،۷۲
ان واجب الادا رقوم کی سرمایہ بستہ مالیت جن کی ادائی ریلوے کے میعادی سالیانوں کی شکل میں ہو رہی ہے۔	۷۰،۶۰	۴۱،۷۵

	۳۱ مارچ ۱۹۱۴ء	۳۱ مارچ ۱۹۳۶ء
	کروڑ روپے کے حساب سے	
ہندوستانی بلز	–	–
پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ	–	۱٫۲۶
انگلستان میں لیے ہوئے قرضوں اور واجبات کی میزان	۲۴۷٫۶۶	۳۷۷٫۴۹
روپے کے معاول اشلنگ ۴ پنس کی شرح سے ۱۹۱۴ء میں اور ۱ اشلنگ ۶ پنس کی شرح سے ۱۹۳۱ء میں۔	۳۷۱٫۵۰	۵۰۳٫۳۲
		–
سودی واجبات کی صد میزان	۵۵۱٫۲۹	۱۲۰۱٫۷۴
	کروڑ روپے کے حساب سے	
اثاثہ جن سے سود وصول ہوتا ہے :-		
ریلوے کو بطور قرض دیا ہوا سرمایہ	۴۳۸٫۹۴	۷۵۷٫۳۸
دوسرے تجارتی محکموں کو بطور قرض دیا ہوا سرمایہ	۱۴٫۰۸	۲۴٫۳۰
صوبوں کو بطور قرض دیا ہوا سرمایہ	۷۱٫۹۹	۱۸۶٫۸۲
دیسی ریاستوں کو بطور قرض دیا ہوا سرمایہ اور سودی قرضہ	ل	۲۲٫۹۲
میزان اثاثے کی جس سے سود وصول ہوتا ہے	۵۲۴٫۷۱	۹۸۹٫۴۲
نقد طلا اور تمسکات جو خزانے کی مد میں جمع ہوں۔	ل	۲۲٫۹۹
مجموعی سودی واجبات کا باقی حصہ جس کا تحفظ مذکورہ بالا اثاثے سے نہیں ہوتا	۲۶٫۵۸	۱۹۸٫۳۳

ل ۔ اعداد دستیاب نہیں ہوئے ۔

۵۶۳

کی خریدی کے سلسلے میں عاید شدہ واجبات کو پورا کرنے کے لیے اختیار کیا گیا۔ ان واجبات کے ایک حصے کو ریلوے کے سالیانے (جو اصل قرض اور سود دونوں کی ادائی کی غرض سے جاری کیے جاتے تھے) ادا کر کے جنگی بیباقی لازمی قرار دی گئی ہے گھٹایا گیا اور یہ طریقہ اب بھی جاری ہے۔ اسی طرح "انڈیا اسٹاک" کو بھی جس کے بارے میں ریلوے کے حصہ داروں کو مجاز گردانا گیا تھا کہ وہ اپنے سالیانوں کے بدلے میں حاصل کریں اور ان تمسکات کو جو ایسی قدیم کمپنیوں کے پاس تھے جن سے ریلیں خریدی گئیں بعض "قرض ادائی ذخیروں" سے کم کیا جا رہا ہے اور یہ ریلوے کی مد کے تحت ظاہر کیے جاتے ہیں۔ جنگ کے زمانے میں ۱۹۱۷ء کے ۵ فیصد والے جنگی قرضے کے اجرا کے سلسلے میں ایک قرض ادائی ذخیرہ قائم کیا گیا۔ حکومت نے اس بات کی حامی بھری کہ جب تک قرضے کے تمسکات کی بازاری قیمت ان کی قیمت اجرا سے کم رہے وہ ان تمسکات کی خریدی اور تنسیخ کی غرض سے قرض کی رقم کا ½ ۱ فیصد حصہ الگ رکھے گی۔ اس کے علاوہ جنگی امداد کے غیر ادا شدہ حصے کے بارے میں ہندوستان کے واجبات کو پورا کرنے کے لیے حکومت نے تقریباً ۵ لاکھ پاؤنڈ سالانہ کی فراہمی کا انتظام کیا۔ نیز حکومت نے ۸۰ لاکھ روپے کی ایک زاید رقم کی اختیاری ادائی کا بھی انتظام کیا جو ۱۹۲۱ء تا ۲۲ء سے ۵ فیصد والے قرضے کے لیے ایک جدید ذخیرۂ ادائی کے قیام کے سلسلے میں زیر تصفیہ تھی۔

لیکن یہ صورت حال زیادہ تر اتفاقات کا نتیجہ تھی اور سرکاری قرضے کی ادائی کے پورے مسئلے کی تحقیق کبھی اصولی اور باقاعدہ طریق پر نہیں ہوئی۔ قرضے کی ادائی کی ایک باقاعدہ ۵۶۷
اسکیم مرتب کرنا نہایت ضروری ہے تاکہ حکومت کی ساکھ ملک کے اندر اور باہر کسی خلل کے بغیر برقرار رہ سکے اور اس طرح قریب الادا قرضے کی تجدید اور مناسب شرح پر حسب ضرورت نئے سرمایے کی فراہمی میں سہولت ہو۔ دسمبر ۱۹۲۴ء میں سر بیسل بلاکٹ کی تحریک پر مجلس قانون ساز نے قرض کی ادائی کی ایک باضابطہ اسکیم منظور کی۔ اس اسکیم کے اصول کی توضیح کرتے ہوئے سر بیسل بلاکٹ نے بتلایا کہ قرض کی ادائی کا باقاعدہ پروگرام تیار کرنے کا بہترین طریق یہ ہے کہ پہلے قرض کی خام مجموعی مقدار معلوم کی جائے، اس کے بعد یہ اندازہ کیا جا سکے کہ اس کے مقابلے میں اثاثے کی شکل میں کتنا سرمایہ موجود ہے اور آخر میں قرض کی ہر مد کو ذخیرۂ ادائی سے ادا کرنے کے لیے ایک مناسب مدت کا تعین کر دیا جائے۔

اس طریق کار کے مطابق ۹ دسمبر ۱۹۲۴ئہ کو رکن مالیہ نے ایک اسکیم کا اعلان کیا جس کی بموجب قرضے کو کم کرنے یا اس سے بچنے کے لیے سالانہ محاصل پر بار ڈالا گیا اور ابتداءً پانچ سال کے لیے اس بار کی مقدار ۴ کروڑ روپے سالانہ مقرر کی گئی۔ اس کے علاوہ ۳۱ مارچ ۱۹۲۳ئہ تک کے غیر ادا شدہ قرضے کے مقابلے میں ہر سال کے ختم پر غیر ادا شدہ قرضے کی جتنی مقدار زاید ہو اس کے $\frac{1}{80}$ حصے کے برابر رقم ذخیرہ ادائی میں رکھنے اور اس تمام قرض میں اسٹرلنگ کے قرض کو بھی ۱۵ روپے فی پاؤنڈ کی شرح سے روپے کے اعداد میں تبدیل کر کے محسوب کرنے کی تجویز منظور ہوئی[1]۔ سر بیسل بلاکٹ کی توضیح کے مطابق مجوزہ ذخیرۂ ادائی قرض کو خالص مجموعی قرض کے کم کرنے کے کام میں اس وقت تک نہیں لایا جا سکتا جب تک کہ جدید مصارف سرمایہ کا وسیع سالانہ پروگرام موجود ہے لیکن اس ذخیرے کو غیر پیدا آور قرضے کو کم کرنے کے کام میں صرف کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح فراہم کردہ رقم کی حیثیت پیدا آور مصارف سرمایہ کے لیے محاصل سے دی ہوئی امداد کی ہوگی۔ اس لیے اس رقم کو ذخیرۂ ادائی قرضہ کے نام سے موسوم کرنے کی بجائے قرض کو کم کرنے یا اس سے بچنے کے لیے محاصل سے دی ہوئی امداد کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔

۱۹۳۰ئہ کے آغاز سے کیش سرٹیفیکٹوں کے متعلق واجبات کی ادائی کا پہلی دفعہ معقول انتظام کر دیا گیا اور اس تاریخ سے کیش سرٹیفیکٹوں کو سرکاری قرضے کا جزو خیال کیا جانے لگا۔

رکن مالیہ نے اپنی ۱۹۳۰ئہ ۔ ۱۹۳۱ئہ کی موازنے والی تقریر میں یہ خیال ظاہر کیا کہ چونکہ ریلوں کے متعلق قواعد (جن کے بموجب ایک مقررہ سالانہ رقم عام محاصل میں شریک کی جاتی ہے اور تمام کی تمام رقم ریلوں میں مشغول سرمایے کی وصولیابی کے طور پر استعمال کی جاتی ہے) اور عام قرضہ کی بے باقی کی اسکیم کے متعلق قواعد ایک دوسرے کے تابع ہیں اس لیے یہ مناسب ہے کہ آخر الذکر قاعدے کو سر دست حسب حال رکھا جائے اور آیندہ مالیات کی نظر ثانی کے وقت اس مسئلے پر غور کیا جائے۔ الغرض یہ تصفیہ کیا گیا کہ فی الوقت سال

[1] دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "India's Parlianemt" جلد دوم صفحہ ۔ ۲۶۵ ۔

سنہ ۱۹۳۰ء سے ۳۱ء کے بعد سے رقم کی فراہمی کا انتظام حسب سابق کیا جائے بجز اس کے کہ اسٹرلنگ کی شکل میں جو قرضہ ہے وہ فی پاؤنڈ ۱۵ روپے کی بجائے ۱۳½ روپے کے حساب سے روپیوں کی شکل میں تبدیل کر لیا جائے[1]۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۳ء سے ۳۴ء کے بعد سے (جیسا کہ صفحہ ۵۶۲ کی جدول ۲ سے ظاہر ہے) سالانہ رقم جو قرضے میں کمی کرنے یا قرضے سے بچنے کے لیے علحدہ کی جاتی ہے وہ گھٹا کر ۳ کروڑ روپے کی یکشت رقم کر دی گئی ہے۔ یہ عمل اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ہند کے قرضے کا تقریباً ۶۰ فیصد حصہ ریلوں سے متعلق ہے اور ایسی حالت میں سنہ ۱۹۳۳ء سے ۳۴ء سے پہلے کے قرض ادائی ذخیرہ کے طریقے کو اختیار کرنے سے جبکہ ریلوں نے عام محاصل میں مقررہ رقم کی ادائی کے طریق کا آغاز نہیں کیا تھا مرکزی حکومت کے موازنے پر ضرورت سے زیادہ بار پڑے گا۔ اس طرح سنہ ۱۹۲۴ء کی قرضے کی ادائی کی اسکیم فی الوقت ملتوی رکھی گئی ہے[2]۔ ۵۶۵

مرکزی اور صوبہ واری حکومتوں کے درمیان

مالی تعلقات

۳۱ - سنہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات سے پہلے مالی تعلقات

سنہ ۱۸۷۱ء سے ۱۹۳۳ء تک تمام مالی اختیارات حکومت ہند کے ہاتھ میں تھے اور وہ صوبہ واری حکومتوں کے اخراجات کے جزئیات پر بھی نظر رکھتی تھی۔ تمام محاصل حکومت ہند کے حساب میں جمع کیے جاتے تھے اور صوبہ واری حکومتوں کو اپنے اخراجات کی تکمیل کے لیے صرف مقررہ رقمیں ملتی تھیں۔ اس کی وجہ سے صوبہ واری مالیے میں اسراف،

---

[1] دیکھو موازنہ کی کیفیت (سنہ ۱۹۳۴ء سے ۳۵ء) فقرہ ۲۵ - ۲۶ اور معتمد مالیہ کی یادداشت برائے (سنہ ۱۹۳۱ء سے ۳۲ء) فقرہ ۳۲۔

[2] دیکھو رکن مالیہ کی موازنے کی تقریریں (سنہ ۱۹۳۴ء سے ۳۵ء) و (سنہ ۱۹۳۵ء سے ۳۶ء)۔

عدم تغیر پذیری ، اور کشمکش اور مرکزی مالیے میں غیر یقینی حالت پیدا ہو جاتی تھی۔ "وہ سرکاری محاصل کی تقسیم ایک طرح کی چھینا جھپٹی ہو گئی تھی۔ جو سب سے طاقت ور ہوتا تھا وہ فایدے میں رہتا تھا اور معقولیت کو اس میں کوئی دخل نہ ہوتا تھا۔ چونکہ کسی خاص مقام کو مقامی کفایت شعاری سے کوئی فایدہ نہیں پہنچتا تھا اس لیے فضول خرچی کی روک تھام نہ ہوتی تھی اور چونکہ مقامی طور پر آمدنی کو ترقی دینے سے مقامی اصلاح و ترقی کے ذرایع کی فراہمی ممکن نہ تھی اس لیے سرکاری محاصل کو بڑھانے کا خیال بھی برائے نام رہ گیا تھا" (سرجان اسٹریچی)۔ ہندوستان جیسے ملک کے لئے جہاں مقامی حالات میں اختلافات بہت نمایاں ہیں مالی معاملات میں اس قسم کی غیر ضروری یکسانیت اور انتہائی مرکزیت بالکل ناموزوں تھی۔ لارڈ میئو نے یہ ضرورت محسوس کی کہ مالی معاملات میں کچھ نہ کچھ لامرکزیت ہونی چاہیے تاکہ صوبہ واری حکومتیں سرکاری محاصل کو ترقی دینے میں دلچسپی لیں، ممکنہ کفایت شعاری سے ان کا انتظام کریں اور تعاون باہمی سے کام لیں۔ ۱۸۷۰ء میں لارڈ میئو نے "صوبہ واری مالی بندوبست" کا طریقہ نافذ کیا جس کے بموجب مقامی نوعیت کے اخراجات کی بعض مدیں صوبوں کو تفویض کر دی گئیں، مثلاً پولس، تعلیمات، سڑکیں، کارہائے عامہ، رجسٹری طبابت اور محابس۔ ان محکموں کے انتظام کے لیے صوبہ واری حکومتوں کو محکمہ واری محاصل کے علاوہ سالانہ مقررہ یکشت رقمیں منظور کی گئیں۔ ان رقموں کی کمی کو حسب ضرورت مقامی محصول عاید کر کے پورا کیا جا سکتا تھا۔ اس جدید انتظام کی وجہ سے زیادہ باقاعدگی پیدا ہو گئی اور صوبے زیادہ کارآمد کاموں پر رقمیں خرچ کرنے لگے۔ اس کے علاوہ صوبے مفوضہ ذرایع آمدنی سے زیادہ آزادی کے ساتھ استفادہ کرنے کے قابل ہو گئے۔

لہ۔ ۱۸۷۰ء میں لارڈ میئو کی اصلاحات کے بعد سے حکومت ہند نے صوبہ واری حکومتوں کو جس قاعدے کے مطابق محاصل تقسیم کیے ہیں اس کی بموجب ڈاکٹر امبیڈکر نے مالی معاملات میں لامرکزیت کے اس دور کو حسب ذیل تقسیم کیا ہے :۔ (۱) یکشت رقم دے کر موازنے کی ترتیب (۱۸۷۱ء-۷۲ء تا ۱۸۷۶ء-۷۷ء)؛ (۲) محاصل کی بعض مدات دے کر موازنہ کی ترتیب (۱۸۷۷ء-۷۸ء تا ۱۸۸۱ء-۸۲ء)؛ (۳) محاصل میں شریک کر کے موازنے کی ترتیب (۱۸۸۲ء-۸۳ء)۔ دیکھو بی آر امبیڈکر کی کتاب موسوم بہ Provincial Finance جلد دوم باب ۴ تا ۶۔

ان نئے انتظامات کے لیے کوئی قطعی مدت مقرر نہیں کی گئی جو ۱۸۷۷ء تک نافذ رہے۔ حقیقی تجربے سے اس طریق کی متعدد خرابیاں ظاہر ہوئیں۔ اس کے تحت صوبوں کو کافی آمدنی فراہم نہیں کی جا سکی۔ ہر سال صوبوں کو جو رقم دی جاتی تھی وہ مرکزی حکومت کی ضروریات کے تابع تھی۔ بعض لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ اس تبدیلی کا اصل منشا یہ نہیں تھا کہ صوبوں کے اختیارات اور ان کی ذمہ داریاں بڑھائی جائیں بلکہ اصل غرض یہ تھی کہ مرکزی مالیے پر جو بار تھا اس کو کم کیا جائے[1]۔ اس کے علاوہ صوبہ واری حالات سے مرکزی حکومت کی لاعلمی کے باعث رقمی منظوریاں کسی اصول کے تابع نہ تھیں۔ اس طریقے کی وجہ سے صوبوں کو کفایت شعاری کرنے کی کوئی ترغیب نہیں ہوئی۔ کیونکہ صوبوں کو یہ اختیار تھا کہ اپنی آمدنی کی کمی کو مزید محصولات عاید کر کے پورا کریں۔ لیکن اس قسم کے زائد محصولوں سے غریبوں کی زیر باری میں اضافہ ہونا یقینی تھا۔

۱۸۷۷ء میں لارڈ لٹن نے اپنے رکن مالیہ سر جان اسٹریچی کی مدد سے لامرکزیت کی طرف ایک اور قدم بڑھایا۔ اخراجات کی تقریباً باقی سب مدیں مثلاً مالگزاری، آبکاری، اسٹامپ، عام نظم و نسق، قانون و عدالت، صوبوں کو منتقل کر دی گئیں۔ محکمہ واری آمدنیوں اور سابق میں منظورہ یکمشت رقموں کے علاوہ محاصل کی بعض مدیں مثلاً آبکاری، اسٹامپ، قانون و عدالت بھی صوبہ واری حکومتوں کو تفویض کر دی گئیں۔ اگر صوبہ واری حکومتوں کی مدات آمدنی میں کوئی اضافہ ہوتا تو اس کا نصف حکومت ہند لے لیا کرتی تھی اور اگر تخمینے سے کم آمدنی ہوتی تو مرکزی حکومت اس کی تلافی کیا کرتی تھی۔ اس کے باوجود یہ ضروری خیال کیا گیا کہ مقررہ یکمشت رقمیں بھی سال بہ سال صوبہ واری حکومتوں کو دی جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے کی طرح ہر سال صوبوں کے مابین کشمکش ہونے لگی۔ اس کے علاوہ صوبوں نے تحصیل آمدنی میں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا کیونکہ ان کا اس آمدنی میں کوئی حصہ نہیں رکھا گیا تھا۔ آسام اور برما چونکہ پسماندہ صوبے تھے اس لیے ان کو مذکورۂ بالا اسکیم میں شریک نہیں کیا گیا۔ مالی بندوبست میں جو ۱۸۷۹ء میں کیا گیا ۵۶۷

[1] دیکھیے پی۔ رین۔ بنرجی کی کتاب موسومہ به
Provincial Finance in India صفحہ (۴۸)۔

یہ ہوا کہ صوبہ واری خسارے کو دور کرنے کی غرض سے ایک مقررہ رقم دینے کے بجائے بر ما کو خالص صوبہ واری آمدنیوں کے علاوہ کچھ حصہ مالگزاری کا دیا گیا۔ اس کے علاوہ اس صوبے کو کچھ حصہ جنگلات کی آمدنی کا اور کچھ حصہ نمک اور چاول کے محصول برآمد کا بھی دیا گیا۔ مشترک یا منقسم آمدنی کا یہی طریقہ آسام کے صوبے کے لیے بھی جاری کیا گیا۔ چنانچہ اس صوبے کو بھی مالگزاری میں سے کچھ حصہ دیا گیا۔ ۱۸۸۲ء میں لارڈ رپن نے محاصل کی یہ تین طرح کی تقسیم یعنی (۱) بالکلیہ مرکزی (۲) بالکلیہ صوبہ واری اور (۳) مشترک طور پر مرکزی اور صوبہ واری بعد میں دوسرے صوبوں میں بھی نافذ کر دی۔[1]

۱۸۸۲ء میں لارڈ رپن نے اپنے رکن مالیہ میجر بیرنگ کی مدد سے صوبہ واری مالی بندوبست میں چند اصلاحیں کیں اور یہ طے پایا کہ ہر پانچ سال کے بعد مالی بندوبست کی تجدید کی جائے۔ لارڈ رپن نے مقررہ یکمشت رقمیں دینے کا طریقہ بالکل موقوف کر دیا اور آمدنی کی تقسیم حسب ذیل کی:-

(۱) مرکزی مدات:- افیون، نمک، کروڑ گیری، تجارتی کاروبار وغیرہ۔

(۲) صوبہ واری مدات:- غیر فوجی محکمے، صوبہ واری کارہائے عامہ، صوبہ واری محصولات۔

(۳) مشترک مدات:- آبکاری، مشخصہ محصول، اسٹامپ، جنگلات، رجسٹریشن وغیرہ۔ صوبہ واری حکومتوں کو خسارے سے نجات دلانے کے لیے پہلے یکمشت رقم دینے کا طریقہ تھا۔ اس کے بجائے ان کو مالگزاری کا مقررہ فیصد دے دیا گیا اس کے ساتھ ساتھ ایک مقررہ نقد رقم دے دی جانے لگی جس سے صوبہ واری حکومتوں کے مالیے کو متوازن بنانے میں بہت مدد ملی۔ ۱۸۸۷ء ۱۸۹۲ء اور ۱۸۹۷ء میں تقریباً اسی قسم کے مالی بندوبست ہوئے اور مقررہ اصول میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ لیکن اس سلسلے میں کافی بحث مباحثہ ہوا اور صوبوں کے مابین بے اطمینانی پھیلی۔ واقعہ یہ تھا کہ محاصل کی تقسیم مرکزی حکومت اور صوبہ واری حکومتوں کے درمیان نیز خود صوبہ واری حکومتوں کے

---

[1] دیکھو ڈاکٹر امبیڈکر کی محولۂ بالا تصنیف صفحہ ۹۶-۹۸-

درمیاں غیر منصفانہ تھی۔ گو اس طریقے کے تحت صوبہ داری حکومتوں کو مشترک مدات آمدنی سے محصولات جمع کرنے کی ترغیب ہوئی تھی اور ساتھ ہی صوبہ داری حکومتوں کے ذرائع آمدنی میں لچک پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن ہر پانچ سال کے بعد بندوبست کی تجدید ہونے کی وجہ سے یہ خرابی پیدا ہوگئی تھی کہ مالی مسلک میں کوئی تسلسل قائم نہیں رہ سکتا تھا، کیونکہ اختتام بندوبست پر جو بھی صوبہ داری فاضلات ہوتے تھے وہ خود مرکزی حکومت لے لیا کرتی تھی۔ علاوہ بریں اگر کوئی صوبہ کفایت شعاری سے کام کرتا تو ایسی حالت میں اس کے کم خرچ کو آیندہ کے بندوبست کا معیار قرار دے دیا جاتا تھا۔ اس طرح صوبوں کے لیے کفایت شعاری کرنے کی کوئی ترغیب باقی نہیں رہی اور ہر پانچ سال کے بعد ناخوشگوار کشمکش ہوا کرتی تھی۔

اس خرابی اور غیر یقینی حالت کو دور کرنے کے لیے سنہ ۱۹۰۴ء میں لارڈ کرزن نے مالی بندوبست کے طریقے کو ایک طرح سے دوامی کر دیا۔ اس بندوبست کی تجدید صرف اسی وقت ہوسکتی تھی جب کہ سابقہ حالات میں کوئی نمایاں تبدیلی واقع ہو یا کسی ناگہانی ضرورت کے موقع پر جیسے جنگ اور قحط۔ اگر مرکزی محاصل میں اتفاقی اضافہ یا بچت ہوتی تو صوبہ داری حکومتیں بعض خاص خاص اغراض مثلاً پولیس کی اصلاح، تعلیمات، صحت عامہ وغیرہ کے لیے یکمشت رقم بطور امداد حاصل کیا کرتی تھیں۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں لارڈ ہارڈنگ کے عہد حکومت ۵۶۸
میں یہ مالی بندوبست تقریباً دوامی کر دیے گئے، اور محاصل کی تقسیم حسب ذیل طریقے پر عمل میں لائی گئی۔ جہاں تک مدات آمدنی کا تعلق ہے مرکزی حکومت نے وہ جملہ مدات اپنے لیے مختص کر لیے جو کسی خاص صوبے سے منسوب نہیں کیے جا سکتے تھے اور ان کو مرکزی مدات محاصل قرار دیا گیا، مثلاً افیون، ریلوے، کروڑگیری، نمک، ٹکسال اور مبادلہ، ڈاک اور تار، فوجی آمدنیاں اور دیسی ریاستوں کے خراج۔ باقی ماندہ ذرائع آمدنی میں سے کچھ بالکلیہ صوبہ داری بنا دیے گئے، مثلاً جنگلات اور آبکاری (بمبئی اور بنگال میں)، رجسٹری اور صوبہ داری محکموں کی آمدنیاں جیسے تعلیمات، قانون وعدالت۔ اس کے علاوہ منقسم مدات محاصل بھی تھے جو کافی اہمیت رکھتے تھے مثلاً مالگزاری، انکم ٹکس، آبکاری (بجز بنگال اور بمبئی کے)، آب پاشی اور اسٹامپ۔ ان ذرائع سے جو آمدنی حاصل ہوتی تھی وہ مرکزی اور صوبہ داری حکومتوں کے درمیان ایک معینہ تناسب سے تقسیم ہوتی تھی۔ یہ تناسب عام طور پر برابر برابر ہوتا تھا، لیکن ہر صوبے کے لیے علٰحدہ رقم کا تعین ہوتا تھا۔

جہاں تک خرچ کا تعلق ہے کم و بیش اسی قسم کا انتظام تھا اور قحط سالی کے ضمن میں اخراجات کی باہمی تقسیم کا خاص انتظام رکھا گیا تھا۔ اصلاحات سے پہلے کا جو طریقہ تھا اس میں حسب ذیل نقائص تھے۔ (۱) مشترک مداتِ محاصل جن سے ہر دو فریق کے اغراض وابستہ تھے ان میں مرکزی حکومت مداخلت کرتی رہتی تھی۔ اس کی وجہ سے صوبہ واری ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوتی تھی۔ (۲) اپنی بچت سے مرکزی حکومت وقتاً فوقتاً صوبوں کو جو مالی امداد دیا کرتی تھی اس کی وجہ سے صوبہ واری مالیے میں بدنظمی پیدا ہو جاتی تھی۔ (۳) صوبوں کے درمیان مالی عدم مساوات پیدا ہوگئی تھی۔ (۴) صوبہ واری حکومتیں محصولات عاید کرنے اور قرضہ لینے میں خود مختار و آزادانہ تھیں۔ (۵) مرکزی حکومت صوبہ واری موازنوں اور اخراجات پر ضرورت سے زیادہ نگرانی رکھتی تھی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ صوبے نہ تو اپنے گھاٹے کو پورا کرنے کا انتظام کر سکتے تھے اور نہ اپنے فاضلات کو آزادی کے ساتھ خرچ کر سکتے تھے۔

۳۲ - ۱۹۱۹ء کے اصلاحات کے بعد مالی تعلقات

مرکزی حکومت سے جو مالی تعلقات ہیں وہ اصلاحات کے بعد سے کافی بدل چکے ہیں۔ چونکہ صوبوں میں ذمہ دارانہ حکومت کی آزمائش کرنا مقصود تھا اور صوبہ واری مالی خود مختاری یا مالی اختیارات کی منتقلی اصلاحات کی بنیاد خیال کی جاتی تھی، اس لیے نئے اصول کو نافذ کرنے کی غرض سے مشترک مداتِ محاصل کی تنسیخ ضروری ہوگئی۔ محاصل و مخارج کی جدید طریقے پر حسب ذیل تقسیم کی گئی:- (۱) مرکزی مداتِ محاصل:- افیون، نمک، کروڑگیری، انکم ٹیکس، ریلوے، ڈاک اور تار، فوجی آمدنیاں۔ (۲) صوبہ واری مداتِ محاصل:- مالگزاری (بشمول آب پاشی) اسٹامپ (عدالتی و تجارتی) رجسٹریشن، آبکاری اور جنگلات۔ چونکہ مونٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ اور میسٹن کمیٹی (دیکھو آگے کی فصل) نے انکم ٹیکس ۵۶۹
کو مرکزی مدِ محاصل قرار دیا تھا، اس لیے بمبئی اور بنگال کے صنعتی صوبوں نے انکم ٹیکس سے قطعاً محروم ہو جانے پر سخت احتجاج کیا۔ اس احتجاج کی بنا پر بالآخر یہ طے کیا گیا کہ صوبوں کو بھی انکم ٹیکس کی آمدنی کا کچھ مختصر حصہ دیا جائے۔ ۱۹۲۰ء - ۲۱ء کو معیاری سال قرار دیتے ہوئے اس حصے کا تعین اس طرح کیا گیا کہ اس سال جس قدر آمدنی پر محصول عاید کیا گیا تھا اس کو چھوڑ کر آیندہ جس قدر آمدنی پر ٹیکس عاید ہو اس میں فی روپیہ ۳ پائی کے

حساب سے صوبوں کو دیا جائے۔ محصولات کی تحقیقاتی کمیٹی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ اصول کارگر ثابت نہیں ہوا اور معیاری سال کی بنا پر انکم ٹیکس کی تقسیم کا سارا طریقہ بالکل ناقص ہے

۲۳ - میسٹن کا عطیہ

مشترک مدات محاصل کی تنسیخ اور بعض مدات مثلاً مالگزاری اور اسٹامپ کو صوبہ واری بنا دینے سے ۹۸۳ لاکھ روپے کا خسارہ ہوا۔ اس خسارے کی پابجائی کے لیے ایک اسکیم یہ تجویز کی گئی کہ صوبے مرکزی حکومت کو مالی امداد دیا کریں۔ اس اسکیم اور دوسرے متعلق مسائل پر غور کرنے کے لیے ۱۹۲۰ء میں لارڈ میسٹن کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی کا فیصلہ (جو کہ "میسٹن عطیہ" کہلاتا ہے) بطور خلاصے کے صفحہ ۷۰۵ کی جدول میں دیا گیا ہے۔ یہ فیصلہ اس بار کی تقسیم کے متعلق ہے جس کا تعین ابتدائے ۱۹۲۱ء سے ۲۲ء میں کیا گیا تھا اور اس مقررہ مالی امداد سے بھی متعلق ہے جو ۱۹۲۱ء سے ۲۲ء کے بعد ساتویں سال سے باقاعدہ تدریجی اقساط سے قابل ادائی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا تعلق اس مقررہ مالی امداد کی اسکیم سے بھی تھا جس پر بالآخر عمل ہوا تھا۔ صفحہ ۷۰۵ پر مندرجہ جدول سے ان اندازوں کا بھی پتا چلتا ہے جو مذکورہ کمیٹی نے صوبوں کے فاضلات کے متعلق کیے تھے۔ ان اندازوں کا مقابلہ صوبوں کے ان واقعی فاضلات اور خساروں سے کیا گیا ہے جو ۱۹۲۱ء سے ۲۲ء کے اصلاحات کے بعد پہلے سال میں رونما ہوئے[1]۔

چونکہ صوبوں کی باہمی مالی عدم مساوات کو کمیٹی نے چنداں دور کرنے کی کوشش نہیں کی، اس لیے ابتدائی امدادی رقمیں بالکل بے اصولی تھیں اور مدات محاصل کی جدید تقسیم کی وجہ سے اس امداد کا انحصار صوبوں کی خرچ کرنے کی قوت کے اضافے پر ہو گیا تھا۔ کمیٹی نے محض اس چیز کا لحاظ رکھا تھا کہ ہر صوبے سے مالی امداد کا تعین اس طرح کیا جائے کہ اس کو خسارہ نہ ہو اور اپنے یہاں مزید محصولات عاید کرنے کی نوبت نہ آئے۔ اس طرح یہ طے پایا کہ مدراس ۳۴۸ لاکھ روپے ادا کرے، کیونکہ اس کی خرچ کرنے کی استطاعت میں بقدر ۵۷۶ لاکھ روپے

---

[1] - دیکھو محصولات کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۲۹۵ -

[2] - دیکھو مالی تعلقات کی (میسٹن) کمیٹی کی رپورٹ فقرۂ ۱۷ و ۲۸ اور سائمن کمیشن کی رپورٹ جلد اول فقرہ (۳۹۹)

اضافہ ہوا تھا۔ دوسری جانب بمبئی کو صرف ۵۶ لاکھ روپے ادا کرنے تھے، کیونکہ اس کی خرچ کرنے کی قابلیت میں صرف ۹۳ لاکھ روپے کا اضافہ ہوا تھا۔ اس طرح دوسرے صوبوں کے لیے بھی تصفیہ کیا گیا۔ جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ ہر صوبے کے لیے پہلے سال میں جو رقم ادا کرنا طے پایا ہے بعد کے سالوں میں اس میں کسی صورت میں بھی اضافہ نہ کیا جائے اور مقررہ امدادی رقم کا تعین اس طرح ہو کہ بتدریج مرکزی حکومت کے خسارے کو کم کیا جائے۔

لاکھ روپے کے حساب سے

صوبہ	[illegible]	[illegible]	خسارے کے مقابلے میں مالی امداد کا فیصدی تناسب ۱۹۲۱ء سے ۲۲ء	خسارے کے مقابلے میں مقررہ مالی امداد کا فیصدی تناسب: جیسا کہ مشن کمیٹی نے سفارش کی	جیسا بالآخر عمل ہوا	مالی امداد دینے کے بعد خرچ کرنے کی قوت میں جو اضافہ ہونے والا تھا اس کے بارے میں مشن کمیٹی کا اندازہ	(+) (-) [illegible]
مدراس	۵۶۹	۳۴۸	۳۵ ۱/۲ °	۱۷		۲۸۸	-۹۰
بمبئی	۹۳	۵۶	۵ ۱/۲	۱۳		۳۷	-۱۹۱
بنگال	۱۰۴	۶۳	۶ ۱/۲	۱۹		۴۱	-۲۱۵
صوبۂ متحدہ	۳۹۷	۲۴۰	۲۴ ۱/۲	۱۸		۱۵۷	-۱۴۸
پنجاب	۲۸۹	۱۷۵	۱۸	۹		۱۱۴	-۱۷۱
برما	۲۴۶	۶۴	۶ ۱/۲	۶ ۱/۲		۱۸۲	+۱۴
بہار و اڑیسہ لہ	۱۵	—	—	۱۰	—	۱۵	-۱۵
صوبۂ متوسط	۵۲	۲۲	۲	۵		۳۰	-۲۴
آسام	۴۲	۱۵	۱ ۱/۲	۲ ۱/۲	۲ ۱/۲ / ۹۰	۲۷	-۲۴
میزان	۱۸۵۰	۹۸۳	۱۰ فیصد	۱۰ فیصد	۹۰ فیصد	۸۶۷	۸۸۷

لہ ۔ یہ واضح ہے کہ بہار اور اڑیسہ صاف بچ گئے ۔

اس کے علاوہ ایسے صوبے جن کے ذمے ابتدائی امداد کی رقم ان کی مقررہ مالی امداد سے زیادہ ہو اور جس تناسب سے زیادہ ہو اس کے مطابق ایسے صوبوں کے ساتھ رعایت کی جائے۔ یہ سفارشات اصلاحات کے ان دفعات میں شریک کر دی گئی ہیں جو ۱۹۱۹ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت نافذ ہوئیں۔ مقررہ امدادی رقموں کے متعلق یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ ان کا انحصار ہر صوبے کی استطاعت پر تھا اور استطاعت کا اندازہ کرنے میں آبادی، انکم ٹکس کی آمدنی، نمک اور کپڑے کا خرچ، زراعتی اور صنعتی دولت وغیرہ کا لحاظ رکھا گیا۔

۳۴ - صوبہ واری رقمی امداد کی موقوفی۔

میسٹن کے فیصلے سے کوئی بھی خوش نہیں ہوا اور اس کی وجہ سے صوبوں میں بہت بے چینی پھیلی۔ واقعہ یہ تھا کہ بمبئی اور بنگال جیسے صنعتی صوبے انکم ٹکس کی آمدنی سے محروم ہو جانے کے لیے تیار نہ تھے۔ دوسری طرف مدراس، پنجاب اور صوبۂ متحدہ جیسے زراعتی صوبوں کا اعتراض یہ تھا کہ ابتدائی رقمی امداد جو ان کے ذمے مقرر کی گئی تھی بہت زیادہ تھی۔ یہ امدادی رقمیں صوبوں کے لیے بہت گراں ثابت ہوئیں خصوصاً جبکہ ان صوبوں کے مالیے ہیں پے در پے خسارے ہوئے اور میسٹن کمیٹی کا یہ اندازہ کہ صوبوں کو آسانی بچت ہوا کرے گی غلط ثابت ہوا۔ صوبوں کو مالگزاری جیسے جو ذرائع محاصل تفویض کیے گئے تھے۔ ان میں لچک نہ تھی اور وہ نہ صرف اتفاقی اخراجات لاحق ہو جانے کی صورت میں ناکافی ثابت ہوئے بلکہ معمولی حالات میں بھی صوبوں کی ترقی کے لیے ناکافی تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر رقمی
۱۸۵ امداد کی تنسیخ کا شدت کے ساتھ مطالبہ ہوا۔ مرکزی حکومت کی مالی حالت میں بتدریج اصلاح ہو جانے سے ۲۶-۱۹۲۵ء میں کسی حد تک زیادہ مالی مدد دینا ممکن ہوا۔ چنانچہ ۳ کروڑ ۴۲ لاکھ روپے کی مجموعی فاضل آمدنی میں سے ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے حسب ذیل صوبوں کے حصوں کی معافی کے کام میں لائے گئے:- مدراس (۱۲۶ لاکھ روپے)، صوبۂ متحدہ (۵۶ لاکھ روپے)، پنجاب (۶۱ لاکھ روپے)، اور برما (۷ لاکھ روپے)۔ اس کے بعد کے موازنے کے گوشوارے میں ۱ کروڑ ۲۵ لاکھ روپے کی مزید رقم انھی صوبوں کے حصوں کی معافی میں صرف کی گئی۔ ۲۸-۱۹۲۷ء میں ان صوبوں کے ذمے کی باقی امدادی رقم بھی تمام وکمال معاف کر دی گئی اور ۲۹-۱۹۲۸ء میں ان کو تمام حصوں کی ادائی سے بالکل

سبکدوش کر دیا گیا۔

۳۵۔ ہندوستان میں وفاقی مالیے کا مسئلہ

لیکن صوبوں کی طرف سے امدادی رقوم کی ادائی کی قطعی موقوفی سے مرکزی اور صوبہ واری حکومتوں کے درمیان محاصل کی تقسیم کی نزاع موقوف نہیں ہوئی۔ بلکہ تمام صوبوں خاصکر بمبئی اور بنگال جیسے صنعتی صوبوں کی یہ اصل شکایت بدستور باقی رہی کہ جہاں مرکزی حکومت کے مصارف جو بیشتر فوجی اخراجات اور سرکاری قرضے کے سود کی ادائی سے متعلق تھے بڑی حد تک ایک ہی حالت پر قایم تھے، وہاں مرکزی حکومت نے انکم ٹیکس اور کروڑگیری جیسے ذرایع آمدنی جو بڑھتے جارہے تھے یا جن کے آیندہ بڑھنے کی گنجایش تھی اپنے لیے مختص کر رکھے تھے اور مالگزاری اور آبکاری جیسے غیر لچکدار ذرایع آمدنی صوبوں کو تفویض کر دیے تھے حالانکہ صوبہ واری حکومتوں کی ضروریات تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ مالگزاری بعض مقامات میں پہلے ہی سے زیادہ ہے اور بہر صورت اس کا تعین طویل مدت کے لیے ہوتا ہے۔ مالگزاری میں اضافہ کرنا اس لیے بھی روز بروز مشکل ہوتا جارہا ہے کہ عاملہ پر انتظامی و آئینی بندشیں عاید کی جارہی ہیں۔ آبکاری کی آمدنی میں بھی کمی ہونا ناگزیر تھا، کیونکہ عوام کے مطالبے کے مدنظر امتناع مسکرات کی کارروائی جاری تھی[ل] درحقیقت صوبوں کو یہ شکایت تھی کہ آبکاری کی آمدنی کے گھٹنے کی رفتار ان کے حسب مرضی تیز نہیں تھی۔ وہ اس ناجائز آمدنی سے اپنے تعلق ہی کو ناپسند کرتے تھے۔ لیکن دیوالیہ ہو جانے کے خوف سے اس چیز سے چمٹے رہنے پر مجبور تھے اور ان کو اندیشہ تھا کہ کہیں یہ آمدنی ہمیشہ کے لیے ان کے گلے کا ہار نہ ہو جائے۔ جنگلات سے وافر آمدنی حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ پہلے ان میں اصل کثیر داس لی کے ساتھ لگایا جاتا۔ البتہ صرف ایک مد اسٹامپ کی ایسی تھی جس میں زیادہ آمدنی ہونے کا امکان اور امید تھی۔ صوبوں کے زیرنگرانی

ل۔ صوبوں نے اس اصول کو بطور کلیے کے عام طور پر تسلیم کر لیا تھا کہ آمدنی زیادہ سے زیادہ اور مسکرات کا استعمال کم سے کم ہو۔ لیکن اس اصول کے مطابق پوری طرح عملدرآمد ہونا ہمیشہ آسان نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ امتناع یا پروپگنڈے کی وجہ سے نہیں بلکہ چور تجارت اور بندشوں سے بچنے کی کوشش سے آبکاری کی آمدنی میں کمی ہو جائے۔ دیکھو سائمن کمیشن کی رپورٹ جلد دوم فقرہ ۲۵۵۔

تعلیمات ، طبابت ، اور زراعت وغیرہ جیسے قومی تعمیر کے محکمے کیے گئے تھے جن پر بھاری اخراجات کا ہونا لازمی تھا، قحط کے مصارف بھی صوبہ واری حکومتوں کے ذمے کر دیے گئے
۵۶۲ تھے ۔ مارچ ۱۹۲۵ء میں بمبئی کی قانون ساز کونسل نے حکومت ہند کو اپنے اس خیال سے آگاہ کیا کہ اصلاحات کے تحت صوبوں کو جو زاید محاصل دیے گئے تھے ان کی تقسیم بے قاعدہ طریق پر کی گئی تھی اور وہ نہ تو صوبوں کی ضروریات کے مطابق تھی اور نہ ان سے حاصل کیے ہوئے محصولات کے متناسب ۔ اس کے علاوہ یہ بے قاعدہ انتظام مالیے کے ان وفاقی اصولوں پر مبنی تھا جن کو دنیا کی کسی دوسری وفاقی حکومت نے اختیار نہیں کیا تھا ۔

اسی قانون ساز کونسل نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ تمام خرابیوں کی بنا یہ تھی کہ مونٹیگو چمسفورڈ رپورٹ تیار کرنے والوں نے کامل وفاقی علحدگی کے اصول پر بہت زور دیا تھا ۔ رپورٹ کے مصنفوں کو اس امر پر اصرار تھا کہ اگر حکومت خود اختیاری کو حقیقی بنانا ہے تو صوبوں کو یہ موقع ملنا چاہیے کہ اپنے ذرایع آمدنی کا قطعی طور پر تعین کر سکیں اور اپنی ادائی محصول کی قابلیت کو ترقی دینے میں ایک حد تک آزاد ہوں ۔ لیکن دوسرے ممالک کے وفاقی اور صوبہ واری مالیے کی تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ مرکزی و صوبہ واری محاصل کے درمیان کوئی واضح حد فاصل قایم کرنا ممکن نہیں ہے ۔

مختلف صوبوں کے اساسی ذرایع آمدنی میں بلحاظ اہمیت فرق ۔ حالیہ سالوں میں ان ذرایع آمدنی کا غیر مساوی اضافہ اور صوبہ واری رقمی حصوں کی ادائی کی موقوفی جس کی وجہ سے ابتدائی محاصل کی جدید تقسیم متاثر ہوئی ، ان سب چیزوں سے صوبوں کے درمیان عدم مساوات زیادہ واضح ہو گئی ۔ ۱۹۱۲ء ۔ ۱۹۱۳ء کے مقابلے میں پنجاب کے ۱۹۲۹ء ۔ ۱۹۳۰ء کے بجٹ میں ۱۱۸ فیصد ، برما کے بجٹ میں ۱۱۰ فیصد ، صوبۂ متحدہ ، بنگال اور اوڑیسہ کے بجٹ میں ۸۸ فیصد تا ۱۰۵ فیصد اضافہ ہوا ۔ آسام میں ۸۸ فیصد اور صوبۂ متوسط میں صرف ۱۰۸ فیصد بیشی ہوئی[۱] ۔

جیسا کہ سائمن کمیشن کی رپورٹ میں بتلایا گیا ہے اس طریق کی اساسی خرابی یہ تھی کہ

---

[۱] ۔ دیکھو سائمن کمیشن کی رپورٹ جلد دوم فقرہ ۲۵۹ ۔

اس دعوے کے باوجود کہ اس طریقے میں وفاقی مالیے کے نظری نصب العین کو اختیار کیا گیا تھا، عملاً صوبہ واری حکومتوں کو ناکافی ذرائع آمدنی دیے گئے تھے اور صوبہ واری حکومتوں کو بحیثیت وفاقی حکومت کے اجزا کے اس بات کا کامل اختیار حاصل نہ تھا کہ مرکزی حکومت کے اخراجات کے پیمانے اور ان کی نوعیت کا تعین کریں۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ۱۹۱۹ء کے قانون حکومت ہند نے محصول عاید کرنے کے آخری اختیارات مرکزی حکومت کو تفویض کیے تھے۔

اس طریق کے تحت جہاں صنعتی و تجارتی حیثیت سے زیادہ ترقی یافتہ صوبوں کے لیے جن سے مرکزی حکومت کو انکم ٹکس اور کروڑگیری کے تحت کثیر رقم وصول ہوتی تھی برائے نام آمدنی دی جاتی تھی وہاں زراعتی صوبوں کو جن میں مالگزاری سے کثیر آمدنی وصول ہوتی تھی۔ اپنے اخراجات سے زیادہ آمدنی ہوتی تھی۔

۵۰۳ محاصل کی جدید تقسیم سے جو بظاہر انصاف کا کوئی معیار قایم کیے بغیر عمل میں لائی گئی تھی صوبوں کو بہت ہی غیر مناسب طریقے پر فایدہ پہنچا۔ بظاہر اس قسم کے انصاف کے معیار کو اختیار کرنا دراصل مشکل تھا، کیونکہ نظم و نسق میں مساوات ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ فی کس مصارف بھی مساوی ہوں گے۔ ایک گنجان آباد صوبے کے انتظام کے مقابلے میں کسی ایسے صوبے کے انتظام میں جس کی آبادی منتشر ہو زیادہ اخراجات لاحق ہوتے ہیں۔ اسی طرح کسی ایسے صوبے کے مقابلے میں جہاں تنخواہ اور اجرت کی شرحیں کم ہوں زیادہ تنخواہ و اجرت کی شرحوں والے صوبے میں اور زیادہ تر دیہی آبادی رکھنے والے صوبے کے مقابلے میں بڑی شہری آبادی رکھنے والے صوبے میں نظم و نسق کے اخراجات زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن ان ملحوظات سے اس حقیقی فرق کی پوری تشریح نہیں ہوتی جو مختلف صوبوں میں فی کس اخراجات کے بارے میں پایا جاتا ہے، مثلاً بہار و اوڑیسہ میں ۱٫۸ روپیہ، بنگال میں ۲٫۵ روپے، بمبئی میں ۵٫۳ روپے اور برما میں ۸٫۶ روپے۔ ان اعداد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ واری حکومتیں جو خدمات انجام دیتی ہیں ان کا معیار بعض صوبوں کے مقابلے میں چند صوبوں میں ادنیٰ ہے۔ مثلاً ۲۳-۱۹۲۲ء تا ۳۰-۱۹۲۹ء میں جہاں تین زرعی صوبوں یعنی مدراس، پنجاب اور صوبہ متحدہ میں منتقلہ خدمات (قومی تعمیر کی خدمات) کے اخراجات میں علی الترتیب ۸۹ فیصد، ۸۲ فیصد اور ۳۰ فیصد کا اضافہ ظاہر ہوا وہاں اسی مدت میں بمبئی اور بنگال کے صنعتی صوبوں میں اخراجات میں علی الترتیب ۲۱ فیصد

اور ۴۱ فیصد اضافہ ہوا۔ ۲۶-۱۹۲۵ء سے اخراجات کا یہ فرق اور بھی زیادہ نمایاں ہو گیا۔

اس میں شک نہیں کہ ۱۹۲۰ء میں محاصل کی جو تقسیم عمل میں آئی اس کی وجہ سے سب صوبوں کی خرچ کرنے کی قوت میں اضافہ ہو گیا۔ لیکن اس تقسیم سے ہر صوبے کو مساوی طور پر فائدہ نہیں پہنچا اور ان کے ذمے کی رقمی امداد کے موقوف ہو جانے سے صوبہ واری محاصل کے درمیان جو فرق تھا وہ اور زیادہ ہو گیا۔ چنانچہ جب ۱۹۳۰ء میں سائمن کمیشن نے رپورٹ پیش کی تو صورت حال یہ تھی کہ تمام صوبوں کے مالی ذرائع محدود تھے اور ان کی آیندہ ضروریات ہر جگہ روز افزوں تھیں۔ اگر آیندہ دس سال میں تقریباً ۴۰ تا ۵۰ کروڑ روپیہ بھی خرچ کر دیا جاتا تو اس کو اسراف میں شمار نہیں کیا جا سکتا اور اس سے ہندوستان کو معاشی حیثیت سے بہت بڑا فائدہ پہنچتا۔ اصل سوال یہ تھا کہ ایسی کثیر رقموں کی فراہمی کا کوئی انتظام کیا جائے اور کچھ ایسا مالی بندوبست کیا جائے کہ یہ رقمیں ان سرکاری محکموں کو دستیاب ہو سکیں جن کو ان کی ضرورت تھی۔[1]

صوبوں کے لیے کافی خرچ کرنے کی قوت مہیا کرنا ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر صوبہ واری خود مختاری ایک بے معنی چیز ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کا مالی مسئلہ حقیقت میں یہ ہے کہ کس طرح صوبہ واری اور مرکزی حکومتوں کے درمیان مختلف فرائض اور ذرائع آمدنی کی باہمی تقسیم میں توازن قایم کیا جائے۔ جہاں تک مقدار آمدنی اور اس
کی تغیر پذیری کا تعلق ہے آمدنی کے وہ ذرائع جو نظم و نسق کے نقطۂ نظر سے صوبہ واری ۵۷۴
حکومتوں کے دائرے میں آتے ہیں ان حکومتوں کو تفویض کردہ فرائض کے متناسب ہونے چاہئیں۔ اس نقطۂ نظر سے وہ انتظامات جو میسٹن عطیہ کے تحت کیے گئے تھے نہایت ناقص تھے۔[2]

۳۶۔ مالی تعلقات کے مسئلے کے بارے میں حالیہ تحقیقات۔

مونٹیگو چمسفورڈ اصلاحات کے مجوزین کا یہ خیال حق بجانب تھا کہ صوبوں میں حقیقی حکومت خود اختیاری جاری کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ صحیح معنوں میں وفاقی طریق مالیہ رائج کیا جائے جس کے تحت مرکز اور صوبوں کے درمیان محاصل کی تقسیم قطعی اور معین شکل

[1] دیکھو سائمن کمیشن رپورٹ جلد دوم فقرہ ۲۶۰ – ۲۶۱ اور ۲۶۳۔

[2] دیکھو سائمن کمیشن رپورٹ جلد دوم فقرہ ۲۴۰۔

میں عمل میں لائی جائے تاکہ صوبے اپنی آمدنی کا قطعیت کے ساتھ اندازہ کرنے کے قابل ہوں اور اپنے محاصل کے تدریجی اضافے پر بھروسہ کر سکیں۔ لیکن ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے تحت فی الواقع جو تجویز اختیار کی گئی تھی وہ کس طرح اس مقصد کو پورا کرنے میں ناکام رہی۔ (۱) سر والٹر لیٹن، سائمن کمیشن کے مالی ایسسر نے کمیشن کے پاس جو رپورٹ پیش کی ہے اس میں اس مسئلے پر بہت تفصیلی طور پر بحث کی ہے۔ ان کی تجاویز اس مفروضے پر مبنی تھیں کہ ۱۰ سال کے اختتام پر مرکزی حکومت کو تقریباً $14\frac{1}{2}$ کروڑ روپیہ کی بچت حاصل ہوگی اور اس آمدنی کو دوبارہ تقسیم کرنے کا موقع ملے گا جس سے صوبے معتدبہ فائدہ اٹھانے کے قابل ہوں گے۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ شخصی آمدنی کے ٹکس سے نیز چنگی کے بعض محصولوں سے بشمول نمک کی چنگی کے (جو آبادی کے لحاظ سے تقسیم ہونی چاہئے) جو رقم وصول ہو اس کا نصف حصہ ایک معین نظام العمل کے مطابق صوبوں کو منتقل کر دینا چاہئے اور یہ منتقلی دس سال کی مدت میں مکمل ہو جانی چاہئے۔

یہ طے پایا کہ صوبوں کو آمدنی میں اضافہ کرنے کے لیے نئے ٹکس مثلاً زرعی آمدنیوں پر انکم ٹکس، انکم ٹکس پر صوبہ واری زائد محصول اور مینفاتی محصول عاید کرنے کا اختیار دیا جائے۔

یکسانیت کی خاطر صوبوں کے وزرائے مالیہ پر مشتمل ایک بین صوبہ جاتی کونسل کے مشورے کے مطابق مرکزی مجلس قانون ساز چنگی کے محصول عائد کرے یا ان میں کمی بیشی کرے۔ ان محصولوں کی آمدنی سے ایک صوبہ واری فنڈ قایم کیا جائے۔

جیسا کہ حکومت ہند نے سائمن کمیشن سے متعلق اپنے ۱۹۳۰ء کے مراسلے میں بتلایا، لیٹن اسکیم مرتب کرنے میں انتہائی رجائیت سے کام لیا گیا تھا اور اس میں آمدنی کے متعلق جو اندازہ قایم کیا گیا تھا اس کو آنے والی کساد بازاری نے بالکل غلط ثابت کر دکھایا۔

۵۷۵ (۲) پیل ذیلی کمیٹی (۱۹۳۱ء کی دوسری گول میز کانفرنس کی وفاقی مالیہ کی ذیلی کمیٹی) کا کام محض یہ تھا کہ جدید دستور کے تحت مالی انتظامات کے عام اصول متعین کرے۔

(۳) پرسی کمیٹی (وفاقی مالیے کی کمیٹی) نے ۱۹۳۲ء میں کسی قدر کم رجائیت کے ساتھ اپنی رپورٹ مرتب کی اور انکم ٹکس کی آمدنی کی خاصی مقدار صوبوں کو تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی۔ لیکن ساتھ ہی اس نے مرکزی حکومت کی امداد کے لیے صوبہ واری حصوں کی ادائی کے

قدیم طریق کو کچھ رد و بدل کے بعد دوبارہ جاری کرنے کی سفارش کی۔

(۴) مشترک منتخب کمیٹی (۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۴ء) نے اس خیال کو مسترد کر دیا کہ صوبہ واری ادائیوں کے غیر مقبول طریق کو دوبارہ اختیار کیا جائے۔ یہ کمیٹی سندھ اور اڑیسہ جیسے قاصر موازنے کے دو صوبوں کی صورت حال پر غور کرنے کے لیے قایم کی گئی تھی۔ ایک اور مشکل مسئلہ جس سے کمیٹی کو سابقہ پڑا یہ تھا کہ ریاستیں اپنی حدود میں کسی وفاقی محصول کو عاید کرانے کے لیے راضی نہ تھیں۔ اس طرح انکم ٹکس سے ریاستوں کو وفاق کے رکن کی حیثیت سے فائدہ پہنچتا حالانکہ یہ ٹکس محض برطانوی ہند کے صوبوں کی رعایا ادا کرتی۔ اگر کسی دوسرے سبب سے نہیں تو محض اس بے ضابطگی کو دور کرنے کے لیے مشترک منتخب کمیٹی اس مشورے کی تائید کی طرف مائل ہوئی کہ انکم ٹکس کی کل آمدنی صوبوں کے تفویض کر دی جائے۔ لیکن اس صورت میں یہ مشکل درپیش تھی کہ مرکزی حکومت یہ ایثار کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔

(۵) وھائٹ پیپر میں یہ تجویز کی گئی کہ وفاقی ذرایع پر جو انکم ٹکس عائد کیا جائے اس کی آمدنی مستقل طور پر مرکزی حکومت کو دے دی جائے، اور (بجز کارپوریشن ٹکس کے) آمدنی پر معمولی محصولات کا ایک معین حصہ جو ۵۰ فیصد سے کم اور ۷۵ فیصد سے زیادہ نہ ہو صوبوں کو دیا جائے۔ لیکن وفاقی حکومت کو یہ حق دیا گیا کہ وہ اپنے لیے تین سال تک ایک رقم مقرر کر سے جس کے بعد اس کو بتدریج گھٹا کر سات سال کے عرصے میں صفر تک لے آئے۔ نیز حکومت کو یہ بھی اختیار دیا گیا کہ (شدید ضرورت کے موقع پر) آمدنی کے محصولوں پر زائد ٹکس عاید کرے اور اس کے مقابل دیسی ریاستوں سے بھی مساوی مقدار وصول کرے۔ منتخب مشترک کمیٹی نے انکم ٹکس کے علاوہ زائد ٹکس وصول کرنے کے اصول کو غیر مستحسن خیال کیا، لیکن وھائٹ پیپر (۱۹۳۳ء) کی اکثر تجاویز کی تائید کی، مثلاً یہ کہ زرعی آمدنیوں پر ٹکس عاید کرنے کا اختیار محض صوبوں کو حاصل ہونا چاہیئے اور وفاقی حکومت کو یہ اختیار ہونا چاہیئے کہ نمک اور آبکاری کے محصولوں اور برآمدی محصولوں وغیرہ کی آمدنی کا ایک حصہ صوبوں میں تقسیم کر سکے۔ تاہم مشترک کمیٹی نے اس بات کو ترجیح دی کہ مرکز سے صوبوں کو محاصل اور انکم ٹکس کی کسی معین مقدار کی منتقلی کی اسکیم کو حتی الامکان تاخیر سے نافذ کیا جائے۔

ان سب سابقہ تحقیقاتوں اور خاص کر مشترک منتخب کمیٹی کی سفارشوں کا اثر ۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند کی مالی دفعات میں صاف طور پر نمایاں ہے۔

۳۷۔ جدید دستور کی مالی دفعات

۷۶ھ سنہ ۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند میں جدید دستور کے تحت وفاقی مالیے کے موضوع پر حسب ذیل دفعات شامل ہیں:۔

دفعہ ۱۳۷۔ زرعی اراضی کے علاوہ دوسری جائداد کی وراثت کا محصول، وفاقی قانونی فہرست میں مندرجہ اسٹامپ کے محصول، ریلوے یا ہوائی جہاز سے جانے والے مسافروں یا مال پر میقاتی محصول اور ریلوے کے کرایوں اور محصولوں کے ٹیکس وفاقی حکومت عاید اور وصول کرے گی۔ لیکن کسی مالی سال میں اس قسم کے کسی محصول یا ٹیکس کی خالص آمدنی وفاقی حکومت کے محاصل میں شامل کی جائے گی (بجز اس کے کہ یہ آمدنی اس آمدنی کی نمایندگی کرتی ہو جو چیف کمشنروں کے صوبوں سے منسوب کی جاسکتی ہے) بلکہ ان صوبوں اور وفاقی ریاستوں کے تفویض کی جائے گی جن کے حدود میں یہ محصول یا ٹیکس اس سال عاید کیا گیا ہو اور صوبوں اور ریاستوں میں ان اصول تقسیم کے مطابق تقسیم کی جائے گی جو وفاقی مجلس قانون ساز کے منظورہ قانون میں مرتب کیے جائیں۔

لیکن وفاقی مجلس قانون ساز وفاقی اغراض کے لیے زاید محصول عاید کرکے مذکورہ محصولوں یا ٹیکس میں کسی وقت بھی اضافہ کرسکتی ہے اور اس قسم کے زاید محصولوں کی کل آمدنی وفاقی حکومت کے محاصل میں شامل کی جاسکے گی۔

دفعہ ۱۳۸۔ (۱) زرعی آمدنیوں کے علاوہ دوسری آمدنیوں پر ٹیکس وفاقی حکومت عاید اور وصول کرے گی۔ لیکن کسی مالی سال میں اس قسم کے محصول کی خالص آمدنی کی کوئی معین مقدار (بجز اس صورت کے جب کہ یہ آمدنی اس آمدنی کی نمایندگی کرتی ہو جو چیف کمشنروں کے صوبوں سے منسوب کی جاسکتی ہو یا ایسے ٹیکسوں سے منسوب کی جاسکتی ہو جو وفاقی حکومت کے محنتانے کے سلسلے میں قابل ادائی ہو) وفاقی حکومت کے محاصل میں شامل نہیں کی جائے گی بلکہ ان صوبوں اور وفاقی ریاستوں کو تفویض کی جائے گی جن کے حدود کے اندر اس سال یہ محصول عاید کیا گیا ہو اور صوبوں اور وفاقی ریاستوں میں حسب شرایط مقررہ تقسیم کی جائے گی۔

بہ شرطیکہ:۔

(الف) اس ذیلی دفعہ کے تحت ابتداءً جو فیصد تناسب مقرر کیا گیا ہو اس میں کسی متعاقب

احکام کونسل کے ذریعے اضافہ نہ کیا جائے۔

(ب) وفاقی مجلس قانون ساز وفاقی اغراض کے لیے زاید ٹکس عاید کر کے کسی وقت بھی مذکورہ محصولات میں اضافہ کر سکے گی اور اس قسم کے زاید ٹکس کی کل آمدنی وفاقی حکومت کے محاصل میں شامل نہ کی جائے گی۔

دفعہ ۱۳۸ - (۲) مذکورۂ بالا ذیلی دفعہ کے باوجود وفاقی حکومت اس ذیلی دفعہ کے بموجب صوبوں اور ریاستوں کو دی جانے والی رقوم میں سے :-

(ا) ایک مقررہ مدت کے لیے سال بہ سال ایک مقررہ رقم اپنے لیے رکھ سکتی ہے؛ اور (ب) ایک مزید مقررہ مدت کے لیے ہر سال اتنی رقم اپنے لیے رکھ سکتی ہے کہ ماسبق سال کے مقابلے میں مابعد سال کی رقم ایک معینہ مقدار میں اس طرح کم ہوتی جائے کہ اس مدت کے آخری سال جو رقم رکھی جائے وہ اس قسم کی ہر سالانہ تخفیف کے مساوی ہو؛ بہ شرطیکہ :-

(i) ابتداءً مقرر کی ہوئی مدتوں میں سے کسی میں بھی متعاقب احکام کونسل کی بنا پر کمی نہ ہو؛

(ii) گورنر جنرل اپنی صوابدید پر دوسری مقررہ مدت کے کسی سال یہ حکم دے سکتا ہے کہ اس سال وفاقی حکومت جو رقم اپنے لیے رکھے وہ اتنی ہی ہو جتنی کہ سابقہ سال میں تھی۔ اور اس لحاظ سے دوسری مقررہ مدت میں توسیع کی جائے گی۔ لیکن گورنر جنرل ایسا حکم اس وقت تک نہ دے گا جب تک کہ وہ وفاقی صوبہ واری اور ریاستی نمایندوں سے جن کو وہ مناسب خیال کرے مشورہ نہ کر لے اور اس کو اس بات کا اطمینان نہ ہو جائے کہ وفاقی حکومت کے مالی استحکام کے لیے اس کو ایسا کرنا ضروری ہے۔

دفعہ ۱۳۸ - (۳) جب وفاقی مجلس قانون ساز کا کوئی قانون اس دفعہ کے تحت وفاقی اغراض کے لیے زائد ٹکس عاید کرے تو اس قانون میں یہ بھی دفعہ ہوگی کہ ہر وفاقی ریاست جس میں آمدنی کے ٹکس وفاقی حکومت کی طرف سے عاید نہ کیے جا سکتے ہوں اتنی رقم وفاقی حکومت کے محاصل میں ادا کرے جتنی کہ ریاست کے ذمے واجب الادا ہوتی اگر زاید محصول اس ریاست میں عاید کیا جاتا۔

اس دفعہ میں "آمدنی کے ٹکس" کی تعریف میں کارپوریشن ٹکس داخل نہیں ہے۔

اور مقررہ ٹکس کا مفہوم یہ ہے کہ ٹکس ملک معظم بہ اجلاس کونسل کے حکم سے مقرر کیا گیا ہے ۔
"وفاقی مشاہرہ" کی تعریف میں وہ سب مشاہرے اور وظائف داخل ہیں جو وفاقی حکومت کی آمدنی یا وفاقی ریلوں کی آمدنی سے قابل ادائی ہوں جس پر انکم ٹکس عاید ہو سکتا ہو ۔

دفعہ ۱۳۹ ۔ (۱) وفاقی حکومت کسی وفاقی ریاست میں کارپوریشن ٹکس اس وقت تک عاید نہ کرے گی جب تک کہ وفاقی حکومت کو قایم ہوئے دس سال نہ گزر جائیں ۔

دفعہ ۱۳۹ ۔ (۲) کسی وفاقی قانون میں جس کی رو سے کارپوریشن ٹکس عاید کیا
جائے ایسی دفعات بھی ہوں گی جن کی بموجب کسی ایسی وفاقی ریاست کے والی کو جس پر کہ ۵۶۸
ٹکس بصورت دیگر عائد کیا جاتا یہ اختیار ہوگا کہ ریاست میں ٹکس نہ لگائے بلکہ اس کی بجائے ریاست کی طرف سے وفاقی حکومت کے محاصل میں اتنا حصہ ادا کرے جو اس خالص آمدنی کے مساوی ہو جو ریاست میں ٹکس عاید کرنے کی صورت میں حاصل ہوتی ۔

دفعہ ۱۳۹ ۔ (۳) جہاں والی ریاست مذکورۂ بالا طریقے پر اپنے اختیار سے کام لے وہاں وفاقی حکومت کے عہدہ دار ریاست کے کسی شخص سے کوئی معلومات یا اعداد طلب نہیں کریں گے بلکہ والی کا فرض ہوگا کہ صدر تنقیح ساز ہند کو ایسی معلومات فراہم کرنے کا انتظام کر دے جو صدر تنقیح ساز کو اس قسم کے حصے کی مقدار کا اندازہ کرنے کے لیے بجا طور پر مطلوب ہو ۔

اگر ریاست کے فرمانروا کو کسی مالی سال میں ریاست کی طرف سے ادا کیے جانے والے حصے کی مقدار کے تعین کے بارے میں بے اطمینانی ہو تو وہ وفاقی عدالت میں مرافعہ کر سکتا ہے اور اگر وہ عدالت میں یہ ثابت کر دے کہ معینہ رقم زیادہ ہے تو عدالت اس میں واجبی تخفیف کر دے گی اور عدالت کے اس فیصلے کے خلاف کوئی اپیل دائر نہ ہو سکے گی ۔

دفعہ ۱۴۰ ۔ (۱) وفاقی حکومت نمک کے محصول، آبکاری کے وفاقی محصول اور برآمدی محصول عاید اور وصول کرے گی ۔ لیکن اگر وفاقی مجلس قانون ساز کا قانون لازم قرار دے تو وفاقی حکومت کے محاصل میں سے ان صوبوں اور وفاقی ریاستوں کو جن پر محصول کے قانون کا اطلاق ہوتا ہے ایسی رقوم ادا کی جائیں گی جو اس محصول کی کل خالص آمدنی یا اس کے جز کے مساوی ہوں گی اور یہ رقوم صوبوں اور وفاقی ریاستوں میں ان اصول تقسیم کے مطابق تقسیم کی جائیں گی جو قانون نے مقرر کیے ہوں ۔

دفعہ ۱۴۰۔ مذکورہ بالا ذیلی دفعہ کے باوجود جوٹ یا جوٹ کی پیداوار کے برآمدی محصول کی سالانہ خالص آمدنی کا نصف یا بڑا حصہ جس کا تعین ملک معظم کی حکومت کرے وفاقی حکومت کے محاصل میں شامل نہیں کیا جائے گا بلکہ جوٹ کی کاشت کرنے والے صوبوں یا وفاقی ریاستوں میں جوٹ کی مقدار پیداوار کے تناسب سے تقسیم کیا جائے گا۔

دفعہ ۱۴۱۔ (۱) گورنر جنرل کی اجازت لیے بغیر وفاقی مجلس قانون ساز کے کسی ایوان میں کوئی ایسا مسودۂ قانون یا ترمیمۂ قانون پیش نہیں کیا جائے گا۔ جو کوئی ایسا ٹکس یا محصول عاید کرے یا کسی ایسے محصول یا ٹکس ترمیم کرے جس میں صوبے دلچسپی رکھتے ہوں یا جو "زرعی آمدنی" کے اس مفہوم میں جو ہندوستانی انکم ٹکس سے متعلق قانون نافذ کرنے کے اغراض کے لیے معین کیا گیا ہو تبدیلی کرے یا جو ان اصول کو متاثر کرے جن پر مذکورہ بالا دفعات میں سے کسی کے تحت رقوم صوبوں یا ریاستوں کو قابل ادائی ہوں یا ہو سکتی ہوں یا جو ایسا کوئی وفاقی زاید محصول عاید کرے جس کا ذکر مذکورہ دفعات میں کیا گیا ہو۔ ۵۷۹

دفعہ ۱۴۱۔ (۲) گورنر جنرل مذکورۂ بالا کسی وفاقی زاید محصول کو کسی سال عاید کرنے کے لیے کسی مسودۂ قانون کے نفاذ یا کسی ترمیم کی تحریک کی منظوری اس وقت تک نہ دے گا جب تک کہ اس کو یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ اس سال کی آمدنی کی مد سے وفاقی محاصل و اخراجات کو متوازن کرنے کے لیے وہ تمام کفایات اور تدابیر جو وفاقی حکومت کے لیے وفاقی محصول کی آمدنی میں کلاً یا جزءً اضافہ کا باعث ہو سکتی ہیں اختیار کی گئی ہیں۔

اس دفعہ میں "ٹکس یا محصول جس میں صوبے دلچسپی رکھتے ہوں" کا جو فقرہ استعمال کیا گیا ہے اس کا مفہوم حسب ذیل ہے:۔

(ا) ایسا ٹکس یا محصول جس کی خالص آمدنی کا کل یا جز کسی صوبے کے تفویض کیا جائے؛ یا

(ب) ایسا ٹکس یا محصول جس کی خالص آمدنی کی مد میں رقوم سپردست وفاقی حکومت کے محاصل میں سے صوبوں کو قابل تفویض ہوں۔

دفعہ ۱۴۲۔ ہز مجسٹی بہ اجلاس کونسل جن صوبوں کے متعلق یہ تصفیہ فرمائیں کہ وہ امداد کی مستحق ہیں ان کو ہز مجسٹی بہ اجلاس کونسل کی معین کردہ رقوم ہر سال وفاقی حکومت کے محاصل میں سے بطور امداد دی جائیں گی اور مختلف صوبوں کو مختلف رقوم دی جا سکتی ہیں۔

بہ استثنائے شمال مغربی سرحدی صوبے کے کسی صوبے کے لیے اس دفعہ کے تحت مقرر کی ہوئی امدادی رقم میں اس وقت تک کوئی اضافہ نہ کیا جائے جب تک کہ وفاقی مجلس قانون ساز کے دونوں ایوان گورنر جنرل کے توسط سے ہز مجسٹی کے پاس اضافے کی درخواست پیش کریں۔

دفعہ ۱۴۳ (۱) اس باب کی مذکورہ دفعات میں سے کوئی دفعہ بھی کسی وفاقی ریاست میں عائد کیے جانے والے محصولات یا ٹکس پر اثر انداز نہیں ہوتی بجز اس صورت کے جب کہ وفاقی مجلس قانون ساز کے کسی قانون کا اطلاق ریاست پر ہوتا ہو۔

دفعہ ۱۴۳۔ (۲) اگر اس قانون کے نفاذ سے قبل کوئی ٹکس، محصول، ابواب یا فیس کسی صوبہ واری حکومت، بلدیہ یا مقامی حکومت کی طرف سے صوبہ واری حکومت، بلدیہ یا مقامی حکومت کے اغراض کے لیے ایسے قانون کے تحت جو یکم جنوری ۱۹۳۵ء تک علی حالہ نافذ ہو قانونی طور پر عاید کیے جا رہے ہوں تو یہ سب محصولات باوجود اس کے یہ ٹکس، محصول، ابواب یا فیس وفاقی مجلس قانون ساز کی فہرست میں درج ہو، سابقہ اغراض کے لیے اس وقت تک بدستور عاید اور استعمال کیے جا سکتے ہیں جب تک کہ وفاقی مجلس قانون ساز اس کو منسوخ کر کے کوئی دوسرا انتظام نہ کرے۔

دفعہ ۱۴۴۔ (۱) اس باب کی مذکورۂ بالا دفعات میں ٹکس یا محصول کی "خالص
۵۸۰ آمدنی" سے مراد وہ آمدنی ہے جو ٹکس یا محصول کی وصول یابی کے مصارف کو منہا کرنے کے بعد
باقی بچے اور ان دفعات کے اغراض کے لیے ہندوستان کا صدر تنقیح ساز اس کل ٹکس یا محصول یا اس کے ایک جزو کی جو کسی علاقے میں وصول یا کسی علاقے کو واجب الادا ہو جانچ پڑتال کرے گا اور اس کی تنقیح و تصدیق آخری اور قطعی ہوگی۔

دفعہ ۱۴۴۔ (۲) مذکورۂ بالا شرایط اور اس سلسلے کی دوسری واضح شرائط کے تابع کسی ایسی صورت میں جب کہ وفاقی مجلس قانون ساز کے قانون کے تحت کسی محصول یا ٹکس کی آمدنی کسی صوبے یا ریاست کو تفویض کی جا سکتی ہو یا کسی ریاست کی طرف سے وفاقی حکومت کے محاصل میں حصہ ادا کیا جاتا یا کیا جا سکتا ہو وفاقی مجلس قانون ساز کا قانون یہ تعین کر سکتا ہے کہ کسی محصول یا ٹکس یا حصے کی مقدار کا اندازہ کس طرح کیا جائے، سال میں کتنی مرتبہ اور کس طریقے سے ادائی کی جائے، ایک مالی سال سے دوسرے کو کس طرح مطابق

بنایا جائے اور دوسرے اتفاقی و ذیلی معاملات کا تصفیہ کس طرح کیا جائے ۔

اس سے ظاہر ہوگا کہ جہاں ایک حکومت محصولات اور ٹکس عاید اور جمع کرسکتی ہے وہاں آمدنی دوسری حکومتوں کو کلاً یا جزءً تقسیم کی جاسکتی ہے ۔ اس لیے مالی مدات کو اس لحاظ سے ترتیب دینا مفید ہوسکتا ہے کہ آیا وہ وفاقی حکومت کے تحت ہیں یا صوبہ واری حکومت کی نگرانی میں ہیں[1]۔

وفاقی مجلس قانون ساز کی فہرست میں حسب ذیل مدات شامل ہیں :۔ کروڑگیری کے محصول بہ شمول برآمدی محصول؛ اور تمباکو اور دیگر ہندوستانی مصنوعات کے محصول حسب ذیل اشیا شریک نہیں ہیں :۔ (۱) الکحل شراب جو پینے کے لیے استعمال کی جائے ۔ (۲) افیون ہندوستانی بھنگ اور دوسری مسکر ادویہ اور مسکرات ؛ غیر مسکر ادویہ ؛ (۳) طبی سامان اور سنگار کی چیزیں جن میں الکحل یا نمبر (۲) والی کوئی شے شریک ہو ؛ تشخیصیے کا محصول ؛ نمک ؛ زرعی آمدنی کے سوا دوسری آمدنیوں کے محاصل ؛ بہ استثنائے زرعی زمین افراد اور کمپنیوں کے اثاثے کی سربستہ مالیت ؛ کمپنیوں کے سرمایہ کے محصول ؛ زرعی زمین کے سوا دوسری جائداد کی وراثت پر محصول ؛ ہنڈی، چک، پرامیسری نوٹ، لدائی پرچوں، اعتباری، رقعوں، بیمے کی پالسیوں، مختار ناموں اور رسائد پر اسٹامپ کے محصول ؛ ریلوں یا ہوائی راستوں کے ذریعے جانے والے مال اور مسافروں کے میقاتی محصول ؛ ریلوے کے ذریعے جانے والے سامان کے کرایے اور مسافروں کے کرایے پر محصول ۔

صوبہ واری مجلس قانون ساز کی فہرست میں حسب ذیل مدات شامل ہیں ——
مالگزاری بہ شمول تشخیص و وصولی مالگزاری ؛ صوبوں میں تیار شدہ مندرجۂ ذیل اشیا یا مصنوعات پر چنگی کا محصول اور ہندوستان میں دوسرے مقامات میں تیار شدہ اسی قسم کی اشیا یا مصنوعات پر اسی یا اس سے کم شرح پر جوابی محصول :۔ (۱) الکحل شراب، (۲) افیون، ہندوستانی بھنگ اور دوسری مسکر ادویہ، مسکرات اور غیر مسکر ادویہ، (۳) طبی سامان اور سنگار کی چیزیں جن میں الکحل یا کوئی ایسی شے شریک ہو جو مد (۲) میں بتائی گئی ہیں ؛ زرعی آمدنی ۵۸۱

[1] ۔ دیکھو جے، پی، اڈی اور اف، ایچ، لائن کی کتاب موسوم بہ Indias New Constitution صفحہ ۱۳۳ - ۱۳۵

کے محصولات ؛ اراضی، مکانات، چولھوں اور کھڑکیوں کے محصولات، زرعی اراضی کی وراثت کے متعلق محصولات ؛ معدنی ترقی کے متعلق وفاقی مجلس قانون ساز کے کسی ایکٹ کی عاید کردہ تحدیدات کے تابع معدنی حقوق پر محصولات ؛ نفری محصولات ؛ پیشوں، دھندوں اور کاروباری مشغلوں پر محصولات ؛ حیوانات اور کشتیوں پر محصولات ؛ اشیا کی فروخت اور اشتہارات پر محصولات ؛ کسی خاص علاقے میں اشیا کی درآمد پر ابواب ؛ تفریحات، تماشوں، جوے اور بازی لگانے اور تعیشات پر محصولات ؛ وفاقی مجلس قانون ساز کی دفعات میں محصول اسٹامپ کے سلسلے میں جن دستاویزات کی صراحت کی گئی ہے ان کے علاوہ دستاویزات کے محصول اسٹامپ ؛ اندرونِ ملک کے آبی راستوں پر مسافروں اور مال کی نقل و حمل کے محصولات ؛ نہ بازاری (Toll) اس فہرست میں سے کسی معاملے کے متعلق فیس، لیکن اس فیس میں رسوم عدالت داخل نہیں ہیں۔[1]

۳۸۔ سر آٹو نیمیر کی مالی تحقیقات۔

قانون حکومت ہند کی دفعات ۱۳۸، ۱۴۰ اور ۱۴۲ کے مطابق وزیر ہند نے مالی تحقیق کی غرض سے سر آٹو نیمیر کو مقرر کیا۔ (دیکھو فصل ۳۷)۔ سر آٹو وسط جنوری ۱۹۳۶ء میں ہندوستان آئے اور جو مواد تنقیح کے لیے پیش کیا گیا اس کا مطالعہ تین مہینے میں ختم کر کے ایک رپورٹ مرتب کی جو ۳۰ اپریل ۱۹۳۶ء کو شایع ہوئی۔ رپورٹ میں بتلایا گیا ہے

[1] وزرائے مالیہ کی کانفرنس نے جو جنوری ۱۹۳۵ء میں بمقام دہلی منعقد ہوئی اپنا زیادہ وقت مرکزی وصوبہ واری محصولات کے دائروں کی بحث کے لیے وقف کر دیا۔ سب کی متفقہ رائے تھی کہ یہ دائرے ایک دوسرے سے متصادم ہوتے تھے اور اس بارے میں قانون حکومت ہند کی دفعات غیر واضح تھیں اور یہ اندیشہ تھا کہ اس سلسلے میں وفاقی عدالت میں مقدمات دائر ہوں۔

کہ اپریل ۱۹۳۷ء تک صوبہ واری خود مختاری اور اس کے تقریباً ایک سال بعد وفاق کا نفاذ ممکن ہوگا۔ سرآٹو نیمیر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر ہندوستانی مالیات کا انتظام دانشمندی کے ساتھ کیا جائے تو ہندوستان کے بجٹ کا مستقبل اس توقع کو حق بجانب قرار دیتا ہے کہ نئے دستور کی مالی ضروریات کو بتدریج مناسب طور سے پورا کیا جا سکتا ہے"۔ (دیکھو فصل ۱۴۔)

۳۹۔ نیمیر رپورٹ کی اہم سفارشیں

سرآٹو نیمیر کی اصل سفارش انکم ٹکس کی آمدنی کا ۵۰ فیصد حصہ مرکزی حکومت کی طرف سے صوبوں میں تقسیم کرنے سے متعلق ہے۔ سرآٹو نے اندازہ لگایا کہ برما کو جو نئے دستور کے تحت الگ کر دیا گیا ہے خارج کر کے صرف ہندوستان کو انکم ٹکس سے ۱۲ کروڑ روپے سالانہ آمدنی ہوگی۔ اس کا نصف حصہ یعنی ۶ کروڑ روپیہ صوبوں کو دیا جا سکتا ہے لیکن ابتدائی پانچ سال تک مرکزی حکومت اس حصے سے خود ہی مستفید ہوگی اور اس اثنا میں اپنی مالی حالت کو مستحکم کرلے گی۔ اس کے بعد کے پانچ سالوں میں صوبہ واری خود مختاری کے نفاذ کے چھٹے سال سے لیکن ۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند دفعہ ۱۳۸ (۲) کے تابع یہ حصہ چھ مساوی اقساط میں صوبوں کو بتدریج دیا جائے گا۔ اس طرح دس سال کے بعد انکم ٹکس کی آمدنی سے صوبے اپنا پورا حصہ پانے لگیں گے۔ گویا انکم ٹکس سے اس وقت تک دست بردار نہ ہونا چاہئے جب تک کہ قابل تقسیم رقم کا وہ جز جو مرکزی حکومت کے پاس باقی بچے ریلوں کی آمدنی کو ملا کر کم از کم ۱۳ کروڑ روپے نہ ہو جائے۔ ۵۸۲

۴۰۔ صوبوں کو امداد

سرآٹو نیمیر نے یہ تجویز کی کہ صوبہ واری خود مختاری کا نفاذ شروع ہوتے ہی بعض صوبوں کو فوراً امداد دی جائے جس کا کچھ حصہ نقد رقم کی شکل میں ہو، کچھ حصہ اس خاص قرضے کی تنسیخ یا معافی کی شکل میں ہو جو یکم اپریل ۱۹۳۶ء سے پہلے حاصل کیا گیا ہو اور کچھ حصہ جوٹ ٹکس کی آمدنی سے مزید ½ ۱۲ فیصد کی منتقلی کی شکل میں ہو۔ بنگال، بہار، آسام، شمال مغربی سرحدی صوبے اور اڑیسہ کی حد تک کل خاص قرضہ معاف کر دیا گیا ہے اور صوبہ متوسط کی حد تک وہ سب قرضہ معاف کر دیا گیا جو ۱۹۳۶ء سے پہلے خسارہ ہونے کی وجہ سے لینا پڑا، اس کے علاوہ ۱۹۲۱ء سے پہلے لیے ہوئے قرضے میں سے تقریباً دو کروڑ روپے بھی معاف کر دیے گئے۔

سالانہ نقد امداد حسب ذیل ہے:۔ صوبۂ متحدہ کو ۲۵ لاکھ روپے صرف ۵ سال کے لیے؛ آسام کو ۳۰ لاکھ روپے؛ اوڑیسہ کو ۴۰ لاکھ روپے؛ شمال مغربی سرحدی صوبہ کو ایک کروڑ روپے مگر اس شرط کے ساتھ کہ ۵ سال کے بعد مکرر غور کیا جائے؛ سندھ کو ۱ کروڑ ۵ لاکھ روپے کی رقم جو دس سال کے بعد بتدریج گھٹائی جائے گی۔

مجموعی سالانہ امداد جو سر آٹو نیمیر کے پیش نظر تھی حسب ذیل ہے:۔ بنگال ۷۵ لاکھ روپے؛ بہار ۲۵ لاکھ روپے؛ صوبۂ متوسط ۱۵ لاکھ روپے؛ آسام ۴۵ لاکھ روپے؛ شمال مغربی سرحدی صوبہ ۱ کروڑ ۱۰ لاکھ روپے؛ اوڑیسہ ۵۰ لاکھ روپے؛ سندھ ۱ کروڑ ۵ لاکھ روپے؛ صوبۂ متحدہ ۲۵ لاکھ روپے۔ اس طرح مرکزی حکومت پر ایک کروڑ ۹۲ لاکھ روپے کے زاید متوالی مصارف عاید ہوتے ہیں۔

یہ بھی تجویز کی گئی کہ اوڑیسہ اور سندھ کو علی الترتیب ۱۹ لاکھ اور ۵ لاکھ روپے کی مزید غیر متوالی امداد دی جائے۔

انکم ٹیکس میں صوبوں کا حصہ۔

انکم ٹیکس کی آمدنی کا جو جزو صوبوں میں قابل تقسیم تھا ہر صوبے کے لیے اس کا حصہ بحساب فیصد حسب ذیل ہے:۔

مدراس ۱۵ فیصد؛ بمبئی ۲۰ فیصد؛ بنگال ۲۰ فیصد؛ صوبۂ متحدہ ۱۵ فیصد؛ پنجاب ۸ فیصد؛ بہار ۱۰ فیصد؛ صوبۂ متوسط ۵ فیصد؛ آسام ۲ فیصد؛ شمال مغربی سرحدی صوبہ ۱ فیصد؛ اوڑیسہ ۲ فیصد اور سندھ ۲ فیصد۔

سر آٹو نیمیر کا یہ خیال تھا کہ محصول آمدنی کی تقسیم میں سکونت اور تعداد آبادی دونوں کو ملحوظ رکھنا مبنی بر انصاف ہوگا۔ لیکن ان میں سے کسی ایک عامل پر ضرورت سے زیادہ زور دینا اس لیے مناسب نہیں ہو سکتا کہ ان امور کے متعلق اعداد و شمار زیادہ قابل اعتماد نہیں ہیں۔

۴۱۔ تقسیم کے اصول

رپورٹ کے اہم اقتباسات کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

"قانون حکومت ہند کے نفاذ تک جو مباحث ہوئے ان میں یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ صوبہ واری خود مختاری کے آغاز پر ہر صوبے کی آمدنی اتنی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے مالی توازن کو برقرار رکھنے کی توقع کر سکے؛ خاص کر گھاٹے کی دیرینہ شکایت جس میں بعض صوبے مبتلا تھے ختم کر دینی چاہیے۔ اس ۵۸۳

کے مطابق میرا پہلا مقصد یہ رہا کہ صوبوں کی موجودہ اور آیندہ مالی حالت کی جانچ کر کے اس بات کا تعین کیا جائے کہ مذکورۂ بالا مقصد کو پورا کرنے کے لیے کتنی زاید امداد درکار ہوگی۔ اس کے بعد یہ غور کرنا ضروری ہے کہ مرکزی حکومت اپنے مالی استحکام کو خطرے میں ڈالے بغیر کس حد تک ایسی امداد دے سکے گی۔ آخر میں مجھے مستقبل پر ایک اور گہری نظر ڈالنی تھی اور یہ مشورہ دینا تھا کہ مرکزی حکومت انکم ٹیکس کی آمدنی میں سے صوبوں کو زاید امداد کس حد تک اور کب دے سکے گی۔

"صوبوں کے نقطۂ نظر سے اس آخری مقصد کے حاصل کرنے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور واحد سوال جو اگرچہ بجائے خود ایک پیچیدہ سوال ہے اس بات کا تعین کرنا ہے کہ تقسیم کا کون سا اصول مبنی بر انصاف ہوگا۔ دوسری طرف مرکزی حکومت کے نقطۂ نظر سے ہندوستان کے مالی استحکام اور اعتبار کو بحیثیت مجموعی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ یہ چیز مرکزی حکومت کے لیے جس قدر ضروری ہے اسی قدر صوبوں کے لیے اور صوبہ واری خودمختاری کی کامیابی کے لیے بھی ضروری ہے۔ میں نے اپنی سفارشات کے دوران میں مرکزی حکومت کے مالیات کے استحکام کو مسلسل پیش نظر رکھا ہے۔ مرکزی حکومت کے اخراجات میں اس سے زیادہ کمی کرنا جتنے کہ وہ اب گھٹا کر رکھے گئے ہیں مناسب نہیں خیال کیا جا سکتا۔ ممکن ہے کہ آیندہ قرضوں کی تبدیلی کی صورت میں کچھ بچت ہو۔ لیکن جب تک ان کا تعلق عام موازنے سے رہے گا اس وقت تک ان سے اس سے زیادہ مدد نہیں مل سکتی کہ قرضے کی ادائی کے لیے موجودہ گھٹی ہوئی قسط یعنی ۳ کروڑ روپے میں کچھ اضافہ کیا جائے۔ مجموعی مصارف میں کسی بڑے اضافے کی توقع کرنا کم از کم غیر ضروری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ریلوے کے موازنے میں توقع کے مطابق ترقی نہ ہو۔"

"صوبوں کے اخراجات کی اکثر مدات میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ اضافہ موقع اور محل کے لحاظ سے ہونا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ صوبہ واری ذرایع آمدنی کی موجودہ حالت میں بھی اخراجات میں ایک حد تک اضافہ کیا گیا۔ خصوصاً کساد بازاری سے قبل کے سالوں میں اکثر صوبوں نے تعلیم پر اپنے اخراجات بڑھا دیے تھے۔ تمام صوبہ واری ذرایع محاصل کو قایم نہیں کہا جا سکتا، اس لیے آیندہ ان میں بحالی رونما

ہونے کی صورت میں اخراجات میں بھی اضافے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ بہرحال قانون حکومت ہند کی دفعہ ۱۳۸ کے تحت محصول آمدنی کی جلد تقسیم سے اکثر صوبوں کو آیندہ اخراجات میں اضافے کا موقع مل سکتا ہے۔"

"موجودہ رجحانات کے سرسری مطالعے سے مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہئے کہ اگر
ہندوستانی مالیات کا انتظام دانشمندی کے ساتھ کیا جائے تو ہندوستان کے بجٹ کا مستقبل
اس توقع کو حق بجانب قرار دیتا ہے کہ نئے دستور کی مالی ضروریات کو بتدریج اچھی طرح
سے پورا کیا جاسکتا ہے۔ دستوری اور انتظامی تبدیلیوں سے تھوڑی سی مدت میں ۵۸۴
عام مالی حالت میں تغیر نہیں پیدا کیا جاسکتا اور نہ سب قابل تصوّر مالی ضروریات کی
تکمیل کی جاسکتی ہے۔ لیکن محتاط اور تدریجی ترقی نہ کرنے کی مجھے کوئی وجہ نظر نہیں
آتی۔"

۴۲۔ صوبوں کے حقوق

"(۱) اب میں زیادہ تفصیل کے ساتھ ایک اہم مسئلے پر نظر ڈالتا ہوں۔ صوبوں کی موجودہ حالت اور ایک دوسرے کے مقابلے میں متضاد حیثیت۔ ان دونوں کا لگاؤ اس مسئلے سے ہے کہ صوبوں کو خودمختاری کے آغاز پر مساویانہ سطح پر کس طرح کھڑا کیا جائے۔ اس سلسلے میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اس وقت ہر صوبے کی مالی حالت حقیقت میں کس حد تک مستحکم ہے اور کب تک مستحکم رہ سکتی ہے؟ اس کا جواب صرف ایک سال کی حالت کے اندازے کی بنا پر نہیں دیا جاسکتا۔ کوئی صوبہ خواہ اس کی موجودہ حالت کچھ ہی ہو اپنے معاملات کا انتظام محصولات یا اخراجات کے بارے میں کس قدر ثابت قدمی سے کرتا ہے اور کسی صوبے کو کسی سبب سے پچھلے زمانے میں مالی امداد سے کس حد تک محروم رکھا گیا جس کی وجہ سے اس کی حالت دوسرے صوبوں کے مقابلے میں سقیم ہوگئی ہے؟ بظاہر ان سب سوالات کے بارے میں جو متضاد خیالات اور دلائل پیش کیے گئے ہیں ان میں مطابقت پیدا کرنا مشکل ہے۔ میں جو سفارشیں پیش کروں گا ان سے میرے خیال میں مختلف مکاتیب خیال کے لوگوں کی تشفی ہو جائے گی اور مجھے امید ہے کہ وہ ان کو منظور بھی کرلیں گے۔ میں یہاں بتلا دینا چاہتا ہوں کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں انتظامی ضروریات کے معیاروں میں جگہ جگہ کافی اختلافات کا ہونا لازمات سے ہے، کیونکہ اس

قسم کے اختلافات دنیا کے دوسرے بڑے ملکوں میں بلکہ بعض اوقات چھوٹے ملکوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔"

"جیسا کہ پرسی کمیٹی کا خیال ہے چند صوبوں کو زاید امداد خواہ کسی شکل میں ہو صرف مرکزی حکومت کے محاصل کو متاثر کر کے دی جا سکتی ہے جس کی وجہ سے تمام صوبوں کو محصولات آمدنی سے ان کے حصے ملنے میں تعویق پیدا ہوگئی۔ یہ چیز ہر اس شخص کو محسوس ہوتی ہے جو سارے مسئلے کو منصفانہ طور پر سلجھانے کے لیے کوشاں ہوتا ہے اور صوبوں کی مالی حالت کو قبل از قبل متوازن کرنے پر ایک حد بندی عاید کرتی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح ہے کہ بعض صوبوں کی حالت دوسروں کے مقابلے میں حقیقی طور پر بہتر ہے اور سر دست ان کو زاید آمدنی کی شدید ضرورت نہیں ہے۔ ایسی حالت میں یہ مناسب اور ضروری ہے کہ تھوڑی بہت ترمیم کی جائے خواہ اس کی وجہ سے ان صوبوں کو جو نظم و نسق کے اعلیٰ معیار حاصل کرنے کے قابل ہوئے اب اپنی ترقی کی رفتار مدھم ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔"

بعض اور معاملات پر عام تبصرہ کیا جا سکتا ہے۔ سندھ کی علٰحدگی سے بمبئی پر سے حال ہی میں تقریباً ۹۰ لاکھ روپے سالانہ کا بار کم ہوگیا اور اوڑیسہ کی علٰحدگی سے مدراس
۵۸۵ اور بہار کو علی الترتیب تقریباً ۲۰ لاکھ اور ۸ لاکھ روپے سالانہ کی بچت ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ مدراس، بمبئی اور پنجاب کے نظم و نسق کے معیار ہندوستان میں کوئی ادنیٰ درجہ نہیں رکھتے بنگال کا معیار بظاہر ادنیٰ ہے اور بہار اور اوڑیسہ کے متعلق یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ وہ ہندوستان کے سب سے غریب صوبے ہیں۔ صوبۂ متوسط پر بھی یہی بات کسی قدر کم درجے پر صادق آتی ہے۔ صوبۂ متحدہ کی حالت کسی قدر انوکھی ہے۔ چنانچہ جہاں اس کا قریبی مستقبل زیادہ پریشان کن نہیں ہے وہاں اس کی موجودہ حالت کافی تشویش ناک ہے۔

(۲) سندھ۔ سندھ اور اوڑیسہ نے جب سے نئے صوبوں کی حیثیت اختیار کی ہے ان کو خاص مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ سندھ کا مستقبل اور اس کے مالیات کے جزو کے طور پر مالی امداد کا مسئلہ لائڈ بند کے مالی مستقبل کے ساتھ دوامی طور پر وابستہ ہے۔ بہر حال اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ اس بند سے آیندہ زمانے میں جو آمدنی ہوگی اس کی نوعیت قیاسی ہے میں یہ سفارش کرتا ہوں کہ ایک کروڑ ۵ لاکھ روپے

سالانہ کی مالی امداد سندھ کو دس سال تک (یعنی ۱۹۴۶ء-۱۹۴۷ء کے ختم تک) بدستور جاری رہنی چاہیے۔ اس کے بعد کے ۲۰ سال کے لیے سالانہ امداد میں ۲۵ لاکھ روپے کی کمی کی جائے۔ اس کے بعد ۵ سال کے لیے ۴۰ لاکھ روپے سالانہ کمی اور اس کے بعد کے پانچ سال کے لیے ۴۵ لاکھ روپے سالانہ کی کمی کرنی چاہیے۔ اس کے بعد بند لائڈ کا جملہ قرضہ ادا ہونے تک ۵۰ لاکھ روپے سالانہ کی کمی کرنی چاہیے۔ ۱۹۳۲ء میں قرضے کی ادائی کا انتظام شروع ہونے کے بعد سے تقریباً ۴۰ سال میں جب قرضہ ادا ہو جائے تو مالی امداد کا باقی حصہ بہر حال موقوف کر دیا جائے گا۔"

"(۳) اوڑیسہ۔ اس واقعے کو نظر انداز کرنا مشکل ہے کہ اوڑیسہ کے اخراجات کا موجودہ معیار بہت پست ہے اور مستقبل قریب میں اس صوبے کی آمدنی میں اضافے کا امکان محدود ہے، کیونکہ اوڑیسہ کے متوالی اخراجات کے لیے ۱۹۳۶ء-۱۹۳۷ء ۴۰½ لاکھ روپے رکھے گئے تھے۔ اس لیے معمولی مالی امداد کو کسی قدر بڑھانا ضروری ہے۔ میری یہ تجویز ہے کہ اوڑیسہ کو مجموعی امداد حسب ذیل دینی چاہیے۔ پہلے سال ۵۰ لاکھ روپے، بعد کے ۴ سال تک ۵۳ لاکھ روپے سالانہ اور اس کے بعد ۵۰ لاکھ روپے سالانہ۔"

"(۴) آسام۔ یہ بات عام طور پر مسلمہ ہے کہ آسام ان صوبوں میں سے ایک صوبہ ہے جن کے موازنے میں گھاٹا رہتا ہے اور اس لیے اس کو یقینی طور پر امداد ملنی چاہیے۔ امداد کا دارومدار کچھ آسام کی مستقبل آمدنی پر ہے جس میں آیندہ کچھ اضافے کی گنجائش ہو سکتی ہے اور کچھ اس بات پر ہے کہ موجودہ صوبہ واری گھاٹے (۱۹۳۵ء-۱۹۳۶ء میں ۴۰ لاکھ روپے) کو کس حد تک ناگزیر خیال کیا جا سکتا ہے (بہ اعتبار اخراجات یا محصولات)۔ اس کے علاوہ صوبہ واری خود مختاری کے مصارف ابتدائی اخراجات کا جو جدید انتظام کے تحت مرکزی حکومت کی بجائے آسام کی صوبہ واری حکومت پر عاید ہوں گے کچھ لحاظ کرنا پڑے گا بشمول آسام رائفلز کے مصارف کے جس کا بار اب تک زیادہ تر مرکزی حکومت برداشت کرتی رہی۔ فی الحال مرکزی حکومت آسام رائفلز کے مجموعی اخراجات یعنی ۱۵ لاکھ روپے کے منجملہ ۱۲ لاکھ روپے سالانہ ادا کرتی ہے۔ آیندہ مرکزی حکومت بہرصورت مانی پور بٹالین کے اخراجات (تقریباً ۳ لاکھ روپے) ادا کرے گی۔ مرکزی حکومت کی اب یہ تجویز ہے کہ باقی آسامی فوج کے مصارف میں سے ۹ لاکھ روپے کا بار خود برداشت

کرے اور اس امداد کو خالص صوبہ واری ضروریات کی غرض سے دی ہوئی امداد سے الگ رکھے۔ میرے خیال میں یہ انتظام نہایت مناسب ہے۔"

"(ھ) شمال مغربی سرحدی صوبہ۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کو ۱۹۳۲ء سے مرکزی حکومت سے اکروڑ روپے سالانہ کی امداد مل رہی ہے۔ اس کے علاوہ اس کو ایک خاص رعایت یہ حاصل ہے کہ قانون حکومت ہند کی دفعہ ۱۴۲ مجاز گردانتی ہے کہ وفاقی مجلس قانون ساز کی تحریک کے بغیر اس صوبے کی مالی امداد میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن صوبہ واری اور مرکزی دونوں حکومتوں کے نقطۂ نظر سے زیادہ مناسب یہی ہے کہ چند سالوں کے لیے مالی امداد کی مقدار معین کر دی جائے۔ اس صوبے کے موازنے کی پچھلی اور آیندہ حالت کے معائنے کے بعد میری سفارش یہ ہے کہ اکروڑ روپے کی موجودہ امداد میں تقریباً ۱۰ لاکھ روپے سالانہ کا اضافہ کرنا چاہیئے۔ جس حد تک یہ امداد دفعہ ۱۴۲ کے تحت نقد امداد کی شکل اختیار کرے اس کی مدت پانچ سال مقرر کرنی چاہیئے۔ جس کے بعد اس وقت کے حالات کے لحاظ سے اس کی نظر ثانی ہونی چاہیئے۔"

۴۳۔ مرکزی حکومت کی حالت۔

"کیا مرکزی حکومت اس زاید مطالبے کا بار برداشت کر سکتی ہے؟ تقریباً ۲ کروڑ روپے سالانہ کے اس بار کے علاوہ صوبہ واری خود مختاری کے نفاذ کے ساتھ ہی برما ہندوستان سے الگ ہو جائے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مرکزی محاصل میں حکومت ہند کے موجودہ اندازے کے مطابق تقریباً ۲½ کروڑ روپے کی کمی ہو جائے گی۔ یہ دونوں مدات مل کر موازنے کی حد تک ایک پیچیدہ مسئلہ بن جائیں گی اگر ان کو ۳۸-۱۹۳۷ء میں ایک ساتھ اور اچانک ایک ہی مالی سال کے معمولی ذرائع سے پورا کرنا پڑا۔ اس کے بعد جب مرکزی محاصل میں اضافہ رونما ہوگا جس کی قطعی طور پر توقع کی جا سکتی ہے تو کوئی خاص دقت نہ ہونی چاہیئے۔ لیکن ۲ کروڑ روپے کے اس محفوظ سرمایے کی موجودگی میں جس کے ۳۶-۱۹۳۵ء کی بچت سے ملنے کی توقع ہے میں اس کی کوئی وجہ نہیں پاتا کہ سال ۳۸-۱۹۳۷ء کے کے آغاز ہی سے صوبوں کو یہ زاید مالی امداد کیوں نہ دی جائے۔"

"یہ نتیجہ اخذ کرتے وقت میری یہ بڑی کمزوری ہوگی اگر میں یہ واضح نہ کروں کہ تاوقتیکہ معاشی اصلاح و ترقی کی رفتار موجودہ اندازے سے زیادہ نہ ہو آیندہ چند سالوں میں محاصل

کے بارے میں کمی ہونے کا امکان بہت تھوڑا ہے۔ میں یہ خیال قایم کرنے میں حق بجانب ہوں کہ صوبہ واری خود مختاری کا قیام ایک ایسا نصب العین ہے جس کی طرف حکومت ہند کو اپنے مالی مقاصد کی تنظیم کے سلسلے میں خاص توجہ دینی چاہئے۔"

" مالی نقطۂ نظر سے میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ ہز مجسٹی کی حکومت پارلیمنٹ کو یہ مشورہ دے سکتی ہے کہ ۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند (صوبہ واری خود مختاری) کی دفعہ ۳ ایک سال کے بعد ہی نافذ کر دی جائے۔ ۵۸۷

۴۴۔ جوٹ پیدا کرنے والے صوبوں کا مطالبہ۔

جوٹ پیدا کرنے والے صوبوں کا یہ مطالبہ کہ جوٹ کا محصول برآمد سب کا سب یا اس کا بڑا حصہ ان کو ملنا چاہئے قانون حکومت ہند میں ۵۰ فیصد کی حد تک تسلیم کیا جا چکا ہے۔ میرے خیال میں یہ دلیل مشتبہ ہے کہ اس خاص محصول کا بار سب کا سب دولت پیدا کرنے والے پر پڑتا ہے۔ اس استدلال کو ثابت کرنے کے لیے کوئی قابل اعتماد اعداد پیش نہیں کیے گئے ہیں اور اگر کوئی ایسا ثبوت کسی خاص مدت کے لیے پیش بھی کیا جائے تب بھی یہ مشتبہ ہو سکتا ہے کہ آیا وہ بدلتے ہوئے بازار کے حالات میں صحیح ہوگا۔ اس کے علاوہ اگر استدلال پوری طرح صحیح ہو تب بھی اس مسئلے کے بارے میں وہ قطعی نہیں ہو سکتا کہ آیا ہندوستان میں قوم بحیثیت مجموعی اس ذریعے سے آمدنی حاصل کرنے میں حق بجانب ہے یا نہیں، کیونکہ اس کو در اصل ہندوستان کے مختلف حصوں میں دوسرے غیر مساوی تناسب کے ذرایع سے آمدنی حاصل کرنا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی ملک میں بھی اس کے تمام علاقوں سے کروڑ گیری، جنگی اور محصول آمدنی جیسے محاصل امیروں، غریبوں، یا صنعتی و زرعی ذرایع سے یکساں طور پر وصول نہیں کیے جا سکتے۔ اگر مطالبے کی بنیاد یہ ہو کہ بنگال کی ادائی محصول کی قابلیت اس محصول کے بار کی وجہ سے محدود ہو جاتی ہے تو یہ مطالبہ اس محصول سے خاص طور سے اتنا متعلق نہیں ہے جس قدر کہ عام مالی امداد سے متعلق ہے۔ یہ در اصل محصولات آمدنی میں سے حصہ لینے یا ایسا کوئی خاص ترجیحی سلوک حاصل کرنے کا مطالبہ ہے جس کی تکمیل میری موجودہ سفارشات کا مقصد ہے۔ اگر مذکورہ معاشی دلیل کو صحیح بھی قرار دیا جائے تو اس کے مطابق عمل کیا جا چکا ہے یعنی محصول کی خالص آمدنی کا ۵۰ فیصد حصہ متعلقہ صوبوں

کو دیا جا رہا ہے ۔ لیکن مناسب ہوگا کہ جو امداد میرے زیر غور ہے اس کی ایک شکل یہ ہو کہ ۵۰ فیصد سے کچھ زیادہ ان صوبوں کو دیا جائے ۔ اسی لیے میں یہ سفارش کرتا ہوں کہ قانون کی دفعہ ۱۴۰ (۲) کے تحت حصے کی مقدار بڑھا کر ۱۹۳۶ء - ۱۹۳۷ء کے محصول کے خام انداز سے یعنی ۳۸۰ لاکھ روپے کا ۶۲½ فیصد کر دی جائے ۔ اس ۱۲½ فیصد اضافے کے معنی یہ ہوں گے کہ مختلف صوبوں کے محاصل میں مندرجۂ ذیل اضافہ ہوگا اور اس حد تک مرکزی حکومت کا نقصان ہوگا ۔ بنگال ۴۲ لاکھ روپے، بہار ۲½ لاکھ روپے، آسام ۲¼ لاکھ روپے اور اوڑیسہ زاید از ¼ لاکھ روپے ۔

"برما کی علیحدگی اور صوبوں کے لیے اس ۲ کروڑ کی امداد کے علاوہ جس کی میں نے سفارش کی ہے ممکن ہے کہ جدید وفاقی اداروں کا زاید خرچ (جو غالباً نصف کروڑ روپے سے کچھ زیادہ ہوگا) ابھی بہت جلد عاید ہو اور اس قانون کی دفعہ ۱۴۷ کے بموجب ممکن ہے کہ ریاستوں کے معاملات کی حد تک بھی کچھ مالی سمجھوتہ کرنا پڑے اور اس کا بھی خرچ لاحق ہو جس کا اندازہ اس وقت تقریباً نصف کروڑ روپے سالانہ سے زاید ہوتا ہے ۔ البتہ موخرالذکر مد میں ابتدائی چند سالوں تک سالانہ مصارف کا بار برداشت کرنا نہیں پڑے گا لیکن اگر التویٰ ناگزیر طور پر واقع ہو تو صوبوں کو ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ انھیں مرکزی حکومت سے مجوزۂ بالا رقوم وصول ہوتی رہیں گی اور یہ ان رقوم کے علاوہ ہوں گی جو بعض صوبوں کو جوٹ کے برآمدی محصول سے نیز سڑکوں کے ½ ۱ کروڑ روپے اور دیہات سدھار مدات کے ½ ۳ کروڑ روپے سے وصول ہو رہی ہیں ۔ بعض صوبوں کو اس طرح بھی کافی امداد ملی ہے کہ ان گھاٹے والے علاقوں سے سبکدوش کر دیا گیا ہے ۔"

۴۵ - انکم ٹکس کا بار -

"ان سفارشات کے بارے میں میں دو تنقیدیں کرنا چاہتا ہوں۔ چھوٹی آمدنیوں پر محصول کے منسوخ ہو جانے اور ۱۹۳۱ء میں عاید کردہ محصولوں میں پے در پے دو مرتبہ کمی ہو جانے کے بعد ہندوستان میں انکم ٹکس اور سوپر ٹکس کی شرحیں خاص کر بڑی آمدنیوں کی حد تک ہرگز زیادہ نہیں ہیں ۔ محصولات کی عام اسکیموں کے خلاف ہندوستان کی مرکزی و صوبائی محصولات کی اسکیم کچھ ایسی ہے کہ زیادہ مالدار تاجر حلقوں پر محصول کا بار بہت کم ہے ۔ اگر اس بے قاعدگی میں تھوڑی سی اصلاح کر دی جائے تو اصولاً کسی کو شکایت نہیں ہونی چاہیے ۔ قانون حکومت

ہند میں صوبوں کو مالی امداد دینے کی سب سے اہم صورت محصول آمدنی کی جو اگی ہے اور اگر باقیماندہ بالائی محصول برقرار رہے تو صوبوں کو دوسری مدات سے مالی امداد دینے کا جلد امکان ہو جائے گا[1]۔

انکم ٹکس کی تقسیم کے اصول۔ ۴۶۔ "فطرۃً ہر صوبہ اسی اصول تقسیم کی حمایت کرتا ہے جس سے اُسے سب سے زیادہ مقسوم حاصل ہو، مثلاً آبادی، سکونت وغیرہ۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مجوزہ اصولوں میں سے کوئی اصول بھی خاص طور پر جبایاتی نقطۂ نظر سے صحیح ہے یا ادائی کی قابلیت کے مثالی لیکن عملاً ناقابل تعین معیار کو کسی قابل لحاظ حد تک پورا کرتا ہے۔ اس موضوع کے سابق مباحث میں بتایا جا چکا ہے کہ محض مقام وصولی محصول کوئی موزوں معیار نہیں ہے۔ اگرچہ کہ کسی فرد کی جائے سکونت علاوہ سیاسی وحدتوں کے درمیان دوہرے تعدد محصول کو دور کرنے میں ایک سہولت بخش اور کارآمد خط تقسیم ہو سکتی ہے، لیکن وفاق کے لیے اصولاً موزوں نہیں ہے، بالخصوص ہندوستان کے لیے یہ کوئی اچھا جبایاتی معیار نہیں ہے، کیونکہ اس سے جو نتایج (جن کا اندازہ مجبوراً سرسری طور پر کیا جاتا ہے) پیدا ہوتے ہیں ان پر ان نتایج کا شبہہ ہونے لگتا ہے جو مقام وصولی محصول کو معیار بنانے کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ زیادہ قابل اعتبار نہیں ہوتے۔

بالآخر یہ فرض کرتے ہوئے بھی کہ اس امر کا تعین ہو سکتا ہے کہ آمدنی کے کون سے خاص اجزا (اور نتیجۃً بار محصول) ہندوستان کے کس حصے سے صحیح طور پر متعلق ہیں، یہ امر بحث طلب رہ جاتا ہے کہ ایک وفاق کے تحت دوسرے امور کا بھی لحاظ کرنا پڑتا ہے بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ دیگر اقسام کے عام محصول کے فوائد اور بار مختلف شرکا کے مابین غیر مساویانہ طور پر تقسیم کیے گئے ہوں"۔

۵۸۹ **نیمیر رپورٹ کی منظوری:۔** ۴۷۔ جیسی کہ توقع تھی، نیمیر رپورٹ کی اشاعت سے ہندوستان میں احتجاج کا تقریباً ایک عالمگیر طوفان بپا ہو گیا۔ بجز صوبۂ متوسط کے تمام

[1] ریلوں کی صورت حال کے متعلق سر آٹو نیمیر کے خیالات اور ریلوں کے اخراجات کی از سر نو مکمل تنظیم کی نسبت ان کے ولائی کا ذکر اس سے قبل کیا جا چکا ہے۔ دیکھو باب ۵ فصل (۱۶)۔

دیگر صوبہ جات نے قدرتی طور پر نیمیر کے لائحہ عمل پر اعتراض کیا اور وزیر ہند سے طویل مراسلت کے ذریعے سے اس طرزِ عمل کی شکایت کی جو ان کے ساتھ روا رکھا گیا تھا۔ حکومت ہند نے بھی ایک مراسلہ وزیر ہند کے پاس روانہ کیا جس میں اپنے خیالات کا خلاصہ درج کیا۔ صوبہ جات نے نیمیر فیصلے کی نسبت جو شکایات پیش کیں ان سے ایک نزاعی کشمکش کا اظہار ہوتا ہے۔ ہر صوبہ اٹل طور پر اس امر کا قائل ہے کہ اس کے مطالبات حق بجانب ہیں اور مرکز سے زیادہ سے زیادہ اعانت کا طالب ہے۔ صوبہ جات کا یہ شور و پکار الگ رہا۔ خود حکومت ہند کے مراسلے سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیمیر کے لائحہ عمل کے تحت صوبہ جات کو جو غیر معمولی فیاضانہ امداد ملے گی اس سے خود حکومت ہند کے وسائل بہت کچھ گھٹ جائیں گے[1]۔ اس بارے میں صوبہ جات کی جانب سے جو تنقیدیں ہوئی ہیں ان پر ذیل کی فصل میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ لارڈ زیٹلینڈ ایک مراسلہ (مورخہ ۲۰ مئی ۱۹۳۶ء) میں جس میں حکومت ہند کی اطلاع کے لیے نیمیر رپورٹ پر ہز مجسٹی کی حکومت کا آخری فیصلہ اور اس رپورٹ پر صوبہ جاتی حکومتوں اور حکومت ہند کے نمایندوں کی تنقیدات مندرج ہیں، فرماتے ہیں کہ وہ سر اٹو نیمیر کے اخذ کردہ نتائج کو کامل طور پر تسلیم کرتے ہیں اور یہ اضافہ کرتے ہیں کہ "یہ میری غور کردہ رائے ہے کہ انھوں (سر آٹو نیمیر) نے نزاع کے مختلف فریقوں کے درمیان اس حد تک منصفانہ سمجھوتہ کرا دیا ہے جس حد تک معاملہ مذکورہ اس کی اجازت دیتا ہے"۔ اس طرح وزیر ہند اور حکومت ہند سر آٹو کی رپورٹ کو ایک ثالثی فیصلے کی طرح سمجھتے ہیں۔ مذکورہ مراسلے میں بتایا گیا ہے کہ اس قسم کی عمدگی سے بنائی ہوئی اسکیم میں رد و بدل کرنا اس وقت تک مناسب نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ ایسا کرنے کے معقول ترین وجوہ نہ ہوں۔ اسی مراسلے میں وزیر ہند نے یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو یوم صوبہ واری خود مختاری قرار دیا۔ چنانچہ ۲۰ مئی ۱۹۳۶ء کو آرڈرس ان کونسل جاری کیے گئے جو محاصل کی تقسیم اور صوبہ واری خود مختاری کے آغاز سے متعلق تھے۔ جو آرڈر ان کونسل تقسیم محاصل سے متعلق ہے وہ فیصلۂ نیمیر کو بغیر کسی تغیر کے دوبارہ پیش کرتا ہے۔ اس طرح اس کی حیثیت ایک امر واقعہ کی ہو گئی۔ ۳ جون ۱۹۳۶ء کو مذکورہ آرڈرس ان کونسل کو پارلیمنٹ

---

[1] دیکھو ٹائمز آف انڈیا ۲ جون ۱۹۳۶ء۔

کے روبرو پیش کیا گیا۔

۴۸۔ فیصلۂ نیمیر پر چند تنقیدات۔

چودہ سال پہلے ملکیسٹن انکوائری کمیٹی سے فرمایش کی گئی تھی کہ وہ مرکز اور صوبہ جات کے درمیان تقسیم محاصل کے متعلق نظری اعتبار سے ایک صحیح اسکیم تیار کرے۔ چنانچہ اس نے بتلایا کہ نظری نقطۂ نظر سے ایک مکمل اسکیم جیسی شئے کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ مختلف وفاقوں میں جو مالیاتی طریق کار اختیار کیے گئے ہیں ان کے مطالعے سے واضح ہوگا کہ جو حقیقی انتظامات وہاں روبہ عمل لائے گئے ہیں ان سے خالص نظریے کا کتنا کم تعلق ہے۔ ان انتظامات کا تعین دراصل ان خاص حالات کی بنا پر ہوا ہے جو وفاق کی تشکیل پانے کے بعد نمودار ہوئے۔ حالات حاضرہ کا لحاظ مقدم ہے اور یہ حالات ادعائی اصول سے زیادہ فیصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ سر آٹو نیمیر کی سفارشات کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں حقیقت شعاری اور عملیت کی روح پائی جاتی ہے اور نظریے کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہ رجحان صاف طور پر نمایاں ہو جاتا ہے جب ہم اس طریق پر غور کرتے ہیں جس کے تحت سر آٹو نے مالی امداد و محاصل بر آمد یا انکم ٹکس کی آمدنی کی تقسیم کے مسئلے کو پیش کیا ہے۔ مذکورہ سفارشات اکثر ایسے مقاصد اور نقاط نظر کے درمیان جو ایک دوسرے سے متصادم ہیں ایک مصالحت کی صورت پیش کرتے ہیں اور اسی لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس معاملے سے دلچسپی رکھنے والے فریقوں میں کوئی بھی ان سے کامل طور پر مطمئن نہیں۔ سچ پوچھو تو اس قسم کے ثالثی فیصلوں کی صحت کو جانچنے کا ایک حد تک یہی قابل اطمینان معیار سمجھا جاتا ہے کہ تمام متعلق فریق ان پر معمولی سی بے اطمینانی کا اظہار کریں۔ نیمیر رپورٹ سے بے اطمینانی عام ہے۔ لیکن مخلص نقادوں کا استدلال یہ ہے کہ نزاعی فریقوں میں سے کسی میں بھی بے اطمینانی شدت کے ساتھ نہیں پائی جاتی اور یہ کہ رپورٹ مذکور سے مرکز اور وحدتوں دونوں میں مالیاتی توازن کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ۵۹۰

۴۹۔ صوبوں کی شکایات۔

جیسی کہ توقع تھی، رقمی اعانتوں سے مستفید ہونے والوں میں سے بعضوں نے یہ شکایت کی کہ دوسروں کے مقابلے میں ان کے ساتھ کنجوسی کا برتاؤ کیا گیا۔ چنانچہ اڈیسہ کو اس بات کا

رنج ہے کہ جہاں اس کے حق میں رقمی اعانت صرف ۵۰ لاکھ روپے کی گئی ہے سندھ کو ۱۰۵ لاکھ روپے کی مدد دی گئی ہے ۔ اس امر کی بھی شکایت کی جاتی ہے کہ چونکہ مالی امداد کی تقسیم میں ہر صوبے کی حقیقی ضروریات کا نہ کہ اس کے استحقاق کا لحاظ رکھا گیا ہے، اس لیے صوبہ جات کے لیے محاصل کا جو حصہ مختص کیا گیا ہے وہ بے قاعدہ اور غیر منصفانہ ہے، جن صوبوں نے اپنے مالیوں کو کفایت شعاری اور قابلیت کے ساتھ مرتب کیا ہے وہ فضول خرچ اور نااہل صوبوں کے مقابلے میں بد حال ہی رہے ۔ مثلاً بمبئی کو شکایت ہے کہ اس کی اُس تکلیف وہ کفایت شعاری کا لحاظ نہیں کیا گیا جس پر میسٹن کے غیر منصفانہ فیصلے کی وجہ سے وہ دیر تک کاربند رہا۔ ایک اور وجہ جس کی بنا پر وہ انکم ٹکس کی آمدنی کے نسبتۃً ایک بڑے حصے کا دعوہ دار ہے یہ ہے کہ ۲۵ فیصد سے زیادہ انکم ٹکس بمبئی ہی میں حاصل کیا جاتا ہے اور بمبئی پر لازم ہے کہ وہ اپنی صنعتی آبادی کے فائدے کے لیے بہت سارے گراں خرچ رفاہی کام کرے ۔ بمبئی کو مزید اس امر کا افسوس ہے کہ انکم ٹکس کی امدادی تقسیم کو بالکلیہ ریلوں کے کامیابی کے ساتھ چلنے پر چھوڑ دیا گیا ہے اور اس امر پر زور دیتا ہے کہ غیر پیداآور کارہائے آبپاشی (جن کے لیے قرضوں کے ذریعے نہیں بلکہ محاصل سے روپیہ فراہم کیا گیا) کے ضمن میں جو فرضی قرضہ قایم کیا گیا ہے اُسے منسوخ کر دیا جائے ۔ حکومت بمبئی احتجاج کرتی ہے کہ یہ امر کہ سندھ کو بمبئی سے علحدہ کرنے کی وجہ سے بمبئی کو فایدہ پہنچا ہے، مبالغہ آمیز ہے ۔ اس کی جانب سے یہ استدلال بھی پیش کیا گیا ہے کہ جب بنگال کو سن کے محصول برآمد سے استفادہ کرنے کا موقع حاصل ہے تو اُسے بھی روئی کے محاصل سے فایدہ حاصل ہونا چاہیئے ۔ اسی طرح مدراس سمجھتا ہے کہ اسے بھی زیادہ پانے کا حق ۵۹۱
ہے ۔ یعنی آبادی کے اصول کے تحت ہی اسے انکم ٹکس کا تقریباً ۲۴ فیصد ملنا چاہیئے بجائے ۲۰ فیصد کے جس کی سفارش کی گئی ہے ۔ حکومت مدراس، بنگال جیسے صوبوں سے مقابلہ و موازنہ کرتی ہے جنھوں نے اپنے میزانیوں کو متوازن کرنے کی جانب کمترین توجہ کی اور معترض ہے کہ بمبئی کو انکم ٹکس کا ایک بہت بڑا حصہ ایصال کیا جاتا ہے ۔ بہار اپنے مطالبے میں یہ چیز پیش کرتا ہے کہ وہ سب سے تنگ دست صوبہ ہے اور اس امر کا طالب ہے کہ تقسیم بااصول آبادی پر مبنی ہونی چاہیئے ۔ پنجاب کو اس بات کی شکایت ہے کہ کئی سال پہلے شمال مغربی سرحدی صوبے کی علحدگی کی وجہ سے جو فایدہ اسے حاصل ہوا

بہت ہے اُسے ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور یہ کہ بلا وجہ یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ اگر سرحدی صوبہ، پنجاب کے ایک جزو کے طور پر برقرار رہتا تو وہ اب بھی اس صوبے کے لیے ایک بار عظیم بنا رہتا۔ پنجاب کو اس کی تشویش ہے کہ نیمیر کی سفارشات کے تحت اس کی مرکز سے حاصل کردہ رقوم ۱۹۳۶ء کے مقابلے میں تقریباً پانچ لاکھ روپے سالانہ کی حد تک کم ہوجائیں گے۔ صوبۂ متحدہ ان بڑی بڑی رقموں پر حاسدانہ نظریں ڈالتا ہے جو بنگال اور بمبئی کو دیئے گئے ہیں اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ اُسے بھی مرکز سے نسبتہً زیادہ مدد ملنی چاہیئے چاہے مذکورہ صنعتی صوبوں کو نقصان ہی کیوں نہ ہو۔

ہمارا خیال ہے کہ ان تمام شکایات کا جواب سر آٹو غالباً یہ دیں گے کہ جن استدلالوں کو صوبہ جات مذکورہ اپنے مطالبات کی بنا قرار دیتے ہیں وہ فطری اعتبار سے غیر صحیح ہیں۔ آبادی یا مقام محصول بندی کے لحاظ سے انکم ٹیکس کے بارے میں جو حقوق جتلائے جاتے ہیں نیز جوٹ کے محاصل برآمد سے متعلق جو مسائل ہیں ان پر بحث کرتے ہوئے رپورٹ مذکور نظری اعتبار سے بعض استدلالوں کی کمزوری کی جانب اشارہ کرتی ہے جو اس سلسلے میں پیش کیے گئے ہیں۔

سر آٹو کا ایک استدلال شاید یہ بھی ہو کہ اگر اس جدید سیاسی تجربے کے سلسلے میں وفاق سے متعلقہ ارکان کو ٹھوس فوائد حاصل ہونے کا یقین ہے تو ایسی صورت میں ان کی جانب سے انتہائی مساوات اور کامل منصفانہ تقسیم پر زور دینا خلاف دانشمندی ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ ماضی میں بعض صوبے اسراف و فضول خرچی کے مرتکب ہوئے ہوں۔ باوجود اس کے ان تمام کو فی الحال ممکنہ حد تک ایک ساتھ قدم بڑھانے کا موقع ملنا ضروری ہے اور انتقامی انصاف کے خیالات سراسر بے محل ہیں۔

جن صوبوں نے اپنے کاروبار کی تنظیم احتیاط اور کفایت شعاری کے ساتھ کی ہے انھیں اس خیال سے خود کو تسلی دینا چاہیئے کہ کم از کم مستقبل میں انھیں اپنی کفایت شعاری اور دانشمندانہ انتظام سے پورا فائدہ حاصل کرنے کی اجازت ہوگی اور یہ کہ نیکی کا بالآخران کو صلہ ملے گا۔

یہ منشاء نہیں ہے کہ صوبوں کی جانب سے پیش کردہ بعض شکایات حق بجانب اور قابل تدارک نہیں ہیں۔ لیکن نظر ثانی کی خاطر ایسے استدلال پیش کرنا جن کا جواب

نہ دیا جا سکے تقریباً ناممکن ہے۔ پامال جملوں کے ایک مجموعے کا جواب اتنے ہی فرسودہ فقروں سے دینا بہت آسان ہے۔

ایک بدیہی واقعہ جسے یاد رکھنا چاہیے یہ ہے کہ ایک فریق کو زیادہ دینے کے معنی دوسروں یعنی دوسرے صوبوں یا مرکز کو نسبتہً کم دینے کے ہیں اور ممکن ہے کہ مؤخر الذکر
۵۹۲ کی ضرورت نسبتہً زیادہ شدید ہو یا اس کو کافی طور پر پورا کرنا قوم کے عام مفادات کے لیے ضروری ہو۔

۵۰۔ مرکز کی ضروریات

یہ بہت ضروری ہے کہ صوبوں کو قومی تعمیر کے محکموں پر خرچ کرنے کی کافی طاقت سے مسلح کرنا چاہیے اور یہ بالکل صحیح ہے کہ مرکزی حکومت کی ضروریات نسبتہً ساکن ہیں۔ اس لحاظ سے اس کے وسائل بھی ساکن رکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ سر آٹو نیمیر بھی مرکزی مالیہ کی استقامت واستحکام پر بطور ایک بنیادی ضرورت کے زور دینے میں حق بجانب ہیں۔ مرکز کے پاس کل ہند مقاصد جیسے ملک کی ساکھ قایم رکھنے اور ملک کو بیرونی حملے اور اندرونی فسادات سے بچانے کے لیے کافی رقم ہونی چاہئے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک دیسی ریاستوں کو مرکزی حکومت کے مالی استحکام کا اطمینان نہ ہوگا وہ وفاق میں شریک ہونے کے لیے آمادہ نہ ہوں گی۔ نیز یہ کہ نئے نظام کے تحت مرکزی حکومت کو ایک حد تک زاید خرچہ مثلاً وفاقی عدالت کے قایم کرنے کے سلسلے میں برداشت کرنا ہوگا، یہ کہ اس کے بعض وسائل اتنے قابل اعتماد نہیں رہے جتنے کہ وہ پہلے تھے اور آخر میں یہ کہ وحدتوں کے مقابلے میں اگرچہ اس کے فرایض ہمیشہ محدود رہیں گے لیکن مطلق معنی میں وسیع ہوں گے۔ اس لیے کہ صوبہ جات سے اس کا تعلق قریبی ہوتا جارہا ہے جو رسل و رسائل کے موجودہ ترقیات اور سرکاری مداخلت اور مرکزی رہنمائی کے جدید رجحان کا نتیجہ ہے۔

جیسا کہ سر جیمس گرگ نے اپنے ۱۹۳۸ء کے گوشوارۂ میزانیہ میں بتلایا ہے، مرکزی حکومت جنگ عظیم کے بعد سے صوبہ جات کے حق میں بیس کروڑ روپے سے زیادہ آمدنی سے دست بردار ہو چکی ہے۔ مزید براں تامینی مسلک پر اس حد تک عمل کرنے کے سلسلے میں جس حد تک کہ عمل کیا گیا ہے، مرکزی حکومت کے نزدیک ان نقصانات کی تلافی آسان نہیں ہے جو محصول درآمد کی آمدنی کے تخفیف ہونے کی وجہ سے لاحق ہوئے ہیں، چاہے ہم کتنا ہی افسوس کریں، پریشان کن بین قومی حالات رجو دنیا کو دھمکی

دے رہے ہیں) کی وجہ سے فوج اور بحریئے کے مصارف میں بھی اضافہ ہوسکتا ہے۔ اسے ایک امکان یا گمان غالب ہی کے طور پر تسلیم کرنے کے معنی یہ نہیں کہ سر آٹو نیمیر کی اس رائے کو مستند سمجھ کر مان لیا جائے کہ موجودہ فوجی مصارف کو (غیر معمولی حالات کو چھوڑتے ہوئے بھی موجودہ حالات کے تحت) گھٹانا ممکن نہیں ہے۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے، ہم نے اس پر جو بحث اوپر کی ہے (دیکھو فصل ۱۹) وہ سر آٹو کے غیر متعلق دعوے سے متاثر نہیں ہوسکتی۔ ہم اسے غیر متعلق اس لیے کہتے ہیں کہ فوجی مصارف کے موضوع کی تحقیق کے لیے سر آٹو کو خاص طور پر طلب نہیں کیا گیا تھا اور نہ وہ اپنی رائے کے بارے میں جو انھوں نے اس خصوص میں ظاہر کی ہے ماہر ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں صرف یہی سمجھنا چاہیئے کہ انھوں نے اس معاملے میں سرکاری بیانات بلا کسی تحقیق کے قبول کرنے پر اکتفا کیا اور بجا طور پر سلامتی اسی میں سمجھی کہ یہ فرض کر لیا جائے کہ موجودہ مصارف میں تخفیف کی مزید گنجایش نہیں ہے۔ ۵۹۴

محاصل کروڑ گیری اور انکم ٹکس پر جو زاید محاصل عاید کیے گئے ہیں ان کو سر آٹو نے جائز قرار دیا ہے اور وزیر ہند کی جانب سے اس کی توثیق ہوئی ہے۔ لیکن لوگ اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، اس لیے کہ حکومت نے خود ان کے برخواست کرنے کی باضابطہ ضمانت دی ہے۔ جیسا کہ سر آٹو نے بیان کیا ہے، ہندوستانی محصول بندی کی عام اسکیم نسبتۃً مالدار طبقوں کے حق میں مفید ہوسکتی ہے۔ لیکن اس امر کو تسلیم نہیں کیا جائے گا کہ اس بے ضابطگی کو دور کرنے کی موزوں تدبیر یہ ہے کہ مذکورہ زاید محاصل کو برقرار رکھا جائے، اس لیے کہ ان کا دباؤ نا واجبی شدت کے ساتھ عوام کے ان طبقوں پر پڑتا ہے جو فی الحقیقت ہمدردی اور امداد کے مستحق ہیں۔

۸۱۔ نیمیر اسکیم پر اختتامی تبصرہ۔

سر آٹو کی اسکیم اور بالخصوص اس کے اس حصے کی کامیابی جو مرکز اور صوبہ جات کے درمیان انکم ٹکس کی آمدنی کی تقسیم سے متعلق ہے، ریلوں کی اطمینان بخش کارگزاری پر منحصر ہے۔ صوبہ جاتی حکومتوں کو اپنے ہی مفادات کے تحت ریلوں کی خوشحالی کو واپس لانے اور ان کو اس قابل بنانے میں کہ وہ عام مالیہ میں اپنی آمدنی کا معتدبہ حصہ شریک کر سکیں، حکومت ہند سے تعاون کرنا ہوگا۔ اس سے مراد صوبہ جاتی حکومتوں کی اپنی سرمایہ سے متعلقہ پالیسی

کو منضبط کرنے کے ہیں، تاکہ سڑکیں ریلوں سے مسابقت کرنے کی بجائے امداد کا باعث بن سکیں۔ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ مرکزی حکومت کی جانب سے مصارف ریلوے کی سخت جانچ پڑتال کی جائے اور مختلف ذرائع نقل و حمل کے درمیان ایک مناسب اشتراک عمل ہو۔ (دیکھو پانچواں باب)۔

جیسا کہ ایک نقاد نے بیان کیا ہے، جس وقت نیمیر تجاویز پیش کئے گئے (۱۹۳۶ء) وہ صوبہ جات کے لیے محض ایک علمی دلچسپی رکھتے تھے، کیونکہ انکم ٹکس کی آمدنی میں سے حصہ دس سال کے بعد ملنے والا تھا۔ اس وقت تک صوبہ جات کو ہمیشہ کی طرح تخفیف مصارف اور کفایت شعاری کی پالیسی پر سختی سے عمل کرنا ضروری تھا۔ اگر وہ اپنے "قومی تعمیر" کے عزائم میں سے کسی کی تکمیل کے خواہاں ہوں تو وہ نئے محاصل کی طرف رجوع کر کے ایسا کر سکتے تھے۔ مگر ان نئے محاصل سے کسی قابل لحاظ آمدنی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

صوبہ جات کی خوش قسمتی سے ان کے تمام اندیشے بے بنیاد ثابت ہوئے ۱۹۳۷ء-۳۸ء میں ریلوے کے موازنے میں بچت ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ریلوے سے متعلقہ واجبات بقایا کر دیے گئے (دیکھو پانچواں باب) نیز مرکزی حکومت کے مالیے کی حالت روبہ اصلاح ہوئی۔ ان حالات میں مرکزی حکومت اس قابل ہوئی کہ وہ فیصلۂ نیمیر کے تحت من ابتدائے سال مالیہ ۱۹۳۷ء-۳۸ء سے صوبے جات کو انکم ٹکس کا حصہ دینا شروع کرے۔ جو تخمینے ۲۲ مارچ ۱۹۳۸ء کو دستیاب ہوئے ان کی بنا پر صوبہ جات کو واجب الادا رقوم حسب ذیل تھیں :- بمبئی ۲۵ لاکھ روپے، بنگال (۲۵)، مدراس (۱۸٬۷۵)، صوبہ جات

۵۹۴ متحدہ (۱۸٬۷۵)، بہار (۱۲٬۵۰)، پنجاب (۱۰)، صوبہ جات متوسط (۶٬۲۵)، سندھ (۲٬۵۰) اوڑیسہ (۲٬۵۰)، آسام (۲٬۵۰) اور شمال مغربی سرحدی صوبہ (۱٬۲۵)۔ اس طرح جملہ واجب الادا رقم ۱۲۵ لاکھ روپے رہی۔ خود سر آٹو نیمیر کو اس کی توقع نہ تھی کہ صوبہ جاتی حکومتیں انکم ٹکس کا کوئی حصہ حاصل کر سکیں گی جب تک کہ صوبہ واری خود مختاری کے افتتاح کے بعد پانچ سال نہ گزر جائیں۔ اگر جدید مسودہ قانون انکم ٹکس پاس ہو جائے تو اس عمل کی اختیار میں مزید سرعت پیدا ہو جائے گی۔

آخر میں ہم سر آٹو نیمیر کے تجاویز کا خیر مقدم اس اعتبار سے کر سکتے ہیں کہ ان کی حیثیت

ایک ایسی دیانت دارانہ کوشش کی تھی جو ایک مسلمہ ماہر مالیات کی جانب سے ایک دشوار اور پیچیدہ مسئلے کو حل کرنے کے لیے عمل میں لائی گئی تھی۔ تاہم ہمیں چاہیئے کہ اس پیچیدہ موضوع کے بارے میں ماسبق ماہرانہ سفارشات کا جو حشر ہو چکا ہے اس سے عبرت حاصل کریں اور سر آٹو کی اسکیم کی کامیابی پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ نہ کریں۔ یہ کہنے کی بجا طور پر جسارت کی جا سکتی ہے کہ یہ اس سے قبل کی پیش کردہ اسکیموں کے مقابلے میں زیادہ اصلاح یافتہ ہے، چاہے اس کی صرف یہی وجہ کیوں نہ ہو کہ اس کی تیاری میں نسبتہً زیادہ تجربے سے کام لیا گیا۔ بہرکیف اس کی کامیابی کا انحصار متعدد عوامل پر ہے جن کا پہلے سے اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ملک کی عام معاشی حالت، ریلوں کی خوشحالی، اور بین قومی صورت حال کی ترقی۔ حالیہ مہینوں میں باہر نیز اندرون ہندوستان معاشی حالات نے جو پلٹا کھایا ہے اس کی وجہ سے ہماری تجارت اور ریلوں کی آمدنیاں بری طرح متاثر ہو گئی ہیں اور اس لیے ضرورت ہے کہ رجائیت کے رجحان میں اعتدال کو ملحوظ رکھا جائے۔ انتہائی متزلزل بین الاقوامی صورت حال کا معاملہ تو علٰحدہ ہی ہے۔

۲۵۔ صوبہ جاتی مالیے کے اعداد و شمار

انفرادی طور پر نیز بحیثیت مجموعی صوبہ جات کی مالی حیثیت ذیل کے چار جدولوں سے واضح ہو جائے گی۔

جدول (۱)[1]

صوبہ جات کے مجموعی محاصل و مصارف

کروڑ روپے میں

سال	محاصل	مرکزی حکومت کو حصے کی ادائی	باقی محاصل	مصارف	بچت + گھاٹا −
۱۹۲۱-۲۲	۸۰٫۱۱	۹٫۸۳	۷۰٫۴۳	۷۹٫۱۶	− ۸٫۷۳
۱۹۲۲-۲۳	۸۴٫۹۴	۹٫۲۰	۷۵٫۷۴	۷۷٫۲۳	− ۱٫۴۹
۱۹۲۳-۲۴	۸۸٫۰۵	۹٫۲۰	۷۸٫۸۵	۷۶٫۰۹	+ ۲٫۷۶

[1] دیکھو سائمن کمیشن رپورٹ جلد دوم فقرہ ۲۴۵ اور ایک رپورٹ حکومت ہند کے مالیے اور محاصل کے حسابات ۱۹۳۶ء ۱۹۳۷ء

۲۵-۱۹۲۴	۹۰٫۴۸	۹٫۲۰	۸۱٫۲۸	۷۸٫۴۱	+۲٫۸۷
۲۶-۱۹۲۵	۹۳٫۷۱	۶٫۲۰	۸۷٫۵۱	۸۵٫۸۹	+۱٫۹۲
۲۷-۱۹۲۶	۹۱٫۶۰	۵٫۱۷	۸۶٫۴۳	۹۰٫۱۷	+۳٫۷۴
۲۸-۱۹۲۷	۹۳٫۲۹	—	۹۳٫۲۹	۹۱٫۵۰	+۱٫۷۹
۲۹-۱۹۲۸	۹۱٫۴۹	—	۹۱٫۴۹	۹۲٫۹۱	-۱٫۴۲
۳۰-۱۹۲۹	۹۴٫۵۸	—	۹۴٫۵۸	۹۳٫۸۰	+۰٫۷۸
۳۱-۱۹۳۰	۸۳٫۰۸	—	۸۳٫۰۸	۹۴٫۲۵	-۱۱٫۱۷
۳۲-۱۹۳۱	۸۳٫۱۸	—	۸۳٫۱۸	۸۶٫۷۰	-۳٫۵۲
۳۳-۱۹۳۲	۸۴٫۳۵	—	۸۴٫۳۵	۸۵٫۶۷	-۱٫۳۲
۳۴-۱۹۳۳	۸۲٫۸۵	—	۸۲٫۸۵	۸۵٫۹۰	-۳٫۰۵
۳۶-۱۹۳۵	۸۹٫۰۲	—	۸۹٫۰۲	۸۸٫۶۹	+۰٫۳۳
۳۵-۱۹۳۶	۹۲٫۳۴	—	۹۲٫۳۴	۹۱٫۵۵	+۰٫۷۹

جدول (۲) ب[ل]

مختلف صوبہ جاتی حکومتوں کے محاصل برائے سال مختتم بہ ۳۱ مارچ ۱۹۳۶ء (لاکھ روپے میں)

ابواب محاصل	مدراس	بمبئی	بنگال	صوبہ متحدہ	پنجاب	برما	بہار	صوبہ متوسط و برار	شمال مغربی سرحدی صوبہ	آسام	اڑیسہ	سندھ	صوبہ جاتی حکومتوں کی میزان[ج]
آمدنی پر محصولات	–	–	–	–	–	–	–	–	–	۳٫۱۹	۰٫۵۷	–	۳٫۷۶
نمک[۳]	–	۰٫۰۲	۰٫۵۵	۰٫۰۱	–	۱٫۰۷	۰٫۲۷	–	–	۰٫۰۹	۰٫۰۲	–	۲٫۰۰
مالگزاری	۴۲۵٫۵۹	۳۴۴٫۳۲	۳۵۴٫۰۰	۵۹۴٫۶۹	۲۹۹٫۷۴	۵۰۵٫۷۰	۱۳۹٫۱۴	۲۵۴٫۴۵	۲۱٫۹۷	۱۲۹٫۶۶	۵۰٫۲۶	۴۰۵٫۸۷	۳۱۶۱٫۱۳
چنگی	۳۹۵٫۵۸	۳۱۵٫۳۹	۱۳۶٫۳۶	۱۵۲٫۷۸	۱۲۳٫۵۸	۸۹٫۵۲	۱۱۶٫۱۰	۶۳٫۸۰	۹٫۰۹	۳۵٫۹۰	۳۲٫۷۸	۳۴٫۹۵	۱۴۹۸٫۵۲
اسٹامپ	۱۹۵٫۰۸	۱۴۶٫۹۹	۳۰۲٫۳۵	۱۶۲٫۵۹	۵۹٫۸۵	۴۱٫۹۷	۹۷٫۳۴	۵۰٫۲۲	۸٫۱۴	۱۸٫۲۹	۱۷٫۳۲	۱۸٫۸۵	۱۱۴۹٫۴۴

[ل] ۔ دیکھو "حکومت ہند کے مالیے اور محاصل کے حسابات ۱۹۳۶ء بہ ۱۹۳۷ء جدول (۸)"۔

[ج] ۔ اس میں وفاق ریاست ہائے شان (برما) اور کورگ کے میزانات شامل ہیں۔

[۳] ۔ بیرونی نمک پر لگائے ہوئے درآمدی محصول میں صوبہ جاتی حکومتوں کا حصہ۔

جنگلات	۴۸،۲۹	۴۶،۶۳	۱۸،۳۶	۴۴،۳۶	۲۲،۴۶	۱۴۲،۹۴	۵،۹۵	۴۶،۶۴	۴،۳۶	۱۸،۸۵	۴،۲۸	۶،۲۸	۴۲۵،۲۰
رجسٹریشن	۳۰،۶۹	۱۵،۰۴	۲۳،۹۶	۱۰،۳۵	۹،۳۱	۳،۳۸	۱۲،۶۹	۴،۹۴	۰،۹۸	۱،۶۳	۲،۱۴	۲،۰۱	۱۱۶،۹۱
درج فہرست ٹیکس	۰،۸۲	۱۹،۶۲	۱۶،۸۹	—	۰،۴۳	۱۴،۱۳	—	۰،۰۳	—	—	—	۱،۰۶	۵۲،۸۴
میزان	۱۱،۳۹۶،۰۵	۸۹۹،۱۰	۸۵۲،۴۸	۹۳۴،۶۸	۵۲۳،۳۸	۶۹۸،۱۱	۳۹۸،۱۹	۴۲۱،۰۸	۴۳،۹۴	۱۰۵،۹۵	۱۰،۳۶	۱۰۴،۶۲	۶۴۲۰،۶۶
ریلیں	—	—	۰،۳۸	۱،۰۴	—	—	—	—	—	—	—	—	۱،۴۲
آبپاشی	۲۱۹،۱۰	۲۰،۰۶	-۰،۳۱	۱۵۱،۸۵	۴۴۱،۸۳	۳۲،۱۶	۲۱،۹۵	۴،۲۱	۱۲،۵۱	—	۴،۱۶	۸۹،۹۵	۹۹۴،۶۴
قرضے کی خدمات	۲۵،۱۸	۹۳،۳۴	۶،۲۰	۱۱،۹۳	۹،۳۴	۲،۴۲	۹،۹۶	۳،۹۸	۰،۶۳	۰،۴۴	۰،۲۸	۳،۶۰	۱۶۵،۵۲
غیر فوجی نظم ونسق	۱۲۶،۱۹	۱۲۹،۰۱	۹۴،۳۶	۵۱،۵۹	۶۴،۳۱	۴۹،۱۱	۳۲،۴۳	۲۳،۴۰	۱۰،۲۴	۱۳،۸۴	۴،۸۶	۱۱،۱۸	۶۲۲،۴۹
کارہائے غیر فوجی	۲۶،۴۳	۳۸،۸۳	۲۰،۹۰	۲۲،۱۵	۳۲،۲۲	۲۳،۲۶	۱۰،۳۹	۱۳،۰۱	۵،۸۵	۲۱،۹۳	۱،۵۰	۳،۳۶	۲۳۳،۶۵
متفرق	۱۶،۱۲	۵۹،۴۶	۲۳۹،۳۶	۱۸،۹۶	۴۶،۸۸	۲۳،۹۶	۱۸،۲۱	۵،۰۴	۱۰۲،۰۶	۱۱،۵۲	۵۲،۱۸	۱۸۶،۴۳	۶۹۵،۱۸
مجموعی محاصل	۱۸۵۸،۰۴	۱۲۳۹،۸۰	۱۲۱۴،۳۹	۸۸،۹۶	۴۶،۸۸	۲۳،۹۶	۱۸،۲۱	۵،۰۴	۱۰۲،۰۹	۱۱،۵۲	۵۲،۱۸	۱۸۶،۴۳	۶۹۵،۱۸

۵۹۶

جدول (۳)

مختلف صوبہ جاتی حکومتوں کے مصارف برائے سال مختتمہ ۳۱ مارچ ۱۹۳۷ء (لاکھ روپے میں)

ابواب مصارف	مدراس	بمبئی	بنگال	صوبہ متحدہ	پنجاب	برما	بہار	صوبہ متوسط و برار	شمال مغربی سرحدی صوبہ	آسام	اوڑیسہ	سندھ	صوبہ جاتی حکومتوں کی میزان
محاصل کا راست خرچ	۱۲۲٫۶۲	۱۲۳٫۳۸	۹۲٫۹۲	۱۳۱٫۰۹	۶۳٫۶۴	۱۳۲٫۲۶	۳۵٫۶۶	۹۵٫۸۸	۶٫۸۶	۳۵٫۰۸	۱۴٫۶۸	۲۶٫۲۵	۸۶۹٫۰۸
جنگلات اور دوسرے سرمایہ کے مصارف	۳٫۰۲	۰٫۴۹	۰٫۲۰	۰٫۳۳	۴٫۹۴	۰٫۵۵	۰٫۳۱	۰٫۶۵	—	۰٫۴۴	۰٫۱۶	۰٫۰۳	۱۱٫۰۲
ریلوے کے مصارف	—	—	—	۰٫۰۶	—	—	—	—	—	-٫۴۴	—	—	۰٫۵۱
آبپاشی کے مصارف	۱۲۳٫۵۴	۴۸٫۲۰	۳۱٫۱۶	۱۰۵٫۶۰	۱۳۴٫۲۴	۳۰٫۹۳	۱۲٫۶۷	۲۶٫۶۰	۱۴٫۹۴	۰٫۹۲	۱۳٫۵۵	۱۶۵٫۲۳	۶۰۸٫۶۰
آبپاشی کے سرمایہ کے مصارف	۲٫۳۱	—	—	-٫۶۰	—	—	—	۰٫۱۴	—	—	۰٫۰۴	—	۱٫۶۸
قرضہ کی خدمات	-۰٫۸۶	۱۴۲٫۴۵	۲۸٫۱۵	۹۱٫۵۲	۱۳٫۲۸	۲۸٫۵۶	۵٫۸۶	۹٫۹۴	۰٫۹۳	۱۹٫۸۲	-۰٫۹۱	۶٫۶۴	۲۹۸٫۴۴
غیر فوجی نظم و نسق انتظام عام	۲۶۱٫۳۸	۱۰۰٫۶۲	۱۳۴٫۰۰	۱۴۳٫۴۰	۱۰۴٫۶۵	۹۹٫۰۳	۶۱٫۸۹	۶۶٫۴۰	۲۰٫۹۲	۲۸٫۴۱	۳۶٫۳۰	۳۰٫۹۳	۱۰۶۶٫۲۱
〃 انتظام عدالت	۹۲٫۲۹	۹۱٫۰۵	۹۶٫۳۸	۶۹٫۵۴	۵۱٫۹۳	۵۳٫۰۸	۳۴٫۸۹	۲۹٫۲۶	۶٫۴۴	۹٫۶۲	۹٫۳۸	۱۱٫۹۳	۵۲۲٫۲۳
〃 پولس	۱۵۸٫۰۴	۱۳۹٫۹۸	۲۲۶٫۸۲	۱۶۴٫۹۳	۱۲۵٫۵۳	۱۴۹٫۹۳	۶۹٫۹۱	۵۹٫۰۳	۳۲٫۴۴	۳۰٫۱۶	۲۱٫۸۸	۳۸٫۸۸	۱۲۱۸٫۰۳

۵۹۶

غیر فوجی نظم ونسق تعلیم	۲۵۵٫۶۱	۱۵۸٫۵۸	۱۳۱٫۵۲	۲۰۵٫۱۹	۱۵۷٫۱۷	۷۷٫۶۶	۶۸٫۷۶	۵۱٫۹۱	۲۱٫۲۸	۳۴٫۶۶	۲۵٫۴۵	۲۷٫۵۵	۱۲۱۸٫۸۶
" " طبابت	۹۰٫۶۰	۴۰٫۴۱	۴۹٫۴۵	۳۳٫۲۴	۴۴٫۸۳	۳۸٫۹۲	۲۰٫۸۲	۱۴٫۶۱	۹٫۹۹	۱۳٫۶۸	۷٫۸۲	۷٫۱۰	۳۶۰٫۷۷
" صحت عامہ	۲۳٫۷۶	۲۲٫۴۵	۳۴٫۲۸	۲۱٫۸۰	۱۰٫۹۹	۹٫۹۴	۱۰٫۰۰	۸٫۵۸	۱٫۳۳	۷٫۱۰	۲٫۰۰	۲٫۰۷	۱۴۹٫۸۹
" زراعت	۴۱٫۷۷	۲۱٫۸۴	۲۶٫۶۱	۳۶٫۱۷	۵۵٫۱۰	۱۷٫۰۳	۱۸٫۲۵	۱۵٫۹۷	۵٫۰۶	۷٫۸۹	۳٫۰۳	۷٫۸۸	۲۵۷٫۲۳
" صنعت	۲۲٫۴۰	۶٫۴۸	۱۴٫۳۳	۱۴٫۵۸	۱۴٫۳۳	۱٫۴۹	۸٫۶۸	۲٫۸۳	۰٫۱۵	۲٫۲۴	۱٫۴۶	۰٫۵۹	۸۹٫۵۶
" دوسرے محکمے	۸۵٫۵۳	۴۲٫۹۹	۵۱٫۴۴	۳۰٫۸۱	۳۳٫۱۲	۳۶٫۹۱	۱۹٫۶۲	۱۰٫۵۰	۱۰٫۴۱	۶٫۱۱	۳٫۰۷	۶٫۶۳	۳۲۸٫۰۴
میزان	۱۰۳۷٫۳۵	۵۹۴٫۱۰	۶۷۵٫۸۳	۷۱۹٫۶۵	۴۹۵٫۴۵	۴۸۰٫۹۹	۳۱۲٫۸۹	۲۵۰٫۸۰	۱۰۶٫۰۰	۱۳۹٫۹۸	۹۷٫۳۹	۱۲۳٫۵۶	۵۲۴۱٫۹۲
غیر فوجی کام	۱۳۴٫۲۸	۱۰۹٫۰۲	۹۳٫۱۸	۶۸٫۶۰	۱۵۵٫۵۰	۹۶٫۴۴	۴۳٫۲۷	۵۹٫۰۲	۳۳٫۹۴	۹۱٫۰۸	۱۵٫۴۵	۱۱٫۸۹	۸۹۸٫۷۹
متفرق	۱۵۵٫۰۳	۱۶۱٫۸۳	۱۱۲٫۷۲	۱۴۲٫۹۰	۱۳۳٫۰۶	۱۳۸٫۹۳	۹۵٫۲۷	۹۷٫۱۴	۱۹٫۷۴	۳۷٫۷۳	۱۴٫۹۲	۲۵٫۳۴	۱۱۲۴٫۹۳
مجموعی مصارف	۱۵۷۷٫۳۷	۱۱۹۹٫۴۷	۱۱۷۴٫۰۶	۱۲۹۶٫۲۶	۱۰۸۳٫۵۵	۸۹۸٫۶۸	۴۷۶٫۰۳	۴۸۱٫۲۵	۱۶۹٫۸۲	۲۹۲٫۱۷	۱۵۵٫۵۶	۳۶۰٫۰۴	۹۱۵۵٫۰۷
مجموعی محاصل	۱۵۵۸٫۰۴	۱۲۳۹٫۸۰	۱۲۱۴٫۳۹	۱۱۹۲٫۰۰	۱۱۲۷٫۰۹	۹۲۹٫۰۵	۴۵۷٫۹۳	۴۷۰٫۷۲	۱۶۵٫۳۳	۲۵۳٫۳۷	۱۷۰٫۳۶	۴۰۰٫۳۵	۹۲۳۳٫۷۷
ہر حکومت کی توفیر (+) یا خسارہ (–)	-۱۹٫۳۳	+۴۰٫۳۳	+۴۰٫۴۳	-۳۷٫۲۶	+۴۳٫۵۱	+۳۰٫۳۷	-۱۸٫۱۰	-۱۰٫۵۳	-۴٫۴۹	-۳۸٫۷۹	+۱۴٫۸۰	+۴۰٫۳۱	+۷۸٫۷۰

۵۹۶

جدول (۴) [۱]

صوبہ جاتی میزانیے ۳۱-۱۹۳۰ء ۳۶-۱۹۳۵ء اور ۳۷-۱۹۳۶ء میں (لاکھ روپے میں)

		مدراس	بمبئی	بنگال	صوبۂ متحدہ	پنجاب	بہار و اڑیسہ	صوبۂ متوسط	آسام	شمال مغربی سرحدی صوبہ
آبادی (ملین کے حساب سے) ۱۹۳۱ء		۴۶و۷	۲۱و۹	۵۰و۱	۴۸و۴	۲۳و۶	۳۷و۷	۱۵و۳	۸و۶	۲و۴
۱۹۳۱ء	محاصل	۱۶و۸۴	۱۳و۸۱	۹و۸۶	۱۱و۹۷	۱۰و۵۶	۵و۲۶	۴و۷۰	۲و۴۴	—
	مصارف	۱۷و۹۰	۱۵و۶۳	۱۱و۴۱	۱۲و۸۸	۱۰و۹۹	۶و۰۶	۵و۱۴	۲و۷۹	—
	گھاٹا	-۱و۰۶	-۱و۸۱	-۱و۷۵	-۹۱	-۴۳	-۷۹	-۴۴	-۳۵	—
۳۶-۱۹۳۵ء مرمہ موازنہ:	محاصل	۱۵و۷۲	۱۴و۸۰	۱۱و۴۳	۱۱و۷۹	۱۰و۴۶	۵و۵۴	۴و۵۶	۲و۳۶	۱و۷۰ [۲]
	مصارف	۱۶و۰۴	۱۵و۰۸	۱۱و۳۸	۱۱و۸۴	۱۰و۵۷	۵و۶۱	۴و۸۱	۲و۸۳	۱و۷۶
	گھاٹا	-۳۲	-۲۸	-۱۵	-۵	-۱۱	-۷	-۱۵	-۴۷	-۶

[۱] دیکھو مالی تحقیقات کی رپورٹ از سر آٹو نیمیر صفحہ ۲۸ -

[۲] اس میں حکومت ہند کی مالی امداد شامل ہے -

۵۹۶

	مدراس	بمبئی	بنگال	صوبۂ متحدہ	پنجاب	بہار	صوبۂ متوسط	آسام	شمال مغربی سرحدی صوبہ	اوڑیسہ	سندھ
آبادی جدید حدود (ملین کے حساب سے) ۱۹۳۶ء ۱۹۳۷ء کے پیش کردہ اندازے۔	۴۴٫۶	۱۸٫۰	۵۰٫۱	۴۸٫۴	۲۵٫۶	۵۲٫۴	۱۵٫۳	۸٫۶	۲٫۴	۸٫۳	۳٫۹
محاصل	۱۵٫۹۰	۱۲٫۰۴	۱۱٫۴۹	۱۱٫۷۱	۱۰٫۸۰	۴٫۷۰	۴٫۸۱	۲٫۳۶	۱٫۶۰ [له]	۱٫۶۵ [له]	۳٫۱۳ [له]
مصارف	۱۵٫۹۰	۱۲٫۰۳	۱۱٫۹۱	۱۳٫۴۵	۱۰٫۷۸	۴٫۸۲	۴٫۹۰	۳٫۰۰	۱٫۷۰	۱٫۶۵	۳٫۱۳
بچت یا گھاٹا	-	+۱	-۴۲	-۷۴	+۲	-۱۲	-۹	-۶۳	-۱۰	-	

له۔ اس میں حکومت ہند کی مالی امداد شامل ہے۔

جدول (۱) سے ظاہر ہے کہ صوبہ جات میں مصارف کی مقدار میں معتدبہ اضافہ ہوگیا ۵۹۸
ہے۔ سنہ ۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۴ء اور سنہ ۱۹۲۸ء تا ۱۹۲۹ء کے درمیان جو اضافہ ہوا وہ ۲۲۵ فیصد سے کم نہیں، حالانکہ اس کے مقابلے میں آمدنی میں صرف ۴ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ صوبہ جاتی مصارف میں مسلسل اضافہ صوبہ جاتی چندوں کی معافی کی وجہ سے ممکن ہوا، گو اس کا فائدہ صرف چند ہی صوبوں کی حد تک محدود تھا۔ سنہ ۱۹۳۰ء یا ۱۹۳۱ء سے جہاں صوبہ جاتی آمدنیوں میں مسلسل شدید کساد بازاری کی وجہ سے کمی ہوگئی اس کے مقابل مصارف میں کوئی تخفیف نہیں ہوئی۔ اس لیے خسارے کے سالوں کا نمودار ہونا اٹل تھا۔ بہر کیف حالیہ سالوں میں بعض صوبوں میں صورت حال کی اصلاح ہو چکی ہے۔

جدول (۲) اور (۳) سے سنہ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں متعدد صوبہ جاتی حکومتوں کے محاصل و مخارج کی تفصیل دی گئی ہے۔ اس سے مختلف صوبوں میں مدات آمدنی و خرچ کی اضافی اہمیت بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ جدول (۴) پر ایک نظر ڈالی جائے تو سنہ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء اور سنہ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں صوبہ جاتی میزانیوں (جن میں جدید قائم کردہ صوبہ جات اوڑیسہ اور سندھ کے میزانیے بھی شامل ہیں) کا حال معلوم ہوگا۔ نیز تقابلی و موازنے کے لیے آبادی کے اعداد بھی دیے گئے ہیں۔ یہ جدول ان مالیاتی انتظامات پر غور کرنے میں مفید ثابت ہوگی جن کی سفارش سر آٹو نیمیر نے کی ہے۔

مقامی مالیات

۵۳۔ مقامی (دیہی) مجالس۔

چونکہ برطانوی ہند کی آبادی کا تقریباً ۹۰ فیصد حصہ دیہی رقبہ جات میں سکونت گزیں ہے، لہٰذا ان مجالس بلدیہ کے مقابلے میں جو تعدادی اعتبار سے غیر اہم شہری آبادی کی خدمت انجام دیتے ہیں، ضلع واری اور تحت ضلع واری مجالس کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ایک زمانہ تھا جب کہ اراضی پر صوبہ جاتی محصولات یا زاید محاصل مرکزی حکومت کے میزانیہ میں ایک اہم مد کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن آج کل ضلع واری اور مقامی مجالس کے مالیوں کا ایک معتدبہ حصہ انہی پر مشتمل ہے۔ چنانچہ بمبئی میں مجموعی آمدنی کے مقابلے

میں ان کا تناسب ۲۵ فیصد ہے ۔ اور یہ تناسب بڑھتے بڑھتے بہار اور اوڑیسہ میں
۱۹۲۲ء-۱۹۲۳ء میں ۴۳ فیصد تک ہوگیا ۔ پہلے پہل ان کی ابتدا ۱۸۶۵ء اور
۱۸۶۹ء کے درمیان بمبئی اور مدراس کے درمیان ہوئی تھی اور یہ سڑکوں کی تعمیر و ترمیم، مدارس
اور دواخانوں کی نگہداشت، دیہی حفظ صحت اور دیگر مقامی مصارف کے اغراض کے
تحت اراضی پر عاید کیے گئے تھے ۔ لارڈ میو کی مالیاتی لامرکزیت کی اسکیم کی بموجب
اس اصول کو وسعت دی گئی ۔ ۱۸۷۱ء میں قوانین پاس کیے گئے جن کی رو سے بنگال
صوبہ جات متحدہ اور پنجاب میں اسی قسم کے محاصل عاید کیے گئے ۔ پنجاب اور اودھ میں جو محاصل
سڑکوں، مدارس اور ضلع واری ڈاک کے لیے بندوبست مالگزاری کے وقت متعین
کیے گئے تھے وہ مذکورہ جدید محصولوں کے ساتھ ساتھ جاری رہے ۔ اسی قسم کے محاصل
بندوبست صوبہ جات متوسط، برما اور آسام میں بھی جاری کیے گئے تھے جنکی جگہ بعد
میں چل کر ایک عام محصول نے لے لی ۔ ۱۸۷۱ء اور ۱۹۰۵ء کے درمیان شہنشاہی اغراض
کے تحت بعض محاصل کا اضافہ کیا گیا ۔ ۱۸۷۸ء میں بیمہ قحط فنڈ قائم کیا گیا جس کے ساتھ ساتھ ۵۹۹
بعض صوبوں میں صوبہ جاتی اغراض کے تحت محاصل کا اضافہ کیا گیا جس کا خاص مقصد دیہی
عہدہ داروں کو تنخواہیں دینا تھا ۔ حکومت ہند کی مالی حالت میں اصلاح و ترقی کی وجہ
سے ۱۹۰۵ء-۱۹۰۶ء میں ان تمام محاصل کو برخاست کرنا ممکن ہوگیا جو دیہی اغراض
کے علاوہ دوسرے اغراض کے تحت عاید کیے گئے تھے ۔ بعض صورتوں میں اس اصلاح سے عاید کردہ محاصل کی مقدار
میں کوئی تخفیف نہیں کی گئی بلکہ ان کی آمدنی کو صوبہ جاتی اغراض سے نکال کر دیہاتی اغراض
میں منتقل کر دیا گیا اور اس کا معاوضہ صوبہ جاتی حکومتوں کو خزانۂ شاہی سے ملنے لگا ۔ حال
میں بعض صوبوں میں عام محصول میں اضافہ کرنے یا جیسا کہ مدراس میں ہوا مخصوص مقامی اغراض
جیسے ابتدائی تعلیم کے لیے نئے محاصل عاید کرنے کی جانب ایک رجحان پیدا ہوگیا ہے ۔

یہ مقامی محاصل کس اصول سے عاید کیے جاتے ہیں اس کا انحصار ہر مقام کے طریقۂ مالگزاری
پر ہے ۔ چنانچہ بمبئی، مدراس، برما، صوبہ جات متوسط و برار کے رعیت واری رقبہ جات
اور آسام کے ہنگامی بندوبست کے رقبہ جات میں مذکورہ محصول، مالگزاری کے لحاظ سے عاید
کیا گیا ہے ۔ اس کے برخلاف صوبہ جات متحدہ اور پنجاب میں اراضی کی سالانہ آمدنی نیز
دگنی مالگزاری کو بطور اصول ملحوظ رکھا جاتا ہے ۔ دوامی بندوبست کے رقبہ جات میں

زرلگان یا رقبۂ اراضی کو بطور اصول تسلیم کیا گیا ہے۔ جہاں تک کہ مذکورہ محاصل کی شرحوں کا تعلق ہے انھیں صوبہ جاتی مجالس مقننہ کی جانب سے قایم کردہ بیشترین و کمترین حدود کے تحت مقامی مجالس کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ محاصل اراضی محصول مالگزاری کے ساتھ وصول کیے جاتے ہیں لیکن ان کا انتظام زیادہ تر مقامی مجالس کرتی ہیں۔ ان کی شرحیں مالگزاری کے $6\frac{1}{4}$ فیصد اور $12\frac{1}{2}$ فیصد کے درمیان بدلتی رہتی ہیں[1] محصول اراضی اگرچہ کہ یکساں شرح پر عاید ہونے سے ادائی کی قابلیت سے مناسبت نہیں رکھتا، تاہم یہ ہر جگہ مناسب و موزوں محصول کے طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے، اس لیے کہ اسے ان جایدادوں کے فایدے کے لیے صرف کیا جاتا ہے جو مقامی مجالس کے کاموں سے مستفید ہوتی ہیں۔ محصولات کی تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشات کا حوالہ دیا جا چکا ہے کہ محصول مالگزاری کی شرح گھٹا کر معیاری بنا دینا چاہیئے تاکہ مقامی محاصل کے عاید کرنے کے لیے نسبتاً زیادہ گنجایش چھوڑی جاسکے[2]۔

مندرجۂ ذیل جدول سے برطانوی ہند کے ضلع واری اور مقامی مجالس کے خاص ذرایع آمدنی و مدات خرچ اور مجموعی مداخل و مخارج واضح ہوتے ہیں[3]:—

---

[1] ۔ لے ٹن رپورٹ کے بموجب بیشترین شرح محصول (جو بعض صوبوں میں ایک روپے میں ایک آنہ رہی ہے اور پچاس سال سے زیادہ کا عرصہ ہوتا ہے غیر متغیر رہی) برقرار رکھنے کے لیے کوئی عذر باقی نہیں ہے کیونکہ (۱) محصول مالگزاری خاصکر دوامی بندوبست کے رقبہ جات میں خالص پیداوار کے کسی بڑے تناسب کو ظاہر نہیں کرتا اور (۲) اراضی پر دیگر تمام محاصل برخاست کیے گئے ہیں دیکھو سائمن کمیشن رپورٹ فقرہ ۲۷۵ ۔

[2] ۔ دیکھو جلد اول بارھواں باب فصل ۳۵ ۔

[3] ۔ یہ اعداد ۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۶ء اور ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں علی الترتیب ۲۴۴ اور ۱۰۹۸ مجالس (جن میں مدراس کے اتحادی مجالس پنچایت شامل ہیں) کی مجموعی آمدنی اور خرچ کی کیفیت پیش کرتے ہیں۔ دیکھو "گوشوارۂ اعداد و شمار برائے برطانوی ہند" Statistical Abstract for British India ۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۴ء و ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء ۔

لاکھ روپے میں ۶۰۰

مصارف	سنہ ۱۹۱۵ء سنہ ۱۹۱۶ء	سنہ ۱۹۳۴ء سنہ ۱۹۳۵ء	آمدنی	سنہ ۱۹۱۵ سنہ ۱۹۱۶	سنہ ۱۹۳۴ء سنہ ۱۹۳۵ء
تعلیم	۱و۸۲	۶و۰۸	صوبہ جاتی محاصل	۳و۳۹	۵و۳۹
کارہائے غیر فوجی	۴و۱۶	۴و۰۵	غیر فوجی محاصل	۱و۴۳	۲و۰۶
صحت عامہ و ہسپتال وغیرہ	۷۰	۴و۰۱	دوسرے ذرائع	۲و۶۸	۸و۷۲
قرضہ و متفرق	۱و۳۲	۳و۷۸	میزان	۷و۵۰	۱۶و۱۷
میزان	۸و۰۰	۱۵و۹۲	تعدیہ فی کس	ر-آ-پ ۰-۵-۱	ر-آ-پ ۰-۹-۸

مندرجۂ بالا جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۱۵ء و سنہ ۱۹۱۶ء سے سنہ ۱۹۳۴ء و سنہ ۱۹۳۵ء تک آمدنی میں ۷۰۵۰ کروڑ روپے سے ۱۶۷۱۷ کروڑ روپے تک اضافہ ہوا۔ لیکن چونکہ اس آمدنی کو ۱۰۹۵ مجالس کے درمیان تقسیم کرنا ہوتا ہے اس لیے ایک اوسط درجے کی عام مجلس کی تنگ دستی صاف طور پر نمایاں ہو جاتی ہے۔

۵۴۔ بلدی مالیات

صفحہ ۶۰۱ پر جدول کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ بلدی مجالس کی آمدنی کا خاص ذریعہ مقامی محاصل اور عام محاصل ہیں جو جملہ بلدی آمدنیوں کے تقریباً دو تہائی پر مشتمل ہیں۔ بقیہ ایک تہائی حصہ بلدی املاک، صوبہ جاتی مالیوں میں سے چندہ اور متفرق ذرائع سے حاصل کیا جاتا ہے۔ جن محاصل کو مقامی ارباب اقتدار عاید کرتے ہیں انھیں چار ابواب کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) تجارت پر محاصل مثلاً محاصل کروڑگیری، محاصل میعادی، محصول راہداری وغیرہ۔
(۲) املاک پر محاصل جیسے امکنہ اور ان کی جائے تعمیر پر محاصل (اور دیہی رقبہ جات میں اراضی پر محصول)۔ (۳) اشخاص پر محاصل مثلاً تقاریب، پیشوں، کاروبار، دھندوں، زائرین،

ادنیٰ اور گھریلو ملازمین وغیرہ پر محاصل اور (۴) فیس اور اجازت نامے۔ فیس یا تو ان خاص خدمات کے معاوضے میں لی جاتی ہے جنھیں بلدی مجالس انجام دیتی ہیں جیسے خاکروبی کی فیس یا محاصل تعیشات کی نوعیت رکھتی ہے یا ایک حد تک نگرانی کے اغراض کے تحت عاید کی جاتی ہے، مثلاً موسیقی، گاڑیوں، کتوں اور دیگر جانوروں وغیرہ کے لیے اجازت نامے۔ گروہ اور پُرخطر پیشوں کے لیے بھی لائیسنس فیس لی جاتی ہے۔ محاصل کی تحقیقاتی کمیٹی نے بتلایا کہ بالواسطہ محاصل جیسے تجارت پر کروڑگیری کی شکل میں محاصل، میعادی محاصل اور محصول چنگی کے بارے میں کافی حد تک احتیاط کی ضرورت ہے تاکہ بین الصوبہ جاتی ذرایع آمد ورفت میں نامناسب خلل اندازی کو روکا جاسکے۔ کروڑگیری اور میعادی محاصل پر خاص طور پر اعتراض کیا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ تمام اصول ٹیکس کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور ان کی بجائے چلر فروشیوں اور پیشوں پر محاصل کو بطور بدل پیش کیا جاتا ہے۔ بہرکیف محاصل کروڑگیری کے موجودہ طریق کار میں منصفانہ طور پر رد و بدل کی ضرورت ہے۔ کمیٹی مذکور کی دوسری اہم تجویز اس بات کی تائید میں ہے کہ شہری املاک پر جو بڑی حد تک کارہائے بلدیہ سے مستفید ہوتے ہیں بڑھی ہوئی شرح سے محصول عاید کیا جائے۔ لیکن محصول متعین اور وصول کرنے کے لیے جو طریق کار ہو وہ اس غرض کے لیے آج کل کے مقابلے میں بہت
زیادہ کارگر ہونا چاہیئے۔ سب سے گرانبار مدات خرچ جیسا کہ نیچے کی ۶۰۱
جدول سے ظاہر ہے، صحت و آسایش عامہ، تعمیرات عامہ و تعلیمات ہیں۔ آبرسانی، کارہائے بدررو وغیرہ جیسے بڑے منصوبوں کی تکمیل کے لیے بلدی مجالس اکثر اس قابل نہیں ہوتیں کہ معمولی آمدنیوں سے اپنے مصارف پورے کرلیں بلکہ انھیں عام طور پر یا تو حکومت سے یا کھلے بازار میں روپیہ قرض لینا پڑتا ہے۔ بمبئی کی مجلس بلدیہ کے قرضے سب سے بڑے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کے قرضے کی ذمہ داریاں ۳۱ مارچ ۱۹۳۷ء کو ۶،۵ کروڑ روپے تک تھیں۔

برطانوی ہند کے بلدی مجالس کی مالی حالت کی صراحت ذیل کی جدول سے ہوتی ہے۔لہ

لاکھ روپے میں

مدات آمدنی	۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۶ء	۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء	مدات خرچ	۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۶ء	۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء
بلدی محاصل و ابواب	۱ر۴۵	۱ر۴۹	عام نظم و نسق اور محصول جمع کرنے کے مصارف	۷۶	۱ر۷۷
مکان اور اراضی پر محصول۔	۱ر۸۷	۵ر۳۰			
جانوروں اور گاڑیوں پر محصول	۲۱	۴۷	تحفظ عامہ :۔ بجلی	۷ر۴۳	۱ر۱۹
پیشوں اور دھندوں پر محصول	۱۸	۳۲	ایضاً پولس	۴ر۵۰	۱
سڑکوں اور بجروں پر محصول	۱۷	۲۴	ایضاً۔ آتش فرو انتظام وغیرہ	۱ر۹	۱۵
محصول آبرسانی	۹۷	۰۷ر۲	میزان	۲ر۵۳	۱ر۳۵
بجلی کا محصول	۱۵	۲۶	صحت و سہولت عامہ :۔ آبرسانی، بدررو اور صفائی	۳ر۳۲	۴ر۸۵
صفائی کا محصول	۶۱	۲۰ر۱			
دیگر محاصل	۱۹	۱ر۷۹	دواخانے، شفاخانے اور ٹیکہ اندازی۔	۵۰	۹۴
میزان	۵ر۸۰	۱۳ر۱۴			
خصوصی قوانین کے تحت تحصیلات	۱۱	۱۷	مانع طاعون انتظامات، بازار، چمن بندی و آرایش	۵۰	۹۵
حکومت کی طرف سے عطیے	۸۴	۹۵			
اراضی اور مکانوں وغیرہ کا کرایہ	۴۷	۹۴			
فیس	۳۸	۱ر۰۲	تعمیرات عامہ	۱ر۴۲	۲ر۰۶
بازاروں اور مسلخوں کی آمدنی	۴۷	۹۴	تعلیمات	۹۲	۲ر۲۵
دیگر ذرائع و متفرق آمدنی	۸۵	۱ر۴۵	عام اغراض کے لیے چندہ	۲۶	۷۷
مجموعی آمدنی	۸ر۹۷	۱۹ر۱۸	متفرق :۔ قرضوں کا سود	۷۷	۱ر۷۰
غیر معمولی آمدنی اور قرضہ	۹ر۴۰	۱۹ر۸۹	متفرق :۔ دیگر متفرق مصارف	۴۳	۱ر۱۹
صدر میزان	۱۱ر۱۵	۳۸ر۰۸	مجموعی مصارف	۲ر۹۱۲	۸۳ر۱۷
فی کس تعدیہ	ر - آ - پ	رو - آ - پ	غیر معمولی مصارف اور قرضہ	۰ر۹۳۳	۷۷ر۱۹
(۱) محاصل و ابواب	۹ - ۵ - ۳	۰۰ - ۱۲ - ۵	صدر میزان	۲ر۴۵ر۱۵	۶۰ر۳۷
(۲) مجموعی آمدنی بشمول غیر معمولی آمدنی	۳ - ۰ - ۵	۳ - ۱۵ - ۷			

لہ۔ یہ اعداد ۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۶ء اور ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں علی الترتیب ۷۱۴ اور ۷۹۰ بلدیوں کی مجموعی آمدنی اور خرچ کو ظاہر کرتے ہیں۔ دیکھو "گوشوارۂ اعداد و شمار برائے برطانوی ہند ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء جدول نمبر ۳۴ و ۳۵"۔

۶۰۲ چونکہ اوپر کی جدول میں جو مجموعی آمدنی بتلائی گئی ہے وہ ۹۴۰ بلدی مجالس میں منقسم ہے، لہٰذا یہ بدیہی ہے کہ ہندوستان میں ایک عام اوسط درجے کی بلدی مجلس وسائل کے اعتبار سے بہت تہی دست ہوگی۔ البتہ صرف مجلس بلدیہ بمبئی کی آمدنی ۳ کروڑ روپے سے زیادہ ہے اور مجلس بلدیہ کلکتے کی آمدنی ½۲ کروڑ روپے سے زیادہ ہے۔ باوجودیکہ مجالس بمبئی اور کلکتہ مالیے کی مقدار کے لحاظ سے اس ملک کی ایک عام بلدی مجلس کے مقابلے میں بہت ارفع و اعلیٰ ہیں، تاہم گلاسگو جیسے شہر کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے جس کی آبادی گو کہ کلکتے کی آبادی کے تقریباً برابر ہے لیکن اس کی آمدنی کلکتے کی آمدنی سے بارہ گنا زیادہ ہے۔

۵۵۔ مقامی مجالس کے ناکافی وسائل

یہاں اس کی ضرورت نہیں ہے کہ لارڈ میؤ کے زمانے میں ہندوستان میں مقامی حکومت خود اختیاری کے آغاز سے لے کر اب تک اس کی ترقی کی کیفیت پیش کی جائے۔ حالیہ زمانے میں مقامی حکومت خود اختیاری کی انجمنوں، شہری بلدیوں اور دیہی مجالس کی جو مالی حیثیت رہی اس پر بحث کرنے کی حد تک اکتفا کریں گے۔ اصلاحات کے نفاذ اور وزرا کو مقامی حکومت اختیاری کی منتقلی کے ساتھ مقامی مالیات کے مسئلے نے بہت نمایاں حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ان امور کا لحاظ کرتے ہوئے کہ اقتدارات مقامی انجمنوں کو منتقل کر دیئے گئے ہیں اور فرایض کا ایک وسیع دائرہ جیسے صحت عامہ، تعلیمات وغیرہ بلدی مجالس، دیہی مجالس اور پنچایتوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے، ان انجمنوں کے وسائل فی الحال بالکل ناکافی ہیں۔ ان کے لیے جدید معیارات نظم و نسق کا رائج کرنا ناممکن ہے جب تک کہ ان کی بنا ایک وسیع تر مالیاتی اساس پر نہ رکھی

جائے[1]۔ جدید دستور (سنہ ۱۹۱۹ئہ اور ۱۹۳۵ئہ) کے تحت مقامی انجمنوں سے مطالبہ یہ ہے کہ وہ ان خدمات کے مصارف برداشت کریں جو سابق میں مختلف سررشتہ جات سے متعلق رکھنے والے ملازمین سرکار کی جانب سے مفت انجام دیئے جاتے تھے علاوہ ازیں جوشش اور ولولے کی پہلی رو میں مقامی انجمنوں نے اس بات کو فراموش کردیا کہ "وہ تمام کاموں کا انحصار مالیات پر ہے"[2] اور تعلیم، طبّی امداد وغیرہ کی گراں خرچ اور عظیم الشان اسکیمیں جاری کردیں جو ان کی قدرت سے باہر تھیں۔ اس طرح جو مالی دشواریاں پیدا ہوئیں ان کا مقابلہ حال میں جزوی طور پر تخفیف مصارف سے اور جزوی طور پر مزید محاصل عاید کرکے اور کچھ موجودہ وسائل کو زیادہ احتیاط کے ساتھ تقسیم کرکے کیا گیا ہے۔

۵۶۔ وسائل کے ناکافی ہونے کے اسباب

لوگوں میں ادائیِ محصول کی قوت کا کم ہونا اور مقامی اغراض کے لیے خود پر محصول عاید کرلینے پر ان کی مبینہ ناراضامندی کے قطع نظر دوسرا اہم عامل جس سے مقامی وسائل کے ناکافی ہونے کی وضاحت ہوتی ہے ۶۰۳
وہ مرکزی، صوبہ جاتی اور مقامی ارباب اقتدار

---

[1] ہماری مقامی مجالس کی تنگدستی دوسری جگہ کی اسی قسم کی مجالس کے کثیر وسائل کے مقابلے میں نمایاں طور پر بحالت تضاد نظر آتی ہے۔ مثلاً جیسا کہ سائمن کمیشن نے بتلایا ہے سنہ ۱۹۲۷ء سنہ ۱۹۲۸ئہ میں برطانوی ہند میں تمام قسم کے (شہری و دیہی) محاصل سے تقریباً ۱۲½ ملین پونڈ حاصل ہوئے جو اس آمدنی سے صرف کسی قدر زیادہ ہے جو اسی سال تنہا لندن کونٹی کونسل کو محاصل سے وصول ہوئی" (سائمن کمیشن رپورٹ جلد اول فقرہ ۳۷۷)

[2] یہ کوتلیا کا مقولہ ہے جسے محاصل کی "تحقیقاتی کمیٹی نے بطور اصول عمل کے اختیار کیا ہے۔

کے درمیان آمدنیوں کی ناواجبی تقسیم ہے۔ انگلستان میں اراضی سے حاصل شدہ آمدنی کا بیشتر حصہ مقامی مجالس کو دیا جاتا ہے اور مرکزی حکومت صرف ایک قلیل مقدار بطور محصول اراضی حاصل کرتی ہے۔ ہندوستان کی مقامی مجلسوں کی مالی کمزوری کے وجوہ میں سے ایک یہ ہے کہ مذکورہ مقامی مجالس کی نشوونما اقتدارات کی منتقلی کے ذریعے ہوئی ہے نہ کہ طاقتور نیم آزاد اور نسبتہً چھوٹی چھوٹی وحدتوں کے بڑی سیاسی وحدتوں کے ساتھ وفاق قائم کرنے سے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ عام طور پر مقامی مجالس کی عملداری اتنے وسیع علاقے پر حاوی ہوتی ہے کہ وہ انھیں محصول ادا کرنے والوں کے ساتھ موثر طور پر ربط قائم کرنے نہیں دیتی اگر یہ بات نہ ہوتی تو دیہاتوں میں مقامی مجالس کی جانب سے مکانوں اور اشخاص پر محصول عائد کرنا نسبتہً آسان ہوتا۔ اس نقطۂ نظر سے دیہی پنچایتوں کے اثر ورسوخ کو واپس لانے اور فی الحال جو مجالس کام کر رہی ہیں۔ ان کے فرائض کو محدود کرنے کی خواہش بجا ہوگی۔

۵۸ - وسائل کی ترقی

اگرچہ کہ لامرکزیت کے کمیشن کی سفارشات اور اصلاحات کے نفاذ (۱۹۱۹ء) کی وجہ سے مقامی ارباب اقتدار کو قابل لحاظ مالی آزادی عطا کی گئی ہے۔ لیکن جہاں تک کہ عائد کردہ محاصل کی نوعیت کا تعلق ہے کوئی مادی تبدیلی عمل میں نہیں لائی گئی سوائے اس کے کہ جو محاصل حکومت ہند کی منظوری کے بغیر عاید کیے جا سکتے ہیں ان کی صراحت قواعد محاصل درج فہرست[1] میں کی گئی ہے۔ مقامی مجالس کے وسائل میں اضافہ کرنے کی غرض سے محاصل کی تحقیقاتی کمیٹی نے حسب ذیل

[1] Scheduled Taxes rules

[1] ان قواعد کے تحت جو محاصل درج فہرست، مقامی ارباب اقتدار کی جانب سے عاید کیے جا سکتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔ محاصل چنگی، اراضی اور اراضی کی قیمتوں پر محاصل، عمارات، گاڑیوں، کشتیوں، جانوروں، ادنیٰ ملازمین اور گھریلو ملازمین پر محاصل، کروڑ گیری اور میعادی محاصل، ان اشیاء پر محاصل جو کسی مقامی رقبے میں درآمد اور وہاں سے برآمد کیے جاتے ہیں، کاروبار، پیشوں اور دھندوں پر محاصل، خانگی بازاروں پر محاصل، وہ محاصل جو خدمات کی انجام دہی کے صلے میں ادا کیے جاتے ہیں جیسے محصول آبرسانی اور محصول ڈرینیج اور بازاروں اور دیگر آسایش عامہ کی چیزوں کے استعمال کی فیس۔

سفارشات کی ہیں :-
(۱) " تھاتھامیڈا "[1]، شخصی محصول اور " چوکیداری " کو مقامی آمدنی کے ذرایع میں
تبدیل کرنا چاہیئے۔ (۲) محصول مالگزاری کی شرح گھٹا کر مقرر کرنی چاہیئے تاکہ مقامی محاصل عاید
کرنے کے لیے زیادہ گنجایش نکل سکے۔ (۳) جو رقم صوبہ جاتی حکومتوں کو قصبات میں زمین
کے کرایوں اور غیر زرعی اراضی کے محاصل میں اضافے کی وجہ سے وصول ہوتی ہے اس کا
ایک حصہ مقامی مجالس کو دیا جائے۔ (۴) بلدی مجالس کو اشتہارات پر محصول عاید کرنے کا اختیار
ہونا چاہیئے۔ (۵) محاصل تفریحات و شرط بازی کے دائرے کو وسیع کرنا اور اس کی آمدنی
کا ایک معتد بہ حصہ مقامی مجالس کے حوالے کرنا چاہیے۔ (۶) تقاریب، املاک اور پیشوں
پر عاید کردہ محاصل کے انتظام کی توسیع و اصلاح کی جائے۔ (۷) موٹر گاڑیوں پر عاید کردہ
محصول ورآمد میں تخفیف ہونی چاہیئے اور صوبہ جاتی حکومتوں کو موقع دینا چاہیے کہ وہ
بجائے محاصل جنگی کے صوبہ جاتی محصول مقامی مجالس میں تقسیم کرنے کے لیے عائد کریں۔
(۸) منتخب رقبوں میں مقامی مجالس کو اس کا اختیار دینا چاہیے کہ وہ شادیوں کی رجسٹری کے
٦٠٤ لیے فیس عاید کریں۔ (۹) مقامی ارباب اقتدار کے وسائل کی کمی کا تکملہ امدادی رقوم کے
ذریعے کیا جائے جو معمولاً قومی اہمیت رکھنے والی خدمات کے لیے مختص ہوں اور اس طرح
عطا کی جائیں کہ صوبہ جاتی حکومت کارکردگی کا لزوم عاید کر سکے[2]۔ مقامی مجالس کے وسائل میں
اضافہ کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بلدی کاروبار کو وسعت دیجائے تاکہ محاصل کی موجودہ
محتاجی کم ہو جائے۔ مذکورہ مقامی محاصل کی نسبۃً غیر تغیر پذیری کے پیش نظر یہ مناسب معلوم
ہوتا ہے کہ آیندہ کے لیے غیر محاصلی ذرایع سے نسبۃً زیادہ استفادہ کیا جائے۔ مغربی ممالک
میں بلدی دائرہ عمل زمینداری اور تجارتی و صنعتی کاروبار کی شکل میں روز بروز وسیع ہو رہا ہے
اور وہاں بلدی ٹراموے، کارہائے آبرسانی، کارہائے گیس و برق، قبرستان اور
غسل خانے، ماہی شکارگاہیں، گودیاں، گرنیاں کارخانے، نانبائی کی دکانیں، تھیٹر،
سرائے، ریستوران، شیرخانے وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام کاروبار نہ صرف

[1] برما میں Thathameda اراضی پر عام محصول کو کہتے ہیں۔
[2] دیکھو محاصل کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۱۹۴ تا ۱۹۶۔

شہری آبادی کی موثر طور پر خدمت انجام دے رہے ہیں بلکہ وہ بلدی مجالس کے لیے بھی ایک اہم و گرانقدر ذریعۂ آمدنی ہیں[1]۔ مقامی مالیات کے اس پہلو سے ہندوستان میں بالکل تغافل برتا گیا ہے اور مقامی مجالس کے لیے یہ بات نہایت کارآمد ہوگی کہ وہ اس کے امکانات کی چھان بین کریں تاکہ وہ اپنے قلیل وسائل اور شہری زندگی کی لطافتوں میں اضافہ کرسکیں۔

[1] ۔ دیکھو شاہ اور بہادر جی کی کتاب "ہندوستانی بلدیات کے فرائض و مالیات" صفحہ ۴۲۴۔

بارھواں باب

بے روزگاری

۶۰۵

ا۔ اس باب کی وسعت

مغربی ممالک کے صنعتی انقلاب نے جو معاشی نظام پیدا کیا ہے اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ صنعتی مزدور بے روزگار رہتے ہیں۔ ان ملکوں میں کم و بیش اس خرابی کو دور کرنے کے لیے بے روزگاری کا بیمہ، الاونس، غریبوں کا امدادی فنڈ وغیرہ جیسی بعض تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ لیکن بے روزگاری کے بنیادی سبب کو دور کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ یہ بنیادی سبب پیدائش و صرف دولت کی باہمی عدم مطابقت ہے جو دنیا کے بازاروں کے لیے مسابقتی پیدائش کے موجودہ انفرادی نظام کا جزو لاینفک ہے۔ مابعد جنگ صنعتی کساد بازاری سے اتنے بڑے پیمانے پر بے روزگاری پیدا ہوئی ہے کہ اس سے قبل نظیر نہیں ملتی، اور باوجودیکہ یہ خرابی جس پیمانے پر رونما ہوئی ہے اس کی کوئی نظیر ماضی میں نہیں ملتی، صنعتی بے روزگاری سے مغربی دنیا کو اکثر سابقہ ہوا ہے۔

ہندوستان کی حد تک بے روزگاری کے متعلق جو مسایل ہیں ان کا حل کرنا بھی اگرچہ بہت مشکل ہے لیکن ان کی نوعیت مغربی ممالک کے مقابلے میں کسی قدر مختلف ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ یہاں آبادی کی بڑی اکثریت کا انحصار زراعت پر ہے اور پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ہندوستان کے اکثر حصوں میں کساد بازاری کے زمانے میں سال کے پانچ سے لے کر

نو مہینے تک زراعت میں موسمی بے کاری رہتی ہے۔ چنانچہ اس مسئلے پر بحث کی جا چکی ہے کہ اس غیر اختیاری بے کاری کے زمانے میں کسان کو مصروف رکھنے کے لیے کون کون سی ضمنی و ذیلی صنعتیں موزوں ہیں۔ لیکن مسئلہ بے روزگاری کا اس سے زیادہ نازک پہلو قحط یا خشک سالی کے وقتاً فوقتاً واقع ہونے کے سلسلے میں نمایاں ہوتا ہے جو بارش کے کم ہونے یا نہ ہونے کے باعث پیدا ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وسیع علاقے پر زرعی کاروبار جزوی یا کلی طور پر موقوف ہو جاتا ہے اور زرعی مزدوروں اور زراعت کی ذیلی صنعتوں میں کام کرنے والوں کی کثیر تعداد بے کار ہو جاتی ہے۔ بے روزگاری کی یہی سب سے زیادہ نازک شکل ہے جس سے ہندوستان دوچار رہتا ہے۔

زراعت کے علاوہ جو پیشے اور صنعتیں ہیں ان کی جانب توجہ کرتے ہوئے ہم مزدوروں کو دو گروہ میں تقسیم پاتے ہیں۔ ایک تو دستی یا جسمانی محنت کرنے والے، دوسرے دماغی کام کرنے والے اور محرر جو نام نہاد تعلیم یافتہ متوسط طبقے پر مشتمل ہیں۔ صنعتی مزدوروں کی اول الذکر قسم کی حد تک ظاہر ہے کہ اگرچہ ان میں بے روزگاری مفقود نہیں ہے پھر بھی اس پیمانے پر نہیں پائی جاتی جیسی کہ مغرب میں، جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہماری صنعتی نشو و نما ابھی ابتدائی دور میں ہے۔ جدید صنعتیں جو کچھ بھی ہیں وہ عالمگیر کساد بازاری کے بھنور میں پھنسی ہوئی ہیں۔ اس لحاظ سے ہندوستان میں بھی خاصی صنعتی بیروزگاری پائی جاتی ہے۔ کارخانوں اور کرنیوں کے بند ہو جانے یا ان میں تخفیف مصارف عمل میں آنے کی وجہ سے اکثر ماہر اور غیر ماہر مزدور بے کار ہیں۔ لیکن معمولی حالات میں شکایت زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ صنعتی مزدوروں کی قلت ہے نہ کہ یہ کہ صنعتی مزدوروں میں بے روزگاری ہے۔ علاوہ ازیں جب کبھی بے روزگاری رونما ہوتی ہے تو ہندوستان کے مزدوروں کو وہ مصائب پیش نہیں آتے جیسے کہ مغرب میں جس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے صنعتی مزدوروں کا زراعت سے بہت کچھ تعلق قائم رہتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فیکٹری کے کام کو بالعموم ایک ذیلی کام تصور کیا جاتا ہے اور اس وقت اس کو ہاتھ لگایا جاتا ہے جب کہ زراعت میں کام کم ہو۔ ہندوستان کی صنعتی بے روزگاری مغرب کے مقابلے میں نہ صرف پیمانے کے لحاظ سے مختلف ہے بلکہ اس مسئلے کی نوعیت کے لحاظ سے بھی جو وہ حکومت کے لیے پیدا کرتی ہے۔ کسی حد تک ہندوستان میں یہ مسئلہ خود بخود یوں حل ہو جاتا ہے کہ اکثر بے روزگار اپنے دیہات کو لوٹ جاتے ہیں۔ اس طرح مصیبت دور

۹۰۶

نہیں ہو جاتی بلکہ صنعتی رقبے سے دیہی رقبوں میں منتقل ہو جاتی ہے، اس طرح جہاں تک صنعتی مرکزوں کا تعلق ہے وہ وہاں زیادہ نظر نہیں آتی اور یہاں ویسے مناظر دکھائی نہیں دیتے جیسے کہ یورپ میں کہ بے نیل مرام سڑکوں پر گھومتے پھرتے ہوں۔

منظم صنعتوں میں صنعتی مزدوروں کی بے روزگاری سے قطع نظر گھریلو صنعتوں کے مزدوروں میں بھی کچھ بے روزگاری پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے معاشی انقلاب والے باب میں[1] اور گھریلو صنعتوں کی حالت کی بحث[2] کے سلسلے میں یہ بات عام طور پر ذہن نشین ہو چکی ہے کہ اس انقلاب سے دستکاروں کے مختلف طبقے متاثر ہوئے اور اس تکلیف اور مصیبت کا بھی تھوڑا بہت اندازہ ہو چکا ہے جو اکثر دستکاروں کو ان کے قدیم پیشے اور دھندے چھوٹ جانے اور ان کا کوئی اطمینان بخش بدل نہ ملنے کی وجہ سے اٹھانی پڑیں۔

بے روزگاری کی ایک اور قسم جو نسبتاً حال میں ہندوستان میں وجود میں آئی ہے وہ متوسط طبقے کی بے روزگاری ہے۔ اس میں تعلیم یافتہ طبقہ مبتلا ہے جس کا ذریعۂ معاش زیادہ تر جسمانی یا دفتری کام ہے۔ اس مسئلے نے حال میں بہت اہمیت اختیار کر لی ہے۔

اس باب میں قحطوں سے پیدا ہونے والی بے روزگاری اور متوسط طبقے کی بے روزگاری سے بحث کی جائے گی۔

دیہی بے روزگاری، قحط اور امداد قحط

۲۔ قحطوں کی ذمہ داری کس پر ہے؟ ۶۰۷

انیسویں صدی کے آخری ربع حصے میں قحطوں کا جلد جلد رونما ہونا اور عوام میں سیاسی بیداری پیدا ہونا، ان دونوں چیزوں نے قحطوں کو ایسی اہمیت دے دی جو غالباً ان کے بغیر ممکن نہ ہوتی۔ ہندوستانی سیاسی مشاہیر نے ان قحطوں کی شدت کو حکومت کی صنعتی، مالی اور مالگزاری کی پالیسی سے منسوب کیا۔ اکثر لوگوں کے نزدیک برطانوی حکومت

---

[1] دیکھو جلد اول باب ۵۔

[2] دیکھو باب ۲ فصل ۳۴ تا ۴۱۔

قحطوں کا واحد سبب خیال کی جانے لگی۔ اس قسم کا خیال دور نہ ہو سکا حالانکہ اس کے مقابلے میں برطانوی دور سے قبل کی اس سے زیادہ نہیں تو مساوی طور پر شدید قحطوں کی مستند شہادتیں موجود ہیں۔ اس غیر اصولی تنقیدی رجحان کے جواب میں محض یہ سیدھی سادی دلیل پیش کی جاتی رہی کہ قحطوں کا باعث محض بارش کی قلت تھی جو برطانوی حکومت یا کسی دوسری حکومت کے بس سے باہر تھی۔ لیکن معترضین کی اس سے تشفی نہیں ہوئی اور انھوں نے حکومت پر بارش روکنے کا نہیں بلکہ عوام کو مفلس بنانے کا الزام لگایا جس کی بنا پر وہ کسی ناگہانی قحط و خشک سالی کے اثرات کی مقاومت نہیں کر سکتے تھے۔ اس باب میں اس امر سے بحث نہیں کی جائے گی کہ ہندوستان کے افلاس کی ذمہ داری کس پر ہے بلکہ بحث کا تعلق اس کمتر نزاعی موضوع سے ہے گا کہ ہندوستانی قحطوں کی کیا نوعیت ہے اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی گئیں۔

۳۔ قحطوں کے معاشی اثرات

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں زراعت پر بڑی حد تک گزارہ ہو، قحطوں کے معاشی اثرات کا تباہ کن ہونا یقینی ہے۔ قدیم زمانے میں قحطوں کی یہ امتیازی خصوصیت تھی کہ محض فاقے سے بہت سی جانیں ضائع ہو جاتی تھیں، لیکن موجودہ زمانے کے قحطوں میں ایسا نہیں ہوتا، اگرچہ قحطوں کی وجہ سے جو متعدی بیماریاں پھیلتی ہیں ان سے شرح اموات بہت بڑھ جاتی ہے۔ جو لوگ بچ جاتے ہیں ان کی عام کارکردگی خراب ہو جاتی ہے اور کھیتی باڑی کے رک جانے سے کسانوں کو بہت بڑا معاشی نقصان ہوتا ہے۔ غذا کے قحط کے ساتھ اکثر چارے کا قحط بھی نمودار ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے جو مویشی ضایع ہوتے ہیں اس سے زراعت میں مزید رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ عوام کی کثیر تعداد کی قوت خرید کے گھٹ جانے کی وجہ سے تجارت اور صنعت و حرفت پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ مالیات عامہ کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور حکومت پر ایک طرف محاصل کی کمی کے باعث تو دوسری طرف اخراجات کی زیادتی کی وجہ سے دوطرفہ ضرب پڑتی ہے۔

۴۔ امداد قحط کی سرگزشت[1]

یہ خیال کرنا غلط ہے کہ برطانوی دور سے قبل کے زمانے میں قحط رونما ہی نہیں ہوتا تھا اور اگر ہوتا بھی تھا تو موجودہ زمانے کے مقابلے میں

[1] ہندوستان میں قحطوں کے مختصر مگر جامع بیان کے لیے دیکھو اے، لوڈے کی کتاب "ہندوستانی قحطوں کی تاریخ و معاشیات"۔

اس کی شدت کم ہوتی تھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ۱۲۹۱ء کے قحط میں خاندان فاقے
سے بچنے کے لیے ڈوب مرے۔ ۱۵۵۵ء کے قحط میں لوگ مردہ جانوروں کی کھالیں کھایا
کرتے تھے اور ۱۶۳۰ء کے قحط میں تو انسان نے انسان کو کھایا۔ ان دہشتناک
واقعات کی موجودگی جن کی صحت غیر مشتبہ ہو، عوام کے اس خیال کی تائید میں تامل ہوتا
ہے کہ برطانوی کسی نہ کسی خفیہ طریق پر اپنے ساتھ ہندوستان میں قحط لے کر آئے۔ اس ۶۰۸
کے برخلاف قبل برطانوی دور میں قحط عام تھے اور ناقص ذریعۂ رسل و رسائل کی وجہ
سے امداد قحط کے طریقے کا موجودہ زمانے کے مقابلے میں غیر موثر ہونا ناگزیر تھا۔ حکومتوں
کے صدر مقاموں میں مرکزی گودام تھے جو دراصل جنگی اغراض کے لیے بطور ذخیرہ کام میں
لائے جاتے تھے، لیکن ان سے قحطوں کے زمانے میں فاقہ کش غریبوں کا پیٹ بھرا
جا سکتا تھا۔ چونکہ ذریعہ رسل و رسائل غیر ترقی یافتہ تھے اس لیے مرکزی حکومت کی بجائے
دیہات ہی سماج کی ضروریات کے کفیل تھے۔ چنانچہ دیہات میں غلّے کے جو ذخائر ہوتے
تھے ان کے زاید حصے سے امداد کی توقع کی جا سکتی تھی۔ اس انتظام کے موثر ہونے کا
انحصار قحط کی شدت اور مدت پر ہوتا تھا۔ سرکاری اخراجات سے تعمیرات عامہ کی تکمیل
مثلاً نہروں اور تالابوں کی تعمیر یا مندروں، مسجدوں، قلعوں یا محلوں کی تیاری
سے بہت سے لوگوں کو روزگار فراہم ہوتا تھا اور ان کی تکالیف دور کرنے میں مدد دی جا سکتی
تھی۔ آخر میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بادشاہوں نے بعض اوقات براہ راست خیرات
کا طریقہ اختیار کیا جو بظاہر قحطوں کے ارتفاع کا غیر موثر طریق تھا۔ اس بارے میں حکومت
کی ذمہ داری کا جو جدید تخیل ہے وہ زمانۂ حال کی پیداوار ہے۔ جہاں تک برطانوی دور
کا تعلق ہے، یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور حکومت میں ۱۷۶۰ء
سے لے کر ۱۸۵۷ء تک سب سے شدید قحط ۱۷۷۰ء، ۱۷۸۴ء، ۱۸۰۳ء، ۱۸۲۴ء
اور ۱۸۳۷ء میں رونما ہوئے۔ سب سے پہلے قحط کو چھوڑ کر باقی تمام قحطوں کی طرف حکومت
یا مورخوں نے ویسی توجہ نہیں کی جیسی کہ انیسویں صدی کے آخر نصف حصے کے قحطوں کی
طرف۔ اس سے زیادہ نازک مسائل لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے
ہوئے تھے، مثلاً مسلسل جنگیں، عام بدنظمی جو نامانوس عدالتی اور مالگزاری کے طریقوں
کے اچانک رائج کرنے کی وجہ سے رونما ہوئی تھی، خراب نظم و نسق جس کی اخلاقی حالت

کم تنخواہ یاب اور ناتجربہ کار عہدہ داروں کی وجہ سے بگڑ گئی تھی ، بڑے پیمانے پر بے روزگاری
جو ہندوستانی روسا کے فوجی دستوں کے اچانک توڑ دیے جانے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی،
پنڈاریوں کی تباہ کاریاں وغیرہ ۔ کمپنی کی سیاسی و انتظامی مصروفیتوں نے عوام کی معاشی
حالت کی اصلاح سے اس کو غافل رکھا ۔ اگر کمپنی کے لیے مواقع ہوتے بھی تو شاید وہ
اصلاح کی جانب مائل نہ ہوتی ، کیونکہ اس کا مطمح نظر سراسر تجارتی و کاروباری اغراض
سے وابستہ تھا اور اس کو اپنے حصہ داروں کے مقسوم ادا کرنے کی فکر زیادہ رہتی تھی
اور جن لوگوں سے یہ مقسوم وصول ہوتا تھا ان کی جان کی پروا بھی نہ تھی ۔ کمپنی نے
اپنے زمانۂ قیام کے آخری سالوں میں عام طور پر ان ذمہ داریوں کو تسلیم کر لیا جو قحط زدہ اشخاص
کے بارے میں اس کے سر پر تھیں ۔ لیکن قحط کے متعلق کوئی باقاعدہ پالیسی مرتب کرنے ٦٠٩
میں وہ ناکام رہی ۔ قحطوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بے اصول اور غیر مسلسل کوششیں کی گئیں
مثلاً قیمتوں اور غلے کی تجارت کو منظم کیا گیا ، نقل مقام کی ہمت افزائی کی گئی اور کبھی
کبھی کار ہائے عامہ کو شروع کیا گیا ۔ لیکن قحط جیسے وسیع مسئلے کو حل کرنے کے لیے یہ
تدابیر محض برائے نام تھیں ۔

البتہ جب ۱۸۵۸ء میں ہندوستان تاج برطانیہ سے متعلق ہو گیا تو اس کے بعد
کے دور میں قحط کو روکنے کی تدابیر اور بیمہ اور امداد قحط کے مناسب طریقے کئی تجربوں
اور ناکامیوں کے بعد اختیار کیے جانے لگے ۔ اس دور میں کئی بڑے قحط نمودار ہوئے
مثلاً شمال مغربی ہندوستان میں ۱۸۶۰ء میں، اوڑیسہ میں ۱۸۶۵ء میں ، راجپوتانے
میں ۱۸۶۸ء میں ، بہار میں ۱۸۷۳ء میں ، جنوبی ہند میں ۱۸۷۶ء میں ، اور دو عام
قحط ۱۸۹۶ء اور ۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۰ء میں جن سے ہندوستان کے متعدد حصے بشمول مدراس
۱۸۶۵ء کے اوڑیسہ کے قحط نے پانچ کروڑ انسانوں
بمبئی اور صوبہ متوسط متاثر ہوئے ۔
ابتدا میں حکومت نے تساہل کیا ۔
کو متاثر کیا اور دس لاکھ جانیں اس کی نذر ہوئیں ۔
لیکن بعد میں چل کر متاثرہ رقبوں میں غلہ کثیر مقدار میں بھیجا گیا ۔ اس قحط میں اموات کی
کثیر تعداد کے مدنظر ایک تحقیقاتی کمیٹی سر جان کیمپ بل کی صدارت میں مقرر ہوئی
اور حکومت نے اپنی اس قطعی پالیسی کا اعلان کیا کہ وہ بہر قیمت جانیں بچائے گی ۔ ۱۸۷۳ء
کے بہار کے قحط میں حکومت نے یہ غلطی کی کہ غیر امتیازی طور پر خیرات بانٹی اور بہت

بھاری اخراجات عاید کر لیے ۔ ۱۸۷۶ء تا ۱۸۷۸ء میں جنوبی ہند میں جو زبردست قحط رونما ہوا اس میں ۵۲ لاکھ آدمی نذر اجل ہوئے ۔ اس کی وجہ سے پہلا بڑا قحط کمیشن سر رچرڈ اسٹریچی کی صدارت میں مقرر ہوا اور اس کمیشن کی سفارش پر حکومت ہند نے جو تدابیر اختیار کیں انھی پر بعد میں چل کر امداد قحط کے انتظامات کی بنیاد رکھی گئی ۔ حکومت کی اختیار کردہ تدابیر میں سے قحط کے بیمے کے لیئے رقم کی منظوری خاص طور پر قابل ذکر ہے ۔ ۱۸۷۸ء میں حکومت ہند کے سالانہ موازنے میں ۱/۲ ۱ کروڑ روپیہ فراہم کیا گیا تاکہ قحط کی صورت میں اس کو براہِ راست امداد میں اور معمولی زمانے میں تامینی نوعیت کے تعمیرات عامہ میں خرچ کیا جاسکے ۔ دوسری تدابیر یہ تھیں بہ جلد از جلد فضانتی ریلوں کا طریق جاری کر کے ذریعۂ رسل و رسائل کی توسیع کی گئی ۔ اصول امداد قحط کا اس طرح تعین کیا گیا کہ تندرست اشخاص کو ایسی اجرت پر کام فراہم کیا جاسکے کہ وہ اس سے معمولی آرام کی چیزیں تو حاصل نہ کرسکیں لیکن صحت برقرار رکھنے کی حد تک ضروریات کی تکمیل کرسکیں اور معذوروں کی مفت امداد ان کے دیہات اور محتاج خانوں میں کی جائے ، زمینداروں کی امداد تقاوی قرضوں کے ذریعے سے ، اور مالگزاری کے التوا و معافی سے کی جائے ۔ ہر صوبے میں ان اصولوں کے مطابق قحط کے قواعد بنائے گئے ۔ ۱۸۹۶ء تا ۱۸۹۷ء اور ۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۰ء کے قحطوں میں ان قواعد کی سخت آزمائش ہوئی اور اس طرح حاصل کیئے ہوئے تجربے کی روشنی میں ان میں ترمیم کی گئی ۔ اول الذکر قحط کے بعد سر جیمس لیال کی صدارت میں ایک کمیشن کا تقرر ہوا جس نے جلاہوں اور پہاڑی قبائل جیسے خاص طبقوں کی امداد کے لیے سفارشیں پیش کیں ، خیراتی رقوم کے انتظام کے لیے قواعد تجویز کیے اور دیہات میں مفت امداد زیادہ کشادہ دلی سے دینے کی حمایت کی لیکن منتشر امدادی کاموں کے جاری کرنے کی مخالفت کی ۔ دوسرا قحط پہلے قحط کے بعد اس قدر جلد رونما ہوا کہ حکومت کو ان سفارشات پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا ۔ ۱۹۰۰ء میں مہاراجا جے پور نے ۱۶ لاکھ روپے چندہ دیا جس سے ٫٫ ہندوستانی عوام کا قحط وقف ،، کی بنا پڑی ۔ ۱۹۰۱ء میں آخری قحط کمیشن نے سر انیٹونی میکڈونل کی صدارت میں ٫٫ اخلاقی اعانت ،، یا عوام کی ہمت افزائی کی اہمیت پر زور دیا یعنی خطرہ محسوس ہوتے ہی قرضوں اور دوسرے ذرایع سے لوگوں کی مدد کی جائے ، تقاوی بر وقت اور کشادہ دلی سے تقسیم کی جائے ، مالگزاری

٦١٠

معاف کی جائے، اور دور اندیشانہ خیرات کی پالسی اختیار کی جائے۔ جس کی رو سے امداد کا ایک بڑا اور لچکدار منصوبہ تیار کیا جائے۔ اور لوگوں کو غیر سرکاری طور پر امداد اور نگرانی کے لئے آمادہ کیا جائے۔ کمیشن نے اس بات کی جانب بھی توجہ مبذول کرائی کہ چارے کے قحط سے بچنے کے لیے تدابیر اختیار کرنا اور مویشیوں کو بچانا ضروری ہے۔ اس کی آخری سفارش یہ بھی تھی کہ قرضہ امداد باہمی کی انجمنیں قایم کی جائیں اور تامینی نوعیت کے سرکاری آبپاشی کے کاموں کو وسیع کیا جائے۔ ان اصولوں کو پیش نظر رکھ کر جو مرمہ قواعد قحط بنائے گئے وہ بعد کے قحطوں کے زمانے میں آزمایش میں اچھے ثابت ہوئے مثلاً صوبۂ متحدہ میں ۱۹۰۷ء میں، احمد نگر میں ۱۹۱۲ء میں اور ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۰ء کے اس سے شدید قحطوں میں۔ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب انسان نے ان آسمانی بلاؤں پر اس سے زیادہ موثر طریقے پر قابو پالیا ہے جتنا کہ ہندوستان کی تاریخ میں کبھی پایا تھا۔

۵۔ قحطوں کی نوعیت میں تبدیلی۔

ایک اہم سبب اس اطمینان بخش نتیجے کے رونما ہونے کا یہ ہے کہ قحطوں کی نوعیت بالکل بدل گئی ہے۔ ۱۸۶۷ء کے خصوصی قحط کمیشن نے قحط کی تعریف "کثیر آبادی کی فاقہ کشی" کی تھی۔ لیکن ہندوستان میں قحطوں کی تاریخ سے اس لفظ کے معنے میں تبدیلی کا انکشاف ہوتا ہے جس کا باعث زیادہ تر دو عامل تھے۔ اولاً ترقی یافتہ ذریعۂ رسل ورسائل نقل وحمل جس کی رو سے ایک حصے کی قلت کو دوسرے حصوں کی وافر مقدار حاصل کرکے پورا کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے، قحطوں سے متعلق نظم ونسق کے انتظامات کی تدریجی تکمیل۔ آج کل غذا کا قحط جیسی کوئی چیز وقوع میں نہیں آتی۔ کیونکہ اگر ایک علاقے میں بارش نہ ہو تو ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کسی دوسرے علاقے میں غیر معمولی طور پر اچھی بارش سے یہ صورت حال متوازن نہ ہوجائے۔ اس طرح بحیثیت مجموعی پورے ملک کو لیا جائے تو غذا کی معمولی مقدار عام طور پر دستیاب ہوجاتی ہے۔ موجودہ زمانے کے قحط غذا کے قحط نہیں ہیں بلکہ زر کے قحط ہوتے ہیں اس لیے حکومت سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ کام اور حسب ضرورت اجرت دلانے کا انتظام کرے۔ موجودہ زمانے میں قحط

لہ۔ ڈرگھوڑے کی کتاب محولۂ بالا۔

کی تعریف "فاقے کی وجہ سے موت" کرنے کی بجائے "فصلوں کی ناکامی سے بے روزگاری" کرنا زیادہ صحیح ہوگا۔ اس طرح قحط کی امداد میں یہ بات سب سے اوّل شامل ہونی چاہئے کہ ان لوگوں کے لیے روزگار مہیا کیا جائے جن کے رزق کی قدرت نے عارضی طور پر دربندی کی ہے[1]۔ جب حسب معمول عدوزگار فراہم نہیں ہوتا تو حکومت امداد کا کام جاری کرتی ہے اور تقریباً ہر شخص جو روزگار کا مستلاشی ہو ذریعۂ معاش پالیتا ہے۔ اور اتنی اجرت کمالیتا ہے جس سے وہ محض ضرورت کے لایق غذا خرید سکے۔ ۶۱۱

۶۔ اسباب اور علاج کی بتویب۔

قحطوں کے اسباب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:۔ (۱) فوری اور راست اسباب مثلاً خشک سالی یا خشک سالی کے اثرات اور (۲) بعید لیکن بنیادی اسباب جن کا تعلق لوگوں کے شدید افلاس سے ہے جس کی وجہ سے وہ معاشی زندگی میں خفیف ترین خلل رونما ہونے پر بھی مقاومت نہیں کر سکتے۔ پہلی قسم کے اسباب کو ایسی تدابیر اختیار کر کے دور کیا جاسکتا ہے جن سے مصیبت رفع ہو یا جو دور اندیشی سے بطور حفظ ما تقدم اختیار کئے جائیں تاکہ آفت کا مقابلہ کرنے کی قبل از قبل تیاری ہو سکے۔ غلہ اور چارے کی ذخیرہ بندی اور بیمے کی تمام اسکیمیں حفظ ما تقدم کی مثال ہیں۔ دوسری قسم کے اسباب کا مقابلہ کرنے کے لیے ہندوستان کے افلاس کی تہ میں جو اسباب کام کر رہے ہیں ان سے نبٹنا پڑے گا۔ اس اہم مسئلے کو حل کرنے کے لیے مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالنی پڑے گی اور معاشی تنظیم جدید کا ایک ہمہ گیر اور وسیع نظام العمل اختیار کرنا پڑے گا۔

۷۔ راست اسباب اور علاج۔

چونکہ قحطوں کا سب سے بڑا راست سبب بارش کی کمی یا بالکل نہ ہونا ہے اس لیے اس بات سے یقیناً فائدہ ہوگا کہ ہونے والی بارش کا پہلے سے اندازہ کر لیا جائے۔ محکمۂ فضائیات ان موسمی حالات کی ایک باقاعدہ یادداشت رکھتا ہے جو ملک کے مختلف حصوں میں

---

[1] ۔ دیکھو سرٹی ماریسن کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں صنعتی انقلاب" صفحہ ۱۲۴۔

پائے جاتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مواد خاص کر ان حالات کا حکمیاتی مطالعہ جو فضا کے بالائی حصے میں پائے جاتے ہیں بارش کے متعلق کامیاب اندازہ کرنے میں کافی مدد دیتا ہے۔ ضرورت سے زاید بارش اور سیلاب بھی قحط کے موجب ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی وجہ سے جو نقصان پہنچتا ہے اس کی تلافی نسبتہً آسانی کے ساتھ کی جاسکتی ہے۔ ٹڈی دل اور دوسرے حشرات الارض اور مختلف قسم کے جراثیم فصلوں کی خرابی کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ حکومت کے ماہران جرثومیات اور دوسرے فن داں ان اسباب کا مقابلہ کرنے میں مصروف ہیں۔

۸- قحط کا بیمہ اور امدادی فنڈ

قحط کے متعلق حفاظتی تدابیر میں قحط کے بیمے کا عطیہ بھی شامل ہے جس کا اوپر ذکر ہوچکا ہے۔ حکومت ہند مختلف صوبوں کی ضروریات کے مطابق اس عطیے سے رقوم دیا کرتی تھی۔ اصلاحات سے پہلے قحط کی امداد ایک باقاعدہ منقسمہ مدخرچ ہوتی تھی جس کا دو تہائی بار مرکزی حکومت اور ایک تہائی صوبہ جاتی حکومتیں برداشت کرتی تھیں۔ لیکن مالی لامرکزیت کے بعد جو سنہ ۱۹۱۱ء کی اصلاحات کے بعد عمل میں آئی ہر صوبے پر لازم کیا گیا کہ وہ اپنے سالانہ محاصل میں سے اپنے یہاں ایک قحط فنڈ قائم کرے۔ غیر متصرفہ عطیہ مرکزی فاضلات میں جمع کردیا جاتا تھا اور اس پر
مرکزی حکومت سود ادا کرتی تھی۔ اس فنڈ کی فاضلات حسب ذیل مدات پر خرچ ۶۱۲
کی جاسکتی تھیں :- (۱) امداد قحط، (۲) قحط کی روک تھام کے لیے کار ہائے تعمیری کی اجرائی اور (۳) کسانوں کو قرضہ۔ بیمۂ قحط کے فنڈ کا ایک پیمانہ مقرر کردیا گیا اور ہر صوبہ جاتی حکومت پر لازم کیا گیا کہ وہ اپنے محاصل سے ہر سال ایک مقررہ رقم قحط کے امکان کے تناسب سے قحط کے بیمے میں دیا کرے۔ اس طرح بمبئی، صوبہ متوسط اور صوبہ متحدہ نے قحط کے بیمہ فنڈ میں ترتیب وار ۶۳ء۹۰، ۲۶ء۰۴ اور ۳۹ء۹۰ لاکھ روپے رکھے تو دوسری طرف بہار، اوڑیسہ، مدراس اور پنجاب نے ترتیب وار ۱۱ء۹۲، ۱۶ء۶۱ اور ۳ء۸۱ لاکھ روپے دیئے۔ بنگال کا چندہ ۲۰ء۰۰ لاکھ روپے تھا اور برما و آسام کا ترتیب وار ۰ء۶۷ اور ۰ء۱۰ لاکھ روپے۔ قحط کے بیمہ فنڈ میں مجموعی چندہ ۱۷۵ء۳۰ لاکھ روپے سالانہ تھا۔

قحط کے بیمہ فنڈ کی ترکیب میں مالی سال (۲۹-۱۹۲۸ء) سے ایک اہم تبدیلی رونما ہوئی۔ جدید قواعد کی رو سے اس فنڈ کی حیثیت بیمہ فنڈ کی نہیں رہی۔ اس کو امداد قحط کے فنڈ کے نام سے موسوم کیا جانے لگا اور اس کا اصل مقصد قحط کی امداد پر رقم خرچ کرنا طے پایا۔ لفظ قحط سے ایسا قحط مطلب لیا جاتا تھا جو خشک سالی یا دوسری قدرتی آفتوں کے باعث رونما ہوا ہو۔ چنانچہ محاصل سے دی ہوئی سالانہ رقم اور مجتمعہ فاضلات جس وقت تک وہ ایک مقررہ مقدار سے متجاوز نہ ہوں امداد قحط کے سوا کسی دوسری مد میں خرچ نہیں کیے جاتے۔ جدید امداد قحط کے فنڈ سے کسانوں کو براہِ راست کوئی قرضہ نہیں دیا جاتا۔ البتہ صوبہ داری قرضہ کی مد میں رقم دی جا سکتی ہے بہ شرطیکہ فاضلات کی مقدار مقررہ حد سے متجاوز ہو۔ قدیم قحط کے بیمہ فنڈ میں جو رقوم جمع تھیں وہ یکم اپریل ۱۹۲۸ء کو نئے فنڈ میں منتقل کر دی گئیں۔ برما اور آسام میں جہاں قحط کا کوئی امدادی فنڈ نہیں کھولا گیا قدیم قحط کے بیمہ فنڈ کے فاضلات ان صوبوں کے عام فاضلات میں منتقل کر دیے گئے۔ قحط کے امدادی فنڈ میں یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو مجموعی رقم ۲ کروڑ ۷۹ لاکھ ۹۸ ہزار ۴ سو پانچ تھی۔ ۳۷-۱۹۳۶ء میں (فاضلات پر وصول شدہ سود کو ملا کر) ۳۵ لاکھ ۱۶ ہزار ۴ سو ۷۶ روپے کا اضافہ ہوا/ ۲۲ لاکھ ۲۳ ہزار ۹ سو ۸۴ خرچ ہوئے اور اختتامی سلک ۳۱ مارچ کو ۲ کروڑ ۹۲ لاکھ ۹۰ ہزار ۸ سو ۹۷ تھی۔[1]

قانون حکومت ہند بابتہ ۱۹۳۵ء کی بموجب جدید دستور کا جو خاکہ مرتب کیا گیا ہے اس میں کسی علیحدہ قحط کے امدادی فنڈ کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے جبکہ صوبہ جاتی آزادی کا آغاز ہوا اس فنڈ میں جمع شدہ سلک صوبوں کے تفویض کر دی گئی اور صوبہ جاتی حکومتوں اور ان کی مجالس قانون ساز کی مرضی پر اس بات کو چھوڑا

[1] دیکھو حکومت ہند کے مالیے اور محاصل کے حسابات ۳۷-۱۹۳۶ء صفحہ ۳۷۹-۳۸۰ و ۵۲۲۔

گی کہ اب تک جو تجاویز ان کے لیے مرتب کی گئی تھیں ان کو اختیار کریں۔
ہندوستانی قحط ٹرسٹ کی رقوم او نیچے طبقے کے ان غریبوں کی امداد کے کام میں لائی جاتی ہیں جو معمولی طریقے پر حکومت کی امداد قبول نہیں کر سکتے۔ لیکن قحط رونما ہونے کی صورت میں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے حکومت زیادہ تر اس امدادی انتظام پر بھروسہ کرتی ہے جس کی بناء انیسویں صدی کے آخری نصف حصے میں ڈالی گئی تھی۔ اس انتظام کی روز افزوں خوبی کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ ۱۹۱۸ء کے شدید قحط کے حالات کا اور عوام نے مقابلہ[1] بہت آسانی سے برداشت کیا۔ ۶۱۳

۹ امدادی تدابیر کی تفصیل

اس انتظام کے مختصر بیان سے قاری کو اس بات کا اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کس قدر موثر اور ہمہ گیر ہے اور کس قدر باریک بینی اور احتیاط کے ساتھ اس کو مکمل کیا گیا ہے۔
(۱) بڑے پیمانے پر قبل از قبل تیاریاں کی جاتی ہیں۔ موسمی حالات، فصلوں، قیمتوں، پیدائش و اموات کے متعلق ضروری معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ مناسب امدادی کاموں کے مکمل پروگرام تیار رکھے جاتے ہیں۔ ملک کو امدادی حلقوں میں تقسیم کر کے ان کے نقشے تیار کر لیے جاتے ہیں اور آلات و اوزار کے ذخائر فراہم کیے جاتے ہیں۔ (۲) جب بارش نہیں ہوتی تو خطرے کی علامات پر نظر رکھی جاتی ہے مثلاً قیمتوں میں اضافہ، عوام کی بے چینی اور بے مقصد آوارہ گردی، نجی خیرات کی کمی جرائم کی زیادتی خاص کر چھوٹی موٹی چوریاں وغیرہ۔ (۳) اس کے بعد حکومت ابتدائی کارروائی کرتی ہے اور اخلاقی حالت کو درست کرنے کے لیے اپنی عام پالیسی کا اعلان کرتی ہے، جیسے کیے جاتے ہیں جن میں حکومت کی پالیسی عوام کے گوش گزار کی جاتی ہے۔ غیر سرکاری اشخاص کی امداد حاصل کی جاتی ہے، مالگزاری کے التواء کا اعلان کیا جاتا ہے اور زرعی اصلاح و ترقی کے لیے قرضے دیئے جاتے ہیں۔ دیہات کا معائنہ شروع کیا جاتا ہے اور بے سہارا

---

[1] دیکھو امپیریل گزٹ آف انڈیا جلد سوم صفحہ ۴۷۷ - ۴۸۱

لوگوں کی فہرستیں مرتب کی جاتی۔ (۴) اس کے بعد حقیقی امداد کی پہلی منزل شروع ہوتی ہے۔ آزمایشی کام شروع کیے جاتے ہیں اور اگر کافی مزدوران کی طرف رجوع ہوں تو ان کاموں کو دستورالعمل قحط کے اصول کے مطابق امدادی کاموں میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ (۵) اس کے بعد کی منزل ڈسمبر سے شروع ہوتی ہے۔ مرکزی امدادی کیمپوں کی تنظیم کی جاتی ہے اور دیہات میں مزدوروں کو مفت امداد دی جاتی ہے۔ شہروں میں محتاج خانے اور دیہات میں بچوں کے لیے طعام خانے کھولے جاتے ہیں یہیں میں مصیبت انتہا کو پہنچ جاتی ہے جب کہ ہیضے کے پھوٹ پڑنے کا خوف ہوتا ہے۔ (۶) آخری منزل بارش کی آمد سے شروع ہوتی ہے۔ بڑے امدادی کام بند کر دیئے جاتے ہیں اور لوگوں کو ٹولیوں میں چھوٹے چھوٹے امدادی کاموں کی طرف ان کے دیہات کے قریب منتقل کیا جاتا ہے تاکہ متعدی امراض کو پھیلنے سے روکا جائے اور تقاوی کے بغیر معمولی زرعی حالات کی بحالی میں سہولت پیدا کی جاتی ہے۔ مقامی مفت امداد کا طریق وسیع کیا جاتا ہے اور مویشیوں، بیلوں اور تخم کی خریدی کے لیے کسانوں کو فیاضی سے قرضے دیئے جاتے ہیں۔ جب اصل خزاں کی فصل تیار ہو جاتی ہے تو چند باقی ماندہ کام بھی بتدریج بند کر دیئے جاتے ہیں اور مفت امداد موقوف کر دی جاتی ہے۔ اکتوبر کے وسط تک قحط بالعموم ختم ہو جاتا ہے۔ اس تمام مدت میں طبی عملہ تیار رکھا جاتا ہے تاکہ ہیضہ اور ملیریا جیسے امراض کا مقابلہ کیا جا سکے جو عام طور پر بارش کی آمد کے ساتھ ہی پھوٹ پڑتے ہیں۔ ۶۱۴

۱۰۔ آخری اسباب اور ان کا علاج

عوام کا افلاس قحطوں کا آخری سبب ہے۔ چنانچہ اس پوری کتاب میں ہندوستانی افلاس کی کوئی نہ کوئی خصوصیت زیر بحث آتی رہی ہے، مثلاً زراعت پر جس کا دارومدار غیر یقینی بارش پر ہے۔ آبادی کا بہت زیادہ انحصار، قدیم صنعتوں کی تباہی اور جدید صنعتوں کی عدم موجودگی، کسانوں کی بڑھی ہوئی مقروضیت جو بڑی تنگدستی سے زندگی بسر کرتے ہیں اور قحط کے زمانے میں سہارے کے لیے پونجی نہیں رکھتے۔ عوام کی معاشی طاقت اور قوت برداشت بڑھانے کی تدابیر

میں مختلف قسم کے طریقے شامل ہیں جن کو بیان کرنا آسان ہے مگر ان پر عمل کرنا مشکل ہے، مثلاً کسان کی ساکھ اور اس کے معیار زندگی کو بڑھانا، راست اور بالواسطہ حفاظتی ذرایع کا مہیا کرنا، مثلاً آبپاشی کی نہروں، سڑکوں کو تیار کرنا اور کنووں کی مرمت کرانا، عام نظم ونسق خاص کر مالگزاری کے نظم ونسق میں اصلاح وترقی، تاکہ لگان معقول حد تک گھٹا کر تشخیص کیا جائے اور مالگزاری کے التوا اور معافی کا انتظام کرنے میں خاص ہمدردی سے کام لیا جائے، اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور کشادہ دلی کے ساتھ جنگلات کی پالیسی مرتب کی جائے، محکمۂ زراعت، زرعی کالج اور زرعی تحقیقاتی ادارے وغیرہ قائم کر کے زراعت کو اصلاح وترقی دی جائے، امداد باہمی کی تحریک سے پوری طرح استفادہ کیا جائے، بڑے پیمانے کی صنعتوں کو ترقی دی جائے اور گھریلو صنعتوں کی ہمت افزائی کی جائے۔ مختصر یہ کہ ملک کے لیے ایک ہمہ گیر معاشی منصوبہ بندی عمل میں لائی جائے۔

متوسط طبقے کی بیروزگاری

۱۱۔ اس سوال کی وسعت۔ "تعلیم یافتہ" اور "متوسط طبقے" کی اصطلاحیں عام طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ لیکن تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ کے درمیان یا متوسط طبقے اور اعلیٰ اور ادنیٰ طبقے کے درمیان صحیح خط فاصل کھینچنا آسان نہیں ہے۔ "تعلیم یافتہ متوسط طبقے" کی اصطلاح میں بالعموم ایسے اشخاص کو شامل کیا جاتا ہے جو اتنے خوشحال نہیں ہوتے کہ اپنی قوت بازو سے کمانے کو ترک کر بیٹھیں، جو غیر دستی ورزی پیشوں میں حصہ لیتے ہیں اور تھوڑی بہت ثانوی یا اعلیٰ تعلیم حاصل کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات ایسے لوگ بھی جنھوں نے دیسی زبان میں یا دیسی و انگریزی ہی زبان میں پورا نصاب ختم کر لیا ہو، تعلیم یافتہ طبقے کی تعریف میں داخل تصور کیے جاتے ہیں۔

۱۲ - متوسط طبقے کی بیروز گاری کی شدت و وسعت

حالیہ زمانے میں متوسط طبقے کی بیروز گاری بہت بڑھ گئی ہے اور عام طور پر جاذب توجہ بنی ہوئی ہے۔ مرکزی و صوبہ جاتی مجالس قانون ساز بلکہ جامعات جیسے نیم سرکاری ادارے بھی اس مسئلے میں دلچسپی لے رہے ہیں[1]۔ ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۸ء کے درمیان برطانوی ہند کے بعض صوبوں مثلاً بنگال، مدراس، بمبئی، پنجاب اور بعض دیسی ریاستوں مثلاً ٹراونکور میں ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۸ء کے درمیان خاص طور پر مقرر کردہ کمیٹیوں کے ذریعے سے کئی تحقیقاتیں کی گئیں۔ سب سے حالیہ کمیٹیاں وہ تھیں جنھیں صوبۂ متحدہ کی حکومت نے ۱۹۳۵ء میں سر تیج بہادر سپرو کی صدارت میں اور حکومت بہار نے ۱۹۲۷ء میں مقرر کیا تھا[2]۔ 615

ان تمام کمیٹیوں کی رپورٹوں سے یہ شبہہ، یقین کا درجہ حاصل کر لیتا ہے کہ متوسط حلقوں میں بیروز گاری کا مسئلہ کل ہند نوعیت رکھتا ہے[3]۔ مدراس کمیٹی نے بتلایا کہ روزگار کے متلاشی تعلیم یافتہ اشخاص کا تناسب ان کی طلب کے مقابلے میں کم و بیش ۲ : ۱ ہے، اور مدارس اور کالجوں کی سالانہ پیداوار اور معمولی حالات میں خالی ہونے والی جائدادوں کا حساب لگا کر وہ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ بیروزگاری تکلیف دہ حد تک زیادہ ہے۔ پنجاب کمیٹی (۱۹۲۷ء) نے اس طرح کے حسابات لگانے کے بعد بتلایا کہ جہاں ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۷ء کے پانچ سالوں میں اینگلو ورنیکولر مدارس اور کالجوں کی پیداوار دونی سے زیادہ بڑھ گئی تھی وہاں سرکاری محکموں یا تجارتی اور کاروباری فرموں میں جائدادوں کی تعداد میں اس کے تناسب اضافہ نہیں ہوا تھا۔

---

[1] ہندوستانی جامعات کی کانفرنس منعقدہ ۱۹۳۰ء نے اس مسئلے پر غور کیا۔ لیکن بجز اس کے اور کوئی تجویز پیش نہیں کی کہ جامعات کو چاہیے کہ اپنے طلبا کی بیروزگاری کے متعلق اعداد شمار فراہم کریں۔

[2] بمبئی کا دفتر مزدوران آج کل (۱۹۳۸ء میں) جامعہ کے طیلسانین میں بیروزگاری کی تازہ تحقیقات میں مصروف ہے۔

[3] مختلف ہندوستانی صوبوں اور ریاستوں میں بے روزگاری کے متعلق صورت حال اور اختیار کردہ یا مجوزہ امدادی تدابیر کے بارے میں ایک دلچسپ تبصرے کے لیے دیکھو "نویں صنعتی کانفرنس (۱۹۳۷ء) کی روئیداد اور ہندوستانی صنعتوں اور مزدوروں کا بلیٹن نمبر (۶۵)

گو کہ کسی تقرر طلب جائداد کے لیے اعلان دینے پر جو درخواستیں وصول ہوں ان کی مجموعی تعداد سے کسی حال بیروزگاری کی وسعت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ ممکن ہے کہ بعض درخواست گزار پہلے سے ماموراور اپنے موجودہ گریڈ میں ترقی کے خواہاں ہوں، پھر بھی یہ امر معنی خیز ہے کہ مدراس کمیٹی کے مشورے کے مطابق صوبۂ مدراس میں جو دو اشتہار آزمائشی طور پر دیئے گئے تھے ان کے جواب میں علی الترتیب ۶۶۶ اور ۱۸۷ درخواستیں وصول ہوئیں۔ ان جائدادوں میں سے ایک جائداد محکمۂ تعمیرات میں ۳۵ روپے ماہوار کی اہلکاری کی تھی اور دوسری جائداد ایک تجارتی فرم میں اسی تنخواہ کی تھی۔

اس درجے بے روزگاری اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہے جتنا کہ عام طور پر اس کو خیال کیا جاتا ہے۔ علاوہ اس انفرادی مصیبت کے جس میں وہ بیروزگاروں کو مبتلا کرتی ہے، ان کی مایوسی اور احساس نقصان عام طور پر اخلاقی خرابی پیدا کرتے ہیں جس کا اثر نسلہا نسل تک جاری رہتا ہے۔ نیز بیروزگار نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد
۶۱۶ کی موجودگی مملکت کے سیاسی استحکام کے لیے ایک خطرہ ہے۔ اس مسئلے کو سیڈلر کمیشن نے اچھی طرح یوں بیان کیا ہے کہ: "تعلیم یافتہ بیروزگاروں کی شکایات واجبی ہیں اور ان کا وجود اور تدریجی اضافہ عمدہ حکومت کے لیے ایک خطرہ ہے خاص کر ایسے ملک میں جہاں تعلیم یافتہ لوگوں کا محدود طبقہ احتجاج کی صلاحیت رکھتا ہو۔ خواہ حکومت کوئی شکل اختیار کرے ان سے یہ خطرہ بدستور موجود رہے گا۔ جس وقت تک قوم کا ذہین طبقہ روز افزوں تعداد میں ایک ایسے نصاب تعلیم کی تحصیل پر مجبور کیا جاتا رہے گا جو بالعموم بے ثمر ہو اور ایسے توقعات پیدا کرے جو پوری نہیں کی جاسکتیں اور جس کی تحصیل سے وہ بہت سے ایسے مفید پیشوں میں حصہ لینے کے قابل نہ رہتا ہو جو ملک کی خوشحالی کے لیے ضروری ہیں، اس وقت تک ہر حکومت خواہ وہ کسی شکل کی ہو یعنی استبدادی ہو کہ جمہوری، روز افزوں نکتہ چینی اور امداد کے مطالبوں کی وجہ سے جن کی تکمیل امکان سے باہر ہوا پنے کام میں رکاوٹیں محسوس کرے گی۔ اس کے علاوہ انقلابی اشتمالیت یا اشتراکیت کا مسلک نوجوانوں میں جوشیلے پیرو پیدا کرے گا، کیونکہ یہ لوگ ایک نظام کو جس میں بظاہر ان کو کوئی مقام حاصل

نہیں ہے اپنے مفاد کے سخت منافی خیال کرتے ہیں۔

۱۳۔ کون سے طبقے زیادہ متاثر ہیں۔

بمبئی کی تحقیقاتی کمیٹی نے یہ انکشاف کیا کہ تعداد کے لحاظ سے سب سے اہم طبقہ جو متاثر ہے وہ ایسے نوجوانوں پر مشتمل ہے جن کی عمر ۲۰ سال سے کم ہے خاص گروہ لوگ جن کی تعلیم ادبی نوعیت رکھتی ہے اور جنھوں نے اعلیٰ تعلیم اینگلو ورنیکولر نصاب کے ذریعے حاصل کی۔ جیسا کہ توقع کی جاسکتی تھی، بیروزگاری سب سے زیادہ شدید صورت میں ان لوگوں میں ہے جو اسکول لیونگ یا میٹرک کے امتحان میں جو سرکاری ملازمت کے لیے اقل معیار قابلیت خیال کیا جاتا ہے ناکام رہے۔ اس سے کم درجے پر میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کامیاب اشخاص میں پائی جاتی ہے اور نسبتہً سب سے کم گریجویٹوں میں جو پیشہ ورانہ ڈگری رکھتے ہیں۔ معلمی کے پیشے میں ٹرینڈ کے مقابلے میں ان ٹرینڈ معلمین میں بیروزگاری زیادہ ہے۔ قانونی پیشے کی حد تک یہ بات عام طور پر مان لی گئی ہے کہ اس میں تعداد ضرورت سے زیادہ ہے اور طبقۂ وکلا کے جونیر ارکان کو کسب معاش میں دقت ہوتی ہے۔ اسی طرح پیشۂ طب میں بڑے شہروں میں ضرورت سے زیادہ تعداد ہے۔ البتہ چھوٹے شہروں، قصبات اور دیہات میں جہاں زندگی کی آسائشیں میسر نہیں ہیں اور لوگ طبی امداد کے لیے باقاعدہ نقد فیس ادا کرنے کے عادی نہیں ہوئے ہیں، طبیبوں کی قلت ہے۔ انجینیروں کی حالت ان سے صرف کچھ ہی بہتر ہے۔ ایسے اشخاص کثیر تعداد میں ہیں جو مناسب قابلیت رکھتے ہیں اور ریلوں میں کام کرنے کے خواہاں ہیں لیکن وہ تربیت یافتہ نہیں ہیں۔ اس لیے ملازمت سے محروم ہیں۔ بنک کاری اور محاسبی کی حد تک گو کہ ایسے لوگ جنھوں نے اعلیٰ قسم کی خاص تربیت پائی ہے یا تجربہ رکھتے ہیں بیروزگار نہیں ہیں تاہم بیسیوں ایسے بھی ہیں جنھوں نے خاص تربیت حاصل نہیں کی ہے اور جو روزگار حاصل کرنے میں ناکام رہے۔

۱۴۔ بیروزگاری کے اسباب[1]

(۱) مابعد جنگ کساد بازاری اور تخفیف مصارف۔ ہندوستان باقی دنیا کی طرح مابعد جنگ معاشی کساد بازاری سے متاثر ہوا ہے۔ ایسے اشخاص کی ایک بڑی تعداد جو فوج میں سپاہی یا اہلکار تھے جنگ کے

[1] بنگال کی تحقیقاتی کمیٹی یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ ایسے شخص کی بیروزگاری میں جو اپنی نااہلی کی

کے اختتام پر ملازمت سے ہٹا دیے گئے اور کسی دوسری جگہ ان کو جذب کرنا ممکن نہ ہوا کیونکہ سرکاری محکموں نیم سرکاری اداروں اور کاروباری فرموں میں جو جائدادیں تقرر طلب نکلیں وہ ان کی کھپت کے لیے ناکافی تھیں۔ تخفیف مصارف کا عمل ہر سمت میں کیا گیا اور قدیم محکمے بھی پوری آزادی کے ساتھ برقرار نہ رہ سکے۔ ۱۹۲۹-۳۴ء میں معاشی کساد بازاری خاص طور پر شدت کے ساتھ رونما ہوئی اور دوسروں کے ساتھ متوسط طبقے بھی بے نظیر تکلف و مصیبت کے دور سے گزرے۔ اس کے بعد سے حالات کچھ بہتر ہونے لگے۔

۲۔ تعلیمی نظام کے نقائص۔ بیروزگاری کا ایک اور بیّنہ سبب یہ ہے کہ موجودہ تعلیمی نظام میں اور صنعتی ترقی کی ضروریات میں کوئی باہمی ربط نہیں ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہمارا موجودہ نظام تعلیم محض ایسے اشخاص پیدا کرتا ہے جو زیادہ تر اہلکاری کے پیشے کے قابل ہوتے ہیں اور عام طور پر اس قسم کی تعلیم کو سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے[۱]۔ سر جارج انڈرسن نے اپنی یادداشت میں جو پنجاب کمیٹی کے لیے تیار کی گئی تھی، یہ تسلیم کیا ہے کہ موجودہ تعلیمی نظام ابتدا ہی سے اس خاص مقصد کے تحت مرتب کیا گیا تھا کہ لڑکوں کو بیرونی امتحانات کے لیے تیار کرے جن کی کامیابی اکثروں کے لیے محض ایک پھندا اور دھوکا ہے۔ اس تعلیمی نظام کے قیام کا ایک خاص مقصد یہ بھی تھا کہ لڑکوں کو اہلکاری کے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ بنا پر بیروزگار نہ ہو اور ایسے شخص کی بیروزگاری میں جو اس وجہ سے بیروزگار ہو کہ جائداد موجود ہونے کے باوجود ایسے اسباب کی بنا پر ملازم نہیں رکھا جا سکتا جو اس کی دسترس سے باہر ہیں فرق و امتیاز کرنا چاہیے۔ دیکھو بنگال کی بیروزگاری کی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۲۔

[۱] "ہمارے فوقانی مدارس اور کالجوں میں خرابی یہ نہیں ہے کہ پیشہ ورانہ تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ یہ کہ ایک معین و محدود پیشہ ورانہ تعلیم پر بہت زیادہ توجہ صرف کی جاتی ہے۔ عملی حیثیت سے زیادہ فائدہ مند اور ضروری خیال کرکے ان مدارس اور کالجوں نے اپنا مطمح نظر یہ قرار دے لیا ہے کہ سرکاری عہدہ دار وکیل، ڈاکٹر اور تجارتی اہلکار تیار کریں"۔ دیکھو اے سے ہیو کی کتاب The Education of India صفحہ ۱۴۶۔

کاموں کی تربیت دی جائے۔ لیکن اب چونکہ ایسے تربیت یافتہ لوگ ضرورت سے زیادہ ہو گئے ہیں، اس لیے درخواست گزاروں کی بڑی تعداد ملازمت حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ اس کے بعد سر جارج اینڈرسن میٹرک کامیاب طالب علم کی یوں تعریف کرتے ہیں جن کو وہ بیروزگاری کے مسئلے کی اصل حل طلب چیز خیال کرتے ہیں :- "وہ ایک آوارہ گرد ہے جو بے نیل مرام گھومتا پھرتا ہے اور اس لیے بیروزگار رہتا ہے کہ اس کو ملازمت نہیں مل سکتی" [1] متوسط درجے کا ہندوستانی اولاً
۶۱۸ ذریعۂ معاش کی حیثیت سے سرکاری ملازمت پر نظر جمائے رکھتا ہے اور اس میں ناکامی ہونے کی صورت میں کسی غیر سرکاری ادارہ مثلاً ریلوں، بلدیہ اور دوسری مقامی جماعتوں، بندرگاہ کے ٹرسٹ وغیرہ میں اہلکاری تلاش کرتا ہے۔ تعلیمی نظام پر ایک اور الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ وہ لڑکوں کو اپنے آبائی پیشے میں کام کرنے کے قابل نہیں رکھتا، کیونکہ ایک لمحے کے لیے بھی وہ دستی محنت کے ذریعے کسب معاش کرنے کی ذلت کو گوارا نہیں کر سکتے، اور بشمول زراعت نام نہاد دست ورزی پیشے اختیار کر کے نسبتہً زیادہ آمدنی کمانے کے مقابلے میں شدید تعلیم حاصل کر کے پانچویں درجے کے اہلکار بننا قابل ترجیح سمجھتے ہیں۔ اس طرح دستی محنت سے روایتی طور پر نفرت کرنے والوں کی تعداد موجودہ تعلیمی نظام کی وجہ سے بڑھتی جا رہی ہے[2]۔ یہ نظام "ان لوگوں کی ذہنی وعقلی توانائی کو

---

[1] جیساکہ بنگال کمیٹی نے بتلایا ہے تعلیمی نظام کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ صرف ایک مقصد کی طرف لے جاتی ہے، یعنی یہ کہ طلبا ام اے ام ایس سی یا بی ایل کے امتحانات کامیاب کرلیں۔ یہ نظام ایک بانس کی طرح ہے جس کی ہر گانٹھ ایک امتحان ہے اور اس بانس کا منظر نیچے سے اوپر تک ایک ہی ہے اس کی شاخیں نہیں ہیں اور اوپر کا سرا بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے۔ حالانکہ تعلیمی نظام ایسے درخت کی طرح ہونا چاہیے جس کی شاخیں ہر سمت میں پھیلی ہوئی ہوں اور حتی الامکان تنے کے مختلف مقامات سے وہ نکلی ہوئی ہوں نہ کہ سب کی سب چوٹی پر ہوں۔ دیکھو بنگال کی بے روزگاری کی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۱۹۔

[2] جیساکہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں فراہم شدہ بعض اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے،

گھٹا دیتا ہے جو اس سے فیض یاب ہوتے ہیں اور اکثر صورتوں میں ان کے مفاد کے قطعی منافی ہے"[1] کسان، دستکار اور پسماندہ طبقے اپنے بچوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں مدارس اور کالجوں میں بھیجنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ سرکاری ملازمتوں اور تعلیم یافتہ پیشوں میں جگہ پا سکیں اور اس طرح معاشری زینے کے بالائی حصوں پر رسائی حاصل کر سکیں۔ ادبی اور نیم ادبی پیشوں کی جانب یہ خطرناک رجحان ان طبقوں میں بھی اپنا اثر ڈال رہا ہے جن میں لکھنے پڑھنے کی روایات نہ تھیں۔ اس سے تعلیم یافتہ طبقوں کی موجودہ بے روزگاری میں اور بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن اس قدر بتا دینا ضروری ہے کہ گو یہ صحیح ہے کہ اپنے لڑکوں کے لیے پیشوں کا انتخاب کرنے میں والدین ضروری دور اندیشی اور بصیرت سے کام نہیں لیتے، تاہم اس کی وجہ ایک حد تک یہ کہی جا سکتی ہے کہ زرعی، فنی، صنعتی یا تجارتی تعلیم کے لیے موزوں اور کافی سہولتیں موجود نہیں ہیں۔

۳۔ معاشری اسباب۔ بعض معاشری اسباب مثلاً ذات پات کا طریق، کم عمر کی شادیاں، مشترک خاندان کا طریق اور فرقہ وارانہ عدم مساوات تعلیم یافتہ اشخاص کی قسمتوں اور معاشی حوصلہ مندیوں کو متعین کرنے بلکہ ان میں مزاحمت پیدا کرنے میں غیر محسوس مگر کارگر طریق پر اثر انداز ہوتے ہیں[2] چنانچہ ذات پات کا طریق، تعلیم یافتہ لوگوں کے مفید پیشے اختیار کرنے کی راہ میں مزاحم ہے کیونکہ ہر ذات سے کوئی نہ کوئی پیشہ مختص ہوتا ہے جس کو دوسری ذات والے اختیار کرنا توہین خیال کرتے ہیں۔ اوائل عمر کی شادی نہ صرف کافی تعلیم حاصل کرنے میں خلل ڈالتی ہے بلکہ خاندان کی پرورش کی ذمہ داری نوجوان اشخاص کے ۶۱۹
کندھوں پر قبل از وقت عائد کرتی ہے۔ مشترک خاندان کا طریق اگرچہ اس ذمہ داری کے بوجھ کو ہلکا کر دیتا ہے اور کمزوروں اور بے وسیلہ لوگوں کو

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ مدراس میں کسانوں کے تعلیم یافتہ لڑکوں میں بیروزگاروں کا تناسب بہت زیادہ ہے۔

[1] دیکھو بنگال کمیٹی کے سامنے سر فلپ ہارٹوگ کی گواہی۔

[2] دیکھو مدراس کمیٹی کی رپورٹ، صفحہ ۱۸۔ نیز دیکھو اس کتاب کی جلد اول باب ۔

سہارا دیتا ہے۔[۱] لیکن معاشی حیثیت سے دوسروں کے دست نگر بنے رہنے کی عادت سکھاتا اور انفرادی اختراعی جد وجہد اور حوصلہ مندی کو سلب کر لیتا ہے۔ مشترک خاندان کے طریق کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اپنے وطن سے باہر جا کر تلاش معاش کرنا پسند نہیں کرتے۔ اس کو بھی تعلیم یافتہ طبقوں میں بیروزگاری کا ایک سبب قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف مدراس کی متوسط طبقے کی بیروزگاری کی کمیٹی کا یہ خیال ہے کہ اس قسم کی عدم نقل پذیری کمی پر ہے اور بیروزگاری کے مسئلے پر کوئی اثر نہیں ڈالتی، بلکہ بیروزگاری کا اصل سبب یہ ہے کہ لوگوں کی جتنی مانگ ہے اس سے بہت زیادہ رسد موجود ہے۔[۲]

۴۔ معاشی پسماندگی۔ متوسط طبقے کی بیروزگاری کا سب سے اہم سبب یہ ہے کہ ملک صنعتی حیثیت سے بہت کم ترقی یافتہ ہے اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے کھپت کا میدان محدود ہے۔ انگلستان میں فوج، بحریہ اور غیر فوجی خدمات کو چھوڑ کر مجموعی طور پر ۱۶ ہزار پیشے اور دھندے ہیں ہندوستان میں ان کی تعداد غالباً ۴ ہے۔[۳] یہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ محض پیشہ ورانہ اور فنی تربیت کی سہولتوں کی توسیع سے مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔ اس سے صنعتوں کی ترقی کی رفتار بے شک تیز ہو جائے گی لیکن تاوقتیکہ اس کے ساتھ ساتھ ترقی پذیر صنعتوں کے قیام اور ان میں تربیت یافتہ اشخاص کی کھپت کی خاص تدابیر اختیار نہ کی جائیں، صنعتیں وجود میں نہیں آسکتیں۔ جیسا کہ بنگال کمیٹی نے (دیکھو رپورٹ فقرہ ۳۰) خیال ظاہر کیا ہے "معیاری متوازن ترقی وہ ہے جس میں فنی تربیت اور معاشی ترقی ساتھ ساتھ قدم بڑھائیں

---

[۱] بمبئی کی رپورٹ میں بتلایا گیا ہے کہ صوبے کے کل بیروزگاروں کے منجملہ ۴۹ء۴۶، فیصد یا تقریباً نصف حصے کی پرورش زمانۂ بے روزگاری میں ان کے عزیز رشتہ دار کرتے تھے، ۲۵ء۸ فی صد اپنی پس انداز کی ہوئی رقم سے گزر بسر کرتے تھے، ۷ء۶۱ فیصد ہنگامی کاموں سے گزارہ کرتے تھے، ۴ء۹۱ فیصد کا ذریعۂ معاش جائداد غیر منقولہ کی حقیقی آمدنی تھی۔ [۲]۔ دیکھو مدراس کی رپورٹ صفحہ ۱۸ و ۲۷۔
[۳]۔ دیکھو ٹراونکور کی رپورٹ فقرہ ۵۸۔

اور ایک کو دوسرے سے تقویت پہنچے۔ اگر ان میں سے کوئی پیچھے رہ جائے تو دوسری اس کی مدد کرے"۔ بیروزگاری کے اسباب کے عام مباحث میں بعض اوقات اس ملک کے موجودہ تعلیمی نظام کی ضرورت سے زیادہ ادبی نوعیت اور ذات پات کے تعصبات کو بہت زیادہ مبالغے کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور دوسرے عاملوں مثلاً ہندوستان کے معاشی ذرایع کی پسماندہ وغیر ترقی یافتہ حالت کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ یہی پسماندگی، جیسا کہ کئی بار بیان کیا جا چکا ہے، عوام کے افلاس کا بنیادی سبب ہے اور آخر تجزیے میں یہی بے روزگاری کی بڑی وجہ قرار پاتی ہے۔

۱۵۔ بیروزگاری کو دور کرنے کی تدابیر

۶۲۰ فراہمی روزگار کے ادارے۔ چونکہ بیروزگاری کے مختلف اور متعدد اسباب ہیں، اس لیے اس کو رفع کرنے کی کوئی ایک ہمہ گیر تدبیر نہیں ہو سکتی۔ اولاً ان چند اصلاحی تدابیر پر غور کرنا مناسب ہوگا جو اس سلسلے میں پیش کی گئی ہیں۔ یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ جامعات کی طرف سے فراہمیٔ روزگار کے ادارے سرکاری محکمے یا خانگی ایجنسیاں کھولی جائیں۔ آجروں اور بیروزگاروں میں ربط قائم کرنے کے لیے صوبۂ متحدہ اور پنجاب میں مجالس فراہمی روزگار قایم کی گئی ہیں (دیکھو فصل ۱۸) اگر اس قسم کے اداروں کو عمدگی سے چلایا جائے اور عوام کا اعتماد حاصل کیا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت کار آمد ثابت ہوں گے۔ لیکن یہ ذہن نشیں رکھنا چاہیئے کہ یہ ادارے زیادہ سے زیادہ رسد و طلب کے درمیان زیادہ بہتر مطابقت پیدا کر سکتے ہیں، خاص کر نجی کاروباری فرضوں کی حد تک جہاں کام کرنے والے لوگ بالعموم کافی قابلیت نہیں رکھتے۔ لیکن ایسے ادارے لوگوں کی طلب کے مقابلے میں ان کی رسد کی روز افزوں زیادتی کو نہیں روک سکتے۔

بیروزگاری کو دور کرنے کی ایک تدبیر یہ بھی پیش کی گئی ہے کہ ترک وطن یا توطن خارجی پر عمل کیا جائے۔ لیکن چونکہ متوسط طبقے کی بیروزگاری ایک کل ہند مسئلہ ہے، اس لیے ملک کے اندر نقل مقام کو اس کا حل نہیں خیال کیا جا سکتا۔ البتہ اس سے صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ملک کے تمام حصوں میں

مسئلے کی شدت میں اعتدال پیدا ہو جائے۔ رہا توطن خارجی تو ہم کسی جگہ مدلل طور پر یہ بیان کر چکے ہیں کہ موجودہ حالات میں اس سے کچھ زیادہ مدد ملنے کی توقع نہیں ہے[1]۔

۱۶۔ بیروزگاری کی شماری تحقیقات

حکومت ہند نے مئی ۱۹۳۷ء میں صوبہ جاتی حکومتوں کے نام گشتی میں اس بات پر زور دیا ہے کہ متوسط طبقے کی بیروزگاری کو دور کرنے کی تدابیر میں پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ ان کے متعلق صحیح اعداد و شمار فراہم کیے جائیں۔ یہ بتلایا گیا ہے کہ بیروزگاری کی بجائے ملازمت کے اعداد و شمار کی فراہمی زیادہ مفید ہو گی اور حکومت ہند کا یہ خیال ہے کہ معتبر شماریات حاصل کرنے کی خاطر قانون سازی ضروری ہے۔ اس قسم کی قانون سازی مرکزی حکومت کی جانب سے ہونی چاہئے تاکہ ہر جگہ یکسانیت کا یقین ہو اور حکومت ہند اس کے لیے تیار ہے بشرطیکہ مختلف صوبہ جاتی حکومتیں اس تجویز کی تائید پر آمادہ ہوں۔ سب سے پہلے غالباً یہ مناسب ہو گا کہ تحقیق کو کسی منظم صنعت مثلاً باقاعدہ فیکٹریوں یا ریلوں تک محدود رکھا جائے۔ اس کے بعد تحقیقات کو مختلف تجارتی پیشوں اور کم منظم کسب معاش کے اداروں تک وسعت دی جا سکتی ہے۔ اس قسم کی تحقیق سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ مختلف صنعتوں اور تجارتی کاروبار میں مختلف فنی قابلیت رکھنے والے اشخاص کی کس حد تک ضرورت ہے تاکہ طلب و رسد میں بہتر طریق پر ربط قایم کیا جا سکے۔ اس قسم کے اعداد و شمار سے یہ عام اندازہ قایم کرنے کا موقع مل سکے گا کہ فنی یا عام قسم کی قابلیت رکھنے والے نوجوانوں کے لیے صنعت و تجارت میں کھپت کے کیا امکانات ہیں اور اس طرح بیروزگاری کے متعلق مختلف امکانی تجاویز کے ممکنہ اثرات کا اندازہ کرنے کا موقع مل سکے گا۔ آخری امر یہ کہ اس قسم کے اعداد و شمار کی فراہمی سے شماری مواد کے متعلق عوام کی مانگ اور ضرورت کو پورا کرنے میں مدد ملے گی اور محض قیاسات کی بجائے واقعات کی روشنی میں اس مسئلے پر ۶۲۱

[1] دیکھو جلد اول باب ۱۳، فصل ۳۱، ۳۸۔

غور کرنے کا موقع ملے گا۔ اسی بنا پر ہم ملازمت کے اعداد کی کل ہند تحقیق کی پر زور تائید کرتے ہیں۔

۱۷۔ دوسری تدابیر

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ہر طبقے اور درجے کی بیروزگاری حقیقت میں معاشی پسماندگی کا نتیجہ ہے۔ لہذا ہر وہ چیز جو ملک کی معاشی بہبود و ترقی کا موجب ہوگی ظاہر ہے کہ بیروزگاری کو دور کرنے کا بھی باعث ہوگی[۱]۔ مادی ترقی نہ صرف متوسط طبقے کی ملازمت کے لیے مواقع پیدا کرے گی بلکہ موجودہ قومی خوشحالی کی عام سطح کو بلند کرکے وکیلوں، ڈاکٹروں، اساتذہ وغیرہ کی خدمات کی طلب میں بھی اضافہ کرے گی۔ اس کے علاوہ عام خوشحالی اور اعلیٰ فوجی اور غیر فوجی خدمات کے بتدریج ہندیائے جانے کی وجہ سے انتظامی محکموں میں ملازمت کی زیادہ گنجایش نکل آئے گی۔ اور آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملک کے احیا کے لیے حکومت جو بھی ہمہ گیر پروگرام بروئے عمل لائے اس کی بنا پر بھی تعلیم یافتہ بیروزگاروں کی کچھ تعداد کی کھپت ہوگی۔

مدراس کمیٹی یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ مدراس کی حد تک موجودہ بیروزگاری کو دور کرنے کی اصل تدبیر یہ ہونی چاہیے کہ تعلیم یافتہ متوسط طبقے کے افراد خاص کر وہ جو زمین پر قابض ہیں زراعت کی طرف مائل ہوں اور اس میلان کو ترقی دینے کے لیے کمیٹی اس بات پر زور دیتی ہے کہ "کسی نہ کسی طرح اس خیال کو لوگوں کے دلوں سے نکال دینا چاہیے کہ کسان معاشری حیثیت سے اہلکار یا وکیل یا معلم سے کمتر درجے کا ہے"[۲]۔ بہار کی بیروزگاری کی تحقیقاتی کمیٹی نے بھی اپنی رپورٹ

---

[۱]۔ "متوسط اور دوسرے طبقوں میں بیروزگاری کو دور کرنے کی حقیقی تدبیر یہ ہے کہ ملک کے ذرائع کو تیزی سے ترقی دی جائے"۔ پانچویں صنعتی کانفرنس (۱۹۳۳ء) کی روداد صفحہ ۱۲۴۔

[۲]۔ دیکھو مدراس رپورٹ صفحہ ۲۵۔ بنگال کمیٹی بھی اسی قسم کا مشورہ دیتی ہے اور سفارش کرتی ہے کہ زرعی قرضوں اور ارضی اصلاح و ترقی کے قانون میں اس طرح ترمیم کی جائے کہ اس سے بنگال کے متوسط طبقے کو مدد ملے۔ دیکھو بنگال کی بے روزگاری کی کمیٹی کی رپورٹ فقرہ ۴۷۔

(نومبر ۱۹۳۷ء) میں کچھ اسی طرح کا خیال ظاہر کیا ہے اور اس بات کو نہایت ضروری قرار دیا ہے کہ بہار جیسے صوبے میں جہاں زیادہ تر زراعت ہی پر لوگ گزارہ کرتے ہیں کچھ تعلیم یافتہ لوگوں کو زراعت کی طرف رجوع کیا جائے یا کم از کم شہروں میں ان کی منتقلی کو روکا جائے۔ زمینداروں میں دیہات سے باہر رہنے
۶۲۲ کا جو میلان ہے اور دیہات سے شہروں کی طرف منتقلی کا، تعلیم یافتہ طبقوں میں جو رجحان ہے اس پر ہم اس سے قبل تبصرہ کر چکے ہیں' ان خرابیوں کو روکنا چاہیئے اور متوسط طبقوں کو ترغیب دینی چاہیئے کہ اپنے دماغوں کو زراعت کی طرف رجوع کریں اور اس طرح اپنی اور اپنے ملک کی مدد کریں۔ ابھی سے اس کی علامات ہیں کہ معاشی ضرورت کے دباؤ کے تحت زراعت اور دوسرے دستی پیشوں کے خلاف تعصب رفع ہو رہا ہے۔

مدراس کمیٹی کی یہ تجویز کہ زرعی نو آبادیات قایم کی جائیں کافی دلچسپ ہے' لیکن عملی طور پر اس کے امکانات محدود ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اگر دیہی آبادی اور پست طبقوں کے مقدم مطالبات کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو پنجاب اور آسام جیسے صوبوں کو چھوڑ کر دوسرے صوبوں میں عمدہ قابل کاشت زمین جو تعلیم یافتہ بیروزگاروں کو دی جا سکتی ہے بہت کم مقدار میں دستیاب ہو سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ جیسا کہ مدراس کمیٹی کو اعتراف ہے' اگر اس بات کا عام طور پر علم ہو جائے کہ بیروزگار تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے حکومت اراضی فراہم کرے گی تو متوسط طبقے کے والدین کی یہ خواہش کہ اپنے بچوں کو سرکاری ملازمت کی خاطر مدارس اور کالج بھیجیں اور بھی بڑھ جائے گی۔

پنجاب کی بیروزگاری کی کمیٹی کی اکثریت کا یہ خیال ہے کہ بے روزگاری کو کم کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں صرف ان لوگوں کے لیے مہیا کی جائیں جو نمایاں قابلیت رکھتے ہوں۔ اگر وہ غریب ہوں تو حکومت ان کی مالی مدد کرے ورنہ مستطیع ہونے کی صورت میں اپنے تمام اخراجات کا بار خود ہی اٹھائیں (فقرہ ۱۹)۔

ہماری رائے میں یہ مناسب نہیں ہے کہ دیدہ و دانستہ ملک میں تعلیم کے

اخراجات بڑھائے جائیں یا اعلیٰ تعلیم کی وسعت میں کمی کی جائے۔ البتہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ والدین کو کسی نہ کسی طرح یہ محسوس کرنا ضروری ہے کہ امیدواروں کی موجودہ رسد، سرکاری ملازمت اور قانونی پیشے میں ان کی طلب سے بہت زیادہ ہے، اس لیے ان کو اپنے بچوں کے لیے دوسرے پیشوں اور دھندوں کا انتخاب کرنا چاہیے۔ سپرو کمیٹی بھی اس کی مخالف ہے کہ جامعات میں طلبا کے داخلے شرائط عاید کرکے محدود کیے جائیں۔ ٹراونکور کمیٹی کا یہ مشورہ زیادہ قابل لحاظ ہے کہ مسابقتی امتحانات کے ذریعے ہر درجے کی سرکاری ملازمت میں بھرتی کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ مسابقتی امتحانات کا طریقہ اختیار کرنے اور ملازمت میں داخلے کے معیاروں کو کڑا کرنے سے امیدواروں کی کثیر تعداد خارج ہو جائے گی اور سعی و سفارش یا سرپرستی حاصل کرنے میں جو قوت ضایع جاتی ہے اس کا انسداد ہو جائے گا۔ مسابقتی آزمایش میں ناکام رہنے والوں کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کے لیے سرکاری ملازمت خارج از بحث ہے اور اس طرح کسی نہ کسی وقت ملازمت حاصل کرنے کی موہوم امید میں ادھر ادھر دوڑ دھوپ کرنے کی بجائے وہ کوئی دوسرا دھندا کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس کی وجہ سے تعلیمی معیار بھی بلند ہو جائیں گے اور خدمات پر تقرر کے لیے بہتر امیدوار مل سکیں گے۔ ہم یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں کہ اگر فرقہ وارانہ نمایندگی کے اصول کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی مسابقتی امتحانات کے طریق کے ذریعے اس میں ۶۲۲
اعتدال پیدا کرنا چاہیے۔ تعلیمی طریق کے اصلاح کے مسئلے پر اس سے قبل بحث کی جا چکی ہے[1]

آخر میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ تعلیمی طریق کی اصلاح و ترقی[2] کے ساتھ ساتھ

---

[1] دیکھو جلد اول باب ۸ فصل ۳ با جلد دوم باب ۱ فصل ۱۳، ۱۴۔ نیز دیکھو اے ایبٹ و ایس ہیچ ووڈ کی رپورٹ "ہندوستان میں پیشہ ورانہ تعلیم" پر شایع شدہ ۱۹۳۷ء۔

[2] حکومت بنگال نے ایک اسکیم منظور کی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ متوسط طبقے کے نوجوانوں کے لیے کئی چھوٹی چھوٹی صنعتوں میں پیشہ ورانہ تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ مثلاً چھتریاں اور

معاشرتی نظام اور عوام کے عام مطمح نظر میں بھی کامل تبدیلی ہونی چاہیئے۔ تمام پرانے اور ازکار رفتہ خیالات اور روایات کی جو معاشی اور سیاسی ترقی میں حائل ہیں بے خوف وخطر مخالفت کی جانی چاہیئے اور ان کو مٹانے کے لیے مسلسل اور پرزور کوشش کی جانی چاہیئے۔ کیونکہ جیساکہ سیڈلر کمیشن کا خیال ہے "لوگوں کی تعلیم صرف مدارس اور کالجوں میں نہیں ہوتی۔ بلکہ دوسرے اثرات بھی ان کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ مثلاً اس قوم کے جذبات اور میلانات کا اثر جس میں یہ ادارے کام کرتے ہیں، مروجہ عقاید اور خواہشات کا اثر خیالات اور کردار پر، خاندانی زندگی اور معاشرتی نظام کے عاید کردہ قواعد اور ضوابط کے اثرات اور وہ حالات جن کے تحت قوم کسب معاش کے لیے روزمرہ کام کرتی ہے۔"

۱۸- سپرو بیروزگاری کمیٹی

اب سپرو کمیٹی کی ان چند اہم سفارشات کا ذکر کرنا مناسب ہوگا جو صوبہ متحدہ میں بیروزگاری کے متعلق پیش کی گئی ہیں، کیونکہ ظاہر ہے کہ دوسرے صوبوں کی بیروزگاری کی صورت حال سے بھی وہ متعلق کی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ ان سفارشات کی تقسیم حسب ذیل ہوسکتی ہے:- (۱) وہ جن کا مقصد تعلیم یافتہ اشخاص کی طلب میں اضافہ کرنا ہے۔ (۲) وہ جن کا مقصد زاید رسد کو روکنا ہے۔ (۳) وہ جن کا مقصد حقیقی یا امکانی طلب و رسد کے درمیان مناسب مطابقت پیدا کرنا ہے۔

(۱) بلدیوں اور مجالس ضلع کو مجبور کرنا چاہیئے کہ وہ سڑکوں اور عمارتوں کی درستی و نگہداشت کے لیے قابل انجینیر اور سوپروائزر ملازم رکھیں۔

حکومت قابل طبی اشخاص کو حسب ذیل طریقوں سے فائدے کے ساتھ زیادہ ملازمت فراہم کرسکتی ہے:- عوام کے لیے طبی سہولتیں وسیع کی جائیں، سرکاری

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ کچی دھات کی اشیا بنانا، قینچی چھری وغیرہ تیار کرنا، روغن ظروف بنانا، دھلائی کا صابون اور روزمرہ کے استعمال کے لیے جوٹ اور اون کی اشیا تیار کرنا۔ دیکھو پانچویں صنعتی کانفرنس (دسمبر ۱۹۳۳ء) کی روئداد اور حکومت بمبئی کا اسکیم پیشہ ورانہ کارآموزی کے لیے (سنہ ۱۹۳۶ء)۔

شفاخانوں میں زیادہ تعداد میں نجی طبیب متعین کیے جائیں، دیسی ادویہ کے اثرات کے بارے میں طبی قابلیت رکھنے والے اشخاص کے ذریعے تحقیقات کرائی جائے وغیرہ۔

بلدیوں اور مجالس ضلع کو مجبور کرنا چاہیے کہ وہ صحت عامہ اور حفظ صحت کے سلسلے میں خدمات انجام دینے کے لیے مناسب قابلیت رکھنے والے طبی عہدہ داروں کو ملازم رکھیں۔

قانونی پیشے میں ضرورت سے زیادہ اشخاص کی موجودگی کو کسی حد تک
کم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مختلف کاموں کے لیے زیادہ خصوصی قابلیت کا لزوم ۶۲۴
رکھا جائے، مثلاً بعض لوگ دستاویزات کی تسوید کے خصوصی کام کے لیے ہوں کچھ مقدمات کو پیش کرنے کے لیے وغیرہ۔

حکومت کو چاہیے کہ جوں جوں مالی حالات اجازت دیں ان مفید عہدوں کو بحال کرنے کے مسئلے پر غور کرے جو حال میں کفایت کے نقطۂ نظر سے تخفیف کر دیے گئے تھے۔

سرکاری ملازموں کو ۵۵ سال کی عمر پر پہنچنے پر وظیفے پر علیحدہ کرنے کے قواعد کو سختی سے نافذ کیا جائے تاکہ نئے نوجوان امیدواروں کو ملازمت کا موقع مل سکے۔

بڑے اور چھوٹے پیمانوں کی صنعتوں کو ترقی دینی چاہیے تاکہ ان میں نوجوانوں کی زیادہ سے زیادہ کھپت ہو۔

جبری ابتدائی تعلیم کو جس کے بغیر کافی معاشی ترقی ممکن ہی نہیں شروع کرنے کے لیے پرزور تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ اساتذہ کی طلب بڑھ جائے گی اور اس حد تک موجودہ بے روزگاری میں کمی ہو جائے گی۔

(۲) فوقانی مدرسے کے امتحان کے دو درجے رکھے جانے چاہئیں۔ ایک درجے کی کامیابی محض اس بات کی تصدیق ہو کہ ثانوی تعلیم کا نصاب مکمل کر لیا گیا ہے اور کامیاب امیدوار سرکاری ملازمت کے تحتانی شعبوں میں ماموری کی قابلیت رکھتا ہے۔ نیز صنعتی، تجارتی اور زرعی مدارس میں

داخل کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف درجہ اعلیٰ کی کامیابی آرٹس اور سائنس کالجوں میں داخلے کے قابل بنائے۔ اس طریقے پر اکثر طالب علم جو جامعہ میں فنون اور سائنس کی تعلیم پانے کے ناقابل ہوں اپنی ثانوی تعلیم کے ختم پر دوسری طرف لگ جائیں گے اور اس طرح بیروزگار طیلسانین کی تعداد گھٹ جائے گی۔

(۳) مختلف فنی تعلیم کے اداروں میں عملی تعلیم کی سہولتوں کو وسیع کرنا چاہئے عام تعلیم میں عملی پہلو پر خاص زور دینا چاہئے، اور ابتدائی مدارس کی حد تک تعلیم میں دیہی رنگ قطعی طور پر غالب ہونا چاہئے۔ طبیبوں کی ہمت افزائی کرنی چاہئے کہ وہ چند بڑے شہروں میں کثرت سے جمع ہونے کی بجائے دیہی علاقوں میں جا کر بسیں اور اگر ضرورت ہو تو انھیں مالی امداد دے کر اس کے لیے آمادہ کرنا چاہئے۔

ایسی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جن سے نئے پیشوں مثلاً دواسازی، دنداں سازی، محاسبی، فن تعمیر، کتب خانہ داری، بیمے کا کاروبار، صحیفہ نگاری وغیرہ کو ترقی ہو اور ان دھندوں میں ماہرانہ قابلیت کے حاصل کرنے کے لیے تعلیم کا مناسب انتظام کرنا چاہئے۔

زراعتی طیلسانین اور ڈپلوما رکھنے والوں کو یہ ترغیب دینے کی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ حکمیاتی طریق پر کاشتکاری کو ذریعۂ معاش بنائیں دودھ گھروں کے قیام کو ترقی دینے سے بے روزگاروں کو روزگار دلانے کا ایک اور ممکنہ ذریعہ ہاتھ آئے گا۔

قابل تعلیم یافتہ اشخاص کو تجارتی کوٹھیوں میں ملازمت اختیار کرنے کی ترغیب دینی چاہئے، اور اس غرض کے لیے مختلف پیشوں اور دھندوں میں رہنمائی کے لیے حلقہ واری ادارے قائم کرنے چاہئیں۔

حکومت کو چاہئے کہ روزگار کے موقعوں کے بارے میں معلومات شائع
کرے اور والدین کو اپنے بچوں کے رجحانات کے بارے میں اور ان کے لیے ۶۲۵
موزوں دھندے کا انتخاب کرنے کے بارے میں معقول مشورے دے۔

ثانوی مدارس کو چاہیے کہ موجودہ حالت کے مقابلے میں زیادہ مختلف النوع نصاب مہیا کریں اور جامعات میں حکمیاتی اور پیشہ ورانہ تعلیم پر زیادہ زور دینا چاہیے۔

جامعات کے طیلسانین کے لیے کم و بیش کیمبرج کے نمونے پر مجالس تقررات کا قیام عمل میں لایا جانا چاہیے۔ یہ مجالس جامعات کے معین امیروں، بعض محکموں مثلاً تعلیمات، صنعت و حرفت اور زراعت کے افسروں، عوام کے بعض معتبر نمایندوں اور یورپین اور ہندوستانی کاروباری اشخاص پر مشتمل ہونے چاہئیں۔ اسی طرح کی ایک مجلس ثانوی مدارس، طبی اور زرعی و صنعتی مدارس کے فارغ التحصیل طلبا کے مسئلے سے نبٹنے کے لیے بنائی جانی چاہیے۔ ان مجالس پر لازم گردانا چاہیے کہ وہ جامعات کے طیلسانین، ثانوی مدارس اور انٹرمیڈیٹ کالجوں کے ایسے فارغ طلبا کے اعداد و شمار فراہم کریں جو طازم ہیں۔

حال ہی (اکتوبر ۱۹۳۶ء) میں حکومت صوبۂ متحدہ نے ان تدابیر کو شایع کیا ہے جو سپرو کمیٹی کی سفارشات کو روبہ عمل لانے کے لیے اختیار کی گئیں۔ یہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) صنعت و زراعت کے متعلق تجارتی ماحول میں عملی تعلیم کا انتظام۔

(۲) صنعتی قرضے کی کمپنی، فروخت اشیا کی کمپنی، اور چھوٹے پیمانے کی قرض دہندہ کمپنی کے چلانے کے لیے سرکاری امداد۔

(۳) دیہات میں طبیبوں کو مطب قایم کرنے کے لیے مالی امداد۔

(۴) زراعت کی اصلاح و ترقی کے مرکزوں کا قیام۔

(۵) مختلف طبقوں کے نمایندوں پر مشتمل صوبہ واری مجلس فراہمی ملازمت کا قیام۔

اس کے علاوہ صوبۂ متحدہ کی مجلس قانون ساز نے بیروزگاروں کی امداد کی ان تدابیر کے اخراجات کے لیے ۱۴ لاکھ روپیے سالانہ کے زاید محصولات منظور کیے ہیں۔

تیرھواں باب

اوٹاوا اور دوسرے تجارتی راضی نامے

۲۲۶

۱۔ شاہی ترجیح

اوٹاوا اور دوسرے تجارتی معاہدوں کی بحث سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے حالات کے حوالے سے شاہی ترجیح کی نوعیت و اصل غایت اور اس کے تحدیدات و مقاصد کو مختصر طور پر بیان کر دیا جائے[۱]

ایک زمانہ وہ تھا جب کہ انگلستان میں رائے عامہ کا ایک با اثر طبقہ ماوراء بحر مقبوضات کو نہ صرف مادر وطن کے لیے غیر ضروری بلکہ خود نوابادیات کے حق میں بھی نقصان رساں خیال کرتا تھا۔ لیکن "محدود انگلستان" کے حامیوں کا زمانہ مدت ہوئی گزر چکا۔ آج کل تو برطانیہ اپنے اور اپنی سلطنت کے درمیان قریب ترین تعلقات قایم کرنے کا خواہاں ہے۔ دوسری نوآبادیات سلطنت برطانیہ میں شامل ہونے کے مادی، اخلاقی اور سیاسی فوائد کی قدردانی کو روزافزوں ظاہر کر رہی ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ برطانوی اشیا کو خصوصی مراعات دینے میں پہل کر رہی ہیں اور دوسرے ملکوں کی اشیا کے مقابلے میں

---

[۱]۔ اس موضوع کی تفصیلی بحث کے لیے دیکھو مالیاتی کمیشن کی رپورٹ باب ۱۳۔

ان اشیا کے ساتھ ترجیحی سلوک کر رہی ہیں۔ سلطنتی اشیا کو ترجیح دینے کے حامیوں کا خیال ہے کہ اس سے نہ صرف سلطنتی ممالک کے معاشی اغراض بڑی حد تک ایک دوسرے سے وابستہ ہو جائیں گے بلکہ سلطنت کو یہ سبق بھی حاصل ہوگا کہ وہ بیرونی دنیا کا مقابلہ موثر طور پر متحد ہو کر کریں۔

شاہی ترجیح کی موافقت میں جو تجاویز ہیں وہ سب چند شرائط کے تابع سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا یہاں جایزہ لینا مناسب ہوگا۔ (۱) شاہی ترجیح کو اختیار کرنے کی بنا پر اس تامینی پالیسی میں کسی قسم کی نرمی یا تبدیلی نہ کی جانی چاہئے جو کسی حکومت نے اپنی صنعتوں کو فروغ دینے کی خاطر نافذ کی ہو۔ ہندوستان کو جب کہ یہ اختیار حاصل ہوگیا ہے کہ وہ اپنی صنعتوں کی تامین سلطنت متحدہ کے خلاف بھی کر سکے تو ایسی صورت میں شاہی ترجیح کے معنی عملاً یہ ہوں گے کہ سلطنتی ممالک کے مقابلے میں بیرونی ممالک سے درآمد کردہ اشیا پر نسبتہً زیادہ محصول عاید کیا جائے[1] (۲) سلطنتی ممالک ایک دوسرے کو جو مراعات دیں وہ خالصاً رضاکارانہ اصول پر مبنی ہونے چاہئیں، یہ مراعات مادر وطن کے احکام کی بنا پر یا شاہی کانفرنسوں میں منظورہ قراردادوں کی پابندی کے تحت نہ دیے جانے چاہئیں۔ (۳) آخری امر یہ کہ یہ خیال خاص کر ہندوستان میں شد و مد کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کہ شاہی ترجیح کی کوئی ایسی اسکیم نہ ہونی چاہئے کہ اس کی وجہ سے اقوام کے درمیان بدظنی پیدا ہو یا قریبی معاشی اتحاد بعید از امکان ہو جائے اور بیرونی ممالک سے دوستانہ مفاہمت میں رکاوٹ پیدا ہو۔ ۶۲۷

۲- اس تحریک کی تاریخ

یہ کہا جا سکتا ہے کہ سلطنت کی تجارت کے استحکام کی تحریک ۱۸۹۷ء میں شروع ہوئی جب کہ کینیڈا نے

[1] جنگ عظیم (۱۹۱۴-۱۸ء) سے قبل بعضوں کے نزدیک شاہی ترجیح اس وجہ سے خالص تامین کا سب سے بہتر بدل تھی کہ اس وقت خالص تامین کی پالیسی کو ناقابل عمل خیال کیا جاتا تھا۔ دیکھو سر روجر لیتھ برج کی کتاب "شاہی ترجیح کا ہندوستانی پیش کش" صفحہ ۸۔

برطانوی اشیا پر عاید کردہ محصول درآمد میں بقدر ⅙ کمی کردی ۱۸۹۸ء میں سلطنت متحدہ کے حق میں غیر مشروط طور پر ترجیحی سلوک کیا گیا اور محصول ایک چوتھائی مقرر کیا گیا۔ لیکن جہاں تک دوسری نوآبادیات کا تعلق تھا یہ شرط عاید کی گئی کہ اگر وہ کنیڈا کے ساتھ رعایتی سلوک کریں تو ان کے ساتھ مراعات کی جائیں گی۔ نوآبادیاتی کانفرنس منعقدہ ۱۹۰۲ء نے یہ تجویز کیا کہ شاہی ترجیح کی پالیسی کا اطلاق عام طور پر سلطنت کے تمام اجزا پر ہونا چاہئے اور سب سے استدعا کی گئی کہ وہ کنیڈا کے قدم بہ قدم چلیں۔ چنانچہ برطانوی اشیا پر رعایتی محصول کا طریق نیوزی لینڈ اور جنوبی آفریقہ نے ۱۹۰۳ء اور آسٹریلیا نے ۱۹۰۷ء میں جاری کیا اور برطانیہ سے یہ توقع کی گئی کہ وہ اس کے جواب میں کافی ترجیحی سلوک کرے گا۔ لیکن برطانیہ اس وقت اپنی آزاد تجارت کی پالیسی سے انحراف کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ زیادہ تر کچا مال اور غذائی اشیا درآمد کرتا تھا اور اس کی روش یہ تھی کہ مصنوعات کثیر مقدار میں برآمد کرنے والے کی حیثیت سے ارزاں ترین بازار سے کچا مال اور غذائی اشیا خریدے۔ بالخصوص غذائی اشیا کی حد تک وہ اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا کہ صرف سلطنتی (شاہی) ممالک سے ہی خریدنے کا پابند ہو جائے۔ ان حالات کے تحت سلطنت متحدہ شاہی ترجیح کی عام تحریک میں حصہ لینے کے لیے آمادہ نہ تھی۔ لیکن خود مختار نوآبادیات نے اس پالیسی کو جسے انھوں نے شروع کیا تھا اس امید میں جاری رکھا کہ مادر وطن آیندہ کبھی اس میں شریک ہونے کے وسایل مہیا کرے گی۔ ۱۹۲۰ء سے برطانوی نوآبادیات اور مقبوضات نے سلطنت متحدہ کو وسیع مراعات دیں۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء تک ۲۲ برطانوی نوآبادیات میں ترجیحی محصولات عائد کئے جا چکے تھے۔ ان ممالک کے محصولات کی تقسیم حسب ذیل طریقے پر عمل میں آئی۔ (۱) مالگزاری کے محصولات (۲) تامینی محصولات، اور سلطنت متحدہ کے حق میں اور بعض صورتوں میں ہندوستان اور دیگر سلطنتی ممالک کے حق میں بھی (۱)، (۲) کی حد تک کچھ معافیاں۔ اس کے علاوہ بلا محصول اشیا کی ایک محدود فہرست بھی تھی جن پر صرف اس صورت میں محصول عاید کیا جاتا

جب کہ وہ سلطنت کے باہر سے درآمد کی جائیں۔ نوآبادیات کی جانب سے جو مراعات بالعموم دی جاتی تھیں ان کا پہلا مقصد یہ ہوتا تھا کہ سلطنت متحدہ کو فایدہ پہنچایا جائے۔ اور باہمی معاہدوں کے ذریعے سلطنت کے دوسرے اجزا تک ان مراعات کو وسعت دی جاسکتی تھی۔ ۱۹۱۵ء سے انگلستان نے تامین کے لیے جو تدابیر اختیار کیں اس کی بنا پر وہ اس قابل ہوگیا ہے کہ سلطنت کی تیار کی ہوئی بعض اشیا پر محاصل میں مراعاتی تخفیف کرے۔ مارچ ۱۹۳۲ء میں قانون محصولات درآمد کے نافذ ہوتے ہی برطانیہ کا تامینی نظام کی حمایت میں آزاد تجارت کو ترک کر دینا شاہی ترجیح کے نقطۂ نظر سے ایک نہایت ہی اہم واقعہ ہے۔

۳۔ ترجیح اور تامین کا مقابلہ

حقیقت تو یہ ہے کہ ترجیحی محصول، تامین کی ایک شکل ہے جو موردِ عنایت ملک کو دی جاتی ہے۔ دونوں میں جو فرق
ہے وہ صرف یہ ہے کہ تامین کے تحت صارف کے اغراض ۶۴۸
خود اس کے ملک میں کسی صنعت کے راست فائدے کے لیے قربان کیے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف ترجیحی محصول کے تحت قربانی کا فایدہ موردِ عنایت ملک کے تیار کنندوں کو پہنچتا ہے۔

تامین کی طرح ترجیح صارف پر بار ڈالنے کے علاوہ حکومت کے محاصل پر بھی نقصان عاید کرتی ہے، خواہ اس کی شکل موردِ عنایت ملک کی اشیا پر قدیم شرح محصول کو برقرار رکھتے ہوئے غیر ممالک کے اشیا پر موجودہ محصولوں کے اضافے کی ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اگر اعلیٰ شرح محصول کے زیر اثر قیمتیں قایم ہوں تو اعلیٰ اور ادنیٰ شرح کا فرق موردِ عنایت ملک کے تیار کنندوں کی جیب میں جاتا ہے۔ صارف جو محصول ادا کرتے ہیں اس کی کل مقدار سرکاری خزانے میں جمع نہیں ہوتی۔

شاہی ترجیح کا ایک فایدہ یہ ہے کہ وہ سلطنت کے ذرایع کی کامل نشو ونما میں مدد دیتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی حمایت اس وجہ سے بھی کی جاتی ہے کہ وہ سلطنت کو خود مکتفی بناتی ہے، کیونکہ تامین کے مقاصد میں سے ایک مقصد قومی اکتفائیت کو بتایا جاتا ہے۔ لیکن ایک محدود معاشی نظام

بن جانے کے اعتبار سے سلطنت ایک انتہائی مصنوعی نظام بن جائے گی اور اپنے بعض اجزائے ترکیبی مثلاً ہندوستان پر ناواجب طور پر بھاری نقصانات عاید کرے گی۔ ہندوستان کی معاشی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا فایدہ اس بات میں ہے کہ سلطنت سے باہر کے متعدد ممالک سے اس کے معاشی تعلقات کو ممکنہ طور پر بے روک ٹوک ترقی دی جائے۔ فوجی تحفظ کے نقطۂ نظر سے بھی شاہی خود اکتفائیت کوئی قابل لحاظ فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور نہ دفاع کے اخراجات کو وہ گھٹا سکتی ہے۔ انگلستان کو فخر ہے کہ اس کی سلطنت کے حدود بہت وسیع ہیں۔ لیکن اس کی وسعت اور دور افتادہ نوعیت ہی اس کو دنیا کا ایک سب سے بڑا جہازی بیڑہ رکھنے پر مجبور کرتی ہے خواہ اس کا مقصد اس کے مقبوضات پر بیرونی حملے کو روکنا ہو یا سلطنت کے ایک حصے سے دوسرے میں ضروری اشیا کی نقل و حمل۔

شاہی ترجیح کے بارے میں ہندوستان کا طرزِ عمل

یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ برطانوی دولت مشترکہ کے رکن کی حیثیت سے ہندوستان کو سلطنت کے استحکام و اتحاد کو بڑھانے کی خاطر شاہی ترجیح میں دلچسپی لینا چاہیے۔ لیکن اس بارے میں ہندوستان کی حیثیت خود حکمران مقبوضات کے مقابلے میں گری ہوئی ہے۔ مقبوضات کو خود حکمرانی کا عطیہ مادر وطن سے حاصل ہوا ہے، اس لیے وہ اس کے ممنون کرم ہیں۔ آپس میں بھی ان کے تعلقات مخلصانہ ہیں، کیونکہ بے انصافی اور بددلی پیدا ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ صاف طور پر یہ اعتراف کرنا ضروری ہے کہ ہندوستان کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے۔ یہاں یہ خیال ہے کہ سیاسی اور معاشی مقاصد کے حصول کی جد و جہد میں انگلستان نے اس کی حوصلہ شکنی کی اور اس کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کیں، اور نوآبادیات نے جو مخالف ہند قانون سازی کی اس کی وجہ سے فطری طور پر ہندوستان کے تعلقات ان سے خراب ہو گئے ہیں۔ انسانی فطرت جیسی کچھ ہے اس کے لحاظ سے جس وقت تک ہندوستان سیاسی اعتبار سے غیر مطمئن رہے گا

اس وقت تک شاہی ترجیح کو ترقی دینے کے بارے میں اس کے ارادے کا متزلزل رہنا لازمی ہے۔ دوسری طرف نوآبادیات کو یہ ترغیب دینا کہ وہ مخالف ایشیا قانون سازی سے دست کش ہو جائیں یا اس میں کمی کریں بظاہر بہت دشوار کام ہے۔ ۶۲۹

۵ — ہندوستان کے تعلق سے شاہی ترجیح کی معاشیات

لیکن یہ تصور کرتے ہوئے کہ ہندوستان حتی الامکان شاہی ترجیح کی حمایت کرنے کے لیے تیار ہے دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رعایتی محصولوں کے ذریعے سے انگلستان اور سلطنت کے دوسرے ارکان کی مدد کرنا کس حد تک اس کے اختیار میں ہے اور جو مراعات اس کو ملیں گی ان سے خود اس کو کیا راست معاشی فوائد حاصل ہوں گے۔ اس سلسلے میں ہندوستان کی برآمدی و درآمدی تجارت کے بارے میں جو صورت حال ہے اور جس کا خلاصہ مندرجۂ ذیل جدول میں پیش کیا گیا ہے اس کو اجمالی طور پر جانچنا ضروری ہوگا۔

مندرجۂ ذیل جدول میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں صرف اشیا کی برآمدی و درآمدی تجارت میں برطانوی سلطنت اور سلطنت متحدہ کا فیصد حصہ کتنا ہے[1]

نام ملک	قبل جنگ عظیم اوسط		زمانہ جنگ عظیم کا اوسط		زمانہ بعد جنگ عظیم کا اوسط		۱۹۳۱-۳۲		۱۹۳۳-۳۴		۱۹۳۴-۳۵		۱۹۳۵-۳۶		۱۹۳۶-۳۷	
	درآمد	برآمد	درآمد	برآمد	درآمد	برآمد	درآمد	برآمد	درآمد	برآمد	درآمد	برآمد	درآمد	برآمد	درآمد	برآمد
سلطنت برطانیہ	۶۹٫۷	۳۱٫۱	۶۵٫۳	۵۱٫۷	۶۵٫۲	۳۱٫۳	۳۳٫۸	۳۳٫۵	۵۰٫۰	۳۶٫۷	۳۹٫۳	۳۵٫۹	۳۸٫۶	۳۶٫۳	۳۹٫۲	۳۶٫۳
سلطنت متحدہ	۶۲٫۸	۲۵٫۱	۵۶٫۵	۳۱٫۱	۵۶٫۶	۲۳٫۲	۳۵٫۵	۲۸٫۲	۴۱٫۷	۳۱٫۲	۴۰٫۶	۳۱٫۶	۳۸٫۸	۳۱٫۵	۳۸٫۳	۳۲٫۱

[1] ۔ دیکھو "تبصرہ بر تجارت ہند" سنہ ۱۹۳۶ء-۳۷ء۔ صفحہ ۲۰۱۔

مندرجہ ذیل اہم واقعات کو ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کیونکہ یہ تنقیح زیر بحث سے متعلق ہیں۔
(۱) ہندوستان کی درآمدی اشیا زیادہ تر مصنوعات اور برآمدی اشیا خام مال اور غذائی اجناس پر مشتمل ہیں۔ (۲) زمانہ قبل جنگ عظیم میں اس کی کل درآمدی اشیا کا تقریباً ⅔ حصہ سلطنت برطانیہ سے آتا تھا جس میں سلطنت متحدہ کا حصہ سب سے بڑا تھا۔ (۳) جنگ عظیم سے قبل ہندوستانی برآمدی اشیا زیادہ تر بیرونی ممالک کو جاتی تھیں اور کل مقدار کے صرف تقریباً ۴۰ فی صد حصے کی سلطنت برطانیہ میں کھپت ہوتی تھی سلطنت متحدہ کو جو برآمدی اشیا جاتی تھی ان کی مقدار برآمدی اشیا کی مجموعی مقدار کے مقابلے میں ¼ تھی۔ (۴) جنگ عظیم کے بعد کے زمانے میں جیسا کہ مندرجہ بالا جدول سے معلوم ہوتا ہے، درآمد و برآمد دونوں کی حد تک ہندوستان کی تجارت میں سلطنت متحدہ اور برطانوی سلطنت کا حصہ نسبتہً انحطاط پذیر رہا۔ ۳۳-۱۹۳۲ء اور ۳۴-۱۹۳۳ء کے درمیان برطانیہ کے حصے میں کچھ اضافہ ہوا۔ چنانچہ ۳۲-۱۹۳۱ء کے ۵ر۳۵ فیصد کے مقابلے میں اس کا
۶۳۰ تناسب بڑھ کر ۷ر۴۱ فیصد ہوگیا۔ اس بحالی کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ اوٹاوا کے ترجیحات کے تحت برطانیہ کو ہندوستانی بازار میں موافق مرام حیثیت حاصل ہوگئی تھی[1] لیکن حالیہ سالوں میں برطانیہ کا فیصد حصہ کم ہوگیا ہے۔ چنانچہ ۳۷-۱۹۳۶ء میں ۴ر۳۸ فیصد تھا۔ اس کے برعکس برآمدی تجارت میں اس کا حصہ کافی بڑھ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانیہ سے تجارت کرنے میں بالعموم ہندوستان میں سامان برآمد کے مقابلے میں درآمد کی جو زیادتی رہا کرتی تھی وہ ۳۷-۱۹۳۶ء میں ۱۳ کروڑ روپے کے موافق توازن تجارت میں مبدل ہوگئی۔

برطانیہ اور سلطنت برطانیہ کے دوسرے ممالک سے درآمدی ہوئی اشیا

[1] اس موضوع پر باب ۶ فصل ۱۴ میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔

کو جو فروغ دیا گیا اس کی حد تک ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ہندوستان ایک مفلس ملک ہے اور ناامینی پالسی جس پر وہ عمل پیرا ہوا ہے اس کی وجہ سے اس کے باشندوں کو مختلف قسم کی قربانیاں کرنی پڑیں گی۔ شاہی ترجیح کے سلسلے میں مزید بار برداشت کرنے کی ملک کی صلاحیت بالکل محدود ہے اور دوسروں کو جو حقیقی مراعات وہ دے سکتا ہے وہ بظاہر بہت معمولی ہوں گے۔

۱۹۰۳ء میں حکومت ہند نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "معاشی نقطۂ نظر سے ہندوستان سلطنت کو بہت کم مراعات دے سکتا ہے اور اس کے معاوضے میں جو مراعات حاصل کر سکتا ہے ان کا دائرہ اور بھی محدود ہوگا۔ اس طرح وہ بہت گھاٹے اور نقصان میں رہے گا"[1] حکومت کو یہ ڈر تھا کہ ہندوستان سلطنت کے ملکوں کے ساتھ جو مراعات کرے گا۔ ان کے مقابلے میں بیرونی ممالک اس کے خلاف انتقامی تدابیر اختیار کریں گے۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانے میں رجحان یہ ہے کہ بین سلطنتی تجارتی انتظامات کو نجی معاملہ تصور کیا جائے اور بیرونی ممالک کے خلاف مخاصمانہ کارروائی نہ سمجھا جائے۔ لیکن یہ سوال کہ آیا ہم انتقام کے خطرے کو نظر انداز کر سکتے ہیں یا نہیں اس کا انحصار نہ صرف اس جذبے پر ہوگا جس کے تحت شاہی ترجیح کی پالسی روبہ عمل لانے کے لیے خصوصی کارروائی کی جائے گی بلکہ اس بات پر بھی ہوگا کہ بیرونی ممالک پر اس کا کس حد تک مخالف اثر پڑتا ہے۔ ہندوستان کے لیے بیرونی ممالک کے بازار اس قدر زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کہ شاہی ترجیح کی کسی غیر مدبرانہ پالسی پر عمل کرکے ان کو کھویا یا خطرے میں ڈالا نہیں جا سکتا۔

چونکہ شاہی ترجیح کا مفہوم "کسی بیرونی طاقت کی جانب سے آمرانہ احکام" نہیں بلکہ "آزاد اقوام کے درمیان تعاون" ہے' اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شاہی ترجیح کے سلسلے میں جملہ تجاویز نافذ ہونے سے قبل ہندوستانی مجلس قانون ساز کی منظوری حاصل کی جائے۔ اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ مجلس

---

[1] ۱۹۲۳ء کی شاہی معاشی کانفرنس میں ہندوستان کے نمایندے نے اس خیال کا اعادہ کیا۔

قانون ساز جدید دستور کے تحت ممالک کی محصولی پالسی کی تشکیل پر کس حد تک قطعی اثر ڈالے گی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ہر چیز کا انحصار اس بات پر ہے کہ امتیازات[لہ] کے بارے میں تحفظات اور شرایط کی تعبیر کس طور پر کی جاتی ہے ۱۳۱۶

۶۔ معاہدۂ اوٹاوا[ٹہ] شاہی کانفرنس نے جو لندن میں اکتوبر ۱۹۳۰ء میں منعقد ہوئی شاہی ترجیح اور دوسرے مجوزہ طریقوں شلاً رسدی طریقہ، تھوک خریداری وغیرہ پر بحث کی جن کے ذریعے سے سلطنت کے ملک ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ موثر طور پر فائدہ حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن کانفرنس نے بجز اس کے کوئی مادی نتیجہ حاصل نہیں کیا کہ سلطنت کے ارکان نے تین سال کی مدت کے لیے موجودہ ترجیحات کا سلسلہ جاری رکھنے کے بارے میں آپس میں یقین دلایا۔ سرجاضرے کاربیٹ ہندوستانی نمایندے نے یہ خیال ظاہر کیا کہ گو ہندوستان ان تمام تجاویز پر ہمدردانہ غور کرنے کے لیے تیار ہے جو بین سلطنتی تجارت کی ترقی کی ہمت افزائی کے لیے مرتب ہوں لیکن وہ خود کو ترجیح کی کسی عام اسکیم کا پابند بنا لینے سے قاصر ہے اور اپنی امتیازی تامین کی پالسی سے انحراف کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ لیکن جولائی و اگست ۱۹۳۲ء میں بمقام اوٹاوا جو شاہی معاشی کانفرنس منعقد ہوئی اس میں ایک تجارتی

لہ۔ دیکھو جلد اول باب ۱۳ فصل ۱۹۔

ٹہ۔ دیکھو ناظم اطلاعات عامہ کا شائع کردہ پریس نوٹ موسوم بہ "ہندوستان اور اوٹاوا" اور "ہندوستان کی خارجی تجارت کی پالسی (۱۹۳۶ء)"۔ اوٹاوا کے معاہدے کے خلاف بہترین دلیل ڈی، آر، گاڈگل کی کتاب "ہندوستان کے لیے شاہی ترجیح" (گوکھلے انسٹی ٹیوٹ آف پالٹکس اینڈ اکنامکس اشاعت نمبر ۲) اور اسی مصنف (گاڈگل) کے سلسلۂ مضامین میں ملتی ہیں۔ جو رسالہ سرونٹ آف انڈیا میں ۱۶ جنوری ۱۹۳۶ء اور ۱۲ مارچ ۱۹۳۶ء کے درمیان شایع ہوا۔ ڈی گھوش کی کتاب "اوٹاوا کی نظر ثانی (۱۹۳۶ء)" اور بین، آر، سرکار کی کتاب "ہندی برطانوی تجارتی تعلقات، معاہدۂ اوٹاوا اور اس کے بعد (۱۹۳۶ء)" کا بھی قاری کو حوالہ دیا جاتا ہے۔

معاہدہ طے پایا اور ہندوستان کو معلوم ہوا کہ وہ وسیع شاہی ترجیحات کی ایک ایسی اسکیم میں شریک ہو چکا ہے جس سے اس نے ایک عرصۂ دراز سے شدید بیزاری کا اظہار کیا تھا۔ ہم ہندوستانی محصول کی ترمیم (تجارتی معاہدۂ اوٹاوا) کے قانون بابتہ دسمبر ۱۹۳۲ء پر تبصرہ کر چکے ہیں[1]۔ جس کی وجہ سے وہ محصولی تغیرات ہوئے جو ۲۰ اگست ۱۹۳۲ء کو حکومت ہند اور ہز مجسٹی کی حکومت برطانیہ کے درمیان طے شدہ عام تجارتی معاہدے کی وجہ سے ضروری ہو گئے تھے محصول میں اس طرح جو تبدیلیاں کی گئیں ان کا نفاذ یکم جنوری ۱۹۳۳ء کو ہوا۔ لوہے اور فولاد کے بارے میں ایک ذیلی معاہدے پر ۲۲ ستمبر کو دستخط ہوئے۔ ہندوستانی مجلس قانون ساز نے ان دونوں معاہدوں کی توثیق کی۔ اوٹاوا کے تجارتی معاہدے کو کوئی فریق چھ ماہ کی تنسیخ کی نوٹس دینے کے بعد کسی وقت ختم کر سکتا تھا۔ یہاں اوٹاوا کے معاہدے کے موافق اور مخالف پہلوؤں کو مختصر طور پر بیان کرنا مناسب ہوگا کیونکہ اس سے ان دلایل اور جوش و خروش کا کچھ اندازہ ہوگا جو ہندوستان پر اثر انداز ہونے کی حیثیت سے شاہی ترجیح کے مسئلے کے بارے میں ظاہر کیے جا رہے تھے۔

۷۔ اوٹاوا کے معاہدے کی موافقت میں دلایل

حالیہ معاشی بحران کی پہلی علامت یہ تھی کہ تمام اشیا کی قیمتوں میں نسبتہً زیادہ کمی ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان پر خام مال فراہم کرنے والے دوسرے ممالک کی طرح خاص طور پر بری ضرب پڑی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی برآمدی تجارت کو مغربی بازاروں میں روز افزوں مسابقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ دنیا کے اکثر علاقوں مثلاً افریقہ، جنوبی امریکا اور ایشیائی مجمع الجزایر میں نئی نئی زمینیں زیر کاشت لائی جا رہی تھیں اور ان کی پیداوار دنیا کے بازاروں تک اور بھی زیادہ آسانی کے ساتھ اس وجہ سے لائی جانے لگی کہ حمل و نقل کی سہولتوں میں اصلاح و ترقی ۶۳۲

[1] دیکھو باب ۱۱ فصل ۵۔

ہو گئی تھی۔

دوسرے ملکوں میں بھی پیدایش وسیع ہو رہی تھی اور بعض بیرونی ممالک کے برآمد کرنے والے جو جنگ عظیم سے قبل کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتے تھے اب زبردست مسابقت کرنے والے ثابت ہو رہے تھے۔ اس بڑھتی ہوئی مسابقت کا اثر ہماری بعض اہم برآمدی اشیا مثلاً روغن دار تخموں، سوتی ریشوں، غذائی اجناس، چوبینہ وغیرہ پر شدت سے محسوس ہو رہا تھا۔ اس صورت حال میں مزید دشواری اس پالیسی سے پیدا ہو گئی جو اکثر یورپی ممالک اور ریاستہائے متحدہ امریکا نے جاری اور تحت جاری علاقوں میں اپنے ہی نوآبادیات کی پیداوار کی طلب کو فروغ دینے کے بارے میں اختیار کی تھی ہندوستان جیسے ملکوں کے لیے بدشگونی کا ایک اور سبب یہ تھا کہ روز بروز مصنوعی بدل دریافت ہو رہے تھے جس کی وجہ سے ہندوستان کی بعض معیاری برآمدی اشیا کی مانگ میں کمی کا رجحان رونما ہوا۔ اس کے علاوہ اکثر ملکوں نے معاشی علیحدگی کی پالیسی پر عمل شروع کیا اور اس سلسلے میں بھاری محصول درآمد عاید کیے گئے" مقاجی نوعیت کے محصول لگائے گئے" رسدی طریق اختیار کیا گیا مبادلۂ خارجہ پر کڑی نگرانی قایم کی گئی اور بین قومی تجارتی آزادی پر دوسری بندشیں عاید کی گئیں۔

اس اثنا (ستمبر ۱۹۳۱ء) میں برطانیہ نے معیار طلا کو ترک کیا اور ہندوستان نیز سلطنت کے اکثر دوسرے ملکوں کے زر اسٹرلنگ سے منسلک ہو گئے۔ محولۂ صدر درآمدی محصولوں کے قانون بابتہ ۱۹۳۲ء کی بموجب برطانیہ میں بہت سی اشیا پر جو مجموعی درآمد کے دو تہائی حصے پر مشتمل تھیں محصول عاید کیے گئے۔ لیکن سلطنت کی پیداوار کو ان محصولوں سے اس وقت تک کے لیے مستثنیٰ کرنے کا انتظام کیا گیا جب تک کہ نوآبادیات اور ہندوستان سے محصولی انتظامات کے متعلق گفت و شنید مکمل نہ ہو جائے۔ یہ گفت و شنید بالآخر اوٹاوا کے معاہدے کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس کے حامیوں کا خیال تھا کہ ہندوستان نے معاہدے میں شریک ہو کر مدبرانہ کاروائی کی کیونکہ عدم شرکت کے معنی یہ ہوتے کہ ہندوستان دنیا کے

سب سے مستحکم اور وسیع بازار یعنی سلطنت متحدہ میں رسائی حاصل کرنے سے محروم ہوجاتا۔ جیساکہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے ہندوستانی برآمدوں کی نکاسی کے بازار تیزی سے تنگ ہو رہے تھے۔ فرانس اور جرمنی جیسے دوسرے ممالک زر کی مشکلات سے نجات حاصل کرنے کے لیے ابھی تک کشاکش میں مبتلا تھے۔ اس کے برخلاف وہ ممالک جو اسٹرلنگ سے منسلک تھے ان مشکلات سے نسبتہً بچے ہوئے تھے اور اسی سبب سے ان سے تجارت آسان اور مبادلے کی پیچیدگیوں سے محفوظ تھی۔ ان تمام اسباب کی بنا پر یہ استدلال پیش کیا گیا کہ ہندستان نے اوٹاوا کے معاہدے میں شرکت کا فیصلہ کرکے اپنے اغراض کی بہترین طریقے پر تکمیل کی۔

تین سال بعد (سنہ ۱۹۳۲ء میں) ہندوستان کی برآمدی تجارت کی ۶۲۳
اہم خصوصیات پر تبصرہ کرتے ہوئے اوٹاوا کے معاہدے کے حامیوں نے اپنی دانست میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہندوستان کو اس معاہدے سے کافی فوائد حاصل ہوں گے اور مزید مدت کے لیے اس کو جاری رکھنے کے لیے زور دیا۔

ذیل میں چند اعداد درج کیے جاتے ہیں جن کو امر زیر تنقیح سے متعلق پیش کیا جاتا ہے۔

ہندوستان سے مجموعی برآمد (لاکھ روپے میں)

مجموعی قیمت	سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء	سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء	سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء	سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء
تمام ملکوں کو	۱۵۷٫۵۶	۱۳۳٫۴۷	۱۴۷٫۵۲	۱۵۲٫۲۹
انڈکس	۱۰۰	۸۴٫۶	۹۵٫۶	۹۶٫۷
سلطنت متحدہ کو	۴۲٫۸۸	۳۶٫۸۲	۴۷٫۲۱	۴۸٫۰۷
انڈکس	۱۰۰	۸۵٫۹	۱۰۰٫۱	۱۱۲٫۱
دوسرے ممالک کو	۱۱۴٫۶۸	۹۶٫۴۵	۱۰۰٫۳۱	۱۰۴٫۳۲
انڈکس	۱۰۰	۸۴٫۱	۸۷٫۵	۹۰٫۹

ملک	سنہ ۳۳-۱۹۳۲ء کے مقابلے میں سنہ ۳۵-۱۹۳۴ء میں فی صد اضافہ	سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء کے مقابلے میں سنہ ۳۵-۱۹۳۴ء میں فی صد اضافہ	سنہ ۳۳-۱۹۳۲ء کے مقابلے میں سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء میں فی صد اضافہ
تمام ممالک	۱۰٫۵	۵٫۳	۱۴
سلطنت متحدہ	۲۸٫۲	۲٫۸	۳۰٫۵
دوسرے ممالک	۴	۵٫۹	۸

ہندوستان سے ان اشیا کی برآمد جن میں ترجیح حاصل تھی۔
(لاکھ روپے میں)

	سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء	سنہ ۳۳-۱۹۳۲ء	سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء	سنہ ۳۵-۱۹۳۴ء
مجموعی برآمد	۱۴۲۰٫۹۳	۹۵٫۰۴	۹۹٫۳۴	۹۴٫۴۱
انڈکس	۱۰۰	۸۵٫۷	۸۹٫۶	۸۵٫۱
سلطنت متحدہ کو	۳۳٫۳۰	۲۹٫۷۳	۳۶٫۴۸	۵۶٫۷۱
انڈکس	۱۰۰	۸۹٫۳	۱۰۹٫۵	۱۱۰٫۲
مجموعی برآمد میں سلطنت متحدہ کا حصہ	۳۰٫۰	۳۱٫۳	۳۷٫۷	۳۶٫۹
دوسرے ممالک کو	۷۷٫۹۳	۶۵٫۳۱	۶۰٫۸۶	۵۷٫۷۰
انڈکس	۱۰۰	۸۴٫۱	۸۱٫۰	۷۴٫۳
مجموعی برآمد میں دوسرے ممالک کا حصہ	۷۰٫۰	۶۸٫۷	۶۵٫۳	۶۱٫۱

۴۳۴

	سنہ ۳۳-۱۹۳۲ء کے مقابلے میں سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء میں فی صد تغیر	سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء کے مقابلے میں سنہ ۳۵-۱۹۳۴ء میں فی صد تغیر	سنہ ۳۳-۱۹۳۲ء کے مقابلے میں سنہ ۳۵-۱۹۳۴ء میں فی صد تغیر
سلطنت متحدہ	+۲۲٫۶	+۰٫۶	+۲۳٫۴
دوسرے ممالک	-۳٫۷	-۸٫۳	-۱۱٫۷
میزان	+۴٫۵	-۵٫۰	-۰٫۷

ہماری برآمدی تجارت کی مجموعی قیمت سنہ ۳۵-۱۹۳۴ء میں ۱۵۲٫۴ کروڑ روپے تھی اور ترجیحی مدات اس کے ۶۲ فیصد تھے۔

ترجیحات سے مستفید ہونے والی ہندوستانی ریاستوں کے ناریل کے مصنوعات، مسالہ، تخم ارنڈی اور مونگ پھلی کی برآمد کو جس حد تک ان کے اعداد دستیاب ہو سکے محسوب کیا گیا ہے۔

ہندوستان سے ان اشیا کی برآمد جن میں سلطنت متحدہ میں ترجیح حاصل نہ تھی

(لاکھ روپے میں)

	سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء	سنہ ۳۳-۱۹۳۲ء	سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء	سنہ ۳۵-۱۹۳۴ء
مجموعی برآمد	۴۶٫۶۳	۳۸٫۲۳	۴۸٫۱۸	۳۷٫۹۸
انڈکس	۱۰۰	۸۲٫۰	۱۰۳٫۳	۱۲۴٫۳
سلطنت متحدہ کو برآمد	۹٫۵۸	۷٫۰۹	۱۰٫۷۳	۱۱٫۳۶
انڈکس	۱۰۰	۷۴٫۰	۱۱۲٫۰	۱۱۸٫۶
سلطنت متحدہ کا فیصد حصہ	۲۰٫۵	۱۸٫۵	۲۲٫۳	۱۹٫۶
دوسرے ممالک کو برآمد	۳۷٫۰۵	۳۱٫۱۴	۳۷٫۴۵	۴۶٫۶۲
انڈکس	۱۰۰	۸۴٫۰	۱۰۱٫۱	۱۲۵٫۱
دوسرے ممالک کا فیصد حصہ	۷۹٫۵	۸۱٫۵	۷۷٫۷	۸۰٫۴

	سنہ ۳۳-۱۹۳۲ء کے مقابلے میں سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء میں فیصد اضافہ	سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء کے مقابلے میں سنہ ۳۵-۱۹۳۴ء میں فیصد اضافہ	سنہ ۳۳-۱۹۳۲ء کے مقابلے میں سنہ ۳۵-۱۹۳۴ء میں فیصد اضافہ
سلطنت متحدہ	۵۱٫۳	۷٫۷	۶۰٫۳
دوسرے ممالک	۲۰٫۴	۲۴٫۴	۴۹٫۷
میزان	۲۶٫۰	۲۰٫۳	۵۱٫۶

جیسا کہ مندرجہ بالا اعداد سے معلوم ہوتا ہے ۳۳-۱۹۳۲ء اور ۳۴-۱۹۳۳ء کے
درمیان سلطنت متحدہ سے ہندوستان کی برآمدی تجارت ۲ر۲۸ فیصد بڑھ گئی۔ اس
کے برخلاف دوسرے ملکوں سے اس کی تجارت میں صرف ۴ فیصد اضافہ ہوا۔ اس میں ۶۳۵
شک نہیں کہ خام اشیا کی بڑھتی ہوئی طلب اس ترقی کی ایک حد تک ذمہ دار
تھی۔ لیکن سلطنت متحدہ میں صنعتی بحالی پیدایش کے ہر شعبے میں یکساں نہ تھی بحالی
سب سے زیادہ بھاری صنعتوں میں رونما ہوئی جن کے لیے خام اشیا ہندوستان
سے بڑے پیمانے پر فراہم نہیں کی جاتیں۔ اس لیے اس عامل کو ہندوستان سے
سلطنت متحدہ میں جانے والی برآمدی اشیا کے اضافے کا کاملاً ذمہ دار نہیں قرار
دیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ سلطنت متحدہ کے ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء کی درآمدی تجارت
کے اعداد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیت مجموعی خام پیداوار کی درآمد میں جس
تناسب سے اضافہ ہوا اس کے مقابلے میں ہندوستان سے درآمد کا تناسب
بڑھا ہوا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۳۴-۱۹۳۳ء میں ہندوستان کی برآمد کی
توسیع کی ذمہ داری بڑی حد تک ترجیحات پر تھی۔

۳۵-۱۹۳۴ء کے اعداد سے ترقی کی رفتار میں کچھ کمی ظاہر ہوئی۔ لیکن ایسا
ہونا بھی چاہیے تھا۔ کیونکہ ترجیحی محصول کا اثر پہلے سال میں سب سے زیادہ محسوس
ہوگا اور ترقی کی رفتار میں تدریجی کمی ظاہر ہوگی اور بالآخر ترقی کی مزید گنجایش
نہیں رہے گی۔ اس کے علاوہ بعد کے برسوں میں بعض خاص اسباب پیدا ہوگئے
جن کی وجہ سے چاء جیسی اشیا کی حد تک (جن کی برآمد پر بین قومی معاہدے
کی رو سے بندشیں عاید تھیں) سلطنت متحدہ سے تجارت میں کافی رکاوٹ
ہوگئی۔ اسی کے ساتھ بعض دوسرے خاص اسباب کی بنا پر ہندوستان کی
تجارت دوسرے ملکوں سے بڑھتی گئی۔ مثلاً جاپان نے روئی کی اس کم مقدار
کی تلافی کرنے کے لیے جو ۱۹۳۳ء میں جاپان کی طرف سے ہندوستانی روئی
کے بائیکاٹ کے زمانے میں خریدی گئی تھی غیر معمولی مقدار میں روئی خریدی[۱]

---

[۱]- دیکھو فصل ۱۲ آگے کے صفحات میں۔

مندرجۂ بالا اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک طرف ترجیحی اشیا کی برآمد میں تقریباً ۱۰ فیصد اضافہ ہوا تو دوسری طرف غیر ترجیحی اشیا کی برآمد میں اس سے زیادہ یعنی زاید ۱۸ فیصد اضافہ ہوا۔ یہ واقعہ معترضین کی طرف سے اس بات کے ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا کہ ترجیحی اشیا کی تجارت کی توسیع کا اصل سبب معاہدہ نہیں تھا بلکہ سلطنت متحدہ میں صنعتی جد و جہد کی تجدید کی وجہ سے وہاں ہندوستانی اشیا کی مانگ عام طور پر زیادہ ہو گئی تھی۔ علاوہ ازیں ترجیحی مدات کی حد تک سلطنت متحدہ نے ہندوستان کو جو مراعات دی تھیں وہ ہندوستان کے لیے زیادہ فایدہ مند نہ تھیں۔

لیکن اس نقطۂ نظر میں کئی مادی واقعات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۴ء کے درمیان سلطنت متحدہ میں ترجیحی مدات کی جو اشیا تمام علاقوں سے درآمد ہوئیں ان کی مقدار میں ۲۲ فیصد کمی ہو گئی۔ اس طرح ہندوستانی اشیا کی درآمد ایک ایسے بازار میں بڑھ گئی جس میں بحیثیت مجموعی انقباض پیدا ہو رہا تھا اور اس لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا حق بجانب تھا کہ ترجیح سے بطور خاص ۶۳۶
ہندوستان کو مدد ملی۔ غیر ترجیحی مد میں توسیع تعجب خیز نہ تھی، کیونکہ یہ مد ایسی اشیا پر مشتمل تھی جو بیرونی ممالک کی شدید مسابقت سے دوچار نہ ہوتی تھیں اور اسی وجہ سے وہ ترجیحی اشیا کی فہرست میں شامل نہیں کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ غیر ترجیحی قسم کی بعض اہم مدات کی حد تک (صنعتی تجدید کو چھوڑ کر) خاص طور پر چند موافق اثرات تھے جو ان کی برآمد میں اضافے کا موجب تھے۔ مثلاً روئی کی طلب کے اضافے کا باعث زیادہ تر لنکا شائر انڈین کاٹن کمیٹی کا پروپگنڈا تھا۔ ربر کی مانگ بندش کی ایک اسکیم کی وجہ سے، دھاتوں اور کچ دھات کی مانگ بھاری صنعتوں کی تجدید یافتہ سرگرمی (جو عام صنعتی احیا سے مختلف تھی) کی وجہ سے اور لاکھ کی مانگ لندن کے تاجروں کے حلقے Ring کی سٹہ بازی کی وجہ سے بڑھ گئی تھی۔ موخر الذکر طبقہ چپڑا اور سیاہ مرچ بڑی مقدار میں خرید کر ذخیرہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

معاہدے کے نقادوں کا یہ استدلال تھا کہ سلطنت متحدہ کو برآمد ہونے والی

اشیا کی بڑھی ہوئی مقدار محض اسبات کو ظاہر کرتی تھی کہ تجارت کا رخ بدل گیا تھا۔ اس کا یہ جواب دیا گیا کہ سلطنت متحدہ کو برآمد کی ہوئی اشیا کے اضافے کو اوٹاوا کے معاہدے کی طرف منسوب کرنا درست تھا۔ البتہ دوسرے ممالک کو برآمد کی ہوئی اشیا میں جو کمی ہوئی اس کی وجہ خود اکتفائی کی پالیسی تھی جس پر یہ ملک کار بند تھے اور جس کا معاہدۂ اوٹاوا سے کوئی تعلق نہ تھا۔ درحقیقت یہی تجارت میں رکاوٹ پیدا کرنے والی پالیسی تھی جس سے انگلستان اور ہندوستان دونوں کی تجارت کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے معاہدۂ اوٹاوا حق بجانب تصور کیا گیا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ہندوستان اب تک اس قابل تھا کہ اپنی برآمدی اشیا کا دو تہائی حصہ برطانوی سلطنت سے باہر کے ملکوں کو فروخت کرے۔ لیکن ان بیرونی بازاروں پر گرفت قایم رکھنا اس کے لیے زیادہ سے زیادہ مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ ترجیحات کا طریق ایک خود حفاظتی تدبیر تھی جسے ہندوستان نے اختیار کیا۔ گو اس سے کچھ نقصان بھی ہوا مثلاً ہندوستان کی درآمدی تجارت بیرونی ممالک سے کم ہو گئی اور نتیجتہً ان ممالک کو اس کی برآمد بھی گھٹ گئی۔ لیکن اس قسم کے حالات بہر صورت پیدا ہوئے اور ہندوستان ان کو روک نہیں سکتا تھا۔ معاہدۂ اوٹاوا کے خلاف ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی تھی کہ اس کی وجہ سے ہندوستان کی بیرونی گاہک اس کے خلاف انتقامی کارروائی کریں گے لیکن بیرونی ممالک نے درآمدی تجارت پر جو مختلف بندشیں عاید کی تھیں وہ بلحاظ نوعیت عام تھیں اور ہندوستان کے خلاف کوئی امتیازی کارروائی نہیں کی گئی تھی۔ ان بندشوں کا محرک تجارتی پالیسی کے چند نئے تصورات تھے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ وہ بندشیں معاہدۂ اوٹاوا کی پیدا کی ہوئی کسی خلش کا نتیجہ تھیں۔

۸۔ معاہدۂ اوٹاوا کے خلاف دلائل	معاہدۂ اوٹاوا کے مخالفوں نے اس کی مخالفت زیادہ تر اس بنا پر کی کہ اس کا رجحان ہندوستان کی تجارت کو اس کے اصل راستوں سے ہٹانا اور

ارادی طور پر اس پر کاری ضرب لگتا تھا۔ ترجیحات نے سلطنت متحدہ میں مسابقت کو کم کیا تو دوسری طرف دوسرے زیادہ اہم بیرونی بازاروں میں اس کی شدت کو بڑھادیا۔ ترجیح کی اہم مدات کے دیکھنے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی
تھی کہ صرف السی، دریاں، کمل اور چاول جیسی چند اشیا کو ترجیح سے کچھ فائدہ ۶۳۷
حاصل ہوا۔ یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو ہندوستان سے برما کی علیحدگی کے بعد چار اہم اشیا (چاول، ساگوان، خام سیسہ اور موم) جنھیں معاہدۂ اوٹاوا کے تحت ترجیح حاصل تھی ان کے متعلق سلطنت متحدہ سے کوئی جدید معاہدہ خارج از امکان ہوگیا[1]۔ چند اشیا کے لیے جو ترجیح عطا کی گئی تھی وہ درحقیقت غیر ضروری تھی۔ مثلاً چائے کی بندش کی اسکیم کے تحت چائے پیدا کرنے والے اہم ملکوں یعنی ہندوستان، سیلون اور جاوا نے آپس میں معاہدہ کرلیا تھا جس کی وجہ سے چائے کی تجارت اچھی طرح چل رہی تھی۔ اگر سلطنت متحدہ کے بازار میں ہندوستان سیلون کے مقابلے میں کچھ گھاٹے میں رہے تو بھی وہ دنیا کے مجموعی صرف کے اعتبار سے برآمد کی مجموعی مقدار کے تعین کی اسکیم کے تحت دوسرے بازاروں میں اس نقصان کی تلافی کرسکتا ہے۔ اس کے علاوہ جہاں شے زیر بحث سلطنت متحدہ کے بازار میں قوی حیثیت رکھتی ہو جیسا کہ سن کی مصنوعات، بکرے کے چمڑے، تخم ارنڈی، لاکھ، جوٹ، ابرک کی حد تک تھا، وہاں ترجیح غیر ضروری تھی۔ بعض اشیا کی تجارت میں توسیع کا امکان حسب ذیل اسباب کی بنا پر کم تھا:۔ (۱) سلطنت کے دوسرے حریفوں کی موجودگی مثلاً دباغت کیے ہوئے چمڑے کی حد تک آسٹریلیا، مونگ پھلی کی حد تک برطانوی مغربی آفریقہ سیسے کی حد تک کنیڈا اور آسٹریلیا، ناریل کی مصنوعات اور مسالوں کی حد تک سیلون، کافی کی حد تک مشرقی آفریقہ۔ (۲) بعض چیزوں مثلاً مونگ پھلی کی حد تک بیرونی بازاروں کے مقابلے میں سلطنت متحدہ کا بازار بہت ہی چھوٹا

[1] دیکھو بی، کے، مدن کا مضمون ''دو فلتری طریق اور ہندوستانی تجارت'' انڈین جرنل آف اکنامکس، بابتہ جولائی ۱۹۳۸ء میں۔

تھا۔ (۳) بعض اشیا مثلاً چاول، جو اور تمباکو کی حد تک ہندوستانی برآمد کی مجموعی مقدار اس قدر کم تھی کہ ترجیح یا کسی اور طریقے سے ان کی تجارت کو فروغ دینا بے سود تھا[1] (۴) بعض ہندوستانی اشیا جو اس قسم کی ہوتیں جن کی سلطنت متحدہ میں مانگ ہو وہ ترجیح سے فائدہ حاصل نہ کر سکتی تھیں مثلاً ہندوستانی تمباکو۔ (۵) آخری امر یہ کہ اشیائے بدل کی مسابقت کی وجہ سے ترجیح کے اثرات بڑی حد تک زایل ہو سکتے تھے مثلاً روغنی تخموں کے بدل موجود تھے۔

ایک اور اعتراض یہ تھا کہ ترجیحات سے (تجارت پر زیادہ محصول کی
بجائے کم محصول لگائے جانے کی حد تک) یا تو حکومت کے محاصل کا نقصان ہوتا تھا ۶۳۸
یا غیر برطانوی ارزاں اشیا کی بجائے نسبتہً گراں اشیا خریدنے پر مجبور ہونے کی وجہ سے صارف کا نقصان ہوتا تھا۔ ہندوستانی حکومت یا صارف اس نقصان کو برداشت کرنے کی قابلیت نہ رکھتے تھے۔

شاہی ترجیح نوآبادیات اور مقبوضات کے لیے موزوں ہو سکتی ہے۔ کیونکہ سلطنت متحدہ سے ان کی تجارت باہمی ضروریات کی تکمیل پر مبنی ہے! انگلستان کو ان خام اشیا کی ضرورت ہے جو مقبوضات خاص کر آسٹریلیا اور کنیڈا فراہم کر سکتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ وہ متعدد برطانوی مصنوعات کو درآمد کرنے کے قابل بھی ہیں اور خواہش مند بھی۔ ان دونوں اعتباروں سے ہندوستان کا موقف جداگانہ ہے۔ اس کے لیے یہ بات زیادہ فائدہ بخش اور قابل عمل ہے کہ اپنی پیداوار کے لیے سلطنت متحدہ کے سوا کوئی دوسرا بازار تلاش کرے اور اس کے مختلف النوع قدرتی ذرایع اس کے لیے اس بات کو ممکن بناتے ہیں کہ وہ خود اکتفائی کو اپنی حوصلہ مندی کا نصب العین قرار دے چنانچہ اس نصب العین تک رسائی حاصل کرنے کی غرض سے وہ برطانوی مصنوعات کی مسابقت کے خلاف تامین کا خواہاں ہے جو اس وقت ہندوستان

[1] لیکن سر برائس برٹ نے مجلس قانون ساز کے ایک مباحثے میں تمباکو کی تجارت کے متعلق کہا تھا کہ اس (تمباکو) کی ۹۰ لاکھ پاونڈ کی تجارت ہے"۔

میں درآمد ہوتی ہیں۔

ہندوستان کی خارجی تجارت کا بعد از جنگ میلان یہ رہا کہ سلطنت کے ارکان سے دور رہا جائے[1] لیکن یہ بات نہایت اہمیت رکھتی ہے کہ وہ اب بیرونی ممالک کے بازاروں سے چمٹے رہنے کی منظم اور پر عزم کوشش کر رہا ہے۔ کیونکہ انھی میں اس کی برآمدی اشیا کے بڑے حصے کی کھپت ہوتی ہے۔ موجودہ حالات کے تحت اس مقصد کو حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ غیر ممالک سے باہمی معاہدات کا ایک سلسلہ شروع کیا جائے[2] لیکن معاہدۂ اوٹاوا نے ہندوستان کی اپنے فائدے کی خاطر سوداکرنے کی قابلیت کو بری طرح گھٹا دیا ہے اور اکثر اشیا کی حد تک اس کے ہاتھ باندھ دیے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان مراعات کے معاوضے میں جنھیں وہ غیر ممالک سے طلب کر سکتا ہے اس کے پاس معاوضے میں دینے کو کچھ نہیں ہے۔ یہ غیر اغلب ہے کہ دوسرے ملکوں کے ساتھ اس کے یہ باہمی معاہدے سلطنت متحدہ کے ساتھ اس کی تجارت پر کوئی برا اثر ڈالیں۔ ہندوستان سے سلطنت متحدہ کو برآمد ہونے والی اکثر اشیا خام اشیا پر مشتمل ہیں جنھیں بلا محصول درآمد کرنے سے برطانوی صنعتوں کی غرض وابستہ ہے۔ اس کے علاوہ انگلستان، ہندوستان کا سب سے اہم لین دار ہے اور برطانوی مطالبات کی ادائی صرف اس طرح کی جا سکتی ہے کہ ہماری درآمد سے ہماری برآمد زیادہ ہو۔ کچھ عرصے سے بیرونی ممالک سے ہماری تجارت بڑھ جانے کی وجہ سے برآمدی اس فاضلات میں اضافہ ہو گیا ہے بلکہ حالیہ زمانے میں بھی یہ صورت حال برقرار ہے۔ انگلستان کو چاہیے کہ یا تو ہم کو اس قابل بنانے کے لیے کہ ہم اپنے بیرونی بازاروں کو برقرار رکھیں ضروری تدابیر اختیار کرے یا خود اپنا بازار ہمارے لیے کھول دے تاکہ ہم اس نقصان کی تلافی کر سکیں جو بیرونی بازاروں میں کمی کی وجہ سے رونما ہو۔

[1] دیکھو باب ۶ فصل ۱۳۔
[2] دیکھو فصل ۲۵ موجودہ باب۔

ورنہ انگلستان میں اپنے ذمے کے مطالبات کو پورا کرنا ہندوستان کے لیے ناممکن ہوگا۔ اس استدلال کا رجحان یہ ہے کہ ہمیں سلطنت متحدہ کی جانب سے کسی انتقامی کارروائی کا خوف کرنے کی ضرورت نہیں خواہ ہم معاہدۂ اوٹاوا کے نمونے کے بین سلطنتی معاہدات میں حصہ لینے سے انکار ہی کیوں نہ کریں۔ علاوہ ازیں اگر انگلستان انتقامی کارروائی کرے تو اس کی وجہ سے اس کی ایسی
۶۳۹ بہت سی اشیا جو ہندوستان کو برآمد ہوتی ہیں اور جن کی قیمت ۵۰ کروڑ روپے سالانہ سے بھی زیادہ ہے خطرے میں پڑ جائیں گی۔

حال میں ہندوستان اور انگلستان کے درمیان توازن تجارت نے جو پلٹا کھایا ہے اس کو معاہدۂ اوٹاوا کے حامیوں نے بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ سنہ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء انگلستان کے ساتھ ہندوستان کا توازن تجارت منفی رہا کرتا تھا باوجودیکہ ہندوستان، انگلستان کو مطالبات وطن، جہازی کرایوں، ہندوستان میں لگائے ہوئے سرمائے کے سود اور منافع وغیرہ جیسی خفیہ درآمد کے سلسلے میں کثیر رقوم ادا کرتا رہا۔ سنہ ۳۷-۱۹۳۶ء میں ہندوستان کے حق میں برآمد کی حقیقی فاضلات بقدر ۱۳ کروڑ روپے ہوئے۔ اس بنا پر یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ مستقبل کے تجارتی معاہدات میں ہندوستان کو انگلستان کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرنا چاہیے۔ لیکن یہاں یہ بتا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ جہاں تک توازن تجارت کو دو فریقی طریق کی محدود بنیاد پر جانچنا حق بجانب ہے اس حد تک سلطنت متحدہ سے درآمدہ اشیا میں اس "خفیہ درآمد" کا بھی اضافہ کرنا چاہیے جو سلطنت متحدہ سے ہندوستان میں ہوتی ہے۔ آجکل ایسا کرنا اس لیے اور بھی ضروری ہے کہ خاص کر یورپی ممالک کی حد تک باہمی تجارت میں کمی ہو جانے کی وجہ سے سلطنت متحدہ سے ہماری برآمدی تجارت، درآمدی تجارت سے نسبتہً بڑھی ہوئی رہنا چاہیے۔ ایک حد تک خود معاہدۂ اوٹاوا کے عمل کو اس نتیجے کا ذمہ دار قرار دیا جاسکتا ہے اس لیے سلطنت متحدہ کے ساتھ فیاضانہ مراعات حق بجانب قرار نہیں پاتے۔ یہ بھی خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ سلطنت متحدہ کو جانے والی ہماری برآمدی اشیا کا

بڑا حصہ اس ملک میں برطانوی سرمایہ ہے اور حوصلہ مندی کی پیداوار ہے۔ اس لیے ہندوستان کے خلاف سلطنت متحدہ کے کسی بندش کے عاید کرنے سے جو نقصان عاید ہوگا اس کا مضرت رساں اثر خود برطانیہ پر پڑے گا۔ [ا]

معاہدۂ اوٹاوا سے بے اطمینانی کا ایک اہم سبب یہ احساس تھا کہ ہندوستانی وفد جو ہندوستانی تجارت، صنعت و زراعت کے ذمہ دار نمایندوں پر مشتمل نہ تھا، برطانیہ کے مقابلے میں ہندوستان کی معاملہ کرنے کی قوت کو پوری طرح استعمال کرنے سے قاصر رہا اور جتنی مراعات اس نے دیں اس سے کم حاصل کر سکا۔ یہ معاہدہ بہت عجلت کے ساتھ مجلس کرورڈگیری جیسی کسی فنی جماعت کی کامل تحقیقات کے بغیر مرتب کیا گیا۔ اگر اس مجلس کو موقع دیا جاتا تو وہ سلطنت کی کسی صنعت کے ساتھ ہندوستان میں ترجیحی سلوک کی سفارش کرنے سے قبل اس کو ویسے ہی طریقوں سے جانچتی جیسے کہ امتیازی تامین کی پالیسی میں مضمر ہیں۔ ۶۴۰

معاہدۂ اوٹاوا کے ضمن میں جو محصولی انتظامات طے پائے ان کے اچھے یا برے اثرات کے متعلق کوئی صحیح رائے پیش کرنا دشوار ہے۔ بین الاقوامی تجارت کی رفتار متعدد عاملوں کی تابع ہے اور کسی ایک عامل سے قطعی نتایج کو منسوب کرنا یا ان نتایج کی وسعت کو یقین کے ساتھ معلوم کرنے کی کوشش کرنا ناممکن ہے۔ ان حالات میں صرف یہ طریق کار اختیار کیا جا سکتا ہے کہ مسئلے کے دونوں پہلو بے لاگ طریقے پر پیش کر دیے جائیں اور قاری کو اپنے طور پر رائے قایم کرنے کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ ہم نے اوپر ایسا ہی کرنے کی کوشش کی ہے۔

۹۔ معاہدۂ اوٹاوا کی مخالفت مجلس قانون ساز میں

۳۰ مارچ ۱۹۳۶ء کو ہندوستانی مجلس قانون ساز نے اپنی ایک قرارداد کے ذریعے معاہدۂ اوٹاوا اور اس کے آفریدہ ہندوستانی برطانوی تجارتی

ا۔ دیکھو ڈاکٹر وی کے آر وی راؤ کا مضمون "ہندوستانی برطانوی تجارتی معاہدہ" انڈین ٹریڈ جرنل بابتہ اپریل ۱۹۳۷ء میں۔

معاہدے (دیکھو فصل ۲۰) کے خلاف احتجاج کیا اور ان کے جاری رکھنے کے خلاف رائے دی۔ ذیل میں قائد اعظم محمد علی جناح کی وہ ترمیم درج ہے جو آپ نے مجلس قانون ساز کی منظور کردہ سرکاری قرارداد کے بارے میں پیش فرمائی تھی:

"مجلس قانون ساز، گورنر جنرل باجلاس کونسل سے سفارش کرتی ہے کہ معاہدۂ اوٹاوا مورخہ ۲۰ راگست ۱۹۳۲ء کو بلا تعویق ختم کر دیا جائے اور اس کی تنسیخ کی اطلاع بموجب شرایط معاہدہ دفعہ ۱۴ دیدی جائے۔ مجلس یہ بھی سفارش کرتی ہے کہ دوسرے مختلف اہم ملکوں اور سلطنت برطانیہ سے ہندوستان کی تجارت کی رفتار کا حکومت ہند کو بغور معائنہ کرنا چاہیے، اور ان ملکوں سے دو فرقی تجارتی معاہدات میں شریک ہونے کے امکان کے بارے میں، خواہ وہ کہیں اور کبھی ممکن ہو، تحقیقات کرنی چاہیے تاکہ ہندوستان کی برآمدی تجارت کو ان بازاروں تک وسعت دی جائے اور ایسے سب معاہدے مجلس قانون ساز کی منظوری کے لیے پیش ہوں"[1]

یہ ترمیم ۶۵ کے مقابلے میں ۷۰ آرا سے منظور ہوئی۔ چونکہ حکومت ہند مجلس قانون ساز کے فیصلے پر عمل کرنے کی پابند تھی اس لیے معاہدے کو فسخ کرنے کی بابتہ ۶ ماہ کا نوٹس ۱۳ رمئی ۱۹۳۶ء کو دیا گیا جس کی میعاد ۱۳ رنومبر ۱۹۳۶ء کو ختم ہونے والی تھی۔ نوٹس کی مدت نے ایک نیا معاہدہ طے کرنے کا موقع بہم پہنچایا۔ چنانچہ حکومت برطانیہ اور حکومت ہند کے درمیان بات چیت شروع ہوئی اور موخر الذکر کی وکالت کے لیے متعدد غیر سرکاری مشیر مقرر ہوئے[2] محکمۂ تجارت

---

[1] نیز دیکھو فصل ۲۵۔

[2] یہ حسب ذیل تھے:۔ سر پرشوتم داس ٹھاکر داس، مسٹر جی، ڈی برلا، مسٹر کستور بھائی لال بھائی، سردار داتار سنگھ، نواب زادہ لیاقت علی خاں، ڈاکٹر پی بنارجی اور سر ایڈورڈ بنتھال۔ موخر الذکر دو ارکان کے استعفا دینے کی وجہ سے ان کی جگہ راجہ پارلا کمیڈی اور پروفیسر ڈبلیو رابرٹس غیر سرکاری مشیر مقرر کیے گئے۔

کے ایک کمیونکے مورخہ ۲۰ راکتوبر ۱۹۳۶ء میں بیان کیا گیا کہ جدید معاہدہ طے ہونے تک
دونوں حکومتوں نے اس سے اتفاق کرلیا ہے کہ ۱۹۳۲ء کے معاہدے کو اس شرط
سے نافذ رکھا جائے کہ جدید معاہدہ طے ہونے تک تین ماہ کے نوٹس پر فریقین میں
سے کوئی بھی اس کو منسوخ کرسکتا تھا۔ علاوہ ازیں جدید معاہدے کے طے نہ ۶۴۱
پانے کی صورت میں فریقین میں سے کوئی بھی دوسرے سے مشورہ کئے بغیر موجودہ
ترجیحات کو واپس نہ لے سکے گا۔

۱۰- جدید ہندی برطانوی تجارتی معاہدے کی بابت گفت وشنید کی طوالت۔

حکومت ہند اور حکومت برطانیہ کے درمیان ۱۹۳۲ء کے معاہدۂ اوٹاوا کے بجائے ایک نیا تجارتی معاہدہ طے کرنے کے لیے دو تین سال تک طویل گفت وشنید کا سلسلہ جاری رہا اور دونوں ممالک کے درمیان کسی جدید تجارتی راضی نامے کی عدم موجودگی میں معاہدۂ اوٹاوا کے مطابق عملدرآمد جاری رہا۔

یہاں اس بات چیت پر تفصیلی تبصرہ کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے صرف اہم واقعات کو مختصراً بیان کردینا کافی ہوگا۔

برطانوی محکمۂ تجارت کے مرسلہ تجاویز پر غور کرنے کے لیے ہندوستانی مشیروں کا ایک اجلاس ستمبر ۱۹۳۶ء میں منعقد ہوا۔ عام خیال یہ تھا کہ برطانوی تجارتی تجاویز بہت زیادہ یکطرفہ تھیں۔ اس لیے نظر ثانی شدہ تجاویز کے وصول ہونے تک کانفرنس کو ملتوی کرنے کا تصفیہ کیا گیا۔ بعد میں دسمبر ۱۹۳۶ء میں جب کہ غیر سرکاری مشیروں کی کمیٹی دہلی میں منعقد ہوئی مزید گفت وشنید کو جاری کرنے سے پیشتر حکومت سلطنت متحدہ کی منظوری کے لیے بعض اساسی اصول طے اور پیش کئے گئے۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہ اصول حکومت برطانیہ کے لیے قابل قبول تھے۔

۱۹۳۷ء کے آواخر میں غیر سرکاری مشیروں کا ہندوستانی وفد اور سر محمد ظفر اللہ خاں رکن تجارت حکومت ہند لندن گئے اور حکومت برطانیہ کے نمائندوں سے گفتگو کی۔ لیکن کسی قطعی نتیجے پر پہنچے بغیر اکتوبر ۱۹۳۷ء میں

ہندوستان واپس ہو گئے۔ صورت حال پر احتیاط کے ساتھ تبصرہ کرنیکے بعد حکومت ہند نے تصفیہ کیا کہ غیر سرکاری مشیروں کے پیش کردہ بعض تجاویز کے مطابق اقدام کیا جائے۔ جنوری ۱۹۳۸ء میں حکومت ہند نے آنریبل سر محمد ظفر اللہ خاں کو لندن روانہ کیا تاکہ شخصی مباحث کے ذریعے بعجلت گفت و شنید کی جائے۔ آنریبل سر محمد ظفر اللہ خاں اپریل ۱۹۳۸ء میں ہندوستان واپس ہوئے اور اہم امور کے تصفیے کے سلسلے میں جو ترقی ہوئی تھی اس کی حد تک غیر سرکاری مشیروں سے مشورہ کیا[۵]۔ اس نوعیت پر انگلستان میں یہ محسوس کیا گیا کہ اس مسئلے کا حل یہ تھا کہ لنکاشائر سے تصفیہ کیا جائے۔ اس لیے مئی ۱۹۳۸ء میں برطانوی محکمۂ تجارت نے لنکاشائر کی صنعت پارچہ بافی کی نمایندگی کرنے والے ایک وفد کو بھیجا کہ وہ ہندوستان میں مزید گفت و شنید جاری رکھے۔ جیساکہ آگے چل کر فصل ۱۹ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے گا، شملے میں کپڑے کی تجارت کے متعلق گفتگو ناکام ثابت ہوئی اور لنکاشائر کے وفد کو ناکامی کے ساتھ انگلستان واپس ہونا پڑا۔ اس کے بعد اس مسئلے کو دونوں حکومتوں نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ آنریبل سر محمد ظفر اللہ خاں تیسری دفعہ جون ۱۹۳۸ء میں پھر انگلستان گئے اور برطانوی محکمۂ تجارت کی نظر ثانی کردہ تجاویز اپنے ساتھ ۶۴۲
لائے جن کو ستمبر ۱۹۳۸ء میں غیر سرکاری مشیروں نے دو کے مقابلے میں پانچ کی اکثریت سے ناقابل قبول قرار دیا۔ روئی اور سوتی کپڑے کے بارے میں لنکاشائر کے مسئلے کے علاوہ دوسری مشکلات بھی رونما ہوئیں۔ اس طرح حکومت ہند کی یہ توقع کہ مجلس قانون ساز کی شملے کی میقات کے اختتام سے قبل برطانوی محکمۂ تجارت اور حکومت ہند کے درمیان سمجھوتے کے اصول کا پیش کرنا ممکن ہوگا پوری نہ ہو سکی۔ حکومت ہند کے لیے پھر یہ ضروری ہوا کہ وہ برطانوی محکمۂ تجارت کے ساتھ ان سوالات پر بحث کرے جو غیر سرکاری مشیروں نے اٹھائے تھے اور محکمۂ تجارت کو ان کے قبول کرنے پر آمادہ کرے۔

[۵]۔ دیکھو ام۔ پی۔ گاندھی کی رپورٹ "ہندوستانی سوتی کپڑے کی صنعت ۱۹۳۷ء" صفحہ ۵۵۔

فی الحال (اکتوبر ۱۹۳۸ء میں) ہمیں اس اطمینان آفریں بیان پر اکتفا کرنا چاہیے جو رکن تجارت نے مجلس قانون ساز میں مسٹر ایس ستیا مورتی کے سوال کے جواب میں دیا کہ حکومت فریقین کے درمیان ایک قابل عمل سمجھوتہ کرانے کی ہر ممکنہ کوشش کر رہی ہے۔

اس طویل مباحثے کا عاجلانہ تصفیہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ معاہدۂ اوٹاوا کی غیر معین توسیع کے متعلق ہندوستانی رائے عامہ بے چینی کا اظہار کر رہی ہے۔ اس معاہدے کا سلسلہ جاری رکھنے کے خلاف دو سال قبل ہی مجلس قانون ساز اظہار خیال کر چکی تھی[1]۔ تاوقتیکہ اس مسئلے کی یکسوئی نہ ہو جائے مجلس قانون ساز کے اجلاس منعقدہ مارچ ۱۹۳۶ء کی قرارداد کی متابعت میں سلطنت متحدہ کے سوا دوسرے ملکوں سے تجارتی راضی ناموں کے لیے گفت و شنید شروع کرنا مشکل ہوگا۔ آخر میں یہ کہ تامین کی مدت جس سے ہندوستانی پارچہ بافی کی صنعت متمتع ہو رہی ہے ۳۱ مارچ ۱۹۳۹ء کو ختم ہو گی اور اس مسئلے کو ایک خصوصی مجلس کروڑگیری کے ذریعے طے کرنا پڑے گا جس کا تقرر جدید ہندی برطانوی تجارتی راضی نامہ تکمیل نہ پانے کی وجہ سے تعویق میں پڑ گیا ہے۔ یہ توقع ظاہر کی جاسکتی ہے کہ فریقین نیک نیتی اور مفاہمت سے کام لیں گے اور لنکاشائر اور برطانوی محکمۂ تجارت ہندوستانی نقطۂ نظر کو بہتر طور پر سمجھیں گے تاکہ دونوں ملکوں کے درمیان کوئی معقول تجارتی راضی نامہ باہمی مفاد کی اساس پر ممکن ہو۔

۱۱۔ دوسرے تجارتی راضی نامے — یہاں دوسرے اہم تجارتی راضی ناموں پر تبصرہ کرنا اور ہندوستان کی حد تک دو فریقی تجارتی

---

[1] اس معاملے میں مجلس قانون ساز نے جو خطرہ محسوس کیا اس کا اظہار اس قرارداد سے ہوتا ہے جو مسٹر ایس، ستیا مورتی کی تحریک پر پیش ہوئی اور مجلس نے ۲ اپریل ۱۹۳۸ء کو منظور کی۔ اس قرارداد میں گورنر جنرل باجلاس کونسل سے سفارش کی گئی تھی کہ "مجلس سے مشورہ کیے بغیر کوئی جدید ہندی برطانوی تجارتی معاہدہ یا اسی نوعیت کا کوئی تجارتی راضی نامہ طے کرنے کی کارروائی شروع نہ کی جانی چاہیے"۔ [2] دیکھو (۱) لِل اور نرنا شنوگپن

راضی ناموں کے مستقبل پر عام طور پر غور کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ معاہدۂ اوٹاوا ۶۴۳
کے علاوہ دوسرے تجارتی راضی نامے حسبِ ذیل ہیں:-
(۱) سنہ ۱۹۳۴ء اور سنہ ۱۹۳۷ء کے ہندی جاپانی تجارتی راضی نامے، (۲) بمبئی لنکا شائر کا سوتی کپڑوں کا راضی نامہ جسے عرفِ عام میں "موڈی لیز تھو نامہ بابتہ سنہ ۱۹۳۳ء" کہا جاتا ہے۔ (۳) سوتی کپڑوں کے بارے میں ہندوستان اور لنکاشائر کی ناکام گفتگو (سنہ ۱۹۳۶ء) اور (۴) ہندی برطانوی تجارتی راضی نامہ (سنہ ۱۹۳۵ء)۔

۱۲- ہندی جاپانی راضی نامے کی ابتدا ۱۹۳۴ء

اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے[ل] کہ اپریل سنہ ۱۹۳۳ء میں حکومتِ ہند نے قدیم جاپانی راضی نامہ بابتہ سنہ ۱۹۰۴ء کو منسوخ کر دیا۔ سنہ ۱۹۳۲ء کے آغاز سے "ین" کی قیمت کے مسلسل اتار نے ہندوستان کو بھیجی جانے والی جاپانی برآمدات کے حق میں سنہ ۳۳-۱۹۳۲ء کے اختتام پر بہت ہی موافق صورت پیدا کر دی۔ جس کی وجہ سے ہندوستانی کارخانوں کو ایک انتہائی نازک صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا اور حکومتِ ہند مداخلت کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اگست سنہ ۱۹۳۲ء میں سادہ بھورے رنگ کے غیر برطانوی سوتی کپڑوں پر جو درآمدی محصول تھا وہ بڑھا کر ۵۰ فیصد قیمت واری محصول کر دیا گیا اور اس کے علاوہ ۵¼ آنے فی پونڈ اقل شمار واری محصول عائد کیا گیا۔ لیکن یہ بھی جاپانی مسابقت کو کم کرنے کے لیے ناکافی ثابت ہوا، اور ہندوستانی پارچہ بافی کی صنعت مزید تامین کے لیے مجاہدہ کرتی رہی۔ اس لیے حکومتِ ہند کی جانب

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:- بمبئی کی رپورٹ' (۲) انڈین ٹریڈ جرنل سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء' جولائی سنہ ۱۹۳۶ء مئی سنہ ۱۹۳۷ء' مئی تا ستمبر سنہ ۱۹۳۸ء۔ (۳) ریویو آف دی ٹریڈ آف۔ (۴) انڈین فینانس نمبر ۱۵، جولائی سنہ ۱۹۳۶ء۔ (۵) سوتی کپڑوں کے بارے میں خصوصی ٹیرف بورڈ کی رپورٹ' (۶) ہندوستانی ایوان ہائے تجارت کی رپورٹیں۔ (۷) ام۔ پی گاندھی کی کتاب موسوم بہ Indian Cotton Textile Industry

[ل]۔ دیکھو باب ۲ فصل ۱۲۔

سے حکومت برطانیہ چھ ماہ کی نوٹس حکومت جاپان کو دینے پر مجبور ہو گئی کہ وہ سنہ ۱۹۰۴ء کے قدیم تجارتی راضی نامے کو منسوخ کرنا چاہتی ہے جس کے تحت جاپان بیش ترین رعایت سے متمتع ہو رہا تھا۔ سنہ ۱۹۰۴ء کے تجارتی راضی نامے کے نافذ رہنے تک حکومت ہند کے لیے ممکن نہ تھا کہ قانون تحفظ صنائع کے تحت جو اپریل سنہ ۱۹۳۳ء میں ہندوستانی مجلس قانون ساز نے منظور کیا تھا اور جس کی رو سے حکومت کو یہ اقتدار حاصل تھا کہ جب کبھی ملک کو بیرونی ارزاں اشیا کی درآمد سے تجارت اور صنعت کو خطرہ لاحق ہو تو محصول عاید کرے صرف جاپان کے خلاف کارروائی کرے۔ حکومت کے اس فیصلے کی وجہ سے کہ ہندی جاپانی تجارتی راضی نامہ منسوخ کیا جائے جاپان میں انتقام کے طور پر ہندوستانی روئی کے مقاطعے کی تحریک شروع ہوئی۔ لیکن جاپانی سوت کاتنے والوں اور خام روئی کے سوداگروں کے درمیان ہندوستانی روئی نہ خریدنے کے متعلق سمجھوتہ اس وقت ہوا جبکہ ہندوستان میں جون سنہ ۱۹۳۳ء میں محصول کے تغیرات نافذ ہو گئے۔ غیر ملکی (بشمول جاپان) سوتی کپڑوں پر درآمدی محصول بڑھا کر ۷۵ فیصد قیمت واری محصول کر دیا گیا اور سادہ بھورے رنگ کے کپڑوں پر اقل شمار واری محصول $6\frac{3}{4}$ آنے ۱۴۴
فی پونڈ کے حساب سے عائد کیا گیا۔ ایک جاپانی وفد ہندوستان آیا اور اس نے اکتوبر سنہ ۱۹۳۳ء میں بمقام شملہ حکومت ہند کے سرکاری اور غیر سرکاری نمایندوں سے ملاقات کی۔ گفت و شنید کا سلسلہ تین ماہ سے زائد جاری رہنے کے بعد فریقین میں ایک راضی نامہ ہوا۔ جاپانی مقاطعہ جنوری سنہ ۱۹۳۴ء میں واپس لے لیا گیا اور اس کے ساتھ حکومت ہند نے ۷۵ فیصد قیمت واری محصول گھٹا کر ۵۰ فیصد کر دیا۔ ایک جدید تجارتی معاہدہ باہمی رضامندی سے مرتب کیا گیا اور اس پر ۱۲ر جولائی سنہ ۱۹۳۴ء کو دستخط ہوئے۔ البتہ جاپانی کپڑے کے تھانوں کی درآمد کی نگرانی کے متعلق شرایط اس سے قبل یعنی ۸ جنوری سنہ ۱۹۳۴ء کو نافذ ہو چکے تھے۔

۱۴۔ راضی نامہ سنہ ۱۹۳۴ء کے شرایط

سنہ ۱۹۳۴ء میں جاپان سے جو راضی نامہ ہوا وہ دو حصوں پر مشتمل تھا:۔ (۱) اقرار نامہ (۲) دستاویز شرایط

اقرار نامے میں دونوں ملکوں کے آیندہ باہمی تجارتی تعلقات کا مفصل خاکا پیش کیا گیا تھا، اور دستاویز شرایط میں اس راضی نامے کی مفصل شرایط درج تھیں جو جاپان سے ہندوستان میں سوتی کپڑوں کی درآمد اور ہندوستان سے جاپان کو خام روئی کی برآمد کے متعلق ہوا تھا۔ دستاویز شرایط کی مدت ۳۱ مارچ ۱۹۳۷ء کو ختم ہونے والی تھی اور اقرار نامہ بھی اسی تاریخ کو بہ شرطیکہ معاہدہ کنندہ فریقین میں سے کوئی استرداد کے بارے میں چھ ماہ قبل نوٹس دے۔

اقرار نامے کے اہم شرایط حسب ذیل تھے:۔

(۱) معاہدہ کنندہ فریقین نے اس کو منظور کیا کہ ایک دوسرے کے ساتھ بیش ترین رعایت کی دفعہ کے تحت سلوک کرے گا۔ (۲) فریقین کو یہ حق حاصل ہوگا کہ ایک دوسرے کی درآمد کی ہوئی اشیا پر ایسی شرح سے محصول کروڑگیری عاید کرے یا اس میں ترمیم کرے جو ۳۱ دسمبر ۱۹۳۳ء کے بعد سے علی الترتیب روپے یا "ین" کے تعلق سے "ین" یا روپے کی قدر مبادلہ میں کسی تغیر کے اثر کی اصلاح کے لیے ضروری ہو۔ (۳) گو فریقین نے اپنے لیے یہ حق محفوظ رکھا تھا کہ وہ اپنے محاصل کروڑگیری میں ایسی تبدیلیاں کر سکیں گے جو ان کے مفادات کی حفاظت کے لیے ضروری ہوں، پھر بھی وہ اس پر متفق تھے کہ کسی فریق کی درخواست پر گفت وشنید جاری ہو سکے گی تاکہ حتی الامکان دونوں ممالک کے مفادات کے مطابق اطمینان بخش سمجھوتہ کیا جا سکے۔

دستاویز شرایط کی اہم دفعات حسب ذیل تھیں:۔

(۱) محاصل کروڑگیری جو ہندوستان میں اشیا کی درآمد پر عاید کیے جائیں وہ مندرجۂ ذیل شرحوں سے متجاوز نہ ہوں:۔

(الف) سادہ بھورے رنگ کے کپڑے پر ۵۰ فیصد قیمت واری محصول یا ۵ $\frac{1}{4}$ آنے فی پونڈ (دونوں میں سے جو زیادہ ہو)۔

(ب) دوسری قسم کے کپڑے پر ۵۰ فیصد قیمت واری محصول۔

(۲) دستاویز شرایط کی دفعہ ۲ کی بموجب جاپانی کپڑے کی ہندوستان میں درآمد اور ہندوستانی روئی کی برآمد کے لیے نصاب کا طریقہ معین کیا گیا۔ اس انتظام

۶۴۵ کے تحت جاپان یکم اپریل سے شروع ہونے والے ایک سال میں ہندوستان کو ۳۲۵ ملین گز کپڑا برآمد کر سکتا تھا بہ شرطیکہ وہ ہندوستان سے یکم جنوری سے ایک سال کے اندر روئی کے ایک ملین گانٹھ خریدے۔ یہ بنیادی نصاب تھا۔ مگر جاپان ہندوستان کو زیادہ سے زیادہ جتنا سوتی کپڑا بھیج سکتا تھا اس کی مقدار ۴۰۰ ملین گز سالانہ مقرر کی گئی۔ وہ اس طرح کہ بنیادی نصاب ۳۲۵ ملین گز بھیجنے کے بعد ایک ملین روئی کی گانٹھ سے اوپر ہر دس ہزار گانٹھ روئی کی خریداری پر ۱½ ملین گز زائد کپڑا سالانہ برآمد کیا جا سکتا تھا۔ خام روئی اور سوتی کپڑے کے لیے جو نصاب مقرر کیا گیا تھا اس سے مکرر برآمدات خارج تھے۔

(۳) سوتی کپڑوں کے نصاب کو حسب ذیل چار حصوں میں تقسیم کیا گیا:-

(الف) سادہ بھورے رنگ کے کپڑے ۴۵ فیصد۔

(ب) کوردار بھورے رنگ کے کپڑے ۱۳ فیصد۔

(ج) دھلے ہوئے سفید کپڑے ۸ فیصد۔

(د) رنگین (چھاپے کے رنگے ہوئے یا بافت کے) کپڑے ۳۴ فیصد۔

۱۴۔ ہندی جاپانی راضی نامہ بابتہ ۱۹۳۴ء عمل درآمد اور اس کے نتائج

۱۹۳۴ء کے ہندی جاپانی معاہدے کی تکمیل نے دونوں ملکوں کی باہمی شکر رنجی دور کر دی اور ہندوستان کے روئی کے کاشتکاروں، تاجروں اور کسی حد تک کارخانہ داروں کے لیے یہ معاہدہ مفید ثابت ہوا۔ راضی نامے سے سب سے بڑا فائدہ ہندوستانی روئی کے کاشتکار کو حاصل ہوا، کیونکہ ہندوستان جاپان کو روئی اس مقدار سے زائد برآمد کرنے میں کامیاب ہوا جس کا نصاب راضی نامے کے تحت مقرر کیا گیا تھا۔ ہندوستانی کاشتکار کی معاشی حالت کی بہتری مقامی کپڑے کی صنعت کے حق میں بھی مفید ثابت ہوئی، کیونکہ عوام یعنی غریب ہی مقامی کپڑوں کو سب سے زیادہ مقدار میں صرف کرتے ہیں۔

جاپان کو بھی کافی فوائد حاصل ہوئے۔ ایک تو یہ کہ اس کے ساتھ بیش ترین رعایت کی دفعہ کے تحت سلوک کیا گیا، حالانکہ اس کی وجہ سے

ہندوستان کی بعض ابتدائی اور معمولی صنعتیں بری طرح متاثر ہوئیں۔ جاپان سے ہندوستان میں کپڑوں کی درآمد پر محصول کو ۷۵ فیصد سے گھٹا کر ۵۰ فیصد کر دیا جانا ہندوستانی کارخانہ داروں کے خیال میں یہ محصول ان کی صنعت کی تامین کے لیے ناکافی تھا۔ مگر اس سے جاپان کو بڑا فائدہ پہنچا۔

ہندوستانی نقطۂ نظر سے ۱۹۳۴ء کے ہندی جاپانی راضی نامے پر سخت نکتہ چینی کی گئی اور ہندوستان میں عام خیال یہ تھا کہ ملک کی جانب سے اچھا سودا نہیں کیا گیا۔ چنانچہ جو نصاب مقرر کیا گیا اس کو انتہائی غیر اطمینان بخش تصور کیا گیا۔ تجارتی راضی نامے کی تجدید کے لیے جو ہندی جاپانی گفت و شنید جولائی ۱۹۳۶ء میں شروع ہوئی اس میں حکومت ہند کے غیر سرکاری مشیروں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ تعین نصاب کا طریقہ سوتی کپڑوں کی صنعت میں قیمتوں کی سطح کو برقرار رکھنے میں ناکام رہا اور یہ کہ اس کی زد سے بچنے کی مختلف شکلیں موجود تھیں۔ نہ صرف جاپانیوں بلکہ جاپان کے ہندوستانی تاجروں نے بھی ان کمزوریوں سے بلا تامل فائدہ اٹھایا جو نصاب کے طریق میں پائی جاتی تھیں اور اس طرح اس کے اصل مقصد یعنی جاپانی کپڑے کی درآمد کی مقدار کی تحدید کو پورا نہ ہونے دیا۔ ۶۴۶

کپڑے کے تھانوں کے کترے ہوئے چھوٹے ٹکڑے Feuts جو معیار سے گرے ہوئے ہونے کی وجہ سے کروڑگیری کے کمتر محصول پر درآمد کیے جاتے تھے اس نصاب سے خارج تھے۔ گو کہ جاپانی صناعوں اور برآمد کنندوں نے کپڑے کی کوئی کثیر مقدار اس شکل میں روانہ نہیں کی پھر بھی جاپان کے ہندوستانی تاجروں نے حالیہ برسوں میں اس کی تجارت کو بہت ترقی دیدی۔ اسی طرح مصنوعی ریشمی کپڑے بھی نصاب میں شامل نہیں تھے اور جاپان سے ہندوستان میں ان کی کثیر مقدار درآمد ہوتی رہی۔ نصاب کے انتظام سے بچنے کے لیے جاپانی برآمد کنندوں نے ایک انوکھی ترکیب یہ اختیار کی کہ تیار سوتی کپڑے مثلاً قمیص، ملبوسات، لنگے وغیرہ بھیجنے شروع کئے۔ چنانچہ کچھ برسوں سے ہندوستانی بازار میں ان کی بھرمار ہو رہی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جاپانی کپڑے کے تھان کثیر تعداد میں ہندوستان سے

افغانستان اور نیپال کو بھیجے گئے اور سرحد پار سے نکر ہندوستان میں چور تجارت کے ذریعے واپس لائے گئے۔ غرض یہ ظاہر ہو گیا کہ دستاویز شرایط کے باوجود ہندوستان میں جاپانی برآمد بڑھتی گئی اور اس طرح وہ مقصد فوت ہو گیا جس کے لیے راضی نامہ ہوا تھا۔ گزوں کے حساب سے جتنے طول کے کپڑے بھیجنے کا سمجھوتہ ہوا تھا اسے ناواجب طور پر استعمال کیا گیا اور ہندوستان میں مقررہ ناپ سے بڑے عرض کا کپڑا درآمد کیا گیا۔

یہ بھی خیال ظاہر کیا گیا کہ جاپان نے راضی نامے کی بیش ترین رعایت کی دفعے سے پوری طرح استفادہ کیا اور متفرق ارزاں مصنوعات مثلاً شیشے کا سامان، جوتوں، آہنی ظروف، اونی کپڑوں، سائیکلوں اور چھتریوں کی کثرت سے بھرمار کی جس کی وجہ سے کئی چھوٹی ہندوستانی مصنوعات اور ہاتھ کی بنی ہوئی اشیا جو ترقی کی ابتدائی منزل میں تھیں خطرے میں پڑ گئیں۔ محاصل کے اعداد و شمار سے معلوم ہوا کہ متفرق جاپانی اشیا جو ہندوستان میں درآمد ہوئیں ان کی تعداد میں حالیہ برسوں میں کئی کروڑ روپے کا اضافہ ہو گیا جس کی وجہ سے ہندوستان کے مقابلے میں اس کا مخالف توازن باقی نہیں رہا۔ ہندوستانی پیپر، جوٹ اور روغنی تخموں کی حد تک جاپان کی خریداری میں کافی کمی ہو رہی تھی تو دوسری طرف جاپان سے درآمد کی ہوئی یا درآمد ہونے والی اشیا کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اس لیے اس بات پر زور دیا گیا کہ سوتی کپڑوں اور خام روئی کے باہمی مبادلے کی حد تک راضی نامے کو محدود رکھنے کی بجائے ایک جامع راضی نامہ طے کرنا ضروری تھا۔

جاپانی شرایط نامے میں طے شدہ مقدار کے علاوہ ہندوستان سے جاپان نے جو کثیر مقدار میں روئی خریدی اس کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ جاپان یہ روئی ہندوستان کو خوش کرنے کے لیے نہیں خریدی اور نہ وہ شرایط نامے کے تحت زائد مقدار خریدنے پر مجبور تھا بلکہ اس نے اس وجہ سے خریدی کہ اس کو ایک سستی خام پیداوار کی ضرورت تھی۔ ہندی جاپانی تجارتی راضی نامے کے نفاذ کے بعد سے پہلے سال یعنی ۲۵-۱۹۳۴ء میں جاپان نے ۲۰ لاکھ ۱۰ ہزار

۶۰۰ گانٹھ ہندوستانی روئی خریدی۔ گزشتہ دس سال میں جاپانی خریداری کا سالانہ اوسط ۱۰ لاکھ ۵۰ ہزار گانٹھ تھا۔ اس لیے ہندوستان میں غیر سرکاری تجارتی طبقے کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان سے جاپان کو روئی کی برآمد کی اقل مقدار ۱۰ لاکھ گانٹھ سے بڑھا کر ۱۰ لاکھ ۵۰ ہزار گانٹھ کردینا مناسب تھا۔ یہ استدلال کیا گیا کہ ہندوستانی روئی کی جاپان میں درآمد چند برسوں تک کم نہ ہوگی تا وقتیکہ ۷۴۲
جاپانی اپنی صنعتوں میں ہندوستانی روئی کی بجائے لانبے ریشے کی روئی استعمال نہ کریں۔

۱۵۔ نیا ہندی جاپانی تجارتی راضی نامہ بابت ۱۹۳۷ء

۱۹۳۴ء کے تجارتی راضی نامے کی مدت ۳۱ مارچ ۱۹۳۷ء کو ختم ہوئی اور اس کی تجدید کے لیے جولائی ۱۹۳۶ء میں جو طویل گفت و شنید شروع ہوئی اس کے دوران میں ہندی جاپانی تجارتی راضی نامہ ۱۹۳۴ء کے خلاف جو اعتراضات تھے ان پر بہت کچھ توجہ مبذول کی گئی۔ حکومت ہند کے محکمۂ تجارت کے غیر سرکاری ہندوستانی مشیروں کا اجلاس بمقام شملہ جولائی ۱۹۳۶ء میں منعقد ہوا اور ۱۹۳۳ء میں جیسا ہوا تھا اس کے برعکس اس مرتبہ ان کے مطالبات متفقہ تھے۔ اولاً یہ سفارش کی گئی کہ ایک طرف ہندوستانی روئی کی جاپان کو برآمد کے متعلق راضی نامہ حسب حال قایم رہنا چاہیے تو دوسری طرف ہندوستان میں درآمد ہونے والے جاپانی کپڑوں کی مقدار میں ۵۰ ملین گز کی تخفیف ہونی چاہیے۔ یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ کپڑوں کے چھوٹے ٹکڑوں کا بھی نصاب مقرر ہونا چاہیے اور اس کی مقدار عام کپڑے کے تھانوں کی مقررہ مقدار کے ۲½ فیصد سے زائد نہ ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ یہ تجویز کیا گیا کہ ہندوستان میں جاپانی ریشمی مصنوعات کی بڑھتی ہوئی درآمد کو روکنے کے لیے ان اشیا کو بھی عام کپڑے کے تھانوں کے نصاب میں شامل رکھنا چاہیے اور یہی طریقہ سلے ہوئے سوتی کپڑوں کے بارے میں بھی اختیار کیا جانا چاہیے۔ نصاب گزوں کے طول کے بجائے مربع گز کے حساب سے مقرر کیا جانا چاہیے۔ ایک اور سفارش یہ کی گئی کہ معمولی قسم کے

جاپانی سوت (یعنی ایسا سوت جس کی موٹائی ۵۰ درجے کی ہو) کی مقدار معین ہونی چاہیے۔ آخر میں اس بات پر زور دیا گیا کہ جدید راضی نامے کے تحت یا تو متفرق اشیا کی درآمد کے لیے نصاب مقرر ہونا چاہیے یا شمار واری اعلیٰ درآمدی محصول عائد کیا جانا چاہیے جو ہندوستان کی چھوٹی گھریلو صنعتوں کی تامین کر سکے۔

گفت وشنید نو مہینے تک جاری رہنے کے بعد نظر ثانی شدہ ہندی جاپانی تجارتی راضی نامے کا مسودہ ۱۲ اپریل ۱۹۳۷ء کو تیار ہوا اور اس کے بعد لندن میں باضابطہ دستخط ہو گئے۔ یہ راضی نامہ یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے نافذ ہوا اور اس کی مدت ۳۱ مارچ ۱۹۴۰ء کو ختم ہونے والی تھی۔

شرایط نامہ تجارت کی حد تک سابقہ حیثیت برقرار رکھی گئی اور اس طرح جاپان کو تین سال تک کے لیے بیش ترین رعایت کی دفعہ کے تحت سلوک کا یقین ہو گیا ہے۔

روئی کے متعلق نیا شرایط نامہ بجز چند ترمیمات کے حسب سابق رہا۔ اور ان ترمیمات میں سے چند یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے برما کی ہندوستان سے علٰحدگی کی وجہ سے ضروری ہو گئی تھیں۔ ہندوستانی خام روئی کی ایک ملین گانٹھ کی جاپان کی طرف سے خریداری کے مقابلے میں جاپانی کپڑے کے تھانوں کی درآمد کا سالانہ بنیادی نصاب ۳۲۵ ملین گز سے گھٹا کر ۲۸۳ ملین گز کر دیا گیا ہے۔ درآمد کے مقررہ نصاب میں ۴۲ ملین گز کی تخفیف اس وجہ سے کی گئی کہ ہندوستان سے برما کی علٰحدگی کے باعث ہندوستانی بازار چھوٹا ہو گیا تھا۔ 6/48
اس طرح سوتی کپڑوں کی درآمد کی انتہائی مقدار جو جاپان کے ہندوستان سے خام روئی کے تقریباً ۱½ ملین گانٹھ خریدنے پر موقوف رکھی گئی تھی ۴۰۰ ملین گز سے گھٹا کر ۳۵۸ ملین گز کر دی گئی ہے۔

جدید شرایط نامے میں رنگین کپڑوں کو حسب ذیل قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے:۔
(۱) چھپے ہوئے کپڑے (۲) رنگے ہوئے یا رنگین بافت کے کپڑے، اور رنگین کپڑوں کے لیے مقررہ نصاب ۲۴ فیصد سے بڑھا کر ۳۰ فیصد کر دیا گیا ہے۔
مجموعی نصاب کو بحساب فیصد حسب ذیل قسموں پر تقسیم کیا گیا ہے :۔

(۱) سادہ بھورے رنگ کے کپڑے ۰ ۴ فیصد (۲) قور دار بھورے رنگ کے کپڑے ۱۳ فیصد (۳) دھلے ہوئے سفید کپڑے ۱۰ فیصد (۴) رنگین چھپے ہوئے کپڑے ۲۰ فیصد (۵) رنگے ہوئے یا رنگین بافت کے اور بنے ہوئے کپڑے ۱۷ فیصد۔ سوتی کپڑوں کے بنیادی نصاب سے سوتی کپڑوں کے ٹکڑے خارج ہیں، لیکن جاپان نے اس کی ذمہ داری لی ہے کہ سوتی کپڑے کے ٹکڑوں کی ہندوستان میں درآمد کو گھٹاکر ۸۹ لاکھ ۵۰ ہزار گز سالانہ تک کردے گا۔ حکومت نے اس سے اتفاق کیا ہے کہ سوتی کپڑے کے ٹکڑوں پر کروڑگیری کا محصول ۳۵ فی صد قیمت داری سے متجاوز نہ ہوگا۔

۱۶۔ جدید ہندی جاپانی راضی نامہ بابت ۱۹۳۵ء پر ناقدانہ نظر

جاپان سے کیا ہوا نیا معاہدہ جو یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے نافذ ہوا دراصل ایک سمجھوتے کی کوشش ہے۔ لیکن وہ بمبئی کے تجارتی طبقے اور ہندوستانی سوتی کپڑے کی صنعت کے مطالبات کو پورا کرنے میں ناکام رہا۔ یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ یہ راضی نامہ ان متفقہ اور معقول سفارشات کے مطابق نہیں ہے جو حکومت ہند کے غیر سرکاری مشیروں نے کی اور اس کی حیثیت ۱۹۳۴ء کے سابقہ راضی نامے سے بہتر نہیں ہے۔ حکومت ہند اس سے بہتر شرایط طے کرسکتی تھی جن میں چھوٹی صنعتوں کی تامین بھی شامل ہوتی، کیونکہ جاپانی مسابقت کی وجہ سے ان پر برا اثر پڑ رہا تھا۔ تجارتی معاہدہ موجودہ بنیاد ہی پر جاری رکھا گیا۔ اور جاپان کے خلاف تامین کے اس مطالبے پر کوئی توجہ نہیں دی گئی جو چھوٹی دیسی صنعتوں کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔ دونوں ملکوں کے عام باہمی تجارتی تعلقات کی حد تک موجودہ حالت ہی برقرار رکھی گئی ہے۔ اس لحاظ سے راضی نامے سے جاپان کا فائدہ ہوا۔

روئی کے بارے میں شرایط نامے کی حد تک سابق کے مقابلے میں اہم فرق، جیساکہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے، برما کی علحدگی کی وجہ سے ضروری ہوگیا کیونکہ برما سے جاپان نے ایک راضی نامہ طے کیا ہے جس کی بموجب جاپان کپڑوں کے لیے برمی نصاب ۴۲ ملین گز مقرر ہوا ہے۔ اسی لیے ہندوستانی نصاب میں مساوی

مقدار کی کمی کردی گئی۔ لیکن یہ ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ جیسا کہ سابقہ دو سال کے اعداد سے ظاہر ہوتا ہے برما کی ضروریات تقریباً ۷۰ ملین گز سالانہ ہیں جن کو سابقہ شرائط نامے کی بموجب بنیادی نصاب میں شامل کیا گیا تھا۔ چونکہ علیحدہ برمی نصاب صرف ۴۲ ملین گز مقرر کیا گیا ہے، اس لیے ہندوستان زائد ۲۸ ملین گز درآمد کرسکتا ہے، کیونکہ اس کے نصاب میں صرف ۴۲ ملین گز کمی کی گئی ہے نہ کہ ۷۰ ملین گز جیسا کہ ہونا چاہیے۔ ۶۴۹
ہندوستانی روئی کی جاپانی خریداری میں یقیناً کمی نہیں کی گئی ہے لیکن یہ استدلال کیا گیا ہے کہ یہ اس وجہ سے غیر اہم ہے کہ جاپان کو سوتی کپڑوں کی کثیر برآمد شدنی مقدار تیار کرنے کے لیے ہندوستانی روئی کی ضرورت ہے۔ یہ سچ ہے کہ برما ایک کھلا بازار ہوگا۔ لیکن ہندوستان کو وہاں بیرونی ممالک خاص کر لنکا شائر سے مسابقت کرنی پڑے گی، گو کہ رنگین کپڑوں کی ذیلی تقسیم ہندوستان کے لیے فائدہ مند ہے، لیکن اس قسم کے نصاب کے فیصد میں اضافہ اس واقعے کے پیش نظر حق بجانب نہیں ہے کہ اس قسم کی اشیا کی حد تک جاپان ہندوستان کا سخت حریف ہے۔

یہ بھی بدبختی کی بات ہے کہ سوتی کپڑے کے ٹکڑے، تھانوں کے نصاب میں شامل نہیں کیے گئے ہیں۔ البتہ یہ چیز کسی حد تک اطمینان بخش ہے کہ سوتی کپڑے کے ٹکڑوں کی انتہائی مقدار جو ہندوستان کو سالانہ برآمد کی جاسکتی ہے ۸۹ لاکھ ۵۰ ہزار گز یا سوتی کپڑوں کے نصاب کا ½ ۲ فی صد مقرر کی گئی ہے لیکن حکومت ہند کا یہ وعدہ کہ سوتی کپڑے کے ٹکڑوں پر کروڑ گیری کا محصول قیمت واری ۳۵ فیصد سے متجاوز نہ ہوگا ہندوستان کے مخالف تصور کیا جاتا ہے۔

ریشمی کپڑے کے ٹکڑے اور مصنوعی ریشم کے تھان راضی نامے کے دائرے کے باہر رکھے جانے پر سخت اعتراض کیا گیا ہے۔ لیکن ہندوستانی سوتی کپڑے کی صنعت اور دیسی ریشمی صنعت کو محکمۂ فینانس کے اس حالیہ (۱۹۳۷ء کے) اعلان سے مدد ملی ہے جس میں مصنوعی ریشمی کپڑوں کے ٹکڑوں کی ہندوستان میں درآمد کی ممانعت کی گئی ہے اور مصنوعی ریشمی کپڑوں کے تھانوں پر درآمدی محصول اوسطاً ایک آنہ فی مربع گز کے حساب سے بڑھا دیا گیا ہے۔

غیر سرکاری مشیروں کی پیش کردہ بعض تجاویز قبول نہیں کی گئیں مثلاً

بیرونی سامان یعنی تیار لباس، تولیے، سوتی کمبل کی درآمد اور ہندوستان سے نیپال اور افغانستان کے ہمسایہ بازاروں میں مکرر برآمد پر کوئی نصابی تحدید قائم نہیں کی گئی۔

اس بارے میں بھی مایوسی کا اظہار کیا گیا کہ ہندوستان کی ساحلی جہازرانی کی تجارت میں جاپان کی مداخلت کو روکنے اور جاپان اور ہندوستان کے درمیان تجارت نقل وحمل میں ہندوستان کے مناسب حصے کو یقینی بنانے کے لیے راضی نامے نے جو مواقع پیدا کیے تھے اس سے حکومت ہند نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

جدید ہندی جاپانی راضی نامے کی حمایت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ روئی کے کاشتکار کے مفادات کی حفاظت مقدم تھی اور چینی روئی کے خطرے کے مدنظر جس نے نئی پنج سالہ منصوبہ بندی کی وجہ سے تقویت حاصل کرلی تھی یہ امر اطمینان بخش ہے کہ تین سال کے لیے ہندوستانی روئی کی برآمد کا یقین ہو گیا۔[1] اس سلسلے میں یہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ ہندوستان میں جتنی روئی اگتی ہے اس
۶۵۰ کے بڑے حصے کی نکاسی کا بندوبست ہونا نہایت ضروری ہے۔ ملک میں سالانہ ۵ ملین گانٹھ روئی پیدا ہوتی ہے جس کے منجملہ تقریباً ۵۰ فیصد کی کھپت ہندوستانی کارخانوں میں ہوتی ہے۔ گو کہ ہندوستانی سوتی کپڑے کی صنعت کی توسیع و ترقی کی کچھ گنجایش موجود ہے اور لنکاشائر کے کارخانے پہلے کے مقابلے میں زیادہ روئی استعمال کر رہے ہیں، پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے باوجود برآمد کے لیے کافی روئی بچ رہے گی۔ براعظم یورپ میں ہندوستانی روئی کی مانگ یقینی نہیں ہے اور وہاں کسی صورت میں ہماری روئی کی کھپت مجموعی پیداوار کے چند فیصد سے زیادہ نہ ہوگی۔ آج کل جاپان ہی ہندوستانی روئی کا سب سے بڑا

---

[1] لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ چینی جاپانی لڑائیوں کی وجہ سے نیز ان مشکلات کے باعث جو جاپان کو مبادلۂ خارجہ پر نگرانی رکھنے میں پیش آئیں، جاپان نے ہندوستانی روئی کی خریدی میں کافی کمی کردی۔ چنانچہ ۱۹۳۶-۳۷ء میں ہندوستان سے ۴۲ لاکھ ۶۲ ہزار ۹۴ گانٹھ روئی برآمد ہوئی جس کے مقابلے میں ۱۹۳۷-۳۸ء میں برآمد کے اعداد ۳۱ لاکھ ۵۹ ہزار ۹۲ تھے۔

منفرد خریدار ہے اور اس حیثیت سے اس کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ یہ سمجھنا غلطی ہے کہ جاپان ہماری روئی خریدنے پر مجبور ہے اور یہیں سے لامحالہ خریدے گا۔ بدل کے طور پر وہ امریکا، چین اور مصر سے بھی خرید سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہی جاپان کو روئی بیچنے والے کی حیثیت سے ہندوستان اس قدر کمزور نہیں ہے کہ جاپان ہم سے من مانے شرایط منوالے۔

بحیثیت مجموعی قدیم راضی نامے سے نیا راضی نامہ برا نہیں ہے اور نظر ثانی شدہ شرایط نامے کے تحت ہندوستان کی حیثیت زیادہ مستحکم ہو گئی ہے۔ لیکن یہ خیال کیا جاتا ہے کہ حکومت ہند ہندوستان کے مفادات کو پیش نظر رکھ کر ہماری سوداکرنے کی قابلیت سے پوری طرح کام لے سکتی تھی۔ یہ زیادہ مناسب ہوتا اگر سوتی کپڑے کے مبادلے میں خام روئی دینے کا راضی نامہ طے کرنے کی بجائے ایک جامع تجارتی راضی نامہ کیا جاتا جس میں ہندوستان کی چھوٹی ابتدائی صنعتوں مثلاً شیشہ، شیشے کا سامان، پارچہ بافی، صابون سازی، میناکاری، ادویہ سازی وغیرہ کے لیے تحفظات شامل ہوتے۔ چین و جاپان کی جنگ میں جاپان کی مصروفیت کے باعث ہندوستانی بازار سے جاپانی مسابقت فی الحال کمزور پڑ گئی ہے۔ لیکن اس کا امکان ہے کہ یہ مسابقت کسی لمحہ بھی شدید صورت اختیار کرلے۔

۱۷۔ بمبئی و لنکاشائر کا کپڑوں کا راضی نامہ (موڈی لیز پیمان)

ستمبر ۱۹۳۳ء میں بمقام بمبئی ہندوستانی اور برطانوی سوتی کپڑے کی صنعت کے نمایندوں کی کانفرنس کے بعد تقریباً اسی زمانے میں جب کہ ہندی جاپانی تجارتی راضی نامہ (۱۹۳۴ء) کے بارے میں گفت و شنید جاری تھی ایک سمجھوتہ ہوا جس کے فریق مل اونرز اسوسیئشن بمبئی زیر صدارت مسٹر (حال سر) ایچ۔ پی۔ موڈی اور برطانوی سوتی کپڑوں کی صنعت کا وفد زیر قیادت سر ولیم کلیر لیز تھے۔ یہ سمجھوتہ عرف عام میں "موڈی لیز پیمان" کہلاتا ہے۔ ہندوستانی کپڑے کی صنعت کے نمایندوں میں سخت اختلافات تھے اور متحدہ محاذ پیش

کرنے کی ساری کوششیں رائگاں گئیں۔ لیکن لنکا شائر کے نمایندے، بمبئی کی مل اونرز اسوسیئیشن سے جو ہندوستان کے مجموعی تکلیوں اور راچھوں کے تقریباً ۵۰ فیصد حصے کی نمایندگی کرتی تھی ایک راضی نامہ طے کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

۶۵۱ اس راضی نامے پر ۸ راکتوبر ۱۹۳۸ء کو بمقام بمبئی دستخط ہوئے اور اس کی مدت ۳۱ردسمبر ۱۹۴۱ء تک مقرر ہوئی۔ اس راضی نامے کی اہم خصوصیات حسب ذیل تھیں:-

(۱) یہ اتفاق طے پایا کہ ہندوستانی سوتی کپڑے کی صنعت سلطنت متحدہ کے سوت اور سوتی کپڑوں کی درآمد کے مقابلے میں معقول حد تک تامین کی مستحق ہے۔ اس سے بھی اتفاق کیا گیا کہ موجودہ حالات کے تحت ممالک غیر میں مصارف پیدائش کی کمی اور دیگر عاملین کے باعث ہندوستانی صنعت کے لیے یہ چیز ضروری تھی کہ سلطنت متحدہ کی بہ نسبت ان غیر ملکوں کے مقابلے میں تامین کی سطح بلند تر ہو۔

(۲) سوتی کپڑوں کی حد تک اس سے اتفاق کیا گیا کہ جب کبھی بھی ملک کے محاصل کی حالت حکومت ہند کو اجازت دے کہ وہ ان تمام زائد عام محصولوں کو جو اکتوبر ۱۹۳۱ء میں عائد کیے گئے تھے اٹھالے تو ہندوستانی نمایندے سلطنت متحدہ کے درآمدات پر عائد ہونے والے محصولوں کے بارے میں کوئی تازہ تجاویز پیش نہ کریں گے۔

(۳) لنکا شائر سے ہندوستان میں درآمد ہونے والے سوت اور مصنوعی ریشمی کپڑوں پر محصول گھٹا کر مقرر کرنے سے ہندوستانی نمایندوں نے اتفاق کیا۔

(۴) جہاں تک سلطنت برطانیہ اور دوسرے ماوراء بحر بازاروں کا تعلق تھا، اس سے اتفاق کیا گیا کہ برطانوی سامان کے لیے جو سہولتیں حاصل کی جاسکیں وہ ہندوستانی سامان کو بھی حاصل ہونی چاہییں۔ اور اگر ہندوستان کے لیے علحدہ طور پر کوئی نصاب موجود نہ ہو تو ہندوستان کو بھی اس نصاب میں حصہ ملنا چاہیے۔ جو سلطنت متحدہ کو ایسے بازاروں میں ملے۔ ماوراء بحر

بازاروں کی حد تک جہاں ہندوستانی کارخانوں کے کوئی مقررہ تعلقات نہیں تھے یہ طے کیا گیا کہ مانچسٹر کا ایوان تجارت اپنے اثرات کو کام میں لاکر ہندوستانی صناعوں اور ان برطانوی تجارتی کوٹھیوں کے درمیان روابط قایم کرے جو ان بازاروں میں مستحکم حیثیت رکھتے ہوں۔

(۵) خام روئی کی حد تک برطانوی کپڑوں کی صنعت کے وفد نے اس پر آمادگی ظاہر کی کہ وہ سفارش کرے گا کہ ہندوستانی خام مال کے استعمال کو ترقی دینے کے لیے موثر کارروائی کی جائے اور اس سلسلے میں ضروری حالات سے ہندوستان کو باخبر رکھا جائے۔ یہ بھی قرار پایا کہ ہندوستانی روئی کے کاشتکار کے مفادات کے لیے تعاون باہمی کے دوسرے ذرایع بھی تلاش کیے جانے چاہئیں۔

بمبئی لنکاشائر کا سمجھوتہ پہلی کوشش تھی جو راضی نامے کے ذریعے ہندوستانی اور برطانوی مفادات میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے کی گئی تھی۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ یہ راضی نامہ بہت مفید ثابت ہوا۔ اس کی وجہ سے (لنکاشائر روئی کمیٹی کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ اس کی کوششوں کی بدولت لنکاشائر کے کارخانوں میں ہندوستانی روئی کثیر مقدار میں استعمال ہونے لگی) روئی کی اس مقدار میں بہت کافی اضافہ ہوگیا جو لنکاشائر ہندوستان سے حاصل کرتا تھا اور اس طرح ہندوستانی کاشتکار کو بہت فائدہ حاصل ہوا۔ (اس سلسلے ۶۵۲
میں دیکھو حاشیہ صفحہ ۶۵۴ پر)۔ اس راضی نامے سے ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ اس نے ہندوستانی دستوری اصلاحات کی ترقی کے لیے لنکاشائر کی ہمدردی حاصل کرلی اور یہ ثابت کر دکھایا کہ برطانوی اور ہندوستانی تجارتی مفادات سابقہ باہمی بدگمانی اور بے اعتباری کی فضاء کی بجاے دوستانہ رقابت کے جذبے کے تحت مل کر کام کرسکتے تھے۔ لنکاشائر نے صاف دلی کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرلیا کہ خود اس کے مقابلے میں ہندوستانی کپڑے کی صنعت کو کافی تامین کی ضرورت تھی اور ماوراء بحر اور نوآبادیاتی بازاروں میں ہندوستانی کپڑے کی صنعت کے مفادات کو ترقی دینے کے لیے اپنی نیک تمنائیں اور خدمات پیش کیں۔

دوسری طرف راضی نامے کے نقادوں نے یہ استدلال کیا کہ اس کو ہندوستانی کپڑے کی تمام صنعت کی تائید حاصل نہ تھی۔ علاوہ ازیں گو کہ ہندوستان نے لنکاشائر کو کافی اور قطعی سہولتیں عطا کیں (مثلاً سوتی اور ریشمی کپڑوں کے درآمدی محصول میں کمی) لنکاشائر نے محض چند وعدے کئے اور قطعی طور پر خود کو کسی چیز کا پابند نہیں کیا۔ راضی نامے کے معنی یہ تھے کہ تاہین کا بڑا حصہ جس سے ہندوستانی صنعت سابق میں متمتع ہو رہی تھی واپس لے لیا جائے۔ جہاں تک ماورا بحر بازاروں کا تعلق تھا چونکہ بمبئی کے کارخانے خود گھر کے بازار میں بغیر امداد کے ترقی کرنے کے قابل نہ تھے اس لیے بمشکل ان سے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ ماورا بحر بازار میں لنکاشائر کی مدد اور نیک دلی کے باوجود پنپ سکیں گے۔ آخری بات یہ کہ جہاں تک لنکاشائر کے کارخانوں میں ہندوستانی روئی کے استعمال کا تعلق تھا راضی نامے میں محض ایک مبہم توقع دلائی گئی تھی اور جاپان کی طرح لنکاشائر کے لیے لازم نہیں کیا گیا تھا کہ ہندوستانی روئی کی ایک اقل مقدار خریدے۔

۱۸۔ ہندوستان میں لنکاشائری وفد (سنہ ۱۹۳۸ء)

اس سے قبل باب ۲ فصل ۱۲ میں بیان کیا جاچکا ہے کہ ہندوستانی محصول کردڑگیری کی ترمیم کا قانون۔ یکم مئی سنہ ۱۹۳۴ء کو نافذ ہوا اور اس نے نہ صرف ان محصولوں کی شرح کو جو موڈی لیز پیمان کے تحت طے پائے تھے بلکہ سنہ ۱۹۳۴ء کے ہندی جاپانی راضی نامے کو بھی دستوری طور پر عملی جامہ پہنایا۔ یہ بھی بیان کیا جاچکا ہے (باب ۲ فصل ۱۲) کہ کپڑوں کے محصول کی خصوصی مجلس نے بمبئی لنکاشائر کے کپڑے کی صنعت کے راضی نامے کی دو سالہ مدت کے اختتام پر اس زمانے میں برطانوی کپڑوں پر عاید کردہ کروڑگیری کے محصول کی شرحوں پر نظرثانی کی تھی اور اس کی سفارشات کے مطابق برطانوی سوتی کپڑوں کے محصول کو سادہ بھورے رنگ کے کپڑوں کی حد تک ۲۵ فیصد سے گھٹا کر ۲۰ فیصد کردیا گیا اور چھپے ہوئے کپڑوں کی حد تک محصول ۲۵ فیصد رکھا گیا تھا۔ غیر برطانوی سوتی کپڑوں کا محصول قیمت واری ۵۰ فیصد رہا جیسا کہ سنہ ۱۹۳۴ء کے قانون کے تحت تھا۔

ہندوستانی غیر سرکاری مشیروں نے جو مجوزہ ہندی برطانوی تجارتی معاہدے کے لیے سلسلہ جنبانی کر رہے تھے، سر پرشوتم داس ٹھاکرداس کی رہنمائی میں لنکاشائر کے وفد سے جو مسٹر اے، ڈبی، کیمپ بل کی زیر قیادت تھا شملے میں سوتی کپڑوں کے بارے میں گفت و شنید کی جس کے دوران میں ہندوستان میں درآمد ہونے والے لنکاشائری کپڑوں کے محصول کی مزید نظر ثانی کرنے اور اس کی تجارت کو لنکاشائر کی جانب سے ہندوستانی روئی کی خریداری کے سلسلے میں عام طور پر منظم کرنے کے سوال نے مئی ۱۹۳۶ء میں نمایاں حیثیت اختیار کر لی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ (دیکھو فصل ۱۰) اوٹاوا کے راضی نامے کی نظر ثانی کے لیے گفت و شنید میں گزشتہ دو تین سال سے رکاوٹیں پیدا ہوتی گئیں۔ جب ۱۹۳۶ء کے گرما میں ہندوستانی غیر سرکاری مشیر لنڈن گئے تو معلوم ہوا کہ ان رکاوٹوں کا حل لنکاشائر سے مفاہمت میں مضمر تھا۔ چنانچہ اس سے لنکاشائر کے اس فیصلے کی توجیہ ہوتی ہے کہ ہندوستان کو ایک وفد بھیجا جائے تاکہ وہ عام ہندی برطانوی تجارتی معاہدے کے جز کے طور پر ہندوستانی بازار میں ہندوستانی روئی کی خریدی کے معاوضے میں اپنے سوتی کپڑوں کے لیے تھوڑا سا مگر یقینی حصہ حاصل کر سکے۔ جون ۱۹۳۶ء میں لنکاشائر کے سوتی کپڑوں پر محصول کی کمی نے لنکاشائر کو ہندوستانی بازار میں اپنی حیثیت برقرار رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ لنکاشائر دس سال قبل کے ۱۵۰۰ ملین گز کے مقابلے میں ۳۷-۱۹۳۶ء میں ہندوستان کو صرف ۳۱۴ ملین گز (یا برما کو الگ کر کے ۲۶۶ ملین گز) برآمد کرنے کے قابل ہوا۔ اسی لیے لنکاشائر کوشاں ہے کہ اپنے لیے ہندوستانی بازار میں تھوڑا سا مگر یقینی حصہ حاصل کرے۔ ۱۵۳

۱۹- شملے کی گفت و شنید کا انقطاع

حال میں شملہ میں سوتی کپڑوں کے بارے میں جو گفت و شنید ہوئی اس میں تین اہم مسائل زیر تنقیح رہے:- (۱) لنکاشائر کے لیے سوتی کپڑوں کے نصاب کا تعین۔ (۲) لنکاشائر کے کپڑوں کی درآمد پر کروڑگیری کے محصولوں کا تعین۔ (۳) ہندوستانی بازار میں لنکاشائر کو

سوتی کپڑوں کی جتنی تعداد لانے کی اجازت دی جائے اس کے معاوضے میں لنکا شائر کی طرف سے ہندوستانی روئی کی خریدی۔ لنکا شائر نے اولاً اس بات کی خواہش کی کہ اس کو اس بات کی ضمانت دی جائے کہ ہندوستانی بازار میں اس کا کپڑا موجودہ مقدار سے تقریباً دگنی مقدار میں فروخت ہوگا اور اس بات کا یقین دلانے کے لیے کہ کپڑا خریدا جائے گا محصولوں کی ایک لچکدار یا تدریجی شرح (۱۷ ½ فی صد سے ½ ۷ فیصد تک) مقرر کی جائے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ محصولوں میں کافی کمی کر دی جائے حتیٰ کہ وہ گھٹ کر سابقہ عام محصول سے بھی کم ہو جائیں جس کی شرح ۱۵ فیصد تھی۔ ہندوستانی روئی کی خریدی کی حد تک لنکا شائر ی وفد یہ اطمینان دلانے کے لیے آمادہ تھا کہ حسب سابق ہندوستانی روئی کی زیادہ سے زیادہ مقدار خریدی جانے کے لیے انتہائی کوشش کرے گا لیکن وہ اس کے لیے تیار نہ تھا کہ ہر سال ہندوستانی روئی کی کوئی مقررہ مقدار خریدنے کے بارے میں کوئی قطعی تحریری وعدہ کرے۔

لنکا شائر کا عام استدلال یہ تھا کہ ہندی برطانوی تجارتی راضی نامے کی نظر ثانی کی گفت و شنید کے دوران میں دوسری سمتوں میں ہندوستان کے لیے جن مراعات کا پیش کش کیا گیا تھا وہ خاص کر دنیا کے معاشی حالات کے مد نظر اور دونوں ملکوں کے باہمی توازن تجارت (جو نہ صرف مساوی تھا بلکہ دراصل ہندوستان کے موافق تھا) کا لحاظ کرتے ہوئے کافی اچھا تھا

ہندوستانی نمایندوں کی جانب سے لنکا شائر کے مطالبے سے اصولاً کوئی اختلاف نہیں کیا گیا اور یہ تسلیم کیا گیا کہ لنکا شائر میں ہندوستانی روئی کی روز افزوں کھپت کا یقین دلایا جانا نہایت مناسب تھا خاص کر اس ۶۵۴
بے اطمینانی کے مد نظر جو ہندوستانی روئی کے جاپان کی طرف سے خرید نہ کیے جانے کے متعلق پائی جاتی تھی۔ لیکن اواخر ۱۹۳۵ء میں دونوں جماعتوں کے نقطہ ہائے خیال میں وسیع اختلاف ہونے کی وجہ سے شملہ کی گفت و شنید ناکام رہی۔ ہندوستانی غیر سرکاری مشیر اس بات کے اصولاً مخالف تھے کہ لنکا شائر ی

کپڑوں پر درآمدی محصول تدریجی رکھے جائیں اور محصول کی شرح ۲۵ فیصد کی اوسط سطح سے کم رکھی جائے، کیونکہ ۱۵ فیصد محصول کو کسی صنعت کی تائین کے لیے ضروری اور اقل مقدار تصور کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی مشیروں میں لنکا شائر کے اس مطالبے کو بھی تسلیم کرنے کا رجحان نہیں تھا کہ درآمد کی موجودہ مقدار کا دونا نصاب مقرر کیا جائے۔ لنکا شائر کا ہندوستانی روئی کی ایک مقررہ مقدار خریدنے کی ضمانت دینے سے انکار اور محض یہ زبانی یقین آفرینی کہ ہندوستانی روئی زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کی ہمت افزائی کی جائے گی، ہندوستانی وفد کو ہم نوا نہ بنا سکی[۱]۔ آنریبل سر محمد ظفر اللہ خاں کے بیچ میں آنے کے باوجود فریقین میں جو اختلافات تھے وہ کم نہ ہو سکے۔ جس کی وجہ سے سوتی کپڑوں کے بارے میں گفت وشنید کو ترک کرنا پڑا اور مئی ۱۹۳۸ء میں لنکا شائری وفد انگلستان کو واپس ہو گیا۔ اس کے بعد اسی مسئلے کو مسٹر آلیور اسٹانلی صدر محکمہ تجارت برطانیہ نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ جب تک روئی کے مسئلے کا کوئی اطمینان بخش تصفیہ نہ ہو جائے اور ہندوستان میں برطانوی سوتی کپڑوں کے لیے منصفانہ سلوک کا یقین نہ ہو جائے اس وقت تک ہندوستان سے کسی قسم کا تجارتی راضی نامہ طے کرنا ممکن نہ تھا۔ بعد میں چل کر آنریبل سر محمد ظفر اللہ خاں نے پھر گفت وشنید شروع کی۔ جون ۱۹۳۸ء میں مزید گفتگو کے لیے وہ بطور خاص بذریعۂ ہوائی جہاز انگلستان گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برطانوی محکمۂ تجارت نے اپنی تجاویز نظر ثانی کے بعد پیش کیں۔ شملے میں غیر سرکاری حلقوں میں گفتگو سے پتا چلا کہ برطانوی

---

[۱] گو یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہندوستان نے سلطنت متحدہ کو ۳۶-۱۹۳۵ء میں ۴ لاکھ ۵۶ ہزار ایک سو ۲۴ گانٹھ اور ۳۷-۱۹۳۶ء میں ۶ لاکھ ۲۲ ہزار ۴ سو ۲۳ گانٹھ روئی برآمد کی۔ پھر بھی ۳۸-۱۹۳۷ء میں لنکا شائر نے جو روئی خریدی اس کی مقدار گھٹ کر ۳ لاکھ ۹۵ ہزار ایک سو ۲ گانٹھ ہو گئی۔ اس طرح یہ معلوم ہوا کہ ۳۶-۱۹۳۵ء میں جو اضافہ ہوا وہ عارضی تھا۔

محکمۂ تجارت یہ چاہتا ہے کہ موجودہ محصول کی شرح گھٹا کر ۱۵ فیصد کر دی جائے
اور لنکا شائر کے کپڑوں کی درآمد کا نصاب اقل مقدار ۳۵۰ ملین گز اور انتہائی مقدار
۵۰۰ ملین گز مقرر کیا جائے۔ رہی ہندوستانی روئی کی خریدی تو اس کے متعلق
برطانوی محکمۂ تجارت نے کوئی قطعی ضمانت نہیں دی بلکہ صرف یہ یقین دلایا کہ کم تا
۵ لاکھ گانٹھ روئی سالانہ استعمال کی جائے گی[1]

غیر سرکاری ہندوستانی مشیروں نے ان تجاویز پر غور کرنے کے بعد دو
کے مقابلے میں پانچ آرا سے اس کو نا قابل منظوری قرار دیتے ہوئے ۷ ستمبر ۱۹۳۸ء
کو اپنی رپورٹ حکومت ہند کے سامنے پیش کی۔ حکومت ہند آج کل (اکتوبر ۱۹۳۸ء)
ان تنقیحات پر غور کر رہی ہے جو اس رپورٹ میں پیش کئے گئے ہیں۔

گو اس نوبت پر لنکا شائر کے مباحث کے متعلق کوئی فیصلہ کن بات
کہنا ممکن نہیں ہے، کیونکہ رکن تجارت کی پیش کردہ جدید تجاویز کا عوام کو
۶۵۵ سرکاری طور پر علم نہیں ہوا ہے' پھر بھی چند عام خیالات کا اظہار نا مناسب
نہ ہوگا۔ لنکا شائر کے توقعات نا واجبی حد تک بڑھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس
کے بھیجے ہوئے سامان اور ہندوستانی کارخانوں کے مصنوعات کے درمیان
مسابقت بڑھتی جا رہی ہے اور ہندوستانی مصارف پیدائش میں بتدریج کمی
ہوئی ہے۔ درآمدی محصول میں کمی سے لنکا شائر کو اس وقت تک کوئی خاص
فائدہ نہ ہوگا جب تک کہ اس کو بالکل کم نہ کر دیا جائے۔ لیکن یہ طریقہ نامناسب
ہے، کیونکہ ہندوستانی سوتی کپڑے کی صنعت تا مین کی محتاج ہے[2]

---

[1] دیکھو انڈین ٹکسٹایل جرنل (ستمبر ۱۹۳۸ء) میں اے' یس آینگار کا مضمون "ہندی برطانوی
تجارتی تعلقات کی نازک صورت حال"

[2] یہ بھی ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ سوتی کپڑے کی صنعت میں کام کرنے والے مزدوروں
کی صوبہ واری تحقیقاتی کی سفارشات کی بنا پر ہندوستان کی سوتی کپڑے کی صنعت کو حال ہی
(۱۹۳۹ء) میں اجرت میں اضافہ منظور کرنا پڑا۔ علاوہ ازیں جہاں تک ہندوستانی کارخانوں
کے تیار کردہ مہین کپڑوں اور اعلیٰ قسم کے کپڑوں کا تعلق ہے ان کے لیے غیر ملکی لانبے ریشے کی

اصل دقت یہ ہے کہ ہندوستانی بازار میں جہاں کمترین قیمت کی شے سب سے زیادہ ملتی ہے، ہندوستانی اور جاپانی کپڑے کے نرخوں کے مقابلے میں لنکا شائر مسابقتی شرحیں مقرر کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی سوتی کپڑے کی صنعت بھی کچھ نہ کچھ توسیع و ترقی کی مستحق ہے اور دستی راچھ کی صنعت کے حقوق کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستانی روئی خریدنے کے بارے میں لنکا شائر کا پیش کش ترغیب دہ نہیں ہے۔ اولاً یہ بات بخوبی روشن ہے کہ لنکا شائر کو زیادہ تر لانبے ریشے کی روئی کی ضرورت ہے۔ اس قسم کی روئی کی مانگ آج کل ہندوستانی کارخانوں میں تیزی سے بڑھ رہی ہے اور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا لنکا شائر دوسری قسم کی روئی خریدنے کے لیے آمادہ ہے یا نہیں اور لانبے ریشے کی روئی کتنی مقدار میں دستیاب ہو سکے گی۔ بحالت موجودہ ہندوستان میں لانبے ریشے کی روئی کی درآمد روز افزوں ہے جو زیادہ تر مشرقی آفریقہ سے آتی ہے اور یہ یقیناً زیادہ مناسب ہے کہ اس کی بجائے خود ملک ہی میں ایسی روئی اگا کر کی جائے۔ بیرونی بازاروں میں ہندوستانی روئی کی غیر یقینی مانگ کا لحاظ کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے لیے یہ مناسب ہوگا کہ وہ اپنی سوتی کپڑے کی صنعت کو مزید وسیع کرے اور اپنے کارخانوں کی زاید پیداوار کے لیے برآمد کے بازار کو ترقی دے کر اپنی روئی کے اندرون ملک استعمال میں اضافہ کرے[1]

اب اس مسئلے پر وسیع تر ہندی برطانوی تجارتی معاہدے کے تعلق سے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ روئی درآمد کرنی پڑتی ہے اور اس پر ½ ۷ فیصد محصول ادا کرنا پڑتا ہے۔

[1] ۔ ہندوستانی روئی کے کاشتکاروں کے بعض نمایندوں کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ سوتی کپڑے کے بارے میں شملہ کی گفتگو کی ناکامی کا باعث ہندوستانی سوتی کپڑے کی صنعت کے نمایندوں کا یہ ناواجب طرز عمل تھا کہ وہ لنکا شائر کے لیے سابقہ تین سال کی اوسط درآمد کے مطابق کپڑوں کا نصاب مقرر کرنے کے مخالف تھے۔ یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ روئی کے کاشتکار کے نقطۂ نظر کی کافی نمایندگی نہیں کی گئی۔

غور کرنے کی ضرورت ہے اور اس خاردار مسئلے کے حل کے لیے ہم صرف وقت کا انتظار کرسکتے ہیں۔

۲۰۔ ہندی برطانوی تجارتی راضی نامہ ۱۹۳۵ء

بمبئی ولنکا شائر کے راضی نامے (۱۹۳۳ء) کے بعد ہندی برطانوی تجارتی راضی نامہ (۱۹۳۴ء) طے پایا جس پر دراصل ۹ر جنوری ۱۹۳۵ء کو دستخط ہوئے۔ یہ راضی نامہ اوٹاوا کے تجارتی راضی نامے (۱۹۳۲ء) کا ضمیمہ یا شاخسانہ تھا جس کے متعلق یہ طے پایا کہ وہ موخر الذکر کے دوران میں نافذ رہے گا۔

٦٥٦ دستخط کنندگان نے مندرجۂ ذیل اہم ذمہ داریاں قبول کیں:۔

۱۔ یہ تسلیم کیا گیا کہ اگرچہ ہندوستان کی معاشی خوشحالی کے لیے کسی صنعت کی تامین ضروری ہو سکتی ہے، لیکن حالات ایسے ہو سکتے ہیں کہ کسی ہندوستانی صنعت کے لیے سلطنت متحدہ کی تیار کردہ مصنوعات کے درآمدات کے مقابلے میں جتنی تامین درکار ہے اس سے بہت زیادہ بیرونی ممالک کی اشیا کے مقابلے میں ضروری ہو۔

۲۔ ہز مجسٹی کی حکومت نے یہ تسلیم کیا کہ موجودہ حالات کے تحت درآمدی محاصل حکومت ہند کی آمدنی کا ایک ناگزیر جز ہیں۔ اس لیے درآمدی محصول کی شرح کے تعین میں اغراض آمدنی کو مناسب طور پر ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

۳۔ حکومت ہند نے اس کی ذمہ داری لی کہ صرف ایسی صنعتوں کو تامین دی جائے گی جو مجلس کرد ژگیری کی تحقیق کے بعد حکومت ہند کی امتیازی تامین کی پالیسی کے مطابق مسلمہ طور پر اس کی مستحق قرار پائیں۔ تامین صرف اس حد تک دی جائے گی کہ اس سے درآمدی اشیا کی قیمت ہندوستان میں تیار کردہ مماثل اشیا کی قیمت کے مساوی ہو جائے[1] اور اس شرط کے تابع سلطنت متحدہ کی بنی ہوئی اشیا پر جب کبھی ممکن ہو کمتر شرح سے محصول

---

[1] ۔ دیکھو باب صفحہ ۹۔ ۱۰ احاشیہ ۲۔

لگایا جائے گا۔

۴۔ جب کسی صنعت کو کافی تامین دینے کا سوال مجلس کروڑگیری کے پاس پیش کیا جائے تو حکومت ہند سلطنت متحدہ کی کسی متعلقہ صنعت کو اس بات کا پورا موقع دے گی کہ اپنا مقدمہ پیش کرے اور ان دلایل کا جواب دے جو دوسرے غرضمند فریق پیش کریں۔ حکو ہند اس بات کی ذمہ داری لیتی ہے کہ جن صنعتوں کو تامین دی جائے اگر ان کی حالت میں دوران تامین کوئی نمایاں تبدیلی واقع ہو تو ملک معظم کی حکومت کی درخواست پر یا خود اپنے طور پر اس بات کی تحقیقات کرائے گی کہ مذکورۂ بالا دفعہ (۳) کے اصولوں کے لحاظ سے موجودہ محصول کس حد تک موزوں ہے اور ایسی تحقیق کی صورت میں اگر سلطنت متحدہ کی کسی متعلقہ صنعت کی جانب سے کوئی مقدمہ پیش ہو تو اس پر کامل غور کیا جائے گا۔

۵۔ ملک معظم کی حکومت ان تدابیر پر غور کرے گی جن کے اختیار کرنے سے ہندوستان سے خام اشیا اور نیم مصنوعات کی درآمد کو ترقی دی جاسکے جو وہاں کی مصنوعات کی تیاری میں استعمال ہوتی ہوں جن پر ہندوستان میں رعایتی محصول درآمد عائد کیا گیا ہو۔ ملک معظم کی حکومت اس بات کی بھی ذمہ داری لیتی ہے کہ راضی نامۂ اوٹاوا کی دفعہ ۸ کی رو سے ہندوستانی روئی کے استعمال کو ترقی دینے کے لیے ہر ممکن طریقہ مثلاً تحقیق، تجارتی معلومات کی فراہمی بازار کی توسیع کے انتظام اور صنعتی پروپگنڈا اختیار کرے گی۔

۶۵۷ ۶۔ ملک معظم کی حکومت اس بات کی ذمہ داری لیتی ہے کہ سلطنت متحدہ میں ہندوستانی بیڑ کی بلا محصول درآمد کی رعایت کو اس وقت تک جاری رکھے گی جب تک کہ سلطنت متحدہ کے بنے ہوئے آہنی و فولادی مصنوعات پر ہندوستان میں درآمد کے محصولات کم از کم اتنے موافق ہوں جتنے کہ قانون تامین آہن و فولاد بابتہ ۱۹۳۴ء میں معین کیے گئے ہیں۔

باہمی مراسلت کے ذریعے سے ملک معظم کی حکومت نے اس کی ذمہ داری لی کہ نوآبادیات اور زیر سیادت علاقوں کی حکومتوں کو ترغیب دے گی کہ وہ

ہندوستانی سوتی مصنوعات کے ساتھ ویسا ہی رعایتی سلوک کریں جیسا کہ انھی کے مماثل سلطنت متحدہ کے سوتی کپڑوں کے لیے تجویز کیا جائے تاکہ غیر ممالک کے سوتی مصنوعات کے مقابلے میں ان کی فروخت میں سہولت ہو۔ اسی طرح حکومت ہند نے اس بات کی ذمہ داری لی کہ جب دوسرا زاید محصول منسوخ کیا جائے سلطنت متحدہ کے سوتی کپڑوں پر محصول کی شرحیں گھٹا کر سادہ بھورے کپڑوں پر قیمت واری ۲۰ فیصد یا ۱/۲ ۳ آنے فی پونڈ اور دوسرے سامان پر ۲۰ فیصد قیمت واری کر دی جائیں گی۔ یہ بھی طے پایا کہ بمبئی لنکا شائر راضی نامہ بابتہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۳۳ء کی مدت کے اختتام پر تامین کی باقی مدت کے لیے سلطنت متحدہ کے سامان پر موجودہ حالات کی نظر ثانی کے بعد جو تجربات حاصل ہوں ان کی روشنی میں محصول معین کیے جائیں گے۔

۲۱۔ ہندی برطانوی تجارتی راضی نامہ (ستمبر ۱۹۳۵ء) پر تنقیدی نظر

ہندی برطانوی تجارتی راضی نامہ کی ہندوستان میں مخالفت کی گئی۔ کاروباری طبقے کو یہ شکایت تھی کہ ہندوستان میں تجارتی طبقے سے مشورہ نہیں کیا گیا تھا۔ مجلس قانون ساز میں معاہدہ جب زیر بحث آیا تو اس نے اس کی تنسیخ کی قرارداد منظور کی (۱۹۳۵ء)۔ سر جوزف بھورے نے حکومت کی حمایت میں یہ استدلال پیش کیا کہ راضی نامہ محض امتیازی تامین کے ان اصول اور عملیات کا ایک باضابطہ اظہار تھا جو وقتاً فوقتاً مجلس قانون ساز کی منظوری حاصل کر چکے تھے۔ تجارتی طبقے کی رائے حاصل کرنا اس لیے غیر ضروری تھا کہ ان اصول اور عملیات سے کسی قسم کا انحراف پیش نظر نہ تھا۔ "نہ تو آزادی محصول کے اصول" میں کوئی تبدیلی کی گئی اور نہ امتیازی تامین کی پالسی میں۔ راضی نامہ اس بنا پر حق بجانب قرار دیا گیا کہ گو برطانوی مفادات کو امتیازی تامین وغیرہ کے متعلق موجودہ پالسی پر کوئی اعتراض نہیں تھا، لیکن وہ یہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی پالسی کی تعریف و توضیح کر دی جائے تاکہ آیندہ کسی قسم کی غلط فہمی باقی نہ رہے۔ یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ راضی نامے میں محض ان وعدوں کی توثیق کی گئی تھی جو اوٹاوا میں ضمنی طور پر اور کلیر لیز وفد کے ساتھ قطعی

طور پر کیے گئے تھے۔ راضی نامے کی دفعات (۵) اور (۶) سے ہندوستان کو اس کی روئی اور خام اور نیم خام سامان کے بڑھتے ہوئے صرف اور سلطنت متحدہ میں ہندوستانی بیڑ کے بلا محصول داخلے کے حق کی صورت میں مادی فواید حاصل ہوئے۔ ہندوستان سے یہ بھی وعدہ کیا گیا کہ اس کو ایسی سہولتوں میں شریک کیا جائے گا جو نوآبادیات اور زیر نگرانی علاقے برطانوی سوتی مصنوعات کی حد تک مہیا کریں گے۔ ۱۵۸

دوسری طرف ہندوستانی غیر سرکاری تجارتی طبقے کے خیالات کی ترجمانی کرنے والوں نے راضی نامے پر اس بنا پر سخت اعتراض کیا کہ اس نے ''آزادی محصول کے اصول'' نیز اعتباری تامین کے ان قابل قدر اصولوں سے بے اعتنائی برتی جو ۱۹۲۳ء سے مسلم چلے آرہے تھے۔ علاوہ ازیں فریقین کے مفاد کو پیش نظر نہیں رکھا گیا تھا، کیونکہ راضی نامہ ہندوستان سے زیادہ سلطنت متحدہ کے اغراض کے لیے مرتب کیا گیا تھا۔ گو ہندوستان نے بعض امور میں قطعی وعدے کیے تھے، اس کے جواب میں سلطنت متحدہ نے محض اس بات کا پیش کش کیا کہ وہ ان مختلف تدابیر پر غور کرے گا جو ہندوستانی روئی کے استعمال وغیرہ کو ترقی دینے کے لیے اختیار کی جائیں گی اور ہندوستان سے چند موہوم وعدے کیے جن سے مستقبل قریب میں فائدے کی امید کچھ بھی نہ تھی یا بہت ہی کم تھی۔

یہ بھی اعتراض کیا گیا کہ راضی نامے میں ایسے اصول مان لیے گئے تھے جو نصاب بندی یا محصولوں کے فیصد کی تخفیف سے زیادہ خطرناک تھے۔ ایک معین مدت کے لیے تامین دے دینے کے بعد اس مسئلے کو خاص کر سلطنت متحدہ کی تحریک پر دوبارہ چھیڑنا نامناسب تھا۔ اس قسم کی پالیسی ممکن ہے کہ ہندوستان کی صنعتی ترقی میں رکاوٹ بن جائے اور نئی صنعتوں کے قیام میں مانع ہو۔

راضی نامے کے حامیوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان کو اپنے محصولوں پر نگرانی کا جو اختیار تھا وہ نئے راضی نامے کے تحت بھی برقرار تھا

تامین کے سوال کو مکرر زیر بحث لانے کی حد تک یہ بتلایا گیا کہ حکومت ہند نے کسی ہندوستانی صنعت کی صورت حال کی مکرر تحقیق کرنے سے کبھی کوتاہی نہیں کی اگر اس صنعت کو متاثر کرنے والے حالات و شرایط میں کوئی بڑی تبدیلی واقع ہوئی۔ سر جوزف بھورے نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ قانون برطانوی درآمدی محصولات کے تحت اہل ہند کو اس بات کا دستوری حق حاصل تھا کہ اپنے مقدمے کو سلطنت متحدہ کے محکمۂ تجارت کے سامنے پیش کریں۔

۲۲۔ دو فرقی تجارتی راضی ناموں کی نئی پالسی

حالیہ تجارتی پالسی کی تاریخ کی ایک نمایاں خصوصیت خاص کر ۱۹۳۲ء سے یہ رہی ہے کہ متعدد تجارتی ملکوں نے قلیل المدت دو فرقی تجارتی راضی ناموں کے طے کرنے میں روز افزوں سرگرمی ظاہر کی۔ یہ صورت حال اس قدیم تجارتی پالسی سے نمایاں تضاد رکھتی ہے جو بیش ترین رعایت کے اصول پر مبنی ہے اور جس پر حال تک عام طور پر عملدرآمد رہا۔

دو فرقی راضی ناموں کی مختلف قسموں کے منجملہ سب سے عام شکلیں حسب ذیل ہیں :-

۱۔ تصفیۂ حسابات کے راضی نامے

۲۔ معاوضے یا بارٹر کے راضی نامے

موخر الذکر میں اشیا کے راست مبادلے کا انتظام کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے قیمت ادا کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس قسم کے انتظامات دو ملکوں کی حکومتوں یا دو خانگی اشخاص یا دو فرموں کے درمیان عمل میں آسکتے ہیں۔ تصفیۂ حسابات کے راضی ناموں میں اس کا تعین نہیں کیا جاتا کہ کن خاص اشیا کا مبادلہ کیا جائے گا۔ ان کا مقصد زیادہ تر دو فرقی تجارت کو منظم کرنا ہے تاکہ حتی الامکان برآمدات و درآمدات میں صحیح توازن قایم ہو اور مبادلۂ خارجہ منظم ہو جائے۔[۱] ۷۵۹

[۱]۔ دیکھو پریس نوٹ نمبر (۳) ہندوستان کی خارجی تجارت کی پالسی (۱۹۳۶ء) کے بارے میں

اس میں شک نہیں کہ ایسے دو فرقی راضی ناموں میں بیش ترین رعایت کی دفعہ کا اضافہ اب بھی معمولات میں داخل ہے۔ لیکن اس دفعہ پر عملدرآمد اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ ہی مالی نصاب بندی کے انتظامات صنعتی ذمہ داریوں اور علاقہ واری ترجیحات وغیرہ سے متعلق شرایط بھی داخل کیے جاتے ہیں۔

۲۴۔ ہندوستان میں دو فرقی تجارتی راضی ناموں کی تحریک

ہندوستان کے بیرونی گاہکوں نے خاص کر یورپ میں امتناعات، اجاروں، نصاب بندی مبادلے کی بندشوں اور اجازت ناموں کے طریق وغیرہ کی شکل میں حالیہ زمانے میں مختلف رکاوٹیں پیدا کر رکھی ہیں جس کی وجہ سے تجارتی سامان کی حد تک توازن تجارت ہندوستان کے حق میں بتدریج ناموافق ہوتا جارہا ہے۔ اس صورت حال کو ہندوستانی کاروباری طبقہ سخت تشویش کی نظر سے دیکھتا ہے۔ تجارتی معاہدوں کی بنیاد پر تجارت کو منظم کرنے کے عام میلان میں ایسے معاہدے طے کرنے میں سلطنت متحدہ کی مثال نے ہندوستان میں دو فرقی تجارتی راضی ناموں کے ذریعے تجارت کو ترقی دینے کی جامع پالیسی اختیار کرنے کی تحریک کو تقویت دی۔ حکومت ہند پر زور دیا جارہا ہے کہ وہ ان تمام اہم ملکوں سے جن سے ہندوستان تجارتی تعلقات رکھتا ہے، خاص کر جرمنی، اٹلی، ایران، اور ترکی سے دو فرقی تجارتی راضی نامے کرے۔ کیونکہ ان ملکوں کے تجارتی مبادلے کی منظم پالیسی کے نہایت شدید اثرات ہندوستان کی برآمدی تجارت پر پڑ رہے ہیں۔ ملک کے سامنے سوال یہ ہے کہ "آیا ہندوستان دو فرقی تجارتی راضی ناموں کے طریق کے حق میں اپنی بیش ترین رعایت کی عام روایتی پالیسی کو ترک کردے؟"

اس بحث کو اس لیے بھی تقویت پہنچی کہ مجلس قانون ساز نے اپنے اجلاس منعقدہ مارچ ۱۹۳۶ء میں موجودہ راضی نامۂ اوٹاوا کی تنسیخ کی تائید کی

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ:۔ جو حکومت ہند کے محکمۂ اطلاعات نے جاری کیا؛ نیز پال این ازگ کی کتاب "مبادلے کی نگرانی" صفحہ ۱۵۱-۱۵۲۔

اور حکومت کی تحریک کے متعلق مسٹر جناح کی اس ترمیم سے اتفاق کیا جس میں حکومت سے سفارش کی گئی تھی کہ وہ ہندوستان کی تجارت کے میلانات کو اس نقطۂ نظر سے جانچے کہ دوسرے ملکوں سے دو فرقی تجارتی معاہدے کئے جا سکیں [1]

۲۴ - دو فرقی راضی ناموں کے خلاف استدلال

گو اس طرح حکومت ہند بظاہر دو فرقی تجارتی معاہدوں کی پابند ہو گئی پھر بھی وہ اس کی قایل نہیں ہوئی کہ ایسی پالیسی اختیار کرنا مناسب ہوگا۔ حکومت کے خیال میں گزشتہ چند سال کے دنیا کے معاشی حالات یا ہندوستان کے موجودہ معاشی حالات کے مطالعے سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ مسلمہ پالیسی سے انحراف ضروری ہے[2] یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی برآمدی تجارت زیادہ تر ان چند خام اشیا پر مشتمل ہے جو دنیا کے بڑے بڑے بازاروں کو بھیجی جاتی ہیں اور ہندوستان ۲۶۰ کی خوشحالی کے لیے یہ ضروری ہے کہ توازن تجارت اس کے موافق ہو اور اس کو ممکنہ بڑی حد تک ان بازاروں تک بے روک ٹوک رسائی حاصل ہو۔ اس لیے وہ بیش ترین رعایت کی دفعہ کے بموجب حاصل شدہ حقوق کی بنا پر کسی دروازے کو جو اس وقت کھلا ہو اسے بند کرنے کا خطرہ برداشت نہیں کر سکتا۔ دو فرقی تجارتی راضی نامے نہ صرف معاہدہ کنندہ فریقین کی مجموعی تجارت کو فوراً گھٹا دیتے ہیں بلکہ تجارت کے اپنے قدرتی راستوں سے ہٹ جانے کی وجہ سے اس کا بھی امکان ہے کہ کسی تیسرے فریق پر شدید نقصان عاید ہو۔ تجارت کی مجموعی مقدار کے اضافے پر

---

[1] - دیکھو فصل (۹)۔

[2] - جن دلایل پر یہ نتیجہ مبنی ہے وہ اس پریس نوٹ میں درج ہیں جو ناظم اطلاعات حکومت ہند نے مارچ ۱۹۳۶ء میں ہندوستان کی خارجی تجارتی پالیسی کے بارے میں جاری کیا تھا۔ نیز دیکھو بی۔ کے۔ مدن کا مضمون "دو فرقی تجارتی راضی ناموں کا طریق اور ہندوستانی تجارت" انڈین جرنل آف اکنامکس (جولائی ۱۹۳۶ء)۔

موافق توازن تجارت کو ترجیح دینے کی پالیسی کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام تجارتی فاضلات مسدود ہو جائیں گے اور بین الاقوامی تجارت میں مستقل انحطاط پیدا ہوگا۔ ایسی پالیسی کے اختیار کرنے سے جو اس کی تجارت خارجہ کے برآمدات اور درآمدات کو متوازن کردے ہندوستان کو فائدے کی بجائے نقصان ہوگا۔ ایک استدلال یہ بھی ہے کہ درآمدات کی روک تھام جرمنی جیسے تنگ دست ملکوں کے حق میں ایک افسوسناک ضرورت ہوسکتی ہے۔ لیکن ہندوستان جیسے خوشحال ملکوں کا ایسی تدبیر اختیار کرنا محض شکست پسندی ہوگا۔

جرمنی، اٹلی، ایران اور ترکی جیسے ملکوں سے دو فرقی راضی نامے طے کرنے کی حد تک ہمیں اولاً یہ ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ ہندوستان ان ملکوں کے مقابلے میں معمولاً موافق توازن تجارت رکھتا ہے۔ یعنی وہ جتنی مالیت کا سامان ان سے خریدتا ہے اس سے زیادہ قیمت کا سامان ان کو فروخت کرتا ہے۔ ایک ملک جو اپنی درآمدات کی روک تھام کرے وہ ہمیشہ دوسرے ایسے ملک سے جو اپنا سامان فروخت کرنا چاہتا ہو اچھا معاملہ نہیں کرسکتا، اس کے علاوہ ان ملکوں سے ہندوستان کو جو اشیا برآمد کی جائیں گی وہ براہ راست ہندوستانی صنعتوں کی پیداوار سے مسابقت کریں گی۔ یہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہئے دنیا کے بازاروں میں غذائی اشیا اور خام مال فراہم کرنے والے کی حیثیت سے ہندوستان کو جو برتر اور نمایاں حیثیت حاصل تھی وہ باقی نہیں رہی۔ مثلاً جرمنی سابق میں ہندوستان سے خام اشیا کی جو کثیر مقدار حاصل کیا کرتا تھا وہ اب ایسے ملکوں سے حاصل کررہا ہے جن سے تصفیۂ حسابات کے راضی نامے طے ہوچکے ہیں۔ چنانچہ وہ روئی برازیل، پیرو، مصر، اور ترکی سے، کھالیں جنوبی امریکا سے، روغنی تخم ارجنٹائن اور فرانسیسی نوآبادیات سے حاصل ہورہا ہے۔ اس واقعے کا بھی لحاظ کرنا ضروری ہے کہ ان ملکوں کے زر کی صورت حال اور عام معاشی حالات باقاعدہ دو فرقی تجارتی راضی ناموں کی اجازت نہیں دیتے۔

اس قسم کی مشکلات کا سامنا دوسرے ملکوں کی حد تک بھی کرنا پڑتا ہے، مثلاً فرانس اپنی نوآبادیات کی درآمدات کی ہمت افزائی پر زیادہ تر توجہ صرف کررہا ہے اور ہندوستانی چائے کے مقابلے میں زیادہ خوشبودار اور ہلکی چینی چائے کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ریاستہائے متحدۂ امریکا اب بھی اپنی علحدگی پسند روش پر قایم ہیں اور خارجی تجارت کے مقابلے میں اندرونی تجارت کی اصلاح و ترقی پر اپنی توجہ مرتکز کررہی ہیں۔ ایسی صورت میں ان ملکوں سے دو فرقی راضی نامہ کامیابی کے ساتھ طے کرنا بڑا مشکل کام ہے۔

اگر دور بینی سے کام لیا جائے تو یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ ہندوستان ۶۶۱
خود کو باقی دنیا سے علحدہ رکھ کر تجارتی اکائی کی حیثیت سے اپنی موجودہ اہمیت کو باقی نہیں رکھ سکتا۔ اس کو اپنی زائد پیداوار دنیا کے بازاروں میں پہنچانے کے لیے راستے تلاش کرنے چاہییں۔ اس کی آخری خوشحالی کا دارومدار دنیا کی تجارتی اقوام کی عام خوشحالی پر ہے۔ اس لیے اس کا حقیقی مفاد اس میں مضمر ہے کہ بے روک ٹوک بین الاقوامی تجارت بحال ہوجائے جس پر دنیا کی خوش حالی کا دارومدار ہے۔

۲۵۔ دو فرقی راضی ناموں کی ضرورت

لیکن دوسری طرف یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ دنیا کے سنبھالا لینے اور بین الاقوامی تجارت کی آزادی کی بحالی کے امکانات سردست زیادہ قوی نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں معاشی قومیت، خود اکتفائی اور دو فرقی تجارتی راضی ناموں کی جانب موجودہ رجحانات کمزور ہونے کی بجائے زیادہ قوت پکڑیں۔ ان حالات میں ہندوستان کو چاہیے گا کہ اپنی حفاظت کی خاطر تنظیم تجارت کی پالیسی کو قبول کرلے۔ چنانچہ معاہدۂ اوٹاوا اور ہندی جاپانی راضی نامے طے کرکے اس نے اس پالیسی پر عملدرآمد شروع کردیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ برطانیۂ عظمیٰ اور جاپان ہمارے دو اہم ترین گاہک ہیں اور یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم ان کے ساتھ تجارتی راضی نامے زیادہ سے زیادہ فائدہ مند شرایط پر طے کریں۔ لیکن جیسا کہ مجلس قانون ساز کی قرارداد میں

(جس میں مارچ ۱۹۳۶ء میں راضی نامہ اوٹاوا کو منسوخ کیا گیا) ظاہر کیا گیا ہے ہمیں وسعت نظر سے کام لینا چاہیے اور دوسرے گاہکوں مثلاً ریاستہائے متحدہ امریکا[1] جرمنی، اٹلی، ترکی، ایران، کنیڈا، آئرلینڈ، آسٹریلیا[2]، سیلون، مشرقی افریقہ[3] افغانستان[4] اور مصر[5] سے بھی مناسب دو فریقی راضی نامے طے کرنے کے امکانات پوری طرح تلاش کرنا چاہییں۔ ساتھ ہی یہ کوشش کرنی چاہیے کہ حال ہی میں ان ممالک میں سے چند نے ہماری برآمدات پر جو مختلف قسم کی بندشیں عائد کی ہیں ۶۶۲
ان کو دور کرایا جائے۔ موجودہ نازک زمانے میں اس معاملے میں عدم مداخلت کا اصول زیادہ فائدہ مند نہیں معلوم ہوتا اور تاخیر سے ہماری مشکلات میں اور بھی

۱۔ مجلس قانون ساز کی شملے کی میقات (۱۹۳۶ء) میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے معتمد خارجہ نے کہا کہ حکومت ہند اور سلطنت متحدہ کی ملک معظم کی حکومت کے درمیان ہندوستان اور امریکا کے باہمی تجارتی معاہدے کے امکان کی دریافت کے بارے میں مراسلت ہو رہی ہے۔

۲۔ آسٹریلیا کے وفد نے اپریل ۱۹۳۶ء میں لندن جاتے ہوئے ہندوستان تک آسٹریلیا کی تجارت کو وسیع کرنے کے وسایل پر بحث کرنے کے متعلق اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

۳۔ ہندوستان اپنے کارخانوں میں مہین کپڑے تیار کرنے کے لیے بڑی حد تک مشرقی افریقہ سے لانبے ریشے کی روئی درآمد کرتا رہا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے کپڑوں کے لیے مشرقی افریقہ کے بازار میں نصاب مقرر کرانے کی نسبت گفت و شنید کر سکتا ہے۔

۴۔ حکومت ہند اور حکومت افغانستان نے حال (فروری ۱۹۳۶ء) میں یہ تصفیہ کیا ہے کہ باہمی اساس پر ایک تجارتی معاہدہ طے کیا جائے۔

۵۔ حکومت ہند نے حال ہی (۱۹۳۶ء) میں ایسی اشیا کی حد تک جو اوٹاوا کے راضی ناموں کے سلسلے میں سے کسی کی بنا پر ترجیحی سلوک کی مستحق قرار نہیں پاتیں جنوبی افریقہ کی حکومت سے ایک عارضی تجارتی معاہدہ بیش ترین رعایت کے اصول پر طے کیا ہے۔ اس معاہدے پر مجلس قانون ساز کے اندر اور باہر سخت اعتراض کیا گیا۔ لیکن حکومت ہند نے یہ جواب دیا کہ اگر یہ معاہدہ نہ کیا جاتا تو جنوبی افریقہ کے جدید قانون محصول کے تحت جنوبی افریقہ کو ہونے والی ہندوستانی کپڑوں کی برآمد پر بڑھا ہوا محصول لگایا جاتا۔

اضافہ ہوگا۔ ہندوستانی ایوان تجارت بمبئی جیسی کاروباری جماعتوں نے یہ تجویز کیا ہے کہ تجارتی معاہدے طے کرنے کی ایک مناسب اساس قایم کرنے کی غرض سے ہندوستان کو چاہیے کہ ان ممالک کی حد تک جو تجارت میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی پالسی پر کاربند ہیں اپنی درآمدات اور برآمدات کی تنظیم کی اسکیم نافذ کرے۔ ساتھ ہی ہندوستان کو ایسی تمام مساعی کی پوری تائید کرنی چاہیے جو دنیا کی تجارت کے راستے سے موجودہ رکاوٹوں کو دور کرنے اور اس تجارتی آزادی کو خواہ خفیف حد تک ہی کیوں نہ ہو بحال کرنے کے لیے کی جائیں۔

تمت

صحت نامہ

معاشیات ہند جلد دوم

(جتھار اینڈ بیری)

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۹	۶	لی	کی	۱۹	۱۶	ٹیرف	ٹیرف
۱۴	۳	کشش	کمیشن	"	۲۱	بندشین	بندشیں
۱۷	۱	وہ	دو	۲۰	۱	متقابلۃً	مقابلۃً
"	۲	ڈباد	دباؤ	"	۱۰	بابتہ	بابتہ
"	۲۱	بروے	بروئے	"	۱۹	سمدردانہ	ہمدردانہ
"	حاشیہ سطر ۱	این ایس	این - ایس	۲۱	حاشیہ سطر ۱	شاگرد	شاگرد
"	" ۲	نعطے	خطبے	"	" ۴	بیش	بیش
۱۸	پیشانی	بلد	جلد	"	۶	ضعتین	صنعتیں
"	۷	ٹیرف	ٹیرف	"	۱۱	حقائق	حقایق
"	۹	قانوں	قانون	"	۱۵	شالستہ	شایستہ
۱۹	۹	ٹیرف	ٹیرف	"	۱۸	بمبی	بمبئی
"	۱۴	چاہسے	چاہیے	"	۲۰	یوردپی	یورپی
"	"	منتظم	منظم	"	۲۱	ہندوستی	ہندوستانی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۲۲	حاشیہ سطر ۴	سنید	مفید	۲۷	۲	رلپورٹین	رپورٹیں
۲۳	۲	چاہیں	چاہییں	〃	۴	وسوالیسوریا	وسولیشوریا
〃	۹	سپرویزروں	سپروائزروں	〃	۵	طلبا	طلبا
〃	۱۰	ہنگے	مہنگے	〃	۱۲	جزوقتی	جزوقتی
〃	۱۵	وائزرؤں	وائزروں	۲۸	۱۲	روپیے	روپے
〃	۱۷	وظالف	وظائف	〃	〃	〃	〃
〃	۱۸	سکیتیں	سکتیں	〃	۱۳	〃	〃
〃	۲۲	چاہئیں	چاہییں	〃	۱۵	〃	〃
۲۴	۱۷	جیسے پر	جیسے	〃	حاشیہ سطر ۳	Commtu	Commitue
۲۵	۱	ہکومتوں	حکومتوں				
〃	۶	کریں	کریں	〃	〃 ۵	بابتہ	بابت
〃	۳	ٹکنیکل انسٹیٹیوٹ	ٹکنیکل انسٹیٹیوٹ	۲۹	۱۵	ٹیرف	ٹیرف
〃	۴	بمبی	بمبئی	〃	۱۹	نسبتہً	نسبتہً
〃	۱۳	تنظیم	تنظیم	〃	حاشیہ سطر ۲	عہدے دار	عہدہ دار
〃	۱۲	کئی	گئی	〃	〃 ۵	ہوی	ہوئی
〃	۲۰	بمبی	بمبئی	۳۰	۱۱	ضروری	ضرور
۲۶	۱	صنستوں	صنعتوں	〃	۱۲	نگراں	نگران
〃	۳	صنعتیں	صنعتیں	〃	حاشیہ سطر ۱	خام	خام
〃	۵	〃	〃	〃	〃 〃	گلا	گلا
〃	حاشیہ سطر ۱	معاون	معادن	〃	〃 ۳	〃	〃
〃	〃 〃	دعنباد	دھنباد	۳۱	۲	منضبط کرنا چاہیے	منضبط کرنا چاہیے
۲۷	۱	بمبیٔ	بمبئی	〃	۱۸	کردے	کردیے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۳۱	۲۱	ایجنسی	ایجنسی	۹۴	۱۵	نہ صرف	نہ صرف
"	۲۳	بلدے	بلدیے	۱۱۳	۱۵	لشرطیکہ	بشرطیکہ
"	۲۴	کپمیوں	کمپنیوں	"	حاشیہ سطر ۳	پیدا وار	پیداوار
"	۲۵	اتھا	اٹھا	۱۱۴	حاشیہ	ص ۶۲	ص ۶۶
۳۲	۶	دیے	دیے	۱۱۷	۱۰	سویدش	سویڈش
"	۱۱	کراچی	کراچی	"	۱۹	"	"
"	۱۵	روپیہ	روپے	۱۱۹	حاشیہ سطر ۲	بجث	بحث
"	۱۷	انجنیروں	انجینیروں	۱۲۱	۱۶	چاہیے	چاہیے
"	۱۸	گئی	گئی	"	حاشیہ سطر ۱	ڈسمبر	دسمبر
"	حاشیہ سطر ۱	مل	عمل	۱۲۲	۹	ساماں	سامان
۳۳	۵	اپریلی	اپریل	"	۹	سے	ہے
۴۲	۳	۱۸۴-۷۹۲	۱۸۴۲۷۹۲	"	۲۲	شہرون	شہروں
۴۳	۲	کپمنیوں	کمپنیوں	"	حاشیہ سطر ۱	Re Port	Report
"	حاشیہ سطر ۵	"	"	"	" ۲	Presidancy	Prasidency
۴۴	پیشانی	صنعتیں	صنعتیں	۱۲۴	۱۲	اجناعی	اجتماعی
"	"	کئی	کئی	"	حاشیہ سطر ۳	مشیئوں	مشینوں
۴۵	۱۶	چوبیتے	چوبینے	۱۲۵	۳	ازران	ارزان
۴۶	۲۵	لسبتہً	نسبتہً	"	۵	قریے	قریے
۴۸	۱۴	۹۳۴ء	۱۹۳۴ء	۱۲۹	۱۴	تدابیر	تدابیر
"	حاشیہ سطر ۲	منحتم	مختتم	۱۳۰	۲۱	لیئے	لیجئے
۵۴	۲۴	ہندوسانی	ہندوستانی	۱۳۱	۳	جلاما عادتاً	جلاہا عادۃً
۷۶	۱	لیا	کیا	۱۳۲	۱۹	مہتا	مہیا

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۱۳۲	۲۲	جسن	جس	۱۶۷	۱۱	ردپہ	روپیہ
〃	۲۳	شیبتوت	شہتوت	۱۷۱	۴	سنجلہ	منجملہ
〃	۲۴	ارزان	ارزاں	〃	۱۲	بإلک	بالک
۱۳۳	۱۷	مصنوعاًت	مصنوعات	۱۷۴	۷	یچلے	چلے
〃	〃	توجیہ	توجیہ	〃	۱۸	کارخانےسے	کارخانے سے
〃	۱۸	یورپتی	یورپی	〃	حاشیہ سطر ۴	ڈور	دوڑ
۱۳۵	۲	پرورشس	پرورش	۱۷۵	۳	کارگردگی	کارکردگی
〃	۴	متخب	منتخب	۱۷۶	۸	حامل	حاصل
〃	۲۳	پونڈگی	پونڈکی	۱۹۳	۴	غضہ	غصہ
۱۳۶	۱۷	ہندوسانیوں	ہندوستانیوں	۲۰۳	۲۵	اعازت	اجازت
۱۳۹	۱۰	کاٹیج انڈسٹریز	کاٹیج انڈسٹریز	۲۱۰	۶	مزدوراں	مزدوران
۱۴۱	۴	صنعتین	صنعتیں	۲۱۱	۲	سنہ ۱۸۲۹ء	سنہ ۱۹۲۹ء
〃	۶	بیرونی	بیرونی	۲۲۴	حاشیہ	ص ۲۸	ص ۱۲۸
۱۴۲	حاشیہ سطر ۲	Indristries	Industries	۲۳۲	۱۴	جاے	جائے
〃	〃	Stat	State	۲۳۳	۹	م نہاد	نام نہاد
۱۴۳	〃 ۲	Indristreis	Industries	۲۳۴	۵	آمادہ	آمادہ
〃	〃	Stat	State	〃	۶	کرلے	کرنے
۱۴۴	〃 ۱	اکٹوبر	اکتوبر	〃	۱۳	صوبہ دار	صوبہ دار
۱۴۸	۱۳	اسہی	اسی	۲۳۸	۲۵	ایابند	پابند
۱۵۲	۲۴	کھیت	کھپت	۲۵۷	۲	India	India)
۱۵۶	۱۰	کوسلے	کوئلے	۲۵۸	۲۱	آہمیت	اہمیت
۱۶۵	۴	بازلعموم	بالعموم	۲۵۹	۹	ہو۔	ہو)۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۲۶۷	حاشیہ سطر ۱	-Imvesti)	Investi	۳۱۰	۸	ھھیہ	پیہ
〃	〃 ۲	(gations	gations	〃	۹	کوذمہ دار	کا ذمہ دار
۲۶۹	〃 ۱	years	years)	۳۱۵	۳	معینہ	معلنہ
۲۷۴	۱۳	تنفارش	تشفارش	〃	۷	پاسجائی	پابجائی
〃	۱۵	نبویب	تبویب	〃	۲۳	ماسکتی	جاسکتی
۲۷۵	۱۶	شہو	شمار	۳۱۶	۸	تقائم	تائم
۲۸۱	۶	امدنی	آمدنی	〃	۱۶	لوجھ	بوجھ
۲۸۴	۱۳	ں	ہیں	۳۱۷	۹	خلوف	خلاف
۲۸۶	〃	ے کر	بے کر	۳۱۹	۳	استقاط	الفاظ
۲۸۸	۵	احراج	اخراج	〃	۱۱	تقویض	تفویض
۲۹۵	۲۱	سیے	لیے	〃	۱۲	سرمائے	سرمایے
۲۹۷	۳	تہنذیبی	تہذیبی	〃	حاشیہ سطر ۶	کمپنیون	کمپنیوں
〃	۵	چند ان	چنداں	۳۲۷	سطر ۷ کالم ۱	البین	ریلیں
〃	۸	شکلوت	شکلوں	۳۳۶	۱۴	ہمت افزرائے	ہمت افزائی
〃	۱۳	ہندوستاں	ہندوستان	۳۳۷	حاشیہ سطر ۱	سکتا	جاسکتا
۳۰۰	۱۵	کررہی	کررہی ہیں	۳۴۲	۱۳	فتمول	مہتمول
۳۰۱	۷	چھوئی	چھوٹی	〃	۱۸	تیعیرے	تیسرے
〃	۲۴	ریلبن	ریلیں	۳۴۳	۳	ہولی	ہوئی
〃	〃	استظام	انتظام	۳۴۴	۶	تجویز	تجوبیہ
۳۰۲	پیشانی	پانچوان	پانچواں	۳۴۶	〃	افرائی	افزائی
۳۰۷	۹	س	اس	۳۵۲	۱۰	لائوں	لائنوں
۳۰۸	۲۴	کا العدم	کالعدم	〃	حاشیہ سطر ۲	مربع	مربع

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۳۵۴	۱۳	استظام	انتظام	۴۱۶	۲۰	چاچکا	جاچکا
〃	۲۰	امریکیہ	امریکہ	۴۲۰	۱۵	کمی کی کی	کمی کی
۳۵۶	۲۳	برقرلر	برقرار	۴۲۳	۱۶	کساد یاداری	کساد بازاری
۳۵۸	۹	ربی	رہی	۴۲۴	۲	اسکیم کے کے	اسکیم کے
۳۵۹	۶	نپٹنے	نبٹنے	۴۳۵	پیشانی	تحارت	تجارت
〃	۱۴	نمٹانیا	نبٹایا	〃	۵	ذہول	دہول
۳۶۸	۱۲	ہکومت	حکومت	۴۳۶	۱۹	کپاہیں	کپاس
〃	〃	ے	سے	〃	۲۳	ریسے	ریشے
۳۶۹	۱۵	ریلوئے	ریلوے	۴۳۷	۷	فولاوی	فولادی
۳۷۳	۲۰	مقر	مقرر	〃	۲۴	ہں	ہیں
۳۷۷	۴	صوبہ دارخود مختاری	صوبہ ارخود مختاری	۴۳۸	۸	ہں	ہیں
۳۸۷	۱۸	ایہ	ایک	〃	۱۳	گاتھ	گانٹھ
۳۹۱	۷	ییں	ہیں	۴۴۰	۹	روغن ودر	روغن دار
〃	〃	ملکون	ملکوں	۴۴۲	۱۵	یاونڈ	باونڈ
۳۹۳	۳	نوقع	توقع	〃	۱۷	ہندرڈویٹ	ہنڈرڈویٹ
〃	۲۰	افسرون	افسروں	۴۴۳	۱۹	آسٹریبا	آسٹریلیا
۳۹۴	۲۳	ہن	ہیں	۴۴۴	۹	چاپان	جاپان
۳۹۶	۱۷	یہاں	یہاں	۴۴۶	۱۸	چھوے	چھوٹے
۳۹۷	۲	باشندون	باشندوں	۴۴۷	۵	عظم	عظیم
۳۹۸	۸	کاروائی	کارروائی	۴۴۸	حاشیہ سطر ۴	ایک	ایک
۴۰۴	۲۲	سوتیوں	موتیوں	〃	〃 ۲	اسی	اتنی
۴۱۴	۱۹	لبندن	لندن	〃	۷	پٹینڈٹیکر	پنڈلیکر

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۴۴۹	پیشانی	حھٹا	چھٹا	۴۷۴	حاشیہ ۲۲	بصر	بر بسر
〃	۴	حنگ	جنگ	۴۷۵	۱	ست	شت
〃	〃	قتمتیں	قیمتیں	۴۸۱	۱۹	مغاملات	معاملات
〃	۱۵	صرح رکی	طرح رہے	۴۸۲	۱۵	انگلستان	انگلستان
۴۵۰	۴	بیجا	بیچا	۴۸۴	۲	یہاں	بیان
〃	۱۴	بیچھے	پیچھے	۴۸۵	۱۵	ساصل	ساحل
۴۵۴	۱۹	۱۵۳۵ئہ	۱۹۳۵ئہ	۴۹۱	۵	تحنیف	تخفیف
۴۵۵	۶	سرآمد	برآمد	۴۹۷	۵	ترمین	زمین
۴۵۶	پیشانی	معاشا	معاشیات	۵۰۱	۱۶	ناکپور	ناگپور
〃	〃	حھٹا	چھٹا	〃	حاشیہ ۲۲	بعص	بعض
۴۵۹	۴	مالا	بالا	۵۰۳	۱۷	چپڑا	چپڑا
۴۶۰	۱۷	پیشی	بیشی	۵۰۵	۳	جرمنی	جرمنی
〃	۲۱	تکارتی	تجارتی	〃	۱۱	قیضے	قبضے
۴۶۴	۱	اورں کی	اور بیمہ کی	۵۰۷	حاشیہ ۲۲	مستئیڈ	مستیفڈ
〃	۷	حولو	جو	۵۰۸	۱۴	لوئی	کوئی
۴۶۷	۲۰	مرول	مدول	〃	حاشیہ انگریزی ۲۴	.	.
〃	۲۱	ہیں شامل	میں شامل				
〃	〃	کیا	کیا	〃	۲۵〃		.
۴۶۹	۱۶	برسھر	برسو	۵۱۴	۹	یاژاری	بازاری
〃	حاشیہ ۱۴	ثے	نئے				
۴۷۱	۱۴	ذے	ذمے	۵۱۶	۱۳	زریر مشتس	زیر مشتمل
〃	حاشیہ ۲۰	بعھ	برسو	۵۱۷	پیشانی ۱	ساتواں	ساتواں
۴۷۳	۱	سم	ہم	〃	۱	رجیرڈ	رجیسٹرڈ
〃	۱۳	(غیر فوجی فن)	(غیر فوجی)				

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۵۱۷	۶	۰	ۃ	۵۴۱	۳	درکار	درکار
"	۷	ھکہ	حکو	"	۱۹	بھیتجے	بھیجنے
"	۹	نقطۂ	نقطہ	۵۴۳	حاشیہ غائی سطر ۱۸	۳ ۱۱	....
"	۱۳	کر:	کیا				
۵۱۸	۱۶	زرخ	رخ	۵۴۵	۱	ڈھلالی	ڈھلائی
۵۱۹	پیشانی	ساتوں	ساتواں	"	۷	برقے	برقیے
"	۸	حطی	قطعی	۵۴۸	۱۵	ذخیرہ	ذخیرۂ
"	۲۲	دیئا	دنیا	۵۴۹	۲۰	روپیہ	روپئے
۵۲۰	۹	کرنے	کرسنے	۵۵۰	۸	کوئی	کوئی
"	۱۱	غرص	غرض	۵۵۱	حاشیہ ۲۲	کالم	کالم
"	۱۳	اندیشناک	اندیشہ ناک	۵۵۴	۴	ہوتاتا	ہوتاتو
۵۲۲	پیشانی	ساتوان	ساتواں	۵۵۵	۲۴	محفوظ ذحیرہ	محفوظ ذخیرہ
"	۲۰	جاتے	جانے	۵۵۷	۶	داجلی	داخلی
۵۲۴	۱۵	نقصاں	نقصان	۵۵۸	۸	مبادلہ سکے	مبادلے کے
۵۲۵	۶	اعاد	اعادا	۵۵۹	۶	طورپر	طورپر
"	۱۰	مبارلہ	مبادلہ	۵۶۱	۱۸	لے	لئے
"	۲۵	مبادلے کے	مبادلے سکے				
۵۲۶	۶	و د	دو	۵۶۳	پیشانی	ساتراں	ساتواں
"	۲۳	روپیے	روپیے	۵۶۵	"	ناتواں	ساتواں
۵۲۸	۱۵	ساہنے	سونے	۵۶۶	۱۶	کردیکئی	کردیگئی
"	۱۷	گلا	پگلا	۵۶۷	۱۸	پنس	پنس ؟
"	۲۵	قراردے	قراردیے	"	۲۳	بلے	ملے
۵۲۷	۱۱	ٹھہری	ٹھیری	۵۶۸	۱۵	جون	جوں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۵۶۸	۱۷	روپیے	روپلے	۶۴۵	۲	مبادلے	مبادلہ
۵۶۹	۲	مہریں	مہریں	"	۱۸	آیئندہ	آئیندہ
۵۷۲	۳	ترتیب	ترتیب	۶۴۶	۲۲	روپیہ	روپے
۵۷۳	۱۱	روپیے	روپے	"	۲۳	تھا	تھی
۵۷۴	۲۴	اضافے	اضافے	"	۱۷	بڑہ	بڑھ
۵۷۵	۳	بڑھی	بڑھی	۶۴۷	۵	ملا	—
"	۲۱	گئی	گئی	۶۵۰	۱۸	جائیں	جاتیں
۵۹۶	۱۵	مبادکہ	مبادلہ	۶۵۱	۲۴	جائیں	جائیں
۵۹۸	۱۶	پورش	یورش	۶۵۲	۱۲	ال	ان
۶۰۶	خانہ ۹	تمسکات	تمسکات کا	۶۵۳	۲۵	ہلکا	ہلکا
۶۱۸	۸	ضافہ	اضافہ	۶۵۴	پیشانی	اٹھواں	آٹھواں
۶۲۰	۱۶	تقد	نقد	"	۱۹	راج	رواج؟
۶۲۱	۱۹	وا قعے	واقعے	۶۵۸	۶	درار	قرار
۶۳۰	۲۱	کی تجویز	تجویز	۶۶۶	۱۳	ناکے	دنیا کے
۶۳۶	۶	کردی	کردی	۶۸۵	۱۰	خریدی	خریدی
"	۹	نوتوں	نوٹوں	۶۸۷	۱	زررو	رزرو
۶۳۷	۱۷	ہندیوں	ہنڈیوں	۶۹۵	۱	حیثبت	حیثیت
۶۳۹	پیشانی	آٹھواں	آٹھواں	۷۰۸	۴	اپر	اوپر
"	۲	مسکل	مشکل	۷۱۴	۱۰	ہیں ہیں	ہیں
"	۱۴	قواعد ضوابط	قواعد و ضوابط	۷۱۵	۲۲	بحثیت	بحیثیت
۶۴۰	۱۷	بھی	تھی	۷۲۰	۲۳	مں	میں
"	۱۸	یثیت	بحیثیت	۷۲۱	۵	کے روزگاری	بے روزگاری
۶۴۱	۲	اندرولی	اندرون				

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۷۲۱	۱۶	متفالہ	معاملہ	۷۹۴	۲۰	تتانے	ڈھانے
۷۲۲	۱۳	حداد	عدد	۷۹۶	۲۳	ہولے	ہونے
〃	۱۹	اضافر	اضافہ	۷۹۹	۱۲	ڈاکجانے	ڈاکخانے
〃	۲۲	کھٹ کو	گھٹ کر	〃	۲۰	وماں	وہاں
۷۲۶	۷	توانزن	توازن	۸۰۰	۷	ذخرہ	ذخیرہ
۷۲۹	حاشیہ سطرا	انجنسیاں	ایجنسیاں	〃	۱۸	وے	دے
۷۳۱	۱۵	معتدیہ	معتدبہ	۸۰۶	۸	امپیرینک	امپیریل بنک
۷۳۲	۱۶	رو یے	روپے	۸۱۰	۲	نبکوں	بنکوں
۷۴۴	۱	حفاطت	حفاظت	۸۱۳	۲	مصوں	حصوں
۷۴۹	۳	موتیوں	موتیوں	۸۲۰	۴	نگرابی	نگرانی
۷۵۲	۱۶	جالے	جانے	۸۳۰	۱۶	پاچ	پانچ
۷۶۰	۱۷	امپیرینک	امپیریل بنک	۸۴۷	۱۹	متہور	مشہور
〃	۲۱	〃	〃	۸۴۹	۳	ڈبنچروں	ڈبنچروں
۷۶۲	۱۲	حوذہ	خواہ	۸۵۱	۲۰	سیرت	حیرت
۷۷۳	۲	حاے	جائے	۸۵۲	۸	یہ اندازہ	اندازہ
۷۷۷	۲۰	حسباب	حساب	〃	〃	جبیمس	جیمس
۷۸۵	۸	بازا	بازار	۸۵۵	۸	کعونکہ	کیونکہ
〃	۱۸	نے	سے	۸۵۸	۲۱	فروع	فروغ
۷۸۹	۲	حس	جس	۸۶۰	۱۵	متجدہ	متحدہ
〃	۷	پوی	پوری	۸۷۳	۱۱	یافی لہ	پائی سلہ
۷۹۳	۵	صریف	حریف	۸۹۶	۲۴	، فیوں	، افیوں
۷۹۴	۱۱	دریچے	درجے	۹۲۰	۷	اساسبی	اساسی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
۹۲۰	حاشیہ سطر ۳	ٹھیکا	ہلکا
〃	〃 ۱۰	صوبیوں	صوبوں
۹۲۳	جدول خانہ ۳ سطر ۱	قوم	رقوم
۹۳۴	۱۱	گھٹا	گھاٹا
۹۴۶	۲۰	یں	ہیں
۹۶۰	۲	حابص	خالص
۹۶۹	۲۱	پڑے	پڑے
۹۷۲	۱۴	موفیق	تعویق
۹۷۷	۱	بیے	سکے
〃	۵	بیے	دیئے
〃	۱۶	جانیجب	جانب
۹۷۹	۲۵	ہراصوبہ	مرادصوبہ
۹۹۳	۳	معائضے	معاوضے
۹۹۷	۶	تہ سیع	وسیع
〃	۷	دینی	دیتی
〃	۱۳	ترمیت	نوعیت
〃	۱۴	جوحامل	جوحاصل
۹۹۸	۱۶	رسعت	وسعت
〃	۱۹	رصنعتی	وصنعتی
۱۰۰۰	۹	موجودا	موجودہ ا
۱۰۰۱	۷	کاری	گاری
〃	۱۳	سفتی نشوونما	صنعتی نشوونما

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
۱۰۰۳	۹	سےہے	سے رہے
۱۰۰۴	۲۱	ست	سب
۱۰۰۵	۲۲	لقتاثرہ	کم متاثرہ
〃	〃	غہ	غلہ
۱۰۰۶	۱۶	صدرارت	صدارت
۱۰۰۸	۵	ہروز	ہ روز
〃	۷	با	پا
〃	۸	محص	محض
〃	۲۱	راستب	راست
۱۰۱۰	۷	ہوں	نہ ہوں
〃	۱۳	تھ	تھا
۱۰۱۱	۱۴	لی	کی
〃	۲۰	جیبے	جلسے
۱۰۱۲	۷	مصیت	مصیبت
۱۰۱۳	۳	کنودل	کنٹرول
〃	۷	رزاعت	زراعت
۱۰۱۶	۲۴	——	ایسے اشخاص کی کثیر تعداد جو فوج میں سپاہی تھا یا اہلکار تھے جنگ عظیم
〃	〃	——	

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۱۰۱۶	حاشیہ سطر ۱	سحص	شخص	۱۰۲۱	۸	بیرور	بیروز
۱۰۱۷	۶	ہوئی	ہوئی	〃	۲۳	〃	〃
〃	〃	تکلیف	تکلیف	۱۰۵۰	۲۴	نیتہً	نسبتہً
۱۰۱۸	۱۰	ایائی	آبائی	۱۰۵۳	۹	معاہدے	معاہدے
〃	حاشیہ سطر ۱	گمیٹی	کمیٹی	۱۰۵۸	۲۴	پوڈ	پونڈ
〃	〃 ۳	پہ	یہ	۱۰۶۱	۲۴	سینے	سنے
۱۰۲۱	۶	جسا	جیسا	۱۰۸۳	۲۲	ایادیات	آبادیات